ماہر القادری

جلد ۱۰ — نمبر ۱

فاران

اپریل ۱۹۵۸ء ——— ایڈیٹر ——— ماہر القادری

سالانہ چندہ ——— چھ روپے

فی پرچہ ——— آٹھ آنے

——— مقامِ اشاعت ———

دفترِ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

نظم و ترتیب

پرنٹر، پبلشر مسرور حسین — انٹرنیشنل پریس میکلوڈ روڈ کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

دین میں اصل اعتبار کتاب و سنت کا ہے، ہر کسی کے قول و عمل کو چاہے وہ کتنا ہی بڑا امام، فقیہہ، محدث، مفسر، صوفی اور متقی کیوں نہ ہو، کتاب و سنت کی کسوٹی پر پرکھ کر اور پرکھ کر دیکھا جائے گا! جس کسی بڑے سے بڑے آدمی کی کوئی بات کتاب و سنت کے معیار کے مطابق نہ ہوگی، اُسے رد کر دیا جائے گا، کتاب و سنت کے حاملینِ اولین صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تھے اس لئے اُن کے "آثار" میں ملتِ مسلمہ کے لیے سعادت و فلاح بلکہ ہدایت کی روشنی ملتی ہے "آثارِ صحابہؓ" میں بھی جس کسی صحابی کا قول و عمل کتاب و سنت سے جتنا زیادہ قریب ہے اُسے راجح تر سمجھا جاتا ہے! کتاب و سنت اور آثارِ صحابہ کے مقابلہ میں کسی کا بھی قول و عمل کوئی وزن نہیں رکھتا!

جن کو "بزرگانِ دین" کہا جاتا ہے، اُن کی بزرگی صرف اس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہ نیک بندے کتاب و سنت کے مطابق اپنی زندگیاں بسر کرتے تھے، اور اُن کے رد و قبول کا معیار کتاب و سنت تھا، مگر وہ بہرحال انسان تھے، ان میں کوئی معصوم نہ تھا، اور ان میں سے کسی کی بھی زندگی کو "اُسوۂ رسولؐ" کا مقام نہیں دیا جا سکتا! ان بزرگانِ دین میں سے کسی کا کوئی قول و عمل کتاب و سنت کے مطابق اگر نہ پایا جائے تو اس کی کئی وجوہ ہو سکتی ہیں —— یہ کہ ممکن ہے ان کے سوانح حالات ملفوظات اور ارشادات میں کسی نے الحاق کر دیا ہو اور اصل واقعہ اور قول میں کتر بیونت سے کام لیا ہو —— یا یہ کہ کہنے والا اپنے مافی الضمیر کی واضح طور پر ترجمانی نہ کر سکا ہو، اور اس کی ذاتی وہ مراد نہ ہو، جو اس کے کہے ہوئے لفظوں سے ظاہر ہوتی ہے —— یا پھر کتاب و سنت سے اس کے قول و فعل کی مطابقت کرنے میں ہم سے غلطی ہو رہی ہو، وسعتِ نظر اور جائز حدود میں توسع سے کام لیا جائے تو اس قول و عمل کی کتاب و سنت سے مطابقت ہو سکتی ہے،

لیکن

اس پر بھی ان بزرگ کے قول و عمل اور کتاب و سنت میں مطابقت نہ ہو سکے، تو پھر ایمان کا یہی تقاضا ہے کہ اس قول و عمل کو چھوڑ دیا جائے، ایسا کرنے سے اُن بزرگ کی —— چاہے وہ فقہ کے امام ہوں یا تفسیر و حدیث کے عالم، وہ قطب ہوں یا ابدال ہوں —— نہ توہین ہوتی ہے اور نہ اس اختلاف سے دین و ایمان میں ذرا برابر نقصان واقع ہوتا ہے! بزرگانِ دین کی عزت اور احترام "کتاب و سنت" کے ماتحت ہے کتاب و سنت سے بلند و بالا نہیں ہے، ایک مسلمان کے ایمان کا لازمی یہ تقاضا ہونا چاہیئے کہ وہ کتاب و سنت کے مقابلہ میں کسی کے قول و عمل کو وقعت نہ دے، اور جب ان میں ٹکراؤ نظر آئے،

تو اس کی محبت، اطاعت، وفاداری اور رفاقت "کتاب و سنت" کے ساتھ ہو!

ایک مثال :-

بصرہ کے ایک عالم عثمان بن مسلم بتی کے بارے میں حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا :-

"لو ادرکنی البتی لترک کثیراً من قولہ واخذ بقولی"

(اگر عثمان بتی مجھے پاتا تو اپنے بہت سے اقوال ترک کرکے میرے اقوال لے لیتا)

خطیب بغدادی سے اس قول میں انتہائی مغالطہ آمیز تسامح ہوگیا کہ انھوں نے "البتی" کو "النبی" پڑھ کر امام ابوحنیفہ کی طرف یہ بے سروپا قول منسوب کردیا ہے کہ :-

"لو ادرکنی النبی صلی اللہ علیہ وسلم لاخذ بکثیر من قولی"

(اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم مجھے پالیتے ۔ تو میری بہت سی باتیں لے لیتے)

اس واقعہ سے دو باتیں سامنے آتی ہیں کہ خطیب بغدادی چاہے کتنے ہی بڑے عالم کیوں نہ ہوں، مگر (اللہ تعالیٰ انھیں معاف فرمائے) ان سے یہ بہت بڑی غلطی سرزد ہوئی ہے، اور ان کی اس غلطی پر ٹوکنے سے یہ نتیجہ نکالنا کسی طرح درست اور قرینِ صواب نہیں ہے کہ اس سے ایک عالمِ دین کی تخفیف اور توہین ہوتی ہے، اور ہم چونکہ خطیب بغدادی سے صدیوں بعد پیدا ہوئے ہیں، اور ان کے برابر علم و تقویٰ نہیں رکھتے، اس لئے ہمارا یہ منصب نہیں ہے کہ ان کی غلطی پر مواخذہ کریں ——— عقیدت و احترام کا یہی وہ وہم ہے جس نے نہ جانے کتنے افسانوں کو حقیقت بنادیا ہے اور غلط اندیشیوں کے انبار لگا دئے ہیں!

یہ واقعہ دوسری اس حقیقت کو سامنے لاتا ہے کہ فرض کیجئے تحقیق کرنے والوں کو یہ معلوم نہ ہوسکتا کہ امام ابوحنیفہ نے "البتی" کہا تھا "النبی" نہیں کہا تھا، تو ان کے اس قول کی کوئی توجیہ نہ کی جاتی اور اُسے بے دریغ رد کردیا جاتا۔

ایک طرف خطیب بغدادی کی تاریخ میں[1] حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے اصحاب سے غلط سلط باتیں منسوب کی گئی ہیں اور دوسری طرف امام اعظم کی شان میں غلو کا یہ عالم ہے کہ ایک بہت بڑے شیخ وقت اور عالم ربانی نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب دوبارہ دنیا میں آئیں گے تو وہ مذہب ابوحنیفہ پر ہوں گے! یہ تو صحیح ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ عیسوی شریعت نہ ہوگی بلکہ شریعت محمدی کے مطابق عمل فرمائیں گے، مگر ان کا درجہ کیا صحابہ و تابعین کے برابر بھی نہ ہوگا کہ جو خود صاحب اجتہاد تھے اور کتاب و سنت سے براہ راست استنباط فرماتے تھے اور کسی مخصوص فقہی مسلک کے مقلد نہ تھے

ان واقعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پچھلے بڑے آدمیوں سے بھی شخصیتوں کی مدح و منقبت اور تنقید و احتساب میں بعض اوقات افراط و تفریط ہوگئی ہے، لہٰذا ہمیں ان کے اجتہادوں کو جوں کا توں قبول نہیں کرلینا چاہئے!

شیخ محی الدین ابن عربی کے متعلق ان کے بعض محتاط و معتدل عقیدت مندوں کا یہ کہنا ہے کہ "فصوص الحکم" میں بعض ملحدوں نے الحاق کردیا تھا، ورنہ شیخ اکبر کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ ان خرافات سے پاک تھا۔ خدا کرے یہ بات صحیح ہو اور "الفصوص" میں بصائر و حکم کے ساتھ جو خار و خس بلکہ یوں کہنا چاہئے سانپ بچھو پائے جاتے ہیں۔

---

[1] ارباب علم و نظر نے اس کی بھی تحقیق کی ہے کہ تاریخ خطیب میں اس قسم کے اضافے بعد کے لوگوں کے کئے ہوئے ہیں۔

ان کی نسبت شیخ سے درست ہو، مگر ان لوگوں کو کیا کہیے کہ جو ان "الحاقی عبارتوں" کو عرفان و تصوف کے دقیق نکات اور فلسفی حقائق سمجھ کر ان پر ایمان لائے بیٹھے ہیں اور ان خطرناک شطحیات کو کتاب و سنت کے ساتھ جوڑ ملانے کی جسارت کرتے ہیں! اس بحث کے دو پہلو ہیں کہ یا تو "الفصوص" کی قابل اعتراض عبارتوں کو "الحاقی" مانا جائے کہ ان میں خطرناکیوں کی کوئی حد و انتہا نہیں، اور اگر کوئی اصرار کرے کہ نہیں شیخ اکبر نے یہی لکھا تھا، تو پھر ایمانی جرأت سے کام لے کر ان سے اظہار برأت کیا جائے!

تصوف "تزکیۂ نفس" کا نام ہے، مگر منصور حلاج کا نعرۂ "اناالحق" تزکیۂ نفس کی کسی ضرورت کو پورا نہیں کرتا، بلکہ اس نعرے سے "حق" مشتبہ ہوتا ہے اور اس سے فرقہ حلولیہ کے باطل مسالک کو شہ ملتی ہے، اس لئے یہ "نعرہ" اور اس فکر و تصور پر مرتب کئے ہوئے نکتے، اشارے اور مسئلے سب کے سب، رد کر دینے کے مستحق ہیں کہ اسلام کا مزاج اس قسم کی شوخیٔ انکار اور مجذوبانہ باتوں سے دور کی بھی مناسبت اور مطابقت نہیں رکھتا، کہا جاتا ہے کہ منصور کا ظرف چھوٹا تھا جو بادۂ عرفان و مستی کی ذرا سی شراب سے چھلک اٹھا، اول تو یہ توجیہ ہی "دینی توجیہ" نہیں بلکہ شاعرانہ شوخیٔ فکر ہے، اور اگر اس کو درست بھی مان لیا جائے، تو ایسے اوچھے، کم ظرف اور غیر ذمہ دار لوگ دین میں کوئی مقام اور حیثیت نہیں رکھتے!

نقد و نظر

ایک شخص کہتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "حاضر و ناظر ہیں" دوسرا شخص اس عقیدہ کو مشرکانہ بتاتا ہے کہ ہر جگہ اور ہر وقت "حاضر و ناظر" ہونا صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، یہ دونوں اپنے مسلک و عقیدہ کی تائید میں جو دلیلیں پیش کرتے ہیں، ان میں قرآن کی آیتوں، حدیثوں اور اہل علم کے اقوال سے سند لی جاتی ہے ـــــ تو کیا یہ دونوں عقیدے درست ہیں؟ نہیں یہ نہیں ہو سکتا، ان دو عقیدوں میں صرف ایک ہی عقیدہ صحیح و درست ہو سکتا ہے کہ ان میں ذرا سی بھی مشابہت نہیں پائی جاتی، یہ دونوں عقیدے ہر اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد ہیں، پس ان میں سے ایک نے لامحالہ قرآن کی آیتوں اور حدیثوں سے غلط استدلال کیا ہوگا، اور اپنی تائید میں علماء دین کے ایسے اقوال پیش کئے ہوں گے، جو اپنی جگہ بے اصل ہوں گے ـــــ اور تو اور قادیانی تک اپنے گمراہ مسلک کی تائید میں قرآن و حدیث ہی کو پیش کرتے ہیں، اور شیخ محی الدین ابن عربی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کے اقوال سے سند لاتے ہیں۔

مقصد گزارش کرنے کا یہ ہے کہ کسی عقیدے کی تائید میں محض قرآن کی آیتوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو دیکھ کر دھوکا نہ کھانا چاہیئے، دیکھنا یہ چاہیئے کہ ان آیتوں اور حدیثوں سے جو بات ثابت کی جا رہی ہے کیا آیات و احادیث اس سے مطابقت بھی رکھتی ہیں!

یہ جو مسلمانوں میں بدعت چل پڑی ہے کہ وہ کھانا، شربت اور شیرینی رکھ کر اس پر فاتحہ دیتے ہیں، اور وفات پائے ہوئے بزرگوں اور اپنے مرے ہوئے عزیزوں اور دوستوں کو اس کا ثواب پہنچاتے ہیں ـــــ اس کے جواز میں کوئی وہ حدیث پیش کرے کہ حضور نے کھانے، غلہ اور پھلوں پر ہاتھ اٹھا کر اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی تھی ـــــ تو یہ حدیث تو اپنی جگہ ثابت ہے مگر اس سے مروجہ فاتحہ پر استدلال لانا، بالکل غلط بلکہ گمراہی ہے!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے، غلہ اور پھلوں پر بے شک ہاتھ اٹھا کر دعا فرمائی تھی، مگر کس لئے؟ کسی کی وفات

پائے ہوئے مسلمان کی روح کو ثواب پہونچانے کے لئے نہیں، بلکہ کھانے، غلہ اور پھلوں کی مقدار میں اضافہ کے لئے اللہ تعالیٰ سے برکت طلب کی تھی ــــ اس حدیث سے "مروجہ فاتحہ" کا دُور کا بھی تعلق نہیں ہے ــــ اس مثال سے بہ آسانی یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ غلط عقیدوں اور کتاب و سنت کے خلاف رسموں کو درست ثابت کرنے کے لئے آیتوں اور حدیثوں سے کس قدر مغالطہ آمیز استنباط کیا جاتا ہے! عوام ان مغالطوں سے دھوکا کھا جاتے ہیں، اور وہ بیچارے "قال اللہ" اور "قال الرسول" سُن کر مرعوب ہو جاتے ہیں اور اس پر شاذ و نادر ہی غور کرتے ہیں کہ آیات و احادیث سے جو کچھ ثابت کیا جا رہا ہے، کیا اللہ اور رسول کا یہ منشا بھی تھا؟

قرآن کریم کی یہ آیت:

"وَابْتَغُوْا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَه"

عوام کو سُنا کر اہلِ بدعت "وسیلہ" کے خالص اردو معنیٰ کے الجھاوے میں لوگوں کو ڈال دیتے ہیں کہ دیکھو "توسل" تو قرآنِ شریف سے ثابت ہے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی اس اعتبار سے یقیناً وسیلہ ہے کہ حضور کے واسطے اور ذریعے سے دین پہونچا ہے، مگر اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے وقت رسول کا یا دوسرے بزرگوں کا "توسل" ضروری یا پسندیدہ ہوتا، تو قرآنِ پاک کی دُعاؤں میں "بجاہ" "بحق" یا "توسل" ضرور وارد ہوتا! قرآن نے دعا کا جو طریقہ بتایا ہے اُس میں اللہ تعالیٰ سے براہِ راست مانگنے اور درخواست و التجا کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔

دین و شریعت میں فرقِ مراتب بہت ضروری ہے۔

گر فرقِ مراتب نہ کنی زندیقی!

اللہ کا ہمسر نبی کو نہیں ٹھہرایا جا سکتا، نبی کے مقام پر صحابی کو نہیں لا سکتے اور صحابی کا درجہ کسی عالم اور اہلِ ارشاد و تصوف کو نہیں دیا جا سکتا! نبی کی طرح کوئی انسان معصوم اور مطاع نہیں ہوتا، اگر کوئی شخص فرطِ محبت و عقیدت کے سبب کسی پیر، شیخ یا عالم کی تقلید و اطاعت نبی کی اطاعت کی طرح منصوص سمجھے، اور وہ دل میں خوف کرے کہ اگر میں نے کسی پیر یا ولی کی کسی بات سے ذرہ برابر اختلاف کیا تو میرے ایمان کی خیر نہیں ــــ تو ایسی عقیدت و محبت، شریعت میں نہ صرف یہ کہ نامعتبر ہے! بلکہ ایسے غالی معتقدین کو طرح طرح کی بے اعتدالیوں اور گمراہیوں میں مبتلا کر سکتی ہے!

حضرت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کوئی شک نہیں امام الائمہ ہیں، اور وہ صرف کتاب و سنت کے عالم اور فقہی علوم کے امام ہی نہیں بلکہ تقویٰ کے اعتبار سے ایک مثالی کردار کے حامل ہیں، مگر وہ اپنی اس تمام شانِ عظمت اور بزرگی کے باوصف فرماتے ہیں کہ میرے کسی قول کو کتاب و سنت کے خلاف پاؤ تو اُسے دیوار پر دے مارو، حضرت امام اعظم نے یہ بات یوں ہی ازراہِ تواضع و انکسار نہیں فرما دی تھی بلکہ ایک حقیقت کا اظہار کیا تھا کہ آدمی سے ہزار احتیاط کے باوجود بھول چوک ہو ہی جاتی ہے، یہی سبب ہے کہ امام اعظم کے قابلِ فخر شاگردوں نے متعدد مسائل میں اپنے فاضل و محترم استاد کی رائے سے اختلاف کیا ہے، اور ان کے اس اختلاف سے نہ امام اعظم کی توہین ہوتی ہے اور نہ امام ابویوسف اور امام محمد (رحمہما اللہ تعالیٰ) پر "اولیاء اللہ کی عداوت" کا الزام آتا ہے! اسلاف کے اقوال و اعمال سے اخلاف انہی مقامات پر اختلاف کرتے ہیں اور کرنا چاہیئے، جہاں وہ محسوس کریں، یہاں کتاب و سنت سے

شکار ہو رہا ہے، پیروں، ولیوں، اماموں اور عالموں کے اقوال سے کتاب و سنت کا درجہ اتنا بلند ہے، کہ ان کے درمیان کسی نسبت کا تعین دشوار ہے۔

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا اتنا بڑا درجہ ہے کہ ان کو اہل علم "حجۃ الاسلام" کہتے ہیں اور یہ لقب ادر خطاب ان کو سچ یہ ہے کہ زیب بھی دیتا ہے اخلاق و تقویٰ امام موصوف کا خاص موضوع تھا اور اس موضوع پر انھوں نے بصائر و حکم کے موتی بکھیرے ہیں، مگر اپنی کتابوں میں جو احادیث وہ لائے ہیں، ان میں بعض احادیث کمزور اور ثقاہت و صحت کے پایہ سے گری ہوئی ہیں! یا اُن کے بعض ایسے اقوال کہ "سماع اہل کے لئے حلال ہے، نااہل کے لئے حرام" ہے، بہت کچھ محلِ نظر ہیں ــــــ اس ایک مثال کو پیش کرنے کی غرض یہ ہے کہ بلند شخصیتوں اور ان کی کتابوں کے تمام پہلو اہل علم کی نگاہ میں رہنے چاہئیں، کہ کس کا کس فن میں کیا درجہ ہے؟ کون متساہل ہے، کون متشدد ہے؟ کس کا کیا ذوق اور عام رجحان ہے؟ کس کی ثقاہت کس پایہ کی ہے؟ یہ تمام چھان بین بزرگوں کو مطعون کرنے کے لئے نہیں ہوتی بلکہ اللہ کے دین کی حمایت و صیانت کے لئے ہوتی ہے، اگر دین و شریعت کے آئینہ سے حاملینِ کتاب و سنت گرد و غبار دور نہ کرتے رہتے، تو دین کا آئینہ کس قدر مکدر اور غبار آلود ہوتا۔

کتاب و سنت کا درجہ کسی کتاب کو نہیں دیا جا سکتا، اور اللہ و رسول کے قول کے مقابلہ میں کسی کا بھی قول کوئی وقعت و اہمیت نہیں رکھتا، اب رہیں کتابیں تو ان میں ہر طرح کی باتیں ملتی ہیں، قوی سے قوی بھی اور کمزور سے کمزور بھی! ایسی بھی کہ جن کی سند آفتاب کی طرح روشن ہے، اور ایسی بھی جو بالکل پوچ، بیکار اور بے اصل ہیں کہ جن سے اللہ کا دین بدنام ہوتا ہے۔

کتابوں میں بعض متصوفین کے ایسے حالات بھی ملتے ہیں کہ وہ خوبصورت لڑکوں کو حُسنِ حقیقی کا مظہر سمجھتے تھے، اور انھوں نے ایک طرف گرم لوہے کو چوما اور دوسری طرف کسی امرد کا بوسہ لے لیا (معاذ اللہ) بعض "بزرگ" جن سے تصوف کی نسبت دی جاتی ہے، اُن کے ایسے حالات بھی ملتے ہیں کہ وہ تارکِ صلوٰۃ تھے، اور جب اُن کے اس فعل (ترک صلوٰۃ) پر کسی نے ڈرتے ڈرتے ٹوکا، تو وہ کہنے لگے کہ ہم تو اللہ کی راہ میں اپنے کو فنا کر چکے ہیں، اور "مُردے" پر زندوں کی طرح دین کے احکام کب چلتے ہیں؟ بعض متصوفین کے نماز نہ پڑھنے کے لئے اس آیت ــــ

"وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ"

سے دلیل جواز لائی گئی ہے کہ "یقین" کا مرتبہ حاصل کرنے کے بعد "عبادت" کے احکام ساقط ہو جاتے ہیں، حالانکہ اس آیت میں "یقین" سے "موت" مراد ہے! اور اس کے لئے سب سے بڑی سند اور حجت حضور کی زندگی ہے کہ آپ سے بڑھ کر عرفان و یقین کی بلندی اور کس کو حاصل ہو سکتی ہے، مگر حضور نے آخر دم تک نماز ادا فرمائی، اور دین کے کسی ایک حکم کو بھی اپنے لئے ساقط نہیں سمجھا!

ایک صاحب جو ہوش و شعور سے عاری تھے، اور جن کو مجذوب بلکہ سلطان المجاذیب کہا جاتا ہے اور لاکھوں مسلمان جن سے عقیدت رکھتے ہیں، ان کے یہ حالات کتابوں میں نظر سے گزرے کہ وہ عورتوں کے سامنے پیشاب کر دیا کرتے تھے اور ایک بار کرامت کے زور سے مری ہوئی لڑکی کو زندہ کر کے اس کو نچوایا اور بڑے ذوق و شوق سے اس کا ناچ دیکھا! سب سے بڑی حیرت کی بات یہ ہے کہ اس قسم کے واقعات کو ان کے مرید اور منتسبین کتابوں میں نقل

فخر سے چھاپتے ہیں! اور اُن کی عقیدت پر ایسے خلافِ شریعت حالات پڑھ کر اور سُن کر مجروح نہیں ہوتی۔

یہ تو ملفوظات و سوانح کے وہ تاریک پہلو ہیں کہ جن میں کوئی روشنی اور چمک نہیں مگر عقیدت مندوں نے اس تاریکی ہی کو روشنی سمجھ رکھا ہے!

دوسرا رُخ

اکابرِ دین کی کتابوں کو بدگمانی اور شبہ کی نگاہ سے پڑھنا بڑی بدتوفیقی کی دلیل ہے، اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ان کتابوں کے حرف حرف کو کتاب و سنت کی طرح محکم و ثابت سمجھنا بھی کسی طرح درست نہیں! صحیح موقف یہ ہے کہ ان کتابوں میں کسی کے قول و فعل کے لئے کتاب و سنت سے دلیل نہ ملے، تو اُسے چھوڑ دینا چاہیئے، اور کتاب و سنت کی خاطر کسی بزرگ، ولی، پیر، مُفسّر، فقیہہ، محدث، یا صوفی کے قول و عمل کو چھوڑ دینا، ایمان کے کمزور نہیں بلکہ قوی ہونے کی علامت ہے! ہم ان دینی کتابوں کو اسی لئے تو پڑھتے ہیں کہ "کتاب و سنت" کے علم میں اضافہ ہو اور کتاب و سنت کے مطابق، عمل کی توفیق نصیب ہو ——— جب کسی کا قول و عمل "کتاب و سنت" ہی سے ٹکراتا ہو تو اس کا ترک کر دینا ہی "کتاب و سنت" کی محبت عقیدت اور اطاعت کا عین تقاضا ہے!

ایک بہت بڑے قدیم مفسر نے اسرائیلی روایتوں سے متاثر ہوکر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی جگہ حضرت اسحٰق ؑ کو "ذبیح" ٹھہرا دیا، ان کے اس قول کی چونکہ اللہ کی کتاب اور رسول کی احادیث سے مطابقت نہیں ہوتی، لہٰذا اسے غلط قرار دیا جائے گا ——— تذکروں میں ملتا ہے کہ بعض مشائخ چشت کے لوگ قدموں کو چومتے تھے اور سجدہ کے ذریعہ ان کی تعظیم بجا لاتے تھے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ عزت و تکریم کا مستحق اور کون ہو سکتا ہے، مگر صحابہ کرام حضور کو سجدہ نہ کرتے تھے اس لئے مشائخ چشت کے اس فعل کو رد کر دیا جائے گا چاہے وہ مجسم کشف اور سراپا عرفان ہی کیوں نہ ہوں!

ہندوستان کے ایک عالم جلیل اور فاضل عصر محدث کے یہاں ایک طرف یہ تک ملتا ہے کہ قبر کو بوسہ دینا اور اس پر رُخسار رکھنا ممنوع ہے، اور دوسری طرف وہ یہ لکھ گئے ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امتیوں کے اعمال پر حاضر و ناظر ہیں" اُن کا علمی احترام سر آنکھوں پر، مگر اُن کے اس دوسرے قول کو کسی عنوان قبول نہیں کیا جائے گا ——— اسی طرح ایک دوسرے بزرگ جو علمی حیثیت سے انتہائی بلند مقام رکھتے ہیں اور احیاءِ سنت کے داعی ہیں، ان سے "طوافِ قبر" کی اباحت منسوب کی جاتی ہے، اگر یہ نسبت صحیح ہے تو پھر اُن کے اس قول کو ٹھکرا دیا جائے گا، اس لئے نہیں کہ ان بزرگ کی معاذ اللہ توہین مقصود ہے، بلکہ اس لئے کہ اُن کا یہ قول کتاب و سنت اور آثارِ صحابہ کے خلاف جا کر پڑتا ہے!

ایک بہت بڑے شیخ وقت نے جب ایک متبحر عالم کو مرید فرمایا، تو مُرید نے طباق میں شیرینی، عمامہ اور اس پر کچھ روپے رکھ کر پیش کئے، اور پیر صاحب نے قبول فرمائے، شریعت میں ہدیہ کا لینا جائز ہے، مگر بیعت کے وقت اس قسم کے نذرانوں اور ہدیوں کی کتاب و سنت اور اسوۂ صحابہ میں کوئی سند، مثال یا اشارہ نہیں ملتا! اس لئے ان بزرگ کے اس فعل کی تحسین نہیں کی جائے گی!

اگر کوئی بزرگ اور شیخ وقت کسی "بدعت" کے بارے میں یہ فرمائیں کہ "فقیر کو تو اس میں لطف ملتا ہے"، تو ان کے اس قول کو نہیں مانا جائے گا کہ شریعت میں کسی کے ذاتی ذوق و شوق اور لطف و کیف کی کوئی حیثیت نہیں ہے!

ان چند مثالوں سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ کتابوں میں ہر طرح کی باتیں لکھی ہوئی ہیں، قوی و مستند بھی، کمزور اور ضعیف

بھی بے اصل بے سروپا ہیں: ان کو جانچنے اور پرکھنے کی کسوٹی "کتاب و سنت" ہے۔ کسی کا قول و فعل کتاب و سنت کے مخالف نہیں ہے، تو اس کا وہ قول و فعل سر آنکھوں پر! مگر کتاب و سنت سے اس کی مطابقت نہ ہوتی ہو تو پھر مردِ مومن کی فطرت اسے قبول نہیں کر سکتی ——— "اہلِ بدعت" اسی قسم کے کمزور اور بے اصل اقوال کو اپنے مسلک کی تائید میں پیش کرتے ہیں، اور اکابر کے تسامح اور شطحیات سے فائدہ اٹھاتے ہیں ——— اب رہے عوام تو عقیدت و محبت کے نشہ میں عقیدہ اور عمل کی اصلاح کی طرف وہ کم ہی متوجہ ہوتے ہیں! ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب (موضوعات) میں لکھا ہے کہ بغداد میں ایک وعظ کہنے والے نے اپنے وعظ میں یہ حدیث بیان کی کہ:

"قیامت میں اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ساتھ عرش پر بٹھائے گا"۔ امام ابن جریر طبری کے کان تک یہ بات پہونچی، تو وہ بہت برہم ہوئے، اور اپنے مکان کے دروازہ پر یہ عبارت لکھ کر آویزاں کردی کہ:

"خدا کا کوئی ہم نشین نہیں"

اس پر بغداد کے عوام آپے سے باہر ہو گئے، اور انھوں نے امام ابن جریر طبری کے مکان پر اس قدر پتھراؤ کیا کہ پتھروں سے دیواریں ڈھک گئیں! علماء اہلِ بدعت عوام کے اس جذبہ کو بھڑکانے میں یدِطولیٰ رکھتے ہیں، یہاں تک کہ معاملہ بحث و مناظرہ سے گزر کر خون خرابہ تک جا پہونچتا ہے!

اہلِ بدعت کے سامنے آپ قرآن کی کوئی آیت پیش کیجئے وہ اس کے جواب میں کسی صوفی شاعر کا کوئی شعر سنا دیں گے، آپ کہیں گے کہ اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول و عمل ہے، وہ اس کے توڑ پر کسی نابلسی یا سبکی کے اقوال پیش کر دیں گے! بخاری اور مسلم کی صحیح حدیثوں کے مقابلہ میں وہ طبرانی، بیہقی اور ابو نعیم کی وہ روایتیں لائیں گے جو انتہائی کمزور ہیں اور جن پر بہت کچھ کلام کیا گیا ہے،

ان اہلِ بدعت کا سب سے بڑا ہتھیار مواہب لدنیہ کی موضوع اور غلط روایتیں ہیں! عوام عربی کی عبارت اور علامہ قسطلانی کا نام سن کر مرعوب ہو جاتے ہیں، انھیں کیا معلوم کہ مواہب لدنیہ نقلِ روایت کے اعتبار سے آخری درجہ کی کتاب ہے اور اس میں کیسی کیسی وضع کی ہوئی روایتیں پائی جاتی ہیں۔

ہم نے خود اپنے بچپن میں واعظوں کی زبانی اس قسم کی روایتیں سنی ہیں ——— کہ ایک شخص دریا میں ڈوبنے لگا، اس نے "یا اللہ" کہا، مگر وہ ڈوبتا ہی چلا گیا، لیکن "یا غوث" جملہ اس کے منہ سے نکلا تو ایکا ایکی موجوں نے اسے اچھال کر کنارے پر پھینک دیا ——— یہ بھی کہ گیارھویں شریف کا تبرک ایک شخص کے پیروں تلے غلطی سے آگیا، اس بے ادبی پر اسے سخت سزا ملی، اس نے حضرت غوث پاک سے فریاد کی، ارشاد ہوا کہ میں کیا کروں غیرتِ الٰہی جوش میں آگئی تھی ———

اس قسم کی افسانہ طرازیوں پر عوام کس کس طرح جھومتے ہیں ——— توبہ!

ایک مغالطہ کسی بدعت پر جب ٹوکا جاتا ہے تو اہلِ بدعت کی طرف سے یہ مغالطہ دیا جاتا ہے کہ ایسا کرنے کی ممانعت کتاب و سنت میں کہاں آئی ہے؟ یہ بات "بدعات" کے معاملہ میں سو فی صدی غلط مگر اس قسم کے معاملات میں درست ہے ——— کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سیدھے ہاتھ سے کھانا تناول فرماتے تھے اور اس کا آپ نے حکم بھی دیا ہے، اور کھانا اللہ کے نام سے شروع فرمایا ہے۔ مگر اس کے لئے کوئی صراحت نہیں فرمائی گئی کہ کھانا کس چیز پر رکھ کر کھایا جائے۔ اس لئے میز پر کھانا رکھ کر کھانا شریعت کی رو سے نادرست نہیں ہے ———

یا یہ کہ حضور نے دانتوں کی صفائی پر خاص طور سے عملاً زور دیا ہے، اور حضور مسواک استعمال فرماتے تھے، آج کوئی دانتوں کی صفائی کے لئے "ٹوتھ برش" (جس میں خنزیر وغیرہ مردار جانوروں کے بال نہ ہوں) استعمال کرتا ہے تو یہ ناجائز نہیں ہے، البتہ مسواک استعمال کرنے میں ثواب ہے کہ اس سے سنت کی پیروی کی سعادت نصیب ہوتی ہے، اور دین نام ہی اتباعِ رسول کا ہے، جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع نہیں وہاں دین نہیں! ــــ ایک مثال اور :ــ

قرآنِ پاک میں حکم آیا ہے کہ مسلمان اپنے امور مشورت کے ذریعہ طے کیا کریں، اسلامی حکومت کے امیر کا انتخاب بھی "مشورت" کی عملی شکل ہے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو شورائی انتخاب کے ذریعہ منتخب کیا گیا، موجودہ دور میں عام انتخاب کے لئے جو آئینی اہتمام کئے جاتے ہیں ــــ حلقوں کا تعین، ووٹروں کی فہرستوں کی ترتیب اور پولنگ ــــ اس میں شریعت کے نقطۂ نگاہ سے کوئی قباحت کا پہلو نہیں ہے کہ اس سے "انتخاب" کے لئے سہولتیں مہیا ہوتی ہیں۔

مگر

یہ جو آج کل سرکاری تقریبوں اور نیم سرکاری اجتماعات میں رسم چل پڑی ہے کہ قرآن کی تلاوت کے وقت لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں یہ "بدعت" ہے کہ کتاب و سنت اور آثارِ صحابہ میں اس کے لئے کوئی دلیل نہیں ملتی، اور عیسائیوں کی دیکھا دیکھی مسلمانوں نے یہ رسم اختیار کی ہے کہ جب بائبل پڑھی جاتی ہے، تو وہ کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ہر بدعت اور اسلام کی اسپرٹ کے مخالف ہر عمل پر یہ کہہ دینا کہ

"اس کی ممانعت کہاں آئی ہے"

دین میں بہت بڑا فتنہ اور "بدعات" کو سندِ جواز دینے کے لئے نہایت خطرناک منطقی مغالطہ ہے، اس اصول کی بنا پر تو دین کی شکل ہی مسخ ہو کر رہ جائے گی، کسی مسلمان کی میت کو دفن کرنے کے بجائے اُسے جنگل بیابان میں رکھ دیا جائے کہ چیل کوّے اُسے کھا جائیں، یا اُسے جلا دیا جائے، اور اس پر کوئی ٹوکے تو جواب میں کہا جائے ــــ کہ بیشک مسلمانوں کی میتیں دفن ہی کی جاتی رہی ہیں مگر "میت" کو جلانے یا جنگل بیابان میں رکھکر چیل کوّوں کا لقمہ بنانے کی ممانعت کہاں وارد ہوئی ہے ــــ تو سوچ لیجئے کہ یہ "اندازِ فکر" دین کے ساتھ کس قدر ظالمانہ مذاق ہے؟

میلاد شریف کی مجلسوں اور محفلوں میں ذکرِ ولادت کے وقت "قیام" کی رسم بہت بعد کے لوگوں کی نکالی ہوئی ہے صحابہ کرام ہی نہیں بلکہ اس کے صدیوں بعد تک اس "بدعت" کا کوئی رواج نہیں تھا، صحابہ کرام اور تابعین عظام سے زیادہ حضور کی تعظیم و تکریم کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے، اگر ایسا کرنے میں کوئی خیر کا پہلو ہوتا، تو صحابہ اور تابعین اس عمل کو اختیار فرماتے یا حضور کی کسی حدیث میں اس کا ذکر آتا یا ذکر نہ بھی آتا تو کم سے کم کوئی اشارہ یا ایما ہی ملتا، غضب یہ ہے کہ جو لوگ اس بدعت کے مرتکب ہوتے ہیں، وہ تو دعویٰ کریں "عشقِ رسول" کا اور جو خدا کے بندے کتاب و سنت، آثارِ صحابہ اور باقیاتِ تابعین میں اس "بدعات" کے لئے کوئی دلیل اور اشارہ نہ پا کر اس سے اجتناب کریں، اُن پر "بے ادب" کی پھبتی چُست کی جائے، اور بعض جہلا تو اس معاملہ میں اس حد تک پہونچ گئے ہیں ــــ کہ اُن کے عقیدہ کی رو سے محفلِ میلاد میں "قیام" کے وقت حضور کی روحِ مقدس وہاں آتی ہے (نعوذ باللہ من ھٰذہ الہفوات)

تاریخی تجزیہ کیا جائے تو دین میں بہت سی بدعتوں کے موجد ہمارے مسلمان بادشاہ ثابت ہوں گے، ماہ محرم میں "تعزیہ" بنانا تیمور لنگ کی ایجاد بتایا جاتا ہے، مسلمانوں میں یہ "عملِ مولود" جو مروج ہے، اس کا بانی مبانی سلطان ملک شاہ سلجوقی تھا،

پر مسلمان بادشاہ تھے، جنھوں نے اولیاء اللہ کی قبروں کے اہتمام و انتظام کے لئے باقاعدہ جاگیریں عطا کی ہیں اور سجادہ نشینوں اور مجاوروں کا ایک طبقہ پیدا کر کے مسلمانوں کی سوسائٹی میں نذر و نیاز اور پیروں و مہنتوں کے لئے گنجائشیں نکالی ہیں! صحابہ کرام کے دور میں حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے مزار مبارک پر چراغاں، گلپوشی، صندل مالی، فرش و فروش اور عود و گل کا نذکوئی اہتمام تھا، نہ بیت المال میں ان کاموں کے لئے کوئی رقم مقرر تھی، اور نہ حضور کی قبر مبارک پر زائرین چڑھاوے چڑھاتے تھے، یعنی نہ تو قبر کے اہتمام کے لئے کوئی رقم خرچ کی جاتی تھی اور نہ اس کے ذریعہ کسی قسم کی کوئی آمدنی ہوتی تھی، اور نہ حضور کی وفات کے بعد امت میں یہ سوال پیدا ہوا کہ حضور کی قبر مبارک کی تولیت، مجاورت، اور سجادہ نشینی کا حقدار اور وارث کون ہے؟ اس قسم کا کوئی تصور صحابہ کرام کے زمانہ میں پایا ہی نہیں جاتا تھا:

حضور تو قبروں پر چراغ جلانے والوں کے لئے لعنت فرمائیں، اور بادشاہوں اور امیروں کی طرف سے قبروں پر چراغ کی مد کے لئے رقمیں مقرر کی جائیں، یہاں تک کہ یہ بدعت "مسلمانوں میں اولیاء کرام کی محبت و تعظیم کے نام پر ایک محبوب و مقبول رسم بن کر رہ گئی، اس "بدعت حسنہ" کے خلاف کوئی خدا کا نیک بندہ لب کشائی کرتا ہے تو اس پر وہابیت و دیوبندیت اور اولیاء کی توہین کی تہمت جوڑی جاتی ہے، حالانکہ قبروں پر چراغ جلانے سے اولیاء اللہ کی تعظیم و محبت کا دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ اس فعل شنیع سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی مخالفت ہوتی ہے ــــ تو مشرکانہ رسوم اور بدعات پر احتساب سنت رسول اور فرمان نبی کی حمایت اور لعنت بھیجنے والوں کی محبت کے سبب کیا جاتا ہے، یہ اگر دیوبندیت اور وہابیت ہے تو خدا کرے ساری دنیا "دیوبندی" اور "وہابی" ہو جائے!

ایک تو تقاضائے بشریت انسان سے کتاب و سنت کے کسی حکم کی نافرمانی ہو جاتی ہے، اور وہ اس سے توبہ کر لیتا ہے، اور ایک شخص کتاب و سنت کی مخالفت "دین" اور "کار خیر" سمجھ کر کرتا ہے، یہ وہ زبیدی ہے جسے دیکھ کر دل خون ہو جاتا ہے! فاسق سے تو یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے فسق و گناہ کو گناہ جانتا ہے، جس کو مرتے دم تک توبہ کی توفیق نصیب نہیں ہوتی کہ وہ دین کا تقاضا اور نیکی کا جذبہ کر بدعت کا ارتکاب کرتا ہی ہے، ارباب اقتدار کو دیکھئے کہ ہم کسی معروف و تعاون کرنے کی توفیق نہیں ہوتی، مگر پاکستان کے لیڈروں کی قبروں کی مجاورت کا فرض کس مستعدی کے ساتھ انجام دیتے ہیں، مسٹر جناح مرحوم اور لیاقت علی خاں مرحوم کی قبروں پر دوسرے ملکوں کے وفود اور اکابر سے پھولوں کی چادر چڑھانے کی بدعت کو "سرکاری تقریب" کی حیثیت دے دی گئی ہے، کروڑوں روپیہ کی لاگت سے ان قبروں پر گنبد اور بارہ دریاں بنانے کی اسکیم زیر غور ہے، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پختہ قبر بنانے کی ممانعت فرمائی ہے!

غلط ترتیب!

دینی امور میں غور و فکر کرنے کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے کتاب و سنت میں اس مسئلہ کے لئے ثبوت، دلیل اور رہنمائی تلاش کیا جائے، اس کے بعد صحابہ کرام کے اسوہ کو دیکھا جائے، اس کے بعد ائمہ کرام کے اجتہادات کا نمبر آتا ہے جو اصل قانون نہیں بلکہ نظائر قانون کی حیثیت رکھتے ہیں ــــ مگر اہل بدعت نے اس ترتیب کو بالکل الٹ دیا ہے، وہ اپنے بزرگوں اور پیروں کے اقوال و اعمال کو دین کی بنیاد سمجھ کر کتاب و سنت کو ان کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اسی طبقہ کے ایک بہت بڑے عالم نے اپنے مرنے سے پہلے اپنی فاتحہ کے لئے کھانوں کی ایک فہرست (.NU) مرتب فرمائی اور وصیت کی کہ ان کھانوں پر میری فاتحہ دلائی جائے، اس فہرست میں سوڈا واٹر کی بوتل تک کو شامل فرمایا!

کے معتقدین اگر عقیدت کے غلو میں مبتلا نہ ہوتے تو وہ پہلے کتاب و سنت میں دیکھتے کہ اس کے لئے کوئی حکم یا اشارہ ملتا ہے؟ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام یا تابعین اور آئمہ حدیث و فقہ میں سے کسی کا بھی یہ معمول رہا ہے کہ وہ کھانوں کو سامنے رکھکر اس پر فاتحہ پڑھتے ہوں اور اس کا ثواب مردوں کی ارواح کو پہونچاتے ہوں؟ مردوں کے لئے ایصال ثواب جائز ہے مگر یہ طریقہ جو اہل بدعت میں رائج ہے، وہ بے سند اور بے دلیل ہے! اور کیا کسی صحابی یا تابعی یا امام نے کھانوں کی کوئی فہرست مرتب فرمائی ہے کہ فلاں فلاں کھانے اور پھل ہمارے پسندیدہ ہیں، لہٰذا ان پر ہماری فاتحہ دلائی جائے؟ اس کے لئے ضعیف تو کیا کوئی موضوع "اثر" بھی نہیں مل سکتا، کیونکہ روایتیں وضع کرنے والوں کے خیال و تصور میں بھی اس قسم کی نرالی بدعت نہ آئی ہوگی ــ

مگر اس بدعت کے جواز میں قرآن کی اس آیت کو:

"لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ"

پیش کیا جاتا ہے۔

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے!

اس آیت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ "تم جس چیز کو پسند کرتے ہو اُسے اللہ کی راہ میں خرچ کرو" یہ کہاں کہا گیا ہے کہ تم نہیں بلکہ مُردے جن کھانوں کو اپنی زندگی میں پسند کیا کرتے تھے، اُن پر فاتحہ دلاؤ! "مما تحبون" فرمایا گیا ہے "مما یحبون" نہیں کہا گیا! "انفاق فی سبیل اللہ" کے لئے اس آیت میں اہل ایمان کو جو اُبھارا گیا ہے، اس کا مروجہ فاتحہ اور ایصال ثواب کے موجودہ طریقہ سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے!

صحابہ کرام "عبد" کے مفہوم و معنی کو جتنا جانتے تھے اتنا اور کوئی نہیں جان سکتا، اُن کو حضور کی ذات گرامی سے جس قدر محبت تھی اور کسی کو شاید ہی ہو سکے! مگر انہوں نے اپنی اولاد کے نام "عبدالرسول، عبدالنبی اور عبدالمصطفیٰ" نہیں رکھے۔ ہاں کفار قریش کا یہ دستور تھا کہ وہ بتوں کے ناموں پر ـــ "عبدالعزیٰ، عبد ود" ـــ وغیرہ مشرکانہ نام رکھتے تھے! حضور نے "عبدالرحمٰن اور عبداللہ" ـــ جیسے نام جن میں اللہ تعالیٰ سے عبدیت کی نسبت کا اظہار ہوتا ہے پسند فرمائے ہیں! صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین اور بعد کے علماء اور صلحاء کے ہزاروں نام ہماری نظر سے گزرے ہیں مگر مشہور مغلیہ بادشاہ جلال الدین اکبر کے دربار کے ایک مولوی ـــ عبدالنبی ـــ کے نام کے علاوہ، اس حیثیت و ترکیب کا اور کوئی نام ہم نے نہ سنا اور نہ کتابوں میں دیکھا! مگر انہی فاضل بزرگ نے، جنھوں نے اپنی فاتحہ کے لئے ماکولات و مشروبات کا مینو مرتب فرمایا تھا، وہابیوں اور دیوبندیوں کی ضد میں اور انھیں جلانے کے لئے، اپنے نام کے ساتھ "عبدالمصطفیٰ" کا اضافہ کیا، اور اُسے اپنی مہر میں کندہ کرایا! بس ان دو مثالوں سے اس کا اندازہ لگائیے کہ اس قسم کی "فکر" سے "توحید" کے تقاضے پورے ہوں گے۔ یا شرک کے مفاسد اور بدعت کی خرابیوں کو شہ ملے گی۔

حیدرآباد دکن کے ایک جاگیردار کی بابت یہ روایت سننے میں آئی کہ وہ وہابیوں کو جلانے اور کڑھانے کے لئے "بڑی گیارھویں شریف" پر آتش بازی چھوڑتے تھے! (اس فکر و ذہنیت سے اللہ تعالیٰ کی پناہ!)

اسی بدعت پرور ذہنیت کا مشاہدہ کرنا ہو تو کراچی کی ایک مشہور مسجد کی صدر محراب کو دیکھ لیا جائے کہ اس پر قرآن کریم کی یہ آیت: "وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ"

منقوش ہے مگر اسی محراب کے بائیں حصہ میں یہ شعر:

یا رسول اللہ : انظر حالنا
یا رسول اللہ : اسمع قالنا

ایک فریم میں مکتوب ہے یعنی اللہ تعالیٰ کو (معاذ اللہ) ترکی بہ ترکی جواب! قرآن کی آیت کا ہاتھ کے ہاتھ جواب (استغفراللہ) یہاں تک بڑھ گئی ہے کہ بعض اہل بدعت "صلوٰۃ غوثیہ" پڑھتے ہیں، اور نفل رکعتیں پڑھنے کے بعد گیارہ قدم بغداد شریف کی طرف چلتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ ہی کے گھر میں اللہ تعالیٰ کو چیلنج!

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے "توحید" پر سب سے زیادہ زور دیا ہے، اور اپنے مواعظ و ملفوظات میں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دستگیر اور فریاد رس نہیں ہے ـــــ مگر اُن کے غالی معتقدین مصیبت کے وقت اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر "یا غوث" کا نعرہ بلند کرتے ہیں! جیسے اُن کی رگِ جاں سے قریب اللہ تعالیٰ نہیں ہے بلکہ حضرت شیخ جیلانی ہیں!!

ان عقاید و اعمال کے بعد بھی اگر "توحید" ثابت رہتی ہے اور مجروح نہیں ہوتی تو پھر اس کے یہ معنی ہیں کہ (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ نے "شرک" کو "ظلم عظیم" زیبِ داستان کے لئے کہہ دیا تھا۔ "شرک" کا یا تو کہیں وجود ہی نہیں پایا جاتا اور پایا جاتا ہے تو کوئی معترت رساں چیز نہیں ہے (ا)

بشریت

ان بدعتی واعظوں اور داستان سراؤں نے ایک شوشہ چھوڑ دیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "بشر" نہیں تھے بلکہ "نور" تھے! کوئی شک نہیں حضور اخلاق کا نور اور ہدایت و سعادت کی روشنی تھے اسی لئے قرآنِ پاک میں آپ کو "سراج منیر" کہا گیا ہے مگر اس عالم آب و گل میں تخلیق کے اعتبار سے آپ "بشر" تھے، اور جو کوئی آپ کی "بشریت" میں شک کرتا ہے، وہ اللہ اور رسول کو جھٹلاتا ہے! اگر حضور "بشر" نہ تھے بلکہ "نور" تھے تو کیا "نور" کے باپ دادا اور آل اولاد ہوا کرتی ہے، اور "نور" شادی کیا کرتا ہے، اور کیا "نور" پر بچپن جوانی اور بڑھاپے کے دور گزرا کرتے ہیں۔ اور کیا "نور" کو بھوک لگا کرتی ہے اور جنگ میں زخمی ہونے کے بعد "نور" سے لہو کی دھاریں بہا کرتی ہیں اور "نور" کو وفات پانے کے بعد کیا پانی سے غسل بھی دیا کرتے ہیں اور کیا نور کی قبر بھی بنا کرتی ہے؟!

یہی مزاج اور ذہنیت ہے جس نے حضرت عیسیٰ اور حضرت عزیر کی "بشریت" سے انکار کر کے انھیں "ابن اللہ" کہا! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ "بشر" اور "عبد" کہتا ہے، خود حضور اپنی عبدیت اور بشریت کا اعتراف فرماتے ہیں، مگر یہ کیسے مسلمان ہیں جو اللہ اور رسول کے قول کے مقابلہ میں اپنی شوخیٔ فکر (یہ کہ رسول اللہ بشر نہیں نور تھے) کو پیش کرتے ہیں۔

غضب خدا کا میلاد کے جلسوں میں یہ تک کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "حاضر و ناظر" ہیں! اور اس مشرکانہ عقیدہ کے لئے ٹیلی ویژن کی ایجاد کو دلیل میں پیش کیا جاتا ہے جب عقائد کا فساد اس درجہ تک پہنچ جائے، تو ان لوگوں کو کوئی سمجھائے تو کیا سمجھائے!

عرب کے کفار اور مشرکین قریش بھی اسی جہالت اور غلط فہمی کا شکار تھے کہ اللہ کے رسول اور نبی کو "بشر" نہیں "مافوق البشر" ہونا چاہیے ـــــ قرآن ان جاہلوں اور نادانوں کے مزعومہ عقائد اور گمراہ تصورات کو اس طرح پیش کرتا ہے

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِي هَٰذَا الْقُرْآنِ مِن كُلِّ مَثَلٍ فَأَبَىٰ أَكْثَرُ النَّاسِ إِلَّا كُفُورًا ۝

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۙ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۙ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ۙ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ؕ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ؕ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ۞ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْۤا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰۤى اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ۞ قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ۞ (سورہ بنی اسرائیل رکوع ۱۰)

(ہم نے اس قرآن میں لوگوں کو طرح طرح سے سمجھایا کہ اکثر لوگ انکار ہی پر جمے رہے، اور انھوں نے کہا "ہم تیری (یعنی نبی کی) بات نہ مانیں گے، جب تک تو ہمارے لئے زمین کو پھاڑ کر ایک چشمہ جاری نہ کر دے یا تیرے لئے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ پیدا ہو اور تو اس میں نہریں رواں کر دے، یا تو آسمان، کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہمارے اوپر گرا دے جیسا کہ تیرا دعویٰ ہے، یا خدا اور فرشتوں کو رُو در رُو ہمارے سامنے لے آئے یا تیرے لئے سونے کا ایک گھر بن جائے، یا تو آسمان پر چڑھ جائے، اور تیرے چڑھنے کا بھی ہم یقین نہ کریں گے، جب تک تو ہمارے اوپر ایک ایسی تحریر نہ اتار لائے، جسے ہم پڑھیں" ــــــ اے محمد، ان سے کہو پاک ہے میرا پروردگار! کیا میں ایک پیغام لانے والے انسان (بشر) کے سوا اور بھی کچھ ہوں؟ لوگوں کے سامنے جب کبھی ہدایت آئی تو اس پر ایمان لانے سے ان کو کسی چیز نے نہیں روکا مگر ان کے اسی قول نے کہ "کیا اللہ نے بشر کو پیغمبر بنا کر بھیج دیا؟" ان سے کہو اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چل پھر رہے ہوتے، تو ہم ضرور کسی فرشتے ہی کو ان کے لئے پیغمبر بنا کر بھیجتے"۔)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی "بشریت" سے انکار کرنے والے ان آیات کی روشنی میں اپنی پوزیشن کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ وہ کن لوگوں کی فکر کی تائید کر رہے ہیں اور قرآن کی مخالفت میں کتنا عظیم الشان فتنہ اٹھا رہے ہیں۔

مُغالطے

اہل بدعت ایک مغالطہ یہ دیتے ہیں کہ بندہ کو اللہ تعالیٰ نے علم، قدرت، سماعت و بصارت وغیرہ صفات عطا کی ہیں، اور اللہ تعالیٰ خود بھی علیم، قادر، اور سمیع و بصیر ہے ــــــ تو بندہ میں ان صفات (علم و قدرت وغیرہ) کا ماننا شرک نہیں ہے!

لیکن

اے حسینی توحید کو گدلا کرنے والو! یہ کس نے کہا تھا کہ بندہ میں اللہ کی طرف سے بندہ کو دی ہوئی صفات کا ماننا شرک ہے کوئی عاقل بالغ اور صاحب شعور ایسی بات زبان سے نکال ہی نہیں سکتا!

بندہ کو اللہ تعالیٰ نے بے شک "علم" دیا ہے مگر اللہ تعالیٰ کے علم سے کمیت اور کیفیت میں بندہ کا علم کوئی مناسبت نہیں رکھتا اتنی بھی نہیں جتنی ذرہ کو آفتاب سے ہو سکتی ہے!

اللہ تعالیٰ کے "علم" کے بارے میں اس تفریق و امتیاز کے بعد کہ اللہ تعالیٰ کا علم "ذاتی" اور بندہ کا صفاتی!

عطائی" ہے، انسانی بساط کے مطابق زیادہ سے زیادہ جو تصور کیا جاسکتا ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ "مَا کَانَ وَمَا یَکُوْن"
کا علم نہ کتاب یعنی جو کچھ ہو چکا جو کچھ ہو رہا ہے اور جو کچھ ہونے والا ہے اُس کا اللہ تعالیٰ کو پورا پورا علم ہے، وہ اللہ تعالیٰ دلوں
کے خطروں سے واقف ہے، دنیا کی کوئی چیز بھی اُس سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ اگر یہی علم جس کی ابھی ابھی تصریح کی گئی ہے،
نبی یا ولی کے لئے مانا جائے تو "ذاتی علم" کے امتیاز کے سوا اللہ تعالیٰ اور نبی و ولی کے علم میں اور کیا فرق باقی رہ جاتا ہے!
مگر کوئی مسلمان اللہ اور بندہ کے علم میں کسی جہت سے "مساوات" قائم کر کے اپنے دین و ایمان کو برباد نہیں کر سکتا۔
کیا قرآن پاک میں کہیں اس کا کوئی اشارہ تک آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام دنیا کے انسانوں کے دلوں
کے خطرات سے واقف ہیں، اور جس کسی کے دل میں جو بھی خطرہ گزرتا ہے، حضور اس سے واقف ہو جاتے ہیں؟ کیا حدیث
میں اس کا کہیں ذکر آتا ہے ۔۔۔ کتاب و سنت سے یہ ثابت ہے کہ کونین کی کوئی چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہوں
سے چھپی ہوئی نہیں ہے ۔۔۔ کیا قرآن نے کہیں یہ کہا ہے کہ جو کچھ ہو چکا یا ہونے والا ہے اس کا پورا پورا علم رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دیا گیا ۔۔۔ هاتوا برهانكم ان كنتم صدقين!

اس کے برخلاف قرآن کہتا ہے:

قُل لَّا يَعْلَمُ مَن فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ

قرآن کریم کی اس محکم آیت کے بعد کسی اور سند کی ضرورت نہیں ہے ۔۔۔ مگر کوئی علماء حق کا اس بارے میں عقیدہ جاننا چاہتا
ہو تو ملا علی قاری کا یہ قول اس کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہے۔

ثم اعلم ان الانبياء لم يعلموا المغيبات من الاشياء الا ما اعلمهم الله
احيانا وذكر الحنفية تصريحا بالتكفير باعتقاد ان النبي يعلم الغيب لمعارضة
قوله تعالى: قل لا يعلم من في السموت والارض الغيب الا الله!

(پھر تو جان لے کہ انبیاء (علیہم السلام) غیب کی اشیاء کو نہیں جانتے تھے مگر جو اللہ نے (کبھی) انھیں بتا دیا
اور حنفی فقہاء نے صراحت سے اس کا ذکر کیا ہے کہ جو شخص یہ عقیدہ رکھے کہ نبی علم غیب جانتا ہے، وہ کافر ہے کیونکہ
ایسا معتقد قرآن پاک کی اس آیت (قل لا یعلم ...) سے ٹکراتا ہے) (شرح فقہ اکبر مصری ص ۱۳۶)

"موضوعات" (صفحہ ۹۹ ۔۔ ۱۰۰) میں ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے صراحت سے لکھا ہے ۔۔۔

وقد جاهر بالكذب بعض من يدعي العلم في زماننا ان رسول الله صلى الله عليه وسلم
كان يعلم متى تقوم الساعة (الى قوله)

ولا ريب ان الحامل لهؤلاء على هذا الغلو اعتقادهم انه يكفر عنهم سيئاتهم
ويدخلهم الجنة وكلما غلوا كانوا اقرب اليه فهم اعصى الناس لامره واشدهم
مخالفة لسنته فيهم شبه ظاهر من النصارى غلوا على المسيح اعظم الغلو وخالفوا
شرعه ودينه اعظم المخالفة۔

(ہمارے زمانے کے بعض مدعیان علم نے یہ کھلا جھوٹ بولا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم تھا کہ
قیامت کب آئے گی؟ اور بیشک ان مدعیان کو اس غلو پر ان کے اس خیال نے اکسایا ہے کہ ان کا یہ اعتقاد

ان کے گناہوں کا کفارہ بن جائے گا، اور ان کو جنت میں پہونچا دے گا۔ اور یہ کہ جس قدر بھی آپ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان میں غلو سے کام لیں گے، اتنا ہی آپ سے قرب حاصل ہوگا، یہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے نافرمان ہیں، اور آپ کے طریقہ کے سب سے بڑے مخالف! ان میں نصاریٰ کی کھلی ہوئی مشابہت ہے، جنھوں نے بھی حضرت مسیح کے بارے میں بڑے غلو سے کام لیا، اور ان کی شریعت اور ان کے دین کی مخالفت کی)

قرآن پاک کی آیت اور ملا علی قاری کی تشریح کے بعد زیادہ نہیں صرف دو حدیثیں لگے ہاتھوں پڑھ لیجئے ـــ

وعن جابر قال جاء عبدٌ فبایع النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی الھجرۃ ولم یشعر انہ عبد فجاء سیدہ یریدہ فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعنیہ فاشتراہ بعبدین اسودین ولم یبایع احدًا بعدہ حتی یسالہ أعبدٌ ھو ام حرٌ۔ رواہ مسلم

(حضرت جابر سے روایت ہے کہ ایک غلام حضور کی خدمت میں حاضر ہوا اور ہجرت پر حضور سے بیعت کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ پتہ نہ تھا کہ یہ غلام ہے بعد میں اس کا آقا اس کے لینے کے لئے آیا تو حضور نے فرمایا، اسے مجھے بیچ دو، پھر آپ نے دو حبشی غلاموں کے عوض اُسے خرید لیا، اور اس کے بعد آپ جب تک کسی سے پوچھ نہ لیتے کہ وہ غلام ہے یا آزاد، بیعت نہ لیتے!)

وعن جابر ان رجلًا زنی بامرأۃ فامر بہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فجلد الحد ثم اخبر انہ محصن فامر بہ فرجم۔ رواہ ابو داؤد (مشکوٰۃ ـ کتاب الحدود)

(حضرت جابر سے مروی ہے کہ ایک شخص نے ایک عورت سے زنا کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے اس شخص کے حد میں درّے لگائے گئے، بعد میں آپ کو یہ بتایا گیا کہ یہ شادی شدہ (محصن) ہے چنانچہ آپ نے دوبارہ حکم دیا، اور اس کو رجم کر دیا گیا)

کیا یہ حدیثیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عالم الغیب ہونے کی نفی نہیں کر رہی ہیں، اور یہ ابو داؤد و مسلم رحمہا اللہ تعالیٰ جیسے بڑے محدثین بھی کیا "وہابی" تھے؟ کہ اس قسم کی روایتیں احادیث کی کتابوں میں نقل کر ڈالیں۔

غزوۂ احد میں تیر انداز صحابہ کے اپنی جگہ سے ہٹ کر مال غنیمت کی طرف جھک پڑنے سے فتح شکست سے بدل گئی، گھبراہٹ اور اضطراب کا یہ عالم کہ حضرت حذیفہ کے والد ماجد (یمان) تلواروں کی زد میں آگئے، حضرت حذیفہ چیختے رہے کہ "یہ میرے والد ہیں" مگر وہاں کون سنتا تھا، یہاں تک کہ وہ شہید ہو گئے ـــ اس جنگ میں حضور زخمی ہوئے، اور اس عالم میں آپ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلے ـــ

"وہ قوم کیا فلاح پا سکتی ہے، جو اپنے پیغمبر کو زخمی کرتی ہے" اس پر اللہ کی طرف سے یہ تنبیہ آمیز وحی نازل ہوئی:

"لیس لک من الامر شیئ" "تم کو اس معاملہ میں کچھ اختیار نہیں۔

کیا یہ غزوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے "عالم غیب" ہونے کی نفی نہیں کرتا؟ کیا اس غزوہ میں ایسے

ملا (۱) اہل بدعت جو "ذاتی" اور "عطائی" غیب کا مغالطہ دیا کرتے ہیں! کیا حدیث کے اس مجموعے ان کے اس مغالطہ کے تار و پود نہیں بکھیر دیتے؟

واقعات پیش نہیں آتے کہ قضا و قدر کے سامنے کسی کی کچھ نہیں چلتی یہاں تک کہ نبی اور اُس کے صحابہ مجبور نظر آتے ہیں۔ جب اللہ کے آخری نبی اور بنی آدم کے سردار و پیشوا اور آپ کے جاں نثار صحابہ تک کو ایسے حالات پیش آئیں، تو پھر دنیا میں کس ولی اور پیر سے اس کی اُمید رکھیں کہ اُن کی روح قبر و برزخ سے ہماری دستگیری فرما سکتی ہے اور بلیات و مصائب کو ٹال سکتی ہے۔

یہ جو واقعہ "افک" پیش آیا ہے، جس میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہار ڈھونڈتی رہ گئیں، آپ جس ہودج میں سوار ہوتی تھیں صحابہ کرام سمجھے کہ اس میں سوار ہو گئیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اگر اس کا علم ہو جاتا کہ حضرت عائشہ قافلے سے پیچھے رہ گئی ہیں، تو بھلا آپ ان کو تنہا چھوڑ سکتے تھے ـــــ اس واقعہ کی پوری تفصیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے "عالم الغیب" ہونے کی نفی کرتی ہے!

معجزات سے کون انکار کر سکتا ہے ـــــ یہ بھی ہوا ہے کہ مکہ میں کچھ لوگ خفیہ مشورہ فرماتے ہیں اور اللہ تعالیٰ مدینہ منورہ میں اس مشورت کا القا حضور کے قلب مبارک میں فرما دیتا ہے، مگر اس قسم کے واقعات سے یہ نتیجہ نکالنا کسی طرح درست نہیں کہ دنیا میں جہاں بھی جو کچھ بھی ہوتا تھا، اس کی اطلاع حضور کو ہو جایا کرتی تھی ـــــ یہ بھی درست ہے کہ حضور نے بعض آنے والے حوادث کی خبر دی ہے" اور وہ حرف بحرف صحیح ثابت ہوئے ہیں" لیکن اس سے یہ کلیہ نہیں بن سکتا کہ قیامت تک کے تمام حوادث و واقعات جو دنیا میں ہونے والے ہیں، اُن کے ایک ایک جزیہ کا حضور کو علم دے دیا گیا تھا، ایسے کلی علم کی خود قرآن اور احادیث نفی کرتی ہیں! یقیناً حضور کو اللہ تعالیٰ نے تمام دنیا والوں سے زیادہ علم عطا فرمایا تھا، اور حضور کے فضائل و کمالات کی کوئی برابری نہیں کر سکتا، آپ بے شک اولین اور آخرین کے پیشوا ہیں ـــــ مگر "عالم الغیب والشہادہ" اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور صرف ذاتی اور عطائی کا امتیاز باقی رکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایسا "علم کلی" ثابت کرنا جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے مخصوص ہے "کھلی ہوئی گمراہی ہے"!

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا فرائض متعلق کئے تھے، قرآن انہیں بتاتا ہے:ـــ

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ
اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ

(اہل ایمان پر اللہ نے یہ بہت بڑا احسان کیا ہے کہ اُن کے درمیان خود انہی میں سے ایک ایسا پیغمبر مبعوث کیا جو اس کی آیات انہیں سناتا ہے، ان کی زندگیوں کو سنوارتا ہے اور اُن کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے)

قرآن پاک میں کہیں یہ نہیں ملتا اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور نہ صحابہ کرام نے یہ سمجھا کہ زمین و آسمان کا نظام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تصرف سے چل رہا ہے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو رزق، اولاد، صحت، روزگار ..... غرض دنیا کی تمام چیزیں دینے کا اختیار دے دیا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے اختیار سے آپ دنیا کا کارخانہ اور کائنات کا نظام چلا رہے ہیں، اور مخلوق خدا کو اللہ تعالیٰ کے حکم و عطا سے آپ پال رہے ہیں اور کونین کو آپ تھامے ہوئے ہیں، بارش آپ برساتے ہیں، کھیتیاں آپ اگاتے ہیں، جہاز آپ کے اختیار سے چلتے ہیں، اللہ کے اذن سے تمام جہان کے دردمندوں کی فریاد آپ سنتے ہیں، اور جب کسی کو جو کوئی پریشانی لاحق ہوتی ہے، اُسے آپ دور فرماتے ہیں ـــــ جو کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ عقاید رکھتا ہے، وہ اللہ پر اور اللہ کے رسول پر جھوٹ باندھتا ہے، وہ کتاب و سنت کو جھٹلاتا ہے، اور رسول

کی ذات سے اُن کی یہ جاہلانہ عقیدت قیامت کے دن اس کے منہ پر ماردی جائے گی! اللہ تعالیٰ نے رسول کی زبان سے دوٹوک انداز میں کہلوادیا :-

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ

(اے نبی! کہہ دو کہ میں خود اپنی ذات کے لئے نفع و نقصان کا مالک نہیں ہوں مگر جو اللہ چاہے!)

اہلِ بدعت کے یہ عقاید جو ابھی ابھی اوپر بیان کئے گئے ہیں، اللہ تعالیٰ کے ارشاد کی جس بے دردی کے ساتھ نفی بلکہ تکذیب کرتے ہیں، ان کی توقع کسی بندۂ خدا اور اُمتی رسول سے بھلا ہو سکتی ہے:

تمام دنیا کے مریضوں کو شفا دینا، ہر فریاد رس کی فریاد کو پہونچنا، دنیا کے پردے پر جہاں سے بھی کوئی پکارے اس کی پکار سننا، بے اولادوں کو اولاد بخشنا کونین کے ایک ایک ذرہ پر نگاہ رکھنا ——— یہ نبی کے فرائض ہی نہیں ہیں، یہ تو اللہ تعالیٰ کے کرنے کے کام ہیں، جو کوئی عقیدت کے جوش میں اللہ تعالیٰ کے "کام" انبیاء اور اولیاء سے متعلق کرتا ہے، وہ بہت بڑی جہالت اور گمراہی کا ثبوت دیتا ہے اور "ظلم عظیم" کا مرتکب ہوتا ہے!

قرآن پاک میں ایک آیت بھی ایسی نہیں ملتی، جس میں تمام انسانوں کو خطاب کرکے یہ کہا گیا ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اور وفات کے بعد، تم ان کو ہزاروں کوس سے مصائب میں پکارا کرنا وہ تمہارے مصائب دور کردیا کریں گے بلکہ اس کے برخلاف، اللہ تعالیٰ قرآن میں بہ تکرار فرماتا ہے کہ میرے سوا تمہاری مصیبت کو اور کون ٹال سکتا ہے، میں ہی سب کا والی اور رازق ہوں، میں ہی سب کا پالنہار ہوں، عزتیں اور ذلتیں میرے ہاتھ میں ہیں،

اور

وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ۚ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝ (سورہ یونس)

"اے نبی! تم جس حال میں بھی ہوتے ہو اور قرآن میں جو کچھ بھی سناتے ہو اور لوگو! تم بھی جو کچھ کرتے ہو، اس سب کے دوران ہم تم کو دیکھتے رہتے ہیں، کوئی ذرہ برابر چیز آسمان اور زمین میں ایسی نہیں ہے، نہ چھوٹی نہ بڑی، جو تیرے رب کی نظر سے پوشیدہ ہو، اور ایک صاف دفتر میں درج نہ ہو"

اللہ تعالیٰ کے اس کھلے ہوئے فرمان اور اعلان کے بعد کون صاحب ایمان یہ کہنے کی جرأت کرسکتا ہے کہ دنیا کا کوئی بھی بڑے سے بڑا انسان حاضر و ناظر ہے، دنیا کے ہر شخص کے حال پر اس کی نگاہ رہتی ہے اور کائنات کا کوئی چھوٹا بڑا ذرہ اس انسان کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں ہے؛ جو کوئی اس قسم کے عقائد رکھتا ہے، وہ شرک سے کھیلتا ہے اور "توحید" کا کھلا ہوا مذاق اڑاتا ہے، اس قسم کی شرک آمیز عقیدت سے نہ اللہ تعالیٰ خوش ہوسکتا ہے، نہ رسول" اور اولیاء اللہ کی خوشنودی اُسے حاصل ہوسکتی ہے، بلکہ قیامت کے دن انبیاء اور اولیاء ان عقائد سے اظہار برأت کریں گے کہ بارالہا۔ ہم نے حاشا وکلا اس قسم کے مشرکانہ عقائد کی تعلیم نہیں دی تھی!

"اولیاء اللہ" کے بارے میں قرآن کہتا ہے :-

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا

يَتَّقُوْنَ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ ؕ

(سنو! جو اللہ کے دوست ہیں، جو ایمان لائے، اور جنھوں نے تقویٰ کا رویہ اختیار کیا، ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں، دنیا اور آخرت دونوں زندگیوں میں اُن کے لئے بشارت ہے)

قرآن میں یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ اولیاء اللہ کے سپرد اللہ تعالیٰ نے دنیا کی نگرانی، کائنات کے کارخانہ کو چلانا اور سارے جہاں کی پرورش کردی ہے، اور اپنی زندگی میں ہر ولی دنیا بھر کے تمام انسانوں کے احوال پر نگاہ رکھتا ہے اور مرنے کے بعد، ہر نزدیک و دور سے پکارنے والے کی نہ صرف یہ کہ پکار سنتا ہے، بلکہ اس کی مصیبت کو ٹالتا ہے!

کسی ضعیف سے ضعیف اور موضوع سے موضوع روایت میں بھی کیا یہ ملتا ہے کہ جب حضرت عثمانؓ پر بلوائیوں نے زندگی تنگ کی، اور پانی تک بند کردیا تو حضرت عثمانؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو امداد کے لئے پکارا تھا، حالانکہ حضور کی قبر مبارک بیتِ عثمان سے چند قدم کے فاصلہ پر تھی!

اور سب سے زیادہ نمایاں بات

تو یہ ہے کہ امام الاولیاء اور سید الاصفیاء حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے صاحبزادوں (حسن و حسین) کو حضرت عثمان کی حفاظت کے لئے بھیج دیا تھا، حضرت علی اور ہزاروں صحابہ (جو سب کے سب یقیناً اولیاء اللہ سے افضل و اعلیٰ ہیں) نہیں چاہتے تھے کہ حضرت عثمان کو کوئی گزند پہونچے، ان کی اپنی زندگی ہی میں، ایک ہی شہر میں، اتنا خونچکاں حادثہ وقوع میں آجاتا ہے — وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اپنی تمام محبوبیت و مقبولیت اور اپنی ساری روحانیت کے باوجود، اس حادثہ کو روک نہیں سکتے!

اگر اولیاء اللہ کو دنیا جہاں کے تمام واقعات کی خبر رہتی ہے، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر کتنا بڑا الزام آتا ہے کہ آپ اپنی ولایت و روحانیت کے اثر سے قاتلین عثمان کو جانتے تھے، مگر ان سے کوئی باز پرس نہ فرماتے تھے — ہم حضرت علی مرتضیٰ کے بارے میں ایسی بدگمانی نہیں کر سکتے، آپ عین بلوہ کے وقت چونکہ موقع واردات پر موجود نہ تھے، اور بلوائیوں میں افراتفری مچا ہوئی تھی، اس لئے قاتلوں کا تعین کے ساتھ (ایسی تعیین جس کے بعد مجرموں پر حد جاری ہو سکے) آپ کو علم نہ تھا، اور محض "ظن" اور شبہ پر مجرموں پر حد جاری نہیں کی جاسکتی!

حضرت امام حسین علیہ السلام، کوفہ کے لوگ دوسرے کچھ اور خط لکھتے ہیں اور آپ ان کی وفاداری پر اعتماد کرکے مکہ معظمہ سے کوفہ کے لئے روانہ ہو جاتے ہیں — اگر اولیاء اللہ ہر وقت اور ہمیشہ دلوں کے حال اور آنے والے واقعات جان لیا کرتے ہیں، تو حضرت حسین کو کوفہ والوں کے خطوں پر ہے سے اعتماد ہی نہ کرنا تھا، ان کی بے وفائی آپ پر ظاہر ہو جانی چاہیئے تھی، اور پھر آپ کو اپنے سفیر اور چچا زاد بھائی حضرت مسلم کے شہید ہو جانے تک کی اطلاع نہیں ہوتی، اور آپ اس حادثہ جانکاہ سے بے خبر رہتے ہیں۔

جب صحابہ کرام اور اہل بیت اطہار اور ان میں بھی حضرت علی اور حضرت حسین کی یہ بے بسی اور بے اختیاری کا یہ عالم ہے — تو ہم اور کس دل سے یہ توقع رکھیں کہ ہم جہاں کہیں سے اُسے پکاریں گے، وہ ہماری فریاد سن کر ہماری مشکل کو آسان کر دیگا، اور اُس ولی اللہ کو ہمارے تمام احوال کی ہر لحظہ خبر ہوتی رہتی ہے!

شرک و بدعت اختلافی مسئلہ نہیں ہے! خود اپنی قبر کے بارے میں حضور نے فرمایا کہ :-

" اسے وثن (بت) نہ بنانا "

"میری قبر کو عید" نہ بنانا" (یعنی اس پر میلے نہ لگانا) یہ بھی فرمایا کہ: ۔ یہود و نصاریٰ پر خدا کی لعنت ہو کہ انہوں نے نبیوں کی قبروں کو مساجد بنا لیا تھا ـــــ اور یہ بھی تنبیہ وحی ترجمان سے نکلا:

" قبروں پر چراغ جلانے والے پر اللہ کی لعنت ہو ۔ اور یہ بھی کہ قبر کو پختہ نہ کرنا (یعنی پختہ نہ بنانا) ـــــ پھر قبروں پر جانے کا سبب بھی بتا دیا ۔" کہ دنیا سے بے رغبتی پیدا ہو اور آخرت کی یاد آئے۔

زیارت قبور کے بارے میں حضور کی بتائی ہوئی ان "احتیاطوں" اور "ہدایتوں" کے باوجود قبروں کے ساتھ جو آج کل مسلمانوں کا رویہ ہے کیا وہ زبان رسول کی کھلے خزانے مخالفت نہیں ہے ـــــ آثار و سیر میں کہیں بھی یہ نہیں ملتا کہ صحابہ کرام نے قبر رسول پر پھول چڑھائے ہوں، چادر ڈالی ہو، عرس کیا ہو، چراغ جلائے ہوں، عود و صندل ملا ہو، قبر کے سامنے دست بجا بجا کر اشعار گائے ہوں، قبر مبارک کے قریب کے کسی ستون سے عرضیاں یا منت کی لٹکائی ہوں، اس پر چڑھاوے چڑھائے ہوں!

جب قبر رسول کے ساتھ صحابہ کرام اور اہل بیت اطہار کا یہ معاملہ نہیں رہا، تو پھر اور کس کی قبر اس احترام و تعظیم کی مستحق ہو سکتی ہے!

حضور کی وفات کے بعد مکہ میں طائف میں، بصرہ و کوفہ میں دمشق و مصر میں، مدائن و بلقہ میں سینکڑوں صحابہ کی قبریں پائی جاتی تھیں مگر امت نے نہ ان کا عرس کیا، نہ وہاں مرادیں مانگنے کے لئے لوگ جاتے تھے، اور نہ ان کے ساتھ وہ سلوک کیا جاتا تھا، جو آج کل اہل بدعت کا مسلک بن چکا ہے! ان خرافات اور بدعات کی دین میں کوئی گنجائش نہیں، یہ سب بعد کے لوگوں کے اضافے اور ایجادیں ہیں، جس کسی کو کتاب و سنت سے محبت اور عقیدت ہوگی، اس کو فطری طور پر "بدعات" سے نفرت ہونی چاہیئے۔

بعض حضرات ان مسائل کو "اختلافی مسائل" کہہ کر معاملہ کی سنگینی کو ہلکا بنا دیتے ہیں، فقہی مسائل میں تو دو دو رائیں ہو سکتی ہیں اور فروع میں اختلافات پائے بھی جاتے ہیں مثلاً یہ کہ نماز کے لئے کتنی مسافت پر قصر کرنا چاہیئے وغیرہ میں سنتوں کو قصر کیا جائے یا نہیں ـــــ اس قسم کے فقہی مسائل میں ضرور اختلاف رائے ہوتا ہے جو مختلف واقعات و حالات کی بنا پر ہے امت کے لئے "رحمت" ہے، مگر شرک و بدعت میں اختلاف رائے نہیں ہو سکتا، یہ تو بعد کے لوگوں کی بحث [illegible] ہے، جسے دیکھ کر بعض لوگ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ بھی فقہی مسائل کی طرح اختلافی مسائل ہیں، اور فقہی مذاہب کی طرح "بدعت" بھی کوئی مذہب ہے، جسے چلتے رہنا چاہیئے، معاذ اللہ "شرک" جسے اللہ تعالیٰ "ظلم عظیم" فرمائے اور "بدعت" جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "ضلالت" کہیں مسلمانوں کا مسلک کس طرح بن سکتا ہے!

رسول اللہ علیہ وسلم کا "عالم الغیب" اور "حاضر و ناظر" ہونا، قرون اول میں نزاعی مسئلہ نہیں رہا، اللہ تعالیٰ کے دور اول کے جمہور مسلمین نے کسی کو "عالم الغیب" اور "حاضر و ناظر" نہیں مانا ـــــ اسی طرح صحابہ کرام اور تابعین نے قبروں کے ساتھ وہ بدعات روا نہیں رکھیں، جو آجکل مسلمانوں میں پائی جاتی ہیں!

اہل شرک و بدعت کا یہ ہمیشہ سے مسلک رہا ہے کہ وہ بزرگوں کے بارے میں یک "عقیدہ" اپنے ذہنوں سے تراشتے ہیں، اور جو ان کے "عقیدہ" سے ہم آہنگ نہیں ہوتا، اس پر بزرگوں کی توہین کی تہمت جوڑتے ہیں! مثلاً نصاریٰ نے عقیدت کے جوش میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو "ابن اللہ" فرض کر لیا، اب جو کوئی بھی حضرت مسیح کو "ابن اللہ" نہیں مانتا، اس کو وہ حضرت مسیح کا مخالف، منکر اور ان کے مرتبہ کو گھٹانے والا سمجھتے ہیں ـــــ یہی حال اہل بدعت کا ہے،

کہ انھوں نے اپنے ذہنوں سے نبی اور اولیا سے الٰہی صفات منسوب کر دی ہیں، جو کوئی اُن کے خود تراشیدہ عقائد کی تائید نہیں کرتا اس کو "وہابی" "نجدی" اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں!

گزارشیں

جو حضرات تحقیق حق کا جذبہ رکھتے ہیں، اُن کی خدمت میں ہم چند گزارشیں کرنا چاہتے ہیں — یہ کہ وہ جن زندہ بزرگوں سے بھی بیعت کا تعلق یا عقیدت رکھتے ہیں، اُن کے حالات پر غور کریں، ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی بزرگ کسی بیمار پر کوئی دعا پڑھ کر پھونک دیں اور وہ اچھا ہو جائے، کسی بے روزگار کے لئے کوئی پیر فرمادیں کہ اسے اس ہفتہ میں روزگار مل جائے گا" اور اُسے روزگار مل جائے گا، کوئی مرید اپنے ذہن میں کوئی سوال لے کر آئے، اور اس کے شیخ اس سوال کی طرف مرید کے اظہارِ حال سے پہلے اشارہ فرمادیں، کراچی میں بیٹھ کر یہ تک بتادیں کہ لاہور یا ڈھاکہ میں فلاں شخص پر اس وقت یہ حال گزر رہا ہے، اس قسم کی کشف و کرامت کا صدور صلحاءِ امت (اولیاءِ کرام) سے ہو سکتا ہے — مگر جب وہ حالات کا صحیح طور پر جائزہ لیں گے تو وہ اس نتیجہ پر پہونچیں گے، کہ اس قسم کی کرامتیں اور خوارق بہت ہی کم ظہور میں آتے ہیں۔ ان بزرگوں اور پیروں کی پوری زندگی "کرامت" یا "خارق عادت" نہیں ہے، بلکہ قدم قدم پر احتیاج اور بے اختیاری کی زندگی ہے، ان کے بزرگ پیر اور مشائخ کی پوری زندگی کا یہ حال ہے کہ یہ حضرات — ٹرین کے اوقات معلوم کرنے کے لئے ریلوے ٹائم ٹیبل کے محتاج ہیں — اسٹیشن پر بروقت نہیں پہونچتے تو ٹرین چھوٹ جاتی ہے — تار اور ہوائی ڈاک کے ذریعہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کی خیریت منگاتے ہیں — مکان میں بجلی فیل ہو جائے تو تاریکی میں دور تک دیکھ نہیں سکتے، اندھیرے میں انھیں تکلیف ہوتی ہے — پانی کا نل [illegible] ہو جاتا ہے تو پریشان ہو کر [illegible] کام کرنے والوں کو تلاش کرتے پھرتے ہیں — اپنے ذہنی [illegible] میں کبھی کبھی [illegible] رہتے ہیں اور کبھی ان کی کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں — وہ سرکاری مردم شماری دیکھے بغیر نہیں بتا سکتے کہ اس بستی [illegible] محلہ میں کتنے آدمی رہتے ہیں — وہ اگر مسجد کے حجرے میں رہتے ہیں تو انھیں نہیں معلوم کہ مسجد کے پیچھے مکانوں میں کیا ہو رہا ہے — خبریں معلوم کرنے کے لئے وہ اخبارات پڑھتے اور ریڈیو سنتے ہیں، نئی و عجیب خبریں سن کر انھیں بھی دوسروں کی طرح حیرت ہوتی ہے — ان کے بیوی بچے بیمار ہوتے ہیں تو ڈاکٹروں کی دوا دارو کے لئے کیسے دوڑے دوڑے پھرتے ہیں — سواری نہیں ہوتی تو دو چار میل پیدل چلنا دشوار ہو جاتا ہے — [illegible] بوڑھے ہو جاتے ہیں تو [illegible] عینک لگانے کی ضرورت پیش آتی ہے، اور عینک کے بغیر پڑھ نہیں سکتے — اور ان کی زندگی میں کوئی مرید یہ نہیں کرتا کہ شہر کا راستہ بھول جائے تو اپنے پیر کو پکارے کہ "اے پیر و مرشد! مجھے راستہ بتا دیجئے"!

تو جب ان زندہ پیروں، فقیروں اور شیوخ کی احتیاج اور مجبوریوں کا یہ عالم ہے، تو مرنے کے بعد وہ "صاحبِ اختیار" کس منطق کی رو سے ہو جاتے ہیں، [illegible] قبر و برزخ میں کس [illegible] معاملہ پیش آ رہا ہے، یہ دین کا فلسفہ و منطق [illegible] کا کون سا اصول ہے کہ زندگی میں کوئی مجبور و بے اختیار رہے — اور قبر میں دفن ہوتے ہی وہ اس قدر با اختیار اور قدرت والا ہو جائے کہ دُنیا کے ہر گوشہ پر جہاں سے بھی اسے پکارا جائے تو وہ فریاد کرنے والوں کی نہ صرف یہ کہ پکار سن لے بلکہ ان کی مشکل کو بھی کھول دے [illegible] ہر زبان، ہر قوم کی آوازیں پیدا ہوتی رہتی ہیں، ان میں ہر آواز کو بے شمار آوازوں کے ہجوم میں علیحدہ علیحدہ پہچاننا اللہ تعالیٰ کے

سوا اور کس کی صفت ہو سکتی ہے کہ بندہ "سامع" ہے مگر "سمیع" اللہ تعالیٰ ہے، اس پر شاید یہ شعر پڑھ دیا جائے۔

کارِ پاکاں را قیاس از خود مگیر
گرچہ آید در نبشتن شیر، شیر

مگر ہم نے اپنے حالات پر کہاں قیاس کیا ہے، ہم نے تو اس اپنے زمانہ کے "پاکوں" اور "صالحین" ہی کی زندگیوں کی ایک جھلک یہاں پیش کی ہے، اور ہمارے دور کے یہ وہ مشائخ، اربابِ طریقت، اہلِ کشف و معرفت، اور پیرانِ کرام ہیں، جن میں سے سو سال بعد، کوئی ـــ "غوث الاغوث" کہلائے گا، کسی کو "قطب الاقطاب" کا لقب دیا جائے گا ـــ کوئی "دستگیر" کا خطاب پائے گا ـــ کسی کو معتقدین "شاہِ ولایت" کہہ کر پکاریں گے اور کسی کو لوگ "داتا" کہا کریں گے، یعنی اس ہمارے زمانے کے مجبور پیروں کو کچھ زمانہ گزرنے کے بعد "عطائی اللہ" بنا دیا جائے گا!

اس زمانہ میں کسی پیر یا بزرگ کی چائے کی پیالی ٹوٹ جاتی ہے، تو وہ اُسے جوڑ نہیں سکتا، اس کے کپڑے میلے ہو جاتے ہیں تو دھوبی کے یہاں دھونے کے لئے بھیجتا ہے، ہونا تو یہ چاہیئے کہ اس کے کپڑے ہی میلے نہ ہوں، اس کے کپڑوں پر گرد و غبار کو اپنا اثر ہی نہ چھوڑنا چاہیئے، اور گرد و غبار کا اثر ہو، تو بس کپڑوں پر وہ نگاہِ توجہ ڈالیں اور میل آن کی آن میں کافور ہو جائے، پاکستان کے تمام زندہ پیر، مشائخ اور اولیا برسوں سے کشمیر کے لئے دعا کر رہے ہیں، مگر ان کی دعا ابھی تک قبول نہیں ہوئی، اور اللہ کی مشیت اور حکمتِ تکوین کے مقابلہ میں وہ بے دست و پا اور مجبور ہیں!

ہمارے نزدیک ـــ اور ہمارے نہیں کتاب و سنت کے نقطۂ نگاہ سے انبیاء، اولیا، و صلحاء کا احتیاج جو "بندہ" کی لازمی صفت ہے، اُن کے لئے ذرہ برابر وجہِ عار نہیں ہے ان نفوسِ قدسیہ کی بڑائی تو اس میں ہے کہ وہ اپنی پوری زندگی اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق گزارتے ہیں، اور ایک بندۂ قانت و فرمانبردار کی طرح رہتے ہیں! ہوا و ہوس کے ہجوم میں برائیوں سے بچ کر، کنول کی طرح زندگی گزار دینے سے بڑھ کر نفسِ انسانی کے لئے کوئی کرامت نہیں، مقامِ "فنائیت" اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی میں تمام آرزوؤں کو گم اور فنا کر دیا جائے یعنی اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف کوئی فعل صادر نہ ہو، اور بہ تقاضائے بشریت بھول چوک ہو بھی جائے تو آدمی اس پر جما نہ رہے، اور توبہ و انابت سے اس کا ازالہ کر دے!

ہماری ان گزارشوں پر غور و فکر کرنے سے ان مسائل کی جانے کتنی گتھیاں سلجھ جائیں گی، اور ذہن بہت کچھ صاف ہو جائے گا!

آخری بات

"شرک و بدعت" ایسی چیز نہیں ہے، جسے خاموشی سے گوارا کر لیا جائے، جو لوگ ان گمراہیوں کا احساس رکھتے ہیں، اور توحیدِ خالص کی غیرت اور محبتِ رسول کی حرارت سے جن کے سینے معمور ہیں، ان کا فرض ہے کہ احیاءِ سنت اور امحاءِ بدعت کے لئے جد و جہد کریں، ورنہ قیامت کے دن ان سے باز پرس ہوگی کہ شرک و بدعت کی جب گرم بازاری ہو رہی تھی، تو تم کہاں مر گئے تھے؟

"فتنہ و فساد" کو اللہ تعالیٰ نے "اشد من القتل" فرمایا ہے، سنت قائم کرنے اور بدعات مٹانے کے لئے کسی ہنگامہ آرائی کو ہرگز ہرگز شہ نہیں دینی چاہیئے اس جد و جہد کو پورے نظم و ضبط، حکمت اور ضرورت پڑے تو جرأت کے ساتھ شروع کرنا چاہیئے! بحث مباحثے سرِ منظرِ عام پر مناظرہ بازی سے بھی اجتناب کی ضرورت ہے کہ عام جلسوں میں

علمی اور دینی بحثیں آخرکار فتنہ و فساد کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔

اس جد و جہد کا آغاز اپنے پڑوسیوں، دوستوں اور عزیزوں سے کرنا چاہیئے! ہمارا خود ذاتی تجربہ ہے کہ جب ان لوگوں کے دل میں یہ بات اُتاری گئی ہے کہ یہ "بدعات" اللہ اور رسول اور بزرگان دین کی خوشنودی کا باعث نہیں ہو سکتیں، تو وہ لوگ شروع میں تو چونکے ہیں اور انھوں نے ہماری بات کو حیرت کے ساتھ سُنا ہے، لیکن رفتہ رفتہ وہ بدعات سے دُور ہوتے چلے گئے ہیں!

مشرکانہ رسوم بدعات کے خلاف جد و جہد کرنے کا سب سے زیادہ فطری، حکمت آمیز اور موثر طریقہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو "قرآن سمجھ کر پڑھنے" کی طرف راغب کیا جائے، جو کوئی مسلمان سمجھ کر قرآن پڑھ لے گا، اس کا ذہن ان مسائل میں صاف ہو جائے گا، اُسے تو قرآن میں ہر جگہ یہی ملے گا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی مشکل نہیں کھول سکتا، قرآن پڑھنے والے کو ایک آیت بھی ایسی نہیں ملے گی، جس میں یہ کہا گیا ہو کہ تم وفات پائے ہوئے بزرگوں کے ناموں کی دہائی دو اور اُن کو مدد کے لئے پکارو! قرآن پاک میں انبیاء کے حالات پڑھ کر ایک مسلمان یہ سوچے گا کہ یہ نفوسِ قدسیہ ہر مصیبت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنا دکھ درد پیش کرتے تھے، اور ایسا کبھی نہیں ہوا کہ نوح نے آدم کو، اور ابراہیم نے نوح کو، اور موسیٰ نے ابراہیم کو اور عیسیٰ نے موسیٰ کو (علیہم السلام) مدد کے لئے پکارا ہو، یا ان کے صحابیوں نے انبیاء کی وفات کے بعد اُن سے استغاثہ کیا ہو! قرآنِ پاک میں تو جگہ جگہ "شرک" کی مذمت ملے گی، اور "قبروں" پر جو آجکل خرافات ہوتی ہیں اُن کے جواز کے لئے کوئی اشارہ تک نہ ملے گا، قرآنِ پاک میں تو قاری کی نگاہ سے یہ آیت تک گزرے گی:

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ "اے محمد! آپ کو بھی موت آنی ہے، اور بے شبہ وہ بھی مرنے والے ہیں"

قرآنِ پاک میں انبیاء کرام کے معجزات کے ساتھ یہ بھی ملے گا کہ ان نفوسِ قدسیہ کو بھی زندگی میں انسانوں جیسے حالات پیش آتے تھے، مثلاً حضرت یعقوب علیہ السلام کو برسوں اپنے نورِ نظر حضرت یوسف علیہ السلام سے جدا رہنا پڑتا ہے، اور اس غم میں آپ کی آنکھیں سفید ہو جاتی ہیں مگر اللہ کے حکم اور مشیت کے آگے مجبور اور لاچار ہیں برسوں کی درد انگیز جدائی کے بعد، جب اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے تو باپ، بیٹے کا ملاپ ہوتا ہے!

قرآن پاک کے ساتھ ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ پڑھی جائے یا زیر مطالعہ رہے تو ذہن اور زیادہ صاف ہوتا چلا جائے گا کہ وہاں ہر چیز زیادہ مفصل ملے گی، (ان) بدعات کا نام و نشان تک نہیں، علم غیب کی سیرت کے بے شمار واقعات سے نفی، اس کا کہیں ذکر تک نہیں کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اپنے کارخانے کے چلانے کے تمام انتظامات سپرد فرما دئے ہیں اور اللہ تعالیٰ تو "ذاتی فریاد رس اور مشکل کشا ہے" اور میں "عطائی فریاد رس اور حلالِ مشکلات" ہوں کوئی شک نہیں حضور افضل البشر تھے، اللہ تعالیٰ کے بعد تمام فضائل و کمالات اور عزتیں حضور ہی کو سزاوار ہیں ــــــ مگر "افضل البشر" بھی "بشر" ہی ہوتا ہے لہذا حضور کو بھی "بشر" ہونے کی حیثیت سے احوال و واقعات پیش آتے تھے، حضور کو بھوک لگتی تھی، دھوپ میں جسم مبارک کو پسینہ آجاتا تھا، غزوۂ احد میں تلوار نے حضور کو زخمی کر دیا، یہ نہیں ہوا کہ حضور نے پھونک ماری اور زخم اچھا ہو گیا! بلکہ جس طرح زخموں کے لئے انسان تدبیریں کیا کرتے ہیں، حضرت علی اور حضرت فاطمہ نے اسی طرح کی تدبیریں اختیار کیں، شروع شروع میں خون تھما ہی نہیں، آخر میں چٹائی کا ٹکڑا جلا کر زخم پر رکھا گیا تو لہو بند ہوا۔

سیرتِ مقدسہ میں یہ بھی ملے گا کہ غزوۂ خیبر میں حضرت حضرت علی کرم اللہ وجہ کی آشوب زدہ آنکھیں حضور کے لعاب دہن سے اچھی ہو جاتی ہیں، اور یہ بھی ملے گا کہ اُحد کی جنگ میں خود حضور کے قریب حضرت طلحہ کا ایک ہاتھ تلوار سے کٹ کر گر پڑتا ہے اور حضور اس حادثہ کو نہ روک سکے، حضورؐ کے بس میں ہوتا تو بھلا اپنے پیارے چچا حمزہ (رضی اللہ عنہ) کو اس بے دردی کے ساتھ شہید ہو جانے دیتے کہ اُن کی لاش کا مثلہ کیا گیا اور اُن کا پیٹ چاک کر کے کلیجہ نکال کر چبایا گیا، یہ وہ مقام قضا و قدر ہے "جہاں نبی بھی اپنے کو مجبور پاتا ہے!

اس کے بعد صحابہ کرام کے حالات کا مطالعہ کرنا ضروری ہے، وہاں یہ تک ملے گا کہ حضور کی وفات کے بعد حضرت صدیق اکبر خطبہ دے رہے ہیں۔

اَلَا مَنْ کان یعبد محمداً فان محمداً صلی اللہ علیہ وسلم قدمات ومن کان یعبد اللہ فان اللہ حی لا یموت۔

"(جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پوجا کرتا تھا، وہ سُن لے کہ بے شبہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی موت واقع ہوگئی جو شخص اللہ کی بندگی کرتا ہے، تو بیشک اللہ زندہ ہے، اس کے لئے موت نہیں"!)

جمل وصفین کی جنگیں خود اس کی شاہد ہیں کہ ان ناگوار واقعات کو لاکھوں صحابہ کرام بھی نہ روک سکے، اور یہ نفوسِ قدسیہ بھی مقدرات کے آگے مجبور تھے! جب جنگوں میں صحابہ کرام تک کو یہ حالات پیش آئیں، تو ہم مصیبت کے وقت اللہ تعالیٰ کے سوا اور کس ولی کو امداد کے لئے پکاریں!

جو کوئی کتاب اللہ، سیرتِ رسول، اور صحابہ کرام اور اہلِ بیت کے حالات سمجھ کر پڑھ لے گا، وہ پھر کسی مشرکانہ رسم اور بدعت کے پاس بھی نہ پھٹکے گا، اور اس کو ان خرافات و بدعات کے لئے کوئی سندِ جواز کیا اشارہ تک نہ ملے گا اور بعد کے اکابر و مشاہیر کے احوال و اقوال میں جہاں بھی اسے کوئی بات کتاب و سنت اور آثارِ صحابہ سے ٹکراتی ہوئی ملے گی، اسے وہ چھوڑ دے گا۔ وہ اپنے اکابر کا احترام ضرور کرے گا مگر کتاب و سنت کے مقابلہ میں ان سے مرعوب نہ ہوگا! جس نے اس حقیقت کو سمجھ لیا اور اس پر عمل کیا، بس پھر اُسے کوئی کھٹکا نہیں!

ماہر القادری

۲۳ مارچ ۱۹۵۸ء

فاران
کے معرکہ آرا نمبر
خلافت نمبر
کی تیاریاں
جاری ہیں،
"سیرت نمبر
اور توحید نمبر
کی طرح — "خلافت نمبر" بھی اپنی آپ مثال ہوگا، اس موضوع پر اتنا جامع
مدلل، دل نشین اور ایمان افروز "خاص شمارہ" اردو ادب میں شاید
منظر عام پر نہ آیا ہو۔
مکمل انتظامات کے بعد ہی مہینہ کا اعلان کیا جائے گا۔
"خلافت نمبر" چاہے تاخیر سے آئے، مگر، اہل ایمان اسے
دیکھکر پکار اٹھیں:
ع آمد آں یارے کہ ما می خواستیم

عبدالعلی آصفی

مولانا شبلی کا ایک جلیل القدر شاگرد

مولانا شبلی جہاں سب کچھ تھے بہت اچھے معلم و مدرس بھی تھے، وہ جہاں بھی رہتے تھے درس و افادہ کا سلسلہ برابر جاری رہتا تھا، اور شائقین علوم اور طلبہ برابر اُن سے مستفید ہوتے رہتے تھے۔ ندوہ کے تو وہ ناظم تعلیمات تھے، اور دارالعلوم کے درس و تعلیم کی نگرانی اور اس کا اہتمام ان کے سپرد تھا، لیکن ندوہ کے خارج اوقات میں طلبہ کو قرآن و حدیث کا درس بھی دیتے تھے، جامع صحیح بخاری کا درس ان کا بہت مشہور تھا، اور اس میں ندوہ کے طلبہ اور دوسرے لوگ بہ تعداد کثیر شریک ہوتے تھے، اعظم گڈھ آتے تھے، تو یہاں بھی یہی مشغلہ جاری رہتا تھا، اس طرح کے مستفیدین و متعلمین میں مولانا حمید الدین اور مولانا سہیل بہت ممتاز ہیں۔ مولانا حمید الدین فراہی سے مولانا شبلی کی نسبت، تعلق اور تلمذ کا حال تو ساری دنیا کو معلوم ہے مکاتیب شبلی کے حصہ دوم میں خطوط کی ایک بڑی تعداد ان جلیل القدر شاگرد کے نام بھی ہے، بلکہ اس جلد کا آغاز ان ہی کے نام کے خطوط سے ہوا ہے۔ خود مولانا شبلی کو اپنے ان شاگرد پر بڑا ناز تھا، اور ان کی عربی دانی کے بڑے معترف تھے، انھوں نے جمہرۃ البلاغہ لکھی تو اپنے قلم سے الندوہ میں اس کا تعارف کرایا، اور اس کے کچھ صفحات کا ترجمہ بھی شائع کیا، اپنے تمام علمی و تصنیفی معاملات میں اُن سے مشورہ لیتے تھے، مولانا حمید الدین کی فارسی شاعری سے بھی وہ بہت متاثر تھے، فرماتے تھے کہ کسی ایرانی شاعر کا کلام معلوم ہوتا ہے، لیکن مولانا شبلی کو ان کی ذات سے جو توقعات تھیں، وہ پوری نہ ہوسکیں جن کا ان کو بیحد افسوس تھا، مولانا چاہتے تھے کہ وہ جو کچھ لکھیں اردو میں لکھیں، لیکن یہ اردو میں لکھنا نہیں چاہتے تھے یا لکھ نہیں سکتے تھے، ان کی ساری تصنیفات عربی میں ہیں، جن سے عربی داں ہی مستفید ہوسکتے ہیں۔

مولانا شبلی سے مولانا سہیل کے تلمذ و شاگردی کی تمام تر روایات خود انہی سے منقول ہیں، جن کی کسی اور ذریعہ سے شہادت نہیں ملتی، بہرحال ان کے صحیح اور مستند ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے، انھوں نے مولانا شبلی کے سامنے اس زمانہ میں زانوئے ادب تہ کیا جب مولانا کا باقاعدہ تعلق ایم، اے، او کالج علی گڈھ سے ہوگیا تھا۔ وہ جب چھٹیوں میں اعظم گڈھ آتے تھے، تو مولانا سہیل ان سے پڑھتے تھے، اور دیوان حماسہ، شرح سلم، بحرالعلوم اور عقد الفرید وغیرہ کتابیں درس میں تھیں، ان کے زمانۂ شاگردی کا ایک واقعہ مولانا سید سلیمان ندوی نے انہی کی زبانی حیات شبلی میں نقل کیا ہے، وہ ۱۸۹۹ء میں علامہ مرحوم سے حماسہ پڑھتے تھے۔ ایک دن ابن زیابۃ التیمی کا یہ شعر سبق میں تھا۔

الرمح لا املأ کفی به — واللبد لا اتبع تزواله

نیزہ کو مٹھی بھر کر نہیں پکڑتا — اور زین کے کھسکنے سے میں نہیں کھسکتا

اس شعر کی تشریح میں مولانا نے اپنے سفر حج کا ایک واقعہ بیان کیا کہ ایک بدوی نے ان کو نیزہ بازی کا طریقہ عملاً سکھلایا تب جاکر اس شعر کا مفہوم صحیح طور پر ان کی سمجھ میں آیا۔ فرمانے لگے کہ اہل عرب نیزے کے ڈانڈ کو مضبوط نہیں

پکڑتے بلکہ گرفت ڈھیلی رکھتے ہیں، اور ہتھیلیوں اور انگلیوں سے جو حلقہ نیزہ کی گرفت کے لئے بناتے ہیں، اس میں قصداً خلا چھوڑتے ہیں، اور نیزہ بازی کے وقت سارا زور بازو کی جنبش پر صرف کرتے ہیں تاکہ حریف کے جسم میں نیزے کی انی کافی حد تک پیوست ہو سکے۔ فرماتے تھے کہ جاہلی اور کتابی زبان میں بڑا فرق ہوتا ہے، اور ان دونوں کو جانے بغیر عربی ادب پر پورا تبحر حاصل نہیں ہوتا۔

مولانا سہیل، مولانا شبلی کے حلقہ شاگردی میں آنے سے پہلے شاعر ہو چکے تھے، مولانا شبلی کی شاگردی، صحبت اور ہم نشینی میں اس ذوق کو اور زیادہ جلا ہوگئی، جس کے واقعات اس مضمون کے آئندہ اوراق میں آ رہے ہیں، مولانا شبلی کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ لڑکہ عربی کے جید طالب علم ہی نہیں، فطری شاعر بھی ہیں، اور فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں، تو ان کی توجہ اور زیادہ ان کی طرف مبذول ہوگئی، اور ان کو بڑے شوق اور دلچسپی سے پڑھانے لگے۔ ان کو مولانا شبلی سے صرف شاگردی ہی کا نہیں برادری اور ہم وطنی کا بھی رشتہ تھا، اور ان سہ گونہ رشتوں اور تعلقات کی وجہ سے مولانا شبلی ان پر بہت شفقت فرماتے تھے۔

ان سے مولانا جہاں استادانہ شفقت، رفق و التفات سے پیش آتے تھے، کبھی کبھی ان کی تنبیہ بھی فرماتے تھے، جس کو وہ انتہائی سعادت مندی و خورشدلی کے ساتھ انگیز کرتے تھے، ان کی طالب العلمی کا ایک واقعہ مولوی محمد احمد صاحب سے منقول ہے، جو ان کے ساتھی، اسکول فیلو اور ہم مذاق تھے، فرماتے تھے کہ مولانا شبلی بڑے قاعدہ و ضابطہ کے پابند تھے کسی معمولی بے ضابطگی کو بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے، مولانا سہیل ان کے مطالعہ کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ کسی ضرورت سے مولانا شبلی اٹھ گئے، مولانا سہیل اس درمیان میں ان کی میز سے کوئی کاغذ اٹھا کر پڑھنے لگے کہ مولانا شبلی آگئے، اور یہ دیکھ کر ان پر سخت برافروختہ ہوئے۔

اسی طرح ان سے ایک مرتبہ فرش پر اگالدان ان کے ہاتھ سے لگ کر گر گیا، مولانا کو اس کی کہاں برداشت تھی۔ فوراً کمرے سے نکلوا دیا، مگر مولانا سہیل اپنی ساری عمر اس صفائی اور ستھرائی کے پابند نہیں رہے، ان کی پان کی پیک سے کمرہ کا فرش ہی نہیں، ان کی شیروانی، پاجامہ سب رنگین رہتے تھے، پان بے حد استعمال کرتے تھے، بلکہ کہنا چاہیئے کہ کھاتے تھے، پان کے بیڑوں کی کوئی تعداد مقرر نہیں تھی، اور اس کے اجزائے ترکیبی میں سب سے زیادہ چونا استعمال کرتے تھے، ان کے لئے پان کے جو بیڑے بن کر آتے تھے کوئی دوسرا ان کو استعمال نہیں کر سکتا تھا، کہ اس سے کام و دہن کی اچھی خاصی تواضع ہو جاتی تھی۔ ان کی شعر گوئی سخن سنجی و قافیہ پیمائی و خیال آرائی میں بھی پان کو بڑا دخل ہوتا تھا، پان سے بے نیاز ہو کر ان کی طبیعت موڈ میں آتی نہیں تھی، طبع آزمائی اور پان خوری لازم و ملزوم تھی۔ جہاں لوگ ان سے کسی تقریب کے لئے نظم کی فرمائش کرتے تھے، ان کے لئے ان کے ذوق کے مطابق پان کا بھی اہتمام کرتے تھے، عدالتوں میں بھی بغیر پان کھائے ہوئے نہیں جاتے تھے، بلکہ بحث کرتے وقت بعض اوقات پان کی چھینٹیں صاحب عدالت کے چہرہ و رخ تک بھی پہنچ جاتی تھیں۔ عدالتیں جہاں ان کی قابلیت، قانونی تبحر، اور قوت استدلال سے متاثر ہوتی تھیں۔ ان کی اس ادائے خاص کو بھی لحاظ کرتی تھیں،

مولانا سید سلیمان کو مولانا شبلی کے ان مایہ ناز شاگرد سے بے حد محبت تھی، وہ جب شبلی منزل میں آتے تھے تو ان کو دیکھ باغ باغ ہو جاتے تھے ان پر بہت زیادہ اعتماد کرتے تھے، بلکہ حیات شبلی میں مولانا شبلی کے ابتدائے زندگی اور علی گڈھ

کے بہت سے واقعات تنہا انہی کی روایت پر نقل کئے ہیں جو مولانا سہیل کے لئے بڑے فخر کی بات ہے۔

مولانا شبلی کے قیام علیگڑھ کے آخری دور میں سرسید کی سوانح عمری لکھنے کا جو مسئلہ پیدا ہوگیا تھا، اس کا ایک جزو مولانا سہیل ہی سے منقول ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ سرسید کو اپنی آخری عمر میں یہ بڑی خواہش پیدا ہوئی تھی، کہ ان کی سوانح عمری لکھی جائے۔ اور انہی کی زندگی میں پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے اور وہ چاہتے تھے کہ یہ کام مولانا شبلی انجام دیں جو ہر وقت انہی کے پاس رہتے ہیں اور ان سے ان کی زندگی سے متعلق ہر قسم کے واقعات و معلومات حاصل کرکے قرینہ سے ترتیب دے دیں، لیکن مولانا کو کسی وجہ سے اس سے گریز تھا، اور جب اس کا اظہار ان کے سامنے ہوتا تھا تو اس سے پہلو بچاتے تھے۔ اس سلسلہ میں بلاواسطہ و بالواسطہ جتنی بھی کوششیں ہوئیں وہ سب ناکام ہوگئیں، یہاں تک کہ نواب اسماعیل خاں صاحب رئیس دتاولی کا خواب بھی جو انھوں نے اس سلسلہ میں دیکھا تھا، مولانا کو اس کے لئے آمادہ نہ کرسکا۔ تو مولانا سہیل کی روایت ہے کہ سرسید نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ مولانا کو بلا کر ہر روز اپنے کچھ حالات نوٹ کراتے رہے اور مولانا اس کو بجنسہٖ لکھتے رہے، جب یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی تو قرعۂ فال مولانا حالی کے نام نکلا، اور انھوں نے ۱۸۹۱ء سے اس کو انجام دینا شروع کردیا اور بالآخر مکمل کردیا۔

سرسید دعاؤں کی قبولیت کے قائل نہ تھے، اور اس لئے قبولیت کے لئے دعا مانگنے کو فعل عبث قرار دیتے تھے، اور اس پر "الدعاء والاستجابہ" کے عنوان سے تہذیب الاخلاق میں جو انہی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا، ایک مضمون بھی لکھا تھا، اس کی تردید میں ایک ہندو بزرگ نے جو اچھے پڑھے لکھے اور صوفیانہ خیال کے آدمی تھے، اور اعظم گڈھ میں پوسٹ ماسٹر تھے۔ ایک دل نشین رسالہ شائع کیا، جس پر نواب وقار الملک نے جو سرسید کے ساتھیوں میں، سب سے زیادہ مذہبی اور کٹر مسلمان تھے نہایت عمدہ ریویو لکھا۔ اس رسالہ کی ترتیب، قوت استدلال، اور انداز بیان سے بعض لوگوں کو شبہ ہوا کہ اس کے مصنف دراصل مولانا شبلی ہیں، چونکہ یہ رسالہ اعظم گڈھ میں لکھا گیا تھا۔ اس لئے اس سے اس شبہہ کو اور زیادہ تقویت پہنچی، وہ ہندو پوسٹ ماسٹر صاحب مولانا کے شناسا اور واقف کار بھی تھے۔

سرسید کے اپنی تفسیر کے عربی میں ترجمہ کرانے کا مسئلہ جس کے لئے ان کی نظر بار بار مولانا شبلی پر پڑتی تھی، مولانا نے اپنی گوناگوں مصروفیتوں کی بنا پر عذر کیا تو اس کے بعد مولانا کے ماموں زاد بھائی اور شاگرد مولانا حمید الدین صاحب فراہی پر نگاہ پڑی، جو سرسید کے حکم سے طبقات ابن سعد کے ایک حصہ کا فارسی میں ترجمہ بھی کرچکے تھے، مگر مولانا حمید الدین صاحب نے انکار کردیا، اور جب سرسید نے بار بار اس کی وجہ پوچھی تو صاف کہہ دیا کہ اس باطل کی اشاعت میں تعاون علی الاثم کے گناہ میں مبتلا ہونا نہیں چاہتے۔

یہ دونوں مؤخر الذکر روایتیں بھی سید صاحب نے سہیل صاحب کی تحریر مندرجہ الاصلاح سے لی ہیں اور ان کے تنہا راوی اپنی معلومات کے مطابق درج کی ہیں اور اس قسم کے اور واقعات کے تجزیہ نے جو سرسید اور مولانا شبلی کی کشمکش کا باعث تھے ارباب علی گڈھ کو برہم کردیا اور دونوں بزرگوں نے توجیہاتِ شبلی کے رد و تنقید میں دو مستقل کتابیں لکھ دیں۔ ایک شبلی نامہ جس کو محمد اکرام آئی سی ایس نے لکھا ہے اور دوسری ذکر شبلی جس کو جناب امین صاحب زبیری نے تصنیف کیا ہے، جنہوں نے حیات شبلی کے لئے بہت سارا مواد اکٹھا کرکے بھیجا، اور جو مولانا شبلی کے بہت قریبی دوست، مخلص، معتقد بلکہ پرستار تھے، اس کتاب کا لب و لہجہ امین صاحب کی شدت تاثر اور مرعوبیت غضب کا پورا آئینہ دار ہے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ان دونوں کتابوں کو جو بڑے اہتمام کے ساتھ لکھی اور شائع کی گئیں حیات شبلی کے مقابلہ

تک فروغ حاصل نہ ہو سکا، بلکہ شاید بہت سے لوگوں کو ان کا پتہ بھی نہ چل سکا، اور وہ پردۂ گمنامی میں چلی گئیں، لیکن حیاتِ شبلی کی عظمت اپنی جگہ پر قائم اور مسلّم ہے، علی گڑھ اور حامیانِ علی گڑھ کے نقطۂ نظر سے اس میں جا بجا جتنی خوبیاں، تلخیاں اور ناپسندیدہ باتیں بھی ہوں، لیکن مولانا حالی کی حیاتِ جاوید کے بعد اسی کا درجہ ہے، اور اردو زبان کی بہترین سوانح عمریوں میں اس کا شمار ہے، اس کی حیثیت محض سوانح عمری ہی کی نہیں، پوری ایک صدی کے مسلمانوں کے علم و افکار کی تاریخ اور علماء و فضلا کے تذکرہ کی ہے، جس میں ہندوستان میں عربی تعلیم کے متعلق اتنا مواد اکٹھا کر دیا گیا ہے، جو کسی کتاب میں نہیں مل سکتا۔

مولانا سہیل مولانا شبلی پر اتنے نثار تھے، اور ان کے متعلق ان کے اتنے وسیع معلومات تھے کہ ان پر پوری کتاب لکھ سکتے تھے، اور انھوں نے سیرتِ شبلی کے عنوان سے الاصلاح سرائے میر میں جو دائرۂ حمیدیہ کی طرف سے مولانا امین احسن اصلاحی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا، ایک سلسلہ مضمون لکھنا شروع بھی کر دیا تھا، لیکن وہ پندرہ قسطوں تک پہنچ کر رک گیا، اس کے بعد بقول سید صاحب قبلہ کے وہ اسمبلی کی ممبری، اور اس کے سیاسی فرائض کی ادائیگی میں ایسا الجھے کہ اس کو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکے، اور اس کے لئے مناسب وقت اور فرصت پھر ان کو میسر نہ آسکی، سیرتِ شبلی کا یہی ناتمام مسودہ عنقریب شبلی نیشنل کالج کے سلسلۂ مطبوعات کے تحت بڑے آب و تاب سے شائع ہو رہا ہے، جس سے ان کی تصنیفی صلاحیت، اور مولانا شبلی کے متعلق ان کے وسیع معلومات کا اندازہ ہوگا۔

مولانا سہیل نے شبلی ڈے کی ایک تقریب کے لئے "شبلی کی جامعیت" کے عنوان سے بھی ایک مضمون لکھا تھا، جو بہت دلچسپ، پُر کیف اور ان کے زورِ انشاء کا بہترین نمونہ ہے، وہ شبلی کالج کے اس سال کے میگزین کے علاوہ ان کے تازہ مجموعہ مضامین افکارِ سہیل میں بھی آگیا ہے، اس میں شبلی کی فارسی شاعری کے متعلق ایک بہت دلچسپ واقعہ لکھا ہے،

جس زمانہ میں علامہ شبلی علیگڈھ کالج میں السنۂ مشرقیہ کے پروفیسر تھے، ایک ایرانی شاعر تقی الدین کمال بجز طرازی وارد ہندوستان ہوا، اور دہلی لکھنؤ رامپور ہوتا ہوا علی گڑھ پہنچا، مولانا اس وقت نوجوان تھے، عمر کے ساتھ علم کا بھی شباب تھا، شعر و سخن سے کافی دلچسپی رکھتے تھے، طلبہ قریب قریب مولانا کے ہم عمر اور کافی بے تکلف تھے، علی گڈھ میں سنجر کے ورود سے طلبہ کو ایک دلچسپ مشغلہ ہاتھ آگیا، اور ان دونوں باکمال شاعروں میں باہم مقابلہ طے پا گیا۔ اس طرح کہ دونوں باکمال ایک ایک بہاریہ قصیدہ لکھ کر ایک مجلس میں پڑھیں، دونوں اساتذۂ سخن نے اپنی اپنی جگہ فکرِ سخن شروع کر دی، ابھی مولانا کے قصیدہ کے چند ہی شعر ہوئے تھے، کہ کسی صاحب نے اچک لیے، اور ان کو سنجر تک پہنچا دیا، سنجر پر انھی چند اشعار کا اتنا رعب طاری ہوا کہ وہ رات ہی کو بقول ڈپٹی نذیر احمد کے چپکے سے سٹک گیا۔ اور مقابلہ کی نوبت نہیں آئی۔

مولانا شبلی کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ان کا "حادثۂ پا" بھی ہے، جس کی تفصیل مولانا سید سلیمان صاحب نے حیاتِ شبلی میں ایک مستقل عنوان کے تحت لکھی ہے، لیکن اس کی روایت مولانا سہیل سے بھی منقول ہے، جس کو انہی کے الفاظ میں درج کرتے ہیں، فرماتے ہیں کہ شعر العجم کے دوران تصنیف میں ایک اتفاقی واقعہ سے مولانا کا ایک پاؤں شہید ہو گیا، میں اس وقت اپنے گاؤں پر تھا، دو تین دن کے بعد خبر ملی تو حاضر خدمت ہوا، اور یہ منظر دیکھ کر بے اختیار آبدیدہ ہو گیا۔ مولانا نے میری یہ کیفیت دیکھی تو فرمایا "یہ کیا بزدلی ہے مسلمانوں کے اسلاف تو وہ تھے کہ معرکۂ جہاد میں پاؤں کٹ جاتا تو خبر نہ ہوتی۔ نہ ان کے جوشِ جہاد میں کوئی فرق آتا۔ اس کے بعد غالب کا یہ شعر پڑھا،

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

دوسرے دن جب پھر حاضر خدمت ہوا۔ تو مولانا نے ایک رباعی سنائی جس کا دوسرا شعر حسب ذیل ہے۔

یعنی کہ پہنچ گیا ہوں جب منزل تک
یاں سے سفر عدم بس اب آساں ہے

یہ رباعی سنتے ہی میرے ذہن میں ایک خیال وارد ہوا، جو فوراً موزوں بھی ہو گیا۔ میں نے یہ قطعہ مولانا کو سنایا۔

شکستہ پائی مقدر تھی سرنوشت میں تھی — لگے گا ہاتھ نہ کچھ اب تو ہاتھ ملنے سے
عدم کی دوری منزل نہ جا سکیں گے حضور — چلے گا قوم کا کام آپ کے نہ چلنے سے

مولانا نے یہ قطعہ بہت پسند کیا، اور حکم دیا۔ کہ الندوہ میں اشاعت کے لئے سید سلیمان کو جو اس زمانہ میں اس کے سب اڈیٹر تھے بھیجدو۔ یہ قطعہ لکھنے بیٹھا تو چند رباعیاں ذہن میں آئیں، جو حسب ذیل ہیں۔

صد حیف ہوا شکستہ پائے شبلی — اب سلسلۂ سفر بھی مسدود ہوا
مشتاق زیارت جو ہو خود آئے یہاں — رہبر جو تھا اب کعبۂ مقصود ہوا

اللہ نے آپ کو جو ممتاز کیا — ہر وصف میں بے نظیر و انباز کیا
باقی تھا فقط فخر شہادت ملنا — اک پاؤں کو اس سے بھی سرافراز کیا

اے آنکہ تو اہل علم را ملجائی — حق دادہ ترا بہ ملک فن دارائی
چوں نیست کسے ہمسر تو در پایہ — پس پائے ترا ہمی سزد یکتائی

اے سرور قوم و فخر ابنائے زماں — اے علم و کمال بر وجودت نازاں
یک پائے تو چوں شد بعالم دانستم — زیر قدم تو شد کنون ہر دو جہاں

اس خیال کو دوسری رباعی میں اس طرح موزوں کیا تھا،

کھینچئے نہ غم شکستِ پا مولانا — اس میں بھی تھی حکمتِ خدائے دانا
تھی اہلِ عدم کو آرزوئے پابوسی — اک پاؤں وہاں بھی چاہیئے تھا جانا

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ استاذ مرحوم کی قدر نوازی تھی کہ ان فی البدیہہ رباعیات کو غیر معمولی اہمیت دی اور مہینوں تک احباب سے ان کا تذکرہ فرماتے رہے' عنفوان شباب اس پایہ کے بڑے امام فن کی قدر شناسی و کرم نے مجھے ان کی خدمت میں گستاخ کر دیا۔ اکثر نکات ادب کے متعلق مولانا سے گفتگو ہوتی اور کبھی کبھی باہم اختلاف رائے بھی ہو جاتا۔

بمبئی کی مشہور مسلمان خاتون عطیہ بیگم نے بمبئی کے مشہور نو مسلم آرٹسٹ مسٹر رحمین سے جو پہلے یہودی مذہب رکھتے تھے، شادی کی اور مولانا کو اس کی خبر ہوئی تو اس وقت بھی مولانا یہیں شبلی منزل میں ان کی خدمت میں حاضر تھے' یہ ان کے علی گڑھ کالج میں داخلہ سے کئی برس پہلے کا واقعہ ہے' مولانا نے عطیہ کی شادی پر مبارکباد کا خط لکھا تو اس میں یہ قطعہ بھی تھا۔

"کھینچ سکتا جو نہ تھا مجھ کو کوئی اپنی طرف — اس لئے ننگ قرابت سے مجھے دوری تھی

آپ "نقاش" ہیں اور حسن کی تصویر ہوں میں　　　آپ نے مجھکو جو کھینچا" تو یہ مجبوری تھی

اس کے ساتھ یہ شعر بھی

بتانِ ہند کا فر کیا کرتے تھے مسلم کو　　　عطیہ کی بدولت آج ایک کافر مسلماں ہے

مولانا سہیل فرماتے ہیں کہ مولانا نے وہ قطعہ مجھ کو بھی سنایا اور ٹیکنے کی میز سے سرے اٹھ گئے، مجھے موقع ملا تو کاغذ کی ایک چٹ پر:　　　" جائے استاد خالیست "

کے عنوان سے حسب ذیل قطعہ لکھکر مولانا کی میز پر رکھدیا اور گھر چلا آیا

کب ہوئی ہے عطیہ! عقد زیبا تھا تمہیں　　　بنت فیضی تم ہو یہ رشتہ نہ کرنا تھا تمہیں
میں نے یہ مانا وہ "مانی" ہے تو تم تصویر حسن　　　تم کو کھنچنا تھا مصور نے جو کھینچا تھا تمہیں

شام کو جب پھر حاضر خدمت ہوا، تو مولانا مسکرائے، اور فرمایا ابھی تک تمہاری مولویانہ تنگ نظری نہیں گئی۔

اس پر میں نے عطیہ کے شوہر کی طرف سے یہ شعر لکھکر پیش کیا،

صفحۂ دل پہ جو کھینچی آپ کی تصویر حسن
مستحق تھا جس عطیہ کا وہ میں نے پالیا

یہی عطیہ ہیں، جن کے نام کے مولانا شبلی کے خطوط، مولانا شبلی کے انتقال کے ایک عرصہ کے بعد جناب امین صاحب زبیری نے مولانا عبدالحق انجمن ترقی اردو کے ایک طویل مقدمہ کے ساتھ خطوط شبلی کے نام سے شائع کئے ہیں، ان خطوط کے شائع کرنے کا ان کے مرتبین کا جو بھی منشا رہا ہو، اس سے بحث نہیں، لیکن اگر یہ خطوط شائع نہ ہوتے تو اردو ادب کی ایک بہت بڑی متاع سے ہم محروم رہ جاتے۔ ان خطوط کو پڑھتے وقت غالب کے خطوط کا مزہ آجاتا ہے، ان میں بھی وہی برجستگی، بے تکلفی، طرز ادا کی رعنائی و دلکشی ہے، جو خطوط غالب کا طرۂ امتیاز ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ محترم خاتون سامنے بیٹھی ہیں، اور مولانا فنون لطیفہ، ادب، شاعری، اور موسیقی پر باتیں کر رہے ہیں، اور فارسی شاعری کے محاسن اجاگر کر رہے ہیں، اور قومی، علمی، ادبی و مجلسی مشورے دے رہے ہیں ادبی نکات بتا رہے ہیں، اور ایک بلند مرتبہ تعلیم یافتہ مسلم خاتون کا ان کے دماغ میں جو آئیڈیل ہے اس پر روشنی ڈال رہے ہیں، اور جب مولانا کو محسوس ہوتا ہے، کہ عطیہ بیگم اور ان کی بہن زہرا بیگم کو اپنی نسوانی کمزوریوں کی وجہ سے بعض مشوروں کے قبول کرنے میں عذر ہو رہا ہے تو ان کی ان زوردار الفاظ میں ہمت بندھا رہے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی بعض قومی و ملی توقعات کا مرکز یہی ہیں۔

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ مولانا عبدالحق نے ان خطوط کی اشاعت سے جو توقعات قائم کی تھیں وہ پوری نہیں ہوئیں، یعنی اس مجموعہ کے دو ایڈیشنوں کے بعد ہی ان کو لوگ بھول گئے اور اب شاید ہی بازار میں ان کا کوئی نسخہ دستیاب ہوتا ہو، حیات شبلی میں بھی ان خطوط سے بالکل تعرض نہیں کیا گیا ہے، اور شاید بعض ناقدین کے نزدیک یہ بھی اس کتاب کا ایک نقص ہے۔ بہرحال مولانا کی ساری تصانیف الفاروق، سوانح مولانا روم، الغزالی، المامون وغیرہ کے اب تک بے شمار اڈیشن نکل چکے ہیں، اور اب بھی ھل من مزید کا نعرہ بلند ہے، مکاتیب شبلی کے نام سے مولانا کے خطوط کے دو مجموعے دارالمصنفین سے شائع ہوئے تھے جو رقعات عالمگیر و خطوط غالب کی طرح بعض مدارس کے کورس میں شامل ہیں، ان کے بھی ابھی تک کئی اڈیشن نکل چکے ہیں، جن پر مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے طویل مقدمہ بہت پر معلومات مفید اور پڑھنے کے قابل ہے، یہ مقدمہ مولانا سید

سلیمان ندوی کے ادبی مضامین کے مجموعہ نقوشِ سلیمانی میں بھی جو انہی کے اہتمام میں معارف پریس اعظم گڈھ سے شائع ہوا تھا، آگیا ہے، اور اس کا سید صاحب کے بہترین مضامین میں شمار ہے،

"خطوطِ شبلی" کے متعلق مولانا سہیل کی رائے یہ تھی، کہ مولوی عبدالحق اور ان کے حواریوں کا منشاء یہ تھا کہ ان خطوط کے پردہ میں اپنے دل کا کانٹا قلم کی زبان سے نکالیں، اور اس میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوگئے، مگر عطیہ کی شہرت کے جہاں اور بہت سے اسباب ہیں، ان کی اور ان کے پورے خاندان کی شبلی کے ساتھ عقیدت بھی ہے اس معزز و محترم خاندان سے مولانا کے بڑے گہرے اور عزیزانہ تعلقات تھے۔ ان کی ہر خوشی و غم میں شریک ہوتے تھے، کئی بار مولانا جنجیرہ جاکر ان کے مہمان بھی ہوئے تھے، اور ایک آدھ بار شاید عطیہ خود بھی مولانا سے ملنے لکھنؤ آئی تھیں، یا آنے والی تھیں، مولانا کے ان خطوط کو نہ صرف عطیہ بیگم بلکہ ان کی محترم بہنیں بھی بڑی قدر و منزلت سے پڑھتی تھیں، اور ایک غیر معمولی ادبی صحیفہ سمجھکر ان کی لعل و گوہر سے بھی زیادہ حفاظت کرتی تھیں، بلکہ معلوم ہوا کہ "آئرن سیف" میں رکھتی تھیں، کہ کہیں ایسا نہ ہو، کہ یہ ادبی متاع ضائع ہو جائے،

خود عطیہ بیگم کے شوہر مسٹر رحیمن فیضی نے مولانا کی ایک تصویر بنائی تھی، اور اس میں فنِ مصوری کا پورا کمال دکھایا تھا، یہ تصویر فرانس کی کریش منعقدہ ۱۹۱۳ء کی آرٹ گیلری میں رکھنے کے لئے بھیجی گئی تھی، جہاں اس کی بے انتہا قدر کی گئی، اور نہایت معقول قیمت لگی، لیکن عطیہ بیگم صاحبہ نے جیسا کہ محمد امین صاحب زبیری نے لکھا ہے، اس کو جدا کرنا گوارا نہیں کیا، اور غالباً اب تک وہ تصویر اس خاندان میں محفوظ ہے، خطوط تو امین صاحب کی پے در پے کوششوں کے بعد شائع ہوگئے لیکن وہ تصویر اب تک منظرِ عام پر نہ آسکی،

مولانا سہیل کو اپنے استاد مولانا شبلی سے غیر معمولی عقیدت ہی نہیں عشق تھا، کسی صحبت یا مجلس میں جب ان کا نام یا ذکر آجاتا تو ان پر وجد طاری ہو جاتا، یہ تو اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ مولانا شبلی کی یاد میں کوئی تقریب ہوئی ہے، یا کوئی نظم پڑھنے یا کچھ کہنے اور بولنے کی فرمائش کی گئی ہے تو وہ فرطِ تاثر سے پوری نہیں کر سکے ہیں، دو ہی چار فقروں اور شعروں کے بعد گلوگیر ہو جاتے، سسکیاں بھرنے لگتے، اور پھر خاموش ہو جاتے، یہ ایسا منظر ہوتا کہ سارا مجمع تڑپ جاتا، اور چند منٹ کے لئے پوری فضا سوگوار ہو جاتی، مولانا شبلی کے وصال کے بعد اپنی ساری عمر میں غالباً ایک موقع پر وہ اپنے جذبات کو قابو میں رکھ سکے، اور پوری نظم سنائی، شبلی ڈگری کالج کی عمارت کے سنگِ بنیاد کا جلسہ تھا، جس کے لئے حبیبِ شبلی مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی صدر الصدور امورِ مذہبی سرکارِ عالی حیدر آباد کو دعوت دی گئی تھی، مولانا سہیل نے اپنی آنکھوں سے انھیں دیکھا تو ان کے چشمِ تصور میں مولانا شبلی کی تصویر کھنچ گئی، اور سمجھے کہ حبیبِ شبلی نہیں خود شبلی ہی اپنے کمالات و محاسن اور جمال صورت و معنی کے ساتھ مسند آرائے بزمِ علم و دانش ہیں، جیسے کہ ان کو مخاطب کرکے ارشاد فرمایا:

تو کہ معنوئیم ہستی و نہ ذاتست تو باد
تو دیگی کلکِ سہیل ارزانی

یہ قصیدہ تبریک بھی ان کے تمام قصائد فارسی کی طرح ان کی طباعی اور قدرتِ کلام کا گواہ ہے، یہ محض چست کردہ الفاظ، دلکش تراکیب اور دل آویز استعارات کا مجموعہ ہی نہیں، حقائق و معانی کا گنج گرانمایہ ہے، اور اس کا ہر شعر ممدوح کے ساتھ شاعر کے انتہائی خلوص و عقیدت کا آئینہ دار ہے، جس کو پڑھتے وقت دل و دماغ عالمِ وجد و کیف میں چلا جاتا ہے،

ایک طویل دلکش تشبیب اور تعلّی کے بعد:

ز پیکرے کہ دہم شاہدانِ معنیٰ را ہزار رہ شکند بہ رخِ مانی
مشامِ خلوتیانِ فلک شود شاداب چو من ز خامہ فشانم رحیق ریحانی
شرابِ خم کدۂ فارسی از لبم جوشد اگرچہ من نہ صفاہانیم نہ کاشانی
ز بسکہ خردۂ جان می تراود از قلم نوید زندگی نو دہم بہ فانی

اپنے ان کمالات کا انتساب شبلی سے کرتے ہیں:

زمین جرعۂ فیضانِ شبلی است کہ من قصیدۂ بنویسم براست عمانی
ز فیض تربیتش این سہیل شد است وگرنہ ناسرہ نقدم بہ ہیچ نستانی

اس کے بعد مولانا شبلی کی مدح میں جو اشعار ان کے قلم سے نکلے ہیں، وہ سننے کے قابل ہیں۔

حریف بزم کمالش ہذیل و فارابی گدائے خوانِ نوالش جریر و خاقانی
روایتے ز کتابش صحیفۂ رازی حکایتے ز خطابش کمال سحبانی
بہ نام آئینہ دار حبدل فاروقی بہ خامہ شانہ کشِ اجتہاد نعمانی
جو سیرت نبوی بہ نگاشت خامۂ او فرا گرفتہ جہان را بجلوہ سامانی

بقیہ اشعار اصل ممدوح کی مدح میں ہیں، مولانا شروانی ادیب، انشا پرداز، سخن سنج و سخن فہم تو تھے ہی، بلکہ اس حیثیت سے وہ صحیح معنی میں شبلی ثانی تھے،

لیکن "بڑے متقی پرہیزگار اور زاہد شب زندہ دار بھی تھے" مولانا سہیل فرماتے ہیں۔

بہ اتقائے تو نازد شعار اسلامی بہ اعتقاد تو خندد بہار ایمانی

مولانا شبلی کے تلامذہ و منتسبین کے وسیع حلقہ میں یوں تو سبھی طرح کے لوگ تھے، مفسر تھے، متکلم تھے، فلسفی تھے، ادیب تھے، خطیب تھے، مصنف تھے، معلم تھے، رہنما تھے، لیڈر تھے، صحافی تھے، مبلغ تھے، بلکہ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ جیسے جامع حیثیات بھی تھے، لیکن کوئی شاعر نہیں تھا، اس خلا کو مولانا اقبال سہیل نے پر کیا تھا، اور اس حیثیت سے مولانا شبلی کے علی گڑھ، ندوہ، اعظم گڈھ کے تمام تلامذہ میں کوئی بھی ان کا حریف نہیں تھا، بلکہ جہاں تک قصیدہ نویسی، منقبت نگاری اور نعت گوئی کا تعلق ہے شاگرد اپنے استاد سے نہیں بعض اساتذۂ قدیم سے بھی بڑھ گیا تھا بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اس دور میں پورے ہندوستان میں اس سے بڑا صحیح معنی میں کوئی نعت گو شاعر موجود نہیں تھا، اس کے دیوان کا بڑا حصہ نعت و منقبت ہی پر مشتمل ہے، جو اس کے کمال شاعری کا مظہر ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی مغفرت و بخشائش کا بھی ذریعہ ہے، اگر وہ کچھ اور نہ لکھتے تو بھی ان کی یہ نعتیہ و مدحیہ نظمیں ان کو بقائے دوام کی مجلس میں جگہ دینے کے لئے کافی تھیں، ان کی ایک مشہور و مقبول نظم موج کوثر ہے، جس کا قافیہ خاتم اور ردیف صلے اللہ علیہ وسلم ہے، جس میں انھوں نے اپنے کمال شاعری اور فنی قابلیت کا خوب خوب اظہار کیا ہے۔

اُن کے کمالِ شاعری اور قدرت کلام کا جو شہرہ تھا، اس سے سبھی لوگ مرعوب تھے، ان کا مقابلہ کرنا اور ان کے سامنے آنے کی مشکل ہی سے لوگوں کو جرأت ہوتی تھی، مشاعروں میں شریک ہوتے تھے، تو پورے دفعہ پہ چھا جاتے تھے، وہ

مجلس مشاعرہ بہت کامیاب سمجھی جاتی تھی، جس میں وہ بنفس نفیس شریک ہوتے تھے اور اپنا کلام سناتے تھے، ان کے بعد پھر کسی کا رنگ نہیں جمتا تھا، اور یہ کچھ مشاعروں ہی پر موقوف نہیں تھا، بلکہ جس مجلس اور جس صحبت میں بھی وہ اپنا کلام سناتے تھے سننے کے ساتھ ہی لوگ مرعوب و متاثر ہو جاتے تھے، مولانا شاہ معین الدین صاحب ایڈیٹر "معارف" ان کے متعلق ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ آج سے پندرہ سولہ برس پہلے افغانستان کے مشہور شاعر اور انجمن ادبی کابل کے سکریٹری سرور خاں گویا ہندوستان کے تمام علمی اداروں اور یونیورسٹیوں کی سیر کے لئے ہندوستان آئے تھے، انھوں نے اس سلسلہ میں اعظم گڑھ آکر دارالمصنفین کو بھی شرف بخشا تھا، سہیل صاحب ان سے ملنے کے لئے آئے، بحیثیت شاعر کے دونوں بزرگوں کا تعارف ہوا، دونوں نے ایک دوسرے سے اپنا کلام سننے کی فرمائش کی، سرور خاں گویا کے اصرار پر پہلے اقبال سہیل صاحب نے اپنا ایک قصیدہ سنایا، سرور خاں حیرت و استعجاب کے ساتھ اس کو سنتے رہے، اقبال صاحب پورا قصیدہ سنا چکے تو سرور خاں نے اٹھ کر ان کو گلے لگایا، اور مذاقاً کہا کہ اگر کبھی ہندوستان پر افغانستان کا حملہ ہوا تو میں مال غنیمت میں صرف سہیل کو لے لوں گا۔ اس کے بعد بمشکل تمام انھوں نے اپنا کلام سنایا، حالانکہ وہ بہت اونچے درجہ کے شاعر تھے، پرگو تھے، قادر الکلام تھے، اور ان کا کلام انجمن ادبی کابل کے ماہنامہ "کابل" میں برابر چھپتا بھی تھا، کافی پڑھے لکھے تھے، جرمنی کے گریجویٹ تھے، فارسی شاعری کی تاریخ اور اس کے تدریجی ارتقاء کے اچھے خاصے عالم تھے، وہ حکومت افغانستان کے سرکاری نمائندہ کی حیثیت سے ہندوستان کا دورہ کر رہے تھے، اور پھر ایسے مردم خیز خطہ سے تعلق رکھتے تھے، جس کی خاک سے فرخی، عسجدی، منوچہری، عنصری حکیم سنائی جیسے شعراء اٹھ چکے ہیں، لیکن اقبال سہیل جیسے ہندوستانی شاعر کا فی البدیہہ کلام سن کر ان پر حیرت طاری ہو گئی،

ہم ذیل میں مولانا شبلی کے اسی ذہین طباع بلکہ اپنی گوناگوں صلاحیتوں کے اعتبار سے مافوق العادۃ شاگرد کے خاندانی اور ابتدائے زندگی کے حالات پیش کر رہے ہیں، جو مختار اعظمی کے ایک مضمون سے شکریہ کے ساتھ مستفاد ہیں، یہ مضمون شبلی نیشنل کالج کے اردو میگزین "سہیل نمبر" میں ابھی ابھی شائع ہوا ہے،

مولانا سہیل کے مورث اعلیٰ کا نام حسن خان ہے جو سرحد کے ایک ضلع سوات و بنیر کے رہنے والے تھے، ان کے ایک بھائی اور تھے جن کا نام حسین خان تھا، دونوں بھائیوں میں کسی مسئلہ پر اختلاف ہو گیا، جس نے بعد میں مستقل نزاع کی صورت اختیار کر لی، بڑے بھائی حسن خاں کو چھوٹے بھائی کی گستاخی گوارا نہیں ہوئی، اور وطن کو خیرباد کہدیا، اور ایک گھوڑے پر مع زادراہ کے سوار ہو کر یکہ و تنہا ہندوستان کی طرف چل کھڑے ہوئے، چونکہ جونپور ان دنوں علم و دانش کا مرکز اور ارباب فضل و ہنر کا مسکن تھا، اور اس پر طرہ یہ کہ اس کا حکمران پٹھان تھا، اس لئے انھوں نے ادھر ہی کا رخ کیا، مگر جونپور کے حدود میں پہنچ کر اتفاق سے راستہ بھول گئے، اور جونپور کے بالکل قریب ایک جنگل میں پھنس گئے، بہت کوشش کی لیکن اس سے نکل نہ سکے، اندھیری رات، جنگل کی پرہیبت فضا، قیامت کا سناٹا، دور تک کوئی نشان ان کو دکھائی نہیں دیتا، جو ان کی رہنمائی کرتا، اور ان کو منزل مقصود پر پہنچا دیتا، لیکن اس بے بسی میں ذرا بھی خوف محسوس نہیں ہوا،

ایک پناہ گاہ کی تلاش و جستجو میں یہ مسافر ادھر ادھر بھٹک ہی رہا تھا کہ اتفاق سے ایک آدمی دکھائی دیا، معلوم ہوا کہ لکڑہارا ہے، دن بھر لکڑیاں چنتا ہے اور شام کو ایک گڑھے میں سو رہتا ہے، اس سے پناہ کے خواستگار ہوئے، تو اس نے کہا یہ بہت خطرناک جگہ ہے، رات کو شیر آتا ہے، اگر کسی زندہ جانور کو پا جاتا ہے، تو اس پر حملہ کر کے اس کا کام تمام کر دیتا ہے، آپ تنہا ہوتے تو کوئی بات نہ تھی، میرے ساتھ آپ بھی اس غار میں شب باش ہو جاتے، مشکل یہ ہے، کہ آپ کے ساتھ آپ کا

ایک موضع تو وہ بھی خرید لیا اور ان کے صاحبزادے امانت اللہ خاں ایک انگریز تاجر نیل کے گودام کے منیجر ہو گئے، بعد میں خود انھوں نے تجارت شروع کر دی، باپ بیٹے نے مل کر اس طرح سے ایک اچھی خاصی جائداد پیدا کر لی، اور ان کا شمار گاؤں اور آس پاس کے علاقوں کے بڑے آدمیوں میں ہونے لگا۔

جناب سہیل اسی خانوادہ سیادت و امارت کے چشم و چراغ ہیں جو جرأت و بے باکی کے ساتھ علم و کمال سے بھی بہرہ ور تھا، سہیل کے والد عزیز اللہ خاں کے متعلق تو تحقیق سے معلوم نہیں کہ ان کی تعلیم کہاں تک ہوئی تھی، اور اس وقت کی کس درسگاہ میں تعلیم پائی تھی، کن کن لوگوں کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا تھا، لیکن وہ فارسی جو اس زمانہ کی تعلیمی اور سرکاری زبان تھی، نہایت ستھرا ذوق رکھتے تھے، اور اس میں بے تکلف بولتے اور لکھتے تھے، مولانا سہیل کا فارسی ذوق جس پر ایران و کابل کے ادبا و شعرا بھی رشک کرتے تھے، اور ان کی فارسی دانی کا لوہا مانتے تھے، درحقیقت اسی ابتدائی ماحول کا نتیجہ تھا جس نے بعد میں اُن کو ہندوستان میں فارسی کا سب سے بڑا شاعر بنا دیا۔

اُن کی اردو شاعری کے متعلق تو دو رائیں ہو سکتی ہیں، لیکن فارسی شاعری میں علامہ اقبال کو چھوڑ کر پورے ہندوستان میں ان کا کوئی ہمسر نہیں تھا، وہ اس طرح اس میں شاعری کرتے تھے کہ اردو کی طرح فارسی زبان بھی ان کی گویا خانہ زاد ہے، افسوس ہے کہ فارسی کلام کا بڑا حصہ ان کی شان بے نیازی اور دست برد زمانہ سے ضائع ہو گیا، جس سے ان کے کمال شاعری کا اندازہ ہوتا، لیکن جو کچھ باقی رہ گیا ہے، وہ فارسی زبان میں ان کی بے پناہ قدرت پر شاہد عادل ہے، جس کو آگے چل کر ہم تفصیل سے لکھیں گے۔

ولادت و تعلیم و تربیت

سہیل [illegible] میں اواخر ربیع الآخر کو اپنے پردادا امین خاں کی سسرال بڑھریا میں پیدا ہوئے، یہ جب بڑے ہوئے تو والدین کو ان کی تعلیم کی فکر ہوئی، اس زمانہ میں دستور تھا کہ جو لوگ صاحب حیثیت اور خوشحال ہوتے تھے، اپنے بچوں کو کسی مدرسہ میں بھیجنے یا کسی ملاّ کے سپرد کرنے کے بجائے گھر پر ملازم رکھ کے پڑھواتے تھے، سہیل کے دادا اور والد کی خواہش تھی کہ ان کی تعلیم کے لئے ایسے آدمی کو تلاش کیا جائے، جو عربی جاننے کے ساتھ قرآن اچھا پڑھ سکتا ہو،

چنانچہ اس کے لئے قریب کے ایک موضع سیدی سلطان پور کے ایک عالم باعمل مولانا محمد شفیع مرحوم کی خدمات حاصل کی گئیں، یہ غیر معمولی علمی صلاحیتوں کے آدمی تھے، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر جس کے آوازہ شہرت سے آج سارا ہندوستان گونج رہا ہے، اور جس کے بعض فضلا کو علم و ادب اور صحافت میں آج ایک ممتاز مقام حاصل ہے، اس کے بانی اور محرک یہی بزرگ تھے، سہیل مرحوم نے سب سے پہلے انہی کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا، انھوں نے عام طریقہ کے خلاف ناظرہ کی منزل سے ان کو قرآن پڑھانا شروع کیا، اسی کے ساتھ فارسی کی ابتدائی تعلیم کا بھی آغاز ہوا،

والد کی سخت تاکید تھی کہ ابھی سے فارسی میں لکھنے اور بولنے کی مشق بہم پہنچاؤ، چنانچہ روزانہ کا دستور تھا کہ سہیل مرحوم فارسی میں خطوط لکھتے، اور بغرض اصلاح اپنے والد کو دکھاتے ان پر جو اصلاحیں ہوتی تھیں، ان کو وہ پھر غور سے پڑھتے اور یاد کرتے تھے، بعض وقت یہ اصلاحیں مستقل مضامین کی صورت اختیار کر لیتی تھیں، اور جنھیں ان کو حفظ کرنا پڑتا تھا، اس طرح سے ان کا فارسی ذوق بڑھتا ہی گیا، ابھی بارہ برس ہی کے تھے کہ وہ نہ صرف بے تکلف فارسی میں لکھنے اور بولنے لگے، بلکہ شعر بھی کہنے لگے، اس زمانہ کا ایک شعر یہ ہے، ؎ عندلیب گلشن فردوس ہستم حامدا

تیرخوانی نی کار است طوطی جانے من

ابتدائی تعلیم ختم کرنے کے بعد سہیل نے عربی کی طرف توجہ کی ان کے حقیقی نانا شیخ عبدالرحیم صاحب اعظم گڈھ میں ایک وکیل کے ور تھے، وہ انہی کے پاس اعظم گڈھ چلے آئے یہاں ان کو خوبی قسمت سے مولانا شبلی کی شاگردی کی سعادت حاصل ہوگئی انھوں نے مولانا سے ادب دیوان حماسہ، عقد الفرید، اور فلسفہ میں شرح سلم اور بحر العلوم وغیرہ کتابیں پڑھیں، درس کے علاوہ بھی وہ مولانا شبلی کی خدمت میں برابر حاضر رہتے، جہاں شعر وشاعری کا اکثر ذکر رہتا، اور فارسی کے شعراء کے کلام پر نقد وتبصرہ ہوتا، جس کو سہیل بہت غور سے سنتے اور جو اشعار ان کو پسند آجاتے، انھیں یاد کر لیتے، اس طرح سے مولانا شبلی رفتہ رفتہ شاگرد کی ذہانت، ذکاوت، دماغی اور غیر معمولی صلاحیتوں کے قائل ہوگئے، اور ان کو بہت زیادہ ماننے لگے۔

مولانا شبلی تک، اپنے تعلیم وتعلم کی دلچسپ روداد انھوں نے نہایت اجمال کے ساتھ اپنے شاگرد خاص جناب یحیٰی اعظمی کے مجموعۂ کلام نوائے حیات کے تعارف نامہ میں ایک موقع پر خود اپنے قلم سے بھی لکھی ہے، فرماتے ہیں کہ :-

"درس سے خارج اوقات میں بھی حاضر خدمت رہتا، بزم شبلی میں ادبیات فارسی اور نقد سخن کا جو تذکرہ ہوتا، یا فارسی شاعری کے متعلق جو مذاکرے ہوتے ان کو خاص توجہ سے سنتا، حافظہ موہبت ایزدی سے اچھا ملا تھا اس لئے ان صحبتوں میں اساتذہ کے جو اشعار پڑھے جاتے، یا جو تنقیدی نکتے مولانا ارشاد فرماتے وہ میرے حافظہ پر نقش ہو جاتے، اس طرح سے اس آب حیات کا ہر جرعہ میری تشنگی اور بڑھا دیتا، اور اس آرزو میں کہ شاید مولانا کی زبان سے کوئی بلند و پرکیف شعر یا حکیمانہ نکتۂ ادب سننے کو مل جائے اسا اوقات ہی بزم شرف میں گزار دیتا۔

رشح کف بحر می چکد از منقالم
سیرابی نطقم از فیض حکیم است

اس زمانہ میں سہیل مرحوم کے ماموں نے جوان پر بید شفیق اور مہربان تھے، عین عالم شباب میں انتقال کیا، سہیل کی زندگی کا پہلا حادثہ تھا، اس لئے اس سے بہت زیادہ متاثر ہوئے، اسی عالم حزن وغم میں سوز غم نے ناموزوں کی صورت اختیار کر لی، اور ماموں کا ایک لمبا مرثیہ لکھ ڈالا ٹھیک اس بحر وقافیہ میں، جس میں ان کے استاد مولانا شبلی نے اپنے والد مرحوم کا مرثیہ لکھا تھا، بعض احباب کی وساطت سے یہ مرثیہ بزرگوں کی بزم قدس تک پہنچا، اور ایک طفل چہاردہ سالہ کے قلم سے اس طرح کی فارسی نظم غیر متوقع سمجھی گئی۔ اور صدائے تحسین و مرحبا سے ساری فضا معمور ہوگئی، اس زمانہ میں لکھنؤ کے ایک بزرگ قدرت علی خان مرحوم اعظم گڈھ سے بیرل نام کا ایک ہفتہ وار اخبار نکالتے تھے، انھوں نے سہیل کے اس مرثیہ کو اپنے اخبار میں شائع کر دیا، جس کو پڑھکر مولانا شبلی کو سخت حیرت اور اسی کے ساتھ غیر معمولی مسرت ہوئی، اور مولانا نے ان کو بلایا اور اس مرثیہ کی حد سے زیادہ داد دی، فرمایا کہ تمہارے ان اشعار پر مجھکو خود اپنے کلام کا دھوکہ ہو رہا تھا، آخر یہ رنگ سخن کب اور کیسے حاصل کیا، مولانا جیسے امام فن کی زبان سے ان چند کلمات تحسین کا نکلنا تھا کہ دفعتہً وہ اعظم گڈھ کے پورے علمی وادبی حلقہ کا مرکز توجہ بن گئے، اور اس وقت کے بڑے بڑے شعراء ان سے مشورہ سخن کرنے اور اپنے کلام پر اصلاح لینے لگے،

سہیل کی یہ خوش نصیبی قابل رشک ہے، کہ ان کو اپنی طالب علمی کے بالکل ابتدائی دور میں مولانا شبلی

سلطان پوری جیسے مؤرخ عالم، اور مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین جیسے اساتذہ فن کی صحبت نصیب ہوئی۔

وطن سے فراغت تعلیم کے بعد وہ انگریزی تعلیم کے حصول کے لئے علی گڑھ کالج میں داخل ہوگئے، جہاں مولانا حمید الدین کے ساتھ ان کے زمانہ پروفیسری (سنہ ۱۹۰۷ء، سنہ ۱۹۰۸ء) میں رہ چکے تھے، اور عربی کی بعض اہم کتابیں مثلاً سبعہ معلقہ وغیرہ اسی زمانہ میں مولانا حمید الدین سے پڑھی تھیں، مولانا حمید الدین کو ان کی عربی دانی اور عربی کے ذوق پر اتنا اعتماد ہوگیا تھا، کہ ایک مرتبہ مصر کے جدید مطبوعات کی فہرست آئی تو انھوں نے انہیں سے فرمائش کی، کہ اس میں سے ایک ہزار روپیہ تک کی کتابیں اپنے ذوق سے منتخب کرو، چنانچہ انھوں نے اس کی تعمیل کی۔ اور جب انھوں نے اپنا انتخاب مولانا کے سامنے پیش کیا تو وہ اس کو دیکھکر بہت مسرور ہوئے،

اس طرح کے اور بہت سے واقعات تھے، جن کی وجہ سے سہیل کی علمی و ادبی عظمت کا سکہ سارے کالج پر بیٹھ گیا، خطابت ہو یا شاعری، ادبی تنقید ہو یا فلسفیانہ مباحث، سہیل مرحوم سب میں نمایاں تھے، اسی زمانہ میں مولانا حسرت موہانی علیگڈھ سے اردوئے معلی نکالتے تھے، اور اپنی آزادی پسندی اور بے باکی کی وجہ سے علیگڈھ کے تعلیمی حلقوں میں زیادہ مقبول نہیں تھے، انھوں نے اپنے اس اخبار کا ایک خاص نمبر نکالا، جس میں مصر میں برطانیہ کی عیارانہ سیاست پر مولانا سہیل نے بھی ایک مضمون لکھا، یہ بالکل ممکن تھا، کہ اگر ارباب کالج کو اس کا پتہ چل جاتا، تو اس اعلان حق کی پاداش میں وہ کالج سے نکال دئے جاتے، یا قید کردیئے جاتے، اس لئے مولانا حسرت نے ان کا نام نہیں ظاہر کیا، مضمون شائع ہوا تو حکومت تلملا اٹھی، اور مولانا حسرت موہانی گرفتار کرلئے گئے، اور اردوئے معلی بند ہوگیا، لیکن انھوں نے آخر آخر تک اس کا اظہار نہیں کیا، کہ یہ مضمون ان کا نہیں، کالج کے ایک ہونہار طالب علم اقبال سہیل کے قلم کا ہے، مولانا حسرت موہانی کا یہ مشہور شعر اسی زمانۂ اسارت کا نتیجہ فکر ہے،

ہے مشق سخن جاری ، چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی،

ان کی علیگڈھ کی طالب العلمی کے زمانہ کا یہ واقعہ بھی سننے کے قابل ہے، یونین میں سنہ ۱۹۱۸ء میں امام السنہ عربی پر لاہوری قادیانی جماعت کے مشہور مبلغ خواجہ کمال الدین کی اردو میں تقریر تھی، خواجہ صاحب نے کم و بیش دو گھنٹے تقریر کی، حاضرین پر ایک حیرت کا عالم طاری تھا، اتنے میں یونین کے وائس پریسیڈنٹ نے ڈائس پر کھڑے ہوکر اعلان کیا، کہ مولانا سہیل فاضل مقرر کا شکریہ ادا کریں گے، حالانکہ اقبال سہیل آنکھوں کی تکلیف میں مبتلا تھے، اور دوستوں کے اصرار سے اسپتال سے اٹھکر جلسے میں آگئے تھے، آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی، دوستوں اور ساتھیوں نے اسی عالم میں ان کو لیجا کر منبر تقریر پر کھڑا کردیا، مولانا کی عبقریت ہمیشہ ان ہی مواقع کی تلاش میں رہتی تھی، انھوں نے اس موضوع پر برجستہ تقریر جو شروع کی، تو سارا مجمع ہمہ تن گوش ہوگیا، تقریر اتنی دل نشین، اتنی شگفتہ اور اتنی پر از معلومات اور ہمہ گیر تھی، کہ خواجہ صاحب بے اختیار بغل گیر ہوگئے، اور فرمایا کہ "تمہارے ایسا جامع کمالات کام کرنے والا مجھے مل جائے، تو میں اسلام کا جھنڈا یورپ کی سب سے بلند چوٹی پر نصب کردوں گا"

مولانا سہیل کی برجستہ تقریر تو قلمبند نہ کی جا سکی، لیکن خواجہ صاحب کی یہی تقریر بعد میں ام الالسنہ کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئی، اور اپنے موضوع پر وقت کی بہترین کتاب سمجھی جاتی ہے،

علیگڑھ میں جب کوئی تقریب ہوتی تھی، یا کوئی معزز مہمان آتا تھا تو اقبال صاحب سے نظم کی فرمائش کی جاتی، اور وہ طوعاً و رضاً یا بجبر و اکراہ اس کی تعمیل منظور کرتے تھے، علیگڑھ کے دور کی اکثر نظمیں اور قصائد اسی طرح کے ہیں اور تقریباً سب فارسی میں ہیں، جو اس قدر رنگین، پرکیف اور رواں ہیں، کہ ان پر قاآنی کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے، بلکہ بعض قصائد قاآنی سے بھی بڑھ گئے ہیں۔ علیگڑھ میں یونین کی صدارت ایک معزز ترین عہدہ ہے، اور جو اس پر فائز ہوتا ہے، وہ بہت خوش قسمت سمجھا جاتا ہے۔ اس کا حصول کرنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں ہے، اس پر اب تک جو لوگ فائز ہو چکے ہیں، وہ اپنے اپنے دور میں علمی و تعلیمی ذہنی و دماغی حیثیت سے تمام طلبہ میں بہت ممتاز رہے ہیں، سہیل کی طالب علمی کے زمانہ میں بھی متعدد بزرگوں کو یہ سعادت حاصل ہوئی تھی، جن میں سے دو کی کامیابی پر انھوں نے بہت پُر زور بہاریہ قصیدے لکھے ہیں، ان میں سے ایک سردار محمد اورنگ زیب خاں سرحدی تھے، جو بعد میں متحدہ ہندوستان میں صوبہ سرحد کے وزیر اعظم تھے، اور مسلم لیگ کی ہمہ گیر تحریک کے زمانہ میں، اس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر اور مسلم لیگ کے [illegible] لیڈروں میں ان کا شمار تھا، سہیل صاحب کے مخلص دوستوں میں تھے۔ وہ جب یونین کی صدارت پر فائز ہوئے، تو ان کی شان میں ایک ولولہ انگیز بہاریہ قصیدہ لکھا، جس کا پہلا شعر یہ ہے:

سنو دگر بہ نوروزی چمن دامن کشاں آمد　　　　که گل با فرِ فیروزی بصحن بوستاں آمد

یہ بہت لمبا قصیدہ ہے، اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے میگزین کے سہیل نمبر میں آ گیا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کو جناب سہیل سے بہت اخلاص تھا، اور ان کی شاعری اور خطابت کا طالب علم کے زمانہ میں جو نقش ڈاکٹر صاحب کے دل پر جم گیا تھا، وہ آخر تک باقی رہا، اس کا اندازہ ان کے ان تاثرات سے ہو سکتا ہے، جو انھوں نے محمڈن اینگلو کالج کے میگزین کے سہیل نمبر کو لکھ کر بھیجا تھا، اور جو اس کے شروع میں درج بھی ہے، لکھا ہے، کہ شعر و سخن سے قطع نظر ان جیسا ذہین و طبّاع شخص اب تک کہیں دیکھنے میں نہیں آیا، بلا مبالغہ کہہ سکتا ہوں، کہ طالب علمی کے زمانہ میں جن شخصیتوں نے مجھ پر سب سے زیادہ اثر کیا۔ ان میں سہیل کسی سے پیچھے نہیں، ان کی شاعری، ان کی خطابت، ان کی طباعی و ذہانت کے نقش کتنے ہی گہرے سہی مگر ایک نقش ان سب سے زیادہ گہرا دل پر دکھائی دیتا ہے، وہ ان کی بے پایاں محبت و شفقت و کرم گستری کا نقش ہے، جو کبھی مٹ نہیں سکتا۔ محبت یوں بھی حاصل ہو جاتی ہے اس کے لئے استحقاق کوئی ضروری چیز نہیں، لیکن مجھے ان کی محبت بے استحقاق حاصل ہے، اور میں اس پر فخر کرتا ہوں۔ یہ بزرگ ان کی طالب علمی کے زمانہ میں یونین کی مسندِ صدارت پر اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے فائز ہوئے، تو سہیل کو اپنے ان مخلص دوست کی متوقع اور شاندار کامیابی پر جو مسرت ہوئی۔ اس کا اظہار انھوں نے ایک پرجوش ترکیب بند بہاریہ قصیدہ کی صورت میں کیا، جو اپنے لفظ و معنی کے اعتبار سے فارسی زبان کے بہترین قصائد میں شمار کیا جا سکتا ہے، اس کے بعض اشعار سے آپ بھی لطف اندوز ہوں۔

دلا گر میل جاں بینی بہ ہر سو گلستاں بینی　　　　عزادہ حیراں بینی شفیق لالہ رواں بینی
چہ می جوئی ز جام جم ز راز خود نہ محرم　　　　دل خود بیں کہ صد عالم بہ ہر دانش نہاں بینی

بہ گلبرگ مشوخستم کہ برتابیز عنم کہ ہمچو قطرۂ شبنم شعاعش نزد برمی تنگ

جی چاہتا ہے کہ پورا ترکیب بند یہاں نقل کر دیا جائے لیکن بخوف طوالت قلم انداز کیا جاتا ہے۔ یہ قصیدہ بھی سہیل نمبر میں آ گیا ہے۔ معلوم ہوتا کسی ہندوستان نژاد کا نہیں، کسی باکمال ایرانی شاعر کا کلام ہے، جس کو فارسی زبان پہنچی ہی نہیں اس کی نظم و نثر نے تمام اسالیب پر غیر معمولی قدرت حاصل کی ہے۔

مولانا سہیل کی شروع طالب علمی کا زمانہ تھا کہ میر عثمان علی خان آصف جاہ سابع کا ورود مدرستہ العلوم علی گڈھ میں ہوا۔ شاعر تو یقیناً اور بھی وہاں رہے ہوں گے، اسٹاف میں بھی اور طلبہ میں بھی اور علیگڈھ میں بھی، لیکن خیر مقدم کی نظم کی فرمائش انہی سے ہوئی اور انھوں نے ۵۷ شعروں کا ایک فی البدیہہ قصیدہ کہہ کر پیش کر دیا جس کا قافیہ "مدار" اور ردیف "مگذار" ہے۔ جو اس قدر دلاویز ہے کہ بار بار پڑھنے سے بھی کسی طرح ذوق آسودہ نہیں ہوتا، اور جی چاہتا ہے کہ بار بار کوئی مغنی یہ نغمۂ الہام سنتے رہیں۔ اس کی تشبیب ۲۴ شعروں تک چلی گئی ہے اور اتنی زوردار ہے کہ شاعری ساحری معلوم ہوتی ہے، اس کے بعد گریز ہے، اور اس شان کا ہے کہ بس دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے، فرماتے ہیں:

کہ اگر حضرو خاور زمطلع چسرخ برزد سر | تو پنداری ضیا گستر لوائے شہریار آمد
شہ فرخ شیم عثمان علی خاں آنکہ طلعت را | زحشم زخم دوراں دور و نامِ او حصار آمد
نظام الملک آصف جاہ سابع رستم دوراں | رشک انجم قدم کیواں علم گردون وقار آمد

ایک جگہ لکھتے ہیں۔

دل از لطف تو آبادان ہمہ از مقدمت شاداں | سہیل خستہ و ناداں بدحست نکتہ بار آمد
اگر مشتاق، اگر مہدی، اگر شبلی دگر حالی | ہمہ از خوانِ نعمت زلہ بند و جرعہ خوار آمد

آخری شعر ہے،

یہ مدح ناصرالدین شہ حبیب ار گشتہ قاآنی | سہیل از آصفی گردد بنا بہت سازگار آمد

لیکن جناب سہیل بہت خود دار و غیور واقع ہوئے تھے، انھوں نے شاعر بننے کی تمنا تو ضرور کی لیکن کسی دربار سے منسلک ہونا سہی تھا انھوں نے پسند نہیں کیا، اگر وہ اس کی تمنا کرتے، تو ان کا کمال شاعری، دربار آصفی تک ان کو ضرور پہنچا دیتا، جس طرح مشتاق، مہدی اور شبلی کو دربار آصفی سے وابستگی کی بنا پر فروغ ہوا، ان کے فکر و فن کو بھی یقیناً نظام حیدرآباد کی سرپرستی میں فروغ حاصل ہوتا، جلیل، جوش اور امجد کی طرح ان کے آوازۂ شہرت سے بھی ہندوستان گونجتا جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے، اگر وہ شاعری کی طرف پوری توجہ فرماتے تو عرفی اور فیضی کی جگہ خالی نہ ہوتی۔

مولانا سہیل کی طالب علمی کا زمانہ تھا کہ مسز سروجنی نائیڈو اپنی عمر میں پہلی مرتبہ علیگڈھ کالج میں تشریف لائیں۔ آغا حیدر حسن دہلوی نے بیگماتی زبان میں بیگم نائیڈو پر ایک مضمون لکھا جو اپنی بعض خوبیوں کے اعتبار سے اردو ادب میں بے نظیر ہے، اور نظم مولانا سہیل نے لکھی، اور جلسہ میں جس وقت انھوں نے اپنے خاص لہجہ و ترنم میں سنائی، تو نظم کی بیت بیت پر شور تحسین و آفریں بلند ہوا، اور وجد کا عالم طاری ہو گیا، چند شعر ہیں آپ بھی سن لیں،

شب چو مہر خاوری بر روئے خود نقاب زد | زمانہ تاج سروری بہ فرق ماہتاب زد
شب از نشاط خرمی، بجستہ عہد رخصت ماتمی | زمانہ فال بے غمی، بہ عیش کامیاب زد

یکے خود بسنگ زد، رحیق لالہ رنگ زد — یکے بچنگ چنگ زد، یکے دم از رباب زد
یکے چو لالہ جام زد، یکے چو سرو گام زد — طرب صلائے عام زد کہ فتنہ سر بخواب زد
یکے بچنگ دامنوں، و سیر باغ شد بروں — یکے بخانہ اندروں، بہ باب زن کباب زد
یکے چو سرو بوستاں، بصحن باغ شد چماں — یکے بیاد دوستاں پیالۂ شراب زد

کنوں بچشم روشنی چو جلوہ زد سروجنی
فلک بہ بزم سوسنی، بساط ماہتاب زد

آخری شعر کی صحیح داد وہی دے سکتا ہے جو اس جلسہ میں شریک رہا ہو، جس کو بلبل ہند کی تقریر سننے کا موقع ملا ہو، واقعہ یہ ہے جیسا کہ ان کے ہم عصر شاعر مرزا احسان احمد صاحب بیان کرتے ہیں کہ تقریر کے وقت یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی رباب رنگین کے پردے مشتعل ہو گئے ہیں، اور سامعہ نشاط انگیز موجوں میں ڈوب گیا ہے، جب بھی آپ یہ نظم سنیں گے تو اس وقت کا پورا سماں آنکھوں کے سامنے کھنچ جائے گا، اور آپ کا سامعہ وجد میں آجائے گا۔

مسز سروجنی نائیڈو کی علیگڈھ میں آمد اور اقبال سہیل کا ان کی شان میں وہ دلآویز قصیدہ علیگڈھ کا ایک تاریخی واقعہ ہے،
اقبال صرف شاعر ہی نہیں تھے، بہت اچھا پڑھتے بھی تھے، جب وہ کسی جلسہ یا مشاعرہ میں اپنی نظم یا غزل سنانے کے لئے اسٹیج پر آتے تھے تو مجمع دفعتہً سنجیدہ ہو جاتا تھا، اور اس کی پوری قوت سامعہ ان کے نغموں کو سننے کے لئے متوجہ ہو جاتی تھی، پڑھنے کا یہ طرز و انداز بھی انھوں نے اپنے استاد مولانا شبلی سے سیکھا تھا، ان کے سامنے مشکل ہی سے کوئی جم سکتا تھا،

اقبال سہیل شروع میں زیادہ تر فارسی ہی میں طبع آزمائی کرتے تھے، اگر ان کا فارسی کا سارا کلام محفوظ ہوتا، تو فارسی کا اچھا خاصہ دیوان ہو جاتا، لیکن ان کی عجیب عادت تھی کہ انہوں نے فارسی تو فارسی اردو کلام تک کو محفوظ نہیں رکھا، اور ان کی طالب علمی کے دور کا اکثر کلام یقیناً ضائع ہو گیا، جس کی بازیابی کی کوئی اُمید نہیں کی جا سکتی، ان کا فارسی کلام جو تھوڑا بہت نیاز احمد صاحب صدیقی کی تلاش و جستجو اور کد و کاوش سے مل سکا ہے۔ وہ محمد حسن انٹر کالج کے شائع کردہ دیوان سہیل میں تذکار فارسی کے عنوان سے آخر میں اکٹھا کر دیا گیا ہے، جو چند قصائد اور ایک آدھ نظم اور متفرق اشعار پر مشتمل ہے لیکن انہی اوراق کو پڑھ کر آپ بے اختیار یہ کہہ اٹھیں گے کہ کسی ہندی نژاد کا کلام نہیں، کسی ایرانی کا ہے:

ان کے زمانۂ طالب علمی میں کالج میں غالب و ذوق کا موازنہ بھی بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی کے بہت مقبول ادبی ورزش تھی، ایک صحبت میں، جہاں ذوق کے پرستاروں کی تعداد زیادہ تھی، مولانا سہیل بھی گشت کرتے ہوئے پہنچ گئے، مولانا کی رائے طلب کی گئی، تو خاموش رہے، لیکن ایک صاحب نے ذرا فاتحانہ انداز سے ذوق کا یہ شعر پڑھا،

سر بوقت ذبح اپنا اس کے زیر پائے ہے
یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

تو مولانا چونک پڑے اور شعر کا مصرعہ دہرایا اور آہستہ سے "لاحول ولا قوۃ" کہہ دیا، یہ سننا تھا کہ ذوق کے سارے طرفدار ہوا خواہ خفیف اور خجل ہو کر اٹھ گئے۔

اس کے بعد علیگڈھ کالج سے عبدالرحمن بجنوری پیدا ہوئے جن کا مقدمہ دیوان غالب اردو ادب کا شاہکار ہے، انھوں نے لکھا کہ ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، ایک وید مقدس اور دوسری دیوان غالب، تو غالب کے طرفدار

معترضوں اور ناقدوں کے لبوں پر مہر سکوت لگ گئی، اس کے بعد سے جو غالب پر کتابیں اور ان کے منتخب دیوان کی شرحیں لکھی جانے لگیں، تو اس کا سلسلہ ختم ہی ہونے کو نہیں آرہا ہے۔ اور نہ مولانا حالی کی یادگار غالب کے بعد بہت عرصہ تک کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ غالب کے کمالات شاعری کے اجاگر کرنے میں مولانا حالی کے بعد، جہاں عبدالرحمٰن بجنوری اور دوسرے بزرگوں کے زبان و قلم کا دخل رہا ہے، مولانا سہیل کا بھی ہے، جس سے کوئی انصاف پسند انکار نہیں کرسکتا، لیکن بدقسمتی سے ان کو وہ شہرت حاصل نہ ہوسکی، جو دیوان غالب کے دوسرے شارحوں اور سوانح نگاروں کو حاصل ہوئی۔ انھوں نے ایک مرتبہ دیوان غالب کی شرح لکھنے کا بھی ارادہ کیا تھا، جو اگر عمل میں آجاتا تو غالب کے پرستاروں کے ہاتھ میں آج ایک اور بھی شرح ہوتی، جو کسی طرح حسرت اور طباطبائی کی شرحوں سے کم نہ ہوتی۔

مولانا عبدالسلام ندوی نے اپنی مشہور کتاب شعرالہند میں کہیں ایک نکتہ دان ادیب کا قول نقل کیا ہے کہ میر و سودا، ذوق و غالب، آتش و ناسخ، انشا و مصحفی، داغ و امیر، انیس و دبیر میں ایک فطری شاعر تھا اور ایک غیر فطری، وہ سودا کے علاوہ ذوق، ناسخ، مصحفی اور دبیر کو غیر فطری شاعر سمجھتے تھے۔ علامہ سہیل کی اور شعرا کے متعلق تو رائے معلوم نہیں ہے لیکن وہ ذوق کو غالب کے مقابلہ میں لانا غالب کی توہین سمجھتے تھے، اور غالب کو سعدی و عرفی کے پایہ کا شاعر جانتے تھے۔ خواجہ میر احمد انصاری پانی پتی کوئی بزرگ تھے، جو ذوق کے بڑے قدردان اور پرستار تھے، ایک مجلس میں ان کے ہاتھ میں، مولانا محمد حسین آزاد کا مرتبہ دیوان ذوق دیکھ، تو بے اختیار ان کی زبان سے یہ فقرہ نکل گیا، کہ "آزاد نے انتخاب اچھا نہیں کیا۔" جس کا انھوں نے بہت برا مانا اور کہا کہ آپ کو اس کے کہنے کا حق حاصل نہیں ہے، میں ابھی ذوق کی ایک غزل پڑھتا ہوں، آپ اس کا جواب لکھدیں تو جانوں، سہیل آمادہ ہوگئے، خواجہ صاحب نے (ذ) ایک غزل پیش کی جس کا مطلع یہ ہے۔

ابھی کس بے گنہ کو مارا سمجھ کے قاتل نے کشتنی ہے
کہ آج کوچہ میں اس کے شور بای ذنب قتلتنی ہے

کتنی لمبی بحر ہے، اور کتنا مشکل قافیہ ہے، لیکن انھوں نے اس کا جواب لکھ دیا۔ پہلا شعر یہ ہے۔

حریم دل میں وہ حسن مطلق جو بے سر جلوہ افگنی ہے
تو محرمان وصال کے لب پہ عقدہ ما دعہ تنی ہے

اب اس کا فیصلہ کرنا کہ ذوق کی غزل بہتر ہے یا سہیل کی، یہ ارباب فن کا کام ہے، لیکن سہیل کو اپنی رائے میں جہاں اتنا غلو تھا، انصاف بھی اتنا فرمایا۔ اگر غالب ذوق کی یہ غزل پڑھتا جس کا ایک شعر یہ ہے

وقت پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

تو میں قیامت تک اس کا جواب نہیں لکھ سکتا تھا۔

اردو ادب میں غالب و ذوق کے سہروں کی بڑی شہرت ہے، اور عام طور سے لوگ ذوق ہی کے سہرے کو ترجیح دیتے ہیں لیکن مولانا سہیل علانیہ غالب کے سہرے کی ترجیح کے قائل تھے، اور بجو دو بانی کے مجموعہ مضامین "گنجینہ تحقیق" کے تبصرہ میں ایک موقع پر ان سہروں پر انھوں نے جو محاکمہ کیا ہے، اور غالب کے سہرے کے جو وجوہ ترجیح پیش کئے ہیں، وہ پڑھنے کے قابل ہیں، انھوں نے لکھا ہے کہ اول تو ذوق نے شروع سے آخر تک غالب کی نقالی کی ہے۔ دوسرے جہاں کہیں انھوں نے اجتہاد

سے کام لیا ہے اور کوئی نئی بات کہی ہے اوس میں بھی شدید قسم کے معائب شعری پیدا ہوگئے ہیں مثلاً یہ شعر

رونمائی میں تجھے دے یہ خورشید فلک
کھول دے منہ کو جو تو منہ سے اٹھا کر سہرا

کہتے ہیں کہ اولاً تو دولہا کو رونمائی نہیں سلامی دی جاتی ہے، ثانیاً منہ سے سہرا اٹھانے کے بعد ظاہر ہے کہ منہ ہی کھلتا، پھر بیکار منہ کی تکرار کیا، اگر یہ بات بھی ذہن میں ہو تو پھر اس شعر کی مضحکہ انگیزی کا کیا کہنا۔

اسی طرح بڑی تفصیل کے ساتھ ان سہروں پر محاکمہ کیا ہے، اور تنقید کی داد دی ہے!

علی گڑھ کے زمانۂ قیام میں جہاں ان کے اور بہت سے مشاغل تھے جن میں ان کا وقت صرف ہوتا تھا، اور ان کا جوہر کھلتا تھا اُن میں یونین کا الیکشن بھی تھا، اسی الیکشن ہی کے سلسلہ میں علیگڑھ کے مشہور صاحب طرز ادیب جناب رشید احمد صدیقی اور ان میں راہ و رسم پیدا ہوئی جس نے بعد میں محبت اور پھر عقیدت کی صورت اختیار کرلی، ان کے الیکشن سے دلچسپی کی تفصیل خود رشید صاحب کی زبانی سنیئے،

الیکشن کے لئے جد و جہد اور دوڑ دھوپ شروع ہوگئی تھی، اور فریقین میں مقابلہ و مسابقت کا جذبہ خطرناک حد تک بڑھ گیا تھا، ہر طرف اسی کا چرچا، مسجد ڈائننگ ہال، یونین، کلاس روم ہر جگہ اسی کا شور اور ہر شخص اسی آشوب میں مبتلا تھا، مولانا بسمل اس زمانہ میں کچی بارک ہی میں مقیم تھے، کچی ویکی بارکوں کی جھنک وہاں کی تاریخی چیز ہے، الیکشن کے زمانہ میں اس میں اور زیادہ شدت پیدا ہو جاتی ہے، ایک فریق کے ایجنٹ رشید صاحب کے کمرے میں بھی کو سنگ کے لئے آگئے، مولانا کو کسی طرح اس کی خبر ہوگئی وہ اس مغتنم موقع کو کہاں ضائع کر سکتے تھے، فوراً ہی قاآنی کا ایک شعر گنگناتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے، لیکن یہاں جگہ بھر چکی تھی، اور فریق مخالف کے ایجنٹ اپنے امیدوار سے کہیں زیادہ رشید صاحب کی قابلیت کا خطبہ پڑھنے میں مصروف تھے۔ کچی بارک کے غسل خانے بھی اسی حیثیت کے تھے، یہ غسل خانہ رشید صاحب کے تصرف میں تھا، اس کی آبادی صرف ایک گھڑے پر مشتمل تھی، اور دوسرے کی جگہ خالی تھی، مولانا انتہائی بے تکلفی کے ساتھ اسی پر بیٹھ گئے، اور الیکشن پر بحث شروع ہوگئی، مولانا نے اپنے حریف کو اتنا زچ کر دیا کہ اوس نے اس اعتراف پر بحث ختم کرنی چاہی کہ صاحب دونوں ہی امیدوار احمق ہیں۔ مولانا نے برجستہ فرمایا کہ جب یہ بات ہے تو میرے احمق کو وجہ ترجیح کیوں نہ حاصل ہو اور اس کو ووٹ کیوں نہ دیا جائے:

مولانا کا جاریہ الیکشن ایک خاص نظام کے ماتحت ہوتا، امیدوار کا انتخاب زیادہ تر وہ خود کرتے۔ اس کے بعد پروپگنڈا شروع ہوتا۔ مشاعرہ، تقریر کے جلسے سب کچھ ہوتے، مشاعرہ کے لئے غزل تیار کرتے اور جلسوں کے لئے تقریر لکھتے۔ امیدوار کو روپیہ کی ضرورت ہوتی تو اس سے بھی دریغ نہ کرتے، کسی مضمون میں کمزور ہوتا، تو اس کا باقاعدہ درس بھی دیتے، وہ کوئی حماقت کر بیٹھتا، تو مولانا اس حماقت کو لیاقت و ذہانت ثابت کرتے، نتیجہ یہ ہوتا کہ مولانا کے لوگ قائل تو ہو جاتے، اور ان کے پیچھے کے دشمن ہو جاتے، اور پھر انتخاب تک جو گذرتا اس کا اندازہ آپ خود کر سکتے ہیں۔

یہ الیکشن کا ذوق بدقسمتی سے عمر کے آخری دور تک قائم رہا، جس کی وجہ سے ان کی بہت سی علمی و فکری صلاحیتیں ضائع ہوگئیں، پہلے تو یونین کا الیکشن لڑتے اور لڑاتے تھے، عملی دنیا میں آئے تو میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ سے گذر کر اسمبلی کا الیکشن لڑانے لگے، اس حد تک بھی غنیمت تھا، پھر بھی ہم جیسے معتقدوں اور نیاز مندوں کے لئے یہ بھی ناقابل برداشت

حتیٰ یہاں تک کہ ایک جنرل انتخاب میں خود ہی کھڑے ہوگئے اور اس میں فریق مخالف اور اس کی پوری پارٹی کی شان میں وہ ہجویں کہیں کہ سودا اور انشاء تک گرد ہوگئے، اور مخالف پارٹی کا ایک ایک فرد تڑپ کر رہ گیا، اقبال صاحب کے جوڑ اور تدبیر کا مقابلہ کیا جاسکتا تھا، اور کیا بھی گیا، لیکن ان کی ہزلیات اور ہجویات کے مقابلہ کی تاب کس میں تھی، اس وقت یہ ہجویہ نظمیں جو سہیل صاحب کی جدت پسندی و ندرت آفرینی کا پورا مظہر ہوتی تھیں، ایک ایک بچہ کی زبان پر آگئی تھیں اس زمانہ میں انہی کے نام کے انتساب سے اعظم گڑھ سے ایک ہفتہ وار اخبار سہیل نکلتا تھا، جو نکلتا تو تھا ایک غیر معروف اور کم پڑھے لکھے بزرگ کی ادارت میں لیکن اس میں لکھنے والے بہت اچھے اچھے لوگ تھے۔ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں اردو کی چیئر خالی ہوئی، تو اس کے لئے جو لوگ پیش نظر تھے، یا جن پر نگاہ انتخاب اٹھی تھی، ان میں اقبال سہیل بھی تھے، بعض لوگوں نے ان سے بااصرار کہا بھی، کہ آپ اس جگہ کے لئے ضرور کوشش کیجئے، آپ کے کامیاب ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے آپ تو یقیناً لے لئے جائیں گے، لیکن جب ان کو معلوم ہوا کہ اس جگہ کے لئے ان کے مخلص دوست جناب رشید احمد صاحب صدیقی بھی امیدوار ہیں اور اس کے وہ اپنی ادبی شہرت اور وسیع تجربہ کی بنا پر مستحق بھی ہیں، تو انہوں نے اس کے لئے کوشش کرنے سے صاف انکار کردیا، حالانکہ وہ اپنی فطری صلاحیتوں کے اعتبار سے وکالت سے کہیں زیادہ اس کے لئے موزوں تھے۔ اور پھر علیگڑھ کے اولڈ بوائے تھے، اور اپنے دور طالب علمی میں وہاں کے ادبی اور علمی حلقوں میں اپنا نام بھی پیدا کر چکے تھے، اور پھر اردو فارسی ہی کے نہیں عربی کے بھی فاضل تھے، اور مولانا شبلی اور مولانا فراہی جیسے اساتذہ وقت کے شاگرد تھے، ان کے پرزور فارسی قصائد سے علیگڑھ کے در و بام اس وقت تک گونج رہے تھے، اردوئے معلیٰ حسرت کے صفحات اور علیگڑھ میگزین کے اوراق ان کی ادبی قابلیت کے گواہ تھے، ایک دوست کے لئے ان کا ایثار نفس ان کی بلند طبعی کی کتنی بڑی دلیل ہے۔

اقبال سہیل نے عربی ضرور پڑھی تھی، اور مولانا شبلی اور مولانا فراہی جیسے باکمال بزرگوں سے پڑھی تھی، اور ان سے ادب معانی و بلاغت کی اونچے درجہ کی کتابوں کا درس لیا تھا، لیکن انہوں نے کسی مدرسہ میں جاکر اس کی باقاعدہ تکمیل نہیں کی تھی، اور نہ ان کو، اور ان کے سرپرستوں کو اس کا خیال ہی پیدا ہوا، اور نہ عربی کی تکمیل کے بعد وہ بڑی آسانی سے مولانا حمید الدین کی طرح انگریزی کی طرف توجہ کرسکتے تھے، لیکن عربی کی اتنی ہی استعداد پر وہ بڑے بڑے علمائے فن سے ٹکر لینے لگے تھے، اور ہر موضوع اور ہر بحث پر واقفیت کارانہ گفتگو کرتے تھے، خالص مولویوں اور عربی دانوں کے مجمع میں ذرا بھی بیگانہ نہیں معلوم ہوتے تھے اوائل عمر میں ان کو مناظرہ سے بھی شغف تھا اور آریوں اور عیسائی مشنریوں سے برسرِ عام خوب خوب مناظرہ کرتے تھے، مولانا ابو القاسم بنارسی اور ان کے چھوٹے بھائی مولانا قمر بنارسی جو چندوسی کالج میں اردو و فارسی کے لکچرار ہیں ان کی صحبت میں اس ذوق کو اور جلا ہوگئی تھی،

"ربوا" تو قطعاً حرام ہے، جس کو کوئی مسلمان بھی جائز نہیں کہہ سکتا، مگر اس زمانہ میں تجارتی معاملات کی بعض ایسی شکلیں پیدا ہوگئی ہیں جو بعض علماء کے نزدیک ربوا کے تحت میں نہیں آتیں، اس لئے وہ ان کے جواز کے قائل ہیں، مولانا اقبال سہیل ان ہی لوگوں میں تھے، اور جواز سود پر ایک ضخیم رسالہ لکھ ڈالا تھا، انہوں نے اس کے وجوہ جواز کی تلاش میں فقہ اسلامی کا پورا دفتر اس طرح کھنگال ڈالا تھا، کہ فقہ کی امہات کتب کے عنوان اور فقہا کے اقوال تو الگ رہے، ان کے حواشی تک ان کو زبانی یاد ہوگئے تھے۔ مولانا معین الدین صاحب ندوی بیان کرتے ہیں، کہ اس مسئلہ کی تحقیقات کے لئے وہ اکثر دار المصنفین

بھی آیا کرتے تھے، کتابوں سے اس کی تحقیق کرتے تھے، اور دارالمصنفین کے لوگوں سے اس مسئلہ پر اس طرح گفتگو کرتے تھے کہ ان کی نکتہ آفرینی کو دیکھکر وہ حیرت میں آجاتے تھے، کتابوں کی مراجعت میں اگر ان کو کوئی جزئیہ ان کے مطلب کے موافق مل جاتا تو اس کی بنیاد پر اپنی ذہانت اور زورِ استدلال سے ایک عظیم الشان عمارت کھڑی کر دیتے تھے، ان کے دلائل کا جواب دینا کسی کے لئے آسان نہ ہوتا، کبھی کبھی مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اس مسئلہ پر گفتگو کرتے تھے، لیکن وہ بھی ان کی تشفی نہ کر سکتے تھے، ان کے اردو فارسی کلام کی طرح ان کا یہ فقہی رسالہ بھی نذرِ طاقِ نسیان ہو گیا تھا، اور بہت عرصہ تک مسودہ ہی کی صورت میں پڑا رہا، اتفاق سے وہ اسمبلی کے الکشن میں آزاد ٹکٹ پر کھڑے ہوگئے۔ ان کے مخالف کیمپ کے کسی آدمی نے اس مسودہ کو یا اس کی نقل حاصل کر کے چھپوا دیا، کہ جو شخص سود جیسے حرام ذریعۂ معاش کے جواز کا قائل ہو، اور اس پر ایک مستقل رسالہ بھی لکھ چکا ہو، وہ مسلمانوں کا نمائندہ کیسے ہو سکتا ہے، یہ رسالہ ان کی تحقیقات۔ استدلالات اور نتائج سے قطع نظر ان کی فنی واقفیت اور فقہی موشگافیوں کا پورا آئینہ دار ہے، اور اس سے پتہ چلتا ہے، کہ اگر وہ اپنی فطری ذہانت و صلاحیت کو جو خدا نے ان کو ودیعت کی تھی، کسی صحیح مصرف میں استعمال کرتے، تو کسی اسلامی و دینی موضوع پر کتنی بہتر کتاب ان کے قلم کے سایہ میں نکل سکتی تھی، ان کی مافوق العادۃ ذہانت ان کو ہر موضوع کے اصل ماخذ تک پہونچا دیتی تھی،

مولنا اقبال سہیل کو اربابِ تشیع کے معاملہ میں بڑا غلو تھا، اس مسئلہ میں وہ اس انتہا تک پہونچ گئے تھے کہ کسی بستی کی آبادی کا ذکر کرتے تو فرماتے۔

"فلاں قصبہ میں اتنے مسلمان رہتے ہیں اور اس قدر شیعہ"

وہ مسلم لیگ کے بھی، اسی تعلق کی بنا پر مخالف تھے، وہ کھلے طور پر مسلم حکومتوں کی تباہی کے اسباب بتاتے اور عبداللہ بن سبا سے لے کر ابن علقمی تک اور ابن علقمی سے لیکر "بادشاہ گر" (KING MAKERS) سادات بارہہ تک کا کچا چٹھا بیان کر دیتے!

مگر اس کے ساتھ ہی جناب امیرؓ، حضرات حسنینؓ اور حضرت سیدہ فاطمہؓ کی منقبت میں انھوں نے نہایت ہی پرجوش قصیدے لکھے ہیں، جن کو خود شیعہ صاحبان کے جلسوں میں جا کر پڑھتے تھے، جن کو سن کر اہل محفل پر وجد کا عالم طاری ہو جاتا۔ ان قصائد کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ افراط و تفریط سے پاک ہیں، اور فرقِ مراتب اور آدابِ شریعت کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے!

سچ یہ ہے کہ اقبال سہیل جیسے طباع ذہین اور نکتہ سنج انسان روز روز کہاں پیدا ہوتے ہیں، وہ اپنا آپ جواب تھے اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے! یہ مصرعہ ہر اعتبار سے اس مردِ قلندر کے "احوال" پر صادق آتا ہے

؎ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

عروج قادری

فریبِ عقل

زمیں تیری حکمت سے کیا کچھ بنی — کہ تو نے فلک کی بھی اب ٹھان لی
زمیں کو بنا کر تباہی کا گھر — فلک کا کیا تو نے عزمِ سفر
تعقل کی ہانڈی میں آیا اُبال — خدا کو کہا تو نے وہم و خیال
ترا قول سینے کو برما گیا — یہ سن کر ہمالہ بھی تھرا گیا
گلوں کے لبوں پہ ہنسی آگئی — حماقت بھی بے چاری شرما گئی
تری دانش و فکر فرسودہ ہے — ترا ذہن بھی زنگ آلودہ ہے
ارے او گرفتارِ دنیائے دوں — نہ بن نفسِ بدخو کا صیدِ زبوں
نہ بن دشمنِ عقل و ہوش و خرد — نہ یوں ڈال روئے شرافت پہ گرد
خدا نے تجھے عقل دی اس لئے — کہ تو خود خدا ہی پہ فقرے کسے؟
یہ کفرانِ نعمت حذر الحذر — جبینِ ور تشکر! پسینے سے تر
خدا کی حلیمی سے دھوکا نہ کھا — یہ مہلت غنیمت ہے تو باز آ

★

تری عقل و دانش کا یہ ہے فتور — کہ انساں ہوا آدمیت سے دور
یہاں ٹکڑوں ٹکڑوں میں ایسی بٹی — کہ یہ ساری دنیا جہنم بنی
ہر بزم تہذیب ننگی کھڑی — تمدن کی دیوار وہ بیٹھی پڑی
تجارت کو جانچو تو خیرہ سری — سیاست کو دیکھو تو وہ بس بھری
نچوڑے گا جیسے کسی شے میں رس — بڑھی اس قدر تیری حرص و ہوس
یہ خواہش کہ سارا جہاں لوٹ لوں — اگر بس چلے آسماں لوٹ لوں
زمیں کے کرّے کو تو پہلے سنبھال — تو پھر پھینکنا ماہ و انجم پہ جال
ترے واسطے میری سوغات ہے — اگرچہ پرانی بہت بات ہے

"تو کارِ زمیں را نکو ساختی
کہ با آسماں نیز پرداختی"

عبدالمجید حیرت

دو غزلیں

جب عشق ظفرمند و خوش انجام نہ ہوگا
کیا حسن بھی کچھ موردِ الزام نہ ہوگا

ساقی سے شکایت نہیں کچھ تشنہ لبی کی
قسمت میں ہماری ہی کوئی جام نہ ہوگا

بیمار کو اس طرح جو دیکھا ہے کسی نے
کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ آرام نہ ہوگا

اک شور تو ہوگا کہ وہ محفل ہے بہت خوب
محفل کے لئے اذن مگر عام نہ ہوگا

کرنا ہی پڑے گی ہمیں تدبیر کوئی اور
کم یوں تو غمِ گردشِ ایام نہ ہوگا

افسوس کہ وہ فاصلہ بھی ہو نہ سکا طے
ہم جس کو سمجھتے تھے کہ دو گام نہ ہوگا

پھر آپ کے چاہے سے تو اے حضرتِ حیرت
تبدیل نظامِ سحر و شام نہ ہوگا

ماہر القادری

دل امیدوں سے پھر شادماں ہے
اے تبسمِ بیکسی! تو کہاں ہے

ہجر میں کوئی کیوں بدگماں ہے
یہ تو اک منزلِ درمیاں ہے

اس جبیں پر پسینہ کے قطرے
جیسے بھیگی ہوئی کہکشاں ہے

تم جفاؤں پہ نادم نہ ہونا
یہ حسابِ دلِ دوستاں ہے

آتشِ گل کر اب کے ہوا کیا
گلستاں میں دھواں ہی دھواں ہے

چوٹ کھائے ہوئے دل کی "لے" میں
نغمہ کم ہے، زیادہ فغاں ہے

قربِ منزل کا دھوکا نہ کھانا
زندگی منزلِ بے نشاں ہے

ہر قدم ایک تازہ قیامت!
ہر زمیں پر نیا آسماں ہے

عاشقی اک مصیبت ہے ماہر
دل نگاہوں سے بھی بدگماں ہے

نذیم جعفری

جذبات

کبھی یقیں کے کرشمے کبھی گماں کے قریب
عجیب رنگ سے کھائے تھے جہاں کے قریب

بھٹک رہے ہیں ابھی تک تلاشِ منزل میں
دلیل رہ ہیں وہی میرِ کارواں کے قریب

★

سرشکِ غم شبِ فرقت مچلتے جاتے ہیں
چراغ ہیں کہ اندھیروں میں جلتے جاتے ہیں

عجب ہے رنگِ تصور گماں یہ ہوتا ہے
کہ جیسے وہ میرے ہمراہ چلتے جاتے ہیں

★

عبث ہے دل کی تباہی کا تذکرہ ان سے
وہ تھوڑی دیر پشیماں ہوئے تو کیا ہوگا

وہ ناشنیدہ فسانے تری نگاہوں کے
کسی کے شوق کا عنوان ہوئے تو کیا ہوگا

★

وہ شوخ سرو خراماں نہیں کچھ اور بھی ہے
لطافتِ گل خنداں نہیں کچھ اور بھی ہے

نہ جانے کتنے گلوں کا لہو ہے اس میں شریک
چمن میں جشنِ بہاراں نہیں کچھ اور بھی ہے

نہیں یہ جام ذرا دیکھ بھال کے دینا
علاجِ گردشِ دوراں نہیں کچھ اور بھی ہے

ہمیں نگاہِ محبت سے دیکھنے والے
یہ التفاتِ فراواں نہیں کچھ اور بھی ہے

دلؔ تاج محلی

ترے خلوص کا جب بھی یقین آیا ہے
شعور نے کوئی دھوکا ضرور کھایا ہے

اسی جنوں نے خرد کا خطاب پایا ہے
وہی جنوں جو مجھے سازگار آیا ہے

بلائے گردشِ دوراں سے ہوگئے محفوظ
وہ لوگ جن پہ ترے گیسوؤں کا سایا ہے

تمہارے غم کو محبت سے کیوں جدا کردوں
تمہارے غم سے محبت میں اوج آیا ہے

مرے رفیق مری سادگی پہ طنز نہ کر
کہ میں نے سوچ سمجھ کر فریب کھایا ہے

ہزاروں ترکِ تعلق کے بعد بھی اے دلؔ
کبھی وہ سامنے آئے تو جی بھر آیا ہے

ابو محمد امام الدین رام نگری

کوئی مشکل مرحلہ مشکل نہیں میرے لئے
خود لئے جاتی ہے منزل جانبِ منزل مجھے

اس طرح طے ہو رہی ہے منزلِ شہرِ حبیب
ہر قدم پر "مرحبا" کہتا ہے میرا دل مجھے

روحِ انتخاب

مکہ سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روانگی کی خبر مدینہ میں پہونچ چکی تھی، اور یہاں آپ کی آمد آمد کا غلغلہ بلند تھا انصار کا بچہ بچہ ہمہ تن چشم شوق بنا ہوا تھا، مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر ایک بالائی آبادی ہے جسے قبا کہتے ہیں دیوانگانِ جمالِ محمدی سویرے سے یہاں پہونچ جاتے اور گردن اٹھا اٹھا کر دیکھتے کہ کوکبِ نبوی کے راستہ میں اڑتی ہوئی گرد نظر آجائے تو چشمِ انتظار کے لئے توتیا بنا کر رکھیں، دوپہر کو جب دھوپ تیز ہو جاتی تو حسرت و افسوس کے ساتھ گھر واپس لوٹ جاتے، روز کا یہی معمول تھا، ایک دن اسی طرح گھر واپس آچکے تھے کہ ایک یہودی جو ایک اونچے ٹیلے پر سے دیکھ رہا تھا، اچانک اس کی نگاہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقاء پر پڑی جو لباس زیب تن کئے ہوئے تھے، اس سے ضبط نہ ہو سکا، اور بے ساختہ پکارا "او اے عرب کے لوگو! جن کا تم کو انتظار تھا وہ آگئے"! انصار نے سنا تو جوشِ مسرت سے قابو سے باہر ہو گئے، اور ہتھیار سج سجا استقبال کے لئے آگے بڑھے، حرہ کی پشت پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہوئی، یہاں عمرو بن عوف کا ایک ممتاز خاندان آباد تھا، شہنشاہ دو عالم نے سب سے پہلے اس کو ہی میزبانی کا شرف عطا فرمایا، حضور تو سواری سے اتر کر خاموش بیٹھ گئے، حضرت ابوبکر لوگوں سے بات چیت کے لئے کھڑے رہے، انصار کے جن لوگوں نے اب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھا تھا، وہ آتے تھے، تو حضرت ابوبکر ہی کو پیغمبر آخر الزماں سمجھ کر سلام کرتے تھے، اتنے میں دھوپ ذرا تیز ہو گئی، تو حضرت ابوبکر صدیق آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی چادر کا سایہ کر کے کھڑے ہو گئے، اس سے ان کو معلوم ہوا کہ دراصل ان کا گوہرِ مقصود کون ہے؟

مدینہ طیبہ پہونچنے کے بعد ضروری تھا کہ ایک مسجد تعمیر کی جاتی تاکہ سب مسلمان ایک ساتھ جمع ہو کر عبادتِ خداوندی آزادی کے ساتھ بجا لاتے اور جہاں دوسرے اہم دینی اور اجتماعی امور کا فیصلہ ہوتا، اس مقصد کے لئے حضور نے زمین کا جو ٹکڑا منتخب کیا وہ سہل اور سہیل نام کے دو بچوں کی ملکیت تھا، یہ بچے سعد بن زرارہ کی سرپرستی میں تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قطعہ زمین کا معاملہ کیا تو دونوں نے کہا "یہ آپ کی نذر ہے اے اللہ کے رسول!" لیکن آپ نے نذر قبول کرنے سے انکار فرمایا اور آخر قیمتاً اس کو خرید لیا، قطعہ زمین کی یہ قیمت جو بعض روایات کے مطابق دس دینار تھی، اس کے ادا کرنے کی سعادت بھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حاصل ہوئی، آپ نے صرف قیمت ہی ادا نہیں کی بلکہ جب سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم خود مزدوروں کی طرح تعمیر مسجد کے کام میں شریک تھے، اور اینٹیں اٹھا اٹھا کر دے رہے تھے، تو یہ کیونکر ممکن تھا کہ رفیقِ غارِ ثور، اس میں آپ کا شریک نہ ہوتا۔

(صدیق اکبر — مولانا سعید احمد اکبرآبادی)

ہماری نظر میں

انوارِ سبحانی

ترجمہ فتحِ ربانی مترجم:۔ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی مرحوم، ضخامت ۴۴۸ صفحات، قیمت پانچ روپے، مجلد رنگین گردپوش کے ساتھ۔ ملنے کا پتہ علمی کتب خانہ مظفر گڑھ

حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۵۶۱ھ کے چالیس مواعظ کا اردو ترجمہ "انوارِ سبحانی" کے نام سے علمی کتب خانہ مظفر گڑھ نے شائع کیا ہے، تطہیرِ فکر اور تعمیرِ سیرت کے لئے یہ بہترین کتاب ہے، اس کے پڑھنے سے دل میں خشیتِ الٰہی اور سوز و گداز پیدا ہوتا ہے! حضرت شیخ نے اپنے مواعظ میں جگہ جگہ "توحید" کی اہمیت پر بہت زور دیا ہے اس کے علاوہ عنوان بدل بدل کر اس کی ترغیب دی ہے کہ عمل میں اخلاص پیدا ہونا ضروری ہے اور مردِ مومن کو "آخرت" کے محاسبہ کا ہر دم احساس رہنا چاہئے، حضرت شیخ جیلانی نے "تقدیر" پر ایمان لانے اور راضی برضا رہنے کی بار بار تلقین فرمائی ہے!

چند اقتباسات:۔

"تقویٰ اور اطاعتِ الٰہی کو اپنے لئے لازم سمجھو، نہ کسی سے ڈرو اور نہ کسی غیر کی طرف جھکو، خدا کے بغیر کسی پر اعتماد نہ کرو، کیونکہ اسی توحید پر ہی سب کا اتفاق ہے۔۔۔ خدا اور رسول کی اطاعت کرو، بدعات سے بچو۔ ساری حاجتیں اللہ تعالیٰ کے حوالے کر، اسی سے مانگ اور اس کے سوا کسی پر بھروسا نہ کر۔ (اللہ تعالیٰ ہی) ڈر کے قابل ہے اور امید کے لائق، اسی سے ڈرو اور اس کے سوا کسی سے نہ ڈرو، اسی سے ہر قسم کی امید رکھو اور کسی سے امید مت رکھو۔"

"صاحبو! میرا کہنا مانو کہ میں اللہ جل جلالہ کا داعی ہوں کہ تم کو بلاتا ہوں اس کے دروازہ اور اس کی اطاعت کی طرف، میں تم کو اپنی ذات کی طرف نہیں بلاتا۔"

"اے حق تعالیٰ اور اس کے صدیق بندوں سے اعراض کرنے والے اور مخلوق کو شریکِ خدا بنا کر ان کی طرف متوجہ ہونے والے، یہ مخلوق پر تیری توجہ کب تک رہے گی؟ بھلا وہ تجھے کیا نفع دے سکتے ہیں؟ وائے! تجھ پر، کیا اتنا نہیں سمجھتا کہ ساری مخلوق ضعیف و کمزور اور سرتاپا حاجت ہے، کہ ان کے ہاتھ میں نہ نقصان ہے نہ نفع ہے، نہ سبب ہے، نہ ترجیح بانفع و نقصان کے متعلق تو ان میں اور جمادات میں کچھ بھی فرق نہیں، پھر ان کو مشکل کشا اور حاجت روا سمجھنا کس درجہ حماقت ہے، خوب سمجھ لے کہ بادشاہ ایک ہی ہے، نقصان پہنچانے والا ایک ہی ہے، نفع پہنچانے والا ایک ہی ہے۔ اور اس کی تکبیر میں تو جھوٹ بولتا ہے، کیونکہ تیرے قلب میں دوسرا معبود موجود ہے، جس کو تو اپنا مطلب اور اپنا حاجت روا اور مشکل کشا سمجھ رہا ہے، اور ہر وہ شے جس سے تو خوف کرے یا آرزو رکھے وہ تیرا معبود ہے۔"

اس کتاب کے بعض مقامات پر کھٹک سی پیدا ہوتی ہے، اولیاء اور صلحاء کے بارے میں صفحہ ۱۹۱ پر لکھا ہے کہ:

"حق تعالیٰ نے بادشاہ بنا رکھا ہے یعنی ساری دنیا کا انتظام بھی ان کے حوالے کیا ہے۔۔۔ ساری مخلوق ان کی رعایا ہے"

حالانکہ ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کی رعایا ہے کہ وہی مالک السموٰت والارض ہے، ہاں! کسی صالح اور متقی کو اللہ تعالیٰ نے کسی مقام کا حاکم

بنایا ہو جس طرح خلفائے راشدین کو اللہ تعالیٰ نے خلافت ارضی عطا فرمائی تھی، تو وہ بیشک اپنی زندگی میں اسلامی حکومت کا کاروبار چلاتے تھے، مگر یہ نہیں تھا کہ ساری دنیا کا انتظام اُن کے سپرد تھا۔

"اے عابدو! تم میں کوئی ایسا نہیں جو تو بہ کا حاجت مند نہ ہو، میرے پاس تمہاری موت اور تمہاری حیات کی ساری خبریں ہیں، جب تمہارے اُمور کی ابتدا اور تمہاری ظاہر داری کے سبب مجھ پر مشتبہ ہو جاتی ہے تو انجام کار اس کا تمہاری موت کے وقت مجھ کو انکشاف ہو جاتا ہے (صفحہ ۲۲۱)

حضرت شیخ کا یہ دعویٰ دل میں کھٹک پیدا کرتا ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہ نہیں فرمایا تھا کہ جو صحابی بھی وفات پاتا تھا اس کی موت کے وقت کیا حالات تھے؟ اس کا انکشاف مجھے ہو جاتا ہے، لیکن یہ کھٹک بعد کی عبارت سے دور ہو جاتی ہے (۸)

"جب تم میں سے کسی کے مال کی اصلیت مجھ پر پوشیدہ ہوتی ہے، تو میں اس کے خرچ کا انتظار کیا کرتا ہوں، پس اگر اولاد اور اہل نفقہ ہیں یا حق تعالیٰ کے فقیروں اور مخلوق کی مصلحتوں میں خرچ ہو تو میں جان لیتا ہوں کہ اصل مال حلال طریقہ سے آیا تھا، میں بازاروں میں تمہارے ساتھ نہ تھا، مگر حق تعالیٰ نے اسی طریقہ اور نیز دوسرے طریقوں سے تمہارے اموال کی حالت مجھ پر ظاہر فرما دی ہے کہ حلال ہیں یا حرام"

اسی طریقہ سے حضرت شیخ کے زمانہ کے جن علماء اور صلحاء کے حالات اُن کی زبانی آپ کو پہنچتے ہوں گے، اُن سے آپ اندازہ لگا لیتے ہوں کہ موت کے وقت کس کے کیا حالات رہے!

"اسی طرح جب قلب صحیح ہو جاتا ہے اور اس کی شرافت اور ماسویٰ اللہ سے طہارت ظاہر ہو جاتی ہے تو حق تعالیٰ اپنے بندوں کے قلوب پر اس کو قبضہ بخشتا ہے اور اپنی مملکت یعنی دنیا و آخرت پر اس کو اختیار عطا کرتا ہے (صفحہ ۲۲۳)

ان جملوں سے یہ کھٹک پیدا ہو سکتی ہے کہ اولیاء اللہ اور اصفیاء و اتقیاء دنیا و آخرت میں تصرف کی طاقت رکھتے ہیں مگر اس عبارت سے قبل حضرت شیخ نے حضرت یوسف علیہ السلام کی حاکمیت کی مثال دی ہے، اور اس بعد کی (مندرجہ بالا) عبارت سے آپ کا یہی مفہوم ہے کہ اپنے صالح بندوں کو اللہ تعالیٰ دنیا کی حاکمیت بھی عطا فرماتا ہے اور ان کی آخرت بھی بہتر ہوتی ہے!

اس عبارت سے کوئی شخص اہل بدعت کی طرح اس دھوکے میں مبتلا نہ ہو جائے کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ دین و دنیا کے بادشاہ تھے، اور وہ جس کو جو چاہیں دے سکتے ہیں، اسی کتاب کے صفحہ ۲۵۰ پر حضرت شیخ کا یہ ارشاد اس کھٹک کو دور کر دیتا ہے

"بالکل صحیح ہے کہ میری آبرو اور مال سب تم پر نثار ہے اور میرے پاس کچھ نہیں ہے، اگر کچھ ہوتا تو تم کو اس سے بھی نہ روکتا"

بزرگانِ دین کے ملفوظات پڑھتے وقت اگر کتاب و سنت پر نظر رہے، تو پھر کوئی کھٹکا نہیں ہر کسی کے قول و فعل کو جانچنے اور پرکھنے کی کسوٹی "کتاب و سنت" ہے! بزرگ دین سے بدگمانی نہ رکھنی چاہیے، اُن کا کوئی قول کھٹکے تو اس کی تاویل کی کوشش کی جائے، ایسی تاویل جو اس کھٹک یا اعتراض کو دور کر دے، اگر کسی کا قول "کتاب و سنت" کے مخالف ہو اور اس کی تاویل ہی نہ ہو سکے، تو اس کا بھی امکان ہے کہ ملفوظات میں کسی نے الحاق کر دیا ہو، اور اگر یہ امکانات بھی باقی نہ رہیں تو پھر قوت ایمانی سے کام لیکر اس قول کو چھوڑ دیا جائے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ "توحید خالص" کے داعی تھے، ان کے تمام ملفوظات سامنے رہیں تو کہیں کہیں اُن کے قول سے جو کھٹک پیدا ہوتی ہے اس کی تطبیق کی جا سکتی ہے، بزرگانِ دین کے بعض پُرجوش دعوے یہ کہ اللہ تعالیٰ ہم سے یہ کہلواتا

ہمیں ایسا حکم ہوا ہے" اس کی کوئی دینی اور شرعی حیثیت نہیں ہے!

"انوارِ سبحانی" کے مطالعہ سے خشیت و تقویٰ کی طرف طبیعت جھکتی ہے۔ ترجمہ آسان اور عام فہم ہے، اللہ تعالیٰ مترجم اور ناشر کو جزائے خیر عطا فرمائے اور حضرت شیخ کی قبر پر اللہ کی رحمت کے پھول سدا برستے رہیں؟

خونِ جگر ہونے تک

از: فضل احمد کریم فضلی، ضخامت ۳۶۴ صفحات (قیمت درج نہیں) ملنے کا پتہ کراچی ایجوکیشن سوسائٹی، ہارون چیمبرس، ساؤتھ نیپیر روڈ کراچی ملے

جناب فضل احمد کریم فضلی (سی، ایس، پی) کا نام اردو داں طبقہ کے لئے اب اجنبی نہیں رہا، وہ کسی پروپیگنڈے کے بغیر تنہا اپنی غزلوں کے سبب مشہور ہوئے ہیں، ہما شما کا کیا ذکر، رئیس المتغزلین حضرت جگر مرادآبادی تک فضلی صاحب کے دامِ تغزل کے اسیر ہیں۔

اب تک ادبی حلقے فضلی صاحب کو ایک غزل گو شاعر کی حیثیت سے جانتے، پہچانتے تھے، مگر اُن کے ناول — خونِ جگر ہونے تک — نے اربابِ نقد و نظر کو چونکایا بلکہ حیرت میں ڈال دیا کہ فضلی صاحب اتنے اچھے نثر نگار اور کامیاب ناول نویس بھی ہیں، ان کا یہ جوہر تو اب تک دبا ہی رہا، اسی ناول نے پہلی بار اُن کے کمال کے اس رُخ کو اُجاگر کیا ہے!

زیرِ تنقید ناول (خونِ جگر ہونے تک) میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں، جو ایک کامیاب ناول میں پائی جانی چاہئیں، پلاٹ شروع سے لیکر آخر تک مربوط ہے، ایک دلفانہ ہے۔ جو کہیں ٹوٹتی نظر نہیں آتی، ناول کے تمام ابواب مل جل کر سلسلۂ الذہب (GOLDEN CHAN) بن گئے ہیں، کردار نگاری میں نفسیات کی کتنی کامیاب ترجمانی کی گئی ہے کہ افسانہ پر حقیقت کا گمان ہوتا ہے، مکالمے کس قدر دلچسپ ہیں اور ساتھ ہی ہر "کردار" کو نمایاں کرنے والے بھی! زبان سلیس، عام فہم، شستہ اور رواں ہے، کہیں کہیں تو نثر کے ٹکڑے شعر کی طرح سہل ممتنع بن گئے ہیں، مصنف نے بنگال کی دیہاتی زندگی کی کاغذ پر سچ مچ تصویر کھینچ دی ہے، قحطِ بنگال کے مناظر کتنے درد انگیز ہیں، سماج اور سیاست پر بھی طنز ہے، زبان کی گھلاوٹ میں "مزاح" کا نمک بھی خوب مزہ دے رہا ہے — ایک نمونہ:

چچا گوہر:- "تم کون ہوتے ہو بولنے والے" "ہاں بیٹا پوچھو"

پھول محمد:- تو پھر کیا ہوا چاچا آپ تو پڑے۔ پھر

جمعدار صاحب:- ہاں! بھیا ہم چپ سادھے پڑے رہے، ہم نے کہاں کون مسٹر مفت جان دے"

جگو دھر:- زندہ رہ شاباش (جمعدار صاحب) بہت عقلمند آدمی ہیں۔

پھول محمد — چاچا سنت نہیں تو کیا آپ دام لے کے جان دیتے ہیں؟

چند اور نمونے:-

اس نے بیر میاں کو بہت سمجھایا کہ یہ کہاں کی جوانمردی ہے کہ دریا میں ذرا سی موج آئی اور ہتیار چھوڑ کر بیٹھ گئے، کہیں

ملہ "دو ہتڑ بھر بھر کر جس نے معارفِ خیر میں دنیا کو خوب لٹایا! (صفحہ ۳۳۱) "دو ہتڑ" یہاں بالکل غلط استعمال ہوا ہے" دونوں ہاتھ! "دونوں ہاتھ بھر بھر کر" کا محل تھا! دو ہتڑ" تو اس طرح بولا جاتا ہے!

"آقا کو نوکر پر غصہ آیا اور اس نے نوکر کے دو ہتڑ رسید کر دیا"۔

اس طرح پیرا یا ہوا ہے —"

—چھیر میاں کا حال اس غوطہ زن کا سا ہو رہا تھا، جو پانی کی گہرائی ناپنے کے لئے ڈبکیاں لگا، با ہر اور پاؤں کہیں تھا۔"

— اماوس کی اندھیری گھپ رات تھی آسمان سے کروڑوں حوریں تاروں سے جھانک رہی تھیں، ان کا عکس دریا میں لوٹ رہا تھا، کنارے پر لاکھوں جگنو کی پریاں رقص کر رہی تھیں، جیسے زمین پر آسمان اُتر آیا ہو، شبنم میں نہائی ہوئی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، آغوشِ دریا کو گدگداتی، موجوں سے کھیلتی، تاروں کی حوروں کو جھولا جھلاتی، جگنو کی پریوں کو اُڑاتی، انسان کے دل میں ترنگ پیدا کرتی ..... انسان کے گانے کی آواز بھی دور سے آنے لگی وہ بھٹیالی کا روح پرور راگ، دریائے وارنگا کے کشتی بانوں کے راگ کو شرماتا ہوا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فطرت کی نغمگی انسان کی لے میں حل ہو گئی ہے، اور یہ لے فطرت سے اس قدر ہم آہنگ ہے کہ انسان کے وجود کا پردہ اُٹھ چکا ہے، اور نغمہ ہی نغمہ رہ گیا ہے....."

دوسرا رخ :— "ہمارے پاس ایک بڑا چانڈیل سپاہی کھڑا تھا" (صفحہ ۳۰)

غالباً گرانڈیل کو "چانڈیل" کہا گیا ہے — "ان کا دھوم دھامی استقبال" (صفحہ ۳۰) "دھوم دھامی" پہلی بار نظر سے گزرا اور وجدان نے بڑی اجنبیت محسوس کی — "داروغہ جی کے ہاتھ میں دس روپے رکھے" صفحہ (۸۸) "میں" کی جگہ "پر" کا محل تھا، "میں" کے ساتھ جملہ اس طرح ہونا چاہیئے :-

"داروغہ جی کے ہاتھ میں دس روپے تھما دئے"

رل ملا کرتے (صفحہ ۹۵) — "رل ترل کرتے یا بھاؤ تاؤ کرتے" روزمرہ ہے — "جن کے یہاں فاقہ پڑ رہا تھا (صفحہ ۱۷۹) "قحط پڑنا" تو بولتے ہیں، فاقہ پڑنا پہلی بار سنا۔ "رہتے ہیں مجھے لکھنے کچھ تھا" صفحہ ۵۹ "کچھ" بالاتفاق مؤنث ہے — "حسب معمول اجرہ کے دودھ میں چھپا ہوا تھا" (صفحہ ۲۹۱) "میں" کی جگہ "سے" لکھنا تھا — "ایک ونڈے نے بانس کی پتلی چھڑی سے جمعدار صاحب کو گودا" (صفحہ ۲۸۹) "گودنے" کا محل نہیں ہے، "پتلی چھڑی سے کچوکے دئے" سے مفہوم کی واقعی ترجمانی ہو جاتی،

کتاب میں کہیں کہیں مقامی محاورے (مثلاً "پیکنا) بھی آگئے ہیں، صفحہ ۳۲۲ پر "مزاحیہ" کا "مذاحیہ" ("ذ" کے ساتھ) چھپ جانا کتابت کی غلطی ہو سکتی ہے، مگر صفحہ ۲۸۹ پر "شعائیں" جو نظر آیا تو اس طرف ذہن گیا کہ آجکل "غیظ" کو "غیض" اور "شعاعوں" کو "شعاؤں" جو لکھا جا رہا ہے تو ناول نگار بھی اس غلطی کا شکار ہو گیا۔

"تو یہ تو بے کوئی ایسا بھی کرتا ہے، یہ تو بڑی دغابازی کی بات ہے چھی چھی وغیرہ وغیرہ" (صفحہ ۳۹)

"وغیرہ وغیرہ" کا اس طرح استعمال وجدان کو خاصہ کھٹکتا ہے، کتاب میں یہ لفظ (وغیرہ وغیرہ) بار بار آیا ہے!

بھول چوک کس سے نہیں ہوتی : ؎ چلے کتنا ہی بچ کر کوئی ٹھوکر کھا ہی جاتا ہے۔

مجموعی طور پر "ناول" ہر اعتبار سے دلچسپ اور کامیاب ہے، کتاب ہاتھ میں لینے کے بعد جی یہی چاہتا ہے کہ کتاب ختم کر کے ہی دم لیجئے! کمال یہ ہے کہ ناول میں جنسیات کے چٹخارے نہیں ہیں مگر ناول اس پر بھی لطف انگیز ہے! ناول سنجیدہ اور پُروقار بھی ہے اس لئے شریف عورتوں کو بلا تامل پڑھنے کے لئے دیا جا سکتا ہے!

"خون جگر ہونے تک" میں اردو زبان کے کسی ناول نویس کے طرز و اسلوب کی نقل نہیں کی گئی اس اعتبار سے

یہ ناول اپنے رنگ میں منفرد ہے!

کیسل اینڈ کمپنی لمیٹڈ لندن نے اس کتاب کو بڑے اہتمام سے چھاپا ہے، کاغذ طباعت اور کتابت غرض ہر چیز خوب سے خوب تر ہے ہر ورق میں "آرٹ" پایا جاتا ہے، "خون جگر ہونے تک" اُردو ادب میں خوشگوار اضافہ ہے۔ جناب فضلی صاحب نے یہ ناول لکھ کر پڑھنے والوں کو اپنے آنے والے ناولوں کے انتظار میں مبتلا کر دیا ہے۔

سفر چین از: عبدالقدوس ہاشمی، ضخامت ۱۷۰ صفحات، مجلد رنگین گرد پوش کے ساتھ قیمت دو روپے — ملنے کا پتہ: مکتبہ ۱۳۸ فیروز، کراچی۔

اب سے تقریباً دو سال قبل مئی ۱۹۵۶ء میں پاکستانی علماء کا ایک وفد چین گیا تھا، یہ وفد آٹھ علماء پر مشتمل تھا جس کے ایک رکن مولانا عبدالقدوس ہاشمی بھی تھے، صاحب موصوف نے اپنے "تاثراتِ سفر" کتابی شکل میں مرتب فرمائے ہیں، کوئی شک نہیں یہ "سفرنامہ" خاصہ دلچسپ اور معلومات آفریں ہے مگر جناب ہاشمی صاحب سے ہم اس سے زیادہ بلند تصنیف کی توقع رکھتے تھے۔

"سفرنامہ چین" کے چند اقتباسات:-

"کوئی شخص چین کے باہر سے کوئی پارسل حاصل نہیں کر سکتا حتیٰ کہ کتابیں اور اخبارات بھی نہیں آسکتے نہ کوئی شخص باہر کا کوئی ریڈیائی براڈکاسٹ سُن سکتا ہے (صفحہ ۶۲) — "مسٹر ماؤ اور مسٹر اسٹالن کے بڑے بڑے بت بیکار رکھے ہوئے ہیں (صفحہ ۶۶) — "روز بروز مسجد کے مکاتب میں حاضر ہونے والوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے، قابل ستائش ہیں چین کے مسلمان کہ وہ اپنی ہر امکانی کوشش سے اپنی اولاد کو مسلمان ہی باقی رکھنے کی سعی کر رہے ہیں، حالانکہ حکومت اپنے تمام ذرائع سے آئندہ نسلوں کو ایک ایسی سوسائٹی کے لئے تیار کر رہی ہے، جس میں خدا کا کوئی تصور باقی نہ رہے اور حیات بعد الممات کے خیال کو کہیں دخل انداز ہونے کا موقعہ نہ حاصل ہو — "آپ کو یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اور اتنی کم آبادی کے باوجود لنکیانگ کے لوگ غریب ہیں، مفلس خستہ حال ہیں کیونکہ اُن کے ذرائع معاش پر حکومت کا قبضہ ہے اور چین کی مرکزی حکومت ان سے شدید آٹھ گھنٹے محنت لے کر بھی انھیں صرف اس قدر دیتی ہے کہ جس سے یہ لوگ بمشکل پیٹ بھر لیں اور پھٹے پرانے کپڑوں سے تن ڈھانک لیں، انفرادی سرمایہ داری کے عذاب سے خلاصی کے بعد یہ لوگ ملکی سرمایہ داری کے عذاب میں مبتلا ہوگئے ہیں (صفحہ ۱۱۶) — "بیس روپیہ کی قیمت کا ایک جوڑا ۵۰ یوان (سو روپے) میں سوتی پائجاموں کی ایک معمولی جوڑی تین یوان (چھ روپیہ) میں (صفحہ ۱۳۰) — بہت سی لڑکیاں بھی ورزش کر رہی ہیں اور لڑکوں سے الگ الگ نہیں ہیں، مشرقی حیا اور شائستگی کو نہ جانے کیا ہو گیا (صفحہ ۱۴۵) — "ناشتہ کے بعد صبح سات بجے ہوٹل کنگ کانگ سے روانہ ہوئے اور ٹھیک آٹھ بجے طیارہ پر تھے، مقامی مسلمانوں نے جس محبت و خلوص کے ساتھ رخصت کیا، اور یہ غریب جس حسرت کے ساتھ ہمیں روانہ ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے وہ زبانِ حال سے کہہ رہی تھی کہ تم اکثریت میں بسنے والے مسلمانو! کیا جانو گے کہ ہم کس حال میں ہیں، یقیناً حکومت چین ہمارے ساتھ مساوات کا سلوک کرتی ہوگی مگر مقامی ارباب اقتدار ہمیں سرکاری کارخانوں میں بہ حیثیت اور بھی کہاں آسانی کے ساتھ کام سے لگاتے ہیں، یہ تو تم نے بھی دیکھ لیا کہ فونش ہین کے کارخانہ میں جہاں چھ سو مزدور کام کرتے ہیں، وہاں صرف دو مسلمان روزگار پاسکے ہیں، اور اس پر ہم ایک لفظ بھی نہیں بول سکتے کیونکہ یہ وہ دنیا ہے.... جس میں "اس قفس کے طائروں کو پھڑپھڑانا ہے منع!" (صفحہ ۱۵۰)

ان اقتباسات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سویٹ نظام کس قدر جابرانہ آمریت نژاد اور مذہب و اخلاق کا دشمن ہے!!

دروسِ فارسی

مؤلفہ :۔ مولنا حبیب اللہ (فاضل دیوبند) ضخامت ۶۴ صفحات، قیمت بارہ آنے
ملنے کا پتہ :۔ کتب خانہ محمودیہ دیوبند ضلع سہارن پور۔

ابتدائی جماعت کے طلباء کے لئے فارسی نصاب کی یہ کتاب جدید انداز پر تالیف کی گئی ہے، یہ کتاب چالیس اسباق (LESSONS) پر مشتمل ہے، جن کے پڑھنے سے فارسی سے اُردو اور اردو سے فارسی ترجمہ کرنے کی مشق پیدا ہوتی ہے؟

کتاب چھوٹی عمر کے طلباء کے لئے لکھی گئی ہے مگر اس کے مطالعہ سے پختہ عمر کے لوگوں کو بھی فائدہ ہوگا! کتنے فارسی داں ہیں جن کو ان الفاظ کے معنی معلوم ہوں گے :۔ تبل (سمت) چرغوک (لتو) شنوز (ڈنڈ پیلنا) سرماہک (آنکھ مچولی) قلوالات، شکنجی (چٹکی)، تلنگی (ٹھوکے)، بارکردن (سر چڑھانا)، غلیچ (گدگدی)، چلیک (گلا)، موسیچہ (پیہا) نساس، عنک (کھٹمل) لنگ، در (کواڑ کا پٹ)......

فارسی گرامر بھی بڑے اختصار اور جامعیت کے ساتھ اس کتاب میں منضبط کی گئی ہے اور نوآموزوں کی نفسیات کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے۔

بنگال کے سیاسی حالات کا منظر وپس منظر

از :۔ چودھری علی احمد خاں مرحوم، ضخامت ۸۰ صفحات قیمت ایک روپیہ
ملنے کا پتہ :۔ مکتبہ تعمیر انسانیت گوجر گلی موچی دروازہ لاہور

چودھری علی احمد خاں مرحوم جماعت اسلامی کے انتہائی مخلص اور فعال کارکن تھے، انھوں نے اپنی زندگی اقامت دین کے لئے وقف کردی تھی، مردِ مومن میں جو فراست، بے باکی، عملی قوت اور فکری صلاحیت ہونی چاہیئے اس کے اعتبار سے وہ ایک نمونہ تھے! مشرقی پاکستان میں جماعت اسلامی نے انھیں جماعت کی تنظیم کے لئے بھیجا، اور اس مرد مجاہد نے چار پانچ سال میں جماعت کے کام کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا۔

یہ کتاب چودھری صاحب مرحوم کے مشرقی پاکستان کے قیام اور وہاں کے حالات کے مطالعہ و مشاہدہ کی یادگار ہے! اس کتاب میں انھوں نے بتایا ہے کہ راجہ رام موہن رائے، ایشور چند ودیا ساگر، سوامی دیکانند اور آشوتوش مکرجی نے بنگال کے ہندوؤں کی ترقی اور مسلمانوں پر اُن کے غلبہ و تسلط اور تفوق و برتری کے لئے کیا جدوجہد کی، اور کس حکمت عملی سے کام لیا، کلکتہ یونیورسٹی پر ہمیشہ ہندوؤں کا غلبہ رہا اور مسلمانوں کو زندگی کی کسی منزل میں آگے نہیں بڑھنے دیا گیا، ہندوؤں کی اس پالیسی کا انگریزی حکومت نے بھی ساتھ دیا!

چودھری علی احمد خاں مرحوم نے تقسیم بنگال سے لیکر ۱۹۵۰ء تک کے حالات کا جائزہ لیکر بتایا ہے کہ ہندوؤں نے کس ہوشیاری کے ساتھ "بنگالی قومیت" اور "بنگالی زبان" کا نعرہ بلند کیا ہے، اور مشرقی پاکستان کے نوجوان مسلمان ان نعروں کا کس طرح شکار ہوئے ہیں! اور ہندو اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ مسلم قومیت کے تصور کو ناکام بنادیں!

اس کتاب میں مسلم لیگ، عوامی لیگ، کرشک سرمک پارٹی، نظام اسلام جماعت، گن تنتری دل، کمیونسٹ پارٹی اور خلافت ربانی پارٹی کے موقف پر سرسری تبصرہ ہے!

اور یہ بھی ـــــ کہ نوجوانوں کے سامنے اسلام کو سائنٹفک طرز پر پیش کرنے کے لئے بنگلہ زبان میں کوئی لٹریچر نہیں ـــــ نذر الاسلام مسلمان شاعر ہیں مگر ان کے یہاں ہندو دیوی اور دیوتاؤں کی مدح و مناقب میں نظمیں اور بھجن ملتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض "ترقی پسند" اونچے تعلیم یافتہ مسلمانوں کی لڑکیاں نہایت نہایت ہی فخر سے مشرکانہ رسوم ادا کرتی ہیں اور ہندو دیوی

کے بت کے سامنے ناچتی ہیں، اس پر پھول چڑھاتی ہیں ......"

اور

"ہندو بڑی حد تک دیہاتی، قصباتی اور ایک حد تک شہری کاروبار اور اقتصادیات پر چھایا ہوا ہے۔ کالجوں اور اسکولوں میں اب بھی ہندو اساتذہ کی تعداد کا تناسب نوے (۹۰) فی صدی کے لگ بھگ ہے۔"

اور یہ دردناک **حقیقت** :

"اس وقت بنگال اسمبلی کے قریباً ۳۱۲، ارکان میں سے غالباً ۷۲ ہندو ہیں، باقی مسلمان ارکان متحدہ محاذ اور عوامی لیگ میں بٹے ہوئے ہیں، ان دونوں پارٹیوں کی جنگِ اقتدار نے طاقت کا توازن ہندو کے ہاتھ میں دے دیا ہے۔ دونوں ہی پارٹیاں برسر اقتدار رہنے یا آنے کے لئے ہندو کی خوشامد کر رہی ہیں، ہندو اپنی اس پوزیشن سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہا ہے۔ چنانچہ کسی بھی پارٹی کے پلڑے میں وہ اپنا وزن ڈالنے کے لئے جو قیمت چاہتا ہے وہ ہے (۱) مخلوط انتخاب (۲) بنگلہ زبان (۳) صوبائی اور مرکزی وزارتوں میں اپنی پوزیشن کے مطابق نمائندگی (۴) مشرقی پاکستان کے بجائے اس صوبہ کا نام بنگال (۵) اسکولوں سے مذہبی تعلیم کا خاتمہ (۶) صوبائی خود مختاری اور (۷) اسلامی دستور کے بجائے سیکولر دستور۔"

اور یہ تمام فتنے آج اُبھر کر سامنے آ رہے ہیں!!

آخر میں کتاب کے مصنف نے مشرقی پاکستان میں جماعتِ اسلامی کی کوششوں کا جائزہ دیا ہے، کتاب ان جملوں پر ختم ہوتی ہے :—

"پاکستان اور اسلام کا دارومدار اس پر ہے کہ اس صوبہ کے نوجوان اور تعلیم یافتہ طبقہ کی اکثریت کے ذہنوں سے بنگال نیشنلزم اور کمیونزم کے اثرات کو دور کیا جائے"!

خدیجہؓ تالیف :- شبینہ توفیق بصری، ترجمہ :- شیخ محمد احمد پانی پتی ضخامت ۱۱۲ صفحات، مجلد رنگین گرد پوش کے ساتھ، قیمت دو روپے ملنے کا پتہ: مرکزِ اشاعت امام گلی نمبر ۲ برانڈرتھ روڈ، لاہور۔

ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی سوانح حیات کا یہ عربی سے اردو ترجمہ ہے جسے مرکزِ اشاعت (لاہور) نے خاصے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ ترجمہ کی زبان سادہ اور سلیس ہے، مسلم خواتین کے لئے خدیجہؓ عائشہؓ اور فاطمہؓ کی زندگیاں "نمونہ" اور "مثال" ہیں، اس لئے ان نفوس قدسیہ کی سیرت کی کتابیں مسلم گھرانوں میں زیادہ سے زیادہ عام کئے جانے کی مستحق ہیں!

حضرت خدیجہ کے پہلے شوہر ابو ہالہ تھے، اس دور میں ان کے یہاں دو لڑکے پیدا ہوئے جن کے نام ہالہ اور ہندہ رکھے گئے، یہ نام "لڑکیوں" جیسے ہیں، اس کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ "عرب میں والدین اپنے بچوں کو نظرِ بد سے بچانے کے لئے بعض اوقات ان کے (یعنی لڑکوں کے) نام عورتوں جیسے رکھ دیا کرتے تھے"۔

ترجمہ میں زبان کی کہیں کہیں غلطیاں ملتی ہیں۔

"میں نے انھیں کہہ دیا ہے" (صفحہ ۳۷) "میں نے ان سے کہہ دیا ہے" روزمرہ کے مطابق ہے —— "مسلمانوں کو ارشاد فرمایا" (صفحہ ۷۸) "سے" کا محل تھا —— "کس طرح بپایۂ حقارت ٹھکرا دیا" (صفحہ ۹۲) "پائے حقارت سے ٹھکرا دیا" لکھنا چاہئے تھا —— "حضرت خدیجہ کی مجتمع کردہ ان مصائب نے گھن کی طرح کھا لیا تھا" (صفحہ ۱۰۲) "صحت" کی جمع

"مصنون" اور وہ بھی صرف ایک "فرد" کے لئے؟ وہ عجیب ہی نہیں عجیب تر ہے!

صفحہ ۳۰ پر "عکاظ" کا املا "عکاز" نظر آیا، مدینہ کے قریب ایام جاہلیت میں جو بازار لگا کرتا تھا وہ "عکاظ" ہے "ظ" کے ساتھ "عکاز" تو ایک قسم کے عصا کو کہتے ہیں!

ISLAM VERSSUS MARXISM

از:۔ مولانا محمد فضل الرحمٰن انصاری، ضخامت ۱۰ صفحات۔ ملنے کا پتہ:۔ آل پاکستان اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن، ۱۲ دولت منزل، اگنڈوانی اسٹریٹ قریب جوبلی سینما کراچی۳

مولانا فضل الرحمٰن انصاری نے کئی سال تک پاکستان کے مشہور دینی ماہنامہ "VOICE ISLAM" کی ادارت کے فرائض انجام دئے ہیں، موصوف متعدد کتابوں کے مصنف ہیں اور خانوادۂ ارشادؔ تصوف سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس کتابچہ میں لائق مصنف نے مارکسزم اور اسلام کے بنیادی فرق کو واضح کیا ہے اور بتایا ہے کہ جہاں تک اقتصادی اور سوشل مسایل اور سرمایہ و محنت کا تعلق ہے "اسلام" ان مسائل کو عین فطرت کے مطابق حل کرتا ہے، مارکس کا نقطۂ نگاہ خالص مادی اور غیر فطری ہے، اپنے موضوع پر یہ کتابچہ خوب ہے۔

قاعدہ "مرآۃ القرآن یعنی قرآنی آئینہ"

مرتبہ، الحاج شیخ چاند محمد بی۔ اے (پروفیسر تعلیمات) ضخامت ۴۴ صفحات قیمت آٹھ آنے

ملنے کا پتہ:۔ قرآنی آئینہ اکیڈیمی آرام باغ روڈ، کراچی۔

جناب شیخ چاند محمد صاحب نے اپنی ساری عمر درس و تدریس میں گزاری ہے، اور بچوں کی تعلیم ان کا خاص موضوع رہا ہے، صاحب موصوف نے یہ قاعدہ بڑی محنت اور خلوص کے ساتھ مرتب فرمایا ہے، اس قاعدہ کو جو بچہ سمجھ کر پڑھ لے گا، قرآن پڑھنے میں اسے بڑی آسانی ہوگی، یہ اپنی طرز کا "منفرد" قاعدہ ہے!

مشاہیر علماء نے اس قاعدہ (مرآۃ القرآن) کو پسند فرمایا ہے، جن کی آراء کتاب کے آخر میں درج ہیں، یہ قاعدہ "بلاک" پر چھاپا گیا ہے، جس کے پڑھنے سے آنکھوں میں نور آتا ہے، کاغذ بھی بہت دیدہ زیب ہے، شیخ چاند محمد صاحب نے یہ قاعدہ مرتب کرکے اپنے لئے دین و دنیا میں بڑی سعادت مہیا کی ہے!

کیا دین قائم ہے؟

از: شیبا قادری، ضخامت ۳۲ صفحات، قیمت پانچ آنہ

ملنے کا پتہ: مکتبہ نشاۃ ثانیہ معظم جاہی مارکیٹ، حیدر آباد دکن۔

اس کتابچہ کے مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے:

"یہ رسالہ خاص کر ان مسلمانوں کے لئے لکھا گیا ہے جو بلند پایہ اور مشکل تصانیف کو سمجھنے میں دقت محسوس کرتے ہیں، اس میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ جب دین قائم تھا تو اس کا رنگ ڈھنگ کیسا تھا؟ اس کی حالت کیا تھی؟ اور آج کیا ہے؟ تاکہ مسلمان معلوم کرسکیں کہ دین کی موجودہ حالت ناقابلِ اطمینان ہے اور دین کی جدوجہد ان پر فرض ہے"

اسی تصور کو فاضل مصنف نے اس کتابچہ میں پھیلا دیا ہے، انداز بیان دل نشین اور دردمندانہ ہے، زبان سہل اور آسان ہے، یہ کتابچہ اس کا مستحق ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ مسلمانوں تک پہونچایا جائے۔

عشہ "گوارا" کا املا "گوارہ" البتہ کھٹکا!

مصری افسانے

مترجم:- طاہر سورتی، نظرثانی نعیم احمد ملک، ایم۔ اے، ضخامت ۲۴۳ صفحات، قیمت ایک روپیہ چار آنہ
ملنے کا پتہ:- انجمن ترقی تعلیم خوشاب ضلع (پاکستان)

حضرت مولانا محمد سورتی مرحوم عربی لغت و زبان کے امام تھے، انہی کے لائق فرزند مولانا عبدالرحمن طاہر سورتی نے عربی زبان کے سات افسانوں کا اردو میں منتقل فرمایا ہے ـــــ عنوانات:

سفرِ حیات ـــ چاندی کے تیس سکے ـــ اپنا مجرم ـــ فورشال ـــ موت کا تعاقب ـــ خداوندا! اے گگری بھر کے لئے بلادے ـــ مکافات۔

ترجمہ اس قدر شگفتہ اور رواں ہے کہ "ترجمہ" ہی نہیں معلوم ہوتا، افسانے بھی دلچسپ سبق آموز اور شستہ ہیں، زبان بھی اچھی ہے، دو چار جگہ ضرور کھٹک محسوس ہوئی: "گھبرایا ہوا" کو صفحہ ۵۳ پر "گبھرایا ہوا" لکھا گیا ہے ـــ "قدموں کی چاپوں" (صفحہ ۵۸) "چاپ" کی جمع (چاپوں) کچھ بھلی نہیں لگتی ـــ "خود بوڑھی کو غلطی لگ جاتی" (صفحہ ۱۲۲) "غلطی لگنا" محاورہ نہیں ہے!

مولانا طاہر صاحب اگر منہاج السنہ اور حجۃ اللہ البالغہ جیسی بلند پایہ کتابوں کو دلنشین اردو میں منتقل فرما دیں تو وہ دین و ادب کی بہت بڑی خدمت انجام دیں گے:

آسان ریاضی حصہ ۵

مرتبہ:- شوکت علی (بی۔ اے، ایل۔ ٹی) ضخامت ۱۹۲ صفحات، قیمت ایک روپیہ چار آنہ،
ملنے کا پتہ: مکتبہ جماعت اسلامی (ہند) رام پور (یو۔ پی)

ہم اپنی طالب علمی کے زمانہ میں یہ سُنا کرتے تھے کہ مسلمان حساب میں کچے ہوتے ہیں مگر جماعتِ اسلامی ہند نے طلباء کے لئے "ریاضی" کا نصاب مرتب کر کے، یہ ثابت کر دیا کہ فراستِ مومن علم و فن کے ہر شعبہ میں اپنے جوہر دکھا سکتی ہے!

"آسان ریاضی" کے اس پانچویں حصہ میں کسور اعشاریہ، حسابِ تجارت، الجبرا اور علم ہندسہ کے ضروری قاعدوں کو آسان ترین انداز میں پیش کیا گیا ہے، یہ کتاب طلباء کو ریاضی جیسے خشک مضمون سے مناسبت اور دلچسپی پیدا کرانے میں مدد دے گی!

اللہ تعالیٰ اس کتاب کے مرتب کو دارین میں جزائے خیر عطا فرمائے کہ انہوں نے "ریاضی" میں بھی جگہ جگہ دینی تصورات کو سمویا ہے

ـــ ساجد ایک گھنٹہ میں $\frac{3}{4}$ پارہ قرآن مجید پڑھتا ہے، تو ۳ گھنٹہ میں کتنا پڑھے گا؟

ـــ سلیم نے رمضان شریف کے $\frac{11}{15}$ حصہ میں روزے رکھے، تو بتاؤ اسے کتنے روزوں کی قضا کرنی ہے؟

ـــ فجر کی نماز میں ۴ صفیں تھیں، اور ہر صف میں ب نمازی تھے، بتاؤ کل نمازی کتنے تھے (الجبر والمقابلہ)

یہ وہ نیک لوگ ہیں کہ جو ہر محاذ پر اللہ کے دین کے لئے جد و جہد کر رہے ہیں، اور جن کو زندگی کی منزل میں ایک ایک قدم پر اللہ تعالیٰ کی خوشنودی مطلوب ہے!

اسلامی نظام

از:- مولانا تمنا عمادی مجیبی پھلواروی، ضخامت ۵۹ صفحات، قیمت درج نہیں، ملنے کا پتہ: اسلامک کوئیزیم ڈھاکہ

اس کتاب میں "اسلامی نظام" سے بحث کی گئی ہے اور فاضل مصنف نے بڑے اخلاص اور دردمندی کے ساتھ یہ کتاب لکھی ہے وہ یہ چاہتے ہیں کہ اسلامی حکومت میں، قوانین اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی تعلیم کے مطابق نافذ ہوں اور اسلامی حکومت کسی ایک فرد یا جماعت کی اجارہ داری بن کر رہ جائے، ان کے اس نظریہ کی صحت سے کون انکار کر سکتا ہے!

مولانا تمنا عمادی نے بعض فقہی مسائل پر بھی گرفت کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ کان میں تیل ڈالنے اور انجکشن لگانے سے روزہ ٹوٹنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، روزہ تو چور بازاری کرنے، جھوٹ بولنے اور فحش بکنے سے ٹوٹ جانا چاہیئے جس کے بارے میں فقیہانِ کرام خاموش ہیں۔

مصنف کے بیان میں کہیں کہیں تضاد بھی ملتا ہے، ایک طرف وہ یہ کہتے ہیں:

"خلافتِ راشدہ جس عنوان سے چلی تھی دیر پا نہ رہ سکی، اس لئے کہ اس میں انتہا پسندی تھی (صفحہ ۱۰۳) لیکن اسی کتاب کے صفحہ ۹۹ پر انھوں نے اعتراف کیا ہے کہ

"حقیقت یہ ہے کہ وعدہ الٰہی خلافتِ راشدہ میں پورا اترا ۔۔۔"

اور ان کا یہی خیال صحیح ہے! اگر "خلافتِ راشدہ" بھی اسلامی حکومت کے لئے معیار اور نمونہ (MODEL) قرار نہ پائے، تو پھر اسلامی حکومت! افلاطون کی ریاست کی طرح ایک "خیالی حکومت" بن کر رہ جائے گی! "خلافتِ راشدہ" پر انتہا پسندی کا الزام لگانا حریتِ فکر نہیں "آوارگی فکر" کی دلیل ہے۔

فاضل مصنف "ملوکیت" کو غیر اسلامی چیز نہیں سمجھتے اور اس پر قرآن کی اس آیت سے وہ دلیل لاتے ہیں کہ:-

"اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا" (صفحہ ۱۰۲) اس صفحہ پر انھوں نے لکھا ہے:

"خلفائے راشدین کی شہادت کے بعد خلافت کا دور ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا! آج کل جو لوگ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا نام لیا کرتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ پھر خلافت فاروقی قائم کی جا سکتی ہے، وہ گویا قصداً دھوکا دیتے ہیں یا افیونی کی طرح خیالی منصوبے باندھا کرتے ہیں۔"

ظاہر ہے "ملوکیت" کو جو شخص پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے، وہ "خلافتِ راشدہ" کی اہمیت کا پورے طور پر احساس نہیں کر سکتا! مولانا عمادی نے جس انداز میں یہ بات کہی ہے، اسی انداز پر یہ بھی کہا جا سکتا ہے:

"وہ شخص افیونی کی طرح باتیں کرتا ہے" جو یہ کہتا ہے کہ صحابہ کے دور میں جو تقویٰ پایا جاتا تھا۔ اسی طرح کا تقویٰ مسلمانوں میں پایا جانا چاہیئے ۔۔۔ اور وہ شخص احمقوں کی جنت میں رہتا ہے۔ جس کا یہ دعویٰ ہے کہ اسلامی معاشرہ میں قرنِ اول کا رنگ پیدا ہونا چاہیئے ۔۔۔"

ہم عرض کرتے ہیں کہ قرآن پاک جو اخلاق کا معیار پیش کرتا ہے اس پر ٹھیک سو فی صدی کون پورا اُتر سکتا ہے؟ تو اس سے کیا یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ قرآن کے "معیارِ اخلاق" کا جو شخص نام لیتا ہے وہ افیونیوں کی سی باتیں کرتا ہے!! کاش! اس قسم کے خلجانات اس کی [illegible]

مولانا مودودی اور تصوّف

از:- ابو منظور شیخ احمد ضخامت ۱۵۲ صفحات، قیمت ایک روپیہ (۵۰ نئے پیسے) [illegible]

ملنے کا پتہ: اسلامک بک سینٹر مسجد چوک حیدرآباد (آندھرا پردیش)

مولانا ابو منظور شیخ احمد صاحب کا یہ گرانقدر مقالہ ماہنامہ "تجلی" (دیوبند) کے "خاص نمبر" میں چھپ کر قبولِ عام کی [illegible] پا چکا ہے، اسلامک سینٹر نے اب اسے کتابی صورت میں شائع کیا ہے جس پر ماہر القادری مدیر "فاران" نے "پیش لفظ" اور مولانا عامر عثمانی نے "مقدمہ" لکھا ہے!

یہی مقالہ پاکستان میں بھی اسی نام اور عنوان سے مکتبۂ جہانِ نو سرگودھا سے شائع ہوا ہے جس پر جناب اسعد گیلانی نے "تعارف" لکھا ہے، اس کی قیمت ڈیڑھ روپیہ ہے! یہ مقالہ ہر اعتبار سے وقیع اور جاندار ہے، فاضل مضمون نگار نے فکر و عقل کے توازن کو اس میں سمو دیا ہے، دلائل بہت وزنی اور مُسکت ہیں: اس مقالہ کا خلاصہ یہ ہے کہ "تصوف" اگر صدقِ مقال [illegible] اکلِ حلال، تزکیۂ نفس، تقویٰ اور پاکیزگی ہی کا نام ہے، تو پھر مولانا ابو الاعلیٰ مودودی "تصوف" کے مخالف نہیں بلکہ اس کے مؤید ہیں!

ہر قسم کے درد
سے فوری نجات کیلئے
انالجین ٹکیاں
ANALGIN
SPOTLIT

آدم جی کے پارچہ جات
دیرپا ہوتے ہیں
ACM
آدم جی کاٹن ملز لانڈھی کراچی

فاران
کراچی
پاکستان
ماہر القادری

نظم و ترتیب

پرنٹر پبلشر سرور حسین، مطبع سعیدی، قرآن محل مقابل مولوی مسافر خانہ کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

دین و سیاست اور ملک و ملت کے بہت سے ضروری مسائل ہیں جن پر زیادہ سے زیادہ لکھنے اور توجہ دلانے کی ضرورت ہے، ملت کے ہر شعبۂ حیات میں بگاڑ پایا جاتا ہے اور مسلمانوں کا پورا معاشرہ جاہلیت میں ڈوبا ہوا ہے، اور اُسی کا ایک فرد بلکہ مجرم "نقشِ اوّل" کا قلم کار بھی ہے، ان احوال و کوائف اور اہم مسائل کے ہجوم میں اتنی فرصت کہاں ہے کہ کسی ایک شخصیت کی طرف سے ہم مدافعت کریں، یا "فاران" کو کسی کا صحیفۂ مناقب بنا دیں، ہر شخص اپنے قول و فعل اور کردار کا ذمہ دار ہے، دین کے کام میں جس کے اخلاص میں جتنی کمی ہوگی، اسی کے بقدر اس کا اجر کم دیا جائے گا، یعنی اس شخص کو اجر تو ملے گا مگر "اجرِ غیر ممنون" کا شاید وہ حقدار اور مستحق نہ ہوگا! بہرحال یہ تو ہمارے اندازے اور تخمینے ہیں، اللہ کے غضب اور رحمت کا کوئی یقینی پیمانہ بندوں کے پاس نہیں ہے، اس شہنشاہِ مطلق کی حکمتیں ہماری سمجھ سے باہر ہیں!

مولانا مودودی پر "نقشِ اوّل" میں اسی وقت کچھ لکھا گیا ہے، جب ہم نے یہ محسوس کیا ہے کہ اُن کی ذات پر جارحانہ تنقید کا اثر اقامتِ دین کی تحریک پر پڑ رہا ہے، یہی جذبہ اس تحریر کا اصل محرک ہے، ہمیں یہ دعویٰ نہیں ہے کہ ہمارے قلم سے جو لفظ بھی نکل جاتا ہے وہ لازمی طور پر "حق" ہوتا ہے، اور ہم اصلاح و تقویٰ کے منصب بلند پر فائز ہیں، یہ ایک عاصی و خاطی بندہ کی تحریر ہے، جو اپنے کردار کی کمزوریوں کا اعتراف کرتا ہے! جو حضرات اپنے تقویٰ کا احساس رکھتے ہوں اور دوسروں کے تقویٰ کو جانچنے اور پرکھنے کی صلاحیت جن میں پائی جاتی ہو، اُن کی خدمت میں ہماری مودبانہ گذارش ہے کہ وہ ہمارے معروضات پڑھتے وقت نفس کی کمزوریوں کا تھوڑا سا الاؤنس ہمیں دیدیں، تو ان کی بڑی نوازش ہوگی! اللہ کا فضل ہو تو کبھی کبھی گنہگار بھی کام کی بات کہہ جاتے ہیں، اور عمل میں کوتاہی کرنے والے بھی اخلاص اور سوز و گداز کی نعمت سے قطعاً محروم نہیں کر دیے گئے، نالۂ نیم شبی اور آہِ سحرگاہی کی توفیق ان پر بند نہیں کی گئی، مانا کہ ان کے دامن میں "اشک ہائے ندامت" کے سوا اور کچھ نہیں ہے مگر جہاں تک اسلام کی خیرخواہی اور دردمندی کا تعلق ہے "یہ گنہگار لوگ" اہلِ تقویٰ" سے شاید ایک قدم بھی پیچھے نہ ہوں! کاش! دل دکھانے کی چیز ہوتی!

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی ذات تنقید و احتساب اور طعن و طنز کا جس قدر ہدف بنی ہے، ملت میں شاید ہی کسی اہلِ قلم مفکر اور عالمِ دین کے ساتھ یہ سلوک کیا گیا ہو اور اسے اتنے بہت سے چرکے سہنے پڑے ہوں، وہ تو مودودی صاحب کی ہمت اور سخت جانی ہے کہ وہ ناوک فگنوں کے ایک ایک تیر کو کلیجہ پر لیتے چلے جا رہے ہیں، کوئی دوسرا ہوتا تو شاید میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوتا۔

مودودی صاحب کے نام پر اعتراض کہ تمہارا نام "ابوالاعلیٰ" کیوں ہے؟ جماعت اسلامی پر طنز کہ کیا اس جماعت کے سوا مسلمانوں کی تمام دوسری پارٹیاں اور جماعتیں "غیر اسلامی" ہیں ـــــ یہ پیش گوئی کہ مودودی صاحب چند دن کے بعد مجددیت یا مہدویت کا دعویٰ کرنے والے ہیں ـــــ یہ کہ مودودی صاحب گناہِ کبیرہ کے مرتکب کو کافر سمجھتے ہیں اور ان کی تحریروں سے خارجیت کی بو آتی ہے ـــــ یہ بھی کہ جماعت اسلامی کا جو اساسی منشور ہے اس کی ایک دفعہ سے صحابہ کرام کی توہین کا پہلو نکلتا ہے ـــــ یہ کہ مودودی صاحب "منکرِ حدیث" ہیں ـــــ دشمنی اور عداوت کی حد ہو گئی کہ مودودی صاحب کو مرزا غلام احمد قادیانی کا مشابہ و مثیل ٹھہرایا گیا! اور ستم بالائے ستم یہ کہ "احتیاط و تقویٰ" اور پاکبازی و نیکوکاری نے تمام و کمال نیک نیتی (؟) کے ساتھ مولانا مودودی کی تحریروں میں کتربیونت اور تحریف کی، اور ان کو وہ معنی پہنائے جو صاحبِ تحریر کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھے!

مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے خلاف برسوں سے الزام تراشی اور تہمت سازیوں کا یہ فتنہ برپا کیا جا رہا ہے! کہیں کہیں تو ایسا بھی ہوا کہ کسی دیوبندی عالم نے جماعت اسلامی والوں کو "مودودیے" کا لقب دے کر فتویٰ صادر فرمایا کہ یہ لوگ دین سے خارج ہیں، نہ ان کے پیچھے نماز درست ہے اور نہ ان کے ساتھ نماز پڑھنی چاہیے ـــــ اس ظلم و ستم، ناانصافی اور فتنہ پردازیوں کے باوجود نہ کسی کے "تقویٰ" پر کوئی آنچ آئی، نہ کسی کے دامنِ زہد و تقدس کا تار ادھر سے ادھر ہوا اور نہ کسی کی "خشیتِ الٰہی" میں کوئی کمی واقع ہوئی، بلکہ کیا عجب ہے کہ صدق و تقویٰ اور کشف و شہود کے جو مقامات ان بزرگوں کی نگاہ میں ہیں، ان میں کچھ رفعت ہی پیدا ہو گئی ہو!

مولانا مودودی کے خلاف جتنے حربے بھی اب تک استعمال ہو چکے ہیں، وہ اللہ کے فضل سے سب کے سب بیکار اور ناکام ثابت ہوئے، لوگوں نے مولانا مودودی کی کتابوں کو پڑھا اور جماعت اسلامی کے ارکان کی زندگیوں کو دیکھا تو ان تہمتوں اور الزاموں کی قلعی کھل گئی، اور حقیقتِ حال کا انکشاف ہو گیا! یہ تہمت طراز چاہے زبان سے اقرار نہ کریں، مگر ان کے ضمیر اندر ہی اندر چٹکیاں لیتے ہوں گے کہ ہم نے یہ کیا کیا؟

اب مولانا مودودی پر تازہ ترین طنز یہ کی گئی ہے کہ ان کی زندگی میں تقویٰ کی کمی پائی جاتی ہے، اور ان کی سیرت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا وہ "رنگ و بو" نہیں ہے، جسے دیکھ کر اہلِ ایمان کے دلوں میں کشش اور اطمینان کا سامان پیدا ہو ـــــ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کی صفائی میں مودودی صاحب لب کشائی نہیں کر سکتے! ہم عرض کرتے ہیں کہ مودودی صاحب تو بیچارے کیا چیز ہیں کوئی حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہ کہتا کہ حضرت! آپ اخلاقِ محمدی کا کامل نمونہ نہیں ہیں، تو وہ بھی یہی اعتراف کرتے کہ ہاں! بھائی! مجھ میں بہت سی کوتاہیاں پائی جاتی ہیں میں اسی کوشش میں لگا رہتا ہوں کہ کسی طرح اخلاقِ محمدی کی جھلک اور خوشبو مجھ میں پیدا ہو جائے، وہ اپنی صفائی میں یہ نہ فرماتے کہ نہیں! تم غلط کہہ رہے ہو، میں تو مجسم اخلاقِ رسول اور سراپا سیرتِ نبوی بن گیا ہوں! کوئی شخص

واقعی "مقامِ تقویٰ" پر فائز ہو اور کوئی محتسب اور تنقید نگار اس پر تقویٰ کی کمی کی طنز کرے، تو وہ صاحبِ تقویٰ اپنی صفائی میں یہ نہ کہہ سکے گا کہ تم مجھ پر تہمت جوڑ رہے ہو، میں تو مطلوب تقویٰ کے معیار سے بال برابر بھی ہٹا ہوا نہیں ہوں؟۔

اس گذارش کے بعد ہم جو کچھ آگے عرض کرنا چاہتے ہیں اس سے مبادا کسی کو کوئی غلط فہمی پیدا ہو، اس لئے ہم یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہی انسانیت کے لئے معیارِ کامل ہے، اہلِ ایمان کو اسی کی نقل اتارنے کی کوشش میں اپنی پوری زندگی صرف کر دینی چاہیئے، اور اس کے بعد صحابہ کرام کا "تقویٰ" ہی اسلام کو مطلوب ہے، اور اسی "تقویٰ" کی قربت، مماثلت اور عکس پذیری کی سعی کرنی چاہیئے۔ عہدِ صحابہ کے بعد بنو امیہ اور بنو عباس کے دور میں عام طور پر علماء و صلحاء میں صحابہ کرام کے تقویٰ کی شان نظر نہیں آتی، تو اس سے ہم اپنی یا کسی دوسرے کی کوتاہی، غفلت اور نفسِ دنی کے لئے جواز کا کوئی پہلو پیدا نہیں کر سکتے۔ اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو وہ بہت بڑی بد توفیقی کا ثبوت دیتا ہے۔ ہم خود اپنی تحریروں کا اپنے ذاتی حالات سے مقابلہ کرتے ہیں، تو اللہ جانتا ہے کتنی پشیمانی اور ندامت ہوتی ہے، اور سب سے زیادہ پشیمانی کا وقت تو وہ ہوتا ہے، جب ہمارے مضمون کی مدح و ستائش میں کسی کا کوئی مکتوب ہمیں ملتا ہے۔

صحابہ کرام (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) بیشک عدول اور اہلِ تقویٰ تھے مگر ان سب کے حالات بالکل ایک جیسے نہ تھے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ دنیا سے اور مال و دولت سے آخری درجہ کی بے رغبتی رکھتے تھے؛ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کی زندگی میں یہ "شانِ ابوذری" نہیں ملتی، ایک طرف مال و دولت سے انتہائی نفرت۔ رشد و ہدایت کا یہ رنگ [illegible] پسندیدہ، اور دوسری طرف تجارت اور مال و دولت کی وہ فراوانی کہ شام اور دوسرے مقامات سے سینکڑوں اونٹ مالِ تجارت سے لدے ہوئے مدینہ میں چلے آ رہے ہیں؛ لیکن کس کی مجال ہے جو یہ کہہ کر اپنا دین و ایمان تباہ کرے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو مال و دولت سے چونکہ نفرت تھی اس لئے وہ سراپا اخلاص اور مجسم تقویٰ تھے، مال و دولت کی فراوانی کے سبب حضرت عبدالرحمن ابن عوف کی زندگی میں "اخلاص و تقویٰ" کی کمی تھی (خاک بدہنِ گستاخ)! حضرت ابوذر رضی اللہ کا زہد کوئی شک نہیں بے نفسی اور للہیت کی معراج مگر حضرت عبدالرحمن ابن عوف رضی اللہ عنہ کے مال و دولت سے زکوٰۃ اور انفاق فی سبیل اللہ کی شکل میں امت کو جو فائدہ پہونچا اس کی اہمیت اور افادیت سے بھی کون صرفِ نظر کر سکتا ہے! اور پھر انھوں نے عیسائی اور یہودی تاجروں سے لین دین میں جس دیانت و احتیاط سے کام لیا اس کی افادیت پر بھی تو غور کیجئے کہ غیروں کے دلوں پر اسلام کی عظمت کے نقش ثبت کر دئے کہ اہلِ ایمان تجارت اور معاملت اس طرح کیا کرتے ہیں؟

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے "زہد فی المال والدنیا" کا مقام بہت بلند ہے، اللہ تعالیٰ اس کی ذرا سی ہی پرچھائیں ہم نفس کے بندوں اور پیٹ کے کتوں پر ڈال دے! مگر حضرت عبدالرحمن بن عوف کی "تجارت اور مال" سے جو امت کو فائدے پہنچے، وہ حضرت ابوذر کے زہد و تقشف سے کہاں پہنچ سکتے تھے!

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کے نماز، روزے، ذکر و تسبیح اور دنیا سے بے رغبتی کی جو روایتیں کتابوں میں ملتی ہیں، اتنی اور ایسی روایتیں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں نہیں ملتیں، مگر حضرت ابوہریرہؓ کے ذریعہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی جتنی کثیر تعداد امت کو پہونچی ہے، اس کی افادیت

اور خیر و برکت کا بھلا کوئی اندازہ کر سکتا ہے، اُمت کو کتنا دین ابوہریرہؓ کے واسطے سے ملا ہے۔

علماء دین اور اسلام کے خدمت گزاروں پر تنقید کرتے وقت اُن کی زندگی کے تمام پہلو سامنے رہنے چاہئیں، کسی میں کسی خاص صفت کی کمی یا کوتاہی دیکھ کر یہ حکم لگا دینا ٹھیک نہیں کہ فلاں شخص میں چونکہ تقویٰ کی کمی ہے، اس لئے اس کی ذات سے خیر کی توقع ہی نہیں رہی، شخصیتوں کے بارے میں ایسے حکم لگانا، اور اُن کی اشاعت کرنا خود "تقویٰ" کے نقطۂ نگاہ سے بھی کوئی پسندیدہ فعل نہیں ہے!

مولانا مودودی نہ تو "تقویٰ" کے مدعی ہیں، نہ جماعتِ اسلامی کے منتسبین نے اُن کے "تقویٰ" کے افسانے لوگوں میں مشہور کر رکھے ہیں، اور نہ "نقشِ اول" لکھنے والے نے مولانا موصوف کی ذات سے عقیدت کے باوجود ان کی زندگی کو معیاری زندگی سمجھا ہے۔ مودودی صاحب کی زندگی اور اُن کے احوال کی مختصر کیفیت یہ ہے کہ وہ "معروفات" کا اہتمام کرتے ہیں، "منکرات" سے بچتے ہیں (یعنی باتوں میں مبتلا نہیں ہیں) حلال روزی کھاتے ہیں، اور ان کی تمام کوششوں کا محور "اللہ کے دین کی سربلندی" ہے، اسی کے لئے وہ برسوں سے کام کر رہے ہیں! اللہ کے فضل سے ہم اُن کی ذات سے اندھی عقیدت نہیں رکھتے، مودودی صاحب بشری کمزوریوں سے خالی نہیں ہیں، ان سے فکر و نظر کی لغزشیں بھی ہوئی ہیں اور اُن کے نفس کو خیر پسند ہونے کے باوجود تزکیہ کی ضرورت ہے کہ اس آئینہ پر تو ہر وقت صیقل ہوتی رہنی چاہئے، ذرا سی غفلت سے یہ غبار آلود ہو جاتا ہے!

مودودی صاحب کی سیدھی سادی زندگی ہے، بناوٹ ان کو آتی ہی نہیں، وہ برسوں کے بعد بھی کسی عزیز دوست سے ملیں گے تو اُس سے بے اختیار لپٹ نہیں جائیں گے، ان کی اس سنجیدگی کو دیکھ کر کوئی یہ حکم بھی لگا سکتا ہے کہ ان میں جذباتِ محبت کی گرمجوشی نہیں ہے، مگر اس تصویر کا ایک رُخ یہ بھی تو ہے، کہ:

؎ طوفان اُسی میں بند ہیں جو آنکھ تر نہیں

مولانا مودودی کی صاف ستھری معاشرت ہے، وہ سلیقے کے ساتھ رہتے ہیں اور قرینے کے کپڑے پہنتے ہیں، صرف اس لئے کہ بعض لوگوں کو اُن کا رہن سہن کھٹکتا ہے، وہ لوگوں کو دکھانے، معترضین کو مطمئن اور اپنے مداحوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کے لئے "مصنوعی فقیری" اختیار نہیں کرتے ــــ جن لوگوں کے دلوں میں مودودی صاحب کا طرزِ معاشرت کھٹک پیدا کرتا ہے، ہم نے اُن کے پاس بھی قیمتی گھڑیاں اور جاڑوں میں خاصہ آرام دہ لباس دیکھا ہے، پیوند پر پیوند وہ بھی نہیں لگاتے، اور اُن کی کمر سے کھجور کی چھال کی رسیاں بندھی رہتی ہیں، اور نہ وہ جو کی روٹی آدھے پیٹ زیتون کے تیل یا سرکے سے کھاتے ہیں! اُن کے گھروں میں بھی فاقہ نہیں رہتا بلکہ دن میں تین تین وقت چولہے جلتے ہیں، اور ان کے مکانوں میں بھی مٹی کے چراغوں کی جگہ بجلی کے قمقمے جگ مگ کرتے ہیں! اور نہ اُن کے شانوں پر دوسروں کے پانی کی مشکیں ڈھوتے ڈھوتے نیل اور گھٹے پڑ گئے ہیں! "سادگیٔ معاشرت" جن بزرگوں کا موضوع ہے، خود اُن سے بھی سادہ زندگی بسر کرنے کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے! اور احسان و تقویٰ میں وہ بھی کامل نہیں ہیں۔

ہاں، مودودی صاحب کو ہم نے اس حالت میں بیشک نہیں دیکھا کہ کسی دینی بات پر وہ جھرجھری لے کر اپنی آنکھوں کو اوپر نیچے کرنے لگیں، ایک خاص ماحول میں پرورش پایا ہوا شخص یہ رائے قائم کر سکتا ہے کہ ان میں جذب و کیف کی کمی پائی جاتی ہے ــــ اُن کے ہاتھ میں تسبیح نہیں رہتی، نماز پڑھنے کے بعد وہ اُٹھ کر چلے جاتے ہیں اور کسی دینی کام ہی میں

مصروف ہوجاتے ہیں، کوئی دیکھنے والا کہہ سکتا ہے کہ ذاتی تزکیۂ نفس کے لئے نماز کے بعد مراقبہ بھی ضروری تھا، مگر دین کے جس کام میں وہ لگ جاتے ہیں، اجتماعی فوائد کے اعتبار سے وہ بھی کچھ کم قابلِ قدر کام نہیں ہوتا!

جب اُن کو سزائے موت کا حکم سنایا گیا ہے، اس وقت بھی لوگوں نے اُن کو مضطرب نہیں پایا، اور نہ اُن کے چہرے کو تمتمایا ہوا دیکھا ــــ اُن کے اس ضبط و صبر اور ظرف و سنجیدگی کو دیکھ کر کیا یہ رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ اُن کو نہ اپنی زندگی سے محبت ہے اور نہ اپنے بیوی بچوں کا غم ہے، اس سے اندازہ لگایئے کہ اُن کا باطن کس قدر بے تاب و پرشور ہوگا مگر اُن کی سنجیدگی سے سوزِ اندروں ظاہر نہیں ہو پاتا، اس شخص کے تو ظرف کی داد دینی چاہیئے، جس کے اندر آتش کدہ سُلگ رہا ہو مگر اُس کے تیور نرم و سرد ہوں! ظاہر و باطن کے اس عالم کی تو فقر و تصوف کی کتابوں میں بڑی تعریف آئی ہے!

مودودی صاحب بے تکلف صحبتوں میں ہنسی دل لگی کی باتیں بھی کرتے ہیں، مگر اُس مزاح و ظرافت میں بعض اوقات دین کے بڑے کار آمد نکتے بیان کر جاتے ہیں، میں نے ایک بار اُن سے پوچھا کہ اس "امکانِ کذب" کی بحث سے مجھے عجیب خلجان ہوتا ہے، آپ اس پر کچھ روشنی ڈالیئے۔ اس پر وہ بولے:

> "بھئی! مجھے حیرت ہے کہ اس قسم کے تصورات ذہن میں پیدا کیوں ہوتے ہیں! کیا کسی شخص کو اس طرز پر سوچنا چاہیئے ــــ وہ یہ بات زبان سے نکالنی چاہیئے کہ میں اپنی ماں سے زنا تو کر سکتا ہوں مگر کروں گا نہیں"

اس سلسلہ میں آخری بات ہمیں یہ کہنی ہے کہ مودودی صاحب سے کوئی احسان و تقویٰ، پاکیزگی و طہارت، اور سادگی معاشرت کا جتنا بھی زیادہ سے زیادہ مطالبہ کرتا ہے، اس کے مطالبہ کی قدر ہی کرنی چاہیئے اور خود مودودی صاحب کو ایسے مخلص اہلِ احتساب کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے، مگر جو کوئی اصلاح کا یہ انداز اختیار کرتا ہے ــــ چونکہ مودودی صاحب کی معاشرت سادگی کی اس خاص سطح تک نہیں آئی اور اُن کا تقویٰ اس ممتاز مقام تک نہیں پہنچا، لہٰذا ان کی ذات سے خیر و فلاح کی توقع ہی نہیں رہی ــــ وہ اصلاح کے پردے میں فساد کا بیج بوتا ہے!

نیا حربہ!

ایک تو وہ اہلِ قلم اور اہلِ فکر و نظر ہیں جو خود فسق میں مبتلا ہیں، اور فسق کو پھیلتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں اور جو فحاشی و معصیت کے مبلغ ہیں، ان لوگوں کی گمراہی میں کون شک کر سکتا ہے ــــ

دوسرے وہ اربابِ خامہ و قرطاس ہیں جو خود تو برائیوں کا شکار ہیں مگر ان کے زبان و قلم سے نیکی کی باتیں ہی نکلتی ہیں اور وہ نیکی کا فروغ ہی چاہتے ہیں۔ ایسے لوگ رفتہ رفتہ سنبھل جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ انھیں توبہ و انابت اور اصلاحِ حال کی توفیق عطا فرما دیتا ہے ــــ تیسرے وہ صاحبانِ فکر و نظر ہیں جو اللہ کے فضل سے فواحش و منکرات میں مبتلا نہیں ہیں اور پسندیدہ اخلاق رکھتے ہیں اور جن کے زبان و قلم حق کی تبلیغ کے لئے وقف ہوتے ہیں، ان کی بعض صفات اس معیار کے عین مطابق ممکن ہو سکتا ہے کہ نہ ہوں، جس کی وہ تبلیغ کرتے ہیں مگر ان کا کردار ان کی تقریر و تحریر کی نفی نہیں کرتا، اس مزاج، کردار اور فکر کے اہلِ علم سے دُنیا کو فائدہ ہی پہونچتا ہے، اُن کی ذات سے خیر ہی پھیلتا ہے، شر نہیں پھیلتا، اور اس دورِ انحطاط میں تو ایسے اہلِ قلم اور اربابِ علم کا وجود

---

٥٠ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا ان لفظوں میں اظہار کہ "اللہ جھوٹ بول تو سکتا ہے مگر بولے گا نہیں!"

ایسا غنیمت ہے!

مولٰنا ابوالاعلیٰ مودودی انہی لوگوں میں سے ہیں جو اپنے عنفوانِ شباب ہی سے اپنے قلم سے دین کی خدمت کر رہے ہیں، اور انھوں نے جس جماعت کی بنا ڈالی ہے اس کا مقصود "اقامتِ دین" اور حصولِ رضائے الٰہی کے سوا اور کچھ نہیں ہے، انھوں نے اور جماعتِ اسلامی نے خیر و فلاح ہی کی طرف لوگوں کو دعوت دی ہے، اور ہم ان سے مستقبل میں بھی اسی نیکی کی توقع رکھتے ہیں! اب رہیں غلطیاں اور کمزوریاں تو اس سے کون پاک ہے، جو اہلِ تقویٰ اور صاحبانِ ذکر و شغل ہیں، وہ جو کچھ زبان سے کہتے اور قلم سے لکھتے ہیں، کیا اُن کی زندگیاں حرف بحرف ان کے اقوال و نگارش کے مطابق ہیں، انبیاء کی تعلیم اور صحابہ کرام کی زندگیوں کی طرف اُمت کو بلانے والے کیا اپنے کردار میں ہو بہو صحابہ کے مشابہ ہیں؟ نقص و کمی سب میں پائی جاتی ہے، کسی میں زیادہ کسی میں کم! یہ کمی دور ہی ہونی چاہیئے اس نقص کو کمال سے بدلنے کی جدوجہد ضروری ہے، مگر کمی "ضلال و گمراہی" نہیں ہوا کرتی اور اس پر "ضلال و فتنہ" کا فتویٰ لگانا بڑی غیر ذمہ داری کی بات ہے!

ضلال اور تقویٰ کی کمی کی سامنے کی مثالیں یہ ہیں کہ مصر کے ڈکٹیٹر جمال ناصر کی ذات سے "ضلال" ہی ضلال پھیلا ہے اور شاہ سعود بہت سی کمزوریوں کے باوجود اپنی ذات سے خیر و فلاح کے ضامن ہیں! کسی کی ایک کمزوری اور غلطی اور نقصِ کمال کو اس کی پوری زندگی پر پھیلا دینا، کوئی انصاف کی بات نہیں ہے،

تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو یزید کی ولی عہدی کی سب سے پہلے رائے حضرت مغیرہ ابن شعبہ رض نے دی تھی! —— تو اب کوئی اُن کے شرفِ صحابیت، دین کی خدمت اور تمام دوسری صفات کو نظر انداز کر کے صرف اسی ایک واقعہ کو موضوعِ تنقید بنالے، تو یہ کتنی بڑی زیادتی اور غلط اندیشی ہوگی —— حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کی دوسری خوبیوں کو پسِ پشت ڈال کر کوئی یہ سوچنے بیٹھے کہ وہ "ستار" اور "موسیقی" کے شوقین تھے اور ان کی عمر کا خاصہ حصہ شاہزادوں اور بادشاہوں کی درباداری میں گزرا ہے اور بادشاہوں کی درباداری وہی کر سکتا ہے جو اُن کا مزاج شناس اور ہاں میں ہاں ملانے والا ہو —— تو ایسا تنقید نگار کیا خسرو کے ساتھ پورا انصاف کر سکے گا؟

اسی زمانہ کے ایک بہت بڑے شیخِ وقت جو وفات پا چکے ہیں، ان کے بارے میں ثقہ لوگوں نے تواتر سے کہا کہ وہ اپنے حاشیہ نشینوں کی لکھی ہوئی عبارتوں پر فتویٰ صادر کر دیتے ہیں، اصل عبارتیں پڑھنے کی انھیں فرصت نہیں ملتی —— یہ بڑی بے احتیاطی کی بات ہے مگر اُن کی اس کمزوری کو اُن کی تمام اچھی صفات پر پھیلا دینا، کس قدر ظلم ہوگا۔

ایک بہت بڑے مرحوم بزرگ اور عالم کو جو سب کے نزدیک محترم ہیں ہم نے دوبار ایسے اجتماع میں دیکھا، جس میں بے پردہ عورتیں بھی تھیں، دل میں کھٹک پیدا ہوئی کہ اس مقدس شخصیت کے حامل ہم جیسے عامی لوگوں کی سطح پر کیسے آگئے، مگر اُن کے اس فعل سے جو مقامِ تقویٰ سے فروتر ہے، کیا ان کے تمام کمالات اور دینی صفات پر پانی پھر جائے گا؟

ہمارے سامنے اس وقت اپنے محترم بزرگ حضرت مولٰنا محمد منظور نعمانی کا وہ مقالہ ہے، جو موصوف نے شعبان و رمضان کے "الفرقان" میں تحریر فرمایا ہے، جس میں انھوں نے تفصیل سے بتایا ہے کہ مولٰنا مودودی اور جماعتِ اسلامی سے کس طرح تعلق پیدا ہوا، اور پھر مختلف ادوار میں اُن کی کیا رائیں رہیں؟ اور اب انھوں نے کھُل کر اعلان کیا ہے کہ مودودی صاحب ضلال و فتنہ کی طرف جا رہے ہیں اور جماعتِ اسلامی کے ذریعہ مستقبل میں کوئی ضلال پیدا ہونے والا

ہے؟ اس مضمون میں انھوں نے اپنے نزدیک "اکرام مسلم" کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے بڑے معصومانہ انداز
میں مولنا مودودی کی ذاتی زندگی، ان کی نوخوانی، عربی قابلیت اور فہم قرآن پر چوٹیں کی ہیں! انھوں نے مودودی صاحب
کے کمال انشاپردازی کو "کاغذی ناؤ چلانے" سے تشبیہ دی ہے اور آخر میں ایک صاحب کے قول کے حوالہ کے
ساتھ یہ تک کہہ دیا ہے کہ مودودی صاحب دین کے بارے میں قابل اطمینان نہیں ہیں!

مولنا نعمانی صاحب اسلاف کی عقیدت کا ذکر و شغل کا، پاکیزگی و تقویٰ کا بہت بڑا سرمایہ اپنے دامن میں رکھتے
ہیں، ان کا علم مستند اور اُن کا وجدان و ذوق معتبر ہے، اُن کے ادراک پر عالم اعلیٰ کے انوار کا سایہ بھی پڑتا رہتا ہے،
وہ خواب جن کو حدیث میں "مبشرات" کہا گیا ہے، ان کی بھی وہ پہچان رکھتے ہیں، کس میں حیات نبوی کا رنگ و بو ہے اور
کس میں نہیں ہے اس سے بھی وہ واقف ہیں ـــ لہٰذا وہ جس کو "خیر" فرمادیں، اُسے "خیر" ہی ہونا چاہئیے اور جس
پر "ضلال" کا حکم لگادیں، "ضلال" کے سوا وہ اور کچھ ہو نہیں سکتا۔

آہ کسے خبر تھی کہ چودھویں صدی میں تقویٰ اپنے ٹوٹے قلم سے چہرے کی جھائیوں کو اُبھارنے کے بجائے اصل چہرے
ہی کو بگاڑ کر دنیا کے سامنے پیش کرے گا، جس کی تحریروں سے پھیلنے والی نیکی کی ہزاروں محسوس شہادتیں موجود ہیں۔
اس پر "کاغذی ناؤ" کی پھبتی چُست کی جائے گی اور جس کی دعوت پر لوگ خیر و ہدایت کی طرف آرہے ہوں، اسس پر
ضلال و گمراہی کا سنگین حکم لگایا جائے گا! یہ وہ قدر اندازی اور ناوک فگنی ہے کہ ترکش کے تمام تیر کسی کے سینہ کو گھایل
کرتے چلے جائیں مگر ناوک فگن مسکرا رہا ہو کہ یہ تو میں نے پھول برسائے تھے یا یہ کہ اپنے سابقہ خیالات کی تردید اور
اپنے عاجلانہ موقف کی وضاحت کی تھی کہ لوگ غلط فہمی میں نہ رہیں (اناللہ وانا الیہ راجعون)

مولنا نعمانی صاحب مدظلہ کے اس مضمون سے پتہ لگا کہ کسی کے بارے میں جیسے جیسے حالات وکوائف کا اُن پر
انکشاف ہوتا جاتا ہے، وہ اپنی رائے بدلتے رہتے ہیں، لہٰذا اُن کے مزاج و طبیعت کی اس افتاد کو دیکھکر، ہمیں اُمید
بندھتی ہے کہ مولنا مودودی کے بارے میں، وہ اس انداز پر پھر سے غور کریں، کیا عجب ہے کہ اُن کی رائے بدل جائے،
اور اُن کو اس کا احساس ہو کہ میرے قلم سے یہ کیا نکل گیا۔

مولنا موصوف اس انداز پر سوچیں ـــ یہ مودودی دوسرے انشاپردازوں کی طرح عشقیہ افسانے اور
رنگین ڈرامے بھی لکھ سکتا تھا کہ اس سے بہت جلد شہرت بھی ہوجاتی، اور آمدنی کے بھی زیادہ سے زیادہ مواقع تھے،
مگر اس نے شروع ہی سے اپنے قلم سے دین و اخلاق کی ترجمانی کی ـــ نوجوانی کے بعد جوانی کے زمانہ میں وہ
"لیلیٰ کے خطوط" جیسی کتاب مرتب کرسکتا تھا، مگر اس نے اسلام کے بہت بڑے رکن "جہاد" کی حمایت میں
"الجہاد فی الاسلام" جیسی معرکۃ آرا تصنیف دُنیا کے سامنے پیش کی ـــ وہ کوئی ادبی اور رومانی پرچہ بھی نکال سکتا
تھا، مگر اُس نے "ترچھی نظر" اور "رومان" کے بجائے "ترجمان القرآن" کی زمام ادارت کو سنبھالا ـــ عام طور پر شاعروں
ادیبوں اور انشاپردازوں کی "جوانی" کی بعض رنگینیں لوگوں میں مشہور ہوجاتی ہیں، ان میں کچھ مبالغہ اور کچھ اصلیت ہوتی
ہے، مگر مودودی کی جوانی کی اس کے دوستوں اور ہمنشینوں میں اچھی ہی شہرت ہے ـــ انکار حدیث، بے پردگی
سود، ضبط ولادت، تجدد و تہذیب کے جتنے فتنے ہیں، اُن کے رد میں مودودی نے ایسے مضامین اور کتابیں لکھی ہیں
کہ جن میں سے بعض کتابیں تو اس وقت تک "حرف آخر" ہیں ـــ مودودی کی کتابیں "توحید خالص" کی حامل

وترجمان ہو، شرک و بدعت کی قاطع ہیں، جو کوئی مودودی کی کتابوں سے متاثر ہو جائے گا وہ شرک و بدعت کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتا ۔۔۔ اشتراکیت کے فتنۂ عظیم کا توڑ جو مودودی کے قلم نے جیسا کیا ہے، ایسا کسی نے نہیں کیا ۔۔۔ مودودی نے جس جماعت کی بنیاد ڈالی، اُس نے کوئی تھیٹریکل کمپنی یا پکچر ہاؤس قائم نہیں کیا، بلکہ نیکی کو پھیلایا، اور لوگوں کو دین سے قریب کیا، جماعتِ اسلامی کے وجود سے خدانخواستہ فواحش نہیں پھیل رہے ہیں، بلکہ نیکیاں پروان چڑھ رہی ہیں ۔۔۔ مودودی کی کتابوں نے لاکھوں زندگیوں میں اسلامی انقلاب برپا کیا، اس کی تحریروں نے بہت سے گردنوں کے سر اللہ کے سامنے جھکائے اور تشکیک زدہ ذہنوں میں یقین پیدا کیا ہے، جو نماز کا مذاق اڑاتے تھے، ان کو نماز کا پابند اور بعض بعض کو تو اشراق و تہجد کا شوقین بنایا ہے ۔۔۔ لوگوں نے مودودی کی کتابیں پڑھ کر سود چھوڑا ہے، رشوت چھوڑی ہے، فسق و فجور سے توبہ کی ہے اور حلال کی کمائی کو کسب کا مقصود بنایا ہے ۔۔۔ مسلمان کے پیر میں کانٹا چبھتا ہے اور اس کا چراغ ہوا کے جھونکے سے گل ہو جاتا ہے، تو اس ذرا سے اضطراب پر اللہ تعالیٰ اجر عطا فرماتا ہے، جس مودودی کو کلمۂ حق کہنے کے جرم میں سزائے موت تک سننی پڑی ہو اور جس کو پھانسی پانے والے قیدیوں کا لباس تک پہنا دیا گیا ہو، مگر اس بندۂ خدا کے ماتھے پر شکن بھی نہ آئی ہو ۔۔۔ کیا اس کی اس مسلسل دینی جدوجہد اس حق گوئی، اللہ اور رسول سے اس محبت اور اسلام کے لئے اس جذبۂ خیر خواہی کو ایک کھیل، ڈرامہ، ڈھونگ اور بہروپ اور نمائش سمجھ لیں، کیا اللہ تعالیٰ کے یہاں مودودی کی اس دینی جدوجہد کا کوئی صلہ نہ ملے گا، اس کی تحریروں سے لوگوں کو بفضلِ ایزدی جو ہدایت نصیب ہوئی ہے، اس کے اجر سے بیچارے مودودی کو کیا محروم کر دیا جائے گا؟ کیا الحاد و دہریت کے طوفانوں سے لڑنے والے کو "کاغذی ناؤ چلانے والا" کہا جا سکتا ہے، کیا احسان و تقویٰ کی کمی کا نتیجہ "ضلال مبین" ہی ہوا کرتا ہے ۔۔۔ کیا مودودی کی یہ "دینی جدوجہد" "احسان و تقویٰ" سے کوئی ربط و نسبت نہیں رکھتی؟

بدگمانیاں

مولانا محمد منظور نعمانی نے لکھا ہے کہ:

"میں بھی ان مضامین (مولانا مودودی کے مضامین) سے بہت متاثر ہوا بلکہ ان مضامین نے میری زندگی کا رخ موڑ دیا۔"

مولانا نعمانی صاحب کو مودودی صاحب کے مضامین نے دین سے دور تو نہیں کر دیا تھا، یہ تو نہیں ہوا تھا کہ ان کے مضامین پڑھ کر وہ نماز روزہ چھوڑ بیٹھے ہوں، ان کے تقویٰ میں کمی واقع ہوگئی ہو، ان کے متاثر ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ دین سے رشتہ مضبوط تر ہو گیا، دل میں ایک لگن اور ولولہ پیدا ہوا ۔۔۔ بس یہی حال ان لاکھوں انسانوں کا ہے جو مولانا کی تحریریں پڑھ کر دین سے قریب تر ہوئے ہیں، ان کی زندگیوں میں اسلامی انقلاب آیا ہے اور ان کی نگاہ اسلام کے سانچے میں ڈھل گئی ہے، جس شخص کی تحریروں سے دین و اخلاق کو اتنا عظیم الشان فائدہ پہنچا ہو اس سے "ضلال" منسوب کرنا اگر صداقت حق ہے تو "باطل" کو مطمئن ہو جانا چاہیے کہ اس کے خلاف کوئی شہادت فراہم نہیں کی جا سکتی!

مولانا مودودی کی جن تحریروں اور کتابوں سے مولانا نعمانی متاثر ہوئے تھے، ان تحریروں اور کتابوں کو مولانا مودودی نے تو بدل دیا ہے اور نہ "اجتہاد" "سود" اور "پردہ" کے رد میں نئی کتابیں لکھ دی ہیں، اور نہ ان کے ان دینی نظریوں میں کوئی تبدیلی آئی ہے، ان سے اگر کسی مقام کی وضاحت و توضیح میں غلطی ہو گئی ہے تو اسے بے شک رد کیا جا سکتا ہے، ان کی [illegible] تعمیر کو ٹھکرایا جا رہا ہے؟ مودودی صاحب کی کتابیں آج بھی تبلیغ حق کا دینی فرض انجام دے رہی ہیں [illegible]

پہلے دی تھیں، یہ نہیں ہے کہ اب وہ "کافر کی ناؤ" بن گئی ہیں اور اُن سے ہدایت کے بجائے ضلال پھیل رہا ہے۔

مولانا نعمانی صاحب کو مودودی صاحب اور جماعتِ اسلامی سے جو بدظنی ہوئی ہے، یوں کہئے اُن کے حُسنِ ظن میں تبدیلی آئی ہے، اور اس میں ان کو اب "خیر" کے بجائے "ضلال" کے واضح آثار نظر آنے لگے ہیں، اس کی بہت بڑی بنیاد:-

— بعض بزرگوں کی پیش گوئیاں اور ان کا وجدان

— استخارے اور

— خوابوں میں بعض اشارے

ہیں — ہم اہلِ علم سے فقیہانِ کرام سے، ہر اس شخص سے جو دین کا درد اور ساتھ ہی دین کی فہم بھی رکھتا ہو، یہ پوچھتے ہیں کہ کسی فرد یا جماعت پر "ضلال" کا حکم "بزرگوں کی پیش گوئیوں" — استخاروں اور خوابوں کے اشاروں کی بنیاد پر لگایا جا سکتا ہے؟ اس طرح تو ہدایت و ضلالت کا فیصلہ ایک کھیل بن کر رہ جائے گا، کسی کو خواب میں کوئی اشارہ ملا، کسی بزرگ نے کسی بارے میں کوئی رائے ظاہر کر دی، کسی کے وجدان میں کوئی کھٹک پیدا ہوئی — اور بس اس پر "ضلال" کے فتوے کی توپ داغ دی! یہ تصور کس قدر غلط، یہ رجحان کتنا خطرناک اور یہ فکر کس درجہ سطحی اور عامیانہ ہے!

جماعتِ اسلامی کے بارے میں یہ حکم لگانا کہ:

"ملاء اعلیٰ کی رضا اسے حاصل نہیں ہے"

کتنی بڑی بات "بڑا بول" چھوٹے منہ سے کہی گئی ہے، یہ منصب تو رسول ہی کا ہو سکتا ہے کہ اس پر وحی آتی ہے، اور جہاں تک ہمارے محدود مطالعہ کا تعلق ہے، شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کسی اہلِ ایمان کے لئے ایسی بات زبان سے نہیں فرمائی۔ شعر و ادب میں تو "وجدان" کے فیصلہ کا ایک مقام ہے مگر کسی کے دین کے بارے میں "ضلال" و "ہدایت" کا فیصلہ کرنے کے لئے "وجدان" کی شہادت اور اس کا اعتبار نہ صرف یہ کہ ناکافی ہے بلکہ یہ معیار اپنی جگہ خود ضلالت ہے۔

مولانا نعمانی صاحب قبلہ نے بعض بزرگوں کے نام لئے ہیں کہ انھوں نے مودودی صاحب اور جماعتِ اسلامی کے بارے میں انھیں پہلے اس طرح متنبہ کیا تھا، ہم ان کی بات کو جھٹلا نہیں سکتے، لیکن سوال یہ ہے کہ ان کی ایسے ہی لوگوں سے ملاقات کیوں ہوتی رہی جو مودودی صاحب اور جماعتِ اسلامی کے خلاف اپنے دلوں میں کھٹک رکھتے تھے، آخر ان کا مودودی صاحب اور جماعتِ اسلامی کے اچھا سمجھنے والوں سے ملنا کیوں نہیں ہوا، پھر پاکستان آنے کے بعد وہ صرف ان حضرات سے ملتے ہیں جو جماعتِ اسلامی سے مستعفی ہو چکے ہیں اور مولانا مودودی کی ذات سے جن کو شکایتیں ہیں، مگر وہ جماعتِ اسلامی کے ارکان اور اس کے خیراندیشوں سے نہیں ملتے اور اگر وہ کسی سے ملے ہیں تو اصل واقعہ کی تحقیق نہیں کی، بس ایک طرف کے بیانات سُن کر وہ مطمئن بلکہ خوش ہو جاتے ہیں کہ اس سے تو ان کے "وجدان" کے یا خوابوں کے اشارات اور ان کے بعض بزرگوں کی پیش گوئیوں کی تائید ہوتی ہے، حالانکہ دیانت و تقویٰ اور حق و انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ فردِ جرم لگانے سے قبل "ملزموں" کو بھی صفائی کا موقع دیتے، اُن سے بھی ملتے اور ان کے دل کی بات بھی سنتے، حضرت مولانا نعمانی نے ایسا نہیں کیا، کیوں نہیں کیا، اس کنہہ کو ہم جیسے گنہگار کہاں پہونچ سکتے ہیں! اہلِ تقویٰ کے مدارج اور احوال اور صاحبِ کشف و وجدان کی حکمتیں ہیں؟

مولانا نعمانی کے "وجدان" نے مودودی صاحب کی ذات کے بارے میں پہلی ملاقات ہی سے جو کھٹک محسوس کی

ہے، جس کھٹک کو شک و ریب اور اندیشہ کو وہ غذا دیتے رہتے ہیں یا یوں کہیے کہ اسے غذا ملتی رہی ہے، یہ وہ اوہام، اندیشے اور بدگمانیاں ہیں جو شوہر کو بیوی سے اور بیٹے کو باپ سے بالآخر جدا کر دیتی ہیں، اور یہ تفرقہ شیطان کی سب سے بڑی جیت ہوتی ہے! اس قسم کے ظنون و اوہام سے "وصل" کے مقابلہ میں "فصل" کو تقویت پہونچتی ہے! اس ذہنیت و مزاج کے انسان کی نگاہ محاسن پر کم ہی جاتی ہے، بس عیوب اور کمزوریوں کی تلاش!

جناب مولانا محمد منظور نعمانی کو یہ بھی تو سوچنا چاہیے تھا جو بزرگانِ کرام جماعت اسلامی سے باہر آئے ہیں جماعت میں صرف یہی چند "مصلح" اور "متقیا" تو نہ تھے "آخر جماعت سے سیکڑوں ارکان جو اب تک وابستہ ہیں وہ سب کے سب ناقابل اعتماد بے ضمیر اور بازاری قسم کے لوگ تو نہیں ہیں، ان کے پاس بھی دیانت ہے، تقویٰ ہے، دین کی فہم ہے اور ان کا تعلق جماعتِ اسلامی سے صرف اللہ اور رسول کی محبت کی بنا پر ہے!

اب رہا کسی جماعت سے چند افراد کے علحدگی اور بیزاری کا مسئلہ تو ہمارے پاس تبلیغی جماعت کے بعض منتسبین کے خطوط آئے ہیں کہ وہ اس جماعت کے محدود دینی نقطۂ نظر اور تنگ حدود عمل کی بنا پر علحدہ ہو رہے ہیں، ہم اس قسم کے خطوط "فاران" میں شائع کر سکتے تھے مگر ہم نے اس اعلان کی اشاعت کو مناسب نہ سمجھا کہ چند لوگوں کی علحدگی اور ان کے کسی فیصلہ کی بنا پر تبلیغی جماعت کی دینی خدمت اور اس کی افادیت مشتبہ نہیں ہو سکتی!

سندھ کے ایک پیر، عالم دین اور مجددی خانوادہ کے مقتدر رکن نے ہم سے کہا کہ انھوں نے تبلیغی جماعت کے ایک بہت بڑے اجتماع میں یہ تجویز پیش کی کہ دین کی اس دعوت کے ساتھ مسلمانوں میں "روحِ جہاد" کو زندہ و متحرک رکھنے کے لئے بھی سعی کرنی چاہیئے، اس پر تبلیغی جماعت کے سب سے بڑے شیخ نے فرمایا کہ:-

"یہ (یعنی جہاد) ہمارے پروگرام میں شامل نہیں ہے"

اس پر پیر صاحب بولے کہ یہ "ہمارا پروگرام" کیا چیز ہے؟ آپ کا پروگرام کیا خدا و رسول کے پروگرام کے علاوہ کوئی اور پروگرام ہے؟ بس اس کے بعد موصوف نے اس جماعت سے قطع تعلق کر لیا۔ تبلیغی جماعت کے شیخ سے جواب کی تحسین نہیں کر سکتے مگر ان کی زبان سے جب تقاضائے بشری ایک غلط بات نکل گئی، اس کو بنیاد قرار دے کر ہم یہ حکم نہیں لگا سکتے کہ ان بزرگ اور تبلیغی جماعت سے خیر کی توقع ہی نہیں رہی، اور ایک ممتاز عالم اور دیانتدار بزرگ جو تبلیغی جماعت سے باہر آگیا ہے، اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "حیاتِ طیبہ سے ننگ و عار" پر ہی علحدگی اختیار کی ہوگی!

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ مولانا نعمانی صاحب سے کم درجہ کے عالم اور اہل تقویٰ نہیں تھے انھوں نے مولانا مودودی کو دیکھکر اور ان سے مل کر اچھا ہی اثر قبول کیا اور جب مودودی صاحب جیل میں تھے! تو مولانا عثمانی مرحوم نے فرمایا کہ حکومت پاکستان نے اسلام کی تلوار کو بیکار کر کے رکھدیا ہے، الجزائر کے مجاہد عالم اور عربی زبان کے شاید سب سے بڑے ادیب علامہ بشیر ابراہیمی نے مولانا مودودی سے مل کر جو تاثر قبول فرمایا، انھوں نے اسے اپنے مقالہ میں ظاہر کیا ہے۔ جس میں مودودی صاحب کی ذات سے اُن کی بے پناہ محبت بلکہ عقیدت کا [illegible] ہوتا ہے۔ ہم نے اس منظر کو اپنی آنکھ سے دیکھا ہے کہ مودودی صاحب جب حج سے واپس آئے ہیں تو یہی مجاہد عالم اپنی کبرسنی کے باوجود لنگڑاتا ہوا مودودی صاحب کے خیر مقدم کے لئے ایرپورٹ پہونچا۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی جو ایک [illegible] عالم اور حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ مجاز ہیں، انھوں نے مولانا مودودی کو سفر و حضر میں دیکھا ہے، ان کی زبان سے ہم

نے مودودی صاحب کی نسبت ہمیشہ کلمات خیر ہی سُنے' کسی نے بعض فقہی اختلافات کا ذکر نکالا تو مفتی صاحب نے فرمایا کہ مجھے بعض مسائل میں اپنے پیرو مرشد حضرت تھانوی تک سے اختلاف ہے' میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ اجتماعی طور پر دین کو کس سے کیا فائدہ پہونچ رہا ہے ؟

مودودی صاحب سے سینکڑوں نہیں ہزاروں نوجوان طلبا، علما، اہل قلم اور عام اشخاص ملے ہیں' اور وہ اُن سے اچھا اثر ہی لے کر آئے ہیں! مولٰنا نعمانی صاحب کے قلب نے مودودی صاحب سے مل کر اچھا اثر قبول نہ کیا ہو تو ان کے قلب کا یہ تاثر کوئی یقینی پیمانہ' معیار اور کسوٹی تو نہیں ہے کہ جو اس کسوٹی پر پورا اترے بس وہی کھرا ہے اور جو پورا نہ اترے وہ سو فی صدی کھوٹا ہے! ایک ہی بوتل کا شہد جو سینکڑوں کو خوش ذائقہ معلوم ہو' اگر کسی ایک شخص کو اس میں تلخی محسوس ہو تو کیا "شہد" ہی کو سرے سے بے اعتبار اور غیر خالص ٹھہرا دیا جائے۔ کیا اس کا امکان نہیں ہے کہ چکھنے والے کا ذائقہ علیل ہو!

مولٰنا نعمانی صاحب نے "شہادتِ حق" کی زحمت ناحق ہی برداشت فرمائی' لاہور کے ایک اور "اہلِ تقویٰ" اور صاحب ارشاد و تصوف جو مولٰنا نعمانی صاحب سے کہیں بڑھ کر ــــ

" اعفو اللحیٰ ـــ اور ارخو اللحیٰ "

کے تقاضوں کو پہچانتے ہیں بلکہ اُن کا مظہر ہیں کئی سال سے "شہادت حق" دے رہے ہیں' اور مولنا مودودی کو دین کے ستونوں کو ڈھانے والا "ثابت کرنے کے لیے اپنے علم و تقویٰ کی ساری قوت صرف فرما رہے ہیں!

ایک اور بے بنیاد الزام

مولنا مودودی کا ایک "جرم" یہ بتایا گیا ہے کہ ان کی کتابیں پڑھ کر "اسلاف" سے تعلق کٹ جاتا ہے اور اُن کے دینی کارنامے مشتبہ ہو جاتے ہیں!

اس کے جواب میں مولنا مودودی کی تحریریں پیش کی جاسکتی ہیں' مثلاً "تفہیم القرآن" میں انھوں نے جگہ جگہ حسن بصری' عکرمہ' قتادہ' مکحول' لیث' اوزاعی اور ائمہ اربعہ (رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) وغیرہ اکابر و اسلاف کا ذکر کیا ہے اور اُن کے اجتہادات اور قرآنی تشریحات پیش کی ہیں' یہ "ذکر و بیان" اسلاف سے سلسلہ کو جوڑتا ہے کہ توڑتا ہے! اسی طرح اپنی دوسری کتابوں میں انھوں نے ائمہ فقہ کے اقوال و اجتہادات سے بار بار استنباط و استناد کیا ہے' ان حوالوں کو پڑھ کر ان بزرگوں کے ساتھ تعلق قائم ہوگا' یا بے تعلقی اور بے اعتمادی پیدا ہوگی ؟

اب رہا محاکمہ و تنقید تو امام مالکؒ کی ابن اسحٰق پر جرح و تنقید کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ بزرگوں سے تعلق کاٹ دینا چاہتے ہیں' اور پھر محدثین کی بہت بڑی جماعت نے امام مالک کی اس جرح کو قبول نہ کر کے' امام مالک کو خدانخواستہ بے اعتماد ٹھہرانے کی کوشش نہیں کی ـــ اس طرح تو امام ابو یوسف اور امام محمدؒ پر سب سے بڑا الزام عائد ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے استاد ابو حنیفہ کے اجتہادات سے اختلافات کر کے امام اعظم سے ہمارا تعلق کاٹ دیا ـــ محدثین کی ثقاہت' تفقہ اور فہم حدیث پر جس نے بھی گفتگو کی تو کیا اس نے ان بزرگوں کے بارے میں لوگوں کو شبہ میں ڈال دیا ـــ اسلامی لٹریچر میں کتابوں کی کتابیں ان اختلافات سے بھری پڑی ہیں مگر ان کے بارے میں کسی نے یہ نہیں کہا کہ اخلاف نے اسلاف پر جو تنقید کی ہے' تو اس کے سبب اسلاف سے امتِ خلف کا تعلق منقطع ہو جاتا ہے ـ!

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے بیشک اپنی کتابوں میں اس تصور کو اجاگر کیا ہے کہ دین میں اصل اعتبار "کتاب و سنت" کا ہے، دین کی یہی اساس ہے، ہر کسی کے قول و فعل کو اسی کسوٹی پر جانچ کر اور پرکھ کر دیکھنا چاہیے، اللہ اور رسول کی طرح کوئی شخصیت بھی مطاع نہیں ہے، جس کسی کی کوئی بات "کتاب و سنت" کی کسوٹی پر پوری نہ اترے، اس کا ترک کر دینا ہی ایمانی قوت کی دلیل ہے!

"کتاب و سنت" کی حمایت تمام حاملین کتاب و سنت سے تعلق کو جوڑتی ہے، اور اسلاف سے یہ تعلق مولانا مودودی کی کتابوں میں ملتا ہے، ہاں! اس مفرط عقیدت کے وہ قائل نہیں ہیں، کہ اسلاف کے اقوال و افعال کو "کتاب و سنت" کا درجہ دے دیا جائے اور جہاں سلف سے خلف کا اختلاف دین و ایمان کے زوال کا باعث سمجھا جائے! اس وہم کو بیشک انھوں نے دلوں سے نکالا ہے۔

"تقلید و تصوف" پر علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے کتنی سختی سے تنقید کی ہے مگر تمام حق پسند ان کا احترام کرتے ہیں کہ انھوں نے "کتاب و سنت" کی حمایت ہی میں یہ اقدام کیا ہے، علامہ ابن تیمیہ کی کتابیں پڑھ کر لوگ "اسلاف" سے کٹ تو نہیں گئے۔ امت میں تجدید و اصلاح کے لئے جب بھی ہمہ گیر و جامع انقلابی قدم اٹھایا جائے گا علامہ ابن تیمیہ کا مزاج ایک داعی کے فکر و عمل میں جھلکنے لگے گا، حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ ایک طرف وہ بادشاہ وقت سے ٹکرا جاتے ہیں اور دوسری طرف "وحدت الوجود" کو باطل قرار دے کر، خانقاہوں اور تصوف کدوں میں ہلچل پیدا کر دیتے ہیں، اس اعلان حق سے کسی کی عقیدت سے انقطاع ہی ہو رہا ہو تو ہو جائے، اللہ اور رسولؐ سے تو اس طرح تعلق مضبوط تر ہو جاتا ہے! قیامت کے دن اللہ تعالیٰ یہ نہیں پوچھے گا کہ تم نے فلاں بزرگ کے ذوق، وجدان، رجحان اور مسلک کا کس حد تک لحاظ رکھا تھا، اور کہاں تک پاسداری کی تھی، وہاں اس کی بازپرس ہوگی کہ اللہ اور رسول کے احکام اور منشاء کے ساتھ تمہارا کیا سلوک اور رویہ رہا۔

یہ نہیں ہے کہ اس زمانہ میں حق ہر جگہ سے سمٹ سمٹا کر ابوالاعلیٰ مودودی کی ذات میں مرتکز ہو گیا ہے، اس تصور سے لاکھ بار، اللہ کی پناہ! ان کے قول و فعل کو بھی کتاب و سنت ہی کی کسوٹی پر جانچا اور کسا جائے گا، اور ان کی جو بات "کتاب و سنت" کے خلاف نظر آئے گی، اُسے دیوار پر نہیں مزبلہ میں پھینک دیا جائے گا!

مولانا مودودی کی دینی خدمات کا سرسری جائزہ

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے قلم نے کتاب و سنت کی جو ترجمانی کی ہے، اور دین کی جو خدمت انجام دی ہے، وہ کوئی شک نہیں کہ اپنی آپ نظیر اور اپنے رنگ میں ممتاز و منفرد ہے، وہ اس دور کے بہت بڑے اسلامی مفکر ہیں، اُن کے ناخن حکمت نے بہت سے نازک مسائل کی گرہ کشائی کی ہے!

جہاد، تعدد ازدواج اور اس قسم کے دوسرے مسائل میں بڑے بڑے اہل قلم معذرت (APOLOGY) کے انداز میں دبی دبی گفتگو کرتے تھے مگر مودودی نے اس معذرت کو جرأت آمیز اعتراف سے بدل دیا، اور دلائل سے ثابت کیا کہ اسلام نے جس انداز میں ان مسائل کو پیش کیا ہے، وہ انسانی فطرت عدل و انصاف اور تمدن و معاشرت کے تقاضوں کے عین مطابق ہیں!

مودودی صاحب نے دلائل و براہین کے جدید ترین ہتھیار اس دور کی نوجوان نسل کو دے دئے ہیں کہ وہ الحاد و اشتراکیت اور تجدد و تشکیک کے ہر محاذ پر ان گمراہیوں سے نمٹ سکتے ہیں ــــ اُمت کو جتنا فائدہ مودودی صاحب کی

تحریروں سے پہنچا ہے، اتنا فائدہ بہت کم ارباب قلم اور اہل فکر کی تحریروں سے پہنچا ہوگا۔ اُن کی کتابوں نے صرف ذہنی اور فکری انقلاب ہی پیدا نہیں کیا، بلکہ عملی طور پر زندگیوں کو بدلا ہے، تجدد و تشکیک، اور الحاد و اشتراکیت جن کا اوڑھنا بچھونا تھا، اور جو دین کا مذاق اڑایا کرتے تھے مولانا مودودی کی کتابیں پڑھ کر وہ دین کے پُرجوش مبلغ بن گئے ہیں! مودودی اپنی ذات سے ایک دبستان ہے، ایک ادارہ، اکیڈیمی اور دانش گاہ ہے!

ایک مشہور ہفتہ وار اخبار کے ایڈیٹر نے لکھا تھا کہ جب وہ جیل میں تھے تو اشتراکی لٹریچر نے اُن کے عقائد کو متزلزل کر دیا تھا، مولانا مودودی کی کتابوں نے ان کو سنبھالا! ایسے ہزاروں مثالیں ملیں گی کہ مودودی صاحب کی کتابوں نے ان متشککین اور منکرین کو یقین و ایمان دیا ہے! پاکستان اور ہندوستان کے قریب قریب ہر شہر اور ہر قصبہ میں ایسے لوگ ملیں گے جن میں مودودی کی کتابوں نے دین کا ذوق پیدا کیا ہے اور ان کی زندگیوں کو بدلا ہے! اتنے عظیم الشان دینی کارنامہ پر کوئی بزرگ "کاغذ کی ناؤ چلانے" کی پھبتی چست فرما کر، اپنے دل کو تو بے شک تسلی دے سکتے ہیں، مگر ان محسوس و مشہود دینی فوائد سے جو آفتاب کی طرح دنیا کو نظر آ رہے ہیں لوگوں کی آنکھوں سے چُھپا نہیں سکتے!

مودودی کے صریر خامہ کی بازگشت آج کہاں کہاں سے آ رہی ہے، اور کس کس زبان سے یہ نکل رہا ہے کہ اسلام ایک مذہب نہیں مکمل ترین ضابطۂ حیات اور دستور زندگی ہے! مودودی نے واضح طور پر بتایا کہ حق کا راستہ صفا اور بدر و احد کی منزلوں سے گزر کر فتح مکہ تک پہنچتا ہے!

مودودی نے نوجوان مسلمانوں میں اس احساس کو بیدار کیا ہے کہ دنیا کی قیادت کے مستحق اور اللہ کے دین کے وارث "مومنین صالحین" ہی ہیں، اور اللہ کا دین مظلوم نہیں غالب ہونے کے لئے ہی آیا ہے! مولانا مودودی "قرآنی سلوک" اسے سمجھتے ہیں جو صرف ساحل ہی پر سجدے ادا کر کے مطمئن نہ ہو جائے، بلکہ طوفان میں اتر کر موجوں کی شورشوں میں نماز قائم کرے، وہ یہ کہتے ہیں کہ "حق" دبا دبا، سہما سہما اور سمٹا سمٹا کیوں رہے، اُسے پھیلنا، بڑھنا، چھا جانا اور غالب ہو جانا چاہئے زندگی کے ایک ایک شعبہ پر! مسجدوں سے لیکر قصر و ایوان تک صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اسی کے قانون کی فرمانروائی ان کی کوشش ہے کہ منبر و محراب ہی سے نہیں قصر و ایوان اور اسمبلیوں اور پارلیمنٹوں سے بھی حق کی آواز بلند ہو!

بیشک مولانا مودودی نے اس "زہد و تقویٰ" پر کس کر تنقید کی ہے جو کفر کے سایے میں بڑے اطمینان کے ساتھ نمازیں ادا کرتا رہتا ہے، اور کتاب و سنت کے احکام کو معطل اور کفر کے قانون کو نافذ و کارفرما دیکھکر اس کے اندر کوئی تڑپ اور بے چینی پیدا نہیں ہوتی۔ مولانا کے اس احتساب پر کوئی صاحب برا مانیں کہ ان کی اس تنقید کی زد ہمارے فلاں بزرگ کے "مسلک و طریق" پر پڑتی ہے تو مودودی بیچارہ کیا کرے، کسی کے طریق و مسلک کے لئے وہ "اقامت دین" کی کوششوں کا رُخ تو نہیں بدل سکتا۔

مولانا مودودی کی کتابیں دلوں سے شکوک و شبہات کے کانٹے نکال کر، ایمان و یقین پیدا کرتی ہیں، یہ ایمان و یقین کمزوروں کا نہیں طاقتوروں کا ایمان و یقین ہوتا ہے، جن کے کان فتح و نصرت کی بشارتیں سنتے ہیں! ہندوستان اور پاکستان ہی میں نہیں انگلستان میں، امریکہ اور کناڈا میں، بحرین اور شام میں، افریقہ اور زنجبار میں وہ نوجوان ہیں جن میں مودودی کی کتابوں نے دین کی لگن پیدا کی ہے، اللہ کے دین کے لئے اپنی بساط اور وسائل و ذرائع کے مطابق جد و جہد کر رہے ہیں۔

اب رہی لغزشیں اور غلطیاں تو غلطیاں کس سے سرزد نہیں ہوئیں، ایسا کون عالم، مجتہد اور فقیہہ، مفسر اور محدث

محمد زکریا مائل

قادیانی ریشہ دوانیاں مصر میں

مصر میں "وزارت تربیت وتعلیم" کے زیر انتظام ایک محکمہ ادارہ ثقافت عامہ کے نام سے قائم ہے۔ اس ادارہ نے گزشتہ سال محمد علی لاہوری احمدی کی ایک انگریزی کتاب کا عربی ترجمہ الفکر الخوالد للنبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے شائع کیا ہے۔ ادارہ مذکور نے بڑے لمبے چوڑے دعووں کے ساتھ ایک ہزار کتابیں شائع کرنے کی اسکیم مرتب کی تھی، یہ کتاب اسی اسکیم کے تحت اشاعت پذیر ہوئی ہے۔

مجلہ "الازہر" فروری ۵۸ء میں استاذ محب الدین الخطیب کا ایک مفصل مضمون "تشجیع التالیف الاسلامی و تحوی عن کتب من الف کتاب" کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس میں ادارہ ثقافت عامہ کی مذکورہ اسکیم کے اسباب و محرکات اور اس کے دعووں پر بحث کرنے کے بعد "الفکر الخوالد" پر ایک سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ چونکہ یہ مضمون بہت دلچسپ اور پُر از معلومات ہے اور مسلمانانِ پاکستان کے لئے خصوصیت سے قابلِ غور ہے اس لئے میں اس کا ترجمہ قارئین فاران کے لئے پیش کر رہا ہوں۔ تاکہ اس کا اندازہ ہو سکے کہ اس فرقہ ضالہ کی ریشہ دوانیاں مصر میں کس طرح کام کر رہی ہیں۔ یہاں اس امر کی توضیح ضروری ہے کہ یہ ترجمہ پورے مضمون کا نہیں ہے بلکہ اسے بڑی حد تک کتاب زیر بحث کے تبصرہ تک محدود رکھا گیا ہے اور باقی مطالب حسب ضرورت اختصار کے ساتھ اردو میں منتقل کئے گئے ہیں۔

استاذ محب الدین خطیب لکھتے ہیں "کل مجھے سعودی فاضل شیخ یوسف بن عبدالعزیز النافع نے جو مسجد حرام میں ادارہ الامر بالمعروف کے نگران ہیں اور آجکل مصر کے مہمان ہیں مطلع کیا کہ وزارت تربیت وتعلیم مصر کے ادارہ ثقافت عامہ نے ایک کتاب اپنی ایک ہزار اسلامی کتابوں کے مجوزہ سلسلے کے ضمن شائع کی ہے جو برطانوی استعمار کے آغوش میں پرورش پانے والے دشمنِ خدا غلام احمد قادیانی کے ایک ممتاز چیلے کی لکھی ہوئی ہے۔

کہیں قارئین اس غلط فہمی میں نہ پڑ جائیں کہ ادارہ ثقافت عامہ یا وہ تمام لوگ جو اس کتاب کے ترجمے اور اس کی اشاعت کی نگرانی وغیرہ کے کام سے متعلق ہیں یہ نہیں جانتے کہ محمد علی لاہوری مرزا غلام احمد قادیانی کا شاگرد ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ یہ لوگ اس سے واقف ہیں اور انھوں نے کتاب کے جس صفحے پر مؤلف کا تعارف لکھا ہے اس میں اپنی واقفیت کے اعتراف کے ساتھ یہ الفاظ لکھے ہیں "مؤلف حصولِ فضیلت کے لئے وقف تھے، عبادت گذار تھے اور قرآن کریم کے بڑے گرویدہ۔ انھوں نے اپنے روحانی مرشد غلام احمد القادیانی بانی تحریک احمدیت کی صحبت میں دنیوی حرص وطمع سے ہاتھ اُٹھا لیا تھا.... اور وہ اپنے استاد ہی کی رہنمائی میں عابدوں اور زاہدوں کے مسلک پر گامزن رہے۔ انھوں نے انھیں کی ہدایت سے مجلۂ اسلامیہ (اسلامک ریویو۔ مترجم) جاری کیا تاکہ اسلامی تعلیمات یورپ اور

امریکہ میں پہنچائیں۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ وزارت تربیت و تعلیم کا ادارۂ ثقافت عامہ محمد علی لاہوری اور ان کے استاد غلام احمد قادیانی سے بڑا حسنِ ظن رکھتا ہے اور اسے اب تک اس حقیقت کا علم نہیں ہوا ہے کہ غلام احمد قادیانی خدا کا دشمن ہے اور وہ عابد و زاہد ائمہ میں سے نہیں ہے۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ یہ ادارہ اس بات سے بھی نابلد ہے کہ مرزائے قادیان برطانوی استعمار کا پروردۂ آغوش تھا۔ حالانکہ یہ حقیقت خود مرزا غلام احمد نے متعدد مواقع پر اپنے ہی قلم سے آشکارا کی ہے۔ مرزا غلام احمد نے اپنی کتاب "التبلیغ" میں لکھا ہے:- "انگلستان کی بہی خواہی میں کوتاہی کرنا اللہ کی جناب میں کوتاہی کرنے کی طرح ہے۔" اسی طرح اس بات کی اشاعت کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ادارہ ثقافت عامہ یہ بھی نہیں جانتا کہ غلام احمد قادیانی اپنی تاریخ وفات تک اس کا دعویٰ کرتا رہا کہ وہ نبی ہے اور اس پر وحی بھیجی جاتی ہے۔ اور وہ اس کے پیرو بغیر کسی شک و شبہ کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت "خاتم الانبیاء" کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ یہ لفظ زینۃ الانبیاء کے معنوں میں ہے جس طرح انگوٹھی انگلی کی زینت ہوتی ہے اسی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبیوں کی زینت تھے اس کے نزدیک۔ خاتم الانبیاء آخری نبی کے معنوں میں نہیں ہے۔ غلام احمد قادیانی اپنی نسبت کہا کرتا تھا:- "میں اسی طرح محمدی نبی ہوں جس طرح عیسیٰ ابن مریم اور بنی اسرائیل کے انبیاء موسوی نبی تھے۔ اور جس طرح مسیح ابن مریم شرع موسیٰ کو توڑنے اور منسوخ کرنے کے لئے آئے تھے اسی طرح مسیح موعود غلام احمد قادیانی اس کا مدعی ہے کہ وہ محمدی مسیح ہے اور اسلام کو توڑنے کے لئے نہیں بلکہ اس کی تکمیل کے لئے آیا ہے۔"

دیکھا آپ نے محمد علی لاہوری کے روحانی مرشد غلام احمد قادیانی کی حقیقت یہ ہے! اور یہ ہے وہ کتاب جسے ادارۂ ثقافت عامہ نے اس نقصان پر پردہ ڈالنے کے لئے جو معاصر مسلمان مؤلفوں کی کتابوں میں نظر آتا ہے۔ انتخاب کیا ہے۔ اور اگر اس ادارہ کا مبلغ علم اسلام اور اس کے دوستوں اور دشمنوں سے متعلق یہی ہے تو یہ ہمارا اسلامی فریضہ قرار پاتا ہے کہ اس موضوع پر ادارہ ثقافت عامہ ہی نہیں بلکہ ہر مسلمان کو توجہ دلائی جائے کہ وہ اچھی طرح سوچ سمجھ سکیں اور ان واقعات کو نظر میں رکھیں۔

محمد علی لاہوری قادیانیت کے ان چار ستونوں میں سے ہے[ف] جن کے شانوں پر غلام احمد قادیانی کی گمراہی قائم تھی۔ اور یہ غلام احمد وہی ہے جو مرتے دم تک یہی دعویٰ کرتا رہا کہ وہ مسیح موعود ہے اور اس کے پاس وحی آتی ہے۔ اور جو بھی اس کا پیرو ہے اس کے اس دعویٰ کا ہمنوا ہے اور برابر یہی دعویٰ کئے جاتا ہے کہ مرزا غلام احمد نبی تھے۔ یہ لوگ مرزائی اور خود اپنی منافقت کی وجہ سے اسے اسلامی نبی کے نام سے موسوم کرتے ہیں جو ان کے عقیدہ میں اسلام کو مکمل کرنے کے لئے آیا تھا۔۔۔۔۔۔ اور اس کے اسلام کو مکمل کرنے کی ایک شان یہ ہے کہ اس نے اعلان کیا کہ جہاد باطل ہے اس کے دین میں انگریز سے لڑنا حرام ہے ہاں "انگریز کی صفوں میں شامل ہو کر مسلمانوں سے لڑنا جہاد شروع ہے! مرزا اپنی کتاب "الھدیٰ والتبصرۃ لمن یریٰ" کی جلد ۱ صفحہ ۲۹ میں حکومت برطانیہ کے متعلق لکھتا ہے:- "اس مبارک حکومت پر

ف ان چاروں کے نام یہ ہیں (۱) حاجی (حکیم) نورالدین قریشی جو مئی ۱۹۰۸ء سے اپنے انتقال (۱۹۱۴ء) تک غلام احمد قادیانی کا خلیفہ رہا۔ (۲) محمد علی لاہوری جو اپنی وفات ۱۳ اکتوبر ۱۹۵۱ء تک اس تحریک کا لیڈر رہا۔ (۳) خواجہ کمال الدین جو مجلس معتمدین قادیان کا رکن اور صدر انجمن احمدیہ کا سکرٹری تھا۔ (۴) بشیرالدین محمود مرزائے قادیانی کا بیٹا۔

پر مخفی نہ ہوگا کہ میں اس کے قدیم خادموں ہی سے ہوں اور دعا گویوں میں سے ہوں ...... اور میرے والد میرزا غلام مرتضیٰ ابن مرزا عطا محمد قادیانی دولت برطانیہ کے خیر اندیشوں میں سے تھے ... میرے والد نے شورش (۱۸۵۷ء) کے زمانہ میں پچاس سواروں سے مع گھوڑوں کے حکومت کی مدد کی تھی۔ (یعنی استعمار کے مقابلے میں مسلمانوں نے جو ہنگامہ برپا کیا تھا۔ اس زمانے میں، اور اس طرح اس نے اپنے دین، قوم اور وطن سے غداری کی اور برطانوی استعمار کے ساتھ ہو کر مسلمانوں سے لڑا) اور خطرات نازل ہوتے وقت وہ حکومت کو مالی امداد دینے میں بہتوں سے سبقت لے گئے ..... رہا میں سو میرے پاس دنیا کا مال گھوڑے اور سوار تو نہیں ہیں مگر مجھے قلم کے گھوڑے اور کلام کے جواہرات دئے گئے ہیں اور اس ہی (آسمانی حکومت نے مجھے غنی کر دیا ہے میرے افلاس کا تدارک کر دیا ہے، مجھے روشنی دی ہے، میری شب سیاہ کو منور کر دیا ہے۔ اور مجھے دولتمندوں میں داخل کر دیا ہے ..... اس لئے میں اپنے قلم اور ہاتھ سے اس کی امداد کے لئے اٹھ کھڑا ہوا اور اللہ میری مدد پر ہے، میں نے اس وقت سے اللہ سے عہد کیا ہے کہ جو مبسوط کتاب بھی تالیف کروں گا اس میں قیصرِ ہند (ملکہ وکٹوریہ) کے احسانات کا اور ان عنایتوں کا ذکر ضرور کروں گا جن کی شکر گذاری مسلمانوں پر واجب ہے، اس لئے میں نے یہ کتابیں جو ان مضامین پر مشتمل ہیں ہر ملک میں اور تمام لوگوں میں شائع کی ہیں اور انھیں عرب و حجاز وغیرہ کے دور دراز شہروں میں بھیجا ہے تاکہ وہ یہ جان لیں کہ یہ حکومت ان کی محسن ہے اور برضا و رغبت اس سے محبت کرنے لگیں۔ یہی میرا کام ہے اور یہی میری خدمت اور اللہ میری نیت کو جانتا ہے اور وہ بہترین محاسب ہے ...... اور جسے اس بات میں شک ہو وہ میری کتاب البراہین' (براہین احمدیہ۔ مترجم) کی طرف رجوع کرے، اگر وہ بھی رفع شک میں کافی نہ ہو تو میری کتاب 'التبلیغ' دیکھے، اس پر بھی مطمئن نہ ہو تو میری کتاب 'الحمامہ' پڑھے۔ اس کے بعد بھی کوئی شبہ باقی رہے تو میری کتاب 'الشہادۃ' پر غور کرے تاکہ اس پر اچھی طرح واضح ہو جائے کہ میں نے کتنی بلند آوازسے جہاد کی منسوخیت اور اس حکومت کے خلاف بغاوت کی ممانعت کا اعلان کیا ہے اور مجاہدین کی غلطی واضح کی ہے ..... یہاں تک کہ مجھے اس قسم کی اشاعتوں کے کام میں گیارہ برس ہو چکے ہیں اور میں نے اس فرض کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کی ہے۔ اگر میں ان خدمات میں اپنے منفرد ہونے کا دعویٰ کروں تو مجھے زیب دیتا ہے ... کیونکہ اس حکومت کے لئے میری جیسی تائید و اعانت کرنے میں کوئی میرا نظیر و مثیل نہیں اور یہ حکومت اگر قدر شناس ہے تو عنقریب اس سے واقف ہو جائیگی۔"

برطانوی استعمار کا یہ خاکسار بندہ اپنی کتاب 'بشریٰ' حصہ اول صفحہ ۵۶ میں دعویٰ کرتا ہے کہ اسے حسب ذیل وحی بھیجی گئی:

"اللہ قادیان میں نزول کرے گا"

وہ اپنی کتاب حقیقۃ الوحی' ص ۳۹۱ طبع قادیان میگزین مئی ۱۹۰۷ء میں جو اس کی آخری تالیفات میں سے ہے کہتا ہے "اس امت میں جو لوگ اولیا، ابدال، اور اقطاب میں سے گزرے ہیں انھیں ان چیزوں میں سے جو مجھے دی گئی ہیں کچھ نہیں دیا گیا، میرے ساتھ یہ خصوصیت رکھی گئی ہے کہ میں نبی ہوں اور سوائے میرے کوئی اس کا استحقاق نہیں رکھتا، کیونکہ بکثرت وحی اور غیبی امور ان میں نہیں پائے گئے"۔

اس نے کتاب (اشتہار معیار الاخیار) کے صفحہ ۱۱ پر لکھا ہے "میں ابوبکر سے افضل ہوں" بلکہ انبیا سے بھی افضل ہوں۔[1]

وہ اپنی کتاب دافع البلاء' ص ۱۳ میں کہتا ہے "میں حسین سے افضل ہوں"

---

[1] اس موقع پر مرزا کا یہ شعر بھی نظر میں رکھئے
کربلا ئیست سیر ہر آنم		صد حسین است در گریبانم (مترجم)

اس نے اپنی کتاب ضمیمۂ انجام آتھم میں لکھا ہے "یزداہو عیسیٰ" کا انجیل میں جو کچھ اس کی جبلی (موعظت کرپی) تعلیم ہے وہ اس نے یہودیوں کی کتاب التلمود سے سرقہ کیا ہے اور اس سرقہ کے بعد بھی لوگوں سے دعویٰ کیا ہے کہ یہ اس کی وہ کتاب ہے جو اس پر آسمان سے نازل کی گئی ہے"۔

اسی طرح وہ خاتم النبیین محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں استہزاء وجسارت کا مرتکب ہوتے ہوئے لکھتا ہے :-

له انخسف القمر المنیر، وان لی
غسا القمران المشرقان، اتنکر

(اس (رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم) کے لئے روشن چاند گہن میں آیا اور میرے لئے دو روشن چاند ابھرے کیا تم ان سے انکار کروگے۔ (مترجم))

اس نے اس شعر کی جو تشریح اردو زبان میں کی ہے وہ نبی اکرم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں اس کی گستاخی، بے ادبی پر اور ساتھ ہی اس کے کفر وجہالت اور دیوانگی پر دلالت کرتی ہے۔ قادیانیوں کے عقائد میں یہ بھی ہے کہ نبی کریم محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہلال تھے اور غلام قادیانی بدر کامل۔ اور انہوں نے اپنے بلی علم پر اسی عقیدہ کی بنا پر ہلال اور بدر کے نقش بنائے ہیں، اور ان دونوں کے درمیان ایک منارہ ہے جو ان کے عقیدے میں مسیح قادیانی کا منارہ ہے۔ یہ اس غرض سے ہے کہ مسجد دمشق کے مشرقی منارے کا قائم مقام ہو سکے جس کے متعلق بعض آثار میں آیا ہے کہ مسیح عیسیٰ ابن مریم آخر زمانے میں اس منارے پر اتریں گے۔ اس لئے قادیانی نے اس کا دعویٰ کر دیا کہ اس (عیسیٰ) سے خود اسی کی ذات مقصود ہے۔ اس کے لئے انھوں نے ایک شہر بنایا جس کا نام ربوہ رکھ دیا تاکہ اس کے ذریعہ اس قرآنی آیت ربوۃ ذات قرار ومعین کی تعبیر ہوسکے۔

(مرزائے) قادیانی نے اپنی کتاب "اربعین" ج ۲ ص ۳ میں اور رسالۂ انجام آتھم میں لکھا ہے:- "اللہ نے میرے پاس وحی بھیجی ہے:" اخترتك لنفسی، الارض والسماء معك كما هی معی، وسرك سری۔ انت منی بمنزلة توحیدی وتفریدی"۔ (میں نے تجھے اپنی ذات کے لئے اختیار کیا ہے۔ آسمان وزمین تیرے ساتھ ہیں جیسے کہ وہ میرے ساتھ ہیں، تیرا راز میرا راز ہے، تو میری طرف سے میری توحید وتفرید کے درجے میں ہے۔ مترجم)

وہ اپنی کتاب "آئینۂ کمالات اسلام" کے صفحات (۵۶۴-۵۶۵) میں رقمطراز ہے:

"میں نے خواب میں دیکھا کہ میں اللہ ہوں، اور میں نے یقین کر لیا کہ میں بعینہٖ اللہ ہی ہوں، اور میرے دل میں آئی کہ میں دنیا کی اصلاح کروں اور اسے ایک نئے نظام کے ساتھ منظم کروں یعنی آسمان اور زمین کو نئے سرے سے پیدا کروں"[1]

اس نے اپنی کتاب "توضیح المرام" میں ذکر کیا ہے: "اللہ طول وعرض والا ہے اس کے بے شمار وبے حساب ہاتھ پاؤں ہیں اور برقی تار کی طرح اعصاب وادتار ہیں جو تمام سمتوں میں پھیلے ہوئے ہیں"۔

اپنی کتاب (برکات خلافہ ص ۵) میں دعویٰ کرتا ہے: "میرے ظہور کے بعد حج قادیان میں منتقل ہوگیا ہے"۔

توضیح المرام ص ۵۲ میں لکھتا ہے "ملائکہ روح کی حرارت کے نام کے سوا کچھ نہیں ہیں"۔

ازالۃ الاوہام ص ۲ میں ہے: "قیامت آنے والی نہیں اور تقدیر کوئی چیز نہیں"۔

---

[1] یہاں مرزا کی اس وحی کا تذکرہ بھی بے محل نہ ہوگا جس میں اس نے ظاہر کیا ہے کہ (معاذ اللہ) خدا نے مجھ سے مقاربت کی، میں اس سے حاملہ ہوا! ایک وحی میں ہے خدا نے مجھے امساک کا نسخہ تعلیم کیا (معاذنا اللہ من ھذہ الخرافات) (مترجم)

ضمیمہ تحفہ گولڑویہ ص ۱۰ میں لکھا ہے: "مجھے اللہ نے اس کا اختیار کامل عطا کیا ہے کہ جو احادیث میرے الہام کے موافق ہوں انھیں قبول کروں، اور اگر وہ میری رایوں کے خلاف پڑیں تو انھیں رد کر دوں۔"

غلام احمد قادیانی کے جو اقوال میرے پاس موجود ہیں اگر ان سے اسی قسم کی چیزیں لکھتا چلا جاؤں تو اندیشہ ہے کہ مجلہ الاعتصام ابتدا سے انتہا تک بھر جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ میں نے اس موقع پر جتنے اقوال نقل کئے ہیں وہ سیاسی، وطنی اور دینی و عقلی زاویۂ نگاہ سے مرزا کے تعارف کے لئے بہت کافی ہیں۔

تو یہ ہے اس محمد علی لاہوری کا روحانی مرشد جس کی ایک کتاب وزارت تربیت و تعلیم کے ادارۂ ثقافت عامہ نے ہزاروں کتابوں کی اسکیم کے ضمن میں انتخاب کی ہے تاکہ بازاری کتابوں کی بکثرت اشاعت کی وجہ سے اسلامی ثقافت میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے اسے پُر کیا جا سکے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا قادیانیوں ہی کی کتابیں جو غلام احمد قادیانی کی رہنمائی پر تکیہ کرتی ہیں وہ ارفع و اعلیٰ کتابیں ہیں جو اسلام سے متعلق عربی کتب خیال میں پیدا ہونے والے خلا کو پُر کر سکتی ہیں؟

ادارۂ ثقافت عامہ بہت بھولا بن کر کہتا ہے "اس میں محمد علی لاہوری کا کیا گناہ ہے کہ اس کا روحانی مرشد اس پست درجے تک گر گیا ہے جسے دوزخ میں قرار نہیں۔"

اس کی نسبت میرا جواب یہ ہے کہ "ریویو آف ریلیجنز" ج ۸ ص ۱۶۳ پر محمد علی لاہوری کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس میں وہ کہتا ہے "احمدی تحریک اور اسلام کی مثال مسیحیت اور یہودیت کی شان پر ہے۔" اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ احمدی تحریک جس کا ایک داعی محمد علی بھی ہے اسلام سے اسی قدر مختلف ہے جس قدر مسیحیت یہودیت سے مختلف ہے[1] اور جس طرح مسیحی کلیسا کے مبلغین تورات کی اشاعت کرتے ہیں اور اسے اپنی کتابوں میں سے خیال کرتے ہیں، اگرچہ اس کی تفسیر و تفہیم میں وہ یہودیوں سے اختلاف کرتے ہیں اسی طرح محمد علی لاہوری اور احمدیوں میں سے اس کی جماعت قرآن کی تفسیر و تفہیم میں مسلمانوں سے اختلاف رکھتی ہے، اور ساتھ ہی قرآن سے انتساب کا دعویٰ کرتی ہے۔

اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ محمد علی لاہوری اور احمدیوں میں سے اس کی جماعت جو اس بر خود غلط اور یاوہ گو شخص مرزا غلام احمد کو اس کی ان تمام کوتاہیوں، ورخیانتوں کے ساتھ اور ان حماقتوں، گستاخیوں اور بے ادبیوں کے باوجود اپنا روحانی مرشد سمجھتی ہے، ادارہ ثقافت عامہ نے کتاب مذکور کو شائع کر کے مؤلف کے اس روحانی ارشاد پر مہر تصدیق ثبت کر دیا ہے۔

اسی طرح یہ بھی مفہوم ہوتا ہے کہ محمد علی لاہوری اور اس کی احمدی جماعت کے لوگ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ان کا احمق رہنما اسی طرح اسلام کا مسیحا تھا جس طرح عیسیٰ بن مریم یہودیت کے مسیحا تھے۔ وہ اس کے اس دعویٰ کی تکذیب نہیں کرتے کہ اسے اس قسم کی وحی آیا کرتی تھی جس کے نمونے ہم اس مضمون میں درج کر چکے ہیں۔ اب ہم محمد علی لاہوری کے اس عقیدے کا ذکر کریں گے جو وحی سے متعلق ہے اور جس کا سلسلہ اس کے عقیدے میں اب تک منقطع نہیں ہوا ہے۔

محمد علی لاہوری نے کتاب حکیم (قرآن کریم) کا جو مسخ شدہ ترجمہ کیا ہے اس کے مقدمے میں وہ کہتا ہے "سب سے

---

[1] ملاحظہ فرمایا آپ نے سہ جادو وہ جو سر پر چڑھ کے بولے۔ اس مضمون کا یہ حصہ خصوصیت سے ان لوگوں کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہے جو لاہوری احمدیوں کے مداح ہیں اور انھیں قادیانیوں سے مختلف سمجھتے ہیں۔

آخر میں یہ کہتا ہے کہ اس کتاب میں جو خوبی بھی ہو سکتی ہے اس میں میرے امام دین اور اس عہد کے امام اکبر میرزا غلام احمد قادیانی نے مجھے مستفید کیا ہے۔ میں علم کے اس مواج سرچشمے سے سیراب ہوا ہوں جو اس مصلح کبیر، اس زمانے کے مجدد، اس امت کے مہدی اور تحریک احمدیت کے بانی کے سینے سے پھوٹتا ہے۔"

اس سے بھی بڑھ کر وہ اس اعلان کے چوتھے فقرہ میں جو محمد علی لاہوری کے دستخط سے شائع ہوا ہے کہتے ہیں: "بے شبہ غلام احمد چودھویں صدی کے مجدد تھے"۔ اسی اعلان کے پانچویں فقرے میں انھوں نے اس اعتقاد کا اعلان کیا ہے:- "اللہ اپنے اولیا سے کلام کرتا ہے"۔

محمد علی لاہوری اپنے ترجمۂ قرآن کے مقدمے میں کہتا ہے "وحی الٰہی کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے اور سچے مسلمان (یعنی غلام احمد قادیانی کے پیرو) کے لئے اس دروازہ میں داخل ہونا ممکن ہے"۔

محمد علی لاہوری نے اپنی کتاب 'دین اسلام' اس کے اصول و قواعد کے دو مواقع پر لکھا ہے "وحی الٰہی ابتک جاری ہے"۔ یہ وہ کتاب ہے جس کا ترجمہ سنہ ۱۹۵۲ء میں محکمہ ریلوے قاہرہ کے جنرل سکرٹری نے کیا ہے۔

(لاہوری) احمدیوں کا رسالہ لائٹ Light جو برطانوی استعمار کے زمانے میں لاہور 'پنجاب' سے شائع ہونا شروع ہوا تھا اور جس کے سرنامے پر یہ الفاظ مرقوم ہیں "اشاعت اسلام کے لئے جمعیۃ احمدیہ کی خدمات اس کا ایک شمارہ" ان لوگوں نے میرے پاس بھیجا تھا۔ اس رسالہ کی اشاعت ۶ جولائی سنہ ۱۹۳۲ء نمبر ۱۹ میں بعنوان 'اللہ کی آواز' یہ عبارت درج ہے: "گاندھی پر وحی الٰہی نازل ہوتی ہے، اللہ نے ایسی آوازیں جو گاندھی نے اپنے کانوں سے سنی ہے گاندھی سے کلام کیا ہے"۔ ساتھ ہی اس بیہودہ بکواس پر یہ حاشیہ چڑھایا ہے "گاندھی نے ہم سے صرف یہی نہیں بیان کیا ہے کہ اللہ صرف موجود ہے' بلکہ ہم سے اس سے بھی زیادہ بعید بات یہ کہی ہے کہ وہ انسان سے کلام کرتا ہے، اور حقیقۃً اس (گاندھی) نے خود اس کی آواز سنی ہے"۔

اس کے بعد ان لوگوں نے کہا ہے "خصوصاً ہم لوگوں کے لئے تو اس مسئلے کی اہمیت وعظمت کے اسباب موجود ہیں جو اسے ہمارے نزدیک بہت اہم بناتے ہیں۔ اللہ کی آواز تو تحریک احمدیت کے زاویہ کا ایک پتھر ہے اور جو دین[1] اس زندہ خصلت سے کٹ گیا ہے وہ پستی میں جا پڑا یہاں تک کہ پرانی قصہ کہانی بن گیا ہے اور اس کے سوا کچھ نہ رہا[2] اور مردہ قصے کہانیاں تو بے جان ہڈیاں ہیں جو زندگی سے اور حیاتیاتی نشو ونما کی قدرت سے عاری ہیں"۔

اسی کا ایک اقتباس اور ملاحظہ ہو:

"ہندوستان کے بت پرستوں کا عقیدہ ہے کہ اللہ نے ایک مرتبہ دنیا کی ابتدا میں کلام کیا اور نوع انسان کو وید یعنی وہ کتاب دی جسے برہمن مقدس مانتے ہیں۔ ہمیشہ کے لئے اس نے خاموش رہنے کا عہد کر لیا۔ اسی طرح یہود ونصاریٰ اور دوسرے پیرو ان مذاہب نے اپنی طرف سے وحی الٰہی کا دروازہ بند کر دیا۔ اسی طرح ان مسلموں نے دین کی حیاتیاتی حقیقت کو گم کر دیا اور اس طریقے سے اسے مردہ کہانیاں بنا ڈالا۔ اور مسلمان علما نے

---

[1] یعنی وہ اسلامی دین جو انقطاع وحی کے عقیدے پر قائم ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین یقین کرتا ہے۔

[2] اس بنا پر دین اسلام احمدی تحریک سے اس سے کہیں زیادہ دور ہے جتنا یہودیوں کا دین مسیحی دین ہے۔

بھی اسی غلطی کا ارتکاب کیا اور اس ذریعے سے اسلام کے حیات اور نور کے سرچشمے یعنی اللہ کے کلام کو منقطع کر دیا واقعہ یہ اسلام کے لئے ایک بڑی برائی ہے کہ مسلمانوں کے اور اس اعلیٰ روحانی برکت یعنی کلام الٰہی کے درمیان ایک بند قائم کر دیا جائے حالانکہ اللہ کا کلام زندگی کی عظیم ترین مسرتوں میں سے ہے۔ اور یہ اس ہمیشہ زندہ رہنے والے خدا کا کلام ہے جسے انسان اپنے کانوں سے سنتا ہے۔ اسلام آیا ہی اس لئے ہے کہ نوع انسانی کے لئے برکت بنے لیکن مسلمان علماء نے خود اسلام ہی کے نام سے مسلمانوں کو اللہ کی اس برکتِ عظمیٰ سے محروم کر دیا ہے۔"

لائٹ کی اسی اشاعت میں مسلمانوں اور ان کے دین کو بے نقط سناتے ہوئے لکھا گیا ہے: "یہ وہ درخت ہے جو پھل نہیں دیتا اور جس کی کوئی قیمت نہیں حتیٰ مسلمان کے ساتھ اللہ کے امکان کلام سے انکار کر کے علما نے اسلام کو خسارہ میں ڈال دیا ہے اور وہ انجیر کے اس درخت کی طرح ہو گیا ہے جس کا ذکر انجیل میں ہے جو پھل نہ دیتا تھا اس لئے مسیح نے اس پر لعنت کی تھی اور وہ اس میں حق بجانب تھے۔"

جب ان لوگوں نے ۱۹۳۲ء میں یہ باتیں شائع کیں تو علامہ تقی الدین الہلالی نے جو اس زمانے میں بون یونیورسٹی (جرمنی) کے ایک پروفیسر تھے مجلہ الفتح میں ان کی تردید کرنے کی زحمت گوارا کی اور ان اشخاص پر بجلیاں گرائیں جن کی آنکھوں میں اللہ کا وہ زندہ جاوید کلام جو قرآن میں موجود ہے اور جس نے ہر چھوٹی بڑی بات کا احصا کر لیا ہے نہیں سمایا اور یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ اللہ نہ صرف ان ملکے نبی غلام احمد القادیانی جیسے کذابوں، پاگلوں اور دجالوں سے کلام کرتا ہے بلکہ گاؤ پرست برہمنوں سے بھی ایسی آواز میں ہمکلام ہوتا ہے جسے وہ اپنے کانوں سے سنتے ہیں اس دعوے کے ساتھ انھوں نے اسلام میں تغیر و تبدل کرنے کا ارادہ کیا اور استعماریت کے کام آنے کے لئے ایسے ایسے دین پیش کئے جیسا ان کے استاد، مطلع، مجدد اور روحانی مرشد عدو اللہ غلام احمد قادیانی کا دین ہے اور جس کا دعویٰ تھا کہ اللہ نے اس سے کلام کیا ہے اور اس سے یہ کہا ہے "سید رشید رضا صاحب مجلۃ المنار مصر میں اور مولوی ثناء اللہ امرتسری صاحب رسالہ اہل حدیث امرتسر ہندوستان میں دونوں عنقریب مر جائیں گے[1]، پھر برطانوی استعمار کا یہ مخلص خادم ہی پہلے بدترین موت مرا اور یہ دونوں بزرگ ایک مدت تک زندہ رہے تاکہ اللہ لوگوں پر مرزا کا جھوٹ ثابت کر دے اور یہ بھی ثابت کر دے کہ وہ شیطان کی وحی سے ہمکلام ہوتا ہے۔ قدیم زمانے کی بات ہے، احنف بن قیس سے کہا گیا کہ مختار بن عبید الثقفی دعویٰ کرتا ہے کہ اس پر وحی آتی ہے، تو احنف نے کہا "اس نے سچ کہا اور ساتھ ہی یہ آیت تلاوت کی: وان الشیاطین لیوحون الی اولیائھم (بیشک شیاطین اپنے دوستوں کے پاس وحی لاتے ہیں)"

عجیب بات ہے کہ محمد علی لاہوری اور اس کا گروہ استمرار وحی کے دعوے پر تو قائم ہے تاکہ یہ ثابت کرے کہ ان کے قادیانی احمق پر وحی آیا کرتی ہے اور جس کے نمونے ہم انکی بیح اور لچر کتابوں سے اوپر نقل کر چکے ہیں۔ ان کتابوں کی سخافت سے وہ خود بھی واقف ہیں جس کی دلیل یہ ہے کہ وہ ان مطبوعہ کتابوں کے نئے ایڈیشن شائع نہیں کرتے اور ان کے قدیم مطبوعہ نسخے جمع کر کے انھیں اس طرح چھپانے کی کوشش کرتے ہیں جس طرح بلی اپنے براز کو! اس کے باوجود وہ عقیدہ استمرار وحی کی خرافات

---

[1] اس میں اس مشہور واقعہ کی طرف اشارہ ہے جو واقعہ مباہلہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مباہلہ مرزا غلام احمد اور مولوی ثناء اللہ صاحب امرتسری مرحوم کے درمیان بڑی باقاعدگی کے ساتھ ہوا تھا اور اس کا موضوع یہی تھا کہ فریقین میں سے جو جھوٹا ہو وہ پہلے مر جائے گا اور سچا جو وہ اس کے بعد بھی زندہ رہے گا۔ اور دنیا نے دیکھ لیا کہ پہلے مرزا کو موت آئی۔ ہیضہ ہوا اور مرتے وقت منہ سے پاخانہ خارج ہوا۔ (مترجم)

کا تحفظ کرتے ہیں، اس کی تصدیق کرتے ہیں اور اس کے اتمام پر اصرار کرتے ہیں۔ اس طرح غلام احمد قادیانی کا کلام ان کے نزدیک وحی ہے اور ساتھ ہی خود ہی کا کلام بھی ہے۔ محمد علی لاہوری جس کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ادارہ ثقافت عامہ نے کیا اور اسے ایک ہزار کتابوں والی اسکیم میں پیشرو کتاب کی حیثیت سے شائع کیا ہے، اپنے قارئین کے ذہن میں یہ بات مرتسم کرنا چاہتا ہے کہ قرآن کریم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے افکار ہیں سے ہے اور اس کے ساتھ ہی ان پر اس کی وحی کی گئی ہے۔ اسی لئے محمد علی نے اپنی کتاب کا نام "محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زندہ جاوید افکار" رکھا ہے اور اس کے اندر تمام قرآنی آیات درج کی ہیں جس طرح غلام قادیانی کی تالیفات جو اسلام سے انکار اور برطانوی استعمار کی تعظیم و تمجید سے بھری پڑی ہیں محمد علی لاہوری کے نزدیک غلام قادیانی کے دوامی افکار ہیں اور ساتھ ہی اسے ان کی وحی کی گئی ہے، اسی طرح اس کی نظر میں قرآنی آیات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دوامی افکار بھی ہیں اور انہی کی وحی بھی ان پر بھیجی گئی ہے۔

اس طرح وہ جس بات کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی سے منسوب کرتا ہے اس کے نزدیک اس کی حیثیت اس کے مسیح موعود غلام قادیانی کی وحی کی ہے۔ وہ گاندھی کی بات کو بھی اسی وحی سے منسوب کرتا ہے۔ جبکہ اس کے نزدیک وحی اب تک جاری ہے اور تمام لوگوں کے لئے ہمیشہ جاری رہے گی۔ وہ تو اپنے ہم وطن ہندو برہمنوں پر اس کا عیب لگاتا ہے کہ یہ لوگ ابتداء سے وحی کو کتاب وید میں محصور کئے ہیں۔ اسی لئے اس کے نزدیک وہ غلطی پر ہیں، اور یہود و نصاریٰ وغیرہ اہل مذاہب نے جو وحی الٰہی کا دروازہ بند کر رکھا ہے ان کے اعتبار سے وہ بھی خاطی ہیں اور ان میں سب سے زیادہ خطاکار وہ مسلمان ہیں جو اس کے قائل ہیں کہ خاتم النبیین کی وفات کے ساتھ وحی منقطع ہوگئی۔ ان کی نظر میں تنہا قادیانیت ہی صحیح راستے پر ہے کیونکہ ان کے نزدیک خاتم النبیین کے معنی انبیاء کی زینت ہیں جس کی مثال انگوٹھی کی سی ہے جو انگلی کے لئے زینت ہوتی ہے۔

آپ نے دیکھا کہ اسلام غلام احمد قادیانی، اور ان تمام لوگوں کی تکذیب کر کے جن پر شیطان وحی بھیجتا ہے ایک بے ثمر درخت بن کر رہ گیا ہے اور ایسا درخت ہوگیا ہے جس پر مسیح (علیہ السلام) نے لعنت کی ہے۔ اور اسلام کا وہ ثمر جو قیامت تک ہمیشہ باقی رہنے والی وحی کی صورت میں کتاب مبین کی آیات میں موجود ہے۔ ان کے نزدیک کوئی شے نہیں۔ اس لئے کہ حقیقی وحی الٰہی کی یہ تلاوت برطانوی استعمار کی تعظیم و تکریم نہیں کرتی اور انبیاء صحابہ کے خلاف دشنام طرازی نہیں کرتی، ورنہ احمق غلام کی کفریات میں اس کا مقابلہ کرتی ہے۔

اس کے بعد میں مصر کے وزیر تربیت و تعلیم جیسے مسلمان مجاہد کی خدمت میں یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ وہ محمد علی لاہوری کی اس کتاب کے نسخے ضبط کرنے کا حکم دیں جس کا ترجمہ ادارۂ ثقافت عامہ نے شائع کیا ہے۔ بلکہ انھیں نذرِ آتش کر دیں اور کتاب کے ترجمے اور اس کی اشاعت کے مصارف کا تاوان اس شخص پر عائد کریں جس نے اسے ہزار کتابوں کے منصوبے میں داخل کرنے کی رائے دی ہے، اور ادارۂ ثقافت عامہ کو اچھی طرح متنبہ کر دیں کہ وہ ہر بات میں امانت دار، خیر اندیش اور حقائق اشیاء سے واقف کار لوگوں سے مشورہ کیا کرے۔ واللہ الموفق

(محب الدین الخطیب)

براہ راست عربی سے ترجمہ

پروفیسر چودھری صفدر علی ایم۔اے ایل۔ایل۔بی

اسلامی بین الاقوامی مذاکرہ کا آنکھوں دیکھا حال

بین الاقوامی مذاکرے کو آپ ایک مثال سے اچھی طرح سے سمجھ سکیں گے۔ ہمارے علاقے میں ایک نہایت ہی نیک، خدا رسیدہ اور پاک باز بزرگ بابا خاکی شاہ گزرے ہیں جنھوں نے آکر اپنی تبلیغ و دعوت سے اور اپنے بلند اخلاق اور سیرت و کردار سے ہزاروں لوگوں کو مسلمان کیا تھا۔ حضرت بابا نے تعلیمات اسلامی پر کتابیں بھی چھوڑی ہیں اور کچھ حقیقت و معرفت کے اشعار اور کافیاں بھی دیگر صوفیاء کی طرح کہی ہیں۔ تقسیم سے قبل آپ کا عرس ہوتا تھا اور اس میں مختلف لوگ مختلف مقاصد سے حصہ لینے آتے تھے۔

پہلے نمبر پر وہ گروہ تھا جو حضرت صاحب کا سچا مرید اور ان کے افکار و تعلیمات پر چلتا تھا۔ یہ لوگ اصل میں حضرت صاحب کی تعلیمات اور مناقب کی تذکیر کرنے، مراقبے کرنے اور لوگوں کو اس طرف بلانے کے لئے آتے تھے۔ انھیں میلے کے باقی خرافات سے نہ صرف یہ کہ کوئی دلچسپی اور غرض نہ تھی بلکہ یہ انھیں بند کرنا چاہتے تھے۔ اور خلاف شرع باتوں پر گدی نشین تک کو ٹوکنے سے نہیں چوکتے تھے۔

دوسرا گروہ ان مریدوں اور عقیدت مندوں کا تھا جو بابا حضرت کی تعلیمات چھوڑ چکے تھے۔ اپنی خواہشات کے پیرو بن چکے تھے اور من مانی کرتے تھے لیکن دوسرا غضب یہ کرتے تھے کہ جو غلط بات کرنا چاہتے تھے اس کو حضرت صاحب کے ساتھ یا تو منسوب کر دیتے تھے یا کسی طرح سے کھینچ تان کر ان کی کتب اور اشعار سے کسی چیز کو وہی معنی اپنی من مانی اور من گھڑت تاویلوں سے پہنا دیتے تھے مثلاً ان کا قوالی سننے کو جی چاہتا تو کہتے قوالی تو پہلے سے معرفت کی جان رہی ہے دوسرے صوفیاء نے بھی سنی ہے اس کا ہماری طبیعت پر بڑا روحانی اثر پڑتا ہے۔ یہ حضرت صاحب نے اس لئے منع کیا تھا کہ اس وقت وہ ہندوؤں کے دیوتاؤں کے بھجن گاتے تھے اب تو وہ حضرت صاحب کی مدح گاتے ہیں۔ لہذا کوئی حرج نہیں۔ رقاصاؤں کے ناچ دیکھتے اور ٹوکنے پر کہہ دیتے یہ بھی حضرت صاحب کی عقیدت مند ہیں۔ لہذا ۔ کل مومن اخوۃ۔ میلے میں جوا، شراب، تھیٹر، ناٹک وغیرہ اور دیگر خرافات ہوتے تھے۔ انھیں روکنے کے لئے کہا جاتا تو فرماتے یہ اپنے افعال کے خود ذمہ دار ہیں ہم ان پر زبردستی نہیں کر سکتے۔ لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْن ۔ بڑی مصیبت یہ تھی کہ درگاہ کا یہ نظم انہی لوگوں کے تصرف میں تھا گدی نشین سے لے کر [illegible] تک سب اسی گروہ سے تعلق رکھتے تھے اور مریدوں میں بھی اکثریت ان کے ساتھ تھی۔ ان کا کام حضرت صاحب کی تعریف کرنا اور ان کی شان میں مدح سرائی میں رطب اللسان رہنا

مرادیں مانگنا، چڑھاوے چڑھانا معجزے اور کرامات بیان کرنا لیکن حضرت صاحب کی ایک بات بھی زندگی میں مان کر نہ دینا تھا۔ سچے مریدوں سے ان کی ہمیشہ چلتی رہتی تھی۔

میلے میں آنے والے دو گروہ اپنے مخصوص ارادوں سے آتے تھے یہ ہندو اور سکھ تھے۔ ان کا رویہ حضرت صاحب سے اور ان کے پیروؤں سے ہمیشہ نہایت ہی شدید معاندانہ رہا تھا۔ بابا خاکی شاہ کی شخصیت پر سب وشتم کرتے جھوٹے پروپیگنڈے کرتے اپنے لٹریچر میں ان کے خلاف مقالے لکھتے مریدوں سے بھی بارہا فرقہ وارانہ فساد ہوا۔ خود کسی مندر میں گائے کا گوشت پھینک دیتے اور کسی مسلمان کا نام دھر کر فساد کرا دیتے۔ سکھ بھی مسلمانوں کے تہواروں میں ہڑبونگ مچاتے۔ درگاہ کی تعمیر کے وقت خاصا لمبا مقدمہ ان سے چلتا رہا تھا۔

لیکن اب ان معاندین کے لئے سیاسی ضرورت کے پیش نظر حضرت صاحب کے مریدوں کو ساتھ ملانا ضروری تھا۔ چنانچہ اب ہندو آکر مزار کو ڈنڈوت بھی کرتے گدی نشین سے ان کی گاڑھی چھنتی تھی، عرس میں وہ مالی امداد بھی دیتے تھے قوالوں، بھانڈوں کو پیسے دیتے تھے، اور حضرت صاحب کی تعلیمات اب یکایک ان کے ویدوں کے مطابق ہوگئی تھیں تاکہ اس طرح وہ انھیں سیاسی مصالح کے لئے ساتھ ملا سکیں۔ دوسری طرف سکھ تھے۔ وہ اپنے گرنتھ کی تعلیمات کو حضرت صاحب کی ہی تعلیمات ثابت کرتے تھے۔ اور یہ بھی ظاہر کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ ہم اپنے مسلمان مزارعوں کو بہت ہی مراعات دیتے ہیں یہ ہندو دراصل تمہارا خون چوستے ہیں وہ ہمارے خلاف غلط پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ ہم حضرت صاحب کے مریدوں کے مذہبی معاملات میں دخل دیتے ہیں۔ ان دونوں حریفوں کے درمیان بات بات پر باہم چھیڑ چلتی تھی۔ پیچ پر پیچ ہوتی تھی اور ہر سیاسی پہلوان دوسرے کو گرانے کی ہر ممکن کوشش کرتا تھا۔

عوام الناس اس میلے میں تفریحاً آتے تھے کہ باقی میلوں کی طرح اس کا بھی لطف اٹھائیں۔ ان کا مقصد کھیل تفریح کے علاوہ کچھ نہ ہوتا تھا۔

ایک بات قابل افسوس یہ تھی کہ مرید بھی ہم خیال نہ تھے بلکہ اپنے گاؤں والوں کی حمایت کرتے تھے میلے میں اگر دو گاؤں آپس میں الجھ جائیں جو اکثر ہوتا تھا۔ تو یہ اپنے ہی گاؤں والوں کی طرفداری کرتے تھے خواہ وہ حق پر ہوں یا ناحق پر۔ صرف سچے مریدوں میں یکجہتی پائی جاتی تھی وہ مختلف جگہوں سے آنے کے باوجود بھائی بھائی تھے۔ اور دوسروں کو بھی اسی اتحاد کی ترغیب دیا کرتے تھے۔

اس عرس کو اگر میں اسلامی مذاکرہ پر منطبق کروں تو بابا خاکی شاہ اسلام ہیں سچے مرید اسلام پسند مندوبین روایتی مرید مغرب زدہ مندوبین، ہندو امریکی بلاک مستشرقین اور سکھ روسی بلاک تھے اور عوام الناس یہاں وہ لوگ تھے جو مندوبین کے علاوہ مذاکرہ میں حاضر ہوتے تھے۔

سیاسی لوگ

سیاسی لوگوں کو یہ توقعات تھیں۔ کہ مولوی جو آئے دن اسلام اسلام پکارتا ہے اور اس کے نافذ کرنے کا شور مچاتا ہے اور اپنی "تنگ نظری" اور "تاریک خیالی" سے پاکستان کی ترقی کی راہ میں روڑا بنا ہوا ہے۔ اس کی آواز اس نقار خانے میں دب کر رہ جائے گی۔ دوسرے اسلامی ممالک سے "ماڈرن" اور "ترقی پسند" لوگ آئیں گے مغربی افکار و جدید اقدار کو چیلنج کو پیش کریں گے۔ اجتہاد کا دروازہ ہمارے لئے بلا کسی پاسبانی کے چوپٹ کھول دیں گے۔ اور پھر یہاں اسلام کا ایک جدید ایڈیشن تیار ہوگا۔ جس میں ہمارے کرتوت جائز ہی نہیں بلکہ

مشعلِ راہ ثابت ہو کر رہیں گے ۔ اور ہم "تماشہ" کر سکیں گے۔ کہ وہ چودہ سو سال پرانا اسلام جس کے اتباع کی آٹھوں پہر تو تبلیغ کرتا رہتا ہے۔ سارے اسلامی ممالک ترک کر چکے ہیں بس ایک تو ہی اسے سینے سے لگائے پھرتا ہے۔

اس کا اظہار صدر کی تقریر سے لے کر ہر اس شخص نے کیا جو خود نہیں بدلنا چاہتا اور قرآن کو اپنے مطابق بدلنا چاہتا ہے۔ ان لوگوں نے اسلام کی شان میں قصائد مدحیہ پڑھے لیکن اگر کوئی ان سے اسلام نافذ کرنے کے لئے کہے تو حضرات بغلیں جھانکنے لگتے ہیں، حالانکہ یہ سب مقتدر حضرات تھے اور بعض تو ان میں اس پوزیشن میں ہیں کہ اگر چاہیں تو اسلامی اقدار کو نافذ کر سکیں۔

صدر پاکستان جنرل اسکندر مرزا نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا "اب ضرورت ہے کہ اسلام مسجد سے باہر نکلے اور اجتماعی زندگی میں ہر شعبے پر حاوی ہو سائنسداں تجربہ گاہ میں، کسان کھیت میں اور بچہ مدرسے میں اسلام کا حامل ہو اور اسے پیش کرے"

میاں افضل حسین وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی نے اپنے استقبالیہ خطبے میں کہا "اسلام کی اخلاقی قدروں کی آج اشد ضرورت ہے"

ترکیہ جمہوریہ کے وزیر تعلیم ڈاکٹر فواد نے کہا "اسلام اعلیٰ ثقافت بہترین اصول اور زریں روایات کا حامل ہے"۔ لیکن اگر کہا جائے کہ بہت اچھے اسلام کو نافذ کرنے میں کیا چیز مانع ہے تو جواب ملتا ہے "مولوی بڑا ہی تنگ نظر ہے" ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ۔

کہ جس کے دوست تم ہو

مستشرقین مغرب جن کا استاد ہمیشہ یہ ہے کہ وہ ہم کو اپنے لئے مفید بنانا چاہتا تھا۔ اب تک جن کو اسلام اور بانیٔ اسلام میں برائیاں ہی برائیاں نظر آتی تھیں۔ آج روس کے مقابلے میں اسلام سے کام لینے کے لئے ان کے مذہب کے عین مطابق ہو گیا تھا آج وہ اسلام اور عیسائیت کو اپنی سیاست کا ریشمی لنگر جوڑنے کو تیار تھے اس کے لئے انہوں نے ۱۹۵۲ء میں ایک اسلامی بین الاقوامی مذاکرہ امریکہ میں بھی منعقد کیا تھا۔ ظاہر ہے یہ مقصد جب ہی حاصل ہو سکتا تھا جب اسلام کی بنیادوں کو اس طریق سے منہدم کیا جائے کہ یہ دنیا کے آخری مذہب اور تعذیب انگیز تحریک کے طور پر اپنی بنیاد ہی کھو دے۔ اس کے لئے انہوں نے مختلف طریقے اختیار کئے۔

۱۔ ایسی بنیادیں فراہم کی جائیں جو شرق و مغرب میں مشترک ہوں اور یہ ممکن تب ہی ہے جب اسلامی بنیادی عقائد کو موزوں کر کے انطباق کیا جائے۔ چنانچہ ڈاکٹر ہیلر نے اپنے مقالے میں مشورہ دیا کہ مسلمان نبوت، معجزات، نماز، قیامت، جیسے بنیادی عقائد کو جدید نفسیات کے اصولوں کے مطابق از سر نو مرتب کریں۔ اور ان پر نظر ثانی کریں۔

۲۔ مسلمانوں کے دماغوں میں بٹھایا جائے کہ ان کی بقا اور ترقی کا راز اسی میں ہے کہ مسلمان دین حق کو مسجد کی چار دیواری میں چھوڑ کر اپنے ملکی اور اجتماعی مسائل میں ہدایت الٰہی کی بجائے مغرب کو رہنما مانیں کیونکہ اسلامی تعلیمات عہد حاضر کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دیتیں۔ وحی تو صرف زمان و مکان کے تقاضوں کے تحت نازل ہوتی ہے اس مقصد کے لئے نہایت چابکدستی سے ایسی چیزیں منتخب کی گئیں جو جدید تہذیب و تمدن کے خلاف پڑتی ہیں مثلاً پردہ ضبط تولید وغیرہ۔

۳۔ ایک کوشش اسلامی برادری کو ختم کرنے کی یہ کی گئی کہ مسلمانوں کے دلوں میں ان کی جاہلی تہذیبوں کی محبت ڈالنے کی کوشش کی گئی یہ کہ مسلمان مصری، عربی، شامی، ایرانی، پاکستانی پہلے ہوں اور مسلمان بعد میں۔

۴۔ اُن لوگوں کے ناموں کو زیادہ سے زیادہ اچھالا گیا جنہوں نے اسلامی ممالک میں سے کسی کو لادینیت کی راہ پر ڈالا ہے۔ ترکی کے ایک شخص ضیا کوک الپ کے افکار و مساعی کی دل و جان سے داد دی گئی۔

یہی ہتھکنڈے یا ان میں سے اکثر یہاں بھی استعمال کئے گئے لیکن مذکورہ دونوں گروہوں کی شومئ قسمت سے مندوبین میں لاکھ احتیاط کے باوجود چند اسلام کے شیدائی اس میں تفقہ اور تدبر اور بصیرت رکھنے والے۔ جدید تعلیم یافتہ لیکن اسلامی غیرت و حمیت رکھنے والے مندوبین بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔ اور لطف کی بات یہ کہ ان میں کوئی بھی ملا نہ تھا سب "مسٹر" تھے۔ لہٰذا پہلے گروہ کا تو تماشا نہ ہوا جو ملا کے پرزے اڑتے دیکھنے آیا تھا اور دوسرے گروہ کا انھوں نے ہر موقع پر دندان شکن جواب دیا۔ بلکہ انھوں نے متعدد موقعوں پر اس کا اعلان بھی کیا کہ ہم اسلام کے خلاف ان لوگوں کے عزائم کبھی پورے نہ ہونے دیں گے۔

پہلے مقصد کے لئے سب سے زیادہ مواد ڈاکٹر داؤد رہبر کے مقالے نے فراہم کیا۔ لیکن شامی اور مصری اور عراقی مندوبین نے اس کی نہ صرف مخالفت بھی کی بلکہ شدید کی۔ جن چار باتوں کو انھوں نے قابل اعتراض کہا وہ یہ ہیں۔

۱۔ اسلام کے بنیادی عقائد کو بھی ضرورت کے پیش نظر تبدیل و منسوخ کیا جا سکتا ہے

۲۔ حضور کو نبوت پر سرفراز ہونے اور نزول قرآن سے پہلے ہی انبیاء کے قصص معلوم تھے۔

۳۔ وحی نبی و انسان کے لئے ہی مخصوص نہیں حیوانات پر بھی نازل ہو سکتی ہے۔

۴۔ بعض قرآنی آیات کا نزول واقعات کے سبب سے ہوا ان کی مستقل اور دوامی حیثیت کوئی نہیں۔

مصری فاضل ابو زہرہ نے ان کا جواب تفصیل سے دیا ان کے بعد پروفیسر محمد مبارک اٹھے اور سخت الفاظ میں کہا کہ افسوس ہے ڈاکٹر رہبر نے ایسے مقالے کی جرأت کی ہے۔ جو اسلام کے وضع احکام کے منافی ہے۔ ان کے بعد شامی سابق وزیر مصطفیٰ زرقا اٹھے اور کہا بعض مغرب پرست مسلمان اسلام کے بارے میں مغربی یونیورسٹیوں سے ڈگریاں لے آتے ہیں اور اسلام کو خاص سیاسی مقاصد کے تحت اپنا تختہ مشق بناتے ہیں۔ اور ہم پر ایسے تصورات مسلط کرنا چاہتے ہیں جو سراسر غیر اسلامی ہیں ہم اس بین الاقوامی اسلامی مجلس میں ایسے خلاف اسلام کوششوں کو کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔ [illegible] وفد کے لیڈر ڈاکٹر عبدالوہاب عزام نے ڈاکٹر داؤد رہبر کے مقالہ کو واپس لینے کا مطالبہ کیا آخر فیصلہ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب [illegible] ایک دوسرا مقالہ کلوکیم کے لئے لکھ دیں۔ جاتے وقت جب انھیں پتہ چلا کہ ڈاکٹر رہبر صاحب اس کے لئے تیار نہیں تو [illegible] صاحب ہوائی اڈے سے واپس آگئے اور اس وقت تک لاہور میں رہنے کا ارادہ کیا۔ ارادہ کیا جب تک وہ نیا مقالہ لکھ کر نہ دیں یا اسے واپس نہ لے لیں۔

"جدید دور کا اور قدامت کا اسلامی معاشرے کو چیلنج" یہ بھی ایک دن کا موضوع تھا جس میں اس عنصر نے کوشش کی کہ مسلمانوں کو اسلام کے جدید تقاضوں کے لئے ناکافی ہونے کا احساس دلایا جائے

امریکی مستشرق ڈاکٹر گرون باؤم نے کہا مسلمانوں میں صرف عقیدے کی قدر مشترک ہے اور بس۔ یعنی یہ کوئی ایسی قدر نہیں جس سے پچھڑے ہوئے ہیں نئی دنیا نے اور بہت سی اقدار پیش کی ہیں قوم ملک وطن زبان رنگ ان پر اشتراک کی بنیاد رکھو۔

ڈاکٹر مبارک نے فرمایا نہیں بلکہ مسلمان الجزائر سے انڈونیشیا تک سماجی، سیاسی، اخلاقی، اقتصادی اور معاشرتی طور پر ایک ہیں اسی لئے ایک طرح کے جذبات کشمیر فلسطین و الجزائر کے لئے اپنے اندر رکھتے ہیں۔

غلام واحد چوہدری نے اپنا موضوع چھوڑ کر پاکستان میں آئین سازی کی تاریخ شروع کر دی اور "مولوی" کو کوسنا شروع کر دیا۔ مولانا ظفر احمد انصاری نے ان کی ایک ایک بات کو بڑی خوبی کے ساتھ رد فرمایا یہ مقالہ ہرگز ایسی علمی محفل میں پڑھنے کے قابل نہ تھا اور اس کا معیار قطعی ایسا نہ تھا کہ اسے یہاں پڑھا جاتا۔ بلکہ یہ موچی دروازے یا قاسم باغ کے لائق تھا

"لادینیت اور اس کے علمبردار" ... دن کا پہلا ڈاکٹر برنارڈ لیوس نے پڑھا جنھوں نے "جوان سال ترکوں کے سیاسی افکار" پر اپنا مقالہ پڑھا۔ اکبر نا بید ستان نے کہا "جی ہاں وہی جو اپنی حدود میں محدود ہو کر داعی اجل کا انتظار کر رہے ہیں۔" ڈاکٹر شمتھ نے اپنے مقالے میں کہا اسلامی قانون کی تنزیل مکمل ہو گئی ہے لیکن تفہیم مکمل نہیں ہوئی لہذا ہر زمانے میں جدید تقاضوں کے مطابق ہونا چاہیے۔ اجتہاد ضروری ہی نہیں فرض ہے۔ اگر اسلامی قانون نہ ہوتا پھر بھی کوئی تو قانون ہوتا۔ جیسے معتزلہ کا مذہب ہے کہ اللہ کے قانون کو آدمی وحی کے بغیر عقل سے بھی سمجھ سکتا ہے۔ مسٹر عبدالقادر صدیقی نے اس کی پرزور تردید کی اور فرمایا اللہ کے قانون کی ہمیشہ بنیادیں ہوتی ہیں۔ اور اب بھی ہیں معتزلہ کا یہ عقیدہ امت کے نزدیک ہمیشہ سے غلط ہے۔ مولانا مودودی نے اجتہاد اور قانون سازی کی حدود کو نہایت ہی احسن طریق پر واضح کیا۔

ڈاکٹر رودی پرٹ (جرمنی) نے اپنے مقالے میں کہا اسلام کی سزائیں اور حدود کا بھی خیال میں کوئی بھی شخص آج حامی نہیں ہو سکتا تو جب انھیں بدلا جا سکتا ہے تو شراکت، اوقاف وغیرہ کے قوانین کیوں نہیں بدلے جا سکتے کیونکہ اسلام کے تشریعی مسائل عصر حاضر کے لئے ہر لحاظ سے مکتفی نہیں۔ ڈاکٹر ابوز۔قاد نے اس کی پرزور تردید کی اور سعودی عرب کی مثال دی جہاں یہ قانون رائج ہے۔ ڈاکٹر حامد یکٹز اور ڈاکٹر جرڈ ڈالی کے مقالات میں مستشرقین اور مغرب کا مقصد کھل گیا تھا کہ ہم پہلے اسلام کو برا کہتے رہے ہیں۔ لیکن آیئے اب اسلام اور عیسائیت اور مشرق و مغرب میں اشتراک پیدا کریں۔ کیونکہ ان میں بہت سی باتیں مشترک ہیں اور اسلام ہی اشتراکیت کو روک سکتا ہے۔ کچھ آپ اپنے عقائد پر نظر ثانی کریں کچھ ہم قریب آتے ہیں۔ ان کو سب سے مکمل کر جواب دینے والے مندوب جناب بہاء الامیری شامی ہیں۔ "عربوں کی چھاتی پر مونگ دلنے والے فلسطین سے عربوں کو بے گھر کر کے یہودیوں کو بسا کر یہ نہ کہیں کہ ہم اپنے وطن کو بھول گئے ہیں۔ الجزائر اور کشمیر کا زخم ابھی تازہ ہے۔ عرب اس وقت تک چین نہیں لیں گے۔ جب تک انھیں کسی اور ملک میں نہیں، ان کے اپنے ملک فلسطین میں نہ بسایا جائے گا۔" یہی ہیں جنھوں نے جب سیاسی بحث نہ چھیڑنے کے لئے کہا گیا تھا تو کہا تھا سیاست اسلام کا حصہ ہے، اس پر گفتگو ہونی چاہیے البتہ بیرونی پروپیگنڈے کو درمیان میں نہیں لانا چاہیے۔

دو پہلوان

عالمی اکھاڑے کے دونوں پہلوان یہاں اپنی ساکھ بٹھانے آئے تھے۔ اور ہم چون ما دیگرے نیست اور لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ کا ڈنکا بجانے آئے تھے۔ اپنے اپنے پٹھوں کی پیٹھ ٹھونک کر رکھتے بس یونہی کوئی ایک دوسرے کے متعلق کوئی بات کہتا خم ٹھونک کر میدان میں آ جاتے، اور بڑی مشکل سے بیچ بچاؤ کر دیا جاتا۔ پہلے دن چونکہ دوسرا پہلوان غیر حاضر تھا۔ (یعنی روسی وفد) ابھی لاہور نہیں پہنچا تھا۔ لہذا میدان خالی پا کر حریف کے ایک پٹھے

نے دعوتِ مبارزت دے دی۔ یہ تھے ہارورڈ یونیورسٹی (امریکہ) کے پروفیسر رچرڈ فرائی انھوں نے کہا "روس مشرق وسطیٰ کے وفود پر یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ کہ وسط ایشیا میں پوری مذہبی آزادی ہے حالانکہ سب اس آزادی کو جانتے ہیں۔ ساتھ ساتھ یہ بھی احساس دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ امریکہ مشرق وسطیٰ کو بھاری صنعتی امداد نہیں دیتا۔ اور ہم ہر طرح مدد دینے کے لئے تیار ہیں۔ انھوں نے ساتھ یہ بھی کہا تھا کہ مشرق و مغرب میں بہت سی اقدار مشترک ہیں۔ اور انہی کو اساس بنا کر ہمیں اشتراکیت کا مقابلہ کرنا چاہئے اور اسلام ہی مشرق وسطیٰ میں اشتراکیت کو روک سکتا ہے۔" لیکن پتہ اس وقت چلا جب مقالہ ختم ہوتے ہی روسی سفارت خانہ کے فرسٹ سکریٹری مارکوف غصّے میں کانپتے ہوئے دھم سے آن موجود ہوئے اور انھوں نے صدر کی اجازت کی ضرورت سمجھے بغیر کہنا شروع کیا "امریکی پروفیسر کا مقالہ بیہودہ اور رسوا کن ہے میں اس کا جواب نہیں دوں گا لیکن احتجاج ضرور کرتا ہوں جواب روسی وفد دے گا۔" اس کے بعد چینی وفد کے قائد مسٹر یسین صدائی نے شام کے اجلاس میں احتجاج کی اجازت مانگی اور کہا اگر اجازت نہ دی گئی تو وہ اجلاس میں نہیں آئیں گے اور پروفیسر ہٹی (HITTI) بیچ بچاؤ کرائیں گے۔

دوسری طرف دوسرے پہلوان اپنے ا ... اد (روسی ... ری) مسٹر آئی بست اخوت کو بڑا بھاری بھرکم عمامہ پہنا کر اور بڑے بڑے دھاری دار جُبّے زیب تن کرا کر لائے تھے گویا کہ شیخ الاسلام ہیں اور ایک لمحہ اکیلا نہیں چھوڑتے تھے گویا ہمزاد کا ڈر ہو۔ ویسے موصوف عربی بول لیتے تھے لیکن پرانی اور ادبی مقامات حریری والی عربی۔

ایک دن جرمنی کے ڈاکٹر سپولر نے پھر اپنے مقالہ میں روس میں مذہبی آزادی اور پروپیگنڈے کے متعلق کہدیا کہ وہاں یہ نا پید ہے۔ بس روسی وفد کے قائد شمس الدینوف پھر کون روک سکتا تھا آگئے میدان میں کہ روس کے آئین میں مذہبی آزادی کی شق موجود ہے۔ وسط ایشیا سائبیریا وغیرہ میں مذہبی بورڈ موجود ہیں۔ جو آپ انسانوں کو انسانوں کے چنگل سے نکلنے نہیں دینا چاہتے۔ وہی سوشلزم کی مخالفت کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سپولر نے جواباً کہا میرا بھی یہی مطلب ہے کہ روس میں آزادئ مذہب بھی ہے اور مذہب کے خلاف پروپیگنڈے کی بھی آزادی ہے۔ شمس الدینوف نے انھیں جواب دے کر آتے ہوئے رستے میں لیا اور کہا کہ یہ کیا کم مثال ہے کہ روس میں برابر قرآن شائع ہوتا ہے اور پاکستانی وفد کو اس کی ایک کاپی بھی تحفۃً دی گئی تھی۔

اشتراکی مندوبین اکثر اپنے مقالات کے موضوع سے ہٹ کر یہ یقین دلانے لگ جاتے کہ ہم مذہبی طور پر آزاد ہیں۔ اور روس کے خلاف یہ پروپیگنڈا غلط ہے۔ ڈاکٹر یسین صدائی پروی چین کے مندوب نے بھی یہی ثابت کرنا شروع کر دیا۔ کہ انقلاب کے بعد اشتراکی چین میں ہم مذہبی طور پر پہلے سے زیادہ آزاد ہیں۔ دوسرے چینی مندوب مسٹر امین خدومستے بھی یہی پرچار کیا کہ دنیائے اسلام کا فرض ہے ان اقوام کی مدد کریں جو سامراجی طاقتوں کے طوق غلامی کو ختم کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ آخری دن اور آخری اجلاس میں تو اور بھی زیادہ حیرت ہوئی کہ روسی وفد کے قائد نے صدر اجلاس جو اس دن وائس چانسلر افضل حسین صاحب تھے ان سے بڑی بحث مباحثے کے بعد اور پروفیسر ہٹی کی سپیشل سفارش سے اپنے ایک مندوب ڈاکٹر محمد اسماعیل مخدوم کے لئے ۵ سات منٹ لئے لیکن مقالے میں پھر روس میں اسلام کی آزادی کا ذکر شروع کر دیا اس پر خلیفہ عبدالحکیم صاحب نے کہا کہ ہم یہاں مقالہ سننے آئے ہیں مذہبی پروپیگنڈا سننے کے لئے نہیں آئے۔

مجتہدینِ پاکستان

دنیا میں ہر علم کا دروازہ ہر شخص کے لئے کھلا ہوا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ دنیا میں ہر شعبہ علم میں یہ سنت رائج ہے کہ اس علم پر ہر آدمی کو تبصرے اور رائے زنی کی اجازت نہیں ہوتی بلکہ صرف اس کا علم رکھنے والوں کو یہ حق دیا جاتا ہے۔ اور لوگ اس علم پر کچھ کہنے سے پہلے اس کا ضروری علم حاصل کرنا لازمی سمجھتے ہیں۔ اور اس میں اپنی رائے رکھنے والے کے لئے اس کا کامل اور اساسی اور فرسٹ ہینڈ علم ضروری ہوتا ہے لیکن اسلام ایک ایسا بدقسمت موضوع ہے کہ جس پر ایک وکیل ایک جج اور ایک انجنیئر ایک سیاست داں غرضیکہ ایک پنواڑی حتیٰ کہ ایک بازاری آدمی بھی اپنے آپ کو امام ابوحنیفہ اور شیخ الاسلام سے کم نہیں سمجھتا اور یہاں الٹی گنگا بہتی ہے کہ جو یہاں اہل علم ہیں انھیں تنگ نظر "ملا" اور اسلام کی راہ میں رکاوٹ خیال کیا جاتا ہے اور جن کی قربانیوں اور کوششوں سے اسلام کا اتنا کچھ بھی باقی رہا اور لوگ نمازیں پڑھتے اور قرآن و سنت کی بات کرتے نظر آرہے ہیں۔ انھیں مسلمانوں کے لئے اصل مصیبت قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن جن لوگوں کا سرمایۂ علم یہ ہے کہ قرآن کی ایک آیت بھی عربی میں پڑھ نہیں سکتے اور عمل کی حالت یہ ہے کہ گھر میں بیٹھ ہوا ایرانی قالین تو شاید مل جائیں لیکن جا نماز نہ ملے گی اور اسلام سے عقیدت اتنی ہے کہ قرآن کے ہاتھوں میں زندگی کی باگ دے کر نہیں بلکہ قرآن کے اسٹرنگ کو پکڑ کر اپنی مرضی کے مطابق چلانا چاہتے ہیں وہ لوگ دین کے مفسر، مجتہد، فقیہ، اور اہل الرائے بن گئے ہیں چنانچہ کسی کو قرآن اشتراکیت کی کوکھ معلوم ہوتا ہے کسی کو اپنی صُلح پسندی، رواداری اور معذرت خواہانہ رویہ کے پیش نظر سب مذاہب ایک ہی جیسے نظر آتے ہیں کسی کو اسلام اور قرآن دو دو نظر آتے ہیں۔ اور ان کے نزدیک اگر دنیا میں کوئی ابجر ہمرکو بھی پیچھے چھوڑ گیا ہے تو وہ موجودہ سائنس دان ہیں۔ کوئی اپنی من مانی تاویل کرنے کے راستے میں رکاوٹ سمجھ کر حدیث وسنت پر ہی ہاتھ صاف کر رہا ہے "تاکہ مزے سے جو چاہیں مفہوم نکالیں۔ بابا خاکی شاہ کے اس میلے میں یہ گروہ اپنے خیالات کی اشاعت کرنے آیا تھا اختصار کے پیش نظر میں بیرونی مندوبین کو چھوڑتا ہوں صرف پاکستانی مجتہدین کو لیتا ہوں کہ صحیح اسلام پسند طبقے نے ان کا بھانڈا کیسے چوراہے پر پھوڑا کہ ان کی علمیت اور قرآن فہمی کا طول و عرض نظر آگیا۔ چنانچہ ڈاکٹر غلام واحد چودھری اور ڈاکٹر داؤد رہبر صاحب کا ذکر خیر تو پہلے ہو چکا ہے۔ اس فہرست میں اگلے مندوب غلام احمد صاحب پرویز تھے انھوں نے اپنے مقالے میں جو کچھ کہا خیر انھیں اپنی رائے رکھنے کا حق تھا لیکن دو باتیں بڑی عجیب تھیں۔ انھوں نے کہا جو اس دنیا میں خوش حال ہیں وہی اس دنیا آخرت میں بھی اللہ کے محبوب ہوں گے۔

دوسری بات اس سے بھی مضحکہ خیز تھی اشتراکیت کو ثابت کرتے کرتے انھوں نے کہا کہ اسلام میں زمین کسی فرد کی ملکیت نہیں ہوسکتی کیونکہ یہ اللہ کی ہے۔ اور نہ دولت کسی کے پاس رہنے دی جاسکتی ہے۔ اور قرآن میں وراثت زکوٰۃ، حج، صدقہ، خیرات کے احکامات کا سوال تو یہ عبوری احکام تھے یعنی جب سوشلسٹ نظام قائم ہو جائے تو یہ آپ سے آپ منسوخ ہو جائیں گے۔ اور ایک لطف کی بات یہ بھی تھی کہ ایک آدھ آیت کے ٹکڑے کے علاوہ انھوں نے اپنے مقالے میں آیت کا صرف حوالہ دیا آیت پڑھی کوئی بھی نہیں۔

مصری فاضل عبدالوہاب عزام نے فرمایا یہ استدلال خوب ہے کہ زمین اللہ کی ہے لہٰذا کسی فرد کی ملکیت نہیں ہوسکتی اور فرد کی ملکیت تو ہو نہیں سکتی لیکن افراد یعنی حکومت کی ملکیت ہوسکتی ہے یہ بھی عجیب ہے۔ انھوں نے عرب کے

ایک بدو کی مثال دی کہ اس سے کسی نے پوچھا یہ بھیڑیں کس کی ہیں اس نے برملا کہا ، اللہ کا مال اور میرے پاس ہے
"مولانا مودودی کے مقالہ پر پرویز صاحب نے جو سوالات کئے تھے اس میں ایک ان کا پرانا ہدف سنت بھی تھا کہ
یہ اسلامی قانون کا ماخذ کیسے ہو سکتی ہے۔ کوئی دعویٰ کر سکتا ہے کہ بخاری کی ساری احادیث سچی ہیں جبکہ محدثین کو
ہمیشہ سے اس میں کلام رہا ہے۔ مولانا نے اس کا جواب مدلل دیا جو اس کی طوالت کی وجہ سے درج نہیں کیا جا سکتا مصری
فاضل شیخ ابوزہرہ نے اس کا جواب بہت اچھا دیا کہ اسلام میں قرآن وسنت کی اہمیت ایک دوسرے کے ساتھ
مل کر ہے اور انھیں جدا نہیں کیا جا سکتا۔ نہ بعض ضعیف احادیث کی وجہ سے اس خزانے کو دریا برد کیا جا سکتا ہے۔
حیرت ہے کہ محدثین کی اتنی بات تو آپ مان لیتے ہیں کہ فلاں حدیث ضعیف ہے لیکن ان کی یہ بات نہیں مانتے کہ یہ
حدیث کھری اور سچی ہے۔ بہرحال سونے کو صرف ذرا سی ملاوٹ کی وجہ سے پھینکا نہیں جا سکتا۔ مولانا ظفر احمد انصاری
سابق سکریٹری بورڈ تعلیمات اسلامیہ نے فرمایا پرویز صاحب نے کوئی علمی سوال نہیں کیا بلکہ اپنی دقت اور مشکل سامنے
رکھی ہے کہ میں اس کمیشن کا ممبر ہوں جسے قرآن وسنت کے مطابق پاکستانی قانون کو مرتب کرنا ہے اور مجھے پتہ نہیں
کہ سنت کیا ہے" زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم"۔ انھیں اس منصب کو قبول کرنا نہیں چاہئے تھا یا پھر تقرر کرنے
والوں سے پوچھنا چاہئے تھا۔ اگر اراکین مجلس انھیں بتا بھی دیں تو بھی ان کی مشکل حل نہیں ہوگی۔ کیونکہ آپ عربی
نہیں جانتے اور تراجم کی مدد سے قرآن وسنت کا مفہوم کما حقہٗ متعین نہیں کیا جا سکتا۔

خلیفہ عبدالحکیم صاحب نے لوگوں کو اپنی رواداری اور امن پسندی کا یقین دلاتے ہوئے وہی آیت جو سرسید
مرحوم اور مولانا آزاد مرحوم نے پیش کی ۔ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِئِیْنَ
مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَبِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ
وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ اور ثابت کیا کہ اسلام عیسائیت یہودیت ہندومت بدھ مت سب یکساں ذریعہ نجات
ہیں۔ یہ بات دیکھنے میں بڑی بے ضرر بلکہ خوشنما سی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس کے مان لینے کے بعد اسلام کی طرف
دنیا کو دعوت دینے کا سوال ہی باقی نہیں رہتا۔ جو آیا ہی اس لئے ہے کہ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ مصیبت یہ
ہے کہ غیروں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے یہ بات پیش کی جاتی ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ اس آیت کو یوں مکمل فرماتے
ہیں۔ ولو کرہ المشرکین ۔ چنانچہ شام کے مندوب احمد السمان نے فرمایا کہ میں اپنی ۱۵ سال تعلیمی زندگی میں
کبھی جذباتی نہیں بن سکا۔ افسوس ہے کہ پاکستانی مندوبین ایسے وقت میں اپنی من گھڑت تاویلیں اور شکوک پیش
کر رہے ہیں۔ جبکہ ماضی کے کھنڈرات پر اسلام کی تعمیر نو ہو رہی ہے۔

جسٹس ایس اے رحمٰن نے اپنے مقالے میں کہا تھا کہ قرآن میں کوئی آئینی ڈھانچہ موجود نہیں صرف اصول ہیں۔
اور ولھن مثل الذی علیھن سے عورتوں کی نائندگی کا جواز نکالا تھا۔ شیخ ابوزہرہ نے فرمایا ایس اے رحمٰن
کا یہ کہنا درست نہیں کیونکہ قرآن میں تو بعض قوانین تفصیل سے بھی درج ہیں وراثت ، نکاح ، طلاق ، اور جنگ و
معاہدات کے قوانین۔ یہ ناممکن ہے کہ وہ ایک قانون کو نافذ کرنے کا حکم دے اور اس کے متعلق خاموش رہے دوسرے
آپ نے کہا عورتوں کے جواز کی جو آیت آپ نے پیش کی ہے اس کا اگلا ٹکڑا وَلِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ آپ
چھوڑ گئے ہیں۔ حالانکہ چیف جسٹس سے امید نہیں کی جا سکتی کہ اپنا مطلب نکالنے کے لئے آیت کا ایک حصہ

چھوڑ دے۔ ہم اتنی دور سے ہوا کے دوش پر کس لئے آئے ہیں ہم کسی کو اسلام کو کھلونا بنانے کی اجازت نہیں دیں گے ان قیاس آرائیوں کی مذمت کرتے ہوئے مسٹر بہاء والقاسم نے فرمایا اسلام یہاں مجرموں کے کٹہرے میں تو نہیں کھڑا۔ ہم اسے ضابطۂ زندگی کے طور پر پیش کرنے آئے ہیں سعودی عرب کے مندوب شیخ احمد محمد جمال نے ان حضرات کو عربی سیکھنے کی تلقین کی اور فرمایا یہ حضرات پہلے اپنے اندر عربی ادب کا ذوق پیدا کریں، اور قرآن میں قیاس آرائیاں نہ کریں۔ —— شیخ ابو زہرہ نے بھی ایک موقع پر ڈاکٹر داؤد رہبر خلیفہ عبدالحکیم اور پرویز کو عربی کا مشورہ دیتے ہوئے فرمایا۔ "جب آپ انگریزی قانون انگریزی سیکھے بغیر اور فرانسیسی قانون فرانسیسی سیکھے بغیر نہیں سمجھ سکتے تو آخر اسلام ہی نے کیا قصور کیا ہے کہ اس کا قانون سمجھنے کے لئے عربی کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ حالانکہ اس کے ماخذ قرآن وسنت عربی میں ہیں۔

حزب اللہ

"ترقی پسند" مندوبین کے لئے بڑی مصیبت یہ تھی کہ ان کی من مانی تاویلوں پر بار بار ٹوکنے والا گروہ کوئی درس نظامیہ کا پڑھا ہوا نہ تھا۔ بلکہ اس میں کا ہر ایک بیرونی یونیورسٹیوں میں پڑھا ہوا اور جدید علوم کا بنظر غائر مطالعہ کئے ہوئے تھا۔ لہٰذا ان حضرات کے لئے یہ ناممکن تھا کہ ان مشرقی ومغربی علوم کے ماہر حضرات کو "ملا" "تنگ نظر" اور "تاریک خیال" کہکر بٹھا دیتے۔ یہ حضرات (جن کو میں حزب اللہ کا نام دے رہا ہوں) نہ تو مغربی علوم سے متاثر ہوکر معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرنے کو تیار تھے نہ اسلام کو پرانا سمجھتے تھے۔ بلکہ صحیح معنوں میں اللہ کے دین ہی کو بہترین نظریۂ حیات سمجھتے تھے اسلاف سے گوناگوں عقیدت رکھتے تھے۔ آج بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو معیار انسانیت اور ان کی دی ہوئی ہدایت میں انسانیت کی نجات دارین سمجھتے تھے اور یہ عقیدہ ان کا روایتی نہ تھا بلکہ مغرب کو کھنگالنے اور باطل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کے بعد قائم کردہ تھا۔

میں ان میں سے بعض کا آپ سے تعارف کراتا ہوں۔

عمر بہاء الامیری: شام کے سابقہ سفیر متعینہ پاکستان۔ ایک نڈر، بے باک حق گو نوجوان۔ اسلام پسند شاعر وادیب۔ ایک غیور اور خوددار مجاہد۔ کلوکیم میں ان کی گرجتی ہوئی آواز بارہا باطل کی دیواروں سے ٹکرائی۔ فلسطین۔ الجزائر اور کشمیر کا بار بار ذکر کرنے والا اخوان۔

شیخ احمد محمد جمال: سعودی عرب کی مجلس شوریٰ کا ایک پڑھا لکھا اور مدبر خوبرو نوجوان۔ کئی کتب کا مصنف —— عورت اور اس کے دائرہ عمل پر نہایت متوازن اور پر مغز مقالہ پیش کرچکے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالوہاب عزام: پاکستان میں مصر کے سفیر رہ چکے ہیں علامہ اقبال مرحوم کی ضرب کلیم اور ارمغان حجاز کو عربی اشعار کا جامہ پہنا چکے ہیں۔ ہند وپاک پر ان کا سفرنامہ بہترین اور تاریخی معلومات کا ذخیرہ ہے۔

ڈاکٹر شیخ ابو زہرہ: لا کالج فواد یونیورسٹی کے اسلامی قانون کے پروفیسر ہیں ائمہ وفقہاء اسلام پر بہترین تصانیف لکھی ہیں فقہ میں بہت دقیق نظر رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر احمد السمان شام یونیورسٹی کے لا کالج کے پرنسپل ہیں۔ وہ ۱۵ سالہ تعلیمی تجربہ رکھتے ہیں۔

مصطفیٰ الزرقاء: حکومت شام کے سابقہ وزیر انصاف۔ یہ خود اپنوں کے طفیل ایک سوشلسٹ کے مقابلے میں کامیاب نہ ہوسکے۔

ڈاکٹر محمد طیب النجار: جامعہ ازہر کے پروفیسر ہیں علوم متداولہ کے ماہر ہیں۔

محمد المبارک: شام یونیورسٹی لاکالج کے پروفیسر شامی پارلیمنٹ کے ممبر مسلمانان اور اسلام کے مسائل اور ان کے حل پر گہری نظر رکھتے ہیں۔
حسبی الصدیقی: آپ انڈونیشیا کی مجلس دستور ساز کے ممبر ہیں اور وہاں اسلامی نظام کے لئے کوشاں ہیں۔
مولانا شاہ محمد رشاد: افغانستان کے پریس انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ میں فکری رہنمائی کے ڈائرکٹر ہیں۔ عربی فارسی اردو پر یکساں عبور رکھتے ہیں ان کا رسالہ "پیام حق" اسلامی شاہ پاروں کا پشتو اور فارسی میں ترجمہ بھی چھاپتا ہے

دیگر مندوبین شیخ علامہ بہجۃ البیطار (مصر) ڈاکٹر شفق (ایران) عبدالقہار

(آپ حضرات انڈونیشیا کی یونیورسٹیز کے چانسلر اور مجلس دستور ساز کے رکن ہیں) وغیرہ اسلام پسند علماء کی فہرست کے نام ہیں۔

الغرض مصر شام سعودی عرب۔ ایران۔ افغانستان۔ انڈونیشیا وغیرہ کے مندوبین کے نام گن جایئے آپ کو سارے ہی اعلیٰ تعلیم یافتہ لیکن اسلام کے شیدائی نظر آئیں گے۔

تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَقُلُوبُهُمْ شَتّٰى:

اس بین الاقوامی اسلامی مذاکرہ کے انعقاد سے پہلے ایک عام تاثر یہ تھا کہ دنیا کے کونے کونے سے آنے والے یہ حضرات جو تقریباً ساری دنیائے اسلام کا عکس ہیں اور پورے مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہیں مسلمانوں کے اجتماعی مسائل پر غور و فکر کے بعد ان کے حل تجویز کریں گے اور اس کے لئے کوئی ٹھوس پروگرام اپنے ساتھ رکھتے ہوں گے اپنے اپنے ممالک میں اسلام کی ترقی اس کے امکانات و ذرائع وہاں انفرادی کوششوں اور نتائج کو سامنے لائیں گے۔ اسلامی برادری کا **کل مؤمن اخوۃ** کا سا سماں نظر آئے گا اور مختلف ممالک میں مسلمانوں کی تکالیف اور دقتوں میں ہاتھ بٹانے کے پروگرام بنائیں گے۔ جملہ مسلمانوں کے تعلقات پیدا کرنے بہتر بنانے اور قائم رکھنے کی صورتیں پیدا ہوں گی۔ اسی طرح مل بیٹھنے کی کوئی مستقل صورت سامنے آئے گی۔ لیکن وہ قوم جس کے متعلق آنحضرت ؐ نے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ مسلمان ایک جسم کی طرح ہیں ان میں سے اگر ایک عضو کو بھی تکلیف ہوتی ہے تو سارا جسم اس میں شریک ہوتا ہے اور جس کو آپ نے دیوار کے مشابہ قرار دیا۔ جس کی ایک اینٹ دوسری اینٹ کو تھامے رہتی ہے۔ اب حضور کی وہ پیش گوئی پوری کر رہی تھی کہ ایک وقت ہوگا لوگ تم سے لڑنے کے لئے اور تمہاری شان و شوکت مٹانے کے لئے اس طرح ساتھیوں کو بلائیں گے جیسے ایک آدمی دوسرے کو کھانے پر بلاتا ہے۔ اب یہ قوم ہے اور غیر تو ذرا سمجھ کر نگل جانے کو تیار ہیں۔ احساس زیاں سے بے گانہ **کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ** ہ کی مصداق ہے۔ مندوبین کی اکثریت اپنے ممالک سے اس بین الاقوامی اسلامی مذاکرے میں اسلام کی نمائندگی کرنے نہیں بلکہ اپنے ممالک کی نمائندگی کرنے آئی تھی۔ اگر کبھی کسی نے کسی ملک کی کسی غیر اسلامی روش یا دنیائے اسلام کے لئے نقصان دہ چیز کی نشان دہی کی تو یہ وطن پرست چونک اٹھے اور اپنے ملک کی مدافعت شروع کر دی۔ اشتراکی مندوبین کا ذکر تو آچکا ہے باقی ممالک کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ شام کے ایک مخلص مندوب عمر بہاؤ الامیری نے ایک دن صرف اتنا کہہ دیا کہ جس طرح ہم اسلامی ممالک سے آکر یہاں مل بیٹھے ہیں خدا کرے یہ مواقع پھر بھی آئیں اور ان میں

الجزائر، کشمیر اور فلسطین کے مندوبین میں تشریف لائیں۔ اتنا کہنا تھا کہ بھارتی مندوب امیر علی صاحب نے احتجاج کیا کہ کشمیر کا ذکر ہرگز نہیں آنا چاہئیے۔ مصری وفد کے قائد عبدالوہاب عزام اس مجلس کی صدارت فرما رہے تھے انھوں نے تین بار فرمایا "کشمیر کا ذکر آئے گا" اس پر بھارتی وفد وہاں سے واک آؤٹ کر گیا۔

یونیورسٹی بنکاک کے پروفیسر رنگرٹ شوفر نے اپنے مقالے میں کہا کہ تھائی لینڈ میں بدھوں اور وہاں کے بدھ بادشاہ کا رویہ مسلمان اور عیسائی اقلیتوں کے ساتھ نہایت اچھا ہے۔ ہم مذہبی رسوم ادا کرنے میں آزاد ہیں بھکشو ہم پر اور ہمارے مذہب پر کوئی تنقید نہیں کرتے یعنی "تیری بندہ پروری سے مرے دن گذر رہے ہیں"

عرب قومیت کے فتنہ پر اگر کسی نے پوچھ لیا تو ڈاکٹر مہدی علام جیسے مدبر نے جھٹ کہہ دیا عرب قوم پرستی کی تحریک اسلام کے خلاف نہیں اور دلیل یہ کہ عرب اسلام کے خلاف کیسے جا سکتے ہیں غرضیکہ لِکُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا کا سماں تھا۔ ہاں وہ چند دردمندانِ اسلام جن کو میں نے حزب اللہ کا نام دیا ہے۔ اسلامی اخوت کا احساس رکھتے تھے اور اس کی دعوت دیتے تھے۔

اس "بین الاقوامی مذاکرہ" میں ایک بات سب سے زیادہ نمایاں رہی، وہ یہ کہ تمام معاندانہ کوششوں کے باوجود اللہ کے فضل سے "کلوکیم" کی عام فضا پر اسلام پسندوں کا غلبہ رہا، اور "تجدد و تفرنج" کے بہت سے حربے بیکار ثابت ہوئے۔

(حلقۂ ادب اسلامی ملتان میں پڑھا گیا)

ماہر القادری

یادِ رفتگاں

سردار عبدالرب نشتر مرحوم

پاکستان بننے سے تقریباً دو سال پہلے کی بات ہے کہ میں اپنے کرم فرما دوست نواب محی الدین خاں مرحوم (رئیس گنگوہ) سے ملنے کے لئے دہلی کے لکشمی ہوٹل میں گیا، وہاں حمایت صاحب دہلوی کی زبانی معلوم ہوا کہ اسی ہوٹل میں سردار عبدالرب نشتر تین چار دن قیام کر کے چلے گئے، دو ڈھائی روپیہ روزانہ کا کمرہ کرایہ پر لیا تھا! اخبارات میں نشتر صاحب مرحوم کا نام پڑھ چکا تھا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو اس طرز پر شاید سوچتا کہ ہندوستان کی ملی جلی حکومت (INTERIM GOVERNMENT) میں وزارت کے لئے جن کا نام اخبارات میں آ رہا ہے انھیں تو دہلی کے کسی بڑھیا ہوٹل میں قیام کرنا تھا، کیا یہ اتنے معمولی ہوٹل میں وہ ٹھہرے، اور سب سے تعجب کر رہے ہیں! ——— مگر سردار نشتر مرحوم کی اس شانِ قلندری نے مجھے متاثر کیا کہ مسلم لیگ کا یہ لیڈر کوئی دولت مند اور جاگیردار نہیں ہے، بلکہ ہمیں جیسا مردِ بے سر و سامان ہے!

اگر مجھے بڑے آدمیوں سے ملنے کا شوق ہوتا، اور اکابر پرستی ہوتی تو از خود کوشش کر کے ملتا، تو سب سے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد سے ملتا، مگر طبیعت کا اس طرف شروع ہی سے کچھ زیادہ میلان نہیں رہا! بڑے بڑے آدمیوں سے ملاقاتیں میری کوشش کے بغیر ہی ہو گئی ہیں، اللہ تعالیٰ سے اب تک میرا معاملہ "آسانی" کا رہا ہے، اللہ تعالیٰ کی شانِ ربوبیت نے میری آرزوؤں کے لئے از خود سہولتیں پیدا کی ہیں (الحمدللہ علی احسانہ)!

سردار عبدالرب نشتر مرحوم سے ملاقات پاکستان بننے کے بعد ہوئی، وہ وزارت کے عہدۂ جلیلہ پر فائز تھے، مگر جب بھی ملنا ہوا، انھوں نے یہ محسوس ہی نہیں ہونے دیا کہ وہ کرسی نشین ہیں اور میں بوریا نشین ہوں! ایک بار کراچی کے کسی کالج میں شام کے وقت کوئی تقریب تھی، سردار نشتر مرحوم اس تقریب کے مہمان خصوصی تھے، میری نشست ان کے سامنے تھی! طلباء کو جو شوخی سوجھی تو انھوں نے میری غزل کے اس مصرعہ :—

تم نے تو وہ شب دیکھی ہوگی، جس شب کی سحر ہو جاتی ہے

کی "پیروڈی" کی اور قوالی کے انداز میں گا کر سنائی، پھر شعر شاعری، سردار نشتر مرحوم خود شاعر تھے، اور شاعروں کی اس شوخ محفل میں ذرا بھی اجنبی نہیں لگتے تھے! اسی محفل میں "احادیث" کا موضوع باتوں باتوں میں چھڑ گیا اور ان سے کچھ دیر تک گفتگو رہی!

سردار نشتر مرحوم پنجاب کی گورنری کے زمانہ میں کسی سرکاری کام سے کراچی آئے ہوئے تھے، اتفاق کی بات

کو انہی دنوں گورنر جنرل ہاؤس میں شعر و سخن کی محفل منعقد ہوئی، خواجہ ناظم الدین صاحب کا دورِ حکومت تھا، اس بزمِ شعر و سخن کے میرِ مجلس نشتر صاحب ہی قرار پائے، حضرت جگر مرادآبادی کی باری آئی، تو نشتر مرحوم نے اُن کی غزل کا یہ مصرعہ پڑھا۔

توبہ کو توڑ تاڑ کے لہرا کے پی گیا

اُن کے پڑھنے کا انداز بھی خاصہ دل نشین تھا، محفل میں سرخوشی کی ایک لہر سی دوڑ گئی!

ایک بار حکیم نصیر الدین ندوی (مالک نظامی دواخانہ) کے یہاں کھانے پر ملاقات ہوئی، تو بڑی توجہ اور دلچسپی کے ساتھ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا ذکر چھیڑا، اور اُن کی خیریت پوچھنے لگے!

چار سال سے کچھ زیادہ مدت ہونے کو آئی کہ میں شدید بیمار ہو گیا تھا، ایک مہینہ جناح ہسپتال کے اسپیشل وارڈ میں رہنا پڑا، ہسپتال کی زندگی کا یہ پہلا تجربہ تھا۔۔۔۔۔

ولے بخیر گذشت ....

میری صحت یابی کی خوشی میں مخلص احباب نے ایک بہت بڑی دعوت کا اہتمام کر ڈالا، سردار نشتر مرحوم کو بھی دعوت دی گئی، وہ اُس دن پہلے سے کہیں اور مدعو تھے مگر دعوت دینے والوں سے بولے کہ یہ ماہر کی صحت یابی کا جلسہ ہے، میں ضرور شرکت کروں گا، چنانچہ دعوت سے فارغ ہو کر اس تقریب میں شرکت فرمائی اور آخر تک ٹھیرے رہے!

جس دن مسٹر غلام محمد مرحوم نے ناظم الدین وزارت کا تیا پانچہ کیا ہے، وہ دن "اسلام پسندوں" کے لئے سخت اذیت کوش تھا، اسلامی دستور کا بنا بنایا کھیل ہی بگڑ گیا، کمند اس وقت توڑی گئی جب کہ "بام" بس دو چار ہاتھ رہ گیا تھا! جناب ظفر احمد انصاری اور میں اسی دن شب میں نشتر صاحب کے یہاں پہونچے، وہ اپنے بنگلہ کے ہال میں تنہا بیٹھے تھے، ہمیں دیکھ کر تپاک سے ملے، فکر مند ضرور تھے مگر ان کی باتوں کی سنجیدگی سے گھبراہٹ ظاہر نہ ہوتی تھی مونچھوں پر مسلسل ہاتھ پھیرتے ہوئے، بنگلہ کے گیٹ پر اُن کی نگاہ بار بار جاتی تھی!

مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم کی جہاں قبر ہے، وہاں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے قائم کردہ "دارالعلوم" کا جلسہ ہوا، سردار نشتر مرحوم نے بھی اس جلسہ میں تقریر کی، تقریر کے بعد جلسہ گاہ کے ایک گوشہ میں وہ چلے گئے، میں ان کے ساتھ تھا۔ بہت دیر تک بات چیت کرتے رہے، میں نے عرض کیا کہ ملک کے حالات آپ دیکھ رہے ہیں، فرمائیے اب کیا ہوگا؟

بولے: "ان شاء اللہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا.."

ان کے لہجے میں یقین کی گرمی سمٹی ہوئی تھی، کہ حالات کتنے ہی نازک اور ابتر ہوں گے وہ مایوس نہیں ہیں، گفتگو میں چوہدری محمد علی صاحب کا ذکر آیا، تو اُن کے بارے میں نشتر صاحب کو شکوہ سنج ہی پایا۔

اس بات کو بھی پانچ مہینے ہونے کو آئے کہ میں جناح ہسپتال میں جناب فضل کریم فضلی کو دیکھنے کے لئے [illegible] صاحب کی عیادت کر کے سامنے کے وارڈ میں پہونچا معلوم ہوا کہ نشتر صاحب مرحوم سے لوگ مل نہیں سکتے، ڈاکٹروں نے پابندی لگا دی ہے، میں اُن تک اپنی اطلاع بھجوا دیتا، تو یقین تھا کہ وہ مجھے بلا لیتے مگر میں نے اُن کو زحمت دینا مناسب نہ سمجھا وزیٹرس بک پر اپنا نام لکھ کر چلا آیا ـــ بس پھر اس کے بعد اُن کے انتقال کی خبر ہی اُن کانوں نے سُنی، جو اُن کی صحتیابی کی نوید سننے کے منتظر تھے، دل کو بڑا سخت دھچکا لگا، دل نے کہا اب کیا ہوگا؟ چڑھتی ہوئی دھوپ میں کراچی کی فضا ایک دم دھندلی ہو گئی! جس کسی نے بھی اس خبر کو سُنا، کلیجہ تھام کر رہ گیا، اخبارات کے ضمیمے نکلنے لگے، سارا شہر

سوگ میں ڈوبا ہوا! لوگ محسوس کر رہے تھے کہ ملک و ملت کا سچا دردمند موت نے چھین لیا!

ہم سردار نشتر مرحوم کی کوٹھی پر پہونچے، عزاداروں کا ایک ہجوم تھا جو اپنے قائد کے آخری دیدار کے لئے مضطرب تھا، اس ہجوم میں اندر جانے کا مجھے موقع نہ مل سکا، معلوم ہوا کہ مسلم لیگ کے اکابر کا ایک وفد وزیر اعظم سے ملنے کے لئے گیا ہوا ہے، وزیر اعظم کا کہنا یہ ہے کہ اس طرح تو قائدِ اعظم مرحوم کی قبر کے آس پاس کی زمین عام قبرستان بن جائے گی! اور انھوں نے یہ بھی کہا کہ کل سہروردی صاحب کا انتقال ہوا تو وہ کہاں دفن ہوں گے؟ ـــ حکیم احسن صاحب اس گفتگو کے راوی تھے، پھر وہ خود ہی بولے کہ:-

"سہروردی صاحب تو میٹروپول ہوٹل میں اپنے دفن ہونے کے لئے وصیت فرمائیں گے ـــ"

معلوم ہوا کہ تین بجے کے قریب جہانگیر پارک میں نماز جنازہ ہوگی، ہم وقت سے کچھ پہلے ہی پہونچ گئے، جہانگیر پارک کا بہت بڑا حصہ عزاداروں سے بھر چکا تھا، اور لوگ آئے چلے جا رہے تھے، نماز عصر کے بعد سردار ملت کا جنازہ آیا، دُور دور تک آدمی ہی آدمی دکھائی دیتے تھے، بلا مبالغہ لاکھوں کا مجمع! نواب بہادر یار جنگ مرحوم کے جنازے اور نماز کا سماں نگاہوں میں پھر گیا! جس کو زمین پر اتنی مقبولیت، اور محبوبیت حاصل ہوئی ہو کیا عجیب ہے کہ آسمان پر غفران و رحمت کے دریچے اس کے لئے باز کر دئے گئے ہیں!

سردار عبد الرب نشتر مرحوم کو یہ بڑائی اور عزت خاندانی طور پر ورثہ میں نہیں ملی تھی وہ (شاید) ایک معمولی درجہ کے خاندان کے فرد تھے، ان کی وضع کی یک رنگی، خلوص و استقامت اور مقصد کی لگن نے اُن کو اس اونچے رتبہ تک پہونچایا! اور عوام کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے اُن کی محبت ڈال دی۔

جس زمانہ میں وہ حکومت پاکستان کے مرکزی وزیر تھے، اور دستور سازی کا مسئلہ درپیش تھا، تو اُن پر ایک ایسا دور بھی گزرا کہ ایوانِ حکومت میں جب دستور کی کمیٹیاں ہوتیں، تو وہ حکومت کی طرف سے نمائندگی کا پورا پورا حق ادا کرتے ہوئے "دستور" میں کاٹ چھانٹ کے لئے بحث مباحثہ کرتے!

"ناظم الدین وزارت" کے دور میں نشتر مرحوم کو یہ کشمکش پیش آئی کہ خواجہ ناظم الدین کو یہ وہم ہوگیا تھا کہ نشتر صاحب وزیر اعظم بننے کی تمنا رکھتے ہیں! "ناظم الدین وزارت" کو جب غلام محمد مرحوم نے ٹھکانے لگا دیا، اس کے بعد سے سردار نشتر مرحوم کے حالات میں غیر معمولی تبدیلی پیدا ہونی شروع ہوگئی! شروع شروع میں لوگوں کو اُن سے یہ شکایت رہی کہ وہ جتنا زیادہ سوچتے ہیں، اتنے زیادہ فعال نہیں ہیں، ان کی جرأت کی کمی کے جو عوام میں تذکرے مشہور ہوئے، تو ان کا قد و قامت یہاں تک کہ ان کی "مونچھیں" بھی اچھا خاصہ مبحث بن گئیں! مگر یہ حالت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی، انھوں نے اپنی زندگی کے آخری سالوں میں اپنے قول و عمل سے یہ ثابت کر دیا کہ وہ سوچنے والا دماغ ہی نہیں دل جرأت آزما بھی رکھتے ہیں۔

"مسلم لیگ" سچ مچ مر چکی تھی، نشتر ہی کی مسیحائی نے اس کے تنِ بے جان میں روح پھونکی، مسلم لیگ کے وقارِ رفتہ کو واپس لانے کے لئے انھوں نے طوفانی دورہ کیا، وہ جس شہر میں بھی گئے، عوام اُن کے لئے فرشِ راہ بن گئے، تقریریں اس قدر تند و تیز کیں جیسے ہر قسم کے خوف کو انھوں نے دل سے نکال دیا ہے، اور اپنے اللہ کے سوا کسی اور سے وہ نہیں ڈرتے، حکومت کی اونچی سے اونچی شخصیتوں کو انھوں نے بے نقاب کیا، کسی کسی کے بارے میں تو یہ تک کہہ دیا کہ:

حضرت ؛ خاندانی طور پر انگریزوں کے غلام رہے ہیں، ملک و قوم سے غداری کرنا اُن کے خمیر میں شامل ہے! کسی کو جرأت نہ ہو سکی جو ان حقائق کی تردید کرتا، اس لئے کہ :-

ع قلندر ہر چہ گوید، دیدہ گوید!

سردار نشتر مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے وجاہت کے ساتھ حسن و دلکشی بھی دی تھی، وہ کچھ بھی نہ ہوتے، پھر بھی ہر جلسہ اور محفل میں لوگوں کی نظریں انھی کی طرف اُٹھتیں، قیادت، شہرت اور عوام کی ہر دلعزیزی نے ان کی شخصیت میں اور چار چاند لگا دئے، جس محفل میں پہونچ جاتے، وہ ہی وہ نظر آتے، یہاں تک کہ پاکستان کے صدر اور وزیر اعظم کی موجودگی میں بھی، انہی کی ذات لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی رہتی، بڑے بڑے ان سے دبتے ہوئے ہی دکھائی دیتے!

نشتر مرحوم شعر و ادب کا ستھرا ذوق رکھتے تھے، فارسی میں شعر بھی کہتے تھے، تقریر شستہ، رواں اور اثر انگیز ہوتی تھی، مذہب ان کی گھٹی میں پڑا تھا، ان کی سب سے بڑی تمنا یہی تھی کہ پاکستان میں اللہ کا دین قائم ہو اور یہاں کا معاشرہ اخلاقِ نبویؐ کا آئینہ دار بن جائے، مذہبی معلومات بھی خاصی رکھتے تھے، علماء دیوبند کے قدر شناس اور ان سے بہت متأثر تھے، جس دن انھوں نے اس دنیا سے رختِ سفر باندھا ہے، اس دن بھی صبح کو فجر کی نماز ادا کی، اور اوراد و وظائف بھی پورے کئے، ان کی موت نے حکومتِ پاکستان کے جھنڈوں ہی کو خم نہیں کیا، عوام کے دلوں کو جھکا دیا۔ ایک ایسی کامیاب موت جس پر "زندگی" کو رشک آئے! جس کسی نے بھی اُن کی تاریخ وفات،

"غریق رحمت" (۱۹۵۸ء)

کہی، الہامی تاریخ کہی! اللہ تعالیٰ کی رحمت کے پھول اُن کی تربت پر سدا برستے رہیں (آمین)

دورؔ ہاشمی کانپوری

جماعتِ اسلامی

ہمہ طلب، ہمہ فکر و نظر، ہمہ پیغام! ہمہ تلاش و تجسس، ہمہ سراغِ مدام!

ہمہ خلوص ہمہ شوق زندگی جس کی! محبتِ بشری جس کا صرفِ نظمِ نظام!

ادا شناسِ مزاجِ محمدِ عربیؐ! کمالِ صدق کا پیکر، مبلغِ اسلام!

فقط ہے خدمتِ نوعِ بشر ہے جس کی غرض! ہے جس کا مقصدِ اعلیٰ فقط رفاہِ عام!

یہ پاک و صاف یہ گشتی حسین شفاخانے ٹھہر گئے ہیں سرِ راہ ہو کے مستِ خرام!

دوائیں مفت میسّر، امیر ہوں کہ غریب! عطائے خاص ہے جاری خواص ہوں کہ عوام!

○

وہ جس کا خضرِ طریقت جنابِ مودودی! وہ علم و فضل کا پیکر، وہ عصرِ نو کا امام

موحدِ ازلی وہ مجاہدِ ابدی...! وہ مایۂ صداقت وہ روحِ امن و سلام

وہ جس کے طرزِ نگارش کے معترف دشمن! وہ جس کا حسنِ تخاطب ہے آبروئے کلام

اگرچہ اور ادارے بھی ہیں یہاں اے دورؔ!

مگر یہ ایک جماعت کہ جس کا نیک ہے کام!

ماہرؔ القادری

اے عظمتِ جمہور!

(۱)

تو محفلِ ایجاد میں موضوعِ رسالت
تو عالمِ تکوین میں عنوانِ مشیت
نازل ہوا تیرے لئے اللہ کا منشور
اے فطرتِ ــــ جمہور!

(۲)

وہ عہدِ نبوت، وہ خلافت کا زمانہ
انسان کے لئے خیر و سعادت کا زمانہ
چمکے کی طرح کیوں نہیں تابندہ و پرنور
اے قسمتِ ــــ جمہور!

(۳)

یہ رقصِ حیا سوز، یہ تشتِ مے و مینا
آجائے جسے دیکھ کے شیطان کو پسینہ
افرنگ کی تہذیب کا ہر وار ہے بھرپور
اے عصمتِ ــــ جمہور!

(۴)

دھوکے کے بھنور، اور سیاست کے بگولے
عشرت کے یہ باغ اور شہنشاہوں کے جھولے
حیرت ہے کہ اس دور میں ہوں قیصر و فغفور
اے عزتِ ــــ جمہور!

(۵)

کھائی تھی قسم شعبدہ بازوں نے خدا کی
جب وقتِ عمل آیا تو ملت سے دغا کی
چھینا ہی کیا صفحۂ قرطاس پہ دستور
اے غیرتِ ــــ جمہور!

(۶)

جو کھیت کسانوں کو نہ محنت کا صلہ دے
اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دے
کب تک تہِ دامن ترے شعلے رہیں مستور
اے طاقتِ ــــ جمہور!

(۷)

پھیلے ہوئے یہ جال سمٹنے کے لئے ہیں
یہ تخت، قیادت کے اُلٹنے کے لئے ہیں
یہ وقت بھی آجائے گا، یہ دن بھی نہیں دور
اے جرأتِ ــــ جمہور!

(۸)

اس پاک زمیں پر عجب اُفتاد پڑی ہے
جس سمت چلے جائیے اک لوٹ مچی ہے
قانون بھی خاموش ہے انصاف بھی مجبور
اے سطوتِ ــــ جمہور!

(۹)

شاہوں کی یہ سج دھج یہ جوانی نہ رہے گی
یہ عیش یہ رشوت کی کمائی نہ رہے گی
ہوگا تری ٹھوکر میں ہر اک جابر و مغرور
اے عظمتِ ــــ جمہور!

بہارِ تغزل

شفقت کاظمی

○

اسی امید پہ ہم دیکھتے ہیں راہ تری — کبھی ادھر کو بھی شاید اٹھے نگاہ تری
ترے دیار کی راہیں انہی پہ بند رہیں — بصد خلوص جو ڈھونڈھا کئے پناہ تری
وہ رونقیں وہ بہاریں وہ نزہتیں نہ رہیں — ترے بغیر ہے کتنی اداس راہ تری
ترے جمال کا مشتاق اک زمانہ رہا — اگرچہ راس نہ آئی کسی کو چاہ تری

ہزار بار کسی سے نظر ملی شفقت
مگر وہی ہے ابھی حسرتِ نگاہ تری

○

جب کبھی ترکِ محبت کا خیال آیا ہے — مجھکو تا دیر تری یاد نے تڑپایا ہے
تجھسے رکھنا ہی نہ تھا ربطِ محبت ہم کو — ہوش آیا ہے مگر دیر کے بعد آیا ہے
آہ اس عرضِ محبت کا مقدر اے دوست — بارہا تو نے جسے ناز سے ٹھکرایا ہے
اُن کے جاتے ہی گئی گھر کی وہ رونق نہ رہی — در و دیوار پہ حسرت کا سماں چھایا ہے

○

دلِ بیتاب کو تسکین ملی ہے کیا کیا — یاد آنے کی طرح جب کوئی یاد آیا ہے
دیدہ و دل تری راہوں میں بچھے جاتے ہیں — کوئی شاید ترے آنے کی خبر لایا ہے
جادۂ شوق میں دو گام چلے تھے کہ ہمیں — اپنی محرومیٔ قسمت کا خیال آیا ہے

نہ زمانہ کی شکایت نہ مقدر کا گلہ
ہم نے ہر حال میں شفقت تجھے خوش پایا ہے

زکی زاکانی

○

فضائے عمر ہے بہت خوب زندگی کے لئے — چمک رہے ہیں کئی چاند روشنی کے لئے
شراب خانوں میں چھپ چھپ کے پینے والوں کو — پکارتا ہوں سرِ راہ مے کشی کے لئے
جو خود سمجھ نہ سکے دردِ عشق کا مفہوم — نکل پڑے ہیں زمانے کی رہبری کے لئے
تو سنگِ میل سمجھتا ہے جن ستاروں کو — ہیں نقشِ راہ ترے پائے بیخودی کے لئے
اسی کے نور کا پرتو ہے چار سو پہ محیط — غم اک چراغ ہے دنیا میں روشنی کے لئے
بدلنے والے زمانے کو خود بدلتے ہیں — زمانہ خود کو بدلتا نہیں کسی کے لئے

غزلیں

منظر کلیمی

ہمارے حالِ پریشاں پہ بھی کرم ساقی
پڑے ہیں کب سے ترے میکدے میں ہم ساقی

اسی شرابِ کہن کا ہو ایک جامِ عطا
ہیں مست جس سے ابھی تک عرب، عجم ساقی

لگا لگا کے ہونٹوں سے جامِ آبِ حیات
پلا پلا کے ہے اب تو لبوں پہ دم ساقی

مجھے یہ تاب کہاں تیرے لطف کی شہ پر
اُٹھے ہیں تیری طرف خود بخود قدم ساقی

میں خالی ہاتھ ترے میکدے میں کیوں آتا
یہ دیکھ لایا ہوں دل چاک چشم نم ساقی

○

آج دو ٹوک فیصلہ ہی سہی
چاہے وہ موت کی سزا ہی سہی

تو اگر ساتھ ہے تو سب کچھ ہے
میں زمانے میں بے نوا ہی سہی

چشمِ ساقی کا لطف کیا کم ہے
دستِ میخوار نارسا ہی سہی

بحرِ الفت میں کچھ تو مل جائے
ایک تنکے کا آسرا ہی سہی

گاہے گاہے بہک بھی جاتا ہے
واعظِ شہر پارسا ہی سہی

○

حیاتِ دہر کا برہم ہوا نظام اے دوست
زمانہ گرتا چلا جا رہا ہے تھام اے دوست

ترے خلوص و محبت کی انتہا معلوم
ترے خلوص و محبت کو بھی سلام اے دوست

○

بہت ہی سخت ہیں موجوں کے دھارے
کٹے جاتے ہیں تیزی سے کنارے

اُٹھے ہیں آج پھر قسمت کے مارے
دئے تیری نگاہوں نے سہارے

عجب انداز سے وہ آرہے ہیں
زمیں پر بچھتے جاتے ہیں ستارے

راسخ عرفانی

دلِ مضطر مصائب میں اُلجھ کر شاد ہوتا ہے
یہ وہ گھر ہے جو ویراں ہو تو پھر آباد ہوتا ہے

نشاطِ زندگانی کی تمنا ہی نہیں رہتی
جب انساں آشنائے لذتِ بیداد ہوتا ہے

کوئی کوتاہیِ پرواز کا شکوہ نہیں کرتا
جہاں بھی جائیے بس شکوۂ صیاد ہوتا ہے

وفا براہی

روتی ہے عندلیبِ قفس! زار زار کیا
کچھ اور گل کھلائے گی فصلِ بہار کیا!

مانا کہ عہدِ رفتہ کی باقی ہے یادگار
ناکام زندگی کی مگر یادگار کیا

اہلِ چمن پہ فرض ہے پھولوں کا احترام
پھولوں سے بار بار اُلجھتے ہیں خار کیا

کلیوں کی زندگی سے ہے قائم چمن کی شان
کلیوں کی زندگی کا مگر اعتبار کیا

روحِ انتخاب

مذاہب میں جو تصورات مشترک نظر آتے ہیں، افسوس ہے کہ سطحی نظر رکھنے والے اُن کی حقیقت تک پہونچنے کی کوشش نہیں کرتے، اور بعض سطح پر نگاہ ڈال کر چند غلط مقدمات کو غلط طریقے سے ترتیب دے کر غلط نتائج نکال لیتے ہیں، حالانکہ دراصل یہ اشتراک ایک اہم حقیقت کی طرح رہنمائی کرتا ہے، وہ پتہ دیتا ہے کہ درحقیقت یہ تمام مذاہب ایک ہی اصل سے نکلے ہیں، ان تمام تصورات اور تعلیمات کا مبدا ایک ہے، کوئی ایک ذریعۂ علم ہے، جس نے انسان کو مختلف ممالک، مختلف اوقات اور مختلف زبانوں میں ان مشترک صداقتوں سے روشناس کیا، کوئی ایک بصیرت ہے جو مشرق و مغرب کا بعد رکھنے والے اور سینکڑوں ہزاروں برس کا فصل رکھنے والے لوگوں کو حاصل ہوئی، اور اُس بصیرت سے وہ سب کے سب ایک ہی قسم کے نتائج تک پہونچے، لیکن مذاہب جب اپنی اصل اور اپنے مبدا سے دور ہوگئے تو ان میں کچھ خارجی تصورات اور اجنبی معتقدات و تعلیمات نے راہ پالی، اور چونکہ یہ بعد والی چیزیں اُس مشترک مبدا، اور اور مشترک بصیرت سے ماخوذ نہ تھیں، بلکہ مختلف طبائع، مختلف رجحانات اور مختلف علمی و عقلی مراتب رکھنے والے انسانوں کی طبع زاد تھیں، اس لئے انھوں نے ان مشترک بنیادوں پر جو عمارتیں تعمیر کیں وہ اپنے نقشوں اور وضع و ہیئت میں بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہوگئیں۔

پس اگر حق اور صدق کا حکم لگایا جا سکتا ہے تو اُس اصل مشترک پر لگایا جا سکتا ہے نہ کہ اُن مختلف تفصیلی صورتوں اور ہیئتوں پر جن میں موجودہ مذاہب پائے جاتے ہیں، کیونکہ حق ایک جنس بسیط ہے، اُس کے افراد میں اختلاف نہیں ہو سکتا۔ جس طرح ہم سیاہ اور سپید، سرخ اور سبز پر لفظ "رنگ" کا اطلاق یکسانی کے ساتھ کر سکتے ہیں، اس طرح خدا ایک ہے، اور خدا دو ہیں اور خدا کروڑوں ہیں کے مختلف احکام پر لفظ "حق" کا اطلاق نہیں کر سکتے۔

قرآن مجید کا بیان ہے اول اول تمام انسان ایک ہی اُمت تھے یعنی ایک خالص انسانی فطرت حالت[1] پر قائم تھے اور ان کے پاس خدا کی طرف سے راہ راست کا علم دیا جاتا تھا، پھر اُن میں اختلاف ہوا اور اختلاف اس وجہ سے ہوا کہ ان میں سے بعض لوگوں نے اپنی حد جائز سے گزرنے، اپنے فطری مرتبے سے زیادہ بلند مرتبہ حاصل کرنے اور اپنے فطری حقوق سے بڑھکر حقوق قائم کرنے کی کوشش کی، تب اللہ کی طرف سے انبیاء آنے شروع ہوئے، تاکہ لوگوں کو حق کا صحیح علم دیں، اور ان کے درمیان اجتماعی عدل (social justice) قائم کریں، تمام انبیاء کا دنیا میں یہی مشن رہا ہے، جن لوگوں نے اس مشن کو قبول کیا اور نبی کے دئے ہوئے علم کی ٹھیک ٹھیک پیروی کی اور نبی کے بتائے ہوئے قانون کا اتباع کیا، صرف وہی حق پر ہیں، باقی سب باطل پر ہیں — وہ بھی باطل پر جنھوں نے نبی کے اتباع سے انکار کیا، اور وہ بھی باطل پر جنھوں نے نبی کی تعلیم کو اپنی خواہشات کے مطابق ڈھال لیا۔ (تفہیمات — سید ابوالاعلیٰ مودودی)

---

[1] یہ نکتہ ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ آج کل کے نظریۂ ارتقاء اور فلسفۂ تاریخ کے برعکس قرآن مجید کا بیان یہ ہے کہ زمین پر نوعِ انسانی کا آغاز جہالت کی تاریکی میں نہیں ہوا بلکہ خداداد علم کی روشنی میں ہوا تھا، خدا نے سب سے پہلے آدم علیہ السلام کو پیغمبر بنایا تھا، اور ان کو الہام کے ذریعہ وہ علم دے دیا تھا جو زمین پر صحیح زندگی بسر کرنے کے لئے ضروری تھا۔

ہماری نظر میں

صدیقِ اکبر رضؓ

مرتبہ :- مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایم۔ اے ضخامت ۴۰۰ صفحات قیمت غیر مجلد ساٹھ روپے، قیمت مجلد آٹھ روپے، ملنے کا پتہ : ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی

ندوۃ المصنفین نے دین و اخلاق اور علم و ادب کی اتنی شاندار خدمت انجام دی ہے کہ دار المصنفین (اعظم گڑھ) کے بعد اسی ادارے کا نام آتا ہے، ندوۃ المصنفین کے سلسلہ تصانیف کی یہ پینسٹھویں (۶۵) کتاب ہے جو کتابت و طباعت کے خاصے اہتمام کے ساتھ منظرِ عام پر آئی ہے!

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ انبیاء کرام کے بعد جو شخصیت سب سے زیادہ جاذبِ نظر، نمایاں اور ممتاز نظر آتی ہے وہ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی ذاتِ قدسی صفات ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت، محبت وفاداری اور دین کی خیرخواہی کا جیسا حق سیدنا ابوبکر صدیق نے ادا کیا ہے بس وہ اپنی جگہ اپنی آپ مثال ہے!

مولانا سعید احمد اکبر آبادی، جن کے علمی کارناموں سے اردو دنیا اچھی طرح واقف ہے، اُمّتِ مسلمہ کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے "افضل البشر بعد الانبیاء" کے سوانحِ حیات اس قدر تحقیق و کاوش کے ساتھ مرتب فرمائے ہیں کہ ایک ایک صفحہ پر اُن کے لئے بے ساختہ دل سے دعا نکلتی ہے!

پوری کتاب ۴۶۸ ذیلی ابواب پر مشتمل ہے۔ فاضل مرتب نے مستند تاریخی کتابوں کے حوالے جگہ جگہ دیے ہیں، اور بعض اہم مسائل اور نازک مباحث پر ناقدانہ گفتگو کی ہے۔

عام طور پر مشہور ہے کہ "لاتحزن ان اللہ معنا" کا نزول غارِ ثور میں ہوا تھا، مگر مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی تحقیق یہ ہے کہ یہ واقعہ تو ہجرت ہی میں پیش آیا، مگر اس کا تعلق غارِ ثور سے نہیں بلکہ سراقہ بن جعشم کے تعاقب اور حملہ سے ہے! یعنی سراقہ جب گھوڑے پر سوار ہو کر حضور کے بالکل قریب پہنچ گیا، تو حضرت ابوبکر مضطرب ہوئے اور پریشان ہو کر بولے "یا رسول اللہ! یہ تو ہماری طلب میں (سر ہی پر) آ گیا"، اس پر نطقِ وحی ترجمان نے فرمایا ——

"لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا"

ایک غلط روایت کی تردید ——

"...... قاضی ابو یوسف نے ایک روایت نقل کی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر نے خمس میں سے رسول اور ذوی القربیٰ کا حصہ ساقط کر دیا تھا اور صرف تین حصے باقی رکھے تھے، لیکن یہ روایت بالکل لغو اور غلط ہے، کیونکہ اس کا راوی محمد بن السائب الکلبی ہے اور وہ محدثین کے نزدیک مجروح اور ناقابلِ اعتبار ہے ...... یزید بن زریع جو مشہور امام حدیث ہیں، انھوں نے ایک مرتبہ کلبی سے کوئی روایت نقل کی

تو ساتھ ہی فرمایا کہ کلبی سبائی تھا.....“ (صفحہ ۳۴۹، ۳۵۰)

صحیح بخاری کی روایت کی بنا پر عام مورخین اور ارباب سیر نے یہ رائے قائم کی ہے کہ حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ نے حضرت سیدہ فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی وفات تک خلیفہ اول سے بیعت نہیں کی ــــ مگر مولنا سعید احمد اکبرآبادی نے حاکم کی روایت کو جو انھوں نے مستدرک میں نقل کی ہے، صحیح بخاری کی اس روایت پر ترجیح دی ہے، اور دو روایات کے مابین محاکمہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچے ہیں ــــ کہ

”حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے ایک مرتبہ نہیں، دو مرتبہ بیعت کی ہے، پہلی بیعت، بیعت خلافت ہے، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے دوسرے ہی دن مسجد نبوی میں بیعت عامہ کے موقع پر کی گئی۔ اور دوسری بیعت ”بیعت رضا“ ہے، جو آپ نے حضرت فاطمہ کی وفات کے بعد کی ہے اس بیعت کا مقصد آپس میں صلح صفائی کرنا اور باہمی تعلقات کو پھر از سر نو خوشگوار کر لینا تھا۔“ (صفحہ ۸۰)

بعض مقامات پر فاضل مرتب نے جلال الدین سیوطی اور مولنا شبلی نعمانی کی رائے سے بھی اختلاف کیا ہے، اور یہ دلیل ہے اُن کی حریت فکر کی کہ وہ نرے مقلد اور محض ناقل و راوی نہیں ہیں بلکہ تاریخ و سیر میں ناقدانہ نگاہ بھی رکھتے ہیں۔

کتاب کی زبان اور انداز بیان بھی خوب بلکہ دل نشین ہے، مطالعہ کے دوران میں نفس خاص اثر قبول کرتا ہے

صفحہ ۳۱۲ اور ۳۱۳ پر ”اشرافی“ کی جگہ ”اشراقی“ (ف کے بجائے ق) کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے ــــ صفحہ ۳۸۴ پر ”تیر تہوار“ نظر آیا، مگر ہماری زبان پر تو ”تیج تہوار“ ہے:۔ صفحہ ۳۲۶ پر ”وزارت عظمیٰ“ کے ذیلی عنوان نے کھٹک پیدا کی، کوئی شک نہیں کہ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ، امور مملکت میں حضرت صدیق اکبر کے دست راست تھے مگر اُن کے ساتھ ”وزارت عظمیٰ“ کی نسبت وجدان کو اجنبی اجنبی سی لگتی ہے۔

”.... حضرت ابوبکر صدیق نے جب فیروز کو اپنا نائب مقرر کیا تو اس کی عربی عصبیت کی رگ غیرت وحمیت پھڑک اٹھی، اور یہ مرتد ہو گیا، اس کے بعد اس نے ایک جمعیت اپنے ارد گرد فراہم کر کے ان ایرانی النسل متوطنین یمن کو یمن سے پاک و صاف کر دینے کا ایک منصوبہ باندھا، لیکن حضرت ابوبکرؓ نے اس کا یہ منصوبہ ناکام بنا دیا، اس طرح گویا تاریخ اسلام میں یہ سب سے پہلا واقعہ ہے، جب کہ عربی عصبیت کے سر پر عملاً ایک ضرب لگا کر اسلامی اخوت و مساوات کی ایک مثال قائم کی ــــ (صفحہ ۲۳۰)

کاش! جمال ناصر اور اُس کے قوم پرست حواریوں کی سمجھ میں یہ بات آ سکے!

مولنا سعید احمد صاحب اکبرآبادی کی اس کتاب (صدیق اکبر) نے اردو زبان و ادب کے سرمایہ میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ (فجزاہ اللہ خیر الجزاء)

محکمات

تالیف: علامہ عبداللہ العمادی مرحوم (سابق رکن دار الترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن) ضخامت ۲۰۰ صفحات، مجلد رنگین گرد پوش کے ساتھ قیمت دو روپے بارہ آنہ، ملنے کا پتہ: مکتبہ نشاۃ ثانیہ، معظم جاہی مارکیٹ، حیدرآباد (آندھرا)

یہ کتاب اپنے موضوع پر بہت خوب ہے .... اس کتاب میں کیا ہے، اس کی تفصیل کتاب کے ناشر کی زبان سے سنیئے:

"قرآن مجید کی وہ آیتیں جو تفسیر کی اصطلاح میں محکمات کہلائی جاتی ہیں، جن سے احکام و نتائج استنباط کئے جاتے ہیں، ان کی تفسیر میں طرح طرح کے اختلافات پائے جاتے ہیں، بے سروپا باتیں لکھی گئی ہیں، اور اس قدر بعید از قیاس روایتیں اور اتنی بے اصول توجیہیں نکالی گئی ہیں کہ آیت کا مطلب کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے، اور علم قرآن میں صریحی مخالفت نظر آتی ہے، علامہ مرحوم نے ان میں سے بعض آیتوں کی بے نظیر تحقیق فرمائی ہے اور کوئی پہلو نظر انداز نہیں کیا ..... اس کے بعد یہ ظاہر کیا ہے کہ حقیقت میں بات کیا ہے! خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان آیات زیر بحث کی نسبت کیا ہدایتیں کی ہیں؟ صحابہ کرام نے ان کا کیا مطلب سمجھا ہے، تابعین کی تحقیقات ان کے بارے میں کیا ہے؟ یہ تحقیقات اس قدر واضح و دل نشین اور زود رس ہیں کہ ان سے تمام اعتراضات آپ ہی آپ مٹ جاتے ہیں" (ص۴)

"..... تاج محل جس تمدن کا نوحہ خواں ہے" (صفحہ ۱۱۹) "تاج محل" اسلامی تمدن کی کوئی اچھی مثال نہیں ہے کہ قبروں پر گنبد وغیرہ بنانے کی ممانعت آئی ہے ـــــ "اخلاف تاج میراث چھوڑا تھا" (صفحہ ۱۲۰) "میراث" تو بالاتفاق مؤنث ہے۔

قرآن کریم کی تفہیم میں یہ کتاب (محکمات) بہت مفید ثابت ہوگی، اور نہ جانے کتنی گرہوں کو کھول دے گی!

ابن الحریری ومقاماتہ تالیف: ڈاکٹر محمد احمد صدیقی ضخامت ۲۳۲ صفحات (بڑا سائز) کتابت و طباعت دیدہ زیب اور کاغذ معیاری! (قیمت درج نہیں) ملنے کا پتہ فاضل مؤلف سے (شعبہ عربی و فارسی، الٰہ آباد یونیورسٹی، الٰہ آباد)

"مقامات حریری" اپنے صنائع و بدائع کے اعتبار سے عربی ادب کے لئے سرمایۂ نازش و فخر ہیں! ڈاکٹر محمد احمد صدیقی نے بڑی کد و کاوش اور تحقیق و جستجو کے بعد "ابن حریری کے مقامات" پر فاضلانہ مقالہ لکھا ہے، شروع میں "ابن الحریری" کی زندگی کے حالات لکھے ہیں، ان میں دلچسپ بات یہ ہے کہ حریری جب کوئی بات سوچتا تھا، تو اپنی ڈاڑھی کے بال نوچتا جاتا تھا جس نے اس کے حلیہ کو اور بھی بگاڑ دیا تھا ـــــ دولت عباسیہ میں لوگ شراب و کباب کے عادی تھے مگر حریری شراب سے نفرت کرتا تھا! وہ شافعی مذہب رکھتا تھا اور زاہد و پاکباز تھا۔

فاضل ناقد حریری کی نثر کے بارے میں لکھتے ہیں:-

"اما نثرہٗ فکانما یوحی الیہ"

(لیکن اس کی نثر ایسی ہے، جیسے کہ اس پر وحی کی جاتی تھی)

اور

"اذہان اسے پڑھ کر غرق حیرت ہو جاتے ہیں اور عقل سراسیمہ ہو جاتی ہے"

"مقامات حریری" کی ایک خصوصیت یہ بھی بتائی گئی ہے کہ اُن میں اہل بصرہ کی معاشرت، اقتصادیات، ادب اور مذہب کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

ڈاکٹر محمد احمد صدیقی نے اس خیال کی تردید کی ہے کہ "مقامات حریری" "مقامات بدیعی" سے ایک حد تک چونکہ ملتے جلتے ہیں اس لئے بدیعی کے مقامات سے چوری کئے ہوئے "مقامات" ہیں! وہ کہتے ہیں اس صنف خاص کا موجد بدیعی ہمدانی نہیں بلکہ ابن درید تھا اور حریری اپنے فن کا امام تھا۔

اس کتاب کے یہ آخری دو باب بہت قیمتی ہیں کہ :- (۱) ادیبوں کے نزدیک "مقاماتِ حریری" کی کیا قدر و قیمت ہے اور (۲) اہلِ عرب کے ادب اور اُن کی زندگی پر مقاماتِ حریری نے کیا اثر چھوڑا؟ فاضل مؤلف حریری کے مداح ہیں مگر اس کے "مقامات" کے معائب پر بھی ان کی نظر ہے، انھوں نے

"معائب مقاماتہ"

کے عنوان سے ایک مستقل باب لکھا ہے اور بتایا ہے کہ حریری آخر انسان تھا، اس لئے لغزشوں سے محفوظ نہ رہ سکا!

یہ جو بعض فرنگی مصنفین نے حریری پر تہمت جوڑی ہے کہ وہ بُری عادتیں رکھتا تھا اور اپنے "مقامات" کے پڑھنے والوں کو لڑکوں کے ساتھ اختلاط پر اُبھارتا ہے، اس کی ڈاکٹر صدیقی نے پُرزور تردید کی ہے!

فاضل ناقد نے "مقاماتِ حریری" کے جابجا اقتباسات دیئے ہیں اور مشکل الفاظ کے فٹ نوٹ میں معنی بھی لکھ دیئے ہیں — کتاب[1] اپنے موضوع پر خوب ہے اور عربی جاننے والوں کے لئے بڑی دلچسپ اور معلومات آفریں ادبی پیش کش ہے،

میر کی آپ بیتی

مرتب :- نثار احمد فاروقی، ضخامت ۱۹۲ صفحات، قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ، مجلد رنگین گرد پوش کے ساتھ، ملنے کا پتہ :- مکتبہ برہان اُردو بازار، دلی ۶ (بھارت)

میر نے فارسی میں اپنی سوانح عمری لکھی تھی، جس کا اردو ترجمہ ضروری حواشی اور تعلیقات کے ساتھ، جناب نثار احمد فاروقی نے کیا ہے، ترجمہ بہت شگفتہ اور رواں ہے، ایک نمونہ :-

> "میری جان! کیا تم دودھ پیتے بچے ہو، جو ہر وقت روتے ہو، اپنا غم کیوں کرتے ہو، تمہارا وارث تو خدا ہے؟ جانے والے کبھی نہیں آتے، گزرنے والے منہ نہیں دکھاتے، بیٹے! یہاں چل چلاؤ لگ رہا ہے، جسے بھی دیکھئے ہو وہ آمادۂ سفر ہے، یہ مت سمجھو کہ دنیا تمہارے رہنے کی جگہ ہے
> یہ دو دم کی مجلس نے گمان کر رکھا ہے، جو حاضر تھے چلے گئے، جو بیٹھے تھے گزر گئے، کلی کی طرح دلگیر نہ ہو، پھول کی مانند مسکراؤ، اس چمن کی بہار تو اُجڑنے والی ہے، بے وجہ دل اپنا میلا نہ کرو، دنیا کے اس قمار خانہ میں تم ایسے بہت سے دل ہار چکے ہیں —"

صفحہ ۹۴ پر "احول" کا ترجمہ "کانا" کیا ہے، حالانکہ "احول" "یک چشم" کو نہیں بلکہ "بھینگے" کو کہتے ہیں اور "یک چشم" کو نہیں بلکہ "احول" (بھینگے) ہی کو ایک کے دو نظر آتے ہیں :- صفحہ ۱۱۸ پر "مستی گم ہو گئی" کو "مسّی" (ملانے ہونے کے ساتھ) لکھا ہے، یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے — اسی طرح صفحہ ۱۲۰ پر "ادھر" کی جگہ "ادھر" لکھا ہوا تھا! —

"بندہ اپنی عزت تھامے شہر میں بیٹھا رہا" (صفحہ ۱۲۱) "عزت سنبھالے" فصیح تر تھا، بلکہ روزمرہ کے عین مطابق!

فاضل مرتب نے "ذکرِ میر" کے بعض حصوں پر کس قدر صائب رائے کا اظہار فرمایا ہے :-

"اس کتاب میں ابتدائی حصہ میر کے والد اور منہ بولے چچا کی تعریفوں اور مسائلِ تصوف سے بھرا ہوا ہے، اس میں نہایت

---

[1] "کما یمتاز الشمس بین الکواکب" (۱۵۵) "کما یمتاز القمر" لکھنا تھا، دن میں "کواکب" کب نظر آتے ہیں، کہ آفتاب اور ستاروں میں امتیاز کیا جا سکے (م - ق)

شاعرانہ مبالغے سے کام لیا ہے "میر کے والد یا چچا، ماشاء اللہ اتنے بڑے صوفی اور بزرگ نہ تھے کہ خلقِ خدا اُن کے آستانے کی خاک بطور تبرک لے جاتی، یا وہ آسمانِ درویشی کے آفتاب و ماہتاب ہوں! اس میں میر نے جی کھول کر مبالغہ سے کام لیا ہے!"

"..... جن دنوں کی یہ باتیں ہیں اُس وقت میر کی عمر سات آٹھ سال سے زیادہ نہیں تھی، پھر یہ ممکن نہیں تھا کہ اتنا کم سن بچہ درویشوں کے صوفیانہ اقوال کو اسی طرح سمجھ سکے کہ تقریباً تیس چالیس برس کے بعد جب وہ اپنی سوانح عمری لکھنے بیٹھے تو انھیں من و عن نقل کر دے، میرا اپنا خیال ہے کہ یہ سارے واقعات میر کے اپنے ذہن کے اختراع ہیں" (صفحہ ۱۳)

"ذکرِ میر" پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ کے بعض صوفی خوبرو لڑکوں سے دلچسپی رکھتے تھے اور خود میر جو اپنے کو خاندانی صوفی کہتے ہیں ان چٹخاروں سے نہ بچ سکے، ان کا ایک شعر بھی تو ہے:

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اُسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا معاشرہ کس قدر پست اور بازاری ہو گیا تھا!

ایک مجذوب کی "بڑ" میر نے نقل کی ہے:-

"اے موسیٰ! آپ نے اس فریبی کو نہیں پہچانا ہے اور نہ میری طرح اس کی محبت میں دل ہارا ہے، اس کی عیارکی باتیں پہلودار ہوتی ہیں، اور اُس کے اشارے دل کو چرا دیتے ہیں، استغفر اللہ! میں اس کے کہنے پر کب راہ پاتا ہوں، ہاں! اس کے رسول کا لحاظ نہ کروں تو کافر ہو جاؤں۔

؎ باخدا دیوانہ باش و با نبیؐ ہشیار باش!

یہ وہ "لغویات" ہیں جو "تصوف کے غامض حقائق اور دقیق معارف" کے نام سے کتابوں میں موجود ہیں (توبہ!)

"تصوف" کے نام پر کیسے کیسے ایمان سوز فتنے اُٹھے ہیں، اُن کی ایک جھلک اس کتاب میں دیکھئے:

"خلفشاں نمود کا تعلق میر محمد حسین مشہدی کے گروہ سے معلوم ہوتا ہے، جس نے عالمگیر کی وفات (۱۱۱۸ھ) کے بعد ایک نئے مسلک کی بنیاد ڈالی تھی، وہ اپنے تئیں "بیگوگ" کہتا تھا، اس کا کہنا تھا کہ ہر نبی کے نو (۹) بیگوگ ہوتے ہیں اور میں دینِ محمدی کا سب سے آخری بیگوگ ہوں، میر محمد حسین عمدۃ الملک امیر خاں صوبیدار کابل کی بے باک کا شوہر اور امیر خاں کا داروغہ خوشبو خانہ تھا، وہ علوم متداولہ میں کافی دستگاہ رکھتا تھا اور نہایت شیریں بیان و نغز گفتار تھا، اس نے عمدۃ الملک امیر خاں اور عالمگیر کی وفات کے بعد بہادر شاہ اول کے عہد میں نیا ڈھونگ رچایا، اپنا نام "نمود و انمود" یا "نمود اللہ" رکھا اور اپنا مرتبہ نبوت و ولایت کے درمیان ظاہر کیا، ایک کتاب "اقوزہ مقدسہ" کے نام سے تصنیف کی اور اسے الہامی ظاہر کیا، اس نے ایسے الفاظ اور فقرے وضع کر رکھے تھے، جو قطعاً مہمل تھے اور جن کا مطلب خود اُسے بھی معلوم نہ تھا، اس کے مرید "فربود" سلام کی جگہ "نمود بود ال" کہتے تھے .....

میر محمد حسین کے پیروکار، خلیفہ اور مرید سلطنت میں پھیل گئے اور انھیں "نشان" یا خطاب عطا کئے گئے تھے، "خلفشاں نمود" بھی اسی سلسلہ کا ایک پیروکار تھا"!

"میر کی آپ بیتی" میں آپ بیتی بہت کم زیادہ تر اُس زمانہ کی جنگوں اور معرکوں کا حال ملتا ہے اور عبرت کی

ایک تصویر نگاہوں کے سامنے مجسم ہوجاتی ہے کہ دنیا والوں نے حکومت و اقتدار کی خاطر کیسی کیسی سفاکیاں اور بے وفائیاں کی ہیں اور انسانی جانیں کس قدر ارزاں ہوگئی ہیں!

کتاب پر مقدمہ جناب مالک رام (ایم ۔ اے) نے لکھا ہے، اور اس میں موصوف نے بتایا ہے کہ میر کے متعلق محمد حسین آزاد نے آب حیات میں کیسی کیسی غلط بیانیوں سے کام لیا ہے اور ـــ

"میر کے ذاتی حالات کے علاوہ یہ کتاب ہندستان کے اس دور کی تاریخ کا بھی بہت اچھا ماخذ ہے"

عہد فاطمی میں علم و ادب

از:- عاشق حسین برہان پوری و محمد شاکر برہان پوری، ضخامت ۲۰۸ صفحات (بڑا سائز) قیمت دو روپے آٹھ آنہ ملنے کا پتہ:- ڈی بی بک ڈپو ۱۸۶ مسجد بندر روڈ، بمبئی ۳

یہ کتاب ـــ فاطمی عقائد سے شروع ہوکر فاطمی دور کے "انشاء و کتابت" پر ختم ہوتی ہے، درمیانی ابواب حسب ذیل ہیں:

ـــ نظام دعوت فاطمیہ ـــ مراکز علم ـــ فاطمی علم و ادب کا مفہوم ـــ مشہور مصنفین دعوت ـــ تصنیفات دعوت ـــ قرآن و تفسیر ـــ حدیث ـــ فقہ ـــ لغت و نحو ـــ تاریخ نگاری ـــ سیرت نگاری ـــ فلسفیانہ علوم ـــ

کتاب کے آخر میں ان کتابوں کی طویل فہرست ہے، جن سے اس کتاب کی تصنیف میں فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

اس کتاب میں عہد فاطمی کے علمی و ادبی اور دینی کارناموں کو پیش کیا گیا ہے، اور واقعات بڑی کد و کاوش کے ساتھ فراہم کئے گئے ہیں! اس میں اُن غلط عقائد کی تردید بھی کی گئی ہے، جو اسمٰعیلی گروہ سے منسوب ہیں یا منسوب کئے جاتے ہیں، مثلاً یہ کہ :-

"امیرالمومنین معبود ہیں ـــ فاطمی ائمہ علم غیب کا دعویٰ کیا کرتے تھے ـــ"

کتاب اپنے موضوع پر خوب ہے؛ جو لوگ تاریخی انکشافات (ریسرچ) کا ذوق رکھتے ہیں، ان کو اس کا مطالعہ بہت فائدہ دے گا!

فاطمی عقائد اور اُن کی دعوت اصل میں کیا تھی؟ اور اس کتاب میں جن الزامات کی تردید کی گئی ہے وہ "تردید" کیا وزن رکھتی ہے؟ ـــ اس پر نقد و تبصرہ وہی حضرات کرسکتے ہیں، جو تاریخ اسلام اور فرقوں کے عقائد پر پورا عبور رکھتے ہیں!

تجلیاتِ عثمانی

از:- پروفیسر محمد انوار الحسن انور شیرکوٹی، ضخامت ۷۰۰ صفحات رنگین گردپوش کے ساتھ قیمت دس روپے آٹھ آنہ ملنے کا پتہ:- ادارۂ نشر المعارف، چہلیک، ملتان شہر۔

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی علم و عمل کا سرچشمہ تھی، ان کی زبان و قلم نے اللہ کے دین کی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں، اس جامعیت کے لوگ امت میں روز روز تھوڑی پیدا ہوتے ہیں، مولنا عثمانی دراصل "شیخ الاسلام" تھے، وہ آخر دم تک اسلام کی سربلندی کے لئے ہی جد و جہد کرتے رہے، اس علم و فضل کے ہوتے ہوئے کس قدر تواضع تھی، کیا انکسار تھا، طبیعت کی سادہ پائی تھی، تکلف اور تصنع سے دور! (اللّٰھم کثر امثالہ)۔

جناب پروفیسر انوار الحسن انور نے علامہ عثمانی مرحوم کے علم تفسیر، حدیث، فقہ، علم کلام، فلسفہ، منطق، مناظرہ، تقریر، اردو، فارسی، عربی ادب اور سیاسیات "بڑی تحقیق" کے ساتھ سیر حاصل تبصرہ کیا ہے! کتاب کی رنگا رنگی اور تنوع کا یہ عالم ہے کہ سات سو سے اوپر ذیلی عنوانات پر یہ مبسوط تصنیف مشتمل ہے!

پروفیسر انوار الحسن صاحب نے علامہ عثمانی کی تصانیف کو کھنگال ڈالا ہے، اس بحر مواج کے وہ کامیاب شناور ہیں، انھوں نے اس دریا کے ایک ایک صدف کو جانچا اور اس "اکیڈیمی" کے ایک ایک صفحہ کو پڑھا ہے "علوم عثمانی" کے شاید اس دور میں وہ سب سے بڑے محقق اور اسکالر ہیں!

فاضل مصنف نے مولنا شبیر احمد عثمانی قدس سرہٗ کی کتابوں سے اقتباسات دے کر اپنی رائے پر مہر ثبت کر دی ہے، مثلاً "تفسیر" کے باب میں انھوں نے بتایا ہے کہ مولنا عثمانی سلف صالحین کے مسلک سے کس قدر قریب ہیں اس کے باوجود وہ علوم دینی میں مجتہدانہ بصیرت بھی رکھتے ہیں، متقدمین کی کسی رائے سے اختلاف کیا ہے تو اس میں کس قدر وزن پایا جاتا ہے اور "اختلاف" میں آداب و اخلاق کی حد سے تجاوز نہیں کرتے!

اتنی ضخیم و مبسوط کتاب پر چند سطروں کی "تقریظ"! کاش! مولنا محمد ادریس کاندھلوی مولنا عثمانی مرحوم کے علوم کے شایانِ شان "دیباچہ" تحریر فرماتے!

انسان کے کام میں تھوڑی بہت کور کسر رہ ہی جاتی ہے، اس سے کون خالی ہے، چنانچہ ـــ

ـــ "جہاں لاکھوں کی تعداد میں لوگوں نے نماز جنازہ میں شرکت کی۔" (صفحہ ۱۵) یہ مبالغہ ہے، میں خود علامہ عثمانی کی نماز جنازہ میں شریک تھا مجمع بہت بڑا تھا مگر لاکھوں نہ تھا بلکہ ایک لاکھ سے بھی کم تھا ـــ اور صفحہ ۱۸ پر یہ شعر

اور میں وہ ہوں کہ گر جی میں کبھی غور کروں
غیر کیا خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے

بہت ہی سپاٹ اور بے مزہ ہے! ـــ "صبح صادق کے پر بہار سویروں کے وقت ....." (صفحہ ۲۰) "صبح صادق کے سویرے" یہ تو "شب لیلۃ القدر کی رات" والی بات ہوئی ـــ "یہ جملہ حضرت عثمانی کی علمی تحقیقات پر گہری بصیرت کا غماز ہے" (صفحہ ۳۱) ترجمہ سا معلوم ہوتا ہے ـــ "مولنا عثمانی نے کس تاریخ سے یہ تفسیر لکھنا شروع کی گمنامی کے پردے میں چھپی ہوئی ہے" (صفحہ ۷۷) کاش! ایسے کمزور اور بے جان جملے اس بلند پایہ کتاب میں نہ ہوتے!

مولنا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ واقعی "قاسم العلوم والخیرات" تھے، مگر ان کی کتابیں اتنی غامض ہیں کہ حضرت مولنا اشرف تھانوی رحمۃ اللہ علیہ تک نے اُن کے سمجھنے سے اپنے عجز کا اعتراف کیا ہے، تحریر کا اس قدر دقیق و غامض ہونا بھی ٹھیک نہیں، مولنا عثمانی مرحوم نے اگر مولنا نانوتوی قدس سرہٗ کے علوم کو اپنے انداز میں بیان فرمایا ہے تو واقعی کمال کیا ہے، اُن نازک عقدوں کا کھولنا ہر کسی کے بس کی بات نہ تھی!

"اس کتاب میں تفسیر نہیں عربیت ہے، پھر شیعہ تھا" (صفحہ ۱۰۵) فیضی کی تفسیر پر یہ ریمارک کس قدر بے جان ہے، فیضی نے جو "غیر منقوط الفاظ" کی صنعت کا التزام کیا ہے، اس پر ایک دو جملے لکھنے چاہیئے تھے، جس طرح مولنا شبلی نعمانی ایک دو جملوں میں مدح و ذم کا حق ادا کر دیتے ہیں! ـــ "صحیح حدیث اور اسوۂ حسنہ کے بغیر قرآن کریم کا سمجھنا دشوار ہی نہیں بلکہ طبیعت مستقیمہ کے نزدیک ناممکن ہے" (صفحہ ۲۰۳) یہ "طبیعت مستقیمہ"

بھرتی کی ترکیب یہاں لائی گئی ہے!

مولٰنا عثمانی مرحوم کو جگہ جگہ "محدث پاکباز" اور "فقیہہ دانشمند" کے جو خطابات دئے گئے ہیں، اور وہ جہاں جہاں آئے ہیں، اُن سے وجدان کو وحشت ہوتی ہے ـــــ صفحہ ۲۲۴ پر صاحب ہدایہ (علی بن ابی بکر مرغینانی) کا نام "علی بن ابن بکر مرغیانی" لکھا ہے، یہ کتابت کی غلطی ہے!

"میرے نزدیک خیریت کی صورت یہ ہے کہ اجتہاد کی قدریں ختم ہو چکیں" (صفحہ ۳۴۹) حالانکہ "اجتہاد کی قدریں" نہ ختم ہوئیں اور نہ ہونی چاہئیں، ہاں! یہ ضرور ہے کہ ہر کس و ناکس کو "اجتہاد" کا حق نہیں دیا جاسکتا۔ "اجتہاد" کی آج بھی ضرورت موجود ہے، اور تمدن و اقتصادیات کے نئے نئے مسائل میں "اجتہاد" ہو ہی رہا ہے!

حیرت ہے کہ مولٰنا عثمانی کے "قطعات" پر فاضل مصنف نے "رباعیات" کا عنوان قائم کیا ہے، وہ خود بھی شعر کہتے ہیں اور اپنے نام کے ساتھ خاص طور سے اپنے تخلص (انور) کا اظہار فرمایا ہے، مگر "رباعی" کے اوزان نہیں پہچانتے!

"اگر آپ حکومت وقت کے اس طرح آڑے نہ آتے ڈکٹر کا حریصانہ منہ کبھی بند نہ ہوتا ...." (صفحہ ۶۰۳)

یہ کیا انداز بیان ہے؟ ـــــ "سمرنا میں فتح کی چراغاں ہو رہی تھی" (۶۳۰) "چراغاں" بالاتفاق مذکر ہے ـــــ آپ نے ہندوستان سے مولانا مناظر احسن گیلانی اور مسٹر عبدالحمید حیدرآبادی مشہور قانون داں کو بلایا" (صفحہ ۷۰۲) ان کا نام "ڈاکٹر حمید اللہ" ہے!

صفحہ ۳۵۶ پر فاضل مصنف نے "لاؤڈ اسپیکر" کے بارے میں لکھا ہے کہ حضرت حکیم الامت مولٰنا تھانوی نے اس سے مقتدیوں کی نماز فاسد ہونے کا جو فتویٰ صادر فرمایا تھا، یہ "تقویٰ کا مقام" تھا، حالانکہ یہ "مقام تقویٰ" نہیں "مقام درع" تھا! فقہی جزئیات میں اس قدر ہندی کی چندی اور ایسی تنگی مناسب نہیں مولٰنا تھانوی نے "ریڈیو" کو بھی "آلہ لہو و لعب" غلطی سے سمجھ لیا تھا، اور اُن کا یہ بھی فتویٰ ہے کہ "پرامیسری نوٹ" کی حیثیت "ہنڈی" کی سی ہے، لہٰذا "نوٹ سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوسکتی ـــــ اکابر کے تسامح پر گرفت کرنے کی کسی میں جرأت نہ ہو تو کم سے کم اس کی تحسین نہیں کرنی چاہئیے! عقیدت و انصاف کا یہی وہ دوراہہ ہے، جہاں ثبات قدم کا امتحان ہوتا ہے!

"تجلیات عثمانی" کوئی شک نہیں قابل قدر تصنیف ہے" یہ کتاب خود لکھنے والے کی بالغ نظری، وسعت علم اور تعمق فکر کا بولتا ہوا ثبوت ہے! پروفیسر انوار الحسن صاحب اگر علامہ عثمانی مرحوم کے غیر مطبوعہ مسودات چھپوا دیں تو اُن کا قوم پر بہت بڑا احسان ہوگا! اللہ کے فضل سے اس دور میں مولٰنا عامر عثمانی مدیر "تجلّی" کا قلم خانوادۂ عثمانی کے اس علمی شرف کا ترجمان ہے!

ISLAMIC LAW AND CONSTITUTION	از:- مولٰنا سید ابوالاعلیٰ مودودی ـــــ مرتبہ: خورشید احمد (ایم۔ اے) ضخامت ۲۰۴ صفحات، قیمت چار روپیہ آٹھ آنہ (آٹھ شلنگ چھ پنس) ملنے کا پتہ:- مکتبہ جماعت اسلامی، آؤٹرام روڈ، کراچی۔

پاکستان میں اسلامی دستور سازی کی جو مہم برسوں جاری رہی ہے، اس میں مولٰنا مودودی صاحب کی فکر و بصیرت اور جماعت اسلامی کی عملی جدوجہد نے ممتاز اور نمایاں پارٹ انجام دیا ہے! اس کتاب میں مودودی صاحب کے

اہم مقالوں اور تقریروں کا انگریزی ترجمہ پیش کیا گیا ہے، جناب خورشید احمد صاحب ایم۔ اے نے ان مضامین کو بڑے سلیقہ کے ساتھ ایڈٹ کیا ہے، شروع میں اُن کا لکھا ہوا "تعارف" ہے، جو سنجیدہ اور جاندار ہے، یہ کتاب بیاسات اہم مضامین پر مشتمل ہے، اس میں علماء پاکستان کے وہ متفقہ اساسی اصول بھی درج کئے گئے ہیں، جنھوں نے علماء کے اتحاد و وحدت کی ایک مثال قائم کر دی ہے، آخر میں مولانا مودودی صاحب کی زندگی کے مختصر حالات کتاب میں شامل ہیں :

اسلامی دستور سازی میں مولانا مودودی مجتہدانہ بصیرت رکھتے ہیں، ان کی فکر مستقیم اور اُن کی رائے صائب ہے، مولانا موصوف اللہ کے دین کو صرف مسجدوں، مدرسوں اور خانقاہوں تک محدود کر دینے کے قائل نہیں ہے، بلکہ وہ زندگی کے ہر گوشہ پر اللہ کے دین کو غالب و نافذ دیکھنا چاہتے ہیں، اور اسی جامع کوشش کا نام ان کے نزدیک "اقامت دین" ہے! اُن کا مشن ہی یہ ہے۔ سیاست، تجارت، معیشت و معاشرت اور صنعت و حرفت، غرض زندگی کا کوئی گوشہ بھی دین کے حدود عمل سے باہر نہ رہے، وہ جو کہتے ہیں، اس کے لئے کتاب و سنت سے دلیل لاتے ہیں، یہ کتاب اُن کے افکار کی آئینہ دار ہے، جسے پڑھ کر بہت سے شکوک دور ہوتے ہیں اور دل مطمئن ہو جاتا ہے کہ اللہ کا دین ہی غالب ہونے کا مستحق ہے!

انگریزی داں طبقہ میں اس کتاب کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہونی چاہیئے تاکہ اللہ کے دین کی عظمت ان کے دلوں میں جاگزیں ہو اور مغربی افکار کی مرعوبیت ختم ہو۔

انتخاب کلام سکندر علی وجد

ضخامت ۶۴ صفحات، قیمت ۵، نئے پیسے۔ ملنے کا پتہ: انجمن ترقی اُردو، علی گڑھ

انجمن ترقی اُردو (ہند) حالات کی ناسازگاری کے باوجود اُردو کی قابل قدر خدمت انجام دے رہی ہے، ایک طرف اس نے اُردو زبان کو اس کا حق دلانے کے لئے آئینی جدوجہد شروع کر رکھی ہے، دوسری طرف اس کی مرتب کی ہوئی کتابیں اُردو کے سرمایہ میں اضافہ کر رہی ہیں، جناب آل احمد سرور، اس انجمن کے روحِ رواں ہیں!

شعراء کے انتخابی سلسلہ کا ایک سیٹ انجمن ترقی اردو پیش کر چکی ہے، دکن کے مشہور شاعر جناب سکندر علی وجد کے کلام کا انتخاب اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے! وجد کوئی شک نہیں نغزگو شاعر ہیں، اُن کے کلام میں جوش اور گرمی پائی جاتی ہے، غزل اور نظم دونوں صنفوں پر وہ قدرت رکھتے ہیں —— تاج محل اور اجنتا —— ان کی نظمیں بڑے معرکہ کی ہیں، جن کی وجہ سے اُن کا نام زندہ رہے گا!

اپنے "نکتہ چیں" سے وجد خطاب کرتا ہے۔

اس گلشنِ معنی کی اچھوتی ہیں بہاریں —— دُنیا تو پُرانی ہے، اُدھر کیا ہے ادھر دیکھ
یہ منظرِ دلکش کہیں دیکھا بھی نہ ہوگا —— الفاظ کی نبضوں میں رواں خونِ جگر دیکھ

ان کی مشہور نظم —— اجنتا —— کے دو بند ——

جگر کے خون سے کھینچے گئے ہیں نقشِ لاثانی —— تصدق جن کے ہر خط پہ تحیر خانہ، مانی
مکمل ہے شباب و حسن میں تخئیل انسانی —— تقدس کے سہارے پی رہا ہے ذوقِ عریانی

گلستانِ اجنتا پہ جنوں کا راج ہے گویا
یہاں جذبات کے اظہار کی معراج ہے گویا

کرشمہ ہے یہ اربابِ ہمم کی سعیِ پیہم کا — جنھیں احساس تک باقی نہ تھا کچھ شادی و غم کا
دلوں پر عکس کھنچ آیا تھا جن کے حُسنِ عالم کا — قلم کو نقش ازبر ہو گیا تھا اسمِ اعظم کا
چٹانوں پر شباب و حُسن کی موجیں رواں کر دیں
فسوں کاروں نے رنگوں میں مُقید بجلیاں کر دیں

"تاج محل" کا یہ بند کس قیامت کا ہے ——

بہزادِ عصر ہیں دری گل کاریوں پہ دنگ — منظر کشِ بہارِ چمن ہے، جبینِ سنگ
کلیوں کا وہ نکھار، وہ گل ہائے رنگ رنگ — فانوسِ شمعِ کشتہ سے لپٹے ہوئے پتنگ
رنگینیاں ہیں جوہرِ اہلِ کمال کی
چھنتی ہے جالیوں سے نزاکت خیال کی

د کی ایک نظم —— مزدوروں کا پیغام، طلبہ جامعہ عثمانیہ کے نام —— ہے، اس کے دو بند کس قدر ولولہ انگیز اور جاندار ہیں

نونہالانِ چمن اہلِ ہنر بنتے ہیں — جوش زن قلب میں ہے شوقِ سفر جاتے ہیں
صورتِ خاک رہے، مثلِ شرر جاتے ہیں — یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ کدھر جاتے ہیں
لو چلا قافلۂ کوہکن خانہ بدوش
کل سے ہو جائیں گی تیشوں کی صدائیں خاموش

جوشِ اخلاص سے کی کوششِ پیہم ہم نے — نظمِ کہسار کیا درہم و برہم ہم نے
کوہِ غم ٹوٹ پڑے پر نہ کیا غم ہم نے — کر دیا قوم کا اک خواب مجسم ہم نے
ہم نے نقشِ ہوسِ خام نہیں چھوڑا ہے
کام چھوڑا ہے مگر نام نہیں چھوڑا ہے

غزل کے چند اشعار:-

اب کے جنوں میں چاک گریباں نہ ہو سکا — کچھ اہتمامِ جشنِ بہاراں نہ ہو سکا
ہر ایک قہر ترے چاہنے والے کے لیے — ہر ادا جان سے پیاری ہے تجھے کیا معلوم
ہزار نقص ہیں مجھ میں مرے کمال کو دیکھ — مجھے نہ دیکھ دل آویزیِ خیال کو دیکھ
روز و شب سلسلۂ حادثہ پیمائی ہے — وقت حالات کا خاموش تماشائی ہے
کس قدر زور پہ ہے نشۂ صہبائے بہار — ہر شگوفے کی قبا چاک ہوئی جاتی ہے

دوسرا رُخ:

تاریک ہیں وہ جانِ طرب نور باریاں — ڈستی ہے دل کو شمعِ شبستاں ترے بغیر (صفحہ ۸)

گر دو شعر: "جانِ طرب نور باریاں" —— یہ ترکیب ہی غیر مانوس لگتی ہے، پھر "شمعِ شبستان" کا ڈسنا، اس پر مستزاد!

دل کی طرف ہے پھر نگہ التفاتِ غم ٭ ہے دستِ یاس سلسلہ جنباں ترے بغیر (صفحہ ۸) شعر کیا ہے، اچھی خاصی چیستاں ہے ! "نگہ التفاتِ غم" میں کتنا تکلف پایا جاتا ہے "دستِ یاس کی سلسلہ جنبانی" نے شعر کو اور پست کر دیا !

پیامِ زندگی دیتی تھیں شرمیلی ملاقاتیں ٭ جواں برسات کے دن جان لیوا چاندنی راتیں (صفحہ ۹) برسات کے دن جوان اور بوڑھے بھی ہوا کرتے ہیں، خوب ! اور یہ چاندنی راتیں جن میں محبوب سے ملاقاتیں ہوتی تھیں حیات بخش ہونی چاہئے تھیں کہ جان لیوا بہادل گیا، اہلِ جنوں کو حسن کاری کا ٭ اثاثہ لوٹ ڈالا شوق میں فصلِ بہاری کا (صفحہ ۱۰) نومشقوں کا سا شعر ! "لوٹ" کے ساتھ "ڈالا" بھی کھٹکتا ہے !

کل صبحِ حسن بزمِ شبانہ چلا گیا معصوم عاشقی کا بہانہ چلا گیا
باقی نہیں سکونِ دل و مرکزِ خیال بہکی ہوئی نظر کا نشانہ چلا گیا (صفحہ ۱۸)

ایسے بھرتی کے شعر بھلا "انتخاب" میں آنے کے قابل تھے !

مخالفانِ تغیر کی بے حسی پہ سدا گری ہے برق زمانے کے تازیانے کی (صفحہ ۲۴)

نری آورد ! "بے حسی پر زمانے کے تازیانے کی برق کا گرنا" آخر یہ بات کیا ہوئی !

سادگی لاجواب ہے جنکی ٭ ان سوالوں کی یاد آتی ہے (صفحہ ۵) مصرعِ ثانی اس قدر مبہم ہے کہ وجدان شدید گھٹن محسوس کرتا ہے ! سکندر علی وجد کی نہ جانے کتنی اچھی غزلیں اس انتخاب میں آتے آتے رہ گئیں ! "انتخاب" میں تو ایسے اشعار آنے چاہئیں کہ ہر شعر "کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست" کا مصداق بن جائے۔

اعتراف : جناب فضل کریم فضلی کے ناول "خونِ جگر ہونے تک" پر ماہ اپریل کے "فاران" میں تبصرہ کیا گیا تھا اور ان کی عبارت کی ایک ترکیب (دھوم دھامی) پر گرفت کی گئی تھی جناب نقشت کاظمی نے داغ کا ایک شعر لکھ کر بھیجا ہے، یہ ترکیب داغ نے استعمال کی ہے۔

مرے قتل کے روز میلہ لگے گا
یہ جلسہ وہ اک دھوم دھامی کریں گے

ماہر القادری

جلد ۱۰ نمبر ۳

فاران

جون ۱۹۵۸ء ایڈیٹر ماہرالقادری

سالانہ چندہ چھ روپے

فی پرچہ آٹھ آنے

مقام اشاعت

دفتر فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۹

نظم و ترتیب

پرنٹر و پبلشر مسرور حسین — مطبع سعیدی قرآن محل مقابل مولوی مسافرخانہ کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

نقشِ اوّل

کسی ملک میں بادشاہت یا آمریت کی فرمانروائی ہو تو وہاں انقلاب لانے اور آمریت و خسروی کا تخت الٹنے کے لئے طاقت کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے اور یہ انقلاب غیر آئینی تدابیر بلکہ خون خرابہ کے ذریعہ آتا ہے۔ ڈکٹیٹر شپ اور بادشاہت کی فضا میں کسی کو آئینی احتجاج کی اوّل تو ہمت ہی نہیں ہوتی اور اگر خدا کا بندہ ہمت کرتا بھی ہے تو خوف و جبر کے سبب اُسے اپنے موقف و منوانے کی ہمت نہ دیں ہے۔ آئے دن یہ سننے میں آتا ہے کہ احتجاج نقار خانے میں طوطی کی صدا بن کر رہ جاتی ہے مصر اور روس کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ جمال ناصر کی جابرانہ آمریت کے سامنے کس کی مجال ہے جو لب کشائی کر سکے ناصر کی زبان مصر کا قانون ہے اور یہ دلیر شخص جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے۔ جس نے اسلامی تہذیب کے مقابلہ میں فرعونی تہذیب کو ابھارا اور مصری عوام جرأتِ احتجاج نہ کر سکے۔ اس نے سوویت روس کی سرپرستی کو قبول کیا اور کوئی چوں نہ کر سکا۔ آج مصر و شام کے بیڑے کی ناخدائی اسی کے ہاتھ میں ہے اور یہ وہ بے رحم ملاح ہے جو مشرقِ وسطیٰ کی سب سے بڑی دینی تحریک —— اخوان المسلمون —— کے سفینہ کو پاش پاش کر چکا ہے۔

روس کے بادشاہوں کی قسمت کا مالک "خروشچیف" جیسا ظالم سنگدل اور ضدی شخص ہے۔ جس کی پالیسی سے اختلاف کی پاداش میں نہ جانے کتنے بڑے آدمی موت کے گھاٹ اتارے جا چکے ہیں۔ روس درحقیقت ایک بہت بڑا "قید خانہ" ہے۔ جس کے لیے دولت تبدیلیوں کی طرح زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں —— ان ملکوں میں جب کبھی انقلاب آئیگا تو اس کو رافت و مصلحت کو فی ٹوٹے گی! کمیونسٹ نے زار کی شہنشاہی کو خون خرابہ کے ذریعہ تباہ کیا اسی طرح کمیونسٹ حکومت کی ڈکٹیٹر شپ کا بدترین مظاہرہ ہے اس کا تختہ بھی غیر آئینی ہنگامہ آرائیوں کے واسطے الٹا جائے گا آگ اور لہو کے دریا سے گذر کر ہی روس کو یہ مقدر ہو چکا ہے۔

پاکستان ہمارا وطن ناوک فگن ہے نہ بادشاہت کی نحوست کا دور دورہ ہے اور نہ یہاں آمریت کی لعنت مسلط ہے۔ اس ملک کو خون ریزی کے ذریعہ فتح نہیں کیا گیا کہ یہاں انقلاب لانے کے لئے تلوار کو پھر امتحان کیا جائے۔ پاکستان آئینی جد و جہد کے ذریعہ وجود میں آیا ہے۔ پوری مسلم قوم اس مملکت کی بانی مؤید اور قیم ہے! پاکستان مسلمانوں کی متاعِ دل

حکومت کی خاطر اس "قصر و ایوان نژاد پارٹی" (Party - born in palace) میں دوسری پارٹیوں کے اونچے لوگ ٹوٹ ٹوٹ کر شامل ہو جاتے ہیں، جس "پارٹی" کی بنیاد ہی جاہ و اقتدار کی ہوس پر قائم کی گئی ہو، اور خود غرضی جس کے خمیر میں شامل ہو، اس پارٹی سے ملک و ملت کو بھلا کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

خرابی کی حد ہو گئی کہ وہ "بڑے لوگ" جن کی پیشانیوں پر انگریز کی نیاز مندی کے داغ نمایاں ہیں، جن کا ماضی حکومت برطانیہ کی وفاداری کے سوا اور کوئی "جنسِ گراں مایہ" اپنے دامن میں نہیں رکھتا، جن کا عوام سے کوئی ربط نہیں رہا۔ ملک کی قسمت کے مالک بنے ہوئے ہیں، اور ان میں کوئی کوئی بزرگ ایسے ہیں کہ جن کا نہ حافظہ صحیح رہا ہے۔ اور نہ جن کی قوتِ فکر ٹھیک طور پر کام کرتی ہے جن کی تقریریں اور بیانات غیر ذمہ داری اور عدم تدبر کے شاہکار ہوتے ہیں۔

پاکستان کے حکمرانوں کی باہمی کشمکش اور آپس کی لڑائی نے بین الاقوامی دنیا میں پاکستان کی ساکھ کو جوکھوں میں ڈال دیا ہے۔ دوسرے ملکوں میں پاکستانی ذلت و نفرت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ لوگ مذاق اڑاتے اور پھبتیاں کستے ہیں کہ یہ اس ملک کے باشندے ہیں اور اس حکومت کی رعایا ہیں جہاں بچوں کے گھروندوں کی طرح وزارتیں ٹوٹتی، پھوٹتی اور بنتی بگڑتی رہتی ہیں۔

ان اقتدار کے بھوکوں اور غرض کے بندوں نے مشرقی پاکستان کو خرابی کی اس حد تک پہنچا دیا ہے کہ کمیونسٹ اور مہا سبھائی ہندو ایکا ایکی "بنگالیت" کا نام چھوڑ کر اس دھاکے سے لوگوں کو بد حواس کر دیں، اور بھاشانی جیسی ذہنیت کے لوگ پاکستان کو سلام علیکم کہہ کر "عظیم تر بنگال" (Greater Bengal) کی گود میں چلے جائیں۔ یہ سطریں لکھتے ہوئے ہاتھ کانپ رہا ہے، اور دل بار بار "معاذ اللہ" پڑھ رہا ہے —— مگر ان "خطرات" کو چھپایا بھی تو نہیں جا سکتا
اللہ نے چاہا تو پاکستان کے دشمن ذلیل و رسوا ہی ہوں گے اور ان کی یہ تمنائیں جی کی جی ہی میں رہ جائیں گی۔ لیکن تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ جو کوئی دشمن کو حقیر و درماندہ سمجھ کر غفلت میں رہا اور جس نے بھی فتنوں کے توڑ کی تدبیریں نہ کیں، اس نے سخت حماقت و بے دانشی کا ثبوت دیا۔ اور کبھی کبھی تو اس غفلت نے حالات کے رخ ہی کو موڑ کر رکھ دیا۔

پاکستان کے حکمرانوں نے کسی "اسلامی قدر" کو بھی یہاں اُجاگر نہیں ہونے دیا۔ بلکہ اس کے مقابلے میں ان تمام بد اخلاقیوں، فحاشیوں، بے حیائیوں اور برائیوں کی یہاں سرپرستی کی جا رہی ہے، جن کے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ وہ مسلمان لڑکیاں جن کی زندگیوں میں مریمؑ و فاطمہؓ اور خدیجہؓ و عائشہؓ کا پاکیزہ کردار جھلکنا چاہئے تھا، ان کو ایکٹریس، رقاصہ اور مطربہ بنانے کی تدبیریں کی گئی ہیں۔

سیاست ہو یا اخلاق، تجارت ہو یا معیشت —— تخریب ہی تخریب ——— تعمیر کا دور دور پتہ نہیں۔ بناؤ کی طرف توجہ ہی نہیں کی گئی۔ بگاڑ اور مسلسل بگاڑ۔ جیسے اس فن میں یہ "بڑے لوگ" ید طولیٰ رکھتے ہوں۔ مسائل کی عقدہ کشائی انھیں آتی ہی نہیں، یہ تو الجھنوں پر الجھنیں بڑھائے جاتے ہیں، چاکِ دامن کی بخیہ گری سے ان کو کیا سروکار، یہ تو جیب و داماں کی دھجیاں اڑانے میں کمال رکھتے ہیں۔

کوئی مرے مر جانے دو ؛ ان کو اپنے عیش سے کام

اور

راج محل میں ناچ اور رنگ ؛ پرجا کے گھر میں کہرام

انقلاب قیادت

کسی کا دل بالکل ہی پتھر ہو گیا ہو تو دوسری بات ہے ورنہ کوئی حساس اور غیرت مند شخص ان خراب حالات کو دیکھ کر چین سے نہیں بیٹھ سکتا۔ پاکستان کی اس تمام زبوں حالی کی ذمہ دار یہاں کی بگڑی ہوئی قیادت ہے۔ موجودہ حکمراں اور برسر قیادت ٹولے کی موجودگی میں پاکستان پر مسرت و خوشحالی کی ایک صبح بھی طلوع نہیں ہو سکتی۔ حالات روز بروز بگڑ ہی رہے ہیں۔ اور جب تک ان بڑے لوگوں" کا دست شفقت پاکستان کے سر پر رکھا ہوا ہے۔ یہ "بچہ" بھوکا، ننگا اور آوارہ و بدنام ہی رہے گا۔

پاکستان کی فاسد قیادت کو بدلو

یہ کوئی سیاسی اسٹنٹ اور چلتا ہوا نعرہ نہیں ہے، یہ وقت کی آواز، حالات کا تقاضہ، ہاتف غیبی کی ندا اور دلوں کی پکار ہے!

پاکستان کو تباہی سے بچانا ہے تو یہاں "انقلاب قیادت" ناگزیر ہے، اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں۔ یہ زہر جو پاکستان کی رگ رگ میں سرایت کر گیا ہے، اس کی سمیت کو "انقلاب قیادت" کا تریاق ہی زائل کر سکتا ہے! ان "بڑے لوگوں" کو برسوں سے ہم برت رہے ہیں۔ ان کو ملک و ملت نے ہر طرح آزما کر دیکھ لیا۔ بس اب ان سے چھٹکارہ پانے ہی میں پاکستان کی بہتری ہے! پاکستان کی عزت و ناموس سے یہ لوگ بہت دن تک فٹ بال کی گیند کی طرح کھیلتے رہے، اب یہ کھیل بند ہونا چاہئے۔ ملک کی، ملت کی، اسلام و اخلاق کی یہ رسوائی "تا کجے!" کہاں تک کوئی خون کے گھونٹ پی کر ان ذلتوں کو دیکھتا رہے، ہر چیز کی آخر ایک حد ہوتی ہے!

اس مضمون کے آغاز ہی میں اس کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ پاکستان میں نہ بادشاہت موجود ہے ورنہ یہاں ڈکٹیٹر شپ پائی جاتی ہے کہ جہاں انقلاب لانے کے لئے غیر آئینی تدبیروں کو کام میں لایا جائے۔ یہ ایک جمہوری ریاست ہے اور وہ بھی اسلامی جمہوریت! یہاں قیادت کو بدلنے کے لئے آئینی اور جمہوری طریقوں سے کام لیا جائے گا۔ کوئی توڑ پھوڑ نہیں، کسی قسم کا شر و فساد نہیں، کوئی فریب اور چالبازی نہیں! شرافت، ایمانداری اور [illegible] کے ساتھ آنے والے انتخابات کے ذریعہ ان لوگوں کو اوپر لایا جائے۔ جو اسلام پسند، خدا ترس اور عوام کے خیر خواہ ہوں اور جو اپنے اندر ملک و ملت کا درد رکھتے ہوں ـــ یہ ہے ـــ "انقلاب قیادت" ـــ کی وہ شریفانہ تدبیر مؤثر حربہ اور کارگر طریقہ کہ جس کے بعد پاکستان کے افق پر ایک نئی صبح طلوع ہوگی، وہ صبح جس کے لئے برسوں سے عوام کی نگاہیں منتظر ہیں!

انتخابات کا زمانہ قریب تر آ رہا ہے۔ چھ مہینہ کا وقفہ ہی کیا ہوتا ہے، کام بہت بڑا ہے، وقت کم ہے، اور مقابلہ ان لوگوں سے ہے جو ناجائز ہتھکنڈوں کے ذریعہ کروڑوں روپیہ الیکشن میں خرچ کرنے کے لئے جمع کئے بیٹھے ہیں اور جن کو اپنی عدم مقبولیت اور غیر ہر دلعزیزی کے باوجود اپنی اکٹھی کی ہوئی دولت پر ناز ہے۔ بلکہ اعتماد و اطمینان ہے کہ جس "فولاد" پر بھی "زر" رکھ دیں گے وہ نرم ہو کر رہے گا۔ روپے میں بڑی طاقت ہے۔ دولت نے بڑے بڑے میدان مارے ہیں۔ اور بڑے معرکے سر کئے ہیں۔ اور صرف دولت ہی نہیں ان کے ساتھ دوسرے قسم کے لالچ، دھونس، دھوکے اور سیاسی

شعبدہ بازیاں بھی ہیں!

پاکستان کی پبلک زیادہ صاحب شعور نہیں ہے۔ وہ بہت بھولی اور سیدھی سادی ہے۔ انتخابات کے زمانے میں ناپسندیدہ لوگ، عوام کے دردمندوں اور بہی خواہوں کے بھیس میں رونما ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی "خدمات" کا جھوٹا پروپیگنڈہ کرتے ہیں اور پبلک کو طرح طرح سے یقین دلاتے ہیں کہ پبلک کے ووٹوں کے ذریعہ اگر وہ انتخاب میں کامیاب ہوگئے، تو عوام کے بس دلدر ہی دور ہو جائیں گے۔ اور ملک کی قسمت جاگ اٹھے گی۔!

عوام کو اس فریب سے بچانے کے لئے اس کی ضرورت ہے کہ ہزاروں لکھے پڑھے لوگ اور خاص طور سے تعلیم یافتہ نوجوان اٹھ کھڑے ہوں، اور نہ عوام کو بتائیں کہ ان امیدواروں میں کون کیا ہے؟ ضرورت ہے کہ ایک ایک امیدوار کے چہرے کو بے نقاب کرنے اور ہر غلط کار کی زندگی کو منظر عام پہ لانے کی!

سب سے پہلے عوام کے دل میں یہ بات اتار دی جائے کہ تمہارے "ووٹ" سے ملک کی قسمت وابستہ ہے۔ تمہارا ووٹ ملک کو بگاڑ بھی سکتا ہے اور بنا بھی سکتا ہے۔ اگر تمہیں اپنے ملک سے، قوم سے، اور دین سے ہمدردی اور لگاؤ ہے تو اپنے "ووٹ" کو قوم کی امانت سمجھ کر اس کا صحیح استعمال کرو۔!

الیکشن میں "ووٹ" لینے کے لئے ہر پارٹی اور جماعت تمہارے پاس آئے گی، اور اپنی شان میں قصیدہ خوانی کرے گی تم افراد کی طرح پارٹیوں اور جماعتوں میں بھی صحیح اور غلط، اچھے اور برے اور صالح و غیر صالح کی تمیز کرو۔ سب سے پہلے یہ دیکھو کہ کس پارٹی اور جماعت کا پاکستان میں کیا رول رہا ہے؟ کس نے اپنے مؤقف کو بدلا ہے۔ اور کون اپنے موقف پر جمی رہی ہے، کس نے قوم کی کیا خدمت انجام دی ہے؟ کس کے کارکن عہدوں کے بھوکے ہیں اور کرسیوں پر جان دیتے ہیں۔ اور کس کے ارکان عہدے، و منصب کی ایک ادنیٰ خواہش بھی اپنے اندر نہیں رکھتے؟ کس امیدوار کی عام زندگی کیا ہے؟ دینیات، وہ کس درجہ شغف رکھتا ہے؟ عام لوگوں کے ساتھ اس کی معاملت کیسی ہے؟

عوام کو بتلانے کی ضرورت ہے کہ جو لوگ اپنی پارٹیوں میں عہدوں اور کرسیوں کے لئے جوڑ توڑ سے کام لیتے ہوں وہ حکومت و اقتدار کی کرسی کے لئے جو بھاگ دوڑ کر رہے ہیں، ان میں اخلاص کہاں ہو سکتا ہے۔

کراچی میں اس کا تجربہ ہو چکا ہے کہ عوام کے شعور کو بیدار کیا گیا۔ انھیں احساس دلایا گیا تو مقابل طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کے باوجود جماعت اسلامی کو کارپوریشن کے انتخاب میں توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی۔ جن حلقہ ہائے انتخاب سے جماعت نے اپنے امیدوار کھڑے نہیں کئے، ان حلقوں کے باشندوں کو شکایت اور افسوس ہے کہ ہم اس سعادت سے محروم رہے!

شکست و فتح اور کامیابی اور ناکامی تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ مگر ظاہری اسباب کے اعتبار سے ہر جائز تدبیر انتخابات میں استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے ہر سعی اور جدوجہد کو حد کمال تک پہنچانا چاہیے۔

جو لوگ جماعت اسلامی کے مقصد سے متفق ہیں اور اس پر اطمینان رکھتے ہیں، ان کو اپنے وقت کی، مال و دولت کی، جسم و توانائی کی، قربانی دینے کی ضرورت ہے۔ تماشائی بن کر بیٹھے رہنے سے کام نہ چلے گا۔ میدان عمل میں آنے کا وقت آچکا ہے۔ حق و باطل کے معرکے میں آج حقیقت "بہت بڑا کارنامہ انجام دینا ہے ـــــــــ ! مقصود اللہ تعالیٰ کے دین کو

غالب کرنا ہے، "ووٹ" کے ذریعہ جب یہ مقصد پورا ہوتا ہو تو یہ بھی ایک طرح کا "جہاد فی سبیل اللہ" ہی ہے، اور اس راستہ میں جو قدم غبار آلود ہوں گے ان کو اللہ تعالیٰ کے یہاں اجر ملے گا۔ دوسرے کیلئے یہ الیکشن "سیاست بازی ہے"۔ مگر جماعت اسلامی نے "اقامت دین" کی خاطر یہ "طریق کار" اختیار کیا ہے۔ اس لئے یہ دین ہی کا کام ہے! قرآن نے ہمیں تعلیم دی ہے کہ اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لئے جس سر و سامان اور طاقت و توانائی کی ضرورت ہو اس سے دریغ نہ کرنا چاہئے۔! الیکشن واقعی سیاست بازوں کے ہاتھ میں پڑ کر ایک گندہ کام بن گیا تھا۔ اسلام پسند اس کی تطہیر کر کے دکھا دینگے کہ مقصد پاکیزہ ہو تو طریق کار بھی پاک مطہر بن جاتا ہے۔ تاریخ و سیر شاہد ہیں کہ اللہ کے نیک بندوں نے دنیا کو پوری طرح برتا ہے، مگر ان کے دامن آلائش سے پاک رہے ہیں۔

اگر پاکستان کے عوام نے انتخاب اور ووٹ کی اہمیت کو محسوس کیا، اور ان کے دلوں میں یہ بات اتر گئی کہ وہ آزمائی ہوئی پارٹیوں اور ناپسندیدہ افراد کو اپنے ووٹ کسی قیمت پر نہ دیں گے، تو پھر پاکستان کے دن پھرنے میں، انشاء اللہ زیادہ دیر نہ لگے گی تاریخ پھر ایک نیا ورق الٹے گی۔ اور یہاں کے زمین و آسمان ہی بدلے ہوئے نظر آئینگے جیسے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں روشنی نمودار ہو جائے، اور بنجر زمین میں سبزہ اگ آئے یا یوں سمجھئے کہ خزاں بہار سے بدل جائے!

یہ انقلاب "قیادت" صرف چند "سروں" اور "چہروں" کا انقلاب نہ ہوگا، بلکہ یہ فکر و نظر اور عمل و کردار کا انقلاب ہوگا، اللہ کی کتاب اور رسول اللہ کی سنت سے اب تک جو گریز کیا جاتا رہا ہے، وہی کتاب و سنت "پاکستان کی سیاست و تجارت، تعلیم و تربیت، قانون و دستور اور معاشرے پر غالب ہوگی، ہر طرف نیکی کا چلن، امن و اطمینان کا دور دورہ!

کہا جاتا ہے کہ پاکستان کی قیادت پر اسلام پسند عناصر کا پوری طرح غلبہ تیسرے انتخابات میں جاکر ہوگا مگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہو اور ملک کے عوام بیداری کا ثبوت دیں تو اس اندازے کی مدت کم بھی ہو سکتی ہے بہر حال اس انتخاب میں اسلام پسندوں کی جتنی زیادہ سے زیادہ تعداد کامیاب ہوگی، اسی تناسب سے ملک کے حالات کی اصلاح ہو سکے گی، ان کے اخلاق و کردار کا حکومت کے ایوانوں میں خاصہ وزن محسوس کیا جائے گا، اور مفاد پرستوں اور اغراض کے بندوں کی دراز دستیوں کو کھلی چھٹی نہ مل سکے گی، اصول و اخلاق کی قوت بہت بڑی قوت ہے۔ چاہے وہ دیکھنے میں قلیل ہی نظر آئے۔ بگڑے ہوئے آدمیوں کی ٹولی میں چند اصلاح پسند اور شریف آدمیوں کے آجانے سے تخریب و فساد بڑی کنٹرول تو ہو جاتا ہے۔ ہندوستان کو آزادی برسوں کی جد وجہد کے بعد ملی ہے، عوام اپنے اصول پر جمے رہے اور آزادی کے لئے مسلسل کام ہوتا رہا، یہاں تک کہ انگریز کی جابرانہ شہنشاہی کو گھٹنے ٹیک کر آخر ہتھیار ڈال دینے پڑے۔ دنیا میں کوئی قربانی ضائع نہیں جاتی اور ہر جد و جہد بالآخر سود مند ہوتی۔ کوئی نتیجہ نکل کر رہتا ہے!

پاکستان کے عوام اپنی اخلاقی کمزوریوں کے باوجود اسلام سے محبت رکھتے ہیں، ان کی دلی تمنا یہی ہے کہ پاکستان میں اسلام قائم ہو، عوام کے اسی اسلامی جذبہ کو تربیت دے کر اس سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ اور یہ "کام لینا" کسی فرد کے شخصی مفاد یا کسی جماعت کی تنہا سر بلندی کے لئے نہیں ہے بلکہ اللہ کے دین کو غالب کرنا اس کا مقصود و منتہا ہے۔

مفاد پرست اور غلط کار لوگ جاگیرداروں، زمینداروں، کارخانہ داروں اور سرمایہ داروں ہی کو نہیں، جبوں، عماموں اور تسبیحوں کو بھی اپنے مقصد کے حصول کے لئے استعمال کریں گے۔ "قال اللہ" اور "قال الرسول" سے بھی اللہ کے کلمہ کو پست

کرنے کا کام کیا جائے گا، عوام کو بہت کچھ چوکنے اور ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے، عوام نے دام ہمرنگ زمین کو پہچان لیا اور شکاری بہروپیوں سے وہ بچے رہے ـــــ تو کیا عجب ہے کہ اس پہلے ہی معرکہ میں پانسہ پلٹ جائے۔

سے کہ ہم نے انقلاب دورِ گردوں یوں بھی دیکھے ہیں۔

ماہر القادری ۲۰ مئی ۵۸ء

ترجمہ:۔ عبدالمجید اصلاحی

اسلام میں عائلی نظام کی روحانی بنیادیں

[شیخ مصطفےٰ احمد زرقا کے ایک مضمون بعنوان "الأسس الروحیۃ فی الاسلام ضمن نطاق الأسرۃ" کا ترجمہ مجلۃ المسلمون قاہرہ]

حیات انسانی کا کوکبۂ عظمت وجلال اس وقت تک پوری آب وتاب کے ساتھ دمک نہیں سکتا جب تک کہ اس کے اندر مادی اور روحانی دونوں نوعیتوں کا معتدل امتزاج پیدا نہ کیا جائے۔ انسان اگر سر سے پیر تک صرف مادیت کے سمندر میں غوطہ زن رہے تو اس کا مطلب ہے کہ معاشرۂ انسانی کے لئے روح فرسا تباہی کے مناظر مقدر ہیں، اسی طرح اگر اس کے ذہن ودماغ اور قلب ونظر پر صرف روحانی قدروں ہی کا استیلاء و غلبہ ہو تو اجتماعی ومعاشرتی تعمیر و ترقی کا سدِ باب یقینی ہے۔ الہٰی افکار وعقائد اور ارشادات وتعلیمات مذکورہ بالا اصول ہی پر مبنی ہیں۔ اس معنی کی تائید میں قرآن پاک کا ارشاد گرامی ملاحظہ ہو:

وابتغ فیما آتاک اللہ الدار الآخرۃ ولا تنس نصیبک من الدنیا واحسن کما احسن اللہ الیک ولا تبغ الفساد فی الارض ان اللہ لا یحب المفسدین ۲۸/۷۷

(جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تمہیں دے رکھا ہے اس کے اندر آخرت کا گھر تلاش کرو اور دنیا سے اپنے حصہ کو فراموش نہ کرو اور جیسا کہ اللہ نے تمہارے ساتھ بھلائی کی ہے تم بھی بھلائی کرو۔ اور زمین میں فساد کے خواہاں نہ رہو۔ اللہ کے نزدیک مفسدین پسندیدہ نہیں ہیں۔)

ایک حدیث بھی ہے جس کی سند اگرچہ روایت کے اعتبار سے کمزور ہے، لیکن بعض قرآنی اور شریعت کے اصول اس کے معنی و مفہوم کے حق میں ہیں

دنیا کے لئے ایسے کارکن ہو جو حیات سرمدی کی امید رکھتا ہو اور آخرت کے لئے اس شخص کی طرح کام کرو جو ڈر نہ ہو کر کل ہی مر جائے گا۔

اسلام میں روحانیت کے تین ستون ہیں

(۱) خالق کائنات، اس کی وحدانیت، اس کے رسولوں پر اعتقاد، آخرت کی جزاء وسزا اور دوسری ابدی زندگی پر کامل یقین۔

(۲) عبادت جو روحانیت کے ساتھ انسان کے دائمی تعلق کی ضمانت دار ہے۔ انسان کو مستقل طور پر خالق اور عاقبت کے بارے میں تذکیر کرتی رہتی ہے کہ مبادا اللہ سے اہمال وغفلت کا سلسلہ دراز نہ ہو اور ان جالستان خیالات، فاسد اوہام و وساوس اور تباہ کن محرکات کا یک قلم خاتمہ ہو جو غفلت کی پیداوار ہوتے ہیں۔

(۳) اخلاص۔ آدمی خواہ مزدور ہو یا مالک، امیر ہو یا مامور روحانی یا مادی دونوں پہلوؤں کے اندر اس طرح پر کامل جذبہ کے ساتھ کام کرے کہ اس کی سعی وکاوش اور تگ وتاز کا مقصود فرض کی ادائیگی ہو۔ نفس کا پورا پورا احتساب کرتے ہوئے خود غرضی اور مفاد خویش کے جذبات سے یکسر پاک ہو کر صرف حق کے لئے اس فرض کو پورا کرے جس پر زندگی کی اصلاح

تعمیر کا تمام تر دار و مدار ہے۔ اسے تقویٰ کہتے ہیں
بنا بریں جس طرح اجتماعی زندگی کی صحت و تعمیر کے لئے اسلام عائلی اصلاح کا فریضہ عائد کرتا ہے۔ اسی طرح وہ روحانی اعتبار سے فرد کی اصلاح بھی واجب قرار دیتا ہے۔ کیونکہ اصلاح فرد عائلی نظام زندگی کی اصلاح و تعمیر کا بنیادی پتھر ہے۔
اس حقیقت کو پیش نظر رکھئے اور پھر دیکھئے کہ انسانی خاندان کو اسلام کی روحانی تعلیمات کس طرح ہر طرف سے گھیرے ہوئی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خاندان کی ابتدائے آفرینش سے لے کر بقیہ سارے ... روایات تک، اس کی تعلیمات کا دائرہ پھیلا ہوا ہے۔

عائلی مراحل اور اسلامی تعلیمات

رفیقۂ حیات کا انتخاب خاندان کی بالفعل تشکیل سے پہلے ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی تعلیمات ہم عورت کے لئے ایک ایسا موقف متعین کرتی ہیں جو آگے چل کر روحانی اعتبار سے خاندان کی تشکیل و قیام میں ایک اہم پارٹ ادا کرتا ہے۔ یعنی رفیقۂ حیات کا انتخاب جو اسلام کی نظر میں عائلی زندگی، یہ مستقبل کے لئے ایک وہ اوّل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر خشت اوّل ہی ٹھوس، پائدار اور محکم نہ ہوگی تو تا ثریا می رود دیوار کج کے بمصداق عمارت ناپائیدار ہوگی۔ جسے ہوا کا ایک معمولی سا تھپیڑا بھی بڑی آسانی سے سرنگوں کر سکتا ہے۔ اسی لئے اسلام نے اندھی خواہش اور خالص مادی معیارات سے الگ رہنے کی تعلیم دے کر صالح رفیقۂ حیات کا انتخاب کرنے کے لئے ایک روحانی معیار بخشا ہے۔ کیونکہ مادی معیار (مال و دولت) اور عارضی عوامل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دوسرے یہ ناقص اور نا تمام عوامل ہیں جن پر اگر خاندان کی بنا رکھی جائے تو چند ہی دنوں میں جہنم کا تماشہ دیکھنا پڑے گا
بیوی کے انتخاب کے لئے اسلام نے روحانی معیار کے ضمن میں جو کچھ کہا ہے اسے ملاحظہ فرمائیے:۔
(۱) قرآن نے ازدواجی زندگی کے فیوض و برکات کی تصویر کشی کی ہے جس سے حسن انتخاب کا معیار سمجھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ قرآن عزیز نے ربانی کرشموں کو بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

ومن آیاتہ أن خلق لکم من أنفسکم أزواجا لتسکنوا إلیہا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ
(اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے خود تمہارے اندر سے تمہارے تسکین کی خاطر بیویاں پیدا کیں اور تمہارے اندر رافت و رحمت کی طرح ڈالی)

آیت مذکورہ سے معلوم ہوا کہ انتخاب شوہر اور انتخاب زوجہ کے لئے شخصی فضائل و محامد کو معیار بنایا جائے جو انسانی اقدار اور کریمانہ اخلاق و عادات کے آئینہ دار ہوں تاکہ طرفین کے مابین پیدا ہونے والے تعلقات ایسی طاہر و پاکیزہ زندگی وجود میں لائیں جو خاندان کی فضائے خوشگوار میں روحانی مظاہر کے جلوے بکھیر دیں۔
(ب) قرآن کے پہلو بہ پہلو رسول گرامی کا ارشاد بھی آیا ہے جو طریق انتخاب کو اور زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش کرتا ہے چنانچہ مردوں کے لئے بیوی کے انتخاب کا طریقہ بتاتے ہوئے آپ نے فرمایا ہے:۔
مسئلہ ... کا ہیں بلکہ ترغیب کا ہے۔ وہ عورت جو دینی اعتبار سے ممتاز نہ ہوگی اسے بھی شوہر ملے گا۔ وہ شوہر ... پر یہ فریضہ عائد ہوگا کہ وہ اپنی بیوی کے اندر دینی اور روحانی اوصاف کی کمی کو پورا کرنے کی جدوجہد کرے۔ لیکن معقول اور صحیح طریقہ یہی ہے کہ انسان انتخاب کے وقت صلح ترکو پیش نظر رکھے۔ یہ

طریقہ زیادہ موزوں اور باہم دگر موافقت کے اعتبار سے زیادہ انسب ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ نے اپنی مسند کے اندر جلیل القدر صحابی حضرت سعد بن وقاصؓ سے ایک روایت نقل کی ہے جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو ایک دلنشین انداز میں رہنمائی فرما رہے ہیں۔

"ابن آدم کی نیک بختی کے لئے تین چیزیں ہیں اور اسی طرح اس کی بدبختی کے لئے بھی تین چیزیں ہیں۔ ابن آدم کی نیک بختی کے لئے صالح رفیقۂ حیات، مناسب رہائش گاہ، اور موزوں سواری ہے، اور ابن آدم کی بدبختی کے لئے غیر صالح بیوی، نامناسب جائے سکونت اور غیر موزوں سواری ہے۔"

یہ ہے انتخاب بیوی کا روحانی طریقہ جو اساسی اور معیاری اعتبار سے دینی اور اخلاقی قدروں کا پوری طرح حامل ہے۔

یہاں تک تو ایجابی پہلو رہا۔ اس کا سلبی پہلو بھی ہے۔ چنانچہ اسلام نے مردوں کو ان عورتوں کے انتخاب سے ہوشیار رہنے کی تعلیم دی، جو بظاہر حسن و جمال میں یکتائے روزگار تسلیم کی جاتی ہوں۔ لیکن اصلیت کے اعتبار سے فاسد ہوں چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:۔

"گھورے کی شادابی سے بچو۔"

پوچھا گیا گھورے کی شادابی کیا چیز ہے؟ فرمایا:۔

"بری نسل کی خوبصورت عورت"

"گھورا" جس لفظ کا ترجمہ کیا گیا ہے وہ "دِمَن" ہے۔ دِمنۃ عربی زبان میں اس قطعہ زمین کو کہتے ہیں جہاں کوڑا کرکٹ اور آلائشوں کا ڈھیر ہو۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فاسد الاصل خوبصورت عورت کی تشبیہ اس سرسبز و شاداب پودے سے دی ہے جس کے نیچے مزبلہ ہو۔ جس طرح یہ سرسبز پودا چراگاہ کے لئے موزوں نہیں اسی طرح یہ بھی موزوں نہیں کہ ازدواجی زندگی کی بنیاد کے لئے فاسد الاصل خوبرو عورت کو منتخب کیا جائے۔

اس دینی معیار اور روحانی رہنمائی کے تحت اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ مرد شادی کے وقت صالح رفیقۂ حیات کا انتخاب عمل میں لائے، تاکہ اس کی ازدواجی زندگی کا مستقبل روح فرسا اضطرابات اور گوناگوں مشکلات کا شکار نہ ہو۔

جس طرح اسلام نے انتخاب زوجہ کے موقع پر مرد کو اس قسم کی روحانی ہدایت کی ہے اسی طرح عورت کو بھی انتخاب شوہر کے وقت تاکید کی ہے چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا صاف صاف اعلان ہے:۔

"جب تمہارے پاس ایسا شخص آئے جس کے دین و اخلاق سے تم مطمئن ہو تب تو شادی کر دو ورنہ زمین میں فتنہ اور ہمہ گیر فساد کے علاوہ اور کچھ نہ ہوگا۔" [۵۱]

حدیث مذکور اور اس کے علاوہ اور دوسری احادیث میں آپ نے [illegible] رسوم و رواج سے منع فرمایا ہے لوگوں کی عام عادت ہے کہ وہ اپنی صاحبزادیوں کے لئے مردوں کی صالحیت و نیکوکاری کے بجائے دولت و ثروت یا منصب تلاش کرتے ہیں۔ دولتمند یا عہدہ دار خواہ کتنا بڑا ملحد اور دین و اخلاق سے بیگانہ کیوں نہ ہو۔ بہرحال انتظار اسی کا رہتا ہے تاکہ اس سے اپنی بیٹی بیاہ کر ہر طرف سے مرحبا اور مبارکبادی کے پیغامات وصول کئے جائیں [illegible] شہرت اور نام و نمود کے دلدادہ ہوتے ہیں

[۵۱] سند ضعیف ہے لیکن مفہوم اصول شریعت کے مطابق ہے۔

دینداری، اخلاق، شرافت، تقویٰ اور نیکو کاری کو ہیچ تصور کرتے ہیں۔

قرآن کریم کا ارشاد ہے:۔

ولعبد مومن خیر من مشرک ولو اعجبکم

(ایک مومن غلام حتماً ایک مشرک سے خواہ کتنا دلکش کیوں نہ ہو بہتر ہے)

دوسرا مرحلہ۔ ازدواجی زندگی انتخاب شوہر یا انتخاب بیوی کے بعد دوسرا مرحلہ آتا ہے جو روحانی انتخاب کی تنفیذ کا مرحلہ ہے۔ اس مرحلہ میں قرآن عزیز نے ازدواجی زندگی کے مقصد اور اس کی امتیازی خصوصیات کی تعین کی ہے۔ وہ آیت کریمہ دوبارہ تلاوت کیجئے جو اس سے قبل پیش کی جا چکی ہے۔

وَمِنْ اٰیٰتِہٖ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْا اِلَیْہَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

"تم میں سے ہر کسی کو اس لقمہ پر بھی اجر و ثواب ملے گا جو وہ اپنی بیوی کے منہ میں ڈالتا ہے۔"

اطمینان و سکون، محبت و مؤانست، تقویٰ و نیکو کاری نیز زندگی کو راہِ حق کی طرف موڑنے اور ایک مومن، اطاعت کیش اور صالح خاندان کی تشکیل کے لئے طرفین کا باہمی تعاون اور اشتراکِ عمل، اسلام کی نگاہ میں یہ وہ امتیازی فضائل، و محامد ہیں جو صالح اور کامیاب ازدواجی زندگی کے جلی عنوانات ہیں۔

چنانچہ مرد و عورت کی باہمی رفاقت، میں یہی وہ روحانی کردار ہیں جس کے لئے اسلام معصیت الٰہی کے علاوہ اور کاموں میں عورت کو مرد کے زیر اطاعت رکھا ہے۔ چونکہ اسلام کا یہ طے شدہ اصول ہے کہ "لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق" معصیت خالق کے کاموں میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں اس لئے اس کے بموجب عورت کو معصیت الٰہی کے کاموں میں شوہر کی اطاعت سے روک دیا گیا۔

نیز یہی وہ روحانی مصالح ہیں جن کے پیش نظر اسلام شوہر کو حکم دیتا ہے کہ وہ اپنے خاندان (Family) کو عبادت الٰہی کا پابند بنائے۔ کسب معیشت کے معاملہ میں حد درجہ انہماک اس عبادت سے غفلت و اہمال کا موجب نہ بنے۔ اسلام نے اطاعت الٰہی، حسن، نیت اور اخلاص عمل کی طرف متوجہ کرتے ہوئے وعدہ کیا ہے کہ بندگیٔ رب ہی انسان کے معاشی مصالح اور تحصیل رزق کی تنہا کفیل ہے۔ اس طرح انسان کے اندر اعتماد و توکل اور قناعت کی فضائے خوشگوار پیدا ہوتی ہے جو حصول رزق کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ قرآن کا فرمودہ پاک ہے۔

وَاْمُرْ اَھْلَکَ بِالصَّلٰوۃِ وَاصْطَبِرْ عَلَیْھَا لَا نَسْئَلُکَ رِزْقًا نَحْنُ نَرْزُقُکَ وَالْعَاقِبَۃُ لِلتَّقْوٰی

(اپنے لوگوں کو نماز کا حکم کرو۔ اس پر جمے رہو ہم تم سے کسی رزق کا مطالبہ نہیں کرتے، رزق تو ہم خود دیتے ہیں۔ انجام کار تقویٰ کا ہے)

عائلی زندگی کے اس مرحلہ میں اسلام عورت کی ذمہ داریوں کی وضاحت بھی کرتا ہے۔ چنانچہ وہ ایک ذمہ دار کی حیثیت سے اس کے کندھوں پر مسئولیت اور جوابدہی کا بار بھی ڈالتا ہے۔ گھر کے داخلی امور کی سربراہ کاری اسی کو تفویض کی گئی ہے ان امور کے اندر اس سے بھی باز پرس اسی طرح ہوگی جس طرح امراء اور والیانِ ریاست سے ہوگی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:۔

ہر شخص راعی ہے اور رعیت کے باب میں جوابدہ ہے۔ ....

...... اور عورت اپنے شوہر کے گھر کی ذمہ دار ہے اور ذمہ داری کے تحت امور و معاملات کی مسئول ہے۔"

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اور دوسری احادیث کے اندر واضح فرمایا ہے کہ اپنے اہل وعیال کی معاش کیلئے آدمی کی تگ و تاز جہاد فی سبیل اللہ کا مرتبہ رکھتی ہے۔ اسی طرح زوجین میں باہمی الفت اور کامل یکسانیت کے لئے آپ کی نرم مزاجی، نرم خوئی، شفقت اور ملاطفت بھی اجر و ثواب کے اعتبار سے عبادت کے مرتبہ میں ہے۔ جب تک طرفین میں روحانی فکر و عمل کی مشترک خصوصیت پائی جائے گی، حلال کو حلال، حرام کو حرام تصور کیا جائے گا۔ حدود الٰہی کا پاس و ادب اور لحاظ و احترام ہوگا اس وقت تک ان کے شخصی حظائظ کا شمار بھی عبادت ہی میں ہوگا۔

اولاد کی پرورش و پرداخت

بعد ازاں اولاد کی تعلیم و تربیت کا مرحلہ آتا ہے۔ اولاد ازدواجی زندگی کے پھل ہوتے ہیں۔ چونکہ خاندان ہی افراد کے لئے اوّلین درسگاہ کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے شریعت اسلامی نے اولاد کے ضمن میں مرد و عورت پر دو فریضے عائد کئے ہیں۔

اوّلاً اولاد کو دینی رخ پر لگانا، عہد طفولیت ہی سے انھیں بندگی رب کا پابند بنانا۔ ان کے دلوں میں عقیدۂ الٰہی کو راسخ کرانا تاکہ بڑے ہوں تو ایمان و عقیدہ اور یوم آخرت کے احساس سے ان کا پیمانۂ قلب و نظر لبریز رہے۔ اسی طرح قانون شریعت والدین کو اس بات کا بھی مکلف ٹھہراتا ہے کہ وہ اپنی اولاد کو سن و شعور کے اعتبار سے شرعی آداب و اصول کا پابند بنائیں۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:۔

"جب تمہارے بچے ساتویں سال کی عمر میں داخل ہوں تو انھیں نماز کا حکم دو۔ اور دسویں سال میں قدم رکھیں تو نماز نہ پڑھنے پر ان کی سرزنش کرو۔ اور انھیں ایک جگہ نہ سونے دو۔"

مقصد یہ ہے کہ بچہ سن بلوغ سے پیشتر ہی آداب روحانی کی مشق بہم پہنچالے تاکہ بڑے ہو کر یہ پابندیاں اس پر شاق نہ گزریں۔ ثانیاً بچوں کو دینی عقیدہ، عبادات، خاص و عام فرائض و واجبات کی تعلیم دینا۔ یہ ایسی چیزیں ہیں جن کی بڑے ہو کر بچوں کو ضرورت پیش آئے گی۔ الغرض والدین پر رسول اللہ کے اس قول سے

"حصولِ علم ہر مسلمان پر فرض ہے" کے بموجب بچوں کی دینی تعلیم فرض ہے۔

یہ بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لینے کی ضرورت ہے کہ ہر فریضہ کی ادائیگی مکمل طور پر اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ حکومت کا دستِ تعاون دراز نہ ہو، چنانچہ حکومت پر بھی فرض ہے کہ وہ تعلیم و تربیت کے لئے مناسب ظروف و حالات اور اسباب و وسائل پیدا کرے۔ خصوصاً نوخیز نسل کے لئے تو دینی تعلیم بے حد ضروری ہے۔ کیونکہ دینی تعلیم و تربیت کا مکمل طور پر اہتمام کر لینا تنہا انفرادی کوششوں کے بس میں نہیں ہے۔ اس لئے شدت سے اس بات کی ضرورت ہے کہ منجملہ اور علوم و فنون کے دینی تعلیم بھی حکومت کے تعلیمی منصوبوں کا ایک جزو ہو، تاکہ عام تعلیم کا رجحان روحانی قدروں ہی کے زیر اثر رہے۔ کیونکہ علم اگر مجرد ہوگا تو اس کی مثال دو دھاری تلوار کی سی ہوگی، جس کے ایک پہلو میں اگر فائدہ ہوگا تو دوسرے پہلو سے نقصان بھی ہوگا۔ ایسی صورت میں علم انسان کے استعمارانہ عزائم اور اور خود غرضانہ مصالح کیلئے آلۂ کار ثابت ہوگا۔ اور فطرت کا یہ بچہ مادیت استکبار اور مفاد خویش کا بھوت بن کر رہ جائے گا۔ انسان جب بھی شاہراہ حق و عدالت سے منحرف ہوگا، مجرد اپنے علم و خرد کی بدولت ایک درندہ یا عفریت تو بن سکتا ہے لیکن ایک

انسان نہیں بن سکتا۔

اس مرحلہ میں اولاد پر بھی والدین کے ساتھ حسنِ سلوک، اور ان کے حقوق و مراتب کے آداب و احترام کا فریضہ عائد ہوتا ہے۔ میری نگاہ میں عائلی زندگی کا یہ سب سے اہم روحانی گوشہ ہے۔ والدین پر اس کی طرف سے جو فرائض عائد ہوئے ہیں ان کے مقابلہ میں اولاد کا فریضہ بھی دینی اور ادبی فرض کی حیثیت سے تصور کیا جائے گا۔ قرآن کا صاف صاف اعلان ہے :۔

"ووصینا الانسان بوالدیہ احسانا" ۱۵/۱۰

(ہم نے انسان کو والدین کے ساتھ بھلائی کرنے کی نصیحت کی ہے)

"قرآن نے اس کا رتبہ عبادت الٰہی کے بعد ہی رکھا ہے"

مسلمان بیٹے پر اسلام کی طرف سے عائد کیا ہوا یہ فرض ہے خواہ والدین مسلمان ہوں یا اسلام سے اعتقادی اختلاف رکھتے ہوں۔

"وصاحبھما فی الدنیا معروفا"

(اور ان دونوں کے ساتھ دنیا کی زندگی میں بھلے طور پر رہو)

۳۔ طلاق کا مرحلہ

ازدواجی زندگی کا تسلسل کسی بھی علت کے تحت بسا دشوار بھی ہو جاتا ہے۔ اور پیدا شدہ حالات میاں بیوی کو علٰحدگی پر مجبور کر دیتے ہیں۔ قرآن نے اس بارے میں ایک نہایت عمدہ اصول بخشا ہے جس کو تعلق کے باقی رکھنے یا ختم کر دینے میں ہمہ وقت ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

"فامساک بمعروف او تسریح باحسان"

(پس دستور کے مطابق روک لینا ہے یا پھر عمدہ طور پر رخصت کر دینا ہے)

"ولا تمسکوھن ضرارا لتعتدوا ومن یفعل ذالک فقد ظلم نفسہ"

(اور انھیں نقصان پہنچا کر ظلم کرنے کے لئے نہ روکو، جو شخص ایسا کرے گا اس کے معنی ہیں کہ وہ خود اپنا ظالم ہے)

علاوہ بریں طلاق کے رجحان کے وقت بھی اسلام نے طلاق سے باز رہنے کی روحانی ہدایت فرمائی ہے تاکہ اس کی نوبت اسی وقت آئے جبکہ اصلاح کی طرف سے مطلقاً مایوسی نظر آجائے۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔

"نکاح سے زیادہ محبوب اور طلاق سے زیادہ مبغوض اور کوئی چیز اللہ تعالیٰ نے حلال نہیں کی ہے"

قرآن نے ایک خصوصی انداز میں مردوں کو نصیحت کی ہے کہ وہ کسی معمولی سبب کے تحت علیحدگی کے فیصلہ میں جلدی نہ کریں، اپنی عورتوں کو جس قدر انگیز کر سکتے ہیں انگیز کریں اور اس محبت کو فراموش نہ کریں جو ازدواجی زندگی کی بدولت طرفین میں پیدا ہو گئی تھی۔

"ولا تنسوا الفضل بینکم"

اس مثالی طریقہ کو اختیار کرنے پر قرآن نے حسن انجام کی بشارت بھی دی ہے۔

---

۱۵ سند ضعیف ہے لیکن مفہوم اصول شریعت کے مطابق ہے۔

"وعاشروھن بالمعروف، فان کرھتموھن فعسیٰ ان تکرھوا شیئاً ویجعل اللہ فیہ خیراً کثیراً"

"ان کے ساتھ معروف طریقے پر زندگی بسر کرو۔ پس اگر انھیں بار خاطر تصور کرو تو ہو سکتا ہے کہ کوئی چیز تم بار خاطر تصور کرو اور اس میں اللہ تعالیٰ نے بہت زیادہ بھلائیاں رکھ چھوڑی ہیں۔"

اسلام میں عائلی نظام زندگی کی روحانی قدروں کے باب میں یہ ایک اجمالی خاکہ ہے۔ جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اسلام نے خاندان کے ضمن میں کس قدر قصد و اہتمام سے کام لیا ہے۔ ابتداء سے لے کر انتہا تک اس کے اہتمام کا دائرہ پھیلا ہوا ہے کیونکہ خاندان ہی بہ روحانی بنیاد جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے تکوین فرد اور تعمیر معاشرہ کی راہ میں روحانی افکار و مشاغل کا منبع و سرچشمہ ہے۔

——"کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا"!

میرِ کارواں —— جیالا معمار!

محمد خالد فاروقی

وہ اسی دلنواز مسکراہٹ کے ساتھ ملا۔ لیکن اس مسکراہٹ کے نیچے میری نگاہیں اس کے دکھ بھرے دل کو دیکھ رہی تھیں! اس کی آنکھوں میں وہی چمک تھی، لیکن مجھے ان میں غم کی اٹھتی ہوئی موجیں صاف نظر آ رہی تھیں! اس نے اپنی زندگی میں بے شمار صدمے اٹھائے تھے، اپنوں کی طرف سے —— غیروں کی طرف سے —— گالیوں سے لے کر جیل —— اور پھانسی تک کی چوٹیں اس نے اپنے دل پر کھائی تھیں! اور ان سب کو وہ مسکراہٹوں کے ساتھ سہتا گیا! اس کی کشادہ پیشانی پر ایک بل بھی نہ آیا۔!

وہ ایک بھرپور جوان تھا اور اس کے قافلہ کی جمعیت بھی بڑھی ہوئی تھی۔ سب کی نظریں منزل پر جمی ہوئی تھیں، سب دوش بدوش تھے۔ سب کے دل ملے ہوئے تھے۔ یہی باتیں تھیں جو اس کے قافلے کو دوسرے قافلوں سے ممتاز کرتی تھیں اس کی راہ میں کتنے ہی پیچ و خم آئے —— کتنی ہی دشوار گزار گھاٹیاں پڑیں —— کتنے ہی شب خون مارے گئے —— کتنے ہی غارت گروں نے متاعِ قافلہ لوٹنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کی جرأت، محبت، تدبر و حکمت سے قافلہ آگے ہی بڑھتا گیا —— منزل قریب سے قریب تر ہوتی گئی، مصائب و مشکلات کے طوفان مہیب و خوفناک ہوتے گئے —— پہاڑوں کی طرح موجیں اٹھنے لگیں —— آفتوں کے گھٹا ٹوپ اندھیرے، مشکلات کی موسلادھار بارش، اور رہ رہ کر چمکنے والی آشیاں سوز بجلیوں میں میرِ کارواں کا مسکراتا ہوا چہرہ، ایک جیوٹ اور دلیر پاکستانی کی طرح نظر آتا جو جہاز کے عرشہ پر کھڑا قافلہ والوں کے ڈوبتے ہوئے دلوں کا سہارا بن رہا ہو —— ! وہ جہاز کو خطرات کے سمندر سے باہر نکال لے گیا —— !

اب اس کا جہاز پرسکون پانی پر ایک دلکش و با رعب وقار کے ساتھ بہتا جا رہا تھا، لیکن اس کی دوررس نگاہیں اس پرسکون پانی کے پیچھے کروٹیں لیتے ہوئے طوفان کو دیکھ رہی تھیں! اس کو دور —— افق کے قریب —— سمندری چٹانوں سے گھرا ہوا علاقہ بھی دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے عزائم پہلے سے زیادہ مضبوط اور نظر عمیق تر اور فکر پختہ تر ہو چکی تھی، اس نے ایک بھرپور عزم کے ساتھ افق میں اٹھتے ہوئے سیاہ بادلوں کو دیکھا۔ ساتھ ہی اس کی نظر اپنی گھنی ڈاڑھی پر بھی پڑی۔ جس کو اس کی شبانہ روز کی انتھک محنتوں نے وقت سے پہلے سفید کر دیا تھا —— ! —— اور قریب تھا کہ وہ کسی مایوسی سے دوچار ہو جاتا۔ اگر اس کی نگاہیں اپنے دائیں بائیں ان جوان رفیقوں کو نہ دیکھ لیتیں جو اس کشتی کو کھینے میں اس کے ساتھ خون پسینہ ایک کر رہے تھے۔ پھر اس نے سوچا —— میں نے اس سفر کا آغاز ان کے بھروسہ پر تو نہیں کیا، میرا بھروسہ تو ہمیشہ سے اس پر رہا

جس مالک نے یہ کہا ہے کہ ——— جو لوگ ہماری راہ میں کوشش کرتے ہیں ہم انھیں راستہ دکھاتے ہیں، وہ دل ہی دل میں پکار اٹھا کہ یہ کمزور سہارے ہیں، کیا معلوم کون اس راہ میں تھک کر بیٹھ جائے! کون کسی اور کشتی میں سوار ہو جائے!! کون کسی گمراہی کے بھنور میں پھنس جائے!!! ——— وہ پکار اٹھا ——— "اے مالک! تو ہی میرا ناصر و مددگار ہے"! اس نے پھر ایک تازہ عزم کے ساتھ افق کے اس پار نظر ڈالی!

وہ ایک ایماندار مزدور کی طرح کام کرتا رہا۔ پسینہ میں شرابور ——— ! اس کو ایک نئی تعمیر کرنی تھی اس کو بتکدۂ دل کے اس جہان میں خدا کا گھر اٹھانا تھا! وہ ان یورشوں کا بھی مقابلہ کرتا رہا۔ جو اس کی تعمیر کو مٹانے کے لئے ہر طرف سے ہو رہی تھیں! وہ ایک بڑے ستون کی طرح پورے وقار کے ساتھ اس عظیم عمارت کو اپنے دوش پر لئے کھڑا تھا! دشمنوں کی یورشیں دن بہ دن شدید تر ہوتی جا رہی تھیں! اس کی ہمت جوان تھی ——— اس کا ارادہ ناقابلِ شکست تھا ——— لیکن اس کے پیروں کو طاقت کی ضرورت تھی اس کے بازوؤں کے لئے نیا خون درکار تھا! ——— اس کے کندھوں پر بوجھ بڑھتا جا رہا تھا اور وہ بوڑھا ہو رہا تھا! اس کی ہڈیاں چٹخ رہی تھیں! ——— اس نے اپنے گرد و پیش کے چھوٹے بڑے ستونوں پر نظر ڈالی۔ اس کے دل نے کہا۔

"اے خدا کوئی ہو جو میری جگہ ستون بن کر کھڑا ہو سکے اور اس مقدس گھر کا بار گراں سہار سکے" اس کی دور بیں نظروں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا، اس کی نگاہوں نے بعض چہروں کے اضطراب کے پیچھے دلوں کا اضطراب دیکھ لیا۔ چند لمحے نہیں گزرے کہ چند ستون یہ کہتے ہوئے گر پڑے۔ "یہ گھر خدا کی کبریائی کے لئے نہیں، بلکہ اس معمار نے اپنی عظمت کے لئے بنایا ہے"! وہ تڑپ اٹھا اور اس نے یہ کہتے ہوئے اپنے دکھتے ہوئے بازوؤں پر اور بوجھ سہار لیا۔

"اے مالک، تو فیصلے کے دن کا بھی مالک ہے"! ——— ایک اور گوشہ میں کچھ اور ستون یہ کہتے ہوئے گر پڑے ——— "اس گھر میں شر نے ڈیرہ ڈال دیا ہے"! ——— اس نے ایک اور چوٹ اپنے دل پر پوری مستقل مزاجی سے سہی! زیادہ دیر نہیں گذری، ایک اور بڑا ستون اپنی جگہ سے ہٹا اور اس نے پورے اخلاص اور نیک نیتی سے کہا ——— "میرے ساتھ کچھ ایسے ستون ہیں جن کو دیمک لگ گئی ہے۔ اس لئے میں ان کے ساتھ نہیں کھڑا رہ سکتا"! اس ستون کے ہٹتے ہی عمارت میں ایک ارتعاش سا پیدا ہوا۔ لیکن اس معمار نے ہمتوں کو بڑھانے والی ایک آواز کے سہارے اپنا پورا زور لگا دیا! وقت گذرتا گیا اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب ستونوں کے گرنے کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے ——— لیکن یہ کیا ———؟! اس کے ستون کے قریب ہی ایک بہت بڑا ستون اپنی جگہ سے یہ کہتا ہوا سرک گیا "مجھے اس عمارت کے طرزِ تعمیر اور ڈیول تعمیر سے اختلاف ہو گیا ہے"! عظیم عمارت لرز اٹھی اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ برسوں کی تراشی ہوئی یہ تعمیر جس کے گارے میں خون پسینہ ملایا گیا ہے، زمین پر آ رہے گی! بوڑھے معمار نے اپنے دل پر ایسی کاری چوٹ کبھی نہ کھائی تھی، اسے توقع نہ تھی کہ یہ ستون بھی اپنی جگہ سے ٹل جائے گا!! وہ پکار اٹھا "میرے مالک! مجھے صرف تیری ذات پر بھروسہ ہے میں نے اس گھر کی بنیاد صرف تیرے ہی بھروسہ پر رکھی تھی، اور تو ہی اس کی تکمیل کر سکتا ہے" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی کمر کو اور سیدھا کر لیا! لرزتی ہوئی عمارت اور لڑکھڑاتے ہوئے ستونوں کے قدم پھر جم گئے! وہ خدا کے اس گھر کا معمار عظیم عمارت کے بیچوں بیچ کھڑا تھا۔ اس کے جمے ہوئے قدم بنیاد کا پتھر معلوم ہو رہے تھے۔ جسم ایک فولادی ستون کی طرح سیدھا تھا! اس کے بازو بھی شہتیروں کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ بوجھ کی ہر مقدار کے ساتھ اس کے جسم میں ایک غیبی طاقت دوڑ جاتی اگرچہ اس کی

ابھی اس نے اپنے دل پر ایک تازہ چوٹ کھائی تھی پھر بھی وہ اسی دلنواز تبسم کے ساتھ اپنے ساتھیوں کی طرف بڑھا۔ اس دیکھتے ہی چہرے چمک اٹھے جیسے ٹمٹماتے دئیوں میں کسی نے روغن ڈال دیا ہو، احسان کی لوٹ جاری ہو۔!!

ماہرالقادری

یادِ رفتگاں

افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق مرحوم

اب سے تقریباً اٹھارہ انیس سال پہلے کی بات ہے کہ ان دنوں میرا حیدرآباد دکن میں قیام تھا اور قیام کیا' بلکہ یوں کہئے کہ مستقل اقامت تھی۔ اسی زمانے میں مدراس سے اُردو کانفرنس اور مشاعرے میں شرکت کی دعوت آئی' میری طبیعت کچھ ناساز تھی' اور پھر رقمی شرائط بھی خاطرخواہ طے نہ ہو سکے' اس لئے میں نے معذرت لکھ کر بھیج دی۔ میرے انکاری جواب پر کانفرنس والوں نے اپنے ایک نمائندے کو دوڑایا۔ جس کے پرخلوص اِصرار کے آگے میری تمام معذرت آمیز دلیلوں کو سپر ڈال دینی پڑی اور میں نے مدراس چلنے کی ہامی بھر لی۔ شب میں جب ٹرین میں سوار ہوا تو طبیعت خاصی بے کیف تھی۔ مگر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ ورنگل جنکشن پر پہنچتے پہنچتے میں اپنے اندر چستی محسوس کرنے لگا۔ دوسرے دن صبح آٹھ بجے دریائے کرشنا کو پار کر کے جب ٹرین بجواڑہ پہنچی تو طبیعت چاق چوبند تھی' اور شام کے وقت مدراس کے قریب پہنچ کر جب سرو اور جھاڑ کے درختوں کے مناظر نگاہ سے گزرے تو طبیعت پر بے کیفی کی جگہ نشاط کا غلبہ تھا' سچ تو یہ ہے کہ مدراس کی آب و ہوا نے میرے حق میں مسیحائی کی!

مولانا ظفر علی خان مرحوم کانفرنس کے صدر تھے' زندگی میں پہلی بار کئی دن تک ان کی معیت' ہم نشینی اور بے تکلف صحبت کا شرف حاصل رہا۔ کانفرنس کا افتتاح ہز ہائینس نواب صاحب بینگن پلی نے کیا' کانفرنس کامیاب رہی اور مشاعرہ کامیاب تر!

مدراس پریسیڈنسی میں "اسلامیہ کالج" کو وہاں کے مسلمانوں کی یونیورسٹی سمجھئے۔ اسی کالج کے پرنسپل ڈاکٹر عبدالحق مرحوم تھے۔ ان کی دعوت پر مولانا ظفر علی خاں مرحوم اور میں اسلامیہ کالج پہنچے' مولانا نے تقریر کی' میں نے کلام سنایا اور پھر ڈاکٹر صاحب مرحوم کے یہاں دوپہر کا کھانا کھایا۔ ڈاکٹر صاحب کے والد مولانا محمد عمر مرحوم سے بھی شرف نیاز حاصل ہوا سعادت مند بیٹے اور خوش قسمت باپ کی یکجائی شعر و ادب اور فلکیات کی زبان میں اسی کو "قران السعدین" کہا جاتا ہے!

مدراس کا یہ میرا سب سے پہلا سفر تھا۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی دعوت میں بنگلور کا ذکر نکلا کہ وہ شہر دکن کی جنت (Paradise of Deccan) ہے۔ میں سیر سپاٹے کا بچپن سے شوقین ہوں۔ بنگلور کی تعریف سن کر وہاں جانے کی تمنا نے اور زیادہ ابھارا۔ ڈاکٹر عبدالحق مرحوم نے فرمایا کہ آپ وہاں میرے دوست عبدالغفور صاحب مودی کے یہاں ٹھہر یے۔ وہ وہاں کے ذی عزت تاجر اور علم دوست بزرگ ہیں۔

ویلور کے ایک ادبی جلسہ میں شرکت کے بعد میں بنگلور روانہ ہوا۔ راستہ بھر سوچتا رہا کہ اگر اسٹیشن پر عبدالغفور صاحب مودی کا کوئی آدمی مجھے لینے کے لئے نہ آیا تو کیا ہوگا؟ میں ان کے یہاں سواری میں بیٹھ کر جا بھی سکتا ہوں مگر ایک اجنبی شخص کے یہاں اس طرح "ناخواندہ مہمان" بن کر جانا ممکن بھی تو خاصا غور طلب مسئلہ ہے! ایسے مواقع پر

عقل اور ضمیر کے مابین "جرح و تعدیل" اور ردّ و قبول کی کشمکش برپا ہو جاتی ہے!

بنگلور اسٹیشن پر پہنچا تو ایک سن رسیدہ خوش شکل بزرگ میری طرف بڑھے اور "عبدالغفور مودی میرا نام ہے" کہتے ہوئے بغلگیر ہو گئے، بولے ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے مدراس سے آپ کی آمد کی مجھے اطلاع دیدی تھی۔ میں نے مہمانوں کو لینے کے لئے اسٹیشن خود جایا کرتا ہوں، ورنہ اس معاملہ میں نوکروں پر اعتبار نہیں کرتا۔

بنگلور میں کئی دن تک مودی صاحب کے یہاں قیام رہا، دو دن کے بعد مولانا ظفر علی صاحب بھی تشریف لے آئے، محمد علی ہال میں بڑے دھوم کا مشاعرہ ہوا، اس کے بعد بنگلور میں اتنے دوست ہو گئے کہ وہاں بار بار جاتا رہا اور بنگلور میری "تفریح گاہ" بن گیا! میری یہ غزل قیام بنگلور ہی کی یادگار ہے

سیکڑوں مفہوم رکھتی ہے وہ چشم التفات
دیکھنے والوں کو دھوکے میں نہ آنا چاہئے

غالباً ۱۹۴۷ء تھا۔ فلمی دنیا سے تعلق کے سبب بمبئی میں میرا قیام تھا، ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کا خط ملا کہ اسلامیہ کالج مدراس کی جوبلی ہو رہی ہے، اس میں مشاعرے کا بھی پروگرام ہے، تمہاری شرکت ضروری ہے، طبیعت سفر کے لئے آمادہ نہ تھی، مگر ڈاکٹر صاحب مرحوم کے ٹیلیگرام نے رخت سفر باندھنے پر مجبور کر دیا۔ بمبئی سے سیدھا مدراس پہنچا۔ اسلامیہ کالج کی جوبلی کے دوسرے پروگرام ہو چکے تھے، بس مشاعرہ باقی تھا، اور یہی اس علمی ادارہ کے جشن سیمیں کا نقطۂ اختتام تھا، ڈاکٹر عبدالحق مرحوم بڑے تپاک سے ملے، مصافحہ اور معانقہ میں ان کا انداز دیدنی تھا کہ جیسے میرے آجانے پر سراپا سپاس بنے ہوئے ہیں، ان کے اس انکسار تواضع کو دیکھ کر میں پانی پانی ہوا جاتا تھا!

مجھے جس کمرہ میں ٹھہرایا گیا، اسی کے برابر ڈاکٹر ہادی حسن صاحب (سابق پروفیسر مسلم یونیورسٹی) کا قیام تھا انھوں نے ہز ایکسیلینسی گورنر مدراس کی موجودگی میں "اسلامی فن تعمیر" پر تقریر کی تھی جو بہت کامیاب رہی۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نشۂ تحسین و ستائش سے سرشار تھے، مجھ سے انگریزی میں خطاب کیا۔

Mahir —— "you missed a very good Lecture."

میں نے جواب میں عرض کیا کہ مجھے بہت افسوس ہے کہ آپ کی تقریر میں نہ سن سکا۔ کیا کروں مشاعرے کا تا ہی بہ مشکل تنت وقت پر ملا۔

ڈاکٹر ہادی حسن صاحب ذہانت کا مجسمہ ہیں بڑی دھواں دھار تقریر کرتے ہیں۔ مگر بعض "دانایانِ رازگی زبانی یہ روایت بھی پہنچی ہے کہ وہ اپنی تقریروں میں صفحے کے صفحے دوسروں کی کتابوں سے سنا دیتے ہیں! (واللہ اعلم بالصواب)

اسلامیہ کالج کا مشاعرہ اتنا کامیاب رہا کہ اس قدر جماؤ اور دلچسپی کے مشاعرے کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ رات کے دو بجے جا کر یہ محفل ختم ہوئی، میں مدراس میں بس ایک ہی رات کا مہمان تھا، مجھے اسی دن صبح حیدر آباد دکن جانا تھا، میں اپنے کمرے میں آ کر پلنگ پر لیٹا اور تکیہ پر سر رکھتے ہی نیند آ گئی! دو ڈھائی گھنٹے کے بعد جو آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں کہ کوئی صاحب دبے پاؤں برآمدے میں ٹہل رہے ہیں۔ میں پلنگ سے اٹھا تو ڈاکٹر عبدالحق صاحب سامنے موجود تھے۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ — آپ ——" میں نے حیرت کے ساتھ تشکر آمیز لہجہ میں کہا

ڈاکٹر صاحب نے بڑی متانت کے ساتھ جواب دیا۔

بھائی! آپ میری دعوت پر سیکڑوں میل کا سفر کر کے آئے ہیں! نوکروں پر آپ کے جگانے کا کام چھوڑ دیتا تو کیا عجب ہے کہ وہ خود تھکے ہارے ہیں سو جاتے اور آپ کی ٹرین نکل جاتی، میں مشاعرے کے بعد سویا تھوڑی ہوں، آپ کچھ دیر اور نہ اٹھتے تو میں آپ کو جگانے والا ہی تھا۔

ان کی اس محبت، قدر شناسی، مہمان نوازی اور عالی ظرفی کا مجھ پر جو اثر تھا اس کے اظہار کے لئے اپنی زبان کو فرطِ جذبات سے گنگ پاتا تھا۔

میں ضروریات سے فارغ ہوا تو ڈاکٹر صاحب مرحوم کا ملازم پرتکلف ناشتہ کا خوان لئے ہوئے آگیا، ڈاکٹر صاحب اور میں نے ناشتہ کیا، پھر وہ مجھے اپنی کار میں لے کر اسٹیشن پہنچے، خود پیش قدمی کر کے ٹکٹ خریدا۔ ریلوے میل سروس کے ایک کلرک کو جو اس ٹرین سے جا رہا تھا تاکید کی کہ وہ راستہ میں میرے آرام اور ضروریات کی خبر خبر رکھے۔

اس کے بعد پھر ان سے ملنا نہ ہو سکا۔ اخبارات میں ان کے مناصب کی ترقی اور علمی مصروفیتوں کی خبریں پڑھتا رہا۔ اب سے چند ماہ قبل مدراس میں منعقد ہونے والے اردو سیمینار کا دعوت نامہ آیا تھا، کیا عجب ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کا بھی اس میں ایماء شریک ہو۔

میں نے جواب میں معذرت کرتے ہوئے لکھا کہ:-

از گوشۂ بامے کہ پریدیم، پریدیم

بس پھر اس کے بعد ڈاکٹر عبدالحق کی موت کی خبر اخبار میں پڑھی، اور دل نے بڑی اذیت محسوس کی، ہر آدمی کو اپنی زندگی پیاری ہوتی ہے، لیکن ڈاکٹر صاحب مرحوم اتنے کام کے آدمی تھے کہ اگر زندگی کا کچھ حصہ دوسرے کو دیا جا سکتا تو میں ناکارہ اپنی عمر کے چند سال ان کو نذر کر دیتا۔!

ڈاکٹر عبدالحق مرحوم سر سے پیر تک اور دل سے نگاہ تک "مردِ مومن" تھے۔ "قلب او مومن و دماغش ہم مومن بود"!! صورت، سیرت، چال ڈھال، وضع قطع اور نشست و برخاست میں اسلامی شرافت اور مشرقی تہذیب و تمدن کا نمونہ! فلالوجی میں ڈاکٹر، عربی کے عالم، حکومت میں بڑے سے بڑے عہدہ پر رہے۔ مگر طبیعت کی سادگی اور مزاج کے انکسار میں کوئی فرق نہ آیا۔ مردِ یک رنگ! اپنے اللہ سے جو عہد وفا باندھا تھا اسے آخر وقت تک نباہتے رہے، انگریزی تعلیم یافتہ طبقے کے لئے اسلامی اخلاق کی ایک مثال! دین و دنیا میں کامیاب و بامراد! اللہ تعالیٰ قبر سے لے کر آخرت تک کی ہر منزل کو ان کے لئے آسان بنائے (آمین) اللھم اغفرہ وارحمہ۔!

فکر و عمل

عروج قادری

جب بھی دنیا کی قیادت کا سوال آتا ہے ؛ دل میں فوراً ہی محمدؐ کا خیال آتا ہے
اف یہ گھنگھور اندھیرا یہ فضائے تاریک ؛ ایسے میں یاد مجھے ان کا جمال آتا ہے
ابن عالم کے اصولوں پہ جہاں بحث چھڑی ؛ سامنے وحیِ الٰہی کا کمال آتا ہے
قوتِ فکر و نظر پہلے فنا ہوتی ہے ؛ تب کسی قوم کی شوکت پہ زوال آتا ہے
راہ کے سنگِ گراں فرشِ قدم بنتے ہیں ؛ جیسے ہی عزم کے تیور پہ جلال آتا ہے
تازہ رکھ جذبِ دروں، صبح ہے نزدیک عروج ؛ کٹ گئی ہجر کی شب روزِ وصال آتا ہے

جذب و سوز

وفا براہی

اب کون لائے گا دلِ ناداں کو راہ پر
پہرے بٹھا دیے ہیں محبت نے آہ پر
اِک انقلابِ نو کی زیارت کے واسطے
کچھ لوگ منتظر ہیں درِ خانقاہ پر
ذرّوں کو دے رہا ہوں ابھی درسِ زندگی
فرصت کہاں کہ غور کروں مہر و ماہ پر

تو ہی سبب بتا کچھ اے عقلِ پختہ کاراں
کیوں آج دیکھتا ہوں برہم مزاجِ یاراں
اِک وہ بھی تھا زمانہ تھی رونقِ چمن تھا
اِک یہ بھی ہے زمانہ ہوں حسرتِ بہاراں

یادِ ماضی کو نہ چھیڑ اے سعیِ لاحاصل ابھی
حال کی آغوش میں ملتا ہے مستقبل ابھی
دے گیا اگر صدا کوئی لبِ ساحل ابھی
ڈوبنے والے کئے جاسکتے لاحاصل ابھی
تم غمِ ماضی کو چھوڑو حال کی سیوا کرو
راز رہنے دو اگر ہے رازِ مستقبل ابھی

ندیم جعفری

جب گلستاں میں کوئی حادثہ پیش آیا ہے
دور تک بادِ صبا نے اُسے پھیلایا ہے
تیرے ہنستے ہوئے چہرے نے اچانک اے دوست
ایک اُلجھے ہوئے مفہوم کو سلجھایا ہے

دِل تاج محلی

وارفتگیٔ شوق میں اتنی خبر کہاں
آئے نظر کہاں وہ نہ آئے نظر کہاں
جتنا تمہیں حسین بنایا ہے عشق نے
مانا کہ تم حسین تھے مگر اس قدر کہاں
تارے اداس، شمع فسردہ، فضا خموش
ایسے میں جا رہے ہو مجھے چھوڑ کر کہاں
بے ہوش ہے کہ تم سے ملی تھی کہیں نظر
یہ کیا خبر کہ تم سے ملی تھی نظر کہاں

تازہ بہ تازہ نو بہ نو

ان کی چین جبیں بن گیا ہے ؛ عرضِ غم[1] کیا حسیں بن گیا ہے
اس ہجوم ہواؤ ہوس میں ؛ عشق تنہا نشیں بن گیا ہے
وہ جو تھا ایک وہم تصور ؛ رفتہ رفتہ یقیں بن گیا ہے
میرے حسنِ نظر کی بدولت ؛ کوئی زہرہ جبیں بن گیا ہے
شکریہ زحمتِ چارہ گر کا، ؛ غم مگر دل نشیں بن گیا ہے
ان کا چہرہ مرا نام سُن کر ؛ اور بھی کچھ حسیں بن گیا ہے
حسن خلوت سے محفل میں آکر ؛ کس قدر شرمگیں بن گیا ہے
آپ اور یہ کرم، یہ تواضع، ؛ آسماں کیوں زمیں بن گیا ہے
عشق پاکیزگی و ہوس میں ؛ اصل دنیا و دیں بن گیا ہے

آپ ماہرؔ کو جو چاہیں کہہ لیں
غیر کیوں نکتہ چیں بن گیا ہے

دل ہے اور فکرِ شاد کامی ہے، ؛ یہ بھی اِک طرح کی غلامی ہے
خود ہی کرسیِ نشین بن بیٹھے ؛ یہ بھی کوئی بلند بامی ہے

نظرِ بد سے رہے دور تو اے شاہسوار ؛ مہر و انجم تو تری راہ کے ہیں گرد و غبار

اپنی حالت پہ میں خود اشک بہا کر ہنس لوں ؛ آج میں اُن کے تصور کو بھی زحمت کیوں دوں

---

[1] عرضِ غم کو جو حضرات "مونث" سمجھتے ہوں وہ اس مصرعہ کو یوں پڑھیں :-
حالِ دل کیا حسیں بن گیا ہے

"سنئے۔ مولانا نے ۱۹۴۷ء میں دہلی کی جامع مسجد میں مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے کیا کچھ کہا تھا۔
میں نے پکارا اور تم نے میری زبان کاٹ لی، میں نے قلم کو ہاتھ میں اٹھایا اور تم نے میرے ہاتھ قطع کر لئے، میں نے چلنا چاہا تم نے میرے پاؤں کاٹ دیئے، میں نے کروٹ لینا چاہی تم نے میری کمر توڑ دی، حتیٰ کہ پچھلے "سات سال کی تلخ سیاست" جو آج تمہیں داغ جدائی دے گئی ہے اس کے عہد شباب میں میں نے بھی تمہیں خطرے کی ہر شاہراہ پر جھنجھوڑا لیکن تم نے میری صدا سے نہ صرف اعراض کیا بلکہ غفلت و انکار کی ساری سنتیں تازہ کر دیں۔ نتیجہ معلوم کہ آج انہیں خطروں نے تمہیں گھیر لیا ہے جن کا اندیشہ تمہیں صراط مستقیم سے دور لے گیا تھا۔"

ان الفاظ سے کون انکار کر سکے گا۔ صرف اتنا سوچنا باقی رہ جاتا ہے کہ وہ کونسی صراط مستقیم تھی جس سے "تلخ سیاست" نے مسلمانوں کو ہٹا کر خطروں میں گھیر دیا۔ کیا وہ جس کی فلک شگاف دعوت پاسکار دعوت الہلال و البلاغ کے صفحات میں دفن ہے یا وہ جس نے وحدت خون، جمہوریت، سیکولرازم، نیشنل ازم وغیرہ کے نظر فریب جامے پہنے ہیں۔ قبل آزادی کی سات سالہ "تلخ سیاست" بے شک خطرات سے خالی نہ تھی۔ لیکن کیا وہ سیاست جس کی راہ پر مولانا چلا رہے تھے کچھ اور طرح کے خطروں سے خالی تھی؟
خالی بھی ہو تو کیا وہ اسی منزل پر پہنچانے والی تھی جس کے در و بام سقف و سکون اور نقش و نگار کے خاکے الہلال میں قسم قسم سے بنا کر دکھائے گئے تھے؟ یہ سوال سوچنے کا ہے۔ خالی عقیدت اگر سہارا نہ دے تو اس کا جواب بہت ہی مشکل ہوگا۔ اچھا ہے اگر مشکلات سے بچنے کے لئے عقیدت ہی کا سہارا لے لیا جائے

پھر فرمایا:-
"سچ پوچھو تو اب میں ایک جمود ہوں یا ایک دور افتادہ صدا جس نے وطن میں رہ کر بھی غریب الوطنی کی زندگی گزاری ہے۔ یہی بات گزرے دنوں کے ہوتے ہیں کوئی [illegible] ہم اندازہ کرنے [illegible] کا منہ نوچ لیں ہم کہتے کہ صاحب الحال اور جمود [illegible] اور [illegible] پہلے بھی شہر تھا اور آج بھی شہر ہے وہ پہلے بھی آباد تھا اور آج بھی آباد ہے [illegible] پہلے [illegible] سیراب شدہ کھیتی کاٹ رہا ہے۔ پہلے لڑ رہا تھا اب گھات میں ہے۔ پہلے [illegible] آواز کی منتشر قوتیں جمع کر رہا ہے۔ پہلے سیدھی راہ جا رہا تھا اور اب راستہ کاٹ کر جا رہا ہے۔ کیونکہ سیدھے راستہ کو [illegible] سمت کا اندازہ نہیں [illegible] منزل وہی ہے۔ سفر جاری ہے۔"

پھر کہا تھا:-
"میرے دامن کو تمہاری دست درازیوں سے گلہ ہے۔ میرا احساس زخمی ہے اور میرے دل کو صدمہ ہے۔ سوچو تم نے کونسی راہ اختیار کی، کہاں پہنچے اور اب کہاں کھڑے ہو۔ کیا یہ خوف کی زندگی نہیں اور کیا تمہارے حواس میں اختلال نہیں آگیا۔ یہ خوف تم نے خود فراہم کیا ہے۔ یہ تمہارے اپنے ہی اعمال کا پھل ہے۔ ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں بیتا جب میں نے تمہیں کہا تھا کہ دو قوموں کا نظریہ حیات معنوی کے لئے مرض الموت کا درجہ رکھتا ہے۔"
شکر ہے دو قومی نظریے کے حاملین ملک سے چلے گئے۔ اب یہاں وہی نظریہ کارفرما ہے جو حیاتِ معنوی کو صحت کاملہ عطا کرنے کی تاثیر رکھتا ہے۔ اب یہ تہ بہ تہ اندھیرے کروٹ لینے والے ہیں۔ اب وہ صبح درخشاں طلوع ہوگی جس کی بشارت [illegible]

الہلال جیسا اب سال تک دیتے رہے ہیں اب صراطِ مستقیم کھل گیا ہے۔ پھر مرض کا علاج ان الفاظ میں بتایا تھا:-

"عزیزو! اپنے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرو۔ جس طرح آج سے کچھ عرصہ پہلے تمہارا جوش تھا اسی طرح آج تمہارا یہ خوف و ہراس بھی بے جا ہے۔ مسلمان اور بزدلی یا مسلمان اور اشتعال ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ سچے مسلمان کو نہ کوئی طمع ہلا سکتی ہے اور نہ کوئی خوف ڈرا سکتا ہے....."

کتنا شاندار عزم! کیسے دلنشین الفاظ ——— پھر:-

"اپنے دل کو اس خدا کی جلوہ گاہ بناؤ جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے عرب کے ایک امی کی معرفت فرمایا تھا کہ ——"جو خدا پر ایمان لائے اس پر جم گئے تو ان کے لئے نہ کسی کا ڈر ہے اور نہ کوئی غم ہے۔"

اس کے بعد وہی سحر انگیز خطبہ تھا جس میں مولانا کی خطابت کا جادو بھی تھا، زبان کی شیرینی کے ساتھ وہ ٹیس لئے رہتے جس میں بجلیوں کی لپک ہے، جس میں مٹھاس ہے، رچاؤ ہے، خوشبو ہے، رنگ ہے، دلنوازی ہے، موسیقی ہے، پیغام ہے، آتش ہے، وہ سب کچھ ہے جیسے صاحب الہلال کے خطبے میں ہونا ہی چاہیے۔ سننے والے وجد میں آگئے۔ ڈوبتے دلوں کو ڈھارس ملی۔ خوف و ہراس کی آگ ٹھنڈی پڑ گئی۔

پھر کچھ زیادہ وقت نہیں گذرا تھا کہ الفاظ کا نشہ صداقت کی ترشی نے اتار دیا۔ کیف و سرور کے متوالے اپنے جادو بیان خطیب اپنے امام الہند اپنے ہادی و داعی کی طرف دوڑے کہ۔ عرض کریں۔ "کچھ خطبے اور ——— جادو اثر ٹوٹ رہا ہے، ہمیں تاہیں آنے لگی ہیں ——"

لیکن اینٹ پتھر کی دیواروں نے ان کا راستہ روک لیا۔ حقائق نے ان کے رخسار پر چپت رسید کر کے بتایا کہ نادانو! یہ خواب و خیال الفاظ و بیان اور شعر و ادب کی دنیا نہیں ہے۔ یہ قانون و منصب و اقتدار و قوت کی دنیا ہے۔ یہاں خطبات اور حقائق کے درمیان لوہے کی دیواریں بنی ہوئی ہیں۔ جادو حسین واعظوں اور خوش نما پیغاموں سے دل بہلا دو اور منظوم گیت گاؤ۔ لیکن سننے والوں نے اسے ابھی ان کے خطبے کا جزو سمجھا اور واہ واہ کا شور اور بڑھ گیا۔

یہ معروضات پیش کرنے کی ضرورت یوں پڑی کہ ثناخواں حضرات نے مولانا کی حقیقی و واقعی ثنا پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بعض ایسے اسلاف کا نام بھی بیچ میں لے آئے جن کا سفینۂ حیات آخر دم تک تند و تیز لہروں سے ٹکراتا رہا اور ٹکراتے ٹکراتے ہی آگے بڑھتا گیا۔ چشم فلک نے نہیں دیکھا کہ منجدھار طوفانوں اور گردابوں سے دل برداشتہ ہو کر اس سفینے نے کوئی ساحلِ عافیت تلاش کر لیا ہو بلکہ دیکھا کہ موجوں سے ٹکراتے ٹکراتے اس نے آخر کار طوفانوں کے بیچ اپنا آخری تختہ تک نذرِ اجل کر دیا ہے۔

حالانکہ مولانا علیہ الرحمۃ کے مناقب و اوصاف اتنے کثیر ہیں کہ اسلاف کو اگر ان کی فہرست سے الگ کر دیا جاتا تب بھی ثناخوانی کا میدان تنگ نہیں رہ جاتا۔ دنیا جانتی ہے اور ہم بھی جانتے ہیں کہ امام الہند ایک شاندار ادیب تھے، ایک جلیل المرتبت عالم، ایک سحر طراز انشا پرداز، ایک ذہین و ذکی مدبر، ایک وطن دوست، وطن پرور، قوم نواز، وسیع النظر لیڈر اور متعدد امتیازی صفات کے جامع انسان تھے۔ ان کی دعوت اقامتِ دین چاہے نتائج کے اعتبار سے اتنی کامیاب ثابت نہ ہوئی ہو لیکن مردہ رگوں میں خون دوڑانے، سوتوں کو بیدار کرنے، انگریز کو نکالنے، ملک کو آزاد کرانے، اور اپنی خطابت و قیادت اور عبقریت و انفرادیت کا لوہا منوانے میں وہ اتنے ہی کامیاب رہے جتنا کوئی بہت بڑا رہنما رہ سکتا ہے۔ تاریخ نے اگر انصاف کیا تو وہ انہیں دنیا کے ان عظیم لیڈروں میں شامل کرے گی جنہوں نے اپنے وطن کو بیرونی غلبہ و تسلط سے نکال لے جانے میں ناقابل فراموش خدمات ادا کی ہیں۔ جنہوں نے قوم و وطن کی نجات کیلئے اپنے اوقات، اپنی جسمانی طاقتیں اور مادی وسائل ہی کو نہیں بلکہ اپنا اخلاقی نصب العین اور مرشد پیام دعوت کو بھی داؤ پر لگا دیا جس کے لئے ان کا قلم ایک چوتھائی صدی سے زیادہ تک پیہم زحمتِ خرام اٹھاتا رہا تھا۔ وہ بڑے نکتہ شناس تھے۔ بڑے فہیم بڑے

سیاستداں، بڑے وسیع النظر جاری عوامی حکومت کے سرکردہ اصحاب ان کی صواب دید اور بصیرت سے آخری دم تک مستفید ہوتے رہے۔ جو اعلیٰ درجہ کی صلاحیتیں عرصہ دراز تک اقامت دین کو آگے بڑھانے قرآن و حدیث کے نکات بیان کرنے اور حکومت الٰہیہ کے خاکے میں رنگ بھرنے میں صرف ہوتی رہی تھیں وہ سب کی سب سیکولرازم اور نیشنلزم کی نوک پلک سنوارنے میں اس طرح مرکوز ہو گئیں کہ پھوٹ پھوٹ کر رونے والے جواہر لال اور غم سے بے حال ہو جانے والے دیگر اعیان اقتدار شائد زندگی بھر ان کے احسانات نہیں بھولیں گے۔ (اسلام منتظر رہا کہ غلامی کے غار سے آزادی کے مینار پر چھلانگ لگا جانے والا داعی و مبلغ کب لپکے اور پر بلاتا ہے، لیکن اوپر اچانک اتنے مسائلِ قومی و وطنی گتھیوں کی شکل میں سامنے آگئے تھے کہ داعی ان کے سلجھانے میں ہمہ تن مصروف ہو گیا! اور اسلام تکتا رہا ۔۔۔ وہ تکتا ہی رہیگا ۔۔۔ تکتے تکتے اس کی آنکھیں پتھرا جائیں گی اور پھر شائد کوئی اور ابوالکلام پیدا ہو اور اپنی پیٹھ پر چڑھا کر اسے اوپر لے جائے!

تاریخ کے ان بھولے بسرے اجزا کو یاد کر کر کے سر دھننے والے عوام منتظر رہے کہ انگریزوں پر حق گوئی و احتجاج کے ریکارڈ قائم کرنے والے شیر نیستان سے اپنی گورنمنٹ کی کسی زیادتی، کسی لغزش، کسی خفیان پردہ دہانی پر بھی للکار دبی صدائے غلغلہ انداز سنیں پھر دیکھیں کہ سلطان جائر کے آگے کلمۂ حق کہنے کا جہاد کیسا ہوتا ہے، لیکن انھیں مایوسی ہوئی۔ کون جانے اس کا کیا سبب تھا ہو سکتا ہے عوام ہی کے کان بہرے ہو گئے ہوں اور ہو سکتا ہے کہ شیر نیستاں ہی کو ہجوم یاس نے لوریاں دے کر بستر استراحت پر سلا دیا ہو۔ یہ ممکن ہے یہ خموشی انتقام ہو اس اعراز وانکار اور سرکشی کا جس کی شکایت مولانا نے سنہ ۱۹۴۷ء میں کی تھی۔ یا ہو سکتا ہے اپنی گورنمنٹ کوئی لائقِ احتجاج زیادتی ہی سرزد نہ ہوئی ہو اور عوام جس چیز کو زیادتی سمجھ رہے ہوں وہ عین انصاف ہو۔ یا کیا تعجب حدیث کے "سلطان جائر" کا اطلاق ہی جمہوری و عوامی گورنمنٹوں پر تنگ ہو سکتا ہو۔ بہرحال امام الہند محض داعیِ حق اور علامۂ و خطیب ہی نہ تھے، وزیر بھی تھے اور مسند اقتدار کا سوال جب بیچ میں آجائے تو یہی کہہ کر زبان پر قفل چڑھا لینا چاہیے کہ:۔

امور مصلحت خویش خسرواں دانند

(مولانا عامر عثمانی، مدیر "تجلی" دیوبند)

ہماری نظر میں

موطا امام محمد مترجم اردو | ترجمہ و فوائد محمد خواجہ عبدالوحید ضخامت ۷۵۴ صفحات مجلد، رنگین گرد پوش کے ساتھ قیمت
ملنے کا پتہ:۔ محمد سعید اینڈ سنز، قرآن محل مقابل مولوی مسافر خانہ، کراچی

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی موطا احادیث نبوی کا مستند و موثق مجموعہ ہے۔ تقدیم زمانی کے ضمن میں یہ مجموعہ صحیحین سے بڑھ کر ہے، اور بقول شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ:۔

موطا گویا اصل و ام صحیحین است۔

جہاں تک جامع و مسانید کا تعلق ہے، بعض محدثین نے موطا کو ہر ایک کتاب پر مقدم مانا ہے۔

راویوں کی کثیر تعداد نے امام مالک سے روایت کی ہے، ان میں سب سے زیادہ مشہور و مستند (۱) موطا بروایت امام محمد اور (۲) موطا بروایت یحییٰ بن یحییٰ لیثی ہیں۔ یہی دونوں نسخے متداول و معروف ہیں۔

اس کتاب کا مقدمہ مولانا عبدالرشید نعمانی نے بڑی تحقیق سے لکھا ہے، فقہ حنفی کی مدافعت و حمایت کرنا نعمانی کا محبوب ترین موضوع ہے، چنانچہ اپنے مقدمہ میں انھوں نے موطا امام محمد اور موطا یحییٰ کا موازنہ کرتے ہوئے موطا امام محمد کو موطا یحییٰ پر ترجیح دی ہے۔ اور اس کے وجوہ بیان کئے ہیں۔ یہ کہ

(۱) یحییٰ اگرچہ ثقہ اور عاقل تھے مگر فن حدیث میں، امام محمد کی برابر ان کو بصیرت حاصل

(۲) روایت میں خفیف یحییٰ سے غلطیاں بھی سرزد ہوگئی ہیں۔

(۳) امام محمد کو تابعین کرام سے استفادہ کی سعادت حاصل ہوئی۔ یحییٰ لیثی رحمۃ اللہ علیہ اس سے محروم رہے

(۴) امام محمد نے کئی سال امام مالک کی خدمت میں گذارے۔ مگر یحییٰ لیثی رحمۃ اللہ علیہ کو پورا ایک سال بھی امام موصوف سے استفادہ کا موقع نہ مل سکا۔

موطا امام محمد میں روایتوں کی کل تعداد ایک ہزار ایک سو آٹھ ہے۔ امام موصوف نے ہر مسئلہ میں حنفی مسلک کی تائید و تصویب کی ہے یا یوں کہئے حنفی مذہب کے نقطۂ نگاہ کو پیش نظر رکھا ہے مگر اس کتاب کے مترجم اور فوائد نگار نے صفحہ ۵۵ پر "رفع یدین" کے بارے میں لکھا ہے کہ:۔

اس میں شک نہیں کہ احادیث سے دونوں فعل ثابت ہیں۔ یہ اختلاف صرف اولیٰ اور بہتر ہونے میں ہے، باقی اکثر احادیث و آثار جو سنداً زیادہ قوی و ثابت میں رفع یدین کے اولیٰ ہونے پر بھی دلالت کرتے ہیں، اسی وجہ سے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی۔ حجۃ اللہ البالغہ میں خوبیاں ملتے ہیں۔ [illegible] رفع یدین

کرنے والا زیادہ پسندیدہ ہے بسبب اس شخص کے جو رفع یدین "نہیں کرتا"۔

کتاب کا اردو ترجمہ آسان اور سلیس ہے۔ احادیث نبوی کا یہ مجموعہ دستورحیات اور حرز جان بنانے کے قابل ہے۔ ناشر نے اس کتاب کو ترجمہ کے ساتھ چھاپ کر اردو داں طبقہ پر احسان کیا ہے۔

اصح السیر تالیف مولانا حکیم ابوالبرکات عبدالرؤف قادری داناپوری مرحوم ضخامت ۶۵۶ صفحات۔ مجلد گردپوش کے ساتھ، قیمت دس روپے۔

ملنے کا پتہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ، کراچی۔

اردو میں مولانا شبلی نعمانی کی "سیرۃ النبی" اور مولانا قاضی سلیمان منصورپوری کی "رحمۃ للعالمین" بہت مقبول و مشہور ہیں، پروفیسر نواب علی مرحوم نے "سیرت رسول" بھی بڑی محنت وکاوش کے ساتھ تالیف کی، مگر اس کو قبول عام حاصل نہ ہو سکا۔ مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی "نشر الطیب فی ذکر الحبیب" بھی نعتیہ قصائد کی ترجمانی اور میلاد کے دلچسپ مواعظ کا سا رنگ ہے "رحمت عالم" (از مولانا سید سلیمان ندوی) اور "النبی الخاتم" (از مولانا مناظر احسن گیلانی) سیرت کے موضوع پر ایمان افروز کتب ہیں۔ گزشتہ سال ملا واحدی صاحب کی "حیات سرور کائنات" شائع ہوئی ہے۔ اور اپنی سادگی و روانی اور لکھنے والے کے خلوص کے سبب مقبول ہوتی جا رہی ہے! مولانا قاسم دلاوری کی "سیرت کبریٰ" بھی خاصی ضخیم و مفصل کتاب ہے!

مولانا ابوبرکات عبدالرؤف داناپوری کی "اصح السیر" جامعیت اور نقل واقعات کی تفصیل کے اعتبار سے اپنی جگہ ممتاز و منفرد ہے۔ مولانا داناپوری نے ہر واقعہ کو پوری تفصیل سے لکھا ہے۔ یہاں تک کہ مولانا شبلی نے جن روایتوں کو اپنی کتاب میں درج کرنا مناسب نہ سمجھا ان کو "اصح السیر" میں بڑے اہتمام کے ساتھ نقل کیا گیا ہے۔

سیرت و مغازی، اور احادیث کے نقد و محاکمہ پر مولانا شبلی نعمانی نے "سیرۃ النبی" میں جو مقدمہ لکھا ہے وہ کوئی شک نہیں کہ مولانا موصوف کا قابل فخر کارنامہ ہے، مگر "اصح السیر" کا مقدمہ بھی اپنی جگہ بہت خوب ہے اور اس کے بعض مباحث نے تو شبلی کے مقدمہ پر اضافہ کیا ہے۔ مولانا داناپوری نے اپنے مقدمہ میں شبلی نعمانی کے بعض تسامحات پر گرفت کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"مولانا شبلی سے تسامح یہ ہوا ہے کہ وہ درایت اور نقل کو ایک چیز سمجھتے ہیں۔ وہ درایت کو اسناد پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں اور کسی محدث کا یہ مسلک نہیں ہے بلکہ صریح البطلان ہے۔"

"اصح السیر" کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں فقہی مسائل کی تفصیل کتاب و سنت کی روشنی میں ملتی ہے۔ کسی دوسری کتاب میں یہ اہتمام نہیں کیا گیا، مگر اس کی یہی خوبی خامی تک نظر آتی ہے کہ "سیرت رسول" کے بہت سے ابواب کتاب الفقہ بن کر رہ گئے ہیں، اور کتاب پڑھنے والا "سیرت رسول" سے ہٹ کر فقہی مباحث میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔

مثلاً "العشرۃ والخراج" کے باب میں وہ امام طحاوی، ابن حجر عسقلانی، ابن کمال، صاحب ہدایہ اور دوسرے ائمہ فقہ کے اختلافات سے بحث کرتے ہیں۔ سیرت میں فقہی مباحث کا اس قدر تفصیل سے لانا اور فقہاء کے اختلافات بیان کرنا "سیرت" کے اصل موضوع سے باہر کی باتیں ہیں۔

افراد و قبائل اور مقامات کے نام پڑھنے میں اکثر لوگ غلطی کر جاتے ہیں۔ اردو میں تو یہ پہلی کتاب ہے۔ جس میں اسماء پر اعراب کی تفصیل لگائی ہے مثلاً

۱- عرباض بن ساریہ ـــ اول بکسر عین مہملہ و آخر ضاد معجمہ ـــ یہ سلمی ہیں کنیت ابونجیح ہے۔

اس قدر احتیاط کے باوجود صفحہ ۲۶ پر "یبوع" لکھا ہوا ملا۔ یہ کتابت کی غلطی ہے۔ ہمارے خیال میں اس مقام کا اصل "انا ینبوع" ہے ـــ صفحہ ۹۵ پر "طمانیت" "جرأت" (تنابن) کے ساتھ لکھی گئی ہیں، یہ بھی غالباً کاتب کا سہو ہے۔

"میں نے لگام چھوڑ دیا" (صفحہ ۲۰) "لگام" بالاتفاق مونث ہے۔ صفحہ ۲۳ پر "مواخات" کو مذکر لکھا ہے ـــ "تیروں کو تیر ماریں" پڑھ کر وجدان نے بڑی وحشت محسوس کی۔ کہیں کہیں زبان کی خامیاں ملتی ہیں۔

ـــ مگر ـــ

کوئی شک نہیں کہ مجموعی طور پر "اصح السیر" بڑے پایہ کی علمی، ادبی، تحقیقی اور دینی پیشکش ہے۔ مولانا دانا پوری مرحوم نے اپنی عمر کا کتنا حصہ اس کتاب کی تالیف و تدوین میں صرف کیا ہے اور کہاں کہاں سے مواد جمع کیا ہے!

"سیرت نبوی کے ریسرچ اسکالر اس کتاب سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ مولف کو اللہ تعالیٰ اپنے جوار رحمت میں جگہ دے کہ انھوں نے اس انسانِ کامل کے اسوۂ حسنہ کی تجلیاں دکھائی ہیں جس کے اتباع کے بغیر ہدایت و نجات مل ہی نہیں سکتی۔

سوانح عمری خواجہ حسن نظامی

نوشتہ ملا واحدی دہلوی، مجلد، ضخامت ۲۲۴ صفحات (خواجہ صاحب اور ملا واحدی کی تصویریں اور خواجہ صاحب مرحوم کی قلمی تحریر کے ساتھ) قیمت [illegible] ایڈیشن چھ روپے، قسم اول ساڑھے تین روپے، قسم دوم ڈھائی روپے۔ ملنے کا پتہ: ہندوستان میں خواجہ حسن نظامی درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا۔ دہلی۔

خواجہ حسن نظامی دہلوی مرحوم کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے، ان کا نام ہی خود ان کا تعارف ہے۔ اس کا جواب مشکل ہے کہ خواجہ صاحب کیا تھے اور کیا نہ تھے، وہ صوفی تھے، مرشد تھے، مبلغ تھے، تاجر تھے، انشاء پرداز تھے، فقیر دولت [illegible] ان کا دربار [illegible] امرا [illegible] اور وزیروں سے ان کی دوستی تھی، ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ جب وہ حیدرآباد دکن میں [illegible] تھے تو نواب فخر الملک، کمانڈر انچیف افواج آصفیہ اور کرنل سر [illegible] وزیر پولیس و مالگزاری کے ہمراہ وہ ایک ہی موٹر میں گزر رہے تھے، ایک طرف شہزادہ معظم جاہ [illegible] سے تعویذ لے رہے ہیں [illegible] اور دوسری طرف [illegible] درگاہ شاہ نظامی کے ٹوٹے ہوئے مکان میں بیٹھے ہوئے قوالی سن رہے ہیں! امیر [illegible] سبھی کے دوست اور [illegible]۔

[illegible] کو اپنی طرف مائل کرنے کے فن میں خواجہ حسن نظامی ید طولیٰ رکھتے تھے، یہ اگر فن نہ تھا تو شاید [illegible] کی ذات [illegible] ہو گیا اور کوئی عمل تھا تو وہ اسے اپنے ساتھ ہی لے گئے، ان کی زندگی کرامت تھی کہ [illegible] گھر [illegible] بسر ہوتا تھا ہر طرف سے روپے کی بارش! ان پر ایک دور وہ بھی گزرا ہے کہ حضرت سلطان جی رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ کے دروازے پر زائرین کے جوتوں کی حفاظت کر کے چار چھ پیسے پیدا کر لیا کرتے تھے۔ اور پھر خوشحالی اور فارغ البالی کا وہ زمانہ بھی آیا کہ آپ کے گھر کا ماہانہ خرچ پانچ ہزار سے کچھ اوپر ہی ہو گا! خواجہ صاحب کی یہ عالی ظرفی تھی کہ وہ اپنی غربت کے واقعات کو چھپاتے نہ تھے اور اپنی ناداری و خستہ حالی کے ذکر و بیان میں وہ ذرہ برابر عار اور سبکی محسوس نہ کرتے تھے۔

خواجہ صاحب نے ہندو جوگیوں کا روپ دھار کر بھارت کے پوتر استھانوں، مندروں اور تیرتھوں کی یاترا اور سیر بھی کی ہے۔ جس زمانے میں انگریزی حکومت کے خلاف ہندو اور مسلمانوں کے قریب قریب تمام اکابر مورچہ لگائے ہوئے

اس زمانے میں اونچے درجے کے انگریز افسروں سے خواجہ صاحب کے خاص مراسم اور تعلقات تھے! اس لئے ان کی زندگی کو جس نے بھی "پُراسرار" کہا ہے اس نے غالباً مبالغہ نہیں کیا۔

خواجہ حسن نظامی کی شہرت ہیں سب سے بڑا حصّہ ان کے "قلم" کا ہے! ان کا خامہ گوہر بار، واقعی سحر نما تھا۔ ان کی تحریروں نے اردو زبان و ادب کو بہت کچھ دیا! میں نے بچپن میں ان کا ایک مضمون ——"میرا کالا کوئلہ" یاد ہے۔ پڑھا۔ جس کا نقش اب تک باقی ہے۔

ایک طرف وہ، اتنے بڑے انشاء پرداز تھے، اور دوسری طرف "فاسفورس" کا تیل بھی ان کے اہتمام سے تیار ہوتا اور بکتا تھا۔! انھوں نے قرآن کی آسان زبان میں شرح و ترجمانی بھی کی ہے، اور دوسری طرف وہ "عجمی تصوف" کے پرجوش مبلغ بھی تھے۔ اور مشرکانہ توہمات اور بدعات میں اس درجے تک پہنچے ہوئے تھے کہ "سجدۂ تعظیمی" کو بلا دریغ جائز قرار دیتے تھے۔ ان کی ذات نے بدعات کو بہت فروغ دیا۔

"اسی کتاب (زیرِ تنقید) کے صفحہ ۲۲۱ پر لکھا ہے ——

عوام تو عوام ہیں انھوں (خواجہ حسن نظامی) نے تو چوٹی کے لوگوں کو بھی تصوف کی طرف مائل کیا، والیانِ ریاست کو مرید کیا، ہندو، سکھ، عیسائی، انگریز، اطالوی، امریکن، بدھسٹ یوگی، ہر طبقہ کے اونچے سے اونچے اشخاص ان کے خلفاء ہوئے۔"

یہ اسلامی تصوف تو کسی طرح بھی نہیں ہو سکتا کہ جس کے حلقۂ ارادت میں کافروں اور مشرکوں کو نہ صرف یہ کہ باریابی حاصل ہو، بلکہ انھیں خلافت کے منصب عطا فرما کر ان کو شرک و کفر پر مطمئن کر دیا جائے (معاذ اللہ، استغفر اللہ!)

جناب مُلّا واحدی صاحب نے خواجہ حسن نظامی مرحوم کی سوانح عمری اپنے مخصوص انداز میں لکھی ہے۔ دلکش و سادہ اسلوب، واقعات کی صحیح عکاسی اور ترجمانی! تحریر سلجھی ہوئی زبان ٹکسالی اور منجھی ہوئی! صاحب سوانح کو انھوں نے سراہا ہے مگر قصیدہ خوانی کا رنگ تحریر میں نہیں جھلکنے پایا، کہیں کہیں ان کی کمزوریوں کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے!

تحریر کا ایک نمونہ:۔

خواجہ صاحب بہت اونچے انسان تھے انھیں بہت اونچا جانا تھا۔ انھوں نے اپنے کنبے کا ذکر ابھی ۱۹۱۹ء میں بیان کیا ہے، اور محض حکایتاً سبق آموزی کی نیت سے بیان کیا ہے کنبہ جب کانٹے بچھا رہا تھا۔ اس وقت وہ راستہ کاٹ کر کانٹوں سے بچ جاتے تھے، کانٹے ہٹاتے یا کانٹوں میں اُلجھتے نہیں تھے، کانٹے ہٹاتے اور کانٹوں میں اُلجھنے کی فرصت کہاں تھی!

اور

"(خواجہ صاحب) اپنی چھ برس کی عمر کا واقعہ سناتے تھے کہ میں نے پیسہ پر ملکہ وکٹوریہ کی شکل دیکھ کر والدہ سے پوچھا یہ کون ہے؟ والدہ نے فرمایا "آج کل ہم اسی کی رعایا ہیں اسی کے محکوم ہیں" میں نے کہا پیسہ پر میری شکل بنوا دو۔ والدہ کا دل چونکہ اسلامی حکومت کے مٹ جانے سے چھلنی تھا وہ رونے لگیں اور بولیں بیٹا! اللہ تمہیں بادشاہ بنائے تو کلمہ کا پیسہ چلانا۔ مسلمانوں کے پیسہ پر صورت نہیں ہوتی۔"

کاش اس دورِ انحطاط میں مسلم خواتین کا کم سے کم ایسا ہی مزاج، ذہنیت اور زاویۂ نگاہ ہو جائے۔

صفحہ ۱۵ پر کاتب صاحب کی شوخیٔ قلم نے "مجرد" کو "مجدد" بنا دیا۔

"ایک اور ننھی سی مخالفت" میں ننھی کھٹکتا، چھوٹی سی یا معمولی سی مخالفت لکھنے کا محل تھا —— ممکن ہے دلّی میں یہ لفظ اس طرح بولا جاتا ہو، مگر نفاق، مخالفت، دشمنی وغیرہ الفاظ کے ساتھ ننھا یا ننھی بھلا نہیں لگتا۔

حیرت ہے کہ خواجہ حسن نظامی صاحب نے:۔

> اس مصر میں کتنے کرتے پتلون والے تیری طرح سرکشی کے جذبات سے سرشار جوتیاں کھٹکھٹاتے پھر رہے ہیں۔ (صفحہ ۹)

کیسے کہہ دیا، محاورہ "جوتیاں کھٹکھٹانا" نہیں "جوتیاں چٹخانا" ہے، اگر انگریزی جوتے (بوٹ) کی آواز کا اظہار مقصود تھا تو "جوتیوں" کے بجائے "جوتے" لکھنا تھا۔ اگرچہ جوتوں کے ساتھ کھٹکھٹانا پھر بھی محلِ نظر ہی رہتا۔

> ۱۷ رجولائی کو حضرت مریم علیہ السلام کے مزار پر حاضر ہوئے، حضرت مریمؑ کے مزار کے پاس سے اوپر پہاڑ پر راستہ ہے، جہاں بتایا گیا کہ حضرت سلمان فارسی وغیرہ نامدار اصحاب مدفون ہیں۔ (صفحہ ۱۰۰)

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا مزار شام و فلسطین میں نہیں بغداد شریف سے چند میل کے فاصلہ پر مدائن میں ہے، قصرِ کسریٰ کے بالکل قریب! اس آبادی کا نام ہی "سلمان پاک" ہے۔

خود ہم نے قبرِ سلمانؓ کی زیارت کی ہے۔

> اس سفر نے بھی خواجہ صاحب کو بہت چمکایا، دنیا اور خلقت کی رجوعات بے انتہا بڑھا دی تھی۔ (صفحہ ۱۱۲)

"رجوعات" پڑھ کر حیرت ہوئی۔

خواجہ صاحب اور مُلّا واحدی صاحب دونوں نے کھانوں کو "مکلّف" کہا ہے۔ "پُر تکلف" لکھنا چاہئے تھا، "مکلّف" تو لباس کے لئے بولا جاتا ہے۔

"تخریبِ معدے کو تنبیہ" (صفحہ ۲۰۵) کو پڑھ کر بے اختیار ہنسی آگئی۔ یہ کیا ترکیب اور اندازِ بیان ہے! یہ ذہن خواجہ صاحب کا تراشا ہوا ہے تو اور زیادہ موجبِ حیرت ہے،

> اس دن سے دلّی کے مسلمانوں نے بسنتی میلہ کو اپنا لیا، جس دن ہندو کالکا دیوی پر پھول چڑھاتے ہیں، اس دن نمازِ عصر کے بعد مسلمان اس مقام پر جمع ہوتے ہیں، جہاں کوشک لال کا گنبد ہے، وہ پتھر باقی ہے جس پر سلطان المشائخ تشریف رکھتے ہیں۔ حضرت خواجہ صاحب نے یہاں کتبہ بھی لگا دیا ہے۔ اسی جگہ سے جلوس کی شکل میں حضرت خواجہ سید محمد امام کے مزار پر جاتے ہیں اور پھول چڑھاتے ہیں۔ (صفحہ ۲۳)

یہ مزاروں پر میلے ٹھیلے، چراغاں اور پھولوں کا چڑھانا، کافروں اور مشرکوں کی ہی دلی رسمیں ہیں!

جناب محمود احمد عباسی نے کوئی شک نہیں سوانح نگاری میں بڑی صاف بیانی سے کام لیا ہے، اور ہر بات جانچ تول کر

گئی ہے مگر خواجہ صاحب کی زندگی کے بعض ایسے اہم واقعات بھی ہیں جن پر مکمل روشنی نہیں ڈالی گئی اور نہ دوسری جلد میں اس انکشاف اور اظہار حقیقت کی توقع ہے ۔!

رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر مرحوم کا وہ مشہور شعر ـــہ

. . . . ـــہ

دنیا میں پھر بھی تیرا نظامی ہی نام ہے ۔

ـــہ (مصرعہ اولیٰ ہمیں یاد ہے، مگر ہم نے قصداً نہیں لکھا)

ایک مستقل پس منظر رکھتا ہے ۔ ججّے پور کی مسجد میں گولی چلنے کا خونیں حادثہ اس مشہد میں خواجہ صاحب موجود تھے ۔ نواب رام پور کی بہن کا واقعہ اور اس قضیہ نامرضیہ کے سلسلہ میں دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر ریاست سے خواجہ صاحب کی جنگ یہ واقعات سوانح نگار سے تھوڑی سی روشنائی "چاہتے تھے" !

حیرت ہوتی ہے کہ خواجہ صاحب مرحوم اور مُلّا واحدی صاحب کے عقائد اور طبیعتوں کے اختلاف کے باوجود پچاس سال تک دونوں میں ایسی دوستی رہی کہ جس کی مثال ملنا مشکل ہے ۔ خواجہ صاحب سجدۂ تعظیمی تک کو جائز سمجھنے والے، اور مُلّا واحدی صاحب کو چھوٹی چھوٹی بدعات تک سے نفرت! خواجہ صاحب "تلوّن مزاج" ۔ مُلّا صاحب کی طبیعت میں استقامت وہ شاہ خرچ کہ ادھر روپیہ آیا، اور ادھر خرچ ہوا ۔ مگر یہ کفایت شعار، اور مصارف کی جزئیات تک پر نگاہ ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کتاب اپنے موضوع پر کامیاب اور دلچسپ ہے اور فن سیرت نگاری کا بہت اچھا نمونہ ہے، پاکستان آنے کے بعد مُلّا واحدی صاحب کے ہاتھ کی گرہیں سی کھل گئی ہیں کہ وہ اس مدت میں کئی کتابیں لکھ چکے ہیں اور اس سرمایہ میں روزانہ کچھ نہ کچھ اضافہ ہی ہوجاتا ہے ۔

تلامذہ غالب

از ۔ مالک رام (ایم ۔ اے) ضخامت ۳۱۴ صفحات، مجلد، سرورق باتصویر، قیمت سات روپے آٹھ آنے ۔ مرکزِ تصنیف و تالیف نکودر (مشرقی پنجاب، ہندوستان)

جناب مالک رام (ایم ۔ اے) کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے ۔ ان کی کتابوں نے اردو زبان کے سرمایہ میں گرانقدر اضافہ کیا ہے اور غالب پر تو ان کی شخصیت سند authority سمجھی جاتی ہے ۔

تلامذۂ غالب کا مرتب کرنا کوئی ہنسی کھیل نہیں تھا ۔ جناب مالک رام نے اس کے لئے دفتر کے دفتر کھنگال ڈالے ہیں ۔ تب کہیں جاکر یہ تذکرہ مدون ہوا ہے ۔ جن کتابوں اور رسالوں سے انھوں نے استفادہ کیا ہے ۔ ان کی فہرست کتاب کے آخر میں درج ہے، جن کی تعداد سیکڑوں تک پہنچی ہے، سچ تو یہ ہے کہ فاضل تذکرہ نگار نے ایک ایک گل کدے اور چمن چمن سے پھول منتخب فرماکر یہ گلدستہ مرتب کیا ہے ۔!

اس کتاب میں مرزا غالب کے ایک سو چھیالیس شاگردوں کے حالات درج ہیں اور ساتھ ہی نمونہ کلام بھی ! تلامذہ غالب میں سے بعض کی تصویریں فاضل مصنف نے نہ جانے کہاں کہاں سے فراہم کی ہیں !

نظیر اکبر آبادی کے رنگ اور طرز (Style) پر جناب مالک رام نے چند جملوں میں کس قدر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے ۔

"جس ماحول میں شیفتہ نے تربیت پائی تھی اس میں نظیر کی شاعری صرف درجہ عامی اور غیر ثقہ شمار

ہوتی تھی۔ اور اس لئے وہ اس رائے کے علاوہ جو انھوں نے ظاہر کی کوئی دوسری رائے دے ہی نہیں سکتے تھے۔ میرے خیال میں بہت اچھا ہوا کہ اس زمانے میں لوگوں نے عام طور پر نظیر کو پسند نہ کیا، کیونکہ پسند بالعموم تقلید کا پیش خیمہ ہوا کرتی ہے، نظیر کے زمانے میں اردو ابھی تکمیل کے مدارج طے کر رہی تھی۔ میر و مرزا اور دوسرے اساتذہ قدیم کی کاوشوں کے باوجود زبان ابھی ترقی کی معراج تک نہیں پہنچی تھی، اگر اس ابتدائی زمانے میں لوگ نظیر کے کلام کی پیروی شروع کر دیتے۔ تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ اس کی ترقی رک جاتی اور زبان متبذل ہو کر رہ جاتی۔ وجہ ظاہر ہے سہ
"نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند"
سنجیدگی سے ظرافت اور طنز کو نباہنے کے لئے بہت بڑے سلیقہ کی ضرورت ہے۔ جو بہت کم لوگوں کے حصہ میں آتا ہے۔ یہ نظیر ہی تھے جو اس رنگ کو نباہ گئے، اگر ان سے کم درجہ کا شاعر اس موضوع پر قلم اٹھاتا تو یقیناً منہ چڑانے لگتا اور مسخرہ ہو کر رہ جاتا۔

شاہ ظفر کی شاعری کے بارے میں لائق تنقید نگار کے یہ دو جملے کتنے فنی اور بصیرت افروز ہیں:۔

"موئے کو مارے شاہ مدار۔ شاہی اور دنیوی اختیارات کا یہ عالم تھا، لے دے کے ایک شاعری رہ گئی تھی، لیکن تذکرہ نگاروں نے یہاں بھی انصاف کیا حق پوشی سے کام لے کر ظفر کی عمر بھر کی کمائی اپنے استاد ذوق کی جھولی میں ڈالدی۔"

"..... لیکن سکندرہ ضلع علیگڈھ رہتے تھے (صفحہ ۱۵۴) اس قصبہ کا نام سکندرہ راؤ ہے۔ سکندرہ تو آگرہ میں ہے جہاں اکبر بادشاہ کی قبر ہے۔

"والی ریاست کچھ دنوں کے چھوٹے بھائی کنور ان سنگھ کے سکتر بن کے چلے گئے (صفحہ ۲۸۲) اردو زبان میں نوشیغانہ ایریا اور میونسپلٹی کے "سکریٹری" ہی کو سکتر کہتے ہیں، دوسرے محکموں کے سکریٹریوں یا بڑے آدمیوں کے پرائیویٹ سکریٹریوں" کو سکتر نہیں کہتے۔ اور ان ہی ایام میں مرزا فتح الدولہ برق اور امداد علی بحر سے عروض وغیرہ حاصل کئے (صفحہ ۲۰۴) عروض اور دوسرے علوم حاصل کئے۔ لکھنا تھا عروض وغیرہ حاصل کئے در و بست کے اعتبار سے خالی خالی سا لگتا ہے عبارت کو چست ہی ہونا چاہئے"

مولوی عبدالسمیع بیدل رامپوری کے وطن کی نسبت سے یہ دھوکا ہو سکتا ہے کہ یہ ریاست رامپور کے رہنے والے تھے۔ کہ یہ وہی مولانا عبدالسمیع بیدل ہیں، جن کا لکھا ہوا میلاد شریف خاص مشہور ہے، تو یہ رامپور منہاران کے رہنے والے تھے جو غالباً ضلع سہارنپور میں واقع ہے!

حیرت ہے کہ غدر سنہ ستاون کے ہیرو اور مشہور ظالم ہڈسن (Hudson) کو ہر جگہ ہاڈسن لکھا ہے۔ یہ تو اس اودھ دھن کا طرز املا ہے کہ وہاں فیکٹری کو فاکٹری اور ہیٹ کو ہیاٹ لکھتے ہیں۔!

نواب یوسف علی خاں ناظم کی شاعری کے بارے میں مالک رام کی یہ رائے ہے!

"یہ شبہ عام طور پر وارد کیا گیا ہے کہ ناظم کے دیوان میں غزلوں کی طرزیں ایسی ہیں جن پر غالب کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے

وہی اندازِ فکر، وہی اسلوب، وہی مضمون آفرینی اور خاص خاص الفاظ اور ترکیبیں جو غالب کے کلام کی خصوصیات ہیں، ہمیں ناظم کے دیوان کی کئی غزلوں میں اس حد تک ملتی ہیں کہ ہم انھیں محض استاد کی اصلاح تک محدود نہیں کر سکتے! یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلام خوش استاد نے خود کہہ کر شاگرد کے حوالہ کر دیا تھا۔ اس شبہ کی تقویت ایک اور بات سے ہوتی ہے کہ ناظم ۱۸۵۷ء کے شروع میں غالب کے شاگرد ہوئے، اور ان کا ضخیم دیوان چار برس بعد ۱۸۶۱ء میں شائع ہوا۔ ایک بالکل مبتدی کے لئے جس نے اس سے پہلے کبھی ایک مصرعہ تک نہ کہا ہو اتنی قلیل مدت میں ایک وافر کلام کا مالک ہو جانا حیرت ناک ضرور ہے۔"

مولانا اسمٰعیل میرٹھی کے صاحبزادے جناب اسلم سیفی نے قاطع برہان کے سلسلہ میں جو مولانا مرحوم کی خدمات کا ذکر کیا ہے، اس کی مالک رام صاحب نے تردید کی ہے کہ، "جس زمانے میں مولانا اسمٰعیل میرٹھی مرزا رحیم بیگ کے مدرسہ میں پڑھتے تھے، اس وقت تک مرزا غالب کی قاطع برہان وجود میں بھی نہ آئی تھی۔"

یہ جو عام طور پر مشہور ہے کہ ہندوستان کے مشہور سائنسداں ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر منشی ہرگوپال تفتہ کے نواسہ تھے۔ فاضل مصنف نے اس کی پر زور تردید کی ہے اور اس پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ "ڈاکٹر شانتی سروپ نے اس "غلط نسبت" کو انگیز کر لیا اور اپنی زندگی میں اس کی تردید نہیں کی۔"

اس کتاب سے پہلی بار یہ معلوم ہوا کہ یہ مشہور شعر ؂

یہ منصب بلند ملا جس کو مل گیا ؛ ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے فرزند اکبر نواب محمد علی خاں رشکی (تلمیذ غالب) کا ہے۔

ادب و انشاء کی خوبیوں کے علاوہ جہاں تک تحقیق کا تعلق ہے۔ کتاب تحسین و ستائش کی مستحق ہے۔ "جناب مالک رام نے "تلامذہ غالب" لکھ کر اردو دنیا پر احسان کیا ہے!

"تلامذہ غالب" کے جن منتخب و چیدہ اشعار سے ہم لطف اندوز ہوئے ہیں۔ قارئین فاران کو بھی ہم اس لطف میں شریک کرنا چاہتے ہیں

آج وہ لوگ کئے لیتے ہیں ان سے ناچار ؛ بن گئی اپنے ہی دم پر تو مروت کیسی (سیف الحق ادیب)

نہیں معلوم کیا وجہ ہے کیا فرض ؛ مرے مذہب میں ہے تیری رضا فرض

نہ آئے شمع رو رہ کے ہر شام ہی سے ؛ ابھی تجھ کو آنسو بہانے بہت ہیں

ہر چند مرا غیبت بتو ہیچ کلامے ؛ ہر دم زتو ہمہ بار پیامے و سلامے (اسمٰعیل میرٹھی)

تمہیں یاں تک آنا قیامت سہی ؛ ہمیں جی سے جانے میں کیا ہو گیا

نہ میں سمجھا نہ آپ آئے کہیں سے ؛ پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے (انور دہلوی)

رخصت وہ ہوا اشک ہمارے نکل آئے ؛ خورشید کے چھپتے ہی ستارے نکل آئے (بال مکند بے صبر)

خشک شد دامن تر بادۂ ناب ساقی ؛ دائم نہ زہد ریائی دم آبے ساقی (تحسین پانی پتی)

[illegible] ؛ بہ دل خستہ آمد و با چشم تر گزشت (ہرگوپال تفتہ)

[illegible] ؛ [illegible] پیچ پیچ عارض، کچھ قمر داری (شاہزادہ بشیر الدین توفیق)

[illegible] ؛ [illegible] کیوں آئے کیا بھولے تھے [illegible] (جنون بریلوی)

ہم روزِ وداع اس سے ہنس ہنس کے ہوئے رخصت ۔۔ رونا تھا بہت ہم کو روتے بھی تو کیا ہوتا۔ تمنا

گر صاحبِ دل ہوتے سن کر مری بے تابی ۔۔ تم کو بھی قلق ہوتا، اور مجھ سے سوا ہوتا تو

اک عمر چاہئے کہ گوارا ہو نیشِ عشق ۔۔ رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت ۔۔ ہم میں طاقت نہیں جدائی کی

لطفِ طاعت چہ بود نیست اگر ذوقِ نظر ۔۔ ذرہ پرستم صنمے راکہ خود آرا نبود (حالی پانی پتی)

او درِ دلِ من است و دلِ من بدستِ او ۔۔ چوں آئینہ بدستِ من و من در آئینہ

(مرزا محمد اکبر خاں قزلباش خاور)

وہ لے گئے ہیں خدا جانے کس طرح دل کو ۔۔ دیا ہے میں نے نہیں، اپنے اختیار سے کیا (مرزا فرخ رمز)

ناصح! قمارِ عشق کو ہم چھوڑ دیں گے آپ ۔۔ باقی ہے ایک جان ذرا اس کو ہار لیں

نہیں ہے عشق کی سرگشتگی میں ساتھ ضرور ۔۔ ہمیں تو خاک اڑانی ہے کارواں نہ سہی (ذکی دہلوی)

نہیں اک بار بھی اب سننے کی طاقت دل میں ۔۔ پہلے سو بار ترا نام لیا کرتا تھا۔

تم بھی وہی کہو تو کہیں سب بجا درست ۔۔ میں بھی وہی کہوں تو کہے اک جہاں غلط

(مرزا قربان علی بیگ سالک دہلوی)

تھامتا دل کو کہ آنکھوں کو نہ رونے دیتا ۔۔ ایک میں جھگڑے ہزاروں تھے کیا کیا کرتا (سروش رامپوری)

تیری نگاہِ مست اثر دل میں کر گئی ۔۔ ساقی! یہ جام دے کہ مرا کام ہو گیا (سوزاں سہارنپوری)

ہر یکے در دورِ چشمش شد خراب ۔۔ مے فروش و مے کش و پیمانہ ہم (شاکر مچھلی شہری)

فتنۂ دہر ہو بیٹھے ہی رہو ۔۔ گر اٹھو گے تو قیامت ہو گی (شہاب رامپوری)

پوچھو نہ اہلِ عشق کو کیا ہیں کہاں کے ہیں ۔۔ اچھے ہیں جس طرح کے ہیں، جو ہیں جہاں کے ہیں (شبیر رامپوری)

ایک دن شام ہماری بھی سحر کر دے گا ۔۔ وہی جو شام کو ہر روز سحر کرتا ہے

کس لئے لطف کی باتیں ہیں پھر ۔۔ کیا کوئی اور ستم یاد آیا

ہم طالبِ شہرت ہیں، ہمیں ننگ سے کیا کام ۔۔ بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہو گا

گر ہم سے خفا وہ ہیں، گر اُن سے خفا ہم ۔۔ مدت سے اسی طرح بھی جاتی ہے باہم

افسردہ خاطری وہ بلا ہے کہ شیفتہ ۔۔ طاعت میں کچھ مزہ ہے، نہ لذت گناہ میں

اتنی نہ بڑھا پاکیِ داماں کی حکایت ۔۔ دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ

وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی ۔۔ میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے

فسانے اپنی محبت کے سچ ہیں پر کچھ کچھ ۔۔ بڑھا بھی دیتے ہیں ہم زیبِ داستاں کیلئے

رحم است بر کسے کہ در آں کوے می رود ۔۔ در دست ناقہ من و برلب سلام ما

خار رانہ از نگیری کہ گلشن در جیب است ۔۔ قطرہ را سہل مپندار کہ دریائے ہست (شیفتہ)

لاکھوں دنیا میں ہوں زہد اور عبادت والے ۔۔ کہیں دو چار ہی نکلیں گے محبت والے (صدقی)

دل دے کے ان کو ایسی اذیت ہوئی ہمیں ؛ اب دل کبھی نہ دیں گے نصیحت ہوئی ہمیں (شاہ ظفر)

نزاکت است ترا باعثِ درستیِ عہد ؛ وگرنہ شیوۂ خوباں شکستِ سوگند است (زین العابدین خان عارف)

گر ہماری بندگی ہے نا قبول ؛ تو بتوں کی بھی خدائی ہو چکی (عاشق دہلوی)

شعلۂ عشق وہ ہے جس سے زمانہ جل جائے ؛ یوں تو پتھر کے بھی سینہ میں شرر ہوتا ہے

ہر شرارے اگر دل پر شورِ من سر برکشید ؛ قدسیاں بر آسماں بردند و اختر ساختند (سید احمد حسن قنوجی عرشی)

بلا کے بات بھی کی اور مسکرا بھی دیا ؛ کیا شہید بھی قاتل نے خوں بہا بھی دیا (عزیز صفی پوری)

یہی انداز تو ہیں دل کے اڑا لینے کے ؛ ان کی تم بھی نگاہوں پہ نہ جانا ہرگز

یہ جو چپکے سے آنے بیٹھے ہیں ؛ لاکھ فتنے اٹھائے بیٹھے ہیں

مری ٹوٹی ہوئی توبہ کے ٹکڑے ؛ کوئی لا دے درِ پیرِ مغاں سے

کہ ان کو جوڑ کر میں توڑ ڈالوں ؛ پھر اک جامِ شرابِ ارغواں سے (میر مہدی مجروح)

فقیر بن کے گیا واں تو کیا سوال کروں ؛ مگر کہوں کہ بھلا کر ترا بھلا ہوگا

اب لکھیں گے شکوۂ بیداد ہم دل کھول کر ؛ نام ان کا آسماں ٹھہرا لیا تحریر میں (نواب یوسف علی خان ناظم)

ارمغان

اردو ۱۲ صفحات، انگریزی ۲۲ صفحات، (ڈبل سائز) - ناشر مجلس انتظامی یوم محمد قلی قطب شاہ • ادارہ ادبیات اردو خیریت آباد، حیدرآباد دکن،

۱۱ر جنوری ۱۹۵۸ء کو حیدرآباد دکن میں "یوم محمد قلی قطب شاہ" کا افتتاح آندھرا پردیش کے گورنر بھیم سین سچر نے کیا تھا۔ اس کتابچہ میں اس تقریب کا پروگرام درج ہے، اس کے بعد غلام یزدانی صاحب کا سلطان محمد قلی قطب شاہ پر ایک مقالہ ہے، دوسرے مضامین مجلس کی رفتار (از ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ) دیوان مادنا (از بھوپال راؤ بی اے) نمائش نور اور عہد قطب شاہی (از محمد عبدالوہاب) ہیں۔ انگریزی کے حصہ میں عہد قطب شاہی کے آثار قدیمہ پر ایک مقالہ اور شاہان قطب شاہی کے مختصر حالات درج ہیں۔ متعدد تصاویر بھی اس کتاب کی زینت ہیں!

سیرت فاروق اعظم

از رشید القادری رام نگری ضخامت ۵۰ صفحات (قیمت درج نہیں) ملنے کا پتہ: مکتبہ منزل رام نگر بنارس

حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی سیرت آسان زبان میں مرتب کی گئی ہے۔ انداز بیان دلچسپ ہے۔

رمضان شریف میں نماز تراویح شروع کرائی (صفحہ ۱۳) حالانکہ نماز تراویح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سعادت عہد میں بھی پڑھی جاتی تھی، لکھنا یوں چاہیے تھا کہ حضرت عمر کے عہد میں باجماعت تراویح کو مداومت حاصل ہوئی ——— "محمد ابن شیرین" (صفحہ ۲۲) یہ "سیرین" ہے

"بیویوں کو طلاق دے چکا ہے (صفحہ ۲۲)" "طلاق دیدی گئی ہے" لکھنا تھا ——— "فیروز نے دو دھاری تلوار بنا کر زہر میں بجھایا (صفحہ ۲۸)" "زہر میں بجھائی" لکھنا چاہیے تھا کہ "تلوار" بالاتفاق مذکر ہے۔ یا پھر جملہ کی ہیئت اس طرح ہونی تھی ———

"اس نے تلوار کو زہر میں بجھایا"

موازنے

از: مشرق خالدی، ضخامت ۹۰ صفحات، قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ: علوی پریس بھوپال

اس انداز کی شاید پہلی کتاب اُردو زبان میں لکھی گئی ہے، جس میں قدیم شعراء کے کلام اور ان کے خصوصیاتِ کلام کا موازنہ کیا گیا ہے۔ فاضل ناقد بڑے نام شہرت رکھتے ہیں مگر وہ بعض مشہور ناقدین سے زیادہ اچھا مذاقِ سخن اور تیز تر نگاہ نقد و محاکمہ رکھتے ہیں۔ میر اور مومن کی شاعری پر صرف دو جملے:۔

"میر کے ہاتھ میں پڑ کر غزل نے جس طرح دل میں پیوست ہو جانے والا تیر بن جانا سیکھا، مومن کے ہاتھوں اسے عشق کی زبان بننے کا شرف بھی حاصل ہو گیا۔"

موازنۂ غالب و مومن کے چند اقتباسات:۔

غالب	مومن
آزاد مشرب، عاشق کم معشوق زیادہ مزاج میں شاہی، انداز میں شاہ پرستی	متشرع سراپا عشق و نیاز حسن کا فدائی عشق کا غلام مگر شاہ پرستی سے متنفر
عشق پاکیزہ ہے اور بیشتر جگہ خود ہی عاشق ہیں اور خود ہی معشوق	خیال میں تو پاکیزگی ہے، لیکن عشق کی حدیں ہوس اور لذت کو چھو لیتی ہیں۔
.... بعض جگہ محذوفات سے کام لیا تھا۔ جو دماغ کے دماغ کو ورزش ہی کرا دیتے ہیں۔	.... بیشتر جگہ محذوفات سے کام لیا ہے، جس کی وجہ سے درمیانی خلا کو پُر کرنے میں الجھن محسوس ہوتی ہے۔

اردو کے ساتھ بھارت میں جو دردناک سلوک کیا جا رہا ہے اس پر مصنف کس جرأت کے ساتھ اظہار خیال کرتا ہے:

"کتنی دردناک اور تلخ حقیقت ہے کہ بعض ہندوستان دشمن لوگ، اردو کو مٹانے کے لئے منصوبہ باندھتے ہیں کہ چار کروڑ مسلمانوں کا یہ بوجھ ہندوستان کے سر سے ٹل جائے، تو اردو کا جنازہ بھی نکل جائے گا۔ ایک عظیم اکثریت کے دل و دماغ پر ضد کے چار کروڑ سادہ دل ہندوؤں کا بھوت اگر سوار ہو جائے، تو یہ ان سادہ دل ہندوؤں کا قصور نہیں، یہ تو عظیم اکثریت کی بھی شکست ہے۔"

کتابت کی غلطی کے سبب میر حسن کی مثنوی کا سنہ تصنیف "۱۷۸۴ء" درج ہو گیا۔ "۱۷۸۵ء" ہونا چاہئے ۔ عرب کے مشہور شاعر فرزدق (زے کے ساتھ) کو "فرزوق" (واو کے ساتھ) لکھا ہے .... "سولہ ہزار بیت پاسٹھ اشعار" "وصف ادراک" کی کیا ضرورت تھی "سولہ ہزار" لکھنا تھا! ناقد نے لکھا ہے:۔

"ان دو آتشہ کی نوبیاں اسے سولہ ہزار ایک سو پاسٹھ شعار میں سے چھ ہزار دو سو چالیس اشعار فارسی اضافت اور عطف سے خالی ہیں" .... اس سے تنقید نگار کی محنت کا اندازہ ہو سکتا ہے!

حالی کی نثر کے متعلق ناقد کی یہ رائے:۔

"سنجیدگیٔ بیان نے دل کو ہاتھ سے کھو دیا ہے"

درست نہیں حالی کی نثر میں بڑی گھلاوٹ، دلکشی اور شیرینی ہے۔

محمد حسین آزاد کے بارے میں لکھتے ہیں:

"نثر میں ایک بہترین اسلوب کے خالق مطلق" (صفحہ ۴۳) "مطلق" زائد ہے!

محمد حسین آزاد کی "آب حیات" کے بارے میں ضرور اظہار خیال کرنا چاہئے تھا کہ جہاں تک زبان و بیان کا تعلق ہے یہ کتاب ادب و انشاء کا معجزہ ہے مگر تاریخی واقعات اور سیرت و سوانح کے اعتبار سے ساقط الاعتبار! آزاد نے اپنے دل سے کیسی کیسی بے سروپا باتیں جوڑ کر افسانوں کا ایک محل کھڑا کر دیا ہے!

جناب مشرقی خالدی فن تنقید پر توجہ دیں، تو کام کی کتابیں علم و ادب کے شائقین کو دے سکیں گے!

طالب و موہنی

از: سید محمد واله موسوی، مرتبہ: ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، ضخامت ۰۰ صفحات قیمت ایک روپیہ پچاس نئے پیسے، ملنے کا پتہ: سب رس کتاب گھر خیریت آباد حیدرآباد (آندھرا)

یہ چار اشتر کے تاریخی شہر پرینڈہ کی داستان عشق ہے، جسے اب سے سوا دو سو سال قبل سید محمد واله موسوی نے منظوم کیا تھا، واله کے حالات زندگی کے ساتھ ان کی تصنیفات کا مختصر تعارف بھی کرا دیا گیا ہے!

اس دور کی اردو زبان کا دکن میں یہ رنگ تھا کہ:

"گایا" کو —— "بولایا" —— "بُرا کو بُردا" —— "بھلایا کو بھولایا" —— "ملادے کو میلادے" —— اور "کھلائی" کو "کھیلائی" لکھتے اور بولتے تھے!

اس مثنوی کے یہ اشعار اور مصرعے کتنے بے ساختہ اور رواں ہیں:

ہوا یوں تازگی کی باس لاتی   کہ گویا زلف کے کوچے سے آتی

کہا طالب نے میں تجھ پر فدا ہوں   ترا عاشق ہوں تیرا مبتلا ہوں

؎ کیا شکر اس کا آہنگ غزل میں

؎ تبسم صبح محشر کی علامت

؎ زبان سوسن کی تتلانے لگی ہے

گفتگو کو واله موسوی نے مذکر باندھا ہے (ہوا ہے گفتگوئے عشق تازہ) اور "مکر" کو بھی مذکر نظم کیا ہے —— (مکر عاشق کی بدخواہی پہ باندھا) —— اس مصرعہ ——

کہ اوفوا بالعہود ہے حکم تنزیل (صفحہ ۷۳)

میں "اوفوا" سے گر رہی ہے —— قصہ کو مُشدّد کے بجائے "مفا" کے وزن پر نظم کیا ہے

؎ قصہ پورا ہوا الحمد للہ

"محشر" کا "مش" ساکن ہے مگر واله نے اپنی مثنوی میں اُسے متحرک نظم کیا ہے

؎ محشر کا گرمئ بازار تازہ

پرانے شاعروں کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو زبان کن منزلوں سے گزر کر اور کیسے کیسے سانچوں میں ڈھل کر آئی ہے!

تک پہونچی ہے، ڈاکٹر زور کی یہ کوشش قدر و ستائش کی مستحق ہے،

رہبر حج معہ تاریخ حرمین و سفرنامہ

از:- سید محمد احمد کاظمی (ممبر پارلیمنٹ) ضخامت ۱۲۴ صفحات قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ ملنے کا پتہ:- مکتبۂ علمیہ قاضی اسٹریٹ، میرٹھ (بھارت)

جناب سید محمد احمد کاظمی کو ۱۹۵۵ء میں حج بیت اللہ (سفر حرمین شریفین) کی سعادت نصیب ہوئی، موصوف نے اپنے تاثرات و مشاہدات کتابی صورت میں پیش کئے ہیں۔ سیدھا سادھا انداز بیان ہے، اور جو کچھ انھوں نے دیکھا ہے، اُسے کاغذ پر منتقل کر دیا ہے!

"مدینہ منورہ میں رسول کریمؐ کا سوا دس سال قیام"— یہ اس کتاب کا اہم تاریخی باب ہے، حجر اسود، منیٰ، عرفات، مسجد خیف، رمی جمار، مدینہ منورہ، اور مسجد نبوی کے فوٹو بھی کتاب میں شامل ہیں!

"کوئی شخص سول نافرمانی کرتا ہے، یا روزہ رکھتا ہے تو اس کے حالات کی تشہیر موافق و مخالف سب ہی کرتے ہیں" (صفحہ ۶۶، ۶۷) "تشہیر" تو "بری شہرت" کو کہتے ہیں ـــ صفحہ ۱۰۸ پر حاجی مصطفےٰ خاں صاحب کو "مصطفےٰ علی" اور صفحہ ۱۴۰ پر مولٰنا کرم علی "ملیح آبادی" کو مولانا کرم علی لکھنوی لکھا ہے!

"..... اگر ایک دو جھٹکے ایسے اور لگ جاتے تو معاملہ صاف تھا" (صفحہ ۱۴۱) معاملہ ختم تھا یا قصہ پاک تھا لکھنا تھا ـــ "ایک کیلو میٹر قریب پانچ میل ہوتا ہے" (صفحہ ۲۴) حالانکہ اس سے اوپر کی سطروں میں "۳۲ کیلو میٹر کو ۲۰ میل کی برابر لکھا ہے۔ اس حساب سے تو کیلو میٹر ایک میل سے چھوٹا ہوا!

مصنف ادیب اور اہل قلم نہیں ہیں، پھر بھی مکہ اور مدینہ کا ذکر کتنا ہی سادہ انداز میں کیوں نہ کیا جائے، اہل ایمان اس سے لطف اندوز ہی ہوتے ہیں!

سلاطین اندلس یعنی تاریخ ہسپانیہ

از:- مفتی انتظام اللہ شہابی، ضخامت ۲۰۰ صفحات، مجلد قیمت تین روپے ملنے کا پتہ: مکتبۂ فریدی، اردو کالج، کراچی

مولٰنا مفتی انتظام اللہ شہابی سیکڑوں کتابوں کے مصنف و مؤلف ہیں "تاریخ" ان کا محبوب ترین موضوع ہے، وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ لکھتے ہی رہتے ہیں، اب انھوں نے ہسپانیہ کی مختصر تاریخ مرتب فرمائی ہے! اس کتاب میں موصوف نے اندلس کی قدیم تاریخ کے بعد، فاتح یورپ موسیٰ ابن نصیر سے لیکر ہسپانیہ کے آخری فرمانروا تک کے حالات قلمبند کئے ہیں، یہی حالات تفصیل میں جا کر ہزاروں صفحات پر پھیل سکتے ہیں، مگر مفتی صاحب موصوف نے تاریخی واقعات کا عطر کھینچ لیا ہے، مشہور اور اہم واقعات دسترس سے باہر نہیں ہونے پائے ہیں!

سلاطین کے بعد انھوں نے بلاد اندلس (اشبیلیہ، غرناطہ وغیرہ) کے حالات لکھے ہیں، اور کتاب کا سب سے زیادہ اہم حصہ وہ ہے، جس میں اندلسی عربوں کے علوم و فنون کی تفصیل پیش کی ہے کہ انھوں نے کیا ایجادات کیں، انھوں نے حدیث، شاعری، طب اور سائنس کی کتنی بیش بہا خدمات انجام دیں، اور یورپ نے ان سے کس قدر علم و شائستگی سیکھی!

فاضل مصنف نے اندلس میں مسلمانوں کے اسباب زوال سے بھی بحث کی ہے مگر افسوس ہے کہ یہ باب جسے سب سے زیادہ مفصل، مدلل اور جاندار ہونا چاہیئے تھا، بہت مختصر اور تشنہ ہے، یہی وہ مواقع ہوتے ہیں جہاں ایک مورخ کی ناقدانہ قابلیت کا مظاہرہ ہوتا ہے، یہ نہ ہوا تو پھر مورخ راوی اور ناقل بن کر رہ جاتا ہے!

کتاب سے ایک اقتباس

موسیو لیبان تمدن عرب میں لکھتا ہے

"اندلس کے عرب مسلمانوں پر جو مظالم توڑے گئے، دُنیا کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں مل سکتی، حالانکہ یہی وہ مسلمان تھے، جنھوں نے اپنے اقتدار و حکومت کے زمانہ میں عیسائیوں پر کبھی اس قسم کے ظلم نہیں کیے اگر وہ ایسا کرتے پر آجاتے تو آج پورا جزیرہ نمائے اسپین عیسائیوں کے نام و نشان اور ان کے وجود سے یکسر خالی ہوجاتا"

عیسائیوں نے مسلمانوں کے علمی ذخائر کو جس بے دردی کے ساتھ تباہ کیا، وہ بھی علم و فن کی بہت بڑی ٹریجڈی ہے، دس لاکھ کتابیں ظالموں نے نذرِ آتش کردیں:

اندلس کی تاریخ مسلمانوں کے عروج و زوال کا عبرت آموز مرقع ہے سارے یورپ میں جن کی دھاک تھی، جن کے علم اور تہذیب و تمدن نے یورپ کو مہذب و شائستہ بنایا جن کے قصر و ایوان اور باغوں نے زمین پر "جنت" کے نمونے قائم کردیے، آپس کی پھوٹ اور امراء کے عیش و عشرت کے ہاتھوں انھیں وہ ذلت نصیب ہوئی کہ ہسپانیہ سے مسلمان قوم کا نام و نشان تک مٹ گیا! اسپین بقول علامہ اقبال، تہذیب حجازی کا مزار ہے! (اللّٰھم احفظنا من ھٰذہ الذلۃ)

پاکستان میں بھی یہی رنگ نظر آرہا ہے، یہاں بھی سازشیں چل رہی ہیں، اور اقتدار کی کشمکش برپا ہے، فسق و فجور کی بھی گرم بازاری ہے، اللہ تعالیٰ اپنا رحم فرمائے ورنہ آثار اچھے نہیں ہیں!

قواعد اللغۃ العربیۃ (حصہ اوّل)

تالیف:۔ عبدالحق، ضخامت ۲۲۴ صفحات، قیمت دو روپے

ملنے کا پتہ: المکتبۃ العلمیۃ ۱۵ ایبک روڈ لاہور

جناب مولوی عبدالحق صاحب نے عربی کی گرامر آسان اور سہل انداز میں مرتب فرمائی ہے، کتنی دلنشین مثالیں اور کس قدر مفید مشقیں اس میں دی گئی ہیں!

صرف ایک مثال:۔

"جب آپ کہیں: سَارَ الْمَرْكَبُ وَالشَّاطِئَ تو کلمہ (شاطئ) سے اس جگہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ جہاز کنارے کے ساتھ ساتھ چلا کیونکہ کنارہ تو چلتا ہی نہیں "واو" کے معنی یہاں (مع) کے ہیں اور اس کو "واو معیت" کہتے ہیں، اسی طرح جب ہم یہ کہیں عَادَ الْعُمَّالُ وَغُرُوبَ الشَّمْسِ تو کلمہ (غروب) سے ہم پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ (عمال) کی واپسی غروب آفتاب کے ساتھ تھی ــــ اس نوع کے ہر کلمہ کو "مفعول معہ" کہتے ہیں اور ہمیشہ منصوب ہوتا ہے"

کتاب کے آخر میں مشکل الفاظ کی فرہنگ دی ہے، عربی سیکھنے والوں کے لئے یہ کتاب بہت فائدہ مند ثابت ہوگی۔

جنگِ آزادی کا ایک مجاہد

از:۔ محمد ایوب قادری (بی۔ اے) ضخامت ۴۰ صفحات (مجلد) قیمت بارہ آنے ملنے کا پتہ: محمد نصرت اللہ قادری مینیجر پاک اکیڈمی ۱۴۴

صفحہ کی جگہ "نفح لطیب" کو "نفح الطیب" (ح کے بجائے "خ") اور ابن حزم کو "ابن خرم" لکھا ہے، جو لوگ عربی نہیں جانتے، وہ کتابت کی اس غلطی میں مبتلا ہوسکتے ہیں۔

صفحہ ۲۹ پر "فتحہ" کو "فتحہ" لکھا ہے (اور اس کے آخر میں ہمیشہ فتحہ رہتی ہے) حالانکہ "فتحۃ" زبر کو کہتے ہیں!

محمد آباد، گولی مار، کراچی :

مولانا فیض احمد بدایونی مرحوم بدایوں کے ایک علمی و خانقاہی خانوادے کے چشم و چراغ تھے، چودہ سال کی عمر میں علوم منقول و معقول میں فارغ التحصیل ہوگئے۔ سلطنی اور شاعری میں بھی صاحب درک تھا۔ ان تمام کمالات کے ساتھ جہاد کا ولولہ اپنے اندر رکھتے تھے، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی جب شروع ہوئی تو مولانا فیض احمد بدایونی انگریزوں کے خلاف جہاد میں پیش پیش تھے، جنگ آزادی کے ہیرو جنرل بخت خاں جنگی معاملات میں مولانا مرحوم سے مشورت کرتے تھے اور جنرل بخت خاں کے وہ معتمد علیہ تھے، انگریزوں کے خلاف علمائے کرام نے جہاد کا جو فتویٰ دیا تھا اس کی سب سے زیادہ نشر و اشاعت مولانا فیض احمد بدایونی نے کی، بدایوں کے قریب لگرالا کے معرکہ میں بھی سرفروش جماعت کے پرجوش کارکن یہی مولانا تھے!

مولانا شاہ سید احمد اللہ، ہی جنہوں نے حقیقت میں جہاد کا صور پھونکا تھا، اور نہ جانے کتنے مورچوں اور میدانوں پر انگریزی فوج سے وہ نبرد آزما ہوئے تھے، مولانا فیض احمد بدایونی ان کے دست راست تھے۔۔۔ اگر چند یہ لوگ غداری نہ کرتے تو یہ جنگ آزادی کامیاب ہوجاتی اور ہندوستان کی تاریخ پھر کچھ اور ہوتی، لیکن مشیت کو کچھ اور ہی منظور تھا!

مولانا احمد اللہ صاحب کی شہادت اور مجاہدین کے منتشر ہوجانے کے بعد مولانا فیض احمد روپوش ہوگئے، کہا جاتا ہے کہ وہ نیپال کی طرف چلے گئے، مگر کوئی یقینی بات نہیں کہی جاسکتی کہ وہ کہاں گئے اور کیا حشر ہوا؟

مورخین نے مولانا فیض احمد بدایونی جیسے مجاہد کو نظر انداز کر دیا تھا، جناب محمد ایوب قادری نے اس فروگذاشت کی تلافی کی ہے، اور بڑے سلیقہ سے واقعات کو یکجا کرکے ایک گمنام مجاہد کو روشناس کرایا ہے!

سماع کی حقیقت

از: میر نذر علی درد کاکوروی، ضخامت ۴۰ صفحات (قیمت درج نہیں) ملنے کا پتہ: — محمد امیر الدین، مسجد محلہ صرافہ، اورنگ آباد (دکن)

یہ رسالہ "سماع" کے جواز میں لکھا گیا ہے، اس میں جو عقلی و نقلی دلیلیں "سماع" کے جواز پر لائی گئی ہیں اس کا جواب اگر دیا جائے، تو "فاران" کی شاید ایک اشاعت اسی بحث کی نذر ہو جائے گی!

حد ہوگئی تجاوز عن الحق کی، آج کل جو قوال مزامیر کے ساتھ گاتے بجاتے ہیں، اور جسے "سماع" کا نام دیا گیا ہے اس کے جواز کی قرآن پاک کی اس آیت:

"وَالَّذِين يَستمعون القولَ فيتبعون احسنه"

سے دلیل لائی گئی ہے:

میر درد صاحب کاکوروی لکھتے ہیں کہ "علماء و مشائخ کا ایک گروہ کہتا ہے، اس آیت "یستمعون" سے "سماع" مراد ہے" معاذ اللہ! یہ اللہ کے کلام کی کھلی ہوئی معنوی تحریف ہے:

اور سنیئے:- وَاِن من شیءٍ الا یسبح بحمدہ ولکن لا تفقھون تسبیحھم

(اور کوئی چیز نہیں، مگر اللہ کی یاد کرتی ہے، لیکن تم نہیں سمجھتے۔)

اس آیت کے تحت اگر کوئی یہ سمجھے کہ ہارمونیم، ڈھولک یا طبلے کی آواز یا تھاپ سے اللہ اللہ یا اللہ ہو کی صدا نکلتی ہے تو کیا بری بات ہے ۔۔۔ یہ بُری بات کیوں ہونے لگی، یہ تو بڑے ثواب کی بات ہے، اور جب قرآن آپ

جب "متصوفین" کا تختۂ مشق بن جائے تو پھر طوائفیں پشوری اور گھنگرو بندھ کر جو رقص کرتی ہیں، ان کا لعب بھی "ذکر اللہ کی تسبیح" ہی قرار پائے گا ـــ توبہ! معاذ اللہ! اس فکر و دانش سے کروڑ بار اللہ کی پناہ!

اگر قرآن پاک کی تفسیر اسی انداز پر کی جائے، اور اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو اسی طرح کھیل بنایا جائے تو پھر ایک زانی اور چور "إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ" کو اپنی صفائی میں پیش کر سکتا ہے!

مصنف کی جسارت بیجا کا یہ عالم ہے، فرماتے ہیں:-

"... بلکہ جن لوگوں نے سماع مع مزامیر کو لہو الحدیث کے تحت داخل کیا ہے، ان پر العلم حجاب الاکبر کی تعریف صادق آتی ہے۔"

حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے آلات موسیقی کا توڑنے والا بنا کر مبعوث فرمایا تھا!

مصنف نے یہ جو نے کن کن صوفیوں اور بزرگوں کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کا "سماع" میں انتقال ہوا، مگر کسی کے "سماع" میں انتقال فرما جانے سے "سماع" کی حلت تو ثابت نہیں ہو سکتی، دین کے مسائل کا کسی کے مرنے جینے اور غمگین و رنجیدہ ہونے کی کیفیات سے کیا تعلق ہے؟ کاش! ان بزرگوں کا نماز پڑھتے میں انتقال ہوتا۔

سازد از حق وصی مصطفیٰ   پیر مشہ مرداں علی مرتضیٰ

حضرت علی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا "وصی" سمجھنا، یہ اہل رفض کے تراشے ہوئے عقائد ہیں، یہ وہ عقیدہ ہے، جس کی براہ راست ضرب خلفائے ثلاثہ پر جا کر پڑتی ہے!

اس فکر نادرہ کار کو آخر ہم کیا کہیں، جس نے اس حدیث:

"زَيِّنُوا الْقُرْآنَ بِأَصْوَاتِكُمْ"

(زینت دو قرآن کو اپنی آوازوں سے)

کو "سماع" کے جواز کے لئے سند میں پیش کیا ہے!

یہ لطیفہ بھی تو ملاحظہ فرمائیے ـــــ لکھتے ہیں:

"... حضرت آدم علیہ السلام کا پتلہ تیار ہوا اور اس میں اللہ نے اپنی روح پھونک یعنی روح کو آدم کے جسم میں جانے کا حکم دیا، تو یہ کالی کوٹھری دیکھ کر گھبرائی، فوراً اللہ تعالیٰ نے حوروں سے کہا گاؤ، حوروں نے گانا شروع کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ اس سماع کی تجلی سے آدم کا دل جگمگا اٹھا۔"

اب بس یہ کہنا باقی رہ گیا ہے ... کہ "فرشتے باجا بجاتے ہیں، حوریں رقص کرتی ہیں اور اللہ تعالیٰ نیچے جاتا ہے" (معاذ اللہ)

اے صاحبان وجد و حال! اگر کچھ صوفیا سماع سنتے تھے، تو ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو، اس کے جواز کے لئے کتاب و سنت میں تو تحریفیں نہ کرو، اور اسلام کو تو "رنگ و چنگ" کا مذہب نہ بناؤ!

فلسفۂ نماز از سید محمد ہاشم صاحب ہاشمی، ضخامت ۶۴ صفحات (مجلد مع گرد پوش اور جاذب نظر) قیمت ایک روپیہ، ملنے کا پتہ: اظہر بک ڈپو متصل مسجد آرام باغ، کراچی ۱

مولانا سید محمد ہاشم صاحب ہاشمی نے یہ کتاب بڑی دردمندی کے ساتھ لکھی ہے، مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں کو نماز

پڑھنے کا شوق پیدا ہوا اور وہ دین کے اس عظیم الشان فریضے سے غفلت نہ برتیں! موصوف نے اپنے مخصوص فلسفیانہ انداز میں نماز کی ضرورت اور اس کے فوائد پر بھی روشنی ڈالی ہے ــــ مگر اس کتاب میں "الصلوٰۃ" پر جو کم لکھا گیا ہے، علاوہ اقتصادی اور معاشی مسائل کا ہے، جن میں سے بعض کا تو "نماز" کے ساتھ بس کھینچ تان کر ہی جوڑ ملایا جا سکتا ہے!

"..... یہاں تک کہ جو شخص اپنی نماز کے ذریعہ صرف بقائے الٰہی کی نیت نہیں کرتا تو از روئے باطن اس کی نماز ادا نہیں ہوتی، بلکہ نماز میں جنت و جہنم کا تصور بھی شریک نیت نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ یہ بھی ایک قسم کا شرک ہے، جو مخلصین للدین کے خلاف ہے... " (صفحہ ۱۹)

اس بیباکی اور غیر ذمہ داری کے ساتھ "شرک" کا فتویٰ لگا دینا اہلِ حق کو زیب نہیں دیتا! ایک نمازی جب قرآن پاک میں وہ آیتیں تلاوت کرے گا، جن میں "جنت کی نعمتوں" اور "دوزخ کے عذاب" کا ذکر ہے، تو کیا وہ اپنے ذہن کو "جنت کی تمنا اور "دوزخ کے عذاب سے بچنے" کی آرزو سے خالی رکھ سکتا ہے؟ اور ان آیتوں سے کیا وہ کوئی اثر قبول نہ کرے گا!

یہ تو محض شاعرانہ خوش خیالیاں ہیں کہ :-

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو

"جنت" محلِ رضائے الٰہی ہے لہٰذا اس کی تمنا اور طلب کرنی چاہیے، اس سے اخلاصِ عبودیت اور نکھرتا ہے، مکدر نہیں ہوتا!

تحریک مجاہدین کا انقلابی پہلو

از : اسعد گیلانی، ضخامت ۲۶۲ صفحات، مجلد، رنگین و خوبصورت گرد پوش کے ساتھ! قیمت تین روپے ملنے کا پتہ : مکتبۂ تعمیر انسانیت، اچھرگلی، موچی گیٹ، لاہور

حضرت سید احمد بریلوی شہید رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد اسمٰعیل شہید قدس سرہٗ نے ہندستان میں جو جہاد کیا تھا، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ باطل سے ٹکرانے اور اُلجھنے کی جو طرح ڈالی تھی، یہ کتاب اُسی ایمان افروز داستان کی ہنری کڑی ہے! جناب اسعد گیلانی نے یہ کتاب بڑے جوش، ولولہ اور عقیدت کے ساتھ لکھی ہے، موصوف "اقامتِ دین" کی تحریک میں برسوں سے عملی طور پر حصہ لے رہے ہیں! اس لئے اُن کے مردانہ دلوں نے اس شرابِ طہور کو دو آتشہ بنا دیا ہے!

کوئی شک نہیں کہ مولانا غلام رسول مہر نے سید احمد شہید کی مبسوط و جامع تصنیف لکھ کر بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے، لیکن اسعد گیلانی کی کتاب ــ "تحریک مجاہدین" کو پڑھ کر جو ولولۂ جہاد، وہ جوشِ فداکاری پیدا ہوتا ہے، اس اگری سے مہر صاحب کی کتاب خالی خالی سی نظر آتی ہے!

کتاب کی ترتیب بھی بہت خوب ہے، ہر باب کے آغاز میں آیاتِ قرآنی اور احادیث نبوی درج ہیں، سلیس ترجمہ دیا گیا ہے، جس سے قلب آنے والے مضمون کے لئے اچھی طرح سے متاثر اور تیار ہو جاتا ہے! اسعد صاحب کے اندازِ بیان کی دلنشینی اور خلوص قلبی نے کتاب کو بہت دلچسپ بنا دیا ہے! اللہ تعالیٰ مصنف اور ناشر کو داد دیں!

اجرِ عطا فرمائے ! آمین)

طریقہ جدیدۃ فی تعلیم العربیہ
(الجزء الثالث)

مؤلف: سید محمد امین المصری ضخامت ۲۴۰ صفحات قیمت دو روپے، ملنے کا پتہ: المکتبۃ العلمیہ ۱۵ لیک روڈ لاہور

جناب محمد امین المصری وزارت خارجہ شام کی طرف سے عربی زبان کی ترویج کے لئے پاکستان میں مامور تھے، صاحب موصوف نے کئی سال تک اپنے کام کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا اور اس مدت میں انھوں نے عربی زبان سیکھنے کے لئے کئی کتابیں لکھیں؛

سید محمد امین المصری عربی تعلیم کا وسیع تجربہ رکھتے ہیں، وہ اس کو جانتے ہیں کہ عربی سیکھنے میں طلبہ کو کیا مشکلات پیش آتی ہیں، وہ عربی گرامر اُن کو کس طرح ذہن نشین کرائی جائے کہ گرامر کی خشکی سے انھیں وحشت بھی نہ ہو، اور باتوں باتوں میں عربی گرامر کے قاعدے ذہن میں اُترتے چلے جائیں!

یہ کتاب جو ہمارے سامنے ہے، ہر اعتبار سے مفید، کارآمد اور زبان و انشاء کے اعتبار سے مستند ہے! نوشقوں کے مزاج، استعداد اور ذہن و فطرت کے مطابق دروس و تمرینات (Lessons & Excercises) مرتب کئے گئے ہیں، آخر میں قرآنی آیات اور احادیث نبوی درج کی گئی ہیں کہ مؤلف عربی کو صرف "عربی" کے لئے سکھانا نہیں چاہتے، عربی تو بہت سے عیسائی اور یہودی بھی جانتے ہیں، ان کا مقصود یہ ہے کہ "عربی" کے ذریعہ قرآن و احادیث سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو اور مسلمان براہِ راست کتاب و سنت سے استفادہ کر سکیں! مکتبۃ العلمیہ اس کتاب کی اشاعت پر مبارکباد کا مستحق ہے۔

ترجمان القرآن
جزء تبارک (۲۹)

مؤلف: عبدالحق عباسی، ضخامت ۱۶۸ صفحات، ہدیہ ایک روپیہ آٹھ آنہ، ملنے کا پتہ: المکتبۃ العلمیہ ۱۵ لیک روڈ لاہور۔

مولانا عبدالحق عباسی صاحب نے قرآن پاک کے انتیسویں پارہ (تبارک الذی) کو لفظی اور محاورہ ترجمہ کے ساتھ کتابی صورت میں پیش کیا ہے، ایک نمونہ:

تَبٰرَكَ الَّذِىْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ

۱ تبارك	الذی	ب	ید	ہ	ال	مُلْكُ
بابرکت ہے	وہ کہ	میں ہے	ہاتھ	اُس کے		ملک

(بڑا بابرکت ہے وہ (عالی ذات) جس کے ہاتھ میں سارا راج ہے)

قرآن کی تفہیم کی یہ کوشش مفید اور لائق ستائش ہے:

ترجمہ میں کہیں کہیں کھٹک بھی پیدا ہوئی:

"اِنَّ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ" (یقیناً) وہ لوگ خائف رہتے ہیں اپنے رب سے، صفحہ ۹ "خائف" ایک تو مشکل لفظ ہے، دوسرے "خائف" اگرچہ "خوف" سے مشتق ہے، مگر "خشیۃ" کی اس سے ٹھیک طور پر ترجمانی نہیں ہوتی، یقیناً وہ لوگ اپنے رب سے ڈرتے رہتے ہیں، سیدھا سادہ ترجمہ ہو سکتا تھا؛

"اِنَّ لَکَ لَاَجْرًا غَیْرَ مَمْنُوْنٍ" (تیرے لئے تو ایسا اجر ہے کہ گھٹنے کا نہیں۔" (صفحہ ۲۲)
"گھٹنے کا نہیں" زیادہ بامحاورہ نہیں ہے ـــــ "تیرے لئے تو ایسا اجر ہے جس میں کوئی کمی نہ ہوگی" غالباً موزوں ترجمہ ہے۔

شانِ رسالت

از: مولٰنا قاری محمد طیب دیوبندی، ضخامت ۷۲ صفحات ملنے کا پتہ مکتبۂ خانہ حدیقیہ بیرون بوہڑ دروازہ، ملتان شہر

حضرت مولٰنا قاری محمد طیب صاحب اپنے اسلاف کے صحیح جانشین اور علوم نبوی کے حامل و وارث ہیں، اللہ تعالیٰ نے اُن کی زبان و قلم کو خدمتِ دین کے لئے وقف کر دیا ہے، قاری صاحب موصوف نے اس کتاب میں "شانِ رسالت" کو واضح کیا ہے، استدلال و تفہیم کے لئے جگہ جگہ کلام و فلسفہ کا انداز آگیا ہے، جس نے اس کتاب کو عقلی دلائل کے لحاظ سے بھی بہت وقیع بنا دیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت تو ایک ایک سطر سے جھلکتی ہے۔ ثابت یہ کیا گیا ہے کہ شانِ رسالت، شئونِ الٰہیہ کا مظہر ہوتی ہے! اپنے موضوع پر یہ کتاب بہت خوب ہے!

ایک اقتباس:-

"حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے مقاماتِ رفیع کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ انسانی سعادت و تکمیل کا مدار تین قوتوں پر ہے، ایک قوتِ علمیہ، ایک قوتِ عملیہ، ایک قوتِ اخلاقیہ، اگر علم و عمل و اخلاق حدِ کمال تک پہونچ جائیں تو یہی انسان کی تکمیل کی نشانی ہے، سو اندازہ کیجئے کہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ کی علمی قوت تو اس حد پر آگئی تھی کہ نصوصِ شرعیہ میں کہیں بھی تعارض نظر نہ آتا تھا، عملی قوت اس درجہ پر آگئی تھی کہ امورِ شرعیہ، امورِ طبیعیہ بن گئے تھے اور قوتِ اخلاقیہ اس مرتبہ پر آگئی تھی کہ مادح اور ذام یکساں نظر آنے لگے تھے۔"

کتاب میں کہیں کہیں کھٹک بھی پیدا ہوئی ہے:-

"وہ اگر معبودیت میں وحدہٗ لاشریک ہے تو آپ اپنی عابدیت میں وحدہٗ لاشریک ہیں" (صفحہ ۵۹)

"عبدیت" ہی میں سہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "وحدہٗ لاشریک لہٗ" نہیں کہنا چاہیئے، حضرت قاری صاحب اللہ کے فضل سے توحید کے تقاضوں کو اچھی طرح پہچانتے ہیں اور شرک و بدعت کا رد تو ان کا کام ہی ہے، وہ صحیح العقیدہ عالم ہیں ـــــ مگر اس عبارت میں اُن کے قلم سے بھول چوک یا یوں کہیئے شوخی سرزد ہوگئی! اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے لئے جو الفاظ مخصوص ہیں، انھیں کسی دوسرے کے لئے استعمال نہ کرنا چاہیئے!

"..... اور گویا آپ نے وہی کیا جو صفاتِ الٰہیہ کرتیں، یعنی صفاتِ الٰہیہ نے آپ کی ذاتِ اقدس میں جلوہ گر ہو کر اپنا کام انجام دیا ـــ" (صفحہ ۶۲)

اس خیال کو بھی محتاط لفظوں میں ادا کرنا تھا، اس قسم کی عبارت سے عقیدت کے اُس غلو کے لئے چور دروازے نکل سکتے ہیں، جس "غلو" سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روکا ہے،

کتاب کے آخر میں فضائلِ صحابہ اور ترتیبِ خلافت سے جو بحث کی گئی ہے، وہ بھی بہت وزنی اور معقول ہے۔ اس کتاب کی افادیت اپنی جگہ ثابت و مسلم ہے!

ہدایت الشیعہ

از: حضرت مجدد الف ثانی سرہندی ضخامت ۳۲ صفحات قیمت چار آنہ ملنے کا پتہ:- ادارہ الکتاب ۸۰ اسٹرکلر روڈ چوک انارکلی لاہور

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک فارسی مکتوب کا ترجمہ "ہدایت الشیعہ" کے نام سے ادارہ "الکتاب" نے شائع کیا ہے، حضرت مجدد صاحب نے اس میں یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ نے خلفائے ثلاثہ کے زمانہ میں تقیہ ہرگز نہیں کیا تھا، فاتح خیبر سے یہ بزدلی ظہور میں نہیں آسکتی اور صحابہ کرام حضور کے معاون و انصار اور دل و جان سے فدائی تھے، اس لئے:-

"ہر عاقل منصف صحابہ کرام کے بغض کو اُن کی محبت کے بجائے کبھی نہیں اختیار کرے گا" اور پیغمبر علیہ الصلوٰۃ و السلام کی دوستی کے سبب تمام اصحاب سے دوستی رکھے گا۔"

اور

"قرآن و حدیث، صحابہ کی تعلیم سے ہم تک پہونچے ہیں، اگر اصحاب رسول ہی مطعون ہوگئے، تو وہ دین جو ان کے ذریعہ ہم تک پہونچا ہے، ضرور مطعون ہوگا!" نعوذ باللہ سبحانہ من ذالک"

اسلام کی قدریں اور ان کا اشتراکی نظام سے اجمالی تقابل

از:- ڈاکٹر سید اعجاز حسین جعفری، ضخامت ۳۶ صفحات (قیمت درج نہیں) ملنے کا پتہ: اسلامک کمپوزرز، ڈھاکہ۔

اس کتابچہ میں مسلمانوں کو "اشتراکیت" سے دُور رہنے کی تلقین کی گئی ہے اور یہاں تک کہا گیا ہے کہ کمیونزم "فرعون" ہے اور "اسلام" ہی موسیٰ بن کر اس فرعون کی قوت کو توڑ سکتا ہے!

فاضل مصنف نے اشتراکی فلسفہ کا نگاہ تعمق سے مطالعہ کیا ہے، اسی لئے وہ "اشتراکیت" سے بہت زیادہ بیزار ہیں، انھوں نے، اجمالی طور پر کارل مارکس کی تعلیمات سے بھی بحث کی ہے، اور اس کے کلیئہ تضاد، کلیہ نفی اور کلیہ تغیر کی تشریح فرمائی ہے:

ڈاکٹر جعفری نے اسلام اور اشتراکیت کا مقابلہ کرکے بھی دکھایا ہے کہ ان میں سے کس نظام میں عوام کے لئے زیادہ سے زیادہ رفاہیت، آسودگی، آزادی اور بہتری پائی جاتی ہے اور کونسا نظام جابرانہ اور غیر فطری ہے انتہاپسندانہ بھی جس میں کوئی توازن نہیں!

سورۂ فاتحہ کی تفسیر

از:- مولانا شائق احمد عثمانی، ضخامت ۴۵ صفحات قیمت آٹھ آنہ ملنے کا پتہ: پبلشرز علمی مرکز ۱۶/۲۰۹ پیر الٰہی بخش کالونی ۔ کراچی ۵

مولانا شائق احمد عثمانی خلافت کے زمانہ کے قومی ورکر اور بہت پرانے صحافت نگار ہیں، انگریز کے دور میں انھوں نے قید و بند کی مصیبتیں بھی برداشت کی ہیں، موصوف ایک درد مند عالم دین ہیں، اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے شرف تلمذ رکھتے ہیں۔

مولانا شائق احمد عثمانی نے سورۂ فاتحہ تفسیر بڑے دل نشین اور عام فہم انداز میں لکھی ہے، جسے پڑھ کر اللہ اور رسول کی محبت دل میں پیدا ہوتی ہے۔ اور آخرت کا یقین مستحکم تر ہوتا ہے!

۱۰ اقامتِ صلوٰۃ

از مولانا عبدالحلیم قاسمی، ضخامت ۸۰ صفحات، قیمت مجلد ایک روپیہ، غیر مجلد بارہ آنے، ملنے کا پتہ: جامعہ حنفیہ، شبلی روڈ، لاہور

مولانا عبدالحلیم صاحب قاسمی نے "اقامتِ صلوٰۃ" کی اہمیت اور فرضیت، نماز کے شرائط، فرائض، واجبات سنن اور دیگر ضروری مسائل کو مستند اور تمام، طریقہ پر مسلکِ حنفیہ کے تحت پیش کیا ہے۔

"... جو افراد گندے ماحول میں پروان چڑھے ہیں اور معصیت میں گرفتار ہیں، ان کے لئے نماز بہت بھاری بھرکم ہے" (صفحہ ۱) "بھاری بھرکم" کا استعمال یہاں صحیح نہیں ہو "گراں" یا "بھاری" لکھنا چاہئے تھا، صفحہ ۱۳ پر بھنگ پینے والے کو "بھنگی" لکھا ہے "بھنگی" تو خاکروب کو کہتے ہیں، بھنگ پینے والے کو بھنگڑ کہا جاتا ہے۔

"... مسلمان نے نماز ادا کرنا ہے" "نے" روزمرہ کے خلاف ہے "کو" لکھنا چاہئے تھا! صفحہ ۱۰ پر "سجدہ سہو کرنے" کو "سجدۂ سہو نکالنا" لکھا ہے، سجدہ کیا جاتا ہے نکالا نہیں جاتا!

کتاب اپنے موضوع پر بہرحال مفید اور کارآمد ہے!

جلوسِ عزا سے متعلق سوادِ اعظم اہلِ سنت کا نقطۂ نظر

ضخامت ۶۴ صفحات، قیمت درج نہیں، ملنے کا پتہ: سعید برادران کچہری روڈ ملتان شہر

اس کتابچہ میں شیعہ اخبارات، رسالوں اور ان کے مقررین کی تقریروں کے حوالے دے کر اس ناخوشگوار حقیقت کو سامنے لایا گیا ہے کہ کس طرح ان سے صحابہ کرام اور خاص طور سے خلفاء ثلاثہ پر سب و شتم کی جاتی ہے! اور ان نفوسِ قدسیہ کو برا بھلا کہا جاتا ہے (خاک بدہن گستاخ)

اس کتابچہ میں کتب اہلِ بیت اور شیعوں کی مستند کتابوں کے حوالے سے ثابت کیا گیا ہے کہ جزع فزع اور ماتم کرنے کو خود ائمہ اہلِ بیت نے پسند نہیں فرمایا بلکہ اس کی ممانعت کی گئی ہے!

اس کتابچہ کا سب سے زیادہ اہم حصہ وہ ہے، جس میں علماء کرام نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ مروجہ ماتمی جلوسوں سے فرقہ وارانہ منافرت پھیلتی ہے، اسلامی تمدن کی ہنسی اڑتی ہے [illegible] ق کے قانونوں کی خلاف ورزی ہوتی ہے ——— لہٰذا جلوس [illegible] ممنوع قرار دیا جائے!

یہ ایک حقیقت ہے کہ فتنہ "مدح" سے نہیں "دشنام طرازی" سے پیدا ہوتا ہے ... اس پر اربابِ قضا اور اہلِ فکر اگر عدل و انصاف سے غور کریں، تو وہ انگلی رکھ کر بتا سکتے ہیں کہ "فتنہ" کا سرچشمہ کہاں ہے!

آشفتہ بیانی میری

از رشید احمد صدیقی، ضخامت ۱۹۲ صفحات، قیمت مجلد تین روپے، غیر مجلد دو روپے آٹھ آنے، ملنے کا پتہ: سرسید بک ڈپو، شمشاد بلڈنگ علی گڈھ

جناب رشید احمد صدیقی کو کون نہیں جانتا، ان کے قلم نے اُردو زبان کو اتنا کچھ دیا ہے، کہ آئندہ نسلیں اس پر فخر کریں گی، اور لوگ تعجب کریں گے کہ اس قدر پُرآشوب دور میں ایسا شگفتہ نگار، طناز کیسے پیدا ہو گیا، دل کو گدگدانے اور لبوں پر مسکراہٹ پیدا کرنے میں تو فرحت اللہ بیگ دہلوی شاید سب سے آگے ہیں، مگر طنز و مزاح میں جس نے فلسفہ اور حقیقت کے باب اور ذہنی سنجیدگی کو برقرار رکھا ہے، اس کا نام رشید احمد صدیقی ہے!

یہ کتاب ـــــ آشفتہ بیانی میری ـــــ رشید صاحب کی تازہ ترین تصنیف ہے اس کتاب کا تعلق ان کی علی گڑھ کی زندگی سے ہے، اس "آپ بیتی" کی دلکشی اور جاذبیت کا کیا کہنا، شاید ہی کوئی ایسا بدذوق ہوگا جو اس کتاب کو ہاتھ میں لے کر اسے ختم کئے بغیر رہ سکے، کس بلا کی روانی، اور کس قیامت کی شگفتگی ہے، زبان ایسی صاف ستھری اور نکھری ہوئی جیسے ابھی ابھی قلعہ معلی کے مرمریں حوض میں نہا کر آئی ہے ـــــ اور وہ بھی اس انداز سے کہ:۔

؎ جھک جھک کے نچوڑتی ہوئی بال

چند اقتباسات:۔

"مجھے اعتراف ہے۔ مجھ میں کمزوریاں بھی ہیں گو میں اس کے جواز میں کسی قیمت پر یہ کہنے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ کون ہے جس میں کمزوریاں نہیں ہوتیں، لیکن یہ علی گڑھ کی دی ہوئی نہیں ہیں میں ان کو ساتھ لایا تھا ـــ"

ـــ "شاید مجھ پر یہ الزام رکھا جائے کہ میں اپنا پروپیگنڈا کرتا ہوں، لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی ذہن میں آئی کہ میرا پروپیگنڈا دوسرے کیا کم کرتے ہیں کہ میں خود کرنے لگوں، پھر عمر کی جس منزل میں ہوں وہاں پروپیگنڈا نہیں کرتے توبہ و استغفار کرتے ہیں یا فقدانِ ثالث ـــ"

ـــ "ماسٹر صاحب رامائن بڑے والہانہ انداز سے پڑھتے اور اس کا مطلب اتنی ہی نرمی اور محبت سے اپنی زبان میں جو ٹھیٹھ پوربی سے بھی زیادہ ٹھیٹھ کوئی چیز ہوتی سمجھاتے، حاضرین جن میں دیہاتی مرد عورت بچے ہوتے، زمین پر ہاتھ جوڑے اس طرح اکڑوں بیٹھے ہوتے جیسے اس زمانے کے تھانیداروں کے سامنے مستغیث اور ملزم دونوں روزنامچہ میں پولیس کا بیان اپنی زبان میں لکھاتے ہوتے ـــ"

ـــ "تقسیم ملک کے بعد علی گڑھ کی آبادی میں ذاکر صاحب کو جن دقتوں اور نزاکتوں کا سامنا رہا اور جن پر انھوں نے جتنے کم عرصہ میں خاموشی اور خوبصورتی سے قابو پا لیا وہ ایک ایسی داستان ہے جو شاید کبھی لکھی نہ جا سکے لیکن عوامی گیتوں کی طرح ہمیشہ یاد رکھی جائے گی ـــ"

ـــ "[illegible] مذہب کے پورے اعتماد کے ساتھ کتنا خوبصورت اور توانا کھیل کھیلتے ہر اسٹروک جیسے جنتر سے نکلا ہوا تار یا کڑی کمان کا تیر ـــ"

ـــ "ادھر سے گزرتے ہوئے تفسیر کلاس میں بیٹھنے والوں کی عقیدت و احترام اور درس دینے میں مرحوم کے "جذبۂ بے اختیار شوق" کو دیکھ کر متاثر ہوتا تھا اور دل میں [illegible] تھی کہ کیسی دلکش مسجد میں کتنا شاندار شخص کس موضوع پر کتنا دل افروز درس دے رہا ہے"

ـــ "ڈاکٹر صاحب بڑے کم گو اور کم آمیز تھے، نپی تلی بات کرتے اور قرینہ آداب سے ہٹ کر مسکرانا تک گوارا نہ کرتے، اگر کبھی خوش طبعی کا کوئی فقرہ کہہ دیتے تو لطف لینے سے پہلے سوچنا پڑتا ـــ کہ

؎ ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

ـــ "اردو میں ایسے لکھنے والے کم نہیں ہیں، جو اکثر موضوع کو اسلوب پر قربان کر دیتے ہیں، انشاپردازی کی یہ کمزوری ہے کہ اس کا موضوع اس کے اسلوب کا شکار ہو جائے"

ـــ "نذیر احمد جیسے شخص میں جنھوں نے عورت کو داستان طرازوں بادشاہوں اور شاعروں کے قبضے سے نکال کر روزانہ زندگی کے نشیب و فراز اور دھوپ چھاؤں میں دکھایا ہے"

دو چار جگہ کھٹک بھی پیدا ہوئی ——— "تعویذیں باندھی ہوں گی" (صفحہ ۳۰) "تعویذ" بالاتفاق مذکر ہے ——— "دعائیں گھول کر پی ہوں گی" ——— "دعاؤں" کی جگہ "نقش" لکھتے تو بات صاف ہو جاتی ——— "سرسید مغلیہ سلطنت کی تباہی اور غدر کی ہولناکیوں سے برآمد ہوئے (صفحہ ۳۸) یہ ترجمہ سا معلوم ہوتا ہے! ——— "سرسید کی تحریروں نیز ان کی عام اقدامات میں وہ توانائی یا غلبہ زائی ملتی ہے" (صفحہ ۱۵۸) یقین نہیں آتا کہ رشید احمد کے قلم سے یہ جملہ نکلا ہو ممکن ہے کتابت کی غلطی نے اصل تحریر کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا ہو ——— "ان کی عام اقدامات" حالانکہ "اقدام" بھی مذکر ہے اور اس کی جمع بھی مذکر ہونی چاہیے پھر "سرسید کے عام اقدامات" یہ کیا بات ہوئی اور "غلبہ زائی" اس پر مستزاد!

رشید احمد صدیقی نے مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی شخصیتوں کو اپنی تحریر میں مصور کر دیا ہے ان شخصیتوں میں مشتاق اور مولانا سید جان اشرف مرحوم سے لیکر کھن پنواڑی اور سراج بیرے تک شامل ہیں کوئی مشتاق ناول نویس اور ذہین افسانہ نگار بھی شاید اس سے بہتر کردار نگاری نہ کر سکتا!

رشید صاحب سرسید اور حالی سے بہت زیادہ متاثر ہیں اس لئے شبلی کی مدح سرائی میں ان کا قلم رک رک کر چلا ہے حالانکہ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ شبلی سے بڑا انشاء پرداز اردو زبان میں اب تک پیدا نہیں ہوا!

"آشفتہ بیانی میری" ——— بہت اونچے درجہ کی کتاب ہے۔ رشید صاحب نے یہ کتاب لکھ کر اردو زبان کی قدر و قیمت میں اضافہ کیا ہے۔ رشید احمد جیسے "آشفتہ بیان" روز روز پیدا نہیں ہوتے۔

نوائے فردا

محمد ایوب، ضخامت ۲۲۲ صفحات (اقبال کی زبور عجم کے سائز پر) مجلد کتابت، طباعت، کاغذ مرتبہ خوب سے خوب تر، قیمت: پانچ روپیہ ملنے کا پتہ ——— فیروز سنز کراچی۔

جناب ایوب صاحب (شیخ محمد ایوب) اچانک ایک نو طلوع ستارے کی طرح شعر و ادب کے افق پر نمودار ہوئے ہیں۔ صحافت و ادب اور شعر و سخن کی دنیا میں وہ پہلی بار متعارف ہو رہے ہیں! صاحب موصوف پاکستان کی مرکزی وزارت مواصلات کے نائب مشیر مالیات ہیں اس خشک بلکہ یوں کہئے غیر شاعرانہ عہدے کے ساتھ شاعرانہ ذوق کو نباہ دینا شیشہ و سنگ کا امتزاج ہے۔

ان کے فارسی کلام کے اس مجموعہ ——— نوائے فردا ——— پر جناب ڈاکٹر محمد رفیع الدین (ڈائرکٹر اقبال اکیڈمی) نے عالمانہ اور فلسفیانہ دیباچہ لکھا ہے یہ کتاب اسی قسم کے بلند و عمیق دیباچہ کی مستحق تھی۔

چند اقتباسات:-

"انسان کی طلب جمال جب اس کے روزمرہ کے افعال کو اپنی راہ بناتی ہے تو ہم اسے حسن اخلاق (Morality) کا نام دیتے ہیں۔ جب طلب صداقت کی صورت اختیار کرتی ہے تو ہم اسے جستجوئے علم کہتے ہیں۔ اجب وہ کسی تصور حسن کمال (آئیڈیل) کے تتبع کی شکل میں نمودار ہوتی ہے، تو ہم اسے نصب العین یا نظریہ حیات کی پیروی کا نام دیتے ہیں۔ اور جب وہ کسی محسوس واسطہ (Medium) کے پیرایہ میں اپنا اظہار پاتی ہے، تو ہم اسے فن (Art) کا نام دیتے ہیں۔"

——— "اگر ہم مصوری کے ایک اچھے نمونہ کو شعر منقوش یا شاعری کے ایک اچھے نمونے کو تصویر ملفوظ کہیں تو بجا ہے"

——— "شاعر کی آرزوئے حسن عام آدمیوں کی نسبت زیادہ شدید ہوتی ہے، لہذا وہ اپنی شدت آرزو کی وجہ

لیے ان چیزوں کی طرف وہ صفاتِ حسن بھی منسوب کر لیتا ہے جو فی الواقع ان کے اندر موجود نہیں ہوتیں۔"

اس دیباچہ میں اظہارِ خیال کہیں کہیں اتنا گہرا ہو گیا ہے کہ وہ ہم جیسے عامیوں کو پیچیدہ اور گنجلک محسوس ہوتا ہے! جناب ایوب نے اپنی یہ کتاب — نوائے فردا — علامہ اقبال کی — زبورِ عجم — کے جواب میں نہیں بلکہ "تقلید" میں لکھی ہے، وہ اقبال کے مقلد، عقیدت مند بلکہ روحانی مرید ہیں۔ اقبال کی تقلید کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے، اقبال کی تقلید کو وسیع المطالعہ صاحبِ فکر بلند نظر اور اہلِ دل ہونا ضروری ہے، جناب ایوب نے "تقلیدِ اقبال" میں بڑی ذہانت، فکر، چابکدستی اور فراستِ ایمانی کا ثبوت دیا ہے ان کے ان شعروں کو پڑھ کر آپ محسوس کریں گے کہ شاعر نے اقبال کی میں لَے ملا دی ہے۔ اور اس کا "آرٹ" "اقبالیات" کا خوشہ چیں، عکاس اور ترجمان ہے۔

تا بہ دلت فرو رود تلخ نوا کہ می زنم ؛؛ صورتِ نغمہ داد و ام شیون و آہ و نالہ را
تو بہ گلستانِ ہستی چہ درے بمن کشادی ؛؛ زخزاں غمے ندارم، زبہار بے نیازم
زنماز پنجگانہ بودار مراد یا دستش ؛؛ بخدائے لایزالے ہمہ وقت در نمازم
تو بر رسمِ درہ جمہوری چہ می نازی ؛؛ کہ جان کو ہکن امروز ہم در دستِ پرویز است
تپشے کہ شعلہ ریزد بہ درونِ سینۂ من ؛؛ بہ شرار می فروزد رگِ جانِ سنگِ خارہ
اے کہ افروختۂ شمعِ فرنگی بہ حرم ؛؛ می ندانی کہ ہمیں خانہ براندازِ ہے ہست
چہ عجب کہ خوش نیاید بنوا گراں نوایم ؛؛ کہ بہ بزمِ حرف و صوتے روشِ یگانہ دارم
چہ عجب بارِ دگر سبز شود شاخِ حیات ؛؛ ساقیا! جرعۂ ہم برخس و خاشاک انداز
پس از عمرِ دراز سے آں نگار آمد بہ آغوشم ؛؛ کہ آخر انتظارِ شوق با من یاوری کردہ
نیازِ بندگی چوں از مسلمانے نمی آید ؛؛ دریں عہدِ بغاوت کوش از کافر چہ می خواہی
دعائے شیخ بحقِ مرید اثر دارد ؛؛ بہ حقِ قوم اگر کرد بے اثر گردد
صنماں را کہ ز اجداد گرفتی بشکن ؛؛ ایں گناہیست کہ بے خونِ دخطر باید کرد
ماتمِ درماندگی ندماندہ تر سازد ترا ؛؛ وقتِ پیکار است ایں وقتِ فغاں آہ نیست
دائے رنجے کہ دردِ لیش بہ مداوا نہ رسد ؛؛ جاں رشیدش بہ لبش لیک مسیحا نہ رسد
واعظِ مسجدِ ما گرچہ بلند آہنگ است ؛؛ عجب آنست کہ حرفش بہ کلیسا نہ رسد
توا چیدن زگردوں خوشہ ہائے ماہ و انجم را ؛؛ اگر دستِ طلب در آستینت نیست کوتاہے
دروں سینۂ خود کن دلِ پر آرزو پیدا ؛؛ دلِ بے آرزوئے می نیرزد با پرِ کاہے
جمالِ خواجہ کونین را تواں دیدن ؛؛ بہ نورِ قلبِ علیؓ یا بدیدۂ صدیقؓ
دریں چمن نفسم شعلہ آفریں کردند ؛؛ بہ فیضِ آں جگرِ لالہ آتشیں کردند
بہ ہر کسے کہ سپردند کارو بارِ جہاں ؛؛ صفائے قلب و نظر شرطِ اولیں کردند

دوسرا رخ :—

نوائے فردا میں شاعر نے "زبورِ عجم" کے نہ صرف "خیال" و "اسلوب"

(Idea and style) کی پیروی کی ہے۔ بلکہ ردیف و قافیہ، بحر، مطلع، و مقطع، املا کتابت و طباعت یہاں تک، کہ تعداد صفحات کا چربہ اتارا ہے! علامہ اقبال کی کتاب کے کسی صفحہ پر صرف دو شعر مرقوم ہیں تو ایوب صاحب نے بھی اسی زمین میں دو شعر ہی کہے ہیں! اس قسم کی تقلید جامد ہی نہیں مضحکہ خیز بھی ہے، جس میں "آمد" سے زیادہ "آورد" پائی جانی چاہیے۔ ان کی فکر نے اس حد تک تقلید اور پیروی کو کس طرح گوارا کر لیا کہ کسی موضوع پر ایک دو شعر کہہ کر ہی فکر کا بحر موّاج ٹھہر جائے!

خس و خاشاک پریشان نیستان خرد ؎ می توان سوخت بیک شعلۂ آہے کاہے (صفحہ ۲)

مصرع اولیٰ میں "توالی اضافات" کے علاوہ تنافر اور تکلف پایا جاتا ہے۔ اگر مصرع یوں ہوتا:۔

"خس و خاشاکِ پریشاں بہ نیستانِ خرد"

تو شعر میں روانی آجاتی۔

دلِ ازیں سلسلہ شام و سحر افسردہ است ؎ برطریقِ دگرے گردشِ افلاک انداز (صفحہ ۴)

"ساغر انداختن" اور "طرح انداختن" تو مروج و مسموع ہے مگر "گردش انداختن" محلِ نظر ہے۔

ہمہ جسم و توت آدم بہ مراد یار کردند ؎ چہ خوش آں کسے کہ اندیشہ دو رسم بوترابی (صفحہ ۵۰)

مصرع اولیٰ بے کیف اور کمزور ہے، مصرع ثانی کے جوڑ کا نہیں ہے۔

خاور کہ اندریں خزاں ہا نہ سال اگر ؎ شاخش گرفت بازنم و مائل نموست (صفحہ ۷۱)

خزاں کی جمع "خزاں ہا" یہاں کھٹکتی ہے، مصرع اولیٰ کو دوسرے ڈھنگ سے کہنا چاہیے تھا "خاور" سے مترشح ہے تو "مشرق" ہی نظم کرنا چاہیے تھا، "مشرق" میں "خاور" سے زیادہ شعریت پائی جاتی ہے۔

اے بے خبر از جنبش چراغِ رہ براہی ؎ از بحر خودی ہم صفت سیل رواں خیز (صفحہ ۱۰۷)

"رہن براہی" نے پورے شعر کو کمزور کر دیا!

آرام دو گیتی را در دشت مشقت جو ؎ ایں گنج فراوانے پیدا سرِ راہے نیست (صفحہ ۱۵۰)

"دشت مشقت" معنوی اعتبار سے غلط نہیں ہے مگر "دشت مشقت" وجدان کو بھلا نہیں لگتا، اچھے شعر کی خوبی یہ ہے کہ ایک ایک لفظ نگینہ کی طرح جڑا ہو!

چہ کارم باظن و تخمیں یقینے محکمے دارم ؎ عروجِ عشق از حدِ خیال افزوں شود درزے (صفحہ ۱۵۹)

"چہ سازم باظن و تخمیں" کہنا چاہیے تھا۔ "عروجِ عشق" بھی بھرتی کی ترکیب ہے۔ دوسرا مصرعہ اس انداز کا ہونا چاہیے تھا

؎ کہ موجِ عشق از حدِ خیال افزوں شود درزے

صفحہ ۱۸۳ پر ایک شعر ہے ـــ

بہ مکتب ہا نہ موزند راہ و رسم الفت را ؎ کہ مضمونِ محبت ماورائے علم و فرہنگ است (صفحہ ۱۸۳)

"علم" ـــ کی جگہ "عقل" "لوح" یا "شرح" ہوتا تو شعر اور زیادہ چست ہو جاتا، "محبت" کا حریف شاعری میں "علم" کو نہیں، "عقل" کو ٹھہرایا جاتا ہے۔

تو بے خبر نہ زندوانِ فقیہہ ما ؎ دل بے سرور و سوز، لبش داستاں سرا (صفحہ ۱۹۳)

"فقیہہ" کی جگہ "واعظ" کا محل تھا کہ "داستاں سرا" اس زمانہ میں بھی فقیہہ نہیں واعظ ہی ہوتا ہے:

۵ چہ خبر ترا کہ تپیدش ز ہزار حریت بہ (صفحہ ۱۳)

۵ مسافت ہائے او در قید پیمائش کجا آید (صفحہ ۱۸۳)

اس قسم کے مصرعے جن میں "فارسیت" کم اور "ہندیت" زیادہ پائی جاتی ہے "نوائے فردا" میں جگہ جگہ ملتے ہیں۔

جناب ایوب صاحب "نوائے فردا" کی یہ کوشش اور جرات ہر حال قابل داد ہے کہ انہوں نے "زبور عجم" کے طرز پر اردو کی کتاب مرتب کردی۔ کاش! وہ آئندہ اقبال کی کتابوں کی ہو بہو اور سطر بہ سطر تقلید کرنے کے بجائے "افکار اقبال" کی اپنے اسلوب و رنگ میں ترجمانی فرمائیں اور خود اپنی "فکر" کے نادر نمونے بھی پیش کریں۔

رضوان شاہ و روح افزا

از :- فائز، مرتبہ سید محمد ایم۔ اے، ریڈر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی، ضخامت ۱۶۶ صفحات، قیمت دو روپے ملنے کا پتہ — دکھنی ساہتیہ پرکاشن سمتی، حیدرآباد دکن (آندھرا پردیش بھارت)

قطب شاہی خاندان کا آخری فرمانروا ابوالحسن تانا شاہ تھا جو ۱۰۸۳ ہجری میں تخت حکومت پر متمکن ہوا اور چودہ سال حکومت کرنے کے بعد ۱۰۹۸ ہجری میں اپنے زوال کے ساتھ "قطب شاہی خاندان کے چراغ" کو بھی ہمیشہ کے لئے گل کر گیا۔ ابوالحسن علم و ادب کا قدردان تھا اور خود شاعر بھی تھا، فائز اسی کے دور کا ایک شاعر تھا جس نے دکنی (اردو) زبان میں ایک مثنوی کہی تھی، اس مثنوی کا ہیرو چین کا شاہزادہ رضوان شاہ ہے، جو ایک پری (روح افزا) کو دل دے بیٹھا ہے، اور بڑے پاپڑ بیل کر اور دکھ اٹھا کر اپنی محبوبہ کو حاصل کر لیتا ہے۔ یہ اب سے تقریباً دو سو اسی (۲۸۰) سال پہلے کی کہی ہوئی مثنوی ہے!

جناب سید محمد صاحب ایم۔ اے نے اس مثنوی کو کئی نسخوں سے مقابلہ کرکے ایڈٹ کیا ہے اس پر ایک دیباچہ لکھا ہے اور آخر میں مشکل الفاظ کی فرہنگ دی ہے، صفحہ ۱۶۴ پر "ترت" کے معنی "جلدی" لکھے ہیں حالانکہ "ترت" "فوراً" کو کہتے ہیں!

فائز نے "نزدیک" کو "نزیک" — "اندازہ" (بر وزن بنجارہ) کو "اندازہ"[۱] (بر وزن۔ اناڑہ)، "جنگل" کو "جنگل" (بر وزن "آنچل") "ہاتھی" کو "ہتی" — نظم کیا ہے:-

— اور —

"ملک" "مُلک" (بر وزن "فلک") اور "شرط" کو "شرط" (بر وزن "نفر") باندھا ہے!

ایک شعر:—

دسیا وہاں چنپے کا مجھے جھاڑ خوب ؛ کلیاں اس کی رہ گئی مرے دل میں چوب (صفحہ ۱۰۲)

اس زمانہ میں لفظوں کا تلفظ اور لہجہ ہمارے زمانے سے مختلف تھا، ورنہ ہم اپنے لہجہ میں اس شعر کو پڑھیں تو دونوں مصرعے بحر سے خارج ٹھہریں گے! شعر کا مفہوم یہ ہے کہ:-

"مجھے وہاں چنپا کا درخت اچھی طرح دکھائی دیا یا چنپا کا ایک خوبصورت درخت نظر آیا جس کی کلیاں میرے دل میں چبھ کر اور گھب کر رہ گئیں"

اردو زبان اور شاعری کے یہ ابتدائی خاکے بہت قدروقیمت رکھتے ہیں، مقام شکر و مسرت ہے کہ یہ لوادر دستبرد روزگار سے بچ گئے۔

---

[۱] یو دیوانگی بے اندازہ کردں ۵۲ جنگل میں بھی نہیں، گھر میں نہیں کاں گیا

مثنوی چندر بدن و مہیار

از:- مرزا محمد مقیم مقیمی بیجاپوری، مرتبہ — محمد اکبر الدین صدیقی ایم-اے لکچرار سٹی کالج (عثمانیہ یونیورسٹی) ضخامت ۱۲۰ صفحات (قیمت درج نہیں) ملنے کا پتہ:- مجلس اشاعت دکنی مخطوطات، حیدرآباد دکن۔

یہ مثنوی اب سے تقریباً تین سو سال قبل کی کہی ہوئی ہے، جسے جناب محمد اکبر الدین صدیقی (ایم-اے) نے مرتب فرمایا ہے اور اس پر طویل تحقیقی مقدمہ لکھا ہے! فاضل مرتب نے بتایا کہ اس مثنوی (چندر بدن مہیار) کی پچھلے دور میں خاصی شہرت تھی اور بعض شاعروں نے اس طرز پر مثنویاں کہی ہیں وہ لکھتے ہیں کہ:-

"گمان یہ ہے کہ میر تقی میر نے سیف اللہ کی طرح چندر بدن کی کہانی سنی ہو اور قصے میں ندرت ہونے کی بنا پر اسے اپنے انداز میں لکھا ہو۔"

ستیا کھان پانی دھونے کوں بھی ؎ لگیا بھبوت ارڈا کے رونے کوں بھی

(اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا اور بہت چلا چلا کے رونے لگا)

صفحہ ۲۴ پر مقدمہ نگار نے "غیظ" کو "غیض" لکھا ہے، افسوس ہے کہ املا کی یہ غلطی بہت عام ہوتی جا رہی ہے اور لکھے پڑھے لوگ تک اس کا ارتکاب کرنے لگے ہیں۔

؎ کہاں رام سیتا مرک تو کہاں (صفحہ ۸۹)

"مرک" کے معنی ذیلی حاشیہ پر "بیوقوف" لکھے ہیں اس کے معنی "مورکھ" ہی لکھنے تھے کہ شاعر نے "مورکھ" کو "مرک" نظم کیا ہے، پھر مورکھ کی صحیح ترجمانی "بیوقوف" سے نہیں ہوتی نادان اور سادہ لوح کا مفہوم بھی "مورکھ" میں پنہاں ہے۔

مثنوی تصویر جاناں

از:- لچھمی نراین شفیق اورنگ آبادی، مرتبہ:- خواجہ حمید الدین شاہد ایم اے لکچرار اردو چادر گھاٹ کالج، حیدرآباد دکن) ضخامت ۷۰ صفحات (قیمت درج نہیں) ملنے کا پتہ:- مجلس اشاعت دکنی مخطوطات حیدرآباد دکن (آندھرا- بھارت)

لچھمی نراین شفیق اورنگ آبادی کا نام اہل اردو دنیا کے لیے اب اجنبی نہیں رہا، اپنے دور کے وہ بہت بڑے نثر نگار، انشا پرداز، تذکرہ نگار اور مورخ تھے، علامہ میر غلام علی آزاد بلگرامی سے شرف تلمیذ حاصل تھا، لچھمی نراین پہلے صاحب تخلص کرتے تھے جب انہیں معلوم ہوا کہ ایک اور شاعر کا بھی یہی تخلص ہے تو ان کی درخواست پر علامہ آزاد بلگرامی نے ان کو "شفیق" تخلص عطا فرمایا یہ ۱۱۶۷ھ ہجری کا واقعہ ہے۔

لچھمی نراین شفیق نے محبوب کا سراپا بہ طرز مثنوی منظوم کیا تھا جسے جناب خواجہ حمید الدین شاہد نے ترتیب دے کر اس پر ایک معلومات آفریں مقدمہ بھی تحریر فرمایا ہے۔

اس مثنوی میں شاعر نے محبوب کے سراپا کو جس تفصیل سے بیان کیا ہے، اس تفصیل کے ساتھ کسی دوسرے شاعر نے شاید ہی بیان کیا ہو، شفیق نے زلف محبوب ہی کی تعریف نہیں کی، بلکہ کنگھی کرنے میں جو آواز "کر کراہٹ" کنگھی کے دندانوں سے نکلتی ہے اسے بھی نظم کر دیا ہے، آنکھ کے کوئے، ابرو کا پسینہ، غبار مژگاں، کان کی لو، لعاب دہن اور پان کی پیک ان سب پر شعر کہے ہیں اور یہ "لے" "ناف دکمر" سے بھی آگے بڑھ گئی ہے جس کی تشریح کی غیرت اجازت نہیں دیتی، شاعرانہ چٹخاروں کا یہی وہ حمام ہے جس میں بڑے بڑے متغزل لوگ برہنہ ہو گئے ہیں!

چند نمونے:-

بجائے سرخ ہیں آنکھوں کے کوئے ؎ مگر یاقوت کے ریزے ہیں دھوئے

بگل میں قطرۂ شبنم بھرے ہیں ؎ گہر مرجاں کی ڈبی میں دھرے ہیں

دو دنداں مسی ہیں نیں ہیں چمکتے ؎ اندھیرے گھر میں آئینے چمکتے

نمایاں یوں گلے سے پان کا پیک ؎ کہ شیشے سے مئے گلگوں کا جیون لیک (لکیر)

نہیں یہ چشم وابرو میں گیا بھول ؎ دھرے ہیں طاق میں دو نرگسی پھول

فقیر یک خانماں آوارہ مدہوش ؎ بگولے کی طرح سے خانہ بر دوش

"رضوان شاہ و روح افزا" اور "چندر بدن ومہیار" ان دونوں مثنویوں کے بعد "تصویر جاناں" کو پڑھ کر اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ سو سال کے بعد اردو زبان کتنی نکھر گئی ہے۔ اور تخئیل و اظہار میں کس قدر نزاکت و بیساختگی پیدا ہو گئی ہے۔ دکن کے یہ شعراء اردو زبان کے محسن ہیں۔ ہم ان کی بارگاہ میں سلامِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

یو-پی کے دیہات میں آج بھی اس طرح بولتے ہیں:-

"تم کاں گئے تھے" یعنی "کہاں گئے تھے"

اور اب سے تین سو سال پہلے دکن میں "کہاں" کی جگہ "کاں" ہی بولا جاتا تھا۔ اسی طرح ہماری طرف کے گاؤں[علہ] میں آج بھی "کھینچنا" کو "اینچنا" بولتے ہیں، "لچھمی نراین شفیق نے بھی "اینچنا" نظم کیا ہے۔

نہیں ہے چشم پر دنبالہ اینچا ؎ غضب سے ترک نے خنجر کو کھینچا

"سب" کے معنی میں ایک لفظ "سگل" دکنی زبان میں ملتا ہے، اور یو-پی کے دیہات میں "سگلا"، "سگرا"، "سبلا" اب بھی مستعمل ہے، نظیر اکبر آبادی نے بھی "سب" کو "سبلا" نظم کیا ہے۔ صفحہ ۱۳ پر کتابت کی غلطی کے سبب "مکیدن" "تمہیدن" چھپ گیا۔

حیدر آباد دکن میں آج بھی اردو زبان و ادب کی قابلِ رشک پیمانہ پر خدمت ہو رہی ہے۔ "ان مجاہدینِ اردو" نے اس ناسازگار دور میں بھی ہمت نہیں ہاری بلکہ سینہ سپر ہو کر آگے بڑھتے جا رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے عزائم کو کامیاب فرمائے! جناب ڈاکٹر محی الدین قادری زور اس منزل کے امیر کارواں ہیں ــــ افسوس پاکستان میں آنا ہے کہ یہاں کے بڑے آدمیوں کو منصب و اقتداری کی نزاع و کشمکش ہی سے فرصت نہیں ملتی، زمانہ غافلوں اور خود غرضوں کو کبھی معاف نہیں کرتا! مگر یہ دھند، یہ اندھیرا اور گرد و غبار ایک نہ ایک دن انشاء اللہ چھٹ کر رہے گا اور "اردو اپنا جائز اور صحیح مقام حاصل کر کے رہے گی (اردو زندہ باد.........)۔

علہ- اس مثنوی کا ایک نسخہ ہے سو لیا ہاتھوں میں لپٹے پیالہ دو دو لگا در چپنے کے تند دو ــــ یو-پی کے دیہات میں اب بھی پان اور پیچنا بولتے ہیں

رموزِ حیات

ترجمہ۔ راسخ عرفانی۔ ضخامت ۹۲ صفحات، کتاب پر قیمت کے بجائے اشاعت خرچ فی جلد غیر مجلد دس آنہ درج ہے۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ نور، گوجرانوالہ

★ حضرت شیخ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کے پندنامہ کا ترجمہ جناب راسخ عرفانی نے اردو نظم میں کیا ہے۔ ترجمہ کے شگفتہ اشعار کا یہ رنگ ہے:۔

پہلا سننا نغمہ ہائے دل نشیں ؛ دوسرا دیدار محبوب حسین

~~~~~~~~

مست چھپا حالات، واشتہاس ہے ؛ یار عاقل سے طبیب خاص سے

~~~~~~~~

ہے ترے لطف و کرم کی آرزو ؛ تو نے فرمایا ہے خود لاتقنطوا

جناب راسخ کی نظم "مشورہ" کا آخری بند خوب ہے:۔

جو یہاں بادۂ گلگوں کے دلدادہ ہیں ؛ ان کو ہم ساغرِ توحید سے سرشار کریں
مدتوں زلف کی پرچھائیں میں بیمار ہو ہیں ؛ آؤ اے شاعرو! اب قوم کو بیدار کریں

دوسرا رخ:۔

الٰہی میری خاموشی کو ہمراز بیاں کر دے ؛ زباں میری قلم کی میرے دل کی ترجماں کر دے

مصرعہ اولیٰ میں "کو" کی ضرورت تھی۔ "میری قلم کی زبان کو میرے دل کی ترجمان کر دے" یہ ہونی چاہیے دوسرے مصرعہ کی نثر۔

نہیں بیکار ہستی میں یہ خواہش تعیش کی ؛ رہے خامہ کو تو ہمراز شمشیر و سناں کر دے

تعیش نے اس کو نرشتوں کا سا شعر بنا دیا! مصرعہ ثانی میں "ہمراز" سے اچھا لفظ "مانند" تھا، اس شعر سے اوپر مطلع میں "ہمراز" آ بھی چکا ہے۔

غم غلط کرنے کے رنگین بہانے سے کبھی ؛ قلب مبہوت مرا غرق مے و جام رہا

"مبہوت" بالکل بے جوڑ اور بھرتی کا لفظ ہے

جو بتاتا ہے تجھے تیری خطا ؛ وہ دکھاتا ہے تجھے راہ صفا (صفحہ ۲۷)

"راہ ہدیٰ" ترجمہ کرنا تھا۔

کر بتاں ایسے آدمی سے اجتناب ؛ دور تجھ سے تار ہے نار التہاب (صفحہ ۳۰)

یہ "نار التہاب" کیا ترکیب ہے؟ اضافت مقلوب بھی اس طرح درست نہیں ہے کہ چشم زدن کی طرح "نار التہاب" کو صحیح قرار دیا جائے

ترجمہ سیدھا سادہ ہے، اس میں کوئی کشش اور دلچسپی نہیں ہے ــــــ راسخ صاحب کی نعتیہ نظم کے یہ دو شعر کتنے اچھے ہیں:۔

جس کی شگفتگی پہ بہاروں کو ناز ہے ؛ خلد بریں کے مثل گل خنداں تمہیں تو ہو
خوشنودی خدا بھی تمہاری رضا میں ہے ؛ دار عمل میں حاصل ایماں تمہیں تو ہو

~~~~~~~~
~~~~~~~~

کراچی
فاران
پاکستان
ماہر القادری

جلد ۱۰ — نمبر ۴

ایڈیٹر

ماہر القادری

جون ۱۹۵۸ء

سالانہ چندہ ——— چھ روپے

فی پرچہ ——— آٹھ آنے

مقامِ اشاعت

دفتر فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

نظم و ترتیب

پرنٹر و پبلشر — سرور حسین — مطبع سعید آرٹ پریس مقابل مولوی مسافر خانہ — کراچی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نقشِ اوّل

کسی تشابہ اور اجمال کے بغیر دو ٹوک انداز میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ——— اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہو۔

تو ——————— وہ "بڑے آدمی"

جن کی زندگیاں نہ صرف یہ کہ تقویٰ سے خالی ہیں بلکہ اسلامی اخلاق کی ضد ہیں جو دن رات جام و مینا اور بادہ و شاہد سے کھیلتے ہیں، جو کلب گھروں میں عورتوں کے ساتھ رقص کرتے ہیں۔ "تبرج جاہلیت" جن کے گھرانوں کا سرمایہ فخر و ناز ہے جو بیلے درجے کے مسرف اور عیش پسند ہیں۔ رشوت ہو، سود ہو، قمار بازی یا اسمگلنگ ہو، ان کو تو کمائی کرنے اور اپنے گھر بھرنے سے کام۔ حلال و حرام کے امتیاز کی حس ہی ان کے اندر نہیں رہی ——— عین نماز کے وقت جن کے یہاں کاک ٹیل پارٹیاں ہوتی ہیں اور ماہ صیام میں جو لنچ اور ایٹ ہوم کی دعوتیں دیتے ہیں ——— اللہ تعالیٰ کے ایک ایک قانون کی پوری دیدہ دلیری کے ساتھ ڈنکے کی چوٹ خلاف ورزی کرنے والے ——— آخرت فراموش، خدا ناشناس، فسق و فجور کی مداومت کے سبب جن کے دل گداز سے محروم ہو کر پتھر بن گئے ہیں۔ ملک و ملت کی تباہی پر ان کے اندر رمق برابر بے چینی پیدا نہیں ہوتی!

کوئی مرے مر جانے دو ⁂ ان کو اپنے عیش سے کام!

کیا یہ ——————— لوگ ——— "معزز" ہیں؟؟

ہاں! معزز ہیں، خوشامدی درباریوں، جی حضوریوں اور جاہ پرستوں کے نزدیک، اور بلاشبہ سلامی اسپاسناموں اور خیر مقدموں (Receptions) کی چھوٹی نمائش نے ان کو بہلاوے میں ڈال رکھا ہے کہ ہم بھی کوئی عزت کا مقام رکھتے ہیں۔ مگر اللہ کے یہاں ان کے لیے کوئی عزت و اکرام نہیں! اور حقیقی پائیدار اور سچی عزت تو وہی ہے جس پر "عنداللہ" کی چھاپ لگی ہوا

تاریخ، تجربہ اور مشاہدہ بتاتا ہے کہ ایسے فسق مشرب اور معصیت مزاج لوگ جب کرسیوں سے ہٹتے ہیں تو لوگ "یوم نجات" مناتے ہیں، اور جب مرتے ہیں تو لوگ "خس کم جہاں پاک" کہہ کر خوش ہوتے ہیں! آنے والی نسلیں ان کو برے نام سے

یاد کرتی ہیں۔ اور تاریخ کے صفحات پر مورخ کا قلم ان کے ذکر کے لئے نفرت وحقارت کی سیاہی استعمال کرتا ہے!

سعدی نے اپنے وقت کے حکمرانوں اور بڑے آدمیوں ہی کے لئے غالباً شعر کہا تھا ؎

خیرے کن اے فلان وغنیمت شمار عمر ؛ زاں پیشتر کہ بانگ برآید فلاں نماند

مگر

فسق وفجور جن کی زندگی بن گیا ہو وہ "خیر" کو کیا جانیں، ان کی ذات سے تو "شر" کو فروغ ہوتا ہے، وہ یہ لوگ اللہ کی زمین پر "معروف" کی جگہ "منکر" کو قائم کرتے ہیں۔

بیشک اللہ تعالیٰ نے "اولو الامر" کی اطاعت کا حکم دیا ہے، مگر یہ نہیں ہے کہ جو شخص بھی عہدہ ومنصب پر قابض ہے وہ "اولو الامر" ہے، اور جس کسی نے بھی تخت وکرسی کو ہتھیا لیا ہے اس کی اطاعت واجب ہے۔ جو لوگ اللہ کی زمین میں فساد پھیلا کرتے ہیں اور اصلاح حال کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ ان کی اطاعت نہ کرنے کا حکم قرآن کریم میں آیا ہے

وَلَا تُطِيعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ اور ان حد سے گذر جانے والوں کے حکم کی اطاعت نہ کرو جو زمین میں فساد پیدا کرتے ہیں، اور اصلاح نہیں کرتے۔

اور

وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا ؕ کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو جس کے قلب کو ہم نے اپنی یاد سے غافل بنا دیا ہے اور وہ اپنی نفسانی خواہشوں کی پیروی کرتا ہے اور اس کا حال حد سے گذر گیا ہے۔

جس شخص کا دل اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل ہو جائے گا۔ اور جو ہوائے نفس کی پیروی کرے گا اس کی ذات سے دنیا میں فساد ہی پھیلے گا اور اس کے دم سے برائیاں پروان چڑھیں گی۔

ایسا شخص اگر ملک کی بدقسمتی سے حاکم ہے تو اس کے دورِ حکومت میں رقص وغنا اور بت سازی کی سرپرستی کی جائے گی۔ مسلمان لڑکیوں کو ناچ گانا سیکھنے کے لئے ابھارا جائے گا۔ شراب خوری، زنا، سود، قمار بازی اور اسی قسم کے دوسرے فواحش کو شہ ملے گی۔ یہاں تک کہ سارا ماحول بدکاریوں کے دھوئیں سے سیاہ اور تاریک ہو جائے گا۔ اور جس کسی کا دل اللہ کی یاد سے غافل ہو جاتا ہے اس دل میں اللہ کی مخلوق کے لئے بھی کوئی جذبہ ہمدردی نہیں رہتا۔ ایسا سنگدل دنیا کے لئے ایک عذاب ہے

اور "اطاعت" ——— "معروف" میں ہے "معصیت" میں نہیں ہے ——— کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:

لا طاعۃ فی معصیۃ ۔ ۔ ۔ ۔ معصیت میں کوئی اطاعت نہیں ۔ !

معصیت جن کی سرشت ہو، اور فسق وفجور جن کا مزاج ہو وہ اگر معاصی میں اہل ایمان سے "اطاعت" کی توقع رکھتے ہیں۔ تو ان کی یہ توقع سطح دریا کی لکیر سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی، ہاں! طاقت کے زور اور جبر وزبردستی سے ایسا ممکن ہے کہ لوگ سکوت اختیار کریں اور اس سکوت کو ..... "اطاعت" سمجھ لیا جائے! جبر، اطاعت میں رعایا کا دل شریک نہ ہو تو مارے باندھے کی اطاعت ہے اور ایسے جابر حاکم کو زوالِ نعمت کے لئے ہر لمحہ تیار رہنا چاہئے کہ عوام کی ناخوشی کا شعلہ خاموش نہ جانے کب بھڑک اٹھے! جس حاکم اور فرمانروا نے عوام کی خوشی اور ناخوشی سے بے پروا ہو کر اپنی چلتی چلائی اس نے اپنے مستقبل کے لئے بہت بڑا خطرہ مول لے لیا۔ ایسے فرمانروا کا تخت حکومت ریت کے ڈھیر پر بچھا ہوا ہے۔ !

جس کسی کو اولی الامر بننے کی تمنا و آرزو ہے اسے چاہئے کہ اولی الامر کے خواص و صفات اپنے اندر پیدا کرے جو نیک ہے اور نیکی کو قائم کرنے کے لئے دوڑ دھوپ کرے۔ "امیر المومنین" کوئی یوں ہی نہیں بن جاتا۔ اور طاقت کے زور پر بن بھی جائے تو مسلم عوام کے قلوب ایسی امارت کی آواز پر سمعنا و اطعنا نہیں کہہ سکتے، مسلمانوں کا امیر تو ان کا خادم ہوتا ہے، عوام کے دکھ درد کا ساتھی، اللہ سے ڈرنے والا اور آخرت کے محاسبہ سے ہر آن لرزاں و ترساں! حضرت عمر ابن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کی مثال دنیا کے سامنے ہے کہ زمام خلافت سنبھالتے ہی ان میں غیر معمولی تغیر پیدا ہو گیا عیش و نعم کی گود میں جس کا نشو و نما ہوا تھا وہ اس قدر سختی اٹھانے والا اور سادہ و جفاکش بن گیا کہ دنیا فرط مسرت سے پکار اٹھی کہ یہ تو دوسرا عمر فاروقؓ پیدا ہو گیا۔

اچھے اور برے حاکم

اچھا امیر کون ہے اور برا امیر کون ہے! اس کا بھی ایک پیمانہ اور معیار اللہ کے سچے رسولؐ نے مقرر فرما دیا ہے (ہمارے جان و مال حضورؐ کے نعلین مبارک پر نچھاور ہیں)۔

عن عمر قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الا اخبرکم بخیار امرائکم و شرارھم خیارھم الذین تحبونھم ویحبونکم وتدعون لھم ویدعون لکم وشرار امرائکم الذین تبغضونھم ویبغضونکم وتلعنونھم ویلعنونکم۔ عمرؓ سے روایت کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تمہیں بتا دوں کہ تمہارے اچھے امیر کون ہیں اور برے امیر کون ہیں؟ (سنو!) اچھے امیر تو وہ ہیں کہ جن سے تم محبت کرتے ہو اور وہ تمہارے لئے دعا کرتے ہوں اور تم ان کے لئے دعا کرتے ہو۔ اور برے امیر وہ ہیں جن کو تم ناپسند کرتے ہو اور وہ تمہیں ناپسند کرتے ہوں اور جن پر تم لعنت کرتے ہو اور وہ تم پر لعنت کرتے ہوں۔

کوئی رعایا اپنے حاکموں اور فرمانرواؤں سے یونہی دل لگی اور تفریح کے طور پر بیزار نہیں ہو جایا کرتی۔ اس بیزاری اور ناپسندیدگی کے اسباب ہوتے ہیں! رعایا خوب اچھی طرح دیکھ لیتی اور تجربہ کر لیتی ہے کہ ہمارے حاکموں کو نہ خدا کا خوف ہے اور نہ بندوں کی شرم ہے جن کی خود غرضیوں اور ہوس پرستیوں کی بدولت ملک کی حالت ابتر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ جن کے دل میں عوام کے لئے کوئی خیر خواہی کا جذبہ نہیں ہے جو ملک و ملت کے معمار نہیں بلکہ اسے ڈھانے والے ہیں .. تو پھر رعایا ان کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے اور ان سے بیزار ہو جاتی ہے اور تمنا کرتی ہے کہ ایسے ناپسندیدہ حاکموں سے اسے نجات حاصل ہو جائے۔ وہ شخص احمقوں کی جنت میں رہتا ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ عوام کچھ نہیں کر سکتے اور طاقت کے زور سے انہیں دبایا جا سکتا ہے .. بیشک دبایا اور پامال کیا جا سکتا ہے .. مگر کب تک؟ ظلم کی ناؤ زیادہ دنوں تک نہیں چل سکتی یہ ایک نہ ایک دن ڈوب کر رہتی ہے اس کی غرقابی میں چاہے پُر شور موجوں کا ہاتھ ہو یا ہاپ کی یا وہ کسی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے۔

ناپسندیدہ حاکم جب دیکھتے ہیں کہ رعایا کے دلوں میں ان کے خلاف ناخوشی اور بے اعتمادی کا دریا موجیں مار رہا ہے تو وہ بھی اسی رعایا کو پسند نہیں کرتے۔ اس طرح رعایا اور حاکموں کے درمیان بے اعتمادی، ناپسندیدگی اور نفرت و بیزاری کی کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ حکومت کا کاروبار عوام اور حکمران طبقہ کے باہمی تعاون سے چلتا ہے اگر ایک دوسرے سے نفرت و بیزاری پیدا ہو جائے تو باہمی تعاون "نہ تو آسمان سے برس سکتا ہے اور نہ زمین سے اُگ سکتا ہے" ... نتیجہ؟ ملک میں انتشار و ابتری زندگی کے ہر شعبہ میں تباہی! ایسے موقعوں سے دشمن حکومتیں خوب فائدہ اٹھاتی ہیں۔ وہ اپنے جاسوسوں اور خود اسی ملک کے بعض ضمیر فروش عناصر کے ذریعہ ملک میں ایسے ایسے مسائل کھڑے کر دیتی ہیں جن میں ملک کی پوری سیاست اور توانائی الجھ کر رہ جاتی

ہے!۔ حکمران طبقہ اگر ان مسائل کو چاہے تو سلجھا سکتا ہے، مگر نہیں سلجھاتا! کیوں؟ اس لئے کہ ان مسائل کے زیادہ سے زیادہ پیچیدہ ہونے سے ان کے اقتدار کی عمر دراز ہوتی ہے۔ یہ لوگ اپنی زندگی عوام کے اختلافات میں دیکھتے ہیں، عوام کا اتحاد ان کے اقتدار کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے اس لئے وہ اپنی ترکیبوں اور چالبازیوں سے عوام کو متحد نہیں ہونے دیتے!

کتنا بدنصیب ہے وہ ملک جس کے عوام، اور حاکموں کے نظریوں میں اختلاف ہو! ایک کعبہ کی طرف جانا چاہے اور دوسرا کلیسا کی جانب کھینچنے کی کوشش کر رہا ہو! نظریوں کی یہ رسہ کشی کوئی معمولی مصیبت نہیں ہے، یہ ایک مستقل جنگ ہے جو عوام اور ارباب اقتدار کے درمیان برپا ہوتی ہے، اور جب تک یہ نزاع و کشمکش جاری رہتی ہے، ملک کو سکون و راحت اور مسرت و اطمینان کی ایک ساعت بھی میسر نہیں آسکتی۔۔!

جو بڑے لوگ عوام کے معتقدات اور نظریوں کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ ان کو عوام پر حکومت کرنے کا حق حاصل نہیں ہے ان کا وجود عوام پر ایک بوجھ رہتا ہے، ان کی ذات پبلک کے لئے ایک مصیبت ہے۔

وہ جس حدیث کا حوالہ دیا گیا ہے، اس کا جوہر اور خلاصہ یہ ہے کہ وہی ملک خوشحال اور باعزت ہو سکتا ہے، جس کے عوام اور حاکموں کے درمیان محبت و اتحاد، ہم آہنگی اور یک جہتی پائی جاتی ہو اور جو ایک دوسرے کو پسند کرتے ہوں، رعایا اور راعی کا یہی وہ تعاون ہے جو کسی ملک کو مضبوط، خوش حال اور بافراغ رکھتا ہے جب یہ اتحاد و ہم آہنگی کی برکت مفقود ہو اور آپس میں کشمکش برپا ہو، رعایا کے منہ سے دعا کی جگہ بددعا نکلتی ہو، تو ناں جو مصیبت بھی آجائے کم ہے، اور جو قیامت بھی گزر جائے تھوڑی ہے! میاں بیوی کے اختلاف کے سبب جب ایک گھر جہنم بن جاتا ہے تو جس ملک میں عوام اور رعایا کے درمیان نفرت و بیزاری پائی جاتی ہو وہاں کوئی مسرت و خوشحالی کی تمنا کرتا ہے تو وہ سادہ لوح ہے اور سایوں کو پکڑنے کے لئے ان کے پیچھے بھاگتا ہے!

جس ملک میں بھی عوام اور ارباب اقتدار کے درمیان اس قسم کی کشمکش اور بیزاری پائی جاتی ہے، وہاں کا برسرکار طبقہ ملک میں بگاڑ پیدا کر کے الٹا خوش ہوتا ہے اور وہ اسے اپنی جیت سمجھتا ہے کہ اس طرح عوام کے مفاد پر چوٹ لگ رہی ہے۔ اور یہ ناشدنی ملک مصیبت کا شکار ہو رہی ہے۔ اس ذہنیت اور مزاج کے "بڑے لوگ" دشمنی اور عناد کی اس حد تک پہنچ جاتے ہیں کہ جنہیں اگر کرسیوں سے ہٹنا ہی پڑا تو ایسی حالت بنا جائیں گے کہ ملک کی کوئی چول سیدھی نہ رہے گی اور بگاڑ کا کوئی عنوان باقی نہ رہے گا۔ اور ایسی لٹی ہوئی حکومت ان کے بعد آنے والوں کو ملے گی جس کا خزانہ خالی ہوگا، جس کے ہر محکمہ میں بگاڑ ہی بگاڑ نظر آئے گا۔ اور جس کے داخلی اور خارجی مسائل اتنے پیچیدہ ہو گئے ہوں گے کہ ان کو سلجھانا کوہ کنی کر کے جوئے شیر لانے سے زیادہ دشوار ہوگا۔

عہدوں کے حریص لوگ!!

بخاری کی حدیث ہے:۔

عن ابی موسیٰ الاشعری قال اقبلت الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ومعی رجلان من الاشعریین فقلت ما علمت انھما یطلبان العمل فقال لن او لا نستعمل علیٰ عملنا من ارادہ۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری سے روایت ہے کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میرے ہمراہ دو اشعری بھی تھے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ان دونوں آدمیوں کو کہیں عامل بنا دیجئے۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ یہ عامل بننے کی خواہش رکھتے ہیں۔ حضورؐ نے (اس پر) فرمایا کہ میں اس شخص کو ہرگز اپنے

کام پر (یعنی نظام حکومت میں) میں عامل نہیں بناؤں گا۔ جو اس کی خواہش (یا درخواست) کرے۔

حضرت عبد الرحمٰن بن سمرہ سے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فرمایا کہ:۔

"لاتسأل الامارۃ" تم کبھی امارت کی درخواست نہ کرنا

——— ہاں ———

تمہاری خواہش اور طلب کے بغیر تمہیں امیر بنا دیا گیا تو پھر اللہ تعالیٰ کی جانب سے تمہاری اعانت کی جائے گی

(بخاری و مسلم، باب الامارۃ)

ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ واضح ارشاد اور تلقین و تعلیم ہے اور دوسری طرف آج "بڑے لوگوں" کی ذہنیت، مزاج، کردار اور زندگیوں کا جائزہ لیجئے، جو عہدوں کے لئے مرے جاتے ہیں جو کیسی کیسی چالبازی اور جوڑ توڑ کے ذریعہ کرسیوں کو حاصل کرتے ہیں، سیاسی پارٹیوں سے جن کی وفاداری عہدے کی خاطر دن رات میں سو بار بدل سکتی ہے عہدے اور منصب کے لئے جن کے ضمیر کا نیلام ہوتا رہتا ہے۔ جو بلاوے وزارت کی خاطر اپنے ہر اصول کی قربانی دے سکتے ہیں۔

——— اور ——— جب ———

ان کو کرسیاں مل جاتی ہیں تو وہ پھر زندگی کی آخری ہچکی تک کرسیوں سے چمٹے رہنا چاہتے ہیں۔ وہ تو ان کا بس نہیں چلتا ورنہ ان کا دل تو یہی چاہتا ہے کہ ان "عہدوں" کا دوامی پٹہ اپنے نام کرا لیں اور پھر انہی کی اولاد کے حق میں اسے "وقف" قرار دیں۔

سرکار ختمی مرتبت علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی جس کے نقل کرنے کی ہم سعادت حاصل کر چکے ہیں، اس نفسیاتی حقیقت کا مظہر ہے کہ جس کسی کے دل میں عہدے کی جتنی طلب اور خواہش ہوگی اتنا ہی وہ عہدے سے اپنے نفس کے لئے لذت، راحت اور نفع اٹھانے کی سعی کرے گا۔ اور عہدہ و منصب کے لئے اکتساب لذت کی خواہش اخلاص کی دشمن ہے، عہدے کا حریص شاذ و نادر ہی مخلص اور معاملہ کا سچا ہوتا ہے۔ نظام حکومت میں بگاڑ پیدا ہی اس وقت ہوتا ہے جب جاہ و اقتدار کو حصول اغراض کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ عہدے کے بھوکے کو جب کرسی ملتی ہے تو وہ دونوں ہاتھوں سے ملک کو لوٹتا ہے۔ اس ظالم کو اس نزاکت کی پروا تک نہیں ہوتی کہ فوج کے لئے غیر ممالک سے جو اسلحہ خریدا جا رہا ہے وہ کس کوالیٹی (Quality) کا ہے، ایسا کارتوس وقت پر چلیں گے بھی یا دغا دے جائیں گے۔ ایسے غرض پرست شخص کو تو بس دینے میں اپنا کمیشن وصول کرنے اور پیسے بنانے سے کام! خدا نخواستہ ان ناقص اور گھٹیا قسم کے اسلحہ کے سبب دشمن حکومت سے جنگ میں شکست ہو جائے تو ہو جائے اس ظالم کا تو گھر بھر گیا!

عہدے کے اس لالچی کی خوب زش سے کروڑوں روپے کا مال دوسرے ملک کو اسمگلنگ ہو کر جا سکتا ہے، ناشنوسا ور بیرمشوں کی دمڑی کے ساتھ چور بازاری ہو سکتی ہے اس خود غرض کی جیب بھرنی چاہئے، خواہ حکومت کا خزانہ خالی اور ملک کنگال ہو جائے۔ جس حکومت پر عہدوں کے لالچی لوگ چھائے رہتے ہیں، وہ حکومت کبھی پنپ نہیں سکتی۔ رعایا کی گاڑھی کمائی کا کروڑوں روپیہ تو ان بندگان حرص و ہوس کی عیش و راحت اور شان و شوکت پر خرچ ہو جاتا ہے۔ اوپر سے لے کر نیچے تک "لوٹ کا جلن"، ایک سرکاری عمارت بنتی ہے تو چپراسی سے لے کر اوپر کے عہدہ داروں تک سب کا اس میں "حق" "شریک" ہوتا ہے اور اس طرح ایک لاکھ کی حقیقی لاگت سے جو عمارت بن سکتی تھی وہ دس لاکھ میں بنتی ہے اور اس میں بھی ناقص مسالہ لگایا جاتا ہے، کہ وقت سے بہت پہلے اس پر (Under Repair) کی تختی نصب کرنی پڑتی ہے۔

عہدوں کے حریص عوام کی بھلائی کے لئے اخلاص و دردمندی سے کوئی کام کر ہی نہیں سکتے۔ کوئی نیکی اور بھلائی کا کام ان سے ہو بھی جاتا ہے تو اس کا اخباروں میں کتنا پرشور پروپیگنڈا کرایا جاتا ہے اور ایسے موقعوں پر حکومت کے کیمرہ مین تو ان "عزت مآبوں" کے جلوس رہتے ہیں اگر صبا رفتار موٹر سے فٹ پاتھ پر اترے اور فوٹوگرافروں نے کھٹ سے فوٹو لے لیا اور وہ پھر اخبار میں چھپتا ہے کہ "عزت مآب" عوام سے ربط پیدا فرما رہے ہیں۔

جہاں اخلاص نہیں وہاں برکت نہیں، جہاں تقویٰ نہیں وہاں دردمندی، نیکی اور انسانیت نہیں۔ جس دل میں عہدے کی حرص، منصب کا لالچ اور کرسی کی تمنا ہے اس دل سے خیر کی توقع رکھنا حماقت ہے، عہدوں کے لالچی اپنی کرسیوں کی خاطر ہر چالبازی اور سازش کر سکتے ہیں، تاریخ بتاتی ہے اور بے شک بتاتی ہے کہ اس مزاج و کردار کے لوگوں نے دشمنوں سے ساز باز کر کے اپنے ملکوں کو لٹوایا اور اپنی قوم کو تباہ کرا دیا ہے! ؎

جعفر از بنگال، صادق از دکن
ننگِ ملت، ننگِ دیں، ننگِ وطن

جو کوئی شخص اپنی ذات کی منفعت کے لئے عہدوں اور کرسیوں کی تمنا کرتا ہے اور جس کے سامنے کوئی بلند مقصد نہیں ہوتا اس کے اندر "جعفر و صادق" کی ذہنیت کارفرما ہوتی ہے۔ اور وہ موقع ملنے پر "ابن علقمی" کا پارٹ ادا کر سکتا ہے!

والی اور حاکم کا یہ فرض اور دین ہے کہ وہ رعایا اور عامہ کی خیر خواہی کرے، ان کے دکھ درد میں ان کا شریک ہو کر رہے ان کے ساتھ وہ سلوک روا رکھے جیسا سلوک ایک مالی باغ کے پودوں کے ساتھ کرتا ہے، عوام کے پاؤں میں کانٹا چبھے تو اس کی کھٹک حاکم کے دل میں اس وقت تک ہوتی رہے جب تک یہ کانٹا نکل نہ جائے، یہ نہ ہو کہ عوام تو فقر و فاقہ میں مبتلا ہوں اور حاکم کے قصر میں شراب کے دور چل رہے ہوں۔!

عوام کے لئے جو حاکم اپنے اندر جذبۂ خیر خواہی نہ رکھتے ہوں، ان کے لئے جو "وعید" آئی ہے وہ بھی اس صادق و مصدوق کی زبان وحی ترجمان سے سن لیجئے جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کا اتمام فرما دیا تھا اور جس کا نقشِ قدم قیامت تک کے لئے دلیلِ راہ اور چراغِ ہدایت ہے۔

عن معقل بن یسارؓ قال سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول ما من عبد استرعاہ اللہ رعیتہ فلم یحطھا بنصیحۃ الا لم یجد رائحۃ الجنۃ (بخاری) حضرت معقل بن یسار سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ جس بندے کو اللہ تعالیٰ نے رعیت کا حاکم بنایا، پھر اس نے اپنی رعیت کی خیر خواہی کے ساتھ حفاظت نہ (دیکھ بھال) نہیں کی تو وہ جنت کی خوشبو نہ پائے گا۔ (۱۵۵)

دنیا کے پردے پر جہاں بھی کرسی ہے، عہدہ ہے اور منصب و اقتدار ہے اللہ کے سچے نبی کی فرمائی ہوئی اس "وعید" کو سن پائے اور ارباب اقتدار اپنے نفوس و اعمال کا خود ہی جائزہ لے کر فیصلہ کریں کہ رعایا اور عوام کے ساتھ وہ خیر خواہی کر رہے ہیں یا بدخواہی۔

وہ ارباب اقتدار کتنے خوش نصیب ہیں جن کی رعایا کی یہ دلی تمنا ہو کہ اس پر اللہ کے قانون کو جاری کیا جائے جو اسے معاشرہ کی اسلامی اخلاق کا مثالی نمونہ بنائے جانے کی آرزو رکھتی ہو۔ اور وہ رعایا کس درجہ بدنصیب ہے جس کے حکام اسلام کی راہ روکنے کے لئے طرح طرح کی تدبیریں کر رہے ہوں، جو اس کوشش میں لگے ہوئے ہوں کہ ملک کے معاشرے سے رہی سہی اسلامی قدریں بھی ختم ہو جائیں، اور وہ سب نئی روشنی کے رنگ میں رنگ جائے جو صبغۃ اللہ کی بالکل ضد واقع ہوا ہے!

ہم غیب داں نہیں ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اس کشمکش کا کیا انجام ہوگا۔ ہم تو "قتال" سے سروکار رکھتے ہیں، اور لوگوں کو اس کی دعوت دیتے ہیں۔ کہ وہ اپنے موقف کا جائزہ لیں کہ وہ نیکی اور بدی کے ان دو محاذوں میں سے کس کیمپ کے ساتھ ہیں؟ اور جس کے بھی ساتھ ہیں تو صرف دل سے ساتھ ہیں۔ یا اس کے لئے کچھ دوڑ دھوپ بھی کر رہے ہیں! جو کوئی خاموش تماشائی بن کر اس کشمکش کو دیکھ رہا ہے وہ بھی سوچ لے کہ کیا قیامت کے دن اس سے کیا یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ اللہ کے کلمہ کو بلند اور پست کرنے کے لئے جو کشمکش برپا تھی اس میں تم اس وقت کہاں مر رہے تھے؟ اور تمہارا تقویٰ کس گوشۂ عافیت میں چھپا بیٹھا تھا۔

وہ مدعیانِ تقویٰ، ارباب ذکر و تصوف، اور اہل مراقبہ و مکاشفہ جو اہل عزیمت کے مظلوم راہرووں کا ساتھ دینے اور کم سے کم ہمت بڑھانے کے بجائے ان کی عزیمت کا مذاق اڑا کر ان کا دل توڑ رہے ہیں۔ اور اپنی اس "شہادت حق" سے مخالف کیمپ کو کمک پہنچا رہے ہیں۔ ان سے ہم کیا کہیں کہ وہ خود ملاء اعلیٰ سے ربط رکھتے ہیں، مگر جی نہیں مانتا، ڈرتے ڈرتے اتنا تو عرض کئے ہی دیتے ہیں!۔

کہ نادان گر گئے سجدے میں جب وقتِ قیام آیا

اور ——————

اے! تم —— تم! زبان نہ کھلواؤ ——————

تم سے اُمید چارہ سازیِ حق کی ——————

ماہر القادری

۲۵ جون ۵۸ء

...اولاد کو پالتی اور اُن کی نگہداشت صبر و سکون کے ساتھ بلا معاوضہ کرتی ہے۔ خود گیلی جگہ سوتی اور بچوں کو خشک جگہ سلاتی ہے۔ اپنے جسم کے خون کے چند قطروں کو دودھ کی شکل میں اس کے جسم میں انڈیلتی ہے۔ اس کے لئے بھوک پیاس اور تکلیف برداشت کرتی ہے۔ اور یہ سب بغیر مزد و اُجرت کے جو وہ انجام دیتی ہے۔ ایسی مومنہ ماں کی خدمت کا حضور نے بار بار حکم فرمایا ہے اور ماں کے پاؤں کے نیچے جنت قرار دیا ہے۔ اس کا رشتہ محکم، پائیدار اور پاکیزہ ہے۔ موت کے سوا اسے کوئی توڑ نہیں سکتی۔

قرآن میں مسلمان عورت کی صفاتی تصویر — اللہ تعالیٰ نے مومنہ خاتون کی ایک بڑی مفصل صفاتی تصویر قرآن پاک کی سورہ احزاب میں دی ہے۔ ایک خاتون قرآن کے بتلائے ہوئے ان خدوخال کو اگر اپنے سراپا میں جذب کرلے تو ایک ایسی ہستی وجود میں آتی ہے جو اللہ تعالیٰ کو مسلمان عورت کی حیثیت سے دنیا میں مطلوب ہے۔ بتایا گیا ہے کہ

- **مسلمات** — وہ خدا کی فرمانبرداری کرنیوالی اور اس کے غصے سے بچنے کی کوشش کرنیوالی ہوتی ہے۔
- **مومنات** — وہ اللہ پر اس کے رسول پر اور آخرت پر ایمان لانیوالی اور اپنے اعمال میں اس ایمان پر قائم رہنے والی ہوتی ہے۔
- **قانتات** — وہ اپنی زندگی کے سارے معاملات میں خدا کی طرف جھکنے والی۔ اسی سے اپنی حاجات طلب کرنیوالی اور اسی پر توکل کرنیوالی ہوتی ہے
- **صادقات** — وہ ایمان کی صداقت پر قائم اور صادق ہوتی ہے۔ کذب سے محفوظ اور جھوٹ سے دامن بچانے والی ہوتی ہے۔
- **صابرات** — وہ مشکلات آنے پر راہ حق پر ثابت قدم رہنے والی اور مالک کی مرضی پر مصائب برداشت کرجانے والی ہوتی ہے۔
- **خاشعات** — وہ خدا کے حضور میں پست۔ اس کے احکام کے سامنے تابع اور اسکی مرضی کی پابند ہوتی ہے۔
- **متصدقات** — وہ اپنے مال میں مسکین کا حصہ نکالنے والی۔ عزیز و اقرباء کے حقوق ادا کرنیوالی اور صدقہ و خیرات کا اہتمام کرنیوالی ہوتی ہے
- **صائمات** — وہ روزہ رکھنے والی اور اللہ کے احکام کی پابندی کرنیوالی ہوتی ہے۔
- **حافظات** — وہ اپنی عصمت و آبرو کی محافظ۔ شرم و حیا کی پتلی اور باعفت ہوتی ہے۔
- **ذاکرات** — وہ ہمیشہ اللہ کو یاد کرنیوالی۔ اسی سے لو لگانیوالی اور اسی پر تکیہ کرنیوالی ہوتی ہے۔
- **محصنات** — وہ نیکوکار۔ پرہیزگار۔ پاکدامن اور معصوم ہوتی ہے۔ اسے چھل فریب نہیں آتے۔ اسے دھوکا اور مکر نہیں آتا۔ وہ بھولی بھالی صاف دل اور نیک طینت ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ وہ اپنے شوہر کی وفادار۔ دیانتدار اور خدمت گزار ہوتی ہے۔ اسکے رازوں کی امین۔ حفاظت کرنے والی اور اس کے عیوب کی پردہ پوشی کرنیوالی ہوتی ہے۔ اسی طرح سورہ طلاق، سورہ تحریم اور سورہ نور میں اس کی صفات بیان ہوئی ہیں۔ اسلامی معاشرے کی مطلوبہ مثالی خاتون کا نقشہ ایسی صفائی اور وضاحت سے پیش کردیا گیا ہے کہ اس میں کسی ابہام کی گنجائش باقی نہیں رہ گئی ہے۔

دو مثالی کردار — پھر اس کے بعد قرآن نے دو مثالی کردار بھی پیش کردیئے ہیں جس کا نام ہی مسلمان خاتون کیلئے ایک بہترین مثال ہونیکی ضمانت ہے۔

- فرعون کی بیوی — حضرت آسیہؓ
- حضرت عیسیٰؑ کی والدہ محترمہ — حضرت مریمؑ

ایک خاتون اپنے وقت کے فرعون جابر و بدترین بادشاہ کے محل میں ہے جو ظلم، جبر، قہر اور کبر کی پیروی کیلئے تمام کے تمام بے شمار سامان اسباب اور وسائل اپنے جلو میں لئے ہوئے موافق دست بستہ ساتھ موجود ہیں۔ دوسری طرف اللہ سے تعلق جوڑنے، اس کی معرفت حاصل کرنے اور اس کا ذکر دل میں جگا کر رکھنے اور اس کی بندی بن کر رہنے کا وہاں کوئی موقعہ نہیں ہے۔ ایک جابر و قاہر انسان اپنی خدائی...

اور نیکی اگر ہنستی کھیلتی ہوئی اور پھر وجود میں آتی ہو تو ان کا اثر انداز ہوکر رہتی ہے اور عورت کیلئے تو اثر انداز ہونے کے مواقع مرد سے کہیں زیادہ ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ گھر کی فضا پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ جس قسم کی فضا گھر میں رہ پائیگی وہی فضا گھر کے، افراد پر اثر ڈالیگی اور انکے ذہن و فکر کے کاموں کا رخ بدلے گی۔ ویسے بھی گھروں میں ہونے والی نیکی کی باتوں کو پھیلانے کا انہیں حکم دیا گیا ہے۔

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ

(تمہارے گھروں میں اللہ کی آیتیں اور حکمت کی جو باتیں ہوتی ہیں ان کا چرچا کرو)

دنیا کی وہ عورتیں جو اپنی فطرت سے [illegible] کر پھانجانے کی وجہ سے تباہ و برباد ہو چکی ہیں ان میں تہذیب مغرب

مغرب کی عورت کے تلخ تجربات کا پہلے تذکرہ۔ اس کا مختصر اور انجام اقتصادی بیان کر دینا بہت کافی ہے تاکہ آپ جان سکیں کہ اسلام کی تعلیمات سے انحراف کرکے اپنے نفس سے ہدایت حاصل کرتا ہے وہ دنیا میں مادی اور سائنسی ترقی کے باوجود کتنی تلخی، کتنی مصیبت، اور کتنے عذاب سے دوچار ہے۔

تہذیب مغرب نے یورپ میں اور جہاں جہاں اس کے اثرات ہوئے ہیں ہر جگہ عورت کو اسکے دائرہ کار سے نکال کر مردوں کے دائرہ کار میں لاکر ڈال دیا۔ اسے لانے کیلئے بڑے بڑے خوشنما اور دلآویز نعرے لگائے گئے۔ اسے آمادہ کرنے کیلئے ترغیبات دی گئیں۔ آزادی۔ مساوات۔ ترقی پسندی۔ معاشی استقلال اور روشن خیالی کے نام پر اسے اسکے اصل میدان سے لاکر مردوں کے میدان میں کھڑا کیا گیا۔ اسلام نے جسے وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ کہکر عزت احترام اور وقار کا مقام دیا تھا وہ اس سے چھین لیا گیا۔ نتیجہ ظاہر ہے کیا ہونا تھا۔

● جس میدان میں عورت منفرد تھی۔ اسکے مقابل کوئی نہ تھا۔ جہاں کی وہ مختار مطلق تھی۔ جہاں وہ سیاہ و سفید کی مالک تھی جس کیلئے اسکی فطری صلاحیتیں موزوں ترین تھیں۔ اسکی ذہنی کیفیت۔ اسکی جسمانی ساخت۔ اس کی صحت اسکی توجہ جس [illegible] کے میدان کی متقاضی تھیں وہاں سے اسے نکال لیا گیا۔ اپنے فطری دائرہ کار چھوڑ دینے کی وجہ سے اس کی ایک میدان میں [illegible] اور مادرانہ حیثیت ختم ہوگئی۔ وہ اپنے باوقار مقام سے گر گئی۔ چنانچہ گھر اجڑ گئے بچے شفقت مادری سے محروم ہوگئے۔

● جس میدان میں اسے لایا گیا وہاں اس کے مقابلے میں ایک قوی حریف یعنی مرد تھا۔ جو جسمانی ساخت۔ صحت۔ محنت و مشقت میں اس سے فائق تر تھا۔ ایک ہی میدان معاش میں اگر جب دونوں کا مقابلہ ہوا تو لازماً عورت فروتر ثابت ہوئی۔ اور مرد کو لازماً فوقیت حاصل رہی۔

● وہ مردوں کے کھلے میدان مسابقت میں آکر گھروں کی حفاظت اور مخصوص ماحول کی پناہ سے بھی محروم ہوگئی۔ کھلے میدان میں اس پر چاروں طرف سے بھوکے بھیڑیوں کی طرح نفس پرستی کے حملے ہونے لگے جس کی وجہ سے اس کی عزت و آبرو بھی خطرے میں پڑ گئی۔

● اس پر دوہری ذمہ داریاں ڈال دی گئیں۔ فطرت کی طرف سے لازمی عائد کردہ فرائض تو اسے بہرحال ادا کرنے ہی پڑتے۔ میدان معاش میں اپنی روزی کا بندوبست بھی اس کے ذمے ہوگیا چونکہ اس کے لئے باعزت طور پر کارخانوں۔ ملوں۔ کھیتوں۔ کانوں۔ اور فیکٹریوں میں کام کرنا مشکل تھا۔ اس کی صحت اس کی متحمل نہ تھی اس لئے مجبوراً اسے مردوں کو خوش کرکے روزی کمانے کیلئے رقص گاہوں۔ کلب گھروں۔ تھیٹروں۔ سینماؤں۔ فلموں اور ثقافتی اداروں کی طرف آنا پڑا اور رجوع کرنا پڑا تاکہ جو اس کی اصل متاع نسائیت ہے اس کی نمائش کرکے روزی کما سکے۔

یہ وہ دردناک انجام ہے جس سے تہذیب مغرب کی بیٹی دوچار ہے۔

اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔

● خاندانی نظام درہم برہم ہوگیا ہے۔ ان کے گھروں کا سکون رخصت ہوگیا ہے۔ ہوٹلوں میں کھانا، سینماؤں اور پارکوں میں تفریح، ہسپتالوں میں بیماری اور مرنا، اور کسی قبرستان میں جاکر دفن ہو جانا۔ یہ وہ عام زندگی ہے جس کی سطح پر

● ملک بھر میں آرٹ کونسل کے نام سے ناچ رنگ کے ادارے قائم کئے ہیں جو سرپرست سرکاری حکام تک ہو گئے۔ اور اسلامی تعلیمات کے فروغ پر کچھ صرف کرنے کی بجائے بھاری رقوم جیل اکیڈمی جیسے اسلامی تہذیب کے منافی اداروں پر صرف کی جارہی ہیں۔

● معصوم بچیوں تک کو ناچ گانے کی تعلیم دی جانے لگی ہے۔ اور ہر تقریب موقع پر ڈراموں کے ذریعہ سے لڑکیوں کو ایسے کاموں کی ترغیب اور تعلیم دی جاتی ہے۔

● لازم ہے کہ اب میٹرک تک کے نصاب تعلیم کو بھی اس طرز کا مرتب کیا گیا ہے۔ جس میں گانے بجانے اور ثقافتی سرگرمیوں کے لئے گنجائش رکھی گئی ہے۔ تاکہ اگر موقع مل جائے اور قوم ان سرگرمیوں کو برداشت کرلے تو پھر آہستہ آہستہ اس ڈھب پہ آ جائے کہ پوری قوم کو اپنے رنگ میں رنگ کر پوری طرح شرم و حیا اور اخلاق و آداب اور اسلامی جذبات و حیات اور تہذیب سے عاری کر دیا جائے۔

ان سرگرمیوں کے نتیجہ میں پاکستان میں پہلے کے مقابلے میں غنڈہ گردی بڑھ گئی ہے۔ طلاقیں بڑھ گئی ہیں۔ بداخلاقی اغوا اور فحش کاری کے واقعات بڑھ گئے ہیں اور محسوس ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے حکومت کی قوت اور دولت اور اثر و رسوخ بھی کاموں پر صرف کیا ہے۔ اس کے نتائج اب برآمد ہونے لگے ہیں۔

خدا اور رسول سے باغی ہماری موجودہ قیادت کے نزدیک ان سرگرمیوں کے سیاسی وجوہ بھی ہیں اور اخلاقی بھی۔ اخلاقی تو یہ ہے۔ کہ جس اخلاق کے وہ خوگر ہیں اسی اخلاق میں اگر قوم کو بھی رنگ دیا جائے۔ تو پھر کسی کو ان پر انگلی اٹھانے کی ہمت نہ ہوگی۔ ان کی حیثیت اس دم کٹی لومڑی کی ہے جس نے تمام لومڑیوں کی چالاکی میں اپنی اخلاقی دم کٹوائی ہے۔ اور اب ساری قوم کو دم کے نقصانات پر وعظ سنا رہی ہے اور اس کے درپے ہو ہے۔ سیاسی وجہ یہ ہے کہ جب ایک فاسقانہ رنگ میں سب رنگ جائیں گے تو قوم کو اسلامی نظام کا جو بار بار عشق سوار ہو جاتا ہے۔ اس کا توڑ ہو جائے گا اور قوم اسلامی نظام کے تصور کے ساتھ ہی ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو نمونے کے طور پر رکھتی ہے۔ اس کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ اور ان کے تخت اقتدار کے پائے زیادہ مضبوط اور پائیدار ہو جائیں گے۔

اب میں عرض کروں گا کہ وہ مسلمان خواتین جو ان حالات سے دوچار ہیں۔ جو ان حالات کی ابتری کا احساس رکھتی ہیں۔ مسلمان خواتین کی عزیمت جن کے سامنے کرنے کے کام کا ایک پہاڑ ہے جو اپنی دنیا اور آخرت دونوں کی [illegible] اسی میں سمجھتی ہیں۔ کہ خدا کی راہ کا کام کریں۔ ان کے لئے یہ انوکھا کام نہیں ہے۔ ان سے پہلے بھی اسلام کی خادم اللہ کی بندیوں نے وہ کارنامے انجام دیئے ہیں جو خواتین کی تاریخ کا سنہری باب ہیں۔ اور جو ان کے لئے آخرت کی بہترین متاع ہو سکتے ہیں۔

نبی اکرم نے غار حرا سے واپس آکر اضطراب کی حالت میں لرزتے ہوئے اپنا واقعہ بیان فرمایا۔

"مجھے اپنی جان کا خطرہ ہے"

"نہیں آپ کو ڈر کاہے کا۔ میں دیکھتی ہوں۔ آپ اقربا پر شفقت فرماتے ہیں۔ سچ بولتے۔ بیواؤں یتیموں کی دستگیری کرتے۔ مہمان نوازی فرماتے اور مصیبت زدوں سے ہمدردی فرماتے ہیں۔ خدا آپ کو کبھی غمگین نہ کرے گا"

یہ وہ آواز تھی جس نے بعثت کا عظیم تر بوجھ پڑنے پر حضور نبی کریم کی ہمت افزائی کی۔ انہیں تسلی دی۔ تشفی دی اور ایک کی پشت پناہی کی۔ دولت کا سب سے بڑی قوت کا سہارا دیا۔ یہ کون تھیں۔ ہماری آپ کی اور سب مومنین کی محترم و مکرم ماں — حضرت خدیجہ الکبریٰ اللہ تعالیٰ جنت میں ان کے درجات کو بلند سے بلند تر فرمائے۔ ان کا یہ احسان کہ انہوں نے دنیا کے سب سے بڑے انسان کو دنیا کا سب سے بڑا کام سرانجام دینے میں مدد کی۔ تعاون کیا۔ ہمت بندھائی۔ رفاقت کی۔ ساتھ دیا اور اپنا سب کچھ اس راہ میں لگا دیا۔ جنہوں نے نبی نوع انسان کے آخری ہادی برحق کو تسلی تشفی دی۔ یہ وہ احسان عظیم ہے۔ ہم مسلمانوں پر جو قیامت تک پیدا ہونے والے انسانوں پر وہ احسان ہے۔ جو کبھی اتارا نہیں جا سکتا۔ جو کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔

یہ فخر ایک خاتون کو ہی حاصل ہوا۔ ہم، ہمارے آباؤ اجداد، ہماری نسلیں بعثت کی عظمت کے بوجھ تلے دبے جائیں گے۔ اور کبھی اس کا حق ادا نہ کر سکیں گے پھر جب تبلیغ کا فریضہ ادا کیا جانے لگا۔ تو ایک خاتون حضرت خدیجۃ الکبریٰ ہی تھیں جو سب سے پہلے ایمان لائیں۔ یہ تحریک جو اُٹھ رہی تھی، نیا دین جو پیدا ہو رہا تھا۔ نیا تصورِ زندگی جو ابھر رہا تھا۔ اس کی رفاقت کے لئے اس پر ایمان لانے کے لئے اس کی کارکن بننے کے لئے اپنا سب کچھ لٹانے کے لئے سب سے پہلے آگے بڑھنے کا فخر ایک خاتون کو ہی حاصل ہوا۔ پھر جیسے جیسے اسلام کی دعوت پھیلتی گئی۔ وہ اپنا اثاثہ، اپنی صلاحیت، اپنی قوت و ہمت اور اپنا اثر و رسوخ اسے پھیلانے کیلئے اور داعی اسلام کے لئے سکینت و محبت فراہم کرنے کے لئے صرف کرتی چلی گئیں۔ یہاں تک کہ ان کی وفات کے بعد بھی حضور اکرمؐ ان کو بہت یاد فرمایا کرتے تھے۔

جیسے جیسے دعوت پھیلی۔ مردوں کے ساتھ خواتین نے بھی بڑھ چڑھ کر اس میں حصہ لیا۔ اسلام میں سب سے پہلی شہادت بھی ایک خاتون ہی نے پیش کی۔ ابوجہل کے نیزے نے حضرت سمیہؓ کو سب سے پہلے اس کے مالک کی راہ میں شہید کیا۔ حضرت عمر فاروقؓ جیسے انسان کو اسلام کے دائرے میں داخل کرنے کی سعادت بھی ایک خاتون کو ہی حاصل ہوئی۔ جنہوں نے خون سے لہولہان ہونے اور اسلام کے لئے سخت ترین مار کھانے کے باوجود بلند آواز سے صاف صاف کہہ دیا کہ عمر جو چاہے کرو اسلام اب دل سے نکل نہیں سکتا۔ یہی وہ تاریخی جملہ ہے۔ جس نے حضرت عمرؓ کے سامنے سے تاریکیوں کے بادل چیر کر آفتابِ حقیقت کو نمایاں اور روشن کر دیا۔

پھر وہ بھی ایک خاتون ہی تھیں۔ اسماء بنت ابوبکر صدیقؓ جنہوں نے ایک انقلابی ہمت و شجاعت کے ساتھ تین دن تک غارِ ثور میں حضورؐ تک کھانا پہنچایا۔ جبکہ قریش بھوکے بھیڑیوں کی طرح آپ کے درپے تھے۔ اور سرخ اونٹوں کے انعام کے لالچ میں دشت و بیاباں کے اندر تلاش میں سرگرداں تھے۔ جنہوں نے ابوجہل جیسے تند خو آدمی کی پرسش پر صاف جواب دیا اور ایک سخت طمانچہ برداشت کیا۔

پھر وہ بھی ایک خاتون ہی تھیں۔ جنہوں نے معرکۂ احد میں بیش بہا جنگی خدمات انجام دیں۔ زخمیوں کو پانی پلاتی پھرتی تھیں اور خطرناک ترین حالات میں بھی راہِ حق میں مشکلات کا مقابلہ کرتی رہیں۔ اپنے بھائیوں اور شوہروں کی مسخ شدہ لاشیں دیکھتی تھیں۔ لیکن زبان سے اف نہ نکلتی تھی۔ بلکہ صرف نبی اکرمؐ کی خیریت کی طالب تھیں۔ مسلمانوں کی معاشرت کا بیشتر حصہ خواتین کی معرفت تیار اور مرتب ہوا۔ کئی کئی ہزار احادیث روایت کیں اور اپنی علمی قوت سے دینِ اسلام کی بیش بہا خدمت بھی انجام دیں۔

ہماری محترم ماؤں اور بہنوں کی یہ وہ درخشاں کہانی ہے۔ جو تاریخ کے صفحات پر کندہ ہے۔ جس کی موجودگی اس بات کی شہادت ہے۔ کہ مسلمان خاتون اپنی آخرت بنانے میں مردوں سے کبھی پیچھے نہیں رہیں۔ نہ انہوں نے کبھی مردوں کا ضمیر بن کر اپنا دین ان کے حوالے کیا ہے۔ نہ انہوں نے اس بات کو کافی سمجھا ہے۔ کہ جو طریق سوسائٹی کا ہو وہی ہمارا ہے۔ بلکہ انہوں نے شعور حاصل کیا اور پھر اپنے شعور کے مطابق اپنے مقصدِ زندگی کے لئے بیش قیمت قربانیاں پیش کیں۔

اسلام کی آپ سے آج جبکہ ہمارے ملک میں غیر اسلامی تہذیب و معاشرت اور غیر اسلامی اقدار و افکار کا ایک سیلاب امڈا چلا آ رہا ہے۔ حکومت سے کیا توقعات ہیں۔ قوت اور ہماری جاہلیت پسند بہنوں کی مدد سے مغربی تہذیب کا لاؤ لشکر ہمارے درمیان ڈیرہ ڈال رہا ہے۔ تو آخر ہماری خواتین کا، میری ماؤں اور بہنوں کا کیا فرض ہے۔ انہیں کیا کرنا چاہئے۔ یہ ایک سوال ہے۔ جو ان کے سامنے آ کھڑا ہوا ہے۔

اس کا مختصر جواب یہ ہے۔ کہ وہ اپنی ہستی کی پوری قوت سے اس سیلاب کا راستہ روکیں۔ اس کے سامنے بند باندھیں اور اپنے گھروں کو اس سے بچائیں۔ اپنی اولادوں کو اس میں غرق ہونے سے محفوظ رکھیں۔ اپنے مردوں کو اس کی طرف مائل ہونے سے روکیں اور شیطان جو اپنے لاؤ لشکروں کے ساتھ اس سرزمین پر چڑھا آ رہا ہے۔ اس کا ڈٹ کر مقابلہ کریں۔ ایسا مقابلہ جو موت یا مکمل فتح پر منتج ہو۔

اب تک ہماری تہذیب اور گھریلو ماحول میں تھوڑے بہت جو اصل یا اہم اسلامی اثرات محفوظ ہیں۔ وہ کلی طور پر جاہلی اور غیر اسلامی ہونے سے اس لئے بچا ہے۔ کہ ہمارے فرنگی آقاؤں کو براہ راست ہماری معاشرت پر حملہ کرنے کی ہمت نہ تھی۔ اس لئے وہ چادر اور

آپ کا آنا بڑا خطرناک ہے ۔ مشرقی دشمن ثابت نہ ہوا تھا جتنے ہمارے اپنے یہ وطنی بھائی ثابت ہو رہے ہیں ۔ جو ان کی نا سمجھی اور ناپختگی کر رہے ہیں ۔ اس
مغربی تہذیب سے گھروں کی اخلاقی حالت کو محفوظ رکھنا بڑا اہم اور مشکل کام ہے ۔ اور میں آپ سے عرض کروں کہ گھر کے اس آخری قلعے کی قلعہ دار آپ ہی ہیں
آپ ۔ اس کے دروازے کھول دیں گی تو اس کے مفتوح ہونے میں کوئی شبہ نہ رہ جائے گا ۔ آپ ہی خدانخواستہ اس کے چور دروازوں سے مغربی تہذیب کی
در آمد کرا دیں گی ۔ تو مرد بے بس ہو جائیں گے ۔ آپ ہی خدانخواستہ دشمن سے مرعوب ہو گئیں تو باہر سے کوئی مدافعت نہ ہو سکے گی ۔ یہ آپ کا فرض ہے
کہ قلعے کے دروازے پوری قوت سے اس ظالم دشمن مغربی تہذیب و اخلاق پر بند رکھیں پھر دیکھئے آپ کے مرد کتنی مردانگی اور جانبازی سے اس کا
مقابلہ کرتے ہیں ۔ اس محاذ پہ آپ کی پشت پناہی نہ ہوئی تو وہ کچھ بھی نہ کر سکیں گے ۔

اس ملک کے اسلام پسند مرد ایک جنگ لڑ رہے ہیں ۔ ایک شدید جاں گسل کشمکش سے دوچار ہیں ۔ اس جنگ کا سارا سیاسی
محاذ ان کے سامنے ہے ۔ اس پر وہ آپ کو تکلیف نہ دیں گے ۔ لیکن جس طرح ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت صفیہ اور حضرت ام سلیم اور دوسری
محترم خواتین معرکے میں مشکیں بھر بھر کر زخمیوں کو اٹھاتے ۔ پانی پلانے اور زخمیوں کی حفاظت کرنے میں پیش پیش رہتی تھیں ۔ آپ بھی اس سیاسی و انقلابی
جنگ میں اسلام کے خادموں کا سہارا بنیئے ۔ اس سلسلے میں چند چیزوں کی طرف توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں ۔

● سب سے پہلے یہ فہم حاصل کرنا ضروری ہے ۔ کہ آپ کس کے خلاف اور کس کی حمایت میں جنگ کر رہی ہیں ۔ اسلام کیا ہے جس سے آپ کو محبت
عقیدت اور جانثاری کا دعویٰ ہے ۔ اور جاہلیت کیا ہے جس سے آپ کو نفرت دشمنی اور عداوت ہے ۔ یعنی دین کا ضروری فہم حاصل کرنا لازمی ہے ۔ اس کے بغیر آپ
اپنے سمت سفر متعین نہیں کر سکتیں ۔ اپنے ہتھیار کا ہدف مقرر نہیں کر سکتیں ۔ اس کے بغیر تو آپ یہ بھی نہیں جان سکتیں ۔ کہ خدا اور رسول کا آپ سے
کیا مطالبہ ہے ۔ آخرت میں آپ سے کیا سوال ہونا ہے ۔ آپ کو کس قسم کی تیاری کرنی چاہیئے ۔ اس لئے دین کا فہم حاصل کیجئے کم سے کم اتنا فہم جس سے آپ
میں اچھائی برائی ۔ نیکی بدی ۔ اور روشنی کی شناخت اور امتیاز پیدا ہو جائے ۔ یہ ایک انتہائی ضروری اور پہلا مرحلہ ہے ۔ جس کے بغیر آپ چار قدم بھی نہیں
چل سکتیں ۔ اور نہ چل پڑیں تو غلط سمت پر چل پڑنے کا پورا امکان ہے ۔ اس کام کے لئے اردو کے اندر آسان دینی کتب کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے ۔
جماعت اسلامی نے بھی خواتین میں دین کا فہم پیدا کرنے کے لئے بہت سی سہل کتابیں تیار کر دی ہیں ۔ ان سے فائدہ اٹھایئے

● دوسرا کام یہ ہے ۔ کہ اپنے ان مردوں کے ساتھ رفاقت کا حق ادا کیجئے جو حق و باطل کی اس کشمکش میں حق کا ساتھ دے رہے ہیں ۔ جاہلیت
کے غالب نظام زندگی کے خلاف کشمکش کرنا ایک کٹھن کام ہے ۔ ایسے شخص کو کانٹوں کے بستر پر سونا ہوتا ہے ۔ غلط نظام اس کو چاروں طرف
سے کھینچ کر کچل ڈالنے کی کوشش کرتا ہے ۔ رشتہ داروں کی پشت پناہی ۔ احباب کی دوستیاں ، اور رزق کی فراخی ان سب سے محروم ہونا پڑتا
ہے اس صورت میں اگر آپ بھی اپنے گھروں میں ان کے لئے سکون کی فضا فراہم نہ کریں ۔ تو یہ ان کے لئے بڑا دشوار مرحلہ ہوگا ۔ اس لئے ایسے
مردوں کی رفاقت کا حق ادا کیجئے ۔ اور برے بھلے وقت میں ان کا ساتھ دیجئے اور اپنے ناحق پرست اور حق و باطل کی کشمکش سے بے نیاز
مردوں کو مسلسل ترغیب کے ذریعے کرنے کے اس اہم کام پر ابھاریئے ۔ مسلسل ترغیب سے آپ اپنے مردوں سے ہر کام کرا لیتی ہیں ۔ اور اس کا تجربہ
خوب تجربہ ہے ۔ کہ اس میں آپ کبھی ناکام نہیں رہتیں ۔ تو پھر چھوٹے چھوٹے غیر ضروری ذاتی کام جب ترغیب سے ہو سکتے ہیں ۔ تو یہ تو پھر اللہ
خدا اور رسول کے حقوق کی ادائیگی اور ان کی اطاعت کا حق ادا کرنے کی ترغیب ہے ۔ اس ترغیب و تبلیغ سے آپ کے گھروں میں ایک توازن پیدا ہوگا ۔
جو بہت سی معاشی و معاشرتی مشکلات اور گتھیوں کو سلجھا دے گا ۔

● تیسرا کام یہ ہے ۔ کہ آپ اپنے گھر میں اگنے والی انسانی فصل کو کیڑوں مکوڑوں سے بچا کر اچھی طرح پرورش کریں ۔ تاکہ یہ پیداوار ان کے
حقیقی مالک کے کھاتے میں جا سکے ۔ اور اس کے دین کے کام آئیں ۔ اپنے بچوں کو اسلام کا خادم اور شیدائی بنا کر اٹھایئے ۔ یہی آپ کو تباہ شدہ محنت
سے جو مال آپ کے ان گھریلو کارخانوں میں تیار ہو رہا ہے ۔ وہ سارے کا سارا ناکارہ مال ثابت ہو رہا ہے ۔ دنیا میں اس کی قیمت دو کوڑی

حتا زیا۔ تیس برس سے کم میں اس منصوبے اور نظام نے شہنشاہ قسطنطنیہ کو شکست دی۔ ایران کے بادشاہوں کو مغلوب کیا۔ شام، عراق عرب اور مصر کو فتح کیا اور بحیرہ احمر سے طلیطلہ تک فتوحات کو پھیلا دیا اور بارہ صدی سے آج تک سوائے اسپین کے ان حدود میں برابر مسلمانوں کی حکومت چلی آتی ہے اور اسلام شمالی ایشیاء، وسط افریقہ اور علاقہ سپین میں پھیل گیا اور پھیلتا چلا جاتا ہے۔

عبد الکریم ثمر

حضرت عمر بن عبد العزیز کی عید

تاریخ اسلام کا ایک زرین ورق

اسلامی تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ نبی کریم صلعم نے پہلی عید الفطر مدینہ منورہ میں ادا فرمائی۔ کیونکہ اسی سال روزے فرض ہوئے تھے۔ لفظ عید در اصل عود تھا۔ بوجہ کثرت استعمال و ی سے تبدیل ہو گئی اور لفظ عید بنا۔ عید کے لغوی معنی رجوع کے ہیں۔ یہ نام اسی لئے رکھا گیا۔ کہ اس دن اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے بندوں پر انعامات کا نزول فرماتا ہے۔ اور اللہ کے بندے بھی اللہ کی جانب رجوع کرتے ہیں۔

دنیا کی اقوام نے اظہار مسرت اور جشن عام کے لئے اپنے خاص دن مقرر کر رکھے ہیں۔ جن میں ہر قسم کی بے ہودگیاں رقص و سرود اور لہو و لعب کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ لیکن اسلام نے نہ صرف عبادات ہی پر اپنا دامن محفوظ رکھا ہے۔ بلکہ جشن مسرت کے لئے بھی خاص قواعد اور پابندیاں متعین فرما دی ہیں۔ ہر قسم کے فسق و فجور سے منع کیا۔ اور عید کے جشن میں تسبیح و تہلیل اور ذکر الٰہی [illegible] کرنے کا ارشاد فرمایا

صدقہ فطر واجب قرار دیا۔ کہ مفت کے مسکین اور بے یار و مددگار افراد بھی عید کی خوشیوں سے متمتع ہو سکیں۔ پھر نماز دوگانہ ادا کے ساتھ تجدید عہد پاکیزگی جسم زینت دنیا کے ساتھ ساتھ طہارت نفس اور آرائش باطن کی تیاری تاکہ مسلمان وعید سے محفوظ رہیں۔ [illegible] اور اسراف ہے اس کو قطعاً پسند نہیں کیا

عہد خلافت امویہ کا ایک واقعہ ہے۔ کہ امیر المومنین حضرت عمر بن عبد العزیز امور خلافت سے ابھی فارغ نہیں ہوئے۔ کہ عید نے نقارہ مسرت و بہجت پر چوٹ لگائی۔ اور رمضان کی مبارک گھڑیاں [illegible] فردوس گوش ہو گئیں۔ ہلال عید نظر آ رہا ہے۔ حضرت امیر المومنین نماز مغرب کے بعد حرم میں تشریف لے گئے۔ تو دیکھا کہ چھوٹا بچہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا ہے۔ اور حضرت فاطمہ نور نظر کو ہر طرح بہلانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ فرط محبت سے پیشانی چومتی ہیں۔ اور مضطربانہ انداز میں پوچھتی ہیں۔ نور نظر میرے لال کیا بات ہے۔ امیر المومنین نے پوچھا (فاطمہ) یہ بچہ کیوں رو رہا ہے۔ کل عید ہے مگر وہ دمشق کے امراء کے بچے [illegible] باہر بچے اچھل اچھل کر اظہار مسرت کر رہے ہیں۔ اور ...... بچے نے روتے ہوئے شکایت کی یا امیر المومنین امی کہتی ہیں کہ مجھے عید کے دن پرانے ہی کپڑے دھو کر پہنا دیے جائیں گے۔ اور جو امیر کے تمام بچے حسین، طارق، زبیر سب نئے اچھے کپڑے پہن کر عید گاہ جائیں گے۔ مجھے شرم آتی ہے۔ تو عید گاہ نہیں جاؤں گا۔

بچہ کہہ کر پھر رونے لگا۔ اور ماں سے چمٹ گیا۔ ماں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ انہوں نے بچے کو چمکارتے ہوئے کہا بیٹا یہ بھی رونے کی کوئی بات ہے۔ ہم تمہیں بھی ابھی نئے کپڑے بنوا دیتے ہیں۔ یہ سن کر بچہ [illegible] کھل اٹھا۔ دوسرے بچے بھی مسرت سے جھومنے لگے

حضرت فاطمہ نے حضرت عمرؒ سے عرض کیا - یا امیر المومنین انہیں نئی عبائیں منگوا دیجئے - آخر یہ خلیفۂ وقت کے فرزند ہیں - انھیں پھٹے پرانے کپڑے تو زیب نہیں دیتے - خلیفہ نے فرمایا - فاطمہ میری تنخواہ قلیل ہے - محدود آمدنی سے بمشکل روکھی سوکھی روٹی چل رہی ہے - تم جانتی ہو اور کسی قسم کا اثاثہ میرے پاس نہیں - اگر تمہارے پاس کوئی چیز ہو تو اسے دو - اسے بیچ کر بچوں کے لئے نئے کپڑے منگوائے جائیں -
بیوی نے عرض کیا - اے امیر المومنین میرے پاس تو اب ایک چھلا تک باقی نہیں - آپ نے کاروبار خلافت سنبھالتے ہی تمام زیورات بلکہ وہ قیمتی ہار بھی مجھ سے چھین کر بیت المال میں داخل کرا دیا تھا - جو میرے والد مرحوم نے بطور یادگار عنایت فرمایا تھا - اب میرے پاس کیا رکھا ہے!

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ دیر تک سر جھکائے سوچتے رہے - پھر مہتمم بیت المال کے نام ایک رقعہ لکھا - کہ مجھے ایک ماہ کی تنخواہ بیت المال سے پیشگی دے دی جائے - اور خادم کو بار بار تاکید فرمائی کہ خط کے جواب میں مہتمم بیت المال جو کچھ دیں - وہ سنبھال کر لے آئے - تھوڑی دیر کے بعد خادم واپس آیا - اور وہی رقعہ ساتھ لایا جس کی پشت پر مرقوم تھا - امیر المومنین کا حکم سر آنکھوں پر لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ امیر المومنین آئندہ ماہ تک زندہ رہیں گے -

یہ جواب پڑھ کر حضرت عمرؒ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے - اور فرمایا مہتمم نے مجھے ہلاکت سے بچا لیا - اللہ اسے جزائے خیر دے - دوسرے دن پورا دمشق عید کی مسرتوں سے ہمکنار تھا - رنگینیاں خوشیوں عطر بیزیوں اور گلہائے تہنیت کی رعنائیاں ہر طرف جلوہ گر تھیں - ہر فرد و بشر بالخصوص امیر بچے بچیاں خوبصورت جوڑے عبائیں عمامے اور حلے زیب تن کئے عیدگاہ کی جانب رواں دواں تھے - اور خاندان امویہ کا یہ جلیل القدر خلیفہ عمر بن عبد العزیز جس کے نام کا خطبہ نصف کرۂ ارض میں پڑھا جاتا تھا - بچوں کو ساتھ لئے عیدگاہ جا رہا تھا - اس کے صاحبزادے وہی پرانی عبائیں پہنے بھی خوشی خوشی باپ کی انگلی پکڑے ساتھ تھے - کیونکہ رات ہی کو انہیں سمجھا دیا گیا تھا - جو بچے عید کے دن یہاں پھٹے پرانے کپڑے پہن لیتے ہیں - ان کو بہشت میں نئے ریشمی جوڑے عطا کئے جاتے ہیں -

---

کوثر نیازی

کیا ہوگا ــــــ !!

درازِ سلسلۂ ممکنات، کیا ہوگا؟
نشانِ پائے قیام و ثبات، کیا ہوگا!

یزیدِ وقت کی اطاعت جسے گوارا ہو
وہ قدر دانِ شہیدِ فرات کیا ہوگا!

مثالِ نجم و سحر ہم تو ڈوب جائیں گے
علاجِ تیرگیٔ شش جہت کیا ہوگا!

دراز بازوئے حیدرؓ نہ حضرتِ فاروقؓ
قدم قدم پہ ہیں لات و منات، کیا ہوگا!

کسی کے وعدۂ فردا پہ ناز کرتا ہوں۔
دل و نظر کی یہ سب کائنات، کیا ہوگا!

ابھی سے ہوش اڑے جا رہے ہیں اے کوثر
یہ بے رخی ہے تو پھر التفات کیا ہوگا!

یہ کوئی نئی تحریک نہیں!

آلام و مصائب سے ڈرنا، اربابِ وفا کا کام نہیں
آغاز کیا ہے جرأت سے اب ہم کو غمِ انجام نہیں

جو ان کے تصور میں گزرے، جو ان کی یاد میں کٹ جائے
اس صبح سی کوئی صبح نہیں، اس شام سی کوئی شام نہیں

اس عشق کی منزل میں لاکھوں پہلے بھی رہے سرگرمِ سفر
یہ کوئی نئی تحریک نہیں، یہ کوئی نیا اقدام نہیں

یہ رہنما، یہ ذوقِ سفر، دکھلائے نہ اک دن یہ منظر
رہرو ہیں کہ ہمت ہار چکے، منزل ہے کہ اک دو گام نہیں

دل سوز سے خالی کیوں نہ رہیں، جذبات نہ ہوں کیوں پژمردہ
تقویٰ کے بھرم سے کیا حاصل، جب دل میں غمِ اسلام نہیں

افسردگیٔ بزمِ وطن گو ترجمہ ہوں تو کس سے کہوں۔
جو کچھ بھی کیا اپنوں نے کیا، غیروں پہ کوئی الزام نہیں

ریلوے اسٹیشن پہونچ گیا تھا۔ یہ سفر زیادہ سے زیادہ تین گھنٹے کا تھا پھر بھی میں نے حسین مناظر سے اچھی طرح لطف اندوز ہونے کے لئے تھرماس کافی سے بھر کر کیمرہ بغل میں لٹکایا اور صبح سویرے ناشتے سے فارغ ہوتے ہی چل پڑا۔

منظر انتہائی حسین اور دلکش تھا اور دلفریب تھے یہ نئے ولٹیں جو لہلہاتے ہوئے نباتات کی سرحد سے تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے ٹھیک راستہ پر چلتا رہا۔ مگر پھر راستہ بھٹک گیا۔ اور اب بھی جبکہ مشرق سے آہستہ آہستہ بڑھتی ہوئی سیاہی دن کی دم توڑتی ہوئی روشنی پر غالب آنے لگی تھی اور تارے نیند سے بیدار ہونے کے بار بار اپنی پلکیں جھپکا رہے تھے میں منزل مقصود تک نہ پہونچ سکا تھا۔ اور نہ کسی آبادی کے نشان نظر آتے تھے۔ میں اس طلسماتی فضا میں ایک معجزہ کا منتظر تھا جیسے میرے وطن میں کرسمس کے موقع پر راہ گم کردہ مسافروں کو پیش آیا کرتے ہیں اور آخرکار ایک اونچے سے ٹیلے کو پار کرتے ہی وہ معجزہ ظہور میں آگیا جس کا میں منتظر تھا۔۔

میرے سامنے حد نظر تک پھیلے ہوئے کھیت تھے۔ گیہوں کی فصل تیار کھڑی تھی ہلکی ہلکی چلتی ہوئی شمالی ہوا میں دانوں سے لدی ہوئی بالیوں کی کھنکھناہٹ اور ہلاتے ہوئے پودوں کی سرسراہٹ نے ایک نغمہ بکھیر دیا تھا کھیتوں کے درمیان چند مکانات کے دودکشوں سے نکلتا ہوا دھواں زندگی کا ثبوت دے رہا تھا۔ اس وقت دہقانوں کے وہ خام مٹی اور پھوس سے بنے ہوئے چند مکانات میرے لئے کسی شہر سے کم حیثیت نہ رکھتے تھے۔ آگے بڑھنے پر ایک دس تیرہ سال کی خوبصورت سی لڑکی مرغیوں کو پانی دے رہی تھی۔ میرے نزدیک پہونچنے پر وہ چونکی۔

تم کون ہو۔؟ اس نے اپنی کانچ کی نئی گولیوں کی طرح چمکتی ہوئی شفاف نیلی آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔ میں اس کو جواب دینے سے پیشتر صراحی اٹھا کر اس سے اپنا منہ لگا دیا سرد اور شیریں پانی سے سیراب ہو لینے کے بعد میں نے اس سے کہا، مجھے گھر لے چلو۔

تم شہر سے مرغیاں لینے آئے ہو! اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

میں نے کہا میں تو تمہارے ملک میں مسافر ہوں تم اپنے گھر تک میری رہبری کرو۔ میں نے اس کی بالٹی بھر کر اٹھالی۔

تم مسافر ہو۔ ہمارے گھر رہو گے؟ وہ بڑے غور اور تعجب سے مجھے گھور گھور کر دیکھتی رہی اور پھر یکایک اس کا چہرہ کھل اٹھا اور وہ خوشی سے تالیاں بجاتی میرے آگے آگے دوڑتی ہوئی ایک گھر میں داخل ہوگئی۔ جب میں وہاں پہونچا تو اس کے چلا چلا کر بات کرنے کی آوازیں مجھے باہر تک سنائی دے رہی تھیں۔ ایک ادھیڑ عمر کے آدمی نے باہر آکر مجھے خوش آمدید کہا۔ بیٹا۔ وہ چھوٹی بچی میرے بارے میں اسے بتا چکی تھی جلد ہی میرے چاروں طرف بچوں کی ایک بھیڑ سی لگ گئی۔ شاید کوئی پردیسی اس گاؤں میں مدت سے نہ آیا تھا۔

میں نے وہ رات اس مختصر سے خاندان کے ساتھ بسر کی۔ میں اپنی سیاحت کی اس طویل زندگی میں آج تک کہیں گھل ملا نہیں تھا جتنا ان کے ساتھ۔ اس رات کی پرخلوص و پرجوش محبت نے مجھے اپنا لیا۔ رات گئے تک ہم لوگ آتشدان کے نزدیک بیٹھے ہاتھ تاپتے اور گرم گرم قہوہ پیتے رہے تھے گو وہ ہم غریب تھے کے باوجود مجھے کرید کرید کر دوسرے ملکوں کا حال مجھ سے پوچھتا رہا۔ پھر اس کے بیٹے اپنے اسکول کے چند دلچسپ واقعات سنائے جناب کی تعلیم وہ ختم کر چکا تھا اس کی عمر مشکل تیرہ برس ہوگی مگر اپنے چہرہ پر بکھری ہوئی اداسی کے سبب وہ زیادہ عمر کا نظر آتا تھا۔ میں نے جب اس کی اداسی کا سبب پوچھا تو معلوم ہوا کہ اس کو ایک ماہ بعد ٹیکنیکل اسکول میں بھیج دیا جائے گا جہاں ایک سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد پھر کسی فولاد کے کارخانے میں کام کرنے کے لئے جانا پڑے گا۔ اس نے مجھے بتایا کہ میں نے سوچا تھا کہ میں پڑھ لکھ کر ادیب بنوں گا میرے چاروں طرف اچھی اچھی کتابوں کا ڈھیر ہوگا اور میں بیٹھا پڑھتا لکھتا رہا کروں گا مگر میرے والدین غریب ہیں اور سرکار کو فی الحال ادیبوں کی نہیں کارخانوں میں کام کرنے والے انجینیروں کی ضرورت ہے

لینا جو دوسری طرف میرے کاندھے سے لگی بیٹھی تھی بہت چپکے چپکے سب سن رہی تھی کہ بول پڑی۔ بھیا بھی کہانیاں لکھتے ہیں۔

کیوں جی تم کہانیاں بھی لکھتے ہو۔؟ میں نے پوچھا۔

اس کے چہرہ پر چھائی ہوئی افسردگی کی لکیریں اور گہری ہوگئیں۔

نہیں تو — اس نے اپنے باپ کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

ہاں لکھتے ہیں — ایلی مسکرائی — اس کی بھوری آنکھیں شوخی و شرارت سے چمک رہی تھیں۔

نکولا نے اسے گھور کر دیکھا پھر سرگوشی کے لہجے میں بولا — میں نے کئی کہانیاں لکھی تھیں ایک کہانی اس کارخانے کے بارے میں تھی جہاں بھائی جارج کام کرتے کرتے سوکھ کر کانٹا ہو گئے ہیں۔ انہیں مجھ سے بڑی محبت ہے مگر انہیں فرصت ہی نہیں ملتی کہ ہمارے ساتھ رہ سکیں۔ وہ دیکھئے سامنے ان کا فوٹو لگا ہے مگر شاید اب آپ انکو پہچان بھی نہ سکیں۔ دوسری کہانی میں نے بیٹے کا ذہنے کے بارے میں لکھی تھی۔ یہ دونوں کہانیاں میں نے مدرسے کے ایک رسالہ میں چھپنے کیلئے بھیجی تھیں مگر اڈیٹر نے شائع کرنے کی بجائے انہیں حکومت کو بھیجدیا۔ پھر چند دن کے بعد دو آدمی آپکے پاس آئے خدا جانے کیا باتیں کرتے تھے کہ آپ بار بار ان سے معافی مانگ رہے تھے ان کے جانے کے بعد ابا نے مجھے بہت مارا کہ ایسی بورژوا طبقہ کی طرح کہانیاں لکھنی تجھکو کیسے آئیں کس نے یہ سب باتیں سکھائیں۔ اور پھر میرا داخلہ كارم ٹیکنیکل اسکول میں بھیجدیا۔

نکولا چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گیا پھر کچھ جھجکتے ہوئے بولا ایک دن میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ میری جو کہانیاں لکھی تھیں وہ شائع ہو گئی ہیں اور بہت سے آدمی انکو پڑھکر طلب و رہے بن گئے ہیں۔

وہ خاموش ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔ اس کے چہرہ پر امید و بیم کی ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ اور آنکھیں بار بار کسی پوشیدہ مسرت سے جگمگانے لگتی تھیں۔ مگر شاید اس کے باپ نے خواب والی بات سن لی تھی اس نے نکولا کو بڑے زور سے ڈانٹا۔

چپ رہو — میں تمکو منع کر چکا ہوں یہ باتیں نہ کیا کرو — جاؤ اب سو رہو۔

دونوں بچے سہم کر سونے چلے گئے — رات کافی گذر چکی تھی — میں بھی بستر پر دراز ہو گیا اور اپنے ساتھیوں کا دھیان کرتے کرتے جو اسٹیشن پر میرا منتظر کرتے ہوں گے خدا جانے کب سو گیا۔

صبح جب میں ناشتہ سے فارغ ہو کر چلنے کیلئے تیار ہوا تو میں نے دیکھا نکولا ایک طرف دیوار سے لگا خاموش مجھے دیکھ رہا ہے میں نے اس کی پیٹھ تھپتھپائی، اور کہا "تم گھبراؤ نہیں تمہاری کہانیاں ایک دن ضرور شائع ہونگی"

یہ سنکر اس کی آنکھیں فرط مسرت سے جگمگانے لگیں اس نے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا "مجھے خود بھی یقین ہے میرا خواب ایک دن ضرور سچا ہوگا"

میں چلنے کیلئے تیار ہوا تو دور سے میرا میزبان مجھے دور تک پہنچانے آیا — وہ مجھے راستے کے متعلق مختلف ہدایات دیتا رہا — آخر کار ہم جدا ہونے کے لئے تیار ہو گئے مگر اس وقت یکایک میری نظروں میں ننھے نکولا کی تصویر پھر گئی۔

میں نے اس کا ہاتھ، اپنی گرفت میں لیتے ہوئے کہا "آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں۔"

فرمائیے — اس نے بڑی محبت سے جواب دیا۔

میں نے کہا رات آپ کو ننھے نکولا کو اتنی سختی سے تنبیہ نہیں کرنا چاہئے تھی ماشاء اللہ وہ بہت ہونہار بچہ ہے مگر اس طرح اس کا دل ٹوٹ جائے گا۔

وہ — دراصل اس کا مجھے خود بہت افسوس ہے آپ نہیں جانتے میں اس سے کتنی محبت کرتا ہوں مگر وہ نا سمجھ اپنے خواب کا ذکر ہر کسی سے کرتا پھرتا ہے — سوچئے یہ بات اگر کسی طرح صدر کمیٹی کے ارکان کے کانوں تک جا پہونچے تو اس کا کیا حشر ہو۔ اصلاحی سکول صرف نام ہی کا اصلاحی ہے وہ … کی سختیوں کی تاب نہ لا سکے گا — میں اسی وجہ سے ڈرتا ہوں ورنہ آپ ہی کی طرح کہوں — اس نے چاروں طرف ایک نظر ڈالی پھر آہستہ سے کہا "خیر آپ پردیسی ہیں آپ جیسے ہیں کوئی ہرج نہیں مگر کسی سے اس کا ذکر نہ کیجئے گا — وہ پھر چند لمحوں کیلئے خاموش ہو گیا جیسے وہ کسی کشمکش میں مبتلا

ہو بھی بچیاں بہت بلا لیا ہوں، اس طرح کا ایک خواب تو شاید دن ہونے میں نے خود دیکھا تھا - یہ کہ میری دونوں گائیں نے بہت سا دودھ دیا ہے اور کھیتی کی گاڑی بھی اس دن دودھ دوہ کر لانے نہیں آئی ہے - بچوں کی ماں ان کے لئے دودھ کی کھیر پکا رہی ہے جس کا بچوں کو بہت شوق ہے اور میرے بچے کھیر پکتی دیکھ کر خوشی سے ناچ رہے ہیں -

وہ خاموش ہو گیا - اس کی نگاہیں اس طرح جھکی ہوئی تھیں جیسے وہ اس طرح کا خواب دیکھنے پر شرمندہ اور نادم ہو - اس نے جلدی سے مجھے رخصتی کلمات کہے اور بغیر مڑ کے تیزی سے مڑ کر رخصت ہو گیا - میں اسے بہت دور تک ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے جاتا دیکھتا رہا -

اس واقعہ کو ایک مدت گذر چکی ہے مجھے یاد ہے ایک بار میں نے ننھے ننھے کو آئی کا قصہ اپنے گھر والوں کو بھی سنایا تھا اور اب میں اس واقعہ کو تقریباً بھول چکا تھا آج دوپہر کے وقت میری چھوٹی بچی کھیر کی طشتری ہاتھ میں لئے میرے پاس آئی اور جب میں نے کہا "آپا جی اس کو کو آئی کے پاس بھیج دیجئے - آپ نے کہا تھا نا ان کو کھیر کا بہت شوق ہے" - تو مجھے سب کچھ یاد آ گیا -

میری نگاہیں بچی پر ہی ہوئی تھیں مگر میرے خیالات دور - بہت دور پہنچے ہوئے تھے جہاں سرخ سرخ اونچے نیچے ٹیلوں کے اس پار وہ کھڑا ہوا ہے اپنے چھوٹے گھر میں شاید اب تک اسی طرح کے خواب دیکھتا ہو، وہ ننھا کو آئی کسی کارخانہ میں مشین چلاتے ہوئے اب بھی اپنے خواب کی تعبیر کا منتظر ہو گا -

(حلقۂ ادب اسلامی کراچی کی ایک نشست میں پڑھا گیا)

اور بخشش دینے سے ہے، اور عطا دینے سے مخلوق کا عاجز ہونا بھی اسی طور پر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اللہ سے اس کے فضل کا سوال کرو" اور فرمایا "تمہارے سوا جنھیں پکارتے ہو، وہ تمہارے لئے رزق کے مالک نہیں ہیں، پس اللہ ہی سے رزق طلب کرو، اور اسی کی عبادت کرو اور اسی کا شکر ادا کرو" اور فرمایا "اے نبی! جب میرے بندے میری نسبت آپ سے سوال کریں، تو بیشک میں اپنے بندوں سے قریب ہوں، میں پکارنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے" اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا "مجھ سے دعا کرو میں تمہاری دعا قبول کروں گا" اور فرمایا "اللہ ہی رازق و رزق دینے والا، صاحب قوت اور مضبوط ہے" اور فرمایا "اللہ جس کو چاہتا ہے ذات بے حساب رزق دیتا ہے۔"

فتوح الغیب ۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ

بخاری اور مسلم کی حدیثوں کی یقینی صحت ــ تصنیف بخاری کے وقت کتب احادیث یا قی تھیں ــ صحیح حدیث کی تعریف اور اس کی اقسام کی تفصیل ــ نعم رسم پر مفصل بحث اور اس کی تشریح کہ حدیث میں "سب خیرت السنہ کیا مراد ہے ــ نسخ کسے کہتے ہیں؟ وسیع کی مثالیں اور دلیلیں پرویز اور برق کی غلط اندیشیوں اور گروہ کن باتوں کا وبال ہمکو ہے؟

بعض کم نظر لوگ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر "قیاس رائے" کی پھبتی چست کرتے ہیں اور "قیاس رائے" کے مقابلہ میں ترک حدیث کا الزام لگاتے ہیں حالانکہ حضرت امام اعظم سنت رسول کے محافظ و علمبردار اور حدیث پر پوری طرح عامل تھے۔ فاضل مصنف لکھتے ہیں۔

علامہ شاطبی اور حافظ ابن عبد البر کی مذکورہ بالا تحریروں سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی عالم اور محدث نے ایک باب کی ہر ایک حدیث کو من وعن تسلیم نہیں کیا ہے بلکہ ہر ایک فقیہ اور محدث نے کلی استقرا اور اجتہاد کے بعد جس حدیث کو معمول بہ بنا لیا ہے تو اس کے مخالف حدیث کی اس نے توجیہ اور تاویل کی ہے اور امام ابو حنیفہ نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ امام ابو حنیفہ کو جب صاحب شریعت سے ایک عام اور کلیہ قاعدہ ثابت ہو جاتا ہے تو اس جامع قاعدہ کے خلاف جب کبھی جزئیات سامنے آتی ہیں تو امام صاحب ان میں تاویل کرتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ امام صاحب اصول کو جزئیات پر قربان نہیں کرتے بلکہ آپ نے اصول کے مقابلہ پر جزئیات میں تاویل کرنے کا راستہ اختیار فرمایا ہے اور اس کلی کی تخصیص اور توجیہ کو جزوی واقعہ کی وجہ سے پسند نہیں کرتے بلکہ ایک معنوی علت کی بنا پر آپ نے اس حدیث کو چھوڑ دیا جس کی حیثیت جزوی واقعہ سے زیادہ نہیں تھی۔ اور وہ ایسی حدیث کی مزاحم ہو رہی تھی جس کا مقام جامع ضابطہ کی ..... ہے۔

(اصل عبارت میں کوئی لفظ چھوٹ گیا ہے)

امام ابو حنیفہ کی اس مجتہدانہ بصیرت اور اصول نظریہ کو ارباب فہم عمل بالحدیث کہتے ہیں اور بے سمجھ معاند اس کو ترک حدیث کا نام دیتے ہیں ــ مثلاً ــ طبعی حاجت کے بیٹھنے کیلئے شریعت کا جامع قاعدہ یہ ہے کہ قبلہ کو اپنے سامنے یا پشت کی جانب نہ رکھنا چاہیئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بول اور غائط کے وقت قبلہ کو سامنے اور پشت کی جانب نہ رکھو (مسلم شریف)

"یہ حدیث اس باب میں صراحت اور تشریح میں جامع حکم ہے اس کے خلاف ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک بار اچانک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قبلہ کی جانب پشت ہوتے انسانی حاجت کیلئے بیٹھا ہوا دیکھا۔ (مسلم شریف) امام ابو حنیفہ نے ابن عمرؓ کی اس روایت (حدیث) کو اس لئے ترک کر دیا ہے کہ وہ محض ایک واقعہ ہے اور جزوی خبر ہے اور اس میں عذر وغیرہ کا بھی احتمال ہے اور پہلی حدیث جامع اور منضبط تشریع ہے۔ ایک جزوی واقعہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔"

اجتہاد کے بارے میں فاضل مصنف نے کتنی معقول بات کہی ہے ــ

"... مجتہد کی رائے محض عقلی رائے نہیں ہوتی بلکہ وہ ذاتی اور اجتہادی قوت کا ثمرہ ہوتا ہے جس کو مجتہد نے شریعت ہی کے علم و عمل کی مزاولت اور تجربہ و تدبر کے بعد اللہ تعالیٰ کی توفیق اور تائید سے حاصل کی ہے وہ تصرف ضرور ہے مگر عین شریعت میں خود شریعت ہی کا تصرف ہے"

لیکن صفحہ نمبر ۵۸ پر یہ جو فرمایا ہے۔

"... اس لئے اجتہاد کی اب ضرورت نہیں ہے بلکہ اجتہاد کے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی ضرورت اور وقت ہے۔

درست نہیں ہے نبوت کی طرح اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہو اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہنا چاہیئے۔ ہاں ہر کس و ناکس کو اجتہاد کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ اجتہاد کیلئے تو بڑی خاص شرائط اور اصول مقرر ہیں۔

صفحہ نمبر ۵۸ پر فقہ بعد نبوت کی جامعیت کی فقہ کی تدوین کے ساتھ جو شہادت دی گئی ہے اس سے بڑھ کر عجائب پیدا ہوا کوئی شک نہیں کہ فقہائے کرام اور مجتہدین عظام نے اسلامی قانون کی تدوین کا عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔ اور امت مسلمہ پر ان کا بہت بڑا احسان ہے مگر جمود

کا کام ختم نہیں ہوا، یہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک اس زمین پر انسان بستے ہیں۔

"امام صاحب نے علم فقہ کو بیشتر کا شغل بنا یا ہوا تھا (صفحہ ۲۱) اس قسم کی زبان کی فروگذاشتیں کہیں کہیں ملتی ہیں مجموعی طور پر یہ کتاب قدردستاں کی مستحق ہے۔

محمد بن قاسم کی مہارت فن حرب

از جنرل محمد اکبر خاں، ضخامت ۱۹۸ صفحات، مجلد، رنگین گرد پوش کے ساتھ قیمت تین روپیہ آٹھ آنے ملنے کا پتہ

فیروز سنز، کراچی

جنرل محمد اکبر خاں "اسلامی فن حرب" میں قابل اعتماد بصیرت رکھتے ہیں، ان کی کئی کتابیں اس موضوع پر شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں، یہ ان کی تازہ ترین کتاب "محمد بن قاسم کی مہارت فن حرب" آئی ہے جو بڑی معلومات افزا کتاب ہے، جنرل صاحب موصوف نے یہ کتاب بڑی محنت کے ساتھ مرتب فرمائی ہے اس میں جنگ کے نقشے بھی دیئے ہیں جنہیں بتایا گیا ہے کہ راجہ داہر، وجے سنگھ کے ہندی رسالہ کی پوزیشن تھی اور محمد بن قاسم کے عساکر نے کس ترتیب کے ساتھ میدان جنگ میں مورچہ بنایا تھا۔

سندھ کی تاریخ کے بعض اہم ابواب بھی اس کتاب میں ضمناً آگئے ہیں اس دور کے اہم شہروں کے حالات کا تذکرہ بھی ملتا ہے تاریخ و جغرافیہ کے اس امتزاج نے اس کتاب کی علمی حیثیت کو بلند کردیا ہے۔

اس میں یہ بھی ملے گا۔

"النفیر۔ لنفیر۔ جب فوج کا امیر یا سالار "النفیر" پکارتا تو اس سے مراد ہوتی کہ حملہ کرو۔

"الرجعۃ۔ الرجعۃ۔ اپنے امیر سے "رجعۃ" کی پکار سن کر لشکر والے یہ سمجھتے کہ اس وقت حملہ کرنا موزوں نہیں ہے۔

"الخیل" کی صدا پر سوار دشمن پر حملہ آور ہوتے ——— اور "فارض" کی صدا سنتے ہی سوار گھوڑوں سے زمین پر اتر پڑتے تاکہ جانوروں کو آرام دیا جاسکے۔

صفحہ نمبر ۴۸ پر "گو بیٹھے" سے غالباً "گوبین" مراد ہے ——— یہ تمام علاقہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں سے جو صرف چند سو فٹ کی بلندی کی ہیں اٹا پڑا ہے۔ (صفحہ نمبر ۴۸) "اٹا پڑا ہے لکھا چاہیئے تھا" "اٹا پڑنا" گرد و غبار کیلئے بولا جاتا ہے۔

حجاج کے جبر و تشدد اور ظلم و ستم کو ——

"ماہر جراح کے عضو فاسد کے کاٹ دینے سے"

تعبیر کر کے جو اس خونخوار درندے اور ظالم و جابر حاکم کی مدافعت فرمائی گئی ہے اس نے اس اچھی خاصی کتاب کو داغدار بنا دیا ہے۔ حجاج بن یوسف ثقفی کے جبر و ستم کی مدافعت یا انہیں ہلکا بنا کر پیش کرنا کتاب کے موضوع سے غیر متعلق بات تھی یقین ہے کہ جنرل صاحب موصوف دوسرے ایڈیشن میں اس اذیت کوش بحث کو کتاب سے خارج فرمادیں گے۔

کتاب اپنے موضوع پر ہر اعتبار سے خوب بلکہ بہت خوب ہے۔ مصنف کا دینی مزاج کتاب کی ایک ایک سطر سے جھلکتا ہے۔

بدعت کیا ہے!

ضخامت تین سو صفحات۔ مجلد گرد پوش کے ساتھ کتابت، طباعت اور کاغذ خوب سے خوب تر قیمت تین روپے علاوہ محصول ڈاک۔ ملنے کا پتہ: احمد سعید، ۳۰ نرتن بادار، مدراس۔ بھارت

فاران کا توحید نمبر توقع سے زیادہ کامیاب اور مقبول رہا، اس کے تقریباً دو ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گئے اور اب تک اس کی مانگ کا سلسلہ جاری ہے، اس معرکہ آرا نمبر کے چار مضامین ملتے ہیں۔

(۱) نقش ... (۲) ... حقیقتی مفہوم (محترمہ عطیہ خلیل عرب) — (۳) قبر پرستی۔ (مولانا شیخ محمد) (۴)

ذوقِ سلیم پر کس قدر گراں گزرتا ہے جو "سفینۂ غزل" میں موجود ہے۔

صفحہ نمبر ۴۹ پر مومن کی غزل کے ایک مصرعہ میں "بوالہوس" کو "بلہوس" لکھا گیا ہے یہ کتابت کی غلطی بھی ہو سکتی ہے مگر میں نے اس غلطی کی خاص طور سے نشاندہی اس لئے کی ہے کہ ڈاکٹر جعفر حسین کی طرح بعض لوگوں میں یہ غلط رجحان پیدا ہو گیا ہے کہ عربی رسم الخط کے برخلاف "اردو املا کی بنیاد" "لہجۂ آواز" کو قرار دیا جائے مثلاً "خوش" کو "خش" اور "بالکل" کو "بلکل" لکھا جائے۔

قلق کے اس شعر میں —

الٰہی خیر ہو کچھ آج رنگ بے ڈھب ہے　　　تپک رہا ہے کئی دن سے آبلہ دل کا

"تپک" کو "ٹپک" لکھا گیا ہے، یہ کتابت کی خاصی فاحش غلطی ہے "آبلہ" کی کیا بساط ہے جو کئی دن تک ٹپک رہے وہ تو خاصی دیر میں پھوٹ جاتا ہے۔ ٹپکنا اور رستہ زخم دونا سور کی خاصیت ہے۔ "آبلے" میں جو سوزش ہوتی ہے اور اس کے اندر حرکت سی پیدا ہوتی ہے، اسے "تپکنا" کہتے ہیں۔

غالب کے اس شعر کی —

غالب مرے کلام میں کیوں کر مزہ نہ ہو　　　پیتا ہوں دھو کے خسرو شیریں سخن کے پاؤں

"سفینۂ غزل" کے مولف و مرتب نے عجیب توجیہہ فرمائی ہے —

"حضرت امیر خسرو سے بڑی عقیدت رکھتے تھے ان کے قریب ہی نظام الدین میں دفن ہوئے" حالانکہ اس شعر میں "خسرو شیریں سخن" سے امیر خسرو نہیں شاہ ظفر مراد ہیں۔

داغ کی غزل کا یہ شعر —

چلے آتے ہیں دل میں ارمان لاکھوں　　　مکان بھر گیا میہمان آتے آتے

حذف کر دیا تھا اور ان کی بعض دوسری اچھی غزلوں کا انتخاب پیش کر دیا تھا۔

حیرت ہے کہ حسن بریلوی کی غزلوں اور شعروں کے انتخاب میں ان کی یہ [illegible] —

حسن جب مقتل کی جانب تیغ براں لے چلا　　　عشق اپنے مجرموں کو پابجولاں لے چلا

صاحب تذکرہ کی نگاہ میں کیوں نہ جچی!

یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ شیفتہ جیسے نغز گو شاعر کے کل تین اشعار انتخاب میں لئے ہیں ان کا یہ شعر —

تم بڑھا پائے داماں کی حکایت　　　دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ

"انتخاب میں نہ آسکا! — فریاد!!"

اکبر الٰہ آبادی کے استاد وحید الٰہ آبادی کا یہ شعر —

انکی مژگاں کو دیکھنا تھا فقط　　　زخم تو خود جگر میں رکھا تھا

انتخاب میں نہ پا کر سید محمد عباس صاحب کا ذوقِ شعری اور وجدان "مشتبہ" سا ہو گیا۔

حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کے بعد کئی سو سال کا خلا اور شعرائے دلی کا تذکرہ بھی نہ ہونا کھٹکتا ہے۔ فاضل مرتب کو دکن کے شعرائے قدیم کا انتخاب دینا تھا اور ان کا تذکرہ کرنا تھا تاکہ اس سلسلہ کی کڑی سے کڑی مل جاتی۔

صفحہ ۲۰۱ پر نواب یوسف علی خاں ناظم والئ رام پور کے بارے میں جو لکھا ہے —

"جو پہلے حکیم مومن خاں اور پھر مرزا غالب سے اصلاح لیتے تھے"
یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا اور وہ اس لئے کہ مومن ۱۸۵۱ء میں وفات پا چکے تھے اور نواب یوسف علی خاں ناظم ۱۸۵۸ء کے شروع میں مرزا غالب کے شاگرد ہوئے ہیں اور ان کی شاعری کا آغاز بھی اسی زمانے سے ہوتا ہے۔

ایک شعر غلط طور پر ریاض سے منسوب ہو گیا تھا۔

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور　　نکلے جو میکدہ سے تو دنیا بدل گئی

اس "انتخاب" سے اس کی مزید تصدیق ہو گئی کہ یہ شعر دراصل گستاخ رام پوری کا ہے۔

ان کوتاہیوں کے باوجود "سفینۂ غزل" کی ترتیب و تدوین میں جو محنت کی گئی ہے وہ مدیر دست نقش بلکہ اردو دنیا کی طرف سے شکریہ کی مستحق ہے۔

آگ میں پھول

از۔ حمایت علی شاعر ضخامت ۱۹۲ صفحات۔ مجلد۔ رنگین گرد پوش۔ مصنف کی تصویر کے ساتھ۔ قیمت تین روپے
ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ شعور۔ اسٹیشن روڈ۔ حیدرآباد!

جناب حمایت علی شاعر پاکستان کے ادبی حلقوں میں کافی معروف ہو چکے ہیں اور مشاعروں میں ان کی کامیابی نے ایک حد تک پبلک سے بھی ان کا تعارف کرا دیا ہے۔ "آگ میں پھول" ان کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے جو خاصے اہتمام سے شائع ہوا ہے۔

"میں اور میرا فن" ـــ کتاب کا دیباچہ خود شاعر نے لکھا ہے جو مختصر سی آپ بیتی بھی ہے اور اپنے فن کا تعارف بھی ـــ فرماتے ہیں۔
ـــ "... اور میں نے کوشش کی ہے کہ خیال مجرد طور پر کہیں میرے شعر کا موضوع نہ بنے بلکہ اس کی محسوس تشکیل میں میری صلاحیتیں صرف ہوں۔

" بات کیا ہوئی؟ وہ کون سا شاعر ہے جس کے خیال کی تشکیل میں اس کی صلاحیتیں صرف نہیں ہوتیں ـــ پھر خیالوں کا مجرد طور پر شعر کا موضوع بننا یا نہ بننا یہ بھی ایک "چیستاں" سے کم نہیں! گو کہ بات کہنا بلا وجہ دور کی کوڑی لانے کی کوشش کرنا اور کاواک قسم کے خیالات ظاہر کرنا آج کل رسم بنتا جا رہا ہے، شعر ہو یا نثر ـــ ضعف الجھاؤ میں نہیں سلجھاؤ میں ہے۔

حمایت علی شاعر کی شاعری قدامت اور جدت کا برزخ ہے، انہوں نے "قدامت" کی خوبیوں کو بھی اپنی شاعری میں سمونے کی کوشش کی ہے اور جدت و ترقی کا بھی خیر مقدم کیا ہے، وہ یک رخے شاعر نہیں ہیں، غزل اور نظم دونوں اصناف فن پر قدرت رکھتے ہیں مگر ان کی طبیعت کو زیادہ مناسبت "نظم" سے ہے، ان کی شاعری میں غم روزگار کے ساتھ غم جاناں بھی پایا جاتا ہے، لیکن "غم روزگار" کا پلہ بھاری ہے! حمایت علی شاعر جاگیرداری نظام اور مغربی سامراج کا دشمن ہے! اس نے اپنے کلام میں جگہ جگہ ان سنگین بتوں پر چوٹیں اور ضربیں لگائی ہیں۔

چند منتخب اشعار ـــ

رزمِ شب میں گفتگو کی امنگ　　گونج سی رہی ہے میرے لئے

ایک درماندہ راہرو کے لئے　　سنگِ راہ و سفر ہی کیا کم ہے

کوئی تسکین جاوداں نہ سہی
راحت مختصر ہی کیا کم ہے

آج اے دل لب و رخسار کی باتیں ہی سہی
وقت کٹ جائے گا کچھ پیار کی باتیں ہی سہی

چشم خنداں کی چمک دیکھ کے آتا ہے خیال
یہ تبسم نہیں اشکوں کی نمی ہے شاید

عشق تو غیر ہے کب جذبۂ سوزاں کرے
کسی سائے کسی شعلے کی قوت ہی نہیں

یہ گرد آلود بچے راستوں پر!
کسی بوڑھے کی آنکھوں کی طرح چپ
شکستہ جھونپڑے گرتے ہوئے کھم
کسی بیوہ کے دامن کی طرح نم

تہ بہ تہ آبگینوں میں قوس قزح
کتنی نزدیک اور کتنی دور!!

ساریاں جیسے سطح آب رواں
ساریاں جیسے چاندنی لب جو
ساریاں جیسے کہکشاں لہرائے
ساریاں جیسے گلستاں لہرائے

یہ بزم طرب اور یہ آداب قدح خواری
ساقی ہے تو ساقی کی نظروں میں وہ پرکاری
نغموں کی کشاکش سے بہکا نہ کوئی ہائے
ہر رند تہی ساغر اور فیض کرم جاری

اس کو کیا کہئے کہ احساس زیاں کے باوجود
کارواں خطرے میں ہے کچھ دیر ہی جاگے تو کیا
راستے میں راہبر و راہرو سب سو گئے
کون اس کا پاسباں ہوگا اگر سب سو گئے

جہل زندہ ہے تو رسوا ہی رہے گی تہذیب
بھوک زندہ ہے تو بکتے ہی رہیں گے اجسام

جن کے ابرو کے اک اشارے پر
جن کے بت خانۂ سیاست ہیں
انقلابات رخ بدلتے ہیں!
ناخدا کیا خدا بھی جھکتے ہیں

راہزن کے بارے میں اور کیا کہوں کھل کر
صرف زندہ رہنے کو زندگی نہیں کہتے
ہر کارواں یارو ہر کارواں یارو
کچھ غم محبت ہو کچھ غم جہاں یارو

پھول "طسون" میں نہیں "دھاگے" میں پرویا جاتا ہے، پھر مصرعِ ثانی میں "سولی" وجدان پر کس قدر گراں گزرتا ہے۔

بہرحال اس سے نہیں ہوتی کوئی شک نہیں کہ رحمت علی شاکر کے اس مجموعۂ کلام کو لوگ شوق و دلچسپی کے ساتھ پڑھیں گے شاعر کے مستقبل سے زبان، ادب اور سماج اچھی توقعات رکھتے ہیں۔

طریقۂ جدیدۃ فی تعلیم العربیۃ
مولف:- محمد امین المصری۔ ضخامت ۱۲۰ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ چھ آنہ۔ ملنے کا پتہ
مکتبۃ العلمیہ ۱۵ لیک روڈ۔ لاہور۔

جناب امین مصری عربی زبان کی تعلیم میں مہارت کامل اور ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ ان کی کتابوں سے نوآموزوں کو بڑا فائدہ پہونچا ہے، اور بہت سے لوگ صاحب موصوف کے "طریقۂ تعلیم" کی بدولت عربی سمجھنے بولنے اور لکھنے لگے ہیں۔

یہ کتاب جو اس وقت ہمارے سامنے ہے عربی زبان کی ابتدائی تعلیم کے لئے ایک "معلم" کا فرض انجام دیتی ہے۔ پوری کتاب میں "صرف و نحو" کا ذکر تک نہیں کیا گیا مگر مشقوں کے ذریعہ گرامر کے نکتے قاعدے ذہنوں میں اتار دیئے۔

جو حضرات عربی سیکھنے کا شوق رکھتے ہوں وہ اس کتاب کو ہر اعتبار سے مفید اور کارآمد پائیں گے۔

عثمانؓ از:- ڈاکٹر طٰہٰ حسین۔ مترجم:- عبدالحمید نعمانی۔ ضخامت ۲۴۴ صفحات (مجلد) ملنے کا پتہ انجمن پریس۔ بمبئی نمبر ۳

ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصر کے مشہور و معروف اور مستند ادیب ہیں۔ ان کی متعدد کتابیں عربی دنیا میں مقبول ہو چکی ہیں۔ حضرت سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی سیرت پر ڈاکٹر صاحب موصوف نے جو کتاب لکھی ہے اس کا ترجمہ مولوی عبدالحمید نعمانی نے سلیس و شستہ اردو میں کیا ہے۔
ڈاکٹر طٰہٰ حسین کا رجحان طبع "تجدد و تفرنج" کی طرف ہے اس لئے اسلام پر جو کچھ وہ لکھتے ہیں، اس میں غلط افکار کی آمیزش بھی کر دیتے ہیں۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر کوئی شک نہیں بعض حیثیتوں سے منفرد ہے مگر اس میں یہ بھی لکھا ہے۔

"ان باتوں سے اگر کچھ نتیجہ نکلتا ہے تو وہ یہی کہ عہد نبوی میں جو نظامِ حکومت تھا وہ الٰہی نظام نہ تھا جس میں لوگوں کی رائے کو دخل نہ ہو۔ (صفحہ ۴۴)

ڈاکٹر طٰہٰ حسین کا یہ خیال کس قدر بے بنیاد اور گمراہ کن ہے، عہد نبوت کے طرزِ حکومت کو "الٰہی نظام" نہ کہنا تعجب و لطف کی بات ہے۔ اس کتاب کو پڑھتے وقت ہوشیار رہنا چاہیئے کہ نہ جانے کس فکر و خیال کے پردے میں زہر ملا دیا گیا ہو۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کا پیش کردہ ادب ایک ایسا گلدستہ ہے جس میں سانپ بچھو بھی لپٹے اور گندھے ہوئے ہیں۔

"تب بعض لوگوں نے اس کو ملامت کیا (صفحہ ۳۱)" "اس کو ملامت کی "مکت چاہیئے تھا" ..." تو خود سے توبہ کیا" (صفحہ ۹۱) "...... تو انھوں نے توبہ کی" "یہ زبان ہے" اس طرح ابو موسیٰ اشعری کا پوزیشن بالکل الگ تھا (۹۳) پوزیشن وشتہ ہے۔

آثارِ ابوالکلام از:- قاضی محمد عبدالغفار مرادآبادی۔ ضخامت ۲۲۲ صفحات۔ مجلد خوبصورت گردپوش کے ساتھ قیمت تین روپے بارہ آنے۔ ملنے کا پتہ۔ آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی (رجسٹرڈ)

"نقشِ فرنگ" اور "لیلیٰ کے خطوط" کے مصنف کو کون نہیں جانتا، ان کے قلم کی شوخی اور رعنائی کے سب معترف ہیں۔ "آثارِ ابوالکلام" انہی کی قلم کاری کا شاہکار ہے۔ یہ کتاب جب لکھی گئی تھی تو مولانا آزاد اور قاضی عبدالغفار دونوں حیات تھے مگر آج وہ دونوں اس دنیائے کون و فساد میں موجود نہیں ہیں۔ اور "مرحوم" ہو چکے ہیں رہے نام اللہ کا!

قاضی عبدالغفار نے جمال الدین افغانی پر ایک کتاب لکھی تھی مگر وہ زیادہ جاندار نہ تھی۔ "آثارِ ابوالکلام" میں لکھنے والے کی عقیدت اور

دل کا جوش بھی شامل ہے۔ اس لئے یہ کتاب قاضی صاحب مرحوم کی انشا پردازی کا دلکش نقش بن گئی ہے۔

اقتباس دیتے ہیں، "آثار ابوالکلام" کی شگفتگی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

"مولانا اپنے کمرہ کی خلوت میں ان "دو کا ندوں" (چڑیوں) کی دور تہ زندگی کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ اس مطالعہ کے نتائج غبار خاطر کے ایک مکتوب میں اس طرح مندرج ہو گئے ہیں، کہ گویا ایک مورخ نے قلعہ احمد نگر کی چڑیوں کے اس خاندان کو دوامی بنا دیا۔

مولانا نے ان چڑیوں سے ربط پیدا کرنے کی پوری تفصیلات اپنے مکتوب میں بیان کی ہیں۔ کہ کس طرح انہوں نے کمرہ کے ان حسین باشندوں سے راہ و رسم پیدا کی۔ کس طرح اجنبیت کی تحریک دور ہوئی۔ اور پھر کیوں کر رفتہ رفتہ وہ اپنی خلوت میں ان آہوان وحشی کی طفل آمائیوں میں حصہ لینے لگے۔ آغاز کار میں ان عشوہ طرازان ہوا سے راہ و رسم پیدا کرنے میں جو دقتیں پیش آئیں اور آخر میں جس طرح مولانا نے اپنے ان کے درمیان حجابات کو ختم کیا اس تمام رسم کو درجہ بدرجہ اور قدم بقدم مولانا نے بیان فرمایا ہے۔"

یہ کتاب مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی مستقل سوانح حیات نہیں ہے بلکہ ان کی زندگی کا تفصیلی مطالعہ ہے وہ خود ان کی تحریروں کے اقتباسات پیش کر کے بتایا گیا ہے کہ وہ کیا تھے۔

مولانا آزاد کی ذات سے قاضی عبدالغفار کو اس لئے بھی عقیدت و محبت تھی کہ مولانا مرحوم کانگریسی مزاج رکھتے تھے، اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی "وحدت قومیت" کے پر جوش مبلغ تھے۔ اس جوش عقیدت کی نے یہاں تک بڑھ گئی ہے کہ رئیس الاحرار مولانا محمد علی رحمتہ اللہ علیہ اور مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی زندگیوں کا ان الفاظ میں تقابل کیا گیا ہے

"مولانا آزاد مرحوم کی زندگی کا پس منظر ان کا خاندانی تقدس تھا اور اسی سانچے میں ان کی زندگی ڈھل چکی تھی مولانا محمد علی کی فطرت کا سانچہ دوسرا تھا وہ علی گڈھ کے بیباک کھلنڈروں کا سانچہ تھا اس لئے دونوں کے درمیان کوئی ایسی چیز مشترک نہ تھی جو دیر پا ہم آہنگی پیدا کر سکتی"

مولانا محمد علی مرحوم کی زندگی پر "علی گڈھ کے بیباک کھلنڈروں" کی جو طنز کی گئی ہے۔ وہ لکھنے والے کے کردار کا پتہ دیتی ہے کہ وہ کس قسم کی زندگی کو پسند کرتے تھے۔ اور کن شمائل اور عقائد و اعمال سے دور رہتے تھے۔ مولانا محمد علی علی گڈھ کی زندگی ایک مرد مومن اور حق کوش مجاہد کی زندگی تھی وہ اپنی جوانی میں فسق و فجور سے کنارہ کش رہے ہیں اور عوام و دنیا کو چھوا تک نہیں۔ وہ صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے۔ اور طبیعت کے گداز کا یہ عالم تھا کہ قرآن کی آیتیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی سنکر بے قرار اشک آلود ہو جاتے۔ جس وقت انہوں نے محسوس کیا کہ کانگریس ایک فرقہ وارانہ جماعت ہے اور مسلمانوں کے ساتھ انصاف اور رواداری برتنے کیلئے تیار نہیں ہے تو وہ اپنی شہرت اور شخصیت کو خطرے میں ڈال کر کانگریس سے علیحدہ ہو گئے۔ ان کا آخر زمانہ بھی سے بھی زیادہ اچھا ثابت ہوا یہاں تک کہ

سے سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گذشت

مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی کا مولانا محمد علی کی زندگی سے کیا مقابلہ؟! وہاں شروع سے لے کر آخر تک عزیمت ہی عزیمت، یہاں شروع میں عزیمت، مگر آخری دور میں رخصت ہی رخصت، یہ ایک المیہ ہے کہ حکومت ہی کا حامی اور حریت جنیل کے پیام کا مبلغ ایک لادینی حکومت کے قلمدان وزارت کو قبول کرتا ہے اور اس جابر اور مسلم کش حکومت کا اس طرح ساتھ دیتا ہے کہ ایک صدائے احتجاج بھی اس کی زبان سے نہیں سنی جاتی!

پاکستان اور مسٹر محمد علی جناح مرحوم پر "آثار ابوالکلام" میں جگہ جگہ چوٹیں کی گئی ہیں، اور یہ تک لکھ دیا گیا ہے۔

"اور اس طرح پر انگریز نے پھر اپنے سامراجی منصوبے قائم کئے اور آزاد ہندوستان کے پہلو میں برطانوی سامراج کا ایک قصر پاکستان کے نام سے بالآخر قائم کر لیا" (صفحہ ۹۴)

اور سفینہ۔

"… لیکن دونوں رفیق (ابوالکلام آزاد اور گاندھی جی) کی نظر میں مذہب پہلے وسیع تر معنی میں کوئی اخلاقی مسئلہ تھا۔ صفحہ ۵۱

حالانکہ یہ کفر و اسلام کا اختلاف تھا!

صفحہ ۲۵ پر "سماج" کو مونث (اشتی جون سماج) لکھا ہے……

"یہ اعلان ایک چنگاری تھی جو پنجاب کے باروت خانہ میں گری" (صفحہ ۱۱) صحیح لفظ باروت ہی ہے لیکن اردو والوں نے "باروت" کو "بارود" بنا لیا ہے لہذا یہی صحیح ہے اور بارود ہی لکھا اور بولنا چاہیئے۔ ہاں شعر میں قافیہ کی ضرورت کے سبب "باروت" استعمال ہو سکتا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی تحریروں میں جا بجا آزاد منشی اور جولانی کی ترنگوں کا اظہار کیا ہے۔ اس پر قاضی عبدالغفار صاحب یہ کہ خوش ہیں بلکہ انہیں شکوہ ہے کہ مولانا کو یہ باتیں کھل کر کہنی چاہیئے تھیں۔

"تحصیل علوم کی تکمیل کیلئے مولانا ازہر بھیجے گئے" (صفحہ ۲۳) یہ قطعاً غلط ہے مولانا آزاد نے جامع ازہر میں تعلیم نہیں پائی۔ بلکہ ان کا وہ سفر تک مشتبہ ہے۔!

ادب و انشا کے اعتبار سے یہ کتاب بہت دلچسپ ہے اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریروں کے اقتباسات نے تو "افکار ابوالکلام" کو سچ مچ چار چاند لگا دیئے ہیں۔

ترجمان غالب

از شہاب الدین مصطفےٰ۔ ضخامت ۲۴۸ صفحات قیمت چار روپے ملنے کا پتہ: مکتبۂ نشاۃ ثانیہ معظم جاہی مارکیٹ حیدرآباد دکن (بھارت)

غالب کی شاعرانہ عظمت سب کے نزدیک مسلم ہے اردو شاعری میں غالب سے بڑا غزل گو آج تک پیدا نہیں ہوا مگر اس کی شہرت و عظمت اور قبول عام کے آگے غالب کی شاعری کے کمزور پہلو کی طرف لوگوں کی نگاہ شاذ و نادر ہی جاتی ہے…… وہ یہ کہ اس کے یہاں بعض شعروں میں اس قدر ابہام اور اغلاق پایا جاتا ہے کہ دماغ کو سوچنے میں دقت سی محسوس ہوتی ہے۔ شعر کا مغلق و مبہم ہونا کوئی کمال کی بات اور شعر کی خوبی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے اردو کلام کی متعدد "شروح" لکھی گئی ہیں۔ اور بعض شعروں کی تشریح میں ایک شارح دوسرے شارح سے مختلف ہے۔

جناب شہاب الدین مصطفےٰ حیدرآبادی نے دیوانِ غالب کی مکمل و جدید ترین "شرح" لکھی ہے جس میں موصوف نے غالب کے مغلق ترین اشعار کی بھی عام فہم انداز میں شرح کی ہے اور کھینچ تان کر ہی سہی انہیں مفہوم و معنی کا لباس تو پہنا دیا ہے۔

غالب کے ایک دلکش و بلند پایہ شعر کی شرح کا نمونہ……

کہتے ہیں نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا: دل کہاں کہ گم کیجے ہم نے مدعا پایا (صفحہ ۵)

عام طور پر جب کوئی چیز پڑا پاتے ہیں اور اس چیز کے مالک کو دینے کا ارادہ ہوتا ہے تو کسی کی گم شدہ چیز ہاتھ میں چھپا کر کہتے ہیں فلاں چیز ہمیں مل جائے تو نہ دیں گے اس سے کہنے والے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ چیز ہمارے پاس ہے معشوق بھی دل ہاتھ میں چھپائے ہوئے دل لگی کر رہا ہے دوسرا مصرعہ عاشق کا جواب ہے فرماتے ہیں کہ عاشقوں کے پاس دل ہی کہاں وہ تو پہلے ہی کھو یا جا چکا ہے۔ البتہ اس کا پتہ نہیں چل رہا تھا اب معلوم ہوا کہ وہ آپ کے قبضہ میں ہے۔

مل ہی ذوق وصل و یاد یار تک باقی نہیں۔ آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا۔ صفحہ ۶

فرماتے ہیں کہ عشق کی آگ میں ہمارا مدعا تک جل گئے ہیں کہ جز یار کے کچھ باقی نہیں وہ یاد بس مٹی ہی رہتا ہے اور کچھ نہیں یعنی فنا فی الذات ہو گئے پھر ذوق وصل کیا اور یاد یار کہاں!

نقش وفا

از:- وفا ڈبائیوی، ضخامت ۱۹۲ صفحات مجلد رنگین و حسین گرد پوش کے ساتھ قیمت دو روپے بارہ آنے،
ملنے کا پتہ:- مکتبہ فریدی اردو کالج کراچی

جناب الحاج محمد حفیظ الرحمن وفا ڈبائیوی (منتظم اردو کالج کراچی) کے کلام کا مجموعہ بڑی آب و تاب کے ساتھ منظر عام پر آیا ہے جناب نظر سیہوری کے نام سے شاعر نے اپنے اس مجموعہ کا انتساب کیا ہے!

"نقش وفا" پر ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں، مولانا منتخب الحق، محمد حبیب اللہ غضنفر، سید ابوالخیر کشفی، مولوی عبدالقیوم ناطق اور قیصر مراد آبادی نے تقریظیں اور پیش لفظ لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ تمنا بجنوری، نشتر ہلالی، ابرار بدایونی اور آرزو ڈبائیوی کے قطعات تاریخ طباعت بھی درج ہیں۔

وفا ڈبائیوی پیشہ ور شاعر نہیں ہیں، شاعری کو انھوں نے اپنے جبلی ذوق کی بنا پر اختیار کیا ہے، ان کا کلام رسالوں اور اخباروں میں بہت ہی کم چھپا ہے۔ مشاعروں میں بھی وہ شاذ و نادر ہی شریک ہوتے ہیں، ان کی شاعرانہ شہرت نہ ہونے کے برابر ہے اس معاملہ میں کہ لوگ ان کو شاعر کی حیثیت سے جانیں، وہ بے پروا سے واقع ہوئے ہیں اسی لئے وہ مشہور نہ ہو سکے۔!

وہ جو پرانی ضرب المثل ہے کہ جیسا نام ویسا کام، تو وفا سچ مچ سراپا مہر و وفا ہیں، اس خود غرض پرست دور میں ان کی دوستی اور محبت پر اعتماد کیا جا سکتا ہے، یہی اخلاص و سادگی ان کے شعروں میں بھی جھلکتی ہے، دین سے وہ بہت شغف رکھتے ہیں، اور خاص طور سے ذات رسالت مآبؐ سے، انہیں والہانہ محبت ہے، ان کا نعتیہ کلام عشق رسولؐ کی بولتی ہوئی شہادت ہے

وفا ایک خوش گو شاعر ہیں اور ان کی شاعری قدیم مکتبۂ فکر کی یادگار ہے۔ مگر جدید اسلوب شاعری اور انداز بیان کی بھی جھلک ان کے یہاں تھوڑی بہت ملتی ہے۔ انھوں نے اپنے دیوان میں مبارکباد کے قطعات اور سہرے تک شامل کر دیئے ہیں کاش، وہ اپنے کلام کا انتخاب کر سکتے تاکہ سہرے کی چیزیں اس میں نہ آنے پاتیں۔ یہ کیا ضرور ہے۔ کہ شاعر کی زبان سے جو شعر نکل جائے وہ اس کے دیوان میں لازمی طور پر شامل ہو کر ہی رہے۔

چند منتخب اشعار:-

(گنبد خضرا، کے وصف میں)

کہتے ہیں کہ فردوس سے لا لا کے زمرد ؛ جبریلؑ نے پلکوں سے بصد ناز کیا رنگ
اللہ رے! نیرنگیٔ نقش حقیقت ؛ رحمت کی نظر پڑتے ہی کچھ اور نکھارا رنگ

تنگ اس حد تک تو ہے آئی پریشانی مری ؛ آئینے نے بھی نہ صورت آج پہچانی مری

چمن والوں سے سیکھا ہے سبق ہم نے محبت کا ؛ فغاں بلبل سے لی شبنم سے گریہ، خامشی گل سے

عمر بھر! ایسے مناظر نظر آنے کے نہیں ؛ میری نظروں نے جو کچھ وقت سحر دیکھ لیا

مریض غم نے کہتے کہتے لے کر آخری ہچکی ؛ قیامت کے لئے باقی اٹھا کر داستاں رکھ دی

بہار آئے، خزاں آئے، بجلیاں ٹوٹیں ؛ ہمارا کوئی تعلق نہیں گلستاں سے
نہ آشیاں کا پتہ ہے نہ ہم صفیروں کا ؛ اسیر جائیں کہاں اب نکل کے زنداں سے

چمن تو لٹ گیا بہار کو شامِ غم میں ؛ یہ سکوں بھی نہ کہیں خوابِ گراں تک پہنچے

جو تم چاہو تو دامانِ کرم سے پردہ پوشی ہو ؛ کہ پلکوں تک تو آپہنچا ہے اب رازِ نہاں میرا

نظموں میں "فریادِ مسلم" خاصی جاندار نظم ہے
دوسرا رخ:-

ہیں صعوباتِ حیات ان کو بشارتِ ارم ؛ اور شہادت ہے مسلماں کو خدا کا پیغام (صفحہ ۸)

صعوبات اور بشارت نے شعر کو کس قدر بوجھل بنا دیا

آتشِ شوقِ شہادت ہے ذرا سرد سی یوں ؛ "جاهدوا" کا نہیں صدیوں سے سنا ہے پیغام (صفحہ ۸)

"کچھ" حشو و زائد ہے ..... ذرا سرد سی یوں اپنی جگہ کمزور ٹکڑا ہے

اسی میں ٹاٹ کی تھی جا نمازِ مولا کی ؛ اسی میں بیٹھ کے قسمت پلٹ دی دنیا کی (صفحہ ۲۱)

مصرعِ اولیٰ میں "میں" کا نہیں "پہ" کا محل تھا۔ جا نماز میں نہیں بیٹھا جاتا بلکہ جا نماز پر بیٹھا جاتا ہے

السلام اے حامیٔ وحی اللہ ؛ السلام اے کہ آشنائے لا الٰہ (صفحہ ۳۰)

"حاملِ وحی اللہ" ہونا چاہئے یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔

مجیب نہ لوٹے کے سائل کوئی کبھی محروم ؛ خدا کی دین ہے کچھ کم نہیں سخائے بتول (صفحہ ۶۱)

نعت و منقبت کا یہ وہ مبالغہ ہے جس کی دین میں ممانعت آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی کسی صفت کو بندے کی صفت کے مقابل اور برابر قرار دینا کسی نقطۂ نگاہ سے بھی درست نہیں۔ ایسی فاش غلطی کسی سے ہو جائے تو توبہ کرنی چاہئے اور فریاد و استمداد بھی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی روح سے درست نہیں! توحیدِ خالص کے تقاضے ہر حالت میں پیشِ نظر رہنے چاہئیں

اس ستم گر پہ آج مٹتا ہے ؛ میرے دل کا بھی کیا کلیجہ ہے۔ (صفحہ ۵۵)

اس قسم کے بے کیف اور سطحی اشعار چھانٹ دینے چاہئے تھے۔ اس محاورہ کو داغ نے کس لطف کے ساتھ اپنے شعر میں سمویا ہے۔

جلوہ دیکھ ترے رعنائی کا ؛ کیا کلیجہ ہے تماشائی کا

صفحہ ۸۷ پر جو غزل ہے اس کے کئی شعر دو بحروں میں ہیں۔ ایسی غلطی ایک کہنہ مشق شاعر سے کیسے سرزد ہو گی۔

ایک شعر

ابرِ رحمت اور ترغیبِ گناہ ؛ یہ ثواب افشاں عذاب کیسے بنے رہے

"خاتونِ مشرق سے خطاب" کا پہلا مصرعہ یہ ہے:-

اے حیائے مشرقیت اے ضیائے در نقاب (صفحہ ۱۱۴)

پہ ضیائے در نقاب "کیا بات ہوئی؟ مفہوم تو سمجھ میں آگیا مگر یہ ترکیب دعوان کے لئے کس قدر نامانوس ہے۔

اب شروع ہوتی ہے تیری ازدواجی زندگی ؎ اب پئے بندہ نوازی ہے یہ دورِ بندگی (صفحہ ۱۷۱)

مصرعہ اولیٰ میں "شروع" کا "ر" تقطیع سے گر رہا ہے۔

سفرِ نماز از:- مولانا سید محمد اشتم شمسی ضخامت ۱۲۸ صفحات، قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ:- زمزم بک ڈپو، مسجد آرام باغ - کراچی۔

اس کتاب میں مولانا شمسی نے اپنے خاص فلسفیانہ انداز میں نماز کا فلسفہ بیان کیا ہے ـــ ایک اقتباس ـــ

"آپ جتنی پستی اور نشیب میں اترتے جائیں گے تعبد میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ وسعت وہمہ گیری سمٹتی جائے گی بالعکس بلندی کی طرف اٹھیں گے، اطلاق و وسعت پیدا ہوتی جائے گی۔"

اس عبادت اور تحریر سے وہی نمازی فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو یا تو خود فلسفی ہوں یا فلسفیانہ مضامین سے مناسبت رکھتے ہوں ادینی احکام میں اس قسم کی کلامی اور فلسفیانہ گفتگو زیادہ مفید ثابت نہیں ہو سکتی۔ بلکہ کیا عجب ہے کہ دل و دماغ در الجھنیں پیدا ہو جائیں۔

"اسی مناسبت سے ارادہ و حرکت کا سمت متعین ہوتا ہے" (صفحہ ۱۴) حالانکہ "سمت" بالاتفاق مؤنث ہے۔۔۔ حد تک اپنا Will - Power بڑھے گا"۔۔۔ "پاور" (Power) اردو میں مؤنث ہو جاتا ہے۔

"نماز کی تعلیم علمائے شریعت وقال دے گئے اور ذکر فکر کی تعلیم صوفیائے طریقت وحال دے گئے" (صفحہ ۲۳)

عہد نبوت اور صحابہ میں یہ تفریق و امتیاز نہیں پایا جاتا تھا کہ کچھ مسٹر "قال" کی تعلیم دیں اور کچھ "حال" کی، اسلام کی ... اور وحدت وجامعیت اس تقسیم کو گوارا نہیں کر سکتی! صلوٰۃ سے بڑھ کر اور کوئی ذکر عبادت نہیں۔ "معلم صلوٰۃ" سے بڑھ کر اور کس کے یہاں ہوگا۔ یہ تو مومن کی معراج ہے!

کیا شریعت کی طرح "طریقت" و صحیح طور پر نص سے ثابت ہے! ایک منصوص اور یقینی چیز کے مقابلہ میں اس سے کم یقینی ... لانا حکمت وبصیرت کے بھی خلاف ہے۔ اور دینی نقطۂ نگاہ سے بھی ناپسندیدہ ہے۔

اقامت صلوٰۃ مرتبہ:- مولانا عبد الحلیم قاسمی، ضخامت ۸۰ صفحات، قیمت مجلد ایک روپیہ غیر مجلد بارہ آنے ملنے کا پتہ: ناظم مکی جامع حنفیہ ٹمپل روڈ، لاہور۔

اس کتابچہ میں "اقامت صلوٰۃ" کی اہمیت و فرضیت نماز کے شرائط، فرائض، واجبات، سنت، اور دیگر ضروری مسائل کو ... اور آسان طریقے پر مسلک حنفیہ کے تحت پیش کیا گیا ہے۔

کتاب اپنی جگہ مفید اور کارآمد ہے عام نمازی اس کتاب سے اپنی نمازوں کی مطابقت کر لیں تو بعض فروگذاشتوں کی اصلاح ہو جائے گی، اور معلومات میں اضافہ بھی ہوگا۔!

صفحہ ۸۰ پر ایک عجیب جملہ نظر آیا ـــــــــــ

"اگر ایک بال بھی غسل میں خشک رہ گیا تو غسل جائز نہیں"

"جائز نہیں" کا یہاں کیا محل ہے؟ لکھنا یوں چاہئے تھا ۔۔۔۔ "تو غسل نہیں ہوا"

...نماز از محمد یعقوب ماہر، ضخامت ۴۴، صفحات، قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے، ملنے کا پتہ: مکتبہ ... گوجرانوالہ

جناب محمد یعقوب طاہر اسلام پسند شاعر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے فکر و ذہن اور تخیل کی توانائیوں اور صلاحیتوں کو اسلام کی ترجمانی کے لئے وقف کر دیا ہے۔ یہ بہت بڑی سعادت ہے جو ان کے حصہ میں آئی ہے، وہ چاہتے تو اپنی شاعری میں زلف و رخسار اور عشوہ و ناز کی عکاسی بھی کر سکتے تھے، مگر انھوں نے چٹخاروں کی یہ راہ ہی اختیار نہیں کی۔ وہ فکر و نظر کی اس منزل کے مسافر ہیں جہاں کتاب و سنت کے قدسی نغمے گونجتے ہیں اور اقامتِ دین کے مجاہد رجز خوانی کرتے ہیں۔

یعقوب طاہر کے کلام میں جوش اور ولولہ پایا جاتا ہے، مرعوبیت، دل شکستگی اور یاس و حزن تو ان کو چھو بھی نہیں سکے۔ وہ ایک بے خوف اور دلیر شاعر ہیں جو اللہ اور رسول کی محبت میں دار و رسن کو ایک کھیل سمجھتے ہیں۔

ان کی ایک نظم ——— تم تو کہتے ——— کا سرورق کا ایک بند پڑھیے اور لطف اٹھایئے:-

تم تو کہتے تھے خزاں دیدہ گلستانوں میں ؛ نئی سج دھج سے بہاروں کے جلوس آئیں گے
وطنِ پاک مساوات کا مسکن ہوگا ؛ شبِ ظلمت میں ستاروں کے جلوس آئیں گے

——— اور ———

رہ ملت کی خیر ہو مرے مولیٰ وطن کی خیر ؛ ملبس کی خیر پھولوں کی خیر اور چمن کی خیر

غزل کا یہ مطلع کس قدر شگفتہ ہے۔

جہاں قلب روشن ہے چراغِ غم نہیں ہوتا ؛ یہ غنچہ تازہ تر بے منتِ شبنم نہیں ہوتا

قدم قدم پہ ہے گم ہمت شکن اندھیروں میں ؛ جنوں کے گھر میں چراغاں ہے دیکھئے کیا ہو

یعقوب طاہر کے کلام میں فن اور زبان کی کمزوریاں بھی پائی جاتی ہیں۔ ان کی نظموں کا یہ حال ہے کہ بعض بند خاصے جاندار ہیں، لیکن بعض دوسرے بند ان بندوں کے جوڑ کے نہیں ہیں، ان کی پرواز فکر بلند ہوتے ہوتے پھر ایکا ایکی پست ہو جاتی ہے۔

بار ہا چاند میں بھی گاڑ دیں آنکھیں ہم نے ؛ اس کی غاروں میں نظر آ نہ سکا تیرا چراغ (صفحہ ۲۲)

"غار" تو باالاتفاق مذکر ہے، پنجاب میں مؤنث بولتے ہوں تو اس کا پتہ نہیں۔

دورِ خزاں تو جا، یہاں آئے ہے بہار ؛ رخصت اداسیو کہ ہے پرستہ بہار انکمار (صفحہ ۳۱)

"بہار" کا الف بڑی طرح دب رہا ہے، "تو جا" نے بھی شعر کو خاصہ کمزور کر دیا۔ ورنہ شعر کی شگفتگی جاتی رہی۔

تعداد کی ہر حد سے پرے لشکرِ ابلیس ؛ اللہ بھی اِک، اس کا مجاہد بھی اکیلا (صفحہ ۶۵)

"تعداد کی ہر حد" کیا بات ہوئی؟ "اِک" کی جگہ "ایک" ہوتا تو اس ذرا سی تبدیلی سے شعر میں (Force) پیدا ہو جاتا۔

مری بساط کا ہر مہرہ اختیار سے پاک ؛ جو کچھ ہے شاطرِ ذی شان ہے دیکھئے کیا ہو (صفحہ ۱۲۴)

مہرہ کا اختیار سے پاک ہونا۔ یہ کیا زبان اور انداز بیان ہے!۔ "ذی شان" محض قافیہ کی مجبوری کے سبب لایا گیا ہے۔ وجدان کو کس قدر کھٹکتا ہے۔!

دنیا و آخرت از:- حکیم الامت مولانا اشرف تھانوی، مرتبہ:- مفتی عبدالرحمٰن خاں ضخامت ۲۰۴ صفحات مجلد قیمت پانچ روپے چھ آنے، ملنے کا پتہ: مکتبہ اشرف المعروف چہلیک، ملتان شہر۔

ملتان میں مکتبہ اشرف المعارف حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتابوں کی نشر و اشاعت کے لئے قائم کیا گیا ہے

اس مکتبہ کی یہ پہلی کتاب منظرِ عام پر آئی ہے۔ ساڑھے سات سو صفحات کی مجلد کتاب کی قیمت کم سے کم آٹھ روپے ہونی چاہئے تھی۔ مگر مکتبہ اشرف المعارف نے اس کی قیمت پانچ روپے چھ آنے رکھ کر سستی سے سستی کتابوں کی قیمت کے ریکارڈ کو توڑ دیا۔ مقصود و غرض یہ ہے کہ حضرت حکیم الامت کے ارشادات زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ سکیں! اور سود و زیاں کے تصور سے بلند ہو کر یہ نیک کام جاری رہے۔

المراد ـــــ الدنیا ـــــ غریب الدنیا ـــــ الرضا بالدنیا ـــــ الاطمینان۔ وخلط الدنیا ـــــ متاع الدنیا الفانی ـــــ الباقی ـــــ الدنیا حال الآخرۃ ـــــ ہم الآخرۃ ـــــ تجارت آخرت ـــــ تذکیر الآخرۃ ـــــ تذکیر الآخرۃ بالمسعود۔ ـــــ

یہ تمام مضامین خوب سے خوب تر ہیں، دین کی آسان و دل نشین تشریح اور تزکیہ نفس کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ہر اعتبار سے مفید ہے۔ مولانا تھانوی دین کی حکمتوں میں قابلِ اعتماد درک و بصیرت رکھتے تھے۔ ان کے قلم و زبان سے لاکھوں آدمیوں نے فائدہ اٹھایا۔ اور بد عقیدوں کے "کفر" کے فتووں کے باوجود تھانوی حلقہ بڑھتا اور پھیلتا ہی گیا۔

ایک اقتباس:۔

"صاحبو! نہ مال اپنا ہے، نہ بیوی اپنی ہے، نہ بچے اپنے ہیں، ہم لوگ تو مزدور ہیں، چھکڑے کھینچ رہے ہیں۔ جس میں بیوی بچے، مال و متاع لدا ہوا ہے، جب منزل پر پہنچ جائے گا تو ٹک کر دیئے جائیں گے۔ صاحبو! مزدور اور خادم اور حمال مالک نہیں ہوا کرتا۔ پس ہم اصل حقیقت میں جب خادم ہیں تو مخدوم کیسے بن جائیں گے، اصل میں جب رعایا ہیں تو حاکم کیسے ہو سکتے ہیں۔ جیسے میں مولیٰ نہیں، یہ چھوٹے ہیں، بڑائی اس کا حق ہے، مقہور و مغلوب ہیں وہ قاہر و غالب ہے۔

وله الکبریاء فی السمٰوٰت والارض۔ (اسی کے لئے ہے بڑائی آسمانوں اور زمینوں میں)"

مولانا تھانوی نے بڑی معقول، در اصل بات فرمائی ہے کہ اسرارِ خداوندی کا تجسس مناسب نہیں، جس مسئلہ کو اللہ تعالیٰ نے مبہم رکھا ہے ہمیں بھی اسے مبہم ہی رکھنا چاہئے۔

مگر

اس کو کیا کیجئے کہ تصوف کی کتابوں میں "متشابہات" پر خاص طور سے گفتگو کی گئی ہے اور ان مبہم و نازک ـــــ تلوار سے تیز اور بال سے باریک ـــــ مسائل کو چھیڑا گیا ہے جن سے ذہن و فکر سخت الجھن میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

"... پس اس اصل پر ہندوستانی جوتہ تو اجازت کے تحت میں آسکتا ہے۔ بخلاف انگریزی جوتے کے کہ اس میں تشبہ بالکفار کی علت حرمت موجود ہے اس کا جواز کسی طرح ثابت نہیں۔" (صفحہ ۳۷)

انگریزی جوتے کو حرام و ناجائز قرار دینا کسی طرح درست نہیں! جس قسم کا جوتا مولانا تھانوی پہنتے تھے "وہ جوتا بھی عربی تمدن اور مدنی تہذیب" کا مظہر نہیں تھا۔ مولانا تھانوی نے بعض مسائل میں اس قدر شدید احتیاط سے کام لیا ہے خاصی تنگی پیدا ہو گئی ہے۔

ادارہ "اشرف المعارف" کو مولانا تھانوی کے ملفوظات پر نظر ثانی کرنے کے بعد انھیں شائع کرنا چاہئے۔ جو عبارتیں غیر ضروری اور محلِ نظر ہوں ان کو حذف کر دیا جائے، لعل و گہر کے ساتھ خزف ریزے نہ رہیں تو اچھا ہے۔

"حالی کا شعر ہے گو حالی کا کلام پڑھنے کو جی نہیں چاہتا مگر ان اشعار میں صحیح مضمون پیش کیا گیا ہے۔" (صفحہ ۴۲۳)

آخر مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا جی حالیؔ کا کلام پڑھنے کو کیوں نہیں چاہتا تھا شاید اس لیے کہ وہ سر سید احمد خان کے قدر شناسوں میں تھے! حیرت ہے کہ حافظ شیرازی جن کا کلام رندی و ہوسناکی کے چٹخاروں میں ڈوبا ہوا ہے اور جسے پڑھ پڑھ کر ایمان بوا شراب خواری اور مردہ پرستی کو فروغ ہوا ہے وہ تو مولانا مرحوم کی نگاہ میں "عرفان و حقائق" کا ترجمان قرار پائے اور حالیؔ جس کا کلام اخلاقی نصائح، ملت کی دردمندی اور حکمت کی باتوں سے پر ہے اسے پڑھنے کے لئے جی بھی نہ چاہے!

اقبال اور عشق رسالت مآبؐ

از :- سید محمد عبد الرشید فاضل (ایم۔ اے) ضخامت ۱۸۴ صفحات کتابت و طباعت دیدہ زیب، قیمت مجلد تین روپے، غیر مجلد دو روپے آٹھ آنے۔

ملنے کا پتہ :- تنویرات علم و ادب ۵۰۰ پیر الٰہی بخش کالونی، کراچی۔

مولانا سید محمد عبد الرشید فاضل شاعر ہیں، ادیب ہیں، ناقد اور عالی اعتقاد اسکالر ہیں۔ اس کتاب میں انہوں نے علامہ اقبال کے اشعار کو پیش کرکے بتایا ہے کہ اقبال کو سرور کائنات (علیہ الصلوٰۃ والتحیات) کی ذات گرامی سے کس قدر والہانہ محبت تھی۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر منفرد ہے اس میں شاعری کا لطف بھی ہے نقد و نظر کے نکتے بھی ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ایمان کو جلا دینے والے مضامین بھی ہیں، فاضل ناقد کی فکر بڑی سلجھی ہوئی ہے۔ انداز بیان دل نشین ہے۔ اقبال کی اسلامی فکر اور پروفیسر عبد الرشید فاضل کے خیالات متوازن واقع ہوئے ہیں اس لئے اقبال کے کلام کی جو شرح انہوں نے لکھی ہے اس کے بارے میں ذمہ داری کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ قبال کا ما فی الضمیر بھی یہی ہوگا۔

فاضل ناقد نے اقبال کے کلام کے شارحین کا شکوہ کیا ہے کہ انہوں نے اپنے نقطۂ نگاہ، رجحان اور معتقدات کی تعبیر کو اقبال کے کلام کی شرح میں سمو دیا ہے، ایک صاحب نے تو :-

"کسی شعر کی بھی شرح ڈھنگ سے نہ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی شرح میں اقبال کو اچھا خاصہ خانقاہی صوفی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جہاں کہیں لفظ "عشق" آیا ہے اس کو پیر کے عشق سے تعبیر کیا ہے۔"

مولانا عبد الرشید فاضل کی یہ کتاب علمی اور دینی نقطۂ نگاہ سے بلند پایہ اور گرانقدر ہے اسے پڑھ کر ایک طرف تو ادبی ذوق کو آسودگی ملتی ہے اور دوسری طرف عشق رسول کی چنگاری بیدار اور تیز تر ہوتی ہے اور دین کی بنیاد ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور اتباع و فرمانبرداری پر قائم ہے۔

آستانۂ زکریا کا عظیم الشان
مشائخ سہرورد نمبر
عنقریب جلوہ گر ہو رہا ہے تیاریاں شروع کر دی گئی ہیں اور اکابر اہل قلم مقالات لکھ رہے ہیں یہ عظیم الشان
خاص نمبر تاریخ و تصوف اور سلسلہ سہروردیہ کا صحیح نمونہ بن کر نمودار ہو گا اس کے مضامین ایمان افروز، معلومات افزا اور بلند
پایہ ہوں گے، تحریک سہروردیت کا تاریخی پس منظر مشائخ سہروردیہ کے مستند واقعات تصوف کے نازک مباحث
کا تجزیہ یہ تمام خوبیاں خاص نمبر میں ملیں گی اس موضوع پر آج تک اتنے تحقیقی مضامین یکجا شائع نہیں ہوئے
مینیجر ماہنامہ آستانہ زکریا، ملتان شہر
گلفام ٹوائیلٹ سوپ
لیلیٰ کریم سوپ
لیلیٰ اسوپ فلیکس پوڈر
ریشمی اور اونی کپڑے دھونے کا خاص اجزاء سے
مرکب صابن
ال رائٹ میڈیکیٹڈ کاربالک صابن
کپڑے دھونے کے بہترین صابن
۱- ہرن برانڈ
۲- ملٹری (۳) ۵۵۵ بار
غسل کیلئے بہترین صابن
صنعت پاکستان کے بہترین نمونے
صابن خریدتے وقت
ذوالفقار انڈسٹریز کا نام دیکھئے
جو، اچھے صابنوں کی ضمانت ہے۔ جدید ترین ولائتی
مشینری سے تیار کردہ
پاکستان میں ہر قسم کے صابن کی ضروریات کیلئے
ذوالفقار انڈسٹریز
منگھوپیر روڈ۔ کراچی

بچے
قوم کا انمول سرمایہ ہیں
ایلبین گلوکوز واٹر
بچوں کے لئے
بیماری میں صحت بخش دوا   تندرستی میں طاقت بخش غذا ہے
ہر انگریزی دوا فروش سے طلب کیجئے
مقررہ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے
لوہے کی ہر قسم کی ضرورتوں
اور پورٹ لینڈ سمینٹ کیلئے
مارش اینڈ کمپنی
کارنر ہاوس پریڈی اسٹریٹ
صدر کراچی ۳ سے
مشورہ کیجئے
اور اس کی
خدمات سے فائدہ اٹھائیے

اپنے مُلک
پاکستان کی صنعت کو ترقی دیجئے
اور اپنے
لائل پور کاٹن ملز
کا
بُنا ہُوا مضبوط کپڑا خرید کر
ملک و قوم کو مضبوط تر بنایئے
پروپرائٹر:- دہلی کلاتھ اینڈ جنرل ملز کمپنی لمیٹڈ
انکارپوریٹڈ اِن انڈیا
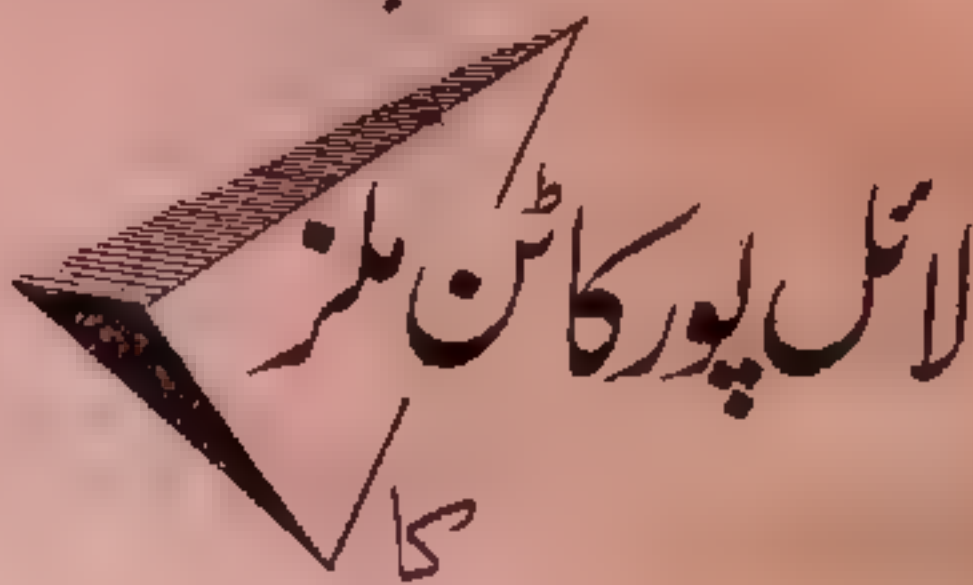
ماہر القادری

جلد ۱۰ ، عدد ۵

ایڈیٹر
ماہر القادری

فاران
کراچی

ماہ
اگست ۵۸ء

سالانہ چندہ . چھ روپے
فی پرچہ :- آٹھ آنے

نظم و ترتیب

مقامِ اشاعت : دفتر فاران، کیمبل اسٹریٹ، کراچی نمبر ۱

پرنٹر پبلشر : مسرور حسین ———— مطبع سعیدی قرآن محل مولوی مسافر خانہ کراچی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اس حقیقت سے کس کو مجال انکار ہو سکتی ہے کہ "تقویٰ" عبادت و معاملات کی روح ہے۔ جو زندگی تقویٰ اور پرہیزگاری سے یکسر عاری ہو، اللہ کے نزدیک وہ "ارذل" (ذلیل ترین) زندگی ہے۔ بہایم اور چوپایوں کی سی زندگی۔ انسان کے شرف و مکرمت کی اصل "تقویٰ" ہے۔ اسی سے ہر عمل میں اخلاص پیدا ہوتا ہے اور انسان کا دل زندہ و بیدار رہتا ہے۔

"تقویٰ" کا معیار کیا ہے؟ اس سوال پر مردِ مومن کا وجدان فوراً پکار اٹھتا ہے :-

"اسوۂ رسولؐ"

اور "اسوۂ رسولؐ" کے بعد صحابہ کرام کی زندگیاں نیکوکاری، خدا ترسی اور پرہیزگاری کے پیمانے ہیں! آثارِ صحابہؓ کے بعد سلف صالحینؒ کی زندگیاں کا "تقویٰ" ہمیں روشنی دیتا ہے کہ اس دنیا کے مکروہات میں گھر کر ایک مردِ مومن [illegible] گزار سکتا ہے!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ اور صحابہ کرام کی زندگیاں ہمیں یہ درس و ہدایت دیتی ہیں اور نمونہ پیش کرتی ہیں کہ ــــ "حکومت و فرمانروائی" شجرِ ممنوعہ نہیں ہیں کہ "تقویٰ" اس کے چھونے اور قریب جانے سے روکتا ہو بلکہ اس کے برخلاف اقامتِ دین کی خاطر اور اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لئے "حکومت و فرمانروائی" کے کاروبار کو سنبھالنا ناگزیر ضرورت ہو جاتا ہے۔ جس سے نہ تو تقویٰ مجروح ہوتا ہے اور نہ توجہ الی اللہ میں کمی آتی ہے، یہاں مسلمانوں کا امیرِ نماز میں عساکرِ اسلامی کی صفوں کو مرتب کرتا ہوتا ہے اور اس کے اس خیال و تصور اور دل و دماغ کے عمل سے خلوصِ عبادت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔

اگر "حکومت" خالص دنیا داری کا کام ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام اسے اختیار نہ کرتے! حضورؐ نے اور صحابہ کرام نے جو اسوہ اُمت کے لئے چھوڑا ہے اس میں حکومت بھی شامل ہے۔ پس وہ مسلمان جسے اسوۂ رسولؐ ہی کی روشنی، کانٹ چھانٹ اور کتر بیونت گوارا نہیں ہے، اور جو حضورؐ کے پورے کے پورے "اسوہ" کو معیارِ عمل سمجھتا ہے، وہ اپنی دینی جدوجہد کے پروگرام سے "حکومت" کے موضوع اور "[illegible]" کو خارج نہیں کر سکتا!

یہ ایک ثابت شدہ تاریخی حقیقت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ تشریف لے جانے کے بعد حالات کو سازگار پا کر پہلا کام یہ کیا کہ "اسلامی اسٹیٹ" کی بنیاد ڈال دی؛ اگر حکومت کا کاروبار "تزکیۂ نفس" کی راہ میں ذرہ برابر بھی حائل ہوتا تو بھلا حضورؐ جو "تزکیۂ نفس" کی ڈیوٹی پر مامور تھے "حکومت و فرمانروائی" کو اختیار فرما سکتے تھے، "اسوۂ رسولؐ" سے اس کی شہادت ملتی ہے کہ اقامتِ دین کی خاطر ــــ "حکومت و جہانبانی" کا کام تزکیۂ نفس اور تقویٰ کی ضد نہیں ہے۔

انفرادی سیرت سازی کی اہمیت سے کس کو انکار ہے اور یہ بھی سو فیصدی درست ہے کہ قیامت کے دن ہر نفس کو اپنے اعمال

کی جواب دہی کرنی ہوگی۔ مگر سیرت سازی کے اسرار و حکم اور داعیات سے جتنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واقف تھے اتنا واقف اور کون ہو سکتا ہے، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے صحابہ کرام سے حکومت چلانے کا کام بھی لیا اور اسی کے ساتھ سیرت سازی بھی ہوتی رہی، جو صحابہ زکوٰۃ وصول فرماتے تھے، قضایا کا فیصلہ اور حدود واللہ جاری کرتے تھے، اسلامی فوجوں کو لڑاتے تھے، بادشاہوں کے درباروں میں اسلامی حکومت کی سفارت لے کر جاتے تھے، وہ تقویٰ اور نیکوکاری میں "اصحابِ صُفّہ" سے کسی عنوان فروتر نہ تھے!

تابعین میں حضرت عمرؓ ابن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی شہادت دیتی ہے کہ "حکومت" جب اقامت دین کے لئے اختیار کی جاتی ہے تو وہ "عبادت" بن جاتی ہے۔ عمر ابن عبدالعزیز کا تقویٰ کوئی شک نہیں کہ صحابہ کرام کے تقویٰ سے ملتا جلتا تھا اور ان کے دور میں اُمتِ مسلمہ محسوس کرتی تھی کہ خلافتِ راشدہ واپس آگئی ہے۔ کس بے نفسی اور تقویٰ و نیکوکاری کے ساتھ "عمر ثانی" نے اسلامی حکومت کو چلایا ہے، امورِ سلطنت میں کیسی کیسی جزئیات پر آپ نگاہ رکھتے تھے۔ یہ نفوسِ قدسیہ حکومت کو دنیاداری کا کام سمجھ کر اگر چھوڑ بیٹھتے تو اُمتِ مسلمہ کی شیرازہ بندی اور اسلام کے غلبہ کو نہ جانے کن حوادث و مصائب سے دوچار ہونا پڑتا۔ اللہ تعالیٰ کی ان اہلِ عزیمت پر رحمت نازل ہو جنہوں نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ اسلام سنیاسیوں، جوگیوں، راہبوں اور عزلت نشینوں کا دین نہیں ہے بلکہ فاتحوں، حوصلہ مندوں اور دنیا پر غلبہ پانے والوں کا دین ہے، وہ تقویٰ جس میں عزیمت نہ ہو راہبوں کا تقویٰ ہے، مردِ مومن کے تقویٰ کو پُرعزیمت ہونا چاہیئے کہ جو منکر کو دل میں بُرا سمجھنے پر ہی قناعت کر کے نہ بیٹھ جائے۔ بلکہ اس کے خلاف زبان سے اعلان کرے اور اس طاقت کی فراہمی میں لگا رہے جس کے زور سے منکر کو بدلا جا سکتا ہے۔ "اسلامی حکومت" کے قیام کی غرض و غایت ہی یہ ہے کہ حکومت کی طاقت سے منکر کو مٹایا جائے اور معروف کو ترقی دی جائے۔ کیا یہ مقصد اور اس کے لئے جدوجہد "تقویٰ" کے تقاضوں کو مجروح کرتی ہے۔

حضرت ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا تقویٰ ضرب المثل بن چکا ہے اور اسے دورِ حاضر میں مثالی تقویٰ کہہ کر پیش کر سکتے ہیں۔ حضرت امام اعظم کے زمانہ میں جب حضرت نفس زکیہ نے عباسی خلفاء کا روحِ حکومت کے خلاف علمِ بغاوت بلند فرمایا تو امام اعظم نے اُن کی مالی معاونت کی۔ یہ ہے سلفِ صالحین کا کردار، تقویٰ اور ان کی شانِ عزیمت! امام اعظم سے بڑھ کر مسائل کی باریکی اور کون عالم اور فقیہ جان سکتا ہے، آپ چودھویں صدی ہجری کے بعض "مدعیانِ تقویٰ" کی طرح اس انداز پر سوچنا چاہیئے تھا کہ نماز، روزہ اور حج زکوٰۃ تو ادا ہو ہی رہے ہیں۔ دینی مدرسہ میں کتاب و سنت کی تعلیم دی ہی جا رہی ہے، پھر بیٹھے بٹھائے سکون کو اضطراب سے بدل دینے سے فائدہ؟ "تقویٰ" کو ہر فتنہ سے الگ تھلگ ہی رہنا چاہیئے، حکومت کا چلانا یا کسی حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے جدوجہد کرنا، دنیاداری کی باتیں ہیں، اس میں "نفس" کی کتنی آمیزش ہوتی ہے! اور اس دھندے میں پڑ کر آدمی یادِ خدا سے غافل ہو جاتا ہے ————— لیکن امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے اس انداز پر نہیں سوچا۔ ان کا تقویٰ دین کے ان تقاضوں کو پہچانتا تھا کہ اقامتِ دین کے لئے "انقلابِ حکومت" کی جدوجہد بہت بڑی نیکی ہے۔ حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہما "انقلابِ حکومت" کی جدوجہد کے زرین نقوش تاریخ کے اوراق پر ثبت کر چکے تھے اور یہ نفوسِ قدسیہ نہ دنیادار تھے اور نہ تقویٰ میں کسی سے گھٹ کر تھے۔ حضرت نفس زکیہ نے بھی اپنے اکابر کی سنت کو تازہ کیا تھا۔ اور حضرت امام اعظم نے اس معرکہ میں کسی پس و پیش اور تامل کے بغیر تعاون فرمایا۔

جس امت کے سامنے سلف صالحین کے یہ نمونے ہوں۔ اس کے بعض اربابِ تقویٰ "انقلابِ حکومت" کی جدوجہد سے چھوت کی بیماری کی طرح دامن بچا لیتے ہی کو تقویٰ سمجھتے ہوں، تو ان کی اس فہم و بصیرت پر ہنسنے سے زیادہ رونا چاہیئے کہ اللہ کے دین کو یہ ـــ بے عزیمت لوگ سدا مظلوم و مغلوب ہی دیکھنا چاہتے ہیں۔

یہ مخالفت!! حکومت و امارت کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ اور صحابہ کرام کے عمل کی تفصیل اوپر پیش کی جا چکی

ہے۔ ان روشن حقائق کے ہوتے ہوئے چون وچرا کی گنجائش ہی کب باقی رہتی ہے ——— مگر ایک مخصوص ماحول میں پرورش پایا ہوا تقویٰ اس طرح سوچتا ہے کہ ہمارے فلاں حضرت نے تو اس نہج پر ہمیں تعلیم نہیں دی تھی، اُن کے ملفوظات میں تو اس قسم کی معرکہ آرائیوں کی تلقین نہیں ملتی، اور فلاں شخص جو علم دین اور تقویٰ میں ہمارے حضرت کے پاؤں کے دھوون کی برابر نہیں ہے اس نے ——— "اقامتِ دین اور حکومتِ الٰہیہ" ——— کی جو تحریک کھڑی کردی ہے، وہ یقیناً "فریبِ نفس" کا ظہور ہے ایسے شخص کے کام میں اخلاص کی کمی ہونی ہی چاہیئے، یہ شخص جس نے کسی پیرِ طریقت سے فیض ہی نہیں پایا اور کسی دارالعلوم میں اس کی دستار بندی ہی نہیں ہوئی، اس کی قبولیت کا اور ——— ہر دلعزیزی کا یہ عالم کہ ذہین نوجوان گروہ در گروہ اس کی طرف کھنچے چلے آرہے ہیں اور اس بے سند عالم اور "بے پیرے شیخ" سے بعض لوگ ——— "تجدیدِ دین" تک کا شرف منسوب کر رہے ہیں تو اس کام "تحریک" اور مشن کو آگے ہی چلنے دیا جائے ——— ——— تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ ہمارے بزرگوں کا بتایا ہوا طریقہ درست نہیں تھا، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آخر ہم نے بال بھی تو دھوپ میں سپید نہیں کئے۔ دین کے راستے میں ہم بھی تو برسوں سے جدوجہد کر رہے ہیں، ہمارے تجربے بھی تو وزن رکھتے ہیں۔

اور پھر

دنیا کو ہمارے قریبی اسلاف اور بزرگوں کی رہنمائی قبول کرلی چاہیئے کہ جن کی ذات شریعت و طریقت کی سنگم تھی، دورِ روحانیت میں جو بہت اونچا مقام رکھتے تھے۔ اور ہمارے بزرگوں نے اس شخص کے کام کو نہیں سراہا، کسی نے سکوت اختیار فرمایا کسی نے کہا کہ یہ شخص بات تو ٹھیک کہتا ہے، ———

ع پر طبیعت ادھر نہیں آتی

اور کسی نے تو مرتے دم تک اس شخص کی مخالفت کی۔ ہم کہ اپنے بزرگوں کے نام لیوا، ہم نشین اور فیض یافتہ ہیں، اپنے بزرگوں کی بات بھلا کیسے [illegible] دیں گے، وہ جس کام کو ادھورا چھوڑ گئے ہیں، اُسے پایۂ تکمیل کو پہنچانا ہمارا فرض ہے اور پھر خود ہم بھی تو علم و تجربہ رکھتے ہیں، طریقت و درجات کی منزلوں میں بھی ہم نے سفر کیا ہے، اخلاص و تقویٰ کی علامتوں کو بھی ہم پہچانتے ہیں اور ہمارے وجدان میں برسوں کی ریاضتوں کے بعد یہ صلاحیت پیدا ہو گئی ہے کہ ہم کسی کے کام، تحریک اور عزم پر حق و ناحق اور صواب و ناصواب کا حکم لگا سکتے ہیں۔ ہمارے بعض بزرگوں نے اس تحریک کے مستقبل کے بارے میں جو خدشے ظاہر کئے تھے ان اندیشوں کو حقیقت بننا ہی چاہیئے، اب تک ہم مخالفت کے جذبے کو دبائے بیٹھے اور دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے رہے، ہاں! یہ کام ہم ضرور کرتے رہے ہیں کہ اپنی نجی صحبتوں، و نجی خطوں میں اس شخص کے بارے میں اپنے سوءِ ظن کا اظہار کردیا مگر جس پر اظہار کیا، اس کو تاکید کردی کہ کسی دوسرے سے اس کا ذکر نہ کرنا،

اب بزرگوں کی دعا اور مولانا اعلیٰ کی تائید سے "شہادتِ حق" کے لئے وقت سازگار ہو چکے ہیں اس لئے کہ خود اسی کی جماعت کے بعض ممتاز افراد جماعت سے ٹوٹ چکے ہیں، ہم بڑے سادہ لوح ہوں گے اگر اس موقعہ سے بروقت فائدہ نہ اٹھائیں۔ یہ تو غیبی امداد ہوئی کہ اس فتنہ کو کچلنے کا اس سے زیادہ موزوں وقت اور کون سا ہوگا۔

تو پھر

کھل کر "شہادتِ حق" کیوں نہ دے دی جائے، دیر تو کی ہی جا چکی۔ یہ ہمارے وجدان کا فیصلہ ہے، اس وجدان کا جس نے "کشف و مراقبہ" اور "ارشاد و تصوف" کی آغوش میں نشو و نما پائی ہے، دو ٹوک لفظوں میں اعلان کردو کہ اس شخص میں تقویٰ کی کمی پائی جاتی ہے۔ اس میں حیاتِ طیبہ کا وہ رنگ نہیں ہے، جس کا ایک داعی میں پایا جانا ضروری ہے۔ پھر دوسروں کے اقوال کے حوالے سے یہ بات بھی کہو کہ دین کے معاملے میں شخص کے احوال قابلِ اطمینان نہیں ہے، اس پر جاہ طلبی اور اقتدار حاصل کرنے کا بھی الزام لگادو۔ یہ بھی کہو کہ وہ جس جماعت کا امیر ہے

اس سے کوئی بہت بڑی ضلالت ظہور میں آنے والی ہے۔ اب رہیں اس کی کتابیں جس نے اُسے مقبول و ہردلعزیز بنایا ہے، ان کو بے اعتبار ٹھیرانے کے لئے مصنف کے بارے میں یہ اعلان کردو کہ اس کا نحو کمزور ہے، اور قرآن و حدیث میں بھی اس کی معلومات سرسری بلکہ کچی ہیں۔ لے دے کے اس شخص کی انشاپردازی رہ جاتی ہے جس کی بہت دھوم ہے تو اس پر "کاغذ کی ناؤ چلانے" کی پھبتی چست کردو۔ غرض اس کے کسی وصف، خوبی اور صفت کو بھی مجروح اور داغدار کئے بغیر نہ چھوڑو۔

"نقشِ اول" پڑھنے والے سمجھ گئے ہوں گے کہ "اس شخص" سے کس کی ذات مراد ہے، یہ وہ مظلوم شخص ہے جسے دُنیا ابوالاعلیٰ مودودی کے نام سے جانتی ہے، اور جس کے ہوش و شعور کی پوری زندگی اللہ کے دین کی خدمت میں گزری ہے اور جس کا اس کے سوا اور کوئی قصور نہیں ہے کہ وہ "اقامتِ دین" کی جدوجہد کی طرف لوگوں کو بلاتا ہے اور اس دعوت کو دہراتا ہے بلکہ اس کی دعوت اسی مرکز کے اردگرد گھومتی ہے کہ:۔

"اللہ کے دین میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ"

یعنی تمہاری زندگی کا کوئی شعبہ دین کے دائرہ سے باہر نہ رہے۔ پوری کی پوری زندگی اللہ کے حکم کے تابع کر دینے کا نام "اسلام" ہے اس حقیقت کو مولانا مودودی نے ہزاروں صفحوں میں پھیلا کر بیان کیا ہے۔ عنوان بدل بدل کر مقالے لکھے ہیں اور طرح طرح سے لوگوں کے دلوں میں یہ بات اتارنے کی کوشش کی ہے کہ مردِ مومن کو زندگی کی ہر منزل میں اللہ اور رسول کا مطیع و فرمانبردار ہونا چاہیئے!

مودودی صاحب کی تحریر کے اللہ کے فضل سے بڑے اچھے دینی اثرات مترتب ہوئے ہیں، لاکھوں مسلمانوں کی زندگیوں میں ان کی کتابیں پڑھ کر دینی انقلاب آیا ہے، جہاں تک عقائد کا تعلق ہے بعض اہلِ رفض اور بہت سے اہلِ بدعت نے اپنے گمراہ کن عقائد سے توبہ کی ہے، منکرین اور ملحدوں اور کمیونسٹوں کو یقین کی روشنی ملی ہے اور اعمال میں تو انقلاب کا یہ عالم ہے کہ گندی زندگیاں اُجلی اور صاف ستھری ہو گئی ہیں۔

اے مدعیانِ تقویٰ۔ تم وجدان اور ملاء اعلیٰ کی مجذوبانہ باتیں کرتے ہو جس پر تم کوئی واضح دلیل نہیں لاسکتے۔ سوائے اس کے کہ تم نے ایک حکم لگا دیا اور لوگ اُسے "الہام" سمجھ کر مان لیں، جو کمبخت نہ مانے گا اُسے ملاءِ اعلیٰ کی خوشنودی حاصل نہیں ہو سکتی! ——— اور ہم گنہگار ہندوستان اور پاکستان کے لاکھوں مسلمانوں کی زندگیاں ہی، ثبوت میں پیش کرتے ہیں کہ یہ وہ زندگیاں ہیں جن کو مولانا مودودی کی کتابوں اور جماعتِ اسلامی کے اثر و تربیت نے صاف پاکیزہ بنایا ہے اور ان میں دینی انقلاب پیدا کیا ہے۔

اس ایمان، فروز منظر کو دیکھ کر تمہیں تو خوش ہونا اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیئے تھا کہ اسلام، ایمان، یقین اور تقویٰ کو اس قدر فروغ حاصل ہو رہا ہے مگر تم ہو کہ خوش ہونے کے بجائے ملاءِ اعلیٰ سے ہو اور ل کھ رہے ہو اور "دعوتِ دین" کی اس منزل میں یقین پہنچنے کے بجائے طرح طرح سے رکاوٹیں ڈال رہے ہو!

جماعتِ اسلامی کے لٹریچر پر "اسلاف سے کٹ جانے" کا الزام تو اس قدر لچر اور بے بنیاد ہے کہ جس کی تردید کرتے ہوئے بھی افسوس ہوتا ہے کہ اتنا وقت اس لایعنی بحث میں کیوں ضائع کیا جو لوگ کتاب و سنت سے اپنی زندگیوں میں رہنمائی اور روشنی حاصل کرنے ہوں وہ "سلف" سے قریب ہوتے ہیں یا کٹ جاتے ہیں۔ جس کسی نے اکل حلال اور صدقِ مقال کو اپنا مشرب اور مسلک بنایا وہ "سلف" سے قریب ہو یا دور ہو گیا جس نے "اقامتِ دین" کے لئے جدوجہد کی وہ اسلاف کا مشابہ بنا یا مخالف! ہاں یہ ضرور ہے کہ جماعتِ اسلامی سے جو لوگ متاثر ہیں وہ اسلاف میں سے کسی شخصیت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح مطاع اور معیارِ حق نہیں سمجھتے، سلف کے کسی قول و عمل میں کوئی الجھن محسوس ہوتی ہے تو کتاب و سنت کی کسوٹی پر اُسے کس کر دیکھتے ہیں، اور کتاب و سنت ہی کے فیصلہ کو حق سمجھتے ہیں!

مولانا مودودی کو اللہ تعالیٰ نے انشاپردازی کی بے پناہ صلاحیت دی ہے، وہ اردو کے صفِ اول کے ادیبوں میں ممتاز درجہ رکھتے

ہیں اور جہاں تک سائنٹفک انداز میں کسی مسئلہ کی افہام و تفہیم اور استدلال کا تعلق ہے وہ انفرادیت کے مالک ہیں، اُن کی فکر بہت سلجھی ہوئی ہے جدید و قدیم علوم کا انھوں نے مطالعہ بھی کیا ہے۔ ان سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دینی بصیرت سے بھی نوازا ہے۔ اس لئے ان کی تحریر میں دلکشی اور تاثیر کے ساتھ وہ خوبی بھی پیدا ہو گئی ہے جس سے ایمان کو تازگی اور آسودگی میسّر آتی ہے "مطمئن کر دینے والے دلائل، دل میں گھر کرنے والا اسلوب تفہیم! مولانا مودودی کی تحریر کی یہ خوبیاں جن کی طرف ابھی ابھی اشارہ کیا گیا ہے، اس صدی کے اکثر عالموں اور ادیبوں کی تحریروں میں نہیں ملتیں۔ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَاءُ وَاللّٰہُ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِیْم

مولانا مودودی نے بڑے بڑے پیچیدہ علمی مسائل کی گرہیں کھولی ہیں، شام کے سابق وزیر معارف اور مایہ ناز ادیب و عالم استاذ مصطفےٰ زرقا کی یہ بات چاہے کسی کے ادعائے علم و فضل پر گراں گذرے مگر انھوں نے ایک حقیقت کا اعتراف کیا ہے ——— "یہ کہ مودودی امام غزالی اور ابن تیمیہ کے سلسلہ کی کڑی ہے" اور پھر اُن کے حال پر اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا فضل یہ ہے کہ انگریزی لٹریچر کے مطالعہ کے باوجود مولانا مودودی دوسرے مغرب زدہ ادیبوں کی طرح "اباحیت" کی طرف ذرا سا بھی میلان نہیں رکھتے، انھوں نے قتل مرتد، سود، ضبط ولادت جیسے مسائل پر اظہار حق فرما کر متفرنجین سے "ماڈرن ملا" اور اسی قسم کی دوسری ملاحیاں، پھبتیاں اور گالیاں سُنی ہیں!

مودودی صاحب کی کتابیں پڑھ کر اقامت دین کا ولولہ پیدا ہوتا ہے، اُن کے یہاں دین کے کسی مسئلہ کے اظہار میں کوئی "معذرت" نہیں، وہ دب کر اور جھجک کر بات نہیں کرتے، پوری جرأت و یقین کے ساتھ صاف اور دو ٹوک لفظوں میں اس کا اعلان کہ "دین و شریعت کی ہر بات عین حق و صواب ہے "کسی کی سمجھ میں اس مسئلہ کی حکمت نہیں آتی تو یہ اس کی اپنی فہم کا قصور ہے!

دین و شریعت اور کتاب و سنت کے ایسے ممتاز الفکر شارح، مفسر اور ترجمان بلند داعی کو مطعون کر کے لوگوں کی نگاہ میں اُسے بے وقعت اور بے اعتبار ٹھیرانا "تقویٰ" نہیں خدا سے "بے خوفی" کی دلیل ہے، اہل تقویٰ کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ دین کے خدمت گزاروں کو طعن و ملامت کا ہدف بنائیں، اور کسی کی زبان سے خواب اور کسی کی زبان سے کچھ پیشگوئیاں سن کر مطمئن ہو جائیں کہ اس شخص کو ملاء اعلیٰ کی پسندیدگی حاصل نہیں ہے، ذمہ دار انسان بھلا اس طرح کی جذباتی باتیں کیا کرتے ہیں!

نیاز فتحپوری کی گمراہی سے لے کر موجودہ دور کے ہر فتنہ کے خلاف، چاہے وہ انکار حدیث کا فتنہ ہو یا اردو میں نماز پڑھنے کی گمراہ کن تحریک۔ مولانا مودودی ہر محاذ پر سینہ سپر نظر آتے ہیں۔ اُن کی عزیمت کا اور ثبات و استقامت کا یہ عالم بھی چشم فلک نے دیکھا ہے کہ حق گوئی کے جرم میں موت کی سزا سن کر بھی اُن کی پیشانی پر بل نہیں آیا، اُن کی عزیمت نے اس دور [illegible] میں ایک مثال قائم کر دی ہے۔ ہم مودودی کو امام برحق کا مقام نہیں دیتے مگر اس حق گوئی و جرأت و عزیمت میں جھلک تو پائی جاتی ہے! نکتہ چینوں کی اس بے بصری کو کیا کہیے کہ مودودی کی ذات و صفت کے یہ شرف و کمال انہیں نظر نہیں آتے۔ اُن کی کمزوریاں بس نہیں دکھائی دے جاتی ہیں، اور اُن کمزوریوں کو طرح طرح سے نمک مرچ لگا کر نمایاں کرتے ہیں۔

یہ کون کہتا ہے کہ مودودی صاحب سے کوئی غلطی ہی سرزد نہیں ہوئی، انھوں نے غلطیاں بھی کی ہیں، مگر ان کے دامن میں چند غلطیوں کے ساتھ ہزاروں خوبیاں اور بھلائیاں بھی تو ہیں۔ انھوں نے کاغذ کے ہزاروں صفحات پر حکمت و دانش کے جو موتی بکھیرے ہیں اُن سے صرف نظر کر کے چند خزف ریزوں کو چُن کر ان کو نمایاں کرنا کیا یہ ہے مصنف کا سرمایۂ علم و تقویٰ، کتنی نا انصافی کی بات ہے!

راتوں کی تنہائی میں خدا کے خوف سے رونا بہت بڑی سعادت ہے، خشیت الٰہی اور ندامت کے اشکوں سے دُھلی ہوئی آنکھوں پر فرشتے رشک کیا کرتے ہیں، یہ سوز و گداز اللہ تعالیٰ ہر کسی کو نصیب کرے! مگر معاملہ آہ نیم شبی اور گریہ سحری پر تو ختم نہیں ہو جاتا، تقویٰ و خشیت الٰہی کا اصل امتحان حق و باطل کی کشمکش میں ہوتا ہے کہ حدود اللہ کو پامال ہوتا دیکھ کر خشیت الٰہی سے رونے والی آنکھیں، کتنی چبھن محسوس کرتی

ہیں اور اس گداز قلب سے معرکۂ حق و باطل میں کیا کام لیا جاتا ہے، صحابہ کرام جو راتوں کی تنہائیوں میں اللہ تعالیٰ کے حضور رو رو کر دعائیں مانگتے تھے، دن میں اُن کی تلواروں کی جھنکار ان دعاؤں پر "آمین" بھی تو کہتی تھی۔ وہ رومی جاسوس کے بقول رات کے راہب اور دن کے شہسوار تھے! جنھوں نے مسلمانوں کو صبح کی نیند سے بیدار کرتے تھے ——— الصلوٰۃ خیر من النوم ——— کے نعروں سے فضائیں گونج اٹھتی تھی۔ وہ بدر و حنین کے میدانوں میں باطل سے ٹکرا بھی تو گئے تھے اور روم و مدائن کا شکوہ اُن کا فرش پا انداز بھی تو بن گیا تھا! نماز کے لئے گشت کرنا اور قافلے بن بن کے نکلنا بہت اچھی بات ہے مگر "دین" کی یہی تو منزلِ مقصود نہیں ہے، اس سے آگے جو پڑاؤ ہے اُس کا وہ انتہائی راستہ، دور ہا پڑے گا؟ دنیا اس لئے "نمازی" بھی تو پائے جاتے ہیں جو ملک اِن تحریکی تبلیغ لیتے ہیں "دین" کی معیت ور. حوالے ہیں کہ کوئی شخص بے نمازی نہ رہنے پائے مگر وہ اس منزل سے آگے بڑھ کر "منکرات" کے خلاف کھل کر آواز بھی بلند کرتے ہیں انکے احتجاج اور جدوجہد سے سینما ہال بنتے بنتے رُک گئے ہیں، قمار بازی کے اڈے بند ہو گئے ہیں۔ رقص و غنا کے پروگرام ملتوی ہو گئے ہیں، انکی مسلسل کوشش ہے حکومت کے دستور میں "کتاب و سنت" اور "اخلاق و اسلام" کے الفاظ برقرار رہے ہیں، اس جدوجہد میں انھوں نے وقت اور روپیہ صرف کیا ہے اور اپنے آرام و آسائش کو ترک کر ایثار، نفس کشی اور رفاقتِ حق کی ایک مثال قائم کی ہے۔ ایک وہ "تقویٰ" کہ جس میں کوئی جوکھوں نہیں، خطرہ تو اس کے پاس بھی پھٹکنے نہیں پاتا۔ چین اور آرام کی پرہیزگاری ——— دوسرا یہ "تقویٰ" جہاں قدم قدم پر خطرے، مصیبتیں اور پریشانیاں ہیں، کتنی ناانصافی، ظلم اور صریح زیادتی ہے کہ اُس پرسکون "تقویٰ" کو تو "سنتِ انبیاء" سمجھا جائے مگر اس بے آرام "تقویٰ" کو جو طرح طرح کے خطروں سے گھرا ہوا ہے، اس پر دنیاداری اور جاہ و اقتدار حاصل کرنے کی طنز کی جائے!

اللہ کے نیک بندوں کی ایک جماعت نے اللہ کے کلمہ کو بلند اور اس کے دین کو غالب کرنے کے لئے جان و مال کی بازی لگا رکھی ہے، حق و باطل کی کشمکش اور ایثار و قربانی کی امتحان گاہ میں ان کا تجربہ بھی کیا جا چکا ہے کہ انھوں نے سخت سے سخت مزاحمت اور طرح طرح کے نقصانات کے باوجود حق کی رفاقت نہیں چھوڑی۔ انھوں نے قید و بند کی مصیبتیں بھی جھیلی ہیں اور مالی خسارے بھی برداشت کئے ہیں مگر ان کے پائے ثبات میں کوئی تزلزل پیدا نہیں ہوا، اور پھر اُن کی اس تمام جدوجہد کے عرصہ میں رفقاء نے، نماز اور دین کے دوسرے احکام کی پابندی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ یہ لوگ ایسی کسی جدوجہد کو انسانیت کے لئے دین و دنیا کا وبال سمجھتے ہیں جس میں کتاب و سنت کا اتباع شامل نہ ہو! کیا ایسی جماعت ارباب علم و تقویٰ کی تحسین کی مستحق ہے یا ملامت کی! ان کی رفاقت "تعاون علی الاثم" ہے یا "تعاون علی البر"؟؟ ان کی حوصلہ افزائی کرنے کی ضرورت ہے، یا دل شکنی کی! ان کے خلاف مسلمانوں کو بھڑکایا جائے اور ان سے نفرت دلائی جائے یا اُن کا اچھے لفظوں میں تعارف کرایا جائے؟؟

اس جماعت کے کام میں کوئی ایسی خرابی ہے کہ جس سے دین و ایمان کو خطرہ لاحق ہے تو اس خرابی کی واضح دلائل کے ساتھ نشاندہی کیجئے صرف خوابوں، بزرگوں کی پیشین گوئیوں اور وجدان کے اشاروں کی بنیاد پر ان کو مطعون کرنا ذمہ دار لوگوں کا شیوہ نہیں ہو سکتا۔ یہ بڑا کمزور موقف ہے جو اختیار کیا گیا ہے۔ دینی نقطۂ نگاہ سے نقد و احتساب کی یہ بہت ہی نیچی سطح ہے اور "تقویٰ" کو اس نیچی سطح تک آنا ہی نہیں چاہیے

اقامتِ دین کی منظم تحریک سے جن بزرگوں کو یہ خطرہ لاحق ہوا اور جو اس اندیشہ کے مارے خواہ مخواہ ہلکان ہو رہے ہوں کہ اس جماعت سے مستقبل قریب میں کوئی بڑی ضلالت رونما ہونے والی ہے ——— اُن کی اس مستقبل بینی و پیشین گوئیوں کو ایک "فتنہ" نہ کہئے تو اور کیا کہئے! یہ تو ایسی ہی بات ہوئی کہ ایک شخص نماز پڑھ رہا ہو اسے دیکھ کر کوئی صاحب فرمانے لگیں کہ یہ نمازی آئندہ چل کر بُت پرستی کرنے لگے گا ——— تو کیا اس پیشین گوئی اور اندیشہ کی بنا پر اس نمازی مسلمان سے بُت پرستوں کا سا برتاؤ کیا جائے! جب وہ بُت پرستی کرنے لگے گا، اس وقت اہل توحید اس سے آپ ہی بیزار ہو جائیں گے!

جس جماعت کی ہمہ گیر تبلیغ کا یہ عالم ہو کہ کالجوں اور مدرسوں میں، دفتروں اور تجارت گاہوں میں، کارخانوں اور فیکٹریوں میں، حکومت کے ایوانوں اور مزدوروں کی انجمنوں میں، جہاں بھی اس کی رسائی ہو چکی ہے، وہاں اس نے اللہ کے دین کی دعوت دی ہے اور لوگوں کے کانوں تک حق کا پیغام پہنچایا ہے، اس نے مزدوروں کے جائز حقوق کی حمایت کی ہے مگر اس حکمت اور خوش اسلوبی کے ساتھ کہ بھوک ہڑتال اور توڑ پھوڑ کی نوبت نہیں آنے دی، اس کے ارکان نے وبائی امراض، قحط اور سیلاب کے مصائب میں اپنے کو خطرے میں ڈال کر خلق خدا کی خدمت کی ہے، اس کے ہسپتالوں اور گشتی شفاخانوں کو دیکھ کر حکومت کے ارباب کار حیران ہیں کہ اتنے کم عملہ اور قلیل مصارف کے تحت اتنے بہت سے مریضوں کی خدمت اور تیمارداری کیسے ہو جاتی ہے؛ مذہبی لوگوں پر جو "ملا" کی پھبتی کسی جاتی تھی، جماعت اسلامی نے اپنے عمل سے اس طنز کو غلط ٹھیرا دیا ہے انھوں نے دنیا کے سامنے عمل کر کے دکھا دیا ہے کہ اسلام پسند لوگ زندگی کے ہر شعبہ میں ان روشن دماغ مہذب مغرب زدہ مسلمانوں سے کوسوں آگے ہیں۔ جماعت اسلامی کے دفتروں کی تنظیم۔ اُن کے جلسوں کا حسن انتظام، اُن کی پبلسٹی کے طریقے اس قدر مہذب، در ترقی یافتہ ہیں کہ انھیں دیکھ کر غیر ملک کے سیاح ماننے حیرت کا اظہار کیا ہے، ہر چیز میں قرینہ، سلیقہ، ربط و نظم۔ صفائی، ستھرائی! کم سے کم خرچ میں زیادہ سے زیادہ خوشنمائی!

جماعت اسلامی نے انتخابات میں بھی حصہ لیا ہے مگر اس شرافت اور احساس ذمہ داری کے ساتھ کہ اس گندے کاروبار کو پاکیزہ کر کے دکھا دیا ہے، نہ دھاندلی، نہ دھونس۔ نہ دھن دولت کی رشوت! الیکشن کے زمانہ میں ایک ایک لمحہ مصروف مگر نماز کے وقت ہر چیز اپنی جگہ چھوڑ کر۔ اللہ تعالیٰ کے حضور سر بسجود! اور یہ سب جدوجہد صرف اس لئے کہ اللہ کے دین کو غلبہ میسر ہو اور حکومت کی زمام کار فاسقوں اور فاجروں کے ہاتھوں سے نکل کر، ان خدا ترس انسانوں کے ہاتھوں میں آئے جو اللہ تعالیٰ کے قانون کو نافذ و برپا کر سکیں اور جو حکومت کے کاروبار میں خلافت راشدہ کی جھلک پیدا کر دیں۔

جو لوگ دین کے بارے میں بہت محدود تصور رکھتے ہیں، اور جو مسجد و خانقاہ سے آگے قدم بڑھاتے ہوئے ہچکچاتے ہیں! ان کو جماعت اسلامی کی یہ جدوجہد بہت کھٹکتی ہے اور وہ اسے سیاست بازی اور دنیاداری کا کام سمجھتے ہیں۔ مگر اُن کی اس تنگ نظری کی خاطر اسلام کی بے پناہ وسعتوں کو سکیڑا تو نہیں جاسکتا۔ ان مدعیان علم تقویٰ کے پیروں، استادوں اور بزرگوں کے طریق کار سے اگر جماعت اسلامی کا پروگرام پوری طرح مطابقت نہیں کرتا تو اس عدم مطابقت پر جماعت اسلامی کیوں متاسف ہو کہ اس کے سامنے اللہ کی کتاب ہے، اسوۂ رسول ہے، اور آثار صحابہ ہیں ———— یہ بزرگان کرام اپنے فتووں اور طنز و ملامت کے تیروں کی دین کے ان خدمت گزاروں کے دل و جگر پر شوق سے مشق کرتے رہیں، اُن کے شوق ناوک فگنی کو پورا کرنے کے لئے انشاء اللہ نئے نئے سینے اور دل و جگر انہیں ملتے رہیں گے یہاں تک کہ یہ مردان باوفا اپنے مجروح سینے اور زخمی دل و جگر لئے ہوئے اپنے رب کے حضور پہونچ جائیں گے۔ اور اس دن جس نے جو کچھ کیا ہو گا اس کا پورا پورا بدلہ اسے مل جائے گا۔

عوام مسلمانوں سے ہماری یہ گذارش ہے کہ وہ ان علماء کرام، صوفیاء عظام اور مبلغین واجب الاحترام کے فتووں اور تحریروں کو پڑھ کر کوئی رائے قائم نہ کریں، جماعت اسلامی کا لٹریچر اس کا پروگرام اور اس کے کارکنوں کی زندگیاں موجود ہیں۔ اس طرح جس طرح کسی کتاب کے اوراق کھلے ہوتے ہیں ان کو پڑھ کر پھر وہ محاکمہ فرمائیں کہ کس کا کیا موقف ہے؟ جماعت اسلامی پر وارد کئے ہوئے اعتراضات والزامات میں کس قدر صداقت ہے؟ یہ ساری جدوجہد اپنی دنیا بنانے کے لئے ہے یا اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے ہے؟ یہ سیاسی شعبدہ باز ہیں یا دین کے مخلص خدمت گزار ہیں؟ اس محاکمہ کے بعد انشاء اللہ حق واضح ہو جائے گا۔

ماہر القادری
۲۵ / جمادی الثانی ۱۳۷۷ھ

ابوالحسن بہاری رشیدی

ایک اہم تبصرہ

فقہی مسائل درایت و روایت کی روشنی میں

فقہ کے جزوی مسائل کا اختلاف ہرگز ہرگز ایسا اختلاف نہیں ہے جس کی زد دین اور اسلام پر آکر پڑتی ہو یا ان اختلافات سے معاملات و عبادات میں بگاڑ پیدا ہوتا ہو۔ ایک نمازی نماز میں زور سے آمین کہتا ہے اس کی بھی نماز ہو جاتی ہے، اور جو آہستہ "آمین" کہتا ہے اس کی نماز بھی ناقص نہیں رہتی رمضان میں تراویح کی آٹھ رکعت ادا کرنے والے پر جو کوئی "وہابیت" کی پھبتی چست کرتا ہے وہ بہت بڑی زیادتی کرتا ہے اور بیس رکعت تراویح پڑھنے والا بھی خدانخواستہ کسی بدعت و احداث کا مرتکب نہیں ہوتا۔ فقہی مسائل کے اختلافات کے کچھ حدود ہیں، ان کو انہی حدود میں رہنا اور رکھنا چاہیے۔ ان اختلافات کو تحریر و تقریر کے ذریعہ اس انداز پر ابھارنا کہ فلاں گروہ نماز میں زور سے "آمین" کہتا ہے، اس لئے اس کی نماز ہی سرے سے نہیں ہوتی اور فلاں فقہی مذہب کے مقلد نماز میں رفع یدین نہیں کرتے اس لئے ان کی نماز باطل ہو جاتی ہے ——— نہایت ہی غیر ذمہ دارانہ انداز تنقید اور اسلوب انتساب ہے۔

فقہی مذاہب کے اختلافات کی نوعیت کیا ہے؟ اس کو ہم ایک مثال کے ذریعہ واضح کرنا چاہتے ہیں، انشاء اللہ اس مثال سے بہت سی الجھنیں دور ہو جائیں گی۔

ایک آقا اپنے غلاموں کو بازار سے پھل خرید کر لانے کا حکم دیتا ہے، یہ غلام اپنے آقا کے حکم کی تعمیل میں بازار کے لئے چل پڑتے ہیں۔ کوئی سائیکل پر، کوئی ٹرام میں، کوئی پاپیادہ، کسی نے آقا کے حکم کی جلد سے جلد تعمیل کے لئے موٹر رکشا کر لیا اور فروٹ مارکیٹ میں جا پہنچا۔ جس غلام نے پیدل سفر طے کیا تھا وہ راستہ میں دوسروں سے پھلوں کے بارے میں معلومات بھی حاصل کرتا رہا کہ کون سے پھل اچھے اور سستے ہیں۔ ایک نے پھلوں کو تول کر خریدا، دوسرے نے درجن کے حساب سے پھل مول لئے۔ ان غلاموں کے سفر اور خریدنے کے انداز میں بیشک اختلاف پایا جاتا ہے۔ مگر جہاں تک آقا کے حکم کی تعمیل کا تعلق ہے اس میں تمام کے تمام غلام متحد، مشترک اور متفق ہیں۔ اور ان کے درمیان کوئی مزاحمت و نزاع نہیں ہے۔ ہاں اس کا امکان ہے کہ کسی غلام کے خریدے ہوئے پھل دوسرے غلام کے پھلوں سے زیادہ اچھے اور شاداب ہوں۔ فقہی مذاہب اور اہل حدیث کے مسلک میں بس اسی قسم کے جزوی اختلاف پائے جاتے ہیں، مقصود سب کا کتاب و سنت کا اتباع اور اللہ و رسول کے حکم کی پیروی ہے! ان میں کس مذہب کے کس مسئلہ میں ترجیحی پہلو پایا جاتا ہے اور کونسا مسئلہ کتاب و سنت سے اقرب ہے، اسے جانچنے اور پرکھنے کی آزادی ہر مسلمان کو حاصل ہے

وہ شخص جاہل اور بلید الذہن ہے جو یہ کہتا ہے:-

"مرا از حدیث چہ کار، قول ابی حنیفہ بیار"

قیامت کے دن خود حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اپنے اس قسم کے عقیدت مندوں اور تقلید کرنے والوں سے بیزاری فرمائیں گے ——— مگر

اس کے برعکس جو کوئی فقہ حنفی کو کتاب و سنت کے مقابلہ میں "قیاس و رائے" کا مذہب سمجھتا ہے وہ بھی حق کو مجروح کرتا، اور سچائی کو مشتبہ اور مشتبہ بناتا ہے۔

فقہ حنفی کے اصل، ماخذ کتاب و سنت ہی ہیں، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث، اور سنت کے اپنے دور میں کسی سے کم تر عالم، عامل اور شیدائی نہ تھے اور آپ کے شاگرد بھی سنت رسول کو اصل دین سمجھتے تھے۔ دینی مسائل میں "تفقہ" خود دین کا عین منشا ہے۔ جہاں روایات اور دلیلوں کا تعارض ہو وہاں ایک مجتہد اور عالم دین کے لئے قیاس ناگزیر ہو جاتا ہے، اور یہ "قیاس" دین کی مخالفت کے لئے نہیں بلکہ دین کی حمایت، خیر خواہی اور کتاب و سنت کے منشا کی تعمیل و تطبیق کے لئے ہی ہوتا ہے۔

کسی نا سمجھ نے خود ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں یہ طنز کی تھی کہ:۔

"قیاس تو سب سے پہلے ابلیس نے کیا تھا یعنی آتشی مخلوق کو خدا کی مخلوق پر جو شیطان نے ترجیح دی، تو یہ اس کا "قیاس" تھا؟"

اس کے جواب میں امام اعظم نے فرمایا:

"بھلے مانس! تم نے بے محل بات کہی، ابلیس نے تو خدا کا حکم ٹھکرایا تھا، یعنی اس کا قیاس اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کے لئے تھا، اور ہم ایک مسئلہ کو دوسرے پر صرف اس لئے قیاس کرتے ہیں کہ اسے قرآن، سنت یا اجماع امت کے اصول کے تابع کریں اور اسی کی کوشش کرتے ہیں اور خدا کے حکم کی پیروی چاہتے ہیں، پھر یہ اور وہ دونوں ایک کیسے ہوئے؟"

اس اعتراف کے بعد ہم کسی تشابہ و ابہام کے بغیر صاف لفظوں میں اس کا بھی اظہار ضروری سمجھتے ہیں کہ فقہ حنفی کی جتنی بھی کتابیں پائی جاتی ہیں ان کا ایک ایک حرف اور شوشہ عین حق و صواب نہیں ہے بعض مسائل میں کمزوریاں بھی پائی جاتی ہیں اور قیاس و رائے میں آئمہ سے غلطیاں بھی ہوئی ہیں، مجموعی طور پر فقہ حنفی "کتاب و سنت" ہی کا ترجمان، نمائندہ، مفسر، شارح اور تابعدار ہے! ابو حنیفہ اللہ تعالیٰ کی ان پر رحمتیں ہوں، دینی مسائل کے بہت بڑے جاننے والے اور امام و مجتہد تھے مگر شارع و مطاع نہ تھے، اس لئے ان کی کسی رائے، قیاس یا مستنبط کئے ہوئے مسئلہ سے اختلاف نہ کفر ہے نہ گناہ ہے اور نہ اس سے دین و ایمان میں خرابی پیدا ہوتی ہے۔ حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ جب صحابہ کرام کے اقوال میں ایک صحابی کے قول کو دوسرے صحابی کے قول پر ترجیح دینے کا حق رکھتے تھے تو دوسرے اہل علم بھی ائمہ فقہ کے اقوال، آراء اور مسائل و نظائر میں ایک کو دوسرے پر ترجیح دے سکتے ہیں۔

اب رہا "تقلید" کا مسئلہ تو یہ وہ "اعتماد" ہے جو فقہ کے کسی امام پر کیا جاتا ہے اس یقین کے ساتھ کہ ان امام نے کتاب و سنت اور اجماع صحابہ کی بنیاد پر ہی مسائل فقہ کو مدون و منضبط کیا ہے! دینی مسائل میں اس "اعتماد" (تقلید) سے مفر نہیں، اور دین ہی پر کیا منحصر ہے، دنیا کا کوئی کام بھی "اعتماد" کے بغیر نہیں چل سکتا، ورکشاپ، کسی اسٹیج میں آدمی کسی اہل فن اور واقف کار کا مقلد ضرور ہوتا ہے۔ مگر ائمہ فقہ کی یہ تقلید اتباع رسول کا درجہ ہرگز نہیں رکھتی کسی فقیہ امام کے دائرۂ تقلید سے کوئی باہر بھی ہو جائے تو وہ "دین" سے باہر نہیں ہوتا۔ مگر اتباع رسول کے دائرے سے باہر ہونا دین سے باہر ہونا ہے "اتباع" و "تقلید" کے اس فرق و امتیاز کو جو کوئی ملحوظ رکھے گا وہ "تقلید" کے "وجوب و ترک" کی انتہاؤں میں الجھنے سے محفوظ رہے گا۔

فقہی اختلافات کا سبب ذکر چھڑ گیا تو ایک مسئلہ جو نزاع و اختلاف کی شدت کے سبب خاصہ ہنگامہ خیز اور معرکہ آرا بن گیا ہے اس پر ہم روشنی ڈالنا چاہتے ہیں ——— یہ ہے نماز میں امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے کا مسئلہ!

بے شک حضور کا یہ ارشاد صحیح ہے کہ "سورۂ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی" یقیناً نماز کی کوئی رکعت بھی سورۂ فاتحہ سے خالی نہیں ہونی چاہئے احناف اسی حکم کی تعمیل میں نوافل و سنن میں فرداً فرداً سورۂ فاتحہ پڑھتے ہیں، اب رہا باجماعت نماز کا مسئلہ تو اس کی نوعیت ان نمازوں کی طرح نہیں ہے جو جماعت سے نہیں پڑھی جاتیں۔

جماعت میں مقتدی امام کی پیروی کرتے ہیں، امام کے سہو کا مقتدیوں کی نماز پر اثر پڑتا ہے، امام سجدۂ سہو کرتا ہے تو وہ "سہو" اگرچہ

مقتدیوں سے سرزد نہیں ہوتا۔ مگر مقتدیوں کو بھی امام کی پیروی میں سجدہ سہو کرنا پڑتا ہے ——— تو باجماعت نماز جس میں امام کے "فعل و عمل" کا مقتدیوں سے خاص تعلق ہے "سورہ فاتحہ" سے خالی نہیں ہوتی۔ امام باجماعت نماز میں سورہ فاتحہ جہراً یا سراً تلاوت ضرور کرتا ہے۔ اس لئے احناف کی "نماز باجماعت" پر "فاتحۃ الکتاب" سے خالی و عاری ہونے کا حکم نہیں لگایا جاسکتا۔

اس مسئلہ پر تین مسلک ہیں ——— امام کے پیچھے مقتدیوں کا سورۂ فاتحہ پڑھنا ——— امام کے پیچھے مقتدیوں کا سورۂ فاتحہ نہ پڑھنا اور امام کی تلاوت فاتحہ کو کافی سمجھنا ——— امام جب جہر سے تلاوت کرے تو خاموش رہنا، مگر جن رکعتوں میں امام جہر سے تلاوت نہ کرے ان میں مقتدیوں کا سورہ فاتحہ پڑھنا ——— ان تینوں مسلکوں میں سے جو مسلک بھی اختیار کیا جائے گا "نماز" ہو جائے گی۔

مولانا محمد صادق سیالکوٹی نے کئی سال ہوئے اپنی کتاب[1] "سبیل رسول" ہمارے یہاں تبصرے کے لئے بھیجی تھی، اس کتاب میں بعض ایسے اختلافی مسائل ہیں جن پر اظہار رائے کے لئے بڑی عالمانہ تحقیق کی ضرورت محسوس کی گئی۔ ہم اس کتاب پر تبصرہ کرنے میں بہت متامل تھے۔ مولانا موصوف نے کئی خطوں کے ذریعہ تبصرہ کے لئے اصرار فرمایا۔

اس کتاب پر

ایک عالم دین نے بڑی تحقیق و کاوش کے ساتھ تبصرہ فرمایا ہے، اور کوئی شک نہیں بعض مقامات پر

می‌توان داد بہ شمشیر جواب شمشیر

کا رنگ پیدا ہو گیا ہے، بحث و مناظرہ میں تندی و تلخی سے دامن بچانا بہت مشکل ہے۔ اس تبصرے میں حنفی مسلک کی پرجوش و مدلل حمایت اور مدافعت کی گئی ہے۔ (م۔ق)

مؤلف صاحب متشدد غیر مقلد ہیں اور انھوں نے یہ کتاب "تقلید ائمہ مجتہدین" کے رد و ابطال کی غرض سے تصنیف فرمائی ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف محترم کی نظر میں "سبیل الرسول" پر گامزن ہونے میں اگر کوئی چیز مانع ہے تو وہ یہی اتباع و تقلید ائمہ ہے اس لئے اگر اس فتنہ کا پورے طور پر قلع قمع کر دیا گیا تو پھر راستے کے تمام روڑے خود بخود صاف ہوتے چلے جائیں گے اور یہ ایسا شاندار کارنامہ ہوگا کہ جس کی بدولت اسلام تمام داخلی و خارجی حملوں سے بالکل محفوظ ہو جائے گا۔ یہ ٹھیک وہی انداز فکر ہے جو ہمارے دوسرے مصلحین (منکرین حدیث) کا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ منکرین حدیث کے خیال میں اس وقت کا سب سے بڑا فتنہ اتباع حدیث ہے اور منکرین فقہ کی رائے میں اتباع مجتہدین۔ غنیمت ہے کہ ملت کے ان نبض شناسوں نے صحیح وقت پر مرض کی تشخیص کر لی۔ اور فوراً ہی اس کے تدارک و علاج میں مصروف ہو گئے ورنہ خدا جانے اگر ذرا دیر ہو جاتی تو ملت کا یہ مرد بیمار کس گھڑی دم توڑ دیتا۔

مؤلف نے "سبیل الرسول" میں پہلے تو اتباع سنت کے متعلق آیات و احادیث کا ذکر کیا ہے پھر بعض بدعات مروجہ گور پرستی وغیرہ کی تردید کی ہے پھر اچانک قلم اپنے اصل موضوع کی طرف پھر جاتا ہے اور تقلید کی برائی شروع ہو جاتی ہے اور مذہب حنفی کو خاص طور پر نشانۂ طعن و ملامت بنایا جاتا ہے۔ ازاں بعد اہل حدیث کی تعریف اور ان کی تاریخ کا بیان ہے اور آخر میں مقلدین ائمہ پر ان آیات و احادیث کو چسپاں کر کے جو یہود و مشرکین کے متعلق ہیں کتاب کو ختم کر دیا ہے۔ یوں تو مؤلف تمام ائمہ اربعہ کے مقلدین کو اہل حق سے خارج سمجھتے ہیں،

---

[1] یہ کتاب ناشر دائرۃ التبلیغ پورہ ہیراں سیالکوٹ شہر سے مل سکتی ہے۔

چنانچہ ارشاد ہے :-

"حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی مقلدین اہل سنت نہیں، اہل سنت وہ ہیں جو بغیر کسی واسطے کے سیدھا قرآن و سنت کے مطابق عمل کرنے والے ہیں۔" ص ۱۵۶

"حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی وغیرہ ہونا دین کی چیزیں نہیں ہیں اور نہ یہ مذاہب ہیں۔" ص ۲۶۵

لیکن حنفیوں پر آپ کی خاص نظر عنایت ہے فرماتے ہیں :-

"اور یہ بات قطعاً غلط ہے کہ مقلد حنفی اہل سنت والجماعت ہیں کہ تقلید کو سنت سے کوئی واسطہ نہیں۔" ص ۱۲۷

اتنا ہی نہیں بلکہ ان کے بارے میں مولف نے اپنی خاص الخاص تحقیقات سے بہت سی ایسی حقیقتوں کو واشگاف کیا ہے کہ جن کا سرے سے آج تک کسی کو پتہ ہی نہ تھا۔ مثلاً :-

"حنفی ہیں کہ نہ خدا کو مانیں، نہ رسول پاک کے ارشاد پر عمل کریں اور نہ امام ابوحنیفہؒ کے کہنے پر چلیں، مانتے ہیں تو صرف اپنے نفس کی یعنی تقلید شخصی کہتے ہیں جس کا نہ خدا نے حکم دیا ہے نہ رسول خدا نے اور نہ امام ابوحنیفہ نے اور پھر فخر سے کہتے ہیں ہم اہل سنت ہیں اور اہل سنت ہونے کے دعوی کا ثبوت یہ دیتے ہیں کہ سنت کے مقابلہ میں امام کے قول پر عمل کرتے ہیں اور سنت کو چھوڑ دیتے ہیں۔" ص ۱۵۲، ۱۵۵

"حضرت امام ابوحنیفہؒ نے ہرگز نہیں فرمایا کہ میری تقلید کرو۔ بلا دلیل میرے قول مانو ...... لیکن یار لوگوں نے آپ کی تقلید کی زنجیر بنا کر لٹکا دی اور خواہ مخواہ حضرت امام ابوحنیفہ کے ہاتھ میں فرضی طور پر پکڑا رکھی ہے۔ بے شمار مسائل خود گھڑ کر امام صاحب کے ذمہ لگا دیئے ہیں اور ان کا ماننا اور عمل میں لانا مقلدوں پر ضروری قرار دے دیا ہے۔" ص ۶۲

"اور یہ جو فقہ کے اندر بے شمار مسائل و احکام حدیث کے صریح خلاف ہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرت امام صاحب کے ذہن میں بعد کے لوگوں کے گھڑے ہوئے ہیں اور جبراً قہراً امام صاحب کے سر منڈھ دیئے ہیں۔" ص ۲۳۹

"حدیث کے خلاف بے شمار مسائل ..... امام صاحب کے ذمہ لگا دیئے ہیں۔"

ع سالہا در صبا ایں ہمہ آوردہ است" ص ۲۰۸

مولف کے نزدیک حنفی مذہب ..... کی گھڑت ہے فرماتے ہیں۔

"..... کے اندر ایک حنفی مذہب گھڑ دیا گیا ہے۔" ص ۲۰۱

"..... جس ..... امام صاحب ..... تھے وہی کام لوگوں نے کر دکھایا ان کے نام سے حنفی مذہب گھڑ ہی لیا۔ فقہ کا طومار بنا کر ان کے ذمہ لگا ہی دیا۔" ص ۲۴۳

اس دعوی کی دلیل ملاحظہ ہو :-

"فقہ حنفیہ کی کتابیں امام صاحب نے ہرگز نہیں لکھیں۔ صدہا سال بعد میں لکھی گئی ہیں ان کے مندرجات کو زبردستی امام صاحب کے ذمہ لگا دیا گیا ہے۔ حضرت امام صاحب ۸۰ ہجری میں پیدا ہوئے اور ۷۰ سال کی عمر پا کر ۱۵۰ ہجری میں وفات پا گئے اب فقہ کی کتابوں کی تصنیف کا زمانہ ملاحظہ ہو :-

قدوری۔ پانچویں صدی میں لکھی گئی یعنی امام صاحب سے تین سو سال بعد۔

ہدایہ :- چھٹی صدی میں لکھی گئی یعنی امام صاحب سے چار سو سال بعد۔

سنت کو حنفی جو حکیم مولانا محمد صادق کے اس پر حکمت و صداقت بیان پر کہیں انگلی رکھ سکے دفجزاہ اللہ علی ما قال)

منیہ۔ ساتویں صدی میں لکھی گئی یعنی امام صاحب سے پانچسو سال بعد
طحاوی۔ شرح وقایہ، نہایہ، کنز، جامع الرموز آٹھویں صدی میں تصنیف ہوئی یعنی امام صاحب سے چھ سو سال بعد
فتاوی بزازیہ، فتح القدیر، خلاصہ کیدانی نویں صدی میں یعنی امام صاحب سے سات سو سال بعد۔ چلپی بحرالرائق، غنیہ تنویر الابصار ذخیرۃ العقبیٰ دسویں صدی میں ظہور میں آئی یعنی امام صاحب سے آٹھ سو سال بعد درمختار گیارھویں صدی میں تیار ہوئی یعنی امام صاحب سے نوسو سال بعد۔ فتاوی عالمگیری بارھویں صدی میں لکھی گئی۔ یعنی امام صاحب سے ہزار سال بعد۔ ان فقہ کی کتابوں میں سب مسائل امام ابوحنیفہؒ کی طرف منسوب کئے گئے ہیں اور سند کوئی نہیں۔ ان بے سند مسائل کو امام صاحب کے ذمہ لگا کر مقلدوں کو حکم دیا جاتا ہے:۔

؎ فلعنۃ ربنا اعداد رمل　٭　علیٰ من رد قول ابی حنیفہ　(شامی)

"ریت کے ذرے جتنی لعنتیں ہوں اس پر جو امام ابوحنیفہ کے قول کو نہ مانے" ص ۱۶۴ و ۱۶۵

سب سے زیادہ غصہ مؤلف نے ہدایہ پر اتارا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"ہدایہ کے لکھنے پڑھنے والے مقلدوں نے ہی حضرت امام ابوحنیفہ کی طرف یہ قول منسوب کئے ہیں" ص ۲۰۹ حاشیہ۔

مزید تفصیل ملاحظہ ہو:۔

"جس طرح قرآن کے بعد صحیح الکتب صحیح بخاری مسلمہ ہے اسی طرح احناف میں قرآن کے بعد ہدایہ کا درجہ ہے[1] اور ہدایہ کے خلاف حدیث احکام امام ابوحنیفہ کے ذمہ لگائے گئے ہیں۔

حالانکہ ہدایہ امام صاحب سے صدیوں بعد لکھی گئی ہے۔۔۔۔۔۔ اس ہدایہ میں کوئی سلسلہ روایت نہیں ہے کہ فلاں مسئلہ جو حضرت امام صاحب کے ذمہ لگایا گیا ہے اس کا ثبوت کیا ہے بس یونہی منڈھ دیا گیا ہے[2]" ص ۲۲۰ و ۲۲۱

کاش مؤلف کی یہ نرالی تحقیق جس سے امت کے اگلے پچھلے سارے علماء یکسر بے خبر رہے تیسری صدی کے اوائل میں ظاہر ہوئی ہوتی تو امام بخاری کے استاد حافظ ابوبکر بن ابی شیبہ کو اپنی مشہور کتاب مصنف ابن ابی شیبہ میں کتاب الرد علی ابی حنیفہ لکھ کر امام ممدوح کی تردید میں صفحہ کے صفحہ سیاہ کرنے کی ضرورت نہ پیش آتی اور انہیں بآسانی معلوم ہو جاتا کہ جن اقوال کو وہ "قال ابوحنیفہ" کہہ کر بیان کر رہے ہیں وہ سب جعلی اور محض گڑھے ہوئے ہیں۔ اور ان کا انتساب امام موصوف کی طرف کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ تعجب ہے کہ ہندوستان کے ایک مشہور اہل حدیث عالم نے بھی یہ غلطی کی کہ مصنف کے اس باب کا اردو ترجمہ مع متن کے چھاپ دیا مگر غریب کی سمجھ میں اتنی بات نہیں آئی کہ ابن شیبہ نے امام صاحب کی طرف جن اقوال کی نسبت کی ہے وہ جعلی ہیں۔

اسی طرح علامہ ابن تیمیہ کو یہ بالکل معلوم نہ ہو سکا کہ:۔

"قدوری پانچویں صدی میں لکھی گئی ہے یعنی امام صاحب کے تین سو سال بعد، اور اس کے مندرجات کو زبردستی امام صاحب کے ذمہ لگا دیا گیا ہے"

---

[1] یہ محض غلط ہے کسی حنفی عالم نے ہدایہ کے بارے میں ایسی تصریح نہیں کی۔ البتہ مؤلف نے محض یہ دیکھ کر کہ "بخاری شریف کی بہت سی حدیثوں کو ہدایہ کے مسائل کے مقابلہ میں چھوڑ دیا گیا" ص ۲۰۰

[2] یہ تجزیہ درست ہے لیکن یہ مؤلف کو بڑی خوش فہمی ہے کہ مذاہب اربعہ میں سے کسی مذہب میں بھی بخاری کی تمام روایات پر عمل در آمد نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ قرآن کے بعد نہ بخاری کا درجہ ہے نہ ہدایہ کا بلکہ احادیث متواترہ و مشہورہ کا درجہ ہے خواہ وہ بخاری میں ہوں یا حدیث کی کسی دوسری کتاب میں متواتر یا مشہور طریقے پر۔ (مدیر)

ورنہ وہ اس کے مندرجہ مسائل کو صحت واستناد کے اعتبار سے روایات صحیحین کے ہم پلہ قرار دیتے چنانچہ علامہ ممدوح اپنی مشہور کتاب منہاج السنۃ میں روایات صحیحین کی صحت کو ثابت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

ومثل ھذا اغالب المسائل التی توجد فی الکتب المصنفۃ فی مذھب الائمۃ مثل القدوری والتنبیہ والجونی والجلاب غالب ما فیھا اذا قیل ذکرہ فلان علم انہٗ مذھب ذالک الامام وقد نقل ذالک سائر اصحابہ وھم خلق کثیر یعتقدین مذھبہ بالتواتر۔

اور اسی طرح (یعنی روایات صحیحین کی طرح) بیشتر وہ مسائل ہیں کہ جو ان کتابوں میں پائے جاتے ہیں کہ جو مذاہب ائمہ میں تصنیف ہوئی ہیں جیسے کہ قدوری اور تنبیہ اور جوزنی اور جلاب ہیں کہ عام طور پر جب ان کتابوں کے مذکورہ مسائل کے بابت ان میں سے کسی کا حوالہ دیا جاتا ہے تو فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ فلاں امام کا مذہب ہے اور اس کو امام کے تمام اصحاب نے نقل کیا ہے ۔۔ یعنی ایک خلقت نے کہ جو اپنے امام کے مذہب کو تواتر کے ساتھ نقل کرتی چلی آرہی ہے۔

مولف کی جرأت ملاحظہ کیجئے کہ قدوری سے پہلے فقہ کی کسی کتاب کا ان کو پتہ نہیں۔ مگر بایں ہمہ تمام کتب فقہ حنفی کے بارے میں یہ عام حکم لگایا ہے ہیں کہ :۔

"فقہ کے تمام دفاتر امام صاحب کی طرف منسوب ہیں اور سب بلا دلیل ہیں" ص ۲۳۴

حالانکہ مولف نے فقہ حنفی کی جن کتابوں کا ذکر کیا ہے اس میں متعدد کتابیں ایسی بھی ہیں کہ جس میں ہر مسئلہ کے ساتھ اس کی عقلی و نقلی دلیل بھی دی گئی ہے۔ جیسے ہدایہ و اس کی شرح فتح القدیر، اسی طرح بحر الرائق اور شامی وغیرہ میں بھی جابجا بہت سے مسائل کے دلائل بیان کر دیئے گئے ہیں۔

اسی طرح یہ بھی مولف کی ایک خاص نوعی تحقیق ہے کہ قدوری تو آٹھویں صدی میں تصنیف ہوئی ہے یعنی امام صاحب سے چھ سو سال بعد اور در مختار گیارھویں صدی میں تیار ہوئی یعنی امام صاحب سے نو سو سال بعد، حالانکہ سب جانتے ہیں کہ قدوری، در مختار کی مشہور شرح ہے مگر مولف کی تحقیق اس بارے میں یہ ہے کہ شرح متن سے دو سو سال پہلے تصنیف ہو چکی ہے۔

منیہ جس کے بارے میں مولف نے لکھا ہے کہ ساتویں صدی میں لکھی گئی۔ معلوم نہیں اس سے کون سی کتب مراد ہے اور اس کا مصنف کس عہد کا ہے۔

جامع الرموز کے متعلق لکھا ہے کہ وہ آٹھویں صدی میں لکھی گئی حالانکہ مصنف نے اپنی اس تالیف کا سنہ فراغ سنہ ۹۴۱ھ یعنی دسویں صدی لکھا ہے (کشف الظنون)

خلاصہ کیدانی کے مصنف کا صحیح طور پر پتہ نہیں کہ وہ کون ہے اس لئے اس کے زمانہ تصنیف کا حال بھی معلوم نہیں۔ یہ بھی واضح ہو کہ جامع الرموز اور خلاصہ کیدانی کا شمار حنفیہ کے نزدیک معتبر کتابوں میں نہیں ہے (ملاحظہ ہو مقدمہ عمدۃ الرعایہ از مولانا عبدالحی لکھنوی فرنگی محلی)

چلپی اور ذخیرۃ العقبیٰ کو مولف نے دو کتابیں شمار کیا ہے حالانکہ چلپی کتاب کا نام نہیں خود ذخیرۃ العقبیٰ کا مصنف ہے۔

۱؎ ان تمام تصریحات کے باوجود حضرت مولف ان ائمہ مصنفین کی خدمت میں اپنا ہدیہ عقیدت اس طرح پیش فرماتے ہیں "حاشا وکلا ہمیں کتب فقہ یا ان کے مصنفین و مجتہدین کے ساتھ کوئی بغض و عناد نہیں۔ ہم ائمہ دین کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان کے لئے خدا سے رحمتیں مانگتے ہیں۔" ص ۱۴۳ (بے شک بے شک)

قنیہ نام کی فقہ حنفی میں متعدد کتابیں ہیں معلوم نہیں مولف کس کتاب کا ذکر کر رہے ہیں۔

کیا امام ابوحنیفہ نے کوئی تصنیف نہیں کی

اور یہ جو مولف نے لکھا ہے کہ "فقہ حنفیہ کی کتابیں امام صاحب نے ہرگز نہیں لکھیں" اس کے بارے میں مولف نے آگے چل کر یہ تفصیل سپرد قلم فرمائی ہے۔

"امام صاحب پر خدا کی بے شمار رحمتیں ہوں۔ (آمین) کہ انھوں نے اس ڈر سے کوئی کتاب نہیں لکھی، کوئی تصنیف نہیں چھوڑی کہ لوگ ان کا مذہب نہ بنالیں ان کے نام سے کوئی فرقہ پیدا نہ کرلیں۔ چنانچہ امام رازی نے مناقب الشافعی میں لکھا ہے "امام صاحب کی کوئی تصنیف نہیں" مولانا شبلی سیرۃ النعمان میں تحریر فرماتے ہیں "انصاف یہ ہے کہ ان تصنیفات کو امام صاحب کی طرف منسوب کرنا نہایت مشکل ہے۔" (ص ۲۳ درق ۲۴)

ناظرین ذرا مولف کے ان دونوں کا حوالوں کا بھی جائزہ لے لیں۔

سیرۃ النعمان کی اصل عبارت حسب ذیل ہے۔

"جو لوگ امام صاحب کے سلسلہ کمالات میں تصنیف و تالیف کا بھی وجود ضروری سمجھتے ہیں وہ انہی مفصلہ بالا کتابوں کی شہادت میں پیش کرتے ہیں، لیکن انصاف یہ ہے کہ ان تصنیفات کو امام صاحب کی طرف منسوب کرنا نہایت مشکل ہے۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ امام صاحب کی زندگی میں ایک مجموعہ فقہ مرتب ہوگیا تھا جس کے حوالے عقود الجمان وغیرہ میں جابجا ملتے ہیں لیکن قیاس غالب ہے کہ وہ نسخہ معدوم ہوگیا اس زمانہ کی ہزاروں تصنیفات کے نام تراجم کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ لیکن دو تین کے سوا ایک کا بھی دنیا کے کسی کتب خانہ میں پتہ نہیں چلتا خود امام صاحب کے ہم عصروں میں سے سفیان ثوری، امام اوزاعی، حماد بن سلمہ ہشیم، معمر، جریر بن عبدالحمید، عبداللہ بن المبارک نے حدیث و فقہ میں بڑی بڑی کتابیں لکھیں۔ لیکن آج ان کا نام ہی نام رہ گیا ہے اور ایک کا بھی وجود نہیں۔ امام رازی نے مناقب الشافعی میں تصریح کی ہے کہ امام ابوحنیفہ کی کوئی تصنیف باقی نہیں رہی"۔

بحث اس میں ہے کہ امام صاحب نے فقہ میں کوئی تصنیف چھوڑی یا نہیں، یہ علیحدہ بات ہے کہ آج ان کی کوئی کتاب موجود ہے یا نہیں اب ناظرین خط کشیدہ الفاظ پر دوبارہ غور فرمائیں اور مولف نے اس سلسلہ میں جو تحقیق فرمائی ہے اس کی داد دیں یہ بھی مولف کا کمال ہے کہ انھوں نے اپنے دعوے کے ثبوت میں امام رازی کی مناقب الشافعی کا جو حوالہ سیرۃ النعمان سے نقل کیا اس میں سے صرف لفظ "باقی" نکال کر باقی عبارت بعینہٖ نقل فرمادی اور مولانا شبلی کی اس پوری عبارت میں سے صرف ان الفاظ کے نقل پر اکتفا کی کہ "ان تصنیفات کو امام صاحب کی طرف منسوب کرنا نہایت مشکل ہے" اب یہ بھی معلوم کیجئے کہ وہ کون سی کتابیں ہیں جن کو امام صاحب کی طرف منسوب کرنا مولانا شبلی کی نظر میں نہایت مشکل معلوم ہوتا ہے سنئے وہ مولانا شبلی ہی کے الفاظ میں یہ ہیں[1]:۔

"امام صاحب کی طرف جو کتابیں منسوب ہیں وہ یہ ہیں، فقہ اکبر، العالم والمتعلم، مسند" (سیرۃ النعمان) ان تینوں میں سے کوئی کتاب فقہ کی نہیں ہے۔ فقہ اکبر اور العالم والمتعلم تو علم عقائد میں دو رسالے ہیں اور مسند کا تعلق علم حدیث سے ہے۔

مولانا شبلی نے امام صاحب کے مرتب کردہ جس "مجموعہ فقہ" کا ذکر کیا ہے اس کی تفصیل بھی مولانا شبلی ہی کی زبانی سننا بہتر ہے فرماتے ہیں:۔

"اس مجموعہ کی ترتیب جیسا کہ حافظ ابوالمحاسن نے بیان کی ہے یہ تھی۔ اول باب الطہارہ، باب الصلوٰۃ، باب الصوم پھر عبادات کے اور ابواب، اس کے بعد معاملات سب کے اخیر میں باب المیراث۔

امام صاحب کی زندگی ہی میں اس مجموعہ نے وہ حسن قبول حاصل کیا کہ اس وقت کے حالات کے لحاظ سے مشکل سے قیاس میں آسکتا ہے جس قدر اس کے اجزاء تیار ہوتے جاتے تھے ساتھ ہی ساتھ ملک میں اس کی اشاعت ہوتی جاتی تھی۔ امام صاحب کی درسگاہ

[1] اس وقت اس سے بحث نہیں ہے کہ مولانا شبلی نے ان تینوں کتابوں کے بارے میں جس رائے کا اظہار کیا ہے وہ کس قدر صحیح ہے۔

ایک قانونی مدرسہ تھا جس کے طلباء نہایت کثرت سے ملکی عہدوں پر مامور ہوتے اور انکی آئین حکومت کا دستور العمل یہی مجموعہ تھا"

امام ابو یوسف اور امام محمد کی تالیفات میں سے جو کتابیں اب تک چھپ کر شائع ہو چکی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:۔

تصنیفات امام ابو یوسف

۱۔ کتاب الآثار	اس کتاب کو مجلس احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآباد دکن نے شائع کیا ہے۔
۲۔ اختلاف ابی حنیفہ و ابن لیلی	ایضاً
۳۔ الرد علی سیر الاوزاعی	ایضاً
۴۔ کتاب الخراج	یہ مصر میں مکرر طبع ہو چکی ہے۔

تصنیفات امام محمد

۱۔ الجامع الکبیر	اس کو مجلس احیاء المعارف النعمانیہ نے شائع کیا ہے۔
۲۔ کتاب الحج	لکھنؤ سے طبع ہو کر شائع ہوئی ہے۔
۳۔ موطا	بارہا ہندوستان میں طبع ہو چکی ہے۔
۴۔ کتاب الآثار	ایضاً
۵۔ الجامع الصغیر	مصر اور ہندوستان دونوں جگہ طبع ہو چکی ہے۔
۶۔ کتاب الامالی	دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن سے شائع ہوئی ہے۔
۷۔ السیر الکبیر	یہ اپنی شرح کے ساتھ جو شمس الائمہ سرخسی کی تصنیف ہے دائرۃ المعارف سے شائع ہوا ہے۔

مگر کیا کیا جائے بیچارے مولف ابھی تک اسی مغالطہ میں ہیں کہ فقہ حنفی میں قدوری سے پہلے دنیا میں کوئی کتاب بھی نہیں لکھی گئی۔

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا　　　لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

اور یہ جو مولف نے لکھا ہے کہ:۔

"ان فقہ کی کتابوں میں سب مسائل امام ابو حنیفہ کی طرف منسوب کیے گئے ہیں اور سند کوئی نہیں، ان بے سند مسائل کو امام صاحب کے ذمہ لگا کر مقلدوں کو حکم دیا جاتا ہے ۔

فلعنتہ ربنا اعداد رمل　　　علی من رد قول ابی حنیفہ　　　(شامی)

ریت کے ذرے جتنی لعنتیں ہوں اس پر جو امام ابو حنیفہ کے قول کو نہ مانے۔ ص ۱۶۴ و ۱۶۵

صحیح نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان فقہ کی کتابوں میں جو مسائل جس امام سے مروی ہیں وہ اسی امام کی طرف منسوب ہیں۔ جس کا جی چاہے ان کتابوں کو اٹھا کر دیکھ لے۔ یہ بھی غلط ہے کہ بے سند مسائل امام صاحب کے ذمہ لگا دیئے ہیں بلکہ جو مسائل امام صاحب سے انکے شاگردوں نے اپنی کتاب میں نقل کئے ہیں وہی ان کتابوں میں مذکور ہیں اور کوئی بھی حنفی عالم ان مسائل کو سن کر اس شعر کو نہیں پڑھتا۔ یہ شعر بھی در مختار میں امام صاحب کے مناقب کے ضمن میں مذکور ہے مسائل کے سلسلہ میں اس کا کسی نے تذکرہ نہیں کیا ہے اور اس شعر کا مصداق بھی وہ لوگ نہیں ہیں کہ جو امام ابو حنیفہ کے اجتہادی مسائل کو صحیح تسلیم نہیں کرتے بلکہ وہ لوگ ہیں جو امام صاحب کے بیان کردہ مسائل شرعیہ کی تحقیر کرتے ہیں۔ افسوس ہے مولف نے شامی کے حوالے سے اس شعر کو تو نقل کر دیا مگر اس کا محمل جو شامی نے بیان کیا تھا

نہیں لکھا سنیئے علامہ شامی کیا فرماتے ہیں :۔

قولہ علی من رد قول ابی حنیفہ' ای علی من رد ماقالہ من الاحکام الشرعیۃ محتقراً لہا فان ذلک موجب للطرد و الابعاد لا لمجرد الطعن فی الاستدلال لان الائمۃ لم یزل یرد بعضہم قول بعض۔

مصرعہ علی من رد قول ابی حنیفۃ کا مطلب یہ ہے کہ جس نے امام ابوحنیفہ کے بیان کردہ احکام شرعیہ کو حقارت کے طور پر رد کر ڈالا کیونکہ یہ حرکت پھٹکار اور لعنت کی موجب ہے، در مجرد امام صاحب کے استدلال پر نکتہ چینی مراد نہیں کیونکہ ائمہ برابر ایک دوسرے کے قول پر تنقید کرتے چلے آئے ہیں۔

مولف اس شعر پر تو بڑے برہم ہیں اور وہ اسے فقہا کا سنگین جرم شمار کرتے ہیں۔ مگر انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ امام بخاری کے تلامذہ کا طرز عمل بھی کچھ اس سے مختلف نہ تھا چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب التہذیب میں امام بخاری کے شاگرد محدث بو عمر وخفاف کی نسبت نقل کیا ہے کہ انھوں نے امام بخاری سے حدیث نقل کی تو روایت کا آغاز ان لفظوں سے کیا۔

حدثنا التقی النقی العالم الذی لم ار مثلہ محمد بن اسمعیل وھو اعلم بالحدیث من اسحاق واحمد بعشرین درجۃ ومن قال فیہ شیئاً فعلیہ مني الف لعنۃ۔

ہم سے محمد بن اسماعیل نے حدیث بیان کی جو ایسے متقی اور پاکباز تھے کہ ان کی نظیر میری نظر سے نہیں گزری۔ اور جو امام اسحاق بن راہویہ اور امام احمد بن حنبل سے بیس درجہ زیادہ حدیث کے عالم تھے جو شخص بھی ان کے بارے میں اپنی زبان سے کچھ کہے اس پر میری طرف سے ہزار لعنتیں۔

اب ظاہر ہے کہ خفاف کی ان لعنتوں کا مستحق وہی شخص ہے کہ جو امام بخاری کے متعلق از راہ بغض و عناد اپنی زبان کھولے نہ کہ وہ حضرات جنھوں نے دیانت داری کے ساتھ امام بخاری سے علمی اختلاف کیا ہے جیسے امام مسلم نے مقدمہ صحیح مسلم میں یا محدث ابن ابی حاتم نے ایک مستقل تالیف میں امام بخاری کے تاریخی اوہام کو جمع کر دیا ہے وہ اس لعنت کے مستحق ہرگز نہیں ہو سکتے۔

مؤلف کو غالباً معلوم نہیں، کہ یہ شعر قدوری یا ان کے بعد کے کسی عالم کا نہیں ہے بلکہ امت مسلمہ کے مشہور امام عبداللہ بن المبارک رحمۃ اللہ علیہ متوفی سنہ ... ہے جن کا ذکر محدث نووی نے تہذیب الاسماء واللغات میں ان لفظوں سے کیا ہے " وہ امام جس کی امامت و جلالت پر ہر باب میں اجماع کیا گیا ہے جس کے ذکر سے خدا کی رحمت نازل ہوتی ہے جس کی محبت سے مغفرت کی امید کی جاتی ہے " یہ بھی ظاہر ہے کہ ایسے شعر اتنے بڑے امام کی طبیعت سے اسی وقت موزوں ہو سکتا ہے کہ جب ان کے دل کو کوئی سخت صدمہ پہنچا ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ امام ابن مبارک امام ابوحنیفہ کے مشہور شاگردوں میں سے ہیں اور ان کو جو بڑے بڑے کمالات حاصل تھے ان میں امام ابوحنیفہ کے فیض صحبت کو بہت بڑا دخل تھا۔ وہ خود کہا کرتے تھے کہ لولا ان اللہ تعالیٰ اغاثنی بابی حنیفۃ و سفیان کنت کسائر الناس [۱] یعنی اگر اللہ تعالیٰ نے امام ابوحنیفہ اور سفیان ثوری کے ذریعہ سے میری دستگیری نہ کی ہوتی تو میں ایک عام آدمی سے بڑھ کر نہ ہوتا۔ اتفاق کی بات کہ امام موصوف کے زمانہ میں ان کے وطن مرو میں ایک تند مزاج اہل حدیث پیدا ہوا جس کا نام قاسم بن محمد بن خزیمہ تھا اس شخص کو امام ابوحنیفہ سے نا... کد تھی یہ نہایت نامعقول بے ہدایت اور زبان دراز شخص تھا۔ اہل سنت کے مذہب کی تائید میں حدیثیں گھڑتا اور امام ابوحنیفہ کی منقبت میں جعلی حکایتیں بناتا ... کی زندگی کا نہایت محبوب مشغلہ تھا۔ چنانچہ منذری نے اپنی مشہور کتاب ترغیب و ترہیب کے ... میں حافظ ذہبی کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔

---

[۱] تہذیب التہذیب ... بغداد

كان نعيم يضع الحديث فى تقوية السنة وحكايات مزورة فى ثلب النعمان۔

نعیم سنت کی تائید میں حدیثیں گھڑ دیتا۔ اور نعمان (یعنی امام ابو حنیفہ) کی برائی میں جھوٹی حکایتیں بنایا کرتا تھا۔

اب خود خیال فرمائیں کہ نعیم کی ان حرکتوں سے ہمارے نیکدل امام عبداللہ بن مبارک کے قلب پر کیا گزرتی ہوگی یہی وجہ ہے کہ جب امام موصوف نے اپنے استاد امام ابو حنیفہ کی منقبت میں نظم لکھی تو نعیم پر آپ کا غصہ اس شعر کی صورت میں ظاہر ہوا۔

نعیم نے امام ابو حنیفہ کی برائی میں جو حکایتیں گڑھی ہیں اگر آپ کے گوش گزار ہوں تو یقین ہے کہ پھر آپ کو بھی اس شعر پر استا برہم ہونے کی کوئی وجہ باقی نہ رہے۔ سنئے امام بخاریؒ نے کتاب الضعفاء و المتروکین میں اس سے دو حکایتیں نقل کی ہیں۔

قال نعيم بن حماد ثنا يحيى بن سعيد ومعاذ بن معاذ سمعا سفيان الثوری يقول قيل استتيب ابوحنيفة من الكفر مرتين۔

نعیم کا بیان ہے کہ ہم سے یحییٰ بن سعید اور معاذ بن معاذ دونوں نے یہ بیان کیا کہ انھوں نے سفیان ثوری کو کہتے سنا کہ بیان کیا جاتا ہے کہ ابو حنیفہ سے کفر سے دو دفعہ توبہ کرائی گئی تھی۔

دوسری حکایت میں اس سے کہیں زیادہ غلاظت اچھالی گئی ہے۔

وقال نعيم عن الفزاری كنت عند سفيان بن عيينة فجاء نعى ابى حنيفة فقال لعنه الله كان يهدم الاسلام عروة عروة ما ولد فى الاسلام اشأم منه۔

نعیم نے فزاری سے نقل کیا ہے کہ میں سفیان بن عیینہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک ابو حنیفہ کی خبر مرگ کی اطلاع ملی۔ ابن عیینہ یہ سن کر بولے خدا کی اس پر لعنت، یہ اسلام کی ایک ایک گرفت کو ختم کر کے اسے ڈھا رہا تھا۔ اسلام میں کوئی شخص اس سے زیادہ منحوس پیدا نہیں ہوا۔

اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ نعیم نے حنفیہ کی تردید میں جو کتابیں لکھی ہونگی ان میں کیا گل کھلایا ہوگا۔

اب ان مسائل کا جائزہ لیتے ہیں کہ جن کے متعلق مولف صاحب نے کو بڑا دعویٰ ہے کہ وہ سراسر خلاف حدیث ہیں اور ان کو گویا بار لوگوں نے خود گھڑ کر زبردستی امام صاحب کے سر تھوپ دیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"اب سنئے امام ابو حنیفہ کا ایک قول، مسئلہ اور فتویٰ مانیں گے یا نہیں۔ اس کے بعد جلی قلم سے یہ عنوان قائم کر کے کہ ـــــ "حنفی مذہب میں شراب حلال" لکھتے ہیں۔ ما يتخذ من الحنطة والشعير والعسل والذرة حلال عند ابى حنيفة ولا يحد شاربه عنده وان سكر منه (ہدایہ شریف کتاب الاشربہ) گیہوں، جو، شہد، جوار کی شراب امام ابو حنیفہ کے نزدیک حلال ہے۔ اس کے پینے والے کو امام صاحب کے نزدیک حد بھی نہیں مارنی چاہئے خواہ اسے نشہ بھی چڑھ جائے" ص ۱۶۵

پھر صاحب ہدایہ اور حنفیوں پر کافی طعن و تشنیع کرنے کے بعد تحریر ہوتا ہے کہ:۔

"اوپر آپ ہدایہ کے حوالہ سے گیہوں، جو، شہد، جوار سے بنی ہوئی شراب کو حلال پڑھ آئے ہیں اب ان چیزوں سے بنی ہوئی شراب کے متعلق ارشاد رسول ملاحظہ فرمائیں۔

ان من الحنطة خمراً ومن الشعير خمراً بے شک گیہوں، جو، کھجور، کشمش اور شہد کی بنی ہوئی بھی[1] خمر

---

[1] یہاں متعینہ لفظ استعمال ہوا ہے مگر مولف نے ترجمہ میں اس کا خیال نہیں رکھا۔ ترجمہ یوں کرنا چاہئے تھا کہ ان اشیاء مذکورہ سے تیار کردہ بعض مشروبات بھی خمر ہیں یعنی اس کے حکم میں داخل ہیں۔

ومن التمر خمراً ومن الزبیب خمراً ومن العسل خمراً (ترمذی۔ ابوداؤد) (شراب) ہے یعنی ان چیزوں کی شراب بھی خمر ہے ص ۱۶۸ و ۱۶۹

اس کے بعد بخط جلی پھر دوسرا عنوان اس طرح قائم کیا ہے "شراب کی حلت کی نئی صورت" اور اس کے ذیل میں ارشاد ہوتا ہے

"شراب تو شریعت میں حرام ہو چکی اس کے حلال ہونے کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی لیکن فقہ کہتی ہے۔ جب تک نشہ نہ ہو اس وقت تک شرب حلال ہے ملاحظہ ہو اصل عبارت:۔

لان المفسد هو القدح الاخیر وهو حرام عندنا (ہدایہ کتاب الاشربہ)

شراب کا وہی پیالہ مفسد ہے جو آخری نشہ آور ہو اور وہی ہمارے نزدیک حرام ہے ص ۱۶۹۔

اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم سنئے۔

عن جابر ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام۔ (ترمذی۔ ابوداؤد، ابن ماجہ)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ چیز زیادہ مقدار میں نشہ لائے اس کی کم مقدار بھی حرام ہے"۔ [1]

یعنی جس چیز کی کل حرام ہے اس کا جز بھی حرام ہے، شراب کی بوتل پی جانا بھی حرام ہے اور ایک قطرہ بھی حرام ہے" ص ۱۷۰

اس بحث میں مولف نے آٹھ صفحے سیاہ کر ڈالے ہیں اور صاحب ہدایہ اور احناف پر طنز و تحقیر میں کوئی کسر اٹھا کر نہیں رکھی۔

ہدایہ کی یہ دونوں عبارتیں جو مولف نے پیش کی ہیں۔ ان میں کوئی لفظ ایسا نہیں جس کا ترجمہ شراب ہو خدا جانے پھر ترجمہ کرتے وقت "شراب" کے استعمال کی کیوں ضرورت پیش آئی۔

پھر ایک طرف تو یہ نقل فرما رہے ہیں کہ۔

"گیہوں، جو، شہد اور جوار کی شراب حلال ہے، اور اس کے پینے والے کو بھی حد نہیں مارنی چاہیئے خواہ اسے نشہ بھی چڑھ جائے"۔

یعنی شراب نوشی کے لئے کھلی چھٹی ہے۔

لیکن دوسری طرف یوں ناقل ہیں کہ:۔

"شراب کا آخری پیالہ جو نشہ آور ہے وہی حرام ہے"۔

احناف کی مخالفت میں آخر یہ کیسی بہکی بہکی باتیں کی جا رہی ہیں؟

پھر یہ بھی جائے غور ہے کہ مولف نے اس مسئلہ میں حنفیوں کے خلاف قرآن سے استدلال نہیں کیا۔ حالانکہ تحریم خمر پر نص قرآنی شاہد ہے معلوم ہوا کہ ہدایہ کے مسئلہ کا تعلق درحقیقت خمر سے نہیں ہے۔ اور یہ مولف کی اپنی ذاتی کج ہے کہ وہ اسے خواہ مخواہ کھینچ کر خمر کے تحت لانا چاہتے ہیں اصل بات یہ ہے کہ تحریم خمر تو مسلمانوں کا اجماعی مسئلہ ہے البتہ نبیذ کے استعمال میں شروع سے ائمہ مجتہدین میں اختلاف چلا آتا ہے اور کوئی شک نہیں کہ امام ابوحنیفہ نبیذ کی حلت کے قائل ہیں۔ ہدایہ کی عبارت پر بحث کرنے سے پہلے اچھا ہے کہ غیر حنفی علماء کی زبانی یہ اس مسئلہ کی تفصیل اور اس کے دلائل سن لیں تاکہ اس بارے میں اگر آپ کے ذہن میں کوئی غلط فہمی ہو تو وہ صاف ہو جائے۔ علامہ ابن رشد مالکی متوفی ۵۹۵ھ اپنی مشہور کتاب بدایۃ المجتہد میں لکھتے ہیں:۔

واما النبات الذی ھو غذاء فکلہ حلال الا الخمر۔ نباتات میں جو غذا ہے وہ سب حلال ہے بجز خمر اور ان تمام نبیذوں

---

[1] یہاں بھی مولف نے ترجمہ میں لفظ بھی کا بیجا حرف بڑھا کر حدیث کا مطلب خبط کر دیا ہے صحیح ترجمہ یہ ہے کہ جس کی کثیر مقدار نشہ لے آئے تو اس کی قلیل مقدار حرام ہے

وسائر الانبذة المتخذة من العصارات التي تتخمر ومن العسل نفسه، اما الخمر فانهم اتفقوا على تحريم قليلها وكثيرها اعني التي هي من عصير العنب، واما الانبذة فانهم اختلفوا في القليل منها الذي لا يسكر، واجمعوا على ان المسكر منها حرام. فقال جمهور فقهاء الحجاز وجمهور المحدثين قليل الانبذة وكثيرها المسكرة حرام وقال العراقيون ابراهيم النخعي من التابعين وسفيان الثوري وابن ابي ليلى وشريك وابن شبرمة وابوحنيفة وسائر فقهاء الكوفيين واكثر علماء البصريين ان المحرم من سائر الانبذة المسكرة هو السكر نفسه لا العين وسبب اختلافهم تعارض الآثار والاقيسة في هذا الباب۔

کے کہ جو ان شیروں سے تیار کی جاتی ہیں کہ جن میں خمیر اٹھتا ہے اور یہی طرح وہ نبیذ بھی جو خالص شہد سے تیار کی جاتی ہے۔ خمر یعنی جو شیرہ انگور سے تیار کی جاتی ہے اس کے بارے میں تو سب کا اتفاق ہے کہ اس کی قلیل مقدار ہو یا کثیر سب حرام ہے البتہ نبیذوں کی اس قلیل مقدار کے استعمال میں کہ جو نشہ آور نہیں مجتہدین میں اختلاف ہے۔ اور اس پر اجماع ہے کہ جو مقدار نشہ آور ہے اس کا استعمال حرام ہے چنانچہ بیشتر فقہاء حجاز اور بیشتر محدثین اس کے قائل ہیں کہ جو نبیذیں نشہ آور ہیں ان کا قلیل وکثیر دونوں مقداریں۔ استعمال کرنا حرام ہے، اور عراقیین جن میں ابراہیم نخعی جو تابعی ہیں اور سفیان ثوری اور ابن ابی لیلیٰ اور شریک اور ابن [illegible] اور ابوحنیفہ اور تمام کوفہ کے فقہا اور اکثر بصرہ کے علماء شامل ہیں یہ کہتے ہیں کہ تمام نشہ آور نبیذوں سے نشہ کرنا حرام ہے نہ بذات خود ان کا استعمال کرنا اور ان ائمہ کے اختلاف کا سبب اس کے بارے میں روایات اور قیاسات کا تعارض ہے۔

اس کے بعد علامہ ممدوح نے علماء حجاز کے دلائل کو ذکر کرکے (جن میں وہ حدیثیں بھی آگئیں ہیں جن کو مؤلف نے نقل کیا ہے) علماء عراق کے دلائل کو حسب ذیل عبارت میں زیب قرطاس کیا ہے:۔

واما الكوفيون فانهم تمسكوا لمذهبهم بظاهر قوله تعالى ﴿ومن ثمرات النخيل والاعناب تتخذون منه سكرا ورزقا حسنا﴾ وبآثار رووها في هذا الباب، وبقياس معنوي. اما احتجاجهم بالآية فانهم قالوا السكر هو المسكر ولو كان محرم العين لما سماه الله رزقا حسنا واما الآثار التي اعتمدوها في هذا الباب فمن اشهرها عندهم حديث ابي عون الثقفي عن عبدالله بن شداد عن عبدالله بن عباس عن النبي عليه الصلوٰة والسلام قال حرمت الخمر لعينها والسكر من غيرها، وقالوا هذا نص لا يحتمل التاويل وضعفه اهل الحجاز لان بعض رواته روى والمسكر من غيرها، ومنها حديث شريك عن سماك بن حرب باسناده عن ابي بردة بن نيار قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اني كنت نهيتكم عن الشراب

اور عراقیین نے اپنے مذہب کے لئے ظاہر آیت (ومن ثمرات النخیل والاعناب) اور میووں میں سے کھجور اور انگور کہ نشہ آور عرق جو تم بناتے ہو اور بہتر رزق (جو تم حاصل کرتے ہو) اور ان احادیث سے کہ جن کو اس بارے میں روایت کرتے ہیں نیز قیاس معنوی سے استدلال کیا ہے اور کہتے ہیں کہ "سکر" کے معنی ہیں مسکر یعنی نشہ آور کے لہٰذا اگر بذاتہ اس کا استعمال حرام ہوتا تو حق تعالیٰ اس کو رزقاً حسنا (عمدہ رزق) کیوں فرماتا اور جن حدیثوں پر انھوں نے اس بارے میں اعتماد کیا ہے ان میں سب سے زیادہ مشہور حدیث ان کے نزدیک ابوعون ثقفی کی روایت ہے جس کو عبداللہ بن شداد کے واسطے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے نقل کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ (خمر تو بذاتہ حرام ہے اور غیر خمر سے صرف نشہ کرنا) وہ کہتے ہیں کہ یہ راس بات میں نص ہے جس میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں اور اہل حجاز نے اس کی تضعیف کی ہے کیونکہ اس روایت کے

بقیہ فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں۔

فی الاوعیة فاشربوا فیه ما بدا لکم ولا تشربوا مسکرا) خرجهما الطحاوی ورووا عن ابن مسعود انه قال (شهدت تحریم النبیذ کما شهدتم ثم شهدت تحلیله فحفظت ونسیتم) ورووا عن ابی موسیٰ قال (بعثنی رسول صلی الله علیه وسلم انا و معاذا الی الیمن فقلنا یا رسول الله ان بها شرابین یصنعان من البر والشعیر احدهما یقال له المزر والآخر یقال له البتع فما نشرب فقال علیه الصلوٰة والسلام اشربا ولا تسکرا) خرجه الطحاوی ایضا الی غیر ذلک من الآثار التی ذکرناها فی هذا الباب۔

کسی راوی نے (والمسکر من غیرھا) کے الفاظ بھی روایت کئے ہیں یعنی غیر خمر میں سے ہر مسکر چیز) اور منجملہ ان احادیث کے ایک شریک کی حدیث ہے کہ جس کو سماک بن حرب کے واسطے سے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابی بردہ بن نیار رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا (میں نے تم کو ظروف میں اشربہ کے استعمال سے منع کر دیا تھا جس برتن میں چاہو پیو مگر نشہ نہ کرو) اس حدیث کو امام طحاوی نے روایت کیا ہے نیز یہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا (میں نبیذ کی تحریم کے وقت موجود تھا جس طرح کہ تم موجود تھے اور پھر اس کی حلت کے وقت بھی موجود رہا۔ پس میں نے تو یاد رکھا مگر تم بھول گئے) اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ (مجھ کو اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کی طرف روانہ فرمایا تو ہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں گیہوں اور جو کے دو مشروبات تیار کئے جاتے ہیں ایک کو مزر کہا جاتا ہے اور دوسرے کو تبع پھر ہم کیا پئیں۔ آپ نے فرمایا پی لینا مگر نشہ نہ کرنا) اس کو بھی امام طحاوی نے روایت کیا ہے ان کے علاوہ اور حدیثیں بھی ہیں کہ جن کو ہم اس باب میں پیش کرتے رہیں۔

وما احتج جمهم من جهة النظر فانهم قالوا قد ثبت بنص القرآن ان علة التحریم فی الخمر انما هو الصد عن ذکر الله ووقوع العداوة والبغضاء کما قال تعالیٰ (انما یرید الشیطان ان یوقع بینکم العداوة والبغضاء فی الخمر والمیسر ویصدکم عن ذکر الله وعن الصلاة) وهذه العلة

اور قیاس کے سلسلہ میں ان کا استدلال یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ قرآن پاک نے بالتصریح بتا دیا ہے کہ تحریم خمر کی علت ہے (کیونکہ نتیجۃً ایسا ہے) یاد الٰہی سے اعراض اور آپس میں بغض و عداوت کا پیدا ہونا واقع ہوتا ہے چنانچہ ارشاد ہوا کہ بیدا سے یعنی شیطان چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے بازی کے ذریعے تمہارے درمیان بغض و عداوت

---

[1] واضح رہے کہ اس حدیث کے تمام تر رواۃ ثقات ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری میں لکھتے ہیں کہ ھو حدیث (اخرجہ النسائی) و رجالہ ثقات یعنی یہ وہ حدیث ہے کہ جس کی نسائی نے روایت کی ہے اور اس کے رجال سب ثقات ہیں۔ تاہم اول تو یہ حدیث صرف عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی نہیں بلکہ صحابہ میں ان کے علاوہ حضرت علیؓ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ بھی اس کے راوی ہیں اور پھر حضرت ابن عباس سے بھی صرف اس کی صرف یہی ایک سند نہیں بلکہ اور طرق سے بھی یہ مروی ہے۔ منجملہ ان کے طبرانی نے بروایت سعید بن المسیب حضرت ابن عباس سے اس کو نقل کیا ہے اور اگر اس سند میں بھی کسی ایک آدھ راوی نے اس کو بلفظ والمسکر من غیرھا روایت کر دیا تو اس سے تضعیف لازم نہیں آتی کیونکہ اس صورت میں بھی مسکر سے وہی مقدار مراد ہوگی جو نشہ آور ہو (اس حدیث کے طرق کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو جوہر النقی تخریج زیلعی، احکام القرآن للجصاص اور عقود الجواہر المنیفہ

توجد في القدر المسكر لا في ما دون ذلك فوجب ان يكون ذلك القدر هو الحرام الا انا عرفنا الاجماع حرمة قليل الخمر وكثيرها، قلنا وهذا نوع من القياس يلحق بالنص وهو القياس الذي بينه الشرع على العلة فيه

کو پیدا کرے اور تم کو نماز اور ذکر الٰہی سے باز رکھے۔ اور یہ علت نبیذ کی صرف اس مقدار میں پائی جاتی ہے کہ جو مسکر ہو اور جو مسکر نہ ہو اس میں یہ علت موجود نہیں۔ اس لئے اتنی ہی مقدار کی حرمت ضروری ہے ہاں خمر اس سے مستثنیٰ ہے کہ اس کے بارے میں تحریم قلیل وکثیر پر اجماع ہو چکا ہے یہ حضرات کہتے ہیں کہ اس نوع کا قیاس نص کے حکم میں ہے یعنی یہ وہ قیاس ہے جس میں شارع نے خود اس حکم کی علت کو بتا دیا ہے۔

اب مؤلف نے اس سلسلہ میں ہدایہ سے جو کچھ نقل کیا ہے اس کی حقیقت سنیئے۔ کتاب ہدایہ میں کتاب الاشربہ کا جس مسئلہ سے آغاز ہوتا ہے وہ یہ ہے:۔

الاشربة المحرمة اربعة، الخمر وهي عصير العنب اذا غلا واشتد وقذف بالزبد والعصير اذا طبخ حتى يذهب اقل من ثلثيه، وهو الطلاء المذكور في الجامع الصغير ونقيع التمر ونقيع الزبيب اذا اشتد وغلا

پینے کی جو چیزیں حرام ہیں چار ہیں (۱) خمر یعنی وہ شیرہ انگور کہ جو جوش مار کر تیز ہو جائے اور جھاگ دینے لگے۔ (۲) وہ شیرہ انگور کہ جس کو پکایا گیا ہو اور ابھی پورا دو تہائی نہیں جلا جامع صغیر میں اس کو طلاء کے نام سے ذکر کیا گیا ہے (۳) نقیع التمر جس کو سکر بھی کہتے ہیں یعنی وہ پانی جس میں خرما کو ڈال کر اس کی مٹھاس نکالی ہو (۴) نقیع الزبیب (یعنی وہ پانی جس میں کشمش یا منقیٰ کو ڈال کر اس کی مٹھاس نکالی گئی ہو) جبکہ اس میں تیزی آ جائے اور جوش اٹھنے لگے۔

اس کے بعد صاحب ہدایہ نے ان چاروں مشروبات پر نہایت تفصیل کے ساتھ کلام کیا ہے جس کا خلاصہ انہی کے الفاظ میں درج ذیل ہے۔۔

اما الخمر فالكلام فيها في عشرة مواضع احدها في بيان ماهيتها وهي النئ من ماء العنب اذا صار مسكرا وهذا عندنا وهو المعروف عند اهل اللغة واهل العلم

الثاني في حد ثبوت هذا الاسم وهذا الذي ذكره في الكتاب قول ابي حنيفة ـ

الثالث ان عينها حرام غير معلول بالسكر ولا موقوف عليه ـ

الرابع انها نجسة نجاسة غليظة كالبول

خمر (یعنی شراب) میں دس جگہ بحث ہے۔

(۱) اس کے ماہیت کے بیان میں خمر انگور کا کچا پانی ہے جبکہ وہ نشہ لا دے اور یہ ہمارے نزدیک ہے۔ اور یہی لغت اور اہل علم میں معروف و مشہور ہے۔

(۲) خمر کا نام اس کو کس حد پر جا کر دیا جائے گا، چنانچہ کتاب میں جو ذکر کیا ہے کہ جب وہ جوش مار کر تیز ہو جائے اور جھاگ لائے، یہ امام ابو حنیفہ کا قول ہے

(۳) نفس خمر (شراب) حرام ہے اور اس کی حرمت کی علت نہ نشہ ہے اور نہ نشہ ہونے پر اس کا حرام ہونا موقوف ہے بلکہ شراب کے ایک قطرہ کا استعمال بھی حرام ہے خواہ وہ بالکل نشہ نہ لائے

(۴) پیشاب کی طرح خمر کی نجاست بھی نجاست غلیظہ ہے۔

الخامس انه یکفر مستحلها

(۵) خمر کو حلال جاننے والا کافر ہے۔

السادس سقوط تقومها فی حق المسلم حتی لا یضمن متلفها وغاصبها ولا یجوز بیعها

(۶) مسلمان کے حق میں اس کی قیمت کا اعتبار کرنا ساقط ہے چنانچہ اگر کوئی شخص اس کو تلف کردے گا یا غصب کرے گا تو اس پر ضمان نہیں آئے گا نیز اس کی خرید و فروخت بھی جائز نہیں ہے۔

السابع حرمة الانتفاع بها

(۷) اس سے ہر قسم کا فائدہ اٹھانا مثلاً دوا کے بطور استعمال کرنا یا جانوروں کو پلانا سب ناجائز ہے۔

الثامن ان یحد شاربها وان لم یسکر

(۸) شارب خمر کو حد ماری جائے گی اگرچہ اسے نشہ نہ ہو۔

التاسع ان الطبخ لا یؤثر فیها

(۹) خمر کو پکانے سے اس کے حکم پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور وہ بدستور حرام اور نجس ہی رہے گی

العاشر جواز تخلیلها

(۱۰) اس کا سرکہ بنانا جائز ہے۔

دیکھا آپ نے خمر جس کی حرمت بنص قرآن قطعی طور پر ثابت ہے اس کے بارے میں صاحب ہدایہ نے کس تفصیل سے احکام سپرد قلم فرمائے ہیں اب دوسرے مشروبات کے متعلق ملاحظہ ہو۔

والعصیر اذا طبخ حتی یذهب اقل من ثلثیه وهو المطبوخ ادنی طبخة ویسمی الباذق والمنصف وهو ما ذهب نصفه بالطبخ فکل ذالک حرام عندنا اذا غلا واشتد وقذف بالزبد

اور "عصیر" (شیرہ انگور) کو پکایا جائے تو جب تک دو تہائی سے کم جلے یعنی وہ جس کو قدرے پکایا گیا ہو جسے بادہ کہتے ہیں اور منصف جو پک کر آدھا رہ گیا ہو سو یہ سب ہمارے نزدیک حرام ہیں جب کہ ان میں جوش آجائے اور تیزی پیدا ہو کر جھاگ دینے لگیں۔

وقال الاوزاعی انه مباح

اور امام اوزاعی منصف کو مباح کہتے ہیں[1]

واما نقیع التمر وهو السکر وهو التی من ماء التمر

اور "نقیع تمر" جس کو سکر کہتے ہیں خرما یعنی کھجور کا کچا پانی ہے سو

ای طب فهو حرام مکروه وقال شریک بن عبداللہ انه مباح

وہ بھی حرام اور مکروہ ہے اور شریک بن عبداللہ اس کو مباح بتاتے ہیں

واما نقیع الزبیب وهو التی من ماء الزبیب فهو حرام اذا اشتد وغلا ویتاتی فیه خلاف الاوزاعی الا ان حرمة هذه الاشربة دون حرمة الخمر حتی لا یکفر مستحلها ویکفر مستحل الخمر لان حرمتها اجتهادیة وحرمة الخمر قطعیة ولا یجب الحد بشربها حتی یسکر ویجب بشرب قطرة من الخمر

اور "نقیع زبیب" جو کشمش اور منقی کا کچا پانی ہے یہ بھی حرام ہے جب یہ تیز ہو کر جوش مارنے لگے اور اس میں بھی اوزاعی کا اختلاف چلتا ہے مگر ان مشروبات کی حرمت خمر کی حرمت سے کم ہے چنانچہ ان کے حلال جاننے والے کو کافر نہیں کہا جائے گا لیکن جو خمر کو حلال سمجھے اس کی تکفیر کی جائے گی کیونکہ ان مشروبات کی حرمت اجتہادی ہے اور خمر کی حرمت قطعی ہے ان کے پینے سے جب تک نشہ نہ ہو حد

---

[1] امام بخاری کی بھی یہی رائے ہے۔ [illegible] یعنی شرب الطلاء علی النصف [illegible] منصف [illegible] امام بخاری کے نزدیک بھی اس کے پینے میں کوئی [illegible] نہیں [illegible] صاحب ہدایہ کی طرح امام بخاری [illegible]

وقال فی الجامع الصغیر وما سوی ذلک من الاشربة فلا باس بہ قالوا ھذا الجواب علی ھذا العموم والبیان لا یوجد فی غیرہ وھو نص علی ان ما یتخذ من الحنطة والشعیر والعسل والذرة حلال عند ابی حنیفة ولا یحد شاربہ عندہ وان سکر منہ ولا یقع طلاق السکران منہ بمنزلة النائم ومن ذھب عقلہ بالبنج ولبن الرماک۔

واجب نہیں ہوگی لیکن خمر کے ایک قطرہ کے استعمال سے بھی حد مارنا واجب ہے۔ جامع صغیر میں کہا ہے کہ ان چار کے علاوہ اور مشروبات کے استعمال میں کچھ مضائقہ نہیں۔ لوگوں (بعض شراح جامع صغیر مراد ہیں) نے کہا ہے کہ یہ جواب اس عموم و وضاحت کے ساتھ دوسری کتاب میں نہیں پایا جاتا اور یہ اس بارے میں نص ہے کہ گیہوں، جو، شہد اور جوار سے جو کچھ تیار کیا جاتا ہے وہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک حلال ہے اور اس کے پینے والے کو حد نہیں لگائی جائے گی۔ اگرچہ اسے نشہ بھی ہو جائے۔ اور ان کو پی کر ان سے جو مدہوش ہو تو اس کی طلاق بھی واقع نہ ہوگی جس طرح سے کہ سونے والے کا حکم ہے اور اس شخص کا کہ جس کی عقل خراسانی اجوائن یا گھوڑی کے دودھ پینے سے جاتی رہی ہو۔

غور کیجئے "ما یتخذ" کے معنی ہیں جو کچھ تیار کیا جائے مگر مؤلف کی زبان دانی اور صداقت بیانی قابل داد ہے کہ انھوں نے اپنی جودت طبع سے "ما یتخذ" کا ترجمہ شراب فرمایا ہے شاید مؤلف کے علم میں گیہوں، جو اور شہد اور جوار سے شراب کے علاوہ اور کسی قسم کا کوئی مشروب (نبیذ، شربت وغیرہ) تیار نہیں ہوتا۔ حالانکہ آگے چل کر خود صاحب ہدایہ نے اس "ما یتخذ" کی تعیین کر دی ہے فرماتے ہیں:-

ونبیذ العسل والتین ونبیذ الحنطة والذرة والشعیر حلال وان لم یطبخ وھذا عند ابی حنیفة وابی یوسف رحمھما اللہ اذا کان من غیر لھو وطرب لقولہ علیہ السلام الخمر من ھاتین الشجرتین واشار الی الکرمة والنخلة خص التحریم بھما والمراد بیان الحکم۔

اور نبیذ شہد کی اور انجیر کی نبیذ گیہوں کی اور جوار کی اور جو کی حلال ہے اگرچہ اس کو پکایا نہ گیا ہو اور یہ امام ابوحنیفہ اور امام ابویوسف رحمہما اللہ کے نزدیک ہے بشرطیکہ اس کو لہو و طرب کے لئے تیار نہ کیا جائے۔ کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے الخمر من ھاتین الشجرتین یعنی شراب ان ہی دو درختوں سے بنتی ہے اور آپ نے انگور اور کھجور کے درختوں کی طرف اشارہ فرمایا۔ دیکھئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حرمت کو ان ہی دو کیساتھ مخصوص رکھا اور آپ کا مقصد ان کا حکم بتانا تھا۔

اور عنایہ کے متعلق ان لفظوں میں اپنی تحقیق پیش کر دی ہے کہ:-

وھل یحد فی المتخذ من الحبوب اذا سکر منہ قیل لا یحد وقد ذکرنا الوجہ من قبل قالوا والاصح انہ یحد فانہ عن محمد فیمن سکر من الاشربة انہ یحد من غیر تفصیل وھذا لان الفساق یجتمعون علیہ فی زماننا اجتماعھم علی سائر الاشربة بل فوق ذلک وکذا المتخذ من الالبان اذا اشتد فھو علی ھذا۔

اور غلوں سے جو نبیذ تیار کی جاتی ہے جب اس کے استعمال سے نشہ ہو جائے تو آیا حد ماری جائے گی یا نہیں؟ سو اس بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ حد نہیں ماری جائے گی اور اس کی وجہ ہم سابق میں ذکر کر چکے ہیں (یعنی اس کا حکم اجوائن خراسانی اور گھوڑی کے دودھ سے مست ہونے والے کا حکم ہے) مشائخ کہتے ہیں اور زیادہ صحیح یہ ہے کہ اس کو حد ماری جائے گی کیونکہ امام محمد سے مشروبات میں

کسی قسم کی تفریق کے بغیر ہی مروی ہے (جس شخص کو نشہ ہوگا اس کو حد ماری جائے گی، اور یہ اس لئے بھی ضروری ہے۔ کہ ہمارے زمانہ میں فساق اس کے استعمال کے لئے اسی طرح جمع ہو جاتے ہیں جس طرح کہ مسکرات کے استعمال پر بلکہ اس سے بھی زیادہ اور یہی حکم مختلف قسم کے دودھ سے تیار کردہ مشروب کا ہوگا۔ جب کہ اس میں تیزی پیدا ہو جائے گی، کہ اگر اس کے استعمال سے بھی نشہ ہوگا تو حد لگائی جائے گی)

اور ہدایہ میں کتاب الحدود کے اندر تو بالکل صاف مرقوم ہے کہ:-

ومن سکر من النبیذ حد لما روی ان عمر اقام الحد علی عربی سکر من النبیذ

اور جو نبیذ سے مست ہو جائے گا۔ اس کو حد ماری جائے گی کیونکہ حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ آپ نے ایک بدو کو جو نبیذ سے مست ہو گیا تھا حد لگوائی۔

اب اخیر پیالہ کا قصہ سنئے۔ فرماتے ہیں:-

وعصیر العنب اذا طبخ حتی ذھب ثلثاہ وبقی ثلثہ حلال وان اشتد وھذا عند ابی حنیفۃ وابی یوسف وقال محمد ومالک والشافعی حرام وھذا الخلاف فیما اذا قصد بہ التقوی اما اذا قصد بہ التلھی لا یحل بالاتفاق وعن محمد مثل قولھما وعنہ انہ کرہ ذلک وعنہ انہ توقف فیہ لھم فی اثبات الحرمۃ قولہ علیہ السلام کل مسکر خمر وقولہ علیہ السلام ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام ویروی عنہ علیہ السلام ما اسکر الجرۃ منہ فالجرعۃ منہ حرام ولان المسکر یفسد العقل فیکون حراما قلیلہ وکثیرہ ولھما قولہ علیہ السلام حرمت الخمر لعینھا ویروی بعینھا قلیلھا وکثیرھا والسکر من کل شراب خص السکر بالتحریم فی غیر الخمر اذ العطف للمغایرۃ ولان المفسد ھو القدح المسکر وھو حرام عندنا وانما یحرم القلیل منہ لانہ یدعو لرقتہ ولطافتہ الی الکثیر فاعطی حکمہ والمثلث لغلظہ لا یدعو وھو فی نفسہ غذاء فبقی علی الاباحۃ والحدیث الاول غیر ثابت علی ما بیناہ ثم ھو محمول علی القدح الاخیر اذ ھو المسکر حقیقۃ۔

اور شیرہ انگور کو جب اس قدر پکایا گیا کہ اس کا دو تہائی بن گیا اور ایک تہائی باقی رہا تو وہ حلال ہے اگرچہ اس میں تیزی آ جائے اور یہ امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف کے نزدیک ہے اور امام محمد امام مالک اور امام شافعی اس کو حرام کہتے ہیں اور یہ اختلاف بھی اس صورت میں ہے جبکہ اس کو تقویت کے لئے استعمال کیا جائے ورنہ اگر اس سے لہو ولعب مقصود ہو تو پھر بالاتفاق حلال نہیں ہے۔ اور امام محمد سے اس کے بارے میں یہ بھی مروی ہے کہ وہ امام ابو حنیفہ اور ابو یوسف کی طرح اس کی حلت کے قائل تھے۔ اور یہ بھی کہ وہ اس کو مکروہ کہتے تھے۔ اور یہ بھی کہ انہوں نے اس کے بارے میں کسی قسم کا فیصلہ کرنے سے توقف فرمایا۔ ان حضرات کی ثبوت حرمت کے سلسلہ میں یہ دلیلیں ہیں کہ حدیث میں آتا ہے (ہر نشہ آور چیز حرام ہے) اور دوسری حدیث میں ہے (جس کی کثیر مقدار نشہ کرے اس کی قلیل مقدار حرام ہے) نیز حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے یہ بھی مروی ہے کہ جس کا سبو نشہ کرے اس کا بھی ایک گھونٹ حرام ہے۔ نیز نشہ آور چیز سے عقل بگڑ جاتی ہے لہٰذا اس کی تھوڑی مقدار ہو یا زیادہ سب کو حرام ہونا چاہئے اور امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف کی دلیل یہ حدیث ہے کہ خمر بعینہ حرام ہے اور دوسرے تمام مشروبات سے صرف نشہ کرنا، غرض غیر خمر

میں حرمت صرف نشہ کرنے کے لئے مخصوص ہے کیونکہ عطف مغایرت کے لئے ہوتا ہے اور عقل کو بگاڑنے والا وہ پیالہ ہے جو نشہ پیدا کرے اور اس کا استعمال ہمارے نزدیک بھی حرام ہے اور شراب کی قلیل مقدار کا استعمال اس لئے حرام ہے کہ اس کی قلیل مقدار بھی اپنی رقت و لطافت کے باعث اس کی کثیر مقدار کے استعمال پر راغب کرتی ہے لہذا اس کی قلیل مقدار کو بھی کثیر کا حکم دے دیا گیا۔ لیکن مثلث میں اپنی غلاظت کے باعث یہ بات نہیں۔ علاوہ ازیں وہ خود غذا ہے۔ لہذا اپنی اصلی اباحت پر رہے گا رہی پہلی حدیث سو وہ تو ثابت نہیں جیسا کہ ہم سابق میں بیان کر چکے ہیں اور بتقدیر صحت وہ اخیر پیالہ پر محمول ہوگی کیونکہ درحقیقت وہی نشہ آور ہے۔

غور فرمایئے زیر خط کشیدہ عبارت کا تعلق طلاء یعنی مثلث عنبی کی بحث سے تھا مولف نے اس کو کس طرح شراب کی بحث بنا دیا یہ بھی واضح رہے کہ امام بخاری بھی[1] مثلث عنبی کی حلت کے قائل تھے چنانچہ وہ اپنی صحیح میں لکھتے ہیں کہ ورای عمر وابو عبیدۃ ومعاذ بن جبل شرب الطلاء علی الثلث یعنی حضرت عمر، ابو عبیدہ اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم شرب طلاء کے قائل ہیں جب کہ وہ جل کر ایک تہائی رہ جائے موطا میں یہ بھی مروی ہے کہ اسی طلاء کے پینے سے جب ایک شخص کو نشہ ہو گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو پوری حد لگائی تھی۔

اور یہ حدیث جو مولف نے نقل کی ہے کہ ان من الحنطۃ خمرا ... سو اس کے متعلق امام ابوبکر جصاص، احکام القرآن میں لکھتے ہیں کہ:

ولیس فی جمیع ما یکون من هذه الاصناف خمرا انما اخبر ان منه خمرا ویحتمل ان یرید به ما یسکر منه فیکون محرما فی تلك الحال

حدیث میں یہ نہیں ہے کہ جو کچھ ان چیزوں سے تیار ہوتا ہے وہ سب خمر ہے بلکہ یہ بتایا ہے کہ ان سے بعض چیزیں ایسی بھی بنائی جاتی ہیں کہ جو خمر کے حکم میں ہیں اور ممکن ہے کہ اس سے وہی مراد ہو جو نشہ آور ہو اور اس لئے صرف اسی حالت میں اس کا استعمال حرام ہو۔

اور دوسری حدیث جو مولف نے ذکر کی ہے کہ ما اسکر کثیرہ فقلیله حرام تو یہ حقیقت میں خود ہماری دلیل ہے چنانچہ شمس الائمہ سرخسی مبسوط میں فرماتے ہیں۔

ثم هذا عند التحقیق دلیل لنا لانه یثبت ما هو المشیر منه یکون مسکرا فالمحرم هو قلیل من ذلك الکثیر وانما یکون ذلك اذا جعلنا المحرم هو القدح الاخیر فاما اذا جعلنا الکل محرما فلا یکون محرم قلیلا من ذلك الکثیر کما اقتضاه ظاهر الحدیث۔ ثم قد بینا ان هذا کان فی الابتداء والتحقیق۔ مزجر

پھر یہ عند التحقیق ہماری ہی دلیل ہے۔ کیونکہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جس کی کثیر مقدار نشہ آور ہے تو اس میں حرام وہی قلیل مقدار ہے جو کثیر کو نشہ آور بناتی ہے اور یہ اسی صورت میں بن سکتا ہے جب کہ ہم آخری پیالہ کو حرام قرار دیں ورنہ اگر کل کو حرام قرار دیں گے تو ظاہر حدیث کے مقتضے کے مطابق اس صورت میں حرام اس کثیر مقدار میں

[1] اب خدا جانے مولف صاحب امام بخاری اور امام مرغینانی (یعنی صاحب ہدایہ) دونوں کو ایک درجہ میں رکھتے ہیں یہ روایتیں امام بخاری کی جرأت سمجھتے ہیں، یا اس کی بھی تاویل کرتے ہیں یا ان کی تقدیس کا کچھ احترام کرتے ہیں۔

ثم جاءت الرخصة بعد ذلك في شرب القليل منه ومعها الجمع بين الآثار قد بث ادى من الاخذ ببعضها والا عراض عن بعضها۔

سے قلیل میں ہوگی پھر ہم یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ ابتداء میں یہ حکم اس لئے تھا کہ نشہ کی بندش پر پوری سختی کے ساتھ عمل درآمد ہو بعد کو قلیل مقدار میں استعمال کی اجازت دے دی گئی۔ اور جب تک احادیث میں تطبیق ممکن ہو یہ بہتر ہے کہ ان میں بعض کو لے لیا جائے اور بعض سے منہ موڑ لیا جائے۔

دیکھئے صاحب ہدایہ نے اس بحث میں دو جگہ جامع صغیر کا حوالہ دیا ہے۔ جو امام ابو حنیفہ کے مشہور شاگرد امام محمد کی تصنیف ہے۔ مگر مؤلف صاحب ابھی تک اسی ناواقفیت میں ہیں کہ قدوری سے پہلے فقہ حنفی میں کوئی تصنیف ہی نہیں ہوئی۔ پھر مؤلف کی اس ابلہ فریبی کو ملاحظہ کیجئے کہ نبیذ اور مثلث علیی کی بحث کو کس طرح شراب کی بحث بنایا حالانکہ حنفیہ کے یہاں ہر طرح کا نشہ کرنا حرام ہے۔

اب دوسرا مسئلہ ملاحظہ ہو:-

"شراب کا سرکہ بنانا"

حدیث میں حرمت | عن انس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم سئل عن الخمر یتخذ خلا فقال لا ...... (رواہ مسلم)

حضرت انس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا، کہ کیا شراب کا سرکہ بنالیا جائے۔ آپ نے فرمایا ہرگز نہیں۔

فقہ میں حلت | واذا تخللت الخمر حلت سواء صارت خلا بنفسها او بشیٔ یطرح فیها ولا یکرہ تخلیلها (ہدایہ کتاب الاشربہ)

شراب کا جب سرکہ بن گیا، تو شراب حلال ہو گئی آپ ہی سرکہ بن جائے یا کسی چیز کے ملانے سے بنالیا جائے حلال ہے اور شراب کا سرکہ بنانا مکروہ بھی نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو یہی فرمائیں کہ شراب کا سرکہ بنانا ہرگز جائز نہیں۔ لیکن حنفی مذہب ہے کہ شراب کا سرکہ بنانا جائز ہے [ص ۱۰۲]

بات یہ ہے کہ ابتداء میں جب شراب کی ممانعت ہوئی تو اس کے متعلق نہایت سختی کے احکام دیئے گئے، یہاں تک کہ شراب کے مٹکوں کو توڑنے اور اس کے مشکیزوں کو پھاڑ ڈالنے تک سے دریغ نہیں کیا گیا۔ چنانچہ یہ حکم بھی اسی ابتدائی زمانے کا ہے بعد کو جب لوگوں سے نشہ کی عادت چھوٹ گئی تو پھر شراب کا سرکہ بنانے کی رخصت دیدی گئی۔ چنانچہ یہ حکم بھی سنن دار قطنی کے زمانہ کا ہے .... ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ان کے پاس ایک بکری تھی جس کا وہ دودھ نکالا کرتی تھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بکری کو نہ پایا تو دریافت کیا کہ بکری کیا ہوئی عرض کیا مر گئی۔ آپ نے فرمایا تم نے اس کی کھال کو کیوں کام میں نہ لیا۔ ہم نے عرض کیا وہ تو مردار ہے حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا ان دباغہا یحله کما یحل خل الخمر (دباغت سے مردار کی کھال اسی طرح حلال ہو جاتی ہے جس طرح کہ شراب سرکہ بنانے سے) بلکہ دوسری حدیث میں یہاں تک موجود ہے کہ خیر خلکم خل خمرکم (رواہ البیہقی فی المعرفۃ) بہترین سرکہ وہ ہے جو شراب سے بنا ہو۔ اور صحیح بخاری باب قول اللہ تعالیٰ احل لکم صید البحر وطعامہ ... میں مذکور ہے قال ابو الدرداء فی المری ذبح الخمر النینان والشمس (یعنی حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے "مری" کے بارے میں فرمایا کہ شراب کو مچھلی اور دھوپ نے ختم کردیا) حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں ابراہیم حربی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ "مری" ملک شام میں تیار کی جاتی تھی جس کی صورت یہ تھی کہ شراب میں مچھلی اور نمک ڈال کر دھوپ میں رکھ دیتے تھے اور شراب کی کیفیت تبدیل ہو جاتی تھی، حضرت ابو درداء اس مری کے استعمال میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے کیونکہ

لہ حدیث میں صرف لا ہے جس کے معنی ہیں "نہیں" اس "نہیں" میں تاکید مؤلف نے خود بڑھائی ہے

اس طرح شراب سرکہ بن جاتی تھی۔ چنانچہ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں وکان ابو الدرداء ممن یفتی بجواز تخلیل الخمر کہ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں تھے جو شراب کا سرکہ بنانے کو جائز قرار دیتے تھے۔ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہم مشہور صحابی ہیں جن سے امام بخاری نے یہ روایت نقل کی ہے اور اس کے خلاف امام بخاری نے کوئی روایت بھی نہیں پیش کی جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مذہب بھی یہی ہے۔ اور امام محمد نے کتاب الحج میں حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ شراب کا سرکہ بنانے میں کچھ حرج نہیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ اگر شراب خود بخود سرکہ بن جائے تو بالاجماع حلال ہے۔

کتے کا ناپاک برتن

رسول اللہ ﷺ کا حکم عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا شرب الکلب فی اناء احدکم فلیغسلہ سبع مرات (بخاری و مسلم) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب کتا تمہارے برتن میں سے پی جائے تو اسے سات مرتبہ دھوؤ۔

فقہ کی مداخلت یغسل الاناء من ولوغہ ثلاثا (ہدایہ کتاب الطہارت) جس برتن سے کتا پی جائے اس کو تین بار دھوؤ۔ مقلد بھائیوں کو آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم مان کر کتے کے جھوٹے کو سات مرتبہ دھوئیں گے یا امام کے قول پر چل کر تین مرتبہ دھوئیں گے۔ کس کی بات مانیں گے اور یہ بھی بتائیے کہ اس فقہ میں حدیث کے علاوہ مسئلے کہاں ہیں اور پھر جو خلاف حدیث مسئلوں کو جان بوجھ کر مانے وہ کون ہے؟ ص ۱۳، ۱۴، ۱۴۲

ہدایہ کی پوری عبارت جو اس مسئلہ سے متعلق ہے پڑھ لیجئے اور پھر مولانا صادق کی صداقت کی داد دیجئے۔

وسؤر الکلب نجس ویغسل الاناء من ولوغہ ثلاثا لقولہ علیہ السلام یغسل الاناء من ولوغ الکلب ثلاثا ولان لسانہ یلاقی الماء دون الاناء فلما تنجس الاناء فاولی ان یتنجس الماء وھذا یفید النجاسۃ والعدد فی الغسل وھو حجۃ علی الشافعی فی اشتراط السبع ولانہ ما یصیبہ بولہ یطھر بالثلاث فما یصیبہ سؤرہ وھو دونہ اولی والامر الوارد بالسبع محمول علی ابتداء الاسلام۔

کتے کا جھوٹا نجس ہے اور برتن میں اس کے منہ ڈالنے سے اس کو تین بار دھویا جائے۔ کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ کتے کے منہ ڈال دینے سے تین مرتبہ برتن کو دھویا جائے اور کتے کی زبان پانی میں پڑتی ہے نہ کہ برتن میں پس جب برتن نجس ہو گیا تو پانی بدرجہ اولیٰ نجس ہوا اور یہ حدیث پانی کی نجاست کو بتلاتی ہے اور دھونے کے بارے میں تعداد کو ظاہر کرتی ہے اور یہ حدیث امام شافعی پر سات مرتبہ دھونے کے بارے میں حجت ہے اور تین مرتبہ دھونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کتے کا پیشاب تین بار کے دھونے سے پاک ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس کا جھوٹا تو بدرجہ اولیٰ تین بار کے دھونے سے پاک ہو جائے گا جو اس کے پیشاب سے کمتر ہے اور سات بار دھونے کا حکم ابتدائے اسلام پر محمول ہے

واقعہ یہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کتوں کے متعلق عام حکم دے دیا تھا کہ ان کو مار ڈالا جائے۔ چنانچہ اس کے جھوٹے برتن کو سات مرتبہ دھونے کا حکم بھی اسی زمانہ کا ہے بعد کو جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے قتل کو روک دیا تو اس حکم میں بھی تخفیف کر دی۔ صاحب ہدایہ نے اس مسئلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جو حکم نقل کیا ہے وہ دراصل ابن عدی کی کتاب الکامل

عن عائشۃ انہا تؤم النساء وتقوم وسطہن ... (مستدرک حاکم باب امامۃ المراءۃ)
حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا صف کے بیچ میں کھڑی ہو کر عورتوں کی امامت کرتی تھیں۔

فقہ کی مزاحمت

یکرہ للنساء ان یصلین وحدھن الجماعۃ (ہدایہ باب الامامۃ) صرف عورتوں کو جماعت سے نماز پڑھنا مکروہ ہے۔

مؤلف کے اعتراض کا جواب خود ہدایہ میں موجود ہے مگر ان کی عادت یہ ہے کہ وہ ہدایہ کی پوری عبارت نقل کرتے ہیں اور نہ حدیث ہی پوری بیان کرتے ہیں کیونکہ اگر ایسا کریں تو مسئلہ کی اصل حقیقت واضح ہو جائے۔ دیکھئے ہدایہ ہی میں اس کے بعد یہ بھی مذکور ہے:

فان فعلن قامت الامام وسطہن لان عائشۃ فعلت کذلک وحمل فعلہا الجماعۃ علی ابتداء الاسلام

اور اگر وہ جماعت کریں تو امام وسط میں کھڑی ہو کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایسا ہی کیا تھا اور ان کا جماعت کرنا اسلام کے ابتدائی زمانہ پر محمول ہے۔

حضرت ام ورقہ کی حدیث سنن ابی داؤد میں دو طریقوں سے مروی ہے۔ ایک میں یہ الفاظ آئے ہیں۔

وکانت قد قرأت القرآن فاستأذنت النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان تتخذ فی دارہا مؤذنا فاذن لہا وکانت دبرت غلاما لہا وجاریۃ

انھوں نے قرآن پڑھا تھا اس لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے درخواست کی کہ وہ اپنے گھر میں ایک مؤذن مقرر کرنا چاہتی ہیں۔ حضور نے انکی درخواست منظور فرمائی اور انھوں نے اپنے ایک غلام اور اپنی ایک لونڈی کو مدبر[1] کر دیا تھا۔

اور دوسرے طریق میں یہ مذکور ہے:۔

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یزورہا فی بیتہا وجعل لہا مؤذنا یؤذن لہا وامرہا ان تؤم اہل دارہا قال عبد الرحمن فانا رأیت مؤذنہا شیخا کبیرا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سے ان کے گھر تشریف لیجایا کرتے۔ آپ نے انکے لئے ایک مؤذن بھی مقرر کر دیا تھا جو ان کے واسطے اذان دیا کرتا تھا اور ان کو حکم دیا تھا کہ وہ اپنے گھر والوں کی امامت کیا کریں۔ عبد الرحمن (جو ام ورقہ سے اس واقعہ کے ناقل ہیں) بیان کرتے ہیں کہ میں نے ان کے مؤذن کو دیکھا تھا وہ نہایت بوڑھا تھا۔

شوکانی اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

والظاہر انہا کانت تصلی بہم ویأتم بہا مؤذنہا وغلامہا وجاریتہا وبقیۃ اہل دارہا (نیل الاوطار باب ما جاء فی امامۃ الفاسق)

ظاہر ہے کہ وہ نماز پڑھایا کرتی تھیں اور ان کا مؤذن اور ان کا غلام اور باقی سب گھر والے انکے مقتدی ہوتے تھے

اور نواب صدیق حسن خاں لکھتے ہیں کہ:۔

حدیث دلیل است بر صحت امامت زن نساء را نہ خود را اگرچہ در ایشان مردے ہم باشد، زیرا کہ مؤذن وے مردے پیر بود چنانکہ گذشت کہ او را وغلام وجاریہ خود را امامت می کرد (مسک الختام شرح بلوغ المرام)

حدیث دلیل ہے اس بات پر کہ عورت کی امامت اپنے گھر والوں کیلئے صحیح ہے۔ اگرچہ ان میں مرد بھی ہو کیونکہ ان کے مؤذن ایک پیر مرد تھے اور ظاہر ہے کہ وہ ان کی اور اپنے غلام اور لونڈی کی امامت کیا کرتی تھیں۔

---

[1] مدبر وہ غلام ہے جس سے اس کا آقا یہ کہدے کہ تو میرے مرنے پر آزاد ہے۔

اسی طرح مستدرک حاکم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی پوری روایت یہ ہے۔

عن عائشۃ انہا کانت تؤذن وتقیم وتؤم النساء وتقوم وسطہن　یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا خود اذان دیتی تھیں اقامت کہتی تھیں اور عورتوں کی امامت کراتی تھیں اور ان کے بیچ میں کھڑی ہوتی تھیں۔

اب خود غور کر لیجئے کہ حضرت ام ورقہ۔ اور عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ عمل کس عہد کا ہونا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ یہ اس زمانہ کے واقعات ہیں جب عورتوں کو مردوں سے الگ، نہ صرف یہ کہ مردوں سے الگ اپنی جماعت کرنا جائز تھی بلکہ اذان دینے اقامت کہنے اور گھر میں اگر مرد موجود ہوں تو ان کی امامت تک کرنے کی اجازت تھی لیکن بعد کو جب آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ الا لا تؤمن امراۃ رجلا (سنن ابن ماجہ عن جابر) خبردار کوئی عورت کسی مرد کی امامت نہ کرے ورلیس علی النساء اذان ولا اقامۃ (سنن بیہقی عن اسماء بنت ابی بکر) یعنی عورتوں پر اذان واقامت نہیں ہے تو عورتوں کی جماعت کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں واقعے نزول حجاب سے پہلے پہلے کے ہیں۔ کیوں کہ پردہ کا حکم نازل ہونے پر تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیم یہ تھی۔

صلوٰۃ امراۃ فی بیتہا افضل من صلوتہا فی حجرتہا وصلوتہا فی مخدعہا افضل من صلوتہا فی بیتہا　(سنن ابوداؤد عن عبداللہ بن مسعود)

عورت کی نماز اندر کے گھر میں باہر کے حجرہ سے افضل ہے اور اندر ہی اندر اس کی چھوٹی سی کوٹھری میں کہ جس میں گھر کا مخصوص سامان حفاظت کی غرض سے رکھا جاتا ہے۔ اس کا نماز پڑھنا اندر کے گھر میں نماز پڑھنے سے بھی افضل ہے۔

اور ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہے کہ:—

ان احب صلوٰۃ المرأۃ الی اللہ فی اشد مکان فی بیتہا ظلمۃ　(صحیح ابن خزیمہ عن ابن مسعود)

اللہ کو عورت کی سب سے زیادہ وہ نماز پسند ہے جو اندر کے گھر میں ایسے مقام پر پڑھے کہ جس جگہ سب سے زیادہ اندھیرا ہو۔

اب غور فرمیئے ایسی چھوٹی سی تنگ وتاریک کوٹھری میں جماعت کا کیا تصور ہو سکتا ہے۔ تاہم اگر اہل حدیث حضرات کو حضرت ام ورقہ اور حضرت عائشہ کی مذکورہ روایات پر عمل کرنے کا ایسا ہی شوق ہے تو بسم اللہ اپنی عورتوں سے اذان کہوائیں اور انہیں مردوں کا امام بنائیں کون روکتا ہے۔ ہم نے اس مسئلے کے قریب قریب تمام پہلو واضح کر دیئے ہیں۔

نابالغ کی امامت

رحمت عالم کی پروانگی عن عمرو بن سلمۃ قال فقدمونی بین ایدیہم وانا ابن ست او سبع سنین (بخاری شریف) عمرو بن سلمہ نے چھ سات سال کی عمر میں لوگوں کی امامت کرائی۔

فقہ کا تعرض ولا یجوز للرجال ان یقتدوا بامراۃ او صبی...... (ہدایہ جلد اول باب الامامۃ) نہیں جائز واسطے مردوں کے کہ نماز پڑھیں پیچھے عورت کے یا بچے کے۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو قرآن کے قاری بچے کی امامت جائز فرماتے ہیں لیکن فقہ میں بچے کی امامت منع ہے کس قدر اندھیر ہو کہ رسول اللہ خدا کے حکم کو بالائے طاق رکھ کر امام کے قول کو مان کر آج بچے کی امامت سے منع کیا جاتا ہے، امام کے قول پر حدیث رسول قربان کی جاتی ہے جتنی بجا تیں! کیا آپ ایسی تقلید سے باز نہیں آئیں گے جس کی تاریکی میں امت امتی نبی سے آگے بڑھا ہوا ہے؟

بچے کی امامت فرض واجب نہیں کہ ضرور اسے ہی امام بنایا جائے بلکہ یہ اسلام میں ایک رخصت ہے، اس رخصت کو حنفی مذہب چھینتا ہے کہ بچے کی امامت جائز نہیں، حالانکہ حضورؐ جائز فرماتے ہیں۔" ص ۱۷۶ و ۱۷۷

مؤلف صاحب امام قدوری، شیخ الاسلام مرغینانی صاحب ہدایہ جیسے اکابر حنفیہ تک کے متعلق جو ثقاہت و عدالت میں بہت بڑا درجہ رکھتے ہیں نہایت جوش اور علائیہ بار بار لکھتے ہیں کہ انھوں نے فقہ حنفی کے مسائل زبردستی امام ابو حنیفہ کے ذمہ منسوب کر دیئے ظاہر ہے کہ اکابر امت پر اس تہمت طرازی کی سزا انہیں قدرتی طور پر ملنی چاہیئے تھی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور وہ اس سنگین ترین کذب بیانی میں گرفتار ہوئے کہ جس سے زیادہ سنگین کوئی کذب بیانی دنیا پر کبھی نہیں بولا گیا۔ یعنی خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں افترا پردازی اور دروغ بیانی! ملاحظہ کیجیے خط کشیدہ الفاظ، حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہیں ثابت نہیں کہ آپ نے یہ فرمایا ہو کہ "قاری بچے کی امامت جائز ہے"۔ مؤلف نے کمال کر دیا! اپنے مذہب کی تائید و نصرت میں حدیث تک وضع کر ڈالی، دیکھئے مؤلف نے اپنے عنوان کی تائید میں صرف اتنا نقل کیا ہے کہ "عمرو بن سلمہ نے چھ سات سال کی عمر میں لوگوں کی امامت کرائی"۔ اب آپ خود ملاحظہ فرمائیں کہ اس روایت میں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی پسندیدگی کا ذکر کہاں ہے اور یہ کہاں مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے قاری بچے کی امامت جائز فرماتے ہیں۔ اگر مؤلف عمرو بن سلمہ کی پوری روایت جو بخاری میں مذکور ہے نقل کر دیتے تو ان کی اس غلط بیانی کی ساری حقیقت کھل جاتی۔ اب عمرو بن سلمہ کی پوری روایت پڑھ لیجیے جو درج ذیل ہے۔

عن ایوب عن ابی قلابة عن عمرو بن سلمة قال قال لی ابو قلابة الا تلقاه فتسأله قال فلقیته فسألته فقال کنا بماء ممر الناس وکان یمر بنا الرکبان فنسألهم ما للناس ما للناس ما هذا الرجل فیقولون یزعم ان الله ارسله اوحی الیه او اوحی الله بکذا فکنت احفظ ذلک الکلام وکأنما یقر فی صدری وکانت العرب تلوم باسلامهم الفتح فیقولون اترکوه وقومه فانه ان ظهر علیهم فهو نبی صادق فلما کانت وقعة اهل الفتح بادر کل قوم باسلامهم وبدر ابی قومی باسلامهم فلما قدم قال جئتکم والله من عند النبی صلی الله علیه وسلم حقا فقال صلوا صلوٰة کذا فی حین کذا وصلوٰة کذا فی حین کذا فاذا حضرت الصلوٰة فلیؤذن احدکم ولیؤمکم اکثرکم قرآنا فنظروا فلم یکن احد اکثر قرآنا منی لما کنت اتلقی من الرکبان فقدمونی بین ایدیهم وانا ابن ست او سبع سنین وکانت علی بردة کنت اذا سجدت تقلصت عنی فقالت امرأة من الحی الا تغطون عنا است قارئکم فاشتروا فقطعوا لی قمیصا فما فرحت بشیء فرحی بذلک القمیص

ایوب، ابو قلابہ سے اور وہ عمرو بن سلمہ سے ناقل ہیں ایوب کہتے ہیں کہ مجھ سے ابو قلابہ نے کہا کہ تم عمرو بن سلمہ سے مل کر دریافت کیوں نہیں کرتے۔ چنانچہ میں نے ان سے مل کر پوچھا تو وہ کہنے لگے کہ ہم ایسے پانی کے پاس قیام پذیر ہیں جو لوگوں کا گزرگاہ تھا جب کارواں ہمارے پاس سے گزرتا تو ہم ان سے پوچھا کرتے کہ لوگوں میں کیا چرچا ہے یہ کون شخص ہے اور وہ بتلاتے رہتے کہ یہ صاحب مدعی ہیں کہ اللہ نے ان کو بھیجا ہے ان کی طرف وحی کی ہے اور یہ وحی کی ہے میں اس کلام کو یاد کر لیتا ہوں اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ میرے سینہ میں جاگزیں ہو گیا ہے۔ اور عرب کا اس وقت یہ حال تھا کہ وہ اسلام قبول کرنے کے لئے فتح مکہ کے منتظر تھے۔ اور کہا کرتے تھے کہ ان کو اپنی قوم سے نبٹنے دو اگر یہ ان پر غالب آگئے تو سچے نبی ہیں۔ پھر جب مکہ فتح ہو گیا۔ تو ہر قوم نے دربارگاہ نبوی میں حاضر ہو کر اپنے اسلام لانے میں عجلت سے کام لیا۔ اور میرے والد نے میری قوم سے بھی پہلے پہنچے اور جب وہ واپس ہوئے تو کہنے لگے خدا کی قسم میں نبی برحق صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے آرہا ہوں۔ انھوں نے فرمایا ہے کہ تم فلاں نماز فلاں وقت پر ادا کرو اور فلاں نماز فلاں وقت پر۔ اور جب نماز کا وقت آجائے تو تم میں سے ایک شخص اذان دے اور جے

میں اس روایت کو پیش کرتے۔ اور حافظ ابن الترکمانی الجوہر النقی میں فرماتے ہیں:۔

ذکر صاحب الکمال انه لم یلق النبی صلی الله علیه وسلم ولم یثبت له سماع والظاهر ان امامته لقومه لم تبلغ النبی صلی الله علیه وسلم والدلیل علیه انه کان اذا سجد خرجت استه وهذا غیر جائز وقال ابن سعد قال احمد لی کان یضعف امر عمرو بن سلمة وقال مرة دعه لیس بشیٔ

الکمال فی اسماء الرجال کے مصنف نے ذکر کیا ہے کہ عمرو بن سلمہ کی ملاقات آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ہوئی اور نہ یہ ثابت ہے کہ انھوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کوئی حدیث سنی ہو اور ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی امامت کی اطلاع آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں ہوئی اور اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ جب سجدہ کرتے تھے تو ان کے سرین کھل جاتے تھے اور یہ چیز نماز میں جائز نہیں ہے۔ ابن سعد کہتے ہیں کہ امام احمد ابن حنبل عمرو بن سلمہ کے واقعہ کی تضعیف کرتے تھے اور ایک دفعہ تو آپ نے یوں فرمایا کہ چھوڑو یہ کچھ نہیں ہے۔

اور حافظ بدر الدین عینی شرح ہدایہ میں لکھتے ہیں:۔

والعجب انهم لم یحتجوا بقول ابی بکر الصدیق وعمر الفاروق وکبار الصحابة رضی الله عنهم ولم یجعلوه حجة واستدلوا بفعل صبی ست سنین ولا یعرف فرائض الصلوٰة ولا سننها فکیف یتقدم فی الامامة ومنعه صح عن ابن عباس لا یؤم الغلام حتی یحتلم وعن ابن مسعود لا یؤم الغلام الذی لا تجب علیه الحدود رواهما الاثرم فی سننه ۔

تعجب ہے کہ یہ لوگ حضرت ابو بکر صدیقؓ عمر فاروقؓ اور بڑے بڑے صحابہ کے قول کو تو حجت نہیں مانتے اور پھر ایک شش سالہ بچے کے فعل سے استدلال کرتے ہیں جس کو وضو اور نماز کے فرائض تک کا پتہ نہیں، اتنی سی عمر کے بچے کو امامت کے لئے کس طرح آگے بڑھایا جا سکتا ہے جب کہ دینی نقطۂ نظر سے ایسے بچے کو امامت سے روکنے ہی میں زیادہ احتیاط ہے چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بچہ جب تک احتلام نہ ہو امام نہ بنے اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بچہ جس پر حدود جاری نہ کی جا سکیں وہ امامت نہ کرائے یہ دونوں روایتیں اثرم نے اپنی سنن میں نقل کی ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ فتویٰ سنن بیہقی میں موجود ہے اور مصنف عبد الرزاق نے تو حضرت ابن عباس کی روایت انہی الفاظ میں خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے اور شمس الائمہ سرخسی مبسوط میں فرماتے ہیں۔

کیف وقد قال رسول الله صلی الله علیه وسلم الامام ضامن والصبی لا یصلح ضامنا عن نفسه فکیف یصلح منه الضمان لصلوٰة المقتدی ۔

بچہ کی امامت کس طرح صحیح ہو سکتی ہے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرماتے ہیں کہ امام ضامن ہوتا ہے، اور بچہ میں اس کی بھی صلاحیت نہیں کہ وہ ایک پیسہ تک کا ضامن بن سکے پھر اس کی طرف سے مقتدی کی نماز کی ضمانت کس طرح صحیح ہو سکتی ہے۔

امام سرخسی نے جس حدیث کا حوالہ دیا ہے یہ سنن ابی داؤد اور جامع ترمذی میں موجود ہے اب معترضین سے ہم یہ عرض کریں گے کہ اول تو وہ اس غلط بیانی سے توبہ کریں کہ "حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بچے کی امامت جائز فرماتے ہیں" کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اس بارے

میں کوئی اجازت منقول نہیں یہ خود مؤلف نے اپنی طرف سے گھڑ کر لکھ دیا ہے۔ دوسرے اگر عمرو بن سلمہ کی اس روایت پر عمل ہی کا شوق ہے تو پھر پوری طرح عمل کریں اور بچے کی امامت کے ساتھ ساتھ ستر عورت کی قید بھی اڑا دیں کہ اتنی شرم کی بھی کیا ضرورت ہے۔

ہبہ کی ہوئی چیز کا مسئلہ

ارشاد خیر الوریٰ | عن ابن عباس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم العائد فی ھبتہ کالکلب یعود فی قیئہ .... (بخاری)

ہبہ کی ہوئی چیز کا واپس لینے والا مانند کتے کے ہے جو قے کر کے چاٹ لیتا ہے۔

فقہ کا تصرف | اذا وھب ھبۃ لاجنبی فلہ الرجوع فیھا ... (ہدایہ کتاب الہبۃ) جب کسی غیر شخص کو کوئی چیز ہبہ کر دی جائے تو ہبہ کرنے والے کو اسے واپس لینے کا اختیار ہے حنفی بھائیو! عزت رسول کو سامنے رکھ کر بتاؤ کہ آپ رسول خدا کا حکم ماننا چاہتے ہیں یا حضور کے خلاف قول امام پر ایمان لانا چاہتے ہیں" ص ۱۷۷۔ سوچیے تو حضور ہبہ کو واپس لینے سے منع فرمائیں اور فقہ رجوع کی اجازت دے۔ کیا فقہ حدیث سے ٹکر نہیں لے رہی ہے ص ۱۷۸۔

ہدایہ میں یہ مسئلہ مع دلیل مذکور ہے۔ ناظرین خود فیصلہ کر لیں، فرماتے ہیں:۔

ولنا قولہ علیہ السلام الواھب احق بھبتہ مالم یثب منھا ای لم یعوض

ہماری دلیل حضور علیہ السلام کا یہ فرمان ہے کہ ہبہ کرنے والا اپنی موہوبہ چیز کا اس وقت تک زیادہ حقدار ہے جب تک کہ اس کو اس چیز کا عوض نہ مل جائے۔

یہ حدیث سنن ابن ماجہ میں بروایت ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ اور معجم طبرانی اور سنن دارقطنی میں بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مستدرک حاکم میں بروایت حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ منقول ہے اور حضرت ابن عمرؓ کی روایت کے متعلق حاکم نے یہ بھی تصریح کی ہے کہ صحیح علی شرط الشیخین یعنی یہ حدیث بخاری و مسلم کی شرط پر صحیح ہے، اسی طرح ابن حزم نے بھی اس روایت کو صحیح کہا ہے، اور حافظ عبد الحق نے الاحکام میں لکھا ہے کہ اس کے رواۃ ثقات ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ یہ حق محض قانونی ہے۔ ورنہ اخلاقی طور پر ایسا کرنا سخت مکروہ ہے چنانچہ صاحب ہدایہ لکھتے ہیں کہ:۔

والکراھۃ لازمۃ لقولہ علیہ السلام العائد فی ھبتہ کالعائد فی قیئہ وھذا لاستقباحہ

لیکن ہبہ کے واپس لینے میں کراہت لازمی ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ہبہ کو واپس لینے والا ایسا ہے جیسا کہ قے کر کے دوبارہ اس کو چاٹنے والا۔ اور یہ تشبیہ اس فعل کی قباحت ہی کے لئے ہے۔

مؤلف صاحب نے حدیث اور فقہ میں ٹکراؤ ثابت کر دیا نہ حدیث کو سمجھے نہ فقہ کو۔ ہدایہ میں کراہت کا صاف حکم آپ کو نظر نہ آیا اور اپنی پیش کردہ حدیث کے بارے میں اتنا نہ سوچا کہ کتے کے فعل کا ذکر قباحت کے لئے ہے۔ حرمت کے لئے نہیں۔

استسقاء کی نماز باجماعت

حضرت اکرم کا فیصلہ | عن عبد اللہ بن زید قال خرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوما الی المصلی یستسقی فصلی بھم رکعتین جھر فیھما بالقراءۃ واستقبل القبلۃ یدعو ورفع یدیہ وحول

نہیں سمجھ رہے تھے کہ نجاشی کا جنازہ آپ کے آگے رکھا ہوا ہے۔

اور مسند احمد میں اسی روایت میں یہ الفاظ ہیں وما نحسب الجنازۃ الا موضوعۃ بین یدیہ ہم جنازے کے متعلق اس کے علاوہ اور کچھ نہیں سمجھ رہے تھے کہ وہ آپ کے سامنے رکھا ہوا ہے۔ بلکہ صحیح ابن عوانہ میں یہ تصریح بھی موجود ہے کہ فصلینا خلفہ ونحن لا نری الا ان الجنازۃ قدامنا ہم نے جب آپ کے پیچھے نماز پڑھی تو ہمیں اس وقت اس کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا تھا کہ جنازہ ہمارے آگے رکھا ہوا ہے۔ اب مؤلف صاحب اگر معجزہ کے منکر نہیں ہیں تو ذرا آنکھیں کھول کر دیکھیں کہ اس حدیث سے دوپہر کے سورج کے مانند نماز جنازہ غائبانہ ثابت ہو رہی ہے یا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اعجاز کی بدولت جنازہ کی موجودگی میں نماز جنازہ پڑھی جارہی مؤلف کو یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ اگر نماز جنازہ غائبانہ مشروع تھی تو اس میں نجاشی ہی کی کیا تخصیص تھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کے علاوہ اور مسلمانوں کی بھی نماز جنازہ غائبانہ ضرور ادا فرماتے حالانکہ صحیح روایات میں نجاشی کے علاوہ کسی اور میت پر نماز غائبانہ ادا کرنا آپ سے منقول نہیں۔ چنانچہ محدث سلام اللہ حنفی، محلی شرح مؤطا میں فرماتے ہیں :۔

ان ذلک خاص بالنجاشی لانہ لم یثبت انہ صلی اللہ علیہ وسلم صلی علی غائب غیرہ مع انہ توفی خلق منہم غیب فی الاسفار کارض حبشۃ ومن اعز الناس علیہ کان القراء ولم یؤثر عنہ قط انہ صلی علیہم

یہ واقعہ نجاشی کے ساتھ خاص ہے کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے یہ ثابت نہیں کہ آپ نے ان کے علاوہ کسی غائب شخص کی نماز جنازہ ادا کی ہو حالانکہ صحابہ کی ایک کثیر تعداد نے آپ کی غیر موجودگی میں بحالت سفر انتقال کیا جیسے کہ حبشہ وغیرہ میں اور ان لوگوں میں آپ کو سب سے زیادہ عزیز قراء تھے (جو بیر معونہ میں شہید ہوئے) مگر آپ سے کہیں یہ مروی نہیں کہ آپ نے ان کی نماز جنازہ غائبانہ ادا کی ہو۔

جماعت میں اکہری تکبیر

ختم نبیان کا حکم | أمر بلال ان یشفع الاذان وان یوتر الاقامۃ الا الاقامۃ .... (بخاری ومسلم) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال کو حکم دیا کہ وہ اذان کے کلمات دوہرے کہیں اور تکبیر کے کلمات اکہرے سوائے قد قامت الصلوٰۃ کے۔

فقہ کی زیادتی | والاقامۃ مثل الاذان (ہدایہ باب الاذان) اور تکبیر بھی مثل اذان کے دوہری کہنی چاہیئے"۔ حدیث شریف میں حضور بلال کو اور بلال کو سنا کر اپنی امت کو حکم دے رہے ہیں کہ تکبیر کے کلمات اکہرے کہے جائیں، لیکن امت کے اندر ایک حنفی مذہب گھڑ لیا گیا ہے جس میں حکم دیا گیا ہے کہ تکبیر کے کلمات دوہرے کہے جائیں حضور کے حکم کی کوئی پرواہ نہیں۔ مسجدوں میں کوئی اکہری تکبیر نہیں کہتا۔ سارے ملک کے اندر امام کے قول کی "وحی" پر ایمان لانے والے دوہری تکبیر کہتے ہیں۔ کیا مجال جو اکہری تکبیر کہہ جائیں اور اگر کوئی حضور کے حکم سے اکہری تکبیر کہہ بیٹھے تو اس کے ساتھ لڑنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ دراصل یہ لڑائی اکہری تکبیر کہنے والوں کے ساتھ نہیں ہے بلکہ یہ لڑائی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے جنہوں نے اکہری تکبیر کہنے کا حکم دیا ہے، ص ۱۸۱، ۱۸۲

اس کے بعد حاشیہ پر فرماتے ہیں :۔

"اگر کوئی کہے دوہری تکبیر بھی ایک روایت میں آئی ہے تو جواب یہ ہے کہ ہم اس روایت کی مع سند میں کلام کئے بغیر مان لیتے ہیں اور اسی لئے دوہری تکبیر کہنے والوں کو روکتے ٹوکتے نہیں۔ اکہری تکبیر کہنے والوں کو روکنے والے خدا کے سامنے جواب دینے کے دن کو یاد کرکے بتائیں کہ وہ بخاری و مسلم کی متفق علیہ حدیث آفتاب نصف النہار کو کیوں نہیں مانتے جس میں بلال کو حضور نے اکہری تکبیر کہنے کا حکم دیا ہے۔ حنفی بھائی اس چودھویں کے چاند کی چاندنی میں بیٹھنا کیوں گوارا نہیں کرتے۔ جگ مگ کرنے والے ہیرے کو کیوں نہیں دیکھ سکتے؟ امر بلال کے آگے کیوں نہیں سر تسلیم خم نہیں کرتے؟ صادق" ص ۱۸۲۔

یہ دونوں عبارتیں آپ کے سامنے ہیں اب آپ خود فیصلہ فرمالیں کہ مولانا صادق صاحب کے اس دعوے میں کس قدر صداقت ہے کہ

"ہم دوہری تکبیر کہنے والوں کو روکتے ٹوکتے نہیں"

دوبارہ پھر غور کرلیجیے کہ اس تحریر میں دوہری تکبیر کہنے والوں پر کہیں روک ٹوک تو نہیں ہے۔

پھر ایک طرف یہ لکھ رہے ہیں کہ:۔

"امت کے اندر ایک حنفی مذہب گھڑ لیا گیا ہے جس میں حکم دیا گیا ہے کہ تکبیر کے کلمات دوہرے کہیں جائیں" الخ

اور دوسری طرف یہ مان رہے ہیں کہ:۔

"دوہری تکبیر بھی ایک روایت میں آئی ہے"

معلوم ہوا کہ دوہری تکبیر کہنے والے بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی کی تعلیم پر عمل کر رہے ہیں۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ مؤلف دوہری تکبیر کی روایت کو بغیر کسی کلام کے ماننے کے لئے تیار ہیں۔ اس لئے ہم بھی دوہری تکبیر کے دلائل پر مزید روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ البتہ مؤلف کو یہ اشکال ہے کہ امر بلال میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اکہری تکبیر کہنے کا حکم دیا ہے۔ سو اول تو یہ روایت اکہری تکبیر پر صراحۃً دال نہیں۔ بلکہ جیسا کہ شمس الائمہ سرخسی مبسوط میں لکھتے ہیں:۔

معناہ امر بلالا ان یوذن بصوتین ویقیم بصوت واحد (مبسوط ج ۱ صفحہ ۲۹)

اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے بلال کو حکم دیا کہ وہ اذان کے کلمات دو آوازوں میں ادا کریں اور اقامت کے ایک آواز میں۔

یعنی اذان کے کلمات ٹھیر ٹھیر کر دو آوازوں سے کہیں اور اقامت میں ٹھیرنے کی ضرورت نہیں ایک آواز میں سب کلمات کہنے چاہئیں اور بالفرض اگر اس کے وہی معنے لئے جائیں جو مؤلف نے بیان کئے ہیں تو قاضی شوکانی کی تحقیق اس سلسلہ میں یہ ہے کہ "امر بلال" والی روایت حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے منسوخ ہے کہ جو مسند احمد، سنن نسائی، سنن ابی داؤد، جامع ترمذی اور سنن ابن ماجہ میں مذکور ہے اور جس میں یہ صاف تصریح ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اقامت کے سترہ کلمے تعلیم فرمائے تھے" چنانچہ وہ نیل الاوطار میں لکھتے ہیں۔

وھو حدیث صححہ الترمذی وغیرہ وھو متاخر عن حدیث بلال الذی فیہ الامر بایتار الاقامۃ لانہ بعد فتح مکۃ لان ابا محذورۃ من مسلمۃ الفتح وبلال امر بافراد الاقامۃ اول ما شرع الاذان فیکون ناسخا وقد روی ابو الشیخ ان بلالا اذن بمنی ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثم مرتین مرتین واقام مثل ذلک

اور اس حدیث کو ترمذی وغیرہ نے صحیح کہا اور یہ بلال کی اس حدیث کے بعد کی روایت ہے کہ جس میں ان کو اقامت کے اکہرا کہنے کا حکم دیا گیا تھا۔ کیونکہ یہ حدیث فتح مکہ کے بعد کی ہے۔ اس لئے کہ ابو محذورہ فتح مکہ میں اسلام لائے ہیں۔ اور بلال کو اقامت کے اکہرا کہنے کا حکم اس وقت ملا تھا جبکہ اذان کی ابتدا ہوئی تھی۔ لہذا ابو محذورہ کی روایت اس کی ناسخ ہوگی اور ابو الشیخ نے روایت

کہی ہے کہ بلال نے منیٰ میں اذان کہی اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام
وہاں تشریف فرما تھے تو انھوں نے کلمات اذان کو دو دو بار دہرایا
اور اقامت بھی اسی طرح کہی۔

لیکن ہماری رائے میں شمس الائمہ کی توجیہ زیادہ پسندیدہ ہے کیونکہ مصنف عبدالرزاق اور دیگر کتب حدیث میں صحیح روایات سے ثابت ہے کہ حضرت بلالؓ اذان کی طرح اقامت کے بھی دوہرے دوہرے کلمات کہا کرتے تھے۔

نماز کی امامت کا مسئلہ

لوگوں کو امامت کون کرائے اس کے متعلق حضرت ختم نبیان فرماتے ہیں۔

يؤم القوم أقرؤهم لكتاب الله تعالى فإن كانوا في القراءة سواء فأعلمهم بالسنة فإن كانوا في السنة سواء فأقدمهم هجرة فإن كانوا في الهجرة سواء فأقدمهم سنا (مسلم شریف)

امامت کرائے لوگوں کی وہ جو سب سے زیادہ قرآن مجید کا قاری ہو اگر قرأت کے جاننے میں سب برابر ہوں تو پھر سب سے زیادہ سنت کا جاننے والا اگر سنت کے علم میں بھی سب برابر ہوں تو سب سے پہلے ہجرت کرنے والا اگر ہجرت میں بھی سب برابر ہوں تو عمر میں سب سے بڑا امامت کرائے (ص ۱۸۳)

فقہ کی بخیہ کاری

اب امامت کے متعلق حدیث رسولؐ پر فقہ کی بخیہ کاری ملاحظہ ہو۔

وأولى الناس بالإمامة أعلمهم بالسنة فإن تساووا فأقرؤهم فإن تساووا فأورعهم فإن تساووا فأسنهم

(ہدایہ جلد اول باب الامامۃ)

امامت کا سب سے بڑھ کر مستحق وہ ہے جو سنت کا سب سے زیادہ عالم ہو اگر اس میں سب برابر ہوں۔ تو بعد وہ جو سب سے زیادہ قرآن کا قاری ہو اگر اس میں سب برابر ہوں تو پھر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے اگر اس میں سب برابر ہوں تو پھر سب سے زیادہ بڑی عمر والا امامت کا مستحق ہے۔

اب حدیث میں فرمودۂ رسولؐ کی چار صورتیں اور فقہ کی ان چار صورتوں کا مقابلہ کریں۔ حضورؐ نے پہلے نمبر پر امامت کا سب سے زیادہ مستحق قرآن مجید کا سب سے زیادہ قاری مقرر فرمایا ہے اور فقہ میں پہلے نمبر پر سب سے زیادہ سنت کا عالم بتایا گیا ہے گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو تبدیل کر دیا ہے۔ دوسرے نمبر پر حضورؐ نے امامت کا مستحق سب سے زیادہ سنت کا عالم رکھا ہے۔ فقہ میں دوسرے نمبر پر قرآن کا قاری مقرر کیا گیا ہے۔ حضورؐ کے فرمان کا رد و بدل ہے یا نہیں۔ تیسرے نمبر پر حضورؐ نے سب سے پہلے ہجرت کرنے والا فرمایا گر فقہ میں تیسرے نمبر پر پرہیزگاری رکھی گئی ہے، یہاں ارشاد نبوی میں تغیر ہے۔ چوتھی صورت میں حدیث کو بحال چھوڑ دیا۔

چلئے آگے۔ حضورؐ کی بیان کردہ چار صورتوں میں رد و بدل کر کے بھی سکوت اختیار نہیں کیا۔ چنانچہ درمختار میں یوں اضافہ کیا گیا ہے:-

والأحق بالإمامة الأعلم بأحكام الصلوٰة ثم الأحسن تلاوة ثم الأورع ثم الأسن ثم الأحسن خلقا ثم الأحسن وجها ثم الأشرف نسبا ثم الأنظف

۱:- سب سے زیادہ امامت کا مستحق سب سے زیادہ نماز کے احکام جاننے والا ہے۔ ۲:- پھر سب سے اچھی تلاوت کرنے والا ۳:- پھر سب سے زیادہ پرہیزگار۔ ۴:- پھر سب سے پہلے

تو۔ فان استووا یقرع او الخیار للقوم
(تنویر الابصار متن درمختار)

اسلام لانے والا۔ ۵:۔ پھر سب سے زیادہ خوش اخلاق۔ ۶:۔ پھر سب سے زیادہ خوب صورت چہرے والا۔ ۷:۔ پھر سب سے زیادہ شریف النسب۔ ۸:۔ پھر سب سے اچھے لباس والا۔ ۹:۔ اور اگر ان صفات میں برابر ہوں تو قرعہ اندازی کریں۔ ۱۰:۔ یا لوگوں کو اختیار ہے جسے چاہیں پسند کریں۔

حدیث میں چار صورتیں تھیں، ان میں تغیر کیا اس کے بعد دس صورتیں بنا ڈالیں" ص ۱۸۵، ۱۸۶ و ۱۸۷۔)

اصل یہ ہے کہ مؤلف نے اس مسئلہ میں جو حدیث مسلم کے حوالہ سے نقل کی ہے۔ اس میں سخت اضطراب ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ اس روایت کا دارو مدار اسماعیل بن رجاء اور اوس بن ضمعج دو شخصوں پر ہے اور یہ دونوں شخص جیسا کہ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں تصریح کی ہے بخاری کی شرط پر نہیں ہیں علاوہ ازیں محدث ابن ابی حاتم نے علل الحدیث میں اپنے والد امام ابو حاتم سے نقل کیا ہے کہ مشہور ناقد حدیث شعبہ کو جو فن حدیث میں امیر المؤمنین خیال کئے جاتے ہیں۔ اس روایت کی صحت میں توقف تھا۔ بہر حال۔ اسماعیل نے اس روایت کو اوس سے اور اوس نے اس کو حضرت ابو مسعود انصاری سے روایت کیا ہے پھر اسمٰعیل سے اس کو حسب ذیل تین مشہور محدثین نقل کرتے ہیں۔

۱۔ اعمش۔ ۲۔ شعبہ۔ ۳۔ حجاج بن ارطاۃ۔ اعمش کے شاگردوں کے بیان میں اضطراب ہے بعض نے تو یہی الفاظ نقل کئے ہیں جو مؤلف نے ذکر کئے لیکن امام نسائی نے اپنی سنن میں حضرت فضیل بن عیاض کی زبانی اعمش کی اسی سند کے تحت نقل کیا ہے

یؤم القوم اقرءهم لکتاب اللہ فان کانوا فی القراءۃ سواء فاقدمہم فی الہجرۃ فان کانوا فی الہجرۃ سواء فاعلمہم بالسنۃ فان کانوا فی السنۃ سواء فاقدمہم سنا۔

قوم کی امامت وہ کرے جو سب سے زیادہ کتاب اللہ کا قاری ہو۔ اور اگر قرأت میں سب برابر ہوں تو پھر وہ شخص جو ہجرت میں سب سے پیش پیش ہو اور اگر ہجرت میں بھی سب برابر ہوں تو وہ شخص جو سنت کا سب سے زیادہ عالم ہو اور اگر سنت میں بھی سب برابر ہوں تو پھر وہ شخص کہ جو عمر میں سب سے بڑا ہو۔

اسی طرح سنن دارقطنی اور مستدرک حاکم میں اعمش کے ایک اور مشہور شاگرد جریر بن حازم کی زبانی یہی روایت اسی ترتیب کے ساتھ اسی کے قریب قریب الفاظ میں موجود ہے۔ اختلاف ظاہر ہے کہ صحیح مسلم کی روایت میں قدیم الہجرت تیسرے نمبر پر ہے اور اعلم بالسنۃ دوسرے نمبر پر اور ان تینوں کتابوں کی روایت میں قدیم الہجرت دوسرے نمبر پر اور اعلم بالسنۃ تیسرے نمبر پر۔

اب شعبہ کی روایت ملاحظہ ہو جو خود صحیح مسلم میں بھی موجود اور سنن ابو داؤد اور سنن ابن ماجہ میں بھی، اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

یؤم القوم اقرءهم لکتاب اللہ واقدمہم قراءۃ فان کانت قراءتہم سواء فلیؤمہم اقدمہم ہجرۃ فان کانوا فی الہجرۃ سواء فلیؤمہم اکبرہم سنا

قوم کی وہ امامت کرے جو سب سے زیادہ کتاب اللہ کا قاری ہو اور جو قرأت میں سب سے مقدم ہو۔ اور اگر سب کی قرأت برابر ہے تو وہ امامت کرے جس نے سب سے پہلے ہجرت کی ہو۔ اور اگر ہجرت میں بھی سب برابر ہوں تو وہ امامت کرے جو عمر میں سب سے بڑا ہو۔

یہ واضح ہے کہ شعبہ کی روایت میں اختلاف نہیں ہے اس لئے انکی روایت کو اعمش کی روایت پر ترجیح ہوگی۔ انکی روایت میں اعلم بالسنۃ کا سرے سے ذکر نہیں ہے۔

اور حجاج ابن ارطاۃ کی جو روایت سنن دارقطنی اور مستدرک حاکم میں مذکور ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

یؤم القوم اقدمهم هجرة فان كانوا فی الهجرة سواء فافقههم فی الدين فان كانوا فی الفقه سواء فاقرؤهم للقرآن۔

لوگوں کی وہ شخص امامت کرے کہ جس نے سب سے پہلے ہجرت کی ہے اور اگر وہ ہجرت میں سب برابر ہیں تو وہ شخص جو دین میں سب سے زیادہ فقیہ ہو اور اگر فقہ میں سب برابر ہوں تو پھر وہ شخص جو کہ قرآن کا زیادہ قاری ہو۔

اس روایت میں قدیم الہجرۃ اول نمبر پر ہے اور فقیہ دوسرے نمبر پر اور قاری تیسرے نمبر پر۔ مگر مولف نے نہ اس روایت کا ذکر کیا نہ شعبہ کی مذکورہ روایت کا کہ جو خود صحیح مسلم میں موجود ہے اور اعتراض کر نا شروع کر دیا۔ حالانکہ حجاج کی روایت سے وہی مسئلہ نکلتا ہے جو ہدایہ میں مذکور ہے کہ جو شخص دین کا سب سے زیادہ فقیہ ہو یعنی جو سنت کا سب سے بڑا عالم ہو وہ امامت میں اس شخص پر مقدم ہے کہ جو سب سے زیادہ قرآن کا قاری ہو۔ اور یہ مسئلہ صرف حنفیوں ہی کا نہیں۔ بلکہ جیسا کہ علامہ نووی نے شرح صحیح مسلم میں تصریح کی ہے۔ امام مالک اور امام شافعی کا بھی مذہب ہے اور اعمش اور شعبہ کی روایات میں جو اقرا کی تقدیم مذکور ہے وہ ان کے مسلک کے خلاف اس لئے نہیں کہ اس عہد میں قرا اور علما علیحدہ علیحدہ نہ تھے بلکہ جو کتاب اللہ کا قاری ہوتا تھا۔ وہ سنت کا بھی عالم ہوتا تھا۔ چنانچہ صاحب ہدایہ لکھتے ہیں:۔

ولنا انهم كانوا يتلقونه باحكامه فقدم فی الحديث ولا كذلك فی زماننا فقدمنا الاعلم۔

جو ان میں سب سے بڑا قاری ہوتا تھا۔ وہ سب سے بڑا عالم بھی ہوتا تھا کیونکہ یہ حضرات کتاب اللہ کی تحصیل مع اس کے احکام کے کرتے تھے۔ اسی بنا پر حدیث میں قرآن کے سب سے بڑے قاری کو مقدم رکھا گیا ہے۔ اور ہمارے عہد میں چونکہ ایسا نہیں ہوتا اس لئے ہم نے اس کو مقدم رکھا جو سب سے بڑا عالم ہو۔

صاحب ہدایہ نے اس سلسلہ میں جو کچھ بیان کیا ہے امام بیہقی نے سنن کبریٰ میں ایک مستقل باب اسی کے ثبوت کے لئے قائم کیا ہے، جس کا عنوان ہے۔ باب البيان انه انما قيل يؤمهم اقرؤهم ان من مضى من الائمة كانوا يسلمون كبارا فيتفقهون قبل ان يقرؤا مع الفقه (یعنی یہ باب اس بیان میں ہے کہ یہ جو فرمایا گیا ہے کہ "لوگوں کی امامت وہ شخص کرے جو قرآن کا سب سے زیادہ قاری ہو) اس کی وجہ یہ ہے کہ گذشتہ عہد میں جو حضرات امام ہوتے تھے۔ وہ بڑی عمر میں اسلام لاتے تھے۔ اور اس لئے وہ حضرات قاری بننے سے پہلے پہلے قرأت کے ساتھ ساتھ فقہ بھی سیکھتے رہتے تھے) اب جس کا جی چاہے سنن کبریٰ میں ان روایات کو دیکھ لے جن میں کہ یہ مذکور ہے کہ صحابہ قرآن کی تعلیم کے ساتھ اس کے احکام کا تفصیلی علم بھی حاصل کیا کرتے تھے۔ اب غور کیجئے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فرمان میں رد و بدل مولف نے کیا ہے یا ان علما نے۔ یہ علما تو ٹھیک اسی حالت کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں جو عہد نبوت میں تھی۔ مگر مولف کا منشا یہ ہے کہ قاری اگر جاہل بھی ہو تو اس کو عالم پر مقدم کر دیا جائے۔ حالانکہ اس زمانے میں "اقرا" کے معنی "اعلم" ہی کے تھے۔ علاوہ ازیں یہ بھی ذہن میں رہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے آخری ایام میں امامت کے لئے حضرت ابوبکر صدیق رض کو مقرر فرمایا جو اس عہد میں سب سے بڑے عالم تھے۔ اور حضرت ابی بن کعب کو امام نہیں بنایا جو قرأت میں سب سے مقدم تھے۔ حالانکہ مولف کے اصول پر معاملہ برعکس ہونا چاہیے تھا۔ پھر مولف نے ہجرت اور پرہیزگاری میں تضاد سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ یہاں بھی وہی معاملہ ہے جو ہجرت میں گھر بار کو چھوڑ دیتا تھا وہ خدا کے نواہی کو پہلے چھوڑ دیتا تھا۔ اور مشکوٰۃ شریف میں صاف روایت موجود ہے کہ:۔

والمہاجر من ہاجر الخطایا والذنوب ... کہ مہاجر وہ ہے کہ جو خطاؤں سے اور گناہوں سے بچے۔ شاید مولف کے نزدیک ہجرت کا مطلب صرف ظاہری طور پر اپنے وطن کو خیرباد کہنا ہے حالانکہ شرعی نقطۂ نگاہ سے ایسا شخص مہاجر کہلانے کا مستحق نہیں۔ مولف صاحب مشکوٰۃ کی پہلی حدیث ملاحظہ فرمائیں۔

انما الاعمال بالنیات وانما لامرئ ما نوی فمن کانت ہجرتہ الی اللہ ورسولہ فہجرتہ الی اللہ ورسولہ ومن کانت ہجرتہ الی دنیا یصیبہا او امرأۃ ینکحہا فہجرتہ الی ما ہاجر الیہ۔

بلاشبہ اعمال کا تمام تر دارومدار نیتوں پر ہے اور ہر شخص کے لئے وہی ہے جس کی وہ نیت رکھے سو جس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہوئی۔ اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہوئی اور جس کی ہجرت دنیا کے کمانے یا کسی عورت کے نکاح کرنے کے لئے ہوئی سو اس کی ہجرت اسی مطلب کے لئے ہوئی جس کے لئے اس نے ہجرت کی۔

اب خود غور کیجئے کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت بغیر پرہیزگاری کے کیوں کر ممکن ہوگی۔ علاوہ ازیں دیلمی نے حضرت براء رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ:۔

الصلوٰۃ خلف رجل ورع مقبولۃ　　　پرہیزگار شخص کی اقتدا میں نماز مقبول ہے۔

اور درمختار سے جو مولف نے نقل کیا ہے وہ آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی تفصیل ہے کہ:۔

اجعلوا ائمتکم خیارکم فانہم وفدکم فیما بینکم وبین ربکم (سنن کبریٰ بیہقی)۔　　　تم اپنے امام ان لوگوں کو مقرر کرو جو تم میں سب سے بہتر ہوں کیونکہ وہ خدا کے اور تمہارے درمیان تمہارے وفد ہیں۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ امامت کے لئے اپنے میں سے بہترین شخص کا انتخاب کرنا چاہیئے اب صاحب درمختار نے دینی اور دنیوی لحاظ سے جو شخص بہترین ہو سکتے تھے ان کو تفصیل کے ساتھ بتلا دیا۔ اس میں کیا جرم ہوگیا۔ علاوہ ازیں مولف نے تنویر الابصار سے "الاسن" نقل کیا ہے۔ اور اس کا ترجمہ کیا ہے (سب سے پہلے اسلام لانے والا) حالانکہ اس کا صحیح ترجمہ ہے (سب سے زیادہ عمر والا) لیکن مسلم کی ایک روایت میں فاقدمہم سنا بھی موجود ہے جس کا ترجمہ وہی ہے جو مولف نے کیا ہے پھر اعتراض کی گنجائش نہیں اور صحیح بخاری میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان موجود ہے کہ ان من خیارکم احاسنکم اخلاقا (مشکوٰۃ) کہ تم میں بہترین لوگ وہ ہیں جن کے بہترین اخلاق ہیں لیجئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خود ہی یہ حکم دیا کہ بہترین اشخاص کو امام بناؤ اور خود ان ہی کی نشاندہی بھی کردی۔ پھر اعتراض کیوں۔ اور سنن کبریٰ بیہقی کی ایک روایت میں فاحسنہم وجہا بھی موجود ہے جس کے معنی ہیں پھر سب سے زیادہ خوبرو۔ اسی طرح شریف النسب کی امامت کے لئے بھی امام بیہقی نے سنن کبریٰ میں ایک باب قائم کیا ہے اور حدیث (قدموا قریشا) کو استدلال میں پیش کیا ہے۔ غرض مولف نے اس مسئلہ میں خواہ مخواہ بلا تحقیق اعتراضات کی بوچھاڑ کردی ہے۔

نماز کا اوّل وقت

پیغمبر رحمت کا ارشاد | عن ابن عباس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امنی جبریل عند البیت مرتین فصلی بی الظہر حین زالت الشمس وکانت قدر الشراک وصلی بی العصر حین صار ظل کل شیء مثلہ .... (ابوداؤد ترمذی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا امامت کی جبرئیل علیہ السلام نے میری بیت اللہ میں اور ظہر کی نماز پڑھائی جب سورج ڈھل گیا۔ اور اس کا سایہ بقدر ایک تسمہ کے ظاہر ہو گیا اور نماز عصر اس وقت پڑھائی جب ہر چیز کا سایہ اس کے برابر ہو گیا۔

حنفی مذہب کا تخالف

واخر وقتہا عند ابی حنیفۃ اذا صار ظل کل شئ مثلیہ واول وقت العصر اذا خرج وقت الظہر

(ہدایہ جلد اول باب المواقیت)

امام ابو حنیفہ کے نزدیک آخری وقت ظہر کا اور اول وقت عصر کا وہ ہے جب ہر چیز کا سایہ اس سے دو گنا ہو جائے۔

دیکھا آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو فرمائیں کہ سایہ ایک گونہ ہونے پر ظہر کا وقت جاتا رہا۔ اور عصر کا وقت شروع ہو گیا لیکن (بقول مقلدان) امام ابو حنیفہؒ کہتے ہیں ابھی ظہر کا وقت نہیں گیا اور عصر کا وقت شروع نہیں ہوا حضور انور ایک گونہ سایہ ہو جانے پر ظہر ختم اور عصر شروع بتائیں۔ امام ابو حنیفہؒ کہیں نہیں۔ شائد دو گنا ہونے پر ظہر ختم اور عصر شروع ہوتی ہے " ص ۱۸۹ و ۱۹۰۔

افسوس یہ ہے کہ مؤلف نے پوری روایت نقل نہیں کی اور مزید یہ کہ متن کا ترجمہ تک نہیں کیا کیونکہ اس سے یہ معلوم ہو جاتا کہ جبرئیل علیہ السلام نے دوبارا امامت کی تھی۔ بلکہ صرف ایک بار کی امامت کا ذکر کر کے مسئلہ ختم کر دیا۔ پوری روایت حسب ذیل ہے:-

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال امنی جبریل عند البیت مرتین فصلی الظہر فی الاولی منہما حین کان الفئ مثل الشراک ثم صلی العصر حین کان کل شئ مثل ظلہ ثم صلی المغرب حین وجبت الشمس وافطر الصائم ثم صلی العشاء حین غاب الشفق ثم صلی الفجر حین برق الفجر وحرم الطعام علی الصائم وصلی مرۃ الثانیۃ الظہر حین کان ظل کل شئ مثلہ لوقت العصر بالامس ثم صلی العصر حین کان ظل کل شئ مثلیہ ثم صلی المغرب لوقتہ الاول ثم صلی العشاء الاخرۃ حین ذہب ثلث اللیل ثم صلی الصبح حین اسفرت الارض ثم التفت الی جبریل وقال یا محمد ھذا وقت الانبیاء من قبلک والوقت فیما بین ھذین الوقتین

(جامع ترمذی و ابوداؤد)

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جبرئیل علیہ السلام دو بار بیت اللہ کے پاس میری امامت کی۔ سو پہلی دفعہ کی امامت میں تو ظہر اس وقت پڑھی جب کہ سایہ تسمہ کے برابر تھا۔ پھر عصر اس وقت پڑھی جب ہر شے اپنے سایہ کے برابر تھی۔ پھر مغرب اس وقت پڑھی جب آفتاب ڈوبا اور روزہ دار نے افطار کیا پھر عشاء اس وقت پڑھی جب شفق غائب ہو گئی۔ پھر صبح اس وقت پڑھی جب پو پھٹی اور روزہ دار پر کھانا حرام ہوا اور دوسری دفعہ ظہر اس وقت پڑھی جب ہر چیز کا سایہ اس کے برابر تھا جس وقت کہ گذشتہ دن عصر پڑھی تھی پھر عصر اس وقت پڑھی جب ہر چیز کا سایہ دو گنا ہو گیا پھر مغرب پہلے اول وقت پڑھی پھر عشاء اس وقت پڑھی جب کہ ایک تہائی رات جا چکی تھی۔ پھر صبح اس وقت پڑھی جب کہ روشن زمین ہو چکی تھی۔ پھر جبرئیل علیہ السلام نے میری طرف مخاطب ہو کر کہا اے محمد! یہ تم سے پہلے نبیوں کا وقت ہے اور وقت مستحب ان دونوں اوقات کے درمیان ہے۔

دیکھئے اس میں کہیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی یہ تصریح نہیں کہ " سایہ ایک گونہ ہونے پر ظہر کا وقت جاتا رہا اور عصر کا وقت شروع ہو گیا " بات مؤلف نے اپنے جی سے گھڑی ہے۔ افسوس کہ مؤلف اپنے مذہب کی تائید میں احادیث تک میں۔۔ بخل و تصرف سے نہیں چوکتے بلکہ اس میں تو صاف طور پر یہ مذکور ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے دوسرے روز ظہر کی نماز ایک مثل ہونے پر ٹھیک اس وقت پڑھائی تھی کہ جس وقت پہلے روز عصر کی ادا کی تھی۔ اب اسی روایت سے یہ معلوم ہوا کہ ظہر کا وقت ایک مثل سایہ ہو جانے پر ختم نہیں ہوتا

بلکہ اس کے بعد بھی باقی رہتا ہے۔ ہاں یہ ٹھیک ہے کہ اس سے عصر کا بھی ایک مثل پر پڑھنا ثابت ہوتا ہے اور اسی لئے امام مالک کا مسلک یہ ہے کہ ایک مثل کے بعد ظہر و عصر کا وقت مشترک ہے۔

لیکن یہ واقعہ ہجرت سے پہلے بالکل ابتدائی زمانہ کا ہے۔ چنانچہ خود اس روایت میں عند البیت کے الفاظ موجود ہیں جو بتاتے ہیں کہ یہ مکہ معظمہ کا واقعہ ہے اور قاضی شوکانی نے صاف لکھا ہے کہ حدیث جبریل کان بمکۃ فی اول الامر (کہ جبریلؑ کی حدیث مکہ میں ابتدائی زمانہ کی ہے) اسی لئے جیسا کہ شمس الائمہ سرخسی نے تصریح کی ہے:۔

والاوقات ما استقرت علی حدیث امامۃ جبریل علیہ السلام نعینہ انہ صلی الفجر فی الیوم الثانی حین اسفر والوقت یبقی بعد الی طلوع الشمس وفیہ ایضا انہ صلی العشاء فی الیوم الثانی حین ذھب ثلث اللیل والوقت یبقی بعدہ ۔

اوقات کا تعین امامت جبریلؑ والی حدیث پر نہیں ہوا ہے کیونکہ اس میں مذکور ہے کہ انہوں نے نماز فجر دوسرے دن اس وقت پڑھی جب کہ روشنی ہو چکی تھی۔ حالانکہ وقت اس کے بعد بھی طلوع آفتاب تک باقی رہتا ہے نیز اس میں یہ بھی ہے کہ انہوں نے دوسرے دن نماز عشا اس وقت پڑھی تھی، جب کہ تہائی رات جا چکی تھی۔ حالانکہ عشا کا وقت اس کے بعد بھی رہتا ہے۔

لیکن بعد کو جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیان فرمایا کہ:۔

ان للصلوٰۃ اولاً واخراً وان اول وقت صلوٰۃ الظھر حین تزول الشمس وان اخر وقتھا حین یدخل وقت العصر وان اول وقت العصر حین یدخل وقتھا

(ترمذی عن ابی ہریرۃ)

بے شک نماز کا اول اور آخر مقرر ہے اور اول وقت ظہر کا وہ ہے جب کہ آفتاب ڈھل جائے۔ اور اس کا آخر وقت وہ ہے جب کہ عصر کا وقت داخل ہو جائے اور عصر کا اول وقت وہ ہے جب کہ اس کا وقت شروع ہو۔

اور صاف تصریح کی کہ:۔

وقت الظھر مالم یحضر العصر

(صحیح مسلم وسنن نسائی وسنن ابوداؤد عن عبداللہ بن عمرو)

ظہر کا وقت اس وقت تک رہتا ہے جب تک کہ عصر کا وقت نہ آئے۔

تو ظہر کے وعصر کے وقت کا اشتراک ختم ہو گیا۔ اور حدیث جبریلؑ سے یہ ظاہر ہے کہ یہ اشتراک ایک سایہ ہونے کے بعد میں تھا کیونکہ انہوں نے پہلے دن عصر کی اور دوسرے دن ظہر کی نماز اسی وقت پڑھائی تھی۔ لہٰذا عصر کا ایک مثل سایہ پر پڑھنا منسوخ ہوا اور دو مثل سایہ پر متعین رہا کہ جبریل علیہ السلام نے دوسرے دن عصر کی نماز اسی وقت پر پڑھائی تھی۔ لہٰذا یہ اس کا متعین وقت ہے۔ باقی رہا ایک مثل سایہ پر ظہر کا ادا کرنا سو بدستور باقی رہا منسوخ نہیں ہوا۔ جس کی دلیل یہ ہے کہ خلال نے حضرت مغیرہؓ سے نقل کیا ہے کہ:۔

کان اٰخر الامرین من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الابراد (نیل الاوطار)

کہ نماز ظہر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری معمول یہ تھا۔ کہ آپ اس کو ٹھنڈے وقت پر ادا کرتے تھے۔

اور امام بیہقی نے سنن کبریٰ میں اس کو ثابت کرنے کے لئے ایک مستقل باب ان الفاظ میں قائم کیا ہے باب الدلیل علی ان خبر الابراد ناسخ لخبر خباب یعنی یہ باب اس دلیل کے بیان میں ہے کہ نماز ظہر کو ٹھنڈے وقت پر پڑھنے کی حدیث حضرت خباب وغیرہ کی حدیث کی ناسخ ہے۔

اور حجاز میں ایک مثل سایہ ہونے تک ٹھنڈک نہیں ہوتی بلکہ اچھی خاصی تپش باقی رہتی ہے اسی لئے صحیح روایات میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی نماز گرمیوں میں ایک مثل سایہ ہو جانے کے بعد ادا فرمائی۔

ماہر القادری

یادِ رفتگاں

نوابُ محمّدُ اسمٰعیلُ خاںؔ مرحُومُ

ہم نے جب ہوش سنبھالا تو ملک تحریک خلافت کے شور سے گونج رہا تھا، ان دنوں اخباروں میں نواب محمد اسماعیل خاں کا نام بھی نظر سے گزرتا تھا۔ ایک تو "نواب" کے لقب و خطاب ہی میں کافی مرعوبیت اور کشش تھی، پھر یہ معلوم ہوا کہ نواب صاحب ہمارے ضلع کے قصبہ جہانگیر آباد کے زمیندار ہیں، ان سب سے بڑی بات ان کا جذبہ ملی، مرحوم کی شخصیت کے ان نقوش سے لوح قلب و دماغ متاثر ہو کر رہی۔

سنہ ۱۹۲۵ء میں میرا دہلی جانا ہوا، جامع مسجد میں جمعہ کی نماز کے بعد جلسہ تھا، مفتی کفایت اللہ مرحوم جلسہ کے صدر تھے، اس جلسہ میں مولانا عبدالماجد بدایونی نے دھواں دھار تقریر کی۔ نواب محمد اسمٰعیل خاں کو اسی جلسہ میں سب سے پہلے دیکھا۔ مولانا عبدالماجد نواب محمد اسمٰعیل خاں کے ساتھ آئے تھے اور انہی کے ساتھ موٹر کار میں (غالباً) میرٹھ چلے گئے۔

نواب صاحب مرحوم کو دور سے دیکھا مگر دل و دماغ کو ان سے قریب ہوتے محسوس کیا، سبب؟ ان کی خاموش سنجیدگی اور خلوص کی کشش! انھوں نے اس جلسہ میں کوئی تقریر نہیں کی لیکن میرے وجدان نے ان کی زبان سکوت ہی سے بہت کچھ سن لیا۔

نواب صاحب مرحوم سے ملاقات حیدرآباد دکن میں ہوئی، یہ کوئی سنہ ۱۹۳۰ء یا سنہ ۳۹ء کی بات ہے، ایک کلب میں ان کے اعزاز میں عصرانہ دیا گیا، میں بھی اس میں مدعو تھا۔ چائے پانی کے بعد شعر و شاعری ہوئی۔ نواب صاحب نے فرمائش کر کے مجھ سے کئی غزلیں سنیں، ان کے داد دینے کا انداز بہت سنجیدہ تھا، مگر سخن شناسی سے بھرپور!

اس کے بعد کانپور میں بڑے دھوم کا مشاعرہ ہوا، وہ کانفرنس منعقد ہوئی، میں حیدرآباد دکن سے کانپور گیا اور وہاں سے اپنے ایک عزیز سے ملنے کے لئے میرٹھ پہنچا، یہ کیسے ممکن تھا کہ میں میرٹھ جاؤں اور نواب صاحب سے نہ ملوں! ان کی عالی شان کوٹھی "مصطفیٰ کیسل" میں حاضر ہوا۔ بڑے تپاک اور گرمجوشی سے ملے، اور دوسرے یا تیسرے دن مجھ خاکسار ناچیز کی خاطر شام کو ایٹ ہوم میں میرٹھ کے عمائد کو بلایا، بڑی پر لطف دعوت رہی۔ نواب جمشید علی خاں مرحوم رئیس باغپت بھی اس دعوت میں شریک تھے، لہٰذا کم مسلسل دو گھنٹے میں نے اپنا کلام سنایا، مصطفیٰ کیسل کا گوشہ گوشہ، سخن شناسوں کا مجمع، قرینہ کی صاف ستھری محفل، دوسروں پر کیا اثر ہوا یہ تو وہ جانیں، مگر خود میرا دل چاہتا تھا کہ غزل پر غزل سناتا ہی چلا جاؤں ع

کبھی کبھی تو یہ موقعے نصیب ہوتے ہیں

یہ میرا معمول بن گیا کہ جب کبھی میرٹھ جانا ہوتا، نواب صاحب کی خدمت میں ضرور حاضری دیتا۔ یہ زمانہ مسلم لیگ اور کانگریس کی معرکہ آرائی کا تھا۔ نواب صاحب مسلم لیگ کے صف اول کے لیڈر تھے اور اس وصف میں تو وہ شاید تمام مسلم لیگی لیڈروں میں ممتاز تھے —— کہ وہ قیادت کے ہر فرمان پر "YES" کہنے والوں میں نہ تھے، یہ دوسری بات ہے کہ قائد اعظم کے نیاز مندوں کے ہجوم میں ان کی بات چل نہ سکی تھی

مگر وہ اظہار رائے میں کسی کی خوشی ناخوشی کی پروا نہ کرتے وہ شخصیت کے نہیں حق کے ساتھی ہمنوا اور پرستار تھے۔

ایک بار وہ مسلم لیگ کونسل کی کسی اہم میٹنگ میں شرکت کر کے میرٹھ آئے، مجھ سے ملاقات ہوئی تو کسی مسئلہ پر قائد اعظم کے اصرار کو انھوں نے ضد سے تعبیر کیا، اس کا انھیں ملال بھی تھا مگر پارٹی ڈسپلن کے بڑی سختی سے پابند تھے۔ تقسیم ہند سے پہلے کانگریس اور مسلم لیگ کی ملی جلی حکومت Interim Government بنی تو اس میں نواب صاحب کے لئے جانے کی سو فیصدی امید تھی اس منصب کے وہ مستحق ہی نہیں اہل بھی تھے۔ مگر وہ نہیں لئے گئے۔

پاکستان بننے کے بعد وہ کئی بار یہاں آئے، اپنے بچوں، عزیزوں اور دوستوں سے ملنے کے لئے! وہ جب بھی یہاں آتے ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا! سب ان کا دل سے احترام بلکہ محبت کرتے تھے، آخری بار ان سے کراچی میں میرا ملنا ہوا: اپنے صاحبزادے محمد اکرام صاحب کے بنگلہ (باتھ آئی لینڈ) میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ بالائی منزل پر قیام تھا، نزلہ میں مبتلا تھے مگر میری حاضری کی اطلاع ملی تو اوپر بلا لیا۔ چند منٹ بات چیت رہی، چہرے سے نقاہت کے آثار نمایاں تھے، ان کی علالت اور اضمحلال کو دیکھ کر اسی وقت میرا ماتھا ٹھنکا تھا کہ یہ شمع تو بجھی سی جا رہی ہے، "اب تب" کا معاملہ ہے!

ان کے انتقال کی خبر سب سے پہلے جناب فضل کریم فضلی نے سنائی، پھر دوسرے دن اخبارات میں تفصیل آگئی۔ غالب نے یہ مصرعہ ایسے ہی المناک حادثوں کے لئے کہا تھا ؏

اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

نواب محمد اسمٰعیل خاں نے شرافت اور امارت خاندانی ورثہ میں پائی تھی۔ وہ نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ جیسے نامور دادا کے پوتے اور نواب محمد اسحاق خاں جیسے بڑے باپ کے بیٹے تھے۔ خلافت کی تحریک سے ان کی قومی و سیاسی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی سیاسی شہرت اور قومی شخصیت سے ذرہ برابر فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ سیاسیات میں آ کر انھوں نے مالی خسارہ ہی برداشت کیا اور روز بروز ان کی مالی مشکلات بڑھتی ہی چلی گئیں۔ حالات یہاں تک پہنچ گئے کہ وہ اپنے قصر مصطفیٰ کیسل سے وسیع و کشادہ باغ کی بھی پوری طرح نگہداشت نہ کر سکتے تھے یہ زمانہ انھوں نے بڑے شکر و صبر کے ساتھ گزارا اور تیوروں کو ملول نہ ہونے دیا۔ تقسیم ہند کے بعد وہ بھی دوسرے مسلم لیگی لیڈروں کی طرح پاکستان چلے آتے تو یہاں انھیں بڑے سے بڑا عہدہ مل سکتا تھا، ان کی موجودگی میں غلام محمد کو کون پوچھتا؟ مگر انھوں نے سارے ہندوستان کے مسلمانوں کو بے سہارا چھوڑ کر پاکستان چلا آنا گوارا نہ کیا، اس ایثار کا، اخلاص و دردمندی اور مسلم دوستی کا اللہ کے یہاں انھیں بہت بڑا صلہ ملے گا۔

نواب محمد اسمٰعیل خاں مرحوم کو دین سے خاص شغف تھا، وہ نماز روزے کے پابند تھے اور قادیانی سلسلہ کی غلامی کو اپنے لئے سب سے بڑا شرف سمجھتے تھے، یہی پاکیزہ عقائد و اعمال کے ساتھ وہ اپنے رب کے حضور پہنچے، اللہ تعالیٰ اپنی شبنم رحمت سے ان کی قبر کو ٹھنڈا رکھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت اور اللہ تعالیٰ کی مغفرت سے انھیں بہرۂ وافر نصیب ہو (آمین)

ماہر القادری

اولیاء اللہ

اولیاء اللہ در بزمِ وجود
ہر نفس سازند با ذکر و درود

جسمِ ایشاں پاک جاں ہا پاک تر
گرم و روشن مثلِ تابندہ شرر

محرمانِ خاص و دانایانِ راز
اہلِ دل، اہلِ نظر، اہلِ نیاز

بندگانِ با صفا، مردانِ حُر
امتثالِ امرِ حق در خواب و خور

محوِ ذکر و فکرِ حق در نیم شب
مثلِ چوبِ خشک پیشِ حکمِ رب

صد ہزاراں شکر بر یک نانِ جو
در عمل چوں شہ سواراں تیز رو

از خشیت چشمِ ایشاں اشکبار
وز غمِ روزِ قیامت بے قرار

مرحبا! ایں طائرانِ ارجمند
در فضائے قدس بالے می زنند

حبّذا! ایں آہوانِ خوش نہاد
پاکدل، قدسی صفت، جنت نژاد

مسلکِ ایں بندگاں صدقِ مقال
مشربِ ایں عاشقاں اکلِ حلال

دینِ ایں آزادگاں در جزو و کل
اتباعِ اسوۂ ختمِ رسلؐ

ایں سبک روحانِ بزمِ اتقا
ایں نگہدارانِ شرعِ مصطفےٰؐ

رازدارانِ نکاتِ "کاف و نون"
حاملانِ منصبِ لا یحزنون

راہِ حق را با جبیں پیمودہ اند
"ہر کسے را بہرِ کارے ساختند"

شعلہ و شبنم

نیر جہلمی

عظمتوں کا نشاں آپ کے ساتھ ہے، سیم و زر کی زباں آپ کے ساتھ ہے
شوق سے روندیئے خاک زادوں کو اب، گردشِ آسماں آپ کے ساتھ ہے

چھین لیجئے گلوں کے لبوں سے ہنسی، تیز تر کیجئے نشترِ خار بھی
روندیئے ہر کلی اپنے پاؤں تلے، باغ کا باغباں آپ کے ساتھ ہے

جو بھی گردن اُٹھے توڑ دیجئے اسے، جو زباں سچ کہے قطع کر دیجئے
لوٹئے کاروانوں کے رختِ سفر، رہبرِ کارواں آپ کے ساتھ ہے

شورشِ بحر سے آپ گھبرائیں کیوں، دیکھ کر زندہ راہوں کا کترائیں کیوں
آپ کے زیرِ فرماں ہیں کشتیاں، موجِ آبِ رواں آپ کے ساتھ ہے

ہر کلی آپ کی، ہر شجر آپ کا، ہر روش آپ کی، ہر ثمر آپ کا
جو نشیمن ہے پھونک دیجئے اسے، زورِ برقِ تپاں آپ کے ساتھ ہے

حسن و الفت کے نغموں میں کھو جائیے، جھومئے خوب پائل کی جھنکار پر
زہرہ و مشتری آپ کے ساتھ ہیں، محفلِ کہکشاں آپ کے ساتھ ہے

شفقت کاظمی

رنج سہتے رہے مسکراتے رہے — اپنی مجبوریاں ہم چھپاتے رہے
راس آیا نہ ترکِ تمنا ہمیں — بھولنے پر بھی وہ یاد آتے رہے
لاکھ مہریں لبوں پر لگی تھیں مگر — ہم ترے پیار کے گیت گاتے رہے
یوں بھی مدِ نظر تھی خوشی آپ کی — ہم جو صدمے پہ صدمے اُٹھاتے رہے
بزمِ دوراں میں پرسش اُنہی کی ہے — تیری محفل میں جو بار پاتے رہے

دور رہ کر بھی وہ مجھ سے اے کاظمی
میرے خوابوں کی دنیا بساتے رہے

مذاق العیشی فیروزپوری

پہنچے کلیم صاعقۂ طور پر کہاں — وہ جلوہ گر جو ہوں تو مجالِ نظر کہاں
پھر تڑپ اٹھے گا تمہیں دیکھ کر کہیں — آئینے کے نصیب میں میری نظر کہاں
اے دوستو اگر نہ بناتے ہم آشیاں — تم ہی کہو کہ رہتے یہ برق و شرر کہاں
ہوں بے نیازِ جستجو، بے نیاز ہیں — راہِ وفا میں سود و زیاں پر نظر کہاں
دل کی بجائے نبض پہ ہو دستِ چارہ گر — یہ چیز کہاں خلشِ عشق اثر کہاں
ہاں اے غمِ حبیب یہ تیرا ہی فیض ہے — ورنہ غمِ حیات، غمِ معتبر کہاں
اک سوچنے کی بات ہے کہ سمجھنے کی بات ہے — وہ جلوہ گر نہیں ہیں تو پھر جلوہ گر کہاں
کب سے رواں ہیں سوئے عدم کاروانِ زیست — کچھ نہیں کہ جاتی ہے یہ رہگزر کہاں
جس آستاں پہ بیٹھ گئے بیٹھ ہی گئے — ساتھ ہے لیکن اب تو پھر یہ دربدر کہاں
جچنے لگیں جو تیر مرے دل کی دھڑکنیں — پڑنے لگی مذاق کسی کی نظر کہاں

راسخ عرفانی

نہیں محفوظ ناموسِ گلستاں ہم نہ کہتے تھے
چمن کی تاک میں ہے برقِ سوزاں ہم نہ کہتے تھے
یہ افرنگی تمدن، یہ ہوس کاری، یہ عریانی
پیامِ موت ہے بہرِ مسلماں ہم نہ کہتے تھے
خرد کی فتنہ کاری سے پریشاں ہو کے اے راسخ
لہو روئے گی آخر چشمِ انساں ہم نہ کہتے تھے

ناصح تری نوازشِ پیہم کا شکریہ
تیرے سوا ہیں کچھ مرے غمخوار اور بھی

میرا کیا ہے جرم محبت کا ارتکاب
یا کچھ خطا ہے اے مرے سرکار اور بھی

المدد اے جذبۂ سوزِ تکلم، المدد
ہے مجھے مقصود اظہارِ غمِ آزارِ دوست

جذبات و واردات

دُرِّ ہاشمی کانپوری

کچھ عجب صورتِ حالات ہوئی جاتی ہے　　زندگی حرف و حکایات ہوئی جاتی ہے
دیکھئے کب نظر آتا ہے سوادِ منزل؟　　جستجو صرفِ مقامات ہوئی جاتی ہے
میری تقدیسِ محبت کو کوئی کیا جانے　　ایک اک سانس مناجات ہوئی جاتی ہے
شرم اے جلوۂ محبوب کہ تیرے ہوتے
آنکھ مانوسِ حجابات ہوئی جاتی ہے

اللہ رے غمِ عشق کی افتاد کا عالم!　　خاموش ہوں لیکن ہے بپا فریاد کا عالم
کیا جانے کوئی اس ستمِ ایجاد کا عالم؟　　جو صید کا عالم وہی صیاد کا عالم؟
دیکھا ہے بہت گلشنِ ایجاد کا عالم　　عالم ہے ترے حسنِ خداداد کا عالم
جب کلی کوئی تو دل ہو گیا بیتاب　　ہم سے کوئی پوچھے ترے ارشاد کا عالم
ہر غنچہ میں ہر برگ بریدہ کا تماشا　　ہر پھول میں ہے نکہتِ برباد کا عالم
اس عالمِ بے نام میں کیا تجھ سے کہوں　　جو ضبط کا عالم ہے نہ فریاد کا عالم
دامِ الفتِ حسن نے فتنا بھی نہ پایا
اللہ رے مری فطرتِ آزاد کا عالم

ڈاکٹر اختر

عجب ہے میرا رنگِ داستاں بھی　　ہنسی کے ساتھ ہونٹوں پر فغاں بھی
یہی دو چار تنکے خار و خس ہیں　　یہی دو چار تنکے آشیاں بھی
نہیں کچھ دوستوں ہی سے محبت　　دعائیں ہیں بنامِ دشمناں بھی
کسی صورت تو دل بہلا قفس میں　　بہر صورت یہ سعیِ رائگاں بھی
بھلا بیٹھے ابھی احباب، گو ہم　　کبھی تھے بیادِ دشمناں بھی
یہ سب جھگڑے ہیں جیتے جی کے اختر
گلستاں بھی قفس بھی آشیاں بھی

مشتاق اختر

تیری یادوں کے کھوئے ہوئے سلسلے
اشک بن بن کے آنکھوں میں آتے رہے
جادۂ شوق پر ہم رہے گامزن
لوگ ہر چند کانٹے بچھاتے رہے

جاتے جاتے وہ لوٹ آئے ہیں　　جانے کیا بات ان کو یاد آئی
سامنے سے وہ اس طرح گذرے　　حسرتیں بن گئیں تماشائی
ہر کلی ہے بہار کا ماتم
جانے کس رنگ سے بہار آئی

انوار انجم

ہم کو نہ دو فریبِ بہاراں کہ دوستو
واقف ہیں خوب فرقِ بہار و خزاں سے ہم
تیری نگاہِ شوق کا اے برق شکریہ
آزاد ہو گئے ہیں غمِ آشیاں سے ہم

ہرگز نہ جھک سکے گی کسی در پہ وہ جبیں
جس کو تلاش صرف ترے آستاں کی ہے

مولانا مودودی

روحِ انتخاب

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اَوْ کَذَّبَ بِاٰیٰتِہٖ ط اِنَّہٗ لَا یُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ

پھر اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو ایک جھوٹی بات گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرے یا اللہ کی واقعی آیات کو جھوٹا قرار دے، یقیناً مجرم کبھی فلاح نہیں پا سکتے ؎

؎ بعض نادان لوگ "فلاح" کو طولِ عمر، یا دنیوی خوشحالی یا دنیوی فروغ کے معنی میں لے لیتے ہیں اور پھر اس آیت سے یہ نتیجہ نکالنا چاہتے ہیں کہ جو شخص نبوت کا دعویٰ کرکے جیتا رہے، یا دنیا میں پھلے پھولے، یا اس کی دعوت کو فروغ نصیب ہو اسے نبی برحق مان لینا چاہیئے۔ کیونکہ اس نے فلاح پائی اگر وہ نبی برحق نہ ہوتا تو جھوٹا دعویٰ کرتے ہی مار ڈالا جاتا یا بھوکوں مار دیا جاتا اور دنیا میں اس کی بات چلنے ہی نہ پاتی۔ لیکن یہ احمقانہ استدلال صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو نہ تو قرآنی اصطلاح "فلاح" کا مفہوم جانتا ہو، نہ اس قانونِ امہال سے واقف ہو جو قرآن کے بیان کے مطابق اللہ تعالیٰ نے مجرموں کے لئے مقرر فرمایا ہے اور نہ یہی سمجھتا ہو کہ اس سلسلۂ بیان میں یہ فقرہ کس معنی میں آیا ہے۔

اول تو یہ بات کہ "مجرم فلاح نہیں پا سکتے" اس سیاق میں اس حیثیت سے فرمائی ہی نہیں گئی ہے کہ یہ کسی کے دعوائے نبوت کو پرکھنے کا معیار ہے جس سے عام لوگ جانچ کر خود فیصلہ کرلیں کہ جو مدعیٔ نبوت "فلاح" پا رہا ہو اس کے دعوے کو مانیں اور جو فلاح نہ پا رہا ہو اس کا انکار کردیں۔ بلکہ یہاں تو یہ بات اس معنی میں کہی گئی ہے کہ "میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مجرموں کو فلاح نصیب نہیں ہوسکتی، اس لئے میں خود تو یہ جرم نہیں کرسکتا کہ نبوت کا جھوٹا دعویٰ کروں۔ البتہ تمہارے متعلق مجھے یقین ہے کہ تم سچے نبی کو جھٹلانے کا جرم کر رہے ہو اس لئے تمہیں فلاح نصیب نہ ہوگی"۔

پھر "فلاح" کا لفظ بھی قرآن میں دنیوی فلاح کے محدود معنی میں نہیں آیا ہے بلکہ اس سے مراد وہ پائیدار کامیابی ہے جو کسی خسران پر منتج ہونے والی نہ ہو۔ قطعِ نظر اس کے کہ دنیوی زندگی کے اس ابتدائی مرحلہ میں اس کے اندر کامیابی کا کوئی پہلو ہو یا نہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ ایک داعیٔ ضلالت دنیا میں مزے سے خوب جیئے، خوب پھلے پھولے اور اس کی گمراہی کو بڑا فروغ نصیب ہو مگر یہ قرآن کی اصطلاح میں فلاح نہیں بلکہ خسران ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک داعیٔ حق دنیا میں سخت مصیبتوں سے دوچار ہو اور شدتِ آلام سے نڈھال ہو کر یا ظالموں کی دست درازیوں کا شکار ہو کر دنیا سے جلد ہی رخصت ہو جائے اور کوئی اُسے مان کر نہ دے مگر یہ قرآن کی زبان میں خسران نہیں عین فلاح ہے۔

علاوہ بریں قرآن کریم میں جگہ جگہ یہ بات پوری تشریح کے ساتھ بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ مجرموں کو پکڑنے میں جلدی نہیں کیا کرتا، بلکہ انہیں سنبھلنے کے لئے کافی مہلت دیتا ہے۔ اور اگر وہ اس مہلت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اور زیادہ بگڑتے ہیں تو اللہ کی طرف سے اُن کو ڈھیل دی جاتی ہے اور بسا اوقات اُن کو نعمتوں سے نوازا جاتا ہے تاکہ وہ اپنے نفس کی چھپی ہوئی تمام شرارتوں کو پوری طرح ظہور میں لے آئیں اور اپنے عمل کی بنا پر اس سزا کے مستحق ہو جائیں جس کے وہ اپنی بری صفات کی وجہ سے فی الحقیقت مستحق ہیں۔ پس اگر کسی جھوٹے مدعی کی رسی دراز ہو رہی ہو

اور اُس پر دنیوی "فلاح" کی برسات برس رہی ہو تو سخت غلطی ہوگی اگر اُس کی اس حالت کو برسرِ ہدایت ہونے کی دلیل سمجھا جائے۔ خدا کا قانونِ امہال و استدراج جس طرح تمام مجرموں کے لئے عام ہے، اسی طرح جھوٹے مدعیانِ نبوت کے لئے بھی ہے اور ان کے اس سے مستثنیٰ ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ پھر شیطان کو قیامت تک کے لئے جو مہلت اللہ تعالیٰ نے دی ہے اس میں یہ استثنا کہیں مذکور نہیں ہے کہ تیرے اور تو سارے فریب چلنے دیئے جائیں گے، لیکن اگر تو اپنی طرف سے کوئی نبی کھڑا کرے گا تو یہ فریب نہ چلنے دیا جائے گا۔

لیکن یہ کوئی شخص ہماری اس بات کے جواب میں وہ آیت پیش کرے جو سورہ الحاقہ (رکوع ۲) میں ارشاد ہوئی ہے کہ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ ــــــ یعنی اگر محمدؐ نے خود گھڑ کر کوئی بات کہی ہوتی تو ہم اس کا ہاتھ پکڑ لیتے اور اس کی رگِ دل کاٹ ڈالتے۔ لیکن اس آیت میں جو بات کہی گئی ہے وہ تو یہ ہے کہ جو شخص فی الواقع خدا کی طرف سے نبی مقرر کیا گیا ہو وہ اگر جھوٹی بات گھڑ کر وحی کی حیثیت سے پیش کرے تو فوراً پکڑا جائے۔ اس سے یہ استدلال کرنا جو مدعی نبوت پکڑا نہیں جا رہا ہے وہ ضرور سچا ہے ایک منطقی مغالطہ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ خدا کے قانونِ امہال و استدراج میں جو استثناء اس آیت سے ثابت ہو رہا ہے وہ صرف سچے نبی کے لئے ہے، اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ جو شخص نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرے وہ بھی اس سے مستثنیٰ کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ سرکاری ملازموں کے لئے حکومت نے جو قانون بنایا ہے اس کا اطلاق انہی لوگوں پر ہوگا جو واقعی سرکاری ملازم ہیں، رہے وہ لوگ جو جعلی طور پر اپنے کو ایک سرکاری عہدہ دار کی حیثیت سے پیش کریں تو اُن پر ضابطۂ ملازمت کا نفاذ نہ ہوگا بلکہ اُن کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے گا جو ضابطۂ فوجداری کے تحت عام بدمعاشوں اور مجرموں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ علاوہ بریں سورۃ الحاقہ میں جو کچھ فرمایا گیا ہے وہ بھی اس غرض کے لئے نہیں فرمایا گیا ہے کہ لوگوں کو نبی کے پرکھنے کا یہ معیار بتایا جائے کہ اگر پردۂ غیب سے کوئی ہاتھ نمودار ہو کر اس کی رگِ دل اچانک کاٹ دے تو سمجھیں جھوٹا ہے ورنہ مان لیں کہ سچا ہے۔ نبی کے صادق یا کاذب ہونے کی جانچ اگر اس کی سیرت، اس کے کام اور اس کے اس چیز سے جو وہ پیش کر رہا ہو ممکن نہ ہوتی تو ایسے غیر معقول معیار تجویز پیش کرنے کی ضرورت پیش آسکتی تھی۔

(تفہیم القرآن ـــــــ جلد دوم)
سید ابوالاعلیٰ مودودی)

فاران کے معرکۃ آرا

"خلافت نمبر"

کی کتابت انشاء اللہ العزیز ماہ اگست میں شروع ہوجائیگی

اس عظیم الشان خاص شمارے میں

خلفائے راشدین کے مقدس حالات پڑھ کر آپ کے ایمان کو تازگی نصیب ہوگی، فدک، واقعہ قرطاس اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکفین و تدفین کے بارے میں جو شبہات پیدا کئے گئے ہیں ان کی ایسی مستند تفصیل آپ کو ملے گی جسے پڑھ کر ان مسائل و واقعات میں کوئی اُلجھن باقی نہ رہے گی۔ فرقہ باطنیہ کی تاریخ بھی "خلافت نمبر" میں آپ پڑھیں گے

اور ــــــ یہ بھی

کہ اہلِ بیت کرام اور صحابۂ عظام کی محبت خدانخواستہ ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں،

مُدیر "فاران"

کا اداریہ، سیرت نمبر اور توحید نمبر کے "نقشِ اول" کی طرح بسیط و جامع ہوگا +

منیجر ماہنامہ "فاران" کراچی

ہماری نظر میں

انسانیت کی تعمیر نو اور اسلام

از عبدالحمید صدیقی ایم۔اے، ضخامت ۳۰۲ صفحات، مجلد رنگین گردپوش کے ساتھ قیمت تین روپے آٹھ آنے۔

ملنے کا پتہ:۔ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی اچھرہ، لاہور

جناب عبدالحمید صدیقی ایم۔اے، اسلام پسند مفکر اور ادیب ہیں جن کے دل و دماغ کی تمام توانائیاں اور صلاحیتیں خدمت دین کے لئے وقف ہیں، اور یہ اتنا بڑا شرف ہے جس کے آگے دوسرے تمام کمالات و فضائل ثانوی درجہ رکھتے ہیں، کتنی بڑی سعادت ہے جو عبدالحمید صدیقی کو میسر آئی ہے کہ "اقامت دین" اُن کی تمام جدوجہد کا موضوع اور مقصود بن گیا ہے۔

اس کتاب کے ابواب کی فہرست ہی سے، کتاب کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

تہذیب لحاد کے اجزائے ترکیبی ——— معاشرتی ارتقاء کا تصور ——— سرمایہ دارانہ جمہوریت ———
سرمایہ دارانہ جمہوریت کا معاشی پہلو ——— اشتراکیت کے اساسی تصورات ——— اشتراکیت کی فکری لغزشیں
اشتراکیت میدانِ عمل میں ——— فسطائیت اور اس کی ستم رانیاں ——— ع معمار حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز۔

فاضل مصنف کے مطالعہ کی وسعت اور محنت و کاوش کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس موضوع پر قلم اٹھانے سے پہلے انھوں نے اردو اور انگریزی کی ڈیڑھ سو کتابیں مطالعہ کی ہیں اور ان کتابوں کے جوہر، خلاصہ اور روح سے اپنی کتاب میں کام لیا ہے۔

جناب عبدالحمید صدیقی نے سرمایہ دارانہ جمہوریت، اشتراکیت اور فسطائیت کا تجزیہ کر کے بتایا ہے کہ ان میں کیا خرابیاں اور کمزوریاں پائی جاتی ہیں اور انکے پیچھے کون سے عوامل، نظریئے اور معتقدات کام کرتے ہیں:۔ انھوں نے کتنی سچی بات کہی ہے:۔

"حقیقت یہ ہے کہ جب تک ہماری مادی خواہشات پر اخلاق کی گرفت مضبوط نہیں ہوتی، اس وقت تک زندگی میں لوٹ کھسوٹ ختم نہیں کی جا سکتی، تمام کار خواہ "پرویز" کے ہاتھ میں ہو یا "کوہکن" کے، اگر وہ اخلاق سے عاری ہوں، تو دونوں سے ایک جیسے اعمال سرزد ہونگے۔" (صفحہ ۱۹۶)

——— اور ———

"مغربی انسان ایک لمبے عرصے سے اس ذہنی کش مکش میں گرفتار چلا آرہا ہے کہ وہ بنیادی اہمیت انفرادیت کو دے یا اجتماعیت کو۔ وہ جب انفرادیت کو اصل قرار دے کر اپنی زندگی کی تعمیر کرتا ہے تو اپنے سامنے سرمایہ داری کی شکل میں ایک نہایت ہی ظالمانہ اور بے حس نظام موجود پاتا ہے، اس کے برعکس جب وہ اجتماعیت کی اساس پر اپنی حیات کا استوار کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اردگرد ایک ایسی جیل کی دیواریں چنی گئی ہیں جن کے اندر نہ صرف اس کا جسم مقید ہے بلکہ اس کی روح بھی پابہ زنجیر ہے ——— موجودہ انسان نے اس مخمصے سے نکلنے کی بے حد کوشش کی ہے مگر اسے اس سلسلہ میں ذرہ برابر کامیابی نہیں ہوئی۔ وہ بڑی مدت سے اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہے مگر اسے کچھ نہیں سوجھتا کہ آخر وہ کیا کرے، وہ بیچارہ کبھی ایک کو آزماتا کبھی دوسرے کو۔۔۔۔"

"یہ وہ ٹھیک مقام ہے:
"جہاں ہمیں اسلام سے رہنمائی ملتی ہے"۔

اور پھر فاضل مصنف نے "اسلام کی اس رہنمائی" کی وضاحت کی ہے کہ وہ کس طرح فرد اور جماعت کے "تضاد" کو دور کر کے فرد کی "شخصیت" اور "اجتماعیت" کے درمیان توازن، ربط اور ہم آہنگی قائم کرتا ہے۔

عبدالحمید صدیقی کے افکار مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی فکر کا فی متاثر ہیں۔ اس لئے اُن کے انداز بیان میں سلجھاؤ اور استدلال میں قوت پائی جاتی ہے ــــــــــ ایسی قوت جس کا کام مرعوب کرنا نہیں بلکہ دل و دماغ کو مطمئن بنانا ہے۔ اُن کی تحریر سے خلوص و یقین کی روشنی چھنتی نظر آتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسلام کے بارے میں وہ "معذرت آمیز" پوزیشن اختیار نہیں کرتے، ہر محاذ پر اس عزیمت کے ساتھ وہ نبرد آزما ہوتے ہیں کہ اسلام اور صرف اسلام ہی دین حق ہے اور اسی کو غالب ہونا چاہیئے! "مدعیان تقویٰ" کو اقامت دین کی یہ کوشش اگر ناپسند آتی ہے تو اُن کو خوش کرنے اور منانے کے لئے اس کاروانِ عزیمت کا رُخ تو نہیں بدلا جا سکتا۔

اقبال کا سیاسی کارنامہ

از:- محمد احمد خاں (ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی) ضخامت ۵۳۳ صفحات۔ مجلد قیمت چھ روپے
ملنے کا پتہ:- ادارہ کاروانِ ادب، حکیم پریس بلڈنگ، نزد شو مارکیٹ لارنس روڈ کراچی۔

جناب محمد احمد خاں جامعہ عثمانیہ کے لائق بلکہ قابل فخر فرزند ہیں، صاحب موصوف چونکہ اسلام پسند ادیب ہیں اس لئے علامہ اقبال کی ذات سے وہ بہت گہری عقیدت رکھتے ہیں ــــ موصوف نے اقبال کی زندگی، عمل اور فکر و نظر کے جس گوشہ پر اس کتاب میں روشنی ڈالی ہے وہ گوشہ اس وضاحت و تشریح کے ساتھ ابھی تک اقبال کے کسی مداح اور عقیدت مند نے پیش نہیں کیا۔ اس لئے ذمہ داری کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ:-

"اقبال کا سیاسی کارنامہ"

اپنے موضوع پر ایک منفرد کتاب ہے۔

اقبال نے ہندوستان کی آزادی اور مسلمانوں کی ترقی اور ان کے حقوق کے تحفظ میں کیا سیاسی کارنامے انجام دیئے؟ یہ کتاب دراصل ہے تو اس موضوع پر ــــــ مگر مسز اینی بسنٹ کی "ہوم رول" کی تحریک سے لے کر تقسیم ہند تک کی سیاسی جدوجہد کی پوری تاریخ اس ضمن میں آگئی ہے۔

فاضل مصنف نے ریسرچ اسکالر کی طرح تحقیق و کاوش کی ہے، تب کہیں جا کر یہ کتاب مرتب ہوئی ہے۔ کیسے کیسے اہم سیاسی دستاویزات ہیں جن کے اس کتاب میں حوالے ہیں۔ کن سیاسی معرکہ آرائیوں کی تفصیل پیش کی گئی ہے اور پھر اس تمام مواد (material) سے کس سلیقہ کے ساتھ اپنے خیال و رائے کی تائید میں کام لیا گیا ہے۔ اس کتاب کی قدر و قیمت کچھ دنوں کے بعد محسوس ہوگی۔ جب مورخ پاکستان اور ہندوستان کی تاریخ لکھنے بیٹھیں گے تو یہ کتاب ان کو واقعات دے گی۔ تاریخی دستاویزات کے حوالے اور اقتباسات فراہم کرے گی اور واقعات سے نتائج اخذ کرنے میں رہنمائی بھی کرے گی۔

مصنف کے قلم کی روانی، تحریر کی قوت اور زور بیان کے ثبوت میں صرف ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

"ان کے (یعنی علامہ اقبال کے) نہاں خانۂ تصورات میں ان شمشیر بکف کلیم بدوش صحرانشین عربوں کی پرشکوہ تصویریں اُبھرنے لگتی ہیں۔ جن کی تلواروں میں بجلیوں نے اپنے آشیانے بنا رکھے تھے۔ اور جن کے سفینوں نے سمندر کی سرکش موجوں کو پابہ زنجیر کر رکھا تھا اور جنھوں نے منگولیہ و ہسپانیہ کے جابر و قاہر شہنشاہوں کے درباروں میں زلزلے ڈال دیئے

تھا اور دنیا کو ایک نیا پیغام دیا تھا ——— زندگی اور آزادی کا پیغام۔

۱۹۳۰ء کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں میں جو افکار اُبھرے اور خود ملک کے جو سیاسی رجحانات تھے۔ ان کا محور کیا تھا؟ اس کی تفصیل دق مصنف کی زبان سے سنیئے :۔

"الغرض قانون دستور حکومت ہند ۱۹۳۵ء کی عملاً ناکامی کے بعد سے ہندوستان کی سیاست کا محور، علامہ اقبال کی تجویز بنی رہی اور مسلمانوں کی عملی فکری سیاست میں اسی تصور کی روح اپنا کام کرتی رہی۔ ڈاکٹر سید عبد اللطیف کی اسکیم۔ سر سکندر کی تجویز اور اصحاب علی گڑھ کی اسکیمیں، مسلم لیگ کی قرار داد لاہور، سر اسٹیفورڈ کرپس کی سفارشات ـــ راجہ جی اور وزیر ہند کا فارمولا، قائد اعظم کی ۱۲ مئی ۱۹۴۶ء والی تجاویز کا بینی وفد اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے منصوبے یہ سب علامہ اقبال کے اس تصور کے اطراف گھومتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ فرق صرف اس تصور سے قرب و بعد کا ہے"۔

مصنف نے بے محل بات نہیں کہی۔ مگر دوسرے مؤرخ اور مفکر اس انداز میں اقبال کو خراج عقیدت مشکل ہی سے ... پیش کر سکیں گے!

اس کتاب میں علامہ اقبال کی زندگی کے اس واقعہ کو پڑھ کر طبیعت بہت متاثر ہوئی ——— وہ یہ کہ اقبال ایک سو تیس روپیہ ماہوار کی ایک کوٹھی میں رہا کرتے تھے جو بہت بوسیدہ اور پرانی ہو گئی تھی۔ اُن کے دوستوں نے مشورہ دیا کہ آپ کسی دوسری کوٹھی میں منتقل کیوں نہیں ہو جاتے، اس کرایہ پر اس سے زیادہ کشادہ آرام دہ اور بہتر کوٹھی مل سکتی ہے۔ اس پر اقبال نے کہا:۔

"ٹھیک ہے، مگر میں یہاں سے جانا نہیں چاہتا، بات دراصل یہ ہے کہ یہ کوٹھی دو ہندو یتیم بچوں کی وراثت ہے، میرے چلے جانے سے اُن کو بہت تکلیف ہوگی۔ اتنا کرایہ شاید اور کوئی نہ دے"۔

ایک مسلمان کو ایسا ہی حوصلہ مند، وسیع النظر اور خلقِ خدا کا بہی خواہ اور شریک درد و غم ہونا ہی چاہیئے۔

اقبال کا ہندوستان کی آزادی سے کیا مطلب تھا؛ اس کی تشریح انھوں نے خود فرمائی ہے:۔

"آزادی سے ہمارا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم آزاد ہو جائیں، بلکہ ہمارا اول مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے ...... مسلمان کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار نہیں ہو سکتا جس کی بنیادیں انھی اصولوں پر ہوں، جن پر انگریزی حکومت قائم ہے۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل کو، قائم کرنا چہ معنی دارد؟

مولانا حسین احمد مدنی مرحوم زندہ ہوتے، تو اقبال کی تحریر کا یہ اقتباس ہم ان کی خدمت میں بھیج دیتے!

POLITICAL — OPPORTUNIST کا ترجمہ "سیاسی قابوچی" بہت خوب ہے، اگر یہ لائق مصنف کی اختراع ہے تو اس ترجمہ پر وہ اُردو دنیا کی طرف سے مبارکباد کے مستحق ہیں۔

"جس فوری مقصد کے پیش نظر بار بڑ بیلے گئے" (صفحہ ۷۶) "پاپڑ بیلے" (ب کے ساتھ) جاتے ہیں "پیلے" (پ کے ساتھ) نہیں جاتے "ڈنٹر پیلنا" البتہ بولتے ہیں ——— "بنگال میں سر فضل حسین کی پر بڑا پارٹی ...." (صفحہ ۲۲۷) یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے کہ "فضل الحق" کی جگہ "سر فضل حسین" لکھا ہے "بتڑیا" ——— "لیکن سب کو یہ نکھرا اتھا" (صفحہ ۲۳۶) صحیح لفظ "دھڑکا" ہے ——— اور "نہ ہی" فرقہ پرستوں کی طرح دھلتے تنزل تھے" (صفحہ ۵۰۸) نہ جانے کس کم سواد اور بے ذوق نے "ہی" کو اس طرح سب سے پہلے استعمال کر کے، تحریر میں بدلطفی پیدا کر دی ہے حیرت اس پر ہے، شگفتہ قلم ادیبوں کو یہ برائی نہیں کھٹکتی اور وہ اسے استعمال کر جاتے ہیں۔

صفحہ ۵۲۹ پر "شبِ قدر کی مبارک رات" پڑھ کر ہنسی بھی آئی اور حیرت بھی ہوئی!

اقبال کو لندن کی گول میز کانفرنس میں جو شریک کیا گیا تھا اس کے بارے میں لوگ چہ میگوئیاں کرتے تھے کہ سر فضل حسین کی کوششوں سے اقبال کو یہ موقعہ ملا ہے ——— سائمن کمیشن کا ہندوستان میں عام طور پر بائیکاٹ کیا گیا مگر اقبال نے اُس سے تعاون کرنے کا مشورہ دیا، اس پر اقبال کو حریت پسند طبقہ کی طرف سے سرکار پرست کہا گیا۔ اس کتاب میں ان الزامات کی کوئی شک نہیں پرزور تردید کی گئی ہے اور اقبال کی طرف سے صفائی اور مدافعت میں فاضل مصنف نے ایک تجربہ کار وکیل کی طرح جرح و تعدیل کی ہے مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ کہیں کہیں پانی پھر بھی مرتا ہوا ہی دکھائی دیتا ہے۔

اقبال فلسفی تھے، مفکر تھے، شاعر تھے مگر مصنف نے دلائل و شواہد کا پورا زور اس بات کے ثابت کرنے میں صرف کر دیا ہے کہ وہ "لیڈر" بھی تھے۔ اقبال کو "لیڈر" بھی کہا جا سکتا ہے مگر اُن کے دوسرے فضائل و محاسن کے مقابلہ میں اُن کا یہ وصف کافی پھیکا نظر آتا ہے۔ گوکھلے، تلک، گاندھی، محمد علی، حسرت موہانی، ڈاکٹر انصاری، ظفر علیخاں، اور محمد علی جناح کا نام سنتے ہی لیڈری کے جو اوصاف اور خصوصیتیں نگاہوں کے سامنے ابھر آتی ہیں، علامہ اقبال کے نام اور کام کے ساتھ وہ خصوصیتیں سامنے نہیں آتیں، صرف فکر کی اصابت اور قوم کی دردمندی کسی کو "لیڈر" نہیں بنا سکتی!

کوئی کہتا ہے کہ چودھری رحمت علی نے پاکستان کا تصور سب سے پیش کیا تھا۔ کسی کا کہنا ہے کہ علی گڑھ کالج کے پرنسپل سر تھیوڈر موریسن اس تصور کے بانی ہیں! کسی کی رائے ہے کہ ڈیرہ اسماعیل خاں کی انجمن اسلامیہ کے صدر خان صاحب سردار محمد کے ذہن میں سب سے پہلے پاکستان کے قیام کی تجویز آئی تھی ——— مگر جناب محمد احمد خاں نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ تصورِ پاکستان کا معمارِ اول علامہ اقبال کے سوا اور کوئی نہ تھا۔

فاضل مصنف نے علامہ اقبال کی تحریک پر پٹھان کوٹ میں "دار الاسلام" کے قیام کا ذکر کیا ہے جس میں چودھری نیاز علی صاحب کا بھی نام آیا ہے لیکن تعجب ہے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا ذکر مصنف نے نہیں کیا، کیا مصنف کو اس کا علم نہیں ہے کہ علامہ اقبال ہی کی تحریک پر مولانا مودودی حیدرآباد دکن چھوڑ کر پنجاب آئے تھے اور "دار الاسلام" کا تصور ذہن میں آتے ہی اقبال کی نگاہِ انتخاب مودودی صاحب پر پڑی۔ لائق مصنف سے یہ بہت بڑی فروگذاشت ہوئی ہے جس کی تلافی معذرت و افسوس سے نہیں ہو سکتی!

یہ کتاب اپنے موضوع پر بہت خوب ہے اور فکر و خیال اور اظہار و بیان کے اعتبار سے بلند پایہ ہی نہیں معلومات آفریں بھی! سیاست ایک خشک موضوع ہے مگر چند واقعاتی صفحات کو چھوڑ کر کتاب کا بیشتر حصہ خاصہ دلچسپ ہے!

فاران
کراچی
پاکستان
ماہر القادری

جلد : ۱۰
شمارہ : ٦

ستمبر سنہ ۱۹۵۸ء

ایڈیٹر
ماہر القادری

سالانہ چندہ
چھ روپے

فی پرچہ
آٹھ آنے

نظم و ترتیب

مقام اشاعت: دفتر فاران، کیمبل اسٹریٹ، کراچی ۱

پرنٹر پبلشر منظور حسین — مطبع سعیدی قرآن محل مولوی مسافر خانہ، کراچی — کتبہ ساجد سعید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

ہندوستان کے تقسیم کرنے اور پاکستان بنوانے میں مسلم لیگ نے جو کارِ نمایاں انجام دیا ہے، وہ اپنی جگہ ایک مسلّم حقیقت ہے، مُسلم لیگ کے اس شرف کا انکار اس کا کوئی بڑے سے بڑا مخالف بھی نہیں کر سکتا! تقسیم ہند سے قبل کوئی شک نہیں کہ مُسلم لیگ کی تمام جدوجہد کا مقصود و منتہا "قیامِ پاکستان" تھا اور اس جدوجہد میں اُسے عظیم الشان کامیابی نصیب ہوئی۔

قیامِ پاکستان کے بعد اس نومولود حکومت کی زمامِ کار بلا شرکتِ غیرے مُسلم لیگ کے ہاتھوں میں آئی۔ مرکز سے لے کر صوبوں تک، ہر جگہ مسلم لیگ ہی کا راج قائم ہوا مسلم لیگ کی حکومت کو کام کرنے کے لئے پاکستان میں ہر اعتبار سے اور ہر جہت سے فضا سازگار تھی۔ جرب مخالف کا وجود ہی نہ تھا اور نہ مسلم لیگ کے مقابلہ میں کوئی ایسی سیاسی پارٹی پائی جاتی تھی جسے مسلم لیگ کا حریف اور مدِ مقابل کہا جا سکے، مسلم لیگ کو پوری قوم کا اعتمادِ کامل حاصل تھا عوام مسلم لیگ سے نہ صرف یہ کہ خوش گمان تھے بلکہ اس سے عقیدت و محبت رکھتے تھے، اُن کا خیال تھا کہ جن اسلامی نظریوں کی بنیاد پر "پاکستان" وجود میں آیا ہے، مسلم لیگ اُن نظریوں کو عملی جامہ پہنائے گی اور پاکستان دُنیا میں اسلامی قدروں کا ایک روشن ستارہ بن کر چمکے گا، مسلم قوم پُر امید تھی، خوش اور مطمئن تھی کہ انہیں پاکستان کیا ملا اپنی گم شدہ جنت مل گئی۔

ہندوستان یوں ہی ہنستے کھیلتے تقسیم نہیں ہو گیا۔ اس کے لئے مسلم قوم کو آگ اور لہو کے طوفانوں سے گزرنا پڑا، مال کی، جان کی اور عزت و آبرو کی قربانیاں انہیں دینی پڑیں۔ سینکڑوں دینی درسگاہیں اور ہزاروں مسجدیں اور خانقاہیں ویران ہوئی ہیں، تب کہیں جا کر پاکستان کو وجود میسر آیا ہے۔ یہ "سحر" یہ "خونِ صد ہزار انجم" سے پیدا ہوئی ہے، اور لاکھوں باغ اُجڑ کر یہ چمن آباد ہوا ہے۔

مگر

"پاکستان بننے کی خوشی میں قوم اپنے خونچکاں زخموں سے بے پروا ہو گئی اور اس نے اپنے رُوح فرسا غموں کو بھلا دیا، لاکھوں چہرے فرطِ غم اور دردِ غُربت سے نڈھال تھے لیکن تیوروں پر صبر و شکر اور اطمینان و مسرت کے ستارے طلوع ہو رہے تھے، یہ مسرت و اطمینان صرف اس لئے تھا کہ پاکستان میں اسلامی حکومت قائم ہوگی، اللہ تعالیٰ کا دین چلے گا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت کو فروغ ہوگا۔ اسلام کو غلبہ اور سربلندی نصیب ہوگی، اور دنیا اس دورِ مادیت اور عہدِ فسق و فجور میں خلافتِ راشدہ کی جھلک اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گی۔

قوم کی ان توقعات، خوش فہمیوں اور تمناؤں کے ساتھ حکومتِ پاکستان کا آغاز ہوا، مگر تھوڑے دن کے بعد ہی قوم نے محسوس کیا کہ جس اُفق پر صبح کے آثار نمودار ہو رہے تھے، وہاں تو اور دُھند چھائی چلی جا رہی ہے یہ جو فضا میں اُجالا سا دکھائی دیا تھا "سیمیا" کا نمود ثابت ہوا، اگر رات بیت کر واقعی صبح ہوئی تھی، تو اس کا اجالا کہاں ہے، وہ دھوپ کیا ہوئی؟ لوگ آنکھیں ملتے ہوئے چیخ اٹھے کہ

اندھیرا اور گہرا اور گہرا ہوتا جاتا ہے

کس قدر شیریں خواب دیکھا تھا مگر اس کی تعبیر اس درجہ بھیانک نکلی! وہ چشمۂ آبِ حیواں کہاں ہے، جس کے لئے موت اور ہلاکت

کی خوفناک وادیوں میں سفر کیا تھا۔ یہ تو چاروں طرف سراب ہی سراب دکھائی دے رہا ہے، وہ بہار کہاں گئی جس کے لئے مدّتوں خزاں کی سختیاں جھیلی تھیں، ہمیں تو چاروں طرف سے بت جھڑ نے گھیر رکھا ہے، پاکستان تو اسلام کے نام پر اور اسلام کے لئے بنا تھا مگر یہاں تو ہر ناکہ اور موڑ پر پہرے بٹھا دیئے گئے ہیں کہ اسلام کسی طرح داخل نہ ہونے پائے، ہائیں! پاکستان میں "بت شکنی" کی جگہ "بت گری" ہو رہی ہے بس دیکھنے میں کرسیاں اور اجسام بدل گئے ہیں مگر وہی "انگریزی روح" اپنا کام کر رہی ہے! بس اتنا ہوا ہے کہ انگریزی صاحبوں کی جگہ کچھ "پاکستانی صاحب" آگئے ہیں ــــــــ اور "صاحب" ہی نہیں "میم صاحبات" بھی!

مسلم لیگ نے ملت کو ایک نعرہ دیا تھا کہ:۔

"پاکستان کا مطلب لا الٰہ الا اللہ"

یہ صرف نعرہ ہی نہ تھا بلکہ وعدہ اور عہد بھی تھا، اسی نعرے اور وعدے کے سہارے پوری قوم مسلم لیگ کے جھنڈے تلے آگئی، اور مسلم لیگ کے بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے لیڈر کی قیادت کو اسی نعرے نے چمکایا!

مگر پاکستان بن جانے کے بعد مسلم لیگ نے اس نعرہ کو جتنا پست و ذلیل کیا ہے اور اپنے عہد اور قول و قسم کی جس بے حیائی کے ساتھ دھجیاں اڑائی ہیں، اس کی مثال کسی پارٹی اور قومی تنظیم کی تاریخ میں شاذونادر ہی ملے گی اور حق یہ ہے کہ نہیں ملے گی، مسلم لیگ نے اپنے دورِ حکومت میں کسی ایک "معروف" کو نہ تو قائم کیا اور نہ کسی "منکر" کو مٹایا، انگریز کے دور میں شراب کا، قماربازی کا، سود کا، بدکاری اور فواحش کا جو کاروبار چلتا تھا اس پہ نہ صرف یہ کہ کوئی قدغن نہیں لگائی بلکہ ان برائیوں، بداخلاقیوں اور فحاشیوں میں اور اضافہ ہو گیا مسلم خواتین کو بے پردہ و بیباک بنانے اور سیر و تفریح کی چاٹ لگانے کا آغاز مینا بازاروں سے لیا گیا، جن کی سربراہ "مسلم لیگی بیگمات" ہی تھیں، مسلم لیگ ہی کے دورِ حکومت میں اسکولوں اور کالجوں کی مسلمان لڑکیوں کو نچایا گیا اور گرل گائیڈ نے باہر سے آئے ہوئے "بڑے آدمیوں" کو سلامی دے کر اسلامی تہذیب و اخلاق کو سربازار رسوا کیا، انگریز ڈیڑھ سو سال میں جو برائیاں اور خرابیاں مسلمانوں کے معاشرے میں پیدا نہ کر سکا تھا مسلم لیگ کی پانچ چھ سال کی حکومت و فرمانروائی کے دور میں وہ اخلاقی برائیاں اس طمطراق اور شان و شکوہ کے ساتھ پیدا ہوئیں اور ابھریں جیسے ہماری تہذیب و تمدن کے لئے یہ بے حیائیاں سرمایہ فخر و ناز ہیں!

مسلم لیگ کے لیڈروں نے اپنے اقتدار اور فرمانروائی کو مستحکم بنانے کے لئے گھٹیا کردار کے لوگوں کی پشت پناہی کی اور نظم و نسق کے بعض مسائل میں، انگریزی ٹیکنک سے کام لیا۔ یہ مسٹر گرمانی مسلم لیگی دور ہی کے "وزیر بے قلمدان" تھے جنھوں نے آزاد کشمیر کے لیڈروں میں پھوٹ ڈلوادی! قادیانیوں کو مسلم لیگ ہی کے عہدِ فرمانروائی میں عروج حاصل ہوا۔ سرظفر اللہ خاں نے مجلس اقوام میں پاکستان کی نمائندگی کے ساتھ ساتھ جاسوسی کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں۔

سیاسی توڑ جوڑ، رشوت، چوربازاری اور اقرباء نوازی نے مسلم لیگ کے دورِ حکومت ہی میں فروغ پایا ہے۔ یہ برائیاں آکاس بیل کی طرح پروان چڑھیں اور پھیلی ہیں اور پاکستان کا خزانہ "خوانِ یغما" بنا رہا ہے!

یہ نکتہ غور و فکر کا مستحق ہے کہ مسلم لیگی لیڈر پہلے تو بہت مخلص، اسلام پسند اور قوم کے دردمند تھے۔ پاکستان بننے کے بعد جب اقتدار ان کے ہاتھ میں آیا تو وہ یکایکی بگڑ گئے اور نشۂ دولت نے انہیں سرشار کر دیا ـــــــــ یہ قوم و ملت کی خوش عقیدگی تھی کہ وہ سیاسی نعروں کے ریلے میں بہہ گئی، اور اس نے اپنے رہنماؤں کی زندگیوں کو پڑھنے اور ان کے مزاج و کردار کا تجزیہ کرنے کی کوشش ہی نہیں کی، چوٹی کے چند مسلم لیگی لیڈروں کو چھوڑتے ہوئے، مسلم لیگی رہنماؤں نے تقسیم ہند سے قبل بھی عہدوں اور منصوبوں کے لئے انتہائی خودغرضی کا ثبوت دیا تھا۔ ہماری آنکھوں نے ناگپور کے جلسوں میں یہ مناظر بھی دیکھے ہیں کہ صوبہ مسلم لیگ کی صدارت کی خاطر نواب صدیق علیخاں

کی پارٹی نے عبدالرؤف شاہ مرحوم کو گرانے اور نیچا دکھانے کی کوشش کی ہے اور، اور وہاں. سی. پی اور برار کے مسلمانوں کے درمیان صوبائی عصبیت کو اچھالا گیا ہے، دوسرے صوبوں میں بھی مسلم لیگ کے عہدوں کے لئے آپس میں کش مکش اور تناتنی رہی ہے، اور جب اسمبلی کے ٹکٹ حاصل کرنے کا زمانہ آیا، اس وقت نہ پوچھئے کہ کس کس طرح کے سیاسی داؤ پیچ اور توڑ جوڑ سے کام لیا گیا۔

مسلم لیگ کے جلسوں میں اسٹیج پر بیٹھنے اور فوٹو گروپ میں آنے کے لئے حریفانہ مسابقت اور رسہ کشی رہی ہے، جلسوں کے پروگراموں میں اس کی رعایت رکھی گئی ہے کہ فلاں ممتاز رکن کہیں ناراض نہ ہو جائیں، ان کو بھی تھوڑی دیر تقریر یا کسی ریزولیشن کی تائید کرنے کا موقعہ دیا جائے۔ جہاں نمود و شہرت اور عہدوں اور منصبوں کی اتنی حرص پائی جاتی ہو، وہاں اخلاص اور ایثار کی توقع رکھنا سادہ لوحی نہیں تو اور کیا ہے؟ جن دماغوں کی ایسی خود غرضی کی فضا اور آپادھاپی کے ماحول میں تربیت ہوئی ہو اور جو عہدوں اور کرسیوں کے اس قدر حریص اور تمنائی ہوں، وہ اقتدار حاصل کرنے اور حکومت کی کرسیوں پر متمکن ہونے کے بعد اگر بدل جاتے تو یہ ایک قسم کا معجزہ ہوتا۔ ان مسلم لیگی اکابر کی اکثریت نے پاکستان کی زمام اقتدار ہاتھوں میں لینے کے بعد بھی وہی کھیل کھیلا جسے وہ برسوں سے کھیلتے آئے تھے، اور جو اُن کا "مزاج" بن گیا تھا، حکومت کے نشہ نے اس مستی کو اور بڑھا دیا اور یہ ہوس تیز تر ہو گئی۔

بگاڑ کا ذمہ دار کون ہے؟

یہ جو مشرقی پاکستان میں کمیونسٹوں اور ہندوؤں کو نمود کا موقعہ ملا ہے، اس کی زیادہ تر ذمہ داری نورالامین صاحب کی مسلم لیگی حکومت پر عائد ہوتی ہے، پنجاب میں، سرحد اور سندھ میں ہر جگہ مسلم لیگ کی وزارتوں ہی نے حالات کو بگاڑا اور ملک میں ابتری پیدا کی۔

عوامی لیگ، نیشنل پارٹی اور ری پبلکن پارٹی جن سیاسی بازیگروں سے عبارت ہیں، ان کی اکثریت مسلم لیگ ہی کی ساختہ پرداختہ ہے۔ یہ سب مسلم لیگ ہی کے کیمپ کے "مفرور مجاہدین" اور بے وفا عشاق ہیں۔ مسلم لیگ نے اپنے ورکروں اور نمائندوں کا جو مزاج بنایا تھا اس کا یہی تقاضا تھا کہ ذاتی اغراض کے لئے نیاز مندیاں اور وفاداریاں بدلتی رہیں اور ضمیر فروخت ہوتے رہیں! اپنے مفاد کے لئے ہر اصول کچے دھاگے کی طرح توڑ دیا جائے، نہ خدا کی شرم نہ بندوں کا خوف اور نہ ملت کی تباہی کا کوئی احساس!

مسلم لیگ کی حکومت ختم ہوئی تو اس کے جانشین وہی لوگ ہوئے جو ایک زمانہ میں مسلم لیگ کے نیاز مند اور وفادار تھے! انھوں نے ملک کے بگاڑ کی رہی سہی کسر کو بھی پورا کر دیا، اب پاکستان کی حالت اس کشتی کی سی ہے جس کے بادبان شکستہ اور جس کے تختوں میں جگہ جگہ چھید ہو گئے ہوں، اور یہ کشتی ٹوٹے ہوئے تختوں اور پھٹے ہوئے بادبانوں کے ساتھ منجدھار میں پھنس گئی ہو! بین الاقوامی دنیا میں بالشت بھر کی ترقی یافتہ حکومت کا بھی کچھ وقار ہے اور اس کی اہمیت تسلیم کی جاتی ہے مگر پاکستان کی کوئی اہمیت نہیں، کوئی ساکھ اور وقار نہیں، پاکستانی لوگ دوسرے ملکوں میں جاتے ہیں تو وہاں ان کو ذلت و نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے

اس کوتاہی قسمت اور خرابی تدبیر کا کس سے گلہ کیجئے اور کس منہ سے کیجئے کہ پاکستان بننے سے پہلے ہم معزز تھے مگر پاکستان بننے کے بعد ذلیل ہو گئے ع

یہ جانتے تو آگ لگاتے نہ گھر کو ہم

مسلم لیگ کو پاکستان میں کام کرنے کا کتنا بڑا میدان ملا تھا، آٹھ کروڑ انسانوں کی آبادی کی عظیم الشان سلطنت کا نظم و نسق اس کے قبضہ میں آیا تھا۔ اس کے لیڈر اخلاص، ایثار اور دردمندی و دلسوزی سے کام کرتے تو آج پاکستان دنیا کی بہت بڑی طاقت ہوتا اس کی آواز اور احتجاج، مشورہ اور اپیل کا اسی دنیا میں وزن محسوس کیا جاتا مگر مسلم لیگ کا جو قدم بھی اٹھا وہ تعمیر کی بجائے تخریب کے لئے اٹھا جیسے کہ اس کا کام یہی تھا کہ :- ع بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے۔

ہنر مش نیز بنگر

ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو کسی کی مخالفت میں عدل و انصاف کی حدود سے گزر جاتے ہیں۔ کسی کے دامن میں بھلائی اور نیک نامی کے چند ذرے بھی ہیں تو ان کے اعتراف میں ہم جھجک محسوس نہیں کرتے: ..... قائداعظم مرحوم کو پاکستان بننے کے بعد کام کرنے کا بہت ہی کم وقت ملا۔ ان کا زیادہ زمانہ بیماری میں گزرا۔ ان کے زمانے میں مشرقی پاکستان میں اردو کے خلاف فتنہ اٹھا تھا جسے انکی حکمت، تدبیر اور ذاتی اثر نے دبا دیا، کاش! "اردو" کے بارے میں وہ کوئی قطعی فیصلہ نافذ کر جاتے!

پاکستانی عوام کا "اسلامی دستور" کے لئے مطالبہ جب فضا میں خاصہ گونج چکا ہے، تو اس کے بعد لیاقت علیخاں مرحوم کو "قرارداد مقاصد" پیش کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ مرحوم حالات کو سنوارنے کیلئے کوئی انقلابی قدم اٹھانا چاہتے تھے کہ راولپنڈی میں انکی شہادت واقع ہو گئی اور انکے منصوبے جی کے جی ہی میں رہ گئے۔ غالباً ناپسندیدہ عناصر کو حکومت سے نکال کر، مرکز کی وہ تطہیر کرنا چاہتے تھے۔

سردار عبدالرب نشتر مرحوم مسلم لیگ سے ناپسندیدہ عناصر کو نکال تو نہ سکے لیکن مرحوم ملک و ملت کے مخلص بہی خواہ اور اسلام پسند تھے۔ انہوں نے اسلام کے اُن نظریوں کو خلوص کے ساتھ دہرایا جن کو قیام پاکستان کی "بنیاد" کہا جا سکتا ہے۔ انہی کے دور میں مسلم لیگ کے لیڈر مسٹر چندریگر نے وزارت عظمیٰ کو سنبھالا اور ان کے ڈیڑھ دو مہینے کے دور حکومت میں کوئی نئی خرابی سننے میں نہیں آئی۔ یہی غنیمت ہے کہ ان کے زمانے میں پچھلی برائیوں میں اضافہ نہیں ہوا۔ نظام اسلام پارٹی کے تنہا ایک وزیر مسٹر فرید احمد کی ایمانی جرأت و فراست نے فضا میں ہلچل سی پیدا کر دی....... مگر یہ دور حکومت "شعلہ مستعجل" ثابت ہوا۔

مسلم لیگ کے لیڈر مولوی تمیزالدین خاں کا یہ کارنامہ پاکستان کی تاریخ میں سنہری حرفوں سے لکھا جائے گا کہ انھوں نے مسٹر غلام محمد کے "آمرانہ دور" میں جمہوریت کو بحال کرانے کے لئے بڑی ایمانی جرأت سے کام لیا۔ اس اخلاص اور جرأت کے لیڈر مسلم لیگ کو میسر آ جائیں تو مسلم لیگ کی تقدیر چمک اٹھے! اور اس پارٹی کے سارے دور ہی دور ہو جائیں۔ کاش! ایسا ہو سکے!

اور...... اب

اس وقت خاں عبدالقیوم خاں مسلم لیگ کے صدر ہیں۔ جن کی تقریریں دھواں دار ہی نہیں شعلہ افشاں بھی ہوتی ہیں۔ خان موصوف جس زمانہ میں صوبہ سرحد کے وزیراعظم تھے، انھوں نے اپنی ملت کے ساتھ "ابریشم" نہیں بلکہ "فولاد" بن کر ہی سلوک کیا۔ اس "مردِ آہن" کی آمریت اور استبداد کو دیکھ کر وہاں کے لوگ پناہ مانگنے لگے کہ اگر جور و استبداد کا نام "ڈسپلن" ہے تو ایسے ڈسپلن کو ہزار بار دُور ہی سے سلام! اُن کے زمانہ میں سرحد میں بے شک ترقیاں ہوئیں مگر عوام کے اشکوں آہ و بکا و فریاد کے ہجوم میں! خاں عبدالقیوم صاحب ہی کی سخت گیر پالیسی کے سبب پیر صاحب مانکی شریف اور مسٹر یوسف خٹک جیسے لیڈروں کو بادلِ ناخواستہ مسلم لیگ چھوڑنی پڑی! اور مسلم لیگ کی تاریخ میں عبدالقیوم خاں صاحب نے اس سیاہ باب کا بھی اضافہ کیا کہ سنہ ۱۹۵۱ء میں جب صوبہ سرحد میں عام انتخابات ہوئے تو مسلم لیگ کی طرف سے یوسف صاحب خٹک کو ٹکٹ دیا گیا۔ یہ صاحب ان دنوں مسلم لیگ کے جنرل سکریٹری تھے۔ مگر دنیا یہ دیکھ کر حیرت میں رہ گئی کہ خود مسلم لیگ کے وزیراعلیٰ جناب خاں عبدالقیوم خاں نے سرکاری مشنری کو اس مہم پر لگا دیا کہ کسی طرح یوسف خٹک ناکام ہو جائیں اور وہ بالآخر ناکام ہو کر رہے۔

سنہ ۱۹۵۵ء میں دستور ساز اسمبلی کا جب انتخاب ہوا تو عبدالقیوم صاحب آس لگائے بیٹھے تھے کہ مجھے ضرور ٹکٹ ملے گا مگر مسلم لیگی پارلیمانی بورڈ نے انہیں ٹکٹ نہیں دیا۔ بس اس ناکامی پر انھوں نے مسلم لیگ سے استعفا دیا اور اپنے بیان میں کہا کہ میں اب آزاد ممبر کی حیثیت سے مسلم لیگ کا مقابلہ کروں گا! انھوں نے اپنے بیان میں مسلم لیگ کے لئے بڑے ناشائستہ الفاظ استعمال کئے!

مسلم لیگ کے لیڈروں کا یہ عالم ہے کہ مسٹر راشدی جنھوں نے مسلم لیگ پر اپنی جان قربان کرنے کا اعلان کیا تھا "سفارت" کی چمک دیکھ کر ایسے وارفتہ ہوئے کہ اپنی جان عزیز کو لے کر فلپائن میں جا براجے اور مسٹر کھوڑو نے مسلم لیگ کے مقابلہ میں متوازی سندھ لیگ قائم کر ڈالی!

مسلم لیگ میں جو بڑے لیڈر باقی رہ گئے ہیں، ان میں سے مسٹر دولتانہ کو سب جانتے ہیں کہ "ختم نبوت" کی تحریک کے زمانہ میں جب وہ پنجاب

کے وزیر اعظم تھے، تو انھوں نے کیا کارنامہ انجام دیا؟ قاضی عیسیٰ مسلم لیگ کی پالیسی کے برخلاف مسٹر سکندر مرزا صدر مملکت کی شان میں جو قصیدہ خوانی فرما چکے ہیں، اس سے ابھی "تمناؤں" کا پتہ چلتا ہے! راجہ غضنفر علیخاں نے ایران اور بھارت کے سفارت خانوں میں جو عیش کئے ہیں اور گلچھرے اڑائے ہیں اور پاکستان کے نام کو اونچا (؟) کیا ہے، وہ اب کوئی راز نہیں رہا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انھوں نے مخلوط انتخاب کی حمایت میں مسلسل مضامین لکھے ہیں ان میں مسٹر بروہی بھی شامل ہیں، جنھوں نے مسٹر غلام محمد کے عہدِ حکومت میں چیلنج دیا تھا کہ کوئی یہ ثابت کر دے کہ اسلامی دستور کا کوئی خاکہ قرآن کریم میں پایا جاتا ہے، یہ صاحب، کوئی شک نہیں بے حد ذہین ہیں مگر ان کے دل و دماغ پر گاندھی کی تعلیم کا غلبہ ہے اور ان کی تقریروں سے "وحدتِ ادیان" کی بو آتی ہے۔

اور یہ بات عالم آشکارا ہو چکی ہے کہ حصول اقتدار کے لالچ میں مسلم لیگ نے نیشنل عوامی پارٹی سے ون یونٹ کی شکست و ریخت اور مخلوط انتخاب کی حمایت کی شرائط پہ معاہدہ کیا تھا! اس ملک کی بدقسمتی پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے، جس کو ایسے "مرغانِ بادنما" قسم کے لیڈر میسر آئے ہوں اور جن کے کارنامے اس درجہ سیاہ ہوں! توبہ!!

ہم مانتے ہیں کہ انسانوں سے غلطیاں بھی ہو جاتی ہیں، آدمی نفس کے فریب اور شیطان کے بہکانے میں بھی آجاتا ہے اور پھر صدقِ دل سے تائب ہو کر صراطِ مستقیم پر گامزن ہو جاتا ہے۔ ندامت کے آنسوؤں سے فردِ عمل دُھل سکتی ہے اور آدمی اخلاص کے ساتھ توبہ کرلے تو تخریب و فساد کے بعد تعمیر و اصلاح کے باب کا آغاز ہو سکتا ہے ——— سوال یہ ہے کہ کیا مسلم لیگ کے موجودہ لیڈروں نے واقعی توبہ کرلی ہے، کیا انھوں نے اپنی پچھلی غلطیوں اور بداعمالیوں کی تلافی کا بیڑا اٹھا لیا ہے، کیا ان کے اندر عہدوں اور کرسیوں کی حرص نہیں رہی اور وہ کامل اخلاص کے ساتھ ملت کی خدمت کرنا چاہتے ہیں اگر ایسا ہو گیا ہے تو یہ اکابر قوم کی طرف سے مبارکباد کے مستحق ہیں۔

——— مگر ———

حال ہی میں کراچی کارپوریشن کے جو الیکشن ہوئے ہیں، انھوں نے اس حقیقت کو ایک بار پھر ابھار دیا کہ زمانے کے اس قدر جھٹکوں اور حالات کے اتنے تلخ تجربوں کے بعد بھی ان مسلم لیگیوں کی ذہنیتوں کا وہی عالم ہے۔ ان میں کوئی تبدیلی ہی پیدا نہیں ہوئی۔ وہی اقتدار کے لئے رسہ کشی، دوسرے کو گرا کر آگے بڑھنے کی کوشش وہی سیاسی ہتھکنڈے اور پالیٹکس کے داؤں پیچ، پارٹی کے ڈسپلن سے بے پرواہی اور اپنے موقف کو مضبوط کرنے کے لئے توڑ جوڑ کر کے گروہ سازی!

ایک جاہل سرمایہ دار جس نے غلام محمد مرحوم کو "محافظ ملت" کا خطاب دیئے جانے کے لئے ایک سوانگ کھڑا کیا تھا، اور اس کی اس حرکت پر ہر طرف سے قوم نے لعنت ملامت کی تھی، اور جو عالم بالا کے اشارے پر مسلم لیگ سے قطع تعلق کر کے ری پبلکن پارٹی سے جا ملا تھا! وہ جو قصر و ایوان کے ضمیر فروش نیاز مندوں اور جی حضوریوں میں اپنی آپ مثال ہے! اس کو پھر مسلم لیگ میں شامل کر لیا گیا ہے، اور اس کو لیگ میں عہدہ دلانے کے لئے ایک پارٹی بن گئی ہے۔

مسلم لیگ کا تقسیم ہند سے قبل وہ زمانہ بھی تھا کہ بیگم مولانا محمد علی اس قدر حجاب و احتیاط، حیا، خودداری اور شرافت و عظمت کے ساتھ مسلم لیگ کے جلسوں میں شرکت فرماتی تھیں کہ ان کی انگلی کی پور تک دکھائی نہ دیتی تھی اور اب مسلم لیگ کے دربار میں وہ بیگمات بار پا رہی ہیں، جن کے دم سے اس زمانے میں "تبرج جاہلیت" زندہ و پائندہ ہے!! اللہ تعالیٰ اس ذہن و مزاج کی "لیڈرانیوں" کی پرچھائیں سے بھی امت مسلمہ کی خواتین کو بچائے۔ آمین

مفاد پرستی اور اغراض دوستی کا یہ وہ پرانا روگ ہے جو پرانے بخار کی طرح مسلم لیگ کے ارکان کی رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے، پاکستان بننے کے بعد مسلم لیگیوں کا یہ کردار رہا ہے۔ اس کی ایک جھلک اوپر پیش کی جا چکی ہے ——— کیا اسی مسلم لیگ میں دینی جماعتوں اور اسلامی تنظیموں کو ضم ہونے کی دعوت دی جا رہی ہے؟ کیا یہی وہ جماعت ہے، جو انتخاب کی آمد کا غلغلہ سن کر یہ دعوی لے کر اٹھی ہے کہ مسلم لیگ نے پاکستان بنوایا تھا اور وہی اس کی مستحق ہے کہ پاکستان کی تقدیر اس کو سونپ دی جائے ——— اس اعتراف نیاز مندی کے ساتھ:-

سپردم بتو مایۂ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

اگر ایسا ہوگیا تو کیا یہ لوگ اپنے ماضی کی برائیوں کو دُہرانے سے باز آجائیں گے؟ ان اندیشوں کو دور کرنے کے لئے قابلِ اعتماد ضمانت درکار ہے۔

امتحان، آزمائش

مغربی ممالک کے باشندوں کو آپ جو چاہے کہہ لیجئے مگر اُن کی اس خوبی کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ قومی کردار اور سیاسی شعور رکھتے ہیں۔ وہاں کوئی ایسا لیڈر فروغ نہیں پا سکتا جس نے ملک و قوم کے مفاد کے خلاف کوئی حرکت کی ہو، وہ لوگ اپنے اکابر اور لیڈروں کی ایک ایک نقل و حرکت پر نگاہ رکھتے ہیں، غلط کردار کے لوگ چاہے وہ کتنے ہی ذہین، لکھے پڑھے اور صاحبِ ثروت کیوں نہ ہوں، لیڈر بن کر منظرِ عام پر آنے کی کوشش ہی سرے سے نہیں کرتے، اگر وہ ایسی حماقت کر بیٹھیں تو عوام میں وہ مقبول نہیں ہو سکتے اور ایک کروڑ پونڈ خرچ کرنے کے بعد بھی کسی ایک منہ سے ان کے لئے "زندہ باد" نہیں نکل سکتا۔

مگر پاکستانی عوام کے جوشِ عقیدت کا یہ عالم ہے کہ ہر نعرہ باز لیڈر کو وہ "زندہ باد" کہنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں، اُن کا حافظہ اس قدر کمزور ہے کہ وہ لیڈروں کے ماضی کو بھول جاتے ہیں کہ کس کا کیا کردار اور سیاسی رول رہا ہے۔

یہاں کسی شخص کا کردار چاہے کتنا ہی مشتبہ بلکہ داغدار کیوں نہ رہا ہو اگر برسرِ حکومت گروہ کو ملاحیاں سنا دے اور صدرِ مملکت پر کڑی تنقید کر دے تو قوم اس کو "ہیرو" سمجھنے لگتی ہے، اور نہیں سوچتی کہ خود یہ صاحب اپنی ذات سے کیا واقع ہوئے ہیں؟ غلام محمد مرحوم سے پاکستانی عوام بیزار تھے۔ لیکن بعض موقعہ پرست خود غرض علماء جب انہیں ایک سیرت کے جلسہ میں لے کر آئے، تو ہزاروں عوام اس جلسہ میں پہنچ گئے اور یہ سوچنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی کہ رسول اکرم کے نام پر اور سیرت النبی کی آڑ میں اپنے ذاتی اغراض اور شخصی مفادات کے حصول کے لئے یہ ایک ڈرامہ اسٹیج کیا جارہا ہے اور جس شخص نے پاکستان میں نبی عربی کا دین قائم نہ ہونے دیا ہو، وہ بھلا اس کا مستحق ہے کہ سیرت النبی کے جلسہ میں مسند نشینی کا اسے اعزاز دیا جائے! یہاں الجزائر و فلسطین کی ہمدردی میں روس کے ایجنٹ جلسے کرتے ہیں اور عوام اُن جلسوں کی رونق بڑھاتے ہیں وہ اس نزاکت پر غور نہیں کرتے کہ امریکہ اور برطانیہ کی مخالفت کا یہ کیا محل ہے! یہ ریزولیشن جو اُن کے سامنے تائید کے لئے پیش کیا جا رہا ہے، اس سے کس بین الاقوامی سیاسی گروپ کے عزائم کو کمک ملتی ہے اور کس کے اشارے اور شہ پر یہ بزم سجائی گئی ہے اور بجلی کے قمقموں سے جلسہ کے میدان کو بقعۂ نور بنایا گیا ہے۔

عوام کی بے حسی اور بے غیرتی کا یہ عالم ہوگیا ہے کہ کلب گھروں میں ناچنے والے لیڈروں کے اعزاز و خیر مقدم میں انہوں نے جلوس نکالے ہیں اور سپاس نامے پیش کئے ہیں وہ لوگ جنہوں نے اسلامی دستور کی کھلے خزانے مخالفت کی ہو، جن کو پاکستان کے لئے "اسلامی مملکت" کی نسبت گوارا نہ ہو اور جو پاکستان کے بنیادی نظریہ کے دشمن ہوں ان کے پیچھے بھی ہزاروں عوام چل رہے ہیں! کوئی ون یونٹ کی تائید کر دے۔ کوئی مہاجرین کی ہمدردی میں کوئی بیان دے دے، کوئی حکومت کو ملاحیاں سُنا دے۔ کوئی عربوں کی ہمدردی میں تقریر جھاڑ دے، کوئی روس یا مغربی طاقتوں کو برا بھلا کہہ دے، کوئی کشمیر کے لئے جان قربان کرنے کا اعلان فرما دے ——— بس ان نعروں اور تقریروں کو سن کر عوام خوش ہو جاتے ہیں اور نہیں سوچتے کہ کہنے والا کس کردار اور مزاج کا آدمی ہے، اس کے کیا مقاصد اور عزائم ہیں۔ وہ کس پارٹی سے تعلق رکھتا ہے اور جس پارٹی سے وہ متعلق ہے خود اس پارٹی کا کیا موقف اور کیا اصول ہیں، اس نے ملک و ملت کے لئے اب تک کیا کیا ہے۔ وہ پارٹی کس کیرکٹر اور سیرت کے افراد سے عبارت ہے۔

عوام کی اسی کمزوری سے یہ موقعہ پرست لیڈر فائدہ اٹھاتے ہیں، وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ کسی ایک سیاسی اسٹنٹ اور ہنگامہ خیز نعرے سے عوام کو اپنی طرف مائل کیا جا سکتا ہے، یہی سبب ہے کہ اس قسم کے لیڈروں کو عوام کے احتساب کا ذرہ برابر ڈر نہیں ہے! عوام کا شعور اگر پوری طرح بیدار ہو، تو بھلا کسی سیاسی بہروپیے کو منظرِ عام پر آنے کی جرأت ہو سکتی ہے۔

عوام میں جب تک سیاسی شعور پوری طرح بیدار نہ ہوگا، وہ کھرے کھوٹے میں تمیز کرنا سیکھیں گے اور جماعتوں اور ان کے کارکن اور رہنماؤں کے عمل و کردار اور سیرت و مزاج کا تجزیہ اور مطالعہ کرنے کی صلاحیت اُن میں پیدا نہ ہوگی، اس وقت تک پاکستان کا سفینہ یونہی ہچکولے کھاتا رہے گا اور یہاں ہر غرض پرست، مفاد دوست اور بے ضمیر انسان کو فرمانروائی کرنے اور سادہ لوح عوام کی گردنوں پر مسلط رہنے کے مواقع ملتے رہیں گے۔

عوام سے ہم مایوس نہیں ہیں بلکہ اُنکی طرف سے پُر امید ہیں، اسلامی دستور سازی کی جدوجہد میں انھوں نے مخلص افراد اور ملک و ملت کے دردمندوں کا ساتھ دیا تو قصر و ایوان کی مخالفت کے باوجود انہیں اس مقدس جدوجہد میں خاصی کامیابی حاصل ہوئی! یہاں پاکستان میں ... جب کبھی اللہ کے حکم سے عوام کی آئینی جدوجہد کی بدولت اسلام پسندوں کو غلبہ حاصل ہوگا تو انشاء اللہ دستور کو جاہلیت کی آمیزش سے پاک کر کے اسے خالص اسلامی بنا دیا جائے گا!

انتخابات آ رہے ہیں، عوام کے شعور و فہم، دینی حمیت، اسلامی غیرت اور ایمانی فراست کے امتحان کا یہی وقت ہے، انہیں پارٹیوں اور جماعتوں کے درمیان فیصلہ کرنا ہوگا کہ کس جماعت کو ووٹ دینے چاہئیں؟ اور اس فیصلہ، انتخاب اور پسندیدگی کے لئے انہیں پوری ذمہ داری، دیانت اور دقتِ نظر کے ساتھ یہ دیکھنا ہوگا کہ ۔۔۔

ملک کی کس جماعت کا اب تک کیا رول ۔۔۔ رہا ہے ــــــــ ملک میں وہ کون سی ایسی جماعت ہے جس کے اصول و مقاصد میں کوئی تغیر پیدا نہیں ہوا ــــــــ جس کے رہنماؤں نے کسی سیاسی جماعت سے سودے بازی نہیں کی ــــــــ جس کے ارکان کے دامن پر لائسنسوں اور پرمٹوں کی آلائش کا ذرا سا داغ بھی نظر نہیں آتا ــــــــ کون جماعت برسوں سے اللہ کے بندوں کی خدمت کر رہی ہے ــــــــ کس جماعت کے ارکان تقویٰ، صالحیت، خدا ترسی اور نیکوکاری کی کتنی کمیت اور کیفیت اپنے اندر رکھتے ہیں ــــــــ کس جماعت کی تنظیم چُست ہے اور کس کے یہاں ڈسپلن کی کمی پائی جاتی ہے ــــــــ قوم کے دل و دماغ اور سیرت کو اسلامی اخلاق کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے کس جماعت نے کیا تدابیر اختیار کی ہیں ــــــــ کس جماعت ... پر آزمائشوں کے کتنے دور آئے، اور اس نے کس عزیمت کا ثبوت دیا؟

ہم اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے، عوام خود فیصلہ کریں کہ پاکستان میں ان خوبیوں کی حامل کونسی جماعت ہو سکتی ہے؟ یقین ہے کہ عوام نے اگر دینی بصیرت اور ایمانی فراست سے کام لیا تو اُن کا فیصلہ صحیح ہوگا۔ اور انتخابات میں عوام نے اس جماعت کا ساتھ دیا۔ تو انشاءاللہ عوام حقیقت منتظر کو "لباسِ مجاز" میں دیکھ لیں گے۔ پاکستان میں اللہ کے دین کو غلبہ حاصل ہوگا۔ اسلامی قدریں پروان چڑھیں گی۔ اور ہر طرف بھلائی اور نیکی کا چلن ہوگا!

وہ پاکستانی حقیقت میں پاکستان کے ساتھ دشمنی کرے گا جو پاکستان کی کسی ایسی پارٹی کو اپنا ووٹ دے گا جو پاکستان کے بنیادی نظریوں کی مخالف ہو۔ یا کسی ایسے فرد کو انتخاب میں کامیاب بنانے کے مواقع فراہم کرے گا جو عہدے کا حریص، مفاد پرست، شعبدہ باز اور بے ضمیر ہو۔

کاش! عوام اس امتحان میں پورے اتر سکیں! اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید پاکستانیوں کے صحیح اقدام کی راہ دیکھ رہی ہے، دیکھیں یہ سعادت کس کس کے حصہ میں آتی ہے!

ماہر القادری
۲۲ اگست ۱۹۵۸ء

سماج اور ادیب

اسعد گیلانی

انسانی سماج مختلف عناصر پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی ہیئت اجتماعی ہے جو اپنے لئے تہذیبی، تمدنی، معاشی، معاشرتی، اخلاقی اور سیاسی اقدار رکھتی ہے جس کی تشکیل و تعمیر اور ارتقا میں بے شمار عوامل سرگرم کار نظر آتے ہیں۔ ہر عامل اپنا حصہ نمایاں طور پر ادا کرتا ہے ان سارے کارکنوں میں جو سماج کے ارتقا اور تعمیر میں معروف نظر آتے ہیں۔ ادیب ایک ذہنی کارکن ہے۔ یہ ذہن کی زمین ہموار کرتا اس میں فکر کی تخم ریزی کے لئے آبیاری کرتا اور ترقی و عمل کی عمارت تعمیر کرنے کے لئے فکری مسالہ فراہم کرتا ہے۔ سماج کی تعمیر میں جزوی عنصر ہونے کے باوجود سب سے زیادہ موثر عنصر یہی ہے اس لئے کہ یہ سماج کے ہر طبقہ کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اور سب سے زیادہ اس طبقہ کو متاثر کرتا ہے جو عملاً معاشرے کی رہنمائی کر رہا ہوتا ہے یعنی تعلیم یافتہ طبقہ —— اگرچہ اب ڈرامے۔ فلم اور ٹیلی وژن کے ذریعہ وہ سماج کے ان پڑھ طبقات کو بھی متاثر کر رہا ہے اور یہ تاثر چونکہ ذہنی عمل سے زیادہ مشاہدات اور مکالمات پر مبنی ہوتا ہے اس لئے اس کی اثر پذیری ان پڑھ عوام پر بہت زیادہ ہے۔ اور چونکہ ناخواندہ عوام برائی بھلائی کا پورا پورا شعور نہیں رکھتے ہیں۔ اس لئے وہ اپنے تفریحی مشاہدات سے بے حد اثر قبول کرتے ہیں جس کے نتائج ان کی روزمرہ کی زندگی میں نمایاں نظر آتے ہیں۔

سماج میں فرد کی حیثیت

سماج کی ہیئت کا تجزیہ کریں تو اس کی اکائی فرد نظر آتا ہے ایک فرد ہی ہے جس کے کردار کی تعمیر و تشکیل پر سماج کا ارتقا منحصر ہے اور جس نوعیت کا کردار کسی سوسائٹی میں ایک فرد کا مشکل ہوتا ہے۔ وہی کردار سماج کی تطہیر میں نمایاں ہوتا ہے۔ اس لئے تعمیر سماج کا اصل عمل فرد سے شروع ہوتا ہے۔

فرد خارجی طور پر دو راستوں سے اثر قبول کرتا ہے:۔

- عقلی اطمینان
- جذباتی تاثر

ادیب ان دونوں راستوں سے فرد کو متاثر کرتا ہے جس طرح میکانکی مشین ہینڈل گھمانے اور بٹن دبانے سے کام کرنے لگتی ہے انسانی مشین عقل کے اشارے پر حرکت میں آتی ہے۔ اور جس طرح میکانکی مشین پٹرول، بجلی، بھاپ یا کسی دوسری قوت سے کام کرتی ہے۔ انسانی مشین بھی جذبات کے تاثر و اشتعال سے کام کرتی ہے۔ ادیب انسان کی عقل کو مطمئن کرکے ایک راہ پر لگاتا ہے اور اس کے جذبات کو متاثر و مشتعل کرکے فعل و عمل پر ابھارتا ہے۔ اسی طرح انسان کے کردار کی تعمیر و تشکیل ہوتی ہے۔ انسانی نفسیات کے محرم اور مقدس ترین حکیم حضور رسول اکرم ﷺ نے اسی بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ:

> انسانی جسم کے اندر جسم کا ایک لوتھڑا ہے جس کا بگاڑ انسان کا بگاڑ ہے اور جس کا سنوار انسان کا سنوار ہے —— اور وہ دل ہے۔

اور یہ ادب ہی ہے جو انسان کے دل پر براہ راست اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

ادب ایک قوت

ادب ایک زور آور قوت ہے جو اپنا داخلی عمل کرتی اور فرد کے ظاہر کو اس داخلی عمل کے ذریعہ متاثر کرتی ہے۔ ادب اپنے موضوع اور فن کے لحاظ سے اثر پذیری میں کم و بیش ہو سکتا ہے لیکن اثر آفرینی مسلم ہے۔ ایک قوت جو حق کی حمایت کرے تو قابل احترام، باطل کی پشت پناہی کرے تو قابل نفرت۔

ایک قوت جو مظلوم کا ساتھ دے تو رحمت اور ظالم کا آلۂ کار بنے تو عذاب۔ ایک قوت جو انسانی سماج کے اندر صدیوں سے مسلم سچائیوں کو فروغ دے تو تعمیری، اور افکار و خیالات کو پراگندہ کر کے ان سچائیوں سے محروم کرے تو تخریبی ہے۔

ادب، ایک تخریبی قوت

سماج جو بے شمار انسانی زندگیوں کا، ان کے ماضی حال مستقبل کا گہوارہ ہے جس کی تعمیر میں بے شمار عوامل کام کرتے رہتے ہیں۔ اگر ادیب کا قلم اس کی تخریب پر اتر آئے تو اس سے بڑا مہلک کوئی دشمن نہیں ہو سکتا۔ ادب کی تعمیری خصوصیات کے تذکرے سے پہلے اگر اس کی تخریبی قوتوں کا اجمالی سا تعارف کرا دیا جائے تو میرے نزدیک تصویر کے دونوں رخ سامنے آجائیں گے جن سے اس کی قدر و قیمت متعین کرنے میں آسانی ہوگی۔

● اگر کوئی ادیب اپنے ادب کی قوت، اپنے حسن کلام اور تاثیر کلام کو سماج کے اندر غلط افکار و خیالات پیدا کرنے، پھیلانے اور فروغ دینے پر صرف کرے۔ سماج کے اندر شکوک و شبہات۔ تذبذب و بے یقینی کو پرورش کرے۔ معروف انسانی اقدار کے ذہنوں کو ڈھانے جلانے تو انسانی سماج کے لئے ایسا ادیب ایک مہلک عامل ہے اور در اصل وہ اپنے سماج کی بنیادوں کو متزلزل کرتا ہے۔

● اگر وہ اپنے سماج میں یہ تصور عام کرے کہ انسان دنیا میں مجبور محض اور اس پر قدرت کا جبر مسلط ہے تو وہ بھی ایک مہلک خدمت انجام دیتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے ہم قوم بھائیوں میں سے احساس ذمہ داری ختم کرتا اور ان کی قوت عمل کو سلب کرتا ہے یا دوسرے لفظوں میں وہ ان میں بے جان آدمی بن کر رہنے کے ارادے اور کوشش کو مضمحل کرتا اور برائی پر مطمئن کرتا ہے۔ یہ چیز فرد کی ہر قسم کی تعمیری قوتوں کو سلب کر لیتی ہے

● اگر وہ افراد میں مایوسی اور قنوطیت پیدا کرتا، مستقبل کی طرف سے نا امید کرتا، حال کی اصلاح کی طرف سے ہمت شکنی کرتا اور ماضی کے درخشاں ندر کی طرف سے متنفر کرتا ہے تو بھی وہ کوئی بہتر خدمت انجام نہیں دیتا۔ اس سے افراد میں زندگی کے بارے میں تاریک نقطۂ نگاہ پیدا ہوتا ہے

● اپنے ادب کو اگر وہ سماج کے اندر غلط جذبات پیدا کرنے پر استعمال کرتا ہے۔ مثلاً نسل پرستی اندھی قوم پرستی نسل پرستی یا صوبہ پرستی تو بھی در اصل وہ اپنے سماج کی جڑیں کھودنے کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ اسی طرح دہشت و درندگی کے جذبات ابھارنا، دوسروں کے خلاف بھڑکانا یا فتنہ و فساد کی ہمت افزائی کرنا بھی تخریبی عمل ہے اور اس چیز نے مغربی اقوام کو بنی نوع انسان کے لئے عذاب و زحمت بنا دیا ہے۔

● سماج اور انسانیت کو مختلف طبقوں میں تقسیم کر کے ان کو باہمی دشمن قرار دینا۔ پھر ان کے درمیان نفرت کی آگ بھڑکانا اور باہمی کش مکش برپا کرنا بھی ایک تخریبی کام ہے جو ادیب یہ کام کرتا ہے وہ انسانی سماج کی تعمیر کے بجائے تخریب کرتا ہے! اس طرح افراد کے اندر تنازع للبقاء (struggle for existence) کا تصور پیدا کر کے ...... ان کے اندر سے انسانی خلق و مروت اور ہمدردی و محبت کے جذبات چھین لینا بھی ایک زبردست تخریبی کارنامہ ہے۔

● افراد کے اندر ان کے سفلی جذبات کو بھڑکا کر ان کے اندر حیوانی حس کو بیدار کرنا اور اس کے ذریعے اپنے ادب کو مقبول عام کرنے کی کوشش کرنا بھی ایک تعمیری ادیب کے شایان شان نہیں ہے جو ادیب اخلاقی پابندیوں کو قید و بند قرار دے اور مادر پدر آزادی کو حقیقی آزادی کے رنگ میں پیش کرے وہ در اصل سماج کا خیر خواہ نہیں ہے۔

● انسانی برائیوں اور کمزوریوں کو خوشنما اور لذت انگیز بنا بنا کر پیش کرنا، بد اخلاق اور بد کردار انسانوں کو اپنے ادب کے اندر نمایاں کردار (HEROS) کا مقام دینا بھی سماج کی تعمیر کے منافی حرکت ہے۔

ایسے ادب کے بارے میں محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ۔

"جو لوگ ہوائی باتیں گھڑتے اور گندے اشعار کہتے ہیں، وہ در اصل اپنے پیٹوں میں پیپ بھرتے ہیں۔"

ادب ایک تعمیری قوت

ادیب کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ اپنی فکر کو پیش کرنے کے لئے موم بتی کی طرح گھلتا اور داخلی سوز و گداز سے لازماً دوچار ہوتا ہے ۔ یہ داخلی عمل جو تخلیق ادب کے لئے ادیب کو پیش آتا ہے ۔ ایک لذت انگیز شدید کرب و درد سے کسی صورت کم نہیں ہوتا ۔ یہ ایسا کام ہے جیسے جس طرح کوئی شخص کدال ہاتھ میں لے کر جس وقت چاہے مٹی کھودنے اور دیوار بنانے لگے ۔ بلاشبہ ادیب کے افکار قلم کی نوک سے روشنائی کی لکیروں کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں ۔ لیکن در اصل قلم کی وہ نوک داخلی طور پر احساس کی تیز سوئی بن کر اس کے خون جگر میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے ۔ ایسا تخلیقی کارنامہ اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ وہ سماج کی تعمیر کے کام آئے ۔ اس لئے میرے نزدیک ادب کی تخلیقات کی جو خصوصیات سماج کی تعمیر کے کام آسکتی ہیں ان کا تذکرہ اختصار کے ساتھ کیا جاتا ہے ۔ سب سے پہلے فکر صحیح و مستقیم کی ضرورت ہے یہ فکر صحیح و درست ہے جو تعمیر کا سب سے بڑا کارنامہ انجام دیتی ہے ۔ اس کے لئے ادیب کا سینہ پرسوز بھی ہو اور فکر صحیح کے چراغ سے منور بھی ہو ۔ اسی بات کو اقبال نے کہا ہے ۔

سینہ روشن ہو تو ہے سوز سخن عین حیات
ہو نہ روشن تو سخن مرگ دوام اے ساقی

ساتھ ہی اپنے فن اور مقصد کے ساتھ گہرا لگاؤ اور خلوص ہو بہت ہی اثر انگیزی ہو سکتی ہے اسی بات کو اقبال نے کہا ہے ۔

رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خون جگر سے نمود

• پھر اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ سماج کے اندر معروف انسانی صفات کو پرورش کرنے کی بھی کوشش کرے ۔ ان کی ترغیب دے ان سے پیار کرنا سکھائے ۔ ان کو خوبصورت بنا کر پیش کرے ۔ دوسری طرف جانی پہچانی برائیوں کے خلاف مزاحمت کرے ذہنی فضا ان کے خلاف ہموار کرے ۔ سماج کے افراد کو ادھر جانے سے روکے ۔

• اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے ادب میں اخلاقی حدود کا لحاظ رکھے ۔ انسانی اور سماجی کمزوریوں کو مزے لے لے بیان نہ کرے بلکہ کراہت انگیز لہجہ اور انداز اختیار کرے تاکہ گندی ذہنیتوں کو ادھر رغبت نہ ہو ۔

• ہر سماج اپنے لئے کچھ بنیادی نظری اقدار رکھتا ہے جس پر اس کی تعمیر ہوتی ہے ۔ ادیب کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان قدروں کا وفادار ہو ان پر یقین اور ایمان بھی رکھتا ہو اور ان کے فروغ کا تہ دل سے متمنی ہو ۔ ساتھ ہی ان بنیادی نظری اقدار سے اس کی واقفیت بھی ضروری ہے چونکہ اس کا کام سماج کی تشکیل و تعمیر کے عمل میں افراد کو انھیں بنیادی نظری اقدار کے مختلف روپ دکھانے ہیں ۔ اس لئے اس کی بے خبری مضر نتائج بھی دکھا سکتی ہے

• یہ بھی ضروری ہے کہ وہ حتی الامکان کردار و عمل کے ایسے خاکے سامنے لائے جو سماج کے اندر افراد کے لئے ایک نمونہ ہو سکتے ہوں ان کے لئے ترغیب عمل کا باعث ہوں اور ان میں انسانیت سے ہمدردی اور خدمت خلق کے جذبات بیدار کریں ۔

• اسے انتا بے باک اور جرأت مند ہونا چاہیئے کہ سماج کے اندر ہر قسم کے ظلم و ستم اور معاشرتی اونچ نیچ اور عدم مساوات کے خلاف آواز بلند کرے ۔ کسی کو خوشی نہ بننے دے کسی اندھا دھند جبر و تشدد کو تادیکھے تو بھی آواز بلند کرے قلم کو حرکت میں لائے ۔

• ہر قسم کی عصبیتوں کی مخالفت کرے جو سماج میں ابھریں ۔ ان کے خلاف ذہنی فضا ہموار کرے ۔ نہ وہ بھی انفرادیت کا شکار نہ بلکہ ہمیشہ اجتماعی مصالح کو پیش نظر رکھے ۔

خود اپنے قول و عمل میں مطابقت پیدا کرنے کی سعی کرے۔ چونکہ انسانی فطرت ایسی واقع ہوئی ہے کہ وہ اس انسان کی تعمیری بات پر کان نہیں دھرتی جو خود تخریبی عمل کر رہا ہو۔ ذاتی کردار کو بھلے اور معقول انسان کا کردار بنائیے کیونکہ ایک نامعقول انسان معقول ادیب و شاعر نہیں ہو سکتا۔

میں نے جو باتیں اوپر عرض کی ہیں یہ ہر قسم کے انسانی سماج کی تعمیر کا لازمی نشان ہیں۔ یوں بنیادی طور پر میں یہ احساس رکھتا ہوں کہ انسانی سماج کی تعمیر کا بہترین نسخہ خود انسان کے پیدا کرنے والے نے بار بار انسان کی طرف انبیاء کرام کی معرفت بھیجا ہے۔ انبیاء کرام نے معاشرے کی تعمیر میں روشن تاریخی کارنامے انجام دئیے ہیں۔ اس لئے سماج کی تعمیر کا کوئی نقشہ ایسا نہیں ہونا چاہئیے جو ان کی دی ہوئی اخلاقی تعلیمات سے بے نیاز ہو۔ انہیں بہترین اصولوں کو سماج کی تعمیر کے لئے بنیادی پتھر کی حیثیت سے قبول کرنا چاہیے۔ اور ہر ادیب کو اپنے سماج میں انہیں تعلیمات اور نظریات کو فروغ دینا ضروری ہے

بہترین انسانی معاشرہ صرف اسی صورت میں وجود میں آ سکتا ہے۔ یہ وہ چیز ہے جسے آج کے بیشتر ادبی مفکرین نے بھی تسلیم کر لیا ہے۔ میتھو آرنلڈ نے کہا ہے:۔

"جو شاعری اخلاقیات سے بغاوت کرتی ہے وہ زندگی سے بغاوت کرتی ہے جو اخلاقیات کو نظرانداز کرتی ہے وہ زندگی کو نظرانداز کرتی ہے"

اور ویسے بھی اب عام یورپی مفکرین کی یہ رائے ہے کہ مشین اور سائنس کی مادی دنیا کو محبت اور روحانیت کے تابع ترقی کرنا چاہئیے۔ تب ہی انسانیت پھل پھول سکتی ہے۔ ورنہ سماج کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی جائے گی۔ سائنس کی رائے ہے کہ انسانیت کے جذبۂ تحفظ خویش نے ہر اس فن کو ٹھکرایا ہے جو اس کی ذہنی نشو و نما اور اخلاقی بقا کے لئے کچھ پیش کرتا۔

ادیب اور ماحول

بلاشبہ ہر ادیب ماحول سے متاثر ہوتا ہے لیکن اس کا اصل کام ماحول کو صحیح راستہ پر لگانا ہے۔ وہ ماحول کی تنگ فضا میں کام نہیں کرتا بلکہ اس کا ذہن عمل افکار کی آزاد فضا میں ہوتا ہے جہاں وہ بے دھڑک راہ راست کا کھوج لگا کر اس کا اظہار کر سکتا ہے۔ وہ کیمرہ اور مشین نہیں ہے وہ تو انسان ہے۔ اور انسان ہونے کی حیثیت سے وہ محض عکاسی کا کام نہیں کرتا بلکہ باشعور عکاسی کرتا ہے جس میں اس کے دل و دماغ کے رجحانات اور وجدانی کیفیات اور معتقدات تک کا اثر موجود ہوتا ہے۔ وہ ماحول سے جو کچھ لیتا ہے۔ سے اگر اسی طرح لوٹانے کی کوشش کرے گا تو اپنے آپ کو مرتبہ انسانی سے گرا کر مشین بنا دے گا۔ اسے تو ماحول سے جو کچھ لینا ہوا سے اپنی ذہنی لیبارٹری میں ڈال کر اس میں اپنی فکر کا تعمیری مسالہ شامل کرنا ہے۔ اچھے رجحانات اور پاکیزہ خیالات سے اس کا خمیر اٹھانا ہے اور پھر اسے واپس کرنا ہے۔ تعمیری نقاد جو سماج کی تعمیر کے زاویۂ نگاہ سے اس کی تخلیقات کو دیکھیں گے وہ شاید یہ چیز بعد میں دیکھیں کہ جو کچھ اسے ماحول سے لیا اسے کس خوبی اور فنی مہارت سے لوٹایا۔ بلکہ وہ یہ دیکھیں گے کہ جو مسالہ اس نے اپنی ذہنی لیبارٹری سے خارجی مواد میں شامل کر کے ایک ادبی میوہ تیار کیا وہ مسالہ کس نوعیت کا ہے وہ تعمیری ہے یا تخریبی یا کچھ بھی نہیں محض لفظی جادوگری اور طلسم ہے۔ اس لئے کہ وہی مسالہ ادیب کی داخلی شخصیت کی نمائندگی بلکہ رہنمائی کرتا ہے۔ پھر جس نوعیت کی وہ شے ہوتی ہے وہی نوعیت اس کے تخلیقی کارنامہ اس قرار پاتی ہے۔

تعمیر سماج میں ادیب کا عملی کارنامہ

اب میں آپ کے سامنے نہایت اختصار کے ساتھ چند ایک ایسی مثالیں رکھنا چاہتا ہوں جن کو واضح ہو کہ مختلف ادوار میں ادیبوں نے سماج میں کیا پارٹ ادا کیا ہے ایسی مثالیں بے شمار و درانگشت ہیں جس طرح مختلف زبانوں اور ملکوں میں انسانی معاشرے بے شمار اور انگشت رہے ہیں یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں ان مثالوں میں ہر معاشرے کے ہر ادیب کے کارناموں کا تعمیری پہلو پیش کر رہا ہوں اور نہ میرے خیال میں یہ کام کسی صورت ممکن ہے۔ اس لئے کہ یہ کام اتنا

وسیع الاطراف ہے کہ شاید کسی ایک انسان کے بس کا بھی نہیں ہے۔ میں صرف اپنی حسب منشا چند مثالیں ادھر ادھر سے نمونۃً بیان کروں گا تاکہ سماج کے لیے ادیب کی تعمیری قوت کی نوعیت کا ایک سرسری اندازہ ہو سکے۔

انگلستان میں سترھویں صدی میں آزاد خیالی اور جدید سائینٹفک ملحدانہ افکار کا شدید ریلہ آیا جس نے وہاں مروجہ عیسائیت کی انقلابی اقدار کے ڈھانچے کو شدید نقصان پہنچایا۔ اس وقت ایک شخص جان بنین (Jhon Bunyan) نے ایک کتاب Pilgrim Progress لکھی جس نے عیسائیت کی گرتی ہوئی دینی قدروں کو ایک طویل مدت تک سہارا دیا اور عیسائی گھرانوں میں اسے بائبل کا سا احترام حاصل ہوا۔ اٹھارھویں صدی میں صنعتی انقلاب کے نتیجے میں انگلستان میں اخلاقی انحطاط کا دور دورہ شروع ہوا۔ ایڈیسن کے پرزور اخلاقی مضامین نے انگلستان کے عوام و خواص کے اندر شرافت و وضعداری کے قدیم معیار کو قائم رکھنے میں بڑی مدد دی۔ انیسویں صدی میں جب الحاد نے مزید قوت حاصل کی تو کارلائل اور رسکن کے مضامین نے اخلاقی قدروں کو سنبھالا۔ اور آج کی انگریزی سوسائٹی جو سراسر مفاد پرستی، مادہ پرستی اور شدید دنیا پرستی میں مبتلا ہے، اس کی تعمیر و تشکیل میں مل اور بینتھم (BEHTHAM) کی "افادیت پسندی" Utilitarianism کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اور تجربہ تری، بداخلاقی، آزاد روی اور مادر پدر آزادی کی انگلستان میں پھیلا دینے کی ذمہ داری سے ارنسٹ ہیمنگ وے جیسے ادیب بچ نہیں سکتے۔ انیسوی صدی میں جب کہ انگریزی سماج بے شمار خرابیوں اور غلط اطوار کا گہوارہ تھا، اس کی اصلاح میں چارلس ڈکنس کے طنزیہ افسانوں نے بے نظیر خدمت انجام دی جس طرح آج ہمارے یہاں منصفانہ انتخابات کا تصور مشکل ہے اسی طرح انیسویں صدی میں انگلستان میں تھا، اور نہایت گھناؤنے طریقوں اور دھاندلی سے انتخابی بکسوں میں پرچیوں میں ردوبدل کر دیا جاتا تھا لیکن چارلس ڈکنس نے اپنی تحریروں میں اس پر شدید طنز میں گہرا مذاق اڑایا جس کے نتیجے میں سماج کے ذمہ دار لوگوں میں بیداری اور احساس ذمہ داری پیدا ہوا اور اصلاح ہو گئی۔ اس وقت پبلک اسکولوں کا حال بڑا خراب تھا۔ اساتذہ اور طلبا انتہائی پریشان کن حالت میں تھے۔ ہسپتالوں میں ڈاکٹروں اور نرسوں اور دواؤں کا معاملہ بھی ہمارے یہاں کے مقابلہ میں کسی صورت بہتر نہ تھا۔ ہسپتالوں سے دواؤں کا چوری ہو جانا عام تھا۔ لیکن چارلس ڈکنس کے طنزیہ مضامین نے سماج کو اس کی اصلاح پر تیار کیا۔ یہاں تک کہ اس کی زندگی میں ہی یہ اصلاحات رونما ہونا شروع ہو گئیں۔ آج برطانیہ کی لیبر پارٹی نے جو جمہوری سوشلزم اپنایا ہے تو اس کا تصور تیار کرنے میں برناڈ شا کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

فرانس کا انقلاب جو دنیا بھر پر اثر انداز ہوا جس کے مساوات و آزادی کے نعرے دنیا بھر میں پہنچے اور بطور فیشن چل پڑے۔ اس انقلاب کی آبیاری روسو اور والٹیئر کی تحریروں سے ہوئی، روسو کی تحریروں کا یہ نتیجہ ہے کہ ماڈرن دنیا میں معاشرتی عدم مساوات، ملوکیت اور جاگیرداری کے خلاف زمین تیار ہو گئی ہے۔

بائرن نے فرانس اور انگلستان کو یونان کی آزادی کے لیے ترکوں کے خلاف بھڑکایا، خود یونانیوں میں اپنی نظموں کے ذریعہ جوش آزادی بیدار کر کے انہیں ترکوں کی عظیم سلطنت کے خلاف کھڑا کر دیا، نہ صرف انہیں کھڑا کیا اور لڑایا بلکہ آزاد کرا دیا۔ یہ کارنامہ ایک ایسے ادیب و شاعر کی قوت تحریر کا ہے جو خود سگڑا بھی تھا اور اخلاقی لحاظ سے گرا ہوا تھا۔ نطشے کے ادب نے جرمنوں کو اپنی نسلی برتری کا یقین دلایا اور انہیں نسل پرستی سکھائی۔ جس کے نتیجے میں جرمنی دنیا کے لیے دو بار عظیم جنگوں کی شکل میں عذاب لانے کا موجب ہوا۔ دو دفعہ اس نے نسلی برتری کے زعم اور عالمگیر حکمرانی کے شوق میں پوری دنیا کے امن و امان کو برباد کیا۔ صرف اس لیے کہ اس کے ادیب فلسفیوں نے ان کے ذہن میں نسلی برتری اور قومی تفوق کے شعلے بھڑکا دیے تھے۔ ہٹلر نے انہی شعلوں کو ہوا دے کر ساری دنیا میں زلزلہ سا ڈال دیا۔

خود ہمارے اپنے ملک میں ہمارا ملک جن ادوار سے گزرا ہے اس پر اثر انداز ہونے میں ہمارے ارباب قلم نے بھی بڑا حصہ لیا ہے۔ جب ہم پر مغرب اپنی سیاسی دسیسہ کاریوں کے بل پر مسلط ہو گیا تو یہاں ایسے ادیبوں کا بھی ایک گروہ پیدا ہو گیا جو مغربی تہذیب سے مرعوب تھے، اور

ان کے اندر احساس کمتری پایا جاتا تھا۔ بعض مسلمان "ذہنوں" نے تو اسلام کی ان باتوں تک کی تاویل کر دی جن کو مغربی حکمران بُرا محسوس کرتے تھے

؎ کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

اس چیز نے قوم کے اندر مغرب کے مقابلہ میں ایک مرعوبانہ ذہن پیدا کر دیا۔ جو آج تک ہمارے سماج میں "باقیات سئیات" کی صورت میں فکر و عمل کو گھن کی طرح کھائے جا رہا ہے، اسی مغربی مرعوبیت کے خلاف زبردست مورچہ اقبال اور اکبر الہ آبادی نے لگایا اور بنگال میں ٹیگور اور قاضی نذرالاسلام نے بھی صور پھونکا، اور اس کے نتیجہ میں مغربی مرعوبیت کا دھند لکا چھٹنے لگا۔

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اسلامی اقدار سے محبت پیدا کرنے میں اقبال اور اکبر کے شاعرانہ افکار کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اکبر نے تو طنز و مزاح میں رمزیت و اشاریت سے بھی کام لیا مگر اقبال نے کھل کر کہا ہے ؎

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام

چہرہ روشن اندرون چنگیز سے تاریک تر

آج ہمارے سماج میں اخلاقی انارکی، الحاد و بے یقینی اور اسلام سے فرار کا جو رجحان پرورش پا رہا ہے۔ اس میں ہمارے ملک کے ترقی پسند ادیبوں کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

علامہ اقبال نے جہاں اسلام سے محبت کرنا، اسے اعلیٰ و ارفع سمجھنا اور اس کی برتری پر ایمان رکھنا سکھایا، اسی کے ساتھ سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریروں نے اسلام کو ایک زبردست نظریۂ حیات کی صورت میں پیش کیا اور اپنے زورِ بیان، قوت استدلال اور خلوص فکر سے سماج کے ایک بہت بڑے طبقہ کو نہ صرف ذہنی طور پر متاثر کیا بلکہ اسلام کے اجتماعی تصورات کے بل پر ایک ہمہ گیر اور جامع تحریک شروع کر دی جو پوری سوسائٹی کو اسلام کی بنیادوں پر ڈھالنے اور سنوارنے کی جد و جہد میں مصروف ہو گئی ہے، مودودی کے لٹریچر نے زندگیوں کو بدلا، تشکیک کی جگہ یقین نے لی، تذبذب نے یکسوئی حاصل کی، جو گمگشتہ راہیں "در بھول بھلیوں" میں ناک ٹوئیاں مار رہے تھے، وہ صراط مستقیم پر گامزن ہو گئے۔ ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریریں دورِ حاضر کا "مثالی ادب" ہیں جن میں لفظ و بیان، ورخیال و اظہار کی تمام خوبیوں کے ساتھ وہ طاقت بھی پائی جاتی ہے جس سے فکر انسانی متاثر ہوتی ہے اور یہ تاثر تیزی کے ساتھ عمل کے قالب میں ڈھل جاتا ہے۔

یہ ان چند تعمیری کارناموں کا سرسری تذکرہ ہے جو ادیب اپنے علم کی قوت سے انجام دیتا ہے۔ ایک ایسی قوت جو ادیب کو فطرت نے عطا کی ہے جو سماج کے لئے تعمیر و تخریب دونوں قسم کی خدمات انجام دے سکتی ہے۔ اس قوت کو راہِ راست پر لگانے اور اس سے تعمیری مقاصد کے کام لینے کے لئے چند مشورے دینا چاہتا ہوں۔

- جس اللہ کے بندے کو اس کے خالق نے یہ قوت دی ہے اس کا فرض ہے کہ اس کو انسانیت کی خدمت میں صرف کرے۔
- جس سماج کا وہ فرد ہے، اس کی فطری بنیادوں کو مضبوط کرے اور ان سے بے پروائی نہ برتے۔
- سماج کے افراد کو بتائے کہ وہ کیا پسند کریں؟ اور کیا ناپسند کریں! کس کو لیں اور کس کو چھوڑ دیں۔ ادیب رد و قبول کا صحیح معیار سوسائٹی کے
- اپنے ادب کو شکم پروری کے لئے فروخت نہ کرے، اس کو اس طریقے سے روزی کمانے کا ذریعہ نہ بنائے کہ اس کے ضمیر کی دب کر رہ جائے

قلم کی عصمت کی حفاظت، ایک ادیب کا اولین فرض ہے جس ادیب، شاعر اور انشا پرداز نے عصمت قلم کی حفاظت نہ کی اور اسے آلودگی سے نہ بچایا، اس نے اپنی صلاحیت کا غلط استعمال کیا اور معاشرے کو چٹخارے تو دیئے مگر بھلائی اور نیکی نہ دی۔۔۔۔۔ ایسی بھلائی جس سے آدمی انسان بنتا ہے +

علامہ سید سلیمان ندوی کی یاد میں

معارف "سلیمان نمبر" کا مطالعہ

ایک عقیدتمند کے قلم سے

اردو رسائل کے خاص نمبروں کی اشاعت کا سلسلہ ایک عرصہ سے جاری ہے، اور تقریباً تمام موقت الشیوع رسائل نے اپنے خاص نمبر شائع کئے ہیں، لیکن معارف اعظم گڑھ نے جو چالیس برس سے نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اپنی عمر میں بالکل پہلی مرتبہ اپنے بانی کی یاد میں "سلیمان نمبر" شائع کیا ہے، یہ محض چند مضامین و مقالات اور نظموں کا دلآویز مجموعہ ہی نہیں۔ بلکہ مولانا سید سلیمان ندوی صاحب معارف کی، ایک چھوٹے پیمانے پر نہایت مربوط اور مسلسل سوانح عمری ہے، جس میں مختلف مشاہیر اہل قلم اور مصنفین نے سید صاحب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈال کر، سید صاحب کی سعید روح کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

اس خاص نمبر کی ترتیب یہ ہے: کہ پہلے فہرست مضامین کے بعد، حسب معمول دو اشتہارات ہیں، اس کے بعد مضامین کا سلسلہ شروع ہوا ہے، جن کو متعدد عنوانوں میں تقسیم کیا گیا ہے، پہلا عنوان "سیرت و سوانح" ہے۔ اس میں تین مضمون ہیں دوسرا "فضائل و کمالات" ہے۔ اس میں چار مضمون ہیں۔ تیسرا "علمی و دینی کارنامے" ہے۔ اس میں پانچ مضمون ہیں۔ چوتھا "سلوک و تصوف" ہے۔ اس میں تین مضمون ہیں۔ ان عنوانات کے بعد ایک عنوان "متفرق مضامین" کا ہے۔ جس میں پانچ مضمون ہیں۔ آخر میں قطعات تاریخی درج ہیں۔ جو گیارہ شعراء کے طبع زاد ہیں۔ سرفہرست جناب یحییٰ اعظمی ہیں، جن سے خواص اہل علم بھی خوب روشناس ہیں۔ بعض تاریخی مادے بڑے دلچسپ ہیں، خود "معارف خاص نمبر" ایک تاریخی مادہ ہے۔ جس سے ۱۳۷۳ھ نکلتا ہے۔

یہ تمام مضامین سید صاحب کے الگ الگ پہلو پر نہیں ہیں۔ بلکہ ان میں سے بیشتر کا موضوع، اور ان کے مباحث عام ہیں۔ یعنی ایک ہی مضمون میں مختلف پہلوؤں پر تبصرہ ہے۔ شروع میں یہ خیال ضرور تھا کہ مختلف پہلوؤں پر لوگوں سے الگ الگ مضامین لکھائے جائیں۔ اور کتابی ترتیب پر ان کو مرتب کر دیا جائے۔ مگر اس میں دشواریاں تھیں۔ ایک تو مضمون نگاروں کو موضوع کا پابند کر دینے میں، مضامین جلد حاصل نہیں کئے جا سکتے تھے، اور پھر اگر اس کا اہتمام کیا جاتا۔ تو یہ خاص نمبر جس کی طلب اور تقاضا بڑھتا چلا جاتا تھا وقت پر شائع نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لئے ان مضامین کی وہ ترتیب تو نہ ہو سکی۔ جو ابتدائی مرتب کے پیش نظر تھی۔ تاہم تغلیباً یعنی جس مضمون میں سید صاحب کی زندگی کا جو پہلو غالب تھا۔ اس کے اعتبار سے مضامین کی تقسیم کر دی گئی ہے۔ مضامین کی کل تعداد ۱۹ ہے۔

مضمون نگاروں میں صرف ایک ہندو بزرگ ہیں، اور وہ ذکر غالب کے مصنف جناب مالک رام صاحب ایم اے۔ ہیں جن کو ذہن و دماغ کے اعتبار سے ہندو کہنا مشکل ہے۔ انھوں نے قرآن پاک کی روشنی میں عورتوں کے مسائل پر "عورت اور اسلامی تعلیم" کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی ہے، ان کو سید صاحب سے اپنی طالب علمی کے زمانہ ہی سے ارادت ہے۔ سید صاحب کی مشہور کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" شائع ہوئی تو وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھ رہے تھے۔ وہ کتاب وہاں پہنچی تو اسے شوق کے ہاتھوں سے لیا اور عقیدت کی نظروں سے پڑھا

کتاب ختم ہوگئی لیکن انکی حسرت باقی رہ گئی کہ کاش کتاب اور لمبی اور ضخیم ہوتی۔ مصنف کے ایک فقرہ سے وہ اس وقت بے حد متاثر ہوئے اور وہی ان کی تقریب ملاقات کا سبب بن گیا۔ مصنف نے ایک جگہ لکھا تھا کہ ہندوستان کی تاریخ لکھنے والوں نے جتنی توجہ فارسی ماخذ پر کی ہے، اتنی عربی سفرناموں اور تاریخ وجغرافیہ کی کتابوں پر نہیں کی، حالانکہ یہ بھی قیمتی معلومات کا خزانہ ہیں، اور ان سے استفادہ کئے بغیر ہمارے ملک کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ اور اسی وقت انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ یہ کام ضرور ہونا چاہیئے کہ جس طرح ایلیٹ نے فارسی ماخذ کا انگریزی میں ترجمہ کر دیا ہے اسی طرح عربی ماخذوں کو اردو میں منتقل کر دیا جائے۔ انھوں نے سید صاحب کو خط لکھا کہ اس قسم کی کتابوں کی ایک فہرست مرتب کر کے بھیجدیں۔ سید صاحب نے فہرست بھیجدی۔ انھوں نے فتوح البلدان بلاذری اور سلیمان تاجر کے سفرنامہ کے ہندوستان سے متعلق حصوں کا ترجمہ شروع کیا تھا کہ تعلیمی مشغولیتیں پیش آگئیں۔ ان سے فارغ ہوئے تو غم روزگار میں مبتلا ہوگئے جس سے آخر آخر تک ان کو زیست نہ مل سکی اور وہ اس اہم کام کو انجام تک نہ پہنچا سکے اور وہ اسی طرح ادھورا پڑا رہ گیا۔ یہ انکی پہلی تقریب ملاقات تھی۔ جو بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ باہم مراسلت کا ایک مستقل سلسلہ قائم ہوگیا۔ انھوں نے اپنی کتاب "عورت اور اسلامی تعلیم" لکھی تو شائع کرنے سے پہلے سید صاحب سے اس پر نظرثانی کرنے کی درخواست کی اور یہ بھی لکھا کہ اس پر ایک مقدمہ بھی ارقام فرمادیں۔ کتاب کا مسودہ پہنچا تو موصوف نے انکی توقع سے کہیں زیادہ تعریف فرمائی۔ اور لکھا کہ آپ کے محض خیالات سے اختلاف ہے۔ جس کو خط وکتابت کے بجائے ذاتی ملاقات ہی سے دور کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس عرصہ میں نہ ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا نہ اختلاف کا پتہ چل سکا۔ لیکن مزید مطالعہ اور غور وفکر کے بعد خود ان کو جہاں جہاں کمی محسوس ہوئی، یا مختلف فیہ چیز نظر آئی۔ اس کو درست کردیا بلکہ اس کا ایک باب جو پردہ سے متعلق تھا پورا کا پورا بدل دیا۔ اس کے بعد کتاب چھپ کر سید صاحب کے پاس پہنچی۔ تو اس کو دیکھ کر خوش ہوگئے اور بڑی تعریف فرمائی۔

اس نمبر میں سب سے طویل اور اپنے موضوع کے اعتبار سے بہت مکمل شاہ معین الدین صاحب ندوی ایڈیٹر معارف کا مضمون ہے۔ سادگی و پرکاری شاہ صاحب کی تحریر کی خاص خصوصیت ہے، وہ اس مضمون میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اس میں کتابوں کے تبصرہ اور بعض اہم مضامین ومقالات کے تعارف کے علاوہ، سید صاحب کے متعلق اور کسی قسم کے معلومات نہیں ہیں، نہ سید صاحب کے اسلوب تحریر اور انداز نگارش پر کوئی اظہار خیال کیا گیا ہے۔ یہ فرض مولانا عبدالماجد صاحب دریاآبادی نے ادا کیا ہے، "ادب انشاء کی چند جھلکیاں" کے عنوان سے انکا ایک مستقل مضمون سید صاحب کے اسی پہلو پر ہے۔ لیکن اس میں سید صاحب کی تحریر کے جو نمونے پیش کئے ہیں، وہ تمام نقوش سلیمان کے ہیں۔ حالانکہ اس طرح کے جواہر پاروں سے انکی تمام کتابیں بھری ہوئی ہیں۔ اس خاص نمبر کا آغاز سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب کے مضمون سے ہوا ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ انکی کتابوں اور مضامین کی طرح یہ مضمون بھی تمہید سے خالی ہے جس سے ایک قسم کی تشنگی محسوس ہوتی ہے، اور بے اختیار جی چاہتا ہے کہ کاش اس کا آغاز کسی دلچسپ اور دلآویز تمہید سے ہوا ہوتا۔ دیباچہ، مقدمہ، اور تمہید نگاری شبلی اسکول کی خاص چیز ہے، جس سے مولانا شبلی کی تصنیفات تو الگ رہیں۔ خود دارالمصنفین کی کوئی کتاب خواہ وہ دین اور مذہب سے متعلق ہو یا ادب، شاعری سے یا تاریخ وفلسفہ سے، اس سے خالی نہیں ہے۔ خود حیات شبلی جس کا تو تمام تر پرتو یہ مضمون ہے۔ اس کے شروع میں ایک طویل فہرست مضامین کے بعد جس میں پوری کتاب کا خلاصہ آگیا ہے اور ورق ہی بیک نظر کتاب کے تمام مباحث اور معلومات پر حاوی ہو سکتا ہے۔ دیباچہ بھی ہے۔ مقدمہ بھی ہے۔ اور ایک طویل تمہید بھی، جس سے اس گرانقدر کتاب کا وزن اور بڑھ گیا ہے۔ اسی طرح اگر یہ مضمون بھی شبلی اسکول کے مسلک کے مطابق تمہید سے شروع ہوا ہوتا۔ تو اور بھی دلچسپ ہوتا۔ تاہم اس کمی کے باوجود جہاں تک سوانح نگاری کا تعلق ہے مضمون بہت مکمل ہے۔ اور سید صاحب کی زندگی کا ہر پہلو روشنی میں آگیا ہے۔ اور اس سلیقہ سے مرتب کیا گیا ہے۔ کہ بے اختیار زبان سے صدائے تحسین بلند ہو جاتی ہے۔ یہ مضمون سید صاحب سے غیر معمولی واقفیت، اور ان کے ساتھ مضمون نگار کے بے پایاں خلوص دونوں کا آئینہ دار ہے۔ مولانا مناظر احسن صاحب مرحوم نے جن کے قلم کی سیر حاصلی کا سارا زمانہ معترف

ہے۔ خلاف عادت اپنے مضمون میں اجمال سے کام لیا ہے۔ حالانکہ تاریخ ارض القرآن سید صاحب کا خاص اور بالکل اچھوتا موضوع تھا جس کی طرف علماً
کے طبقہ میں اس سے پہلے شاید ہی کسی نے توجہ کی ہو۔ اس پر ان جیسے صاحب قلم کو دل کھول کر لکھنا چاہیئے تھا۔ پھر بھی کمال اختصار کے باوجود ان کا
مضمون ۱۴ چودہ صفحوں میں آیا ہے۔ مسعود عالم صاحب کا مضمون، جہاں تک شاگرد و استاد کے روابط کا تعلق ہے، بہت مکمل ہے۔ ان کو
سید صاحب کی ذات کے ساتھ جو والہانہ شیفتگی، محبت اور اخلاص تھا۔ اس لئے اس کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔ تحریک ندوۃ العلماء اور سید صاحب
پر لکھنے کیلئے حقیقت یہ ہے، کہ مولانا مسعود عالم ندوی ہی کا قلم موزوں ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ فرض ایک دوسرے فرزند ندوہ مولوی مجیب اللہ صاحب ندوی۔
رفیق المصنفین نے ادا کیا ہے۔ ندوہ کی تحریک اور اس کے دار العلوم کا حاصل صرف سید صاحب تھے۔ پھر ایسا جامع حیثیات طالب علم اس کے کسی دور
میں نہیں پیدا ہوا۔ ان کو اپنی طالب علمی کے زمانہ ہی میں، اہل علم کے حلقہ میں قبول عام حاصل ہو گیا تھا۔ ایک مرتبہ وہ کسی ضرورت سے دار العلوم
دیوبند گئے، اور یہ پتہ چلا کہ ندوہ سے سید سلیمان آئے ہیں۔ تو طلبہ تو طلبہ اساتذہ تک ان کو دیکھنے کے لئے اپنے حجروں سے نکل آئے۔ اور ان کا وہاں بڑا
اعزاز و اکرام کیا گیا۔ سید صاحب کو طبعاً تصوف کا کوئی ذوق نہیں تھا۔ زمانہ کا کتنا بڑا انقلاب ہے۔ کہ زندگی کے آخری دور میں بعض اسباب کی۔۔
تحریک سے سلوک و تصوف اور خانقاہی اوراد و وظائف سے ان کا تعلق ہو گیا۔ لیکن اس کے باوجود اپنے چچا کے اثر سے جو محدث جلیل حافظ عبد اللہ
صاحب غازی پوری کے شاگرد تھے، بچپن میں قرآن و حدیث سے جو فطری لگاؤ ہو گیا تھا۔ وہ آخر تک۔ قائم رہا۔ اور تصوف اُن پر غالب نہ آسکا۔
اور میرے خیال میں یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل تھا۔ سید سلیمان سب کچھ تھے۔ لیکن صوفی نہیں تھے۔ نہ بن سکتے تھے۔ وہ صحیح معنوں میں موجودہ دور کے
شاہ ولی اللہ تھے۔ انکی ساری تصانیف و مقالات میں یہی رنگ جھلکتا ہے۔ جن لوگوں نے ان کو صوفی اور صاحب سلوک و عرفان کی حیثیت سے پیش
کیا ہے، بہت ممکن ہے ان کو وہ ویسے ہی نظر آتے ہوں۔ ان کی نیتوں میں شک و شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

بہت خوشی ہے کہ کسی نے ان کو ایک شاعر کی حیثیت سے نہیں پیش کیا، اگرچہ انکی بعض غزلوں میں بڑا سوز و گداز ہے۔ اور بزرگوں کی مہک آتی
ہے لیکن انھوں نے کبھی اس کو ذریعہ عزت نہیں سمجھا اور نہ اس سے ان کے کمال میں ذرہ برابر کمی آسکی۔ اردو کے صاحب طرز انشا پردازوں میں رشید احمد
صدیقی کا بھی شمار ہے، ان کا مضمون اپنے طرز کا خوب ہے۔ کہیں کہیں مزاح کی چاشنی بھی آگئی ہے۔ ان سے اسی طرح کے مضمون کی توقع بھی کی جا سکتی تھی۔
سید صاحب کو ان سے غیر معمولی اخلاص تھا مسلم یونیورسٹی کورٹ کی میٹنگ میں شرکت کے لئے یا اور کسی تقریب سے علیگڑھ جاتے تھے تو زیادہ تر
انہیں کے یہاں ٹھہرتے تھے۔ یونیورسٹی کے بہت سے مسائل میں اختلاف کم لیکن اتفاق رائے زیادہ ہوتا تھا۔ اور دونوں ایک دوسرے پر بڑا
اعتماد کرتے تھے۔ یونیورسٹی بھر میں عالمی شہرت کا مالک انہی کو سمجھتے تھے، اور ان کے ادب و انشا کے بڑے قدر دان تھے۔ اس میں دیوبند اسکول کی
بھی نمائندگی ہو گئی ہے۔ اور اس حیثیت سے ایڈیٹر برہان مولانا سعید احمد اکبر آبادی کا مضمون انکی سچی محبت و عقیدت کا آئینہ دار ہے۔ مذکر غالب
کے مصنف جناب مالک رام ایم اے کے مضمون کا کیا کہنا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ہندو نہیں اسلامیات و مشرقیات کا کوئی فاضل مسلمان لکھ
رہا ہے، اردو ان کے وجود پر جتنا ناز کرے کم ہے، اور بیزاری کے اس دور میں بھی۔ ہندوؤں میں اردو کے ایسے اچھے لکھنے والے موجود ہیں جن پر
عربی ادب و تاریخ کے فضلاء کو بھی اگر رشک آجائے تو کوئی تعجب نہیں۔

اس میں سید صاحب کی سیاسی زندگی پر بھی کوئی مضمون نہیں ہے، اور یہ کمی شاید بہت سے لوگوں کو محسوس ہوتی ہو۔ لیکن ہمارے نزدیک
یہ کچھ اچھا ہی تھا۔ سید صاحب اپنی زندگی کے کسی دور میں بھی سیاسی آدمی نہیں رہے، اور نہ کبھی عملاً انھوں نے سیاست میں حصہ لیا۔ وہ محض
دور کے تماشائی تھے۔ اور اسی حیثیت سے ملکی سیاسیات پر کبھی کبھی معارف میں اظہار خیال فرما دیتے تھے۔ جو زیادہ تر تیر و نشتر ہی ہوتے تھے جس کو
پڑھ کر متعلقہ لوگوں کے دل و جگر بیٹھے جاتے تھے۔ اس سے انکار نہیں کہ وہ ایک مرتبہ مولانا محمد علی اور مولانا ابو الکلام آزاد کی گرفتاری کے بعد، گاندھی جی

ایماء سے کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبر ہو گئے تھے۔ خلافت کے بعض اجلاسوں کی صدارت بھی کی تھی۔ اور آل انڈیا جمعیۃ علمائے ہند کی سالانہ کانفرنس منعقدہ کلکتہ کی مسند صدارت کو بھی زینت بخشی تھی، اور اس میں ایک طویل خطبہ صدارت بھی پڑھا تھا۔ اور بعض وفود کی قیادت بھی کی تھی۔ لیکن ان سب سے ان کا تعلق صرف نظری تھا۔ عملی نہیں تھا۔ نہ اس کے وہ مرد میدان تھے۔ ان پر علم غالب تھا۔ اور اسی کا ہر جگہ مظاہرہ ہوتا تھا ان کے خطبات سیاسی سے زیادہ علمی اور تاریخی ہوتے تھے۔ اور اسی نقطۂ نظر سے وہ زیادہ پڑھے اور پسند بھی کئے جاتے تھے۔ اس سلسلہ کی ایک چیز بلاشبہ سید صاحب مرحوم کے اولیات میں ہے۔ یعنی انہی نے سب سے پہلے معارف کے صفحات میں کلچرل اٹانومی یعنی تہذیبی خود اختیاری کا مطالبہ پیش کیا تھا جس کو اگر یہاں کی اکثریت منظور کر لیتی تو شاید ملک کی تقسیم ہی کی نوبت ہی نہ آتی۔ سید صاحب کا مطالبہ زینت قرطاس ہو کر رہ گیا! انھوں نے اس کے لئے عملی جد و جہد کا کوئی پروگرام نہیں پیش کیا۔ نہ اس کی ان میں ہمت تھی۔ جس طرح سے ان کے استاد مولانا شبلی کا ملک کی عملی سیاسیات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اسی طرح ان کا بھی نہیں تھا۔ جب تک لوگ ان کو زاویۂ علم سے گھسیٹ گھسیٹ کر لاتے رہے وہ آتے رہے۔ از خود انھوں نے اپنے گوشۂ تنہائی سے نکلنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ ادھر انھوں نے کانفرنس کی صدارت کی۔ اور ادھر پھر لوٹ کر اپنے کنج عافیت میں گوشہ گیر ہو گئے۔ کسی کو انکی ذات احساس بھی نہیں ہونے پاتا تھا کہ کانفرنسوں اور انجمنوں کی صدارت جیسا ہنگامہ خیز اور پر شور کام انجام دے کر آئے ہیں۔ یہی انکی طبیعت کا اقتضاء تھا۔ اور یہی انھوں نے ساری عمر کیا۔ رائے اور خیالات بلاشبہ بہت گہرے رکھتے تھے، اور کبھی کبھی ان کا اظہار بھی کر دیتے تھے۔ لیکن کسی کش مکش اور جد و جہد کے میدان میں آنا بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔ یہ اچھا ہی ہوا کہ اس پہلو پر کسی نے روشنی نہیں ڈالی۔

سید صاحب وقت کے بہترین مفسر و مترجم قرآن تھے۔ اور فہم و تدبر قرآن کا ملکہ قدرتی تھا۔ سیرت نبوی کی ساری جلدیں اس کی شاہد عادل ہیں۔ لیکن اس موضوع پر کسی نے زور قلم صرف نہیں کیا۔ مولوی ادریس صاحب ندوی کا مضمون اس حیثیت سے بہت تشنہ ہے۔ اس کو اور زیادہ مجید کر لکھنے کی ضرورت تھی۔

سید صاحب چاہے جو کچھ بھی رہے ہوں، لیکن وقت کے سب سے بڑے مورخ ضرور تھے۔ اور مسلمانوں اور ملت اسلامیہ کی تاریخ کے ایک ایک گوشہ پر انکی نظر تھی۔ تاریخ کے جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے تھے اس کا کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑتے تھے۔ حیات شبلی بظاہر مولانا شبلی کی سوانح عمری ہے لیکن درحقیقت شبلی کے دور کی بہت مفصل ادبی و علمی تاریخ ہے، جو بہت سے تاریخی موضوعات کا ماخذ بن سکتی ہے ——— ارض القرآن، عربوں کی جہاز رانی، عرب و ہند کے تعلقات: خلافت اسلامیہ۔ خلافت اور ہندوستان، دنیائے اسلام اور مسئلہ خلافت مسلمانوں کے دور میں ہندوؤں کی علمی و تعلیمی ترقی۔ بہادر خواتین اسلام وغیرہ خالص تاریخی کتابیں ہیں۔ ان میں سے پہلی تین کتابیں تو یورپ کی ہر زبان کی تاریخی کتابوں کے مقابلہ میں رکھی جا سکتی ہیں۔ وہ عبارت آرائی، فصاحت و بلاغت، اور حسن الفاظ سے کہیں زیادہ ——— شہور و سنین کا لحاظ کرتے تھے، کوئی بات پایۂ استناد سے گری ہوئی لکھ ہی نہیں سکتے تھے۔ عبارت کے حسن کو تو قربان کر دے سکتے تھے لیکن کوئی چیز سند اور حوالہ کے بغیر لکھنا ایک لمحہ کے لئے بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لئے انکی کتابوں میں جو لوگ ادبیت تلاش کرتے تھے ان کو ناکامیابی ہوتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود بھی ان کی ہر کتاب "ادب عالیہ" کا مرتبہ رکھتی ہے۔

ان کے قلم کا ایک شاہکار، ان کی سیرت عائشہؓ ہے، یہ نہ صرف اس لئے قابل مطالعہ ہے کہ وہ ایک حجلہ نشین حریم نبوت کی پاک زندگی کے واقعات کا مجموعہ ہے۔ بلکہ اس لحاظ سے بھی اس کا مطالعہ ضروری ہے کہ یہ "دنیا کے بزرگ ترین انسان" کی زندگی کا وہ نصف حصہ ہے جو "مرآۃ کاملہ" کا بہترین مرقع ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ یہ کتاب لکھ کر انھوں نے صنف نسواں پر بڑا زبردست احسان کیا ہے۔ خود ان کی نظر میں بھی اس کی اہمیت تھی، فرماتے ہیں:۔

"ایک مسلمان عورت کے لئے سیرت عائشہ میں اس کی زندگی کے تمام تغیرات اور انقلابات مصائب، شادی، رخصتی، سسرال، شوہر

سوکن، لاولدی، بیوگی، غربت، خانہ داری، رشک و حسد غرض ہر ایک موقع پر اور ہر حالت کے لئے قابل تقلید واقعات موجود ہیں۔ اس لئے سیرت عائشہؓ عورتوں کے لئے ایک آئینہ دار خانہ ہے جس میں اس کو ایک مسلمان عورت کی زندگی کی حقیقی تصویر نظر آسکتی ہے۔

سید صاحب اگر اور کوئی کتاب نہ لکھتے تو تنہا یہی ایک کتاب بقائے دوام کی مجلس میں ان کو جگہ دینے کے لئے کافی تھی۔ لیکن انھوں نے اس کے علاوہ اور بھی متعدد اہم علمی و دینی خدمات انجام دی ہیں۔ ان میں سے ایک مولانا شبلی کی ناتمام "سیرت نبویؐ" کی تکمیل ہے۔ جس کو مولانا شبلی نے زندگی کے سارے مکروہات سے فارغ ہو کر لکھنا شروع کیا تھا۔ اور ان کی بڑی تمنا تھی کہ یہی کتاب ان کے خاتمہ بالخیر ہونے کا سبب بن جائے۔ فرماتے ہیں:۔

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی | مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرِ خاتمؐ | خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

اس مقدس کتاب کی تحریر کے بعد جس کے متعلق روایت ہے کہ ہمیشہ باوضو ہو کر لکھتے تھے، ان کا خاتمہ بالخیر یقیناً ہوا ہوگا۔ لیکن افسوس ہے کہ ان کا پیمانہ عمر لبریز ہو گیا اور کتاب پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی جس کی ان کو بڑی فکر تھی۔ دوران علالت میں جب اپنی ذاتی کشش سے بے اختیار ہو کر شاگرد کسی اطلاع کے بغیر بمبئی پہنچ کر استاد کی بالین پر پہنچا ہے، تو مریض جان بلب ہو چکا تھا، اور طاقت نے جواب دے دیا تھا۔ جواہر مہرہ گھول کر پلایا گیا، اور ذرا دیر کے لئے پھر طاقت بدن میں آگئی۔ تو اسی حالت میں شاگرد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا کہ:۔

"سیرت میری تمام عمر کی کمائی ہے، سب کام چھوڑ کے سیرت تیار کر دو۔"

اور یہی فقرہ کو جب مولانا حمید الدین فراہی عیادت کے لئے آئے تو ان کے سامنے بھی دہرایا، کہ اور زیادہ موکد ہو جائے، اور یہ واقعہ ہے کہ لائق اور ہمہ تن سعادت شاگرد نے دنیا کے سارے ہنگاموں، ساری دلچسپیوں اور ساری ترغیبوں سے منہ موڑ کر جس طرح اس وصیت کو پورا کیا۔ وہ ہمارے اور آپ کے سامنے ہے۔ یہ محض سیرت نہیں۔ جیسا کہ استاد کی آرزو بھی تھی۔ پوری "دائرۃ المعارف النبویہ" بن گئی ہے، سیرت پر اتنا مرتب، اتنا مستند، اتنا وقیع، اتنا جاندار لٹریچر اردو میں کیا خود عربی میں نہیں ہے اور حق ہے کہ پورا ذخیرہ عربی میں منتقل کر دیا جائے۔

شاگرد جب اس مقدس کام کے بڑے حصہ کی تالیف کی تکمیل کر چکا۔ تو اس کو استاد کی دوسری وصیت کے پورا کرنے کا خیال آیا۔ جس کے لئے ان کو ہدایت دی تھی کہ جب تم دنیا کے تمام کاموں سے فارغ ہو تو پورا کر دینا اور دس برس کی انتہائی محنت و جانفشانی و عرق ریزی کے بعد اس کو بھی پورا کر دیا جس کا کوئی واقعہ بھی بلا سند یا استناد سے گرا ہوا نہیں ہے۔ یعنی جس شان تحقیق کے ساتھ انھوں نے سیرت لکھی۔ اسی شان تحقیق کے ساتھ صاحب سیرت کے واقعات زندگی بھی مرتب کر دیئے۔ یوں تو پوری کتاب بڑی معیاری، بہت محققانہ، نہایت مستند بڑی چھان بین کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ لیکن اس کا دیباچہ اور اس کے بعد اس کا مقدمہ جو ۰۰ صفحوں میں آیا ہے، نہایت فاضلانہ اور اپنی جگہ پر مستقل ایک کتاب کا حکم رکھتا ہے۔ اس میں عہد بعہد تعلق سے لے کر مولانا شبلی کے زمانہ ولادت ۱۸۵۷ء تک صوبہ اودھ اور اس کے مضافات کے مشرقی اضلاع کی صدیوں کی علمی و تعلیمی ادوار کی تاریخ اور اس ضمن میں عہد بہ عہد کے مشاہیر علما اور ارباب درس و مدرسین کے حالات دیدہ ریزی کے ساتھ جمع کر دیئے گئے ہیں۔ اس طرح کی کوئی سوانح عمری ہمارے اردو کے سوانحی ادب میں موجود نہیں ہے۔ اور اس حیثیت سے اسے وقت کی تمام مشہور سوانح عمریوں پر تفوق حاصل ہے۔ اسی کتاب کو دیکھ کر بعض معتقدین و منتسبین خانقاہ تھانہ بھون کو خیال پیدا ہوا کہ اسی حسن ترتیب و کمال سلیقہ مندی کے ساتھ سیرت اشرف بھی مرتب کر دی جائے جس کے لئے سارا مواد اشرف السوانح کی شکل میں موجود ہے۔ اسی کو نئے انداز سے اور کچھ حالات و واقعات بڑھا کر ترتیب دینا ہے۔ لیکن افسوس کہ دفعتاً سید صاحب کی صحت نے جواب دے دیا اور اس دوسرے کام کی داغ بیل میں مہلت نہ پیدا کر سکے جس کی غالباً ان کو حسرت رہ گئی۔

خیام کو دنیا ایک رند مشرب شاعر سمجھتی تھی اور اسی حیثیت سے یورپ نے اس کو اچھالا، اور اس کی رندانہ رباعیات کا یورپ کی مختلف زبانوں

ترجمہ ہوا۔ اور اپنے رندانہ خیالات و جذبات کی بنا پر مشرق کے ہر شاعر سے زیادہ وہاں وہ مقبول ہوا، اور خراج تحسین حاصل کیا، اور اس اعتبار سے بھی گو اس کی مزیت اور فضیلت مسلم ہے، اور مشرق اس پر فخر کر سکتا ہے، لیکن سید سلیمان نے خیام لکھ کر پہلی مرتبہ عمر خیام کو ایک حکیم و فلسفی کی حیثیت سے پیش کیا۔ اور اس کے متعدد رسالوں سے ثابت کیا، کہ وہ شاعر تو کم لیکن فلسفی اور حکیم زیادہ تھا۔ اور اس میں اس کے بڑے بڑے کارنامے ہیں جن کو دنیا فراموش نہیں کر سکتی۔ سید صاحب کی یہ کتاب ایسی مقبول ہوئی کہ حکومت افغانستان کی طرف سے، ایران کی کسی علمی و ادبی تقریب کے موقع پر جو تحائف پیش کئے گئے۔ ان میں یہ کتاب بھی تھی۔ کون یقین کر سکتا تھا کہ شبلی کا متقشف شاگرد جواب ترک ارض القرآن، حیات امام مالک اور رسالہ اہل سنت والجماعت وغیرہ جیسی کتابیں لکھتا تھا۔ شبلی کی شعر العجم کی طرح، شعر العجم کے دفاع میں خیام ایسی گرانمایہ کتاب بھی لکھ سکتا ہے، اور یہ واقعہ ہے کہ یہ کتاب لکھ کر شاگرد نے استاد کی جانشینی کا حق ادا کر دیا۔ ورنہ شبلی کے حریف تو سمجھتے تھے شعر العجم کی جتنی جی چاہے تنقیص کر ڈالو اور پایہ استناد سے گرا دو اس کے دفاع کی قوت اب شبلی کے کسی فرد میں نہیں، لیکن سید صاحب نے اس بے محابا قلم اٹھایا اور معترض کے جواب میں، خیام پر۔ معارف میں جو چند صفحے لکھے تھے جس میں یہ کہکر کہ "شعر العجم واقعات کی کھتونی نہیں حسن و عشق کا افسانہ ہے" حریفوں کی خوب خبر لی تھی۔ وہ بڑھ کر کتاب بن گئی اور ایسی کتاب کہ اردو تو اور فارسی و عربی میں بھی کوئی کتاب ایسی نہیں لکھی گئی۔ اس سے خیام کے متعلق سارے یورپ میں جو غلط فہمیاں پھیل گئی تھیں وہ ایک ایک کرکے دور ہو گئیں۔ اب اس کا اس حیثیت سے بھی مطالعہ ہونے لگا کہ وہ فارسی زبان کا مشہور رباعی گو شاعر تو ہے ہی حکیم و فلسفی بھی ہے۔ اور ایک فکری نظام بھی رکھتا ہے اور رسالہ الکون والتکلیف، کلیات وجود، اور میزان الحکمہ جیسی خشک فلسفیانہ کتابوں کا مصنف بھی ہے۔

عام عربی خواں فضلا۔ کو تاریخ و جغرافیہ سے سرے سے واقفیت نہیں ہوتی۔ ان کو اس کا بھی پتہ نہیں کہ مصر کس براعظم میں واقع ہے، اور کابل کہاں ہے، لیکن سید صاحب کو طبعی طور پر تاریخ سے دلچسپی تو تھی بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ انہوں نے استاد سے وراثت میں پائی تھی، لیکن ان کو علم جغرافیہ سے بھی شغف تھا۔ اور شاید وہ عربی میں جغرافیہ پر کوئی کتاب بھی لکھ رہے تھے جس کے کچھ اجزا الضیاء لکھنؤ میں شائع بھی ہوئے تھے۔ لیکن وہ پوری نہ ہو سکی۔ عربوں کی جہازرانی انکی جغرافیائی واقفیت اور معلومات کی شاہد عادل ہے، اس میں عربوں کی جہازرانی کے متعلق عجیب و غریب حقائق پیش کیے ہیں۔ یہ تو ہم انکی تعریف میں پڑھا کرتے تھے کہ

تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی

——— اور ———

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے بحر ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

دو ہی طرح وہ بہت بڑی گہما گہمی کے باعث سے قبیلے روانہ نے سفر کرتے تھے، لیکن ان میں خصوصیت کتنی تھی، اس کا پتہ درحقیقت اس کتاب سے چلتا ہے جو نام و نشان وغیرہ سے نہ دیکھا تھا وہ عرب جہازرانوں نے کر دکھایا: دشمن ملکوں کا سینہ چیرتے ہوئے کہاں سے کہاں نکل گئے۔ اور کیسے کیسے زور دار خطوں اور نسلی آبادیوں کا پتہ چلایا، وہ پھر صحرائے عرب سے نکل کر کہاں کہاں جا کر آباد ہوئے اور دنیا کو اپنے علم و تمدن اور تہذیب و ثقافت سے گلزار بنا دیا۔ دوسری کتابوں کی طرح سید صاحب کی یہ کتاب بھی اپنے موضوع کے لحاظ سے بہت اچھوتی جامع اور مکمل ہے، اور حقیقت یہی ہے کہ اس طرح کی کتاب ارض القرآن کا مصنف ہی لکھ سکتا تھا ..... بہرحال ہم بھی مدیر "صدق" کے ہم زبان ہو کر اپنے جامع و نافع مجموعہ کے جمع و ترتیب و اشاعت پر مبارکباد دیتے ہیں۔ اور عقیدت کیشان سید سے جو وعدہ چلا آ رہا ہے۔ بہت خوبی سے پورا ہو گیا۔ لیکن اس کو سیرت سلیمانی کا بدل ماننے کے لئے ہم تیار نہیں۔ حیات سید۔ یا سیرت سلیمانی کی ضرورت اب بھی باقی ہے۔ اور رفقائے دار المصنفین پر علم و ادب کا یہ ایک ایسا قرض ہے جس سے جلد سے جلد ان کو سبکدوش ہونا چاہئے۔ لیکن وہ جب بھی شائع ہو،

صوری و معنوی، ہر حیثیت سے حیاتِ شبلی کا پورا پورا بدل ہو، اگر گستاخی نہ ہو تو ہمیں کہنے دیجئے کہ شبلی کی لائف تو ان کا شاگرد، ان کی وصیت کے مطابق، دنیا کے اور سارے مکروہات سے فارغ ہو کر تنہا تو لکھ سکتا تھا، کہ اس کو اپنے استاد سے بے پایاں محبت تھی، اور اس کے نظریات و افکار و خیالات کی اشاعت میں عمر گرانمایہ کا بڑا حصہ صرف کر دیا۔ بلکہ استاد کے بہت سے علمی کاموں کی تکمیل میں شاگرد کا بھی بڑا حصہ تھا۔ بلکہ وہ شریک غالب تھا، پھر اس کے مرنے کے بعد اس کے کتنے ناتمام کاموں کی تکمیل کی۔ لیکن حیاتِ سلیمانی، ——————

—————— تنہا ایک آدمی کا کام نہیں، کئی آدمیوں کا کام ہے، اور مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا عبدالباری ندوی، شاہ معین الدین احمد ندوی۔ صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب مل کر بخوبی انجام دے سکتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کے مرحوم سے گوناگوں تعلقات رہے ہیں ——
صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے سید صاحب کے سارے واقعات زندگی کو جس سلیقہ اور حسن ترتیب کے ساتھ جمع کر دیا ہے، اس سے ان کی سیرت نگاری کی اہلیت کا اندازہ ہوتا ہے، اگر وہ کبھی اس اجمال کی تفصیل پر آئیں گے تو خوب خوب داد سیرت نگاری دیں گے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس بزرگ زندگی کا جو عمر کے ۷۰ سالوں پر پھیلی ہوئی ہے کوئی گوشہ ان کی نظر سے اوجھل نہیں ہے، غرض انہی اربعہ عناصر کے امتزاج سے سیرت سید کی تخلیق عمل میں آسکے گی۔

اس میں سید صاحب کے معاصرین کے علاوہ ان کے تمام قابل الذکر رفقاء، تلامذہ و اعزاء مثلاً مولانا عبدالباری ندوی، مولانا سید ابوظفر ندوی، جناب غلام محمد صاحب بی اے حیدر آبادی۔ وغیرہ کے مضامین آگئے ہیں لیکن حیرت انگیز طور پر دو بزرگوں کا حصہ ہم کو نظر نہیں آتا۔ ایک سید صاحب کے رفیق کار و شریک غالب مولانا عبدالسلام ندوی صاحب شعر الہند کا، دوسرے دار المصنفین کے مہتم و نگراں مولانا مسعود علی ندوی کا۔ ان ہی تین بزرگوں سے دار المصنفین عبارت تھا۔ دار المصنفین کے زمانۂ قیام سے لے کر سید صاحب کی ہجرت پاکستان تک تقریباً ۴۰ سال سے ان لوگوں کا اس طرح ساتھ رہا ہے کہ سفر کے علاوہ کبھی یہ علیحدہ نہیں ہوئے۔ یہ دونوں حضرات تو تصنیف و تالیف کا کام کرتے تھے۔ اور مولانا مسعود علی ندوی نظم و نسق اور نگرانی اور اہتمام کے ذمہ دار تھے۔ انہی ارباب ثلاثہ پر، دار المصنفین کا نظام مجلس قائم تھا اس لئے سید صاحب کے انتقال کا اثر طبعی طور پر ان پر پڑ سکتا تھا۔ وہ دوسروں پر یا بعد کے آئے ہوئے لوگوں پر، یا دور کے رہنے والوں پر نہیں پڑ سکتا تھا۔ لیکن اس چالیس سالہ معیت و رفاقت و اشتراک عمل کے باوجود انہی دونوں کے نقوش و تاثرات سے سلیمان نمبر محروم ہے، ایسا کیوں ہوا سید صاحب پر قلم اٹھانے اور اپنے تاثرات و جذبات کے پیش کرنے کی زحمت انہوں نے کیوں نہیں گوارا کی اس کے سمجھنے سے ہم، قاصر ہیں۔[1] افسوس ہے، کہ ان میں سے ایک کے انتقال کی وجہ سے حیاتِ سلیمانی کے ایک مستند ترین اور ثقہ راوی سے ادارہ ہمیشہ کے لئے محروم ہو گیا یعنی مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم، کتابوں کے لئے مواد کی فراہمی اور روایات و واقعات کے انتخاب و استنباط کا کام زیادہ تر سید صاحب ان ہی سے لیتے تھے۔ سیرۃ النبی کی تالیف میں جیسا کہ سید صاحب نے خود اس کے دیباچہ میں لکھا ہے۔ ان کا تعاون برابر ان کو حاصل رہا ہے۔ سیرۃ کی تیسری جلد جو معجزات پر ہے اس کے لئے معجزات کے جزئی واقعات انہی نے اکٹھا کئے، سیرت کی اخلاقیات والی جلد میں تو فضائل، رذائل اور آداب کے بعض بعض عنوان تمام تر انہی کے قلم کے ہیں۔ جن کو سید صاحب نے گھٹا بڑھا کر شامل کر لیا ہے۔ حیاتِ شبلی کی تالیف میں بھی ان کی مدد شامل رہی ہے اس میں مولانا شبلی کے خاندانی حالات اور مکاتیب شبلی کے متفرق واقعات انہی کے جمع کردہ ہیں۔ اسی طرح خود مولانا عبدالسلام ندوی کی مشہور کتاب

---

[1] جب یہ ذکر چھڑ ہی گیا ہے تو عرض ہے کہ ہمارے کانوں تک بعض ایسی اطلاعیں قرائن کے ساتھ پہنچی ہیں کہ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کو اور کے رفیق کار کے طرز عمل سے بڑی اذیت پہنچی!

کوئی واقف حال اہل قلم انصاف و دیانت کے ساتھ ان واقعات پر روشنی ڈال سکیں اور کسی کی رو رعایت اور مصلحت کا خیال نہ کریں، تو علمی دنیا کے لئے یہ عبرت آموز انکشاف ہوگا۔ (م۔ ق)

اسوۂ صحابہ کے بعض ابواب تمام تر سید صاحب کے قلم کے ہیں۔ سید صاحب نے فراغت تعلیم کے بعد الندوہ میں طبقات صحابہ پر ایک مضمون لکھا تھا اسی کو من وعن مولانا عبدالسلام نے کتاب میں شامل کر لیا ہے، دارالمصنفین کے نظم ونسق میں مولانا مسعود علی ندوی کا برابر زبردست تعاون سید صاحب کو حاصل رہا ہے۔ بھوپال میں قیام اور پاکستان جانے سے پہلے شاید ہی کوئی دقیقہ گذرا ہو۔ یا کوئی معاملہ پیش آیا ہو جس میں دونوں برابر کے شریک نہ رہے ہوں۔ ایسے ہمہ وقتی شریک کار کا ایسے حادثۂ فاجعہ سے متاثر نہ ہونا اور اس پر ایک حرف نہ لکھنا ہمارے لئے سخت تعجب انگیز ہے۔

اس میں ایک مضمون اور قابل ذکر ہے، وہ سید صاحب کی علالت سے وفات تک کی تفصیل ہے، جو ان کے بھتیجے اور داماد سید ابو عاصم صاحب ایڈوکیٹ کراچی کے قلم سے ہے۔ اور بہت ہی رقت انگیز ہے، اس کا ایک ایک لفظ درد واثر میں ڈوبا ہوا ہے، ہم نے بار بار اس کے پڑھنے کی کوشش کی لیکن فرط رقت کی بنا پر ہم کامیاب نہ ہو سکے۔ یہ اصل میں ماہنامہ ریاض کراچی کے سلیمان نمبر میں شائع ہوا تھا۔ اس کو ذرا سی ترمیم وحذف کے ساتھ اس میں نقل کر دیا گیا ہے، اگر یہ ضروری اور اہم مضمون شامل ہونے سے رہ جاتا تو بڑی کمی رہ جاتی۔ اس طرح سے ولادت سے لے کر وفات تک سید صاحب کی زندگی کا ایک ایک پہلو اجمال کے ساتھ نظر کے سامنے آگیا ہے۔ ہم ابو عاصم صاحب کو ذہین وطباع تو ضرور سمجھتے تھے، لیکن وہ ایک قادر نویس اہل قلم اور باکمال مصور غم بھی ہیں۔ یہ ہمیں بالکل پہلی مرتبہ معلوم ہوا۔ حیات سید کی تدوین وتالیف اور جمع وترتیب کے سلسلہ میں ہم کو ان سے بڑی توقعات ہیں۔ اس کی ذمہ داری جہاں جانشینان سید اور معتکفان خانقاہ شبلی پر ہے، ان کے اعزا پر بھی ہے۔ خصوصاً رقعات عالمگیر کے جامع ومرتب سید نجیب اشرف صاحب، بزم تیموریہ کے مصنف سید صباح الدین عبدالرحمن (ایم اے) اور جناب سید الحق صاحب مترجم خطبات مدراس (انگریزی) پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

ابو جعفر محمد ابن جریر طبری

علی کاظم

ابن جریر طبری کی پیدائش ۲۲۵ھ کے اوائل میں قصبہ آمل میں ہوئی۔ یہ طبرستان کا ایک قصبہ ہے۔ آپ کی آنکھیں بڑی بڑی، روشن اور شربتی تھیں۔ دراز قامت اور نحیف الجثہ تھے۔ زبان شیریں اور فصیح تھی۔ غیر معمولی ذہین تھے۔ حافظہ بہت قوی تھا۔ مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ اپنے زمانے کے علوم متداولہ کی تحصیل کی تھی۔ زہد و تقویٰ، صبر و قناعت کی زندگی گزارتے تھے اور عیش و نشاط کی زندگی کو قصداً ترک کیا تھا۔ علوم دینیہ کی نشر و اشاعت کا ذوق رکھتے تھے۔ تاریخ، تفسیر میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ آپ کی آرزو فرائض زندگی کی تکمیل میں ایسے اتفاق و عزم کو بروئے کار لاتا تھا جو حیات جاوداں کے حصول میں سعی مسلسل کی تڑپ پیدا کرے اور مکان و زماں کو توڑ کر کھائے۔

اپنی ابتدائی تعلیم کا انہوں نے خود ذکر کیا ہے کہ سات سال کی عمر میں قرآن کریم حفظ کیا۔ آٹھ سال کی عمر میں نماز تراویح پڑھائی اور نو سال کی عمر میں حدیث لکھنا شروع کی۔ آپ کے متعلق آپ کے بزرگوار والد نے خواب میں دیکھا کہ آپ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں اور پتھروں سے بھرا ہوا ایک تھیلا آپ کے سامنے رکھا ہوا ہے آپ تھیلے سے پتھر نکالتے ہیں اور رسول کریمؐ کے سامنے پھینکتے ہیں۔" بعد ازاں اس کی تعبیر پوچھی گئی۔ تعبیر بتانے والوں نے یوں بیان کیا کہ "جب آپ بڑے ہو جائیں گے تو دین کی حمایت اور شریعت کی مدافعت کا فریضہ انجام دیں گے۔" آپ کے والد ماجد کو جب اس تعبیر کا علم ہوا تو اپنے نونہال کی تعلیم کی طرف پوری توجہ کی۔ اعلیٰ تعلیم دینے کا انتظام کیا اور اس خواب کی تعبیر کی تکمیل کی خاطر حتی الوسع کوشش کی۔

آپ نے اس زمانے کے جلیل القدر عالم محمد بن حمید رازی اور مثنی بن ابراہیم ابلی کے فیض و برکات سے بہرہ اندوز ہونے کی سعی بلیغ کی۔ در جہاں کہیں حکمت کے موتی نظر آئے، بڑی عزت سے جھولی میں بھر لئے۔ علم سے آپ کی فطرت کو خاص مناسبت تھی، حافظہ قوی اور دماغ نکتہ سنج پایا تھا۔ آپ کی ذات علماء اور فضلاء کا مرکز بن گئی۔ اور ان علوم سے بہرہ اندوز ہوئی جن میں کوئی ہم عصر شریک و سہیم نہ ہو سکا۔ قرآن کریم کے عارف، احکام قرآن کے فقیہ، سنت کے عالم، ناسخ اور منسوخ کے واقف کار، صحابہ کرام تابعین اور ائمہ عظام کے اقوال کے حافظ۔ اپنے زمانے کے بہت بڑے محدث، یکتائے زمانہ فقیہ، قاری، مورخ، اور یگانہ روزگار محدث۔ کتاب التفسیر اور کتاب التہذیب آپ کے علم و فضل اور ذہانت و تبحر کی روشن دلیل ہیں۔ آپ میں زہد، ورع، خشوع، امانت، اعمال کی صفائی اور نیت کا صدق اس حد تک تھا جن پر آپ کی کتاب آداب النفوس شاہد عدل ہے۔

جب آپ علم قرأت کے متعلق لب کشائی کرتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ آپ اس علم میں اپنا آپ جواب ہیں۔ جب فقہ سے متعلق گفتگو کرتے تو فقہی معارف و نکات اور حکیمانہ دلائل کے موتی بکھیر دیتے۔ جب نحو پر گفتگو کرتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ گویا آپ نے صرف اسی فن میں کمال پیدا کیا ہے اور کوئی دوسرا فن نہیں جانتے۔ فن ریاضی میں بھی آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا۔

ابو بکر خطیب نے کہا ہے کہ میں نے علی بن عبید اللہ کو حکایت بیان کرتے ہوئے سنا کہ محمد بن جریر چالیس سال تک ہر روز چالیس ورق لکھتے رہے اور ابو حامد اسفرائینی نے فرمایا کہ اگر کوئی آدمی چین تک سفر کرے تاکہ کتاب تفسیر محمد بن جریر حاصل کرے تو اس طویل سفر کی صعوبت کچھ زیادہ نہ ہوگی۔

واقعہ ہے کہ ایک دفعہ ابو جعفر طبری نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ کیا تم تفسیر قرآن کے لئے اپنے وقت کو وقف کر دو گے لوگوں نے تفسیر کے صفحات پوچھے آپ نے کہا تیس ہزار ورق لوگوں نے کہا کہ یہ خاتمہ سے پہلے تو ہماری عمریں ختم ہو جائیں گی۔

ابن جریر کے شاگردوں نے ایک دفعہ آپ کے بلوغ سے لے کر وفات تک کے تمام دنوں کو جمع کیا ان دنوں پر آپ کی تصانیف کو تقسیم کیا تو ہر دن کے چودہ ورق ہوتے تھے۔ ابو جعفر طبری ہر رات چوتھائی قرآن پاک کا حصہ تلاوت کرتے تھے۔

آپ خوش طبع تھے۔ خورد و نوش اور لباس میں ممتاز تھے۔ آپ کا مذاق پاکیزہ تھا، جب کھانے پر میوہ وغیرہ آتا تو ان چیزوں کے متعلق ایسی باتیں بیان کرتے جس میں جدت ہوتی تھی۔ تحفہ لینے میں بہت زیادہ محتاط تھے اور عموماً تحفہ لینے سے اعراض کرتے۔ ایسے تحفہ کو قبول کرتے جس میں آپ کو یقین ہوتا کہ میں اس کا بدلہ دے سکتا ہوں ایک دفعہ ابو الہیجا ابن حمدان نے تین ہزار دینار تحفتاً بھیجے آپ نے اس کی طرف بے التفاتی سے دیکھا قاصد کو واپس لے جانے کے لئے اشارہ کیا اور کہا میں وہ قبول نہیں کرتا جس کا بدلہ دینے کی مجھ میں طاقت نہ ہو۔ میرے پاس اتنا کہاں ہے کہ میں اس کا بدلہ دوں۔

ایک روایت ہے کہ ایک دفعہ عبید اللہ وزیر نے ابو جعفر کے پاس کچھ انار تحفتاً بھیجے آپ نے ان کو قبول کر لیا اور اپنے ہمسایوں میں تقسیم کر دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد اس وزیر نے دس ہزار دینار سے بھری ہوئی تھیلی بھیجی ابو جعفر نے تھیلی کو دیکھتے ہی نظر پھیر لی اور کہا اسے واپس لے جاؤ۔ جب آپ نے قبول کرنے سے انکار کیا تو قاصد نے کہا کہ اس روپیہ کو غربا میں تقسیم کر دیں۔ جس کے جواب میں آپ نے کہا کہ وزیر اہل ملک کی حاجت سے زیادہ آشنا ہے اور وہ اس کی تقسیم زیادہ احسن طریقہ سے کر سکتا ہے اگر اسے تحفہ ہی بھیجنا ہے تو وہی انار بھیجے۔

ابو جعفر کھاتے وقت پلیٹ کا صرف ایک کنارہ استعمال کرتے اور جب بھی کھانے کے لئے لقمہ اٹھاتے تو بسم اللہ پڑھتے۔ اگر کھانے کا دانہ ہاتھ میں لگ جاتا تو دوسرا لقمہ لینے سے پہلے اسے صاف کر لیتے۔ لقمہ لیتے وقت بایاں ہاتھ اپنی ریش مبارک پر رکھتے جس وقت مجلس میں بیٹھتے اس وقت تھوکنے یا کھنکارنے سے احتراز کرتے۔ گنگنانے، اور اللہ تعالیٰ کی قسم کھانے سے ہمیشہ پرہیز کرتے۔ پھولوں میں گل ریحان، گل نیلوفر ان کو پسندیدہ تھے۔ ظہر کی نماز گھر پر پڑھا کرتے تھے۔ بعد ازاں تصنیف کا کام کرتے اور عصر کی نماز باہر آ کر ادا کرتے۔ عصر کی نماز کے بعد مجلس منعقد کرتے تھے۔

آپ کی ذہانت کا اندازہ اس ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ایک دفعہ ابو جعفر کو مصر جانے کا اتفاق ہوا۔ ہر شخص آپ کے پاس آتا اور جس علم میں وہ شغف رکھتا اس کے متعلق ابو جعفر سے پوچھتا اور مطمئن و مسرور ہو جاتا۔ ایک شخص نے علم عروض سے متعلق کوئی سوال کیا آپ کو علم عروض سے واقفیت نہیں تھی۔ ابو جعفر نے کہا کہ میں نے عہد کیا ہے کہ آج علم عروض کے متعلق کوئی گفتگو نہیں کروں گا کل میرے پاس آنا اور اپنے سوال کا جواب لے جانا۔ ابو جعفر نے اس رات اپنے ایک دوست کے ذریعے علم عروض پر خلیل بن احمد کی لکھی ہوئی کتاب منگوا بھیجی۔ آپ نے رات کو مطالعہ کیا اور صبح کے وقت علم عروض پر اس انداز سے گفتگو کی، جیسے آپ اس فن کے عالم ہیں!

ابو جعفر کی بلندی اخلاق، خودداری، اور عزت نفس ان اشعار سے ظاہر جھلکتے ہیں:-

اذا اعسرت لم اعلم رفیقی　　واستغنی فیستغنی صدیقی
حیاءٌ حافظٌ لی ماء وجهی　　ورفقی فی مطالبتی رفیقی
ولو انی سمحت ببذل وجهی　　لکنت الی الغنی سهل الطریق

اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ جب میں تنگ دست ہوتا ہوں تو میں نے اپنے دوستوں کو اپنے افلاس کی اطلاع نہیں کی یعنی اپنے دوستوں سے حاجت روائی کی درخواست نہیں کی اور اپنی خودی پامال نہیں کی اور جب میں خوشحال ہوتا ہوں تو میرا دوست بھی خوشحال ہو جاتا ہے یعنی میں اپنی دولت و ثروت میں اپنے دوستوں کو بھی شریک کرتا ہوں۔

میری شرم و حیا میری آبرو کی پاسبان ہے اور میری نرمی اپنے دوستوں سے تقاضا کرنے میں۔
گر میں اپنے مانگنے کو جائز سمجھتا تو دولت بڑی آسانی سے حاصل ہو جاتی۔
ان کے بلند پایہ کلام کا ایک اور نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔

خلقان لا ارضی طریقہما تیہ الغنی ومذلۃ الفقر
فاذا غنیت فلا تکن بطرا واذا افتقرت فتہ علی الدھر

دو عادتوں کو میں پسند نہیں کرتا دولت کا غرور اور فقر کی ذلت گر تم خوشحال ہو جاؤ تو تمہیں اترانا نہیں چاہیئے اور اگر تم مفلس ہو جاؤ تو زمانے کے علی الرغم اپنی خودداری اور عظمت کا اظہار کرو۔
علامہ ابن جریر طبری کا نام رہتی دنیا تک باقی رہے گا۔ اور دنیا انہیں ہمیشہ عزت و احترام کے ساتھ یاد کرے گی۔
ایک عربی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

اخو العلم حیٌّ خالدٌ بعد موتہ واوصالہ تحت التراب رمیم
وذو الجہل میت وھو ماش علی الثری یظن من الاحیاء وھو عدیم

اہل علم اس دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد بھی ہمیشہ زندہ رہتے ہیں جبکہ ان کا جسم مٹی میں فنا ہو جاتا ہے۔
اور جاہل مردوں میں تصور کیا جاتا ہے حالانکہ وہ زمین پر چلتا پھرتا ہے یعنی زندہ ہے لیکن اسے مردہ سمجھا جاتا ہے۔

اُردو شاعری میں معشوق کا تصور

محسن انصاری

عشق کسی شے سے شدید ترین محبت کا نام ہے اور آدمی میں اس سے زیادہ حیرت انگیز اثر رکھنے والا دوسرا کوئی جذبہ نہیں پایا جاتا۔ آدمی اس کائنات رنگ و بو میں اپنے اضطراب قلب و نگاہ کے ساتھ ایک نہایت مختصر مشغول اور پرہیجان زندگی گذارتا ہے۔ عشق ایسا تند و تیز جذبہ ہے کہ جس کے سہارے آدمی کئی زندگیوں کی متاع خیال و عمل کو اپنے تصرف میں لانے کا حوصلہ کرتا ہے۔ گویا اپنی ناپائداری کو وہ عشق سے پائندہ بنانا چاہتا ہے۔ کارخانۂ قدرت میں آدمی کو اپنی مادی و روحانی زندگی کی ارتقا کے سلسلے میں گوناگوں اشیاء سے سابقہ پڑتا ہے اور وہ اپنی ضرورت کے تحت اشیاء سے خاص خاص تعلقات قائم کرتا چلا جاتا ہے۔ عشق جیسے آدمی کو آدمی سے ہوتا ہے کسی شے سے بھی ہو سکتا ہے۔ جاندار سے بھی بے جان سے بھی، مادی و حقیقی شے سے بھی اور کسی پیکر خیالی سے بھی۔ آدمی مجرد اصول و قوانین سے بھی عشق کر سکتا ہے جس کی مثالیں تاریخ عالم میں کمیاب نہیں ہیں۔ آدمی ہمیشہ اپنی عقیدت و نیازمندی اور اپنے بہترین خیالات و جذبات کی وابستگی کے لئے ایک مرکز ڈھونڈتا ہے۔ اور وہ مرکز کسی محبوب کی ذات ہوتی ہے۔

شعر و ادب میں ہم کو جس عشق کا ذکر ملتا ہے وہ آدمی کا آدمی سے عشق ہے۔ مرد اور عورت کی ایک دوسرے سے قریب ہونے کی خواہش حیاتیاتی نوع کی اور فطری ہے۔ عمرانی تہذیبی اور ذوقی عوامل اس کے علاوہ ہوتے ہیں۔ انسان چونکہ باشعور ہستی ہے اس لئے اس کی حیاتیاتی خواہش کی تسکین کا معاملہ بھی اتنا سادہ نہیں جتنا جنگل کے جانوروں کا ہوتا ہے۔ بہرحال عورت اور مرد کے عشق پر جنس کا ذکر آنا قدرتی بات ہے "عشق حقیقی" کے علاوہ سب سے مکمل اور پائدار کوئی عشق ہو سکتا ہے تو وہی جس میں مبتلا ہونے والے اشخاص دو مخالف جنس کے ہوں۔ اس طرح کے دو اشخاص یہی نہیں کہ وہ فطرت کے حیاتیاتی مطالبہ کو پورا کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ بلکہ وہ زندگی کے عظیم تر مطالبوں سے اپنی شیفتگی بھی ظاہر کرتے اور ان کو پورا کرنے کا عزم بھی رکھتے ہیں کہ جن پر عمرانی تہذیبی اور تمدنی ارتقا منحصر ہے۔ عام طور پر شاعری میں ایسا عشق پایا جاتا ہے جس کی نوعیت حیاتیاتی اور فطری کم اور عیش پرستانہ زیادہ ہے۔ شاعری کا موضوع ہی عورت اور اس کے متعلقات رہے ہیں۔ عورت کی کئی کئی حیثیتیں ہیں۔ وہ ایک ناکتخدا لڑکی ہے، ایک بیوی ہے، ایک ماں ہے۔ ان حیثیتوں سے اگر اخلاص کے ساتھ عورت کو شاعری میں داخل کیا جائے، تو شاید مذہب، رسم و رواج اور اخلاق سے شاعری کا کوئی جھگڑا نہ ہو۔ مگر عورت کی ایک دوسری مستقل حیثیت شعرا تسلیم کرتے چلے آئے ہیں وہ حیثیت ہے ایک معشوق کی یوں تو ہر چیز کا مگر خاص طور پر عورت کا بہترین زمانۂ حیات اس کا شباب ہوتا ہے۔ عورت کا شباب وہ چیز ہے کہ بقول فانی جب بھی قیامت کا ذکر آتا ہے تو بات اس کی جوانی تک پہنچتی ہے۔ ایسے زمانۂ حیات کو کوئی کہتا ہے کہ عورت تمام تر عشق کی رنگینیوں کی نذر کر دے۔ کوئی کہتا ہے کہ دنیا سے اس کی لذت پرستی کا انتقام لینے کی خاطر عورت رہبانیت اختیار کر لے۔ کوئی کہتا ہے کہ عورت اپنی نسوانیت کے وقار کو قائم رکھتے ہوئے اپنے سوز دروں سے زندگی کو حسن استحکام بخشے۔ شاعر نے تقریباً ہمیشہ شعر و شراب و موسیقی کے ساتھ عورت کو بھی ایک لازمۂ عیش کے طور پر پیش کیا ہے۔

عورت اور مرد کے عشق میں جذبۂ شہوانی کے موجود ہونے سے قطعاً انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایک دوسرے سے عشق کرتے ہوئے مرد اور عورت

اپنی جنس کو ختم نہیں کرسکتے۔ بلکہ ان کا جنسی تخالف ہی عشق کو اور کچھ شدید کردیتا ہے۔ پھر بھی اپنی جگہ قابل لحاظ ہے کہ عشق کے دوران میں خیالات و جذبات کی جن کاوشوں سے انسان دوچار ہوتا ہے اور ذہنی و روحانی طور پر جس کرب و اذیت کا تجربہ کرتا ہے اس کا ایک مجموعی اثر یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے تصور معشوق میں شخصیت گم ہوجاتی ہے اور شخصیت کی صفات کا احساس ذہنیت کو ایک نیا انداز بخشتا ہے۔ جبلی شہوانی جذبہ کا تعلق انفرادی تسکین نفس سے ہے اور یہ فطری جذبہ ہے اس لئے اس کی نوعیت حیاتیاتی ہے۔ آدمی جس چیز سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ تعلق رکھنے میں اس کے کچھ خیالات و جذبات کام آتے ہیں۔ جذبات و خیالات ہی آدمی کی شخصیت کا تمام وقار اور اس کی خودی کا تمام تر اخلاص پایا جاتا ہے جس قدر گہرا تعلق ہوگا اتنے ہی اونچے گہرے خیالات و جذبات کی بھی اس میں آمیزش ہوگی۔ عشق چونکہ انفرادی خواہش کا سب سے اعلیٰ ظہور ہوتا ہے۔ لہٰذا آدمی جس ذات سے عشق کرتا ہے اس کے معاملے میں دوسرے کی شرکت گوارا نہیں کرتا۔ مردانہ رقابت تو کسی درجہ قابل برداشت ہوسکتی ہے مگر معشوق کا صرف اپنے لئے ہونے میں "غیر" کا مستقل تصور ناقابل برداشت ہے۔ ایک عاشق صادق اور بوالہوس میں عشق کرنے کا فرق ہے۔ بوالہوس کبھی اپنے شہوانی جذبہ کے دائرے سے باہر نہیں نکلتا۔ محض جذبۂ نفس کی تسکین ڈھونڈنا کوئی اعلیٰ فعل نہیں ہوسکتا کہ جس سے شخصیت کا وقار بڑھ جائے اور قلب و روح کے نوارے جگمگا اٹھیں۔ اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ مجھے فلاں سے عشق ہوگیا ہے اور پھر وہ گلی گلی اس کے حسن کی تعریف کرتا پھرتا ہے۔ ہر کس و ناکس کے آگے اس کے ناز و انداز کی داستان بیان کرتا ہے عشق کے بلند بانگ دعوے کرتا ہے۔ یا اپنے معشوق کے مکنہ معاملات کو کھلے کھلے الفاظ میں بیان کرتا ہے تو یہی بوالہوسی کی نشانی ہے۔ نہ اس طرح معشوق کا احترام ہوسکتا ہے اور نہ اپنے خلوص عشق کا اظہار۔ عاشق صادق اور بوالہوس کے عشق کرنے کا طریقہ دونوں کے ذہنی و جذباتی اقدام اور منتہائے نظر میں بھی فرق پیدا کردیتا ہے عشق اور بوالہوسی کا نقطۂ آغاز شہوانی جذبہ ہی سہی۔ مگر دونوں کے مزاج اور سعی و انجام میں فرق ہے۔ یہ ماننا اس بات کے لئے لازم نہیں کہ پھر عشق کی پاکیزگی اور زندگی میں اس کے ایک پرعظمت قوت ہونے سے انکار کردیا جائے۔ خود آدمی کی تخلیق ایک قطرۂ حقیر سے ہوئی ہے۔ یہ حقیقت اس کے روحانی ارتقاء میں مانع نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ آدمی کا انجام موقوف ہے اس کے اعمال پر اور اعمال کی قدر و قیمت متعین ہوتی ہے خیالات اور نیت سے۔

مجموعی طور پر اردو شاعری غزل کی شاعری رہی ہے۔ اور غزل میں عشقیہ مضامین بیان ہوتے ہیں۔ متقدمین شعوری طور پر شاعری کو تب سنجیدہ فن نہیں مانتے تھے جیسا کہ مثلاً اقبال جو کہتا ہے ؎

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا
ان کی تاریکیٔ افکار میں قوموں کے مزار

انھوں نے شاعری کو ذہنی تلذذ کے لئے زندگی کی تلخ حقیقتوں سے جدا کرلیا تھا۔ وہ روز ازل کی اس پستی ہی سے آگاہ تھے جس میں بالعموم فکر و خیال کا اجتہاد معدوم ہوتا ہے۔ شاعری میں عشقیہ مضامین کے تحت وہ تمام فضول باتیں بیان کی گئیں جن کو حقیقی عشقیہ شاعری سے کوئی علاقہ نہ تھا معاملہ بندی کو اس حد تک پہنچایا گیا کہ وہ صرف چوما چاٹی ہوکر رہ گئی۔ محض معشوق کی جسمانی تعریف اور عشق کے زبانی دعوے کرنا شعراء کا شعار قرار پایا۔ ایسے جذبات جو اعلیٰ عشقیہ شاعری کی خصوصیت ہوتے ہیں۔ مثلاً رفاقت کی سچی طلب، ایثار، دلیری، بلند نظری، عالی ہمتی، وفاداری، کشادہ دلی وغیرہ ان کا اظہار جیسا کہ ہونا چاہیے تھا نہیں ہوا۔ یہ نہیں کہ طبیعتوں میں ذوق نہیں تھا۔ بلکہ بدقسمتی سے جو سیاسی و تہذیبی زوال ہندوستانی معاشرہ میں عام ہورہا تھا۔ اسی کا نقشہ اردو شاعری میں ملتا ہے۔ اس قوم کی بدبختی اور افلاس تخیل کا اندازہ کیجئے جس کے اندر دو صدی تک ایسے سخن گو پیدا ہوتے رہے جو ایک ہی صنف سخن میں یہی شاعری کرتے رہے جس کے مضامین پہلے سے طے تھے۔ غزل کے امکانات کی لامحدودیت تسلیم۔ مگر ذہن تو در طبعی تسلیم سخن میں بھی نئے ایجادات چاہتی ہے۔ خیال آفرینی کی استعداد کو صرف کمر و دہن کے لئے تشبیہات و استعارات ڈھونڈنے میں صرف ہوجاتی

تو اس بات کا دعویٰ غلط ہے کہ شاعر اپنی قوم کے ولولوں اور ان کے بہترین خیالات کا ترجمان ہوتا ہے۔ عشقیہ مضامین شاعری کا ایک وقیع جزو ہیں مگر وہی سب کچھ نہیں۔

عشقیہ شاعری کا اعلیٰ یا ادنیٰ ہونا تصورِ معشوق پر مبنی ہے۔ معشوق کا تصور جتنا پاکیزہ، معصوم، خیال افروز اور دلآویز ہوگا۔ اتنی ہی عشقیہ شاعری حسین ہوگی۔ تصورِ معشوق ایک بلور ہے جس سے رنگ برنگ کی خیال کی کرنیں پھوٹتی ہیں۔ تصورِ معشوق کا عکس پوری شاعری پر پڑتا ہے۔ آپ کسی شاعر کے کلام میں اس کے معشوق کے انداز وقد کو نہایت آسانی سے پہچان سکتے ہیں۔ عاشق کے بہترین جذبات اس کی تمام تر عقیدت و نیاز مندی اور اس کا سارا اخلاص فکر و عمل معشوق کی ذات سے وابستہ ہوتا ہے۔ عشق کے مدارج عاشق در اصل اپنے حوصلے سے طے کرتا ہے۔ عاشق کو معشوق کا دامن تھام لینے کی جرأت نہ ہو تو کم سے کم اپنا دامن پھاڑنے پر ضرور قادر ہونا چاہیئے۔ معشوق کی صفات محبوبی سے فائدہ اٹھانے کے لئے عاشق کی فطرت میں جذب و انجذاب کی صلاحیت کا ہونا ضروری ہے۔ اگر معشوق ایک چنگاری ہے تو عاشق کو لازمی خس و خاشاک ہونا چاہیئے۔ ہر حسن عشق کے قابل اور ہر عشق حسن کے شایانِ شان نہیں ہوتا۔ اپنی فطری استعداد پر سب کچھ موقوف ہے ؎

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند
نہ ہر کہ آئینہ سازد سکندری داند

عشق کے درجۂ کمال تک پہنچنے کے لئے نگاہ بلند اور قلبِ سلیم ضروری شرط ہیں۔ یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ عشق میں جنس کو بھی دخل ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ محض شہوانی جذبہ کی مدد سے عشقیہ شاعری کی جا سکتی ہے۔ شہوانی جذبہ کی تکمیل محض ایک وقتی ہیجانی اور خود غرضانہ فعل ہے۔ ایک بار آسودہ ہونے کے بعد اس جذبہ میں وہ تندی، گرمی و سرمستی نہیں رہ جاتی جو دل و دماغ کے لئے ایک مستقل کاوش و جگر کاوی کا سبب بن جائے۔ شہوانی جذبہ آدمی کے دل و دماغ کو ماؤف کر کے رکھ دیتا ہے اس کو اتنی مہلت نہیں دیتا کہ وہ دوسرے خیالات کی طرف متوجہ ہو۔ پھر چونکہ مرد کی نظر میں عورت کی زندگی کا ہر بھلا بُرا پہلو ہوتا ہے۔ اس لئے قدرت نے اس کا جذبہ سپردگی کامل نہیں ہو سکتا۔ شہوانی جذبہ کا بیان ذوقِ سلیم کے موافق نہیں اس لئے وہ اعلیٰ عشقیہ شاعری کا موضوع نہیں بن سکتا۔ نواب مرزا شوق کی مثنوی زہرِ عشق خوبیوں کے لحاظ سے اردو کی بہترین مثنویوں میں شمار ہو سکتی ہے مگر وہ ہمیشہ سے ایک مخرب اخلاق مثنوی کی حیثیت سے بدنام ہے۔ اس کا سبب یہی ہے کہ ساری مثنوی میں محض شہوانی جذبہ کی عکاسی کی گئی ہے اور معشوق کا نہایت گھٹیا تصور پیش کیا ہے جو ایک عاشق مزاج نوجوان کی نفسانی خواہشات کو بے غیرتی کے ساتھ تسکین دیتی ہے۔ بلاشبہ اس مثنوی سے اعلیٰ ذوق سخن آسودہ نہیں ہو سکتا۔

اردو شاعری میں عشقیہ مضامین کے طومار کو دیکھ کر بعض وقت یہ سوال کیا جاتا ہے کہ کیا اردو کے تمام شعراء عاشق تھے یا جھوٹ موٹ عشق کا دعویٰ کر کے خیالی طوطا مینا اڑاتے تھے۔ اصولی طور پر یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ کیا ایک شاعر بغیر عشق کئے ہوئے سچے عشقیہ اشعار کہہ سکتا ہے۔ مجھے یہ بات خلافِ عقل نہیں معلوم ہوتی کہ بغیر عشق کئے ہوئے بھی ایک شاعر عاشقانہ کیفیات کا صحیح اظہار کر سکتا ہے۔ اگر ان لذت اندوزیوں کی بات ہو جن کو صرف دو جسموں کا قرب ہی فراہم کر سکتا ہے تو اس کا بیان کوئی ذوقِ سلیم رکھنے والا شخص بھی گوارا نہ کرے گا۔ البتہ اگر بات دائمی رفاقت کی طلب، جگر کاوی، خستگی اور دل سوزی و گدازی کی ہو، اگر ذکر حسن کی جلوہ بازیوں اور نگاہ کی کرشمہ سازیوں کا ہو تو ایک باذوق شاعر بھی انھیں نظم کر سکتا ہے۔ شاعری کا تعلق خیالات و الفاظ سے ہے۔ دنیا کے حالات سے گذرتے ہوئے آدمی کو اتنی فرصت نہیں ہوتی کہ وہ ان کے اس پہلو کی طرف کماحقہ متوجہ ہو کہ جس کا تعلق خیال سے ہے۔ علیٰ ہذا اس وقت جبکہ آدمی زندگی کے لذائذ و نعائم سے لطف اندوز ہوتا ہے اس کے لئے ممکن نہیں ہوتا کہ اسی وقت اس کی یاد میں مسرت و طرب و نشاط میں ڈوبے ہوئے اشعار ادا ہونے لگیں۔ یا اگر کوئی ناگہانی المناک حادثہ گذر جائے تو وہ اسی وقت المیہ اشعار کا ایک دفتر تصنیف کر ڈالے۔ غیر معمولی خوشی اور غم کے واقعات آدمی کے جذبات و احساسات پر غالب آجاتے ہیں اور اسکی قوت برداشت کو ایسا متاثر کرتے ہیں کہ کسی

خیال کی پرواز کے لئے ذہن میں گنجائش کم رہ جاتی ہے۔ روا روی میں دو چار شعر کہہ دینا اور بات ہے اور کسی موضوع پر باقاعدہ کچھ کہنا اور بات۔ شاعر جب دنیا کے ہنگاموں سے منہ موڑ کر اپنے دل کے خلوت کدے میں لوٹتا ہے اس وقت اس کے منبع فکر سے شعر کے چشمے ابلنے لگتے ہیں۔ زمانہ حالات و حوادث کے نقشے بناتا، بگاڑتا ہوا رواں دواں ہے۔ شعر کہتے وقت شاعر اپنے آپ کو زمانے کے بہاؤ سے تھوڑی دیر کے لئے الگ کر لیتا ہے اور اپنے تفکر میں ایک نئے زمانے کا نیا پن محسوس کرتا ہے۔ یہی کیفیت شعر میں مقید ہو کر اس کو ایسا آہنگ دیتی ہے جس کی تازگی اور نشاط آفرینی ہمیشہ باقی رہنے والی ہوتی ہے۔ مادی تجربات کی کثرت، سخن سنجی اور خیال آفرینی کے لئے زیادہ ضروری نہیں۔ ہر قسم کے واردات کا تجربہ کرنے ہی پر اگر سخن گوئی کا راز پوشیدہ ہوتا تو بلا شبہ ہم میں سے ہر شخص شاعر ہوتا یا کم از کم عشاق تو ضرور شاعر ہوتے جن کے قلبی واردات کو گوناگوں لامحدود سمجھا جاتا ہے مگر فی الواقع ایسا نہیں۔ شہرۂ آفاق عشاق بھی شاعر نہیں ہوتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک شاعر عام انسانوں سے حساس ہوتا ہے۔ اس لئے وہ آسانی سے ایسے حالات کا تصور کر سکتا ہے کہ جب حسن کی ایک نگاہِ غلط انداز کے پڑتے ہی کوئی نقد دل و جان نثار کر دیتا ہے وہ ان جذبات و خیالات کا سراغ لگا سکتا ہے جو حسن اور عشق کے باہمی تعلق کو پر اسرار و دلآویز بناتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ جذبۂ انس و محبت، ایثار، ہمدردی اور وفا شعاری سے شاعر ناواقف ہو۔ ان جذبات کی کارفرمائی زندگی کے عام معاملات میں ہوتی ہے۔ شاعر اگر عاشق نہیں ہے تو بھی اس کا نازک حس اور رقیق القلب ہونا اس بات کے لئے کافی ہے کہ وہ محبت کے رنج و الم کا بخوبی احساس کر سکے، اور اشعار میں ہو بہو ان کا نقشہ کھینچ سکے۔ شاعر کا ذوقِ سلیم اور اس کی ذہنی استعداد اس کو عشق کی اس منزل سے آگے لے جاتے ہیں کہ جہاں جسمانی وصل ایک غیر شاعر عاشق کا بیڑا غرق کر سکتا ہے۔ زمانۂ موجودہ میں جہاں ایسے بہت سے خیالات عام ہوئے جو ہمیں اپنی قدیم شاعری سے نفرت دلانے والے تھے۔ وہیں ایک خیال یہ بھی ہے کہ قدیم شعرا کے یہاں عشقیہ جذبات کا اظہار مصنوعی ہے۔ چنانچہ خیالات کی براقی، جذبات کی گرمی اور اسلوب بیان کی خوبی کے ثبوت میں عاشقانہ زندگی کی پیش کرنے کی ضرورت سمجھی گئی۔ اور کتنوں نے کئی بڑے شعرا کی داستان معاشقہ کو دریافت بھی کر لیا۔ حالانکہ کسی جذبے کا اصلی ہونا اس بات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اظہار ایسے طریقے پر ہو کہ جوش انداز اثر انگیزی کے لحاظ سے دوسرا اسلوب اختیار کرنا ناممکن ہو۔

اردو شاعری میں جو تصورِ معشوق بالعموم پایا جاتا رہا ہے وہ امرد یا زنِ بازاری یا پروردگارِ حقیقی کا ہے۔

اردو شاعری میں امرد کا تصورِ معشوق فارسی شاعری سے براہ راست آیا۔ امرد پرستی ذہنی اپج کی ایک نہایت مذموم اور غیر فطری شکل ہے وہ ایک نفسیاتی عارضہ ہے۔ یہ عارضہ دنیا میں تقریباً ہر جگہ پایا جاتا رہا ہے۔ البتہ ایران کی مینو سواد سرزمین میں اس کا رواج شاید زیادہ ہوا۔ شراب کے عام رواج کے ساتھ امرد پرستی اس کا ایک ضمیمہ تھی۔ امرد پرستی کی ابتدا اور شعر میں اس کے ورود کا سراغ لگانا ہمارے لئے کوئی مفید بات نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ایرانی تہذیب اسلام سے مکمل طور پر مغلوب نہیں ہوئی۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عاشقانہ طبیعتوں نے امرد پرستی کو شریفانہ اور بے ضرر فعل سمجھ کر اختیار کیا ہو اور شاعری میں اس کے ذکر کو اور بھی معصوم سمجھا ہو جس سے مقصود محض جمالیاتی ذوق کی تسکین ہو۔ بات جو بھی ہو اس غیر فطری فعل کے رواج سے اخلاق میں عام فساد رونما ہوا۔ پھر عجمی تصوف نے محبت حسنِ حقیقی کے مظاہرے کی آڑ میں امرد پرستی کو اور تقویت پہنچائی۔ یہ سمجھنا کہ پاکیزگی اور معصومیت کا تصور امرد میں زیادہ پایا جا سکتا ہے خود فریبی اور فریب دہی کی انتہا ہے۔ یہ ثبوت مانگنا بھی بد مذاقی ہوگی کہ ایسے معشوق کا عشق گناہ گار بننے سے کیسے بچا سکتا ہے۔ بات جو کچھ بھی ہو اردو کے شعرا نے امرد کے تصورِ معشوق کو قبول کیا اور اس نے آسانی سے قبول کیا کہ دہلی کے سب شاعر مثلاً ولی، میر، درد وغیرہ صوفی طبیعت رکھتے تھے۔ امرد کے وجود سے محفل سماع بھی خالی نہ ہوتی تھی۔ بعد کے شعرا نے اپنے پچھلے بزرگوں کی محض تقلید کی ہے اور اس عقیدہ کے ساتھ کہ

خطائے بزرگاں گرفتن خطاست

قدیم شعرا نے تو غیر تقلیدی اور روایتی شاعری کی تھی مگر امرد پرستی کے سلسلے میں اپنے زمانے کے ایک ایسے شاعر کے خیالات معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا

جو عشقیہ شاعری کے پیغمبر ہونے کے مدعی ہیں، فرماتے ہیں:

"امرد پرستی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے کیونکہ خواہ آپ اسے غیر فطری کہیں، خواہ مکروہ اور ذلیل خواہ آپ تعزیرات ہند کا سہارا لیں، یہ یاد رہے کہ جو لوگ امرد پرستی کے مرتکب ہیں وہ نہ تو جرائم پیشہ ہوتے ہیں نہ ذلیل اور ذلیل نہ کمینے اور نہ عام طور سے خراب آدمی ہوتے ہیں۔ بلکہ کئی امرد پرست تو اخلاق و تمدن اور روحانیت کی تاریخ کے مشاہیر رہے ہیں جیسے سقراط، سیزر، مائیکل، اینجلو، سرمد، شیکسپیئر اور دنیا بھر کے کھلا امرد پرست رہے ہیں وہ نہایت شریف آدمی رہے ہیں۔"　　(فراق گورکھپوری۔ اردو کی عشقیہ شاعری)

معشوق کے اس تصور کی بدولت اردو میں چند روایات پائی جاتی ہیں۔ مثلاً معشوق کا سبزہ آغاز ہونا، معشوق کو بصیغۂ مذکر باندھنا، معشوق کا تلوار، چھری اور ناوک سے عاشق کی تواضع کرنا، رقیبوں کی کثرت اور ہر محفل شارے وغیرہ۔

اردو شاعری میں امرد کے علاوہ معشوق کا تصور ایک زن بازاری کا تصور ہے۔ یہ دونوں تصورات بالمقابل پائے جاتے ہیں کسی قابل ذکر شاعر کا کلام اٹھا کر دیکھئے آپ کو صاف نظر آئے گا کہ جس دلربا کی تصویر خیالی میں شاعر اپنے تخیل کی رنگ آمیزی کر رہا ہے وہ ایک شاہد بازاری ہے دم رقص جس کی ٹھوکر سے مردے جاگتے ہیں اور جس کی ہر تان میں شعلہ سا لپک جاتا ہے۔ اردو شاعری جب ترقی کے قدم بڑھا رہی تھی مغلیہ سلطنت اپنے آخری سانس لے رہی تھی۔ وہ تمام معاشرتی اور اخلاقی روگ معاشرے کو لگ چکے تھے جو کسی قوم کو کھوکھلا کر کے رکھ دیتے ہیں۔ وضعداری، مذہب اور اخلاق کا ہجوم جدا آرہا تھا روایات، اور سلاطین کے ناموس کا تنا اثر ضرور تھا کہ ایسی غلط کاریوں اور عیش و عشرت کی بدمستیوں میں بھی اپنی آن اور شرافت کا احساس دلوں میں موجود تھا۔ طبقہ امراء کے بگڑنے کے بعد عوام ان کے بگڑنے میں دیر نہیں لگی کسی قوم کا ذہین باصلاحیت اور نسبتاً آسودہ حال طبقہ میں جس کو روزی کمانے کی مشقت کے بعد بھی کچھ علم و ادب کے بیان یا شہسواری کا موقع ملتا ہے۔ اگر وہ کاہلی اور عیش پرستی میں مبتلا ہو جائے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ اس قوم سے زندگی کی روح رخصت ہوگئی۔ یہ سلطنت کے ہل لشکر کا یہ حال تھا کہ وہ بھی رنگین مزاجی میں آپ اپنی مثال تھے۔ پیسہ میں دولت کا یہی مصرف تھا کہ خوب گلچھرے اڑائے جائیں۔ عیش و نشاط کی محفلیں آراستہ ہوں، یاران خوش باش جمع ہوں، شراب آئے۔ کباب آئے۔ شاہد لنواز آئے، نغمہ چھیڑے، غزل گائی جائے۔ یہی سب اس وقت کی شاعری میں بھی ملتا ہے۔ یا تو محض ایک خواب و خیال کی دنیا ہے یا ایسی دنیا جس میں مردوں کی مردانگی کے لائق کوئی شغل نہیں سوائے عشق بازی کے۔ ارباب نشاط کے منظور نظر ہونے کے کئی اسباب تھے۔ معاشرہ سے صالحیت و رعب و توزن اٹھ گیا تھا۔ گھر کی عورت کو تو شریف ہونا ہی چاہیئے تھا۔ مگر مرد کو اپنی رنگین مزاجی کا ثبوت دینے کے لئے کوٹھوں پر جانا مباح تھا۔ مرد بے شرمانے ہوئے کہتا تھا کہ ؎

میرا مزاج میرا لڑکپن سے عاشقانہ ہے

اور عورت کو یہی کہنا زیب دیتا تھا کہ ؎

عشق کیا ہے یہ بیسوا جانیں
ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں

شاعری کے عام رواج نے طبیعتوں میں حسن پرستی و عشق بازی کے ولولے کو بڑھا دیا تھا۔ زنان بازاری کے طبقے میں اور رنگین مزاجوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے سلسلے میں تہذیب و نفاست کا معیار اونچا ہوتا گیا۔ اتنا اونچا کہ پھر تہذیب و نفاست اور آداب محفل سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے امراء و شرفاء کے لڑکوں کا طوائفوں کے کوٹھوں پر جانا ایک رواج بن گیا تھا۔

اردو زبان جو شاہجہاں[1] کے زمانے میں پیدا ہوئی اور قلعہ شاہی میں جس کا بچپن گزرا جس میں دور دور تک پھیلی۔ اس کے بولنے والے امیر

---

[1] اردو زبان کی داغ بیل شاہجہاں سے بہت پہلے پڑ چکی تھی۔ (م۔ق)

غریب، پیر فقیر سبھی ہوئے۔ وہ ہر طبقہ میں مقبول ہوئی اور شعر و شاعری کا چرچا اس زبان میں ایسا ہوا کہ باید و شاید۔ یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ اردو کی جس شاعری میں معشوق کا تصور زنِ بازاری کا تھا وہ پست ہی رہی ہے اور سستے جذبات کے لئے معجون کا کام دیتی رہی ہے۔ اردو کی تاریخ کے اوائل ہی کی بات ہے کہ سراج دکنی اور میر درد جیسے صوفی شاعر پیدا ہوئے۔ میر کی شاعری کا ایک بڑا حصہ ضرور نظر انداز کردینے کے لائق ہے مگر یہ امر مسلم ہے کہ انھوں نے اردو شاعری کو سوز و گداز، دل گداختگی اور سوزِ غم کی بہترین متاع دی۔ انھیں کے ہم دوش سودا نظر آتے ہیں جن کی ہنگامہ آفریں شاعری ایک اونچا درجہ رکھتی ہے۔ ان شعرا کے بعد سینکڑوں شعرا جن میں مومن، مصحفی، آتش وغیرہ کا نام پہلے آتا ہے جنھوں نے اپنی بہترین ذہنی صلاحیتوں سے اردو شاعری کو مالا مال کیا۔ خیالات اور اسالیبِ بیان کا تنوع بڑھ گیا۔ خالص عشقیہ مضامین کے علاوہ دوسرے مضامین مثلاً تصوف، اخلاق اور خارجی واقعات بھی دخل پانے لگے۔ زبان منجھتی گئی۔ فصاحت و بلاغت کا التزام بڑھ گیا۔ تہذیب و نفاست کا معیار اونچا ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عشقیہ شاعری میں خالص جنسی جذبات کی طرف توجہ کم ہو گئی۔ شعرا نے ان جذبات و خیالات کی طرف رخ کیا جو بہرحال معشوق سے وابستہ تھے مگر ان میں ایسی شان پائی جاتی تھی جو ہر باذوق طبیعت سے میل کھانے والے اور ہر دل کو تڑپا دینے والے تھے۔ معشوق کے تصور میں جنس کا ارتعاش رنگین تو موجود رہا مگر اس پر رنگین و لطیف تشبیہات و استعارات کا پردہ ڈال دیا گیا۔ فن محض عریانی کا نام نہیں۔ شاعری میں جبلی جذبات اکثر رنگین پردوں کے پیچھے ہی سے دلاویز و دلکش دکھائی دیتے ہیں۔ عشقیہ شاعری کی یہ خصوصیت میر، مومن، مصحفی اور آتش کے یہاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ داغ کی شاعری تمام تر عشقیہ شاعری ہے مگر بلند عشقیہ شاعری نہیں۔ البتہ یہ زبان ہے جو داغ کو داغ بناتی ہے ؎

اک ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی — اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

داغ نے دیکھے ہیں ہزاروں حسیں — آپ نے کس شخص سے دعویٰ کیا

تہذیب و نفاست کے اونچے معیار پر معشوق کا تصور بھی اونچا ملتا ہے۔ رموزِ دلبری سے واقف ہونے۔ ناز و انداز کی خوبیوں کو حسن کے ساتھ بیان کرنے میں شاعر کے گوناگوں تجربات، قلبی واردات اور افکار کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ ایک ہی تبسم، ایک ہی اشارہ اور ایک ہی بات کو مختلف اشخاص اپنے اپنے ذوق کی بنا پر الگ الگ سمجھتے ہیں۔ منظر ایک ہی ہوتا ہے، مگر زاویہ نظر ایک نہیں ہوتا۔ مومن کا یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

اس حیلہ جو نے وصل کی شب ہم سے روٹھ کر
نیرنگِ روزگار کا عالم دکھا دیا

رعنائی خیال کے لئے کسی شخص کا تصور ضروری ہے۔ اعلیٰ عشقیہ شاعری کے دل کی بھی ضرورت ہے اور دماغ کی بھی۔ دل کی ضرورت کہ حسن کی ایک غلط انداز نگاہ بھی رائیگاں نہ جانے پائے اور دماغ کی ضرورت اس لئے کہ اپنے مخصوص طرزِ فکر کے مطابق جذباتِ الفت کو بیان کیا جائے۔ عاشق جب دیکھتا ہے کہ دکھ درد کے مارے ہوئے اور بھی ہیں۔ اس کی مشکلات کی طرح دوسروں کی مشکلات بھی ہیں جیسی مانع و مزاحم قوتوں سے اس کو سابقہ پڑ رہا ہے دوسروں کو بھی پڑ رہا ہے تو اس کے دل میں عام انسانوں کے لئے ایک ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے وہ اپنے درد میں دوسروں کا درد بھی شریک کر لیتا ہے۔ اس کے دل اور دماغ میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس طرح عشقیہ شاعری محض انفرادی عیش یا غم کا بیان نہیں رہ جاتی بلکہ پھر اس کے اندر زندگی کا نور و نار پیدا ہو جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ معشوق کی ذات کا تصور دھندلا پڑ جاتا ہے اور عشق زیادہ غیر شخصی تصورات سے توانائی حاصل کرتا اور اعمال و افکار پر اثر انداز ہوتا ہے۔ سینکڑوں عشقیہ اشعار میں ہم دیکھتے ہیں کہ معشوق کا تصور ایک آئیڈیل (Ideal) ایک مطمحِ نظر اور ایک خالص تصوراتی شے بن گیا ہے۔ ذیل کے اشعار مثالاً پیش کئے جاتے ہیں

مصائب اور تھے پر دل کا جانا — عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے (میر)

وصل ہوتا ہے جن کو دنیا میں — یارب ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں (میر حسن)

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا　　ساغر کو مرے ہاتھ سے لیجو کہ چلا میں　　(سودا)

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی　　دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی　　(غالب)

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا　　(مومن)

راہ میں تیری شب و روز بسر کرتا ہوں　　وہی میل اور وہی سنگ نشاں ہے کہ جو تھا　　(آتش)

دل عشق کا ہمیشہ حریف نبرد تھا　　اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں پہلے درد تھا　　(میر)

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے　　اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے　　(غالب)

چھٹ کر کہاں اسیر محبت کی زندگی　　ناصح یہ بند غم نہیں قید حیات ہے　　(مومن)

انتہائے شوق ہے اب ضبط کی طاقت کہاں　　ابتدائے شوق میں چندے تحمل ہو گیا　　(آتش)

ان اداؤں کا کوئی مارا جئے کس طرح ہائے　　یا ہے اب یہ گرم جوشی یا کہ وہ پرہیز تھا　　(مصحفی)

مت میرے رنگ زرد کا چرچا کرو کہ یاں　　رنگ ایک سا ہمیشہ کسی کا نہیں رہا　　(〃)

پیامبر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا　　زبان غیر سے کیا شرح آرزو کرتے　　(آتش)

آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی　　اب کسی بات پر نہیں آتی　　(غالب)

میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں　　مانا کہ تیرے رخ سے نگہ کامیاب ہے　　(غالب)

تصوف نے اردو شاعری کو ایک دوسرا تصور معشوق دیا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ تصور انفس و آفاق کی سرشت میں پوشیدہ ہے۔ یہ تصور جتنا پاکیزہ اعلیٰ اور حسین ہو سکتا ہے۔ اس سے ماورا انسان کا تخیل نہیں جا سکتا۔ وہ ہستی جو عالم کائنات کی خالق ہے جس کی ذات نام ہے تمام جلال و جمال، تمام قوت و جبروت اور تمام الطاف و اکرام کا یقیناً وہی انسان کے بہترین جذبات عبودیت و پرستش کا مرکز بن سکتی ہے۔ اسی کی آرزو میں زندگی بسر کرنا اور اسی سے اپنی حسرت اور امید کو وابستہ کرنا انسانیت اولین تقاضا اور اخلاص فکر و عمل کی انتہا ہے۔ وہی ہر امر کا مرجع ہے اور ہر سعی و جہد کی غایت لازماً اسی کو ہونا چاہیے۔ مرنا اور جینا اسی کی خوشنودی کے لئے ہونا چاہیے۔ اور انسان کا کام ہر حالت میں اسی کا دم بھرنا ہے افسوس کہ شعرائے عملاً اپنی شعری تصنیفات میں اس بلند تصور کا حق ادا نہیں کیا۔ زمانے کے عام بگڑے ہوئے ذوق نے تصوفانہ شاعری میں بھی ایسا Perversion پیدا کر دیا جس سے شاہد حقیقی کا جلوہ تقریباً مستور ہو کر رہ گیا۔ وہ تصوف جو اگر اخلاص عمل اور حسن نیت کا نام تھا تو یقیناً اردو شاعری کی عام پستی اور بد مذاقی کے لئے ایک روک (Deterrent) ثابت ہوتا ایسا ہوا مگر بہت کم۔ تصوف کے مضامین بھی سستی عشقیہ شاعری کے زمرے میں کھپ گئے۔ اکثر اونچے خیالات کا احترام بھی محض سامع کی نیت پر موقوف ہو گیا ان کوتاہیوں کے علی الرغم یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ تصوف کی وجہ سے اردو شاعری میں بلند خیالات بھی آئے، پر جوش جذبات بھی تصوف کے اعلیٰ مقامات نے شعر کو نئی بلندیوں سے آشنا کر دیا۔ اہل نظر کی توجہات نے طبیعت کو نئی دہن، خیال کو نئی کاوش اور دل کو نئی گرمی بخشی۔ تصوف ہی کے اثر سے داخلیت عام ہوئی۔ جذبات میں جو گرمی، ہمواری اور خلوص تصوف کی بدولت آیا وہ اس کے بلند تصور معشوق کا اثر تھا۔ عام طور پر شعرا حسن کے خارجی متعلقات کو اپنا موضوع بناتے تھے تو تصوف کے اثر سے یہ ہوا کہ حسن وجوانی آدمی کے باطنی کوائف و احوال پر پڑتا ہے۔ اس کی باتیں ہونے لگیں جیسی ذہنی۔ توکل وضعداری، اداو عزم اور جانبازی کے مجرد خیالات بھی آئے۔ رمزیت کی بھی کثرت ہوئی۔ ان امور کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو شاعری میں یہ صلاحیت پیدا ہو گئی کہ اس کے اشعار کا اطلاق زندگی کے مختلف حالات پر موثر طور پر ہو سکے اور حیات و کائنات کے مسائل غزل کے دائرہ میں آ جائیں۔ یہ سچ ہے کہ تصوف کی شاعری میں خودی میں ڈوب کے ضرب کلیم پیدا کرنے کی صفت نہیں ملتی۔ مگر اس میں ایک زندگی روشنی فکر اور وارفتگی ملتی ہے اس سے انکار ممکن نہیں۔

معاشرہ کے خلاف نفرت کا اظہار کرتا ہے۔ مجاز کو دیکھیے کس لطف اور طنز کے ساتھ کہتا ہے ؎

وہ ارضِ کلیسا کی اک ماہ پارا
وہ دیر و حرم کے لئے اک شرارا

یا فیض احمد فیض کا یہ شعر دیکھیے ؎

تو اپنے حسن کی معصومیت کو کم کر دے۔
گناہ گار نظر کو حجاب آتا ہے

بظاہر یہ عشقیہ شاعری کا ایک خوبصورت شعر ہے مگر اس کے اندر ایک خطرناک نظریہ کا زہر بھی ہے۔ اسلام پسند شعرا میں نعیم صدیقی قابل ذکر ہیں جن کے افکار نے نظام اسلامی کو محبوب کے تصور میں مدغم کر دیا ہے۔

یہ مضمون تشنہ رہے گا اگر اقبال کا ذکر نہ ہو۔ جس نے عشق اور معشوق کے تصور کو پرعظمت بنا دیا۔ پرانے صوفی شعراء کے یہاں قلبی واردات ضرور ملتے ہیں مگر وہ بچے ذہنی اکتسابات نہیں ہیں۔ اقبال نے دل اور دماغ دونوں کو مطمئن کرنے کا سامان کیا۔ اس نے عشق سے لغویت کی داستان کو ختم کر کے آئندہ اردو شعراء کے لئے کئی نصب العین بے شیفتگی کا اظہار کرنے کے لئے زبردست راہیں کھول دیں۔ اقبال کا تصورِ عشق صوفی شعراء کے مماثل اس حد تک ہے کہ دونوں کے جذبات شوق کا مرجع ایک ہی ذات ہے۔ مگر صوفی حجروں کے اندر بیٹھ کر مکاشفات و مجاہدات پر قانع ہو جاتے ہیں اور اقبال جوشِ عشق میں آتشِ نمرود میں کود پڑتا ہے۔ یہ نعرہ لگاتا ہے ؎ ——— یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ ——— خیال کے اثر سے اردو غزل کو ایک نئی توانائی اور ایک پرعظمت لب و لہجہ ملا۔ سنجیدہ خیالات کو موثر طور پر ادا کرنے کے لئے نئے اسالیب بیان کی تلاش ہونے لگی۔ محبت شعراء نے مضامین کے لئے اپنے اپنے تصورِ حیات سے کسب فیض کیا۔ چنانچہ موجودہ اردو شاعری میں اشتراکی خیالات بھی ملتے ہیں۔ عام انسانی فلاح و بہبود کے نیشنلسٹ بھی اور اسلامی افکار بھی۔ زندگی کا تجربہ بتاتا ہے کہ خیال کی یکسوئی اور عمل تحریک کے لئے آدمی کا دل کہیں اٹکا ہوا ہونا چاہیئے۔ ایک چیز ہونی چاہیئے آدمی جس کی آرزو کر سکے جس کے لئے بیتاب ہو سکے جس کے آگے اپنے دلی جذبات کو پیش کر سکے جس کا ذکر اپنے قلب کو تسکین دے سکے جس سے اپنی امیدیں وابستہ کر سکے جس کی خوشی کے لئے تکلیف جھیلنے میں راحت محسوس کرے جو زندگی کا داعیہ بن سکے۔ اب یہ آدمی کے اپنے ذوق پر منحصر ہے کہ وہ کس کو اپنا دل دیتا ہے اور کس کی آرزو کے سوز و ساز سے اس کی فطرت کا اضطراب مائل بسکون ہوتا ہے ؎

سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عینِ حیات
ہو نہ روشن تو سخن مرگِ دوام اے ساقی

نغمہ و فریاد

ماہر القادری

یارانِ ہوس وقت کے دھارے پہ رواں ہیں
اے حسن! ترے عاشقِ جاں باز کہاں ہیں

دشمن ہیں بہاروں کے، پرستارِ خزاں ہیں
تقدیر سے جو لوگ چمن کے نگراں ہیں

گونجے گا یہاں نعرۂ تکبیر کسی روز
یہ قصر یہ ایوان جو محرومِ اذاں ہیں

مظلوم نہ دیں عدل و مروت کی دُہائی
شاہوں کی طبیعت پہ یہ الفاظ گراں ہیں

دوزخ سے بھی بدتر ہیں غریبوں کے ٹھکانے
جنت ہے زمیں پر کہ امیروں کے مکاں ہیں

اے صاحبِ سجادہ و تسبیح ادھر دیکھ!
ہم بھی تو نظر کردۂ صاحب نظراں ہیں

اُس زہد پہ افسوس نہ ہو جس میں عزیمت
وہ دستِ دعا ہائے! جو بے تیر و کماں ہیں

اس دور میں کچھ خاک نشینوں کی بدولت
باقی ابھی اسلام کی عظمت کے نشاں ہیں

اے چارہ گرو! دُکھتے ہوئے دل کو نہ چھیڑو
رہنے دو مرے دل کے دبے زخم جہاں ہیں

کل تک تھے بصد شوق حرم کے جو نگہباں
سنتے ہیں کہ اب معتکفِ کوئے بتاں ہیں

ہیں فکر و نظر، علم و عمل سب گرِوِ غیر
کیا خوب یہ آزادیٔ کامل کے نشاں ہیں

دیکھو تو ہر اک سمت دھندلکا ہی دھندلکا
اور دعوٰی یہ ہے صبح کے آثار عیاں ہیں

ہو روس کی تہذیب کہ یورپ کا تمدن
یہ کچھ بھی نہیں کارگہِ شیشہ گراں ہیں

ماہرؔ تری باتیں ہیں کہ بجلی کے شرارے
پھر بھی ترے اشعار حقیقت کی زباں ہیں

فردوسِ تغزّل

شیفتؔ ادیبی

میں چاہوں اور اے گردشِ ایام نہ آئے
اک ایسی سحر جس کی کبھی شام نہ آئے

اک چیز کئے دیتی ہے بیدار دلوں کو
اک عزم ہے گو اس کا مجھے نام نہ آئے

مرنے کا کسے حوصلہ ہو راہِ وفا میں
گر موت لئے زیست کا پیغام نہ آئے

ہم عہدِ اسیری کے مزے لوٹ کے سمجھے
آزادہ ہو گا جو تہِ دام نہ آئے

یہ سوچ کے اک راز چھپا رکھا ہے دل میں
اہلِ حرم و دیر پہ الزام نہ آئے

اے شیفتؔ محبت کی امانت تو نہیں ہیں
وہ حوصلے اب تک جو کسی کام نہ آئے

دلؔ تاج محلی

اس طرح کل رات ان کی انجمن میں ہم رہے
جیسے اک غنچہ قریبِ شعلہ و شبنم رہے

شادمانی کی سحر ہو یا کہ شامِ غم رہے
اپنا ہر عالم رہے گا کوئی بھی عالم رہے

وہ مرے لب پر تبسم دیکھ کر برہم رہے
کیا خبر ان کو خوشی کے بھیس میں کیا غم رہے

اتفاقاً بھی نہ پائیں گے اماں اہلِ جنوں
احتیاطاً بھی ترے گیسو اگر برہم رہے

آپ کو کرنا پڑے گی خود ہماری جستجو
اور کچھ دن بے نیازِ جستجو گر ہم رہے

دلؔ مرے مشرب میں دل اس آبرو کا نام ہے
جو غمِ دوراں سے ٹکرائے مگر بے غم رہے

انوار ظہوری

یہ ابھرتے ڈوبتے نکلے سفینے
دھڑکتے ہی رہے موجوں کے سینے

باغ میں شبنم اترے گی
پھول کھلیں یا مرجھائیں

آپ کے ہی روٹھنے سے مجھ کو اندازہ ہوا
دوستی میں بھی غلط فہمی کے امکانات ہیں

صرف تیرے وجود کی تصدیق
اور کیا کام زندگانی کا

جگمگاتے ہیں ستارے چاند برسا ہے نور
روشنی بھی ہے فقط ظلمت نہیں ہر رات میں

صرف اک ہوش کی حالت پہ نہیں ہے موقوف
بے خودی میں بھی ترا نام لیا کرتے ہیں

شمع کے دل میں سوز و درد نہیں
کیوں جلے جا رہے ہو پروانو

روشنی کا سفیر ہوں انوارؔ
ہر نئی صبح کا اجالا ہوں

روحِ انتخاب

مولانا آزاد کی کہانی

خود اُن کی زبانی

یہ غریب الدیار عہد، ناآشنائے عصر، بیگانۂ خویش، نمک پروردۂ ریش، خرابۂ حسرت کہ موسوم بہ احمد و مدعو بابی الکلام ہے سنہ ۱۸۸۸ء مطابق ذی الحجہ سنہ ۱۳۰۵ھ میں ہستی عدم سے اس عدمِ ہستی میں وارد ہوا۔ اور تہمت حیات سے متہم۔ والد مرحوم نے تاریخی نام فیروز بخت رکھا تھا اور مصرعۂ ذیل سے ہجری سال کا استخراج کیا تھا۔

"جواں بخت و جواں طالع، جواں باد"

ساری جواں بختی و جواں طالعی کا معاملہ آج نہیں کل فیصل ہونے والا ہے اصلی فیروزمندی وہاں کی فیروزمندی ہے اور جواں بخت وہی ہے جو اس آنے والے دن کی آزمائش میں پورا اترے اگر وہاں روح و ریحان جنت النعیم اور فوزِ عظیم کی فیروزی و کامرانی کام آئی تو پھر بخت بخت ارجمند ہے اور طالع، طالع بلند۔

آبائی وطن دہلی مرحوم ہے مگر وطن مادری سرزمین مطہر طیبہ، و دار الہجرۃ سید المرسلین و شہرستان نبوت و وحی ہے۔ قبلہ عبادت گذاران عشق و کعبہ نیاز مندان شوق۔

اور وطن حقیقی کے متعلق کیا کہیے کہ بحکم "کن فی الدنیا کانک غریب" ہم سب غریب سرائے ارضی کے آوارہ و مسافر تمام مسافران ہستی ایک ہی قافلۂ غربت کے رہسپار سب کو ایک ہی مستقر و وطن درپیش۔

مولد و منشار طفولیت "وادی غیر ذی ذرع" "عند بیتک المحرم" ہے۔ یعنی مکہ معظمہ زاد اللہ شرفاً و کرامۃً قدوۃ متصل باب السلام جتنی زندگی گذر چکی ہے گردن موڑ کر دیکھتا ہوں ایک نمود غبار سے زیادہ نہیں اور جو کچھ سامنے ہے وہ بھی جلوۂ سراب سے زیادہ نظر نہیں آتا۔ قلم درماندہ تذکرۂ نگارش سے عاجز اور فکر گم گشتہ حیران اظہار تعبیر اپنی سرگذشت و رُوداد عمر لکھوں تو کیا لکھوں؟ ایک نمود غبار و جلوۂ سراب کی تاریخ حیات قلمبند ہو تو کیوں کر ہو؟ دریا میں حباب تیرتے ہیں۔ ہوا میں غبار اڑتا ہے، طوفان نے درخت گرا دیئے۔ سیلاب نے عمارتیں بہا دیں۔ عنکبوت نے اپنی پوری زندگی تعمیر میں بسر کر دی۔ مرغ آشیاں پرست نے اپنے گوشے سے چن کر تنکے جمع کئے۔ خرمن و برق کا معاملہ۔

آنکھیں کھلیں تو عہد شباب کی صبح ہو چکی تھی اور خواہشوں اور ولولوں کی شبنم سے خارستان ہستی کا ایک ایک کانٹا پھول کی طرح شاداب تھا۔ ہر طرف دیکھا تو پہلو میں دل کی جگہ سیماب کو پایا۔ دنیا پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ اس صبح فریب کے لئے نہ تو سوز و تپش کی دوپہر ہے نہ ناامیدی و ناکامی کی شام۔ یہ شہرستان امید و نگارخانۂ نظر فریب صرف ایک ہمارے ہی دیدہ و دل کی کامجوئیوں کی بنا ہے اور گویا گوشہ اور ذرہ ذرہ

ہماری ہولناکیوں کے لئے چشم براہ ہے جس طرف کان لگایا یہی صدا سنائی دی معلوم نہیں کہ اپنی ہی گنبد غفلت اور ہنگامہ ہوش کی گونج تھی یا وگرفتاران طلسم شباب کی ہوش ربائیوں کے لئے خود ساز ہستی کا فریب ہی یہی ہے۔

غفلت و مدہوشی نے افسوں پھونکا۔ سرمستی و گمراہی نے جام بھرے، چند دن شباب نے ہاتھ پکڑا اور ولولوں اور ہوسوں نے جو راہ دکھائی دل کی خود فروشیوں نے اسی کو منزل مقصود سمجھا۔ ہوش خرد کو گو پہلے حیرانی ہوئی لیکن پھر اس نے بھی آگے بڑھ کر اشارہ کیا۔ راہ ہے تو یہی راہ ہے اور وقت ہے تو اسی کا۔

جس طرف نظر اٹھائی ایک صنم آباد الفت و پرستش نظر آیا جس میں مندروں اور مورتیوں کے سوا کچھ نہ تھا، ہر مندر جبین نیاز کا طالب ہر مورتی دل فروشی و سر بازی کے لئے وبال ہوش، ہر جلوہ برق تمکین و اختیار، ہر نگاہ بلائے صبر و قرار۔ الفراق اے صبر و تمکیں۔ الوداع اے عقل و ہوش۔

جس راہ میں قدم اٹھایا زنجیروں اور کمندوں نے استقبال کیا، جس گوشہ میں پناہ لی وہی زندان ہوش و آگہی نکلا۔ ایک قید ہو تو ذکر کیجئے ایک زنجیر ہو تو اس کی کڑیاں گنیئے۔ دل ایک تھا، مگر تیر ہزاروں ہاتھوں میں تھے، نظر ایک تھی۔ مگر جلووں سے تمام عالم معمور تھا۔ ہر کشش نے اپنا تیر چلایا ہر رہزن نے اپنی کمند پھینکی۔ ہر فسوں ساز نے اپنا افسون محبت پھونکا، ہر جلوہ ہوش ربا نے صرف اپنے ہی دام الفت میں اسیر اور اپنی ہی فتراک اسیری کا نخچیر رکھنا چاہا۔

یہ بات نہ تھی کہ امتیاز نے بالکل ساتھ چھوڑ دیا ہو اور دیدہ اعتبار یک لخت کور ہو۔ برق نے بارہا چشمک کی۔ ستاروں نے بھی کبھی کبھی پردۂ شب کی اوٹ سے جھانکا لیکن رات کی تاریکی اور طوفان کی تیرگی ایسی نہ تھی جو ان چنگاریوں سے روشن ہو جاتی وہ برابر بڑھتی ہی گئی۔

گمراہی عمل کی آخری حد فسق ہے اور گمراہی اعتقاد کی الحاد سو فسق نہ الحاد کی کوئی قسم ایسی نہ تھی جس سے اپنا نامۂ اعمال خالی رہا ہو اور فسق خود بھی ایک کامل قسم کا الحاد ہے لیکن دنیا کی ساری سچائیوں اور یقینیوں سے بڑھ کر یہ حقیقت ہے کہ ؎

کار ساز ما بفکر کار ما   فکر ما در کار ما آزار ما

غرضکہ اپنی غفلت پرستیوں کا یہ حال تھا مگر ادھر کار فرمائے غیب کا فیصلہ کچھ اور ہی ہو چکا تھا۔ ناگہاں جاذبۂ توفیق الٰہی پردۂ عشق مجاز میں نمودار ہوا اور ہوس پرستی کی آوارگیوں نے خود بخود شاہراہ عشق و محبت تک پہنچا دیا۔ آگ لگتی ہے تو رفتہ رفتہ شعلے بھڑکتے ہیں۔ سیلاب آتا ہے تو بتدریج پھیلتا ہے، یہ تو ایک بجلی تھی جو آناً فاناً نمودار ہوئی چمکی اور دیکھا تو خاک کا ڈھیر تھا۔

بلاشبہ یہ لغزش تھی لیکن اس لغزش کو کیا کہیے جو محبوب کے قدموں پر گرا دے؟ مقصود تو ساری باتوں سے اس تک پہنچنا ہے اگر لغزش و مستی ہی راہ نمائی بن جائے تو پھر کیوں نہ ہزاروں استقامتیں اسی پر قربان ہوں۔ لاکھوں ہوشیاریاں اس پر نچھاور۔ اصل یہ ہے کہ اس راہ کی کامیابی کا سارا دار و مدار قطع وصل اور شکستگی و پیوستگی پر ہے اور قریب ایک منزل ہے جس تک پہنچنے کی راہ ڈھونڈھی ہیں سے ہو کر نکلی ہے یعنی ایک سے ملنے کے لئے سب کو چھوڑنا اور ایک سے جڑنے کے سب سے ٹوٹنا اس دروازہ کا کھلنا اس پر موقوف ہے کہ وہ تمام دروازے بند کر دیئے جائیں جو جب کھول لئے گئے تھے

تو اصل کام یہ ہوا کہ ساری بندشیں کٹیں اور پرستش ماسوا اللہ کی ساری زنجیریں ٹوٹیں۔ اس کے لئے صرف دو ہی صورتیں ہیں یا تو کوئی ایسا طاقتور ہاتھ، سادہ عقدہ کشائی جو ایک ایک کر کے ایک ایک گرہ کھول دے۔ ایک کے بعد ایک ساری زنجیریں کھلتی جائیں۔ یا پھر ایک تلوار چمکے جس کا ایک ہی بھرپور ہاتھ چشم زدن میں ساری بندشوں اور زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دے۔

نہ ناخن گرہ کشا کی منت پذیری، نہ زنجیروں کی حلقہ شماری کی انتظاری۔ ایک سوکھی لکڑی جلانے کے لئے ہزاروں تدبیریں، تب کہیں آگ دھواں اٹھے لیکن معلوم ہو کہ ہزاروں آشیانوں اور خرمنوں کے لئے بجلی کی ایک ہی نظر شعلہ بار کافی ہوتی ہے۔

تو اس کی گرفتاری بھی گرفتاری اس کا اٹکاؤ بھی اٹکاؤ ہے لیکن بہرحال یہی نفع کتنا بڑا نفع ہے کہ اس کی بدولت کام بہت آسان اور مختصر ہو جاتا ہے اور آنے والی منزل کے سارے کاموں کی مشق پہلے ہی سے ہو جاتی ہے پہلے سو زنجیروں کو توڑنا تھا تو اس کی بدولت اب صرف ایک ہی زنجیر سے چھوٹنے کا معاملہ باقی رہ گیا ہے۔ پہلے ہزاروں چوکھٹوں کی جبہ سائیوں سے پیشانی داغدار تھی کس کس داغ کو مٹاتے۔ کن کن پرستش گاہوں کو ڈھاتے اب خود بخود سب ہٹ گئے۔ صرف ایک ہی چوکھٹ کا نشان سجدہ رہ گیا اور اصلی کام بھی یہی تھا کہ پیشانی ایک ہے تو سجدہ گاہ بھی ایک ہی ہو جب یہاں تک معاملہ پہنچ گیا اور ایک کے لئے سب کو چھوڑنے کا سبق مل گیا تو اس کو بھی مسجود حقیقی کی خاطر چھوڑنا کیا مشکل ہے۔ ممکن ہے کہ ایک جھٹکے میں یہ رشتہ آخری بھی ٹوٹ جائے۔

مانا کہ گرفتاری عشق کی یہ ایک زنجیر بھی پابندیوں کی ہزاروں زنجیروں سے بوجھل ہوتی ہے اور اس کے ترکش کا پہلا تیر پاؤں پر لگتا ہے کہ کسی کے بام بلند تک پہنچنے کے لئے یہی زنجیر کمند کا کام نہ کر جائے کتنے ہی راہ کے خوش قسمت ہیں جنہوں نے سیڑھیوں کا ایک ایک زینہ نہیں گنوایا کہ کمند عشق نے ایک ہی جست میں قصر مطلوب تک پہنچا دیا۔ البتہ یاد رہے کہ سفر کی کامیابی نہ تو منزلوں پر موقوف ہے نہ مختلف راہوں پر، رہ لوٹی ہو قدم میں حرکت، اور ہمت میں اقدام ہے تو کبھی نہ کبھی منزل مقصود تک پہنچ ہی جاؤ گے۔ خواہ راہ میں ہر درخت کے سائے تلے دم لو خواہ ہر سرائے میں گھر بسا لو لیکن ساری نامرادی و بے حاصلی اس کے لئے ہے جس کے لئے راہ و منازل کے تماشے اس طرح دامن گیر ہو گئے کہ وہیں ہمیشہ کے لئے بستر بچھا دیا۔ ہوس و عشق پر کیا موقوف ہے کوئی مذہب و مسلک ہو۔ اگر قدم آگے بڑھنے سے رک گئے تو پھر وہی منزل بہت ہے اور ہر اس کا پرستار۔ تسبیح آرائی و دلق پوشی ہی منزل کیوں نہ ہو کامیابی چلتے رہنے اور بڑھتے جانے کا نام ہے۔

چنانچہ الحمد للہ کہ اس منزل کے وقفہ نے بھی زیادہ طول نہ کھینچا۔ ایک سال پانچ ماہ کے اندر اس کوچہ کے بھی تمام رسم و راہ ایک ایک کر کے دیکھ ڈالے۔ کوئی گوشہ کوئی مقام باقی نہ چھوڑا۔ نہ مجنوں سے ہمعنانی کا سودا ہے نہ فرہاد سے مقابلہ کا دعویٰ۔

اگر اس معاملہ کا خاتمہ بظاہر ناکامی و مایوسی پر ہوا لیکن فی الحقیقت فتح و مراد کی ساری شادمانی اسی ناکامی میں پوشیدہ تھی۔ اسی ناکامی نے بالآخر کامیابی کی راہ کھولی اور یاس سے امید کا دروازہ کھلا جو تاریکی اپنی سیاہ بختیوں کی رات نظر آتی تھی وہی صبح مقصود کے طلعت جہاں تاب کا آفتاب ثابت ہوئی گو قدم بتکدہ کی راہ پر تھے۔ مگر غبار مجاز دور ہو کر کعبہ حقیقت سامنے تھا۔

سارا کام پہلے سے ہو چکا تھا۔ جو لوہا قدموں سے گرم تھا۔ ہوس بازی چنگاریوں کا دیا تھا عشق نے شعلہ بھڑکائے تھے۔ صرف اتنی بات باقی رہ گئی تھی کہ ایک دیگچی اتار کر دوسری چڑھا دی جائے یہ کام عشق کی امیدوں سے نہ ہو سکا تو گویا مشاقہ عشق کی مایوسی نے پورا کر دیا۔

بس الحمد للہ کہ آخر میں جو کچھ پایا اس کے لئے ابتدا کا بھٹکنا کام آیا۔ کوئی ہوشیاری ایسی نہ ملی جس کے لئے اپنی اپنی کوئی نہ کوئی غفلت کام نہ آئی ہو۔ چاک جیب۔ گریباں تک ہے ناقص ہے لیکن اگر وہی دامن تک پہنچ جائے تو اس کے کمال میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔

جس حال میں رہے نقش و تماشا سے دل کو ہمیشہ گریز رہا اور روش عام سے پرہیز۔ یہاں کہیں رہے اور جس رنگ میں رہے کبھی کسی دوسرے کے نقش قدم کی تلاش نہ ہوئی۔ اپنی راہ خود ہی نکالی اور دوسروں کے لئے اپنا قدم رستہ چھوڑا۔ رندی اور ہوسناکی کا عالم تو اس کو بھی ناتمام نہ چھوڑا۔ عشق کی فرہوشیاں [illegible] تو وہاں بھی [illegible] اور کسی گوشے سے اپنے قدم نا آشنا نہ رہے لمحوں کے اندر برسوں کے کام انجام پائے۔

فاران کا عظیم الشّان

"خلافت نمبر"

ماہِ دسمبر ۵۸ء میں منظرِ عام پر آرہا ہے

"فاران" کے اب تک دو خاص نمبر ——— سیرت نمبر اور توحید نمبر ——— شائع ہو چکے ہیں اور اللہ کے فضل سے ان دونوں "خاص شماروں" کو غیر معمولی مقبولیت اور ہر دلعزیزی حاصل ہوئی ہے "خلافت نمبر" بھی ہی اہتمام اور مضامین کے حسن ترتیب اور شان تنوع کے ساتھ انشاء اللہ شائع ہوگا اور اپنے موضوع پر ایک عظیم الشان "دینی پیش کش" ہوگا؟

"خلافت نمبر"

میں خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی مقدس سوانحیات کے علاوہ بعض اہم مسائل اور نازک مباحث پر بھی مضامین ہوں گے۔ یہ مضامین شکوک و شبہات دور کر کے یقین و ایمان کو جلا بخشیں گے۔ اسلام ایک ایسے ہی قلب مبانی کو چاہتا ہے جو وحی الٰہی کے مخاطبین اور کتاب و سنت کے حاملین اور محافظین کی محبت و عقیدت سے معمور ہو۔

"خلافت نمبر"

کے مستقل خریداروں کو "خلافت نمبر" سالانہ چندہ ہی میں ملے گا۔ یہ خاص شمارہ چونکہ خریدار صاحبان کی خدمت میں ذریعہ رجسٹری بھیجا جائے گا۔ اس لئے آٹھ آنے (۸/) کے ٹکٹ دفتر "فاران" کو بھیج دیئے جائیں۔ یہ رقم رجسٹری کے مصارف اور پیکنگ میں صرف ہوگی۔

منیجر "فاران"

کیمبل اسٹریٹ، کراچی ۱

ہماری نظر میں

مسند امام اعظم ابو حنیفہؒ ترجمہ و فوائد:۔ مولانا سعد حسن، ضخامت ۲۰۲ صفحات، مجلد رنگین گرد پوش کے ساتھ قیمت آٹھ روپیہ
ملنے کا پتہ:۔ محمد سعید اینڈ سنز تاجران کتب، قرآن محل، مقابل مولوی مسافر خانہ، کراچی۔

جو کوئی کتاب و سنت کا نہ صرف یہ کہ عالم بلکہ اس میں بصیرت نہ رکھتا ہو، وہ "فقیہ" ہو ہی نہیں سکتا اس لئے کہ فقیہ "کتاب و سنت" ہی سے مسائل کا استنباط اور استخراج کرتا ہے، اور اس کا "قیاس" بھی کتاب و سنت کے منشا کے مطابق ہوتا ہے۔

حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فقیہ بھی تھے اور محدث بھی تھے، امام موصوف کی مسانید کے بارے میں علامہ عبد الوہاب شعرانی اپنی شہرہ آفاق کتاب "المیزان الکبریٰ" میں لکھتے ہیں:۔

کل حدیث وجدناہ فی مسانید الامام الثلثۃ فھو صحیح   امام اعظم کی تینوں مسندوں میں ہم نے جو بھی حدیث پائی وہ صحیح ہے

یہ مسند اردو ترجمے اور حواشی کے ساتھ ہمارے سامنے ہے، اصل کتاب کے جامع و مرتب، مولانا شیخ محمد حامد عابد سندھی انصاری ہیں اس کتاب پر مقدمہ مولانا عبد الرشید نعمانی نے لکھا ہے اور امام اعظم کی زندگی کے مختصر حالات قاری احمد صاحب پیلی بھیتی نے تحریر فرمائے ہیں!

کتاب کا ترجمہ سہل، آسان اور رواں ہے، اور مترجم کے لکھے ہوئے فوائد و حواشی نے تو علمی طور پر اس مسند کی احادیث کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ جناب مولانا سعد حسن نے جہاں حدیث دانی میں اشکال محسوس کیا ہے، اس کی تشریح کر دی ہے اور فقہائے اربعہ کے اختلافات پیش کر کے فقہ حنفی کی پُر زور مدافعت کی ہے، اس سے فاضل مترجم کے فقہی تبحر کا پتہ چلتا ہے! سینکڑوں مسائل میں حاشیہ نگار نے حنفی مذہب ہی کو ترجیح دی ہے اور دوسرے فقہی مذاہب کے عمل کو کمزور بلکہ کہیں کہیں غلط و رد بتایا ہے اور کسی کسی جگہ چٹکی بھی لی ہے اور چوٹ کی ہے، پوری کتاب میں ہمیں یہ دیکھنے کی حسرت ہی رہ گئی کہ کسی مسئلہ میں حنفی مذہب کی بھی کمزوری تسلیم کر لی جاتی، یہ کیسے ممکن ہے کہ ہر مختلف فیہ مسئلہ میں دوسرے "فقہی مذاہب" کا مسلک غلط یا کمزور قرار پائے اور بس حنفی مذہب ہی کو صحت و ترجیح کا امتیاز حاصل رہے۔

صفحہ ۰۰ پر منیٰ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے چار رکعت پڑھنے کا ذکر کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں "من تاہل فی بلد"............ کا ترجمہ "جب کوئی کسی شہر میں رہ پڑے" کے مقابلہ میں زیادہ صحیح ترجمہ "جب کوئی کسی شہر میں شادی کر لے"۔ ہو سکتا ہے، اس لئے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے جب پوچھا گیا کہ آپ نے سفر میں پوری نماز کیوں پڑھی اور قصر کیوں نہیں کیا! تو حضرت ذوالنورین نے یہ جواب دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو کوئی کسی شہر میں شادی کر لے:۔

"فلیصل صلوٰۃ المقیم"

"تو پھر وہ مقیم کی سی نماز ادا کرے" (یعنی قصر نہ کرے)

(صفحہ ۱۶۱) "غرض یہ ہیں مذہب حنفیہ کے یہ سند نگین ستون"۔

"نگین" کا استعمال یہاں بالکل غلط ہوا ہے، "منبر یا مستحکم" کا محل تھا۔

محمد سعید اینڈ سنز نے یہ کتاب چھاپ کر دو دنیا پر بڑا احسان کیا ہے یہ مسند عبادات و معاملات میں دلیل راہ و چراغ ہدایت کا

تذکرہ اولیائے ہند و پاکستان

از مفتی ولی حسن ٹونکی، ضخامت ۱۹۲ صفحات، مجلد رنگین گردپوش کے ساتھ۔ قیمت دو روپے
ملنے کا پتہ:۔ مطبع سعیدی قرآن محل، مقابل مولوی مسافر خانہ، کراچی۔

پاکستان اور ہندوستان کے اکابر صوفیا اور اولیاء اللہ کا اس کتاب میں تذکرہ ملتا ہے، زبان آسان و سہل ہے مگر اس چٹخارے کی جسے ادبیت کہتے ہیں کمی محسوس ہوتی ہے! کتاب کا آغاز دیباچہ کے بعد حضرت خواجہ عثمان ہارونی رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرے سے ہوتا ہے اور حضرت حافظ محمد علی خیرآبادی قدس سرہٗ کے حالات پر کتاب ختم ہو جاتی ہے!

ایک اقتباس:۔

"ایک روز حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کے کسی پیر بھائی کے گھر میں مجلس قوالی تھی۔ آپ بھی اس مجلس میں موجود تھے، باجے کے ساتھ سماع شروع ہوا آپ وہاں سے اٹھ کر چلے بعض دوستوں نے کہا تشریف رکھئے، آپ نے کہا میں نہیں بیٹھوں گا۔ کیونکہ باجے کے ساتھ گانا خلاف سنت ہے، ان میں لوگوں نے کہا کہ سماع سے انکار کرتے ہو، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے بزرگوں کے طریقے سے پھر گئے، آپ نے فرمایا یہ کوئی دلیل نہیں، کتاب و سنت سے دلیل چاہیئے۔ سب سے مقدم کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ہے، حضرت محبوب الٰہی سے جب یہ واقعہ بیان کیا گیا تو آپ نے فرمایا "وہ سچ کہتے ہیں اور حق وہی ہے جو وہ کہتے ہیں" (صفحہ ۴۲)

کاش! ارباب تصوف کے ملفوظات و معمولات میں اتباع شریعت کا یہی رنگ قائم رہتا جب یہ احوال کتابوں میں نظر سے گزرتے ہیں کہ..... بعض مشائخ کی محفلوں اور درباروں میں معتقدین اور مریدین سجدہ تعظیمی بجالاتے تھے، تو سخت خلجان اور اذیت ہوتی ہے۔

صفحہ ۱۸ پر شیخ فخر الدین عراقی کا نام "فریدالدین" لکھا ہے مدیہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے ——— "اینٹ و پتھر سے مارنے لگے، (صفحہ ۱۰۳) اردو کے لفظوں کے درمیان واؤ عطف لانا درست نہیں "اینٹ اور پتھر" لکھنا چاہیئے تھا۔

حضرت مخدوم علاء الدین علی احمد صابری کلیری رحمۃ اللہ کا سنہ پیدائش ۵۵۲ ہجری لکھا ہے، حالانکہ اسی کتاب میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت مخدوم صابر کے پردادا پیر ہیں، ان کا سنہ ولادت ۵۳۷ ہجری مرقوم ہے، ان دونوں بزرگوں کے درمیان کم سے کم سو سال کا بُعد و فصل تو ہونا چاہیئے۔

حضرت صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرے میں لکھا ہے کہ:۔

"کلیر کی تباہی کے بعد آپ کئی سال تک گولر کے درخت کو پکڑے دن رات کھڑے رہے"۔

اس سے تو ایسا مترشح ہوتا ہے کہ حضرت صابر صاحب نے اتنے دن تک نماز ہی نہیں پڑھی! ایک ولی اور تارک صلوٰۃ ہو ——— (معاذ اللہ) یہ کیسے ممکن ہے! معجزات و کرامات کے شوقین لوگوں نے اغلب یہ ہے کہ اس قسم کے حاشیے چڑھائے ہیں۔

اور حضرت صابر صاحب سے تو ایک عجیب و غریب کرامت منسوب کی گئی ہے:۔

"نکاح کے بعد جب رات ہوئی تو دلہن کو آپ کے حجرے میں پہنچا دیا، جب خدیجہ بیگم دلہن سے حضرت صابر کلیری کا نکاح ہوا تھا، کمرے میں داخل ہوئیں تو آپ عبادت الٰہی میں مصروف تھے....... جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو خدیجہ بیگم سے پوچھا تو کون ہے! انھوں نے دست بستہ عرض کیا میں آپ کی بیوی ہوں۔ حضرت مخدوم نے نہایت غضبناک ہو کر فرمایا "خدا تو فرد ہے" بیوی سے اسے کیا واسطہ" آپ کا یہ کہنا تھا کہ زمین سے آگ پیدا ہوئی جس نے دلہن کو خاکستر بنا دیا۔ آپ کی والدہ اس صدمہ کو برداشت نہ کر سکیں اور چند دن تک مرض تپ دق میں مبتلا ہو کر رحلت کر گئیں"۔

اس قسم کے واقعات جب صوفیا کے تذکروں میں نظر سے گزرتے ہیں تو دل لرز جاتا ہے! حیرت ہے کہ مولانا مفتی ولی حسن بھی ان عجائب و غرائب

سے دامن نہ بچا سکے!

دکھنی ہندو اور اردو

از:- نصیر الدین ہاشمی، ضخامت ۱۹۰ صفحات، قیمت تین روپیہ پچاس نئے پیسے۔
ملنے کا پتہ:- سب رس کتاب گھر ادارۂ ادبیات اردو، خیریت آباد۔ حیدرآباد دکن۔

جناب نصیر الدین ہاشمی صاحب تقریباً چالیس سال سے اردو زبان کی قلمی خدمت کر رہے ہیں۔ انھوں نے بڑے کام کی کتابیں لکھی ہیں جن سے آنے والی نسلیں فائدہ اٹھائیں گی، اپنی اس کتاب میں ہاشمی صاحب نے اردو زبان کے ہندو نثر نگاروں، شاعروں، ایڈیٹروں اور دکنیوں کے حالات قلمبند کئے ہیں، جن کی تعداد دو سو بتیس تک جا پہنچی ہے، یہ سب کے سب دکن کی سرزمین سے تعلق رکھتے تھے اور رکھتے ہیں۔

اس تذکرے کو فاضل مرتب نے سات ادوار پر تقسیم کیا ہے پہلا دور ۱۴۲۳ء سے شروع ہو کر ۱۵۹۰ء پر ختم ہوتا ہے اور آخری دور کا سنہ اختتام ۱۹۵۰ عیسوی ہے۔

آنند رام رسؔ کا ایک شعر پڑھیے اور لطف اٹھائیے:- ؎

باغ سے آتی ہے غنچوں کے چٹکنے کی صدا گل کو معلوم نہیں کس کی طلب گاری ہے!

یہ تذکرہ بڑی حد تک اُن تعصب زدوں کے اعتراضات کا دندان شکن جواب ہے۔ جو یہ کہتے ہیں کہ "اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے"!

اس کتاب پر پیش لفظ مسٹر بی رام کرشنا راؤ گورنر صوبہ کیرالا نے لکھا ہے جس سے اردو کی محبت اور بہی خواہی کی خوشبو آتی ہے!

ہندوستان اور پاکستان میں "اردو" کے لئے چاہے کوئی کتنی ہی دشمنی کرے، مگر "اردو" کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی پر انشاء اللہ آنچ نہیں آسکتی۔ اس عالمگیر زبان نے روس اور ترکی تک کو اپنے گھیرے میں لے لیا ہے تو پاک و ہند اس سے دامن کشی کس طرح کر سکتے ہیں جو کوئی اردو کو مٹانے کی کوشش کرے گا وہ خود مٹ جائے گا!!

جہانِ کہن

از:- مولانا فضل احمد غزنوی، ضخامت ۱۲۲ صفحات، قیمت ایک روپیہ
ملنے کا پتہ:- ادارہ تبلیغ الاسلام فضل الکٹرک پرنٹنگ پریس گاڑی کھاتہ، حیدرآباد سندھ۔

یہ کتاب ڈاکٹر برق جیلانی کی تصنیف "جہانِ نو" کے جواب میں لکھی گئی ہے، فاضل مصنف نے ڈاکٹر برقؔ کے اُن اعتراضات کے جواب دیئے ہیں جن میں احادیث رسول کا مذاق اڑایا گیا ہے اور ایسی ایسی بے سروپا باتیں لکھی گئی ہیں، جنہیں پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایک مسلمان حفاظتِ قرآن کے نام پر "بے دینی" کی اس سطح تک بھی آسکتا ہے! (لاحول)

مولانا غزنوی کی تحریر میں کہیں کہیں گرمیٔ بیان کے ساتھ مشتعل کی سی کیفیت بھی پیدا ہو گئی ہے۔ دلائل بہت وزنی ہیں مگر وہ اپنے اظہار کے لئے حسین قالب چاہتے تھے۔

یہ کتاب مصنف کی دینی غیرت کا بولتا ہوا ثبوت ہے: غزنوی صاحب اپنی تحریر کے زور میں منکرین حدیث کے منہ پر مسلسل طمانچے رسید کرتے چلے گئے ہیں ——— لوہے کو لوہا ہی کاٹتا ہے!

ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہی ویسی سنی

مثنوی سحر البیان

مرتبہ:- ظہیر احمد صدیقی (ایم۔ اے۔ علیگ) ضخامت ۲۰۰ صفحات قیمت ایک روپیہ بارہ آنے۔
ملنے کا پتہ:- مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ!

میر حسن کی شہرۂ آفاق مثنوی کو جناب ظہیر احمد صدیقی نے ایڈٹ فرمایا ہے اور اس پر تقریباً چالیس صفحات کا مقدمہ لکھا ہے جس سے

مقدمہ نگار کی خوش ذوقی، شعر فہمی اور ناقدانہ بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔ فاضل و جواں بخت ناقد نے سحر البیان اور گلزار نسیم کا جو موازنہ کیا ہے وہ منصفانہ ہے، اور چکبست و شرر کی معرکہ آرائی کو پیام صلح و آشتی ہے!

یہ مثنوی ۱۱۹۹ھ ہجری میں کہی گئی تھی۔ مصحفی کے قطعہ کے آخری مصرعہ سے تاریخ نکلتی ہے۔ ع

یہ بت خانہ چین ہے بے بدل

مرزا قتیل کا جو قطعہ اس کتاب کے آخر میں درج ہے، اس میں کاتب صاحب کی نوازش سے "بریں مثنوی باد ہر دل فدا" کی جگہ "باد ہر دل خدا" چھپ گیا۔ صفحہ ۸۰ پر "اغماض" کو "اغماز" لکھا گیا ہے، یہ بھی کتابت ہی کی غلطی ہونی چاہیئے۔ کیا عجب ہے کہ اصل مثنوی میں "اغماض" کی جگہ "انداز" ہو۔ یوں، ع

چلیں ایک انداز اور ناز سے

صفحہ ۹۴ پر ایک شعر ہے ؎

پڑا تم پہ ایسا کہو کیا سجوگ   کیا واسطے کس کے تم نے یہ جوگ

"سجوگ" نہیں "سنجوگ" تو ایک لفظ ہندی میں ضرور ہے، مگر اس کے استعمال کا یہاں کوئی محل نہیں "بجوگ" ہونا چاہیئے۔ دوسرے مصرعہ میں "کیا" نہیں "لیا" ہوگا اب اس شعر کو پڑھیئے ؎

پڑا تم پہ ایسا کہو کیا بجوگ   لیا واسطے کس کے تم نے یہ جوگ

میر حسن کی اس مثنوی میں اس بیت کو پڑھ کر حیرت ہوئی۔

اب آگے کہانی کی ہے داستاں   ذرا سننے دل دے کے اس کا بیاں   صفحہ ۱۲

"یہ کہانی کی داستان" کیا بات ہوئی!!

سدا عیش و عشرت سدا راگ و رنگ   نہ تھا زیست سے اپنے کوئی بھی تنگ   صفحہ ۱۵

میر حسن نے غالباً "راگ رنگ" (واو عطف کے بغیر) لکھا ہوگا۔ "راگ رنگ" میں "ناچ گانے" کی طرح "واو" نہیں بولا جاتا۔

زمیں سبز و سیراب عالم تمام   لفظ کو طرادت وہاں صبح و شام   صفحہ

صحیح املا عربی کا "طراوت" ہے یا اردو کا "تراوٹ"!

مقدمے کے صفحہ ۳۵ پر ایک جملہ ہے۔

"حسن کا یہ عالم کہ شاید قدرت نے ہیرو ہیروئن کو پیدا کرنے کے بعد وہ قلم توڑ دیا"

وہ "سانچہ توڑ دیا" لکھنا تھا!

مثنوی کے اختتام پر میر حسن نے جو یہ کہا ہے۔

نہیں مثنوی ہے یہ ایک پھلجھڑی   مسلسل ہے موتی کی گویا لڑی

اس میں تعلی ہے اور نہ مبالغہ ہے۔ میر حسن کی مثنوی سچ مچ زبان کی پھلجھڑی بھی ہے اور معانی کے موتیوں کی لڑی بھی!

نکالا گیا ہے توقع سے زیادہ کامیاب اور شاندار ہے، مرتب و ناشر کے لئے دل سے دعا نکلی۔

فاضل مرتب کا اداریہ "دستورِ حیات" ایک متوازن اور معلومات آفریں مقالہ ہے، اس کے بعد —— قانون اور اصولِ قانون۔ اسلام کا تصورِ قانون —— اسلامی قانون کا تقابلی مطالعہ —— ماخذ قانون اسلامی —— —— تاریخ قانون اسلامی دستور، شعر، نظم و شعر، مضامین کے ابواب و عنوانات ہیں۔

جس "خاص نمبر" کے مضمون نگاروں میں،۔

ڈاکٹر عبدالقادر عودہ شہید، سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا امین احسن اصلاحی، ڈاکٹر محمد حمید اللہ، علامہ مصطفیٰ زرقا، ڈاکٹر صبحی محمصانی، سر الفریڈ ڈیننگ اور پروفیسر شاخت جیسی عظیم شخصیتیں شامل ہوں، اس کی کامیابی میں کون شک کر سکتا ہے! ایک سے ایک بہتر مقالہ، بلندی کے ساتھ عمق بھی! اس سلک گہر میں خزف ریزے آنے ہی نہیں دیئے! خالص موتی ہی موتی پروئے اور چنے گئے ہیں!

یوں تو ہر مقالہ اپنی جگہ خوب ہے مگر ڈاکٹر مصطفیٰ زرقا کا مضمون —— "اسلامی فقہ کے ماخذ" —— اس خاص نمبر کی جان ہے۔۔

چراغ راہ کا "اسلامی قانون نمبر" اقامتِ دین کی جدوجہد اور اسلامی دین کو غالب کرنے کی سعی و عزیمت کا مرحلۂ آغاز اور سنگِ بنیاد ہے اس رسالہ کو پڑھ کر اسلام کے قانون کی ہمہ گیری اور جامعیت کے گہرے نقوش دل و دماغ پر ثبت ہوتے ہیں۔

نظموں کا حصہ بھی موضوع کی سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے خاصہ دلچسپ ہے، قدیم و جدید شعرا کی نظموں کے انتخاب نے تنوع پیدا کر دیا ہے۔

صفحہ ۲۸۳ پر ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی یہ عبارت بہت کھٹکی :۔

"آپ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) جہاندیدہ تھے، کئی بار شام، کئی بار یمن و حباشہ، اور کم از کم ایک بار عمان (قبیلہ عبدالقیس یعنی بحرین و عمان) کا سفر فرما چکے تھے۔ جیسا کہ مسند ابن حنبل میں مذکور ہے، بحری سفر کا بھی ایک مرتبہ حبش جانا بھی مکتوب نبوی بنام حبشی کے متعارفانہ انداز وغیرہ سے مستنبط ہوتا ہے اگرچہ کوئی صریح تائید میں حوالہ نہیں ملتا اس تجربہ کا اثر دوسری پر تو نہیں لیکن جتنا رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی صواب دید میں قانون سازی پر پڑ سکتا ہے"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ادیب، مفکر اور جہاندیدہ جیسے القاب منسوب کرنا مناسب نہیں —— "حضور کا حبش کا سفر" بھی فاضل مضمون نگار کی محض قیاس آرائی ہے —— اور حضور کے "اسفار" نے تجربہ سے قانون کی تدوین پر اثر پڑنے کی "نکتہ آفرینی" بھی منصب نبوت سے فروتر ہے!

(۱) دو مضمونوں میں یہ بات کہ، گویا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مناسک حج میں جاہلیت کی بعض رسموں اور طریقوں کو باقی رکھا، —— —— خود حج "اپنی جگہ پر کوئی رسم نہ تھی۔ بلکہ حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کے زمانے سے یہ اسلامی تقریب عرب میں چلی آ رہی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے انہی قدیم طریقوں و مناسک کو باقی رکھا ہوگا، جو دین ابراہیمی کی "باقیات الصالحات" کے طور پر عربوں میں پائے جاتے تھے، چاہے عرب اور خاص طور سے کفار قریش ان مناسک کے اصل و ماخذ سے بے خبر ہوں!

"اسلامی قانون نمبر" ہر اعتبار سے کامیاب ہے، یہ خاص شمارہ اس قابل ہے کہ مسلمانوں کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ میں زیادہ سے زیادہ پھیلایا جائے، اس کے بعض مضامین کے دوسری زبانوں میں ترجمے ہونے چاہئیں! شعور و تجربہ اور علم و خبر کے اس دور میں یہ شمارہ نہ صرف یہ کہ چراغ ہدایت ثابت ہوگا بلکہ اسلام کی علمی عظمت کے جھنڈے گاڑے گا!

اور —— —— یہ تو ہمارا اندازہ ہے۔ اس وقت تک اس نمبر کی دوسری جلد زیر ترتیب ہے مرتب و ناشر ... آنے والی ہے

"نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول"

کی مصداق ہوگی۔ ان شاء اللہ۔

سہ روزہ "منہاج" مدیر: محمد اسحاق، ضخامت آٹھ صفحات۔ سالانہ چندہ چھ روپے ششماہی چار روپے، فی پرچہ دو آنے
ملنے کا پتہ:- "منہاج" شیش محل روڈ، لاہور۔

جناب مولانا محمد اسحاق صاحب "الاعتصام" کو مرتب فرماتے تھے، اب آپ نے سہ روزہ "منہاج" جاری کیا ہے، جو کئی مہینہ سے پابندی کے ساتھ نکل رہا ہے "منہاج" دینی فکر اور اسلامی اقدار کا محافظ ترجمان اور علمبردار ہے، اس کے اداریئے اور شذرے خاصے جاندار ہوتے ہیں، مولانا محمد اسحاق صاحب قابل مبارکباد ہیں کہ اس دورِ تشکیک و انکار میں وہ "ایمان و یقین" کے تقاضوں کو پورا کر رہے ہیں۔

شہید کربلا از:- قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی۔ ضخامت ۱۱۲ صفحات، رنگین سرورق۔ کتابت و طباعت معیاری اور دیدہ زیب
قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ:- مکتبہ علمیہ قاضی واڑہ، میرٹھ۔ پاکستان میں:- کوثر بک ایجنسی، سی ۱/۱ شاہ عالم مارکیٹ، لاہور۔

جناب مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی نے بڑی محبت اور عقیدت کے ساتھ "شہادت نامہ" مرتب فرمایا ہے اور امکانی حد تک تاریخی واقعات کی ثقاہت کو بھی ملحوظ رکھا ہے! یہ کتاب اس قدر اثر انگیز ہے کہ مطالعہ کے دوران میں ان گناہگار آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی!

"منافقوں نے ایک سازش کی، انھوں نے انس رکو یہ پٹی دی (صفحہ ۱۰) "پٹی پڑھانا" روزمرہ ہے، دھوکہ دینا، پھانسہ دینا، اور بہکا دینا، البتہ بولا جاتا ہے۔

اس کتاب کا آغاز "خلافت راشدہ" سے ہوتا ہے اور "حضرت امام کے پیغام" پر کتاب ختم ہو جاتی ہے، اس کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے دو مضمون کتاب میں شامل کئے گئے ہیں۔

کوئی شک نہیں حضرت امام حسین علیہ السلام نے "سلطان جائر" کے مقابلہ میں حق کے کلمہ کو بلند فرمایا تھا، اور یہ جنگ دین کے لئے ہی کی گئی تھی، ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس نواسہ پر "دنیا طلبی" کا الزام لگا کر اپنے ایمان کو جوکھوں میں نہیں ڈال سکتے، ہر صاحب ایمان کے دل میں یزید کے خلاف نفرت کے جذبات اور امام عالی مقام کے لئے احترام و عقیدت کی گنجائش ہونی چاہئے!

یہ کتاب اہل بیت کرام کی محبت و عقیدت کی خوشبو سے بھی ہوئی ہے واقعات کو تاریخی ترتیب کے ساتھ جمع کیا گیا ہے، انداز نگارش بھی اثر انگیز ہے، مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی اس کتاب کی ترتیب و تالیف پر تبریک و تحسین کے مستحق ہیں۔

معجم الاعظمی از:- محمد حسن الاعظمی، حصہ اول ضخامت ۲۲۸ صفحات۔ حصہ ثانی ضخامت ۱۲۰۳ صفحات (قیمت درج نہیں)
ملنے کا پتہ:- مکتبہ اعظمیہ گاندھی گارڈن کراچی۔

جناب محمد حسن الاعظمی صاحب نے عربی زبان و ادب کی خدمت کو اپنی زندگی کا موضوع اور مقصود بنا لیا ہے، اُن کی ساری عمر عربی پڑھنے اور پڑھانے میں صرف ہوئی ہے! انھوں نے عربی زبان میں کئی درجن کتابیں تالیف کی ہیں اور عربی زبان کی ترقی و ترویج کے لئے کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتے ہیں!

معجم الاعظمی عربی اردو کی مختصر مگر جامع لغت ہے، ہزاروں صفحہ کی لغت کی ترتیب و تدوین کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے، فاضل

مرتب نے برسوں کاوش کی ہے، جب یہ معجم (لغت) مرتب ہوئی ہے ——— ایک نمونہ ———

• **ھَلَّا** کلمۂ تخصیص و تندیم ہے، اور "ھل" اور "لا" سے مرکب ہے۔ اگر ماضی پر داخل ہو تو ترک فعل پر ملامت کے لئے! جیسے "ھلّا آمنت" یعنی تم کیوں ایمان نہیں لائے، اور اگر مضارع پر داخل ہو تو برانگیختہ کرنے کے لئے، جیسے "ھلّا تؤمن" "تم ایمان کیوں نہیں لاتے"۔

کوئی شک نہیں "معجم الاعظمی" ایک کارآمد لغت ہے، اور طلبا ہی نہیں پاکستان اور ہندوستان کے علما بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں! حسن الاعظمی کی یہ محنت اور کاوش قابل داد ہے۔

تقویۃ الایمان

از: مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ۔ ضخامت ۱۰۲ صفحات، مجلد، رنگین گرد پوش کے ساتھ قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ: اشاعۃ السنہ مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان، شیش محل روڈ، لاہور۔

• "تقویۃ الایمان" اردو زبان کی اُن چند کتابوں میں سے ہے، جن کی شہرت "ضرب المثل" بن گئی ہے۔ یہ شہرۂ آفاق کتاب ہزاروں نہیں لاکھوں کی تعداد میں شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہے، مخالف اور موافق دونوں گروہوں نے اس کو پڑھا ہے۔ مخالفین نے اس کے لکھنے والے پر کفر کے فتوے لگائے ہیں اور موافقین نے اس کے مصنف سے ماحیٔ شرک و بدعت اور حامیٔ کتاب و سنت کے القاب منسوب کئے ہیں، اور حق یہ ہے کہ مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ماحول کے خلاف شرک و بدعت کے رد میں زبان و قلم سے جو جہاد کیا وہ اسلامی تاریخ کا باب زریں ہے! اور پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو "جہاد بالسیف" کی توفیق بھی عطا فرمائی اور وہ جام شہادت نوش کر کے اس عالم قدس میں پہنچ گئے، جہاں شہدا "حیات ابدی" کا لطف اٹھاتے ہیں! ع

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

اس کا ہمیں اعتراف ہے کہ توحید کے جوش میں حضرت شاہ شہید کے قلم سے کہیں کہیں اونچ نیچ بھی ہو گئی ہے ذرا بھی غیر محتاط عبارتوں کو مخالفین لے اڑے اور رائی کا پربت بنا دیا! مگر شاہ صاحب کی نیت بخیر تھی، ان کا تو مشن ہی یہ تھا اور ان کی ساری زندگی اسی جدوجہد میں صرف ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "سنت" قائم و زندہ ہو۔ جو شخص سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اس قدر فدائی اور متبع ہو، وہ بھی حضورؐ کی اہانت کا تصور بھی اپنے قلب و دماغ میں لا سکتا ہے..

"تقویۃ الایمان" مولانا اسمٰعیل شہید قدس سرہٗ کی سب سے زیادہ مشہور اور کامیاب ترین اردو تصنیف ہے، زبان و ادب کے اعتبار سے بھی ایک مثالی کتاب ہے، اب سے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے جبکہ اردو نثر کا بہت ہی کم چلن تھا، اور اردو پر عربیت اور فارسی کا غلبہ تھا، اس قدر سادہ سہل اور آسان اردو میں دینی مسائل کا بیان کر دینا، زبان کا معجزہ ہے!

"تقویۃ الایمان" مرزا غالب کے خطوط سے کم و بیش نصف صدی قبل تصنیف ہو چکی ہے۔ کیا عجب ہے کہ غالب نے اپنی نثر کی ساخت میں "تقویۃ الایمان" سے استفادہ کیا ہو!

"تقویۃ الایمان" شرک و بدعت کے رد اور کتاب و سنت کی حمایت میں ایک گرانقدر دستاویز ہے، شرک و بدعت کا زور توڑنے میں اس کتاب نے اہم ترین پارٹ انجام دیا ہے، اہل بدعت کو جتنی چڑ اس کتاب سے ہے، شاید ہی کسی اور کتاب سے ہو، اس لئے کہ اس کتاب میں جگہ جگہ ان کی دکھتی ہوئی رگیں شکنجے میں آگئی ہیں!

اس کتاب کو از سرِ نو ترتیب و تہذیب کے ساتھ شائع کیا گیا ہے، مفید اور کارآمد حاشیے اور قوسین میں ضروری تشریح بھی کر دی گئی ہے، صفحہ ۲۹ پر "نزع و اختصار" کتابت کی غلطی ہے "احتضار" ہونا چاہئے۔ صفحہ ۶۰ پر یہ عبارت پڑھ کر حیرت ہوئی:

"یعنی اے شیخ عبدالقادر! مجھ دو تم اللہ کے واسطے، یہ لفظ نہ کہنا چاہیے، اگر یوں کہے "یا اللہ مجھ دے شیخ عبدالقادر کے واسطے" تو بجا ہے"

حالانکہ کتاب و سنت میں جو دعائیں ملتی ہیں، ان میں براہ راست اللہ تعالیٰ سے خطاب ہے اور کسی نبی، ولی، یا فرشتہ کا واسطہ نہیں دیا گیا۔ دعا کا یہی طریقہ منصوص اور مسنون ہے!

جذب و گریز از:۔ بشیر درانی۔ ضخامت ۱۲۰ صفحات، مجلد (سنہری ڈائی) قیمت تین روپے،
ملنے کا پتہ:۔ بشیر درانی، کوارٹر نمبر ۳۲، سعود آباد ۲ کراچی!

جناب بشیر درانی ایک خوش گو شاعر ہیں۔ اُن کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا ترنم اور نغمگی ہے! بشیر صاحب اردو کی پڑھی دنیا کے لئے ایک غیر معروف شاعر ہیں، اس لئے کہ رسالوں میں ان کی کبھی کبھار دو چار غزلیں چھپی ہیں تو وہ نہ چھپنے کے برابر ہیں، جتنے لوگوں میں بھی وہ متعارف ہیں ان کا ذریعہ بس مشاعرے ہیں! اُن کے مجموعۂ کلام پر حضرت جگر مراد آبادی، مولانا حامد حسن قادری، جناب رئیس امروہوی اور ماہر القادری نے تو... لکھی ہیں، حضرت جگر کی رائے ان کے کلام کے بارے میں یہ ہے،

"بشیر صاحب درانی پوری شاعری کیفیات زمانۂ ... سے بھرپور ہے .... اور میرا اور ان کا انداز فکر مشترک ہے...... اور یہ میرے عزیز ترین دوست بھی ہیں اور عزیز ترین شاگرد بھی"

بشیر درانی کے کلام کے لئے اس سے بڑی سند اور کیا ہو سکتی ہے!

ان چند شعروں سے بشیر کے کلام کی خوبیوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

مگر کوئی سننے کی بھلا کیا تاب لائے گا
مرا افسانہ خود مجھ سے بھی دُہرایا نہیں جاتا

مرے دل میں یہاں تک احترام حسن و الفت ہے
عدو کو بھی تری نسبت سے ٹھکرایا نہیں جاتا

کہاں حوادث دوراں نے لاکے چھوڑ دیا
مرے خدا، یہ زمیں ہے نہ آسماں اپنا

اللہ رے کرامتِ حسن جنوں نواز
جس میں ذرا بھی عقل تھی دیوانہ ہو گیا

مجھے بزم سے اٹھا دو یہ نہیں مجھے گوارا
کبھی اس طرف اشارا! کبھی اس طرف اشارا

یاد ایام کہ دنیا پہ ہنسا کرتے تھے
آج رو کے نہیں رکتے ہیں ہمارے آنسو

اعتبار وعدۂ فردا کے بعد
زندگی خود ہی قیامت بن گئی

یہ عشق کی ضد ہے کہ اسے جلوہ نما دیکھ
اور حسن یہ کہتا ہے کہ پردہ نہ اٹھا دیکھ

مجھے منزلوں کا ملال کیا، مری گمرہی کا سوال کیا
کہ ہجوم شوق ہے راہبر نہیں راہبر تو نہیں سہی

یہ بجلی باغباں ہے یا مری قسمت کی کوتاہی
مرا گلشن بھی دیکھیں میرا داماں دیکھنے والے

جان دے دی جس نے تیرے نام پر
آج تک زندہ ہے تیرے نام سے

آنکھ بے مایہ نہ ہوتی تو بتا سکتا تھا!
کیا تعلق ہے ترے گوشۂ داماں سے مجھے

پھول نظارۂ شبنم کو ترس جائیں گے
یہ توقع تو نہ تھی ابر بہاراں سے مجھے

دم آنکھوں میں ہے کار دزیہ پہ نظر ہے
وہ آ جائیں تو قصہ مختصر ہے

برسے ہیں میکدے ابرِ کرم ہے بادہ خواروں پر — کوئی چھینٹا نہ پڑ جائے کہیں پرہیزگاروں پر

قیامت ہے یہ توبہ کی جواں مرگی قیامت ہے — ادھر کی میں نے توبہ اور اُدھر ابرِ بہار آیا

بشیر اس سے کوئی پوچھے کشاکش کفر و ایماں کی — جو کافر ہی رہا اور عمر کعبہ میں گزار آیا

مجھے بھی لذتِ طاعت ملی مگر، زاہد! — تجھے گناہ سے پہلے مجھے گناہ کے بعد

حجاباتِ تعین درمیاں سے اٹھتے جاتے ہیں — نہ جانے کون اب کس کے مقابل ہوتا جاتا ہے

کوئی اور تجھ کو سنا سکا تو سنا کیا مری داستاں — ترے رعبِ حسن کی مصلحت کہ مجھی کو اذنِ بیاں نہیں

دشمنِ دل ہی نہیں دشمنِ جاں ہوتا ہے — اُف! وہ احساس، جو پیری میں جواں ہوتا ہے

کم رُخی حسن کی بہتر نہ سمجھنے والے — اوجِ خورشید مسافر پہ گراں ہوتا ہے

چھین لے اب کوئی تاثیر مرے نالوں سے — تیرے مظلوم پہ ظالم کا گماں ہوتا ہے

جب کبھی سوئے چمن برق چمکتی ہے بشیر
دل اسیروں کا خدا جانے کہاں ہوتا ہے

ناکردہ ستم آپ کا دل کس لئے دھڑکا — تحسین کرم شکوۂ بیداد نہیں ہے

میں ہوں وہی وارفتہ انجام تمنا — آج اپنی تمنا بھی جسے یاد نہیں ہے

بڑھتا جاتا ہے بہ ہر لحظہ خمارِ مئے غم — اور مجھے ہوش سا آتا ہے خدا خیر کرے

ترے فراق میں کاٹی ہیں چاندنی راتیں — سفر کیا ہے شراروں کے درمیاں میں نے

جنوں میں جب کرمِ دستِ ناز یاد آیا — گلے میں ڈال لیں دامن کی دھجیاں میں نے

صفحۂ ہند سے اردو کو مٹائیں وہ بشیر
مطمئن ہوں کہ مرے منہ میں زباں باقی ہے

دوسرا رُخ :-

وہ فرماتے ہیں مجھ سے تیرے دل میں ہو قیام اپنا — یہی میں ہوں تو کعبہ خود ہی کرے احترام اپنا (صفحہ ۲۷)

شعر کے مرکزی تصور کی خوبی سے انکار نہیں مگر اس مفہوم کو جس پیرایہ میں ادا کیا گیا ہے، اس میں بڑا تکلف پایا جاتا ہے ——— "یہی میں ہوں" اس شعر میں "اگر سچ مچ ایسا ہی ہے" کی جگہ استعمال ہوا ہے۔

تیرے ملنے سے پہلے کیا کہوں کیا کیا ارادے تھے — ترے ملتے ہی برہم ہو گیا حسن عدم اپنا (صفحہ ۲۷)

حُسنِ نظام کیا بات ہوئی! کہنا یہ چاہیئے تھا کہ محبوب کے ملتے ہی شیرازۂ حیات یا نظام شعور و احساس برہم ہو گیا۔

ہزار جوشِ نمو صرفِ رنگ و بو ہو کر — بتا سکی نہ پتہ شاخِ آشیاں اپنا (صفحہ ۲۹)

مصرعہ اولیٰ کتنا شگفتہ اور شاندار ہے۔ مگر ثانی مصرعہ ثانی اس کے جوڑ کا نہیں ہے ——— اور پھر شاخِ آشیاں کا پتا نہ بتا سکنا یہ ایک عجیب مفہوم و خیال ہے!

سوئے گلشن کبھی سوئے رُخِ تاباں ہونا — نکہتِ گل کو بہ ہر حال پریشاں ہونا (صفحہ ۳۱)

اس شعر میں مصرعہ ثانی جتنا خوب ہے، اتنا ہی مصرعہ اولیٰ کمزور ہے۔ "نکہت گل کا سوئے رُخ تاباں ہونا" یا لکل بے جوڑ سی بات ہے

خود شمع وقفِ سعیٔ سکوں ہوگئی بشیر جب امتیازِ جرأت پروانہ ہوگیا (صفحہ ۳۲)

شاید کتابت کی غلطی کے سبب "امتحان" کی جگہ "امتیاز" چھپ گیا! شمع کا "وقفِ سعیٔ سکوں" ہونا بھی محلِ غور ہے۔

کبھی بشیر کو محبوب التجا نہ کیے طلب شناسیٔ چشمانِ یار کیا کہنا (صفحہ ۳۵)

"طلب شناسیٔ چشمانِ یار" عجیب ترکیب ہے! چشم کی جمع "چشمان" اس شعر میں کتنی ناگوار محسوس ہوتی ہے۔

آ دبل جُل کر فزدوں افسانۂ موسیٰ کریں تم کبھی پردہ اٹھاؤ، ہم کبھی پردہ کریں (صفحہ ۳۷)

شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ افسانۂ موسیٰ کو اور آگے بڑھائیں اور اس میں اضافہ کریں ——— مگر "فزدوں" نے اس مفہوم کی صحیح طور پر ترجمانی نہیں کی!

خیالات باطل سے بہلا رہا ہوں جہاں حُسن بھی جا کے گم ہوگیا ہے (صفحہ ۳۹)

پورا شعر ایک چیستاں سے کم نہیں۔

کہاں میں اور کہاں مرگ و زیست کے جھگڑے اسیر پنجۂ الزام نارواہوں میں (صفحہ ۴۰)

شاعر آخر کہنا کیا چاہتا ہے!

ہوا کریں تری رعنائیاں جہاں آرا ظہورِ اہلِ بصیرت نہیں تو کچھ بھی نہیں (صفحہ ۴۵)

اس قسم کا ابہام اور بلکہ اہمال بشیر درانی کے شعروں میں کہیں کہیں ملتا ہے ——— اس شعر کی معنویت کو "ظہور" نے غارت کیا ہے!

مرے سکوں کی حکایتوں کو، نظامِ نو کی ستائشوں کو

لباسِ صادق میں لانے والے فریب کاروں کو دیکھتا ہوں صفحہ ۵۰

اسے کہتے ہیں "مفہوم الشاعر فی بطنہ" اس شعر میں "لباسِ صادق" کتنی مہمل ترکیب استعمال کی گئی ہے۔

یہ کرم شکست نما نہیں جو نظر میں گردِ ملال ہے ترے زعمِ حُسن کی خیر ہو مری زندگی کا سوال ہے (صفحہ ۶۲)

مصرعہ اولیٰ ایک پہیلی ہے، جسے بس بوجھتے ہی رہیے!

حریصِ دیدہ منت کشِ وصال ہوں میں جلیسِ مجلسِ رعنائی خیال ہوں میں (صفحہ ۶۳)

"جلیس" اس شعر میں کتنا اکھڑا اکھڑا لگتا ہے۔

بہت دنیا کو میرے ہوش میں لانے کی کوشش کی اگر دنیا سے کہدی لذتِ دیوانگی میں نے (صفحہ ۷۶)

اس قدر الجھا ہوا مفہوم ——— توبہ!

جاں نثار تا ثرِ مژگاں مجھ کو کانٹوں پہ نیند آتی ہے (صفحہ ۷۹)

مصرعہ اولیٰ کس قدر غیر شاعرانہ ہے!

یہ آئینہ ترے رُخ کا جواب کیا ہوگا نہ ہو شراب تو جامِ شراب کیا ہوگا (صفحہ ۸۹)

سہرغول میں اس قدر بے ربطی اور پریشاں خیالی!!

چمن میں کیا خزاں کا دور کامل ہوتا جاتا ہے کہ ہر جانب ہراخونِ عنادل ہوتا جاتا ہے (صفحہ ۱۰۰)

ایسا "اہمال" جس سے ذوقِ شاعرانہ کو اذیت محسوس ہو!

یہ سب سرگرمیاں دو چار پروانوں کے دم سے ہیں فروغِ شورشِ محفل نہیں ہے شمعِ محفل سے (صفحہ ۱۰۱)

• شورشِ محفل کی جگہ گرمیٔ محفل کہنا تھا!

مبارک مجھے راحتِ خلوتِ ہُو کوئی شے یہاں آتی جاتی نہیں ہے (صفحہ ۱۰۶)

حیرت ہے کہ اس قسم کے اُلجھے ہوئے شعر شاعر نے اپنے مجموعہ کلام میں باقی کیسے رہنے دیئے!

میرے زمانہ کی دلّی (حصہ اول)

از:- مُلّا واحدی، ضخامت ۳۴۴ صفحات (مجلد سنہری ڈائی) قیمت تین روپے آٹھ آنے۔
ملنے کا پتہ:- دفتر نظام المشائخ ۲۱/۸ جیکب لائنز کراچی۔

یہ کتاب دلّی کے تمدن و معاشرت کی تاریخ بھی ہے اور دلّی مرحوم کا مرثیہ بھی ہے۔ ملّا واحدی کا قلم اور دلّی کی کہانی، اسے دلچسپ اثر انگیز ہونا ہی چاہیئے، ان کے قلم نے گلفشانی بھی کی ہے اور اشکباری بھی۔ لکھتے ہیں:-

"بچوں سے اتنے عرصے سے واسطہ نہیں رہا جتنے عرصہ دلّی سے واسطہ رہ چکا ہے"

دلّی سے مصنف کا یہی قلبی تعلق... کاغذ پر پھیل کر ایک اثر انگیز داستان بن گیا ہے!

اعلانِ آزادی کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کی کیا پوزیشن ہو گئی، اس کی فاضل مصنف نے کتنی صحیح ترجمانی کی ہے۔

"۱۵ اگست کو میں نے سچ مچ اپنے تئیں آزاد تصور کیا تھا۔ میں پھولا نہیں سماتا تھا کہ مجھے بھی اللہ تعالیٰ نے مرنے سے پہلے آزادی کی صورت دکھا دی میں خیال کرتا تھا کہ پاکستان میں صرف مسلمان اور ہندوستان میں صرف ہندو اور سکھ آزاد نہیں ہوئے ہیں، دونوں سلطنتوں کے کل باشندے آزاد ہوتے ہیں مگر اگست کا مہینہ گزرنے نہ پایا تھا کہ جو محسوس ہونے لگا کہ میں تو اور بندھ گیا، میری محکومی اور بھی آزاد اُبھر آئی۔ انگریزوں کے دور میں اس قدر احساس کمتری نہ تھا جس قدر آزادی کے زمانہ میں ہو رہا تھا"

"میں سرکل راشننگ آفس جاتا، میرا ہندو اور سکھ عملہ مجھ سے ہمیشہ کی طرح پیش آتا۔ اس سرکل کا میں انچارج تھا لیکن چاروں سمت فضا اتنی خراب تھی کہ میں اپنے ہندو اردلی کی بابت سوچنے لگتا کہ یہ سلام کے لئے جھک رہا ہے یا میرا مذاق اڑا رہا ہے"

اس عبارت کی تاثیر دیکھئے:-

"ہم دلّی سے چلے ہیں تو ہمیں رخصت کرنے والے صرف دو تھے۔ حسینی اور میرو۔ اُن کا رونا ہمارے دل پر نقش ہے اور ہماری جدائی کا ان کے دل پر نقش ہے، ۱۹۵۵ء میں میری لڑکی اور داماد (شاکرہ اور شریف) اور میاں علی مقتدی واحدی دلّی گئے تو حسینی اور میرو لے انہیں پھولوں اور گوٹے کے ہاروں میں لاد دیا، اور بچوں کا ان کے سامنے ڈھیر لگا دیا۔ میں دلّی یوں بھی نہیں جاتا کہ حسینی اور میرو کا بدلہ اتارنے کے لائق، دلّی میں روپیہ یہاں سے لاؤں گا"۔

حضرت مولانا محمد ایوب دہلوی کے علم و فضل اور دانش و تبحر پر چند لفظوں میں کتنا جامع تبصرہ کیا ہے:-

"کسی کو اپنی عقل پر گھمنڈ ہو تو وہ مولانا محمد ایوب کی تقریریں سُن لے۔ اُسے اپنی عقل کی بے بضاعتی نہیں نفسِ عقل کی بے بضاعتی کا پتہ لگ جائے گا"

خواجہ حسن نظامی مرحوم محنتی اور جفاکش تھے مگر کثیر الاشغال تھے۔ پر واحدی صاحب نے کس خوبصورتی کے ساتھ تبصرہ فرمایا ہے۔

"خواجہ صاحب کی محنت کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا، ان کا بس چلتا تو شاید رات کا سونا بھی ترک کر دیتے، ان کے کاموں کی

میر تقی اور مرزا غالب کے کلیات سے تشبیہ کرتا ہوں، اتنا کام کرنے والے کے سارے کام ایک معیار پر نہیں اتر سکتے جس طرح میر تقی[1] اور مرزا غالب کا سارا کلام ویسا نہیں تھا جیسا کہ ان کا منتخب کلام ہے، اسی طرح خواجہ صاحب کے کاموں کے کلیات کا انتخاب کرنا چاہیے، انتخاب میں اس قدر کام باقی رہ جائے گا کہ عصر حاضر میں اس قدر کام کرنے کی مثال دستیاب نہیں ہو گی، خواجہ صاحب کو کام کرنے کا چسکا تھا ـــ چاہتے تھے یہ بھی کر لوں، اور وہ بھی کر لوں خواجہ صاحب اسے نہیں سوچتے تھے کہ کون سا کام ان کے کرنے کا ہے اور کون سا کام ان کے کرنے کا نہیں ہے"۔

دلی میں پھل، فالودہ، شربت اور مٹھائی بیچنے والے پھیری میں "آوازیں" لگا کر اپنی چیزیں بیچا کرتے تھے، اُن بولیوں اور آوازوں کا مصنف نے اپنی کتاب میں ذکر کر کے "فسانۂ عجائب" کا رنگ پیدا کر دیا ہے۔

"لیکن امن ٹوٹنے کا ہر آن امکان ہے" (صفحہ ۸) "امن ٹوٹنا" ترجمہ سا معلوم ہوتا ہے ـــ "حکیم نابینا مریض سے دواؤں کی قیمت بھر مٹھی لیتے تھے" (صفحہ ۱۲۶) "بھر مٹھی" وجدان کو کھٹکتا ہے۔ "منہ مانگی قیمت کا محل تھا۔" "جب وہ وجہیں ختم ہو گئیں تو خواجہ صاحب نے محل سرا کو نواب صاحب کے نام کر دیا" (صفحہ ۱۲۹) "وجہیں" کی جگہ کاش! کوئی اور لفظ ہوتا ـــ "اور پھر ان زبرد کے داماد کی بیوی کو قطعی بیٹا بنا لیا" (صفحہ ۱۷۷) "سچ مچ" لکھنا تھا "قطعی" یہاں ٹھیک استعمال نہیں ہوا "اور روزنامہ ہمدم کے کُل کلاں مختار بنا دیئے گئے" (صفحہ ۳۱۴) "کُل کلاں" (آئندہ زمانے کے لئے) تو ضرور بولتے ہیں[2] "کُل کلاں" (تمام شکل کے معنی میں) پہلی بار نگاہ سے گزرا "اہل شہر پر نمبر ایک کا اثر ان کا تھا" (صفحہ ۱۷۲) "نمبر ایک" کئی جگہ استعمال ہوا ہے اور قریب قریب ہر جگہ کھٹکتا ہے۔

دلی کے شاعروں میں مولانا راسخ، آغا شاعر، بیخود، اور سائل کا جس تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اسی تفصیل سے مہاراج بہادر برق دہلوی کا بھی ذکر کرنا چاہیے تھا کہ دلی کے شاعروں میں برق خاص مقام رکھتے تھے ـــ اور پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی کا ذکر کہیں نام تک اس کتاب میں نہ پا کر بہت حیرت ہوئی۔ ساحر دہلوی نے مرزا غالب کو اچھی طرح دیکھا تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل ملاپ کی وہ شاید واحد یادگار تھے۔ ان کے یہاں برسوں مہینہ کے مہینہ پابندی کے ساتھ مشاعرے ہوتے رہے ہیں۔ ساحر کے اس شعر کو کوئی بھول سکتا ہے:۔

کوئی حرم سے دیر سے منسوب ہو کوئی
اک رہ گیا ہوں میں کہ تمہارا کہیں جسے

دلی کے طبیبوں میں فراشخانہ کے حکیم سراج الدین کا ذکر اور نام تک نہ ہونا تعجب ہے۔ اس فروگذاشت کی طرف اس لئے اشارہ نہیں کیا گیا کہ حکیم سراج الدین آنریری مجسٹریٹ اور "خان صاحب" تھے۔ بلکہ اس لئے کہ تقسیم ہند سے قبل دلی کے طبیبوں میں مریضوں کا سب سے زیادہ ہجوم انہی کے مطب میں رہتا تھا۔

صفحہ ۵۰ پر "نظیر اکبر آبادی" کی جگہ "نذیر اکبر آبادی" پڑھ کر بڑا اچنبھا ہوا۔ یہ کتابت کی غلطی بھی نہیں معلوم ہوتی ایک ہی صفحہ پر دو جگہ یہ لفظ (نذیر) آیا ہے ـــ "ہندوؤں کا بیان ہے کہ دلی میں اندرا جب لبیں بھر بھر کر موتیوں کا دان کیا کرتا تھا" (صفحہ ۱۵) یہ لفظ "لب" نہیں "لپ" ("پ" کے ساتھ) ہے، دونوں ہتھیلیاں ملائی جائیں اور جو مقدار دونوں ہتھیلیوں

---

[1] غالب کی طرح میر تقی نے اپنے کلیات کا انتخاب نہیں کیا (م۔ق) [2] ہم نے یو۔پی کے متعدد شہروں کے اہل علم سے "کُل کلاں" کے بارے میں دریافت کیا، یقین سب نے لاعلمی ظاہر کی۔ مگر فرہنگ آصفیہ میں یہ لفظ مل گیا۔ بہرحال یہ لفظ دلی کے ان چند مقامی الفاظ میں شمار کیا جائے گا جو دلی کے باہر مروج ...

کے بس جوف میں آتا اسے "لپ" کہتے ہیں۔ صفحہ ۱۹ پر "دوپلڑی ٹوپی" بھی کھٹکا، ممکن ہے دلّی میں "دُپلّی" ٹوپی کو "دوپلڑی" بولتے ہوں کہ وہاں کے لوگوں کو "ڑ" کی ثقالت ناگوار نہیں گزرتی۔ "چپراسی کو اہلِ دلّی "چپڑاسی" بولتے ہیں۔

صفحہ ۲۹۷ پر "کبڈہ" کو "کبھڈ" لکھا گیا ہے۔ ہندی کا اصل لفظ "کپڈ" ہے جس کے معنی ہیں "بے پڑھا لکھا اور جاہل"! اردو میں "پ" کی جگہ "ب" بولنے لگے۔ بعض لوگ بولنے میں "ہ" کا اظہار نہیں کرتے "کبڈ" بولتے ہیں مگر "کبھڈ" کسی طرح درست نہیں ہے۔ صفحہ ۲۲۴ پر "بذلہ سنجی" کو جو "بزلہ سنجی" لکھا گیا ہے یہ کتابت ہی کی غلطی ہونی چاہیئے۔

احتشام الدین کا ذکر آدھے صفحہ میں ہے مگر ابھی یہ خصوصیت تو بیان کرنے سے رہ ہی گئی، کہ انھوں نے دیوانِ حافظ کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا تھا ——— ڈاکٹر اشرف الحق کے بارے میں لکھا ہے کہ ——— "ہزلیہ اشعار لکھے ہیں جو چھپے نہیں" ——— نظم، غزل اور شعر کے ساتھ "لکھنا" بھی ان دنوں بولنے لگے ہیں مگر "کہنا" صحیح تر ہے ——— ملا واحدی صاحب کو شاید اس کی اطلاع نہیں ملی کہ ڈاکٹر اشرف الحق کا ہزلیہ نہیں بلکہ فحش کلام کتابی صورت میں چھپ چکا ہے مگر اس پر "پرنٹر پبلشر اور پریس" کا نام نہیں ہے، مہاراجہ کشن پرشاد بہادر (وزیر اعظم دکن) نے یہ کتاب جو "مزبلہ فواحش" ہے۔ مجھے دکھائی تھی۔

مولانا ظہور احمد وحشی کو صرف "ادیب" لکھا ہے حالانکہ وہ بہت اچھے شاعر بھی تھے۔ یہ مشہور شعر وحشی شاہجہانپوری کا ہے:۔

اُس طرف کچھ سوچ کر رونے لگے تیماردار
اس طرف بیمارِ غم کچھ کہہ کے غافل ہوگیا

مرزا فرحت اللہ بیگ کو سشن جج لکھا ہے، یہ صحیح ہے کہ وہ ریاست حیدرآباد دکن میں برسوں سشن جج بھی رہے ہیں مگر آخری زمانے میں انہیں عدالت العالیہ (ہائی کورٹ) میں لے لیا گیا تھا۔ اُن کا عہدہ جج ہائی کورٹ کے مماثل تھا۔ اور اسی عہدہ سے انھوں نے پنشن لی

دلّی کی شخصیتوں کے بارے میں مصنف نے ہر کسی کا ذکر بھلائی ہی سے کیا ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ اُن کے عیوب اُن کے محاسن کے مقابلہ میں بہت کم تھے، جناب واحدی صاحب کو طنز و تنقید، بحث مباحثہ، عیب چینی اور خردہ گیری سے ایک طرح کی چڑ ہے۔ انھوں نے صلح کل اور مرنجان و مرنج طبیعت پائی ہے مگر صفحہ ۲۲۹ پر دہلی مسلم لیگ کے آفس سیکرٹری ...... کا ذکر پڑھ کر یہ بات کھٹکی کہ واحدی صاحب کی یہ شریفانہ عادت کسی کسی شخصیت کے بارے میں لوگوں کو غلط فہمی بلکہ یوں کہیئے کہ خوش اندیشی میں مبتلا کر سکتی ہے!

مولانا حالی کا یہ شعر:۔

اپنے جوتوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار
اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

آخر تذکرہ و افسانہ میں کہیں تو صرف ہونا ہی چاہیئے!

علی گڑھ کالج کے غبن کے سلسلہ میں جو یہ لکھا گیا ہے کہ سید محمود نے سرسید احمد خاں کے کہنے پر پچاس ہزار روپیہ کی رقم داخل کر دی تھی ——— صحیح نہیں ہے۔ یہ رقم جو ایم اے او کالج کے ہیڈ کلرک شام بہاری لال نے خرد برد کی تھی۔ اس کی تعداد ایک لاکھ پانچ ہزار اور کچھ سو روپے تھی۔ اتنی رقم سید محمود بے چارے کہاں سے داخل کرتے۔ سرسید احمد خاں اس غبن کے صدمے سے بیمار رہنے لگے اور غالباً سال دو سال کے بعد ہی چل بسے۔

"میں مولانا راسخ سے ملا کبھی نہیں، مولانا حالی کی بھی دور ہی سے زیارت ہوئی۔ دونوں میری نوعمری میں رحلت کر گئے"۔ (صفحہ ۸۵)

مولانا حالی کا انتقال ۱۹۱۴ء میں ہوا ہے۔ اس وقت ملا واحدی صاحب کی عمر اٹھائیس سال کے لگ بھگ ہوگی، دریں اثنا نوعمری کا زمانہ

کا جیکو ہونے لگا وہ اس زمانہ میں رسالہ کے ایڈیٹر تھے۔ مولانا حالی جیسی شخصیت سے ان کا نہ ملنا اور بس دور ہی کی زیارت پر قناعت کرنا" حیرت انگیز ہے۔ حالی کی ذات زیادہ سے زیادہ قرب و حضوری بلکہ نیاز مندی کی مستحق تھی۔

ملا واحدی کا انداز بیان سلیس و سادہ، شگفتہ اور رواں ہے، مگر کہیں کہیں رشتوں کی تفصیل بیان کرنے میں یہ رنگ بھی پیدا ہو گیا ہے

"میری دادی کے ماموں علی محمد خاں کی شادی نواب غلام نبی خاں سے ہوئی تھی۔ غلام نبی خاں حکیم اجمل کے ننیا سسر تھے۔ پھر نواب غلام نبی خاں کے بیٹے عبدالرحمٰن خاں سر سید احمد خاں کے ماموں دبیر الدولہ زین العابدین کی پوتی سے بیاہے گئے۔" (صفحہ ۲۹۲)

عبارت میں ستین واسماء (.......) کا قریب قریب لانا وجدان کو گراں گزرتا ہے۔

اس کتاب کو میں ایک بار پڑھ کر ضروری نشان لگا چکا تھا۔ مگر یہ کتاب گم ہو گئی۔ واحدی صاحب سے میں نے ذکر کیا تو دوبارہ عنایت فرمائی، میں نے اس کتاب کو دوبارہ پڑھا، اور پہلے کی طرح شوق و دلچسپی کے ساتھ پڑھا۔ اس کا دوبارہ پڑھنا ذرا بھی نہیں کھلا بلکہ فرحت و شگفتگی محسوس کی! "میرے زمانہ کی دلی" یقین ہے کہ قبولِ عام حاصل کرے گی!

مجموعہ نظم حالی

مرتبہ:- ظہیر احمد صدیقی (ایم اے) ضخامت ۱۷۶ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ پندرہ آنے۔
ملنے کا پتہ:- ایجوکیشنل بک ہاؤس سول لائن حامد علی بلڈنگ علی گڑھ یو۔پی

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے مولانا حالی کی پندرہ نظموں کو تنقید و تبصرہ اور ضروری تشریحات کے ساتھ مرتب کیا ہے، کتاب کا آغاز حالی کی مختصر سوانح حیات سے ہوتا ہے، اس کے بعد حالی کی ان نظموں پر تبصرہ ہے، جو اس مجموعہ میں شامل ہیں:-

جب بڑوں کے اپنے ساکے یاد آتے تھے انہیں
آبرو پر جان و تن بڑھ بڑھ کے کرتے تھے نثار

اس لفظ کا صحیح املا "ساکھا" ہے جس کے معنی "جنگ و جدال کے کارنامے اور معرکے ہیں۔

حق نے شائستہ ہر بات بنایا تھا ہمیں
ایک ہی دام میں پھنسانا سکھایا تھا ہمیں

یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے، یقین نہیں آتا کہ حالی نے "شائستہ ہر بات" کہا ہوگا۔ ممکن ہے کہ کاتب صاحب نے "شائستہ ہر بزم" کو "شائستہ ہر بات" لکھ مارا ہو۔

کتاب کے آخر میں مشکل الفاظ کی فرہنگ دی ہے۔ جس میں اغلاط پائی جاتی ہیں:-

صفحہ	اصل لفظ	معنی (جو فرہنگ میں درج ہیں)	صحیح معنی
۱۶۵	معلوک	غریب	مصیبت زدہ (غریب کو بھی مفلوک کہتے ہیں)
۱۶۶	تمکین	بُردبار	رکھ رکھاؤ۔
۱۶۶	گونڈے	جھوٹے	شرماتے ہوئے بار احسان کے سبب جھینپے ہوئے۔
۱۶۸	بلونا	صاف کرنا	کسی مائع چیز کو حرکت دے کر اور چلا کر مکھن یا اس چیز کا جوہر نکالنے کے عمل کو "بلونا" کہتے ہیں جس طرح کہ دہی کو بلو کر مکھن نکالتے ہیں۔

صفحہ	اصل لفظ	معنی (جو فرہنگ میں درج ہیں)	صحیح معنی
۱۶۹	بارک اللہ	سبحان اللہ	اللہ تجھے برکت دے! (یہ کلمہ تحسین و دُعا ہے)
۱۷۰	خرقِ عادت	انوکھی بات، عادت کے خلاف	ان معنی کے بعد کرامت اور معجزہ بھی ضرور لکھنا چاہیے تھا۔
۱۷۳	لعبت	حسین، خوب صورت	گڑیا۔
۱۷۴	بادۂ دوشینہ	رات والی شراب	گزری ہوئی رات میں پی ہوئی شراب
۱۷۵	تلچھٹ	کیچڑ	کا مائع اور سیال محلول میں (برتن کے پیندے میں) جو کثیف مادہ رہ جاتا ہے!

کسی کتاب کی فرہنگ میں الفاظ کے معنی کی ایسی غلطیاں بہت زیادہ محلِ نظر ہیں۔

دیوانِ غالب

مرتبہ:- مالک رام (ایم۔اے) ضخامت ۲۵۹ صفحات، (مجلد، رنگین گرد پوش کے ساتھ) قیمت پانچ روپے اور پچاس پیسے (ہندوستانی) ملنے کا پتہ:- آزاد کتاب گھر، کلاں محل، دلی۔

مرزا غالب پر سب سے پہلی کتاب (یادگارِ غالب) ان کے نامور شاگرد حالی نے لکھی جس کا وزن ہر دور میں محسوس کیا جائے گا۔ غالب کے کلام کا کوئی شارح اور ریسرچ اسکالر "یادگارِ غالب" کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ یادگارِ غالب کے بعد ڈاکٹر بجنوری کا دیوانِ غالب پر مقدمہ بہت مقبول ہوا۔ اور اس کتاب نے اردو ادب میں "تنقیدِ جدید" کا ایک نیا باب کھول دیا۔

سر راس مسعود مرحوم کو غالب کے کلام سے غیر معمولی شغف تھا۔ ان کی کوششوں سے غالب کے کلام کے نہایت خوشنما پاکٹ ایڈیشن شائع ہوئے اور "مرقعِ چغتائی" تو دیدہ زیبی، ندرت، فن کاری اور حسن و خوبی (Get-up) میں اگلی پچھلی تمام کتابوں سے بازی لے گیا ——— غالب کے ناقدین میں ڈاکٹر عبدالودود سب سے ممتاز و منفرد ہیں۔ وہ مرزا یگانہ کی طرح غالب سے خدا واسطے کا بیر نہیں رکھتے، انھوں نے ایک دیانتدار ناقد کی طرح غالب کے فارسی کلام پر تنقید کی ہے اور کلامِ غالب کی کمزوریوں کو دکھایا ہے:-

اس دور میں ڈاکٹر مالک رام (ایم۔اے) اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی رامپوری غالب پرست (Authorities) مانے جاتے ہیں۔ حال ہی میں مالک رام صاحب کی کتاب "تلامذۂ غالب" منظرِ عام پر آ چکی ہے، اب اُن کا ترتیب دیا ہوا "دیوانِ غالب" بڑے اہتمام سے چھپا ہے۔ یہ دیوان مرزا غالب کے اصل دیوان کی نقل ہے جو حسنِ اتفاق سے ضائع ہونے سے بچ گیا!

دیوان کے آغاز میں مالک رام صاحب کا مقدمہ ہے۔ جو ہر جہت سے معلومات آفریں ہے، اس دیوان کے آخر میں فاضل مرتب نے "نسخۂ حمیدیہ" سے غالب کے کلام کا انتخاب بھی آخر میں دے دیا ہے۔ اس انتخاب میں غالب کا یہ سطحی شعر؎

کارخانے سے جنوں کے بھی میں عریاں نکلا میری قسمت کا نہ ایک آدھ گریباں نکلا

کیسے شامل ہو گیا!

مالک رام صاحب کے انتخاب کی رو سے، قارئینِ فاران کے ذوق کی آسودگی و پذیرائی کے لئے ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب! ہم نے دشتِ امکاں کو، ایک نقشِ پا پایا

پوچھا تھا اگرچہ یار نے احوالِ دل مگر کس کس کو دماغِ منتِ گفت و شنود تھا

بصورتِ تکلف، بمعنی تاسف اسدؔ! میں تبسم ہوں پژمردگاں کا

خود پرستی سے رہے باہم دگر نا آشنا　　بیکسی میری شریک، آئینہ تیرا آشنا

اسدؔ، سودائے سرسبزی سے ہے تسلیم، رنگیں تر　　کہ کشتِ خشک اس کا، ابرِ بے پروا خرام اس کا

پھر وہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے　　رنگ اڑتا ہے گلستاں کے ہواداروں کا

کس بات پہ مغرور ہے اے عجزِ تمنا!　　سامانِ دعا وحشت و تاثیرِ دعا ہیچ

اسدؔ کی طرح، میری بھی بغیر از صبحِ رخساراں　　ہوئی شامِ جوانی اے دلِ حسرت نصیب! آخر

دوستو! مجھ ستم رسیدہ سے　　دشمنی ہے وصال کا مذکور

اے آرزوئے شہیدِ وفا! خوں بہا نہ مانگ　　جز بہرِ دستِ و بازوئے قاتل دعا نہ مانگ

اسدؔ شکوہ کفر و دعا ناسپاسی　　ہجومِ تمنا سے لاچار ہیں ہم

دیر و حرم - آئینۂ تکرارِ تمنا　　واماندگیِ شوق تراشے ہے پناہیں

ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج　　میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

فتادگی میں قدم استوار رکھتے ہیں　　برنگِ جادہ سرِ کوئے یار رکھتے ہیں

ہوئے کب کلفتِ دل منعِ طوفانِ اشک　　گردِ ساحل سنگِ راہِ جوششِ دریا نہیں

میکدے میں ز دل افسردگیِ بادہ کشاں　　موجِ مے، مثلِ خطِ جام ہے برجا ماندہ

کوئی آگاہ نہیں، باطنِ ہم دیگر سے　　ہے ہر اک فرد جہاں میں ورقِ ناخواندہ

مجھے معلوم ہے، جو تو نے میرے حق میں سوچا ہے　　کہیں ہو جائے جلد اے گردشِ گردونِ دوں وہ بھی۔

کرتے ہو شکوہ کس کا تم اور بیوفائی!　　سر پیٹتے ہیں اپنا، ہم اور نیک نامی

بے چشمِ دل نہ کر ہوسِ سیرِ لالہ زار　　یعنی یہ ہر ورق، ورقِ انتخاب ہے

ہم مشقِ فکرِ وصل و غمِ ہجر سے اسدؔ!　　لائق نہیں رہے ہیں غمِ روزگار کے

اسدؔ! بندِ قبائے یار ہے فردوس کا غنچہ!　　اگر وا ہو، تو دکھلا دوں کہ یک عالم گلستاں ہے

ساقی! بہارِ موسمِ گل ہے سرور بخش　　پیماں سے ہم گزر گئے، پیمانہ چاہیے

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو، پھر ہم کو کیا　　آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے

گدائے طاقتِ تقریر ہے زباں تجھ سے　　کہ خامشی کو ہے پیرایۂ بیاں تجھ سے

تاریخِ خیرپور

از:- نسیم امروہوی، ضخامت دو سو صفحات (بڑا سائز) قیمت دو روپے۔

ملنے کا پتہ: سہ روزہ "مراد" خیرپور میرس۔

جناب نسیم امروہوی صاحب ایک خوش گو قادر الکلام شاعر ہیں، اور اپنے سلاموں اور مرثیوں کے سبب خاصی شہرت رکھتے ہیں۔ ان کی مرتب کی ہوئی ریڈریں کئی سال تک پاکستان کے اسکولوں کے نصاب میں شامل رہی ہیں، مولانا نسیم امروہوی ایک درجن سے زائد کتابوں کے مصنف و مولف ہیں، عربی میں خصوصی دستگاہ رکھتے ہیں۔ شاعری ورعلم و فضل اُن کو آبائی ورثہ میں ملے ہیں۔

نسیم امروہوی، خیرپور میرس کے ایک سہ روزہ اخبار "مراد" کی ادارت سنبھالے ہوئے ہیں۔ اسی اخبار کا ایک خاص شمارہ جو "تاریخ خیرپور" پر مشتمل ہے، ہمارے سامنے ہے، اس پر مختصر سا پیش لفظ ڈاکٹر محمود حسن خاں نے لکھا ہے ـــ کتاب کے اہم عنوانات ـــ

عباسی کلہوڑوں کا سندھ پر قبضہ ــــــ سندھ میں میران تالپور کی ابتدا ــــــ سندھ پر تالپوروں کا قبضہ ــــــ میرانِ تالپور اور کلہوڑوں کے درمیان نزاع اور معرکے ــــــ پورے سندھ میں میروں کی حکومت ــــــ سندھ میں انگریزوں کا اقتدار قائم ہونے کے اسباب ــــــ میرانِ تالپور سے انگریزوں کی جنگ اور کراچی پر انگریزوں کا زبردستی قبضہ ــــــ ریاست خیرپور کے فرمانروا ــــــ ریاست خیرپور تقسیم ہند کے بعد

"تاریخ خیرپور" میں مسٹر قزلباش کے دورِ وزارت عظمیٰ کو "عہدِ زرین" سے تعبیر کیا گیا ہے، اس دور میں جو اصلاحات اور ترقیاں ہوئی ہیں، ان کی تفصیل اس کتاب میں ملتی ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ مسٹر ممتاز حسن قزلباش انتظامی سلیقہ رکھتے ہیں اور ترقی کرتے ہوئے ڈپٹی کلکٹری کے عہدہ سے وزارت کے منصبِ جلیلہ تک پہنچے ہیں، ان کے زمانہ میں ریاست خیرپور نے غیر معمولی ترقی کی مگر یہ بھی ہوا کہ اس ترقی کے ساتھ قزلباش صاحب کے حالات بھی بہتر سے بہتر ہوتے چلے گئے۔

خیرپور میرس کے پہلے باضابطہ والیٔ ریاست جن کو حکومت برطانیہ نے "ہز ہائی نس" کا خطاب دیا تھا۔ میر علی مراد خاں اول تھے۔ ان کے بعد ۱۸۴۲ء سے لے کر ۱۹۵۵ء تک پانچ فرمانروا ہوئے۔ یہاں تک کہ میر علی خاں مراد دوم پر یہ ریاست ختم ہو کر حکومتِ پاکستان میں ضم ہو گئی اور اب تاریخ کے صفحات پر اس کے نقش باقی رہ جائیں گے۔

"تاریخ خیرپور" میں ادبیت کی کمی محسوس ہوئی، تحریر میں "وقائع نگاری" کا رنگ پیدا ہو گیا ہے ــــــ مگر جہاں تک مواد (Matter) اور تاریخی واقعات کا تعلق ہے، یہ کتاب مفید و کارآمد ہے

صبحِ نو

مدیرہ:- صفیہ شیم ملیح آبادی، ضخامت ۱۴۴ صفحات، سالانہ چندہ سات روپے، فی پرچہ دو روپے۔
ملنے کا پتہ:- "صبح نو" اسٹیلائٹ ٹاؤن، راولپنڈی۔

سہ ماہی "صبح نو" محترمہ صفیہ شیم ملیح آبادی کی ادارت میں شعر و ادب کے افق پر بڑے حسنِ اہتمام کے ساتھ طلوع ہوا ہے، پاکستان اور ہندوستان کے قریب قریب تمام مشہور شاعروں اور ادیبوں کا اس نو طلوع مجلہ کو تعاون حاصل ہے، اب تک دو شمارے نکل چکے ہیں، مضامین بلند و دلچسپ بھی ہیں اور متنوع بھی! "شورستان" (حصہ نظم و غزل) اتنا بلند ہے کہ دوسرے پرچوں کو یہ رنگا رنگی اور بلندی مشکل ہی سے میسر آتی ہے!

اس دور میں جب کہ فحاشی اور عریانی کا چلن عام ہوتا جا رہا ہے، اور دینی اقدار کی ہنسی اڑائی جاتی ہے ــــــ "صبح نو" میں شعر و ادب کی سنجیدگی و وقار کو دیکھ کر مسرت ہوئی!

محترمہ صفیہ شیم نے اس دور میں رسالہ نکال کر مالی مشکلات کو دعوت دی ہے۔ خدا کرے حالات ان کی سازگاری کریں اور "صبح نو" کی کبھی شام نہ ہو!

جلد:- ۱۰

شمارہ:- ۷

اکتوبر سنہ ۵۸ء

ایڈیٹر

ماہر القادری

سالانہ چندہ
چھ روپے

فی پرچہ
آٹھ آنے

نظم وترتیب

مقام اشاعت:- دفتر فاران۔ کیمبل اسٹریٹ، کراچی نمبر ۱

پرنٹر پبلشر:- مسٹر در حسین ـــ مطبع سعیدی قرآن محل مولوی مسافر خانہ کراچی ـــ منبر حسین سعید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

نفس اور شیطان کے فریب بڑے ہی نازک اور پُرپیچ ہوتے ہیں، اتنے پُرپیچ کہ ایک اچھا خاصا خداترس اور فرض شناس آدمی اپنے کسی غلط قدم کو عین صواب سمجھتا ہے اور اس غلط روی کے سبب بھول بھلیوں میں پھنس کر بھی آدمی اس غلط فہمی میں مبتلا رہتا ہے کہ وہ صراطِ مستقیم پر گامزن ہے اور اس کا کوئی قدم بھی جادۂ راستی سے باہر نہیں پڑ رہا ہے!

ایک بُرے آدمی کو اور زیادہ بُرا بنانے اور گمراہ کرنے کی شیطان کو اتنی فکر نہیں ہوتی، جتنی فکر اسے اس کی ہوتی ہے کہ ایک اچھے آدمی کو برائی کی راہ پر لگا دے یا کم سے کم اس کے دل میں کسی نیک مقصد کے خلاف وسوسہ ڈال دے اور اسے مُذبذب بنا دے، یا کسی مُفید تر کام سے ہٹا کر کم مُفید کام میں منہمک کر دے! نیک اور سمجھدار لوگوں میں سُستی اور کم ہمتی پیدا کرنے یا انہیں کسی بڑے مقصد سے ہٹانے کے لئے شیطان انتہائی محتاط اور باریک چالیں چلتا ہے۔

ایک صاحب قومی فرائض و سنن کی اُن کے حقوق و اہمیت کے مطابق پابندی کرنا چاہتا ہے۔ شیطان تقرب الی اللہ، محبتِ رسول اور تزکیۂ نفس کے نام پر، فرائض کے مقابلہ میں اُسے "سُنن" سے زیادہ شغف پیدا کرا دیتا ہے، اور اس تنزل کا تیسرا قدم یہ ہوتا ہے کہ "سنن" کی اہمیت بھی اس شخص کی نگاہ میں کم ہو جاتی ہے، اور اب وہ "نوافل" ہی میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ شیطان کی یہ باریک چال اہمیت کے اعتبار سے "عبادات" کی ترتیب ہی کو اُلٹ کر رکھ دیتی ہے۔

ایک اچھے خاصے متقی عالمِ دین کو شیطان اس "نیکی" کے لئے اُبھارتا ہے کہ تم بادشاہوں اور حاکموں سے ربط پیدا کرو، کسی اپنے لئے نہیں! بلکہ دوسروں کی حاجت روائی اور کار برآری کے لئے —— پھر رفتہ رفتہ اس عالمِ دین کو بادشاہوں اور حاکموں کی دربارداری کی چاٹ لگ جاتی ہے، اور پھر اس عالم کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ وہ مدرسہ میں طلبا کو درس دے رہا ہے یا خانقاہ میں تسبیح پڑھ رہا ہے مگر کان دروازے کی آہٹ پر لگے ہوئے ہیں کہ شاید کسی "بڑے آدمی" کا کوئی فرستادہ وہاں سے کوئی پیام لے کر آ رہا ہو اور قصر و ایوان میں مجھے یاد فرمایا جا رہا ہو۔

ایک اسلام پسند ادیب، شاعر، افسانہ نگار اور مقرر سے شیطان یہ نہیں کہتا کہ تم دینی افکار کی تبلیغ و اشاعت ہی سے باز آجاؤ بلکہ وہ اس میں داد و ستائش کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے کہ لوگ اس کی شاعری کی، افسانہ و مقالہ کی اور تقریر کی تعریفیں کریں، اور اس طرح ازراہِ گوشش اس کا نفس فربہ ہوتا چلا جائے۔ شیطان کی اس کامیاب چال سے نیکی کے کام میں "اخلاص" کی کمی واقع ہو جاتی ہے، اور اس نیکی پر اللہ تعالیٰ کے یہاں اجر کا درجہ گھٹ جاتا ہے، کہ خالص اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے جو کام کیا جانا چاہئے تھا اس میں اغراضِ غیر کی آمیزش ہو گئی۔

ایک لیڈر جو "سلطانِ جابر کے سامنے کلمۃ الحق بلند کر کے" افضل الجہاد کے ثواب کا مستحق ہوتا ہے۔ اس کو شیطان "عوام" کا [illegible] بنا دیتا ہے، یعنی جس بے خوفی اور جرأت کے ساتھ وہ لیڈر وقت کے حاکموں کو ٹوکتا اور اُن پر تنقید کرتا ہے، اس انداز

سے وہ عوام کو اُن کی کوتاہیوں، غفلتوں اور غلطیوں پر نہیں ٹوکتا۔ کیونکہ قوم کی غلطیوں اور کمزوریوں پر نقد و احتساب کرنے سے اس لیڈر کی ہر دل عزیزی جاتی رہے گی، در حکومت اور ارباب حکومت کو مذ حیاں سُنکر، عوام کی ایک بھیڑ جو اس کے اردگرد لگ رہی ہے، عوام کو ٹوکتے ہی وہ چھٹنی شروع ہو جائے گی ـــــــــــ شیطان کی اس چال کی کامیابی کی کوئی حد ہے کہ قصر و ایوان میں جو "شیر" ہوتا ہے وہ عوام میں آکر "بزِ غار" بن جاتا ہے۔

ایک مذہبی آدمی دانتوں میں "مسواک" کرنے کا انتہائی پابند ہو جاتا ہے کہ یہ سنّتِ رسول ﷺ ہے اور وہ شخص اپنی جیب میں مسواک لئے لئے پھرتا ہے کہ نہ جانے کہاں نماز کا وقت ہو جائے اور میں "مسواک" کرنے کے ثواب سے محروم ہو جاؤں...... کوئی شک نہیں مسواک کرنے سے دانتوں کی صفائی کے ساتھ ساتھ اتباعِ رسول ﷺ کا اجر بھی ملے گا ـــــ ـــــ مگر جس منہ میں وہ مذہبی آدمی ہر نماز سے پہلے مسواک کرتا ہے، شیطان اس منہ میں حرام کمائی کا لقمہ آنے کی کراہت پیدا نہیں ہونے دیتا ـــــــ یعنی مسواک کا وہ اہتمام اور حرام روزی سے یہ غفلت! ہونا یہ چاہئے تھا کہ مسواک کے اہتمام کے تئیں بلکہ اس سے بہت زیادہ اہتمام حلال روزی کی کمائی کا ہوتا۔

شیطان ایک بددیانت مذہبی آدمی کو نماز پڑھنے سے نہیں روکتا مگر وہ آدمی اس طرح نماز ادا کرتا ہے کہ اس کی جیب میں رشوت کے پرامیسری نوٹ بھرے ہوتے ہیں اور وہ مجو رکوع و سجود ہوتا ہے۔

یہ بھی شیطان کا فریب ہے کہ ایک ایماندار و مخلص مذہبی آدمی کو وہ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کی پابندی سے ایک قدم آگے نہ بڑھنے دے، اور اس کو ساری عمر انہی فرائض میں الجھائے رکھے اور اللہ کے دین کو اس کا پورا تقاضا بنائیے اس میں کوئی داعیہ ہی سرے سے نہ پیدا ہونے دے۔ بلکہ اس کے کان میں یہ پھونک دے کہ جہاں بانی اور حکومت تو دنیا داروں کا کام ہے۔ اہل تقویٰ کو دنیا کے ان دھندوں سے کیا سروکار! اور پھر بیٹھے" بڑھ کر یہاں تک پہنچ جائے کہ کفر و لادینی کے نظام سے نفرت و کراہت تک دل میں باقی نہ رہے۔ اور جو لوگ لادینی اور کافرانہ نظام کو اسلامی نظام سے بدل دینے کے لئے جدوجہد کر رہے ہوں۔ اُن پر حُبِّ جاہ اور دُنیا داری کی تہمت رکھی جائے، اور جو حضرات اس جدوجہد کرنے والی جماعت سے کنارہ کش ہو چکے ہوں۔ اُن کے اس فعل کو سراہا جائے اُن سے ٹوٹے ہوئے ربط کو جوڑا جائے۔ اُن کے اخلاص کی تحسین فرمائی جائے۔

یہ بھی شیطان ہی کا فریب ہے کہ ایک مذہبی آدمی جو کسی دینی جماعت کے ساتھ وابستہ ہو کسی داخلی اور خارجی سبب کے بغیر اس کا دل اس جماعت سے آپ ہی آپ اچاٹ ہو جائے، اور وہ اپنی طبیعت کی اس بیزاری کو منجانب اللہ کی طرف سے کوئی اشارہ یا الہام غیب کا لوں ایسا سمجھ بیٹھے! یہ بھی شیطان ہی کا ایک چکمہ ہے کہ کسی مذہبی آدمی کو اس کے "وجدان" کے بارے میں اس غلط فہمی میں مبتلا کر دے کہ تزکیہ نفس کے طفیل تیرا وجدان اس قدر معیاری بن چکا ہے کہ اس معیار پر کسی کی ہدایت و ضلالت کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے

کسی جماعت یا فرد کے محاسن پر پردہ ڈال کر اس کی کمزوریوں کو نمایاں دیکھنا بھی نفس کا بہت بڑا دھوکا ہے۔ اسی دھوکے میں آجانے کے بعد کسی جماعت یا فرد کے بارے میں جو رائے قائم کی جائے گی وہ عدل و انصاف سے بہت دور ہوگی۔

شیطان کی بُرے آدمیوں کے ساتھ تو یہ ہمت پڑتی ہے کہ وہ انہیں تیزی سے پستی کی طرف لے جاتا ہے۔ کوئی شخص خراخدائی فلمیں دیکھنے کا خوگر ہے، تو اسے وہ چکمہ دے کر طوائفوں کے کوٹھے پر لے جائے گا۔ کوئی نوجوان اپنے گھر میں روپیہ پیسہ چرالیتا ہے شیطان ـــ دوسروں کے مال کی چوری کی ترغیب دے کر اُس کو چوری اور گرہ کٹی کی راہ پر لگا دے گا شیطان کا تو کاروبار اور مشن ہی یہ ہے کہ اللہ کے کسی بندے کو اخلاقی عروج و منزلت نصیب نہ ہونے پائے اور وہ پستی کی طرف ہی گرتا چلا جائے۔ یہاں تک کہ اسفل سافلین میں پہنچ

جائے! اس کام کے لئے جس نے میلادِ آدم کے بعد ہی اللہ تعالیٰ سے مہلت اور ڈھیل مانگی تھی، اور یہ ڈھیل اُسے دیدی گئی۔ — مگر ایک مذہبی آدمی کو وہ ایسے کھلے ہوئے چکمے نہیں دے سکتا، ایک مذہبی شخص جیسے ہی وہ ہو۔ اس سے یہ شیطان نہیں کہے گا کہ تو شراب خواری اور بدکاری میں اپنی دولت کیوں صرف نہیں کرتا اور دولت کے ہوتے ہوئے ایسے چٹخاروں سے کیوں محروم ہے۔ شیطان کو... انسانوں کی نفسیات کا بہت بڑا تجربہ ہے، وہ [illegible] نہیں کرتا، وہ تو داؤں پر داؤں کر آدمی کو پچھاڑتا ہے۔ جیسا وہ آسانی سے پچھاڑ سکتا ہے۔ — چنانچہ ایک دیندار دولت مند کی نگاہوں سے شیطان کسی عظیم دینی مقصد کی اہمیت کو اوجھل کر کے اس کی دولت کو بہت ہی غیر اہم کاموں میں صرف کرا دیتا ہے۔ [illegible] دعوتوں کے بے اتفاقی زیادہ سے زیادہ ضرورت مند ہے، مگر شیطان اس دیندار آدمی کے دریچہ دل کے سامنے [illegible] رخ بدل کے [illegible] جیسوں کو تجاذ بیجا [illegible] کا اقامت دین کی جدوجہد جاری ہے اس کے لئے زیادہ سے زیادہ روپیہ درکار ہے، مگر شیطان اس مذہبی دولت مند [illegible] کسی مسجد کے کلس پر سونے کے پتر منڈھوائے گا اور اس کی محرابوں پر طلائی نقش و نگار کرائے گا، اور اس کی دولت کو مقصد عظیم میں صرف نہ ہونے دے گا۔

کون نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل دی ہے، اور قرآن کریم میں غور و فکر اور تدبر و تفکر کی دعوت دی ہے، اور قرآن میں لَعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ ——— اور لَعَلَّکُمْ تَتَفَکَّرُوْنَ ———— کی تکرار فرمائی ہے، مگر شیطان "تدبر و تفکر" کی اہمیت کو اس انداز سے ابھارتا ہے کہ تمام دینی مسائل کو جانچنے اور پرکھنے کے لئے صرف عقل کسوٹی بن کر رہ جاتی ہے، اور بڑی حد تک [illegible] انقیاد و اطاعت اور "سمع و طاعت" کہنے کے بجائے عقل "حکمت و مصلحت" سمجھنے کا مطالبہ کرتی ہے، اور رفتہ رفتہ یہ "عقلیت" تذبذب، بے عملی اور بعض اوقات انکار و الحاد کی طرف لے جاتی ہے۔۔۔ کلامی فرقوں میں "معتزلہ" کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ ان کو "سرد رہ عقل و غم عشق" ہی کے دوراہے پر شیطان نے بھٹکایا ہے۔

قرآن کریم کی حفاظت کے نام پر "قرآن" ہی کی مخالفت، یہ فتنہ خود ہماری آنکھوں کے سامنے اسی پاکستان میں ابھر رہا ہے۔ قرآن کو عقلی موشگافیوں اور دور از کار تاویلوں سے "بازیچہ" بنانے کی کوشش، یہ شیطان کی کتنی کامیاب چال ہے قرآن پر عمل کرنے کا دعا اور صاحب القرآن (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی سنت اور اسوہ سے بیزاری کی دعوت۔ اس کو شیطان کی سازش نہ کہیں تو اور کیا کہیں، یہی وہ چالیں ہیں جن کی بدولت شیطان کی ذریت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ [illegible] ملتے رہتے ہیں

کہ مسلمان عالم کے اس انجام کو دیکھ کر [illegible] کہ وہ سب سے پہلے تو کسی دینی جماعت سے اپنا تعلق توڑتا ہے۔ پھر وہ روزی کمانے کی خاطر کسی ایسے ادارہ سے وابستہ ہو جاتا ہے، جس کے مزاج میں "تجدد و تفریح" رچا ہوا ہے۔ اس کے بعد یہ عالم دین مسائل میں "اباحیت" کے مسئلہ کو رواج دیتا اور جائز ٹھہرانے کے لئے قرآن و احادیث سے دلیلیں فراہم کر کے "متفرنجین" کے موجب خوشنودی بنتا ہے۔ اور پھر اس سطح پر آ جاتا ہے کہ مزامیر اور گانے بجانے کو مباح ہی نہیں، سُنّتِ رسول ٹھہرا دیتا ہے کہ جس کا ترک جیسے کسی اسلامی شعار کے ترک و ضیاع کے مترادف ہو۔ یہ ہیں شیطان کی وہ چالیں کہ جو کتاب و سنت اور سلف صالحین کے قول کی آڑ میں گمراہیاں پھیلاتی ہیں، ایسی گمراہیاں جن کا توڑ آسانی سے نہیں ہو سکتا، بلکہ بعض اوقات یہ گمراہیاں شاخ در شاخ ہوتی چلی جاتی ہیں اور ایک فتنہ نہ جانے کتنے فتنوں کا سبب بن جاتا ہے۔

شیطان ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے مشن سے غافل نہیں رہتا۔ خدا ہو ملا ہو، جلوت ہو خلوت ہو، فرد ہو، جماعت ہو،

نے اپنے کام سے کام، اور اس کا کام اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ دنیا میں فساد پھیلائے، بگاڑ پیدا کرے اور لوگوں کو گمراہ بنائے اور اچھائی کو پنپنے نہ دے ——— کمال پاشا نے "ترکی قوم" کی سربلندی اور بقاء کے نام پر اسلام کو جس جس طرح سے مجروح اور کمزور کیا تھا، وہ زخم ابھی بھرنے نہ پائے تھے کہ شیطان نے "متحدہ عرب قومیت" کا فتنہ کھڑا کر دیا بلکہ یوں کہیے کہ صور پھونک دیا اور عرب دنیا کے سب سے بڑے فتنہ ساز کو عربوں کی نگاہ میں "بطلِ جلیل" بنا دیا۔

تنگ کی نامسلمانی سے فریاد!

شیطان کو سب سے زیادہ خوشی اس سے ہوتی ہے کہ کسی ادارے، انجمن یا جماعت کا اتحاد باقی نہ رہنے پائے۔ یہ بندھی ہوئی جھاڑو جس طرح بھی ممکن ہو بکھر جائے۔ ایک نیک اور اعلیٰ مقصد کے لئے کچھ خدا ترس لوگوں کے جمع ہو جانے سے جو قوام تیار ہوتا ہے اور اس سے شیرازہ بندی ہوتی ہے، شیطان چاہتا ہے کہ کسی نہ کسی عنوان سے اس شیرازہ کو بکھیر کر، نیک لوگوں کی صفوں میں انتشار پیدا کر دے کیسی کارِ خیر اور نیک مقصد کی خاطر کوئی "اجتماعی جدوجہد" شیطان کے لئے سب سے زیادہ پریشانی اور اضطراب کا باعث ہوتی ہے۔ وہ اس کوشش میں لگا رہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح ان اچھے اور فرض شناس لوگوں میں جدائی ڈال دے، جُڑے ہوئے دلوں کو پھاڑ دے، اور ان کو ٹوٹی ہوئی تسبیح کے دانوں کی طرح بکھیر دے! شیطان اپنی اس مہم کو کمال ہوشیاری اور بڑی زیرک تدبیروں کے ساتھ چلاتا ہے، وہ ان نیک لوگوں کو یہ سبق نہیں پڑھاتا کہ تم جس مقصد کے لئے جمع ہوئے ہو، یہ مقصد ہی سرے سے پست اور غیر مفید ہے، اور تمہیں اپنے نصب العین کی نقطۂ نگاہ ہی کو بدل دینا چاہیئے۔ اگر وہ اس قسم کے مشورے کی غلطی کر بیٹھے تو اس کی "لاحول" کے شہاب ثاقب سے وہ بھاگتا ہی جائے اور اس کے فریب کا جال ذرا سی دیر میں پرزے پرزے ہو جائے۔

شیطان پہلے دلوں میں بدگمانی پیدا کرتا ہے اور نگاہِ حسن بین کو نگاہِ عیب چیں سے بدل دیتا ہے وہ بدگمان عیب بین نگاہوں میں خوردبینیں لگا دیتا ہے کہ کسی اپنے رفیقِ کار کی کمزوری کا ایک ذرہ بھی کسی خوردبین سے بڑا نظر آئے! جب بدگمانیاں پیدا ہو جاتی ہیں تو طرفین کی کمزوریاں ہی ایک دوسرے کے سامنے نمایاں ہوتی رہتی ہیں، محاسن پر نگاہ پڑتی بھی ہے تو اچٹتی ہوئی۔ بدگمانیاں محاسن پر نگاہ کو ٹکنے کہاں دیتی ہیں۔

اور جب دلوں میں ایک دوسرے کی طرف سے خلش پیدا ہو جائے اور یہی جیسی صفائی، رواداری اور رفق داری باقی نہ رہے، اور معاملہ یہاں تک آن پہونچے، تو نفس دلوں میں رکھ رکھاؤ کا مفروضہ عیب پیدا کر دیتا ہے —— یہ کہ معاملہ کی صفائی و مصالحت کے لئے پہل میری ہی طرف سے کیوں ہو؟ ع

سلک سربسر کے لئے پوچھیں کہ وہ سرگراں کیوں ہو؟

ایک طرف بدگمانیوں کی پیداوار میں روز بروز اضافہ ——— دوسری طرف "تمکین و وقار" میں وہ سختی کہ تالیفِ قلب کے لئے بھی لچک پیدا نہ کی جا سکے ——— شیطان یہی کرتا ہے کہ ایک صلح پسند، نیک نفس اور ہوشمند آدمی کو حکمت، مصلحت اور تدبر کے معاملہ میں کمزور بنا دے، اور بے تدبیری کی بدولت الجھی ہوئی گتھی میں پیچ پر پیچ پڑتے چلے جائیں۔

جماعتوں کا نظم و نسق اور ان کے قواعد و ضوابط کی بنا پر مرتب نہیں ہوتے انہیں انسان ہی اپنی فکر و عقل کے مطابق مرتب کرتے ہیں۔ نظم و نسق کے معاملہ میں کوئی شرعی ضابطہ یا بے ضابطگی "کفر و نفاق" یا "فسق و فجور" کا معاملہ نہیں ہے، ہو سکتا ہے کہ کسی جماعت کے سربراہ کار نے پوری نیک نیتی، اخلاص اور اپنی فراست و تجربہ کی بنا پر نظم و نسق کے کسی معاملہ کو اسی طرح چلانا ٹھیک سمجھا ہو ——— مگر بدگمان ذہن اس طرح سوچتا ہے، فلاں صاحب نے یہ غلطی کی ہے لہٰذا ان میں پہلا سا اخلاص

نہیں رہا۔ چونکہ اخلاص نہیں رہا، اس لئے اس ساری جدوجہد اور مہم ہی میں فساد پیدا ہو گیا، پس ہمارے وجدان کا فیصلہ یہ ہے کہ یہ قافلہ اپنی منزل سے بھٹک چکا ہے، ہم جادۂ حق کے راہرو ایسے گم کردہ راہ قافلہ کا ساتھ نہیں دے سکتے!

یہ بدگمانیاں ہیں جو صغریٰ، کبریٰ قائم کر کے ایک "قضیہ" مرتب کرتی ہیں اور "چونکہ" "چنانچہ" "لہٰذا" اور "پس" کا حکم لگا کر اور نتیجے نکال کر، وصل کو فصل سے اور ارتباط کو افتراق سے بدل دیتی ہیں، دین و اخلاق کا بہت بڑا حربہ، مگر شیطان کے لئے سب سے بڑا "حربہ"! اس مفسدہ پرداز کی تمناؤں کے لئے مژدۂ نشاط و کامرانی!

بدگمان نگاہ اس طرف نہیں جاتی کہ فلاں جماعت سے مجموعی طور پر دین کو کس قدر فائدہ پہنچ رہا ہے، اس کی کوشش اور تربیت سے لوگ دین کی طرف آ رہے ہیں یا اس سے دور ہو رہے ہیں۔ جن لوگوں کے ساتھ ہم برسوں کام کر چکے ہیں، وہ ایکا ایکی بددیانت تو نہیں ہو گئے، ان کے کسی عقیدے میں خرابی تو نہیں آ گئی۔ اس جماعت کا جو لٹریچر پہلے کام کر رہا تھا وہ اب بھی کر رہا ہے —— نظم و نسق میں کہیں ڈھیل پیدا ہو گئی ہے، یا کسی ذمہ دار فرد نے اپنے حدود اختیارات سے یہ فرض محال تجاوز ہی کیا ہے، تو اس تھوڑی سی خامی کے مقابلہ میں کیا اتنے بڑے "دینی فائدہ" کو یکسر نظر انداز کر دینا چاہیئے؟ کوتاہی و خامی اور افادیت کی کمیت و کیفیت کو تولنے اور پرکھنے کی ضرورت ہے کہ ان میں سے قدرِ غالب کیا ہے۔

فوج کے برنیل کو کسی حرکت سے ناراض اور بددل ہو کر، فوجی افسروں کا عین محاذ سے چلے آنا چاہے کتنی ہی خلوص و نیک نیتی کی بنا پر ہو، یہاں تک کہ وہ فوجی افسر اپنے موقف کو درست ثابت کرنے کے لئے مطمئن کرنے والی دلیلیں بھی رکھتے ہوں۔ مگر اُن کی اس روش نے اس محاذ کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ اور اس قطع تعلق نے دشمنوں اور دوستوں میں سے کس فریق کو کیا مد؟

دینی جماعتیں ہوں یا سیاسی پارٹیاں، اُن میں لوگ شامل ہوتے اور نکلتے ہی رہتے ہیں۔ جماعتوں میں شامل ہونے اور اُن سے نکلنے کا مسئلہ "کفر و اسلام" کا مسئلہ نہیں ہوتا کہ جس کسی نے کسی دینی جماعت سے قطع کر لیا تو اس کا ایمان ہی خطرے میں پڑ گیا اور اس کے تمام نیک اعمال ہی حبط ہو گئے اور اس کا اب ٹھیک وہ موقف ہو گیا ہے، جو موقف حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کے زمانہ میں "خوارج" کا تھا۔ ایسے وہم اور اندیشے کسی کے قلب و دماغ میں اگر پیدا ہوتے ہیں، تو یہ شیطان کے ڈالے ہوئے وسوسے ہیں:

ایماندارانہ موقف اور صحیح پوزیشن یہ ہے کہ جو افراد جس جماعت کے ساتھ بدستور وابستہ ہیں، اور جماعت کے موقف کو درست سمجھتے ہیں وہ بیہارے والوں کو دیکھ کر بددل نہ ہوں۔ اُن کو چاہیئے کہ پہلے کے مقابلہ میں اور زیادہ تن دہی کے ساتھ کام کریں تاکہ اتنے اچھے اور کام کے رفقاء کے چلے جانے سے جو کمی واقع ہو گئی ہے، وہ پوری ہو جائے —— اور جو حضرات قطع تعلق کر چکے ہیں، ان کو انفرادی یا اجتماعی حیثیت سے اُن خطوط پر کام کرنا ہے، جن خطوط کو وہ صحیح سمجھتے ہیں۔ بس پھر کوئی نزاع و تصادم نہیں ہو گا۔

مو شیطان جدائی ڈلوا کر اور تفرقہ پیدا کر کے نچلا کہاں بیٹھنے دیتا ہے، وہ دلوں میں اتنی بیزاری پیدا کر دیتا ہے —— کہ کسی جماعت سے بعض حضرات قطع تعلق کر لیں۔ اس جماعت کے انتشار کی تمنائیں اپنے دل میں پرورش کرتے رہتے ہیں، اُن کے کانوں میں جماعت کے بارے میں کوئی بڑی خبر اُن کر رس پڑتا ہے۔ وہ جماعت جو انہیں دنیا میں سب سے زیادہ محبوب تھی اب اُن کی نگاہ میں سب سے زیادہ مبغوض ہو جاتی ہے جس جماعت کی تائید و حمایت میں انھوں نے زبان و قلم اور دل و دماغ کی تمام صلاحیتوں اور قوتوں کو لگا دیا تھا۔ اب یہ تمام قوتیں اور صلاحیتیں اس جماعت کی مذمت و تنقید اور طعن و تشنیع میں صرف ہونے لگتی ہیں، اس جماعت کے امیر کو جنھوں نے علم و فضل کا امام مانا تھا، اور جس کی مدح و ستائش کرتے کرتے ان کی زبانیں خشک ہوئی جاتی تھیں۔ اب اس سابق علامہ دوراں اور امام وقت میں کوئی خوبی ہی باقی نہیں رہتی۔ اس کے تمام فضل و کمال بے اعتبار ہو جاتے ہیں جس کا ایثار اور اخلاص کبھی معتبر تھا، مگر اب وہ شخص اُن

معترضین کی نگاہ میں ایک موقع پرست سیاسی لیڈر نظر آتا ہے۔

جو لوگ کسی عمارت میں خشت و سنگ بن کر جڑے رہے ہوں، وہ اس عمارت کے تیار ہونے کے بعد اس عمارت کے لیے تیشہ و کدال کا فرض انجام دینے لگیں، اس کو نفس کا فریب نہ کہیں تو کیا کہیں۔ دراصل مخالفت و عناد میں یہ شدت پیدا ہو جائے کہ اگر اس جماعت کے امیر پر کوئی کسی ہی الزام کیوں نہ لگا دے، یہاں تک کہ اس کی عزت و ناموس کے بارے میں کوئی شبہ ڈالنے والی مبہم بات کہہ دی جائے ــــ تو اس نقد و احتساب کو خوشی کے ساتھ انگیز کر لیا جائے مگر کوئی اس کی مدافعت میں جواب دے تو اس جواب پر تنقید کرنے کی ضرورت محسوس کی جائے، اور اس کا مقابلہ کرنے کے لیے خامہ و قرطاس سے مسلح ہو کر دعوت مبارزت دی جائے۔

تاریخ اور تجربہ بتاتا ہے کہ شیطان نے اصلاح ہی کے نام پر سدا فساد پھیلایا ہے اور تقویٰ و پرہیزگاری کی آڑ لے کر ہی حق و صداقت کے قافلے کی راہ میں روڑے اٹکائے ہیں بلند دیواریں کھڑی کی ہیں۔

اس گفتگو کو ختم کرنے سے پہلے، اس عقیدہ کا اظہار ضروری ہے کہ شیطان کو بے شک مکر و کید کی اللہ تعالیٰ نے مہلت دی ہے مگر یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تحت ہی ہوتا ہے، ہر شے پر اللہ تعالیٰ ہی قادر و غالب ہے اور اس کے حکم کے بغیر ایک پتہ بھی نہیں ہل سکتا، اللہ تعالیٰ کی حکمت نے بندوں کی آزمائش کے لیے خیر و شر کا معرکہ گرم کیا ہے۔ اور شیطان شر کے موقف اور محاذ کا سپہ سالار اور امیر عسا کر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں پر اس کا زور بہت ہی کم چلتا ہے۔ بلکہ کسی کسی پر بالکل نہیں چلتا، اور کبھی چل بھی جاتا ہے تو اللہ کا وہ نیک بندہ اس لغزش پر جما نہیں رہتا۔ اللہ تعالیٰ کے صاحب تقویٰ بندے شیطان کو ہمیشہ شکست دیتے رہے ہیں اور عمر فاروقؓ جیسے صاحب عزم اور اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے صالحین سے تو شیطان اس طرح بھاگتا ہے جس طرح بکری، شیر کو دیکھ کر یا تو سہم جاتی ہے جیسے اس میں جان ہی نہیں رہی یا بھاگ کھڑی ہوتی ہے۔

ہم نے شیطان کے مکر و کید پر جو اتنی لمبی چوڑی باتیں کہی ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم شیطان کے شر سے محفوظ ہیں، اور اس کا کوئی داؤ ہم پر نہیں چلتا۔ سب سے پہلے ہم اپنے نفس کی کمزوریوں اور قلم و زبان اور سیرت و کردار کی لغزشوں کا اعتراف کرتے ہیں، دن رات میں نہ جانے کتنے بار شیطان کس کس حیلے سے ہم پر حملہ آور ہوتا ہے اور اس کے کتنے حملے ہیں جو ناکام ہونے نہیں پاتے کیسے کیسے برے وسوسے ہمارے دل میں شیطان ڈالتا ہے، کس کس بری بات کے لیے ابھارتا ہے، اور وسوسہ اندازیوں کو کس چالاکی کے ساتھ عمل کے قالب میں ڈھال دیتا ہے۔ ہم شیطان کے شر سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ اللہ کے سامنے عجز اور انابت پیش کرتے ہیں۔

اس طویل گزارش کا مقصود یہ ہے کہ اللہ کے نیک بندوں کو اپنے نفس کا جائزہ لیتے رہنا چاہیے کہ نفس امارہ اور شیطان کے کسی فریب نے ان میں تناؤ اور کھنچاؤ، کسی سے بیزاری اور عداوت پیدا تو نہیں کر دی، وہ کسی سے کٹے ہیں تو کیا دیکھ کر کٹے ہیں۔ اور جڑے ہیں تو کیا سمجھ کر جڑے ہیں۔

"خلق و کسب" اور "جبر و قدر" کی بحث چھیڑنا یہاں مقصود نہیں ہے کہ اس سے الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ جہاں ایمان و یقین اور انقیاد و اطاعت ہو وہاں اس قسم کی بحثوں کے لیے گنجائش ہی کہاں رہ سکتی ہے ــــ کہنا یہ ہے کہ جس طرح شیطان کو بہکانے کی قدرت دی گئی ہے، اسی طرح بندوں کو نیکی بدی اور برائی سے بچنے کی بھی قدرت دی ہے ــــ تو جو لوگ اس قدرت کو استعمال نہ کر کے شیطان سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ اس کوتاہی اور غلطی کی اس سے باز پرس کی جائے گی، اور اس قسم کی باز پرس عدل و انصاف کا عین تقاضا ہے، اور صرف باز پرس ہی نہیں [illegible] پر سزا اور عقوبت بھی۔

آخرت میں فوز و فلاح وہی لوگ پائیں گے، جو اس معرکۂ خیر و شر اور کشمکش صلاح و فساد میں شیطان کو شکست دے سکیں گے

گر جو زندگی بھر شیطان کے ہاتھوں شکست پر شکست کھاتے رہیں گے، ان کو آخرت میں خسرانِ عظیم کا سامنا کرنا ہوگا۔

جس نے اس دنیا میں کشور کشائی کی اور ناقابلِ تسخیر قلعوں کو فتح کیا مگر شیطان سے شکست کھا گیا، وہ اللہ کی نگاہ میں بزدل، مغلوب اور شکست خوردہ ہے ـــــــ اور جس نے چاہے ایک انچ زمین بھی فتح نہ کی ہو مگر شیطان کو اس نے ہرا دیا، وہ اللہ کی نگاہ میں فاتح و منصور ہے ہم عالم آب و گل کے رہنے والے نہیں سمجھ سکتے کہ جب شیطان اللہ کے کسی نیک بندے کے ہاتھوں شکست کھاتا ہے تو شیطان کی اس شکست اور بندۂ صالح کی نصرت و کامیابی پر ملاءِ اعلیٰ میں کیسے شادیانے بجتے ہیں۔

جو کم بخت دشمنِ دین، نماز کی حالت میں دلوں میں وسوسے ڈالے، وہ عیش و فراغت اور خوشحالی و آسودگی کے عالم میں کیا کچھ نہیں کر سکتا، اس لئے شیطان کے فریب سے ہر وقت اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے رہنا چاہئے خشیتِ الٰہی اور محاسبۂ آخرت کا خوف، یہ وہ سپر ہے جس پر شیطان کا حربہ اثر نہیں کر سکتا اور کرتا بھی ہو تو فوراً اچٹ جاتا ہے! اور یہ صرف سپر ہی نہیں ہے، تیغ و سناں بھی ہے جس کے وار شیطان کو کمزور کرتے رہتے ہیں۔

ہم اللہ ہی سے دعا کرتے ہیں کہ ہمیں نفس اور شیطان کے فتنوں سے مامون و محفوظ رکھے، ہم سے بہ تقاضائے بشریت بھول چوک ہو جائے تو ہمیں اس پر چھپے نہ دے "حزب اللہ" اور "حزب الشیطان" ان دو گروہوں میں ہمیں "حزب اللہ" کو پسند کرنے اور اس کا پوری طرح ساتھ دینے کی توفیق عطا فرمائے، ہمارا مرنا اور جینا صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہو، اس دورِ انکار و الحاد اور فسق و فجور کے ماحول میں "اقامتِ دین" کی سعادت ہمارے حصہ میں آئے، قیامت میں ہمارا حشر نیکوکاروں اور اللہ تعالیٰ کے محبوب و پسندیدہ بندوں کے ساتھ ہو، اور صاحبِ لواء الحمد علیہ التحیات والثناء کے پرچم کا سایہ ہمیں نصیب ہو! (آمین)

ایک ہدایت یافتہ چوہدری کا مکتوب

ایک گمراہ چوہدری کے نام

جناب چوہدری محمد سرفراز خاں صاحب نے ایک طویل خط مسٹر غلام احمد پرویز کے نام بھیجا تھا جسے صاحب موصوف نے "فاران" میں اشاعت کے لئے مرحمت فرمایا، ہم اس خط کو مکتوب نگار کے شکریہ کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔

اس مکتوب سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ کیسے کیسے اہل فکر و بصیرت جو انشاپردازی کی بھی صلاحیت رکھتے ہیں، گوشۂ گمنامی میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ بعض مضمون نگار کی کسی تشریح اور توجیہ سے بعض اہل علم اور خاص طور سے علم حدیث کے ماہرین کو اختلاف ہو۔ مگر مجموعی طور پر یہ مکتوب متوازن و مدلل ہے اور سنت رسول کی حجیت دینی کے ثبوت میں ایک بصیرت افروز دستاویز ہے۔

مسٹر پرویز کی گمراہی اب انتہا کو پہنچ چکی ہے اور اب اُن کا ہدایت کی طرف واپس آنا دشوار نظر آتا ہے! مغرب زدہ جاہل مداحین نے اس شخص کی گمراہی کو اور پختہ کر دیا ہے۔

قادیانیت کا ایمان سوز فتنہ پنجاب ہی سے اُبھرا تھا۔ یہاں تک کہ یہ "شجرِ خبیث" وہاں جڑ پکڑ گیا، وہاں کی فضا اور ماحول کے اسی اعتقادی بنا پر مسٹر پرویز نے کراچی کو چھوڑ کر لاہور کو اپنا مستقر بنایا ہے، اور اس طرح اہل پنجاب کے غیور مسلمانوں کے دین و ایمان اور عشقِ رسول کو چیلنج کیا ہے؟

(ماہر القادری)

محترم چوہدری غلام احمد صاحب پرویز

معرفت مدیر رسالہ طلوع اسلام۔ کراچی

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

میرے ایک دوست نے مجھے آپ کا رسالہ طلوع اسلام بابت ماہ جنوری و فروری ۱۹۵۸ء جس میں آپ کا ایک مضمون "اسباب زوال امت" بر صفحہ ۴۳ سے ۴۸ تک چھپا ہے پڑھنے کے لئے عطا فرمایا۔ میں نے اس مضمون کا دل سے آخر تک مطالعہ کیا۔ مجھے اس مضمون کے پڑھنے سے پیشتر یہ خیال تھا کہ یہ لوگ یعنی اہل قرآن منکرین حدیث کا گروہ ہے۔ مگر اب معلوم ہوا ہے کہ آپ قرآن کو بھی اس کی اصلی صورت میں نہیں مانتے ہیں اور نہ اس کی پیروی ہی کرتے ہیں۔ بلکہ تاویلات فاسدہ سے اُسے اپنے خیالات کے تحت منکر مانتے ہیں۔ یعنی جو

آپ خود چاہتے ہیں تاویلات بعیدہ سے وہی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ قرآن کی صحیح فرمانبرداری آپ کے نصیب کہاں ؟

پیشتر ازیں میری خط وکتابت آپ کے دینی بھائی اور ہم خیال ڈاکٹر غلام جیلانی صاحب پروفیسر گورنمنٹ کالج کیمبل پور سے ہوئی جنہوں نے اپنی تالیف "دو اسلام" میں دعویٰ تو قرآنی ہمہ دانی کا کیا ۔ مگر وہ قرآن و حدیث کی عبارت میں بھی تمیز نہ کرسکے ۔ آخر انہیں اپنی لغزش کو تسلیم کرنا پڑا ۔ اور وعدہ فرمایا کہ "اگلے اڈیشن سے یہ حصہ حذف ہو جائے گا"

اس سے پیشتر میرے پہلے خط کے جواب میں یہ بھی تسلیم کیا ۔

"کہ آپ قرآن میں تدبر کی کوشش کیا کرتے ہیں ۔ جو آپ کی تحریر سے پتہ چلتا ہے ۔ لیکن ملا کے طلسم سے ابھی آزاد نہیں ہوئے آپ نے تقدیر پر بحث کرتے ہوئے ابتدائی سطور میں بڑے کام کی باتیں کہی ہیں ۔ جزاک اللہ"

اس خط وکتابت میں "تقدیر" پر بحث تھی ۔ برق صاحب نے جن دو آیات سے استدلال کیا تھا ۔ میں نے واضح کر دیا کہ ان آیات کا در حقیقت مسئلہ تقدیر سے دور کا بھی تعلق نہیں ۔ اور میں نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے لکھا ۔ کہ تقدیر پر قرآن میں (۹۰) آیات موجود ہیں مگر ان میں سے آپ کو ایک بھی نہ ملی ۔ پھر میں نے اپنی طرف سے دس آیات پیش کیں اور ان کا ترجمہ اور تفسیر کرنے کے لئے لکھا ۔ مگر وہ کسی ایک آیت کی تفسیر بھی پیش نہ کرسکے ۔ اور اپنی عاجزی کا یوں اظہار کیا ۔ جس پر خط وکتابت بند ہو گئی :۔

"بہرحال آپ کے محققانہ خطوط اور آپ کے جذبہ دینی کے لئے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں ۔ آپ کا ارادہ بہت نیک ہے ۔ یہ الگ بات ہے کہ انک لا تھدی من احببت

اور مجھ جیسے "ابوجہل" کو "راہ راست" پر لانا قدرے مشکل بھی ہے"

(خط ڈاکٹر غلام جیلانی برق صاحب مورخہ ۲۱ نومبر ۱۹۵۲ء)

اب میں آپ کے مضمون کی طرف رجوع کرتا ہوں ۔

مغفرۃ و رزق کریم کا غلط ترجمہ

آپ نے رسالہ کے صفحہ ۸۸ پر "لھم مغفرۃ و رزق کریم" کے معنی "ان کے لئے حفاظت کا سامان اور عزت کی روٹی ہے" لکھے ہیں ۔ مغفرۃ کے معنی "حفاظت کا سامان" تحریف معنوی ہے ۔ کیونکہ آیت میں مغفرۃ کے معنی آخرت میں بخشش کے ہیں ۔ یعنی ان کا انجام اللہ کے ہاں بخشش ہے ۔ اور "رزق کریم" سے محض "عزت کی روٹی" مراد لینا بھی اللہ تعالیٰ کے ان سب نعمات کو محدود کرنا ہے ۔ جو بہشت میں ہر قسم کے انعامات کی شکل میں بے شمار تعداد میں ہیں اور اس لفظ کے مفہوم میں داخل ہیں ۔ یہ بھی خاص طور پر نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ مغفرۃ کا تعلق عالم آخرت سے ہے ۔ اس سے دنیا کے سازو سامان مراد لینا آیت کے منشا کے خلاف ہے ۔ پھر مغفرت کے بعد رزق کریم کا ذکر تمام نعمات جنت کو خاص کرتا ہے ۔

لہذا اس آیت کی بنا پر جو آپ نے عمارت کھڑی کی ہے ۔ وہ یکدم منہدم ہو جاتی ہے آپ کا یہ بیان اور ترجمہ اپنے اندر کوئی خوبی نہیں رکھتے بلکہ "تحریفات کلمات عن مواضعہ" کے مصداق ہیں ؎

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

مندرجہ بالا عبارت سے معلوم ہوا ۔ کہ یہاں لفظ مغفرت ایک خاص معنی پر دلالت کرتا ہے اور لفظ خاص ہے ۔ اور لفظ خاص کا مدلول اپنے مفہوم کے لئے کسی کا محتاج نہیں ہوتا ۔ اور آپ نے جو کچھ کیا ہے وہ محض تکلف ہے ۔

دنیا اور آخرت کی مراد میں اصولی اور بنیادی غلطی

آپ کے اس سارے مضمون میں یہی بنیادی اور اصولی غلطی کارفرما ہے۔ آپ نے دنیا سے مراد زمانۂ حال، اور آخرت سے مراد دنیا ہی میں زمانہ مستقبل مراد لیا ہے۔ یہ تاویل فاسد کاسد ہے۔ جو آپ جیسے مفسرین کا ہی حصہ ہو سکتا ہے۔ تاویل تو قرآن میں صرف اُن مواقع پر کی جانی لازم ہوجاتی ہے۔ جہاں لفظ کے ظاہر معنی مراد نہ لئے جا سکتے ہوں۔ دنیا اور آخرت دونوں عام معنی کے لحاظ سے ظاہر ہیں۔ جن کی تاویل کی حاجت نہیں خدا ہر سچے مسلمان کو ایسی جرأت سے باز رکھے۔

نئی اصطلاح قائم کرکے قرآن کو اس کے تابع بنانے کی بے جا کوشش

آپ رسالہ کے صفحہ ۱۸ پر لکھتے ہیں:۔

"قرآن پیش افتادہ قریبی مفاد عاجلہ کو "دنیا" سے تعبیر کرتا ہے اور مستقبل کا نام "آخرت" رکھتا ہے۔ لہٰذا اس کے نزدیک متاع دنیا سے مفہوم ہوتا ہے وہ مفاد جو انسان صرف اپنی ذات کے لئے تلاش کرتا ہے اور متاع آخرت سے مقصود ہوتا ہے وہ متاع جسے وہ آنے والی نسلوں کے لئے تیار کرتا ہے۔"

نیز اس بحث سے ایک نئی اصطلاح قائم کی ہے جس پر آپ نے اپنے سارے مضمون کا دارومدار رکھا ہے۔ چنانچہ صفحہ ۸۴ پر لکھتے ہیں:۔
"دنیا اور آخرت کے اس اصطلاحی مفہوم کو سامنے رکھئے اور پھر اُن معاملات پر غور کیجئے جن میں قرآن نے صرف دنیا (حال کی پیش افتادہ مفاد) کو خذف ریزے اور آخرت (مستقبل) کے مفاد کو متاع حقیقی قرار دیا ہے۔"

آپ کے سارے مضمون میں اسی نظریہ کی پابندی میں آیات کے صحیح صاف اور سادہ مفہوم کو توڑ موڑ کر اس کے مطابق بنانے کی بے جا کوشش کی گئی ہے، اور بس۔

ظاہر ہے کہ جو شخص اپنے دل میں کوئی بات ٹھیرا کر یا کوئی نظریہ پہلے سے قائم کرکے قرآن کو اس کے مطابق بنانے کی کوشش کرتا ہے تو قرآن اسے اور گمراہ کردیتا ہے۔ کیونکہ اس کا مقصد دراصل قرآن کا اتباع نہیں ہوتا بلکہ وہ قرآن کو اپنے نظریہ کی تائید کا ذریعہ بنانا چاہتا ہے یا بالفاظ دیگر قرآن کو اپنے نظریے کے ماتحت چلانا چاہتا ہے۔ پھر بھلا یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ قرآن کسی کی ماتحتی اختیار کرے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسا کرنے والا انسان اور زیادہ گمراہ ہو جاتا ہے یضل به کثیرا کا یہی مطلب ہے۔ قرآن صرف اسی کے لئے ہدایت، شفا اور رحمت ہے جو قرآن سے ہدایت کا طالب ہو۔ وننزل من القرآن ما هو شفاء ورحمة للمؤمنين ولا يزيد الظالمين الا خسارا ———— یعنی قرآن مومنین کے لئے یعنی قرآن کے ماننے اور اس کا اتباع کرنے والوں کے لئے تو شفا اور رحمت ہے لیکن یہی قرآن ظالموں نا انصافوں اور اس کا اتباع نہ کرنے والوں کے لئے الٹا اور زیادہ ان کے نقصان کا باعث بن جاتا ہے۔ چونکہ آپ اپنے مضامین میں قرآن کا اتباع نہیں کرتے۔ بلکہ اپنے نظریہ کی تائید چاہتے ہیں۔ اس لئے آپ کا بیان قرآن کا مفہوم نہیں جس کی تشریح ذیل میں آتی ہے۔

اب آپ کے رسالہ کے صفحہ ۱۸ کی مندرجہ بالا عبارت پیش نظر ہے جس میں آپ نے دنیا کو "زمانہ حال" اور آخرت کو "مستقبل" سے تعبیر کیا ہے۔ اگر غور فرمائیں تو آپ پر واضح ہو جائے گا کہ کوئی زمانہ حال دنیا میں ہمیشہ زمانہ حال نہیں رہتا۔ اور نہ کوئی زمانہ مستقبل ہی ہمیشہ مستقبل رہ سکتا ہے بلکہ قیامت کے قریب تو مستقبل ہی ایک دن زمانہ ماضی ہو جائے گا۔ پھر دنیا کے کسی مستقبل کو ہی آخرت کیسے کہا جا سکتا ہے۔ دیکھئے تو یہ روز مرہ کی بات عیاں ہے۔ کہ آج زمانہ حال میں ہے اور کل مستقبل میں۔ تو کل ہی آج کا زمانہ ماضی ہو جائے گا۔ اور کل زمانہ مستقبل زمانہ حال میں بدل جائے گا۔ اور پرسوں زمانہ مستقبل میں آ جائے گا اور آج اور کل دونوں زمانہ ماضی میں بدل جائیں گے تو آپ کے اس نظریہ کو کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے جبکہ دنیا میں کوئی زمانہ مستقبل نہیں رہ سکتا۔

اگر حال کی دنیا کا نام آپ کی اصطلاح میں مفادات عاجلہ ہے۔ تو آنے والی نسلوں کا متاع بھی حقیقتاً مفادات عاجلہ ہی ہوں گے۔ کیونکہ وہ اسی دنیا میں باقی ہے۔ اور کیفیت متغیر نہیں ہوئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز آپ کی اصطلاح میں مبدا ہے۔ کل وہ آپ کی آئندہ نسل کے لئے بھی مبدا ہی کہلائے گی۔ حالانکہ آخرت سے مراد معاد ہے۔ چونکہ ہر مبدا کے لئے معاد ہے۔ اس لئے آپ کے مبدا کے لئے بھی معاد کی ضرورت ہے۔ اگر آخرت سے متعلق وہ متاع ہے جو آنے والی نسلوں کے لئے تیار کی گئی ہے تو آپ کے مبدا کے لئے معاد کس شے کو قرار دیا جائے گا۔ اور اگر آنے والی نسلوں کا متاع معاد فرض کر لیا جائے تو ان نسلوں کے اس معاد کے لئے مبدا کیا ہوگا؟

مزید اس تشریح میں انتقاض ضد لازم آتا ہے۔ جو سراسر اصولوں کے خلاف ہے۔ ہر شے کے لئے ضد کا ہونا ضروری ہے۔ کما هو ظاہر یہاں تک کہ تعریف "الاشیاء تعرف باضدادها" بجائے خود اس کلیہ پر دوسری دلیل کا کام دیتا ہے۔

ثانیاً آج تک کسی لغت نے تو کیا کسی عالم نے بھی دنیا اور آخرت کو ایک مقام قرار نہیں دیا۔ ملاحظہ ہو آپ نے یہی لغزش اپنے رسالہ کے صفحہ ۸۶ پر ترجمہ آیت ۳/۱۴۴ ومن یرد ثواب الدنیا نؤته منها ومن یرد ثواب الآخرة نؤته منها .... کے ترجمہ میں کی ہے (جو صرف حال کی خوشگواریاں چاہتا ہے اسے یہ کچھ مل جاتا ہے جو مستقبل کی تابناکی کے لئے خواہاں ہوتا ہے اسے وہ مل جاتا ہے) شاید آپ نے اپنی فصاحت کی خوبی ظاہر کرنے کے لئے دونوں ترجمے کے الفاظ میں اختلاف فرمایا ہے حال کی خوشگواریاں غالباً مفاد عاجلہ کی شرح ہے۔ اور مستقبل کی تابناکی متاع آخرت کی تفسیر ہے۔ محض الفاظ کے ہیر پھیر سے کوئی اصطلاح نہیں بن جایا کرتی۔ اصطلاح اسی وقت کہلاتی ہے کہ جب کسی لفظ یا مجموعۂ الفاظ پر تمام قوم یا تمام اہل حق کا اتفاق ہو جائے اور جس کا استعمال کسی خاص معنی میں تمام قوم یا تمام اہل فن کے نزدیک جائز ہو۔ اور اس کے خلاف پر کوئی دلیل نہ ہو۔ خود الفاظ تراشنے سے کچھ نہیں بنتا۔ البتہ اگر آپ اپنی خودساختہ اصطلاحات کو قوم یا اہل فن کے سامنے پیش کر دیتے اور ان کا آپ کے معہود مفاہیم پر اجماع ہو جاتا تو ان پر بحث پڑتا۔ اس جملہ معترضہ کے بعد لفظ دنیا اور لفظ آخرت کی صرفی حیثیت پر غور کیا جائے تو ہر دو لفظ ظرف مکان کے تحت میں آتے ہیں اور جب تشبیہ ہونے کی اسا چاہتیں کیونکہ صحیح تقابل کے لئے یہ ضروری امر ہے۔ گویا لفظ دنیا اور لفظ آخرت اگر مقام دنیا اور مقام آخرت پر منطبق ہو جائیں تو اقرب الی الفہم ہو جاتے ہیں۔ مقام دنیا ایک محسوس چیز ہے جسے ہر شخص جانتا ہے کہ وہ ایک مقام ہے نہ کہ کوئی سامان یا زمانہ۔ علیٰ ہذا مقام آخرت سے بھی کوئی مقام خاص ہی مقصود ہو سکتا ہے جیسے کہ دنیا ہے۔ کیونکہ

چونکہ { دنیا ایک مقام ہے۔ اور کوئی مقام سامان یا زمانہ نہیں۔ } اس لئے دنیا سامان یا زمانہ نہیں

اگر کبھی کسی جگہ ایسے مفہوم کا ادراک ہو بھی سکتا ہے۔ تو اس سے نہ تو مقام دنیا ہی اور نہ سامان دنیا ہی مقصود ہوگا بلکہ ظاہری عالم مراد ہوگا خواہ وہ کسی کیفیت کے اظہار کے لئے ہو یا کسی اور ہی مفہوم کے لئے اور بس.....

ع میری دنیا لٹ رہی تھی اور میں خاموش تھا

اسی طرح دنیا اور آخرت سے مراد وہ مفہوم لے لیا جائے گا۔ جو ان ہر دو الفاظ کے فحوے سے مترشح ہو۔ یعنی بالفاظ دیگر مفہوم ہوتا ہو۔ البتہ لفظ مشترک (مشترک فی المعانی) میں نحو کا مسئلہ جو نہ اعتبار بھی سمجھا جائے اس پر قرینہ کا ہونا ضروری ہے۔ فیصلہ قرینہ کے حق میں ہوگا اور جیسا کہ اصولوں سے ظاہر ہے دوسرا اعتبار ساقط ہو جائے گا۔ اور ویسے بھی انسان کے لئے چونکہ کسی نہ کسی مستقر کا ہونا ضروری ہے جس پر اس سے افعال صادر ہوں۔ اسی طرح ان اعمال پر نتائج کے ترتب کے لئے کسی مستقر کی ضرورت ہے۔

ولکم فی الارض مستقر و متاع الی حین،

اگر آپ کی اصطلاحات کو قرآن کی تفسیر میں جگہ دی جائے۔ اور اس طرح تاویل کا دروازہ کھول دیا جائے کہ جب کسی کے جی میں جو آئے اُسے کسی آیت کی تفسیر بنالے۔ تو پھر احکام الٰہی جو اس قرآن میں مندرج ہیں وہ بازیچہ اطفال بن کر رہ جائیں گے۔

مثلاً آپ جیسے بلکہ آپ سے ذرا زیادہ فرورڈ شخص زید نامی قرآن کی اُن آیات کو لیتا ہے۔ جن سے مرزائی حضرات اجرائے نبوت غیر تشریعی ثابت کرتے ہیں۔ وہ اپنی تاویل سے انہی آیات کو اپنے لئے تشریعی نبوت کے دعویدار ہونے میں پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ آیت یبنی ادم اما یاتینکم رسل منکم یقصون علیکم ایتی فمن اتقی واصلح فلا خوف علیہم ولا ھم یحزنون .... میں فرماتا ہے کہ۔ اے بنی آدم جب تمہارے پاس تم میں سے رسول آئیں۔ اور تم پر میری آیتیں بیان کریں پھر جو کوئی پرہیزگاری اختیار کرے اور اپنی اصلاح کر لے تو اس پر کچھ خوف نہیں اور نہ وہ غم گین ہوں گے۔ اب اس آیت میں چونکہ بنی آدم مخاطب ہیں اور بنی آدم قیامت تک رہیں گے۔ تو نبوت کیسے ختم ہو گئی؟

اب اگر قرآن کے معنی اور تفسیر میں تاویل کی اس طرح آزادی دیدی جائے۔ جیسے یہ نہیں اندازہ مرزائی حضرات اپنی تاویلوں اپنی راستی پر ہیں یا زید ہی۔ ایسی صورت میں نہ کوئی انہیں روک سکے گا اور نہ کسی اور کو۔ تو نتیجہ اس آزادی کا کیا ہوگا؟ یہی کہ کلام الٰہی ایک کھیل تماشا بن کر رہ جائے گا۔ اور ایسی بیہودہ تاویلات کی روک تھام کے لئے ہمارے پاس کوئی حربہ نہ ہوگا۔ اور قرآن کے ترجمہ اور تفسیر کی صحت اور عدم صحت کا کوئی معیار باقی نہ رہے گا۔ لوگ گمراہ ہو جائیں گے۔ اور قرآن کا آسان ہونا تو درکنار۔ قرآن کا سمجھنا مشکل ترین بن جائے گا۔۔۔ تاویلات بعیدہ کا ایک سیلاب امنڈ آئے گا جو دین و ایمان کو ساتھ بہالے جائے گا ؎

احکام تیرے حق ہیں مگر اپنے مفسر
تاویل سے قرآن کو بنا سکتے ہیں پاژند

اختلاف کے وقت فیصلے کی صحیح صورت

جب کسی بات میں تنازع اور اختلاف واقع ہو۔ تو قرآن نے خود اس کا حل بتلایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ ۔۔۔

یایھا الذین امنوا اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شیء فردوہ الی اللہ والرسول ان کنتم تومنون باللہ والیوم الاخر ط ذلک خیر و احسن تاویلا

(پ ۵ رکوع ۵)

ترجمہ: "اے ایمان والو اللہ کا کہا مانو اور رسول کی فرمانبرداری کرو اور جو لوگ تم میں سے اہل حکومت ہیں ان کی بھی تابعداری کرو پھر اگر کسی چیز میں تمہارا اختلاف ہو جائے۔ تو اُسے اللہ اور رسول کے حوالے کرو اگر تم اللہ اور روز قیامت پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی اچھی بات ہے اور انجام کے لحاظ سے بہترین"

اب اول ہمارا اور آپ کا اس بات میں اختلاف ہے کہ آپ قرآن میں دنیا کے معنی زمانہ حال کے اور آخرۃ کے معنی بھی دنیا ہی میں زمانہ مستقبل کے لیتے ہیں۔ اور ہم دنیا سے عالم دنیا اور آخرۃ سے عالم آخرت مراد لیتے ہیں۔ دوسرے آیت مذکورہ بالا یبنی ادم اما یاتینکم ۔۔ میں ہم تین فریق ہیں۔ ہم اس آیت کو ختم نبوت کے منافی نہیں سمجھتے۔ مرزائی حضرات اس سے اجرائے نبوت غیر تشریعی مانتے ہیں۔ اور تیسرا زید ہے کہ اسی آیت کے بل بوتے پر تشریعی نبوت کا مدعی ہے۔

اب ان میں فیصلہ کیسے ہو؟ خدا سے کلام تو ہیں کر سکتے۔ کہ اس سے دریافت کرلیں۔ اور جبرئیل آتے نہیں۔ فرمایا ہے کہ نزاع کے موقع پر اللہ کی طرف رجوع کرو۔ اس سے مراد یہ ہے کہ کتاب اللہ یعنی قرآن کریم سے فیصلہ حاصل کرو۔ مگر یہاں تو قرآن ہی کے

الفاظ دو آیات متنازع فیہ ہیں۔ ایسی صورت میں لامحالہ رسول کی طرف رجوع کا حکم ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابھی دنیا میں زندہ نہیں کہ ان سے دریافت ہو سکے۔ لہٰذا اس سے مراد یہی تو ہے کہ سنتِ رسول اللہ کو تلاش کیا جائے۔ کیا اللہ تعالیٰ کو معلوم نہ تھا کہ حضور وفات پا جائیں گے۔ پھر حضور کی طرف معاملے جانے کے حکم الٰہی سے حدیث رسول اور سنت رسول اللہ مراد نہیں تو اور کیا ہے؟ اور آپ ہیں کہ اسے مانتے نہیں۔ پھر ہم کہاں جائیں۔ اور کس سے فیصلہ چاہیں؟ اور بفرض محال اگر کوئی فیصلہ کرنے والا پیدا بھی ہو جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم اس کے فیصلے پر راضی بھی ہو جائیں گے؟ اور ہماری تسلی کیسے ہوگی؟

اپنی ضد پر ڈٹے رہ کر حدیث کو نہ مانتے ہوئے بتلایئے کہ ان سوالات کا حل کیا ہے؟

مجھے افسوس ہے کہ حدیث کے انکار سے آپ قرآن کے بھی منکر ہوتے جاتے ہیں۔ مندرجہ بالا آیت نزاع کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کی طرف رجوع کرنے میں نص قطعی ہے۔ اور اگر آپ اس موقع پر حضور کی طرف رجوع نہیں کریں گے یا بالفاظ دیگر اس کا حل حدیث سے تلاش نہ کریں گے تو ایک تو آپ قرآن ہی کے خلاف کریں گے۔ کیونکہ قرآن ہی کا حکم ہے کہ نزاع کے موقع پر قرآن کے بعد حضور کی طرف رجوع کیا جائے۔ دوسرے آپ ان لوگوں کی تسلی کیسے کر سکیں گے جو قرآن و حدیث دونوں کو ماننے والے ہیں، اور حدیث میں اس نزاع کا فیصلہ موجود ہے۔

پھر حضور سے ارشاد ہوتا ہے۔ وما انزلنا علیک الکتٰب الا لتبین لھم الذی اختلفوا فیہ و رحمۃ لقوم یؤمنون۔ (پ ۱۴ رکوع ۹)

"ہم نے آپ پر کتاب صرف اس واسطے نازل کی ہے کہ جن امور میں لوگ اختلاف کریں آپ لوگوں پر اس کو اپنے بیان سے یعنی قرآنی احکام و مسائل کی تشریح کر کے منشاء رب العالمین واضح اور ظاہر فرمائیں" بدستور آپ کا یہ بیان، مومنین کیلئے باعث رحمت ہوگا۔

گویا ایک آیت قرآن کے اختلافی مسائل میں حضور کی طرف رجوع کا حکم دے رہی ہے اور دوسری کتاب کے صحیح مفہوم کو لوگوں پر واضح کرنے کا منصب حضور صلعم کو عطا کر رہی ہے، جس سے ظاہر ہے کہ آپ کا خاص الخاص منصب ہے کہ قرآن میں نازل کردہ احکام کو لوگوں پر واضح کیا جائے۔ قرآن کے متعلق یہی وہ ارشادات نبوی ہیں جنہیں ہم اپنی اصطلاح میں حدیث اور سنت کہتے ہیں۔

آپ لوگوں نے قرآن کے مفہوم میں اپنی عقل کے گھوڑے دوڑا کر حضور کو ان کے اصل منصب سے گرا دیا ہے، اور قرآن کو آنحضرت صلعم سے بہتر سمجھنے کے مدعی بن بیٹھے ہیں۔ جو درپردہ انکار نبوت اور نبوت پر افضلیت کا دعویٰ ہے ؎

خلاف پیمبر کسے رہ گزید
کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

اختلاف روایات

موضوع اور ضعیف وغیرہ روایت میں اختلاف پا کر آپ لوگوں نے صحیح حدیث و سنت سے بھی انکار کر دیا ہے، اور عوام الناس میں حدیث کے خلاف پراپیگنڈہ شروع کر دیا ہے۔ حالانکہ آپ کو کس نے مجبور کیا ہے کہ ضعیف۔ موضوع۔ منکر اور مجروح روایات کو تسلیم کریں۔

جب حدیث کے ماننے اور رد کرنے یا حدیث کی صحت اور عدم صحت کے اصول موجود ہیں جن کی امداد سے ہر سلیم العقل انسان حدیث کے درجات میں بخوبی اور بآسانی تمیز کر سکتا ہے۔ تو پھر کیا غم ہے :-

بطرا ز طوفاں چہ باک

جب "اختلاف امتی رحمۃ" کے متعلق موضوعات کبیر میں ہے، بہ لا اصل لہ یعنی اس کی کوئی اصل نہیں اور یہ موضوع ہے تو پھر آپ کو کیا حق حاصل ہے کہ اسے حدیث ٹھہرا کر اس کے خلاف لکھیں اور لوگوں کو صحیح حدیث سے بھی متنفر کریں۔

تحریر حدیث در عہد رسالت مآب اور اختلاف روایات کے متعلق میں ڈاکٹر برق صاحب کے مفصل تحریر کر کے کافی ثبوت بہم پہنچا چکا ہوں۔ جن کے جواب سے وہ قاصر رہے ہیں اس لئے میں یہ بحث دوبارہ چھیڑنا مناسب نہیں سمجھتا۔ لیکن مختصر یہ کہ اصول میں اختلاف نہیں۔ اور فروع میں اختلاف مضر نہیں بلکہ لازمی اور ناگزیر ہے۔ لا یکلف اللہ نفساً الا وسعھا نص قطعی سے ظاہر ہے سے

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن
اے ذوق اس جہان کو ہے زیب اختلاف سے

آپ لوگ عوام الناس میں مشہور کرتے ہیں، کہ حضور نے حدیث لکھنے سے منع فرمایا، اور خلفائے راشدین حدیث کے مجموعے منگا کر جلا دیتے تھے۔ میں آپ سے دریافت کرتا ہوں کہ کیا آپ نے جن کتب میں یہ واقعات مطالعہ کئے ہیں، کیا انہیں کتب میں یہ بھی درج نہیں کہ حضور صلعم نے عبداللہ عمرو بن عاص سے فرمایا۔ "جو کچھ اس منہ سے نکلے لکھ لیا کرو کیونکہ قسم ہے اس خدا کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے جو کچھ اس سے نکلتا ہے وہ حق ہے"۔

اُکتب فوالذی نفسی بیدہ ما یخرج منہ الاحقاً...... (ابوداؤد) اور حضرت ابوبکر رض اور عمر رض قرآن میں کوئی حکم نہ پاتے تو اس صورت میں صحابہ سے دریافت فرماتے۔ کہ اس کے متعلق حضور صلعم نے کیا فیصلہ صادر فرمایا تھا۔ پھر اس کے مطابق فیصلہ دیتے وغیرہ

اگر یہ صحیح ہے کہ ایسی روایات انہیں کتابوں میں موجود ہیں۔ تو پھر سے آپ کی بددیانتی اور دینی وعلمی خیانت نہ کہیں تو اور کیا کہیں اور کونسی دیانت کی طرف مسلمانوں کو دعوت دی جارہی ہے۔ خدا سے ڈریئے۔ اور اپنے خیالات کی اصلاح کریجئے۔ ورنہ اس کے ہاں ایک دن جواب دہی ضروری ہے۔ اور آپ کے پاس اس کا جواب کوئی نہیں......

فیصلہ

اب ہم قرآنی حکم کے مطابق حضور سے جو اس متنازعہ فیہ امر میں فیصلہ چاہتے ہیں۔ تو سند جو ذیل حدیث ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے

الدنیا مزرعۃ الآخرۃ

یہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔

اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ دنیا اور آخرت دو مختلف چیزیں ہیں۔ اور دنیا میدان عمل ہے اور آخرت ان اعمال کے نتائج حاصل کرنے کا مقام۔ یہ حدیث گویا قرآن کی اُن آیات کی تفسیر ہے۔ جن میں دنیا اور آخرت کا ذکر ہے۔

حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ الدنیا جیفۃ وطالبھا کلاب" یہ دنیا مردار ہے اور اس کے طلب کرنے والے کتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی احادیث ہیں جن سے دنیا کی مذمت نکلتی ہے۔ مگر ان سب کا مطلب یہ ہے جو کسی عارف نے ایک ہی شعر میں بیان کر دیا ہے سے

چیست دنیا از خدا غافل بدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

یعنی جس متاع دنیا کی احادیث میں مذمت آئی ہے۔ اس سے مراد خدا سے اور خدا کے احکام سے غافل ہو کر دنیا کا مال جمع کرنا

ہے۔ ورنہ دنیا میں خدا کے احکام کو ملحوظ رکھتے ہوئے صاحب مقدرت بن جانا عین مبارک ہے۔ چنانچہ مولانا سعدیؒ فرماتے ہیں۔

در عمل نیک کوش ہر چہ خواہی پوش

غور کیا جائے تو اس قسم کی احادیث بھی قرآن ہی کی تفسیر ہیں۔ کیونکہ قرآن نے خود ایسی دنیا اور اس کے ساز و سامان کی مذمت فرمائی ہے۔ مگر آپ صرف قرآن ہی کو ماننے کا دعویٰ کرتے ہوئے بھی قرآن نہ پڑھیں۔ اور اس پر تدبر و تفکر سے کام نہ لیں۔ پھر اس کے ایک پہلو کو لیں اور دوسرے کو نظر انداز کر دیں۔ اور افتومنون ببعض الکتاب و تکفرون ببعض ...... کے مصداق بن جائیں، تو اس میں قصور کس کا ہے؟

ذیل میں ارشادات خداوندی کو بغور دیکھئے، کہ کن پر زور الفاظ میں ایسی دنیا اور اس کے متاع کی مذمت فرمائی ہے۔

(۱) وما الحیٰوۃ الدنیا الا متاع الغرور ———— (پ۴ رکوع ۱۰)

اور دنیا کی زندگی ہے کیا محض دھوکے کی پونجی ہے (حقانی)

(۲) وما الحیٰوۃ الدنیا الا لعب ولھو ط وللدار الاخرۃ خیر للذین یتقون ط افلا تعقلون (پ۷ رکوع ۱۰)

اور دنیا کی زندگی ہے کیا مگر کھیل اور تماشا اور پرہیزگاروں کے لئے آخرت کا گھر بہت ہی بہتر ہے (حقانی)

(۳) وما ھٰذہ الدنیا الا لھو ولعب ط وان الدار الاخرۃ لھی الحیوان لو کانوا یعلمون (پ۲۱ رکوع ۳)

اور کیا ہے اس دنیا کی زندگی مگر کھیل اور کود اور البتہ دار آخرت ہی زندگی کی جگہ ہے، کاش وہ جانتے (حقانی)

(۴) بل تؤثرون الحیٰوۃ الدنیا والاخرۃ خیر وابقیٰ .... (پ۳۰ رکوع ۱۳)

بلکہ تم دنیا کی زندگی پسند کرتے ہو حالانکہ آخرت کا گھر بہتر اور سدا رہنے والا ہے۔ (حقانی)

یہ آیت یوں شروع ہوتی ہے۔ قد افلح من تزکیٰ وذکر اسم ربہ فصلیٰ یعنی جس نے پاکیزگی حاصل کر لی اور اپنے رب کا نام لیتا رہا اور نماز پڑھتا رہا اس نے فلاح پائی۔

تفسیر حقانی میں اس آیت کی تفسیر حسب ذیل ہے:—

"کفار دنیا پرست کہتے تھے کہ ہم کو تو تزکیہ اور ذکر اور نماز میں کوئی فلاح نہیں معلوم ہوتی۔ کیا ہم عقل و ادراک نہیں رکھتے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا ہے یا یوں کہو کہ وہ بھی تزکیہ کے مدعی تھے۔ ان کے جواب میں ارشاد فرماتا ہے۔ تمہیں عقل و ادراک کہاں نہیں۔ بل بلکہ تم تؤثرون الحیٰوۃ الدنیا دنیا کی چند روزہ زندگی اور اس کے لذت فانیہ کو آخرت اور اس کی لذت باقیہ پر فوقیت دیتے ہو۔ حالانکہ والاخرۃ خیر وابقیٰ وہ جہان دنیا سے کہیں بہتر ہے کس لئے کہ دنیا کے گھر میں کونسی لذت ہے جس کے اول بھی تلخی نہ ہو اور آخر بھی تلخی نہ ہو۔ کونسی شادمانی ہے جس میں غم کا کانٹا نہ لگا ہو۔ اگر دنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں اور دولت مندوں سے پوچھئے گا کہ تمہاری پوری مرادیں مل گئیں۔ اب تو کوئی ارمان اور ہوس باقی نہیں۔ تو فوراً کہہ دیں گے۔ ابھی بہت کچھ ارمان دل میں ہیں جو ابھی نہیں نکلے۔ پھر یہ کیسا کانٹا ہے جو ہر وقت کھٹکتا رہتا ہے۔ اور اگر یہ پوچھئے کہ کوئی رنج و غم تو نہیں۔ تو جھٹ بول اٹھیں گے کہ ہزاروں کوئی کہے گا میرا بیٹا مر گیا اور میری زندگی تلخ کر گیا۔ کوئی کہے گا میری محبوبہ مر گئی مجھے اس کی جدائی نے بے چین کر دیا کوئی کہے گا

مجھے فلاں مرض نے مجبور کر رکھا ہے۔ اور اگر ان سب باتوں میں سے کوئی بھی نہیں تو پھر بقا نہیں۔ چند روزہ عیش و کامرانی کے بعد فنا ہے اور فنا بھی ایسی کہ گویا کبھی آئے ہی نہیں تھے۔ برخلاف آخرت کے کہ وہاں کے عیش بے خار ہیں، اور اس پر باقی ہیں فنا ہی نہیں۔"

آپ لوگ موجودہ کفار کی مادی ترقی سے متاثر ہو کر قرآن و حدیث کو خیرباد کہہ بیٹھے ہیں اور خصوصاً حدیث کی آپ کے دل میں کوئی وقعت باقی نہیں رہی۔ حالانکہ قرآن اور حدیث صحیحہ کے مضامین میں تفاوت نہیں۔ بلکہ حدیث تو قرآن ہی کی تشریح و تفسیر ہے کفار کی مادی ترقی سے مرعوب ہونے والے آپ جیسے اصحاب کی تسلی قرآن یوں کرتا ہے کہ حضور کو ارشاد ہوتا ہے:۔

لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ ۔ مَتَاعٌ قَلِيلٌ ۔ ثُمَّ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ لَكِنِ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا　　(پ ۴ رکوع ۱۱)

———— اے نبی! آپ ملک میں کافروں کے اکڑ کر چلنے پھرنے سے دھوکے میں نہ آجانا (یہ تو) تھوڑا سا اسباب ہے پھر تو ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ برا ٹھکانہ ہے۔ لیکن جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہیں، ان کے لئے (وہ) باغ ہیں، جن کے تلے نہریں جاری ہیں۔ جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔　　(حقانی)

یعنی دنیا کے چند روزہ ساز و سامان سے مرعوب نہ ہونا چاہیئے۔ اور دنیا کے اس ساز و سامان کو اللہ تعالیٰ نے "متاع قلیل" فرمایا۔ یہی وجہ ہے کہ اس دنیا میں بادشاہ کی بھی حرص پوری نہیں ہوتی۔ یعنی وہ اپنی سلطنت کو کم سمجھتا ہے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں اللہ کا سچا بندہ اپنی تھوڑی سی پونجی پر قناعت کرتا ہے۔ بادشاہ کو اپنے جاہ و جلال پر بھی ہرگز اطمینان حاصل نہیں۔ اور خدا پر یقین اور بھروسہ کرنے والا فقیر اپنی بے سر و سامانی میں اطمینان کی زندگی بسر کرتا ہے اور اسے حقیقی خوشی نصیب ہے ؎

ہفت اقلیم ار بگیرد پادشاہ　　ہمچناں در بند اقلیمے دگر
نیم نانے گر خورد مرد خدا　　بذل درویشاں کند نیم دگر

اگر وہ سب آیات قرآنیہ یہاں جمع کی جائیں جو اس دنیا اور اس کے متاع کی مذمت کرتی ہیں۔ تو اس کے لئے ایک کتاب درکار ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ جو روایات اور احادیث حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوعاً ثابت ہیں۔ وہ درحقیقت انہیں آیات کی۔ تشریح اور صحیح ترین تعبیر و تفسیر ہیں۔

ہمارا یہ بیان عین تعلیمات قرآنیہ اور احادیث نبویہ یعنی کتاب و سنت کے موافق و مطابق ہے۔ اور ہر سلیم العقل انسان اسے تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ برخلاف اس کے آپ کے ترجمہ اور تشریح کا ثبوت نہ قرآن سے ملتا ہے، نہ اس کی تائید گرامر اور لغت ہی سے ہوتی ہے، اور احادیث کو تو آپ مانتے نہیں۔ پھر جو چیز نقل و عقل دونوں کے خلاف ہے۔ اس کی طرف آپ لوگوں کو دعوت دے رہے ہیں۔

بریں عقل و دانش بباید گریست

مزید برآں آپ کے مضمون سے ظاہر ہے کہ آپ وحی خفی کے قائل نہیں۔ آپ کا یہ مضمون جو پمفلٹ کی شکل میں شائع ہوا ہے اس کے صفحہ ۶۳ کے حاشیہ پر لکھا ہے کہ مسلمانوں کے ہاں وحی غیر متلو کا عقیدہ یہودیوں سے آیا ہے۔ دوسرے حدیث و سنت کے فرق سے آپ نابلد محض ہیں اور تیسرے قرآن و حدیث میں مثلیت (مثلہ معہ) کی حقیقت سے بالکل بے خبر ہیں۔ اور یہ سب کچھ قرآن میں عدم تدبر کا نتیجہ ہے۔

مگران پر مفصل طور پر بحث کی جائے اور آپ کے مضمون کا پورا پورا جواب تحریر کیا جائے تو اس کے لئے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے اور میں صرف اس خط سے آپ کو متنبہ کرنا چاہتا ہوں، کہ جو راستہ آپ نے اختیار کیا ہے۔ وہ قرآن کے اصل منشا اور صحیح مفہوم سے واضح اور ثابت نہیں۔ بلکہ آپ قرآن کو اپنے وہم و گمان کے تابع بنانے کی فکر میں ہیں۔ جو ہرگز ممکن نہیں۔

این خیال است و محال است و جنوں

بہرحال آپ کے اوہام کے لئے میں ان تینوں پر کسی قدر نہایت اختصار سے روشنی ڈالتا ہوں۔ خدا کرے آپ کے لئے مفید ہو وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب۔

وحی جلی و خفی

قرآن میں وحی کی بے شمار قسمیں ہیں۔ کہیں پہاڑوں اور زمین و آسمان کو وحی کی جاتی ہے۔ کہیں شہد کی مکھی کو وحی ہوتی ہے کہیں فرشتوں کی طرف کہیں موسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ کو وحی کی جا رہی ہے۔ کہیں یوسف ؑ کو قبل نبوت کنوئیں میں وحی آتی ہے کہیں عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں پر وحی کا نزول ہوتا ہے اور انبیاء علیہم السلام کی وحی سے تو تمام قرآن بھرا پڑا ہے۔ کیا یہ سب وحیئیں یکساں ہیں؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ ان میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ انبیاء علیہم السلام کو تو وحی ہوتی ہے کہ ان احکام کو میرے بندوں تک پہنچا دیجئے اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا یا اس میں کمی بیشی کی تو رسالت کا حق ادا نہ ہوگا۔ اور اس وحی کا چھپانا جرم عظیم ہے۔ مگر موسیٰ ؑ کی والدہ کو وحی ہوتی ہے کہ بچے کو صندوق میں بند کر کے دریا میں ڈال دو۔ کیا اس کا ظاہر یا اعلان ضروری تھا۔ ہرگز نہیں بلکہ اس کا اخفا لازمی تھا۔ اسی طرح حضرت یوسف ؑ کو بھی پہلی وحی کے اظہار کا حکم نہ تھا۔ حضرت عیسیٰ ؑ کے حواریوں کو وحی ہوئی۔ حضور صلعم پر دونوں قسم کی وحی ہوتی رہی۔ ایک تو وہ جس کے لئے حکم ہوتا ہے بلغ ما انزل الیک من ربک یعنی جو کچھ آپ کی طرف نازل ہوتا ہے لوگوں کو پہنچا دیجئے۔ اور وہ الہامات ہیں جن کی طرف مندرجہ ذیل آیت میں جملہ "بما اراک اللہ" میں اشارہ موجود ہے:

انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما اراک اللہ ولا تکن للخائنین خصیما

(پ۵ رکوع ۱۳)

بیشک ہم نے (اے نبی) آپ پر کتاب برحق نازل کی ہے۔ جیسا کہ کچھ خدا نے تم کو بتایا ہے۔ اسی کے موافق لوگوں کے جھگڑے فیصلہ کیا کرو۔ (حقانی)

بما اراک اللہ کا ترجمہ مستند تراجم میں حسب ذیل ہے:-

۱:- دکھلاتا ہے تجھ کو اللہ۔ (شاہ رفیع الدینؒ)

۲:- جو اللہ نے آپ کو بتلایا ہے۔ (مولانا اشرف علی تھانویؒ)

۳:- بحسب تعلیم الٰہی۔ (خلاصۃ التفاسیر)

۴:- جو کچھ سمجھا دے تجھ کو اللہ (مولانا محمود الحسنؒ شیخ الہند)

۵:- جو کچھ اللہ نے تجھے علم دیا ہے (مولوی محمد علی صاحب بیان القرآن)

۶:- جیسا کچھ خدا نے بتلا دیا ہے (ترجمان القرآن مولانا آزاد صاحب)

۷:- جیسا کہ کچھ خدا نے تم کو بتایا ہے (حقانی)

۸:- جو اللہ نے تجھ کو بتلا دیا ہے (تفسیر القرآن از مولوی محمد انشاء اللہ ایڈیٹر اخبار وطن)

۹۔ جو سمجھائے تجھ کو اللہ (احسن التفاسیر)

۱۰۔ اللہ کے بتلائے ہوئے سے حکم کرے۔ (تفسیر ثنائی)

ثلاث عشرۃ کاملۃ

اس آیت کی شان نزول میں "در منثور" میں ہے، کہ طعمہ بن ابیرق نے اپنے چچا کی زرہ چرائی اور زید سمین کا یہودی کا نام لگایا حضورؐ نے بعد گفت و شنید یہودی کو سزا دینے کا قصد کیا اور طعمہ کی قوم امید وار تھی کہ حضورؐ ہم مسلمانوں کی رعایت فرمائیں گے۔ یہودی گو سچا ہی کیوں نہ ہو۔ ذلیل و خوار ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے یوں قلعی کھول دی۔ (خلاصۃ التفاسیر جلد ۱ صفحہ ۴۲۳)

آیت میں کوئی واقعہ مذکور نہیں۔ مگر بما ارٰئک اللہ میں اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ اللہ نے آپ کو کچھ سمجھا دیا تھا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی پھر اسی کے مطابق فیصلہ فرمایا۔ غور فرمائیے:۔

(۱) کتاب میں اس قصہ کا مذکور نہ ہونا۔

(۲) حضورؐ کا یہودی کو سزا دینے کا قصد کرنا۔

(۳) پھر بحسب تعلیم الٰہی یوں فیصلہ فرمانا:۔ کہ

(۴) یہودی کو سچا ٹھیرانا۔ اور

(۵) طعمہ کو مجرم قرار دینا۔

ظاہر کرتا ہے کہ کتاب کے سوا سب کی تشریح و تفسیر کی تعلیم کا منبع بھی ذات الٰہی تھی۔ اسی تعلیم کو وحی خفی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور یہ آیت ہر دو وحی جلی و خفی دونوں کے لئے نص ہے۔ جلی وحی کے لئے فرمایا انا انزلنا الیک الکتاب اور اسی کتاب میں فیصلہ کرنے کو وحی خفی کے لئے بما ارٰئک اللہ کہہ کر ظاہر فرما دیا۔ کہ کتاب کی تشریح بھی ہم حضورؐ ہی کی معرفت وحی خفی سے کیا کرتے ہیں۔ اور چونکہ یہ تشریح کتاب یعنی قرآن میں درج نہیں۔ اس لئے ہم اسے حدیث و سنت اور وحی خفی کے نام سے پکارتے ہیں۔

یہی صورت ایک اور جگہ سے بھی ملاحظہ ہو:۔

واذ یعدکم اللہ احدی الطائفتین انہا لکم وتودون ان غیر ذات الشوکۃ .... الخ

"اور وہ وقت یاد کرو جبکہ اللہ تم سے وعدہ کر رہا تھا دو گروہوں میں سے ایک تمہارے ہی لئے ہے۔ اور تمہاری خواہش یہ تھی کہ جو گروہ کم شوکت و قوت والا ہے وہی تمہارے حصے میں آئے" یہ غزوۂ بدر سے پہلے ایک واقعے کی طرف اشارہ ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ نے جو مومنوں کے ساتھ وعدہ کیا تھا وہ یقیناً بواسطۂ رسول ہی کیا ہوگا۔ اب اگر رسول سے اللہ کے وعدے کی شکل صرف وحی ہے جو قرآن میں ہے تو اسے قرآن ہی میں ہونا چاہئے لیکن قرآن میں اس کا کہیں ذکر نہیں۔ پھر اس کی شکل بجز الہام کے اور کیا ہو سکتی ہے، اور یہی الہام یعنی وحی "خفی" ہے۔

پھر اگر وحی کے اقسام سے قطع نظر وحی کے ذریعوں پر غور کیا جائے تو بھی یہی نتیجہ نکلے گا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے ماکان لبشر ان یکلمہ اللہ الا وحیاً او من وراء حجاب او یرسل رسولاً فیوحی باذنہ ما یشاء .... کسی بشر کی شان نہیں کہ اللہ سے دو بدو کلام کر سکے۔ بلکہ اس کے تین طریقے ہیں:۔

۱۔ دل میں الہام

۲۔ پس پردہ آواز یا

۳:۔ فرشتہ بھیجکر پیغام پہنچانا۔

ممکن ہے پہلے انبیاء علیہم السلام کو ان تینوں طریقوں میں سے کسی ایک طریق سے کسی کو اور کسی دوسرے طریق سے دوسرے کو وحی ہوتی رہی۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک تو پہلے انبیاء کی طرح وحی ہوئی جس کا ذکر اس آیت میں ہے۔ انا اوحینا الیک کما اوحینا الی نوح وّ النبین من بعدہ (پ ۶ ع ۳) ہم نے آپ کے پاس وحی بھیجی ہے جیسے نوح ؑ اور دیگر انبیاء کے پاس بھیجی تھی۔ وحی کتاب کی شکل اختیار نہ کرسکی اور ان میں اکثر انبیاء ایسے ہیں جن پر کتاب نازل نہیں ہوئی۔ بلکہ یہ طریق اوّل الہام کی صورت تھی۔ اسی الہام ہی کو ہم وحی خفی کہتے ہیں۔ دوسرے قرآن کے نزول کے لئے خاص طور پر فرمایا نزل بہ الروح الامین علے قلبک یعنی قرآن کا نزول بذریعہ جبرئیل علیہ السلام ہوا جس نے کتاب کی شکل اختیار کی۔ ہم اسے وحی جلی کہتے ہیں۔ گویا وحی جلی اور وحی خفی دونوں کا ثبوت قرآن سے ملتا ہے۔ اور جو شخص صرف وحی جلی قرآن ہی کو مانتا ہے تو وہ گویا قرآن کے ایک حصہ کا منکر ہے۔ افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض

حدیث وسنت

ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف قرآن کے سوا ہر چیز کو غیر وحی ہونے کی وجہ سے ظن محض کہہ کر ساقط الاعتبار قرار دیا جارہا ہے۔ اور دوسری جانب ہر دینی علم وفن کو عین وحی بتایا جارہا ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی دیکھنے میں آئے ہیں کہ ان کے سامنے قبل کا شعر پڑھیئے تو جھوم جائیں گے۔ مثنوی رومی کا شعر گنگنایئے تو سر دھننے لگیں گے۔ برکلے، نٹشے اور آئنسٹائن کے فلسفے بیان کیجئے ہمہ تن گوش بن جائیں گے۔ یہ سب کچھ ہوگا لیکن اگر حدیث رسول کہہ کر کچھ سنایئے تو تنگ ہوں گے بیزاری، دماغ میں تردد اور دل میں اعراض دبے رُخی کے انداز پیدا ہو جائیں گے اور دوسری طرف کچھ احباب ایسے بھی دکھائی دیتے ہیں، کہ ان کے سامنے کتنی ہی واضح سے واضح الدلالت آیت پڑھیئے وہ اس پر غور کرنے کے بجائے پہلے یہ دیکھیں گے، کہ اس کے خلاف کوئی روایت تو موجود نہیں؟ یعنی اگر موجود ہو تو قرآن کی آیت کی تاویل کردی جائے۔

پھر ایک شخص کی نگاہ معاملات کے چند متغیر و متبدل جزئیات پر پڑتی ہے، اور وہ دیکھتا ہے کہ یہاں احادیث پر حرف بحرف عمل نہیں ہوسکتا تو وہ یہ فیصلہ کرلیتا ہے کہ پورے کا پورا دفتر روایات ہی ناقابل عمل ہے۔ چند روایات کو خلاف قرآن پاتا ہے، تو یہ طے کرکے اٹھتا ہے کہ سارا ذخیرہ ہی خلاف قرآن ہے۔ چند ضعیف یا موضوع روایات کو دیکھ کر یہ یقین کرلیتا ہے کہ حدیث نام ہی اس مجموعے کا ہے۔ جو کلیتہً ساقط الاعتبار ہو۔ اور یہی دوسری طرف بھی ہو رہا ہے۔ اُن کی نظر طریقہ نماز پر پڑتی ہے جو انہوں نے تعامل کے بعد روایت سے حاصل کیا ہے۔ اور وہ اس نماز میں کسی عقلی ترمیم کی گنجائش نہیں پاتے۔ اس لئے متغیر معاملات کے ہر ہر جزو کے بارے میں بھی اپنا آخری فیصلہ یوں صادر فرماتے ہیں، کہ روایات میں جو کچھ بھی ہے وہ سب کا سب غیر متبدل ہے، اور یہ سارا ذخیرہ قرآن کی طرح ناقابل ترمیم و تبدیل ہے۔ اگر ذرا بھی فرق کیا گیا تو یہ وحی کا انکار ہوگا۔ ایسی وحی کا انکار جو "مثلہ معہ" کا درجہ رکھتی ہے۔

گویا یک گروہ کا یہ دعوٰے کہ فلاں بات چونکہ کسی حدیث کی کتاب میں ہے اس لئے ضرور ساقط الاعتبار ہے۔ اور دوسرے فرقے کا یہ ادعا کہ چونکہ فلاں کتاب حدیث میں یہ بات موجود ہے یقیناً درست ہی ہے۔ غرض اب صحت و عدم صحت کا معیار نہ اسناد روایت ہے نہ اصول روایت بلکہ کسی کتاب میں موجود ہونا ہے ؎

خدا ندا ایں تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں

حدیث رسولؐ

یہ مسلم ہے کہ حضورؐ کی بعثت کا مقصد وحید تبلیغ قرآن ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا حضورؐ ساری عمر صرف قرآن ہی بولتے رہے۔

اس کے سوا کچھ نہ کیا۔ نہ بولے نہ دیکھا؟ یہ دعوے کوئی معمولی سے معمولی عقل و دانش رکھنے والا انسان بھی نہ کر سکے گا۔ یقینی بات ہے کہ حضور نے قرآنی الفاظ کے علاوہ بھی کچھ فرمایا ہوگا۔ بس اسی چیز کا نام حدیث ہے۔ اس میں حضور کے افعال بھی داخل ہیں۔ اب دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نبوت کے ۲۳ سال میں حضور نے جو کچھ فرمایا اور جو کچھ کیا وہ حرفاً حرفاً سب محفوظ ہے۔ اگر ایسا نہیں تو کیا اس کی کوئی چیز بھی محفوظ نہیں؟ ہر صاحب عقل کے نزدیک دونوں کا جواب نفی ہی میں ہوگا۔ حقیقت نہ وہ ہے نہ یہ۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حضور کے بے شمار فرامین و اعمال محفوظ ہیں۔ اگر یہ دعوے کیا جائے کہ حضور کی زندگی کا کوئی واقعہ یا عمل یا قول محفوظ نہیں رہا۔ تو دنیا کی جس ہستی کے متعلق جو کچھ بھی ہے۔ اُسے غلط ماننا پڑے گا۔ گویا قرآن کے سوا جو کچھ بھی کہیں لکھا ہوا ہے۔ وہ غیر محفوظ ہے۔

اب یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ حضور کی زندگی کے بہت سے پہلو خواہ قولی ہوں یا فعلی یا تقریری محفوظ ہیں۔ ایک تیسرا سوال پھر سامنے آتا ہے کہ جو کچھ بھی حضور کے متعلق ہے جسے ہم حدیث کہتے ہیں۔ کیا وہ سب لفظاً لفظاً و حرفاً حرفاً صحیح ہے؟ یا سب کا سب مجموعہ اغلاط ہے۔ اس کے جواب کی نوعیت بھی وہی ہے جو دوسرے سوال کے جواب کی ہے، کہ نہ تو سب کا سب حرفاً حرفاً کانٹے کی تول سے صحیح ہے اور نہ سب کا سب سراسر غلط۔ بلکہ کچھ حصہ[1] صحیح ہے۔ اور کچھ غلط یا مشتبہ۔

اب چوتھا سوال سامنے آتا ہے کہ جتنی بھی حدیثیں صحیح ہیں وہ کل کی کل الہامی ہیں یا سب کی سب غیر الہامی؟

پھر پانچواں سوال یہ ہے کہ جو حصہ الہامی ہے وہ بالکل قرآن کی طرح کی وحی ہے یا اس سے مختلف۔

یہ درست ہے کہ صحیح احادیث کے ساتھ غلط روایات کی بھی آمیزش ہو گئی ہے۔ لیکن اگر دس کھرے سکوں میں دو چار .... کھوٹے سکے مل جائیں تو تمام کے تمام سکے ساقط الاعتبار نہیں ہو جائیں گے کھرے کھرے ہی رہیں گے اور کھوٹے کھوٹے ہی قرار پائیں گے۔

پہلے تین سوالوں کا جواب تو اُوپر آ چکا ہے اب ہم صرف چوتھے اور پانچویں سوال پر روشنی ڈالیں گے۔

محدث کا نقطہ نظر

محدث کو اگر کوئی قولِ رسول مل جائے۔ تو وہ دو چیزوں کو دیکھے گا۔ روایت کو اور درایت کو۔ روایت میں وہ دیکھے گا۔ کہ

(۱) یہ مرفوع ہے اس کی سند متصل ہے۔

(۲) راوی سب ثقہ ہیں۔

اور درایت میں وہ یہ دیکھے گا۔ کہ اس کا مضمون:۔

(۱) عقل کے تو خلاف نہیں۔

(۲) مشاہدے سے تو نہیں ٹکراتا۔

(۳) قرآن کے تو مخالف نہیں۔

(۴) متواتر حدیث سے تو اس کا تناقض نہیں۔

---

[1] فاضل مکتوب نگار نے احادیث کے تمام مجموعوں کے پیش نظر یہ رائے ظاہر کی ہے۔ احادیث کے بہت سے مجموعوں اور دفتروں میں "صحاح ستہ" ہی "کچھ صحیح" کی تعریف میں آتے ہیں۔ بہر حال، احادیث کے جس مجموعہ میں بھی جو حدیث ایسی پائی جاتی ہے جو قرآن کے مطابق ہے۔ اور اس کے سند درواۃ ثقہ درست ہیں۔ وہ صحت ہی کا درجہ رکھتی ہے ——— جن احادیث میں کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ ان کی تو خود محدثین نے نشان دہی کر دی ہے۔ (م۔ ق)

(۵) اجماع قطعی سے بھی متعارض اور قابل تاویل نہیں۔

(۶) عذاب یا ثواب میں مبالغہ تو نہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس کے بعد اگر محدث کو روایت اور درایت کے متعلق ان دونوں پہلوؤں سے، اطمینان ہو گیا تو وہ اس روایت[1] یا حدیث کو اپنی کتاب میں درج کرے گا۔ اور وہ ایسا کرنے میں نیک نیت، در حق بجانب ہوگا۔ لیکن ہو سکتا ہے۔ کہ وہی روایت کسی دوسرے محدث کی نگاہ میں صحیح نہ ہو۔ یا فی نفسہٖ وہ روایت درست نہ ہو۔ بہرحال اُسے صحیح سمجھ کر درج کتاب کرنے والا ہرگز قابل ملامت نہیں۔ وہ اپنے ذوق سے اور قواعد و اصول کے لحاظ سے صرف اتنا کرتا ہے۔ کہ روایت و درایت کے لحاظ سے کسی حدیث کا درجہ متعین کر دیتا ہے۔ کہ یہ متواتر ہے۔ یا مشہور ہے یا احاد یا اس کی فلاں قسم ہے اس کے درجے کا تعلق ہے۔ محدث کا صرف اتنا ہی کام ہے۔

فقیہ کا زاویہ نگاہ

لیکن فقیہ ایک دوسری نگاہ سے بھی حدیثوں کو دیکھتا ہے۔ وہ عمل کی دنیا میں کئی لحاظ سے مقام حدیث کو متعین کرتا ہے فقہ سے ہماری مراد کنز و قدوری نہیں۔ بلکہ وہ نور فراست ہے جس کا ایک معمولی مظہر ہیں۔ کنز و قدوری، ہدایہ و شرح وقایہ۔ جن درجات حدیث کا ہم ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی تعیین دراصل ایک فقیہ کا کام ہے۔ نہ کہ جامع روایات کا۔ یک فقیہ جب مختلف روایات پر نظر ڈالتا ہے تو اسے صاف نظر آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام باتیں یک ہی درجہ نہیں رکھتیں۔ بلکہ۔ بعض باتیں حضورؐ نے طبعی تقاضے سے فرمائیں۔ مثلاً کھانا دو۔ بعض امیر کی حیثیت سے۔ بعض شوہر، باپ۔ بھائی یا آقا کی حیثیت سے مثلاً میرے سر پر پانی ڈالو۔ بعض نصیحت کے طور پر۔ بعض سفارش کرتے ہوئے بعض مصلحت وقتی کی بنا پر۔ بعض غصہ میں مثلاً فلاں پر لعنت ہو۔ بعض مزاح کے طور پر۔ مثلاً تم نے (اے علی) بہت سی کھجوریں کھائیں۔ بعض اشارۃً و کنایۃً۔ بعض تعلیماً و تمثیلاً۔ بعض سوالاً و جواباً۔ بعض ظناً و تخمیناً مثلاً میں اس خواب سے یہ سمجھا۔ بعض پیش گوئیاں مثلاً میری اس ضرب سے قیصر و کسریٰ کے خزانے کھل گئے۔ اور بعض بلاغ تنزیل کے حکم کی تعمیل کے لئے مثلاً سارا قرآن۔

غرض کہاں تک اقسام شمار کی جائیں۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ ایک انسان کی زندگی میں جتنے مراحل آتے ہیں۔ حضورؐ کی مبارک زندگی میں وہ سب پیش آتے رہے اور اُن کے تقاضوں کے مطابق حضورؐ کی زبان اقدس سے کلمات نکلتے رہے۔ افعال مبارک کو بھی اسی پر قیاس کر لیجئے۔ بس انہی چیزوں کو حدیث کہتے ہیں، اور ان کے وجود سے نہ عقلاً انکار کیا جا سکتا ہے اور نہ تاریخاً۔

لیکن یہ تقسیم کئے بغیر بھی چارہ نہیں۔ کہ احادیث کی جو چند فطری قسمیں ابھی بیان کی گئی ہیں۔ وہ سب کی سب احادیث ہونے کے باوجود ازروئے اتباع ایک ہی درجہ و مقام نہیں رکھتیں۔ یعنی یہ ممکن نہیں، کہ حضورؐ یہ ساری باتیں وحی سے فرمایا کرتے ہوں۔ کون باور کر سکتا ہے کہ حضورؐ کھانا بھی وحی سے کھاتے تھے۔ پانی بھی وحی سے پیتے تھے۔ ازواج مطہرات کے پاس بھی وحی سے جاتے تھے مشورہ بھی وحی سے لیتے تھے، یہ دیتے تھے۔ غصہ بھی وحی سے فرماتے تھے۔ غرض ساری باتیں اور تمام کام وحی سے ہی کرتے تھے اور زندگی کی ہر حرکت و سکون نتیجہ وحی ہوتا تھا۔

---

[1] آپ کی حدیث دشمنی کی حد ہو گئی ہے جبکہ اسماء الرجال کے عجیب و غریب بلکہ محیر العقول فن کو آپ کے مذکورہ پمفلٹ کے صفحہ ۶۲ پر محض ایک ڈھونگ قرار دیا ہے۔ جس کے متعلق دوست تو دوست ایک منصف مزاج دشمن کی رائے حسب ذیل ہے:-

"جرمن کے مشہور و معروف عربی دان فاضل ڈاکٹر اسپرنگر نے اصابہ فی معرفۃ الصحابہ کے دیباچہ میں لکھا ہے "نہ کوئی قوم دنیا میں ایسی گزری نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال سا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔"

مطابق وحی اور عین وحی کا فرق

یہ سو فیصدی صحیح ہے کہ حضورؐ کی تمام باتیں وحی کی پیروی تھیں اور مطابق وحی تھیں، حدود وحی کے اندر تھیں، لیکن ساری باتوں کو عین وحی قرار دینا درست نہیں۔ کسی چیز کا عین وحی ہونا اور چیز ہے اور پیروی وحی یا مطابق وحی ہونا شے دیگر ہے۔[۱]

مثلہ معہ

ایک حدیث میں آیا ہے کہ مجھے صرف قرآن ہی نہیں دیا گیا۔ بلکہ اسی طرح اور اس کے ساتھ "مثلہ معہ" ایک چیز اور بھی دی گئی ہے۔ اس حدیث سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے۔ کہ احادیث مثل القرآن ہونے کی وجہ سے قرآن کی ہم پلہ ہیں۔ اس حدیث کی سناد سے قطع نظر اسے صحیح مانتے ہوئے بھی "مثلہ معہ" کا یہ مطلب سمجھنا صحیح نہیں کہ حدیثیں قرآن کی ہم پلہ ہیں۔ مثل کا لفظ جہاں بھی آئے۔ اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ تمام جہات سے اس کی مثلیت موجود ہو۔ مثلیت کے لئے ایک دو حیثیتوں کا ہونا کافی ہوتا ہے۔ اگر ہم کسی آدمی کو شیر سے تمثیل دیں تو صرف بہادری وجہ تمثیل ہوتی ہے اور اتنی تمثیل کافی ہے۔ شیر کے مثل ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ آدمی چار پاؤں پر بھی چلتا ہے۔ جانور کا شکار کر کے کچا گوشت بھی کھاتا ہے، اور دُم بھی رکھتا ہے۔ قرآن پاک کا ارشاد ہے۔ وما من دابة فی الارض ولا طائر یطیر بجناحیه الا اُممٌ امثالکم...... (پ ع ۱۰) یعنی زمین کے تمام جاندار اور اڑنے والے پرندے سب تمہارے ہی "مثل" امتیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر جاندار یا پرندہ صورت و سیرت میں، حقوق فرائض میں، جوابدہی اور انجام میں یقیناً مانند انسان نہیں۔ صرف امت یعنی متحرک بالارادہ مخلوقات کی ٹولیاں ہونے میں انسان کے مثل ہیں۔ پس الہامی وحی کو اگر حضورؐ نے مثل القرآن اور مع القرآن فرمایا ہو تو اس مثلیت سے صرف اتفاقی مثلیت ہو سکتی ہے نہ کہ مثلیت من جمیع الوجوہ۔ اتفاقی مثلیت سے مقصود یہ ہے کہ جس خدا کی طرف سے قرآن وحی ہے اسی خدا کی طرف سے الہامی وحی بھی ہے۔ پس اس سے زیادہ کسی اور مثلیت کو تلاش کر کے الہامی وحی کو قرآنی وحی کے ہو بہو ہم پلہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ مگر یہ الہامی وحی دین میں حجت ہے، "مثلہ معہ" سے یہی مراد ہے (م۔ق)

حدیث اور سنت

حضورؐ نے جو کچھ فرمایا۔ یا کیا۔ اس کا بیان ہمیں یا تو قرآن میں ملتا ہے یا احادیث میں۔ جو کچھ قرآن نے بیان کیا ہے۔ وہ اس وقت ہمارے موضوع بحث سے خارج ہے۔ کیونکہ اس میں کسی قیل و قال کی گنجائش نہیں۔ البتہ جو کچھ احادیث میں ہے اس میں سے وہ حصے الگ کر لیجئے جو مسائل مستحبات سے تعلق رکھتے ہیں، یا جو واجب نہیں۔ تو وہی حصہ باقی رہ جائے گا جو بطور امر و نہی کے حضورؐ نے فرمایا۔ یا امر و نہی کے بغیر حضورؐ نے اسے بہتر تصور فرمایا۔ اس حصے میں اب ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ سنت کیا چیز ہے؟ آیا وہ روایات حدیث ہیں یا اور کچھ اور؟

[۱] انبیاء کے حق میں یہ گمان کرنا صحیح نہیں کہ ان پر صرف وہی امور وحی کئے گئے تھے۔ جو براہ راست تبلیغ رسالت سے تعلق رکھتے تھے۔ درحقیقت ان کی ساری زندگی حق تعالیٰ کی ہدایت کے تابع تھی۔ البتہ اگر فرق ہے تو یہ کہ ان کی زندگی کا ایک شعبہ ایسا ہے جس میں ان کے قدم بقدم چلنا مسلمان ہونے کے لئے ناگزیر شرط ہے۔ اور ایک شعبہ ایسا ہے جس میں ان کا اتباع ہر مسلمان پر فرض نہیں۔ (فاضل مضمون نگار کی اس سے مراد غالباً مدنی تمدن ہے، یعنی جو لباس حضورؐ پہنتے تھے، جو سواری استعمال کرتے تھے، جو کھانے تناول فرماتے تھے...... ان کا اتباع امت پر فرض نہیں ہے۔ ۰ ہ لقادری) مگر جو شخص اللہ کا محبوب و مقبول بندہ بننا چاہتا ہو اور درگاہ حق میں تقرب کا طلب گار ہو اس کے لئے بغیر اس کے چارہ نہیں۔ کہ ٹھیک ٹھیک نبی علیہ السلام کی سنت پر چلے حتیٰ کہ اگر ایک سر مو بھی اس خط سے ہٹے گا تو تقرب اور محبوبیت میں اسی انحراف کی حد تک کسر رہ جائے گی۔ اس لئے کہ محبوبیت کے لئے بجز اتباع نبی کے اور کوئی راستہ ہی نہیں فاتبعونی یحببکم اللہ.... میں اسی طرف اشارہ موجود ہے۔

طرزِ عمل کی روشنی میں آئمہ مجتہدین نے قدم بڑھایا اور یہی حضور کا منشا بھی تھا۔ مصیبت یہ ہے کہ ہم میں کچھ لوگ ہر شاخ کو اس لئے کاٹ پھینکنا ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ عین ثمرات نہیں۔ اور کچھ لوگ ہر شاخ کو اس انداز سے دانتوں کی مضبوط گرفت سے پکڑے ہوئے ہیں کہ گویا یہی عین ثمر ہے۔ بلکہ بعض تو انہی شاخوں پر پانی ڈالتے چلے جاتے ہیں خواہ جڑ سوکھتی چلی جائے .... حدیث کی نسبت حضور صلعم کے ارشاد "مثلہ معہ" کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ قرآن و حدیث میں مثلیت "من کل الوجوہ" ہے۔ بلکہ اس میں محض القائی مثلیت مراد ہے یعنی جس طرح خدا کی طرف سے "وحی جلی" ہوتی ہے اسی خدا کی طرف سے "وحی خفی" بھی ہے۔ حضور کے الفاظ بڑے زور سے مفہوم کی تائید کرتے ہیں۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔

اِنِّی اُوْتِیْتُ الْقُرْاٰن وَمِثْلَہٗ مَعَہٗ (مشکوٰۃ) مجھے قرآن اور اس کے ساتھ اس کا مثل دیا گیا ہے۔

پھر اس بحث سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ہر حدیث سنت نہیں۔ بلکہ سنت، وہ (Spirit) روح ہے جو کسی مسئلہ کی مختلف روایات میں قدرِ مشترک کے پائی جاتی ہے۔ حضور کی سنت کے اتباع کا حکم خود خدا تعالیٰ نے "لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ" فرما دیا ہے۔ اور خلفائے راشدین کی سنت کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد کر کے ہم پر لازم کر دیا ہے کہ علیکم بسنتی و سنت خلفاء الراشدین لیکن اسے قرآن کی طرح غیر متبدل نہ قرار دیا اور بصیرت ائمہ مجتہدین نے اہلِ حل و عقد کو مقتضیات زمانہ کے لحاظ سے تسلیم کرنے کو ارشاد خداوندی ہوتا ہے "اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول و اولی الامر منکم" یعنی اللہ اور رسول کی اطاعت کے بعد اولی الامر کی اطاعت بھی واجب ہے۔ پھر ہم نہیں سمجھ سکتے کہ کتاب و سنت اور اجماع و قیاس کے زریں اصول کی روشنی میں کون سا مسئلہ ہے مشکل و پیچیدہ سے پیچیدہ دینی اور سیاسی مسئلہ بھی لاینحل رہ سکتا ہے؟ اور یاد رہے کہ یہ بصیرت اتباع کتاب و سنت سے حاصل ہوتی ہے اور سنت مختلف روایات میں پھیلی ہوئی ہے جنہیں یکسر ترک کرنے سے ہم سنت کو کھو بیٹھیں گے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ نہیں پڑھ مقام دو رہ میں قبول کئے بغیر چارہ نہیں۔

یہاں تک ہم نے غور و تدبر سے کام لیا ہے۔ ہمیں تو حدیث کی حیثیت قطعی تشریعی ثابت ہوتی ہے۔ حدیث سے ہماری مراد صحیح حدیث ہے نہ کہ روایت۔ موضوع و متروک۔ منکر و مجروح وغیرہ۔ پھر کسی ایک دور میں نہیں بلکہ ہر دور میں حدیث کے حجت شرعی ہونے کا عقیدہ ثابت ہے۔ حضرت ابوبکر سے لے کر حضرت علی کے زمانہ خلافت تک ہر دور میں حلال و حرام کے مسائل یا عام معاملات میں ہمیشہ حدیثیں پیش کی گئیں۔ حضرت ابوبکر صدیق نے جب مانعین زکوٰۃ سے قتال کا ارادہ فرمایا تو حضرت عمر نے اس میں مانع ہوئے تو تاریخ شاہد ہے کہ ان کے خلاف حدیث ہی سے استدلال کیا گیا جس پر حضرت عمر نے کوئی اعتراض نہ کیا بلکہ اس کے سامنے گردن تسلیم خم کر دی۔ حضرت فاطمہ نے جب باغ فدک کا مطالبہ کیا۔ اور عدالت میں دعویٰ دائر ہوا۔ تو حضرت ابوبکر صدیق

(نوٹ گزشتہ صفحہ سے) ہی کی تفسیر کیا بیان کی ہے ...... (غرضیکہ جو سب سے زیادہ جو رہے کہ وہی سب سے بڑا مفتی دین اور حامل شرع متین ہوتا ہے۔ یہ رہبر بر ین کا کام نہیں تو اور کیا ہے؟

آپ علم رکھنے والا غیر بر ین لکھ کر بہت خوش ہوتے ہونگے۔ مگر یہ ایسی بات کہی ہے کہ ایک ادنیٰ سے ادنیٰ علم رکھنے والا بھی نہیں کہہ سکتا۔ مگر جب کوئی شخص تعصب کی پٹی اپنی آنکھوں پر باندھ لے تو پھر وہ حق و باطل میں تمیز نہیں کر سکتا۔ یہی حال آپ کا میں اس مضمون میں دیکھ رہا ہوں۔ خدا ہدایت دے...... علاوہ ازیں یہ بھی کہ سنتِ رسول دین کا ماخذ ہے۔ دین میں حجت ہے؟ اور دین نام ہی اتباعِ رسول کا ہے۔

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

(م۔ ق)

باقی مضمون صفحہ ۲۸ پر ملاحظہ کیجئے

استعانت بالاولیاء

مولانا عامر عثمانی

سوال :- از عبدالسلیم - ضلع نظام آباد **اولیاء سے طلب مدد** قرآن مجید مترجم و محشی از حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن و حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی دیوبندی میں۔

سورۂ فاتحہ آیت اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ... (تیری ہم بندگی کرتے ہیں اور تجھ ہی سے ہم مدد چاہتے ہیں) مدد فقرہ کی تفسیر کے سلسلے میں حاشیہ پر جو تشریح فرمائی گئی ہے وہ یہ ہے "اس آیت شریفہ سے معلوم ہوا کہ اس کی ذات پاک کے سوا کسی سے حقیقت میں مدد مانگنی بالکل ناجائز ہے۔ ہاں اگر کسی مقبول بندے کو محض واسطۂ رحمت الٰہی اور غیر مستقل سمجھ کر استعانت ظاہری اس سے کرے تو یہ جائز ہے کہ یہ استعانت درحقیقت حق تعالیٰ ہی سے استعانت ہے"۔

اس تفسیر سے بعض حضرات یہ مراد لے رہے ہیں کہ یہی تو استعانت بالاولیاء ہے چنانچہ مشہور علمائے دیوبند تک نے اس کو تحریر فرمایا ہے۔ تب ہی تو اولیاء جو کہ "مقبول بندے ہیں" ان سے استعانت چاہنا اللہ سے استعانت چاہنا ہے۔ فی الحقیقت یہی کہا گیا مطلب ہے؟ تجلی کی ڈاک میں وضاحت فرمائی جائے۔

جواب :- جو لوگ پہلے ہی سے استعانت بالاولیاء کا وہ عقیدہ رکھتے ہیں جو تصور توحید کی حدیں پھلانگ کر زمین و آسمان کی وسیع وادیوں میں برساتی نالوں کی طرح بہت بہہ چکا ہے ان کے لئے تو بلے شک ممکن ہے کہ نقل کردہ تفسیر سے جو دل چاہے مطلب نکال لیں لیکن جو لوگ اولیاء اللہ کے بارے میں غلو فی العقیدت اور افراط و تفریط کا شکار نہیں ہیں ان کے لئے اس تفسیر میں کوئی قابل اعتراض و باعث اشکال بات نہیں۔

کسی مقبول بندے کو محض واسطۂ رحمت الٰہی اور غیر مستقل سمجھ کر استعانت ظاہری کرنے کو آج تک کسی عالم نے جرم نہیں ٹھیرایا نہ اور عرف سے جرم کرنا ممکن ہے۔ یہ تفسیر تو "استعانت بالاولیاء" کے غلط تصورات کی نفی کرتے ہوئے اس کی مناسب حدیں متعین کرتی ہے اور وہم و خیال کی بے قید وسعتوں پر بند باندھتی ہے۔

خوب سمجھ لیجئے علمائے دیوبند جس استعانت بالاولیاء کو گمراہی بتاتے ہیں وہ وہ ہے جس میں اولیاء کو ایسی صفات سے متصف سمجھ لیا گیا ہو...... جو اُن میں ثابت نہیں ہیں۔ یا اللہ کی حاکمیت مطلقہ اور قدرت و اختیار کے حقیقی تصور سے بے پشت ڈال کر اولیاء کی قدرت و اختیار پر اس درجہ بھروسہ کر لیا گیا ہو کہ گویا وہ ہی براہ راست ہر طرح کے اختیارات رکھتے ہیں۔

مثال کے طور پر ایک شخص کسی ولی کی قبر پر جا کر اپنی کوئی دلی مراد اُن سے طلب کرتا ہے تو یہ استعانت شرک ہی ہے، کیونکہ طلب تو حقیقتاً خدا سے ہونی چاہیئے نہ کہ اُن بے روح جسموں سے جو منوں مٹی کے نیچے خدا جانے کس حال میں ہیں۔

اور اگر وہ صاحب قبر کو یوں مخاطب کرے کہ ہماری فلاں مراد آپ اللہ سے پوری کرا دیجئے تو اس کی دو صورتیں ہیں۔ یا تو باآواز بلند مخاطب کرے گا یا بغیر آواز کے۔ اگر باآواز کہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کے نزدیک اولیاء مرنے کے بعد بھی سماعت رکھتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کی آیت اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی صریحاً یہ حقیقت بیان کر رہی ہے کہ مُردے سماعت کے اہل نہیں ہیں۔ پھر اس کے نزدیک اولیاء

یہ بھی قدرت رکھتے ہیں کہ اللہ کے حضور اہل دنیا کی سفارشیں کریں حالانکہ قرآن و حدیث سے یہ بھی ثابت نہیں ہے۔

اور اگر بغیر آواز کے استعانت کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ صاحب قبر کو خدا کی ایسی صفت میں شریک کر رہا ہے جس میں کوئی بھی شریک نہیں۔ یعنی دلوں کے تمام پوشیدہ احوال و کیفیات اور مخفی خواہشات و جذبات کا علم ہونا۔ جبھی تو وہ سمجھ رہا ہے کہ اگر میں بغیر آواز کے مانگ رہا ہوں۔ اس کی خبر صاحب قبر کو ہوتی جا رہی ہے اور میری کامیابی کے لئے وہ اللہ سے سفارش کریں گے پھر وہ کب ایسا سمجھ رہا ہے؟ جب کہ صاحب قبر کا جسم روح سے جدا ہو کر مٹی کے سوا کچھ نہیں رہا ہے!

نقل کردہ تفسیر میں "استعانت ظاہری" کی جو شرط ہے وہ بھی یہاں مفقود ہے۔ یہاں استعانت ظاہری کا سوال ہی نہیں۔ بلکہ نہ جانے کون کون سی مرادیں اس صاحب قبر کے حضور پیش کی جا رہی ہیں جو ظاہر میں ایک بے روح تودہ خاک ہے اور اس سے کسی ظاہری امداد کی توقع دیوانوں کے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔

مذکورہ تفسیر میں جس استعانت کو جائز کہا گیا ہے اس کی مثال یہ ہے کہ مثلاً زید کسی زندہ بزرگ کی خدمت میں جا کر عرض کرتا ہے کہ مجھے اللہ کا قرب حاصل کرنے کے طریقوں کی تعلیم دیجئے۔ مجھے وہ اعمال و اشغال بتایئے جو میرے باطن کا تزکیہ کر سکیں اور میرے نفس کو دبا سکیں۔ مراتب اعلیٰ کی طرف میری رہنمائی فرمایئے۔ میرے لئے اللہ سے دعا کیجئے کہ۔ مجھے زیادہ سے زیادہ توفیق نیک عطا فرمائے۔ وغیر ذالک۔

استعانت کی اسی شکل کو تفسیر میں جائز کہا گیا ہے اور یقیناً یہ۔ بے کھٹکے اسی طرح جائز جس طرح دیگر امور میں ہم ایک دوسرے سے مدد لینے میں اور ظاہراً ایک دوسرے کا کام کرتے ہیں۔ اس شکل میں زید نے مذکورہ بزرگ کو محض واسطہ بنایا اور ظاہری.. استعانت کی۔ یہ کوئی عیب نہیں۔ بلکہ دینی اور دنیوی تمام ہی امور میں اعانت و استعانت ایک فطری اور قدرتی امر ہے جسے مسبب الاسباب نے مخلوق کے لئے مقدر کر دیا ہے۔ ہاں وہ استعانت بے شک عیب ہے جو نہ صرف "باطنی" ہو۔ بلکہ خدا ہی کی قدرت و توجہات پر مبنی ہو۔

بقیہ مضمون صفحہ ۲۶:—

رضی اللہ عنہ نے حدیث ہی سے جواب دیا۔ لا نورث ما ترکناہ صدقۃ جس پر حضرت فاطمہؓ خاموش ہو گئیں۔ اس حدیث کی شرح تفہیم الاخبار ترجمہ اردو مشارق الانوار کے صفحہ ۱۰۴ پر حسب ذیل ہے۔

"خلاصہ مطلب یہی ہے کہ اول حضرت فاطمہ علیہا السلام کو معلوم نہ تھا کہ پیغمبروں کے مال میں وراثت نہیں ہوتی۔ اسی سبب سے مانگا تھا۔ جب معلوم ہوا تو چپ رہیں اور اس حدیث کو صرف صدیقؓ ہی نے روایت نہیں کی جو کوئی بدا عتقاد طعنہ کرے بلکہ علی مرتضیٰ بھی اس کے راوی ہیں۔ غرض یہاں ذکر اتنا کفایت کرتا ہے۔ ورنہ بدگمانی کی تو پیغمبر کے پاس بھی دوا نہیں"

جب حدیث کی حجیت اور تشریعی حیثیت دور صحابہ میں بلا اختلاف مسلم تھی تو اب اس کا انکار گویا آنکھوں پر پٹی باندھ لینا نہیں تو اور کیا ہے۔

آپ کے اس مضمون میں کئی اور غلطیاں بھی ہیں جو آیات کی تحریف معنوی اور تاویل فاسد سے کم نہیں۔ لیکن پہلے میرے اس خط کا جواب دیجئے۔ پھر میں ان پر بھی روشنی ڈالوں گا اور آپ کو بتلا دوں گا کہ قرآن فہمی کے لئے حدیث کی کیا اہمیت ہے اور اس کی کس قدر ضرورت ہے اور سنت رسول اللہ کو اس میں کتنا دخل ہے؟ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

محمد عربی

سیف مرحوم (دہلوی)

وہ خوبیوں کی نہایت لئے ہوئے آئے
عجیب شانِ رسالت لئے ہوئے آئے

خزاں رسیدہ عرب کی فضائے گلشن میں
بہارِ خلد طراوت لئے ہوئے آئے

جسے بجھا نہ سکی انقلاب کی آندھی
وہ شمعِ مذہب و ملت لئے ہوئے آئے

جہاں پہ چہرۂ قدرت آپ ہوتا تھا
وہ حسنِ رنگِ صداقت لئے ہوئے آئے

مثال جس کی زمانہ نہ دے سکا اب تک
وہ حسنِ خلق کی وسعت لئے ہوئے آئے

انہیں کا دم ہے مساوات کا علمبردار
وہی نشانِ اخوت لئے ہوئے آئے

جو بت پرست تھے وہ بت شکن ہوئے آخر
یہ جذبۂ احدیت لئے ہوئے آئے

وہ تاجدارِ مدینہ وہ فاتحِ مکہ
عجیب جاہ و جلالت لئے ہوئے آئے

نگار خانۂ عالم کی زیب و زینت کو
کمالِ حسن کی صورت لئے ہوئے آئے

ہر ایک شان نمایاں بہ حیرت جلوہ
ہر ایک جلوہ بہ حیرت لئے ہوئے آئے

حسن زبیدہ بلال حبش صہیب [illegible]
سب اُن کا جوشِ محبت لئے ہوئے آئے

وہ لوگ [illegible] محمد [illegible]
جو حق کے بعد فضیلت لئے ہوئے آئے

خدا نصیب کرے سیفؔ کو بھی دن ایسا
نظر میں جلوۂ رفعت لئے ہوئے آئے

زائرینِ حرم پاک

نازشؔ حیدری

قافلے عرش نشینوں کے گئے اور آئے
اپنے ہمراہ دو عالم کی سعادت لائے

زائرینِ حرم پاک تمہیں قسمت کے دھنی
ان کے حصے میں وہ عزت ہے کہ [illegible]

اس طرح روضۂ اقدس کی زیارت کی ہو
باغِ فردوس کے دروازے پہ دستک دی ہے

شوقِ وارفتہ کو آندھی کے ملے جب اوصاف
ہو گئے ایک بگولے کی طرح وقفِ طواف

رک گئی جا کے نظر چشمۂ زمزم کے قریب
بجلیاں کوند گئیں دیدۂ پرنم کے قریب

پتلیاں آنکھوں کی ہیں رنگ جمالِ کعبہ
اور تقدیر کی گردش ہے طوافِ کعبہ

سنگِ اسود کو جو ہونٹوں سے چھوا ہے تم نے
منجدِ ابرِ کرم چوم لیا ہے تم نے

آہ وہ روضہ وہ ہر دورِ زماں کا مرکز
محورِ عشق وہ پرکارِ محبت کا مرکز!!

روشنی ہو گئی اس طرح ہم آغوشِ جبیں
جاگ اٹھے نامۂ تقدیر کے الفاظ جبیں

کاش نازشؔ بھی مدینے کی فضا میں جھومے
بارگاہِ شہِ لولاک کی چوکھٹ چومے[1]

کاش وہ اس کی [illegible] بھی کبھی سورج کی نظر
جذب ہو جائے اسی خاک میں ذرہ بنکر

کاش [illegible] اسی روضے سے لپٹ کر سو جائیں
دیدۂ [illegible] کے [illegible] بھی [illegible] کے [illegible]

---

[1] نگاہِ شوق و عقیدت سے!

ابلیس کا خطبۂ صدارت

فاروق بانسپاری

وہ دور گیا میری حکومت کے سفیرو
اب عالمِ امکاں میں نئے جال بچھاؤ
لادینیٔ افکار کا مغرب کو ہے سودا
اس خام خیالی میں اسے پختہ بناؤ
بے نور نہ ہو جائے کہیں دل کا اندھیرا
تہذیب کی اس شمع کی لو کچھ اور بڑھاؤ
تکمیلِ مقاصد کے لئے فکر ہو صرف دری
بندوں کی پرستش کا [illegible]
[illegible] کا ہے کچھ اور ہی مسلک
ہیگل کا یہ پیغام جوانوں کو سناؤ
یہ بادہ و شاہد ہیں یہ جوئے یہ کلب گھر
احمق نہ بنو کماؤ [illegible]
بے قید جوانی کو مددگار [illegible]
آزادیٔ نسواں کی حدیں توڑتے جاؤ
بیداریٔ جمہور کی دے دے کے دہائی
قوموں کے نئے عہد کا جادو بھی جگاؤ
چرکے ہی لگانے [illegible] کی یہ گیتی
حکمت کا تقاضا ہے کہ مرہم بھی لگاؤ
مشرق کہ مقلد ہے انہیں مغربیوں کا
اس کو کبھی [illegible] بڑھاؤ

فرسودہ طریقوں کا زمانہ نہیں باقی
بیدار جوانوں کو نئے خواب دکھاؤ
اعراب کو دو نعرۂ قومیتِ اعراب
آفاقیت [illegible] کو محب [illegible] بناؤ
ممکن ہو تو ان چھوٹے ممالک کو ملا کر
دنیائے سیاست میں بڑے فتنے اٹھاؤ
[illegible] کے زندان سے چھڑا کر
دلدل میں انہیں قوم پرستی کے پھنساؤ
[illegible] ہے دھیان
محتاط قدم جادۂ مشرق میں اٹھاؤ
[illegible]
[illegible]
ہر چند کہ ہے [illegible] کے عالم میں گرفتار
بے ربطیٔ انفاس کے دھوکے میں نہ آؤ
دل اس کا ابھی عظمتِ قرآں کا ہے قائل
ان ذوقی نغموں کی شہادت پہ نہ جاؤ
خاکہ تو ہے دیں کا مگر رنگ تمہارا
اس طرح مسلمان کی تصویر بناؤ
رخصت ہوا وہ پاؤں دبانے کا زمانہ
اب وقتِ نماز آئے تو سوتوں کو جگاؤ

کعبے کی زیارت پہ بھی کرتے رہو مائل
ماہِ رمضاں آئے تو روزے بھی رکھاؤ
قرآن کا نور اس کی نگاہوں سے چھپا کر
حافظ بھی بناؤ اسے قاری بھی بناؤ
ہاں! منزلِ مقصود سے بیگانہ بنا کر
اس ناقہ سوار کو [illegible] کھلاؤ
الجھائے رہو رسم و رہِ خانقہی میں
عرسوں کے جھمیلے ہوں تو انگلی پہ نچاؤ
ملا کہ ہر اک عقدۂ دشوار کا حل ہے
قابو میں بہ تفویضِ مناصب اسے لاؤ
بازار میں یہ جنس عجوبہ ابھی کم ہے
مکتب کی مشینوں کو ذرا تیز چلاؤ
جب جنسِ مرکب میں یہ ہو جائے یگانہ
دستارِ فضیلت سرِ اقدس پہ بندھاؤ
اک اور بڑا کام ہے ان سب کے علاوہ
ایوانِ عمل کی اسے بنیاد بناؤ
میدان ہمالہ سے اک آواز اٹھی ہے
مل جل کے اس آواز کو جیسے ہو دباؤ
جس طرح بھی ممکن ہو جوانانِ حرم کو
مودودی تحریک کے پھندے سے بچاؤ

روح انتخاب

مامون الرشید نے طاہر بن الحسین کو رقہ اور مصر کے درمیانی علاقہ کا والی مقرر کیا تھا۔ اسی امیر نے اپنے بیٹے عبداللہ ابن طاہر کو ایک مکتوب لکھا تھا۔ جسے علامہ ابن خلدون نے مقدمہ تاریخ میں درج کیا ہے۔ اس مکتوب کا جستہ جستہ ترجمہ یہاں نقل کیا جاتا ہے: اس مکتوب کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور کے گورنروں اور حاکموں میں کس درجہ اسلام کی محبت، خشیت الٰہی اور نیکی کی طلب پائی جاتی تھی کاش ہمارے زمانہ کے فرمانرواؤں کو اس مکتوب کے آئینے میں اپنے سیرت و کردار کے خدوخال دیکھنے کی توفیق نصیب ہو۔)

(م - ق)

دیکھو، اس اللہ سے ڈرو جو یکتا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اس کے غضب و ناراضگی سے لرزاں و ترساں رہو، رات دن اپنی نیت کی دیکھ بھال اور غور و پرداخت کرو، عافیت میں آخرت کو کبھی نہ بھلاؤ، اس وقت کو یاد رکھو جو تم پر آنے والا ہے، ان باتوں کو دھیان میں لاؤ جن کے بارے میں تم سے سوال کیا جائے گا اور تم سے بازپرس ہوگی، اور ان باتوں کو نہ صرف یہ کہ خیال میں لاؤ، بلکہ ان کے مطابق عمل کرو اور تمام بھلائی اور نیکی کے کاموں پر کاربند رہو: جان لو کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر بڑا احسان کیا ہے۔ اور تم پر بڑی مہربانی فرمائی ہے کہ اپنے بندوں کی دیکھ بھال تمہارے ہاتھ میں رکھی ہے، تم پر واجب ہے کہ ان کے ساتھ عدل و انصاف سے پیش آؤ اور اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے حقوق و حدود کا ان کے بارے میں خیال رکھو، ان کے مصائب اور مشکلیں دور کرنے کی کوشش کرو۔ ان کے ننگ و ناموس، ان کے عہدہ و منصب، ان کی جانوں اور خاندانوں کی پوری پوری حفاظت کرو۔

تم کو چاہیئے کہ سب سے پہلے اپنے نفس کو نماز پنجگانہ کا عادی بناؤ اور اس پر ہمیشہ مداومت اختیار کرو، جماعت کے پابند رہو، سنتیں بھی ہرگز ترک نہ کرو۔ نماز کا وضو بھی ٹھیک ٹھیک طریقہ سے کرو۔ وضو میں دھوئے جانے والے اعضاء کو کما نہ چھوڑو، اس کی ابتدا اللہ تعالیٰ کے ذکر سے کرو۔ قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھو، رکوع سجدہ، تشہد میں جلدی نہ کرو۔ بلکہ بدن کو ٹھہراؤ۔ اور نماز میں اپنے دل و دماغ کو لگاؤ۔ کیونکہ نماز ہر برائی اور ناشائستہ بات سے روک دیتی ہے۔ ان فرائض کی پابندی کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کو اپنا شعار بنا لو جو قدم بھی اٹھاؤ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے اٹھاؤ اور اپنی پسندیدہ اور ناپسندیدہ باتوں میں انصاف کو ہاتھ سے نہ دو اور اس میں کسی اپنے پرائے کی دور رعایت نہ کرو۔ کتاب اللہ کو پڑھو، سمجھو اور اس کا علم رکھنے والوں کے لئے دل میں قدر گنجائش پیدا کرو اور اپنے کاموں میں میانہ روی اختیار کرو، امور میں اعتدال ہی انسان کو برتری اور بھلائی کی طرف لے جاتا ہے، سب کاموں میں اللہ تعالیٰ ہی کا وسیلہ تلاش کرو، اسی پر بھروسہ کرو۔

جس کو کوئی کام سپرد کرو اس میں اس پر کوئی اتہام نہ لگاؤ جب تک حالات کی خوب تفتیش نہ کرلو۔ پاک دامنوں کو متہم نہ کرنا اور ان کے بارے میں بدظنی سب سے بڑا گناہ ہے۔ پھر ایک بات سن لو کہ ان سب امور میں خلوص نیت درکار ہے بغیر اخلاص کے کچھ نہیں اور اپنے نفس کی صلاح میں منہمک ہو کر لگ جاؤ۔ گویا آخرت میں صرف تمہیں سے تمہارے اعمال کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ جن پر تمہاری سیاست چلتی ہے (یعنی حکم چلتا ہے) یا جو تمہاری نگرانی اور دیکھ بھال میں ہیں ان کو بھی دین کے راستہ پر چلاؤ اور ہدایت کی راہ پر لگاؤ اور خود اپنے آپ کو بھی فراموش نہ کرو۔ جرائم پیشہ لوگوں پر ان کے جرم و قصور کے مطابق سزائیں جاری کرو۔ نہ سزا سے درگذر کرو نہ اس میں نرمی برتو۔ نہ اس کو تاہ اور اپنے کاموں میں سنت نبوی کی پیروی کرو اور بدعات و شبہات سے بچو۔ تو اس طرح تمہارا دین بھی محفوظ رہے گا اور تمہاری عزت و حشمت اور مردانگی بھی باقی رہ سکے گی۔ عہد کی پابندی کرو اور بدی کا بدلہ نیکی سے دو۔ تمہاری دنیا اور آخرت کے کاموں کی بہتری کی یہی ستانی ہے۔ یہ کہ تم [illegible] کو پناہ ہم نشین بناؤ۔ راست بازوں کو دوست بناؤ۔ شریفوں کی عزت کرو۔ کمزوروں کی ڈھارس بندھاؤ اور اعزہ کے ساتھ صلہ رحمی سے پیش آؤ یہ سمجھو کہ سارا ملک اللہ تعالیٰ ہی کا ہے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور جس سے لینا چاہتا ہے لے لیتا ہے۔ اور دیکھو دنیا اور اس کے ناز و نعمت تم کو آخرت کی جوابدہی سے غافل نہ کردیں۔ جو کام کرو اللہ تعالیٰ ہی کے لئے کرو اور اسی سے ثواب کی امید رکھو۔ اس کی نعمتوں پر شکرگزار رہو۔ اللہ تعالیٰ کی یہ عادت جاریہ ہے کہ وہ اپنے شکرگزار اور محسن بندوں کے شکر کے مطابق ان پر اپنے احسانات بڑھاتا رہتا ہے۔ کسی گناہ کو حقیر نہ جانو۔ کسی حاسد کی طرف رخ نہ کرو۔ کسی بدکار پر ترس نہ کھاؤ۔ کبھی ناشکرے سے میل جول نہ رکھو۔ کسی دشمن سے بے پروائی نہ برتو۔ کسی چغلخور کو سچا نہ جانو۔ کسی غدار پر بھروسہ نہ کرو۔ کسی فاسق سے دوستی کا رشتہ نہ جوڑو۔ کسی گمراہ کی پیروی نہ کرو۔ ریاکار کی مدح سرائی نہ کرو۔ کسی انسان کو حقیر نہ جانو۔ کسی سائل اور محتاج کو کچھ دئے بغیر واپس نہ کرو۔ وعدہ خلافی نہ کرو۔ غصے سے کام نہ لو۔ اکڑ کر نہ چلو۔ آخرت کی دوستی میں کوتاہی نہ کرو۔ کبھی ظالم سے درگذر و چشم پوشی نہ کرو۔ آخرت کا ثواب دنیا میں نہ ڈھونڈو۔ فقیہوں سے مشورہ لو۔ اپنے نفس کو حلم اور بردباری کا خوگر بناؤ۔ تجربہ کاروں عقلمندوں اور صاحب الرائے اور ارباب حکمت سے کچھ سیکھو۔ اپنے مشورہ میں عیاش اور بخیلوں کو شامل نہ ہونے دو۔ خوب سمجھ لو کہ تم جب حریص ہوگے تو زیادہ لوگے اور کم دوگے۔

فوج کے دفتر و مراتب کی جانچ پڑتال کرو۔ ان کو رزق دل کھول کر دو۔ ان کی معاش میں فراخی پیدا کرو۔ اپنے نفس کے معاملے میں [illegible] کرو۔ کسی امیر کو اس کی امارت کی وجہ سے، کسی کاتب کو اس کی کتابت کی وجہ سے، کسی شریف کو اس کی شرافت کی وجہ سے یا کسی صاحب اور حاشیہ نشین کو اس [illegible] احتساب و عقوبت سے بری نہ کرو۔ برداشت سے زائد کسی پر بوجھ نہ ڈالو کسی کو تاب برداشت تکلیف نہ دو۔ غرض سب کو حق پر جانچے رکھو۔

لوگوں کو حاضری کے لئے اذن عام دو۔ اور بے حجابانہ ان سے ملا کرو۔ ان سے ملتے وقت جوش و حرص خندہ رکھو ان کے سامنے بچھ جاؤ اور خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آؤ ———— تمہارے عامل جو مال جمع کرتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس کی دیکھ بھال رکھو وہ کہاں سے آتا ہے اور کہاں جاتا ہے؟ تم ناجائز ذریعہ سے کمائی کرو اور نہ مال و دولت کو اسراف میں اڑاؤ۔

تمہاری سب سے بڑی خواہش یہ ہونی چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ تم سے خوش ہو۔ دین کا نظام دنیا میں قائم ہو اور دین [illegible] کو عزت نصیب ہو قوم میں انصاف و عدل صلاح کاری اور راست روی کا یقین ہو +

ذکاء الرحمان

جوہی کا پھول

اور ہم سچائی، نیکی اور حسن کی تلاش میں جوہی کے پھولوں
کی وادی میں بھی گئے۔
جہاں ایک نیک دل چرواہے نے ہمارے آگے پھل اور
دودھ رکھا اور کہا۔
کہ آپ نے خواب میں
ہمیں دیکھا تھا

سائے

دسمبر کی ایک سرد شام۔

دھندلکے اندھیروں کا بھیس بدل کر شہر پر چھا رہے تھے ——— چراغوں کے جلتے ہی گلی کوچوں میں ایک اتھاہ خاموشی محیط ہو گئی تھی۔ چوک میں چند دکانیں کھلی تھیں، جن میں ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔ سردی معمول سے زیادہ تھی۔ چنانچہ عورتوں نے سویرے ہی گھر کا کام کاج سمیٹ کر بچوں کو گرم گرم بچھونوں میں سلا دیا تھا۔ اور پورا شہر ایک انجانے سے سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔

شہر کے باہر، گندم اور کپاس کے کھلے کھیتوں میں چودھویں رات کا پُراسرار سرمائی چاند ہولے ہولے طلوع ہو رہا تھا۔ تاروں کی مدھم روشنی، چاند کی کرنوں میں مدغم ہو کر ماند پڑنے لگی تھی۔ انہی کھیتوں کے کنارے شیشم اور نیم کے درختوں سے گھرا ہوا ایک تنہا اور خاموش مکان، دُور سے یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے انگریزوں کا کوئی قدیم قلعہ ہے جسے ٹیپو ابھی ابھی تاراج کر کے گزرا ہے۔ مکان کے روشندان، عشق پیچاں کی نرم نرم بیلوں سے ڈھکے ہوئے تھے، اور شہلا اپنے اس مکان کے برآمدے میں ایک چھوٹی سی تپائی کے سامنے بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ ——— یہ سب کچھ ایک پرانا خواب معلوم ہو رہا تھا، جو شروع رات کی اونچی نیند میں دیکھا گیا ہو، اور جسکی یاد انسانی دل پر سدا بہار رفتہ بن کر چھائی ہے۔

شہلا کے چہرے پر اداسی کے نقوش نمایاں نظر آتے تھے۔ سامنے میز پر رکھی ہوئی چائے میں سے بھاپ نکل رہی تھی۔ ہلکے بادلوں جیسی بھوری بھوری دُھند کا ننھا منھا سا مرغولہ پیالی میں سے بل کھاتا، گھومتا ہوا اوپر کو اٹھ رہا تھا۔ اور ذرا سا اوپر جا کر یخ بستہ فضا میں تحلیل ہو رہا تھا ——— شہلا نے جلدی جلدی گھونٹ بھر کر چائے ختم کی۔ شانوں پر پڑی ہوئی گرم، اونی شال کو درست کیا۔ اور اٹھ کر اندر چلی گئی۔

اپنے کمرے میں جا کر اس نے شمعدان میں موم بتی روشن کی، اور اپنے آرام دہ بستر پر دراز ہو گئی ——— اداسی کے نقوش چہرے پر اور زیادہ نمایاں ہو گئے ——— اور وہ کمرے کی فضا کا عجیب سی نظروں سے جائزہ لینے لگی۔ ——— بے چین آنکھوں میں سے نکلتی ہوئی بھوکی نظروں کی شعاعیں کمرے کی دبیز سرد فضاؤں کو تیزوں کی طرح چیر رہی تھیں۔۔ منقش چھت والے اس کشادہ سرد کمرے کی اونچی دیواروں پر شام کا اندھیرا، ان دیکھے ہاتھوں سے رات کے تاریک سایوں کا سبز لباس بُن رہا تھا۔ دروازوں پر سُرخ پوجھل پردے گرے ہوئے تھے۔ کارنس کے اوپر چینی کے پرانے مرتبان اور اخروٹ کے کٹھی گلدان کے درمیان لمبی چوڑی بھدی سی رنگدار خاندانی تصویروں میں سے ایک تصویر نمایاں نظر آ رہی تھی۔ ——— اونچا لمبا قد۔۔ خوبصورت ترشے ہوئے بال ——— سُرخ و سپید کتابی چہرہ ——— نیلے رنگ کی قمیص ——— سیاہ پتلون ——— شہلا کی نظریں اس تصویر پر جم کر رہ گئیں ——— اُس کے دل میں ایک عجیب سی خواہش انگڑائیاں لینے لگی ——— کاش یہ تصویر اس سے باتیں کرے۔۔۔۔۔۔

"اونہہ! بڑا آیا بیچارا! میں کیوں اس سے باتیں کروں۔ خوب صورت ہوگا تو اپنے لئے ہوگا۔" ——— وہ بڑبڑائی ——— اس نے دوسری طرف کروٹ بدل لی ——— لیکن وہ اس تصویر کو اپنے خیالات کے ذہن سے نہ نکال سکی ——— اور اب

اس کے خیالات کا مرکز بشیر تھا۔

بشیر کئی سال سے گھر سے باہر رہا تھا۔ اور مہینہ بھر ہوا واپس گھر آیا تھا۔ اس نے اپنے بچپن کے بعد جوانی کے آغاز کا زمانہ دور دراز ملکوں کی آوارہ گردی میں بسر کیا تھا۔ اس نے ایک مکمل آزاد اور خود مختار ماحول میں پرورش پائی تھی جس روز وہ گھر واپس آیا تھا تو ان لوگوں نے اُسے بڑی مشکل سے پہچانا تھا ———— وہ کس قدر بدل گیا تھا ———— اور اس نے اپنی چچا زاد بہن شہلا کو کتنی دلچسپی اور حیرت کے ساتھ دیکھا تھا۔

"ارے! تم شہلا ہو؟"

"ہاں" ———— شہلا نے بڑی مشکل سے اپنے احساس مسرت کو چھپاتے ہوئے کہا تھا۔

باہر سڑک پر سے کوئی فوجی ٹرک گڑگڑاتا ہوا گذر گیا ———— شہلا کے خیالات کی لڑی ٹوٹ گئی ———— وہ اٹھی اور پھر برآمدے میں آ بیٹھی ———— اور جوہی ہوکس کے پھولوں کو اس قدر انہماک سے دیکھنے لگی۔ کہ اس کو بشیر کی آمد کا کوئی پتہ نہ چلا ———— وہ کلب سے ٹینس کھیل کر آیا تھا۔

"آؤ ذرا باغ میں سیر کریں۔۔۔۔"

شہلا نے چونک کر سامنے دیکھا ———— بشیر اپنے لمبے قد اور چوڑے چکلے شانوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کے سیاہ بال پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے۔ لبوں پر ایک عجیب قسم کی طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

"چلو آؤ ذرا باغ میں گھوم آئیں" بشیر نے ٹینس کا ریکٹ گھماتے ہوئے کہا۔

وہ ایک انجانے سے جذبے کے تحت اٹھ کھڑی ہوئی ———— باہر رات اپنے سیاہ پر پھیلا رہی تھی ———— وہ دونوں باغ کی ایک روش پر دوش بدوش ٹہلنے لگے ———— پھر وہ فوارے کے پاس ایک پتھریلے چبوترے پر بیٹھ گئے ———— بشیر نے آہستہ سے "کریون اے" کا سگرٹ سلگایا۔ تمباکو کی خوشبو، پھولوں کی خوشبو میں گھل مل گئی، رات کے گہرے نیلگوں سائے انہیں اپنے پراسرار حلقے میں لئے ہوئے تھے۔ بشیر اُسے اپنی آوارہ گردی کی داستانیں سنا رہا تھا اور وہ اُسے بڑے غور سے دیکھ رہی تھی ———— بشیر سُناتے جا رہا تھا کہ کس طرح اس نے اپنی زندگی ایک شتر بے مہار کی طرح گذاری۔ شہلا چپ چاپ بیٹھی، بڑے غور سے بشیر کی ایک ایک بات، ایک ایک واقعہ سنتی رہی ———— بشیر نے جس قدر زیادہ اسے اپنی بے راہ رو زندگی کے کارنامے سُنائے۔ شہلا کو اس کی زندگی اتنی ہی پُر از معلومات اور دلچسپ معلوم ہوئی۔ جب وہ اپنی باتیں ختم کر چکا تو شہلا نے بڑی بے نیازی کے ساتھ اپنے کندھوں کو جھٹکا، اور شیشم کے درختوں کی طرف دیکھنے لگی ———— اُسے اپنے اوپر قافلے سے بچھڑے ہوئے اس درماندہ راہی کا گمان ہوا جو صحرا صحرا خاک چھانتا ہوا کسی چشمے پر پہنچ گیا ہو۔ جہاں پہنچ کر تھکے ماندے مسافر، تازہ دم ہو جاتے ہیں۔ طمانیت کے شدید احساس سے اس کے منہ سے اپنے آپ ایک ہلکی سی آہ نکل گئی۔

"کیا ہوا؟" بشیر نے جھک کر پوچھا۔

"کچھ نہیں" ———— شہلا شرما کر مسکرا دی۔

اسے بشیر کا گرم سانس اپنے بالکل قریب محسوس ہوا تھا ———— اس کا سارا جسم اگرچہ کانپ رہا تھا مگر ایک انجانی لذت کے احساس میں ڈوب گیا۔

دونوں اٹھ کھڑے ہوئے اور اس پتلی سی روش پر چلنے لگے جو مالٹے کے درختوں کی طرف چلی گئی تھی۔ چاند اب نیم کے درختوں

کے عقب میں چمک رہا تھا۔ اور نیم کے پتوں میں سے چھن چھن کر آنے والی مجوب سی کرنیں، شہلا کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔
مالٹے کے درختوں سے گھرے ہوئے سوئمینگ ٹینک پر گہرے سکوت کا سماں طاری تھا ——— بشیر نے ایک لمحے کے لئے شہلا کی طرف دیکھا ——— اور پھر ایک عجیب مدہوشی کے عالم میں اپنا بازو، شہلا کی کمر کے گرد حمائل کرتے ہوئے کہا۔

"تم ہسپین کی دوشیزاؤں سے بھی زیادہ خوب صورت ہو گئی ہو۔"

شہلا کے جسم پر ایک آتشیں سی کپکپی طاری ہو گئی ——— اور وہ شرما کر ذرا پرے ہٹ گئی ——— مگر یک انجانا احساسِ لذت۔؟.....

سبز گھاس میں اُگے ہوئے نیلے پھول رات کی خاموشی اور اندھیرے میں سیاہ دکھائی دے رہے تھے ——— اوپر گہرے، نیلے اور نکھرے ہوئے آسمان پر ستاروں کے دودھیا پھول مسکرا رہے تھے۔

شہلا کے لاشعور میں دبے ہوئے قافیوں کی پراسرار دھیمی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔

"اونہہ۔"

اس نے گردن کو جھٹکا دے کر تحت الشعور کی وادیوں سے آئے ہوئے خیالات کے ان پنچھیوں کو اڑا دیا۔

وہ بشیر کو بُت بنا کر اپنے دل کے سنگھاسن پر بٹھلا چکی تھی۔ وہ اُسے پرانے قصے کہانیوں کا وہ مثالی ہیرو سمجھے ہوئے تھے جو دیس دیس کی خاک چھاننے ——— اور نگر نگر پھرنے کے بعد باقی ماندہ زندگی آرام و آسائش سے گزارنے کے لئے اپنے گھر آگیا ہو۔

جب وہ اپنے کمرے میں آکر سونے لگی تو کمرے کی تمام کھڑکیاں وا تھیں ——— اور سُرخ پردوں میں سے باہر کا گہرا گہرا اندھیرا، عجیب قسم کی پُر اسرار فضا پیدا کر رہا تھا ——— گلدان میں سجے ہوئے نرگس کے پھولوں کی دھیمی دھیمی مہک، تمام کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔

اس نے ایک بار تصویر کی طرف دیکھا ——— مسکرائی ——— اور سو گئی۔

دانہ و دام

دوسرے دن

اگرچہ سورج ابھی تک چمک رہا تھا۔ مگر باغ میں سائے گہرے ہونا شروع ہو گئے تھے۔ فضا میں ٹھنڈک تھی۔ شہلا کی امی باہر برآمدے میں بیٹھی برنارڈ شا کا کوئی ڈرامہ پڑھنے میں مشغول تھی۔ شہلا قریب بیٹھی کسی امریکن میگزین کا مطالعہ کر رہی تھی۔
بشیر سارا دن باغ میں پھولوں اور کیاریوں کی کانٹ چھانٹ کرنے کے بعد اب دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا لوٹ رہا تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ کی انگلیوں میں سگریٹ دبا ہوا تھا۔ وہ اس وقت شفق کی لعگوں روشنی اور پھولوں کی بھینی بھینی خوشبوؤں کی وجہ سے بہت خوش معلوم ہو رہا تھا۔ اور یوں ہلکے ہلکے کش لے رہا تھا جیسے زندگی نے اس کے اندر، مسرت کا شدید احساس پیدا کر دیا ہو۔ اور وہ سگریٹ پیتے ہوئے، اس کا اظہار کر رہا ہو۔

"کلب نہیں چلو گی ——— ؟ ———" اُس نے قریب آکر شہلا سے مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔

شہلا جواب میں مسکرا دی۔

اور وہ غسل خانے میں ہاتھ منہ دھونے چل دیا

کلب کے اندر۔ زرد لیمپ روشن تھے، اور اسی دھند آمیز روشنی میں، لوگ میزوں کے اردگرد بیٹھے، وہسکی، بیئر اور چائے اور جیمن وغیرہ مشروبات پی رہے تھے۔ تاش کھیل رہے تھے اور تاہر اڑا رہے تھے۔ بلیرڈ روم کی طرف سے بھی مردوں اور عورتوں کی ملی جلی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ہال میں ایک بوڑھا اریجن یا نوپرایذ را پاؤنڈ کے کینٹو سنا رہا تھا۔

شہلا نے ہلکے قرمزی رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ جو اس کے گورے رنگ پر بے حد خوب صورت لگ رہا تھا۔ وہ کسی گہرے خیال میں مستغرق ہونے کے باوجود، بشیر سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔

وہ دونوں ایک خالی میز کے پاس جا بیٹھے۔ ——— بشیر نے اپنے "وہسکی اور شہلا کے لئے کافی کا آرڈر دیا۔

وہ بیئر پیتا رہا ——— وہسکی پیتا رہا ——— قہقہے اُڑاتا رہا ——— اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا ——— اور شہلا محض مسکرانے اور کافی کی چسکیاں لینے پر اکتفا کرتی رہی۔

"کیا حال ہے بشیر صاحب" عقب سے آواز آئی۔

بشیر نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

"او ——— ہلو ——— اختر ——— کم آن ——— کم آن"

اور تھوڑی دیر بعد ایک دبلا پتلا سا نحیف نوجوان اُن کے سامنے کھڑا تھا ——— اس کے رخساروں کی ہڈیاں باہر نکلی ہوئی تھیں چہرہ خزاں دیدہ پتے کی مانند زرد تھا۔ وہ کسی پرانی قبر میں سے نکلا ہوا ہڈیوں کا ڈھانچہ معلوم دے رہا تھا۔ وہ کرسی کھینچ کر اُن کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

yes meet my cousin m's shahla — Razi

"یس۔: میٹ مائی کزن مس شہلا رضی" ——— بشیر نے تعارف کرایا۔۔۔

and meet my friend Mr Akhtar Hamid

اینڈ میٹ مائی فرینڈ مسٹر اختر حمید"

اور جب شہلا نے اختر سے مصافحہ کیا تو اُسے یوں محسوس کیا جیسے اس کا ہاتھ برف کی سلوں سے دبا دیا گیا ہو۔

"کہو تمہارے مرض کا کیا حال ہے"۔۔؟ بشیر نے دریافت کیا۔

"میں صرف ایک بات جانتا ہوں" ——— اختر نے اپنے کو سکیڑتے ہوئے کہا

"فرمایئے" ——— بشیر کے سُرخ ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

"یہ کہ میں موت کے دروازے پر کھڑا ہوں"

"خوب۔ خوب" بشیر نے بڑے مزاحیہ انداز میں کہا۔

اس کے بعد اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔

جب وہ کلب سے گھر واپس آئے ——— تو شہلا کی امی کے پاس ایک نوجوان بیٹھا تھا ——— درمیانے قد کا دبلا پتلا نوجوان ——— اس نے سیاہ شیروانی پہن رکھی تھی۔ دلی شرافت کے نقوش اس کے چہرے پر بھی نمایاں تھے۔ ایک عجیب قسم کا بھولا پن اس کے چہرے پر پھیلا ہوا تھا ——— اور موم بتی کی دھیمی دھیمی روشنی میں وہ کوئی آسمانی فرشتہ دکھائی دے رہا تھا۔ جو انسانی روپ میں بھٹکے ہوئے انسانوں کو سچائی اور نیکی کا پیغام دینے کے لئے زمین پر اترا ہو۔

شہلا کی پیشانی پر اس نو دیکھ کر بل پڑ گئے ——— اور وہ منہ بناتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی ——— بشیر سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لگاتا ہوا اُن دونوں کے قریب جا بیٹھا۔

"بشیر تم تو شاید ان سے نہیں ملے۔ یہ شہلا کے منگیتر ہیں اسلم" ——— شہلا کی امی نے تعارف کرایا۔ اور اسلم! یہ میرا بھتیجا بشیر ہے، جس کا ذکر میں ابھی تم سے کر رہی تھی"

دونوں نے ایک دوسرے سے مصافحہ کیا ——— اور باتیں کرنے لگے ——— یکایک بشیر نے کہا ———

"لیکن چچی! آپ نے مجھے تو بتایا نہیں کہ شہلا کی منگنی ہو چکی ہے۔

"میں سمجھی تمہیں شہلا نے بتا دیا ہوگا۔ اور پھر تم میرے پاس بیٹھتے ہی کہاں ہو۔ ہر وقت گھومتے رہتے ہو۔ چکر ہے تمہارے پاؤں میں تو"

بشیر ہنسنے لگا۔

شہلا کی امی تو اٹھ کر چلی گئیں۔ اور یہ دونوں باتیں کرتے رہے۔

پھر اسلم بھی چلا گیا۔

اسلم کے جاتے ہی شہلا آگئی۔

"کیا باتیں کرتا رہا یہ گدھا تم سے"؟ شہلا نے بشیر سے دریافت کیا۔

"بکواس کرتا رہا اور کیا کرتا" بشیر نے جواب دیا۔

شہلا ہنسنے لگی۔

"چلو ذرا باغ میں ٹہل آئیں۔ کمبخت نے بور کر دیا" ——— بشیر کہنے لگا۔

اس وقت سردیوں کا گول، پُراسرار چاند، شیشم کے درختوں کے اوپر نمودار ہو رہا تھا۔ اس کی دودھیا، ملائم کرنیں باغ کے ریشمی پھولوں پر سفید بانات کی لطیف سی چادر پھیلا رہی تھیں۔ باغ میں درختوں کے سائے گہرے ہو گئے تھے۔ بشیر نے کہا۔

"تم چاند سے زیادہ خوب صورت ہو شہلا"

شہلا سوچنے لگی۔ بشیر کس قدر سچی بات کہہ رہا ہے۔

دونوں پھر ملتے کے درختوں سے گھرے ہوئے سوئمنگ ٹینک کے پتھریلے کنارے پر بیٹھ گئے۔ فضا میں مالٹوں کی ترش خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ شہلا نے مسرت کے جذبات سے بھرپور ہو کر صحت مندی کا ایک گہرا سانس لیا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے ہونٹوں کے کنارے ہوا میں پھول کر لرزتی ہوئی پتیوں کی مانند کپکپانے لگے۔ ——— بشیر نے آہستہ سے سگریٹ پرے پھینک کر شہلا کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

شہلا نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ اور چپ چاپ بیٹھی رہی۔

شہلا کا ہاتھ، بشیر کے مضبوط ہاتھ کی گرفت میں تھا۔ بشیر کا ہاتھ گرم اور سخت تھا۔ شہلا کو یوں لگا، جیسے وہ کسی خونی درندے کے غار میں داخل ہو گئی ہے۔ اُسے خوف بھی محسوس ہو رہا تھا۔ اور اس خوف کے تلے تلے خوشی اور مسرت کا احساس بھی تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ کوئی اُسے جھنجھوڑ کے گھاس پر گرا دے، اور اپنے تیز ناخن اس کے سفید سفید نرم بدن میں پیوست کر دے۔ یہاں تک کہ اس کا بدن خون کے دھبوں سے سُرخ ہو جائے۔

بشیر کہنے لگا۔

"میں نے کئی بار سوچا ہے کہ ہم لوگ خود اپنے سب سے بڑے دشمن ہیں"

"وہ کیسے" ـــــــ شہلا نے سرگوشی کی۔

"وہ ایسے کہ ہم نے اپنے اور اپنی خواہشات کے درمیان کئی سمندروں کا فاصلہ حائل کر رکھا ہے۔ میرا مطلب ہماری جائز اور فطری خواہشات سے ہے۔ ہم لوگ اپنے سر پر خود تلوار لئے کھڑے رہیں۔ ہمارا دل خوشی حاصل کرنے کی خواہش میں تڑپتا ہے اور ہم اسے پاؤں تلے دبا کر کچل دیتے ہیں"

شہلا سوچنے لگی ـــــــ نجانے یہ بشیر میرے دل کے احوال کیسے معلوم کر لیتا ہے۔

شہلا کا جسم بید مجنوں کی طرح لرز رہا تھا۔

"تمہیں سردی محسوس ہو رہی ہے؟"

"ہاں"

"میرے قریب ہو جاؤ۔ پھر سردی نہیں لگے گی"

وہ ایک دوسرے کے قریب آگئے ـــــــ اور بھی قریب آگئے اور اندھیرا بڑھتا گیا ـــــ تاریکی گہری ہوتی گئی۔ چاند بدلیوں کی اوٹ میں چھپ گیا ـــــــ مالتی کی جھوٹی ٹہنیاں شہلا کو پکارتی رہیں۔ شہلا! ـــــ شہلا! ـــــ کدھر چلی گئی ہو؟ ـــــــ کہاں جا رہی ہو؟ واپس آجاؤ ـــــــ واپس آجاؤ؟ ـــــــــــــ

مگر ایک انجانا سا احساس لذت ؟ ۔

اسلم

اسلم۔ شہلا کا دُور کا رشتہ دار تھا ـــــــ شہلا کے والد اس کی شادی بشیر سے کرنا چاہتے تھے۔ اپنے مرحوم چھوٹے بھائی سے بہتر بر انہیں کہاں مل سکتا تھا ـــــــ چنانچہ وہ بشیر کا انتظار کرتے کرتے، موت کی آغوش میں جا سوئے۔ وہ اگرچہ اپنے پیچھے اتنی جائداد چھوڑ گئے تھے کہ آئندہ تین نسلیں بھی بخوبی بسر کر سکتی تھیں۔ اس جائداد کی مالک صرف شہلا اور شہلا کی امی تھیں ـــــــ مگر اکیلے پن کے احساس نے شہلا کی والدہ کو بشیر کا مزید انتظار کرنے کا موقعہ نہ دیا ـــــ اور انھوں نے اسلم سے شہلا کی منگنی کر دی۔

اسلم کے والد تو فوت ہو چکے تھے۔ مگر والدہ اور دو بہنیں زندہ تھیں ـــــــ اسلم پہلے تو ادھر اُدھر کی نوکریاں کرتا رہا، مگر اب اُسے اسی شہر میں، آٹھ سو روپے ماہوار پر کسی غیر ملکی فرم میں نوکری مل گئی تھی۔ اور یہ لوگ خوب مزے سے بسر کر رہے تھے۔

اسلم ـــــــ شہلا سے بے پناہ محبت کرتا تھا ـــــــ مگر اس نے کبھی یہ شہلا پر ظاہر نہ کیا تھا ـــــــ فطری طور پر وہ اس قدر شرمیلا اور شریف تھا کہ شہلا تو ہی ایک طرف، وہ کسی بھی عورت سے بات کرنے سے کتراتا تھا ـــــــ مگر شہلا اس سے بہت کچھ مختلف تھی ـــــــ اُس نے اپنی زندگی کا کبھی تجزیہ ہی نہیں کیا کہ اس کے جذبات کا سفینہ کس رُخ پر بہہ رہا ہے۔ اسے اس بات سے بڑی تکلیف ہوتی تھی کہ اسلم ـــــ اس کا منگیتر ہونے کے باوجود، اس سے مردانہ ہمت اور بے باکی کے ساتھ اظہار محبت نہیں کرتا۔ بلکہ ہمیشہ عورتوں کی طرح شرمایا شرمایا رہتا ہے۔ ایسے لمحات میں اُسے محسوس ہوتا کہ اس کے اور اسلم کے درمیان کوئی خاص رشتہ نہیں ہے۔

کئی بار ایسا ہوا کہ اسلم، شہلا کی والدہ کی عدم موجودگی میں اتفاق سے اُن کے گھر چلا جاتا ——— شہلا خوب بن سنور کے اُس کے سامنے آتی اُسے اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر دیتی۔ مگر اسلم اپنی فطری حیا کے سبب شکریہ بھی ادا نہ کر سکتا۔

شہلا اپنی التجا آمیز نگاہوں کے جواب میں اسی قسم کے جذبات سے لبریز نگاہیں چاہتی تھی ——— مگر اسلم چُپ چاپ چائے پیتا رہتا۔ پھر نوکر کو مخاطب کر کے کہتا کہ تائی امی کو میری آمد کی اطلاع دے دینا ——— اور چُپ چاپ کمرے سے نکل جاتا شہلا اس کے اس طرزِ عمل کو اپنی توہین سمجھتی۔ اور احساسِ شکست پر اس کی آنکھیں نمناک ہو جاتیں۔

اسی اثنا میں بشیر آ گیا ——— بشیر نے اُسے وہ سب کچھ دیا جس کی وہ طلب گار تھی۔

اسلم ——— عورت کی یہ ذلت برداشت نہ کر سکا۔ وہ کئی سگریٹ سلگا کر اپنے کمرے میں ٹہلتے ہوئے سوچا کرتا کہ آخر ایک عورت، محض جنسی جذبات کے علاوہ کچھ اور کیوں نہیں ہے۔ کیا دنیا میں لطیف اور پاکیزہ پیار کہیں وجود نہیں ہے یہ خیالات اور مسموم ماحول اس کے دماغ میں ایک جوار بھاٹا برپا کئے رکھتے۔ آخر ایک دن اس نے کوٹ پہنا ——— کوٹ کی اندرونی جیب میں کچھ نقدی رکھ کے باہر نکل آیا ——— اسٹیشن پر پہنچ کر اس نے کسی نامعلوم جگہ کا ٹکٹ لیا۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی سیٹی دینے کے بعد چل پڑی ——— دُور سے جب اس نے شہلا کے مکان کی چمنی دیکھی تو اس کی آنکھوں میں چُبھن ہونے لگی!

سنگ و خشت

دو ایک دن کے بعد شہر کے اس خاص حلقے میں سب کو معلوم ہو گیا کہ اسلم شہر چھوڑ کر کہیں چلا گیا ہے۔ سب حیران تھے بشیر نے تو ایک شام قہوہ خانے میں چائے پیتے ہوئے شہلا کے سامنے اعلان کر دیا۔

"وہ ڈرپوک تھا۔ اور آج سے تیرہ صدیاں قبل کا آدمی تھا۔ اسی لئے وہ بھاگ نکلا ہے"

جب شہلا نے، بشیر کے منہ سے یہ الفاظ سُنے تو اسے افسوس ہوا۔ اس نے اپنے دل میں درد کی ہلکی سی کسک محسوس کی۔ مگر جلد ہی وہ اپنی اصلی حالت پر آ گئی، اور اُسے محسوس ہوا کہ اسلم نے وہاں سے راہِ فرار اختیار کر کے بڑی عقلمندی کا ثبوت دیا ہے وہ اپنی اور اس کی بہتری کے لئے اس سے زیادہ دانشمندانہ قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اسے اس بات سے خوشی حاصل ہو رہی تھی کہ اب وہ پوری آزادی اور بے فکری سے بشیر کی محبت کا لطف اٹھا سکے گی۔ یہ سوچ کر وہ مسکرا دی۔

چنانچہ اسی شام کو اس خوشی میں زیادہ حسین بنانے کے لئے وہ دونوں کلب کی طرف چل پڑے۔

ابھی وہ کلب میں داخل ہوئے ہی تھے کہ انہیں مطلع کیا گیا کہ اختر مر گیا۔

"یہ کیسے ہوا" شہلا جیسے سُن ہو کر رہ گئی۔

اُسے اختر کی موت سے زیادہ اس بات کا صدمہ ہوا تھا کہ ایک حسین شام موت کے سائے نے داغدار کر دی اسے موت سے بے حد خوف محسوس ہوتا تھا۔ وہ موت سے بہت ڈرتی تھی۔ خاص طور پر ایسی خوب صورت شام کو۔

لیکن بشیر پر اس خبر سے کوئی خاص اثر نہ ہوا، اور وہ شہلا کا بازو پکڑ کر، کلب میں اپنے تین چار دوستوں کے جمگھٹے میں لے آیا ——— اور وہسکی پینے لگا۔

"ہم اختر کی یاد میں وہسکی پئیں گے"

شہلا ایک لمحے کے لئے کانپ گئی۔
"تمہیں ایسی باتیں نہیں کرنا چاہئیں"۔
"کیوں؟ ان باتوں سے کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے"۔
"میرا مطلب ہے، ہمیں مرنے والے کا احترام کرنا چاہیئے"۔
"بہت اچھا ہم بڑے احترام سے وہسکی پئیں گے"۔
اس پر ایک زبردست قہقہہ پڑا ——— شہلا غصہ پی کر رہ گئی۔ اس کو اس خیال سے بڑا دکھ ہو رہا تھا کہ ایک روز وہ بھی مر جائے گی اور بشیر کو اسی طرح اس روز بھی کوئی دکھ نہ ہوگا، اور وہ بڑے مزے سے کلب میں اگر اس کی یاد میں وہسکی پینا شروع کر دے گا۔
یہاں سے فارغ ہو کر وہ دونوں سینما چلے گئے۔

جن پہ تکیہ تھا

مس شہلا، بس بشیر کی ہو کر رہ گئی۔
انہی دنوں، ایک روز شہلا کو اچانک احساس ہوا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ شروع شروع میں تو اسے یقین نہ آیا۔ مگر جب اسے پوری طرح یقین ہو گیا تو اس کا سارا جسم کانپ گیا۔ اور رنگ ایک دم زرد ہو گیا۔ اُسے بس بھری دنیا میں بھی بڑا اکیلے پن کا احساس ہوا۔ اس کا خیال یکایک بشیر کی طرف گیا اور یہ سوچ کر کہ وہ اس سے اس قدر پیار کرتا ہے۔ ضرور اس کے لئے کوئی نہ کوئی حل دریافت کرے گا وہ مطمئن سی ہو گئی۔ اس نے جلدی جلدی شام کی چائے پی اور بشیر سے ملنے چل دی۔
بشیر کلب کے باہر، باغ میں چند دوستوں کے ساتھ بیٹھا چائے پی رہا تھا اور تاش کھیل رہا تھا۔ اس نے بشیر کو ایک طرف بلا کر سارا ماجرا کہہ سنایا ——— بشیر نے حسب عادت بے توجہی سے سب کچھ سُنا۔ اور باغ کی ایک اجڑی ہوئی روش پر ہو لیا
"اب کیا کرنا چاہیئے بشیر۔ اور اگر ویسی ویسی بات ہو گئی تو ہمارا سارا خاندان اپنا وقار اور عزت کھو دے گا"۔
بشیر نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور چپ چاپ سگریٹ پیتا رہا۔ باغ کے اندھیرے میں اس کے سگریٹ کا آتشیں کنارا جگنو کی مانند دمک رہا تھا ——— شہلا نے پھر پوچھا۔
"پھر ——— اب کیا ہوگا"؟
"یہی سوچ رہا ہوں کہ اب کیا ہوگا؟"
شہلا خاموش ہو گئی ——— اس کے دل میں ایک ہلکے سے شبہ نے جگہ پائی۔ کہیں بشیر اس سے چھٹکارا تو حاصل کرنا نہیں چاہتا۔ مگر اس خیال نے اسے وہم سے نجات دلا دی کہ بشیر اس سے پیار کرتا ہے، وہ ان نازک حالات میں کبھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑے گا وہ پھر کہنے لگی۔
"ہم شادی کر لیں۔ پھر کسی کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کیوں بشیر؟
"شادی؟ ——— میں نے کبھی اس کے متعلق نہیں سوچا"۔
شہلا سہم گئی۔

"لیکن تم گھبراتی کیوں ہو؟ ــــ میں تمہاری ذمہ داری لیتا ہوں ــــ میں سارے معاملے سے اس طرح نمٹوں گا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی"

شہلا نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"لیکن تم کیا کرو گے ــــ؟"

بشیر نے شہلا کے قریب آتے ہوئے کہا۔

"ہم اس بچے کو ضائع کر دیں گے"

شہلا لرز اٹھی۔ اُسے یوں لگا۔ جیسے کسی نے لوہے کی گرم گرم سلاخ اس کے ہونٹوں پر لگا دی ہو۔ اس کا سارا ذہن سنسنانے لگا

"تم روتی کیوں ہو۔ یقین کرو ہم بڑی آسانی سے اس ابتلاء سے گذر جائیں گے"

شہلا نے غصے میں آکر کہا:۔

"میں اپنے بچے کا خون نہ کروں گی"

"تم بے وقوف ہو"

شہلا نے پھر وہی جواب دیا۔

"میں اپنے بچے کو نہ ماروں گی ــــ میں اس ننھی سی جان کا خون نہیں کر سکتی۔ یہ میرا پہلا بچہ ہے۔ یہ میرے پیار کی نشانی ہے"

بشیر جھنجلا اٹھا۔

"توبہ تم اور تمہارا پیار ــــ خدا جانے عورتیں اس قدر جذباتی کیوں ہوتی ہیں، پیار کو اتنا سر پر کیوں چڑھا لیتی ہیں۔ اور پیار کا انجام ایک کلبلاتا ہوا غیر قانونی بچہ لے کر مردوں کے سر پر کیوں چڑھ دوڑتی ہیں"

شہلا کا جی چاہا کہ بشیر کا منہ نوچ لے ــــ وہ بے اختیار روتے ہوئے کہنے لگی۔

"مگر تم مجھ سے شادی کیوں نہیں کرتے۔ تم نے مجھے کھلونا اور اپنے جذبات کی تسکین کا ذریعہ کیوں سمجھا"؟

"اگر میں نے ایسا کیا ہے تو تم نے بھی یہی کچھ کیا ہے ــــ باقی رہی شادی ــــ تو شادی کا سہرا، مگر زر کلرکوں اور کاروباری لوگوں کے سروں پر ہی سجتا ہے۔ مجھے یہ تاج زیب نہ دے گا"

شہلا کے لیے اب کوئی بات کرنا فضول تھی۔ وہ معاملے کی تہہ تک پہونچ گئی تھی۔ اُسے یقین ہو چکا تھا کہ اب بشیر اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہے ــــ وہ جلدی سے اٹھ کر وہاں سے چل پڑی۔ بشیر نے رسمی طور پر دو ایک بار اُسے روکنے کی کوشش کی۔ لیکن جب وہ نہ رکی تو بشیر بھی چپکے سے دوسری طرف چل دیا اور اپنے دوستوں کے درمیان بیٹھ کر چائے پینے اور قہقہے لگانے لگا۔

پت جھڑ

شہلا، غم واندوہ کے ایک بحرِ بیکراں میں غرق تھی۔

اُسے کبھی یہ توقع نہ تھی کہ اس کی محبت کا یوں مذاق اڑایا جائے گا۔ اس کی وفا کا یوں نیلام کیا جائے گا۔ اس کی عزت کا سودا یوں سرِ بازار بھرے بازار میں چکایا جائے گا ــــ اور اس کا ...... باپ ...... چچا ...... ماموں ...... بھائی ــــ یوں اس کی عصمت کا جنازہ نکالے گا ــــ وہ اتھاہ اندھیرے میں تھی، اُسے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔

شہلا کے ہونٹوں پر غم کی اداسی ——— گہری اداسی جم کر رہ گئی تھی ——— اس کی آنکھوں میں شام کے گہرے سائے تحلیل ہو رہے تھے۔ اس کی رگوں میں بچھڑی ہوئی محبت کا رنگ سیاہی مائل ہو رہا تھا ——— حالات کی تلخیوں نے اس سے اس کے سنہرے آنچل نوچ لیے تھے۔ اور اس کی روح پر غم کا تاریک سایہ چھا گیا تھا ——— اس کی زندگی خزاں زدہ بھورے پتے کی طرح سوکھ رہی تھی ——— اب تو وہ مقبرے کا تعویذ تھی جس پر غمناک آیات کندہ تھیں۔

اس کا دل تاریک پتھروں کی چٹانوں تلے ڈوب رہا تھا۔

اس کی زندگی کے افق پر ایک بے رنگ زردی ——— ایک بے نام افسردگی کی چادر تن گئی تھی ——— اس کی تمام یادیں وقت کے مرقدمیں سے کفن پوش لاشوں کی طرح اوپر کو اٹھ رہی تھیں ——— پیار رو رہا تھا ——— امیدیں خون اگل رہی تھیں۔ زندگی کا ہر درد جاگ اٹھا تھا ——— ہر داغ چمک اٹھا تھا ——— دل کے گھاؤ، جو دکھی ہی کراہ رہے تھے۔ کھول رہے تھے۔

شہلا، اس وقت بھیانک اداسیوں کے بھنور میں پھنسی ہوئی تھی۔ یہ اداسیاں سانپ بن کر، اس کے ارد گرد کنڈلی مار کر بیٹھ گئی تھیں، اور انکی ہزار شاخ زبانیں اس کی طرف دیکھ کر شعلے اگل رہی تھیں ——— شہلا ان کے درمیان ایک زرد پتہ ——— شاخ سے ٹوٹ کر گرا ہوا ——— اڑا ہوا ——— سہا ہوا ——— نیم جاں پتہ

جب ذہن شعلوں سے آتش کدہ بن جائے۔ جب آنکھوں میں آرزوؤں کے تمام چراغ گل ہو جائیں۔ جب چہروں پر راکھ اڑنے لگے۔ جب روپیا سے پلی ہوئی تمناؤں کو اغوا کر لیا جائے۔ ——— جب عزیز امیدوں کے دشتے پر سے ورکر بکھر بلنٹے جائیں ——— تمہارے مٹ ہی جائیں ——— تو پھر انسان روئے نہ تو کیا کرے ——— بلکہ ایسی حالت میں تو آنسو بھی ساتھ چھوڑ جاتے ہیں ——— اور شہلا کی آنکھوں کی جھیلیں خشک تھیں۔

شہلا سوچ رہی تھی ——— بھری بہار میں یہ خزاں کی زرد بوندوں کی بارش کہاں سے شروع ہو گئی ——— ——— میں اپنی روح کے ان جگنوؤں کو کہاں تلاش کرنے نکلوں، جو کسی دور دیس کو چلے گئے ہیں۔

کارنس پر رکھے ہوئے اخروٹ کے کشتی گلدان میں نرگس کے مرجھائے ہوئے پھول ایک بھیانک رات کے اولین اندھیرے میں پہلے سے زیادہ افسردہ دکھائی دینے لگے تھے۔

سو جاؤ نرگس کے پیارے پھولو!

یہ بہت جھکڑ کی رات ہے۔

اس رات خزاں کی حشر خیز آندھیاں چلیں گی ——— موت کے زرد طوفان آئیں گے۔

اے پژمردہ پھولو! تم میں اب کوئی مہک باقی نہیں رہی ——— ایسا نہ ہو کہ خوشبو کے بعد، خزاں کے اداس ہیولے جھکڑ تم سے تمہارا رنگ بھی چھین لیں۔

سو جاؤ!

جس شہزادی کے تم منتظر ہو۔ وہ شہزادی تو، اندھیری راتوں کی نہ جانے کن پگڈنڈیوں پر سے ہو کر ہو کر آئے گی اب اس کے ہاتھ میں صرف اب کے رنگین آنچل کا آخری کنارہ رہ گیا ہے۔

یاد

اس جھنجٹ سے نجات حاصل کرنے کے لئے سب سے پہلا خیال شہلا کے دل میں خودکشی کا آیا۔
لیکن زندگی کی گم شدہ لطافتوں اور بعض قوتوں نے اُسے یہ کرنے سے باز رکھا ——— اس کے دل کے تاریک غار میں نہ جانے کہاں سے نور کی ایک ہلکی سی کرن در آئی ——— اسلم کا خیال ——— بزدل اسلم کا خیال ——— ڈرپوک اسلم کا خیال وہ فرار اختیار کرنے والے اسلم کا خیال ——— اس اسلم کا خیال جو اُسے بے باک نظروں سے نہ تکتا تھا بلکہ جوہی کے پھول کی مانند شرماتا شرمایا رہتا تھا جس کے معصوم چہرے پر مغرب کی چالاکی اور تیزی نہیں بلکہ مشرق کی پُرنور حیا بکھری رہتی تھی ——— اسلم جو اس کے ہوسناک جذبات کو ذرا سی بھی تسکین نہ دے سکا ——— جو اُسے وہ چیز نہ دے سکا جو بشیر نے دی ——— جو اپنی منگیتر کو کانٹوں میں گھسیٹنا گوارا نہ کر سکا ——— جو اس متعفن کیچڑ میں بھی کنول کی طرح پاکیزہ اور سربلند رہا۔
اب اُسے معلوم ہوا تھا کہ اسلم کی محبت کس قدر گہری، مضبوط، سچی، خالص اور ہمیشہ رہنے والی تھی ——— جانے اسلم کہاں ہوگا؟ ——— وہ پریشان افکار کے کھنڈروں میں بھٹکتی رہی ——— اس کا جی چاہا کہ اسلم جہاں کہیں بھی ہو، وہ پر لگا کر اس کے پاس پہنچ جائے ——— اور اس کے پاؤں پر گر کر اپنے گناہوں کا اعتراف کرے ——— وہ زمین پر آسمان کی طرف سے نیکی، سچائی، اور رحمدلی کا پیغام لانے والا فرشتہ ہے ——— وہ ضرور اُسے معاف کر دے گا۔
اس خیال کے آتے ہی وہ اٹھی اور اسلم کے گھر کی طرف چل پڑی۔
گھر سوائے، اس کی والدہ کے اور کوئی نہ تھا ——— اس کی بہنیں ابھی اسکول سے واپس نہ آئی تھیں ——— والدہ نے شہلا کو گلے لگایا ——— پیار کیا اور چائے پلائی ——— انہوں نے اُسے بتایا کہ اسلم آجکل کہاں ہے ——— اس نے اسلم کا ایڈریس نوٹ کر لیا ——— اس کے بعد وہ اپنے کمرے میں جا گئی ——— اس کی کتابوں پر سے گرد جھاڑتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے ایک طرف پڑے ہوئے گرد آلود بوسیدہ سے گلدان میں جوہی کے مرجھائے پھول تھے ——— شہلا نے انہیں گلدان میں سے نکال لیا ——— انہیں پیار کیا ——— اور ایک سیاہ رنگ کی دبیز سی کاپی کے اوراق میں انہیں دبا کر محفوظ رکھنے کے خیال سے اس نے الماری سے وہ کاپی نکال لی ——— جونہی اس نے کاپی کو کھولا ——— وہ ٹھٹک کر رہ گئی۔
——— واردات ——— کاپی کے پہلے صفحہ پر جلی حروف میں لکھا تھا۔ اس کاپی میں اسلم کے نامکمل افسانے اور اس کی زندگی کے وقائع درج تھے ——— شہلا سنبھل کر کرسی پر بیٹھ گئی اور بڑے اور بڑے اشتیاق سے پڑھنے لگی۔
اس کاپی پر بکھرے ہوئے نیلگوں حروف ——— جذبات، درد، تلخ و شیریں حقائق کا ایک عجیب و غریب امتزاج سے ترکیب پائے ہوئے تھے۔
کاپی کے ایک پہلے صفحہ پر لکھا تھا:۔
"خدا جو نہایت مہربان ہے ——— اسی نے قرآن کی تعلیم دی ——— اسی نے انسان کو پیدا کیا ——— اسی نے اس کو بولنا سکھایا ——— سورج اور چاند ایک حساب مقرر سے چل رہے ہیں ——— جھاڑیاں اور درخت سجدہ کر رہے ہیں ——— اسی نے آسمان کو بلند کیا ——— اسی نے خلقت کے لئے زمین کا فرش بچھایا ——— اس میں سے میوے اور کھجور کے درخت اگائے جن کے خوشوں پر غلاف ہوتے ہیں ——— اور اناج جس کے ساتھ چارہ (بھس) ہوتا ہے اور خوشبودار پھول ——— تو تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے۔ اسی نے انسان کو ٹھیکرے کی

طرح کھنکھناتی مٹی سے تخلیق کیا۔ اور جنات کو آگ کے شعلے سے پیدا کیا ــــ ــــ (الرحمٰن - ۱۵)

اور پھر یہ سلسلہ چلتا چلا گیا تھا ــــــ شہلا پڑھتی رہی۔

"ایک حقیقی مصنف کی زندگی میرے نزدیک ایک نہایت ہی پُرلطف زندگی ہے۔ خصوصاً وہ مصنف جو پوری انسانیت کے لئے زندگی کے بہترین پروگرام، مقصد اور نظریئے کا مبلغ ہو ــــ میرے نزدیک ایک ایسا پھول ہے، جو طوفانوں کی سیمابی آغوش میں پلا ہو ــــ ایسے مصنف کا دفتر، اس کی ٹوپی کے اندر ہوتا ہے ــــ اس کے اوزار اس کی جیب میں ہوتے ہیں۔ وہ اپنا آپ افسر ہے ــــ آزاد اور دل چسپ ــــ اپنے وقت کا مالک ــــ اپنے مقصد کی مطابقت سے ہر بات کہنے والا۔ خواہ وہ دوسروں کے لئے غیر مناسب اور خلافِ مصلحت ہی کیوں نہ ہو ــــ اس قسم کا حقیقی مصنف اپنی جنبشِ قلم سے بڑی بڑی عزائی آندھیوں کے رُخ پھیر دیتا ہے ــــ یہ جب اپنے قلم کی خاموش زبان سے دھاڑتا ہے، تو ایک گرج پیدا ہوتی ہے ــــ اس گرج میں کڑک کے انداز ہوتے ہیں ــــ یہ گرج اور کڑک ایک طوفان کا روپ دھار لیتی ہے ــــ ایسا طوفان جس سے دریاؤں کے دِل دہل جاتے ہیں ــــ اس کا قلم رحمدلی، نیکی، سچائی اور روشنی کا پیغامبر ہوتا ہے ــــ اس کے قلم سے روشنائی نہیں بلکہ شبنم ٹپکتی ہے ــــ نیکی اور سچائی کی شبنم ــــ جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم"۔

"آجکل بہترین ادیب وہ ہیں جنہیں اپنی کمائی کی فکر نہیں رہتی۔ بلکہ مقصد کی لگن ان کی تحریروں اور نگارشوں کا محرک ہوتی ہے"۔

"میری زندگی کا طریق کار یہ ہے کہ اپنے مقصد کے لئے انتھک کام کرو۔ کھیلو ــــ دوسروں کی اچھی، بُری رائے کی پروا نہ کرو ــــ کسی دوست کو دھوکا نہ دو ــــ کبھی کسی بات پر غصّے سے لال پیلے نہ ہو جاؤ ــــ جب کام کرتے کرتے تھک جاؤ تو سکون و اطمینان کے لئے کسی اچھے سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لگاؤ ــــ دن میں دو بار غسل کرو ــــ صبح سیر کرنے ضرور جاؤ ــــ شبنم پر ننگے پاؤں پھرو ــــ ہلکی ہلکی ورزش کرو ــــ اچھی غذا کھاؤ ــــ زندگی کے ہر لمحے سے پورا پورا فائدہ اٹھاؤ"۔

شہلا نہ جانے کب تک پڑھتی رہی ــــ دم بخود ــــ حیران و پریشان ــــ اس نے اسلم کو سمجھنے میں کس قدر غلطی سے کام لیا تھا ــــ جوں جوں وہ ورق الٹے رہی تھی اس کے دل میں اسلم کے دل کی سچائی، خلوص اور معصومیت کا نقش گہرا ہوتا جا رہا تھا ــــ وہ اسلم کی تحریریں پڑھ کر مسحور سی ہو گئی تھی۔ اور ایک ایسی باعظمت، بلند اعلیٰ اور صحت مند فضا میں پہنچ گئی تھی جہاں چھوٹی سی چھوٹی شے بھی ہمہ گیر محبت کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ اسے اپنا وجود اس وقت بے حد ہلکا اور بے حقیقت محسوس ہو رہا تھا۔ اس قدر روشنی میں پہنچ کر اسے اپنی روح کے اندھیرے کا شدید اور گہرا احساس ہو رہا تھا۔

آخر اس نے کاپی بند کر کے، الماری میں رکھدی۔ اور ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر زار و قطار رونے لگی ــــ دوسرے کمرے سے اسلم کی والدہ کی آواز سُنائی دی۔

"بیٹی اور چائے پیو گی"؟

شہلا نے جلدی سے رومال سے آنسو پونچھے۔ اور اسلم کی والدہ کے پاس آ گئی۔

"اور چائے پی لو بیٹی"۔

"جی نہیں خالہ جان اب میں چلتی ہوں"۔

اور وہاں سے مل کر، گھر واپس آ گئی۔

تھر پہنچ کر وہ بے حد اداس تھی اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔

فرار

بشیر کے وہی مشاغل تھے ———— جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ———— ایک رات کو وہ بڑی بے چینی سے کروٹیں بدل رہی تھی۔ جُوں جُوں وہ سوچتی، اس کا جی زیادہ پریشان ہونے لگتا آخر اس نے کمرے کی کھڑکی کھول دی۔ باغ میں رات کے سائے بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ ہر طرف اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اور گہرے سبز جھنڈوں میں جھینگر بولنا شروع ہو گئے تھے ——
شہلا کو اپنے آپ ہی بشیر کا خیال آ گیا ——— مجھے بشیر کے پاس جانا چاہیئے ———— وہی میری بدنصیبی کا ذمہ دار ہے۔ اور اب اسی کو اس کا علاج بھی سوچنا پڑے گا۔ اس خیال کے ساتھ ہی اس نے گرم شال کندھے پر اوڑھی اور آہستہ سے اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر صحن میں نکل آئی۔ اور صحن کی پر اسرار فضاؤں میں سے گزرتی ہوئی بشیر کے کمرے میں جا داخل ہوئی۔

بشیر ابھی ابھی کلب سے لوٹا تھا۔

اس کی آنکھیں وسکی کے نشے میں سلگ رہی تھی۔ اور بالوں کی ایک لٹ پیشانی پر جھول رہی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں میز پر کہنیاں ٹکائے، کرسی پر بیٹھا، سگریٹ پینے میں مصروف تھا۔

دروازہ کھلنے کی آہٹ پا کر سُن کر بشیر نے پلٹ کر دیکھا۔

"ارے تم!"

شہلا کا چہرہ بے حد اترا ہوا تھا۔ اور رنگ سپید ہو رہا تھا۔ وہ پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئی ———— اس کی آواز بے حد تھکی تھکی اور کمزور سی تھی۔

"تم نے میری زندگی تباہ کی ہے ———— میں تم سے رحم کی بھیک مانگنے نہیں بلکہ اپنا حق طلب کرنے آئی ہوں۔"

بشیر اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔

"میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں ———— میں زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا ہوں کہ تمہیں ایک پرائیویٹ زنانہ ہسپتال میں لے چلوں۔ وہاں کی لیڈی ڈاکٹر مجھ سے واقف ہے ———— وہ تمہیں اس بوجھ سے سبکدوش کر دے گی۔"

شہلا نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف آنسو تھے کہ آنکھوں سے بہے جا رہے تھے ———— یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے اس کا سارا جسم آنسو بن کر بہہ جائے گا۔

"تم مجھے گڑھے سے نکال کر کنوئیں میں ڈھکیل رہے ہو ———— تمہارا فرض یہ تھا کہ ایسی حالت میں مجھ سے شادی کر لیتے مگر اس کے بجائے میری جان کی بازی لگا رہے ہو۔ مجھے ہمیشہ کے لئے ایک ایسے حق سے محروم کر رہے ہو۔ جو ہر عورت کا بنیادی حق ہے ——— لیکن یہ میری غلطی ہے ———— یہ میری نادانی تھی ———— اور اس کے لئے مجھے بڑی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی ہے ———— مگر خیر ——— اب تم جیسے لوگ مجھے دھوکا نہ دے سکیں گے ———— اب میں کبھی...... میں کل شام کو ہسپتال میں داخل ہو جاؤں گی۔"

شہلا نے اتنا کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی ———— اور بشیر نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے مسکرانے لگا۔

دوسرے روز شہلا ہسپتال میں داخل ہو گئی۔ یہ ہسپتال شہر سے تین میل دُور بڑے پُرفضا مقام پر واقع تھا ——

شہلا نے گھر میں یہ بہانہ بنایا کہ وہ اپنی ایک سہیلی کی شادی پر باہر جا رہی ہے ــــ اس کی والدہ نے اجازت دیدی ــــ
شہلا نے سوچا ــــ شاید اس کی تباہی میں والد کی بے نیازی اور بے پروائی کا بھی تھوڑا بہت ہاتھ ہے، اگر اسے گھر کی طرف سے اتنی آزادی نہ ہوتی۔ اور گھر میں اس پر تھوڑی بہت پابندی رکھی جاتی تو ممکن ہے اُسے آج یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔

شہلا کو ہسپتال کی دوسری منزل پر ایک چھوٹا سا کمرہ دے دیا گیا ــــ جس میں ایک پلنگ ــــ ایک میز کرسی اور غسل خانہ تھا۔

بشیر اُسے ہسپتال میں چھوڑ کے اور ہر روز خبر گیری کے لئے آنے کا وعدہ کرکے چلا گیا۔

شہلا نے منہ ہاتھ دھویا ــــ اور مغرب کی طرف کھلنے والی کھڑکی کھول کر باہر دیکھنے لگی ــــ دوپہر ڈھل چکی تھی۔ اور سورج نے شفق کو لالہ زار بنا رکھا تھا ــــ سامنے ایک دلکش منظر پھیلا ہوا تھا کہ شہلا ایک لحظہ کے لئے اپنے تمام دُکھ درد بھول گئی ــــ آم کے درختوں کی دو رویہ قطار کے درمیان بہتی ہوئی ایک ندی کا شفاف پانی، ڈوبتے سورج کی سنہری روشنی میں سونے کی طرح چمک رہا تھا۔ درختوں کے جھنڈوں میں چڑیوں کی مدھر چہکار گونج رہی تھی سبز سبز کھیتوں میں شام کے ہلکے ہلکے سائے گہری دُھند کی صورت میں پھیلنا شروع ہو گئے تھے، اور اس طرف سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اندر داخل ہو رہی تھی۔ اس ہوا میں کچنار کی ترش مہک تھی۔

اس نے اپنی پُشت پلنگ سے لگادی۔ اور کتاب کھول کر پڑھنے لگی۔

تیسرے روز، صبح صبح نرس نے شہلا کو ایک پرچہ لاکر دیا جس پر لکھا تھا کہ چونکہ اس کے عزیزوں کی طرف سے ہسپتال کے اخراجات کی رقم ملنا بند ہو گئی ہے۔ اس لئے اب مزید اس کا علاج نہ ہو سکے گا۔ لہٰذا اگر وہ شام تک رقم کا انتظام نہ کر سکی تو اسے رات ہونے سے پہلے پہلے ہسپتال کا بستر خالی کر دینا ہوگا۔

شہلا پر جیسے بجلی سی گر پڑی۔

وہ تو خیریت ہوئی کہ وہ شادی پر سہیلی کو تحفہ دینے کے بہانے والدہ سے دو سو روپے لے آئی تھی اُسے مکمل صحت یاب ہونے میں چند روز باقی تھے ــــ اور ایک سو روپے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اس نے سو روپے ہسپتال والوں کے حوالے کردئے

مکمل ایک ہفتہ زیر علاج رہنے کے بعد جب شہلا ہسپتال سے گھر آئی تو وہ بالکل صحت مند تھی۔ گھر آکر اُسے پتہ چلا کہ بشیر دوبارہ انگلستان جا چکا ہے۔

یہ خبر سُن کر اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اندھیرے غار سے نکل کر روشنی میں آگئی ہو۔

آمدِ بہار

اگلے دن اس نے اسلم کو خط لکھا۔

اسلم۔

"میرا خیال ہے، شاید تم میرا یہ خط پڑھنا گوارا نہ کرو۔ ــــ لیکن یہ میرا قصور ہے ــــ واقعی میں ایک ــــ ڈھلوان سڑک پر دوڑی چلی جا رہی تھی۔ تم نے مجھے اپنی خاموش زبان سے آواز دی ــــ انتباہ کیا ــــ مگر میں ــــ نے تمہارے انتباہ پر کان نہ دھرا ــــ تمہاری آواز فضا میں تحلیل ہو کر رہ گئی ــــ اور آخر ــــ واقعی ــــ

یہ ڈھلوان سڑک جس پر میں ردگردے بے نیاز بے تحاشا دوڑی چلی جا رہی تھی ایک تاریک کھڈ کے خوفناک دہانے پر جاکر ختم ہوئی ——— میں سنبھل نہ سکی ——— اور اس کھڈ میں گر گئی ——— اور آخر ایک ایسے جرم کی.... مرتکب ہوئی جس جرم کے تصور سے انسانیت پناہ مانگتی ہے..... اور پھر مجھے اس جرم کو چھپانے کے لئے ہسپتال میں داخل ہونا پڑا ——— اور وہاں ——— ایک دوسرے جرم کا ارتکاب کرنا پڑا اپنے ہی جگر کے ٹکڑے کا قتل! ——— میری زندگی؟ ——— جرم ——— جرم ——— جرم ——— اور محض جرم ——— ——— ———

مگر میں تم سے رحم کی بھیک مانگتی ہوں ——— شہلا! تم سے خود اپنی خیرات مانگتی ہے ——— کیا تم شہلا کو مجھے واپس نہیں دے سکتے؟

صبا کی ان سفید اور سنہری دو پہروں کو میں اپنا چہرہ اوپر اٹھائے دم بخود دکھ بھری اپنی زندگی کے ویران اور اداس افق کو تکتی رہتی ہوں ——— کیا ہوگا ——— کیا ملے گا ——— ؟

میری آنکھوں میں بار بار ایک تباہ شدہ جہاز کی تصویر گھوم جاتی ہے۔ اس کے بادبان ہوا کے تھپیڑوں سے تار تار ہو چکے ہیں۔ اس کا پیندا جگہ جگہ سے ٹوٹ چکا ہے ——— اور اس میں پانی بھر آیا ہے ——— ......

اگر میں ایسے جہاز کے روپ میں تمہارے سامنے آجاؤں تو کیا تم مجھ پر رحم نہ کھاؤ گے؟

سامنے آہستہ آہستہ سورج غروب ہو رہا ہے، شام پر پھیلا رہی ہے، ڈھلتے سورج کی آخری شعاعیں کتنی زرد کتنی کمزور اور کتنی [illegible] ہیں، میں بھی زندگی کے سورج کی ایک ہی کرن ہوں۔ میں یک شکستہ ہوج قبر کا چراغ ہوں جو بجھنے کے قریب ہو کے ایک جھونکے کا منتظر ہو۔ کیا تم اس چراغ کو اپنی رحم دلی اور محبت و شرافت کے دامن میں نہ چھپا لو گے؟ میں اس خدا کا واسطہ دیتی ہوں کہ جو غفور بھی ہے اور رحیم بھی ہے!

اسلم اپنی ذمہ داری کو محسوس کرو، تمہارے قلم کی ایک جنبش پر میری تقدیر کا، مستقبل کا، اور زندگی کا فیصلہ منحصر ہے ——— سسکتی ہوئی لاش کو مٹانا چاہتے ہو یا جلانا چاہتے ہو!

شہلا

شہلا کو چھٹے روز جواب ملا۔ اس نے جلدی سے لفافہ کھولا، اور خط پڑھنے لگی، جیسے قتل کا کوئی ملزم جج کا فیصلہ پڑھ رہا ہو۔

شہلا۔

تمہارے خط کو پڑھ کر بڑی اذیت ہوئی، ایسی اذیت جو لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتی، مگر اب فریاد و ماتم کرنے سے ہو بھی کیا سکتا ہے ——— اس کرب و اذیت کے ہجوم میں مسرت کی ایک لہر بھی میں ابھرتی ہوئی، محسوس کر رہا ہوں ——— وہ یہ کہ تم اپنے کئے پر نادم و شرمسار ہو، اور اب تم اندھیرے سے نکل کر اجالے کی طرف آنے کا عزم صمیم کر چکی ہو۔

توبہ ہر گناہ کا کفارہ بن جاتی ہے، ندامت کے پر خلوص آنسوؤں سے فرد گناہ دھل سکتی ہے۔ کیچڑ میں گر کر کوئی پاک صاف ہونا چاہے تو اس کے لئے پانی مل سکتا ہے

تم نے بہت کچھ کھویا، مٹایا اور بگاڑا ہے، اب اس ملبے کے ڈھیروں کو ہٹا کر ایک ایسی عمارت تعمیر کرو جو پاکیزگی میں تاج محل کو شرما دے اور اپنے حسن و جمال میں "الحمراء" کا مقابلہ کرے ——— شکر ہے، دیر ہی سے

(باقی مضمون ص ۵۷ پر دیکھیے)

ہماری نظر میں

مذاہب عالم از:۔ احمد عبداللہ المسدوسی (بی۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی)، ضخامت ۰۰۵ صفحات مجلّد رنگین وحسین گرد پوش کے ساتھ۔ قیمت بارہ روپے، ملنے کا پتہ:۔

مکتبۂ خدام ملّت، بلاک III / ۸ / ۱ / ۱۲ ناظم آباد کراچی ۱۸

جناب احمد عبداللہ المسدوسی جامعہ عثمانیہ (حیدرآباد دکن) کے قابل فخر فرزند ہیں۔ حیدرآباد دکن میں موصوف نے قائد ملت خطیب اسلام نواب بہادر یار جنگ مرحوم کے دوش بدوش بڑے ٹھوس کام کیا ہے، وہ ایک صاحب فکر اہل قلم ہیں، اور ان کا سینہ دین و ملّت کے درد سے معمور ہے۔ حیدرآباد دکن میں صاحب موصوف خاصی خوشحالی زندگی بسر کرتے تھے مگر پاکستان آنے کے بعد وہ پریشان روزگار ہیں۔ لیکن ان مشکلات میں بھی انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور ان کا مومنانہ عزم حالات کی ناسازگاری کا مقابلہ کرتے ہوئے دین و ملّت اور پاکستان کی خدمت کے لئے سرگرم کار ہے!

دس سال کی پیہم کوشش اور فکر و مطالعہ کے بعد جناب مسدوسی صاحب نے ایک معرکہ آرا کتاب مُرتب فرمائی ہے، جس میں انھوں نے دُنیا کے مشہور مذاہب کا آبادی، رقبہ اور سیاسی مرتبہ کے خطوط پر معاشرتی و سیاسی جائزہ لیا ہے۔ فاضل مصنف کی تحقیق و تفحص اور کاوش و عرق ریزی کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عربی، اُردو اور انگریزی کی دو سو کتابوں اور رسالوں کا انھوں نے اس کتاب کی ترتیب و تدوین کے لیے مطالعہ فرمایا ہے۔ یہ خزینہ یونہی جمع نہیں ہو گیا اس کے لئے سیکڑوں انباروں سے خوشے منتخب کئے گئے ہیں۔

یہ کتاب (مذاہب عالم) چودہ ابواب پر مشتمل ہے۔ جس کا ہر باب اپنے اندر متعدد ذیلی عنوانات رکھتا ہے۔ فاضل مصنف نے .... "مذہب کے تصور" سے جو بحث کی ہے، اس میں بتایا ہے کہ اسلام کا "تصور مذہب" سب سے زیادہ جامع اور کامل ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"جہاں تک اسلام کے نظریۂ دین کا تعلق ہے، یہ بات سب پر روشن ہے کہ وہ مذہب کی جامع تر تعریف پیش کرتا ہے، اس کے نزدیک دین ایک ایسا ضابطۂ حیات ہے، جو خدائے وحدہٗ لاشریک لہ، کی طرف سے اپنے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ خدا کی کتاب (قرآن کریم) کی صورت میں دیا گیا جس میں زندگی کے مادی اور روحانی دونوں شعبوں سے متعلق مکمل اور واضح احکامات دیئے گئے ہیں:"

"اشتراکیت" کو کس ماحول میں اور کن حالات میں کامیابی ہوتی ہے یا ہو سکتی ہے، اس پر مصنف کی بصیرت افروز رائے سنیئے۔

"بہر حال انسانی ترقی کے موجودہ دور میں صرف وہی مذہب کامیاب ہو سکتا ہے، جو انسان کی روحانی تسکین اور تربیت اخلاق کے ساتھ ساتھ اس کی اجتماعی زندگی کے اصلی شعبے یعنی معاشی و سیاسی تنظیم کو بھی در خورِ اعتنا سمجھ کر اس کا کافی اور مناسب بندوبست کرے، اور جب مذہب یہ کردار ادا نہ کر سکے تو اس کی ناکامی اور اشتراکی نظریہ کا غلبہ یقینی ہے۔ مستقبل میں مذہب کی بقا کا دارومدار اس امر پر ہے کہ وہ کس حد تک انسان کی متبادلہ زندگی کے تمام طبعی تقاضوں کو پیش نظر رکھتا اور ان کا قابل عمل و کارگر حل پیش کرتا ہے۔"

اور

"دنیا کے تمام موجودہ بڑے مذاہب کے مقابلہ میں صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس کے پیرو ابھی تک رضاکارانہ طور پر اپنی پسند سے اشتراکیت کے جھنڈے کے نیچے جمع نہیں ہوئے۔"

برّ اعظم افریقہ کی مسلم آبادی کا مسئلہ سب سے زیادہ اُلجھا ہوا رہا ہے۔ مصنف نے اس اُلجھن کو دُور کیا، اس گتھی کو سلجھایا ہے، اور انھوں نے اُن آہنی پردوں کو اُٹھا دیا ہے۔ جو "استعمار" نے ڈال رکھے تھے۔ انھوں نے ثابت کیا کہ۔

"...... افریقہ کے مسلمانوں کی تعداد پونے دس کروڑ ہوتی ہے، جو اس برّ اعظم کی مجموعہ آبادی کا پچاس فیصد ہوتی ہے"

اس تحقیق و جستجو پر صاحبِ تصنیف علمی دنیا کی طرف سے تبریک و تحسین کے مستحق ہیں۔

مسلمانوں کو قرآن پاک نے جو "اُمتِ وسطی" کہا ہے، اس کو مصنف نے جغرافیائی اعتبار سے ثابت کیا ہے کہ وہ دنیا کی اقوام اور دنیا کے رقبہ کے درمیان "اُمتِ وسطی" کی حیثیت رکھتے ہیں ______ فاضل مصنف نے کتنی سچی اور بے لاگ بات کہی ہے۔

"اسلامی نظریۂ حیات کی بڑی طاقت اس کی سادگی اور فطرت پسندی ہے، عقیدۂ توحید (جو اسلام کی اساس ہے) سے زیادہ سادہ اور فطری عقیدہ ناقابل تصور ہے۔ یہ معمولی سمجھ بوجھ کے آدمی کے لئے بھی اسی طرح قابل فہم ہے، جس طرح اعلیٰ دماغ مفکر اور فلسفی کے لئے....."

جناب مسعودی صاحب نے ثابت کیا ہے کہ "مسلمان نسلِ انسانی کے نمائندہ ہیں" کیونکہ

"مسلم قوم میں سامی نسل، آریائی نسل اور منگولی نسل کے اکثریتی علاقے داخل ہیں اور اُن کی آزاد سلطنتیں ان تینوں بنیادی نسلوں کی نمائندہ ہیں۔ مسلمانوں کی یہ خصوصیت ایسی ہے جو دنیا کے دیگر مذاہب کے پیرووں کو حاصل نہیں ہے۔"

بدھ مذہب کی کامیابی اور ناکامی پر ذکی مصنف کا تبصرہ کس قدر بالغ نظری کا حامل ہے:-

"بدھ مت کی دو ہزار سال کی تاریخ سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ وہ جہاں مختلف ممالک اور مذاہب کے قنوطی طبائع کو متاثر کرکے اور انقلابات کے دور میں اپنے لئے عارضی طور پر جگہ پیدا کر لیتا ہے وہاں وہ دوسرے مذاہب کے تبلیغ کا مقابلہ نہیں کرسکتا اور بالآخر مفتوح ہو جاتا ہے......"

یورپین مورخ اور جغرافیہ داں اور انکی حکومتیں مسلمانوں کی آبادی ہمیشہ کم کرکے دکھاتی رہی ہیں بلکہ مسلمانوں کو گرانے کے لئے انھوں نے بدھ مذہب کی آبادی کو زیادہ کرکے دکھایا ہے، فاضل مصنف نے ان تمام غلط بیانیوں اور فریب کاریوں کا پردہ چاک کر دیا ہے، اور ناقابل تردید دلائل و شواہد بلکہ تحریری دستاویزوں کی روشنی میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ دنیا کی آبادی میں مسلمانوں کی موجودہ تعداد

۵۲، ۲۱، ۷۳، ۶۰۹

"باون کروڑ، اکیس لاکھ، تہتر ہزار چھ سو نو ہے۔"

(اللہ ہم زد فزد، علی الرغم اعداء الاسلام)

مسلمانوں کی تعداد اور تیل کے ذخائر میں مسلمان ملکوں کی برتری کی تفصیل پڑھ کر جی خوش ہوا، مگر ساتھ ہی صفحہ ۴۳ پر جدول نمبر ۱ کو دیکھ کر دکھ ہوا۔ اس لئے کہ:-

"اوپر کے جدول سے ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان مغرب کی ترقی یافتہ اقوام کو جانے دیجئے! اپنے ہمسایہ دونوں ممالک بھارت و سیلون سے بھی ہر معاملہ (معاشی و صنعتی ترقی میں) پیچھے ہے۔"

اور پاکستان کے اس معاشی و صنعتی تنزل کے سب سے بڑے ذمہ دار ہمارے اربابِ اقتدار ہیں کہ جنھوں نے ملک کی ترقی کے لئے دھیلہ برابر کام نہیں کیا، بس اقتدار کے لئے آپس میں دست و گریباں رہے ہیں سالنّٰد تعالیٰ ان غرض پرستوں سے جلد پیچھا چھڑائے (آمین)

اس کتاب میں اس پر بھی کافی روشنی ڈالی گئی ہے کہ خود ہندوستان میں ۱۹۵۱ء میں جو مردم شماری ہوئی ہے۔ اس میں ہندوستانی مسلمانوں کی تعداد چھپن لاکھ کم کرکے دکھائی گئی ہے

لائق مصنف نے اس پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے کہ دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں عیسائی مسلمانوں سے زیادہ قریب ہیں اس ضمن میں انھوں نے لکھا ہے :-

"نظریاتی حیثیت سے یہ دونوں (اسلام اور عیسائیت) ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہونے کے باوجود اگر باہم دست و گریباں رہے تو وہ دن دور نہیں جب کہ عالم اسلام کی کمزوری کے نتیجہ میں مغرب شرق کا غلام بن جائے گا۔ قدرت نے عالم اسلام کو مغرب اور عیسائیت کا اولین خطِ دفاع بنایا ہے اگر یہ ٹوٹا تو اس کا خمیازہ عالم اسلام کو تنہا نہ اٹھانا پڑیگا بلکہ عیسائی دنیا کو بھی اٹھانا پڑے گا"

لائق مصنف نے اسلامی دنیا کی نمائندگی کرتے ہوئے عیسائی دنیا کی طرف دستِ مصالحت بڑھانے کی جو کوشش کی ہے اُسے مسلمانوں کا بہت بڑا طبقہ ناپسند کرے گا، کہ تاریخ اور تجربے نے یہ واضح کردیا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے مقابلہ میں عیسائیت اور عیسائی، دوسرے معاندِ اسلام مذاہب کی طرح "الکفر ملت واحدہ" ثابت ہوئے ہیں، اور عیسائی اپنا سب سے بڑا حریف "مسلمانوں ہی کو سمجھتے ہیں .... مگر اس خصوص میں مصنف نے جو مشورے دیئے ہیں اور جو تاریخی حقائق اور دینی افکار پیش کئے ہیں اُن کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، وہ غور و فکر کے مستحق ہیں۔

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام　　بیڑا کسی کا پار لگے یا کہ غرق ہو　　(صفحہ ۲۴)

اس شعر کے مصرعہ ثانی میں مصنف نے تصرف فرماکر، اگرچہ وزن کو قائم رکھا، مگر شعریت کا خون کردیا، مولانا حالی کا یہ شعر اصل میں یوں ہے:-

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام　　کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

"حفیظ" کو دو جگہ "ح" کے ساتھ (غیظ) لکھا ہے، جو کسی طرح درست نہیں!

صفحہ ۰ پر ہندوستان کے سکھوں کے بارے میں جو یہ لکھا ہے کہ اُن کو ہندو بنانے کی کوشش زور شور سے جاری ہیں، یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا ہندوستان میں "سکھ" ہندو مت قبول نہیں کر رہے ہیں .... ہاں! یہ ضرور ہو کہ اچھوت ذات کے نمائندے ڈاکٹر امبیڈکر آنجہانی نے تقسیم ہند سے قبل جب بدھ مذہب قبول کیا تھا تو اس کی دیکھا دیکھی بعض بھنگی اور چمار مذہبی عقائد کی بنا پر نہیں بلکہ صرف سماجی برتری کی حرص میں "سکھ" ہوگئے تھے اور انھوں نے کیس کڑا اور کرپان کے ساتھ "سکھ ہیئت" اختیار کرلی تھی۔ اب یہ نیچ ذات کے لوگ پھر ہندو مذہب کی طرف واپس جارہے ہیں، ہمارا خیال ہے کہ ہندوستان کے ہندو "سکھوں" سے مذہبی چھیڑ چھاڑ کی غلطی شاید نہ کریں گے۔

"پروٹسٹنٹ مذہب میں خداوند یسوع مسیح کے راست اقتدار، عیسائیوں کے عقیدے اور عمل میں حضرت مسیح کی ذات قدس کا بلاراست اثر اور حضرت مسیح کی ذات اور انسانوں کی روح میں بلاراست تعلق ....."　　(صفحہ ۳۶۷)

کتاب میں جہاں جہاں رنگ پیدا ہوگیا ہے، وجدان تمنا کرتا ہے کہ کاش! لکھنے والے کا قلم شگفتہ تر ہوتا۔

اس کتاب میں متعدد رنگین نقشے (maps) کتنے ہی ترسیمات (Graphs) اور درجنوں جدولیں (Charts) ہیں۔ دنیا کا مذہبی و سیاسی نقشہ (Religio Political map of the world

آٹھ رنگوں میں ہے، جس نے اس کتاب کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ تنہا اس ایک نقشہ پر تقریباً ایک ہزار روپیہ خرچ ہوا ہے۔ اس لاگت میں تو اردو کی ایک کتاب چھپ سکتی ہے! جس دیدہ ریزی کے ساتھ یہ نقشے مرتب کئے گئے ہیں، اور جتنی مفصل جدولیں مرتب ہوئی ہیں اس اہتمام کے ساتھ اردو میں اب تک کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی۔ لاگت کے اعتبار سے کتاب کی قیمت دبارہ روپیہ کم رکھی گئی ہے!

جناب احمد عبداللہ المسدوسی نے یہ کتاب (مذاہب عالم) مرتب فرما کر، علمی دنیا میں ہی ایک جگہ پیدا کرلی ہے۔ اس کتاب کا جب انگریزی میں ترجمہ ہوگا تو مغربی دنیا اس کا خیر مقدم کرے گی اور مستشرقین چونک اٹھیں گے!

حسرت کدہ

از:- شفقت کاظمی، ضخامت ۱۷۶ صفحات، مجلد رنگین گردپوش کے ساتھ، قیمت تین روپے۔
ملنے کا پتہ:- علمی کتب خانہ مظفرگڑھ (مغربی پاکستان)

جناب شفقت کاظمی اردو دنیا کے جانے پہچانے شاعر ہیں۔ اُن کی غزلوں کا یہ مجموعہ علمی کتب خانہ مظفرگڑھ نے خوبصورت اہتمام سے شائع کیا ہے۔ جس پر پیش لفظ جناب نیاز فتحپوری (مدیر نگار) نے اور "تعارف" مولانا عبدالمجید سالک نے لکھا ہے! نیاز فتحپوری کی شفقت کاظمی کی شاعری کے بارے میں یہ رائے ہے:-

"۔۔۔ جناب شفقت کی سہل وسادہ جذباتی شاعری اپنی کیفیت کے لحاظ سے اپنے اندر بڑی وسعت رکھتی ہے، وہ صرف زبانِ عشق و محبت اور اعترافِ حُسن و جمال ہی نہیں بلکہ ایک ایسا تاثر روحانیت بھی اس میں پایا جاتا ہے جسے "ماورائے عالم آب و گل" عالم مجردات کی چیز بھی کہا جا سکتا ہے۔۔۔۔ جناب شفقت کی شاعری اس میں شک نہیں وہ حسرت کی شاعری کا آئینہ ہے، لیکن اس میں شفقت کی انفرادیت بھی نمایاں ہے۔"

جناب عبدالمجید سالک لکھتے ہیں:-

"۔۔۔۔ شفقت کاظمی کی غزل میں وہی خوشبو محسوس ہوتی ہے، جس سے کلامِ حسرت مہک رہا ہے، وُہی مہذب و شائستہ اسلوبِ اظہار، وہی بچے تلے الفاظ و تراکیب وہی عشق و تصوف کی آہستہ آہستہ سلگتی ہوئی آگ شفقت کاظمی کے کلام میں بھی موجود ہے۔۔۔۔"

جناب شفقت کاظمی کو امام المتغزلین حضرت حسرت موہانی مرحوم کی ذات سے اتنی گہری عقیدت ہے کہ مولانا حسین احمد مدنی مرحوم نے فرطِ انکسار سے جس طرح "ننگِ اسلاف" کو اپنے نام کا جزو بنایا تھا اسی طرح شفقت صاحب نے "خاکپائے حسرت موہانی" کو اپنے نام میں شامل کرلیا ہے! کوئی شک نہیں شفقت کاظمی نے حسرت موہانی کے اسلوب کو غزل میں جس طرح نباہا ہے، اور اس رنگ کو قائم رکھا ہے، بس وُہ اُنہی کا حصہ ہے!

شفقت کاظمی کی پوری کی پوری غزل ہم یہاں درج کرتے ہیں، جس کا ایک شعر بھی سطحی اور نظرانداز کرنے کے قابل نہیں ہے:-

اغیار ہیں اب نہ آشنا یاد — غربت میں نہ کچھ ہمیں رہا یاد
اٹھی تھی کبھی جو بہرِ پرسش — اب تک ہے وہ چشمِ آشنا یاد
دنیا کی خبر وہی نہ دیں گے — اس شوخ کی یاد بھی ہے کیا یاد
روداد جنوں ہوئی فراموش — آغاز ہے اب نہ انتہا یاد
ساقی تجھے مری غرض کے سنگ — آتی ہے لیے مری دوا یاد
وہ اور تمہارے ستم کا شکوہ — کچھ جن کو نہیں بجز دُعا یاد

وہ رنج اٹھائے ان کے ہاتھوں
شفقت مجھے آگیا خدا یاد

شفقت کا نکھرا ہوا تغزل ہے، تصنع سے دُور اور واقعیت سے قریب! اُن کی غزلوں میں، دُکھے ہوئے دل کی کسک پائی جاتی ہے، اور سادگی میں ایسا بانکپن کہاں ہوتا ہے، ان کے چند منتخب اشعار:

وہی سب سے زیادہ قدرداں دوستی نکلے　　جنہیں ہم نے رہ و رسمِ وفا سے بے خبر جانا
تیری برابری کی مجھ کو مجال کیا تھی　　تو فخرِ مہوشاں تھا، میں ننگِ عاشقاں تھا
پہنچی ہے وہ ایذا ہمیں اپنوں کی بدولت　　غیروں کی جفاؤں کا گلا ہو نہیں سکتا
غم ترا باعثِ تسکینِ دل و جاں نکلا　　جس کو ہم ظلم سمجھتے تھے وہ احساں نکلا
کب ہمیں جراتِ اظہارِ وفا تھی اے دوست　　خود ترا حسنِ کرم سلسلہ جنباں نکلا
یا اپنی زندگی تھی سراسر بے رُخی　　یا اُن کا التفات گوارا نہ ہو سکا
نہ جانے غیر تیرے التفاتِ ظاہری پہ بہت　　مری طرح وہ پشیمانِ آرزو ہوگا
اُن کو دُنیا فریب کیا دیتی　　جن کو دُنیا کا اعتبار نہ تھا
حضورِ دوست غمِ آرزو کے افسانے　　بغیر قصد بھی ہم نے سنائے ہیں کیا کیا
کسی کی یاد نہ جب تک شریکِ حال ہوئی　　رہِ وفا میں قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا
پڑا نہ صبر مری بے کسی کا آخرکار　　سرشکِ غم تری آنکھوں میں آئے ہیں کیا کیا
آپ آئیں تو سہی گورِ غریباں کی طرف　　بے کسی بڑھ کے بتا دے گی ٹھکانہ میرا
اہلِ دُنیا کو ہے کیا درد کے ماروں سے غرض　　کون سنتا ہے بھلا مجھ سے فسانہ میرا
وہ ذکرِ محبت پہ شرما گیا　　کہیں شاید اس کا بھی نام آگیا
میں اپنے دل کی داستاں کسی سے کیا کروں بیاں　　نہ کوئی غمخوار رہا، نہ کوئی آشنا رہا
ہمارے حال کی انہیں خبر نہ تھی مگر ہمیں　　انہیں سے واسطہ رہا، انہیں کا آسرا رہا
ہوتا ہے آج اُن کی نگاہوں کا سامنا　　میں جس سے ڈر رہا تھا وہ ہنگام آگیا
اسباب اور بھی مری بربادیوں کے تھے　　کیا جانے کیوں زباں پہ ترا نام آگیا
ربطِ ماضی کا فسانہ مرے آگے مت چھیڑ　　شوق اس درد کو اب بھول چکا ہے اے دوست
تری ادائے تلون کو اس میں دخل نہیں　　غمِ فراق تھا انجامِ دوستی اے دوست
دل جنتِ سرور ہے عرضِ وفا کے بعد　　جیسے وہ کچھ کہیں گے مری التجا کے بعد
اب مجھے خندۂ عشرت سے سروکار نہیں　　اپنی تقدیر پہ ہوں نوحہ سرا تیرے بعد
تیرے غم سے بھی شاد ہیں ہم لوگ　　وہ محبت نژاد ہیں ہم لوگ
یونہی ذکر اپنا آگیا ہوگا!　　ورنہ کب ان کو یاد ہیں ہم لوگ
دیکھا تھا جو اک بار تجھے آنکھ اٹھا کر　　اب تک ہیں مری سمت زمانے کی نگاہیں

لب پہ آتی ہے جو فریاد تو برہم کیوں ہو — یوں بھی کیا دردِ محبت کا مداوا نہ کریں ؟

دے اجازت جو شوقِ خود بینی — میری جانب بھی اک نظر دیکھو

منزل ہے نظر میں اب نہ جادہ — سرگرمِ سفر ہوں بے ارادہ

واقف ہوں فریبِ دوستی سے — اظہارِ کرم نہ کر زیادہ

اب وہاں غیر کے افسانے ہیں — تذکرے اپنے جہاں تھے پہلے

آہ! اب یہ بھی اُن کی نہ رہی — جو محبت دل و جاں سے پہلے

ہم نے اس راہ کو آساں کیا — ہر قدم سنگِ گراں تھے پہلے

ہم سے ہیں آہ و بکا آج گریزاں کہ جنہیں — دل ربائی کا ہر انداز سکھایا ہم نے

کچھ جوانی نہ کبھی دل میں امید دل کی جُز غم — یوں ترے بعد ترا سوگ منایا ہم نے

تھی یہ قسمت کے اتفاق کی بات — ہم قفس میں تھے ، جب بہار آئی

بیٹھے بیٹھے تعلق پہ کبھی چل نکلا — کبھی وہ یاد جو آئے تو آنکھ بھر آئی

غمِ حبیب ! مری قدر کر کے میرے بعد — کسی سے ہو نہ سکے گی تری پذیرائی

مقدر میں لکھی تھی باہم جدائی — نہ تم بے وفا ہو ، نہ ہم بے وفا ہیں

کیا غرض اہلِ بزم کو شفقت
آپ محزوں اٹھے کہ شاد گئے

دوسرا رُخ :-

حسن کی حسرت نگاہی نے دیے کیا کیا قدم — اُٹھ کے اس محفل سے جب مجبور میں جانے لگا (صفحہ ۱۹)

"قدم لینا" اس مفہوم کے ظاہر کرنے کے لئے اوپر تو درست ہے ——————— پھر حُسن کی "حسرت نگاہی" کے لئے شعر میں کوئی ثبوت ہونا چاہیے تھا . . . . . "حسن" کو آخر کس بات کی حسرت اور کیا مجبوری تھی !

تغافل ہائے بے جا کا مزہ تجھ کو چکھا دیتے — جو ہوتا اپنے قابو میں دلِ بے اختیار اپنا (صفحہ ۳۰)

محبوب سے اس طرح تخاطب . . . . "کہ تجھے مزہ چکھا دیتے" آدابِ محبت کے خلاف ہے !

رہ رہ کے اُن کی یاد ستاتی رہی مجھے — ہر چند رنگِ مہر و محبت نکھر گیا (صفحہ ۲۱)

مصرعہ ثانی کو "رنگِ مہر و محبت نکھر گیا" نے کس قدر بے مزہ بنا دیا۔

مآلِ عشق جز رنج و مصیبت ہو نہیں سکتا — یہ ہم نے بیشتر سمجھا ، یہ ہم نے بیشتر جانا (صفحہ ۲۲)

اس قسم کے مبتدی کے اشعار چھانٹ دینے چاہیے تھے۔

اُدھر بڑھتی ہوئی تاریکیاں شامِ جدائی کی — اِدھر اپنے دلِ مجبور کا گھبرا کے مرجانا (صفحہ ۲۲)

پہلا مصرعہ خاصہ ہے ، دوسرے مصرعہ کا آدھا حصہ بھی پہلے مصرعہ کے جوڑ کا ہے . . . . مگر "گھبرا کے مرجانا" نے سارا مزہ ہی کرکرا کر دیا۔ شاید اس طرح "ہارٹ فیل ہونے" کی ترجمانی کی گئی ہے۔

شفقت کو دیر سے تھا پریشانیٔ خفتی — آخر نثارِ حسن خود ہو گیا (صفحہ ۲۲)

شعر میں کوئی لطف نہیں، بس لفظ جوڑ دیے ہیں۔

الزامِ انکشافِ محبت نہ دے ہمیں		مجبور ہیں کہ ضبط کا یارا نہیں رہا		(صفحہ ۲۷)

کہنا تھا "اظہارِ محبت" اور کہہ گئے "انکشافِ محبت" ایک لفظ نے سارے شعر کو بے لطف کر دیا۔

مدت اک جانِ زار سے تھا جو تقاضا		پاس آکے تجھے ہم تقاضا جو جانا		(صفحہ ۳۰)

آخر شاعر کہنا کیا چاہتا ہے!

کم تاب ضبط کے جو سر منڈھائے ہیں کیا کیا		بہ فرطِ یاس بھی ہم مسکرائے ہیں کیا کیا!		(صفحہ ۳۸)

کاش! "بفرطِ یاس" کی جگہ کوئی موزوں تر لفظ ہوتا۔

شوق کی آنکھیں ہیں سرشارِ محبت کا نمی		ایک دن دیکھی تھی جو رنگینی بازوئے دوست		(صفحہ ۲۵)

محبوب کے لب و رخسار کی رنگینی کو چھوڑ کر "رنگینی بازوئے دوست" سے متاثر ہونا عجیب سی بات ہے۔

اک بت شوخ پہ تیری بھی طبیعت آئے		اب یہی میرے نقیروں کی دعا ہے اے دوست		(صفحہ ۵۱)

کسی شخص کو اگر کسی عورت سے محبت ہو تو اس کا جذبۂ رشک کسی عنوان گوارا نہیں کر سکتا کہ وہ اس سے یہ کہے کہ:۔

اک بت شوخ پہ تیری بھی طبیعت آئے

ہاں! "مرد" سے کسی کو دل لگی ہو تو یہ تمنا کی جا سکتی ہے...... دوسرے ایڈیشن میں اس شعر کو حذف کر دینا ہی مناسب ہے

بارہا جو تیری صحت کو اٹھائے میں نے		ہو گئے شل وہ مرے دستِ دعا تیرے بعد		(صفحہ ۶۰)

"دستِ دعا کا شل ہو جانا" بے جا مبالغہ ہے! شعر میں ایسے "مبالغے" آ سکتے ہیں مگر ان کے لئے کوئی اشارہ، رمز او کنایہ درکار ہے، ابتذال کیوں ہو؟

دے چکے آپ عہد، سوق مگر		مجھ کو اس میں بھی ہے کلام اب تک		(صفحہ ۶۴)

"قول دینا" اور "زبان دینا" روزمرہ ہے، "عہد کرنا" بولتے ہیں — مصرعہ ثانی میں "بھی" زائد ہے

اپنی قسمت کہ شاد کام نہیں		ہم کو تجھ سے کوئی کلام نہیں

ایک مشاق شاعر اور ایسا "بچکانہ شعر"!

تجھ سے مخصوص ہے وفا اپنی		تجھ کو بھولیں تو کس کو یاد کریں		(صفحہ ۸۵)

مصرعہ ثانی کس قیامت کا ہے ——— مگر افسوس پہلا مصرعہ اتنا ہی پھُس پھُسا!

ابھی گزر گئی ہے شغلِ سخن میں شفقت		دنیا کے خرخشوں سے بے خبر رہا ہوں		(صفحہ ۸۱)

"خرخشوں" نے شعر کو کس قدر بوجھل بنا دیا۔

بگڑ نہ جائے تری طبع بے ملال کہیں		ترے حضور میں ڈر ڈر کے بات کرتے ہیں		(صفحہ ۹۵)

"طبیعت کا بگڑنا" عموماً بیماروں کے لئے استعمال ہوتا ہے!

عمرِ جاوید سے یاں کچھ بھی سروکار نہیں		آپ کہتے ہیں اگر جی سے گزر جانے کو		(صفحہ ۹۷)

نہایت درجہ سطحی شعر!! "خیال و اظہار" دونوں ناقص!

یکساں ہے دل نوازئ ارزندۂ محبت		الطاف کسی کا ہو کہ بیداد کسی کی		(صفحہ ۶۹)

مصرعہ اولیٰ کس قدر کمزور ہے۔

مایۂ جاں ہوئی کسی کی جفا — اب مقدر میں کچھ کمی نہ رہی (صفحہ ۱۱)

"وجدان آزادہ" شعر! فریاد!!

بدنامیٔ جنوں سے بہرحال خوش ہیں — مجھ کو جو تاج کرامت نہ ہو سکے (صفحہ ۱۲)

شعر کا سارا مفہوم "بطنِ شاعر" ہی میں محفوظ رہا۔

ٹھیک نہ دیر ہے دینے کی — آ قسمت مرے کاشانے کی

لفظوں کے آہنگ، در و بست کے اعتبار سے "ٹھیک" بھلا نہیں لگتا، کاش! مصرعہ اولیٰ یوں ہوتا۔

ہو بہو شکل ہے ویرانے کی

اسی غزل کا تنہا یہ شعر نہ جانے کتنی غزلوں پر بھاری ہے۔

جرأت آموز ہوس میں کیا کیا — یہ ادائیں ترے شرمانے کی

بار بار پڑھئے اور ہر بار نیا لطف محسوس کیجئے۔

شب کی تنہائی میں جب یاد آ گئے — وہ مجھے کچھ اور بھی تڑپا گئے (صفحہ ۱۴)

"دندانِ توجملہ در دہانند" کے انداز کا شعر!

اس سے پہلے کہ مری روح سُنے مژدہ عیش — دل ترے دردِ محبت سے لگا بھی آئی (صفحہ ۰)

مفہوم تو سمجھ میں آگیا...... مگر اس کا اظہار ٹھیک طرح نہیں ہو سکا۔ "دل کا لگا آنا" خاص طور سے کھٹکتا ہے۔

لغزشوں سے کون بچ سکا ہے جو شفقت کاظمی شروع سے آخر تک بچتے رہتے —— مجموعی طور پر "حسرت کدہ" خوب نہیں خوب تر ہے۔ توقع ہے کہ اس مجموعہ کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

سہی مگر تمہیں اپنی گراوٹ کا احساس تو ہوا۔

میں تمہیں تاریکیوں کی نکالنے کی ذمہ داری لیتا ہوں —— مگر ایک شرط پر کہ تم مجھے نیکی اور انسانیت کا ماہتاب کرنے میں مدد دو گی۔ میں تمہیں شرافت اور نیکی کے اس راستے میں اپنے لئے روشنی کا مینار بنانا چاہتا ہوں تم اپنے مردہ ماضی کے مزار سے دامن جھٹک کر کھڑی ہو جاؤ! جب کہ تم خود تلافیٔ مافات کا بیڑا اٹھا چکی ہو تو یہ گھٹا ٹوپ اندھیرا اجالے میں تبدیل ہو کے رہے گا۔

میں نے اپنے دل کی بات تم سے کہہ دی ہے۔ میرا وعدہ اپنی جگہ اٹل ہے —— مگر تم نے جو کچھ کیا ہے، اس کی معافی اپنے خدا سے طلب کرنی ہے، عجز و عفو کے سجدے، ندامت کے آنسو، توبہ کی ہچکیاں......

اس دل پہ خدا کی رحمت ہو، جس دل کی یہ حالت ہوتی ہے — اک بار خطا ہو جاتی ہے، سو بار ندامت ہوتی ہے،

میں بہت جلد آرہا ہوں

اسلم

نسیمہ کا چہرہ فرطِ مسرت سے چمک رہا تھا، جیسے اس کی مردہ تمناؤں کے ہونٹوں پر کسی نے آبِ حیات چھڑک دیا، اس کی آنکھوں میں دھندلے دھندلے آنسو تھے۔ —— حسرت کے آنسو —— وہ زندگی جس کا تباہی کا نقشہ اس کی نگاہوں کے سامنے تھا اب روشنیوں اور خوشبوؤں کے جھرمٹ میں تھی ——۔ اسلم کا خط پڑھ کر نماز کے لئے وضو کرتے ہوئے اپنے جوبن کے شرمیلے پھولوں کا خیال آگیا، اور پھر وہ نماز میں اس طرح کھڑی تھی، جیسے ایک خونیں مجرم فرطِ خوف سے تھر تھر کانپ رہا ہو!

جامعہ طبیہ شرقیہ پاکستان میں اپنی نوعیت کا پہلا ادارہ ہے

قائدِ اعظم کی ایک دیرینہ خواہش ہمدرد کے ہاتھوں تکمیل کو پہنچی

محترمہ فاطمہ جناح کی تقریر

میرے لیے یہ امر باعثِ مسرت و انبساط ہے کہ جامعہ طبیہ شرقیہ کا افتتاح کیا جا رہا ہے۔ ایک ایسے ادارے کی ہمارے ملک کو ضرورت تھی۔ آج مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہو رہی ہے کہ قائدِ اعظم کی ایک دیرینہ خواہش ہمدرد دواخانہ کے ہاتھوں تکمیل کو پہنچی۔ مشرقی طب کا یہ اہم ادارہ پاکستان میں اپنی نوعیت کا پہلا ادارہ ہے۔

میرا ہمیشہ سے یہ خیال رہا ہے کہ ہر قوم کی ترقی کا راز اس میں مضمر ہے کہ اپنی علمی اور ثقافتی میراث سے روحانی جذبہ حاصل کرے اور اپنے مزاج اور GENIUS کے مطابق تعمیری جدوجہد میں مصروف ہو۔ تاریخ اس کی گواہ ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی ایسا پہلو نہیں جس میں مسلمانوں نے اپنی ذہانت اور قوتِ عمل سے کارہائے نمایاں نہ انجام دیے ہوں۔ جن علوم و فنون کا انسانی بہبود سے براہِ راست تعلق ہے ان میں غالباً طب وہ فن ہے جس کو مسلمانوں نے اپنی محنت اور تحقیق سے سب سے زیادہ جلا بخشی۔ اگرچہ سیاسی اور تمدنی ادبار کی وجہ مسلمانوں کے علمی کمالات کے نقوش بہت کچھ دھندلے پڑ گئے لیکن کم سے کم اس برصغیر کے مسلمان اطباء خصوصاً ہمدرد نے طبِ مشرق کی روایات زندہ رکھنے میں قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں اور انھوں نے اس شریف اور انتہائی مفید فن کو نہ صرف زندہ رکھا بلکہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات اور تقاضوں کے مطابق اس کو ترقی دینے کی کوشش کی۔

قیامِ پاکستان کے بعد ہمدرد کے ٹرسٹیز نے کسی سست رفتاری سے کام نہیں لیا بلکہ اپنی انتھک کوششوں سے وہ فنِ طب کی ترقی کے لیے مسلسل کام کرتے رہے اور اس زمانے میں انھوں نے کئی مفید پیٹنٹ ادویہ تیار کیں جو ہر جگہ آسانی سے مل سکتی ہیں اور جن سے ہر خاص و عام مستفیض ہو رہے ہیں۔ آج وہ ایک ایسا ادارہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے جہاں علمِ طب کی تعلیم کا مناسب انتظام کیا گیا ہے۔ یقیناً یہ بہن طب کی یہ کوششیں قابلِ قدر اور لائقِ ستائش ہیں۔ ہمارے ملک میں ابھی بدقسمتی سے افلاس اور بیماری کا دور دورہ ہے طبی سہولتیں بہت ناکافی ہیں۔ طبِ مشرقی ہمارے ملک کے حالات کے لحاظ سے بہت مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ فن ہماری قوم کے دل و دماغ کی پیداوار ہے۔ قوم کے مزاج سے مطابقت رکھتا ہے اور اس کے ذریعہ علاج کے اخراجات بھی زیادہ نہیں ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ اپنی تعلیم اور ترقیات کو بھی موجودہ زمانے کے حالات کے مطابق ڈھالیں۔ اپنے طریقۂ علاج کو ایسے معیار پر رکھیں کہ قوم کے زیادہ افراد اس سے فائدہ اٹھا سکیں اور اپنے طلباء میں وہ جذبۂ خدمت و ہمدردی پیدا کریں جو اس شریف پیشہ کا طرۂ امتیاز ہے اور جس کے ذریعہ سے معاشرے میں اعلیٰ مقام حاصل ہو سکتا ہے۔

میری دعا ہے کہ یہ ادارہ روز افزوں ترقی کے منازل طے کرے اور قومی خدمت کی جو شمع آپ نے روشن کی ہے وہ ہمیشہ فروزاں رہے۔

میں آخر میں حکیم محمد سعید صاحب اور ان کے رفقائے کار کو مبارکباد پیش کرتی ہوں اور ان الفاظ کے ساتھ رسمِ افتتاح ادا کرتی ہوں۔

فاران
کراچی
پاکستان
ماہر القادری

ترجمان انجمن ادبی رسائل پاکستان

فاران

جلد ۱۰

شمارہ ۸

ماہ نومبر ۵۱ء

ایڈیٹر

ماہر القادری

سالانہ چندہ

چھ روپے

فی پرچہ

آٹھ آنے

ترتیب

مقام اشاعت:۔ دفتر فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی نمبر (۱)

پرنٹر پبلشر:۔ مسرور حسین ـــــ مطبع سعیدی، قرآن محل مولوی مسافر خانہ، کراچی

بشر ہیں انبیاء کرام بشر ہونے کے ساتھ مہبطِ وحی بھی تھے۔ یہی وہ شرف ہے جس نے عام انسانوں سے انبیاء کو ممتاز کر دیا ہے، اور یہ نفوس قدسیہ بشر ہوتے ہوئے، تمام انسانوں میں ممتاز، منتخب اور منفرد نظر آتے ہیں (علیہم السلام والتحیات)۔

وحی و رسالت کا یہ سلسلہ چلتا رہا، اس وقت سے چلتا رہا۔ جب سے پہلا انسان دنیا میں آیا تھا۔ یہاں تک کہ محمد عربی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی ذات قدسی صفات پر اس سلسلہ کو ختم کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس طرح اپنی نعمت کا تمام فرما دیا۔ اب نہ کسی انسان پر اللہ تعالیٰ کی وحی آئے گی، نہ کسی کو نبوت کا منصب عطا کیا جائے گا، اس عہدے ہی کو توڑ دیا گیا اور نبوت و رسالت کے منشور پر آخری مہر لگا دی گئی۔ اب جب کسی کو بھی ہدایت ملے گی، فوز و فلاح، سعادت اور روشنی حاصل ہوگی، حضرت ختمی مرتبت کے اسوۂ مقدسہ کے اتباع سے حاصل ہوگی۔ جس منزل و جادہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم نظر آتے ہیں وہی صراطِ مستقیم ہے!

اقامتِ دین کے مرحلے

مکہ کے بگڑے ہوئے ماحول اور قریش کی گندی سوسائٹی اور مشرکانہ فضا میں یکہ و تنہا آپ ﷺ نے صدائے توحید بلند کی اور اخلاق و پاکیزگی کا پیغام دیا۔ اس پیغام پر گنتی کے چند لوگوں نے لبیک کہی، عام طور پر اس کا مذاق اڑایا گیا، اور صرف مذاق و استہزاء ہی نہیں، گالیاں بھی، نجاست بھی، کانٹے بھی، پتھر بھی، بائیکاٹ بھی، اور وہ بھی شدت کے ساتھ کہ اس کے ساتھیوں اور خاندان والوں کو ایک ایک دانہ کے لئے ترسا دیا گیا۔ حق کی راہ میں رکاوٹیں ہی رکاوٹیں، موانع ہی موانع، ایک ایک قدم پر مصیبتوں کے پہاڑ۔ مظلومیت کی تمام دردناکیوں کا ہجوم... مگر اس صادق و مصدوق اور اس کے مخلص ساتھیوں نے ایک ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے اندر بیزاری اور بے ہمتی محسوس نہیں کی۔ سختیاں اور مظالم عزیمت کو اور مستحکم کرتے چلے گئے!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضور کے صحابہ کو ان مصائب کے بعد ایک اور صبر آزما امتحان سے گزرنا پڑا اور وہ تھا "حبِ وطن" کی قربانی کا امتحان: اپنا وطن ہر کسی کو پیارا ہوتا ہے اور اپنی خوشی سے ترکِ وطن کون گوارا کرتا ہے، اس امتحان میں بھی اللہ کے نیک بندے پورے اترے! ہجرتِ حبشہ کے بعد ہجرتِ مدینہ کی باری آئی اور خود داعی حق کو گھر سے بے گھر ہونا پڑا۔

مکہ اور طائف کی زمین قبولِ حق کے لئے ابھی تک سنگلاخ تھی مگر مدینہ کی خاک میں قبولِ حق کی پوری صلاحیت موجود تھی۔ یہاں اللہ کے فضل و ہدایت سے قبیلے کے قبیلے دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے، یہ انصار تھے جنہوں نے رسول کی اور مہاجرین کی ہر لحاظ سے پوری پوری رفاقت کی اور اسلامی اخوت کا، اور انسانی بھائی چارے کی ایک روشن مثال قائم کر دی۔

مکہ میں مسلمان مظلومیت کی زندگی بسر کر رہے تھے، یا یوں کہئے کہ امتحان و آزمائش کی بھٹی میں انہیں تپا کر تیار کیا جا رہا تھا اور دیکھا جا رہا تھا کہ ان میں کون زرِ خالص ہے؟ اللہ کے فضل سے ہر فرد زرِ خالص ہی ثابت ہوا۔ یہ مدینہ کی زندگی نہ صرف مدافعت بلکہ اقدام و نصرت کی زندگی تھی۔ یہاں مکہ کی طرح زخم کھا کر اور ظلم سہہ کر صبر و سکوت اختیار نہیں کیا گیا بلکہ نیزے کا جواب نیزے سے اور تلوار کا جواب تلوار سے دیا گیا۔ چشمِ آفتاب یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ بدر و احد کی جنگوں میں باپ بیٹے کے خلاف اور ماموں نے بھانجے کا مقابلہ کیا، اسلام کے رشتے کے سامنے تمام قرابتیں دب کر رہ گئیں، اللہ تعالیٰ کے یہ وفادار بندے فتح و کامیاب ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ مکہ کی جس سرزمین سے انہیں اور ان کے قائد و سردار (علیہ الصلوٰۃ والتسلیم) کو مظلومیت کے عالم میں نکلنا پڑا تھا وہاں وہ فتح و نصرت کے پرچم لے کر داخل ہوئے۔ جس انسانِ کامل کو چند سال پہلے مکہ کی سرزمین میں کہیں پناہ نہیں ملتی تھی آج مکہ کی ساری آبادی اس کی پناہ ڈھونڈ رہی تھی۔ اور اس کی جنبشِ ابرو پر صنادیدِ قریش کی نگاہیں لگی ہوئی تھیں

کہ جانوں کی امان کا حکم ملتا ہے، یا گردنیں اڑا دینے کا اشارہ ہوتا ہے؟ خون کے پیاسے دشمن آج محمد ابن عبداللہ (ارواحنا لہ الفداء) کے قبضۂ اختیار میں تھے۔ حضورؐ کے ایک اشارے پر اُن کو خاک و خون میں تڑپایا جا سکتا تھا۔ مگر یہ سکندر و قسطنطین جیسا کوئی فاتح اور.... کشور کشا نہ تھا، یہ وہ تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے عالمین کے لئے رحمت بنا کر بھیجا تھا، اس کی رحمت نے اپنے دشمنوں کو عام معافی عطا کر دی اور اپنے سب سے بڑے دشمن ابو سفیانؓ کو نہ صرف امان دی بلکہ اس کے گھر کو دار الامان قرار دیدیا۔

فتح مکہ نے کفر کے رہے سہے زور کو بھی توڑ دیا۔ ہجرت اسلام کی فتحمندی کا دیباچہ تھا اور فتح مکہ اس کا شباب!

بدر و حنین آج بھی دیتے ہیں یہ پیام
مکہ نہ ہو جو فتح تو ہجرت ہے ناتمام

اس کے بعد باطل کی حق سے جہاں بھی آویزش ہوئی حق کامیاب و سربلند ہوا اور باطل کے قدم اکھڑتے چلے گئے، عتبہ، شیبہ، ولید اور ابو جہل کی جب تک چودھراہٹ قائم تھی، باطل کے کیا دم خم تھے، بنو قریظہ اور بنو نضیر کی سازشیں جب تک چل رہی تھیں اس وقت تک باطل کس قدر زور آور تھا، اور منافقین کو جب تک کُھل کھیلنے کا موقع مل رہا تھا باطل کس مضبوطی سے جما ہوا تھا مگر جب اُن سب کا زور ٹوٹا اور کفر و نفاق کو ایک ایک محاذ پر شکست ہوئی، تو یہ باطل برگِ خزاں دیدہ کی طرح اکھڑ اکھڑ کر جھڑتا تھا، اور جس قطعۂ زمین پر وہ ٹکنے کی کوشش کرتا تھا، اُسے پامالی سے دوچار ہونا پڑتا تھا:

جب یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ کا کلمہ بلند اور کفر کا کلمہ پست ہو گیا تو اس کے صرف یہ معنی نہیں ہوتے کہ جہاں تک آدمی کی گوشت پوست کا تعلق ہے اللہ اکبر کو اعلیٰ ہبل کے نعرہ پر غلبہ حاصل ہو گیا اور نہ اللہ کے دین کے قائد اور اسلام کے فاتح و غالب ہونے کا صرف اتنا سا مفہوم ہے کہ عرب میں بتوں کی پوجا بند ہو گئی تھی۔ لوگ نماز پڑھتے، روزہ رکھتے، زکوٰۃ دیتے اور فریضۂ حج ادا کرتے تھے یہ انقلاب صرف مذہبی انقلاب نہیں بلکہ پوری انسانی زندگی اور تمام معاشرے کا انقلاب تھا۔ تجارت، سیاست، صلح و جنگ، معیشت، معاشرت، اخلاق و کردار، صنعت و زراعت، شعر و ادب، غرض انسانی زندگی اور اجتماعیت و مدنیت کا کوئی ایسا شعبہ نہ تھا جس کو اس ہمہ گیر انقلاب نے اپنے اندر جذب نہ کر لیا ہو، فکر و نظر اور قول و عمل اور انفرادیت و اجتماعیت سب کو اس انقلاب نے ایک ایسا صالح، پاکیزہ، سلیم مزاج اور امن دوست معاشرہ پیدا کیا جس کے شہریوں پر فرشتوں کا دھوکا ہوتا تھا۔ وحشیت کا امتیاز درندگی کا فخر رخصت ہو گیا۔ ع

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز

اس روحانی انقلاب نے کعبے کے برہنہ طواف کرنے والوں کو لباس پہنا کر عریانیت کی (NUD-ISM) کی خبیث تحریک کو ہمیشہ کے لئے ذلیل و رسوا کر دیا۔ اس انقلاب نے عورتوں کو تبرج جاہلیت کی گندگی سے نکال کر گھروں میں مکین کر بیٹھنے کا "وقار" عطا کیا، اور ان کے متاعِ زینت پر "جلباب" ڈال دیئے، اور اس طرح عورت کو تاک جھانک، بدنگاہی، اور لگاوٹ کے نامسعود فتنوں سے محفوظ کر دیا۔ شراب خواروں، زانیوں، بدکاروں اور چوروں پر اسلام نے حدود جاری کیں، اور اپنی تعزیروں کے سخت فیصلوں سے معاشرے میں نیکی اور پاکیزگی کی برقی رو دوڑ دی اور نہ صرف حکومت کے احتساب و دار و گیر کا دلوں میں خوف پیدا کیا بلکہ خشیتِ الٰہی سے سینے معمور کر دیئے تاکہ جس جگہ حکومت کے احتساب کی نگاہ نہ پہنچ سکے، وہاں اللہ تعالیٰ کی خشیت انسان کو بدی کے ارتکاب سے باز رکھے۔

جب ہدایت پوری، دین کامل اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کا اتمام ہو چکا تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ نفسِ نفیس اس

دنیا میں رہنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اور حضور "رفیقِ اعلیٰ" سے جا ملے کہ موت ہر جان کے لئے مقدر کی گئی ہے اور "حی و قیوم" صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد کتاب و سنت کے تحت ایک ایسے صالح معاشرے کو چھوڑا جو بہترین شہریوں سے عبارت تھا۔ اور ایسی اسلامی حکومت بھی چھوڑی جس میں صرف اللہ تعالیٰ کا قانون چلتا تھا، اسلامی معاشرہ اور اسلامی حکومت بھی دراصل "کتاب و سنت" ہی کے عملی مظاہر ہیں!

انسانیت کے لئے نمونہ کامل

ساری دنیا کے واسطے قیامت تک کے لئے یہی اسوۂ حسنہ، یہی اسلامی معاشرہ اور یہی اسلامی حکومت "نمونۂ کامل" ہے! ہم اپنی زندگی کو اسی معیار پر جانچیں گے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے کس درجہ قریب ہے! ہم ہر سوسائٹی کے خوب و ناخوب ہونے کا فیصلہ دورِ نبوت کے معاشرہ ہی کی اساس پر کریں گے اور ہر "حکومت" کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم کی ہوئی حکومت کی کسوٹی پر کس کر دیکھیں گے....

اسوۂ نبوی، سیاستِ نبوی، معاشرتِ نبوی اور حکمتِ نبوی سے جو زندگی جو سوسائٹی اور جو نظام مملکت جتنا دور ہے، اتنی ہی اس میں خامی پائی جاتی ہے، یہ خامی دور ہونی چاہیئے، اور اس کے لئے جد و جہد کرنا ہر امن پسند شہری اور ہر خدا شناس انسان کا فریضہ ہے!

انسانی سیرت کیسی ہونی چاہیئے؟ صالح معاشرے کی کیا خصوصیات ہیں؟ اور ایک اچھی حکومت کن خطوط پر قائم و استوار ہو سکتی ہے؟ اس کے نمونے ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس زندگی میں ملتے ہیں۔ ان مثالوں اور نمونوں کے ہوتے ہوئے، ہمیں کہیں اور سے ہدایت اور روشنی لینے کی ضرورت نہیں اس قوم سے زیادہ سادہ لوح، بد نصیب اور قدر ناشناس قوم کون ہوگی، جس کی دنیا میں مہر نیم روز جلوہ آرا ہو مگر وہ روشنی کے لئے دوسروں کی دیا سلائیوں اور موم بتیوں کی طرف منہ پھیلا رہی ہو! اس شخص کی خود ناشناسی اور بے خبری کو کیا کہئے جس کی جیب لعل و جواہر سے بھری ہو۔ اور وہ خزف ریزوں کے لئے دریوزہ گری کر رہا ہو!

اگر کوئی مسلمان تمدن و تہذیب کی چمک دمک سے مرعوب ہو کر "اسلام" کو آج کی دنیا میں ناقابلِ عمل سمجھتا ہے تو ایسے شخص کا دعویٰ معتبر ہے اور نہ ایمان! "اسلام اور ناقابل عمل" کسی مسلمان کی زبان سے یہ الفاظ نکل ہی نہیں سکتے، اور کوئی مردِ مومن ان لفظوں کو سننا گوارا کر ہی نہیں سکتا۔ یہ غلط اندیشی اور گمراہی سے کروڑ بار اللہ کی پناہ!

قرونِ وسطیٰ میں کلیسا کی تنگ نظری اور علم دشمنی کی دردناک داستانیں کتابوں میں پڑھ پڑھ کر بعض نادان مسلمان اسلام کو بھی عیسائیت کی طرح سائنس اور تہذیب کی ترقیوں کا دشمن سمجھ کر "سیکولرزم" کے رنگ میں رنگے جاتے ہیں۔ یہ ان کی نادانی بے خبری اور غلط اندیشی ہے، اسلام سائنس کی، علم و فن کی اور تہذیب و تمدن کی ترقی کی راہ ہرگز نہیں روکتا۔ علم و فن اور تمدن و تہذیب کی تاریخ گواہ ہے کہ مسلم دانشوروں نے ان علوم کو آگے بڑھایا ہے، آج تہذیب و مغربیت کی جو روشنی پھیلی ہوئی ہے، اس کے بیشتر چراغ تو ہیں جو ہمارے ہی چراغوں سے روشن ہوئے ہیں! جب یہ ایمانی آفریں نعرہ فضا میں بلند کیا جاتا ہے کہ۔

"قرآن و سنت کی طرف لوٹو"

"BACK TO QURAN AND SUNNAH"

تو اس سے یہ مراد ہرگز نہیں ہوتی کہ سائنس کی تمام ترقیوں کو آگ میں جھونک کر اور تہذیب کے تمام مظاہر کو پس پشت ڈال کر، چودہ سو سال قبل کا عربی تمدن اختیار کر لے۔ موٹروں اور ریلوں کو خیرباد کہہ کر لوگ اونٹوں اور خچروں پر سوار ہونے لگیں بجلی کے قمقموں کو توڑ کر، ان کی جگہ مٹی کے چراغوں اور کھجور کی ٹہنیوں کا استعمال شروع کر دیں، صوفے اور قالین چٹائی اور بوریے میں تبدیل ہو جائیں، سیمنٹ اور چونے کی بنی ہوئی بلڈنگوں کو ڈھا کر، ان کی جگہ کچے اور خس پوش مکان بنا دیئے جائیں! یہ نہ کتاب و سنت کا منشا ہے

اور نہ کتاب و سنت کی طرف کوئی دعوت دینے والا، اس بات کی دعوت دیتا ہے۔ قرآن و سنت کی طرف واپسی سے یہ مراد ہے کہ اس ضابطۂ اخلاق کو ہم اپنائیں جو کتاب و سنت سے ماخوذ و عبارت ہے، اور اس معاشرے کی طرف لوٹیں، جو عہدِ رسالت میں نیکی اور تقویٰ کے خطوط پر قائم تھا! اسلام چاند کی طرف پرواز کرنے سے نہیں روکتا، اور نہ کسی جوہری توانائی کی تحقیق کا وہ مخالف ہے! کسی "ترقی" سے اسلام کا اختلاف اس نقطے سے شروع ہوتا ہے جہاں اخلاق کی حد ٹوٹتی ہوتی ہے۔ اخلاق کی حدود میں رہ کر کوئی خوشہ پروین کو بھی توڑ لائے اور چیونٹی کے پاؤں کی دھمک کو کسی نازک و حساس آلہ کے ذریعہ محفوظ کر لے، تو اسلام انکشاف و ترقی کی اس مہم اور تگ و تاز کا مخالف نہیں ہے۔

ایک اشتراکی یہ کر سکتا ہے کہ اور اشتراکیت اس کی اجازت بھی دیتی ہے کہ کسی جگہ صرف انتشار و ابتری پیدا کرنے کے لئے مسافروں کی ایک ٹرین کو پٹری سے اتار کر سینکڑوں بے گناہوں کو ہلاک کر دیا جائے۔ امریکی سائنسداں یہ کر سکتے ہیں اور وہ کر بھی چکے ہیں کہ دشمن کو مرعوب و مغلوب کرنے کے لئے ایٹم بم کے ذریعہ لاکھوں انسانوں کو موت کے آغوش میں سلا دے، پورے شہر کو قبرستان بنا دیا جائے۔ مگر ایک مسلم سائنسداں اور "اقامتِ دین" کا مبلغ یہ ظلم گوارا نہیں کر سکتا، یہی وہ ضابطۂ اخلاق ہے جہاں سے اسلام اور لادینیت کی راہیں پھٹ کر الگ الگ ہو جاتی ہیں۔

سلامتی، امن پسندی اور عوام کی خیر خواہی اسلام کی فطرت میں سموئی ہوئی ہے۔ اسلام، غیر مسلموں کی جان و مال اور آبرو کا محافظ ہے اور اپنے حدودِ عمل میں انہیں زیادہ سے زیادہ شہری حقوق دیتا ہے تاکہ وہ عزت کے ساتھ زندگی گزار سکیں۔ اسلام عوام کی رفاہ و فلاح اور انسان کی بہتری کا نہ صرف یہ کہ خواہش مند ہے، بلکہ علمبردار ہے۔ وہ تمام مخلوق کو اللہ کا کنبہ (الخلق عیال اللہ) سمجھتا ہے، مگر عوام کی جسمانی رفاہ کے ساتھ وہ ان کی اخلاقی رفاہ بھی ملحوظ رکھتا ہے۔ "بے اخلاق رفاہ" اسلام کی نگاہ میں وزن نہیں رکھتی، کوئی شک نہیں ہمارے دوش، انگلستان، امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک میں عوام کی رفاہ کے لئے بہت کچھ ہو رہا ہے، اور ان ممالک میں تو دولت کی فراوانی اور عوام کی خوشحالی کا یہ عالم ہے کہ خاکروبوں اور مزدوروں کے یہاں کیڈیلک کاریں، اور ریفریجریٹر موجود ہیں۔۔۔۔ تہذیب کا ہر عیش وہاں کے عوام کو میسر ہے اور تمدن کی ہر بوقلمونی سے وہ لطف اندوز ہوتے ہیں، مگر ان کی یہ تمام تر رفاہیت اور خوشحالی فسق و فجور، خدا ناشناسی، آخرت کے محاسبہ سے غفلت اور بد خلقی کے محور پر گھوم رہی ہے۔ اس لئے اسلام ایسی معصیت پرور خوشحالی اور رفاہیت کو انسانیت کے لئے ایک عذاب سمجھتا ہے!

اسلام ایک ایسے خوشحال معاشرہ کا نقیب ہے، جہاں اخلاق و نیکوکاری کے حدود میں رہ کر عوام کو اطمینان، امن و سلامتی اور خوشحالی میسر ہو۔ چور، ڈاکو، لٹیرے، اُچکے، شرابی، زناکار اور قمار باز ان سب پر احتساب کیا جاتا ہے، اسلامی معاشرے میں مرد و زن کے وظیفۂ عمل کے بھی حدود مقرر ہیں اور اسلام ان کو خلط ملط ہونے سے روکتا ہے!

معاشرے کی تطہیر انسانیت کی بہت بڑی خدمت ہے۔ معاشرے کی تطہیر سے وہی لوگ ڈرتے ہیں جن کے ضمیر مجرم ہیں جن کے کارنامے سیاہ ہیں اور خیانت و بے ایمانی جن کے مزاج میں رچ گئی ہے۔ نیک یا نیکی کو پسند کرنے والے لوگ تطہیرِ معاشرہ کی ہر کوشش، اور اصلاحِ حال کی ہر تدبیر اور تحریک کا خیر مقدم کرتے ہیں، قوت اور طاقت کے ذریعہ "تغیرِ منکر" کا خود اسلام حکم دیتا ہے!

کوئی شک نہیں یورپ کی سوسائٹی میں بعض اچھی چیزیں بھی پائی جاتی ہیں۔ وہاں اونچے طبقے کے افراد اپنے ذاتی مفاد پر قومی مفاد کو ترجیح دیتے ہیں، وہاں کوئی غرض پرست اور قومی خیانت کرنے والا، قوم کی قیادت و رہنمائی کا منصب حاصل نہیں کر سکتا، وہاں عوام میں فرض شناسی کا جذبہ ملتا ہے، وہاں ڈسپلن کی پابندی کی جاتی ہے۔ لوگ مشین کے کل پرزوں کی طرح کام

کرتے ہیں اس قسم کی تمام خوبیاں جو مغربی سوسائٹی میں آج پائی جاتی ہیں، کسی زمانہ میں یہ ہم مسلمانوں کا طغرائے امتیاز تھیں، یہ وہ حکمتیں، دانائیاں اور خوبیاں ہیں، جو ہم سے گُم ہو گئی ہیں، اور ہمیں اپنی گُم کی ہوئی چیزوں کو، جہاں بھی وہ ملیں لے لینا چاہیے، کسی نیک مقصد کے لئے حاصل کرنے کے لئے غیروں کی کسی ایجاد، تدبیر یا خوبی سے فائدہ اٹھانا اسلام میں ممنوع نہیں ہے غزوہ خندق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل فارس کے طریق دفاع کو مفید سمجھ کر، خندق کھودنے کا حکم دیا، اور صحابہ کے دوش بدوش ایک عام سپاہی کی طرح حضورؐ نے بھی کدال سے زمین کو کھودا اور چٹان کو توڑا۔

یہاں اس نکتہ کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ دوسروں کے انہی طریقوں کو قبول کیا جا سکتا ہے، جن کی زد اسلامی اصول پر اگر نہ پڑتی ہو۔ اگر غیروں کا کوئی ایسا طریقہ اور اصول ہو۔ جو بظاہر مفید کارآمد اور مہذب و ترقی یافتہ نظر آئے، مگر اسلام کے کسی اصول سے ٹکراتا ہو۔ تو اس مفید اصول کو رد کر دیا جائے گا۔ کوئی شک نہیں کہ اسلام جس چیز کو پسند کرتا ہے، اس میں افادیت ہی پائی جاتی ہے، چاہے اس کا احساس ہمیں نہ ہوتا ہو۔ اور جس چیز کو اسلام ناپسند کرتا ہے، اس میں مضرت کا پہلو غالب ہوتا ہے، چاہے وہ پہلو ہمیں نظر نہ آئے۔ مگر اللہ اور رسولؐ کے اوامر و نواہی کو ظاہری افادیت اور مضرت کی بنیاد پر ہم حق نہیں مانتے بلکہ اس لئے حق مانتے ہیں کہ وہ اللہ اور رسولؐ کے احکام ہیں۔ ہم نے اللہ اور رسولؐ کی اطاعت افادیت و مضرت کی بناء پر نہیں بلکہ خدا کے بندے اور نبیؐ کے اُمتی ہونے کی بنا پر قبول کی ہے!

یورپ کے لوگ ہر بات میں صفائی ستھرائی کا خیال رکھتے ہیں، اُن کے ہوٹلوں، دفتروں، کارخانوں اور بازاروں میں کمال درجہ کی صفائی، سلیقہ اور نفاست نظر آتی ہے، ان کا یہ طریقِ زندگی یقیناً لائق تحسین بلکہ قابلِ تقلید ہے، لیکن تصویر کا یہ ایک طرف روشن پہلو ہے، دوسرا تاریک پہلو یہ ہے کہ یہ لوگ بول و براز کی نجاست سے اجتناب نہیں کرتے۔ پیشاب اُن کے نزدیک کوئی نجس اور گندی چیز ہی نہیں ہے، یہی وہ دوراہہ ہے جہاں سے اسلامی طہارت اور مغربی صفائی کے راستے جُدا ہو جاتے ہیں۔

یورپ میں لوگوں کی دیانت کا یہ عالم ہے کہ سرِ راہ ٹوکریوں میں اخبارات رکھے رہتے ہیں اور خریدار، اخبار اُٹھا اُٹھا کر ٹوکریوں میں قیمت ڈالتے چلے جاتے ہیں، وہاں ٹرینوں، بسوں اور ٹراموں میں سوار ہونے کے لئے، دھینگا مُشتی نہیں کی جاتی ہر شخص اپنے نمبر پر سہولت کے ساتھ سوار ہوتا ہے۔ اور ایک مسافر دوسرے مسافر کے لئے زحمت کا سبب نہیں بنتا، وہاں کوئی تاجر کنٹرول کے ریٹ سے زیادہ قیمت پر کوئی چیز فروخت نہیں کرتا۔ مغربی اقوام کے اس قومی کردار کو ہم قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں! کاش! ہمارے عوام بھی ایسے ہی فرض شناس بن جائیں، مگر دوسری طرف یورپ کی سوسائٹی کا یہ رنگ ہے کہ پارکوں، باغیچوں، میدانوں اور سیرگاہوں میں مرد و زن نیم برہنہ حالت میں ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے، اختلاط کرتے نظر آتے ہیں شراب اور لحمِ خنزیر اُن کی محبوب و پسندیدہ غذا بن چکے ہیں۔ وہ سرِ راہ بوس و کنار کرتے ہیں اور یہ کرتے ہوئے انہیں ذرہ برابر شرم محسوس نہیں ہوتی! ایک طرف تو یہ قومی کردار، دوسری جانب جانوروں کی زندگی اور کتوں اور سوروں جیسی بے حیائی!

یورپ کے تمدن کی بنیاد اس نظریہ پر قائم ہے:۔

"کہ کھاؤ پیو، عیش کرو، مزے لوٹو اور مر جاؤ۔"

اسلامی تمدن اپنے مزاج سے مغربی تمدن کی عین ضد واقع ہوا ہے۔ یہاں اخلاق و تقویٰ خشیت الٰہی، آخرت کے محاسبہ کے خوف اور نجات و مغفرت کی اُمید کے محور پر اسلامی تمدن گردش کرتا ہے۔ دونوں تمدنوں کے زاویہ ہائے نگاہ ہی ایک دوسرے سے متضاد ہیں

معاشرہ کی تطہیر کے لئے کوئی ایک قدم بھی اٹھاتا ہے تو وہ تحسین و تبریک کا مستحق ہے، مگر معاشرہ کی تطہیر کامل اسی وقت ہو سکتی ہے، جب کہ اسلامی اخلاق کو اساس اور محور قرار دے کر اصلاح کے لئے سعی کی جائے۔ جن باتوں کو اسلام "منکر و فحش" کہتا ہے، انہیں مٹا دیا جائے اور جن پر "معروف" کا حکم لگتا ہے، اُن کو قائم کیا جائے۔

"امر بالمعروف اور نہی عن المنکر"

یہ ہے مسلمان کا منصب، اس کی ڈیوٹی اور ذمہ داری! عوام و خواص سب پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے، جس نے اس فریضہ کے ادا کرنے میں کوتاہی برتی، اس نے چاہے دنیا میں عیش اڑائے ہوں، مگر آخرت کے لئے بڑے خسارے کا سودا کیا۔ یورپ نے بے روزگاری کو روزگار سے، اور فقر و تنگ دستی کو خوشحالی سے بدل دیا ہے مگر شراب خوری، قمار بازی، زناکاری اور اسی قسم کی دوسری برائیوں کو نہ صرف یہ کہ علیٰ حالہٖ باقی رکھا ہے، بلکہ اُن کی "ویلفیر اسٹیٹ" کے سایہ میں یہ برائیاں پوری قوت کے ساتھ پروان چڑھ رہی ہیں، مسلمانوں کو جہاں بھی طاقت و اقتدار حاصل ہو، اُن کا فرض ہے کہ وہ ایک طرف عوام کو خوشحال بنائیں اور دوسری طرف ان بداخلاقیوں پر سختی کے ساتھ احتساب کریں اور فسق و فجور کی جڑوں کو کاٹ دیں، اسلامی نقطۂ نگاہ سے سوسائٹی کی اصلاح صرف معاشی بنیادوں پر ہی نہیں بلکہ اخلاقی بنیادوں پر ہونی چاہیئے۔ "اخلاق" معاشرت کی جان ہے!

جو شخص کتاب و سنت کے تقاضوں کو پہچانتا ہے، جو اللہ تعالیٰ کی رضا چاہتا ہے، جسے دنیا کی خوشحالی سے زیادہ آخرت کی خوشحالی مطلوب ہے اس کو زندگی میں ایک لمحہ کی بھی فرصت میسر نہیں آسکتی اور وہ کسی عالم میں بھی اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہو سکتا۔ ع

ترا چہ باک خدائے کہ داشتی داری

اس کے لئے کام ہی کام اور ذمہ داریاں ہی ذمہ داریاں ہیں! کوئی شک نہیں ہر کوشش کرنے والا "کامیابی" ہی چاہتا ہے مگر اللہ کی راہ میں اللہ کی رضا مقصود ہوتی ہے کامیابی مقصود نہیں ہوتی۔ اس راہ میں کوئی گرد و غبار بن کر اڑ جائے تو بھی وہ کامیاب اور بامراد ہے۔

یورپ کا معاشرہ کوئی شک نہیں خوشحال ہے مگر پاکیزہ نہیں ہے۔ اسلامی معاشرہ کی سب سے نمایاں اور ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ وہ خوشحال ہونے کے ساتھ ساتھ پاکیزہ ہوتا ہے۔ جنگ، قحط، سیلاب اور اسی قسم کی آسمانی اور زمینی بلاؤں کے سبب کسی مُلک کی خوشحالی متاثر ہوتی ہے، تو اس وقت اسلامی معاشرے کی پاکیزگی اور طہارت لوگوں میں انتشار پیدا نہیں ہونے دیتی۔ وہ اُن میں قناعت و صبر و ضبط کی روح پیدا کرتی ہے، اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ترفّہ اور خوشحالی کے دور میں آدمی اللہ کا شکر گزار بندہ بن کر زندگی گزارے اور مسرت و خوشحالی کی فراوانی اُسے بداخلاق اور بے راہ نہ ہونے دے۔ پریشانی کا دور ہو تو وہ بے صبر اور پست ہمت نہ بننے پائے، صبر و توکل کے ساتھ سختیوں کو برداشت کرے، اور حالات کی بہتری کے لئے ایک طرف اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرے اور دوسری طرف ہر جائز اور ممکن تدبیر کو بروئے کار لائے۔

مادی نقطۂ نگاہ ہے "صرف خوشحال معاشرہ" اسلامی نقطۂ نگاہ ہے۔ "خوشحال اور پاکیزہ معاشرہ" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضورؐ کے جانشینوں نے پاکیزگی اور اخلاق کی بنیادوں پر معاشرے کو برپا کیا تھا، اور لوگوں کی خوشحالی کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ مالدار لوگ زکوٰۃ لے کر زکوٰۃ لینے والوں کو ڈھونڈتے پھرتے تھے!

جو قوم بحیثیت مسلمان اللہ کی مرضی پر چلنے کا عہد کرے گی، اس کو آسمان کی تمام بخششیں، زمین کے تمام خزانے اور ...

سمندروں کی پُرشور موجیں بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتیں!

ہم اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتے ہیں کہ عوام و خواص، چھوٹے اور بڑے، مرد و زن، اہلِ سیف اور اہلِ قلم، مزدور اور سرمایہ دار غرض ہم سب کو نیا بننے، اور نیکی قائم کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ ہماری زندگیوں میں صحابہ کرام کی پاکیزہ زندگیوں کی زیادہ سے زیادہ جھلک پیدا ہو جائے۔ ہمارے سینے خشیتِ الٰہی سے معمور ہو جائیں۔ ہمارے دلوں میں یہ حقیقت اتر جائے کہ ہماری تمام کمزوریوں، کوتاہیوں، غفلتوں اور دکھوں کا علاج "اسلام" اور صرف "اسلام" ہے۔ ہم اسلام کے کسی حکم کی تعمیل کرتے ہوئے، مہذب دنیا سے نہ شرمائیں، ہمارے دلوں میں اللہ کے دین کو قائم کرنے کی ایسی لگن پیدا ہو جائے جو کسی طاقت اور ریچھ کے سامنے سپر انداختہ نہ ہو سکے! اللہ تعالیٰ پر بھروسہ، اسی کا خوف، اسی سے امید اور طمع، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، تعلیم، طرزِ جہانبانی اور اصولِ معاشرت پر انشراحِ قلب کے ساتھ یقین، اطمینان، اور ایمان اور اس پر عمل پیرا ہونے کا عزم!

به مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

ماہر القادری
۱۳ ربیع الاول ۱۳۷۵ھ

فاران، کا

خلافت نمبر

ماہ دسمبر ۱۹۵۵ء میں نہیں آرہا ہے اس کی اشاعت کب ہوگی، فاران ہی میں اس کا اعلان کیا جائیگا

عَرَفْتُ رَبِّی بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ

(میں نے اپنے رب کو ارادوں کے ٹوٹ جانے سے پہچانا)

اس حقیقت کا کس قدر یقین افروز مشاہدہ ہوا ——— خلافت نمبر کے لئے شائقین کس قدر منتظر اور مضطرب ہیں اس کا ہمیں پوری طرح اندازہ ہے، مگر قدرت شاید یہ چاہتی ہے کہ ؎

یہ درد اور فزوں ہو یہ شوق اور بڑھے

خلافت نمبر کی رجسٹری کے لئے ۱۲، کے ٹکٹ جو حضرات ارسال فرما چکے ہیں وہ دفتر فاران میں بطور امانت محفوظ ہیں۔

حضورؐ کے ساتھی (رض)

اسعد گیلانی

جس طرح اولادِ آدم کے اندر بہترین انسان اللہ کے نبی ہوئے ہیں اسی طرح اس دنیا میں انجام دیئے جانے والے کاموں میں بھی مشکل ترین کام وہ ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے نبیاء پر ڈالتے رہے ہیں یعنی اخلاقِ فاضلہ کی تعلیم جس کی جڑ امر بالمعروف ہے اور اخلاق رذیلہ کی تردید۔ جسے نہی عن المنکر کہا جاتا ہے۔

یہ کام انجام دینا فرد واحد کے بس میں نہیں ہے۔ اجتماعی کاموں کے لئے اجتماعی قوت مطلوب ہوتی ہے۔ جب معاشرے میں نیچے سے اوپر تک برائیاں پھیل رہی ہوں۔ تو جس کسی کو اصلاحِ احوال کا کام کرنا ہو اس کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ اس کے مقابلے کے لئے نیکی کو منظم کرے۔

جب ایک نبی آتا ہے تو وہ یہی کام اہم سمجھتا ہے۔ وہ بگڑی ہوئی سوسائٹی کے سامنے اصلاحِ اخلاق کی مضبوط ترین بنیادیں پیش کرتا ہے یعنی . . . .

- اثباتِ توحید
- اقرارِ رسالت
- اور تصورِ آخرت

یہ وہ بنیادیں ہیں جن کے اوپر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا محل کھڑا ہوتا ہے اور معروف کو قائم کر دینے کے لئے ایک امت یعنی ایک ایسا اصول کو دنیا کرنا پڑتا ہے جو قربانیاں دے دے کر اور دشواریاں سہہ سہہ کر اللہ کے کلمہ کو غالب اور حق کے بول کو بالا کر دے۔ اسی چیز کا تصور دلانے کے لئے حضرت عیسیٰ اپنے حواریوں سے یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

"میرے ساتھ وہ آئے جو اپنی صلیب اپنے کندھے پر اٹھا کر لائے"

ایثار، قربانی اور توکل کا یہی وہ تصور ہے جو اپنے ساتھیوں کو دینے کے لئے ایک دوسرے موقع پر فرمایا جاتا ہے۔ "میری وجہ سے لوگ تمہیں ظالموں کے حوالے کریں گے ——— خداوند پر بھروسہ کرو جو ہوا کے پرندوں تک کو رزق دیتا ہے۔ اور سوسن کے پودوں کو جو آج ہیں اور کل نہیں ہوں گے سبز جوڑا پہناتا ہے۔ ——— مال دہاں جمع نہ کرو جہاں زنگ لگے اور چور چرائے بلکہ آسمان پر جمع کرو۔"

کسی تحریک کے لیڈر کا طریقِ تربیت اور نظم اصلاح اخلاق اور معیارِ انتخابِ رفقاء اس کے نصب العین کی خود بخود نشاندہی کر دیتا ہے اور یہ بھی بتا دیتا ہے کہ کس قسم کی جدوجہد اور کس نوعیت کا انقلاب اس کے پیش نظر ہے۔ نبی کریمؐ نے اسلامی انقلاب کا جو عظیم ترین کارنامہ انجام دیا، ساتھیوں کی تربیت کا ایک حیرت انگیز نمونہ ہے۔ عرب کی انتہائی بگڑی ہوئی قوم کے اندر سے شدید محنت شاقہ کے بعد ایسے افراد کو چن چن کر جمع کرنا ان کی اصلاح کرنا انہیں منظم کرنا اور اس کی مدد سے وہ کارنامہ انجام دینا دنیا کے تمام دانشوروں کو حیرت میں مبتلا کرنے والا کام ہے۔ حضورؐ نے ان لوگوں کو جو انتہائی پستیوں میں پڑے ہوئے تھے۔ اخلاق کی ان بلندیوں پر پہنچا دیا جن کے بارے میں حضورؐ نے خود گواہی دی کہ میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں اور جن میں سے ہر ایک کی پیروی ایک مومن کو راہِ راست پر قائم رکھنے اور سنتِ نبوی پر چلنے کے لئے کافی ہے۔

انہیں درخشاں ستاروں کی زندگیوں کے چند پہلو میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ وہ لوگ جو اس راہ پر چلنا چاہتے ہیں جس پر وہ مقدس حضرات چل کر کامیاب ہوئے تو وہ جان لیں کہ اس راہ پر چلنے کے لئے زندگی میں ایک مخصوص رنگ مطلوب ہے جسے صبغت اللہ کہا جاتا ہے۔

قوت ایمانی :-

حضرت کعبؓ بن مالک، انصاری جنگ تبوک میں شریک نہ ہو سکے۔ نبیؐ کے حکم پر مدینہ کی اسلامی سوسائٹی نے ان کا سوشل بائیکاٹ کر دیا ان کے اپنے الفاظ میں "زمین اپنی ساری وسعت کے ساتھ مجھ پر تنگ ہو گئی کوئی مجھ سے بات کرنے والا اور پرسان حال نہ تھا۔ مدینے کی بھری آبادی میں میں کس مپرسی کے عالم میں ہو گیا۔ بے یار و مددگار اور یکہ و تنہا ہو کر رہ گیا۔ عین اس حالت میں بادشاہ غسان کا دعوت نامہ آیا جس میں انہیں نہایت عزت و تکریم کے ساتھ ملک غسان میں جاکر شاہ کی مصاحبت اختیار کرنے کی ترغیب دی گئی تھی۔ اس ترغیب پر کوئی بھی کمزور ایمان آدمی مر مٹ سکتا تھا۔ لیکن حضرت کعب بن مالک نے وہ خط تنور میں جھونک دیا اور نہایت حسرت سے کہا "کیا اب ہم اتنی پستی میں جا گرے کہ کفار بھی ہم پر حریفانہ نگاہیں ڈالنے لگے۔"

مکے میں نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام بڑی سختیاں سہہ سہہ کر اور مصیبتیں برداشت کر کے اسلام کی دعوت پیش فرما رہے تھے اور اس کیلئے وہ تمام تدبیر اختیار کی جا رہی تھیں جس سے قریش اس دعوت کی طرف متوجہ ہوں۔ حضورؐ نے قریش کی ضیافت کی۔ ضیافت کے بعد مجمع کے سامنے کھڑے ہو کر اس اجتماع کی غرض و غایت اور دعوت اسلام پیش کی۔ اور خدا کے ان بندوں کو اللہ کا حکم بلند کرنے کیلئے اپنی رفاقت کیلئے پکارا لیکن پورے مجمع پر سکوت طاری رہا اچانک قریش کے ان معزز دانشور اور معتبر مجمع میں سے گیارہ سال کا ایک لڑکا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور اس نے پکار کر کہا "اگرچہ میری ٹانگیں پتلی ہیں اور میری آنکھیں دکھتی ہیں۔ لیکن یا رسول اللہ میں آپ کا ساتھ دوں گا۔" تین دفعہ یہ دعوت دانشوروں کے اس مجمع میں پیش کی گئی۔ تینوں دفعہ حق کی اس پکار پر مصلحت آمیز خاموشی کا پردہ پڑا رہا اور تینوں بار اس گیارہ سالہ لڑکے نے بار بار اٹھ کر ایسے خطرناک حالات اور ایسے جان لیوا ماحول میں ہر قسم کی مشکلات سے بے پروا ہو کر نبیؐ کو اپنی رفاقت کا یقین دلایا۔ یہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ تھے۔

مکے کے پریشان حال مہاجرین کا پہلا قافلہ پناہ لینے کیلئے حبش پہنچ گیا تھا۔ لیکن جفا جو قریش نے ان کا وہاں بھی تعاقب کیا اور پادریوں کی معرفت عیسائی بادشاہ تک یہ چغلیاں پہنچائیں کہ مکے کے یہ مسلمان پناہ گیر حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں بہت توہین آمیز عقائد رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کی بادشاہ کے دربار میں طلبی ہوئی جس سے غریب بے سہارا مسلمانوں کے درمیان بڑی تشویش پھیل گئی۔ بالآخر حضرت جعفر طیارؓ نے نجاشی کے دربار میں مسلمانوں کے عقیدے کی ترجمانی کی۔ انہوں نے سورہ مریم کی آیات کی تلاوت کی اور اپنی تقریر کے آخر میں کہا کہ حضرت عیسیٰ خدا کے بندے ہیں۔ اس کے رسول ہیں اس کی روح اور اس کا کلمہ ہیں۔ وہ خدا کی الوہیت میں شریک نہیں ہیں۔ نجاشی نے اس بے لاگ حق گوئی کا اعتراف کیا اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے اور اس نے ایک تنکا اٹھا کر کہا کہ خدا کی قسم حضرت عیسیٰ اس سے تنکے بھر بھی زیادہ نہیں ہیں۔"

مسلمانوں کو ہجرت کا حکم مل چکا تھا۔ اور اب نبیؐ بھی حکم خداوندی کے مطابق مکہ چھوڑ کر مدینہ جا رہے تھے۔ لیکن وہ دشمن جو ایک طرف حضورؐ کی جان کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ دوسری طرف اپنی امانتوں کو امین اور صادق کے سوا اور کسی کے پاس پوری طرح محفوظ بھی نہ سمجھتے تھے۔ حضورؐ کے پاس امانتوں کی ایک بہت بڑی تعداد تھی جو ہجرت سے قبل ان کے مالکوں کو واپس کی جانی ضروری تھی جس رات حضورؐ نے ہجرت کی اسی روز کا فیصلہ کیا جا چکا تھا کہ قاتل گروہ حضورؐ پر حملہ کرنے والا تھا۔ جس کا ایک ایک فرد مختلف قبائل سے چنا گیا تھا تاکہ بنو ہاشم قصاص کسی سے نہ لے سکیں اور خون بہا لینے پر مجبور ہو جائیں۔ یہی رات تھی جب نبیؐ نے حضرت علیؓ کو اس کام پر مامور کیا کہ وہ اس رات حضورؐ کے بستر پر سوئیں اور امانت والوں کی امانتیں واپس کر کے مدینہ تشریف لے آئیں۔ حالات کے اعتبار سے وہ رات قتل کی رات تھی اور وہ بستر بستر مرگ تھا لیکن حضرت علیؓ یہ فریضہ انجام دینے کے لئے بستر پر سوئے اور ان کا کہنا ہے کہ اتنی میٹھی نیند اس سے پہلے کبھی نہ آئی تھی۔ قوت ایمانی کے یہی وہ مظاہر تھے جنہوں نے حضورؐ کے ساتھیوں کو آسمانی ستاروں سے زیادہ بلند اور روشن کر دیا تھا۔

شدائد میں استقامت :-

حضرت بلالؓ غلامی کی حالت میں ایمان لے آئے تھے ان کو لوہے کی زرہ پہنا کر تپتی دھوپ میں ڈال دیا جاتا۔ مکہ کے لڑکے انہیں گرم

مسلمانوں کو کافروں سے تعلقات زن و شو توڑ لینے کا حکم دیا گیا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے بھی ان دو بیویوں کو الگ کر دیا جو ابھی تک کفر پر قائم تھیں۔ بہت سی مسلمان خواتین اپنے کافر شوہروں کے گھر بار چھوڑ چھاڑ کر آ گئیں اور انہوں نے غربت اور ہجرت کے مصائب کی ذرا پروا نہ کی۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ یہ حکم سننے کے بعد کسی ایک مسلمان عورت نے بھی اپنے گھر بار، شوہر اور بچوں کی خاطر دین نہیں بدلا۔ ایمان کا یہ وہ بلند معیار ہے جس کی بنا پر حضورؐ کے ساتھیوں نے اپنے سارے رشتے ناطے، تعلقات و روابط اور انس و محبت کو توڑ ڈالا تھا اور کسی ایک نے بھی اللہ کی رضا کے مقابلے میں اپنے نفس کی خواہش کو ترجیح نہ دی۔

عمل بالقرآن:

آج ہم احکام قرآن کو بیان کرنے میں جس قدر بلند آہنگ ہیں، عمل کا میدان بالکل خالی نظر آتا ہے۔ یہ ایک نہایت ہی پریشان کن کمزوری ہے جس نے پوری ملت مسلمہ کے اندر بے عملی، بے حسی اور جمود پیدا کر دیا ہے۔ کسی چیز کو درست سمجھنا اور اس پر عمل نہ کرنا، کسی چیز کو غلط سمجھنا اور غلط سمجھ کر بھی اس پر کاربند رہنا۔ فرد سے لے کر ملت تک جو بھی اس میں مبتلا ہوگا وہ دنیا میں کوئی بلند مقام حاصل نہیں کر سکتا۔ آج ہمارے درمیان علم کا جس قدر چرچا ہے بے عملی بھی اسی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ صحابہ کرامؓ کے اندر یہ چیز بالکل نہیں پائی جاتی تھی۔ وہ دین کا جس قدر علم رکھتے تھے اسی قدر اس پر عمل بھی کرتے تھے اور ان کے علم کے ساتھ بے عملی کا جوڑ نہیں لگا ہوا تھا۔ وہ قرآن پاک کی جس قدر تعلیم حاصل کرتے تھے اسی قدر اس پر عمل کا اہتمام بھی کرتے جاتے۔ پردے کا حکم اترنے سے پہلے عرب میں پردے کا کوئی رواج نہیں تھا۔ عورتوں کے لباس بھی پوری طرح ساتر نہیں ہوتے تھے، اور دوپٹہ اوڑھنے کا رواج تو بالکل نہیں تھا۔ جب پردے کا حکم نازل ہوا تو عورتوں نے اپنے تہبند پھاڑ کر دوپٹے بنا لیے اور اس حکم کو آئے ہوئے چند یوم بھی نہیں گزرے تھے کہ پوری سوسائٹی نے پردے کو اپنا قومی شعار بنا لیا۔

عرب لوگ شراب کے بڑے رسیا تھے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد بھی شراب عام پی جاتی تھی۔ گھر گھر بھٹیاں لگی ہوئی تھیں، اور ہر طرف ہر محفل میں شراب پینا پلانا ایک عام طریق مدارات تھا۔ شراب کی ممانعت کا حکم نازل ہوا تو نبیؐ کے منادی نے مدینے کی گلیوں میں گھوم پھر کر شراب کی حرمت کا اعلان کیا۔ شراب کی سجی ہوئی محفلیں اکھڑ گئیں۔ ہونٹوں تک پہنچے ہوئے جام تھم گئے۔ گردش میں آئے ہوئے پیمانے رک گئے۔ ساقی اور صہبا کا دور رخصت ہو گیا۔ لنڈھائی ہوئی شراب کے ذخیرے مدینے کی گلیوں میں بارش کے پانی کی طرح بہہ گئے۔ وہ آبادی جو چند گھنٹے قبل شراب کی بڑی شائق تھی، شراب سے ایسی متنفر ہوئی کہ اس کی پشت در پشت آنے والی نسلیں بھی شراب سے پوری طرح مجتنب ہو گئیں۔

قرآن مجید میں سونا اور چاندی جمع کرنے والوں، اسے سینت سینت کر رکھنے والوں اور راہ خدا میں خرچ نہ کرنے والوں پر وعید نازل ہوئی۔ انہیں بتایا گیا کہ ایسے لوگوں کے لیے آگ کا بھڑکتا ہوا عذاب تیار ہے۔ حضرت [illegible] یہ سنتے ہی انہیں غش آ گیا۔ شام ہونے سے پہلے پہلے سب کچھ خیرات کر دیا۔

حکم نازل ہوا کہ مسلمانو! نبیؐ کی آواز سے اپنی آواز کو بلند نہ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارا سب کیا کرایا برباد ہو جائے اور تمہیں اس کی خبر بھی نہ ہو۔ اس حکم نے حضرت عمر فاروقؓ کی آواز کو اتنا پست کر دیا کہ جب نبی کریمؐ کی موجودگی میں کوئی بات کرتے تو معلوم ہوتا جیسے سرگوشی کر رہے ہوں۔ حضرت ثابت بن قیسؓ کی آواز طبعاً بلند تھی۔ وہ سہم کر گھر بیٹھ گئے اور رونے لگے کہ بارہا وہ حضورؐ کی موجودگی میں بلند آواز سے بولتے تھے۔ اس لیے ان کے سارے اعمال ضائع ہو گئے۔ نبی کریمؐ نے انہیں تسلی دی تب وہ مطمئن ہوئے۔ اس طرح قرآن کی ہر آیت جب نازل ہوتی تھی تو ہر ایک صحابی یہ سمجھتا تھا کہ بلفظ ہر حکم کا مخاطب وہ تھا اور اس پر عمل نہ کرنے کا وہ تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔

اکل حلال:

حضرت صدیق اکبرؓ کے غلام نے کہانت سے کچھ مال حاصل کیا۔ حضرت ابوبکرؓ لاعلمی میں اس میں سے کچھ کھا بیٹھے۔ جب انہیں علم ہو

کہ وہ مال کہانت سے حاصل کیا گیا تھا، تو انہوں نے حلق میں انگلی ڈال کر قے کر دی اور اس بات کو بالکل پسند نہ کیا کہ اس قسم کی مشتبہ چیز کو اپنے پیٹ میں گوارا کریں۔

یتیموں کا مال کھانے کے بارے میں سخت وعید نازل ہوئی' وہ لوگ جو یتیموں کا مال کھاتے ہیں پیٹ میں آگ بھرتے ہیں۔ اس چیز نے لوگوں کو اتنا ڈرا دیا کہ جن خاندانوں میں یتیم پرورش پاتے تھے، ان کا کھانا پینا الگ کر دیا گیا ورنہ کھانے میں سے اگر کچھ بچ بھی جاتا تو اسے کوئی ہاتھ نہ لگاتا۔ یہ تھا صحابہ کی سوسائٹی میں اکلِ حلال کا اہتمام۔

باہمی تعلقات :-

ایک موقع پر حضرت عمرؓ فاروق اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے درمیان سخت کلامی ہو گئی۔ لیکن فوراً ہی حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس پر شدید ندامت محسوس کی۔ اور کسی قسم کا تکلف کئے بغیر انہوں نے حضرت عمر فاروق سے جا کر معافی مانگ لی۔ حضرت عمر فاروق نے معافی دینے میں ذرا تامل کیا تو حضرت صدیق اکبر اس بات کا شکوہ حضورؐ کے پاس لے کر گئے۔ اس لئے کہ انہیں بالکل یہ گوارا نہیں تھا کہ ان کا ایک دینی بھائی رنجیدہ ہو۔

واقعہ افک میں نبیؐ نے حضرت علی کی معرفت حضرت عائشہ صدیقہ کے بارے میں حضرت زینب کی رائے معلوم کی۔ دونوں ازواج نبوی تھیں اور سوکنوں کا باہمی تعلق فطرتاً ناگوار سا ہی ہوتا ہے۔ لیکن حضرت زینب نے حق پرستی کا اظہار کرتے ہوئے صاف صاف کہہ دیا کہ میں عائشہ کے بارے میں راستی کے سوا اور کچھ نہیں جانتی۔

حضرت کعب بن مالک کی جنگ تبوک سے غیر حاضری اور نبیؐ کے حکم پر مسلمانوں کی طرف سے ان کا بائیکاٹ ایک مشہور واقعہ ہے۔ ان کا اپنا چچا زاد بھائی تک ان سے بات کرنے کا روادار نہ تھا۔ ان کی اپنی بیوی ان کو چھوڑ کر میکے چلی گئی۔ گلیوں میں پھرتے تھے اور کوئی ان سے علیک سلیک نہ کرتا۔ لیکن جب معافی کا حکم نازل ہوا تو ہر چھوٹا بڑا شخص ان کو مبارکباد دینے کے لئے بھاگا چلا جا رہا تھا۔ اور ہر ایک کی کوشش یہ تھی کہ سب سے پہلے پہنچ کر اپنے بھائی کو یہ خوشخبری سنائے۔ اس طرح وہ لوگ ایک دوسرے کے لئے اخلاص و محبت کے سوا اور کچھ نہیں رکھتے تھے۔

ذمہ داری کا احساس :-

حضرت صدیق اکبر پر خلافت کا بوجھ پڑا تو انہوں نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا: "میری خواہش تھی کہ کوئی دوسرا یہ بوجھ اٹھاتا۔ حضورؐ سے جیسی توقعات تھیں میں ان کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ حضورؐ شیطان سے محفوظ تھے اور ان پر وحی نازل ہوتی تھی۔ مجھے ٹیڑھا پاؤ تو سیدھا کر دو"

انہوں نے حضرت عمر فاروق کو خلافت کے لئے نامزد کرنے کے بعد ذمہ داری کا احساس دلاتے ہوئے فرمایا: "تم پر اللہ تعالیٰ کے کچھ حقوق رات میں ہیں جن کو وہ دن میں قبول نہیں کرے گا۔ اور حقوق دن میں ہیں جن کو وہ رات میں قبول نہیں فرمائیگا۔ اور وہ نفل نہیں قبول کرے گا جب تک تم فرض نہ ادا کرو گے" پھر فرمایا: "خدا کی قسم میں کبھی غافل ہو کر نہیں سویا کہ مجھے خواب نظر آتے اور نہ میں نے ہوا میں قلعہ بنائے کہ میں بھٹکتا ——— اس بات کو خوب یاد رکھو کہ جب تک تم اللہ سے ڈرتے رہو گے۔ لوگ تم سے ڈرتے رہیں گے اور جب تک تم سیدھے رستے پر رہو گے لوگ تمہارے لئے سیدھے رہیں گے۔

جب حضرت عمر فاروق پر یہ ذمہ داری آکر پڑی تو انہوں نے کہا کہ اگر کوئی دوسرا یہ بوجھ اٹھانے کی قوت رکھتا تو میرے لئے آسان تھا کہ میری گردن اڑا دی جاتی۔ ایک موقع پر حج سے واپسی پر کنکریاں جمع کر کے ان پر لیٹ گئے۔ اور ذمہ داری کے احساس سے ڈرے ہوئے لہجے میں دعا کی "خدایا میرا سن بڑھ گیا ہیں ضعیف ہو گیا میری رعایا پھیل گئی مجھے اس حال میں اٹھا لے کہ نہ میرے اعمال ضائع ہوں اور نہ میں حد سے بڑھوں!"

آخرت کا خوف :-

حضرت ابوبکر صدیق کو پیاس محسوس ہوئی اور انہوں نے پانی طلب کیا۔ لوگوں نے شہد کا پیالہ پیش کیا۔ صدیق اکبر نے اسے ہاتھوں سے پرے ہٹا دیا اور رو پڑے اور فرمایا: "میں حضورؐ کے ساتھ تھا میں نے دیکھا کہ حضورؐ ہاتھ سے کسی چیز کو دھکیل رہے تھے۔ میں نے سوال کیا تو حضورؐ نے فرمایا۔ دنیا مجسم ہو کر میرے پاس آئی تھی میں نے اسے پیچھے دھکیل دیا اور کہا کہ ہٹ جا اور وہ ہٹ گئی۔ پھر پلٹ کر آئی اور کہا کہ آپ تو مجھ سے بچ گئے۔ لیکن آپ کے بعد والے

نہیں دی سکیں گے، تم نے شہد پیش کیا تو مجھے خوف ہوا کہ دنیا مجھ سے لپٹ نہ جائے۔

ایک موقع پر حضرت عمر فاروقؓ اچانک منبر پر چڑھے اور فرمایا: ایک وقت تھا کہ میں اپنی خالہ کی بکریاں چرا کر اس کے عوض میں کچھ کھجوریں لیا کرتا تھا اور آج میرا یہ زمانہ ہے۔ یہ کہہ کر منبر سے اُتر آئے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے سوال کیا تو کہنے لگے "تنہائی میں میرے دل نے کہا تم امیرالمومنین ہو تم سے افضل کون ہے۔ میں نے اس کا یہی علاج کیا"۔

حضرت عمرؓ آخرت کے خوف سے اکثر کانپ جایا کرتے تھے۔ کبھی فرماتے "کاش میں خس و خاشاک ہوتا، کاش میں پیدا نہ ہوا ہوتا، کاش میری ماں مجھے نہ جنتی" کبھی فرماتے "اس خدا کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ زمین میں جتنا سیم و زر ہے اگر وہ سارے کا سارا مجھے مل جائے تو میں ظاہر ہونے والے دن کے ہول سے بچنے کے لئے فدیہ میں دے دوں"۔

آپ انتہائی مشقت کی زندگی گزرتے، خشک کھانا کھاتے، موٹا پیوند لگا ہوا لباس پہنتے۔ ایک بار حضرت حفصہؓ نے بعض صحابہ کے کہنے پر حضرت عمرؓ کو ذرا نرم کپڑے پہننے اور کچھ بہتر کھانے کی سفارش کی۔ کہنے لگے "جان پدر! تم نے رسول اللہ کی عسرت کا زمانہ دیکھا ہے۔ چولھے میں گھاس اُگ آتی تھی۔ کیا تم وہ زمانہ بھول گئیں" پھر دیر تک نبیؐ کے گھر کی عسرت کی باتیں کرتے رہے بالآخر رو پڑے۔

قحط کے زمانے میں حضرت عمرؓ نے گھر میں کھانا کھانا ترک کر دیا۔ باہر بھوکوں کو کھلانے کے لئے جو کچھ پکتے وہ کھانا عام لوگوں کے ساتھ خود بھی کھا لیتے۔ کہا کرتے: "مجھے رعایا کے دکھ درد کا کیا اندازہ ہوگا، اگر مجھ پر وہی کچھ نہ گزرے جو ان پر گزر رہی ہے" اکثر کہا کرتے: "میں نے رسول اللہ کی صحبت اٹھائی، وہ آپ دنیا سے جب تشریف لے گئے تو مجھ سے راضی تھے۔ میں نے ابوبکر کی صحبت اٹھائی اور وہ بھی مجھ سے خوش گئے۔ اگر کوئی پریشانی ہے تو اس امامت کی ذمہ داریوں کی پریشانی ہے"۔ نہ دن میں آرام کرتے اور نہ رات میں۔ لوگوں کے توجہ دلانے پر کہتے "کیا کروں اگر شب میں آرام کروں تو میں تباہ ہو جاؤں گا اور اگر دن میں آرام کروں تو رعایا تباہ ہو جائے گی"۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ آخرت کے خوف سے تنہائی میں ڈاڑھی پکڑ کر رو دیا کرتے اور کہتے "اے دنیا مجھے فریفتہ نہ کر۔ مجھ سے دور رہ"۔ چنانچہ دنیا کی طرف سے اتنے بے نیاز تھے کہ عمر بھر مکان نہیں بنایا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ پر آخرت کا خوف کچھ اس طرح طاری تھا کہ بعض اوقات جنگل کے پرندوں تک کو مخاطب کیا کرتے اور کہتے "پرندو! مبارک ہو کہ دنیا میں چرتے چگتے ہو اور حساب کتاب سے بری ہو۔ اے کاش ابوبکر تمہاری طرح ہوتا"۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے ایک بار بیت المال کا جائزہ لیا اور اس میں سے صرف ایک درہم نکلا وہ درہم انہوں نے حضرت عمرؓ فاروق کے بیٹے کو دے دیا۔ حضرت عمرؓ اس درہم کو بیت المال میں واپس داخل کرنے کے لئے آئے، اور فرمایا "ابوموسیٰ افسوس! تم کو آل عمرؓ سے کمزور اور کوئی نظر نہ آیا۔ تم چاہتے ہو کہ خدا کے ہاں پوری امت محمدیہ کا مطالبہ میری گردن پر ہو"۔

نیکی، پاکیزگی، اخلاق، تقویٰ اور خدا ترسی کے آسمان پر درخشندہ ستاروں کی یہ چند کرنیں ہیں جو میں نے یہاں بیان کر دی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے لوگ اللہ کی زمین نے نہ پہلے دیکھے اور نہ دیکھ سکے گی۔ آج وہ لوگ جو اس نصب العین اور مقصد کو اپنے سامنے رکھتے ہیں ان کے لئے جان و مال کے ایثار کے نمونے اپنی کی پیروی سے مل سکتے ہیں جنہوں نے یہ کام سب سے بہترین طریق پر انجام دیا کوئی یہ کہے کہ میں صحابہ کرام کا، خصوصاً احترام کرتا ہوں، ان کا سچا پیرو ہوں، ان سے گہری عقیدت رکھتا ہوں، ان کے نقش قدم پر چلنا ذریعہ نجات سمجھتا ہوں۔ لیکن دوسری طرف وہ کسی قسم کی کوئی چوٹ سہنے کے لئے تیار نہ ہو اور انفرادی تقویٰ کے بعض مروج مظاہر پر عمل کر کے وہ اور دوسروں کے دین کے عظیم تقاضوں کو پس پشت ڈال دیتا ہو تو ایسا دعویٰ چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ سے خدا کے ہاں جواب دہی کے لئے ابھی سے تیاری کر لینی چاہیئے۔

اس پر خلیفہ نے جواب دیا " اس کے متعلق عبداللہ سے پوچھو " چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اُٹھے اور کہا " بھائیو! جو کپڑا گھٹ گیا تھا وہ میں نے اپنی چادر سے پورا کر دیا تھا ۔

- ایک دفعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مجلس صحابہ میں رونق افروز تھے کہ اتنے میں مصعب بن عمیرؓ ایک صوف پہنے ہوئے آنکلے جس میں چمڑے کے پیوند لگے ہوئے تھے ۔ صحابہ نے دیکھ کر سر نیچے کر لئے کیونکہ اس وقت کسی کے پاس مدد کے لئے کچھ نہ تھا ۔ مصعب سلام کر کے بیٹھ گئے ۔ حضور صلعم نے مصعبؓ کی تعریف کی اور فرمایا " میں نے کہ میں انھیں اس حالت میں دیکھا تھا کہ قریش کا کوئی لڑکا اپنے ماں باپ کا اتنا ناز پروردہ نہ تھا ۔ پھر خدا و رسول کی محبت میں سب کچھ جاتا رہا ۔ حق یہ ہے کہ مصعبؓ کامیاب ہو گیا "
- صہیبؓ نے مکہ سے ہجرت کا ارادہ کیا تو اہل مکہ مانع ہوئے اور کہا مکہ میں خالی ہاتھ آئے اور یہاں مالدار بنے اب خود بھی جاتے ہو اور مال بھی لے جانا چاہتے ہو ۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا ۔ صہیبؓ نے کہا " اگر میں اپنا سارا مال تمہارے حوالے کر دوں تو مجھے جانے دو گے ؟" مشرکین نے کہا " ہاں " پس صہیبؓ تمام مال و متاع سے دست بردار ہو گئے ۔ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو فرمایا " صہیبؓ نفع میں رہے "
- سلطان نورالدین محمود زنگی ایک جانباز اور غیور مسلمان فرمانروا تھا اس کی پارسائی اور دینداری مسلمہ تھی ۔ پارسائی کے ساتھ تقشف اور دینداری کے تعصب نام کو نہ تھا ۔ دشمن کی طاقت سے بے خوف اور شہادت کے شوق میں ہمیشہ فوج کی اگلی صفوں میں لڑتا تھا ۔ جاں نثاروں نے عرض کیا کہ آپ ہمیشہ اگلی صفوں میں لڑتے ہیں ۔ خدانخواستہ اگر آپ شہید ہو گئے تو آپ کی شہادت سے پوری مسلم قوم کو بہت نقصان پہنچے گا "

سلطان نے متغیر ہو کر کہا " محمود کون ہوتا ہے جسے یہ باتیں سنائی جاتی ہیں ۔ مجھ سے پہلے ملک و قوم کی حفاظت کرنے والی ہستی ایک اور صرف ایک ہے اور وہ اللہ تعالیٰ عزوجل کی ذات ہے ۔

(از درس اخلاق اور رحمۃ للعالمین وغیرہ)

غلط نامۂ فراق گورکھپوری

جلیل قدوائی (ایم اے)

"فراق کو غلط اشعار نقل کرنے کا خاص ملکہ ہے۔ میں جب کبھی کوئی غلط شعر چھپا ہوا دیکھتا ہوں سوچتا ہوں فراق نے نقل کیا ہوگا۔"

یہ جملے حال ہی میں رگھوپتی سہائے فراق کی کتاب "اردو کی عشقیہ شاعری" پڑھنے کے بعد میں نے بے اختیاری کے عالم میں اس کتاب کے ابتدائی صفحات پر لکھ دیئے۔ ان کی دوسری کتابوں اور مضمونوں میں بھی اساتذہ کے اشعار غلط نقل کرنے کا عیب پایا جاتا ہے مگر موجودہ کتاب میں یہ عیب حد کمال کو پہنچا دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ معلوم ہوتا ہے اس امر کا خاص اہتمام کیا گیا ہے کہ جس قدر شاعر یا شعر مشہور ہو اتنا ہی شعر غلط نقل ہو۔

فراق نے موقع بے موقع غلط اشعار نقل کرنے میں جو مہارت تامہ حاصل کی ہے اسی کے پیش نظر اس مضمون کا عنوان بھی مقرر کیا گیا ہے۔ یعنی یہ کسی خاص تصنیف یا دیوان کا غلط نامہ نہیں ہے بلکہ صاحب تصنیف کا غلط نامہ ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس تصنیف میں اشعار غلط نقل ہوں۔ نواب یوسف علی خاں ناظم کا مشہور مطلع ہے ؎

میں نے کہا کہ دعوئ الفت مگر غلط؟		کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط

موجودہ دور میں فراق کو اردو شاعری اور شعر کی تنقید میں اپنے ایک خاص مرتبہ کا جو احساس یا زعم موجود ہے، اسی کی بنا پر اگر اس مضمون کے بارے میں میرے اور ان کے درمیان کوئی سوال و جواب ہو تو اسے شاید مندرجہ بالا مطلع کو بہ خفیف تغیر یوں پڑھنے سے ظاہر کیا جا سکتا ہے

بولے کہ میرا دعوئ نقد و نظر غلط؟		میں نے کہا کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط!

فراق میرے دوست ہیں۔ میں انہیں قدیم طرز کا غزل گو نہ سمجھتے ہوئے بھی پرانی غزل کا اچھا اداشناس اور نباض سمجھتا ہوں۔ میری دوستی پرانی نہیں، اعتقاد ہے کہ عرصہ ہوا جب انھوں نے اپنے کلام کا ایک مجموعہ پاکستان میں چھپوانے کا ارادہ کیا تو مجھے لکھا کہ اس کا انتظام کر دوں۔ مگر میں خود پر توڑ کر بیٹھا ہوں، اور بقول غالب ع

میں کہاں اور یہ وبال کہاں!

میں اور فراق جن اساتذہ اور مشاہیر کی صحبت میں ایک ساتھ بیٹھ چکے ہیں ان میں سے کئی ایک اس جہان سے رخصت ہو چکے ہیں اس وقت اردو دنیا فراق کو زیادہ نہ جانتی تھی اگرچہ انفرادی طور پر متعدد مشاہیر جن سے ان کے روابط تھے ان کی علمیت، ذہانت اور طباعی کی قدر کرتے تھے۔ غالباً ۱۹۳۱ء یا ۱۹۳۲ء میں انہی کے ہاں مجھے سب سے پہلے منشی پریم چند سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔

۱؎ مطبوعہ سنگم پریس الہ آباد۔ جنوری ۱۹۴۵ء۔

ان کی غزلیں جب میں نے پڑھیں تو ان کے ان دو شعروں پر نگاہ جا رکی۔

کسی کی بزم طرب میں حیات بٹتی تھی		امیدوار میں کل موت بھی نظر آئی

اف یہ کہنا چاہیے میں اپنے آئیں گے کبھی		رہ گئے میں بھی دل کے عہد و پیماں دیکھئے!

تھا اس لئے اُن سے خط و کتابت کا سلسلہ پیشتر سے تھا۔

اس تمہید سے یہ بتانا مقصود ہے کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ مضمون ذاتی پرخاش کی بنا پر لکھا گیا ہے یا فرد و فراق کے درمیان جس قسم کی ادبی آویزش چلی ہے یا چل رہی ہے۔ یہ مضمون اس قبیل کی کوئی چیز ہے۔ میرے مضمون کا اصل سبب ادبی خدمت ہے اور ان اساتذہ کے ساتھ انصاف کرنا ہے جن کی حق تلفی کی گئی ہے۔ ہاں اس سلسلہ میں اگر ان کے ایک دوست کی وجہ سے فراق کے ذوق سخن سنجی کی اصلاح بھی ہو جائے، یا جن نوجوانوں کو اشعار متعلقہ غلط یاد ہو گئے ہوں وہ صحیح اشعار سے واقف ہو جائیں تو کیا مضائقہ ہے۔ یہ امر بہر حال افسوسناک ہے کہ ایک مشہور درسگاہ کا انگریزی ادب و شعر کا مدرس جسے اُردو سے بھی عشق ہو، بلکہ جس نے اپنی زندگی اُردو کی خدمت کے لئے وقف کر دی ہو۔ نقد و نظر کے اس ابتدائی اصول سے ناواقف ہو کہ نقل کو ہمیشہ مطابق اصل ہونا چاہیے اور نہ اسے اس امر کا اندازہ ہو کہ اس اصول کے نادانستہ کی وجہ سے وہ ادب کے مبتدیوں میں کتنی شدید گمراہی پھیلانے کا مرتکب ہو گا۔

اُردو کی عشقیہ شاعری

صفحہ گیارہ پر حالی کا مشہور شعر جس میں عشق کی تعریف کی گئی ہے یوں درج کیا گیا ہے :-

عشق کہتے ہیں جسے سب وہ یہی ہے شاید خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

حالانکہ اس شعر کا پہلا مصرعہ یوں ہے :-

عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید!

اس سے آگے دوسرے ہی صفحہ پر در صفحہ ۸۹ پر بھی حالی کا یک در شعر غلط نقل کیا گیا ہے :-

نیا ہے لیجیے جب نام اس کا بڑی وسعت ہے میری داستاں میں

اس میں غلطی یہ ہے کہ دوسرے مصرعہ میں حالی نے "بڑی" کی جگہ "بہت" کا لفظ استعمال کیا ہے یعنی "بہت وسعت ہے میری داستاں میں" یوں صحیح ہے۔

اور یہی صفحہ۔ پہلے چار دو غالب زد میں آگئے۔ مشہور شعر ہے :-

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

فراق نے پہلا مصرعہ یوں لکھا ہے۔

دل چاہتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن

جگر کی ایک غزل ہے، "سوا کریں، سجدہ کریں"، اس کا ایک شعر ہے :-

ہائے یہ مجبوریاں، محرومیاں، ناکامیاں عشق آخر عشق ہے تم کیا کرو ہم کیا کریں

---

[1] اس ملاقات میں منشی پریم چند نے میری ایک غزل (ردیف یاد آئی، یاد آئی) اتنی پسند کی کہ اس کے کچھ اشعار نقل کر لئے۔ انھوں نے اپنے ناول غالباً "غریبِ عمل" میں استعمال کئے۔ اسی غزل کا ایک شعر ہے :-

بے رخی پر تری جب غور کیا مجھ کو اپنی ہی خطا یاد آئی!

[2] اس مضمون میں غلط اشعار کی جو مثالیں دی گئی ہیں وہ فراق کی اور کتابوں میں بھی پائی جاتی ہیں "اندازے" (مطبوعہ ادارہ فروغ اُردو [illegible]) ان کے چند تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے اس کے صفحہ ۱۸ پر بھی شعر اسی طرح درج ہے۔

صفحہ ۲۷ پر جرأت کا ایک مطلع یوں نقل کیا ہے ؎

جب یہ سنتے ہیں وہ ہمسایہ میں ہیں آئے ہوئے کیا در و بام پہ ہم پھرتے ہیں گھبرائے ہوئے

یہ مطلع اس کتاب کے صفحہ ۸۰ پر بھی اسی طرح لکھا ہے[1] حالانکہ اس کا پہلا مصرعہ یوں ہے ۔ ع

جب یہ سنتے ہیں کہ ہمسایہ میں آپ آئے ہوئے

آگے چلئے ۔ صفحہ ۴۸ پر حالی پھر زد میں آگئے ۔ ان کا شعر یوں نقل کیا ہے ۔

جی ڈھونڈھتا ہے بزم طرب میں انہیں مگر وہ انجمن میں آئے تو پھر انجمن کہاں

حالانکہ دوسرے مصرعہ میں "انجمن میں آئے" کی جگہ "آئے انجمن میں" ہونا چاہیئے ع

وہ آئے انجمن میں تو پھر انجمن کہاں

اور دیکھئے ۔ صفحہ ۶۰ پر اقبال کی مشہور نظم "محبت" کا مشہور پہلا مصرعہ ع

عروسِ شب کی زلفیں تھیں ابھی نا آشنا خم سے

یوں لکھا ہے : ۔ ع

عروسِ غم کی زلفیں تھیں ابھی نا آشنا خم سے !

اسی طرح مثنوی مولانا روم کی ایک مشہور حکایت کا یہ مصرعہ ع

عشقِ لیلیٰ نیست ایں کار من است

یوں لکھا گیا ہے ع عشقِ مجنوں نیست ایں کار من است

واضح ہو کہ اس حکایت میں مجنوں ایک رات خداوند تعالیٰ سے فریاد کرتا ہے اور عشقِ لیلیٰ کی نسبت عرض کرتا ہے ۔ حکایت کا آغاز اس طرح ہوتا ہے ؎

یک شبے مجنوں بہ خلوت گاہِ راز گفت کے پروردگارِ بے نیاز

از چرا نامم تو مجنوں کردہ عشقِ لیلیٰ در دلم چوں کردہ

تو جناب یہاں "عشقِ مجنوں" کہاں سے آگیا ۔

اسی صفحہ پر اقبال کے مشہور و معروف مطلع ؎

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

کے مصرعہ میں "ستاروں سے آگے" کے بجائے "ستاروں کے آگے" لکھا گیا ہے "سے" اور "کے" کی اس معمولی تبدیلی سے شعر کی زبان میں جو "لکنت" آئی اور جسے اقبال نے جن پر زبان سے ناواقف ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے[2] دور کرنا چاہا تھا افسوس کہ فراق کو محسوس نہ ہوئی

[1] "انداز نے" کے صفحہ ۵۵ پر بھی یہ مطلع اسی صورت میں درج ہے ۔ [2] میرا ایک مضمون "اقبال کی بعض نظموں کا ابتدائی متن" مطبوعہ "ردد" سہ ماہی کراچی بابت اکتوبر ۱۹۵۲ء میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اقبال زبان کے معاملہ میں اتنے بے پرواہ نہیں تھے جتنے وہ عام طور پر سمجھے جاتے ہیں ۔

[3] ایک بالکل ایسا ہی لطیفہ میرے ذاتی علم میں ہے ۔ ایک دوست نے اپنے رسالہ میں قائد اعظم کی تصویروں کے دو صفحے آمنے سامنے ترتیب دیئے ۔ ایک صفحہ پر پاکستان سے پہلے کی اور دوسرے صفحہ پر پاکستان کے بعد کی تصویریں تھیں ۔ ایک صفحہ کا جلی عنوان رکھا "پاکستان سے پہلے" دوسرے کا عنوان رکھا "پاکستان کے بعد" جن بزرگ کو یہ صفحے پریس بھیجنے تھے انہوں نے پہلے صفحہ پر یوں تصحیح کر دی "پاکستان کے پہلے" وہ دوست سر پیٹتے رہے مگر عنوان یوں ہی چھپا ؎

زور ہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کئے آشیاں اجڑا کیا ہم ناتواں دیکھا کئے !

صفحہ ۸۰ پر میرؔ کے بے مثال وجد آور شعر ؎

رنگِ گل و بوئے گل ہوتے ہیں ہوا دونوں   کیا قافلہ جاتا ہے تو بھی جو چلا چاہے

کے دوسرے مصرعہ کو یوں قتل کر دیا گیا ع

کیا قافلہ جاتا ہے جو بھی تو چلا چاہے

سنا آپ نے؟ اس سے آگے کی ترمیم اس سے بڑھ گئی۔ یعنی "مطلب" اور "معنی" یہ لفظ ایک دوسرے کے مترادف قرار پا گئے یوں کہ صفحہ ۷۶ پر غالب کو پھر کند چھری سے ذبح کر دیا۔ اس کے مشہور مطلع ؎

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز   دعا قبول ہو یا رب کہ عمرِ خضر دراز

کے پہلے مصرعہ میں "مطلبِ مشکل" کو "معنی مشکل" کر دیا۔ غالب نے

اسدؔ اس جفا پر بتوں سے وفا کی   مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

کو اپنی طرف منسوب ہوتے دیکھ کر کیسی بے پناہ پروٹسٹ کی تھی کہ میرا شعر ہو تو رحمت کے بجائے مجھ پر لعنت، جو اور کسی دوسرے اسد کا ہو تو بے شک اس پر رحمت۔ معلوم نہیں موجودہ ترمیم سن کر غریب غالب پر کیا گزرتی اور اب اس کی روح پر کیا گزر رہی ہو گی۔

صفحہ ۸۲ پر "نگہ" کی بجائے "نگاہ" لکھ دیا حالانکہ مصرعہ وزن سے خارج ہو جاتا ہے۔

شعر پھر غالب ہی کا ہے اور مشہور ہے ؎

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی   وہ اک نگہ جو بہ ظاہر نگاہ سے کم ہے

لیجئے، میرؔ اور خود اپنے ممدوح حسرت موہانی کو بھی نہ چھوڑا۔ ان کا کیسا تڑپا دینے والا (بقول فراقؔ چونکا دینے والا) شعر ہے ؎

بزمِ اغیار میں ہر چند وہ بیگانہ رہے   ہاتھ آہستہ مرا پھر بھی دبا کر چھوڑا

فراقؔ نے صفحہ ۹۴ پر دوسرے مصرعہ میں "پھلنے" کا دام گاڑ دیا ہے۔ کے اصل پر بس صرف مفہوم کو نظم کر دیا

ہاتھ چپکے سے مگر میرا دبا کر چھوڑا

اس "غلط نگاری" نے حسرتؔ کے شعر کے ساتھ کتنا دردناک ظلم کیا ہے۔ فریاد!

لہ "اندازے" کے صفحہ ۹۴ پر بھی یہ شعر یونہی درج ہے۔

لہ حسرتؔ کے بارے میں فراقؔ کے خیالات اچھے ہوئے نہیں تو عجیب ضرور ہیں۔ "اندازے" میں ان کا ایک مضمون حسرتؔ پر بھی ہے جس میں ادعا کیا گیا ہے "میں نے حسرت سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ بہت کچھ پایا ہے، بہت کچھ اثر لیا ہے" اس کے بعد حسب عادت اپنی غزلوں کی بعض وہ ترکیبیں مثال کے طور پر پیش کر کے جو حسرتؔ کے اثر سے وجود میں آئیں (حالانکہ ان میں سے بعض مجھ ایسے مداح کے نزدیک مہمل ہیں) اس سے بھی زیادہ عقیدت سے کام لیا گیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں "میں پرستاران حسرت میں اپنے کو کسی سے پیچھے نہیں سمجھتا" مگر پرستش کا یہ خوب ثبوت ہے کہ حسرتؔ کے اشعار غلط کرتے ہیں ... "تحسین ناشناس اس کا نام نہیں ہے تو پھر کس چیز کا ہے؟" میرے اس مضمون میں حسرتؔ کے اس شعر کے علاوہ اور کئی شعر ناظرین دیکھیں گے جو فراقؔ نے غلط نقل کئے ہیں۔ پرستش کا ایک اور عجیب ثبوت فراقؔ نے حسرت کی شاعری پر اظہار رائے کرتے ہوئے یوں دیا ہے "حسرت کی فطنت دوئم درجہ کی فطنت ہے۔ اسی لئے وہ دوئم درجہ کے شعرا کی طرف کھنچے جن کی شاعری میں ترقی و تکمیل کی گنجائش تھی اور حسرت نے یہ ترقی انتہا تک پہنچا دی لیکن وہ انتہا تک پہنچ کر بھی رہی دوئم درجہ ہی کی شاعری"! معلوم نہیں اس سلسلہ میں خود فراقؔ کی "فطنت" کس درجہ کی قرار دی جائے جس نے انہیں دوئم درجہ کی شاعری کی پرستش پر مجبور کیا۔

لگے دو صفحوں پر پھر غالب پر ہاتھ صاف کیا ہے۔ صفحہ ۹۶ پر غالب کے مشہور زمانہ شعر ؎

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں　　جس کے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

کے دوسرے مصرعہ میں "جس کے بازو پر تری زلفیں" کے بجائے "تیری زلفیں جس کے بازو پر" کر دیا۔ اچھا مان لیا۔ بعض دفعہ شعر صحیح یاد رکھنے کے معاملے میں بڑے سے بڑا نقاد دھوکا کھا جاتا ہے اور یہ بہت معمولی سہو ہے مگر صفحہ ۹۷ پر ؎

غالب ترا احوال سنا دیں گے ہم ان کو　　وہ سن کے بلا لیں یہ اجارا نہیں کرتے

کے دوسرے مصرعہ میں جو "یہ" کے بجائے "گے" لگا دیا ہے۔

وہ سن کے بلالیں گے اجارا نہیں کرتے

یہ کیا معاملہ ہے آخر صاحب، بلکہ فراق کی اصطلاح میں "معنی"[1] کیا ہوئے؟

اچھا یہ کاتب کی غلطی سہی۔ صفحہ ۹۸ پر اقبال کے ساتھ پھر "نارو" سلوک ہوا ہے اس کا کیا جواب ہے؟ کس قدر مشہور شعر ہے اور کتنا مناسب حال بھی ؎

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں　　نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلف ایاز میں

فراق نے پہلے مصرعہ کی تبدیلی سے وہی "بھونڈے کچوری" والے مذاق کا پھر ثبوت دیا نا؟ مصرعہ یوں بدلا ہے ؎

رہیں عشق میں نہ وہ گرمیاں رہیں حسن میں نہ وہ شوخیاں[2]

افوہ۔ اب کے تو حد کر دی۔ صفحہ ۱۰۰ پر بے چارے آتش ـــــ ذو الاساتذہ، سرتاج شعرائے قدیم و جدید، ناخدائے سخن وغیرہ وغیرہ کس بیدردی سے قتل ہوا۔

اب تک شاید مذاق رہا ہو مگر اب رونے کا مقام ہے۔ یہ میر کا، جو ب شعر سنیئے اور سر دھنیئے ؎

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے　　درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

---

[1] وہی فراق کا "حریف معنی مشکل نہیں فسون نیاز" جس کا تذکرہ پہلے آچکا ہے۔

[2] یہ مصرعہ کی آخری صورت ہے "بانگ درا" کے مطابق، ورنہ پہلے "تڑپ رہی" کے بجائے "مذاق ہے" تھا۔ مگر پہلے مصرعہ میں تبدیلی کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ "مدارنیت" کے صفحہ ۳۹۹ پر بھی یہ مصرعہ اسی طرح درج ہے۔

بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ :-

حسرت اور "دوئم درجہ کے شعرا" کا بھی فراق نے خوب قصہ گھڑا ہے۔ اپنے مضمون میں انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حسرت نے میر و سودا کی نسبت کہیں زیادہ مومن سے بیدار کے تقلیدی انداز اور رنگ کے طور پر بیدار کی دو غزلیں بھی نقل کی ہیں۔ فراق کا یہ مضمون ان کے مجموعہ میں شامل ہونے سے پہلے نگار کے حسرت نمبر (جنوری فروری ۱۹۵۲ء) میں شائع ہوا تھا۔ میں نے اپنے مرتب کردہ دیوان بیدار مطبوعہ ہندوستانی اکیڈمی، یوپی، الہ آباد، ۱۹۳۵ء کے مقدمہ (نوشتہ ستمبر ۱۹۳۵ء یعنی فراق کے مضمون سے سولہ سترہ برس پہلے) کے ایک فٹ نوٹ میں بیدار کے اشعار پر رائے ظاہر کرتے ہوئے لکھا تھا "یہ تینوں شعر اور بعض اور اشعار جو انتخاب کیے گئے ہیں، ایسی زبان اور انداز بیان کے لحاظ سے مولانا حسرت موہانی کے معلوم ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ خود ایک دلچسپ سوال ہے کہ حسرت کہاں تک قدیم رنگ اور انداز بیان میں شعر کہتے ہیں۔ فراق نے اپنے دعوے کے ثبوت میں بیدار کی جو دو غزلیں پیش کی ہیں ان میں سے ایک غزل وہی ہے جس کے اشعار میں نے اپنے مقدمہ میں انتخاب کیے ہیں مگر حسرت اور بیدار کی شاعری میں جو ربط پایا جاتا ہے اس کے متعلق میرے اور فراق کے خیالات اور بیانات میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔

فراق کی بے دردی پر سینہ کوبی کیجئے ۔ فرضی اور مرحوم حافظ کے بل پر دوسرا مصرعہ یوں بدل دیا ہے ع

درد دل دکھوں کئے جمع تو دیوان ہوا

بائے اپنی طالب علمی کے زمانے میں علی گڑھ میں مخدومی مولانا احسن مارہروی کو داغ کے جن کے وہ شاگرد رشید تھے بلکہ جانشینوں میں شمار ہوتے تھے اور اس وجہ سے اپنے حافظہ پر اعتماد کر سکتے تھے ایک مصرعہ کی صحت کی طرف سے اطمینان کرنے کے سلسلہ میں تین دن سرگرداں دیکھا تھا۔ معلوم ہوا ایسی کاوشیں جاگیردارانہ نظام کے پیدا کئے ہوئے بیوقوف اگلے وقتوں کے لوگوں کے ساتھ ختم ہو گئیں ع

اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

اب "پرولتاری" نظام کے چشم براہوں کو شہرت حاصل کرنے کے بہت سستے نسخے ہاتھ آگئے ہیں ۔ لیجئے ۔ یہ حضرت اکبر الہ آبادی پڑھے کر رہے ہیں ۔ صفحہ ۱۰۲ پر اُن کا مقطع لکھا ہے ؎

ہجر ہو یا وصال اے اکبر جاگنا رات بھر قیامت ہے

حضرت اکبر کہہ رہے ہیں بھائی میرا شعر یوں تھا ؎

ہجر ہو یا وصال ہو اکبر جاگنا ساری رات مشکل ہے !

صفحہ ۳۰ پر پھر میر پر وار کیا ؎

متصل رونے سے شاید کہ بجھے آتش دل ایک دو آنسو تو اور آگ لگا دیتے ہیں

میر ہاتھ جوڑ کر عرض کرتے ہیں حضور میرا شعر یوں ہے ؎

متصل روتے ہی رہئے تو بجھے آتش دل ایک دو آنسو تو اور آگ لگا جاتے ہیں

مگر فراق کہتے ہیں ہم نہیں مانتے بقول حسرت ؎

ایک بار کر چکے جو ہم ارشاد کر چکے !

صفحہ ۱۵۰ پر پھر اقبال کے مجروح ہونے کی باری آئی ۔ مشہور ترانۂ ہندی کے اس شعر کے ۔۔

اے آب رود گنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

پہلے مصرعہ کو یوں نقل کیا ہے ع

اے آب رود گنگا ہے یاد وہ زمانہ

صفحہ ۱۵۵ پر غالب کی پھر شامت آئی ۔ اس کے مصرعہ ۔

ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے جس بھیس میں جو آئے

کو یوں بدل دیا ۔ ع ہم جان گئے اس کو وہ جس رنگ میں آئے :

ہو سکتا ہے یہ فراق کا اپنا مصرعہ ہو یا کسی اور کا ہو کیونکہ شاعر کا نام نہیں لیا گیا ہے ۔ میری اس سوءظنی کی کہ یہ غالب کے مصرعہ کی خرابی ہے تمام ذمہ داری فراق پر ہے جنھوں نے شعر صحیح نقل کرنے کے معاملہ میں کسی خوش فہمی کا امکان نہیں چھوڑا ۔

اندازے

اب تک میں نے فراق کی ایک ہی کتاب "اردو کی عشقیہ شاعری" سامنے رکھی تھی ۔ اب انکی ایک اور کتاب لیجئے "اندازے" جو

مجموعہ ہے اُن کے چند تنقیدی مضامین کا۔ اس کی اغلاط ملاحظہ ہوں:۔

میر کا مشہور نشتر ہے ؎

ہوگا کسی دیوار کے سائے کے تلے میر　　　کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

فراق نے اس پر رنگ لگا دیا اسے منتقل کر دیا۔ صفحہ ۲۴ پر پہلا مصرعہ یوں تحریر ہے فرماتے ہیں ع

ہوگا کسی دیوار کے سائے میں پڑا میر

سوچا ہوگا میر جیسا استاد پہلے مصرعہ میں "کے سائے کے" نہیں لکھ سکتا۔ یعنی فصاحت کے اصول سے "بھرپور" واقفیت کا ثبوت دیا، اور اپنے مجوزہ مصرعہ میں "پڑا" کا لفظ شامل کر کے خاص دہلوی انداز پیدا کر دیا جو میر بے چارہ کو نہیں سوجھا تھا مگر میر صاحب کی فریاد کی صدا میرے کانوں میں آ رہی ہے ؎

ہاتھ سے تیرے اگر میں ناتواں مارا گیا　　　سب کہیں گے یہ کہ کیا اک نیم جاں مارا گیا!

اسی کتاب کے صفحہ ۸۵ پر حسرت موہانی کے مشہور شعر ؎

رونق پیرہن ہوئی خوبیٔ جسم نازنیں　　　اور بھی شوخ ہو گیا رنگ ترے لباس کا!

کے پہلے مصرعہ میں "ہوئی" کے بجائے "بنی" لکھ دیا ع

رونق پیرہن بنی خوبیٔ جسم نازنیں[1]

صفحہ ۲۰۷ پر غالب کا مشہور یوں لکھ دیا ؎

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں!　　　اک تیر میرے سینہ پہ مارا کہ ہائے ہائے

حالانکہ غالب کے ہاں دوسرے مصرعہ میں "سینہ" پہ کے بجائے "سینہ میں" ہے۔

ہاہا ہا! فراق کا شعر کا رعب نظر آیا۔ صفحہ ۲۰۸ پر پھر غالب کا ایک مشہور شعر نقل کیا ہے ؎

ہیں اہل طلب کون سنے طعنۂ نایافت　　　دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

فراق کو جلدی تھی۔ دوسرا مصرعہ شاید یاد نہیں آیا۔ دیوان غالب چوری ہو گیا تھا۔ جھٹ گھڑ دیا۔ ع

جب پا نہ سکے ہم کو تو آپ اپنے کو کھو آئے

اور لیجئے۔ غالب کا وہ "ظہوری" اور "خفائی" والا مشہور شعر ؎

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب　　　میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

فراق کی مہربانی سے صفحہ ۲۱۰ پر اس کے پہلے مصرعہ میں "خفائی" پہلے آئے اور "ظہوری" بعد میں نمودار ہوئے ع

ہوں خفائی کے مقابل میں ظہوری غالب

سبحان اللہ، سبحان اللہ، کس قدر شاندار اصلاح ہوئی ہے جو جیسوں مار دیا۔ عالم ارواح میں بیچارے غالب فریاد کا ایک شور برپا کر رہا ہے۔

---

[1] بنی "پر" بھی یاد آیا۔ ایک دوست نے لطیفہ سنایا کہ ایک منشی جی نے اسکول میں "بنی نوع انسان" کو "بنی نوع انسان" پڑھنا سکھایا۔ انسپکٹر صاحب معائنہ کرنے گئے تو انھوں نے دیکھا ایک بار، دو بار نہیں ہر بار ہر ایک نہیں ہر لڑکا "بنی" پڑھ رہا ہے۔ منشی جی کو بلایا انھوں نے بھی "بنی" پڑھا۔ انسپکٹر صاحب نے کہا "منشی جی ہمیں کچہریاں نہیں چاہئیں۔ آج سے آپ موقوف"

معلوم ہوتا ہے غالب پر ہاتھ صاف کرنے کا فراق کو خاص شوق ہے ۔ صفحہ ۲۶ پر پھر موقع مل گیا ۔ شعر مشہور ہے ۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی ۔۔۔ کچھ ہماری خبر نہیں آتی

دوسرے مصرعہ میں فراق نے "کچھ" کی جگہ "اب" لکھ کر "معنی" کے دریا بہا دیئے ۔

حالی سے فراق کو بڑی عقیدت ہے ۔ نیز حالی کا یہ شعر "والد مرحوم عبرت کے کلیجے کا ٹکڑا تھا ۔ شعر گنگناتے تھے اور وجد کرتے تھے ۔ مگر عقیدت غلط شعر نقل کرنے کے علاوہ کہیں صادق نہیں ہو سکتی ۔ متعدد اشعار جو فراق نے غلط درج کئے ہیں ، سب سے پہلے پیش کئے جا چکے ہیں ۔ اب کچھ اور شعر سنیئے ۔ والد مرحوم کے محبوب شعر والی غزل کا مشہور مطلع ہے ۔

قلق اور دل کا سوا ہو گیا ۔۔۔ دلاسا تمہارا بلا ہو گیا

صفحہ ۲۲۱ پر اس شعر کے پہلے مصرعہ میں فراق نے "کا" کی بجائے "میں" لکھ کر انتہائی عقیدت کا ثبوت مہیا کیا ہے [1]

صفحہ ۲۲۳ پر حالی سے عقیدت کا مزید ثبوت دیجئے ۔ مشہور غزل ہے در کی صورت ، خضر کی صورت ۔ مشہور تر مطلع ہے ۔

اس کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت ۔۔۔ نہ وہ دیوار کی صورت ہے ، نہ در کی صورت

فراق نے پہلا مصرعہ تبدیل کرنے میں اپنی چابکدستی یوں صرف کی ہے ؎

اس کے جاتے ہی ہوئی کیا مرے گھر کی صورت

بھلا حالی "ہی ہوئی" کی فصاحت کہاں سے لاتے ، جس کا اردو شاعری میں مشکل سے جواب ملے گا ۔

حالی کے ایک اور شعر کی فراق نے پھر بڑی گت بنائی ۔ صفحہ ۵۵ پر مشہور شعر ہے ۔

دکھانا پڑے گا مجھے زخمِ دل ۔۔۔ اگر تیر اس کا خطا ہو گیا

کے پہلے مصرعہ میں "مجھے" کے بجائے "ہمیں" رکھ دیا ۔ واضح ہو کہ یہ وہی شعر ہے جو "والد مرحوم عبرت گورکھپوری کے کلیجہ کا ٹکڑا تھا ۔ مگر فراق کو نہ "والد مرحوم" کا کچھ لحاظ آیا نہ حالی کا کلیجہ چھلنی کرنے میں کوئی پس و پیش ہوا ۔[2]

صفحہ ۲۶۶ پر فراق کو میر کا شعر یاد آ گیا ۔

کیا جانیں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے ۔۔۔ کچھ طرز ایسی بھی نہیں ، ایہام بھی نہیں

یہ درست ہے کہ دوسرے مصرعہ میں "طرز" کے بجائے "بات" کا لفظ یاد آ گیا ۔

صفحہ ۲۱۶ پر حالی کا مشہور شعر ہے

یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا ۔۔۔ ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

جس کا پہلا مصرعہ یوں کر دیا ؎

یارانِ تیز گام نے منزل کو جا لیا

فراق کو معلوم ہونا چاہیئے کہ میتھو آرنلڈ ، ورڈزورتھ اور ڈکنس کے بے پڑھا اور موقع بے موقع ذکر ۔۔۔ جیسا کہ انھوں نے حالی والے مضمون میں کیا ہے ، اردو شعر صحیح یاد نہیں ہوتا ۔ اردو شعر تو وہی یاد رکھتے ہیں ۔۔۔ یاد رہ سکتے ۔۔۔ اور اس کے لئے ضرورت ہے اردو زبان کی صحیح واقفیت اور اردو زبان کے صحیح ذوق کی جو حاصل ہوتا ہے اردو کے اساتذہ کو اردو [illegible] [illegible] غزلوں [illegible]

[1] صفحہ ۲۶۰ پر بھی یہ مصرعہ اسی طرح غلط نقل کیا گیا ۔

[2] صفحہ ۲۲۹ پر اسی شعر کے پہلے مصرعہ میں "مجھے" کے بجائے "ہمیں" لکھا ہے ۔

جوانی جس میں کھوئی ہے وہ گلیاں یاد آتی ہیں بڑی حسرت سے لب پر ذکر گورکھپور آتا ہے

فراق کو باوصف ریاضی سے خاص ربط و دردمانی تعلق کے یہ شعر صحیح یاد نہ رہ سکا۔ صفحہ ۳۶۶ پر اسے یوں لکھا ہے۔

وہ گلیاں یاد آتی ہیں جوانی جن میں کھوئی ہے بڑی حسرت سے لب پر ذکر گورکھپور رہتا ہے

لیجئے۔ فانی کی بھی شامت آگئی۔ ان کا مشہور شعر ہے

وحشت در سے پھر نکلے اپنے خدا سے پھر جانا دیوانے یہ ہوش نہیں یہ تو ہوش پرستی ہے

فراق نے صفحہ ۳۸۵ پر شعر کے دوسرے مصرعہ میں "ہوش پرستی" کے بجائے "جوش پرستی" لکھ دیا ہے۔ کاش یہ کتابت کی غلطی ہوتی مگر اتنی غلطیاں نکالنے کے بعد فراق کی طرف سے یہ خوش فہمی کسی طرح قائم نہیں ہوتی۔

آگے چلئے۔ صفحہ ۳۹۰ پر فانی کے اس شعر

کیوں سادگی میں طور کچھ اب بانکپن کے ہیں کل تک تو سادگی کی ادا بانکپن نہ تھی

کے پہلے مصرعہ کو فراق نے یوں درج کیا ہے

کل تک تو سادگی میں ادا بانکپن کی تھی

یعنی شعر کے دونوں مصرعوں کا مفہوم ایک ہی رہا۔

فانی کا مشہور مقطع ہے

چمن سے رخصت فانی قریب ہے شاید کہ اب کے بوئے کفن دامن بہار میں ہے

صفحہ ۳۹۱ پر اس کے دوسرے مصرعہ میں "کہ" کے بجائے "کچھ" کر دیا

کچھ اب کے بوئے کفن دامن بہار میں ہے

اور یہ غفلت اس وقت ہے جبکہ فراق اپنے مضمون کے آخر میں فانی کے ساتھ اپنی بے پناہ عقیدت کے انہماک میں بہ گئے ہیں۔

صفحہ ۳۹۹ پر بے نظیر شاہ وارثی کا مشہور شعر

وہ تری گلی کی قیامتیں کہ لحد سے مردے نکل پڑے یہ مری جبین نیاز تھی کہ جہاں دھری تھی دھری رہی

کس بری طرح مسخ کیا گیا ہے کہ مرثیہ پڑھنے کو جی چاہتا ہے

وہ تری گلی کی قیامتیں کہ لحد سے مُردے نکل گئے وہ مری جبین نیاز تھی کہ وہیں دھری کی دھری رہی

ایسے ہی موقع کے لئے کہا جاتا ہے کہ اہل زبان کا ایک حرف ہزار نشتروں پر بھاری ہوتا ہے۔ آخر "نکل گئے" کا یہاں کیا موقع ہے اور دوسرے مصرعہ میں ناروا تصرف کر کے اس شعر کی شعریت ہی غارت کر دی۔

صفحہ ۴۰۰ پر اصغر کے مشہور شعر پر چھری چلائی گئی ہے

عارض نازک پہ ان کے رنگ سا پھیلا گیا ان گلوں کو چھیڑ کر ہم نے گلستاں کر دیا

پہلے مصرعہ میں فراق نے "کچھ" کے بجائے "اک" کا لفظ رکھ دیا۔ آپ سے پہلے فانی کے ہاں "کہ" کی بجائے "کچھ" کر دیا تھا۔ مار دں گھٹنا پھوٹے "کچھ" غرض کوئی تک نہیں ہے۔ اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی۔

صفحہ ۴۱۷ پر غالب بیچارہ پھر ادب میں آگیا۔

ترے در سے اٹھا ہے اک قد آدم قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

فراق کو کون بتائے کہ پہلے مصرع میں "قدرعنا" نہیں "مرد قد" درست ہے۔ چین سے آخر قبر میں سوتے ہوئے ان بے زبانوں کا صبر سمیٹنے سے فراق کو کیا حاصل ہوگا؟

اچھا، یہ استاد ناسخ ہیں۔ مگر ان سے فراق کو کیا پرخاش تھی؟ مشہور مطلع ہے ؎

جنوں پسند مجھے چھاؤں ہے ببولوں کی عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی

ان اشعار میں سے ہے جنھوں نے بدنام ناسخ کو خشک اور بے رس شاعری کے بجائے ایک جاندار شاعری کی حیثیت سے زندہ رکھنے میں مدد دی ہے۔ مگر فراق نے صفحہ ۲۲۶ پر پہلے مصرع میں داخل در معقولات فرما کر یوں تبدیلی کر دی ع

جنوں پسند بھی کیا چھاؤں ہے ببولوں کی

حفیظ جونپوری کا مشہور دردناک مطلع بچپن سے یوں سنتے چلے آرہے ہیں اور شیخ عبدالقادر مرحوم کے مخزن میں بھی اسے یونہی چھپا دیکھا تھا ؎

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

فراق صفحہ ۲۲۶ پر اس کے پہلے مصرع میں "بیٹھ جاتا ہوں" کے بجائے "بیٹھ جاتے" لکھتے ہیں۔

صفحہ ۲۳۰ پر پیر حسرت کے مجروح ہونے کی باری آگئی۔ مطلع مشہور ہے ؎

ہم نے کس دن ترے کوچہ میں گزارا نہ کیا تو نے اے شوخ مگر کام ہمارا نہ کیا

مگر بد مذاقی کا برا ہو۔ فراق نے پہلا مصرع غارت کر کے رکھ دیا ع

میں نے کس دن ترے کوچہ سے گزارا نہ کیا

اسی صفحہ پر حسرت کے اور اشعار بھی غلط درج ہیں۔ "مجھ سے" کے بجائے "مجھے" اور "ہائے ری" کے بجائے "ہائے رے" وغیرہ کتاب کے دوسرے صفحات میں بھی بعض اشعار میں فاحش غلطیاں ہیں جنہیں دیکھ کر دل کڑھتا نہیں، خون ہوتا ہے۔ مگر ایسی تمام اغلاط جن پر کتابت کی غلطی ہونے کا قوی شبہ ہوا میں نے مضمون سے خارج کر دی ہیں۔

'غلط نامہ فراق گورکھپوری' کا ایک حصہ غلط حوالوں پر مشتمل ہونا چاہیے یعنی شعر کسی کا اور فراق نے منسوب کر دیا کسی اور سے۔ نقاد کو اس معاملے میں بہت محتاط ہونا چاہیے۔ اور حوالہ دینے سے قبل اچھی طرح اطمینان کر لینا چاہیے۔ ورنہ غیر ذمہ داری کا الزام اپنے سر لینے کے لئے تیار رہنا چاہیے۔ مثلاً "اردو کی عشقیہ شاعری" کے صفحہ ۹۳ پر یہ مشہور مطلع ؎

نہ ہم سمجھے نہ آپ آئے کہیں سے پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے

مجروح سے منسوب ہے۔ حالانکہ یہ شعر انور دہلوی کا ہے جو برادر خورد تھے ظہیر دہلوی کے۔ دونوں بھائی ذوق کے شاگرد تھے۔ انور نے ذوق کی وفات کے بعد اپنا کلام غالب کو بھی دکھایا تھا۔ ذوق کی شاگردی کے باوجود دونوں بھائیوں کے کلام میں رنگ مومن نمایاں ہے۔ انور اور ظہیر کو اس وجہ سے خصوصیت کے ساتھ یاد رکھنا چاہیے کہ دہلی اجڑنے کے بعد دونوں نے ٹونک اور جے پور میں اردو شاعری کا چراغ روشن کیا اور وہاں شعراء کی ایک جماعت پیدا کر دی۔

اسی طرح "اندازے" کے صفحہ ۳۶۳ پر یہ شعر ؎

دیکھا کئے وہ مست نگاہوں سے بار بار

جب تک شراب آئے کئی دور ہو گئے

حضرت ریاض خیرآبادی کے منتخب اشعار میں شامل کیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ حضرت شاد عظیم آبادی کی اس غزل کا شعر ہے جس کا مطلع مشہور ہے ؎

بدلی وہ وضع طور سے بے طور ہو گئے ... تم تو شباب آتے ہی کچھ اور ہو گئے!

اردو ادب پاکستان بننے کے بعد

ماہر القادری

یہ تقریر پروفیسر صاحبان اور اعلیٰ کلاسوں کے طلبا کی ایک بزم میں کی گئی تھی۔ جسے بعد میں اضافے کے ساتھ مرتب کر کے مضمون نگار نے حلقہ ادب اسلامی کراچی کے اجلاس میں پڑھ کر سنائی۔

میری تقریر کا موضوع ہے ——————

"اردو ادب، پاکستان بننے کے بعد"

یہ موضوع خاصہ جامع، بسیط اور وسیع الاطراف ہے، کسی ایک مختصر سی صحبت میں اس پر سیر حاصل گفتگو نہیں ہو سکتی۔ یہ اہل علم اور طالبانِ علم کا مجمع ہے۔ آپ حضرات اس موضوع کے بارے میں مجھ سے زیادہ باخبر ہیں، اس لئے میں صرف "اشارات" سے کام لوں گا کہ آپ کی ذہانت، اس اجمال سے خود تفصیل پیدا کر لے گی۔

"ادب" پر گفتگو کرنے سے پہلے "زبان" پر گفتگو کرنا ضروری ہے، کیونکہ "زبان" اولیت اور تقدیم کے اعتبار سے ادب پر فوقیت رکھتی ہے۔ زبان سے ادب پیدا ہوتا ہے، ادب سے زبان پیدا نہیں ہوتی۔ یوں سمجھئے کہ "زبان" کی حیثیت ایک تناور درخت کی سی ہے، اور ادب اس کے پھول پتے اور برگ و ثمر ہیں۔ زبان کے مسئلہ کو میں خاص طور پر اس لئے بھی چھیڑ رہا ہوں کہ بعض رسالوں اور اخباروں میں اس قسم کے مضامین میری نظر سے گزرے ہیں جن میں اس رجحان کو پیش کیا گیا ہے کہ پاکستان بننے کے بعد مختلف صوبوں اور خطوں کے لوگ چونکہ ایک جگہ جمع ہو گئے ہیں، اس سے پاکستان میں "اردو زبان" کو شاید کوئی نیا قالب اختیار کرنا پڑے گا۔

میں اس قیاس، اندیشہ اور خطرے کا شدید مخالف ہوں اور اس کی پرزور تردید کرتا ہوں۔ یہ "تردید" کسی جذباتی تحریک کا ردِ عمل یا صدائے بازگشت نہیں ہے، یہ ایک علمی بحث ہے جس کی پشت پر ٹھوس دلائل ہیں۔

اس بات کو سب لوگ جانتے ہیں کہ زبان، اسماء، افعال، مصادر اور حروف کا مجموعہ ہوتی ہے۔ زبان میں بنیادی حیثیت، افعال، مصادر اور حروف کو حاصل ہے یعنی زبان کا مستقل ڈھانچہ اس کے افعال، مصادر، حروف اور سابقے و لاحقے ہیں، جب کوئی "زبان" بن چکتی ہے، تو پھر اس میں ([illegible]) اسماء کی تو کمی بیشی اور الٹ پھیر ہوتی رہتی ہے مگر اس کی "گرامر" نہیں بدلتی۔ جو لوگ کسی زبان میں صرف چند "ناموں" کی درآمد کو دیکھ کر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ زبان بدل رہی ہے، ان کی یہ رائے درست نہیں ہے۔ وہ زبان کی "روح" اور اس کی ہیئت، اور ماہیت پر سطحی نظر رکھتے ہیں۔

اردو زبان کا یہ حال ہے کہ اس میں ہزاروں لفظ ہندی زبان کے ——— پانی، گوبھی، بیوپار ——— فارسی کے ——— زلف، خوش اندام، آگہی ——— عربی کے ——— حیرت، مع الخصوص، تصدیق و تصوّر ——— انگریزی کے ——— ٹرین، فرسٹ، ٹائم، ڈیوٹی ——— سنسکرت کے

ایجاد، تصویر، تصور، آداب جیسے بہت سے الفاظ ملتے ہیں۔ مگر سندھی کی اس بوقلمونی کے باوجود اردو گرامر میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ دوسری تبدیلیوں سے الفاظ کی حد تک زبان کی قواعد متاثر نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر انگریزی زبان کو لیجئے کہ اسے دنیا کی شاید نصف آبادی سمجھتی اور بولتی ہے اور دنیا کے کیسے کیسے خطوں تک پہنچی ہے اور اس میں دوسرے ملکوں کی زبانوں کے الفاظ کا بھی اضافہ ہوا ہے۔ مثلاً پاک و ہند میں خود انگریزوں کی تحریروں میں ـــــــ

دھوبی ـــ پلاؤ ـــ (سگے بھائی کے لئے) (Pakka Brother) تحصیلدار ـــ

دوتون گو ـــ پٹواری ـــ بنیا ـــ فرمان ـــ جاگیر ـــ زمیندار ـــ مولوی ـــ جیسے

الفاظ ملتے ہیں۔ مگر ان لفظوں کے شامل ہو جانے سے انگریزی زبان بدل نہیں گئی اور اس کی گرامر میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی

ایک زبان جب ترقی کے مختلف فطری مرحلوں سے گزرنے کے بعد بن چکتی ہے تو پھر اس کی بنیاد اور اصل پر کسی انقلاب اور تغیر کا کوئی اثر واقع نہیں ہوتا۔ زبان کا معاملہ بازار کے نرخوں جیسا نہیں ہے جو اترتے چڑھتے رہتے ہیں اور نہ اس کو سیاسی مسائل پر قیاس کرنا چاہیئے کہ جن میں آئے دن تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔

زبانیں خود رو پودوں کی طرح پیدا ہو کر پروان چڑھتی ہیں اور فطری ذرائع سے نمو پاتی ہیں۔ دنیا میں کسی زبان کو انسانوں کی کسی سیاسی دفتری یا قومی تحریک نے جنم نہیں دیا۔ ہاں جب زبان بن چکتی ہے تو پھر اس کی حفاظت، ترقی اور تہذیب و شائستگی کے لئے اکیڈمیاں اور انجمنیں وجود میں آتی ہیں۔ بلکہ بعض اوقات تحریکیں اٹھتی ہیں۔ اب سے تقریباً تیس سال قبل یورپ میں ایک بین الاقوامی زبان بنانے کی تحریک شروع ہوئی تھی۔ اس مصنوعی زبان کا نام "اسپرنٹو" رکھا گیا تھا۔ اس کی ترویج کے لئے لاکھوں روپے صرف کئے گئے۔ مگر چونکہ یہ غیر فطری اور مصنوعی زبان تھی۔ اس لئے کیمیاوی اجزا سے بنایا ہوا یہ طفل مصنوعی "عوں غاں" بھی نہ کہنے پایا تھا کہ ہمیشہ کے لئے موت کی نیند سو گیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا کی سب سے زیادہ مکمل زبان ہے۔ مگر اپنی وسعت، جامعیت، دلکشی اور گیرائی میں کسی زبان سے کمتر نہیں ہے۔ یہ زبان بڑی تیزی کے ساتھ ترقی کر کے اور فطری مراحل سے گذر کر "معیاری زبان" بن گئی۔ مرزا مظہر جان جاناں، ولی، آبرو اور حاتم کے دور تک اردو زبان تغیرات کو قبول کرتی نظر آتی ہے۔ مگر میر کے زمانہ سے لے کر اس زمانہ تک اردو پر "معیاری زبان" کا وہ دور گزرا ہے جس میں اس کی گرامر کو کوئی انقلاب چھو بھی نہیں سکا۔ مرزا غالب کے خطوط جن کو لکھے ہوئے پوری ایک صدی بیت چکی ہے، زبان کے اعتبار سے آج کی "معیاری زبان" کے عکاس، ترجمان بلکہ نمائندہ ہیں۔

پاکستان بننے کے بعد اردو زبان میں بے شک چند نئے ناموں کا اضافہ ہوا ہے اور ایسا ہونا چاہیئے تھا۔ عربی جیسی وسیع زبان نے جیسے "دار الشفاء" کہا جاتا ہے، فارسی زبان کے "بیمارستان" وغیرہ جیسے اسماء کو اپنے میں سمو لیا ہے، تو اردو زبان جو مدتوں سے سب زبانوں سے پیش پیش ہے۔ بعض "مقامی الفاظ" کو جو عوام کا روزمرہ بن چکے ہیں کس طرح رد کر دیتی۔

پاکستان بننے کے بعد اردو زبان میں ـــــ جگی، ہاری، وڈیرے، ریڑھی ...... جیسے الفاظ داخل ہوئے ہیں جن کا ہم کشادہ دلی کے ساتھ خیر مقدم کرتے ہیں۔ تحصیلدار کی جگہ ایک لفظ مختارکار زبانوں پر چڑھ گیا ہے اور یہ لفظ اپنے معنی اور روبست اور آہنگ کے اعتبار سے تحصیلدار سے زیادہ چست ہے

یہ الفاظ سب جو بہت سامنے کی بات ہے اور جسے ہر کوئی جانتا ہے مگر بعض وقت ایسا ہوتا ہے کہ معمولی سی بات کی خصوصیت اور اہمیت کو جب اجاگر کیا جاتا ہے تو لوگ چونکتے ہیں کہ ہیں اس طرف تو ہماری نگاہ ہی نہیں گئی۔

آپ نے ٹرام اور بسوں میں اکثر دیکھا اور سنا ہوگا کہ کنڈکٹر مسافروں سے "بچا" کہہ کر خطاب کرتے ہیں۔ تقسیم ہند سے قبل اس لفظ سے

یک سطر زدا بستہ تھی ————————

"میں تمہیں چچا بنا کے چھوڑوں گا"

تعظیم واحترام اور پیار محبت کے لئے "میاں —— بڑے میاں —— بھائی —— صاحب —— وغیرہ القاب بولے جاتے تھے —— اس لفظ —— چچا —— سے تہذیب وتمدن کی تاریخ وابستہ ہے آپ جانتے ہیں کہ ارض پاک وہند میں سندھ ہی وہ خوش قسمت خطہ ہے۔ جسے سب سے پہلے مسلمانوں کی قدمبوسی کا شرف حاصل ہوا۔ عرب میں تعظیم واحترام کے لئے "عمی" (میرے چچا) کہہ کر خطاب کیا جاتا ہے۔ سندھ نے اس تعظیمی لقب کو اپنایا۔ اور یہاں کی زبان میں یہ لفظ آج تک رائج ہے۔ ابھی یہ تعظیمی لقب بسوں کے کنڈکٹروں اور کوچوانوں تک محدود ہے، باہر سے آنے والے لکھے پڑھے لوگوں میں اس کا رواج نہیں ہو سکا۔

میں نے اب تک جو کچھ کہا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اردو معیاری زبان بن چکی ہے اور پاکستان بننے سے پہلے نظم وغزل اور افسانہ ومقالات میں اسی معیاری زبان کو استعمال کیا جاتا تھا اور پاکستان بننے کے بعد بھی اردو زبان پہلے ہی کی طرح اپنا فرض انجام دے رہی ہے اور اس کی ہیئت اور مزاج میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔

زبان پر گفتگو ہو چکی، بہت مجمل ومختصر، مگر میں جو کچھ کہنا چاہتا تھا، اُسے میں نے کہہ دیا۔ اب میں ادب کا سرسری جائزہ

اردو ادب

لینا چاہتا ہوں۔

آپ میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ پاکستان یونہی ہنستے کھیلتے نہیں بن گیا۔ اس کے لئے مسلمانوں کو آگ اور لہو کے خوفناک طوفانوں سے گزرنا پڑا ہے، کون کس سے اپنی بپتا بیان کرے اور کس کو اپنے دل کے زخم دکھائے۔ ہم سب بلاکش اور کشتگان تیغ ستم ہیں۔

پاکستان بننے کے بعد کم سے کم تین سال تک یہاں کے شاعر، افسانہ نگار اور ناول نویس نالہ وشیون اور آہ وفریاد ہی کرتے رہے۔ زخمی دلوں سے نغمے کہاں سے نکلتے اس لئے "کو فغاں آمیزی ہونا چاہئے تھا۔ یوں سمجھئے کہ یہ دور مرثیوں اور نوحوں کا تھا اور دل کی چوٹوں کو آواز اور الفاظ بن جانا پڑا اور خونچکاں زخموں نے "شعر وافسانہ" کی صورت اختیار کر لی ———— اسے "حزنیہ ادب" کہا جا سکتا ہے!

شیون وفریاد سے فرصت ملی تو یہاں پاکستان میں ادیبوں اور شاعروں کو انتشار اور پریشانی کے آثار نظر آئے ———— توقع کے بالکل خلاف ———— جن معاملات سے واسطہ پڑا۔ وہ بڑے ہی دلشکن اور افسوس ناک تھے ———— ملک کے نظم ونسق سے لیکر زندگی کے ایک ایک شعبہ میں ابتری۔ ملک کی سیاسی پارٹیوں نے اقتدار کے بل بوتے پر جو کھیل کھیلا ہے اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے دکھ ہوتا ہے۔ یہ حالات دیکھ کر پاکستان کے ادیبوں اور شاعروں نے یہاں کے ارباب اقتدار پر نہ صرف یہ کہ تنقید کی بلکہ انھیں نشانۂ ملامت بنایا پاکستان کے سارے پریس اور یہاں کی پوری پوری صحافت نے ان ایوان نشینوں پر ملامت کی اور ۱۹۵۸ء کے اس نویں مہینہ (ستمبر) تک یہ سلسلہ جاری ہے۔

پاکستان کے اہل قلم کو یہاں کے "بڑے آدمیوں" سے خدا واسطے کا کوئی بیر نہیں تھا اور نہ ملامت گری ان کا پیشہ ہے بلکہ شعراء تو ———— امیروں اور بادشاہوں کی ———— مدح قصیدہ خوانی کرتے رہے ہیں ———— مگر پاکستان میں سیاست دانوں کی تیشہ گری کو دیکھ کر شعراء ضبط نہ کر سکے اور انھوں نے جو دیکھا اور محسوس کیا سے شعر وادب کے قالب میں ڈھال دیا ———— اگر وہ ایسا نہ کرتے تو قومی مجرم قرار پاتے۔ شاعر سماج کے دل کی دھڑکنوں کا ترجمان ہوتا ہے۔ میں اس ادب کو "ملامتی ادب" کہتا ہوں۔

"حزنیہ ادب" اور "ملامتی ادب" کے بعد اردو غزل پر کچھ کہنا چاہتا ہوں "کچھ" اس لئے کہ اس مختصری فرصت میں "بہت" کے لئے

گنجائش نہیں نکل سکتی۔

کوئی شک نہیں کہ غزل کہنے والے شاعر سماج ہی میں جنم لیتے اور اسی کی گود میں پرورش پاتے ہیں، اور ان کے احساسات بھی دوسروں سے نازک تر ہوتے ہیں، مگر اس کو کیا کیجیے کہ غزل کا مزاج "نظم" سے مختلف واقع ہوا ہے! سماج اور سیاست کے مسائل غزل کا موضوع بن ہی نہیں سکتے۔ غزل میں ان مسائل کو سمونے کی کوشش کی جائے گی تو "غزل"، "غزل" ہی نہ رہے گی "نظم" بن جائے گی۔ غزل کا یہ مزاج غزل کی کمزوری پر ہرگز دلالت نہیں کرتا۔ کیا پھول کی ڈالی سے ہم تلوار کا کام لے سکتے ہیں۔ نہیں لے سکتے۔ پھول کی ڈالی اس کام کے لئے پیدا ہی نہیں ہوئی ——— تو "شاخ گل" میں "تیغ و خنجر" کا فریضہ ادا کرنے کی صلاحیت کا نہ پایا جانا، اس کی کمزوری کی دلیل نہیں ہے۔

افسوس ہے کہ "غزل" پر جن ناقدین نے بحث و گفتگو کی ہے ان میں سے اکثر غیر شاعر واقع ہوئے ہیں، اور ان کے دل و دماغ مغرب کی شاعری سے متاثر ہیں۔ اُنھوں نے انگریزی نظموں کو پڑھا ہے۔ یہاں غزل کی صنف سرے سے ناپید ہے۔ اس لئے وہ جب بھی کسی غزلگو شاعر کی شاعری پر قلم اٹھاتے ہیں تو "سماج" کے مسائل اُن کے سامنے آجاتے ہیں اور "غزل" کے ساتھ یہ ظلم کرتے ہیں کہ پھول کی ان نازک پتیوں کو سماج اور سیاست کے خارزار میں الجھا دیتے ہیں۔

آپ فارسی کی تمام غزلیہ شاعری کو پڑھ جائیے، آپ کو "سماج" اور "سیاست" کہیں نہیں ملے گی۔ سعدی کے زمانے میں عباسی حکومت کی اینٹ سے اینٹ بج جاتی ہے، سعدی اس اندوہناک حادثہ سے متاثر ہو کر چیخ اٹھتے ہیں۔

آسمان را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں
بر زوال ملک مستعصم امیر المومنیں

مگر سعدی کی غزلوں میں اس انقلاب کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ ایران کے دوسرے غزل گو شعرا کے دور میں بھی حکومتوں میں انقلاب آئے ہیں۔ ان کے یہاں بھی سیاسی اور معاشرتی مسائل موجود تھے لیکن ان کی غزلیں ان مسائل کی ترجمانی نہیں کرتیں۔ غالب کی فارسی اور اردو غزلیں پڑھ کر کسی کو اس کا احساس تک نہیں ہو سکتا کہ غالب کے دور میں ہندوستان کا خونیں حادثہ بھی رونما ہوا تھا اور ہندوستان کے مسلمانوں پر بہت بڑی تباہی آئی تھی۔

بات یہ ہے کہ غزل کا موضوع "حسن و عشق" ہے، اور "حسن و عشق" کے جذبات سدا یکساں رہتے ہیں۔ آج سے ہزاروں سال قبل جس طرح کوئی شخص وصل سے شاد اور ہجر سے ناشاد ہوتا تھا، اسی طرح آج کا متمدن انسان بھی وصل و ہجر سے متاثر ہوتا ہے۔ انسانی جذبات کبھی پرانے نہیں ہوتے، ہر آدمی "وصل تازہ" اور "ہجر نو" یا یوں کہیے کہ "نئی خوشی" اور "نیا غم" رکھتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ غزل کے مضامین ہر دور میں نئے اور تازہ محسوس ہوتے ہیں۔

ایں شرابے است کہ ہم پختہ و ہم خام خوش است

پاکستان بننے کے بعد یہاں غزل میں جو رخنہ پیدا ہوا ہے وہ کہیں کہیں اس انقلاب کی جھلک بھی مل جاتی ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ تقسیم ہند سے قبل غزل گو شاعروں کا جو آہنگ تھا، وہ پاکستان بننے کے بعد بھی باقی ہے، یہ سلسلہ ٹوٹ نہیں سکا۔

اسلامی ادب

پاکستان بننے کے بعد یہاں اسلامی تحریک کے ساتھ "اسلامی ادب" کی تحریک بھی ہوئی ہے۔ اس ادب کو ہم تعمیری ادب اور مقصدی ادب بھی کہہ سکتے ہیں۔ اسلام پسند شاعروں اور ادیبوں نے بھی تحریروں میں

---

[1] حلقہ ادب اسلامی کراچی میں اس مقالہ پر جب تنقید ہوئی تو ایک صاحب نے فرمایا کہ اسرار الحق ... کا ذکر بھی ضرور آنا چاہیے تھا ——— اور مقالہ نگار نے اس اعتراض کو تسلیم کرلیا۔

اس مقصد کی ترجمانی کی ہے جس نے پاکستان کو وجود بخشا ہے۔ یوں سمجھئے کہ "اسلامی ادب" پاکستان کے مقصد وجود کا منطقی اور ناگزیر تقاضا ہے۔ شروع شروع میں ادب اسلامی کا نام سن کر بعض پیشانیوں پر شکنیں اور بعض ہونٹوں پر مسکراہٹیں ابھر آتی تھیں۔ مگر بہ تدریج اور منظم طریقہ سے یہ دھندلکا چھٹتا چلا جا رہا ہے اور اس کے سخت سے سخت حریف بھی "اسلامی ادب" کے بارے میں سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے پر مجبور ہیں۔

آپ جانتے ہیں کہ ہوا و ہوس کی اس دنیا میں نیکی اور بھلائی کو پروان چڑھنے میں بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں اور جاہلیت کے حملوں کے ذیل لوگ اس کاوش اور دلی کے ساتھ خیر مقدم نہیں کرتے۔ لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ بازار سے ترکاری اچھی طرح دیکھ بھال کر مول لیتے ہیں۔ گلی سڑی ترکاری کو کوئی اپنے گھر میں آنے نہیں دیتا۔ مگر لٹریچر کے معاملہ میں ہمارے عوام و خواص اس کی پروا نہیں کرتے کہ گوشت ترکاری اور آٹے کی طرح کتابیں بھی اچھی بری، ناقص، صحیح اور مضر و مفید ہوتی ہیں۔ جس طرح ناقص چیزوں کے استعمال سے جسمانی صحت کو نقصان پہنچتا ہے اسی طرح خراب لٹریچر سے سیرت و کردار کی صحت متاثر ہوتی ہے!

پاکستان میں ادب اسلامی کی تحریک مارکیٹ میں ایسی کتابیں لانا چاہتی ہے جسے قوم کے لڑکے اور لڑکیاں کسی جھجک کے بغیر خلوت و جلوت میں پڑھ سکیں۔ اور یہ کتابیں ان کی تنہائیوں کو نیکی کی روشنی دے سکیں۔ اللہ کے فضل سے یہ کوشش صرف "سوچا ہے" تک محدود نہیں رہی، عملی طور پر بھی اس کا آغاز ہو چکا ہے۔

اسلام پسند اہل قلم اس اندھیرے میں اپنے خون جگر سے جن چراغوں کو روشن کر چکے ہیں، وہ زیادہ دیر تک "تہ داماں" نہ رہ سکیں گے۔ یہ اجالا پھیلتا ہی چلا جائے گا تاکہ اللہ کی زمین اس کے نور سے جگمگا اٹھے!۔ (۲۹ ستمبر سنہ ۵۵ء حلقہ ادب اسلامی کراچی میں پڑھا گیا)

فاران کے خلافت نمبر

کی

اشاعت سرِدست ملتوی کردی گئی ہے

مینجر

نذرِ عقیدت

مظہر جلیل شوق

صلی علیٰ ضیاء رُخ پاک ہاشمی — زلفوں کی دلکشی نازپرورہ شان ہر بھی
انوارِ جسمِ پاک ۔ وہ فی البیت الحرام — گلزار دیں پہ شبنم شادابی کی نمی
آنکھوں سے نور دل میں اترتا چلا گیا — جس کی نگاہ ہوئے پُر انوار پر جمی
وہ کشت لہلہاتی ہوئی ذات پاک تھی — بارش جہاں سحابِ نبوت کی آ تھمی
اے رحمتِ تمام تمنائے دید ہے — مقبول کاش چشم عقیدت کی ہو نمی
اللہ وہ دنیٰ فتدلّیٰ کا مرتبہ — واللہ یہ سعادت عظمیٰ و اعظمی
موسیٰ زہوش رفت بہ یک جلوۂ صفات — تو عین ذات می نگری در تبسمی

ہے منتظر لقائے مبارک کی کب سے شوقؔ
یہ جان مضطرب جو لبوں پر ہے آ تھمی

ماہر القادری

طاقتِ پرواز میں جذبِ یقیں سے کام لے — ماہ و انجم سے گذر عرشِ بریں کو تھام لے
ہم نشیں آ مل کے گائیں نغمۂ دل کے ساز پر — میں کروں ذکر محمدؐ تو خدا کا نام لے

قرآن

عاصی کرنالی

دوستو اس دورِ ظلمت کا تصور کیجئے
جب شعورِ آدمیت تھا حجاب اندر حجاب

جب نجوم و کہکشاں کا رخ تھا کجلایا ہوا
جب غبار آلودہ تھی پیشانیٔ سرخ و گلاب

زندگی کی چال پر ہنستے تھے جب لب ہائے برق
آدمی کے حال پر روتی تھی جب چشمِ سحاب

زندگی تھی نشہ خیز و نشہ بیز و نشہ ریز
آدمی تھا محوِ عشرت، محوِ غفلت، محوِ خواب

کس قدر گم کردہ منزل تھا بشر کا قافلہ
یا خمِ زلفِ صنم یا نغمۂ تارِ رباب

اس قدر اُمڈا ہوا، بپھرا ہو سیلابِ نفس
روح کی بستی اجاڑ اور قلب کا خانہ خراب

کیا تمنا کیا تجسس، کیا نظر، کیا آگہی
فطرتِ انساں کا ایک اک جلوہ تھا زیرِ نقاب

آدمی توحید کے احساس سے بیگانہ تھا
اس کے سینے میں نہ تھی یہ آرزوئے سینہ تاب

دفعتاً ظاہر ہوا توحیدِ باری کا جمال
دستِ رحمت نے ہٹایا پردۂ حسنِ غیاب

آدمی کو دیکھ کر جہلِ مرکب میں اسیر
حق کی جانب سے اُسے بخشی گئی ام الکتاب

وہ چراغِ راہ، وہ شمعِ ہدیٰ، وہ نجمِ نور
قلبِ یزداں کی تجلی، روحِ انساں کا شباب

جو نگاہوں میں اتر جائے وہ مہتابِ خنک
سینہ و دل میں در آئے وہ شعاعِ آفتاب

مردہ دل انسانیت کے واسطے پیغامِ "قم"
اور جمود ستانِ عالم میں صدائے انقلاب

جس نے روشن کر دیئے راہِ صداقت کے خطوط
جس نے آدم کو کیا اُس کے خدا تک باریاب

آفریں ان پر جو اس کے نور سے ہیں مستنیر
مرحبا اُن پر جو اُس کے فیض سے ہیں فیضیاب

یہ کتابِ پاک اک آئینۂ کردار ہے
مومنوں کے ہاتھ میں اللہ کی تلوار ہے

میرے لئے ہے
عارف سیالکوٹی

برسات کی گھنگھور گھٹا میرے لئے ہے
کوئل کی جگر سوز صدا میرے لئے ہے

کلیوں کی نظر تاب ادا میرے لئے ہے
پھولوں کی شفق رنگ قبا میرے لئے ہے

ڈوبی ہوئی مستی میں ہوا میرے لئے ہے
مہکی ہوئی خوشبو میں فضا میرے لئے ہے

ہر برگ شجر میرے لئے ساز سراپا
ہر مرغ چمن نغمہ سرا میرے لئے ہے

ہر شام اٹھتی ہے نقاب رخ زہرہ
ہر صبح شفق جلوہ نما میرے لئے ہے

ہے دن کو درخشانی خورشید منور
شب کو مہ و انجم کی ضیا میرے لئے ہے

یہ چاند، یہ مریخ، یہ سورج، یہ عطارد
یہ ارض و سماں اور یہ خلا میرے لئے ہے

دُنیا میں بھی ہر سمت مری دھوم مچی ہے
جنت میں بھی اک شور بپا میرے لئے ہے

میں اشرف مخلوق ہوں میں نائب خالق
ہر شے زمیں تا بہ سما میرے لئے ہے

ہو جاؤں اگر وقف خدا کے لئے عارف
پھر یہ بھی کہوں گا کہ خدا میرے لئے ہے

خیابانِ تغزل
خلیل رامپوری

جس دور میں زمانے سے ہم آشنا
ہے ستاروں کی گردش بھی کم آشنا

یہ چھلکتا ہوا جام کیا چیز ہے
ہے ہماری نظر جام جم آشنا

تیری رفتار میں دلکشی وہ نہیں
جسکی لذت سے ہیں صرف ہم آشنا

میری نظروں میں ایسے مقامات ہیں
جن سے اہل نظر بھی ہیں کم آشنا

ایک نئی روح تخلیق کرتا ہوں میں
میرے فن سے ہیں اہل قلم آشنا

غزل
جُرم محمد آبادی

محبت کا بھلا ہو ان کے در تک لے گئی ورنہ
ٹھکانہ تھا کہاں ہم بے ٹھکانوں کا زمانے میں

عجب کیا ہے کبھی ہم سوختہ ساماں یاد آئیں
کوئی پہلو بنانے کا بھی رکھ لینا مٹانے میں

زمانہ ہو گیا لے جرم اس طوفان کو گزرے
جوانی پھر بھی باقی ہے محبت کے فسانے میں

غزل
ہاشمی فتحپوری

اپنوں ہی میں جب وفا نہیں ہے
غیروں سے کوئی گلا نہیں ہے

منجدھار میں کر خدا پہ تکیہ
اب حاجتِ ناخدا نہیں ہے

ٹوٹا ہوا سازِ دل ہے لیکن
یہ ساز بھی بے صدا نہیں ہے

جب کبھی وہ مجھے ناگہاں مل گیا
میں یہ سمجھا کہ سارا جہاں مل گیا

زندگی کی حقیقت تو کچھ بھی نہیں
کیوں بشر کو غم دو جہاں مل گیا

ہم اسیر قفس ہیں اسیر بلا
آج صیاد سے باغباں مل گیا

یہ بھی اچھا ہوا تیرگی مٹ گئی
بجلیوں کو مرا آشیاں مل گیا

دل تو کیا جان پہ بن جائے تو کچھ ہوش نہیں
نشۂ عشق ہے یہ بادۂ سرجوش نہیں

اُن کی مخمور نگاہوں کی تجلی توبہ!
ذرہ ذرہ یہ پکارا کہ مجھے ہوش نہیں

ہوش اتنا ہے ترا نام لیے جاتا ہوں
بیخودی یہ ہے کہ اپنا بھی مجھے ہوش نہیں

غزل
دل تاج محلی

بیاباں سے جتنے پیام آ رہے ہیں
وہ شاید ہمارے ہی نام آ رہے ہیں

اُدھر فصل گل کے پیام آ رہے ہیں
اِدھر بجلیوں کے سلام آ رہے ہیں

رہ خلد بھی راہ محبوب نکلی
جہاں بھی گئے سب مقام آ رہے ہیں

بہکتے ہوئے لڑکھڑاتے ہوئے سے
یہ کیا شیخ عالی مقام آ رہے ہیں

نہ قدموں کی آہٹ نہ آنکھوں کی گردش
نہ تم آ رہے ہو نہ جام آ رہے ہیں

غزل
مخمور سعیدی

شراب و شیشہ و ساغر نہ جام و پیمانہ
تری نگاہ ہے ساقی تمام میخانہ

نہیں ہے نازِ محبت کہ تیرا دیوانہ
ترے حریف سبق گر رہے بے نیازانہ

فضائے دیدہ و دل زرد ہوں دھواں مخمور
بجھی بجھی نظر آتی ہے شمع میخانہ

روحِ انتخاب

حقیقت یہ ہے کہ جب تک خصوصیات اسلام اجتہاد کی متقاضی ہیں، دُنیا کی کوئی طاقت بھی اجتہاد کا دروازہ بند نہیں کر سکتی اور اس پر پہرے بٹھا سکتی ہے، یہی وجہ ہے کہ مذاہب اربعہ کے ارباب تقلید میں سے روشن خیال متاخرین نے اپنی کتابوں میں تصریح کی ہے:

"اگر آج بھی کوئی شخص علم کی فراوانی و وسعت کے باعث رتبہ اجتہاد تک پہنچ جائے اور اس کی تمام شرائط اور اہلیتوں پر پورا اترے، تو اس کے لئے مروجہ مذاہب میں سے کسی مذہب کی تقلید جائز نہیں۔"

لیکن عملی طور پر وہ کسی کے لئے اس مرتبہ پر پہنچنے کو تسلیم نہیں کرتے، بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ ــــــ ان کے نزدیک اجتہاد کا دروازہ کھلنا ممکن تو ہے مگر اس کی کنجی (کسی کے پاس) نہیں ہے۔

علامہ عز الدین عبد السلام جو ساتویں صدی ہجری کے نامور شافعی فقہاء میں سے ہیں ایک ممتاز شخصیت کے مالک ہیں، اجتہاد کا دروازہ بند کرنے کے حق میں علماء کے مختلف اقوال ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:-

"یہ تمام اقوال بے بنیاد اور باطل ہیں۔ اگر آج بھی کوئی ایسا واقعہ پیش آجائے، جس میں کوئی نص نہ ملے یا اس میں سلف صالحین کے درمیان اختلاف ہو تو اس لازمی طور پر کتاب و سنت کی نصوص میں اجتہاد کے ذریعہ ہی حل کیا جائے گا۔ اس صحت سے صرف وہی شخص انکار کر سکتا ہے جو ہذیان کے عارضہ میں مبتلا ہے۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ انفرادی اجتہاد زمانہ ماضی کی ایک ضرورت تھی مگر آج وہ ضرر عظیم اور خطرہ جسیم ہے کیونکہ وہ مفاسد جو کل محض اندیشے تھے جن کے پیش نظر فقہاء مذہب نے چوتھی صدی ہجری میں اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا تھا، آج حقیقت ثابتہ بن گئے ہیں۔ آج دین کو فروخت کرنے والے ایسے سوداگروں کی کثرت ہے، اور وہ بھی حق گو علماء کی نسبت زیادہ تیز و طرار اور چالاک ہیں۔ آج جامعہ ازہر کے بعض فیض یافتہ ایسے بھی ہیں جنھوں نے ایسی پر از فریب تاویلیں لکھی ہیں، اور ایسے تدلیس و تلبیس سے بھرپور فتاوے تصنیف کئے جن کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مصنفین نے اسلام کی بنیادیں اکھیڑنے کے لئے دشمنان اسلام کے ہاتھوں میں ایسے ہتھیار دیدیے ہیں جن کے بغیر وہ نقصان پہنچانے سے سراسر عاجز تھے۔ یہ لوگ یا تو اسلام سے خارج ہیں، یا اجتہاد اور حریت فکر کے پردے میں شکار کھیلنے والے خائن و منافق ہیں۔

پس اگر ہم شریعت اور فقہ اسلامی کی روح (اجتہاد) واپس لانا چاہتے ہیں اور اس کا پوری قوم میں جاری رہنا شرعاً واجب سمجھتے ہیں تاکہ وہ زمانہ کی بدلتی ہوئی مشکلات کے لئے شرعی حل پیش کر سکے جن میں خیال کی گہرائی اور دلیل کی پختگی ہو، جو ہر قسم کے شکوک و شبہات سے دور ہوں، اور ہمارے نزدیک وقت تقلید جامد اور حق کو انکار کرنے والی بیماریوں کی سرکوبی کی پوری پوری صلاحیت رکھتے ہوں تو اس کا واحد ذریعہ ہے کہ ہم اجتہاد کی نئے سرے سے ایک جماعت سے تشکیل کریں اور اسے فرد کے ہاتھ سے نکال کر جماعت کے ہاتھ میں دے دیں، اس طرح ہم اسے حضرت ابوبکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے زمانہ کی سی پہلی حالت پر واپس لا سکتے ہیں۔

(ڈاکٹر مصطفیٰ احمد زرقا ـــ پروفیسر سابق قانون شام یونیورسٹی)

قلم کی کہانی اُسی کی زبانی

ماہر القادری

مجھے لوگ فاؤنٹین پین کہتے ہیں، میری جنم بھومی انگلستان ہے مگر میں جانوروں اور انسانوں کی طرح پیدا نہیں ہوا بلکہ بنایا گیا ہوں، اس لئے میرا کوئی نسب نامہ نہیں ہے پس نہ تو میں کسی کا نورِ نظر ہوں، اور نہ میرا کوئی لختِ جگر ہے فولاد اور پلاسٹک ان دو چیزوں سے میں بنا ہوں، میرے بنانے والوں کا مجھ پر کوئی احسان نہیں ہے، انہوں نے مجھے نفع کمانے کے لئے بنایا ہے، اس دُنیا میں انسان اپنے فائدہ کے بغیر ایک تنکا بھی نہیں توڑتا۔ میرا وجود انسان کی غرض دوستی اور نفع اندوزی کا بولتا ہوا ثبوت ہے۔

میں یوں ہی ہنستے کھیلتے نہیں بن گیا ہوں، آگ، دھوئیں، بجلی اور بھاپ کی سخت منزلوں سے گزرنا پڑا ہے مجھ پر کیسی کیسی چوٹیں پڑی ہیں، اور کس کس طرح سے مجھے تپایا گیا ہے جب میں بن چکا تو میری پیشانی داغ کر کارخانہ کا نام "انگلینڈ" کندہ کر دیا گیا، پھر مجھے ایک خوبصورت سے کیس میں بند کیا گیا قفس پھر قفس ہے، چاہے وہ کتنا ہی خوشنما کیوں نہ ہو۔

میں ان جیسا نہیں ہوں جو شیخی بگھارتے اور دوسروں کی لیتے ہیں، اپنا قدر خود شناس ہوں اپنی قدر و قیمت اچھی طرح پہچانتا ہوں "میری اصل قیمت ایک پونڈ اور کچھ شلنگ ہے فیکٹری کے رجسٹر اس کے گواہ ہیں کہ مجھ پر اس سے زیادہ لاگت نہیں آئی مگر جب میں انگلستان سے چل کر دوسرے ملک میں پہنچا ہوں تو وہاں پہنچتے پہنچتے میری قیمت دوگنی سے بھی زیادہ ہو گئی، کیوں؟ یہ نہ پوچھئے یہ بڑی پیچیدہ اور طویل داستان ہے، لیکن جب ذکر چھڑ گیا ہے تو کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی پڑے گا بات یہ ہے کہ انسانوں کے ہاتھوں کی الٹ پھیر سے چیزوں کے دام بڑھتے رہتے ہیں، جو چیز اس دنیا میں جتنے زیادہ واسطوں سے پہنچتی ہے، اتنی ہی اس کی قیمت بڑھ جاتی ہے، ہر ہاتھ دوسرے ہاتھ میں کوئی چیز تھماتے وقت منافع چاہتا ہے، روپیہ پیسہ نہ ہو تو کم سے کم "شکریہ" کے الفاظ ہی سہی!

ہاں، تو انگلستان کی فیکٹری سے چل کر میں دوسرے ملک میں پہنچا، وہاں ایک تھوک فروش کے گودام میں چند دن رہا، اور پھر شہر کے سب سے بڑے بازار کی ایک پُر رونق دکان کے شوکیس میں مجھے رکھ دیا گیا — نمائش کے لئے نہیں بیچنے کے لئے! "بکاؤ مال" شعر و ادب کی زبان میں ایک "جنس" ہے اور میں اس طرز کا صحیح مصداق تھا!

کئی دن تک گاہک مجھے الٹ پلٹ کر بلکہ گھور گھور کر دیکھتے رہے، ڈرائیوروں کی کرخت انگلیوں سے لے کر کنواری لڑکیوں کے نرم و نازک پوروں تک کا مس مجھے نصیب ہوا مگر میری تقدیر میں اتنی جلدی بک جانا نہ لکھا تھا کئی بار گاہکوں سے معاملے ہوتے ہوتے رہ گیا۔

ایک دن ایسا ہوا کہ شاپ میں جو شخص شام کو اکاؤنٹ لکھنے کے لئے آیا کرتا تھا، وہ اپنا قلم بھول آیا، شاپ کے مالک نے مجھے کیس سے نکال کر اس کے حوالے کر دیا، اس کلرک نے تین چار دن مجھے استعمال کیا تھا، بڑا اچھا خط تھا اس بنگالی بابو کا، وہ کاغذ پر حرف کیا لکھتا تھا موتی سے جڑتا تھا۔ ان دنوں کی ایک بات مجھے یاد رہ گئی ہے، کہ ایک لمبے چوڑے کاغذ کو پڑھ کر شاپ کا مالک جھنجھلا کر بولا۔

"یہ تم نے کیسا حساب بنایا ہے اگر انکم ٹیکس پر یہ حساب پیش کر دیا جاتا تو انکم ٹیکس کے مارے میرا تو دیوالہ نکل جائے گا یہ ایمانداری کا زمانہ نہیں ہے بابو صاحب، یہاں سچ بول کر آدمی کو دو وقت روٹی ٹھکانے سے نہیں مل سکتی!"

بس پھر دوسرے دن اسی بابو نے میری ہی نوک زبان سے حساب میں رد و بدل کی ساہوکار اور دستاویز الٹ کر رکھ دیئے، اگر وہ ایسا نہ کرتا تو نوکری سے ہاتھ دھونے پڑتے۔ پھر چوتھے دن مجھے صاف کر کے اسی شوکیس میں رکھ دیا گیا۔

اس واقعہ کے چند دن بعد ایک ادھیڑ عمر کا آدمی شاپ میں آیا میرے بھائی بند دو چار قلموں کے بعد اس نے مجھے دیکھا اور شاپ والے سے قیمت پوچھی، اودھر سے قیمت بتائی گئی ادھر فوراً پاکٹ سے نوٹ برآمد ہوئے، بھاؤ تاؤ کے لئے ذرا سی بھی حجت نہیں کی گئی، تیسرے دن پتہ چلا کہ مجھے شہر کے ایک سرمایہ دار نے خریدا ہے، اور کالج کے ایک تقریری مقابلہ میں مجھے بطور انعام دیا جائے گا۔ یہ دن بھی آ ہی گیا ایک خوبصورت اور ذہین لڑکی اس انعام کی مستحق قرار پائی، اور کالج کے پرنسپل نے جب مجھے اس لڑکی کو دیا ہے تو اس کی خوشی کے مارے باچھیں کھلی جاتی تھیں۔

اس لڑکی نے اپنے گھر آ کر پہلا کام یہ کیا کہ میز کی دراز سے خط لکھنے کا کاغذ نکالا، اور مجھے اس پر رواں کر دیا، میں تو ہر کسی کے ہاتھ میں آ کر اسی کا کار ہو جاتا ہوں، گالیاں ہوں یا دعائیں، میں سب کچھ لکھ دیتا ہوں! ہاں! تو اسی لڑکی نے مجھ سے لکھوایا۔

"ڈیر حسن! خوش خبری جانفزا مژدہ .... سنو! میں نے ابنی امی جان کو راضی کر لیا ہے، میں کل پکنک میں آ سکوں گی ....."

دن گنے جاتے تھے اس دن کے لئے!

اسی لڑکی نے ایک دن کالج کی کاپی سے ایک پرچہ پر یہ شعر لکھا:۔

جو تمہاری طرح تم سے کوئی جھوٹے وعدے کرتا
تمہیں منصفی سے کہہ دو تمہیں اعتبار ہوتا

اور اس پرچہ کی ملائم سی گولی بنا کر ایک نوجوان پر جو کروٹن کے گملوں کے پاس کھڑا ہوا تھا پھینک دی۔

میں کوئی چھ سات مہینہ تک اسی قسم کے جذبات کی ترجمانی کرتا رہا، پھر اس لڑکی نے اپنے ایک دوست کو مجھے تحفہ میں دیدیا۔ وہ نوجوان سالانہ امتحان میں ایک کتاب سے نقل کرتا پکڑا گیا، کتاب اور کاپی کے ساتھ مجھ غریب کو بھی امتحان گاہ کے نگراں نے اپنے قبضہ میں کر لیا، نہ جانے اس طالب علم کا کیا حشر ہوا مگر مجھ پر یہ بیتی کہ وہ نگراں صاحب ایک دن اپنے کوٹ کی جیب میں مجھے لگائے ہوئے موٹر بس سے اتر رہے تھے، بس کے دروازے پر مسافروں کی بھیڑ تھی "اس کشمکش میں ان کی جیب سے گر گیا۔ ——— اور مجھے ایک فال دیکھنے والے نے اٹھا لیا، جو لوگوں کے ہاتھ دیکھ کر ان کی زندگیوں کے پچھلے اور آنے والے واقعات بتایا کرتا تھا ——— اس شخص کے پاس میں بڑے آرام سے رہا یہ اپنے گاہکوں کو زیادہ تر چٹپٹی دار باتوں ہی سے مطمئن کر دیتا تھا ——— لکھنے لکھانے کی شاذو نادر ہی نوبت آتی تھی ——— شہر کے ایک سیٹھ کے لئے اس نے ایک دن سب سے زیادہ لمبی عبارت لکھ کر دی، اس نے لکھا۔

"آپ کی عمر سو سال سے بھی اوپر ہوگی۔ آپ کو پچھم سے آئے ہوئے ایک بیوپاری سے کاروبار کر کے بہت فائدہ ہوگا
دس سال کے بعد ایک بیماری ہوگی۔ مگر پلاؤ کی دس دیگیں پکا کر فقیروں کو کھلا دینے سے یہ بیماری فوراً ٹل جائے گی۔
آپ کے دوستوں اور جلنے والوں کی ہے۔ آپ کے دو دشمن ہیں، ان سے بچے رہیئے۔ قدرت کی مدد آپ کے ساتھ ہے۔ دشمن
کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ آپ کی بائیں ران پر تل ہے .... اور ایک ایسی خوبصورت عورت آپ سے
محبت کرتی ہے، جسے آپ نہیں جانتے۔ آپکے ہاتھ کی سب سے بڑی لکیر آگے جا کر کٹ نہ جاتی تو آپ کسی ریاست کے حاکم ہوتے"

ایک دن ——— یہی شخص ——— اپنی جیب میں مجھے لگائے ہوئے بازی گر کا ——— تماشا دیکھ رہا تھا بہت بھیڑ تھی بازی گر نے ایک تاڑی پر اپنی بانسری کو پھیرایا اور تالیاں بجاتے ہوئے بولا۔

"سب لوگ دو دو قدم پیچھے ہٹ جائیں، بڑی بھیڑ ہو گئی ..."

ہٹتے وہ بیٹھے ہوئے لوگ پیچھے کو ہٹنے لگے۔ اس کشمکش میں اس لڑکے کی جیب سے ایک شخص نے مجھے اس پھرتی کے ساتھ نکالا کہ میں اگر بول سکتا تو

چور کا حال سو میرا حال، گنڈیریاں تین پیسہ کی پنڈ کھوڑے ایک آنہ کے۔ نجو (منشی جی کے لڑکے کا نام) کی ماں کیلئے ایک شال مول لیا، قیمت سات آنہ دو پیسے، مرغیوں کے لئے بازار سے لنگی لایا، چھ آنہ کی! ڈربہ صاف کرنے میں سر کنڈا لگا جس سے خون نکل آیا، کچھ پرواہ نہیں، مسلمان ہو کے کہیں ڈرا کرتا ہے —— میونسپلٹی کے جمعدار نے دکان کا رستہ کی طرف لگانے پر بہت برا کہا، میں نے چپ سادھ لی، کچھ کہتا تو تحفہ کی خیر نہ تھی!

دھوبی کی دھلائی ہوئی ایک روپیہ تین آنہ —— سالا! ایک بار پھر میری کمیز (قمیص) چھوڑ آیا، رات کو قاضی جی کے یہاں پیر صاحب کی نیاز (ریاض) کا کھانا کھایا کھانا اتارنے والے نے اوروں کو سروے (شوربہ) کا تار دیا اور مجھے تلچھٹ بغیر دیکھا جائے گا، اللہ نے چاہا تو ایسا بدلہ لوں گا کہ اسے چھٹی کا دودھ یاد آجائے۔

نجو کی ماں کا آج مجاز نہیں ملتا، کہتی ہے کہ ایک میٹھی عید پر نیا جوڑا پہنوں گی، شمع کا منہ بھر کے بھیجا ہے۔ اگر اللہ نے چاہا معمہ ٹھیک نکل آیا تو ایک جوڑا کیا دس جوڑے بنادوں گا۔ ملاں جی نے دو روپیہ کا پکا تاویز (تعویذ) دیا ہے کہ مرتے دم تک اسے بدن سے جدا نہ کرنا۔ اللہ کا کلام اپنا اثر دکھا کر رہے گا —— پیٹ میں کچھ گڑبڑ ہو رہی ہے، پانی کا لوٹا لیکر پھر جنگل جانا پڑے گا ......!

اب میں اپنی رام کہانی ختم کرتا ہوں، دیکھئے کب تک ان منشی جی کا ساتھ رہتا ہے، اچھا رخصت، سلام، خدا حافظ، اس دعا کے ساتھ کہ —— ——

"جیسی مجھ پہ بپتا پڑی ہے، ایسی بپتا اللہ کسی پر نہ ڈالے ......"

حسین کاظمی (علیگ)
(متعلم)

گرداب

صادق ھدایت کے افسانے کا
فارسی سے براہِ راست ترجمہ۔

ہمایوں از خود باتیں کرنے لگا۔

"کیا یہ سچ ہے؟ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ کیا اکڑیل جوان اور شاہ عبدالعظیم میں ہزاروں مُردوں کے بیچ، سرد اور گیلی مٹی میں سویا ہوا ہے ...... آہ! اس کے بدن سے چپکا ہوا کفن، اب تو نہ وہ آتی بہار دیکھے گا اور نہ جاتی خزاں اور نہ آج کا سا منحوس اور غمگین دن کیا اس کی آنکھوں کی چمک اور آواز کا ترنم بالکل جاتا رہا .... وہ جو کہ اتنا ہنس مکھ تھا اور اتنی پیاری پیاری باتیں کیا کرتا تھا....؛

بادل چھائے ہوئے تھے۔ دریچے کے شیشے دھندلے ہو رہے تھے اور شیشوں کے اس طرف پڑوسی کے گھر کا سائبان جس پر برف کی ایک ہلکی سی تہ جمی ہوئی تھی، نظر آتا تھا۔ برف کے پھاہے آسمان سے آہستہ آہستہ گر رہے تھے اور سائبان پر جمتے جاتے تھے سائبان کے اوپر دھوئیں کی چمنی تھی جس سے سیاہ دھواں لہراتا ہوا نکل رہا تھا اور آسمان کی بلندیوں میں جا کر کھو جاتا تھا۔

ہمایوں، اس کی جوان بیوی اور چھوٹی بچی ہما۔ اپنے کمرے میں آتشدان کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ ہر جمعہ کو اس کمرے میں چہل پہل رہتی تھی۔ خوشیاں ناچا کرتی تھیں لیکن آج خلافِ معمول سب رنجیدہ و غمگین و خاموش تھے۔ یہاں تک کہ ننھی ہما جو ہمیشہ کھلکھلایا کرتی تھی۔ جو ہمیشہ گھر کے ماحول کو ایک زندگی بخشتی تھی آج وہ بھی اپنی گڑیا کو بغل میں دبائے خاموش اور اداس تھی اس کی حیران و پریشان نگاہیں دروازے کی طرف لگی ہوئی تھیں جیسے کہ وہ سمجھ گئی ہے کہ گھر میں کوئی چیز کم ہے۔ اور وہ کمی اس کا چچا بہرام تھا۔ اس وقت وہ ہمیشہ گھر آ جاتا تھا لیکن آج نہ جانے کیا بات ہوئی کہ .... اس نے یہ بھی محسوس کر لیا تھا کہ اس کے ماں باپ کی افسردگی و پریشانی بہرام چچا کے نہ آنے کی وجہ سے ہے۔ کالے کپڑے۔ نیند کی ماتی سُرخ آنکھیں اور سگریٹ کا لہراتا ہوا دھواں۔ ہر چیز اس کے اس خیال کی گواہی دے رہی تھی۔ ہمایوں کی نظریں آتشدان کے انگاروں پر جمی ہوئی تھیں۔ لیکن خیال کی پرواز کہیں دور تھی۔ نہ جانے وہ کیا کیا سوچ رہا تھا۔۔

ایک دم اسے سردیوں کے زمانے کی یاد آئی جب وہ مدرسے میں پڑھا کرتا تھا۔

اس روز ...... جبکہ آج کی طرح ایک ایک بالشت برف زمین پر جمی ہوئی تھی۔ چھٹی کی گھنٹی بجتے ہی وہ کھیل شروع کر دیتے تھے اور دوسرے کھلاڑیوں کو سانس تک نہ لینے دیتے تھے۔ اس وقت دونوں ایک ہی سا کھیل کھیلتے۔ زمین کے اوپر برف کا ڈھیر لگا دیتے۔ اس کے بعد بچوں کی دو ٹولیاں بن جاتیں۔ وہ سب ڈھیر کے پیچھے چھپ جاتے اور برف کی گولہ باری شروع کر دیتے۔ وہ ذرا بھی سردی محسوس نہ کرتے۔ ان کے ہاتھ برف سے کھیلتے کھیلتے سرخ اور شل ہو جاتے لیکن وہ ایک دوسرے پر برف کے گولے پھینکتے رہتے۔

ایک دن ....

جبکہ وہ اسی کھیل میں مشغول تھے۔ اس نے ایک مٹھی بھر کر برف اٹھائی۔ دبا دبا کر اس کا ایک گولا سا بنایا اور بہرام کے کھینچ مارا۔ جس سے اس کی پیشانی بُری طرح زخمی ہو گئی۔ مدرسہ کے ناظم نے خوب کس کس کر اس کے ہاتھ پر بید لگائے۔ اور شاید اسی بات سے بہرام کے ساتھ اس کی دوستی کا آغاز ہوا۔ جب کبھی وہ اس کی پیشانی کا زخم دیکھتا۔ بید کھانے کی یاد سے تڑپ اٹھتا اس اٹھارہ سال کے عرصہ میں وہ ایک جان دو قالب ہو چکے تھے۔ بالکل شیر و شکر۔ آپس میں خوب گھل مل گئے تھے اور ایک دوسرے کے رازدار تھے وہ

دونوں ایک دوسرے سے بہت کچھ ملتے جلتے تھے۔ ایک جیسا طرز فکر۔ ایک جیسا سلیقہ اور ایک ہی جیسا اخلاق۔ اب تک ان کے درمیان ایک خفیف سا اختلاف نظر یا معمولی سی رنجش بھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ کل صبح تک ایسا ہی تھا جبکہ دوسرے دفتر سے کسی نے ہمایوں کو ٹیلیفون کیا کہ بہرآم مرزا نے خودکشی کرلی ہے۔

ہمایوں نے فوراً ہی ایک دکٹوریہ گاڑی لی اور آن کی آن میں جنازہ پر پہنچ گیا۔ سفید کپڑا جو اس کے چہرہ پر ڈال رکھا تھا خون میں لتھڑا ہوا تھا آہستہ سے ہٹایا۔ خون آلود بھویں اور آنکھیں۔ تکیہ پر ٹپکا ہوا خون۔ قالین پر جا بجا خون کے دھبے۔ عزیزوں کی گریہ وزاری۔ نالہ و فریاد .... اُف: دردناک منظر۔ کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

مغرب کے وقت تک ہمایوں وہیں رہا۔ غسل وکفن اور اس کے بعد جنازے کے ساتھ ساتھ قبرستان تک گیا۔ تابوت کو کاندھا بھی دیا، اور اس کی قبر پر پھول بھی چڑھائے اور پھر فاتحہ پڑھ کر بادل نخواستہ دیگر سوگواروں کے ساتھ واپس ہوا۔ لیکن اس روز سے آج تک ایک لمحہ بھی اُسے آرام وچین میسر نہ آیا۔ آنکھوں کی نیند اڑ گئی تھی۔ کنپٹی پر ایک سفید بال بھی چمکنے لگا۔ وہ خیالات میں گم بیٹھا ہوا تھا۔ سگرٹوں کا ڈبہ اس کے سامنے رکھا ہوا تھا اور وہ سگرٹ پر سگرٹ سلگا رہا تھا۔ اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے حیات و ممات کے فلسفہ پر غور کیا۔ بہت دیر تک سوچتا رہا لیکن کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا، اور کسی بات سے اس کی تسلی نہ ہو سکی۔

وہ پریشان ہو کر بالکل تھک چکا تھا اسے اپنی تکلیف کا کچھ بھی اندازہ نہ تھا۔ کبھی دیوانہ سا ہو جاتا۔ ہر چند کوشش کرتا کہ بھلا دے لیکن بھلا نہ سکتا تھا۔ مدرسہ سے انکی دوستی شروع ہوئی تھی اور دونوں ایک دوسرے کے رنج و خوشی میں برابر کے شریک تھے۔ جب بھی کبھی وہ گھر واپس آتا اور بہرآم کی تصویر پر اس کی نظر پڑ جاتی تو زخم پھر سے ہرا ہو جاتا۔ گزری ہوئی باتیں ایک ایک کر کے اس کے سامنے آکھڑی ہوتیں۔ وہ اسے دیکھتا۔ دیکھتا رہتا۔

سنہری مونچھیں، نیلی آنکھیں، چھوٹا سا دہانہ، سبک ٹھوڑی، اس کے بلند قہقہے، کھلنے کی خاص ادا، ہر بات ہر چیز اس کی آنکھوں میں پھر رہی تھی۔ اس کو یقین ہی نہ آتا تھا کہ وہ مرگیا ہے اور وہ بھی اس طرح، یونہی ناگہانی موت۔

بہرآم نے اس کے لئے کیا کیا مشکلات نہ اٹھائی تھیں۔ تین سال کی مدت میں جب کہ وہ کسی دوسری جگہ تعینات کر دیا گیا تھا اس کے گھر اور گھر والوں کی کتنی تندہی اور جانفشانی سے دیکھ بھال کی۔ رات کو رات اور دن کو دن نہیں سمجھا۔ بقول اس کی بیوی بدر آپی کے کہ اس نے "پانی کے لئے بھی پلنگ پر سے نہیں اٹھنے دیا۔"

اب ہمایوں نے زندگی کے بوجھ کو محسوس کیا۔ اسے گزرے ہوئے زمانہ کی یاد سے افسوس ہو رہا تھا کتنے اچھے دن تھے وہ جبکہ پورا کنبہ ایک جگہ جمع ہو رہا تھا۔ ہنستے خوش ہوتے تھے۔ شطرنج کھیلتے تھے اور گھڑیاں اس طرح گذر جاتی تھیں کہ جن کا احساس تک بھی نہ ہوتا تھا۔ لیکن وہ بات.... جو اس کے دل میں ہمیشہ کھٹکتی تھی وہ یہ تھی کہ جب وہ دونوں ایک جان و قالب تھے ایک دوسرے کے رازدار تھے تو یہ کس طرح ہوا کہ بہرآم نے خودکشی کے متعلق اس سے بات تک نہ کی؟ اس کا کیا سبب تھا؟ وہ دیوانہ ہو گیا تھا یا کوئی خانگی بات تھی جس کی وجہ سے اس نے ایسا کیا؟ یہی ایک سوال وہ بار بار اپنے دل سے پوچھتا۔ آخر وہ ایک بات اس کی سمجھ میں آئی اپنی بیوی کے پاس پہنچا اور دریافت کیا۔

تمہارا کیا خیال ہے۔ کچھ جانتی ہو کہ بہرآم نے خودکشی کیوں کی؟"

بدر جو بیٹھا ہر سینے میں مشغول تھی سر اٹھایا جیسے وہ کسی پرسش کے لئے تیار ہی نہ تھی اس نے بے دلی سے جواب دیا۔

"میں کیا جانوں۔ کیا تمہیں اس نے نہیں بتایا تھا؟"

"نہیں......۔ یہ تو میں یونہی پوچھتا ہوں...... مجھے بھی اس بات کا تعجب ہے......... سفر سے جب واپس ہوا ہوں وہ کچھ ملا ہوا معلوم ہوتا تھا مجھے اس نے کچھ بھی نہیں بتایا۔ میں نے سوچا یہ گھبراہٹ شاید کاروباری پابندیوں کی وجہ سے ہو۔ چونکہ وہ ملنے اس کا دفتر بار سے بہت ہی دل برداشتہ سا رہتا تھا۔ بارہا اس نے یہ بات مجھ سے کہی تھی......... وہ تو مجھ سے کوئی چیز بھی پوشیدہ نہ رکھتا تھا۔"

"خدا بخشے۔ بہت ہی زندہ دل اور خوش مزاج تھا۔ اس سے تو یہ بات بالکل بعید تھی۔"

"نہیں یہ بات نہیں۔ بلکہ ہر وہ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ اور کبھی کبھی تو وہ بالکل ہی بدل جاتا تھا خصوصاً تنہائیوں میں۔ ایک دن جو میں اس کے کمرے میں داخل ہوا تو اسے بالکل نہ پہچان سکا۔ ہاتھوں میں سر دیئے بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا۔ دیکھتے ہی میرا دل دھک سے رہ گیا۔ مجھے اس حالت میں دیکھ کر بہت خوش ہوا اور بے تحاشہ قہقہے مارنے لگا کہ اچھے مغالطہ میں ڈالا۔ اچھا خاصا بازیگر تھا۔"

"شاید کوئی ایسی ہی بات ہو جسے تم سے کہتے ہوئے ڈرتا تھا کہ تمہیں سن کر رنج ہوگا۔ ویسے تمہارا بہت خیال رکھتا تھا......... آخر کچھ بھی ہو۔ تم بیوی بچے والے ہو تمہیں اپنی زندگی کی فکر ہونی چاہیئے۔ لیکن وہ......"

اس نے اپنے سر کو ایک خاص اور پُر معنی انداز میں جھٹک دیا۔ گویا اس کی نظر میں اس موت کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ سکوت پھر طاری و مساوی ہو گیا۔ خاموشی نے ڈیرے ڈال دیئے اور دونوں اپنے اپنے خیالات کی رَو میں بہنے لگے۔

ہمایوں نے محسوس کیا کہ اس کی بیوی کی باتیں بناوٹی اور دنیادارانہ ہیں۔ یہی عورت آٹھ سال قبل اس پر جان چھڑکتی تھی۔ عشق و محبت کے فلسفہ پر کتنے اچھے خیالات کا اظہار کرتی تھی۔ اس وقت اُسے اپنی آنکھوں کے سامنے سے ایک پردہ سا اٹھتا محسوس ہوا۔ بہرام کی یاد کے مقابلہ میں اُسے اپنی بیوی کی باتوں سے نفرت ہونے لگی۔ وہ اس سے بیزار ہو گیا کہ اب وہ خود کو کچھ زیادہ عقلمند سمجھتی ہے۔ اپنی راہ سے بھٹک گئی ہے۔ صرف مال و دولت کی فکر میں ہے۔ دنیا کی چاہ میں کھو گئی ہے اور نہیں چاہتی کہ رنج و غم و غصہ اس کے قریب تک بھی آئیں۔ اور دلیل کیا لاتی ہے کہ بہرام کے بیوی بچے نہ تھے۔ کتنا پست خیال ہے۔ چونکہ بہرام نے خود کو اس لذت سے محروم کر دیا تھا لہٰذا اس کی موت کا افسوس نہیں کرنا چاہیئے۔ کیا دوست سے بڑھ کر اس کے بچہ کی قدر و منزلت ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ کیا بہرام قابل افسوس نہیں تھا؟ کیا اُسے اب دنیا میں بہرام جیسا دوست مل سکے گا؟ "افسوس! وہ تو جوان مر جائے اور یہ نوّے سال کی بالکونی بڑھیا سینڈ خانم زندہ رہے جو آج اتنی سخت سردی اور برفباری میں ہانپتی کانپتی۔ سٹھیائی پائچنار سے یہاں تک آئی ہے اور بہرام کے گھر کا پتہ پوچھتی پھرتی ہے کہ مُردے کا حلوا کھانے کو ملے۔ یا خدا تیرے کھیل بھی نیارے ہیں۔ اور بدری کہتی ہے کہ فطرت کا یہی تقاضا ہے۔ آخر وہ بھی تو سینڈ خانم کی طرح بڑھیا ہو جائے گی اور ابھی کونسی جوان ہے۔ بغیر میک اپ کے کتنی بُری معلوم ہوتی ہے آنکھوں کی رعنائی اور آواز کا ترنم بھی جاتا رہا۔ صبح سویرے جب دفتر کو جاتا ہوں تو وہ بھی خواب خرگوش ہی میں مدہوش ہوتی ہے۔ اڑی اڑی سی رنگت اور آنکھوں کے نیچے جھریاں۔

کون جانے بدری بھی میرے متعلق ایسی ہی باتیں سوچتی ہو؟ کیا وہ خود نہیں بدل گیا ہے؟ کیا وہ پہلے جیسا ہی ہمایوں نظر آتا ہے خوب صورت ہنس مکھ۔ محبت کرنے والا۔ آنکھوں کے اشاروں پر چلنے والا؟ کیا اس نے اپنی بیوی کو دھوکہ نہیں دیا ہے؟ لیکن یہ ساری بدگمانیاں کیوں؟ بے خوابی کا اثر تو نہیں۔ یہ دوست کی درد بھری یاد نے تڑپا دیا ہے؟

اُسی وقت دروازہ کھلا اور ایک خادمہ جو اپنی چادر کے کونے کو دانتوں میں دبائے ہوئے تھی۔ داخل ہوئی اور ہمایوں کو ایک سربمہر لفافہ دے کر چلی گئی۔

ہمایوں نے بہرام کے باریک اور جھکے ہوئے خط کو پہچان لیا۔ بے چین آنکھوں۔ دھڑکتے دل اور کانپتے ہاتھوں سے لفافہ کو

چاک کیا اور پڑھنا شروع کیا:۔

"رات کا ڈیڑھ بج رہا ہے۔ آج بتاریخ ۱۳ رمضان ۱۳۱۱ھ اس جانب بہرام میرزا ساکن رثن پور۔ اپنی کل دولت و املاک برضا و رغبت۔ ہما خانم ماہ آفرید کو سونپتا ہوں۔۔۔۔" بہرام استان پور

ہمایوں نے بڑے تعجب کے ساتھ اس خط کو دوبارہ پڑھا۔ وہ بالکل مبہوت ہو چکا تھا۔

اور اسی حالت میں وہ خط اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گیا۔

بدری جو کنکھیوں سے دیکھ رہی تھی پوچھنے لگی۔

"کس کا خط ہے؟"

"بہرام کا"

"کیا لکھا ہے؟"

"اپنی پوری جائداد ہما خانم کے نام کر گیا ہے"۔

"کتنا اچھا آدمی تھا"۔

اس تعجب اور ملاطفت کے اظہار نے ہمایوں کو اپنی بیوی سے اور بھی زیادہ بدظن کر دیا بغیر کسی ارادے کے اس کی نگاہ بہرام کی تصویر پر پڑ گئی اور فوراً ہی پلٹ کر اس نے ہما کو دیکھا۔ اور پھر اسے کوئی ایسی چیز نظر آئی وہ بے اختیار کانپنے لگا جیسے ایک دوسرا پردہ اس کی آنکھوں کے سامنے سے اٹھ گیا ہو۔ ہما بہت کچھ بہرام کی ہم شکل تھی۔ نہ تو باپ پر گئی تھی اور نہ ماں پر۔ ان دونوں میں سے کسی کی بھی آنکھیں نیلی نہ تھیں۔ چھوٹا دہن اور سیک ٹھوڑی۔ عین مین بہرام معلوم ہوتی تھی۔ اب ہمایوں کو خیال آیا کہ بہرام ہما کو کیوں اتنا چاہتا تھا اور کیوں اس نے مرنے کے بعد اپنی ساری دولت ہما کے نام کر دی تھی۔

"کہیں یہ بچہ ان دونوں کی چوری چھپے کی ملاقاتوں کا نتیجہ تو نہیں؟ وہ دوست جس کو جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا جس پر اُسے پورا بھروسہ تھا؟ اور اس کی بیوی جس نے بغیر اسے بتائے برسوں بہرام سے راہ و رسم رکھی۔ اس کی آنکھوں میں دھول جھونکی اس کو بیوقوف بنایا۔۔۔۔۔۔ اور اب یہ وصیت نامہ۔۔۔۔۔۔ مرنے کے بعد یہ مجسم گالی اس کے پاس بھیج دی ہے۔ لیکن نہیں بہرام تنہا اس قابل نہیں تھا کہ سارا نقشہ خود ہی تیار کر لے۔ ضرور کوئی دوسرا اس کا ساتھی ہے"۔

یہ خیالات اس کی آنکھوں کے سامنے بجلی کی طرح کوند گئے۔ سر میں درد ہونے لگا اور رخسار تمتما اٹھے۔ اس نے شرربار نگاہیں بدری پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے۔ بہرام نے ایسا کیوں کیا۔ کیا اس کے بہن بھائی نہیں تھے"۔

"اس بچہ سے اس کو بہت محبت تھی۔ جب تم بندر گز میں تھے ہما کو سرخک ہو گئی۔ دس روز تک دن رات وہ اس کے سرہانے بیٹھا تیمارداری کرتا رہا۔ خدا اُسے جنت نصیب کرے"۔

ہمایوں نے آنکھیں نکال کر کہا۔

"نہ اتنا نیک بھی نہیں تھا"۔

"کیسے نیک نہیں تھا۔ سب تمہاری طرح سے بے پرواہ ہیں؟ کہ بیوی بچے کو چھوڑ کر تین سال کے لئے چلے گئے اور جب لوٹے تو خالی ہاتھ جھلاتے آئے۔ میرے لئے ایک جوڑ جراب کا بھی لے کر نہ آئے۔ کسی کو چاہنا دل دینے کے برابر ہے۔ تمہارے بچہ سے اگر کوئی محبت کرے

تو گویا تم سے محبت کی۔ وہ کیا ہما پر عاشق ہو گیا تھا؟ نہیں دیکھتے تھے کہ اس بچہ کو آنکھ کی پتلی سے بھی زیادہ عزیز رکھتا تھا۔"

"میں کہتا ہوں سچی بات نہیں بتاؤ گی؟"

"آخر چاہتے کیا ہو۔ اور کیا بتاؤں؟ میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آتا...."

"زیادہ بھولی بننے کی کوشش مت کرو۔"

"یعنی کیا مطلب ہے تمہارا؟ اس نے خودکشی کر لی اور دولت ہما کے نام لکھدی اور پوچھ گچھ کے لئے رہ گئی میں۔ آخر میں کیا بتاؤں؟"

"بس میں اتنا جاننا ہوں کہ تم سب کچھ جانتی ہو۔"

"کیا جانتے ہو؟ مجھ سے اشاروں کنایوں میں بات چیت نہ کرو۔ اپنے دماغ کا علاج کراؤ۔ ہوش کے ناخن لو۔ میرے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہو۔"

"اچھا تو تم سمجھتی ہو کہ میں کچھ بھی نہیں جانتا ہوں"

"جانتے ہو تو مجھ سے کیوں پوچھتے ہو؟"

ہمایوں کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ بڑے زور سے چیخا۔

"بس۔ بس۔ زیادہ بیوقوف نہ بناؤ۔"

اس کے بعد بہرام کے وصیت نامہ کی پڑیا سی بنا کر آتشدان میں جھونک دیا۔ جو فوراً ہی جل کر خاکستر ہو گیا۔ پدمنی کے ہاتھ میں ایک نفشئی رنگ کا کپڑا تھا۔ پھینکتے ہوئے اٹھی اور بولی۔

"مجھ سے اگر ضد تھی تو اپنے بچے کا ہی خیال کیا ہوتا۔"

ہمایوں بھی اٹھ کھڑا ہوا اور میز سے تکیہ لگا کر طنزیہ انداز میں کہنے لگا۔

"میرا بچہ؟ میرا بچہ؟ ...... پھر کیوں بہرام کا ہم شکل ہے؟"

اور بہرام کی تصویر والے فریم کو کہنی مار کر نیچے گرا دیا۔ بچہ جو کافی خوفزدہ ہو گیا تھا رونے لگا۔ پدمنی کا چہرہ فق ہو گیا اور تہدید آمیز لہجہ میں کہنے لگی۔

"آخر تمہارا کیا مطلب ہے؟ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میرا مطلب یہ ہے کہ تم نے آٹھ سال تک مجھے بیوقوف بنایا۔ میری آنکھوں میں دھول جھونکی۔ آٹھ سال ہو گئے آٹھ سال تم عورت نہیں تھیں فاحشہ تھیں۔"

"میں؟ مجھے الزام لگاتے ہو؟ میری بچی کو...."

ہمایوں پاگلوں کی طرح چیخ رہا تھا اور قہقہے لگا رہا تھا اور ہانپ رہا تھا۔ اس نے تصویر کے فریم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں۔ تمہاری بچی.... تمہاری بچی.... تصویر کو اٹھا کر دیکھو۔ اب میری آنکھیں کھلی ہیں۔ اب میں سمجھا کہ کیوں اس طرح بخشش کی ہے۔ کیوں نہ ہو بڑا مہربان باپ تھا۔ بڑی محبت کرتا تھا۔ لیکن تم تو بقول خود آٹھ سال ہونے کو آئے کہ...."

"...... یہ کہ تمہارے گھر میں رہی۔ ہر طرح کی ذلت اٹھائی۔ تمہاری غربت میں تمہارا ساتھ دیا۔ تمہارے پیچھے تین سال تک تمہارے گھر کو بنائے رکھا۔ اس پر بھی مجھے خبر ملی کہ ایک آوارہ روسی عورت کے جال میں پھنس گئے ہو۔ میں نے پھر بھی آہ تک نہ کی اور اس پر مجھے یہ بدلہ دیا جا رہا ہے۔ جب کوئی دوسرا بہانہ نہ ملا تو کہتے ہو کہ بچہ بہرام کی شکل ہے۔ اب میں یہاں ایک منٹ نہیں ٹھہر سکتی

اب میں اس گھر میں قید نہیں رہ سکتی۔ چلو بیٹا چلیں!"

ہما وحشت زدہ ہو رہی تھی اس کا رنگ اڑا ہوا تھا اور وہ کانپ رہی تھی۔

ماں باپ کے عجیب اور بے ہنگم جھگڑے کو دیکھ کر وہ رونے لگی اور ماں کے دامن سے لپٹ گئی۔ اور پھر دونوں دروازے کی طرف چلنے لگے۔ دروازے پر پہنچ کر بدری نے چابیوں کا گچھا نکالا اور زور سے پھینکا جو ہمایوں کے قریب آ کر گرا۔ قدموں کی چاپ اور ہما کے رونے کی آوازیں دور ہوتی چلی گئیں۔ دس منٹ کے بعد وکٹوریہ گاڑی کے پہیوں کی آواز آئی جو اس کڑکڑاتی سردی اور برف باری میں ان دونوں کو کہیں لے گئی۔

ہمایوں شکست خوردہ اور ساکت وہیں کھڑا رہ گیا۔ سر اٹھاتے ہوئے بھی اسے ڈر لگتا تھا۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ یہ سب کچھ جو ہوا وہ صحیح ہے۔ وہ بڑبڑانے لگا۔ میں دیوانہ ہو گیا ہوں یا کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہوں۔ لیکن اب جو بات ظاہر ہو چکی تھی اس کے بعد تو ایسی زندگی جہنم تھی۔ اور گھر کاٹنے کو دوڑتا تھا۔ اب اس میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ اپنی پیاری بیٹی ہما کو دیکھے اسے پیار کرے اور شفقت سے پیش آئے۔ اپنے عزیز دوست کی طرف سے اس کا دل میلا ہو چکا تھا اور سب سے زیادہ تو وہ اپنی بیوی سے متنفر تھا کہ مستقل آٹھ سال تک وہ اس کے عزیز دوست سے چھپ چھپ کر ملتی رہی اور اس کی خاندانی عزت کو بٹہ لگایا۔ اور اس کے فرشتوں کو بھی پتہ چلنے نہ دیا۔ سب کے سب بڑے دھوکہ باز اور فریبی نکلے۔ اور صرف وہ ایک الو رہ گیا جو بیوقوف بنا اور سب اس کا مذاق بنا گئے۔

اپنی پوری زندگی سے وہ بیزار ہو چکا تھا۔ دنیا کی ہر چیز اور ہر شخص سے اسے نفرت تھی۔ اسے محسوس ہوتا کہ وہ دنیا میں یکہ و تنہا اور بے یار و مددگار رہ گیا ہے۔ اب اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ کہ وہ کہیں دور چلا جائے یا جنوب میں کسی بندرگاہ پر اپنا تبادلہ کرا لے۔ اور باقی زندگی وہیں پر گذار دے۔ یا پھر اس طرح روپوش ہو جائے کہ اسے کوئی نہ دیکھ سکے۔ یا کسی ایسی جگہ چلا جائے جہاں کوئی بھی نہ ہو اور کسی کی آواز تک نہ سن سکے۔ کسی پہاڑی کھوہ میں جا سوئے اور کبھی بیدار نہ ہو۔ اس نے پہلی بار یہ محسوس کیا کہ اس کے اور اس کے دوستوں کے درمیان ایک خطرناک بھنور پیدا ہو گیا ہے کہ جس سے نکلنا بہت دشوار ہے۔

اس نے ایک سگرٹ سلگائی اور تھوڑی دیر تک کمرے میں ٹہلتا رہا۔ پھر میز سے تکیہ لگا کر کھڑا ہو گیا۔ دریچہ کے شیشہ میں سے اس نے دیکھا کہ برف کے گالے آہستہ آہستہ آسمان کی بلندیوں سے منڈلاتے ہوئے زمین پر گر رہے ہیں۔ جیسے پُر اسرار راگوں کی لے پر فضا میں رقص کر رہے ہوں ناچتے تھرکتے گرتے تھے اور سائبان کی منڈیر پر جم جاتے تھے۔

بے اختیار اس کے دل میں گذرے ہوئے اچھے دنوں کی یاد مچلنے لگی۔ جبکہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ عراق میں اپنے گاؤں گیا تھا بڑے سہانے دن تھے۔ دن دن بھر ہرے بھرے درختوں کے نیچے خنک سبزہ پر لیٹا رہتا۔ سوتا رہتا۔ اسی جگہ جہاں پر شیر علی اپنی چلم میں تمباکو بھر کر پیا کرتا تھا اور گیہوں کی بالوں پر دائیں چلایا کرتا تھا۔ اور اس کی لڑکی سرخ چادر اوڑھے گھنٹوں اپنے باپ کا انتظار کیا کرتی تھی۔ بیلوں کے پیچھے بندھی ہوئی گاڑی جس پر شیر علی بیٹھ کر حقہ پیا کرتا تھا اور مدتوں گیہوں کے ڈھیر پر بیلوں کے ساتھ گھوما کرتا تھا۔ اس کی گاڑی کے پہیوں کی درد بھری آواز فضا میں بکھرتی رہتی تھی اور گیہوں کے سنہرے خوشے، پہیوں سے دب دب کر گیہوں کے دانے اور بھوسا الگ کر دیتے تھے۔ چوڑی پیشانیوں اور لمبے لمبے سینگوں والے بیل جن کے پٹھے چلتے چلتے زخمی ہو گئے تھے۔ شام تک یونہی گھومتے رہتے تھے اور وہ بھی انہی بیلوں کی طرح ہو گیا تھا۔ اس کی اور بیلوں کی زندگی میں کوئی فرق نہ تھا۔ اب سمجھ میں آیا کہ یہ جانور کیا محسوس کرتے ہونگے۔ وہ بھی تمام عمر یونہی آنکھیں بند کئے کولہو کے بیل کی طرح گھومتا رہا۔ بالکل ان بیلوں کی طرح جو گیہوں

کے انبار پر گھومتے ہیں۔

چنگی دفتر کے چھوٹے سے کمرے میں دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی ٹک ٹک اس کے کانوں میں گونجنے لگی اور اس کا ہمیشہ کاغذ سیاہ کرتے رہنا یاد آنے لگا کبھی اپنی رفیق گھڑی پر نظر ڈالتا۔ انگڑائیاں لیتا۔ دوبارہ قلم اٹھا لیتا۔ اور پھر وہی چنگی کے رجسٹروں کی خانہ پری۔ جمع تفریق۔ ضرب تقسیم اور یونہی رجسٹروں کو الٹ پلٹ کرتے رہنا اور کاغذوں میں سر کھپانا۔ لیکن اس وقت دل میں خوشیاں کروٹیں بدلتی تھیں۔ دل میں ایک امنگ تھی ترنگ تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کی بینائی۔ قوتِ فکر۔ جوانی اور طاقت کو گھن لگا ہوا ہے۔ آہستہ آہستہ ہر چیز مضمحل ہوتی جا رہی ہے۔ وہ خوش تھا۔ رات کو جب گھر پہنچتا۔ تو بہرام۔ تمہا اور اپنی بیوی کی مسکراہٹ سے اس کی ساری تھکن دور ہو جاتی جیسے اس کے مُردہ جسم میں کسی نے نئی روح پھونک دی ہو۔ لیکن آج وہ ان تینوں سے بیزار ہو چکا تھا۔ ان تینوں کی وجہ سے اُسے یہ روزِ سیاہ دیکھنا پڑا تھا۔

ایکا ایکی وہ چونکا۔ اٹھا اور لکھنے کی میز کے قریب جا بیٹھا۔ دراز باہر کھینچی سات گولیوں والا چھوٹا پستول جسے وہ ہمیشہ سفر میں اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ باہر نکالا۔ الٹ پلٹ کر اس کو دیکھا بھالا۔ کارتوس اپنی جگہ پر تھے۔ ٹھنڈی اور سیاہ نلکی کو دیکھا اور آہستہ آہستہ پستول کا منہ اپنی کنپٹی پر لگا لیا......

لیکن جب بہرام کی خون بھری شکل اس کی آنکھوں کے سامنے آئی تو اس نے پستول کو اپنی پتلون کی جیب میں رکھ لیا۔

دوبارہ اٹھا۔ دالان میں پہنچا۔ اور کوٹ پہنا۔ لمبے جوتے پہنے۔ چھڑی اٹھائی۔ اور گھر سے باہر نکل گیا۔ گلی میں سناٹا تھا۔ برف کے گالے آہستہ آہستہ فضا میں ناچ رہے تھے۔

وہ بغیر سوچے چل پڑا وہ نہیں جانتا تھا کہ اُسے کہاں جانا ہے اور وہ کدھار جا رہا ہے بس یہی چاہتا تھا کہ اس گھر اور تند و تیز اور بھیانک حادثے سے بچ کر کہیں دور چلا جائے۔

چلتے چلتے وہ ایک ایسی سڑک پر نکلا جو سرد۔ سفید اور غم انگیز تھی۔ گاڑی کے پہیوں کے نشان برف میں دور دور تک نظر آتے تھے اور ان لکیروں کے درمیان برف کے اونچے نیچے ڈھیر۔ وہ آہستہ آہستہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا جا رہا تھا۔ ایک تانگہ اس کے قریب آیا اور چکدار برف اور سڑک کی مٹی اس کے سرد و خشک چہرے پر پھینکتی تیزی سے نکل گئی۔ وہیں رک گیا۔ لباس پر لگی کیچڑ میں لتھڑا ہوا تھا جیسے اُسے تسلی دے رہا ہو۔ راستے میں ماچس کے بکس بیچتا ہوا ایک لڑکا ملا اُسے آواز دی اور بکس خریدا۔ یکایک جیسے ہی اس کے چہرے پر نگاہ پڑی۔ بہرام کی یاد سے تڑپ اٹھا۔ وہی نیلی آنکھیں چپٹا سا چہرہ اور سنہرے بال۔ وہ تھر تھرانے لگا۔ کانپنے لگا اور پھر آگے بڑھ گیا۔ بغیر کچھ سوچے ایک دکان کے سامنے ٹھہر گیا۔ آگے بڑھا اور دکان کے سرد شیشے سے پیشانی لگا دی یہاں تک کہ ٹوپی گرتے گرتے بچی۔ شیشے کے شوکیس میں طرح طرح کے کھلونے چنے ہوئے تھے۔ آستین سے شیشہ کو صاف کیا جو بھاپ سے دھندلا ہو رہا تھا لیکن دھندلے شیشہ کو باہر سے صاف کرنا کتنی بے وقوفی تھی۔ ایک بڑی سی گڑیا سامنے رکھی تھی۔ سرخ منہ اور نیلی آنکھیں۔ مسکرایا اور دیر تک اُسے گھورتا رہا۔ اسے خیال آیا کہ اگر یہ گڑیا تمہا کے پاس ہوتی تو وہ کتنی خوش ہوتی۔ دکاندار نے دروازہ کھولا اور یہ آگے بڑھ گیا۔ چلتے چلتے دو کوچے اور طے کئے۔ گلی کے نکڑ پر ایک مرغ فروش۔ مرغیوں کے چھابے کے قریب بیٹھا تھا۔ چھابے میں صرف تین مرغیاں اور ایک مرغ تھا جن کے پیر رسی سے بندھے ہوئے تھے اور ان کے سرخ سرخ پنجے جاڑے میں کانپ رہے تھے نزدیک ہی برف پر خون کے دھبے پڑے ہوئے تھے۔ ذرا آگے چل کر ایک مکان کی دہلیز پر ایک چھوٹا سا بچہ بیٹھا ہوا تھا۔ پھٹے پرانے کرتے میں سے اس کے بازو باہر جھانک رہے تھے۔ وہ بالکل ننگا پاؤں تھا یہاں تک کہ

اتنا دھیان بھی نہ رہا کہ وہ کس محلّہ اور کون سے راستوں سے گذر رہا ہے۔ اُسے اتنا بھی محسوس نہ ہوا کہ برف گر رہی ہے۔ بند چھتری جو اپنے ساتھ لایا تھا اسی طرح ہاتھ میں تھی۔ اب ایک دوسری سنسان سڑک پر آنکلا اور تھک کر ایک مکان کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ برف بہت تیزی کے ساتھ گر رہی تھی اس نے چھتری کھولی۔ اس کے بدن کا جوڑ جوڑ ٹوٹ رہا تھا۔ سر بوجھل ہو رہا تھا اور آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہوتی چلی گئیں۔

کسی راہگیر کی آواز سن کر وہ چونک پڑا۔ اٹھ کھڑا ہوا۔ فضا تاریک ہو چکی تھی اُسے دن بھر کی ایک ایک بات یاد آنے لگی چھوٹا بچہ جو ایک مکان کی دہلیز پر بیٹھا تھا اور اس کے بازو پھٹے ہوئے کرتے میں سے نظر آ رہے تھے۔ مرغیوں کے سرخ پنجے جو جھابے میں سردی سے کانپ رہے تھے۔ خون جو برف کے اوپر بکھرا پڑا تھا۔

اب اُسے بھوک محسوس ہونے لگی تھی۔ حلوائی کی دکان سے میٹھی روٹیاں خریدیں یونہی چلتے چلتے کھاتا رہا اور بغیر کسی ارادہ کے گلیوں میں سایہ کی طرح گھومتا رہتا۔

جب گھر پہنچا ہے تو رات کے دو بج رہے تھے۔ آرام کے لئے کرسی پر گر پڑا ایک گھنٹے بعد سردی کی شدت سے بیدار ہو گیا بغیر لباس تبدیل کئے پلنگ پر پہنچا اور لحاف اوڑھ کر سو گیا۔ خواب میں کیا دیکھتا ہے کہ وہی ماچس بیچنے والا لڑکا سیاہ لباس میں ملبوس میز کے نزدیک بیٹھا ہے اس کا چہرہ بالکل ایسا ہے جیسے کوئی بڑی گڑیا۔ نیلی نیلی آنکھیں اور مسکراہٹ اس کے چہرے پر کھیل رہی ہے۔ اس کے آگے تین آدمی دست بستہ کھڑے ہیں۔ اس کی لڑکی ہُما داخل ہوتی ہے اور اس کے ہاتھ میں ایک شمع ہے اس کے پیچھے ایک اور آدمی داخل ہوتا ہے۔ اس کے چہرے پر خون میں بھری ایک سفید نقاب پڑی ہوئی ہے۔

وہ آگے بڑھا۔ ماچس بیچنے والے لڑکے اور ہُما کا ہاتھ پکڑ کر چاہتا ہی تھا کہ دروازے سے باہر نکل جائے کہ پردے کے باہر نکلے ہوئے دو ہاتھ دکھائی دیئے کہ پستول سے اُسے نشانہ بناتے ہوئے ہیں۔ ہمایوں ہڑبڑا کر پریشان خواب سے چونکا۔

اس کی زندگی کے دو ہفتے اسی طرح خواب دیکھتے اور سوچتے، پریشان ہوتے گذر گئے۔ دن کو دفتر جاتا اور رات گئے گھر لوٹتا فقط سونے کے لئے۔ کبھی کبھار عصر کے بعد لڑکیوں کے مدرسہ کی طرف نکل جاتا جہاں اس کی بچی ہُما پڑھتی تھی۔ مدرسہ کی چھٹی کے وقت گلی کے موڑ پر دیوار کے پیچھے چھپ کر کھڑا ہو جاتا وہ ڈرتا تھا کہ کہیں اس کی سسرال کا نوکر رشدی علی اسے دیکھ نہ پائے۔ ایک ایک بچہ کو غور سے دیکھتا لیکن ہُما ان بچوں میں نظر نہ آتی۔

یہاں تک کہ ایک روز اس کی درخواست منظور ہو گئی۔ دفتر سے اس کو حکم ملا تھا کہ اس کا تبادلہ چنگی کرمانشاہ کو ہو گیا ہے۔

چلنے سے ایک دن پہلے ہمایوں نے اپنے سارے کام ختم کئے۔ یہاں تک کہ موٹر بسوں کے اڈے پر جا کر اپنی گاڑی بھی دیکھ لی اور ٹکٹ بھی خرید لیا۔ ڈرائیور کی تاکید کے باوجود وہ اپنا سارا سامان نہ باندھ سکا تھا اس لئے یہ طے پایا کہ بجائے اسی روز شام کو سفر کرنے کے دوسرے دن صبح چلے۔

گھر میں جو داخل ہوا تو پہلے اس کمرے میں پہنچا جہاں لکھنے کی میز رکھی تھی۔ کمرے میں چیزیں بکھری پڑی تھیں ہر طرف کوڑا کرکٹ نظر آتا تھا۔ آتشدان کے آگے ٹھنڈی سی ریت بکھری ہوئی تھی بنفشی رنگ کا کپڑا اور وہ لفافہ جس میں سے بہرام کا وصیت نامہ نکلا تھا وہیں پڑا تھا۔ لفافہ کو اٹھایا اور غصہ میں اس کو پھاڑ ڈالا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک چھوٹا سا لکھا ہوا پرچہ اس لفافہ میں اور موجود ہے جس کو وہ جلدی اور غصہ میں اس دن نہ دیکھ پایا تھا۔ جلدی جلدی پھٹے ہوئے ٹکڑے جوڑ کر جب اس نے پڑھا تو لکھا تھا۔

"یقیناً میرے مرنے کے بعد یہ خط تمہیں ملے گا۔ میں جانتا ہوں کہ میرے اس تناقض ارادے پر تمہیں تعجب ہوگا چونکہ

بغیر تمہارے مشورہ کے میں کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ لیکن چاہتا ہوں کہ میرے اور تمہارے درمیان کوئی راز باقی نہ رہے
میں اقرار کرتا ہوں کہ تمہاری بیوی بدرسی پر عاشق تھا۔ چار سال تک مستقل میں خود سے جنگ کرتا رہا آخر میری
جیت ہوئی اور شیطنیت کا وہ دیو جو میرے اندر بیدار ہو گیا تھا میں نے اُسے مار ڈالا۔ چونکہ میں اپنے پیارے دوست
کی امانت میں خیانت نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے میں نے اپنے جذبات کو کچل دیا۔ یہ ناچیز پیش کش ہما خانم کے
لئے ہے امید کہ ضرور قبول کرو گے۔

تمہارا بہرام

ہمایوں دیر تک ہکا بکا کمرے میں بیٹھا رہا۔ اب اس کو پورا یقین ہو گیا تھا کہ ہما اسی کی لڑکی ہے۔ کیا بغیر ہما کو دیکھے وہ سفر پر جا سکتا ہے؟ اس نے خط کو دو تین مرتبہ پڑھا جیب میں رکھا اور گھر سے باہر نکل گیا۔ سڑک کے نکڑ والی کھلونوں کی دکان میں داخل ہوا اور جلدی جلدی سُرخ منہ اور نیلی آنکھوں والی بڑی سی گڑیا کا سودا کیا اور اپنی سسرال کی طرف دوڑا۔ پہنچتے ہی دروازہ کھٹکھٹایا۔ جب ان کے نوکر مشدی علی نے ہمایوں کو دیکھا تو آنکھوں میں آنسو بھر کر کہنے لگا۔

"آقا۔ ہم پر کیسی آفت آئی۔ ہم تو لٹ گئے۔ ہما خانم ۔۔۔۔ !"

"کیا ہوا۔ کچھ کہو تو۔" ہمایوں تھر تھر کانپ رہا تھا۔"

"آقا۔ کیا آپ کو نہیں معلوم۔ آپ کے لئے ہما خانم کتنا تڑپتی تھی۔ کتنی بے چین ہوتی تھی۔ کتنی روتی تھی۔ روزانہ میں اسے مدرسے لے جاتا تھا۔ اتوار کے دن، آج پانچ روز ہونے کو آئے، عصر کے وقت وہ مدرسے سے نہ جانے کہاں چلی گئی، کہتی تھی آقا جان کو دیکھنے جا رہی ہوں۔ ہم لوگ بہت پریشان ہوئے اِدھر اُدھر مارے مارے پھرے۔ کیا طلعت نے آپ کو کچھ نہیں بتایا؟ پولس کو اطلاع دی اور دو مرتبہ آپ کے گھر آپ کو ڈھونڈھتا ہوا گیا۔"

"تم کیا کہہ رہے ہو مشدی علی؟ آخر کیا ہوا؟ کچھ تو بتاؤ؟"

"کیا بتاؤں۔ آقا۔ تاریکی چھانے لگی تھی کہ اُسے گھر لائے۔ راستہ بھول گئی تھی۔ سینہ میں سردی بیٹھ گئی تھی یہاں تک کہ بیچاری نے جان دے دی۔ ہر وقت آپ کو پکارتی تھی اور اس کی زبان پر کوئی دوسرا نام نہ تھا۔ کل اُسے شاہ عبدالعظیم لے گئے۔ اور بہرام میرزا کی قبر کے پہلو میں اُسے بھی سپرد خاک کر دیا۔"

ہمایوں آنکھیں پھاڑے مشدی علی کو دیکھ رہا تھا۔ یہ سنتے ہی سرخ منہ اور نیلی آنکھوں والی گڑیا۔ اس کے ہاتھ سے زمین پر گر گئی۔ دیوانوں کی طرح اس نے اپنے کوٹ کا کالر درست کیا۔ اور بسوں کے اڈے کی طرف بھاگا۔ سامان کو یونہی کھلا ہوا چھوڑا اور چاہتا تھا کہ جتنی بھی جلدی ہو سکے وہاں سے بھاگ جائے۔

ہماری نظر میں

قرآنِ عظیم

پہلا پارہ (الٓمٓ) اردو ترجمہ - از مولانا ابوالقاسم محمد عتیق بحر العلومی -
(ہدیہ درج نہیں) ملنے کا پتہ :- منیجر مکتبہ نظامیہ ٹکسال لکھنؤ -

"قرآنِ عظیم" اس ترجمہ کا تاریخی نام ہے، جس سے ۱۳۷۰ھ ہجری کے اعداد نکلتے ہیں - یہ ترجمہ آسان اور عام فہم ہے، سب سے زیادہ مفید اس کے وہ حواشی ہیں، جن میں قرآن مجید کے مضامین کی تعیین کی گئی ہے - صفحہ ۲۰ کے مضامین :-

مسلمانوں کا صلہ اور انہیں بشارت ——— کفار و مشرکین کا باہمی اختلاف اور اس کا فیصلہ ——— مساجد میں ذکرِ الٰہی سے روکنے والوں اور بربادی کے درپے لوگوں کا حکم .... سمتِ قبلہ کا حکم اور اللہ کے اسمائے صفات ——— اہل کتاب کے عقیدہ کی تردید کہ خدا کے بیٹا ہے اور اس پر استدلال ——— بے مثال قدرتِ الٰہی سے اس پر دوسرا استدلال ———

صفحہ ۲۳ پر :- "قال لا ینال عهدی الظالمین"

کے ترجمہ میں "لا" کا ترجمہ (نہیں) چھوٹ گیا ہے - مولانا سید علماء شیخ الحدیث ندوۃ العلماء کی یہ رائے بڑا وزن رکھتی ہے :-

"میں نے اس مترجم قرآن کریم کا جس قدر مطالعہ کیا بہت کامیاب اور بہتر پایا - سلف کے ترجموں سے کوئی بات متجاوز نہیں کی ...... دوسری خوبی اس ترجمہ کی یہ ہے کہ حضرت مترجم نے ہر آیت کا موضوع متعین فرمایا ہے، اور اس میں بڑی بصیرت اور کاوش سے کام لیا ہے"۔

کتاب المعاشرت

از مفتی انتظام اللہ شہابی، ضخامت ۱۷۶ صفحات، مجلد، نگین گرد پوش کے ساتھ - قیمت دو روپے
ملنے کا پتہ - محمد سعید اینڈ سنز، قرآن محل مقابل مولوی مسافر خانہ کراچی -

یہ کتاب ۶۷ عنوانات پر مشتمل ہے جو تمام کے تمام کتاب و سنت اور آثارِ صحابہ سے عبارت و مستفاد ہیں، سونے جاگنے، اٹھنے بیٹھنے، کپڑے پہنے، کھانے پینے، شادی بیاہ، وغیرہ تمام معاشرتی معاملات میں ایک مسلمان کا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیئے - اس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی سید صاحب دو قدر ساز ہے ——— مگر دلنشین، اللہ تعالیٰ مؤلف اور ناشر دونوں کو اس نیک اور مفید کتاب کی اشاعت پر اجر عطا فرمائے گا۔

عتیق پریکٹیکل انگلش ٹیچر

حصہ اول - مرتبہ :- تحمل علی حسن دیہ ملے ایم، ایل، بی، علیگ) اور غلام سرور خان، بی اے، بی ٹی، ایم، ایل، بی - حصہ دوم - مرتبہ :- غیاث اقبال، ضخامت ۲۵۶ صفحات - قیمت دو روپے چار آنے - ملنے کا پتہ - رحمٰن پرنٹنگ پریس نزد ریڈیو، کراچی ۱

جن کتابوں سے استاد کی مدد کے بغیر انگریزی سیکھی جا سکتی ہے، ایسی بہت سی کتابیں بازار میں مل سکتی ہیں - مگر یہ کتاب (عتیق پریکٹیکل انگلش ٹیچر) ایک ایسے آزمودہ اور مفید اسلوب پر مرتب کی گئی ہے جس نے ایک طرف دوسری "کتابوں" کی کوتاہیوں کو بڑی حد تک دور کیا ہے اور دوسری طرف انگریزی سیکھنے کے لیے سہولتیں مہیا کی ہیں۔

حروفِ تہجی سے شروع ہوکر، انگریزی کے خطوط، درخواستوں اور کاروباری فارموں کی خانہ پُری پر جاکر کتاب ختم ہوتی ہے، ہر سبق کے بعد دوسرا سبق سیکھنے والے کی استعداد میں اضافہ کرتا ہے اور طبیعت پر کسی قسم کا بار اور گرانی محسوس کئے بغیر، انگریزی گرامر سے بھی واقفیت ہوتی چلی جاتی ہے۔ جو نوآموز اس کتاب کو سمجھ کر پڑھے گا۔ وہ انگریزی زبان کے ہزاروں لفظوں سے واقف ہوجائے گا اور کام چلانے کے قابل انگریزی میں بولنے اور لکھنے کی معمولی قابلیت اس میں پیدا ہوجائے گی۔

(صفحہ ۳۵) دماغ عقل ـــــ MIND = عقل کی جگہ "ذہن" ترجمہ کرنا چاہیئے تھا۔ صفحہ ۶۰ پر "برادر رضاعی" ذرا غ بے ساختہ کو "برادر رضائی" لکھا ہے، یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے) ـــــ صفحہ ۶۱ پر " SAILOR " کو " E " سے SAILER لکھا ہے ـــــ "سنگر" (SINGER) کا ترجمہ "گلوکار" عام فہم نہیں ہے۔ " BOSOM " کا ترجمہ "پستان" بھی درست نہیں ہے۔ (صفحہ ۶۴) - اسی طرح sofa کا ترجمہ "پلنگ" بھی ٹھیک نہیں ہے۔ (صفحہ ۷۷) اردو میں " sofa " کو "صوفہ" ہی کہتے ہیں .... صفحہ ۸۲ پر "ہاف بیک" کی جگہ "ہاف بیک" چھپ گیا۔

" I Killed a dog " کا ترجمہ "میں نے ایک کتے کو مارا" (صفحہ ۲) غلط ہے۔ "میں نے ایک کتے کو مار ڈالا" ہونا چاہیئے۔ fully کا ترجمہ "قطعی نہیں" "کلی" زیادہ صحیح ہے (صفحہ ۳۰) "گھوڑوں کی ٹکڑی" ـــــ (A team of horses) کو اردو میں گھوڑوں کا گروہ نہیں کہتے۔

Something is better than nothing انگریزی ضرب المثل کا ترجمہ "بھاگتے چور کی لنگوٹی" (صفحہ ۳۹) کسی طرح درست نہیں اور پھر اردو ضرب المثل "بھاگتے بھوت" ہے، "بھاگتے چور" نہیں ہے!

صفحہ ۵۰ پر ٹائپ میں " guilty " کی جگہ " quilty " چھپ گیا۔ صفحہ ۱۳۱ پر "وکیلداز" کو کاتب نے "زیلدار" لکھدیا ـــــ صفحہ ۲۰۰ کا کچھ حصہ چھپائی میں اڑگیا ہے!

مجموعی طور پر "عقیق پریکٹیکل انگلش ٹیچر" بڑے کام کی کتاب ہے، اور جس مقصد کے لئے اُسے مُرتب کیا گیا ہے۔ اس مقصد کو یہ کتاب پورا کرتی ہے۔ رحمٰن برادرس نے اس کتاب کی تیاری پر بے دریغ روپیہ صرف کیا ہے۔ ٹائپ اور طباعت کی خوبی کے اعتبار سے اس کتاب کا ہر صفحہ جاذب نگاہ ہے۔ توقع ہے کہ اس کتاب کو قبولِ عام حاصل ہوگا، اور اس طرح مُرتبین اور ناشرین کی محنت ٹھکانے لگ جائے گی۔

اسلام پسند خواتین کا ترجمان و مشیر

ماہنامہ بتول لاہور کا پہلا سالنامہ

زیرِ ادارت:۔ حمیدہ بیگم، رخشندہ کوکب

ماہ جنوری سنہ ۱۹۵۹ء میں شائع ہو رہا ہے

ملک کے اس منفرد روایتی طرز کے ممتاز نسوانی پرچے کا یہ یادگار نمبر انشاءاللہ اعلیٰ تعمیری صلاحیتوں سے بہرہ ور خواتین اور مرد اہل قلم کی بہترین نگارشات کو جدید ترین طباعتی حسن کے ساتھ آراستہ پیراستہ کرکے قارئین کی خدمت میں پیش کرے گا

دلکش نظمیں، خیال انگیز غزلیں، نفیس اور پاکیزہ افسانے و ڈرامے، لطیف طنز پارے اور

معلومات افزا مقالات

نیز عورتوں کے مخصوص معاشرتی فرائض و مسائل سے بھرپور مضامین اس نمبر کی زینت ہونگے۔

علاوہ ازیں

"بتول کے مستقل عنوانات، مثلاً "راہ و منزل"، "کمالِ آدمیت"، "نقوش جاوداں"، "ہمارا گھر"، "نعمت کدہ"، اور "کشیدہ کاری" وغیرہ سالنامہ کے اندر نئے انداز اور نئے روپ میں جلوہ گر ہونگے۔

بتول کا سالنامہ

اس حقیقت کی بھرپور آئینہ داری کرے گا کہ مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کی ترقی، عزت اور سربلندی بھی در اصل اسلام ہی کے ضابطۂ حیات کی پیروی میں مضمر ہے اور جدید تہذیب اپنی جھوٹی چمک دمک کے ذریعے عورت کو جس دام فریب میں پھنسانا چاہتی ہے، اس کی حیثیت زمرد کے ایک گوبند سے زیادہ نہیں۔ جو اس کی خودی اور آبرو نیز عزت و شرف کا گلا گھونٹنے کے علاوہ اور کوئی خدمت انجام نہیں دے سکتا!

(ظاہری آرائش و زیب کشش کے لحاظ سے بھی یہ نمبر تمام کا تمام نفاست حسن اور معیار کا ایک اعلیٰ نمونہ ہوگا)

مستقل خریداروں کو سالنامہ مفت دیا جائے گا

نیا اور خوب صورت سرورق۔ اعلیٰ طباعت و کتابت۔ عمدہ کاغذ۔ ضخامت ۲۰۰ صفحات قیمت ۲ روپے

مشتہرین حضرات اپنے اشتہارات کے لئے جلد جگہ مخصوص کرالیں

ایجنٹ حضرات ابھی سے اس کے آرڈر سے کر مطلع فرمائیں

ناظم ادارہ بتول۔ ۴ اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

فاران
کراچی
پاکستان
ماہر القادری

رکن انجمن ادبی رسائل پاکستان

فاران

جلد ۱۰

شمارہ ۹

ماہ دسمبر ۱۹۵۸ء

ایڈیٹر

ماہر القادری

سالانہ چندہ

چھ روپے

فی پرچہ

آٹھ آنے

ترتیب

مقام اشاعت:- دفتر فاران، کیمبل اسٹریٹ، کراچی نمبر (۱)

پرنٹر پبلشر: مسرور حسین ـــــــ مطبع سعیدی۔ قرآن محل۔ مولوی مسافر خانہ، کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

نقشِ اوّل

روس و امریکہ نے انگلستان و فرانس نے بھارت اور چین نے اسی طرح دُنیا کی دوسری حکومتوں نے اپنے یہاں کے اساسی منشور، چارٹر اور مینی فیسٹو مرتب کئے ہیں، جن سے واضح ہوتا ہو کہ اُن حکومتوں کا مزاج کیا ہے؟ اُن کا کاروبار اور نظم و نسق کس بنیاد پر چل رہا ہے؟ اُن کی تعمیری اور اصلاحی کوششوں کی بدولت کس قسم کا معاشرہ ان ممالک میں وجود میں آیا ہے۔

مگر "اسلام" نے

حکومت و فرمانروائی کے لئے جو ہدایت نامہ اور اساسی منشور دیا ہے، وہ اہلِ فکر اور دانشوروں کا بنایا ہوا نہیں ہے، اور نہ رائے عامہ نے اُسے مرتب کیا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کا نازل کیا ہوا ہے، اس اللہ کا جو اس کائنات کا خالق ہے، جس نے انسان کو پیدا کیا ہے، جو انسانی فطرت کی تمام صلاحیتوں سے واقف ہے، اور اجتماعیت اور انفرادیت کے تمام تقاضوں کا علم رکھتا ہے، ارشاد ہوتا ہے:۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ

وہ لوگ جن کو اگر ہم زمین میں متمکن کر دیں گے: تو وہ نماز کو قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم کریں گے، بدی سے روکیں گے اور ہر کام کا انجام صرف خدا کے لئے ہے۔

یہ وہ کسوٹی ہے، اور آخری اور ابدی کسوٹی ہے، جس پر قیامت تک، دُنیا کی تمام حکومتیں کس کر اور جانچ کر دیکھی جائیں گی کہ وہ اس پر کہاں تک پوری اترتی ہیں اور اس الٰہی منشور کی کس حد تک تعمیل کر رہی ہیں، یہ قرآنی منشور دیکھنے میں چند لفظوں پر مشتمل ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے ان چند لفظوں میں حکمت و بصیرت کے دفتر رکھ دیئے ہیں، اور اس کوزے میں سچ مچ دریا سمایا ہوا ہے، اخلاق و حکمت کا دریا جس کا ایک ایک قطرہ آبِ گہر سے زیادہ مجلّیٰ اور تابناک ہے!

اس قرآنی ہدایت نامہ اور ربانی منشور میں بتایا گیا ہے کہ اربابِ حکومت کا درحقیقت منصب کیا ہے؟ حکومت کی زمامِ کار جن لوگوں کو سونپی گئی ہے، اُن پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے کیا فرائض اور ذمہ داریاں عائد کی گئی ہیں!

یہی ربانی منشور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک عہد اور خلافتِ راشدہ کے دورِ مسعود میں پھیل کر ایک "دفترِ عمل" بن جاتا ہے، اور وحیٔ و الہام اور فراستِ ایمانی کے معتبر اور قابلِ اعتماد "اجتہاد" کی بنیاد پر ایک ایسی حکومت وجود میں آتی ہے، جو دنیا کے لئے سراپا خیر و رحمت ہے، یہی "اسلامی حکومت" ایک "مثالی حکومت" (Tata ؟ model) کہے جانے کی مستحق ہے، اس لئے دُنیا کے جس خطہ میں بھی جن افراد اور جماعتوں کے ہاتھ میں حکومت کی زمامِ کار آتی ہے، اُن کا فرض ہو کہ وہ اس "مثالی حکومت" کو نمونہ اور ماڈل بنا کر اصلاح و تعمیر کا کام انجام دیں، جہاں کہیں بھی اس "مثالی حکومت" سے انحراف پایا جاتا ہے، وہاں دودھ اور شہد کی نہریں کیوں نہ بہتی ہوں، وہاں چاہے آسمان سے سُن برستا ہو اور اس جگہ کی زمین سونا اگلتی ہو، مگر وہاں فساد و انتشار ہی پایا جائے گا، اور اس جگہ کا معاشرہ معاشی اعتبار سے چاہے کتنا ہی خوشحال ہو، لیکن اخلاقی حیثیت سے مُفلس و قلاّش ہی رہے گا!

اسلام جو دینِ فطرت ہے، اور اللہ تعالیٰ نے جسے انسانوں کے لئے پسند فرمایا ہے، اُس کے نقطۂ نگاہ سے انسانی زندگی میں اصل اعتبار "معاشیات" کا نہیں بلکہ "اخلاق" کا ہے۔ دُنیا کے جس خطہ میں بھی معاشی قدریں ابھر رہی ہیں مگر "اخلاق" پست ہوتا جا رہا ہے۔ اسلام ایسے معاشرہ کو انسانیت کے لئے وبال سمجھتا ہے ——————— یہی وہ دوراہہ ہے جہاں سے اسلامی حکومت اور سیکولر اسٹیٹ کے راستے پھٹتے ہیں اور دونوں کے حدودِ عمل، مقصد اور نظریات میں تفریق پیدا ہو جاتی ہے!

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اسلام میں اصل اعتبار "معاشیات" کا نہیں اخلاق کا ہے، تو اس سے کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیئے کہ ہم عوام کی رفاہ اور خوشحالی کے خدانخواستہ منکر ہیں اور ہم بھوکے، ننگے اور پریشان روزگار معاشرے کو وجود میں لانا چاہتے ہیں۔ وہ شخص ظالم اور سنگدل ہے جو خدا کی مخلوق کو فقر و فاقہ، افلاس اور معیشت کی تنگی میں مبتلا دیکھنے کا ادنیٰ ترین داعیہ اپنے اندر رکھتا ہے یا معاشرے کی معاشی خوشحالی کو کوئی اہمیت نہیں دیتا، مخلوق کو شکم سیر اور خوشحال بنانا بھی بہت بڑی نیکی ہے، اور جو کوئی اس نیکی کے لئے جدوجہد کر رہا ہے، اس کے ساتھ تعاون کرنا، ہر انسانیت دوست آدمی کا فرض ہے!

اسلام جو دینِ فطرت ہے، وہ انسانوں کی معیشت کے مسائل کو نظر انداز کس طرح کر سکتا ہے، یہ جو اسلام میں زکوٰۃ، عُشر، خراج، جزیہ اور صدقات کا حکم دیا گیا ہے، اس کا تعلق انسانوں کی معاشیات ہی سے تو ہے۔ رعایا کے روزگار، مکان، تعلیم اور طبی سہولتوں کی کفالت اور سرپرستی اسلامی حکومت کے فرائض میں داخل ہے، اسلام نے تو عوام کی خوشحالی کے لئے کسریٰ کے بیش قیمت قالین "بہار" کے ٹکڑے عوام میں تقسیم کرا دیئے تھے، اور تمدن کے تکلفات کو "یادگار" بنا کر رکھنے کے مقابلہ میں، عوام کی ضروریات کو ترجیح دی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسلامی حکومت کے بانی سربراہ کار، قائد اور صدر تھے۔ مگر حضورؐ اپنی اور اپنے اہل و عیال کی ضرورتوں پر اتنا کم خرچ کرتے تھے کہ اتنے کم خرچ کا اس دورِ ترفہ میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، سارا عرب حضورؐ کے زیرِ نگیں تھا مگر کاشانۂ نبوت میں ہفتوں چولہا گرم نہیں ہوتا تھا، بکری کے دودھ، جو کے ستو اور کھجوروں پر ہی گزارا ہوتا تھا اور یہ چیزیں بھی کئی کئی وقت کے فاقوں کے بعد ملتی تھیں، حضورؐ اپنی ضرورت پر عوام کی ضرورت کو ترجیح دیتے تھے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ کوئی سائل آ گیا، اور حضورؐ نے جو کچھ تھوڑا بہت گھر میں موجود تھا، اس ضرورت مند کو عطا فرما دیا اور نبیؐ کے گھرانے میں اس دن فاقہ رہا۔

خلفائے راشدین کے عہد میں اسلامی مملکت کو بہت کچھ وسعت نصیب ہوئی اور ریاست کے محاصل میں غیر معمولی اضافہ ہوا مگر ان کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ پیوند لگے کپڑے پہنتے، اور انتہائی سادہ کھانا کھاتے! حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا تمام وقت امورِ خلافت کی مصروفیت میں گزرتا تھا، اس لئے بیت المال سے وظیفہ لیتے تھے مگر انتقال کے وقت وظیفہ کی یہ رقم بھی واپس فرما دی، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بیت المال سے جو رقم لیتے تھے، وہ ایک مزدور کی مزدوری کے برابر تھی، مستند تاریخ بتاتی ہے:-

وَ نزل نفسه بمنزلة الاجیر و کاحاد المسلمین فی بیت المال	انھوں (عمرؓ) نے بیت المال سے اپنے لئے بس اُسی قدر لیا جس قدر ایک مزدور اور مسلمانوں کے عوام کا حق تھا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے مال و دولت بھی عطا فرمایا تھا جس کے سبب آپ کا لقب "غنی" مشہور ہو گیا مگر سادگی و تواضع کا یہ عالم تھا کہ مسجد نبوی کے صحن میں کنکریوں کے اوپر سو جاتے، بیت المال پر آپ نے اپنے اخراجات کا بار نہیں ڈالا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تو ساری عمر فقر و فاقہ ہی میں بسر ہوئی، اور قوتِ حیدری کا مدار "نانِ شعیر" ہی پر رہا، ایک بار بیت المال کی تمام کی تمام رقم عوام میں بانٹ کر، بیت المال میں نماز ادا فرمائی تاکہ قیامت کے دن لوگ ان کی بے نفسی اور امانت و دیانت کی گواہی دیں۔

اس ترقی یافتہ دور؟ کی حکومتوں کے حکام و فرمانروا اپنے اوپر زیادہ سے زیادہ خرچ کرتے ہیں اور اُن کے شاہانہ مصارف سے حکومتوں کے خزانے خاصے زیر بار ہوتے ہیں، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین اپنی ذات پر کم سے کم خرچ کرتے تھے، اقتصادی معاشیات کا ابجد شناس بھی اس کا فیصلہ کر سکتا ہے کہ ارباب حکومت کے زیادہ سے زیادہ خرچ کے مقابلہ میں "کم سے کم خرچ حکومت کے مالیہ اور میزانیہ کے لئے کس قدر فائدہ مند اور نفع بخش ثابت ہوگا۔ اسی حقیقت سے متاثر ہونے کے بعد گاندھی جی نے کانگریس کی وزارتوں کی سب سے پہلی تشکیل کے وقت، وزراء کو یہ نصیحت کی تھی:-

"کہ سادگی میں ابو بکرؓ و عمرؓ کی پیروی کرو"۔

اُس زمانہ میں اسٹالن، چرچل، چیانگ کائی شک اور امریکہ کے عظیم المرتبت پریسیڈنٹ روزویلٹ بھی موجود تھے، اور دُنیا کی ہر قوم کے زندہ و مُردہ مشاہیر گاندھی جی کی نظر میں تھے مگر حکومت چلانے والوں کے لئے جو نمونہ گاندھی جی کے ذہن میں آیا وہ "ابو بکرؓ و عمرؓ" کا نمونہ تھا!

اس عوامی اور جمہوری دور میں ارباب حکومت کس قدر طمطراق رکھتے، جاہ و حشم اور کتنی حفاظتی تدابیر کے ساتھ قصر و ایوان سے باہر نکلتے ہیں، لیکن حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ خلافت کی زمامِ کار سنبھالنے کے بعد سات مہینہ تک سُنح سے کئی میل پیدل یا سواری پر چل کر مدینہ منورہ تشریف لاتے، اور رات میں عشاء کی نماز کی امامت فرما کر، اپنی قیام گاہ کو واپس جاتے۔

حکومت کے بیت المال میں دیانت و امانت اور احتیاط کا یہ عالم تھا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو ایک بار دوا کے لئے شہد کی ضرورت لاحق ہوئی، تو آپ نے مسجد نبوی کے منبر پر چڑھ کر عوام سے خطاب فرمایا کہ آپ لوگوں کی اجازت ہو تو بیت المال سے تھوڑا سا شہد لے لوں، ورنہ یہ شہد مجھ پر حرام ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے صاحبزادوں (حسن و حسین علیہما السلام) کو نئی چادریں اوڑھے دیکھ کر پوچھا کہ یہ کہاں سے آئیں؟ انھوں نے بتایا کہ فلاں رئیس نے یہ چادریں ہمیں ہدیہ کے طور پر دی ہیں۔ آپ نے ان چادروں کو بیت المال میں داخل کر دیا۔

قیصر و کسریٰ کے خزانے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دستِ تصرف میں تھے مگر سوکھی روٹی، زیتون کے تیل کے ساتھ تناول فرماتے تھے۔ حضرت عمرؓ صبح سویرے لوگوں کو فجر کی نماز کے لئے جگاتے، اور رات کی تاریکی میں مدینہ کی گلیوں میں عوام کی حفاظت کے لئے گشت فرماتے۔ ملک میں قحط پڑا تو غذا میں کمی کر دی، اور قحط کے زمانہ میں گیہوں کی روٹی کا ایک لقمہ بھی کھانا گوارا نہیں کیا۔ حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کا معمول تھا کہ درہ لیکر بازاروں میں تشریف لے جاتے اور لوگوں کو پرہیزگاری اور لین دین میں اچھی معاملت کی تلقین فرماتے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اس بات کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے کہ حکومت کے عمال عیش و راحت کی زندگی کے کہیں خوگر نہ ہو جائیں اور اُن کی اسلامی سادگی پر عجمی تکلفات کا رنگ نہ چڑھ جائے!

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ شام کے بعض اُمراء کی عام غذا پرندے کا گوشت اور میدے کی روٹی بن گئی ہے تو امراء شام سے سخت باز پُرس کی ——— حضرت عمرؓ حکومت کے عمال کے حالات کی ٹوہ رکھتے تھے کہ کون کس طرح زندگی گزارتا ہے، ایک عامل کی زندگی میں نفاق کا پتہ لگا تو اُسے برطرف کر دیا۔ جب کسی صوبہ یا صدر مقام پر کسی حاکم کو مقرر فرماتے تو ہر ایک کے وہاں جانے سے پہلے مقرر کردہ حاکم کے مال و اسباب کی فہرست تیار کی جاتی، اس کے حاکم کے مال و اسباب میں تنخواہ کے حساب سے زیادہ اضافہ ہو جاتا۔ تو زائد مال و اسباب تقسیم کرا لیا جاتا ——— حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بحرین کے حاکم تھے جب وہ وہاں سے مدینہ لوٹ کر آئے۔ تو اُن کے پاس بارہ ہزار درہم تھے۔ حضرت عمرؓ نے یہ پوری کی پوری رقم ان سے لے کر بیت المال میں داخل کر دی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اس کا خاص اہتمام فرماتے تھے کہ ذمیوں سے جو کچھ معاہدہ کیا ہے اُسے ہر حال میں پورا کیا جائے اور اس معاہد میں مسلمانوں کی طرف سے ذرہ برابر کمی بیشی نہ ہونے پائے، حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو فرمان کے ذریعہ نصیحت فرمائی:۔

"مسلمانوں کو ان (ذمیوں) کے ظلم و نقصان سے باز رکھو، اور اُن کے مال کے کھانے سے روکو، اور اُن کو جو حقوق بھی تم نے دیے ہیں، اُن کو پورا کرو"

زندگی کی چند گھڑیاں باقی رہ گئی ہیں، اس عالم میں بستر مرگ پر "ذمیوں" کے لئے وصیت فرماتے ہیں۔

واوصیہ بذمۃ اللہ وذمۃ رسولہ ان یوفی لھم بعھدھم وان یقاتل من ورائھم وان لا یکلفوا فوق طاقتھم	اور میں (اپنے جانشین) کو خدا اور خدا کے رسولؐ کے ذمہ کی وصیت کرتا ہوں کہ وہ ذمیوں سے کئے ہوئے معاہدے کو پورا کرے، ان کی حمایت میں جنگ کرے اور ان پر کوئی ایسی پابندی عائد نہ کرے جس کے برداشت کرنے کی اُن میں طاقت نہ ہو۔

اس حسن سلوک، ایفاء عہد اور رواداری کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے دشمنوں کے مقابلہ میں یہ ذمی مسلمانوں کے حامی و مددگار بن گئے! ایک طرف ذمیوں کے ساتھ حسن سلوک اور ایفاء عہد کا یہ عالم، دوسری طرف حدود شریعت کی حفاظت کا اس قدر اہتمام کہ شام کے ایک عیسائی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مدعو کیا تو آپ نے اس کی دعوت میں جانے سے یہ کہہ کر انکار فرمادیا۔

"ان گرجوں میں چونکہ تصویریں ہیں، اس لئے ہم اُن میں نہیں جاسکتے"

ایک طرف حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا وہ دبدبہ اور شان احتساب کہ صوبوں کے گورنر ڈرتے تھے اور شاہانِ عجم کے درباروں میں آپ کے نام سے لرزہ پیدا ہو جاتا تھا۔ دوسری طرف عوام مسلمانوں کو اظہار رائے اور اعلان حق کی یہ جرأت تھی کہ:۔

"ایک بار حضرت عمرؓ نے منبر پر چڑھ کر کہا۔ صاحبو! اگر میں دُنیا کی طرف جھک جاؤں تو تم لوگ کیا کروگے؟ ایک شخص وہیں کھڑا ہو گیا اور تلوار میان سے کھینچ کر بولا کہ تمہارا سر اڑا دیں گے حضرت عمرؓ نے اس کے آزمانے کو ڈانٹ کر کہا تو میری شان میں یہ لفظ کہتا ہے، اس نے کہا ہاں! تمہاری شان میں! بولے "الحمد للہ قوم میں ایسے لوگ موجود ہیں کہ میں کج ہو جاؤں گا تو مجھ کو سیدھا کردیں گے" (الفاروق)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کوئی مسلمان "تارک صلوٰۃ" تو ہو ہی نہیں سکتا تھا؟ "ترک صلوٰۃ" اور "مسلمان" صحابہ کرام اس "کفر آمیز نفاق" کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، اُن نفوسِ قدسیہ کی نگاہ میں "صلوٰۃ" کی اہمیت کا یہ عالم تھا کہ کسی مسلمان سے ایک دو وقت کی باجماعت نماز چھوٹ جاتی، تو صحابہ کرام میں اس کے "نفاق" کے چرچے ہونے لگتے، اس لئے کہ کسی عذر کے بغیر مسجد میں آکر باجماعت نماز پڑھنے سے ایک منافق ہی گریز کر سکتا ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے منصب کی اہمیت کو اچھی طرح پہچانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو اُمتِ مسلمہ کا والی بنایا تھا، اس لئے "منشور الٰہی" کی پہلی دفعہ کے تحت انہیں "اقامت صلوٰۃ" کا فریضہ بھی انجام دینا تھا۔ اس لئے کہ نماز کو "دین کا ستون" فرمایا گیا ہے جس نے دانستہ نماز چھوڑ دی، اس نے گویا "دین" ہی کو ڈھا دیا، "اقامت صلوٰۃ" کی اس اہمیت کے پیش نظر فاروق اعظمؓ نے عمالِ حکومت کو فرمان لکھا:۔

ان اھم امرکم عندی الصلوٰۃ فمن حفظھا	میرے نزدیک تمہارا سب سے اہم کام نماز ہے، جس شخص نے نماز کی

وحافظ علیہا حفظ دینہ ومن ضیعہا فھو لما سواھا اضیع حفاظت کی، اس نے اپنے دین کی حفاظت کی جس شخص نے اس (نماز) کو ضائع کیا، وہ اس کے سوا اور چیزوں کو بھی ضائع کردے گا۔

یہ ہے اس "ربانی منشور" (الذین ان مکنٰھم .... وللہ عاقبۃ الامور) کی عملی تفصیل کی ایک جھلک جو اوپر پیش کی گئی ہے، صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے تقاضوں کو پہچانا، اور نہ صرف پہچانا بلکہ ان کو پورا کیا، اس کے نتیجہ میں انہیں دین و دنیا کی کامرانیاں نصیب ہوئیں، انھوں نے ایک ایک محاذ پر باطل کی قوتوں کو شکست دی، ان کے دور میں۔۔ "اسلام" دنیا کی سب سے زیادہ غالب قوت تھا، اور مسلمانوں کو دنیا میں وہ عزت، اعتماد اور سربلندی حاصل تھی کہ دوسری قومیں ان کی اقبال مندی اور امانت کی قسمیں کھاتی تھیں!

وہ لوگ جو اللہ اور رسول پر ایمان رکھتے ہیں اور آخرت کا جنہیں یقین ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے جن کو زمین میں تمکن و اقتدار عطا فرمایا ہے، ان کے لئے "خلافتِ راشدہ" ہی مثالی حکومت ہے، یہ نظامِ حکومت افلاطون کی ریاست کی طرح کوئی "خیالی نظام" نہیں ہے۔ یہ برسوں آزمایا جا چکا ہے اور اس کی کامیابی پر تاریخ شاہد ہے!

اسلامی کردار!

یرموک، اجنادین اور قادسیہ کے معرکوں میں اسلامی فوج نے قلتِ تعداد اور اسلحہ کی کمی کے باوجود، جو اپنے مقابل کی فوجوں کو شکستیں دیں اور ان پر غلبہ حاصل کیا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت پر بھروسہ، اپنے مشن پر یقین اور اعلیٰ اخلاقی قوت تھی! عجمی فوجیں اپنے کیمپوں میں شرابیں پیتیں اور رقص و سرود سے لطف اندوز ہوتیں، اس ترکیب سے وہ اپنے اندر ولولہ، تازگی اور جوش و زندگی پیدا کرنا چاہتی تھیں مگر مجاہدینِ اسلام راتوں کو جاگ کر، اللہ تعالیٰ کے حضور اپنا عجز و نیاز پیش کرتے۔ خضوع و خشوع کے ساتھ دعائیں مانگتے، نمازیں پڑھتے: طلوعِ آفتاب کے بعد جب معرکۂ کارزار گرم ہوتا تو کافروں کی فوجوں پر رات کی سیاہکاریوں کے دھندلکے چھائے ہوتے اور عساکرِ اسلامی پر تقویٰ اور پاکیزگی کا نور برستا ہوتا۔ ان قدسی صفت شہسواروں کے سامنے کفر و باطل کی قوتیں کیا ٹھہر سکتی تھیں۔ تاریخ بتاتی ہے اور بالکل ٹھیک بتاتی ہے کہ ان صحرا نشینوں نے ایران و روم کی شہنشاہیتوں کو پارہ پارہ کر دیا۔ دل ایمان و یقین کی طاقت سے قوی و دلیر، سینے ہی تابناک و مجلّٰی تھے! لبوں پر اللہ تعالیٰ کی تکبیر! پیشانیوں پر سجدوں کے نشان، اور ہاتھوں میں تلواریں، جو بھی ان کے سامنے آیا اور ان سے ٹکرایا، اسے ذلیل و رسوا ہونا پڑا، فتح ان کے گھوڑوں کی لگام میں تھامتی تھی اور نصرت ان کی رکابیں چومتی تھی۔ لغت میں جب تک لفظ "شجاعت" باقی ہے ان بہادروں کا نام زندہ رہے گا: انکی فتحمندی دنیا کیلئے رحمت تھی، انکی ذات سے دُنیا میں نیکی کو پہچانا جاتا تھا۔ جو کوئی غلط اندیش اور سطحی بین نپولین ——— سے انکی تشبیہ دیتا ہے وہ نیکی ہی نہیں شجاعت کی بھی توہین کرتا ہے!

دوسری جنگِ عظیم کا ہیرو یا یوں کہیے کہ اس آگ کو بھڑکانے والا جرمنی کا سربراہ ڈکٹیٹر ہٹلر تھا۔ اس کی فوج جب میدانِ جنگ کے لئے برلن سے روانہ ہوئی تو ایک آبرو باختہ جرمن لڑکی ایک چبوترے پر کھڑی ہو گئی تھی، اور فوجی اس کے لب و رخسار کو چومتے ہوئے مارچ کرتے جاتے تھے۔ یہ خبر اخبارات میں جلی سُرخیوں کے ساتھ شائع ہوئی تھی کہ اس لڑکی نے جرمن فوج کی ہمت بڑھانے کے لئے بڑے ایثار اور خلوص کا مظاہرہ کیا، یہ ہے مغرب کی معاشرت اور وہاں کی فوج کا کردار! کھلی ہوئی بے حیائی اور فحاشی پر جہاں "ایثار و خلوص" کا لیبل لگا دیا جائے اور شیطان نے جن لوگوں کی نگاہ میں "بداخلاقی" کو قابلِ تعریف چیز بنا دیا ہو، وہاں شرافت، انسانیت اور اخلاق پر جو کچھ بھی گزر جائے تھوڑا ہے ——— ایک طرف جرمنی فوج کا یہ کردار، دوسری طرف اسلامی تاریخ اس منظر کو پیش کرتی ہے کہ خلافتِ راشدہ کے دور میں ایک شہر فتح ہوتا ہے اور اسلامی فوج کے سپاہی اپنے کمانڈر سے اجازت لے کر شہر دیکھنے کے لئے نکلتے

ہیں۔ شہر کے سب سے زیادہ پُر رونق بازار سے جب اسلامی فوج گزرتی ہے۔ تو اس بازار میں یہودی لڑکیاں خوب بن ٹھن کر جہاں تہاں کھڑی ہوجاتی ہیں۔ اسلامی فوج کے سپاہی نیچی نظریں کئے ہوئے بازار سے گزرتے ہیں۔ شہر کے یہودی اور عیسائی باشندے اسلامی فوج کے اس کردار، اخلاق اور پاکیزہ نگاہی کو دیکھ کر، حیران رہ جاتے ہیں، اور آپس میں اشارے کرتے ہیں کہ یہ فوج کے سپاہی ہیں، یا آسمان سے فرشتے اتر آئے ہیں!

مسلمانوں کے سیاست داں ہوں، حکمراں ہوں، فوجی ہوں، یا سول افسر ہوں، تاجر ہوں، یا زراعت پیشہ ہوں، چھوٹے ہوں یا بڑے ہوں۔ ہم سب کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہی معیار، نمونہ، در مقصود و منتہا ہے، اس کے بعد صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے آثار میں ہمارے لئے ہدایت ہے!

ہمیں دُنیا کے ہر مسئلہ میں یہ دیکھنا ہے کہ اسلام اس بارے میں کیا حکم دیتا ہے، اِس اسی حکم کی ہمیں تعمیل کرنی ہے چاہے ساری دنیا کی رائے اس کے خلاف ہو! یہ دُنیا کے وہ "بڑے آدمی" جن کی دانائی اور تدبر کے آج ڈنکے بج رہے ہیں، اُن کی سمجھ بوجھ کا یہ عالم ہے کہ حال ہی میں بھارت کے سب سے بڑے نیتا پنڈت جواہر لعل نہرو نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا ہے کہ:-

"میں عورتوں کو چادروں اور برقعوں میں دیکھ کر اپنے غصہ کو ضبط ہی نہیں کرسکتا"

حیرت ہے کہ شراب نوشی، بدکاری اور فحاشی کو دیکھ کر پنڈت جی کو ذرا سا بھی غصہ نہیں آتا۔ ہاں! عورتوں کے "حجاب و پردہ پوشی" کو دیکھ کر وہ فرطِ غضب سے بے قابو ہوجاتے ہیں، یہی بات کم سے کم انہیں تو نہیں کہنی چاہئیے تھی۔ کیونکہ وہ بے پردگی اور مرد و زن کے آزادانہ اختلاط کا تجربہ کرچکے ہیں اور اُن کا خاندان یہ زخم کھا چکا ہے، اپنے تلخ تجربہ کے بعد پنڈت نہرو نے "پردہ" پر جو طنز کی ہے، وہ اس بات کی دلیل ہے کہ ایک بے دین آدمی کا نقطۂ نگاہ اخلاق و پاکیزگی کے معاملہ میں کس قدر پست و کج ہوتا ہے! اس مزاج کے دانشور اپنی اصلاحی کوششوں سے سماج کو پاکیزہ بنا ہی نہیں سکتے، یہ تو وہ "بڑے آدمی" (!) ہیں جو معاشرے کی اخلاقی گندگی پر اپنی پسندیدگی کی مہریں ثبت کرتے ہیں، اور ان کے درباروں سے ناچنے گانے والوں اور نرت کاروں کو اعزاز عطا ہوتے ہیں اور آرٹ کی سندیں دی جاتی ہیں۔

یہ ایک مثال ہم نے پیش کی ہے کہ ہم مسلمانوں کے دیکھنے، سوچنے اور سمجھنے کا زاویہ نگاہ ہی دوسروں سے مختلف ہے، دوسروں کے یہاں جو چیز وجہ فخر و ناز ہے، وہ ہمارے نزدیک سبب ننگ و عار ہے! ایک مسلمان جس کے دل میں خدا کا خوف اور آخرت کے محاسبہ کا احساس ہوگا، وہ ایسے خوشحال معاشرے پر جس کی آسودگی اور ترفہ کا وہ بہت کچھ دارو مدار قماربازی، شراب، سود اور زنانِ بازاری کی کمائی کی آمدنی پر ہو۔ فقر و تنگدستی کو ترجیح دے گا! اسلام کی نگاہ میں ایک ایکٹرس کا زرق برق لباس ذلیل اور ایک باحیا عورت کے برقعہ کے پیوند معزز اور قابلِ احترام ہیں!

ایک اچھا مسلمان امریکہ اور روس کے خوشحال معاشرے کو للچائی ہوئی نگاہ سے نہیں دیکھتا کہ وہاں اجسام کی پرورش زیادہ تر لقمہ حرام سے ہوتی ہے، اُن لوگوں کو تو بس خوشحالی چاہیئے، اس طرف ان کی نگاہ ہی نہیں جاتی کہ یہ خوشحالی کن ذرائع سے حاصل ہورہی ہے، مسلمان کی ساری زندگی کا دارو مدار ہی حلال و حرام کے امتیاز پر ہے، اور وہ لوگ جو لادینی اور مادی نقطۂ نگاہ رکھتے ہیں، اُن کے کانوں نے "حلال و حرام" کے لفظ ہی نہیں سُنے، اُن کو تو بس لطف، خوشحالی اور لذت درکار ہے چاہے وہ لحم خنزیر اور سودی کاروبار سے حاصل ہو یا دہشت بدسے! جن لوگوں کی بے غیرتی کا یہ عالم ہو اور جو بے حیائی کی اس پستی تک پہنچ گئے ہوں کہ غیر مردوں کی نظروں کے سامنے، اُن کی ماؤں، بہنوں، بیویوں اور بیٹیوں کو آغوش میں لے کر ڈانس کرتے ہوں، اُن کی سوسائٹی کی پرچھائیں سے بھی ہمیں اپنے معاشرے کو بچانا چاہیئے، ہم اُن سے بہ وقار دفاعی اور تجارتی معاہدے تو کرسکتے ہیں مگر اُن کی سوسائٹی کی گندگیوں کو قبول نہیں کرسکتے، اور نہ دستور و قانون میں وہ ہمارے رہنما بن سکتے ہیں!

جس رات پاکستان میں فوجی انقلاب ہوا ہے، تو دوسرے دن اخبارات میں یہ خبر نمایاں طور پر شائع ہوئی تھی کہ سابق مرکزی حکومت کے بعض وزرا اس انقلابی شب میں ایوانِ صدر میں بیٹھے ہوئے وہسکی پی رہے تھے ——— اس خبر کو پڑھ کر ذہن اس طرف گیا کہ پریسیڈنٹ ہاؤس میں شراب کس نے مہیا کی تھی، اور اس گناہ کا جسے قرآن (رجسٌ من عملِ الشیطان) کہتا ہے، اصل ذمہ دار کون تھا؟

پاکستان کے معاشرے کی اصلاح و تطہیر کی ہر کوشش ہمارے لئے نوید جاں فزا اور روح پرور بشارت ہے! مگر تمام ملک کی نگاہیں اس پر لگی ہوئی ہیں کہ معاشی تطہیر کے ساتھ، گزشتہ دور کی اُن باقی خرابیوں کو بھی مٹایا جائے، جن پر اسلام حرام اور ناجائز ہونے کا حکم لگاتا ہے۔

پاکستان کے گزشتہ دور کی ساری خرابیوں کی جڑ یہ تھی کہ:۔

"امر بالمعروف" اور "نہی عن المنکر"

کے تقاضوں کو پس پشت ڈال دیا گیا تھا، بلکہ بعض معاملات میں تو اس کے برخلاف عمل ہو رہا تھا یعنی "منکر" ابھر رہے تھے اور "معروف" کچلے جا رہے تھے۔ اب وقت آگیا ہے کہ چور بازاری، اسمگلنگ اور رشوت کی طرح دوسرے معاصی اور اخلاقی برائیوں کا بھی قلع قمع کیا جائے، جھونپڑیوں سے لے کر قصر و ایوان تک تطہیر کی ضرورت ہے کہ ہم سب غفلت اور بے عنوانیوں کا شکار رہے ہیں! پاکستان کے عوام و حکام نے اپنی اخلاقی اصلاح کر لی، اگر اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کر لی، تو ایک طرف وہ دنیا میں سربلند و غالب ہوں گے، اور دوسری طرف آخرت کی سعادت انھیں میسر آئے گی، ہماری ہر جد و جہد کا مقصود اگر رضائے الٰہی بن جائے، تو پھر بیڑا پار ہے!

اس دنیا نے "جیبِ قبائے قیصر" کو بھی دیکھا ہے اور "طرفِ کلاہِ کَے" کا بھی مشاہدہ کیا ہے، کیسے کیسے باجبروت شاہنشاہ پیوند خاک ہو گئے وہ کہ جن کو دیکھ کر لوگ سجدہ کرتے تھے اور جو اپنے نسب نامے مہر و ماہ سے ملاتے تھے، جن کی شان و شوکت اور رعب و دبدبہ کی کوئی حد و نہایت نہ تھی، آج ان کی قبروں کے نشان تک نہیں ملتے، ہر زندگی کو یہی دن دیکھنا ہے، موت کا فرشتہ جس آسانی کے ساتھ جھونپڑی میں پہنچتا ہے، اسی سہولت و آسانی سے قصر و ایوان میں بھی داخل ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا ہر شے ہلاک و فانی ہے، انسان اپنے اعمال کے سوا ہر چیز اسی دنیا میں چھوڑ جاتا ہے، مرنے کے بعد نہ تاج و تخت اس کے ساتھ جاتے ہیں اور نہ فوجوں کی سلامی اور رعایا کے آداب کورنش اس کے کام آتے ہیں! کام آنے والی چیز انسان کے اعمال ہیں! اس دنیا میں جس کے اقتدار و اختیار کے حدود جتنے زیادہ وسیع ہیں، اتنی ہی اس کی ذمہ داریاں بڑھی ہوئی ہیں، پس جس کسی نے اللہ کی رضا اور آخرت کی باز پرس کو ذہن میں رکھ کر زندگی گزاری، اس کی زندگی کامیاب ہی، وہ جس نے آخرت کو فراموش کر دیا، وہ بہت بڑے خسارے میں رہا، حضرت عمر ابن عبدالعزیز پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں نازل ہوں، انھوں نے اس راز کو پا لیا تھا، حکومت کی زمام کار ان کے ہاتھ میں آئی، تو انھوں نے اپنے تمام اختیارات کا رُخ معاشرے اور حکومت کی اخلاقی اصلاح کی طرف پھیر دیا، انھوں نے پچھلے حکمرانوں کی چھوڑی ہوئی برائیوں کو ایک ایک کر کے مٹایا، یہاں تک کہ لوگوں نے محسوس کیا کہ "خلافتِ راشدہ" کا مُبارک عہد پھر سے لوٹ آیا ہے!

پاکستان انہی مقدس وعدوں اور نیک تمناؤں کی بنیاد پر وجود میں آیا ہے، اللہ تعالیٰ سے ہماری دُعا ہے کہ پاکستان کو دیکھ کر دنیا کہنے لگے کہ یہ تو "خلافتِ راشدہ" کی تاریخ دہرائی جا رہی ہے!

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝

ماہر القادری

۲۶ نومبر ۱۹۵۸ء

اسلام اور غیر مسلم

زیر ترتیب "سرورِ کائنات" جلد سوم کے چند ورق

ملّا محمد واحدی

مذہب عیسوی کی یہ ہدایت بہت مشہور ہے کہ "تیرے دائیں گال پر اگر کوئی تھپڑ مارے تو بایاں گال بھی اُس کے آگے کر دے"۔ لیکن اس ہدایت کے مطابق عمل کرتے ہم نے کسی عیسائی کو نہیں دیکھا اور نہ سُنا اور نہ کتابوں میں پڑھا کہ فلاں دور ایسا گزرا ہے کہ عیسائی دائیں گال پر تھپڑ مارنے والے کے آگے بایاں گال کر دیا کرتے تھے کہ اسے بھی نوازیئے۔ آجکل کا حال آپ کے سامنے ہے۔

ہندوؤں میں بے شک ایسے لوگ کچھ موجود ہیں جو منہ کے اوپر کپڑا باندھے رہتے ہیں تاکہ ہوائی جراثیم سانس کے ساتھ صرف ناک کے راستے سے جائیں، منہ کے راستے سے نہ جائیں اور اُن کی کم تعداد ہلاک ہو۔ موذی جانوروں کو ہلاک نہ کرنا شاید سب ہندوؤں کا مذہب ہے مگر احساس پیدا ہوتا جاتا ہے کہ ان باتوں نے ہندوؤں کو بزدل بنا رکھا ہے۔

اسلام ایسی بے معنی رحم دلی نہیں سکھاتا۔ اور بایاں گال آگے کرنے کی خلاف فطرت تعلیم نہیں دیتا۔ اسلام کا رحم دکھائی دینے والے کیڑوں اور جانوروں تک محدود ہے[1]۔

ایک سفر میں حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھا کہ صحابہ جس جگہ کھانا پکا رہے ہیں وہاں چیونٹیاں ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا یہاں کھانا مت پکاؤ۔ ان چیونٹیوں کی جان کا خیال کرو۔ ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء۔ تم زمین والوں پر رحم کھاؤ آسمان والا تم پر رحم فرمائے گا۔ من یحرم الرفق یحرم الخیر۔ جو انسان نرمی سے محروم ہو گیا وہ ہر نیکی سے محروم ہو گیا (حدیث) لیکن موذی جانوروں کو مارنے سے اسلام نہیں روکتا۔ قتل الموذی قبل الایذا مسلمانوں کا تکیہ کلام ہے[2]۔

اسلام رحم کے وقت رحم کراتا ہے اور سختی کے وقت سختی۔ کیڑے مکوڑوں سے لے کر انسانوں تک سے برتاؤ کی اسلام نے ہدایات دی ہیں۔ اسلام انسان اور انسانیت کا بڑا قدردان ہے۔ مسلمانوں مسلمانوں میں پھوٹ پڑنے کو تو اسلام نے شرک کے مشابہ بتایا ہے یعنی عظیم ترین گناہ۔ لا تکونوا من المشرکین من الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعا ... (اے مسلمانو، تم کہیں مشرکین کی صف میں نہ جا ملنا جنھوں نے اپنے دین کے پرچھے اڑا دیئے ہیں اور گروہ گروہ ہو گئے ہیں گویا متفرق اور منتشر ہونا شرک یا مثل شرک یا مثل شرک ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام جب اُمت کو حضرت ہارون علیہ السلام کے سپرد کر کے توریت لینے طور پہاڑ پر گئے اور ان کے پیچھے سامری نے امت سے بچھڑے کی پوجا کرا دی تو موسیٰ غصے میں بھرے (اور) غم میں ڈوبے واپس آئے (اور) کہنے لگے اے میری قوم والو! تمہاری عقلیں کہاں چلی گئی تھیں) کیا تم سے تمہارے رب نے (توریت جیسی مشفق کتاب دینے کا) پیارا وعدہ نہیں فرمایا تھا۔ کیا اس وعدے

[1] اسلام میں افراط اور تفریط دونوں ناجائز ہیں۔ وصف اسلام کے نزدیک اسی وقت تک وصف ہے جب تک وہ معتدل در مناسب ہے۔ روپیہ خرچ کرنا اچھی بات ہے لیکن افراط سے خرچ کیا جائے گا تو اسراف کہلائے گا اور تفریط سے خرچ کیا جائے گا تو بخل کے حکم میں آئیگا اسی طرح اسلام شرافت اور بے غیرتی کا فرق سکھاتا ہے۔

[2] موذی جانور کو ایذا پانے سے قبل مار ڈالو۔

[3] یہاں سے "وعدیاں نہ دیا" تک قرآن مجید کا بیان ہے۔

کے پورا ہونے میں چند دن لگ جانے سے وہ) وعدہ تمہیں (بہت) لمبا معلوم ہوا۔ یا تم نے (جان بوجھ کر) اس کی تمنا کی ہے کہ تمہارے رب کا قہر تم پر ٹوٹ پڑے۔ تم نے مجھ سے پیمان (حق پرستی) باندھ کر توڑ ڈالا ہے۔ وہ بولے (اے موسیٰ) ہم نے تم سے پیمان بطور خود نہیں توڑا بلکہ (ہم سامری کے بہکائے میں آگئے۔ واقعہ یہ ہے کہ مصر سے روانہ ہوتے وقت) قبطیوں کے زیورات کے گٹھڑ ہم پر لاد دیئے گئے تھے۔ ہم نے (سامری کے کہنے سے پگھلانے کے لئے) اُن (زیورات) کو (آگ میں) ڈال دیا۔ علیٰ ہذا سامری نے (اپنا زیور بھی لاکر) ڈالا۔ پھر اس نے (ہم) لوگوں کے واسطے (اس پگھلے ہوئے سونے سے) بچھڑے جیسا ایک ڈھانچہ (ڈھال کر) نکالا۔ جس میں سے بچھڑے جیسی آواز نکلتی تھی۔ تو (پھر) سامری اور سامری کے ساتھیوں نے کہا کہ یہ تمہارا معبود ہے اور موسیٰ کا معبود (در اصل یہی) ہے۔ موسیٰ جو طور پر گئے ہیں تو بھول کر گئے ہیں (وہاں جانے کی حقیقتاً ضرورت نہیں تھی) موسیٰ نے (ہارون کے سر اور داڑھی کے بال پکڑ کر) کہا اے ہارون! جب تو نے دیکھا (تھا) کہ یہ گمراہ ہوئے جاتے ہیں تو میری پیروی (اور میری تقلید میں انہیں سمجھانے) سے تجھے کس نے روکا تھا۔ کیا تو نے (بھی) میری نافرمانی کی۔

ہارون نے کہا اے میرے ماں جائے! میری داڑھی اور سر کے بال نہ پکڑ (اور مجھ پر گرم مت ہو۔ نرمی سے جتنا سمجھایا جا سکتا تھا میں نے سمجھایا۔ لیکن میری سُنی نہیں گئی۔ ہاں) اس بات سے میں بے شک ڈرا کہ سختی برتوں اور گو سالہ پرستی سے زبردستی روکوں، تو کہیں تم مجھ سے (نہ) کہو کہ تو نے بنی اسرائیل میں تفرقہ پیدا کر دیا اور (میں تو صلح سلامتی سے رہنے کو کہہ گیا تھا) تو نے میری بات کا خیال نہ رکھا۔ اِنِّیْ خَشِیْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَیْنَ بَنِیْ اِسْرَآئِیْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِیْ

جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ نہیں فرمایا کہ تفرقہ پڑنے دیا ہوتا گویا حضرت ہارون علیہ السلام کا عذر قبول کر لیا۔ پھر حضرت ہارون علیہ السلام خود بھی نبی تھے، ان کا جواب غلط ہو ہی کیسے سکتا تھا۔ مزید برآں اللہ اُن کے جواب کو بیان کر کے غلط نہیں بتاتا ہے سے اندازہ لگائیے کہ اتحاد رکھنا اور تفرقہ نہ ہونے دینا کتنا اہم ہے۔ حضرت ہارون علیہ السلام نے اتحاد کی خاطر بنی اسرائیل کے جلد باز مشرکوں پر اتنی سختی نہیں کی۔ جتنی سختی کا حضرت موسیٰ علیہ السلام انہیں مستحق سمجھ رہے تھے۔

انسان نوازی اس سے زیادہ کیا ممکن ہے۔ بھول کر شرک بھی کر بیٹھیں تو پتہ نہ کاٹو۔ شرک چھوڑ کر لوگ توحید اختیار کر سکتے ہیں لیکن پتہ کٹ گیا اور تفرقہ پڑ گیا تو نہ توحید اختیار کریں گے اور نہ دنیا کو چین سے رہنے دیں گے۔

حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔ اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ .. لوگوں کو اپنے رب کے راستے پر حکمت کے ساتھ اور نیک و بد سمجھا کر بلاؤ۔ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ اور ان کے اعتراض کا جواب دو تو ایسے طریقے سے دو کہ انہیں خوشگوار محسوس ہو۔

جو طرز ہم نے اختیار کر لیا ہے یہی طرز حضور کا ہوتا تو اسلام نہ پھیلتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ...
(اے محمدؐ! یہ) اللہ کی رحمت ہے کہ تم ان (لوگوں) کے حق میں نرم ہو۔ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ...
.... اور جو کہیں تم تُند خو اور سخت قلب ہوتے تو (سب) تمہارے پاس سے بھاگ جاتے۔

پیغمبر کا نرم دل ہونا اللہ کا احسان ہے تو عام مبلغین اور مصلحین کو سخت برتاؤ کی کہاں گنجائش رہی۔ اور سختی کر کے پیغمبر توقع نہیں رکھ سکتا کہ لوگ اس کی طرف کھنچیں گے تو عام مبلغین و مصلحین سختی برت کر کامیابی کی توقع کیسے کر سکتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا نخواستہ مسلمان تکلیف نہیں دیتے تھے۔ حضور کے جس تحمل کی دنیا معترف ہے وہ غیر مسلموں کے معاملہ میں تھا۔ غیر مسلموں کی فقط زبانوں سے نہیں، غیر مسلموں کے ہاتھوں سے حضور تکلیفیں اٹھاتے تھے۔ مگر بددعا نہیں دیتے تھے

بلکہ دعا کرتے تھے کہ الٰہی ان کی آنکھیں کھول۔ اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِي إِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ یا اللہ انہیں ہدایت دے۔ یہ جاہل ہیں۔ حق ناحق کو... پہچانتے نہیں ہیں۔

مسلمانوں کو حکم ہے:۔ لَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللّٰهِ شاہ رفیع الدین صاحب نے اس کا ترجمہ کیا ہے:"مت برا کہو ان لوگوں کو کہ پکارتے ہیں سوائے خدا کے" یعنی جو اللہ کی بجائے اوروں کی پرستش کرتے ہیں انہیں برا مت کہو۔

إِلَّا الَّذِينَ يَصِلُونَ إِلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ أَوْ جَاءُوكُمْ حَصِرَتْ صُدُورُهُمْ أَن يُقَاتِلُوكُمْ أَوْ يُقَاتِلُوا قَوْمَهُمْ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقَاتَلُوكُمْ

جو غیر مسلم، اُن لوگوں میں جاملے ہیں جن سے تمہارا عہد و پیمان ہے یا (ایسے غیر مسلم) جنہیں اپنی قوم کی طرفداری کر کے تم سے لڑنا اور تمہاری طرفداری کر کے اپنی قوم سے لڑنا پسند نہیں ہے اور وہ تنگ آکر تمہارے ہاں پہنچ گئے ہیں تو انہیں گرفتار کرنا و قتل کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ اللہ اگر چاہتا تو اُن کو تم پر مسلط کر دیتا (اور) پھر وہ تم سے ضرور لڑتے (مگر اللہ نے اُن کے دلوں کو تم سے مرعوب کر دیا) فَإِنِ اعْتَزَلُوكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوكُمْ وَأَلْقَوْا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلًا ....

لہٰذا یہ غیر مسلم تم کو ستانے سے باز رہیں اور تم سے نہ لڑیں اور تمہارے ساتھ سلامت روی کا برتاؤ برتیں تو اللہ نے ایسے غیر مسلموں پر سختی کرنے کا تمہارے لئے کوئی راستہ نہیں چھوڑا ہے (سختی کرنے کے تمام راستے بند کر دیئے ہیں۔

اور ارشاد ہے:۔ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُل لَّهُمْ فِي أَنفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا (اے محمدؐ) منافقوں سے درگزر کرو اور انہیں سمجھاؤ اور ایسی باتیں کہو کہ اُن کے دل میں اتریں۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ کسی قوم کی دشمنی تمہیں انصاف سے نہ بھٹکائے۔ سب کے ساتھ انصاف کرو۔ یہ بات تقویٰ سے قریب تر ہے۔

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ ۖ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ .... دین کے معاملے میں زبردستی نہیں کی جا سکتی (دین کا معاملہ دل کا معاملہ ہے۔ جس کا دل ہی دین کی جانب نہیں آیا اُسے زبردستی دین میں شامل کرنے سے حاصل کیا ہے)، صحیح راستہ غلط راستے سے نمایاں ہو چکا۔ (اب جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے ایمان نہ لائے) فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ فَإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ الْمُبِينُ ...... (اے پیغمبر! سمجھانے پر بھی لوگ نہ سمجھیں اور منہ موڑ کر چل دیں تو تمہارے ذمہ تو صرف حکم الٰہی پہنچا دینا ہے۔

لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ ...... تم اُن پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجے گئے ہو۔

لَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ ....

.... نیکی اور بدی برابر کی چیزیں نہیں، برائی کا دفعیہ ایسے برتاؤ سے کرو کہ وہ دوسرے کو بھلا لگے۔ اگر تم نے یہ کیا تو (تم دیکھو گے کہ) تم میں اور جس شخص میں عداوت تھی وہ تمہارا دلی دوست بن گیا۔ اس قسم کے برتاؤ کی توفیق انہی کو دی جاتی ہے جو صبر اور ضبط سے کام لیتے ہیں اور جنہیں اس قسم کی توفیق ملتی ہے وہ بڑے صاحب نصیب ہوتے ہیں۔

مسلمانوں کو تو یہ اختیار نہیں چھوڑا گیا کہ اہل ہوں یا نہ ہوں دین کے معاملوں میں جمہور مسلمین سے اختلاف کرنے بیٹھ جائیں، اور کبھی روس کی کسوٹی پر دین کی جانچ کریں اور کبھی امریکہ کی کسوٹی پر۔ لیکن غیر مسلم اللہ کے نزدیک دین کے معاملے میں آزاد ہیں۔ انہیں

اسلام کی تبلیغ کردی جائے، اس کے بعد وہ جائیں اور اُن کا خدا جانے۔ جو غیر مسلم اسلام کی تبلیغ میں مزاحمت نہ کریں اور اسلامی نظام سے نہ ٹکرائیں انہیں اسلام نے امن کی زندگی گزرنے کا بالکل مسلمانوں جیسا حق دیا ہے، وہ اپنے مذہب کے مطابق امور زندگی کی تنظیم کرسکتے ہیں اور عبادات بجا لاسکتے ہیں۔ اسلام قطعی دخل نہ دے گا بلکہ اُن کے عبادت خانوں کی حفاظت کرے گا۔

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے یثرب (مدینہ منورہ) پہنچ کر فقط مسلمان مہاجرین اور مسلمان انصار کا ہی بھائی چارہ نہیں کرایا تھا، یثرب کے یہودیوں سے بھی مسلمانوں کو ملا دیا تھا اور اس ملاپ اور سمجھوتے میں یہودیوں کی مذہبی آزادی کا صاف صاف اعلان کیا تھا۔

ایک دفعہ یہودی توریت لے کر حضورؐ کے پاس آئے۔ حضورؐ نے توریت کو تکیے پر رکھ لیا اور فرمایا "میں اس کتاب کی بھی تعظیم کرتا ہوں اور اس کتاب کے لانے والے (یعنی موسیٰ علیہ السلام) کی بھی تعظیم کرتا ہوں"۔

نجرانی عیسائیوں کا وفد حضورؐ کی خدمت میں آیا تو حضورؐ نے انہیں مسجد میں اپنے طریقے سے عبادت کرنے کی اجازت دے دی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا۔ یا رسول اللہؐ! یہ تو نجس ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا کوئی انسان نجس نہیں ہوتا۔ البتہ انسان اپنے کو خود نجس بنا لیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نیک توفیق عطا فرمائے انہیں جو چھوٹے چھوٹے مسائل اُٹھا کر مسلمانوں کو مسلمانوں سے لڑواتے ہیں۔

۵ ستمبر ۱۹۵۹ء کے صدقِ جدید (لکھنؤ) نے رسالہ برہان (دہلی) سے حضرت الفاضل علامہ گیلانی رح کے کسی مضمون کا اقتباس نقل کیا ہے علامہ علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں: "کیدانی کے فقہ کے متن کی ایک عبارت کی بدولت سرحد کابل و ترکستان وغیرہ میں معمولی فقہی جزئیہ کی وجہ سے ایک فتنہ صدیوں برپا رہا۔ یعنی نماز میں التحیات پڑھتے ہوئے تشہد کے موقع پر انگلی اٹھائی جائے یا نہ اٹھائی جائے۔ کیدانی کا رجحان انگلی نہ اٹھانے کی طرف ہے اس پر اصرار کرنے والے اسرار کرتے تھے اور جو انگلی اٹھاتا تھا بسا اوقات اس کی انگلیاں توڑ دی جاتی تھیں یا مروڑ لی جاتی تھیں۔ علامہ رشید رضا آفندی مصری نے براہِ راست بعض افغانیوں سے پوچھا۔ انھوں نے تسلیم کیا کہ ہاں ایسا ہوتا تھا"۔

ایسا ہی ہونے نے اسلام کو بدنام کر دیا۔ غیر مسلم کیا مسلم بھی اسلام کی سبقاً سبقاً تعلیم نہیں پاتے۔ سب یہ دیکھتے ہیں کہ اسلام کے پیرووں کی روش کیا ہے۔ اسلام کے پیرو کر کیا رہے ہیں۔ پیرووں کی حرکتوں سے اسلام کی بابت رائے قائم کی جانی قدرتی بات ہے۔ میری یہ مختصر سی تحریر وہ رائے کیونکر بدلے گی۔ بہرحال مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے والے بھی ملا ہیں اور میں بھی ملا ہوں۔ میں غیر مسلموں کے دل سے غلط فہمیاں دھونی چاہتا ہوں اور علامہ گیلانی رح تو آخری زمانے کے ممتاز عالم تھے* لڑنے والوں ہی کو کیوں دیکھا جائے۔

* اپنے پورے دین پر کسی قوم نے کبھی عمل نہیں کیا۔ صرف ہمارے دین کا ایک دور ایسا گزرا ہے کہ قوم کی قوم دین کے رنگ میں رنگ گئی تھی۔ لیکن ادھر خلافت خود غرضی سے بدلی اُدھر وہ دور ڈھلنے لگا اور ڈھلتے ڈھلتے بڑی بڑی نوبت کو پہنچ گیا۔ علمائے سوء اور خود غرضی کی پیداوار ہیں۔ اسلام جیسے عاقلانہ اور شریفانہ دین کو سبک خود غرضی ہی نے کیا ہے۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمایا کرتے تھے مسلمانو! مجھے ڈر ہے تم دولت و اقتدار سے نہ لگ جاؤ۔ (او کما قال) حضورؐ کی پیشین گوئی پوری ہوئی دولت و اقتدار ہر قوم کو اندھا اور بے آپے کر دیتے ہیں۔ یہ تو اللہ کا بڑا فضل تھا اور ہے کہ مسلمانوں میں علمائے خیر بھی برابر پیدا ہوتے رہے (اور) برابر پیدا ہو رہے ہیں اور اسلام پر قوم کی قوم کا نہ سہی فرد کا کم و بیش عمل ہمیشہ رہا ہے اور اب تک ہے۔ اُن افراد میں لاکھوں کے نام زندہ ہیں اور کروڑوں ایسے ہیں جن کے نام ہم اب نہیں جانتے۔ خدا جانے کتنے تھے۔ جن کے نزدیک حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رح کی طرح اصلی کرامت قرآن و سنت کی پیروی ہی تھی اور جو ہر آن یہ سمجھتے تھے کہ (مَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ) جس نے اللہ کی حدود (اور اللہ کے بتلائے ہوئے قانون) کو توڑا اس نے یقیناً خود اپنے نفس پر ظلمِ عظیم کیا۔ (اپنا دین بھی بگاڑ لیا اور دنیا بھی)

بلانے والوں کی بھی سنئے:۔

اسلام نے ہرگز ان سختیوں کی اجازت نہیں دی۔ اسلام نے نرمی و شفقت اور رحم و رافت کی ہدایت فرمائی ہے اور رواداری کو قائم کیا کر ہم خیال و ہم عقیدہ بنانے کے لئے دباؤ استعمال کرنا اور اختلاف خیال و عقیدہ کی بنا پر تنگ کرنا اسلام میں منع ہے۔ لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ اسلام کا دستور العمل ہے۔

ذرا ملاحظہ کیجئے:۔ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے عرب کے یہودیوں کو کیا سند عطا کی تھی۔ سر ولیم میور اپنی کتاب "لائیف آف محمدؐ" میں اس سند کے حسب ذیل الفاظ لکھتے ہیں:۔

"یہودیوں کی امداد و اعانت کی جائے گی۔ یہودی اپنے مذہب پر رہیں گے اور مسلمان اپنے مذہب پر، لیکن بیرونی حملوں کی مدافعت میں یہودی اور مسلمان یک دوسرے کا ساتھ دیں گے:"

ایک اور فرمان:۔

"یہ فرمان محمد رسول اللہؐ نے تمام قریش اور تمام اہل یثرب کو لکھ کر دیا ہے خواہ وہ کسی مذہب اور کسی قوم سے تعلق رکھتے ہوں کہ صلح و جنگ کی حالت سب کے لئے عام ہوگی۔ یہود جو ہماری حکومت اسلامیہ میں رہتے ہیں انہیں ہر اذیت اور ذلت سے بچایا جائے گا۔ انہیں نصرت و حمایت وحسن سلوک کے حقوق مسلمانوں کے مساوی حاصل رہیں گے۔ بنی عوف، بنی نجار، بنی حشم، بنی غالب، بنی اوس، (یعنی یہود) اور جملہ باشندگان یثرب مسلمانوں کے ساتھ ایک قوم سمجھے جائیں گے۔

جو قبیلے یہود کے دوست ہیں اور یہود کے زیر حفاظت ہیں ان کا بھی ویسا ہی اعزاز کیا جائے گا جیسا کہ خود یہود کا کیا جائے گا:"

عیسائیوں کے لئے امن نامہ:۔

"یہ امن نامہ ہے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف سے یوحنا بن روبہ (ایلہ کے حاکم) اور ایلہ کے پادریوں اور باقی تمام لوگوں کے لئے جو خشکی میں ہوں یا تری میں، وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی امان میں ہیں:"

منذر بن ساوی کے نام خط:۔

"ہمارے قاصدوں نے تمہاری نسبت اچھے خیالات ظاہر کئے ہیں۔ جو لوگ مسلمان ہو گئے ہیں انہیں مسلمان رہنے دو اور جنہوں نے نہیں مانا ہے انہیں میں نے معاف کر دیا۔ تم بھی معاف کر دو۔"

تم جب تک عدل و انصاف کرتے رہو گے تمہیں معزول نہیں کیا جائے گا۔ یہودی اور مجوسی اپنے اپنے مذہب پر رہیں۔ اُن سے صرف جزیہ (ٹیکس) لیا جائے گا:"

آزادی کی انتہا:۔

یہ عہد نامہ ہے جسے محمدؐ بن عبد اللہ، رسول اور بشیر و نذیر نے لکھا ہے تاکہ بعد کے لوگوں کے لئے عذر اور بہانہ باقی نہ رہے۔ اس عہد نامے کو میں نے نزدیک اور دور، مشرق و مغرب، عرب

اور عجم، حال اور مستقبل کے عیسائیوں کے واسطے لکھا ہے۔ مسلمانوں میں سے جو اس عہد کو توڑے گا اور اس سے تجاوز کرے گا وہ اللہ کے ہاں، عہد شکن ٹھیرے گا اور اللہ کی لعنت کا سزاوار ہوگا۔ خواہ حاکم ہو یا رعیت۔

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر کوئی راہب یا عیسائی سیاح دغیرہ پہاڑ، جنگل، آبادی، صحرا یا عبادت خانے میں میری حمایت کا خواستگار ہوگا تو میں اپنے اعوان و انصار کے ساتھ اسکی حمایت کروں گا اور اسے اس کے دشمنوں سے بچاؤں گا کیونکہ وہ میرے ذمی ہیں اور مجھے دشمنوں کی ایذا سے بچنے کے لئے جزیہ (ٹیکس) دیتے ہیں۔ لیکن اگر وہ چاہیں کہ اپنی جان، مال اور آبرو کی بطور خود حفاظت کریں تو میں اس پر بھی رضامند ہوں۔

کسی بشپ کو اس کے عہدے سے، کسی راہب کو اس کی رہبانیت سے اور کسی عابد کو اس کی عبادت گاہ سے اور کسی سیاح کو اس کی سیاحت سے نہ روکا جائے۔ ان کی گرجا ئیں منہدم نہ کی جائیں، گرجاؤں کی کوئی چیز مسجدوں اور گھروں کے بننے میں نہ لگائی جائے۔ جو مسلمان ایسا کرے گا وہ اللہ اور رسولؐ سے وعدہ شکنی کرے گا۔

راہبوں اور بشپوں سے جزیہ (ٹیکس) اور تاوان نہ لیا جائے۔ جو عیسائی امکنہ متبرکہ میں گوشہ نشین ہیں، وہ جو کچھ بوتیں جوتیں اس کا اُن سے عُشر نہ لیا جائے اور غلہ کی اُن کے ہاں کمی پڑے تو انہیں غلہ دیا جائے۔ جنگ میں مدد کرنے کی تکلیف وہ چاہیں کریں چاہیں نہ کریں۔ اس عہد کی خلاف ورزی قیامت تک نہ ہو۔"

والٹیئر کا قول ہے:-

"میں اس بات سے جو آپ کہتے ہیں مکمل اختلاف کرتا ہوں، لیکن آپ کو یہ بات کہنے کا قطعی حق ہے اور میں آپ کے اس حق کے لئے تادم زیست لڑتا رہوں گا۔" اس ذہنیت کی بنیاد حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ڈالی تھی جنہیں اسلام اور اسلام کے پیروؤں سے کدورت ہو اسلام اور اسلام کے سچے پیروؤں کے نزدیک، انہیں حق ہے کہ وہ اپنے عقائد پر رہیں اور عزت آبرو اور آزادی کے ساتھ زندگی گزاریں۔ بلکہ یہی پالیسی تھی جسے اسلام کے ناقص پیروؤں یعنی مطلق العنان بادشاہوں تک نے نباہا۔ مسلمانوں میں ذاتی عقائد ٹھونسنے کی مثالیں ملتی ہیں لیکن غیر مسلموں کے عقائد وغیرہ سے کبھی چھیڑ نہیں کی گئی۔ اور سچے مسلمانوں کا کام تو ہمیشہ صرف اسلام کا پہنچا دینا رہا، اسلام کا ٹھونسنا کبھی نہیں رہا۔

خلفائے راشدین کے معاہدے حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے معاہدوں کی طرح محفوظ ہیں اور شاہانِ اسلام کا حال عام تاریخوں میں پڑھ لیجئے۔ ذیل میں فقط ایک خلیفہ کے معاہدے کا اقتباس درج کرتا ہوں۔ حضورؐ کے معاہدوں اور خلیفہ کے معاہدے میں ذرہ برابر فرق نہیں ہے۔ فرماتے ہیں:-

"اللہ کے نام پر جو غفور اور رحیم ہے، یہ معاہدۂ حفاظت ہے جسے اللہ کا بندہ عمرؓ اہل اسلام کے

سالار کی حیثیت سے یروشلم کے لوگوں کے ساتھ کرتا ہے۔ عمر یروشلم کے عیسائیوں کو ہی جان مال، معابد، صلیبوں اور مریضوں اور صحت مندوں، سب کی حفاظت کی ضمانت دیتا ہے اُن کے معبدوں کو منہدم نہیں کیا جائے گا۔ انہیں اُن کے قبضے میں رکھا جائے گا۔ نیز انکی کوئی زمین نہیں چھینی جائے گی۔ یہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کی رُو سے ہے اور میرے پیشرو خلیفہ (ابوبکر صدیق رضؓ) کی ارشادات کے مطابق ہے اور تمام اہل اسلام کے منشا کے مطابق ہے۔"

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ایک مشرک عورت اسلام کی ہجو میں اشعار گاتی پھرتی تھی۔ حاکم نے اسے گرفتار کرلیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کو اطلاع ہوئی تو حضرت نے حاکم کے نام اس مضمون کی تحریر بھیجی:۔

"ہم نے اسکے شرک سے درگزر کیا ہے تو ہجو تو بہرحال شرک سے کم درجے کی شے ہے۔"

حضرت اُسامہ بن زید جب فوج لے کر رومیوں کے مقابلے کے لئے شام جانے لگے تو حضرت ابوبکرؓ نے اُن سے فرمایا:

"دیکھو فریب، دغا، خیانت اور مثلہ (یعنی ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالنے) سے بچنا۔ عورتیں، بچے اور بوڑھے قتل نہ ہونے پائیں۔ گوشہ نشین لوگوں پر سختی نہ کی جائے۔"

ایک مرتبہ عراق کے عیسائیوں نے حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں عرض کیا کہ جسے آپ نے ہم پر حاکم مقرر فرمایا ہے، وہ ہمیں ستاتا ہے، حضرت ابوبکرؓ نے تحقیقات کے بعد حاکم کو لکھا:۔

"تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم سے روگردانی کی ہے کہ غیر مسلموں کے حقوق کا خیال رکھا جائے۔ لہٰذا جواب دہی کے لئے تیار رہو۔ اور پھر اُسے بلا کر عہدے سے ہٹا دیا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں دمشق کا محاصرہ ہو رہا تھا۔ ایک سمت حضرت ابو عبیدہؓ نے گھیر ڈال رکھا تھا۔ دوسری سمت حضرت خالدؓ نے۔ حضرت خالد موقع پاکر شہر پناہ کے اوپر چڑھ گئے اور اندر اتر کر انھوں نے شہر پناہ کا دروازہ کھول دیا۔ فوج شہر میں داخل ہوگئی۔ حضرت ابو عبیدہ کو اس کی خبر نہ تھی۔ اہل شہر نے حضرت ابو عبیدہ کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور حضرت ابو عبیدہ سے صلح کرلی۔ شہر میں مسلمانوں کا ایک کمانڈر ایک سمت سے فاتحانہ گھس رہا تھا اور دوسرا کمانڈر دوسری سمت سے صلح قبول کرکے آرہا تھا۔ وسط شہر میں دونوں کی ملاقات ہوئی اور عقدہ کھلا۔ حضرت خالدؓ نے صلح کا احترام کیا اور فتح کردہ حصے کو بھی صلح کے ماتحت کردیا۔ قیدی چھوڑ دیئے اور مال غنیمت لوٹا دیا۔

اسکندریہ پر قبضہ کرتے وقت کسی مسلمان سپاہی کے تیر سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مجسمے کی آنکھ ٹوٹ گئی تھی۔ اسکندریہ کے عیسائیوں نے فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص سے کہا کہ تم عدل کے مدعی ہو تو اپنے پیغمبر کا مجسمہ بناؤ، ہم اسکی آنکھ توڑیں گے۔ حضرت عمرو بن العاص نے فرمایا۔ یہ تو بالکل لغویات ہے۔ لو یہ خنجر لو اور میری آنکھ پھوڑ دو۔ خنجر عیسائی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ مگر عیسائی اس جرأتِ مومنانہ سے ایسا متاثر ہوا کہ خنجر اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔

والی مصر حضرت عمرو بن العاص چوگان کھیل رہے تھے۔ کسی قبطی کا گھوڑا حضرت عمرو بن العاص کے گھوڑے سے آگے نکل گیا۔ حضرت عمرو بن العاص کے بیٹے عبداللہ کو غصہ آگیا۔ انھوں نے قبطی کی کوڑے سے خبر لے ڈالی۔ قبطی مدینہ منورہ پہنچا اور حضرت عمرؓ کے سامنے یہ واقعہ پیش کیا۔ حضرت عمرؓ نے حضرت عمرو بن العاص اور ان کے بیٹے کی طلبی کے احکام جاری کردیئے۔ وہ دونوں حاضر ہوگئے

تو قبطی سے کہا جس نے تجھے کوڑے سے پیٹا تھا تو بھی اس کے کوڑے مار جتنے اس نے مارے تھے۔ چنانچہ قبطی نے عبداللہ سے بدلہ لیا۔
تمام شریف عیسائی مورخ ان حقائق کو تسلیم کرتے ہیں۔

ایڈم میٹس اپنی تصنیف "چوتھی صدی ہجری میں اسلام کی نشاۃ الثانیہ" میں قرون وسطیٰ کی اسلامی تہذیب کے ایک وصف کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "مسلمانوں کی صفوں میں دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کی بڑی تعداد ملتی ہے جو اس رواداری ہم آہنگی اور رفیقانہ تعاون کا نتیجہ تھی جس کی اسلام نے تعلیم دی ہے اور جس سے اس زمانے کا یورپ ناواقف تھا۔ اسلامی قوانین حکومت میں غیر مسلموں پر کاروبار کے سلسلے میں مطلق پابندی عائد نہیں کی گئی ہے۔ چنانچہ اسلامی مملکتوں میں بعض بڑے نفع بخش کاروبار پر غیر مسلم قابض تھے اور اُن کے پاس بڑی دولت تھی اور ملکیتیں تھیں، اسلامی حکمرانوں نے شاذ ہی کبھی غیر مسلم رعایا کے معاملات میں مداخلت کی ہوگی۔ بلکہ اس کے برعکس وہ غیر مسلموں کے میلوں اور تہواروں اور رسوم میں حصہ لیتے تھے۔"

"مقامی اور غیر ملکی کلچر، فلسفہ اور تصوف، قدامت پسندی اور جدت پسندی، سب کو اسلام کی آغوش میں جگہ حاصل ہے۔ انسانی علم کا کوئی میدان ایسا نہیں ہے جس میں اسلام نے ذہنی سرگرمیوں پر قدغن عائد کیا ہو۔ اسلام میں مذہب اور سائنس کا اختلاف کوئی اہم مسئلہ نہیں ہے۔"

"انسانی ترقی کے موجودہ دور میں مسلمان اگر مندرجہ بالا حقیقت کو سمجھ لیں تو اُن کی خود اعتمادی عود کر آئے گی اور وہ امن عالم کو برقرار رکھنے اور انسانی خوشحالی کے اضافے میں موثر حصہ لے سکیں گے۔ اور مغرب کے لوگ اس حقیقت پر غور کریں تو انہیں پتہ چلے گا کہ... مشرق کے روحانی ورثے میں اسلام نے کتنا گراں قدر اضافہ کیا ہے۔"

ان واقعات کو پڑھنے کے بعد منصف مزاج یورپین محقق بے اختیار کہہ گئے ہیں :-

" یہ الزام کہ اسلام قبول نہ کرنے کی سزا تلوار تھی اسی طرح بیہودہ ہے جس طرح اور مزم جو،
غیر مذاہب والوں نے قطعی ناانصافی سے اسلام پر لگائے ہیں۔
الزام لگانے والے یا تو اسلام کو جانتے نہیں یا دیدہ و دانستہ حق پوشی کرتے تھے۔"

(ڈاکٹر ریچ۔ ڈی۔ سینٹ ہیلر)

"مذاہب عالم میں اسلام تنہا ایسا مذہب ہے جو تنخواہ دار مبلغوں اور متمول تبلیغی مشنوں کی بجائے عامۃ المسلمین کے ذریعہ زمین کے اس سرے سے اُس سرے تک پھیل گیا۔
اسلام کی اشاعت مسلمان سلاطین نے نہیں کی، بلکہ صوفیوں، سیاحوں اور تاجروں نے اپنا اچھا نمونہ پیش کر کے اسلام کو پھیلایا۔
مسلمان تاجر بڑے کامیاب مبلغ ثابت ہوتے۔ صوفیوں کا پھر بھی ایک مشن تھا۔ وہ تھے ہی اسلام کے واسطے وقف، لیکن تاجروں کا تجارت کے دوران میں کچھ اس قسم کا کردار رہتا تھا کہ اسلام خود بخود لوگوں کے دلوں میں اُتر جاتا تھا۔
اسلامی افواج نے کبھی کسی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا۔ اسلامی افواج سے فقط اسلامی مقبوضات کی حفاظت اور نظم و نسق کا کام لیا جاتا تھا۔"

(سر تھامس آرنلڈ)

"اسلامی فوجیں جہاں کہیں گئیں قرآن کی تعلیم اُن کے ساتھ رہی۔ انھوں نے کسی جگہ ظلم و جبر کا ارتکاب نہیں کیا۔ کسی قوم کو انھوں نے اس بنا پر تہ تیغ نہیں کیا کہ وہ اسلام قبول کرنے سے انکار کرتی تھی۔"

(ورڈ جی سن)

"اسلام نے اپنے عقائد منوانے کے لئے تلوار ہرگز نہیں چلائی۔ یہ کہنا کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے ایک من گھڑت افسانہ ہے۔ حقیقت میں مسلمانوں نے مفتوحہ اقوام کے ساتھ جو رواداری برتی ہے اس کی نظیر پچھلی صدیوں کا یورپ نہیں پیش کر سکتا۔"

(سی۔ ڈی۔ بارڈی)

"مسلمان جس ملک میں پہنچے انھوں نے وہاں والوں کے مذہبی غیرت و اعتقادات کو نہیں چھیڑا بلکہ اُن کی مذہبی آزادی کو قائم رہنے دیا۔ قرآن نے مسلمانوں سے کہا ہے کہ جو لوگ تم سے لڑیں تم بھی اُن سے لڑو۔ مگر زیادتی نہ کرو۔ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

(ایچ بالم)

"مشرق کے عیسائی مسلمانوں کی حکومت میں رہنا چاہتے تھے۔ کیونکہ مغرب کے عیسائی حکمراں انہیں رومن کیتھولک بننے کو کہتے تھے اور وہ رومن کیتھولک نہیں بنتے تھے تو انہیں مار ڈالتے تھے .... جن غیر مسلموں نے مسلمانوں کے پیغام صلح کو ٹھکرایا، اُن سے مسلمان بیشک لڑے اور حالتِ جنگ میں غیر مسلموں کے بعض عبادت خانوں کا نقصان بھی ہوا لیکن حالت امن میں اس قسم کا کوئی واقعہ پیش کرنا مشکل ہے۔"

(گبن)

"جن کی طبیعتیں عصبیت سے پاک ہیں وہ بلا ہچر مچر کے اس بات کو تسلیم کریں گے کہ محمدؐ کا دین مشرقی دنیا کے لئے ایک نعمت تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اُسے خونریز تدبیروں کی حاجت نہیں پڑی۔ ایسے دین کے ساتھ گستاخانہ پیش آنا اور اس کی جاہلانہ مذمت کرنا بہت بُری حرکت ہے جنھوں نے عیسائیت اور اسلام دونوں کا مطالعہ کیا ہے وہ یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ اسلام کے احکام عمدہ اور اسلام کے مقاصد اچھے ہیں اور اسلام سے انسانوں کو بڑا فائدہ پہنچا ہے۔"

(جان ڈیون پورٹ)

عیسائی مورخوں کے اعتراف کے آگے کسی مسلمان کی تحریر نقل کرنے کی ضرورت نہیں تھی، لیکن مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کا چونکہ بے شمار غیر مسلم اعتبار کرتے ہیں اُن کے ایک مضمون کا اقتباس پیش کرتا ہوں۔ مولانا لکھتے ہیں:۔

"مسلمان دنیا میں صرف اس لئے آئے ہیں کہ حکومت الٰہیہ قائم کریں۔ اللہ کے عبادت خانوں کی حفاظت کریں۔ وہ نوعِ انسانی کو ظالموں اور سرکشوں کی شرارتوں سے بچائیں۔ چنانچہ جب ایک مذہب دوسرے مذہب کو برباد کرنا چاہتا تھا۔ جبکہ ہر قوم چاہتی تھی کہ خدا کی زمین صرف ہمارے لئے وقف ہو جائے اور کسی دوسری قوم کے مذہب اور مذہبی عمارت کو اس پر جگہ نہ ملے۔ تو مسلمانوں ہی کی تلوار تھی جس نے ان کو ظلم و استبداد سے بچایا اور بربادی اور ہلاکت سے نجات دلائی۔

جزیرۂ عرب و یمن کے اندر مسلمانوں کی وجہ سے عیسائیوں کو جو نفع عظیم پہنچا۔ اس کا تذکرہ طویل اور محتاج تمہید ہے لیکن یہ کون نہیں جانتا کہ مصر کے قبطیوں کو جس قوم نے عیسائیوں کے مذہبی ظلم سے نجات دلائی اور قبطی معابد کو آزادی بخشی، وہ مسلمان ہی تھے۔

چھٹی صدی عیسوی میں خود عیسائیوں ہی کے اندر انتہا درجہ کی مذہبی تفریق، تعصب اور جنگ و جدال تھا۔ ایک چرچ دوسرے چرچ کے پیرو کی تکفیر کرتا تھا اور جلا وطنی کی سزا دیتا تھا اور بسا اوقات زندہ جلا دیتا تھا۔ خصوصیت کے ساتھ گریگ چرچ اس تعصب میں سب سے بڑھ چڑھ کر تھا جس کے ہاتھوں مشہور یعقوبی فرقے کو کیسی کیسی دردانگیز مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔ یہ مسلمان ہی تھے جنھوں نے مصر اور اسکندریہ میں اس فرقے کو پناہ دی۔ یہاں تک کہ اس کے معابد محفوظ ہو گئے اور یہ فرقہ آزادی کے ساتھ اپنے گرجوں کے اندر اقرار توحید کے ساتھ خدائے مسیح کی پرستش کرنے لگا۔

پھر اسلامی حکومتیں قائم ہوئیں۔ گو اسلام کی شرعی خلافت کا یہ دور نہیں تھا۔ تاہم شاہان امویہ و عباسیہ کے عہد پر نظر ڈالو اور دیکھو کہ تمام مذاہب و ملل کو اسلامی حکومتوں میں کس طرح آزادی دے دی گئی تھی اور علی الخصوص عیسائیوں کے فرقے کس طرح مسلمانوں کی بدولت بربادی سے بچ گئے تھے۔

گو خود اسلامی عقائد کو آزادی حاصل نہ تھی۔ شوافع حنابلہ کے دشمن تھے اور حنابلہ شوافع کے۔ سنیوں اور شیعوں کا باہمی قتال بھی ایک داستان خونیں ہے۔ خوارج اور قرامطہ کے حالات تاریخ میں پڑھو۔ ہمیشہ ایک فرقے نے دوسرے فرقے کو تباہ کیا۔ تاہم یہ کیسی عجیب بات ہے کہ مسلمان خود تو ایک دوسرے کو برباد کرتے تھے لیکن غیروں کو انھوں نے ہمیشہ پناہ دی اور ذمیوں کے حقوق دینیہ کی کبھی بے احترامی نہ ہونے دی۔ بغداد کے شوافع نے حنابلہ کا محلہ تو ضرور لوٹ لیا مگر عیسائیوں کے گرجوں کی برابر حفاظت ہوتی رہی۔

گاندھی جی کی رائے بھی سن لیجیے۔ فرماتے ہیں:-

> "قرآن صاف الفاظ میں کہتا ہے لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ یعنی مذہب جبر سے اختیار کرنے کی چیز نہیں ہے۔ پیغمبر اسلام کی سیرت بھی اس اتہام کی پوری تکذیب کرتی ہے کہ اسلام بجبر پھیلا ہے۔ اسلام عالمگیر مذہب ہی نہ ہوتا اگر اس کی جبریہ تبلیغ کی جاتی۔ میرا پختہ عقیدہ ہے کہ اسلام نے تلوار کے بل پر رسوخ نہیں حاصل کیا۔ میں نے ایک بے لوث طالب علم کی طرح پیغمبر اسلام کی سیرت (طرز زندگی) اور قرآن کا مطالعہ کیا ہے۔ میں قرآن کی تعلیمات کو عدم تشدد کے موافق پاتا ہوں"۔

غرضکہ منصف مزاج غیر مسلموں کے بیانات کہاں تک درج کروں۔ بیانات لاتعداد ہیں۔ میں تو سو کی ایک بات کہتا ہوں کہ اسلام کا نمونہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ حجاج بن یوسف جیسے مسلمانوں کی کسوٹی پر اسلام کو نہیں کسنا چاہیے۔ حضور سرور کائنات کا طرز عمل پیش نظر رکھنا چاہیے۔ حضورؐ کا طرز عمل یہ تھا کہ مکہ میں فاتحانہ داخل ہوئے تو سامنے وہ لوگ تھے جنھوں نے حضورؐ کو آٹھ سال وطن سے جدا رکھا تھا اور جو حضورؐ کے راستے میں کانٹے بچھاتے تھے۔ حضورؐ پر آوازے کستے تھے۔ حضورؐ پر پتھر برساتے تھے۔ حضورؐ کو لہولہان کر دیتے تھے۔ نماز پڑھتے میں پشت مبارک کو اوجھڑیوں سے دبا دیتے تھے اور گلے میں پھندے ڈال ڈال کر کھینچتے تھے۔ حضورؐ کو، حضورؐ کے متبعوں اور طرفداروں کو عورتوں اور بچوں سمیت پہاڑ کی گھاٹی میں تین سال محصور رکھ چکے تھے اور درختوں کے پتے اور گرے پڑے

---

[1] حجاج نے بھی ذمیوں پر کوئی ظلم نہیں کیا تھا۔ ظالم وہ مسلمانوں کے لیے تھا۔

سوکھے چمڑے، کھانے پر مجبور کئے گئے تھے۔ غرضکہ حضورؐ نے اور حضورؐ کے متبعوں نے جن کے ہاتھوں سے وہ وہ ظلم سہے تھے کہ ان ظلموں کا تصور رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے اور جسم کو لرزا دیتا ہے۔ لوہے کی تپتی ہوئی سلاخوں سے مسلمانوں کے جسم داغے جاتے تھے۔ انہیں آگ جیسی گرم ریت کے اوپر لٹایا جاتا تھا۔ بوریے میں لپیٹا جاتا تھا اور بوریے کے اندر دھواں چھوڑ دیا جاتا تھا۔ مگر معلوم ہے حضورؐ نے ان ظالم دشمنوں سے کیا سلوک کیا۔ ان سے کیا بدلہ لیا۔ حضورؐ نے ان سے فرمایا:۔ "میں تمہیں اس طرح معاف کرتا ہوں جس طرح یوسفؑ نے اپنے بھائیوں کو معاف کیا تھا۔ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۔ (آج تم پر کچھ الزام نہیں ہے)

اہل مکہ نے مہاجرین کے مکانوں پر قبضہ جمالیا تھا۔ بجائے اس کے کہ مہاجرین کے مکان واپس دلائے جاتے حکم ہوا کہ مہاجرین مکانوں کو اہل مکہ ہی کے قبضے میں رہنے دیں اور ان کی ملکیت سے دست بردار ہو جائیں۔

الہ آباد کے مشہور و معروف پنڈت سندر لال جی اپنی کتاب "حضرت محمدؐ اور اسلام" میں لکھتے ہیں۔

"ایسے ہی وقت پر آدمی اپنے اصلی رنگ میں دکھائی دیتا ہے۔ زندگی بھر کے دشمنوں کے اوپر محمد صاحب (صلعم) کی سب سے بڑی جیت کا دن ان کی اپنی آتما (نفس) کے اوپر بھی سب سے بڑی جیت کا دن تھا۔ جس وقت انھوں نے اپنے کٹر دشمنوں کے شہر میں پاؤں رکھا، صرف چار نام ان کے پاس ایسے تھے جنہیں انصاف کی رُو سے سزا دینا ضروری تھا۔

پیغمبر کی طرح ان کی فوج نے بھی انہیں کی مثال پر عمل کرتے ہوئے ٹھنڈے دل سے اور چُپ چاپ شہر میں قدم بڑھائے، نہ ایک مکان لوٹا گیا اور نہ ایک عورت کی بے عزتی کی گئی۔

اس زمانے کے فوجی اتہاس (تاریخ) میں سچ مُچ یہ ایک انہونی بات تھی۔ جن چار آدمیوں کو سزا دینی ضروری تھی اُن میں سے بھی تین کو معاف کر دیا۔"

فتح مکہ سے پہلے بھی جب کبھی مکے کے مشرک مدینہ پر چڑھ کر گئے تو حضورؐ نے یہی ہدایت کی کہ:۔

"مسلمانو۔ اپنے تیر قابو میں رکھو۔ دشمن قریب آئے تو چلاؤ ورنہ مت چلاؤ، اور تلواریں صرف اس وقت استعمال کرو کہ دشمن تمہاری صفوں میں داخل ہو جائے۔"

ان جنگوں میں جو لوگ پکڑے جاتے تھے وہ وہی ہوتے تھے جن کے مظالم کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اور جن کے مظالم نے حضورؐ سے اور حضورؐ کے متبعین سے مکہ چھڑوایا تھا۔ اُن ظالموں کے لئے حضورؐ کا حکم تھا کہ انہیں قیدی سمجھ کر نہ رکھا جائے۔ مہمان سمجھ کر رکھا جائے۔ چنانچہ مسلمانوں نے کئی کئی قیدیوں کو مہمان بنالیا تھا۔ مسلمان خود کھجوروں سے پیٹ بھر لیتے تھے اور قیدیوں کو روٹیاں کھلاتے تھے۔

اوطاس میں اہل طائف اور اہل حنین گھر گئے اور ان کے پاس کھانے پینے کا سامان نہیں رہا۔ وہ اور ان کے بال بچے بھوکے مرنے لگے۔ حضورؐ نے فرمایا:۔

"مجھ سے نہیں دیکھا جاتا کہ اللہ کی مخلوق خواہ وہ میری دشمن ہی کیوں نہ ہو یوں بھوک پیاس سے تڑپے۔ محاصرہ اٹھالو اور ان کے کھانے پینے کا انتظام کرو۔"

ایک جنگ میں مسلمانوں نے بنو ثقیف اور بنو ہوازن کے چھ ہزار مرد و عورت گرفتار کئے تھے۔ دوسرے دن حضورؐ کا منشا پاکر چھ ہزار

کے چھ ہزار کو آزاد کر دیا گیا۔

یہودیوں کے ساتھ بھی یہی رحم اور انصاف کا برتاؤ ہوتا تھا۔

ایک روز حضرت عمر فاروق رضؓ اور حضرت علی مرتضیٰ رضؓ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ جو کسی یہودی نے آکر کہا کہ میں علی رضؓ کے خلاف یہ یہ شکایت لایا ہوں۔ حضرت عمرؓ کی خلافت کا زمانہ تھا۔ انہوں نے حضرت علی سے فرمایا: "ابوالحسن! سامنے کھڑے ہو جاؤ اور جواب دو۔" حضرت علی اٹھے مگر آپ کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ یہودی کا دعویٰ غلط تھا۔ حضرت عمرؓ نے اُسے خارج کر دیا۔ یہودی جب چلا گیا تو حضرت عمرؓ نے حضرت علی سے پوچھا کہ آپ اس وقت ناخوش سے کیوں نظر آ رہے تھے۔ کیا یہودی کے برابر کھڑا ہونا ناگوار تھا۔ حضرت علی رضؓ نے فرمایا "نہیں یہ بات نہیں تھی۔ بلکہ آپ کا ابوالحسن کہہ کر مجھے مخاطب کرنا ٹھیک نہیں معلوم دیا تھا۔ مبادا یہودی خیال کرتا کہ اس کے مقابلے میں میرا نام عزت کے ساتھ لیا جا رہا ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اسلامی عدالت کی شان معدلت کے خلاف ذرا سا بدگمانی پیدا ہو۔"

غیر مسلموں کی اسلام نے تقسیم کر دی ہے۔ ایک غیر مسلم وہ ہیں جو اسلامی حکومت میں نہیں رہتے۔ کون دیوانہ ہے جو بیٹھے بٹھائے خواہ مخواہ اُن پر پل پڑے گا۔ دوسرے غیر مسلم وہ ہیں جو اسلامی حکومت میں رہتے ہیں۔ انہیں جیسا کہ میں تفصیل سے بتا چکا ہوں ہرگز مجبور نہیں کیا جاتا کہ اسلام قبول کر ہی کریں۔ بلکہ انہیں اسلامی حکومت کی طرف سے جنگ و اخراجات جنگ میں شرکت کے لئے بھی مجبور نہیں کیا جاتا۔ حالانکہ مسلمان اسلامی حکومت کی طرف سے جنگ اور اخراجات جنگ میں شرکت کے لئے مجبور کیا، مامور ہیں۔ البتہ غیر مسلموں سے ٹیکس ضرور لیا جاتا ہے۔ سو ٹیکس مسلمان بھی دیتے ہیں۔ ٹیکس کی ادائیگی مسلمانوں کا ویسا ہی فریضہ ہے جیسا حج فریضہ ہے۔ مسلمانوں کے ٹیکس کو زکوٰۃ کہتے ہیں اور غیر مسلموں کے ٹیکس کا نام جزیہ ہے۔

کیا آپ کوئی حکومت موجودہ زمانے کی یا پرانی ایسی دکھا سکتے ہیں جو ٹیکس وصول نہیں کرتی ہے۔ ٹیکس کے بغیر حکومت چل کیسے سکتی ہے؟ فوج، یہ پولیس، یہ جج، یہ مجسٹریٹ، یہ تعلیم و تربیت، یہ پختہ سڑکیں، یہ صفائی ستھرائی۔ یہ فلاں بات کا انتظام، وہ یہ فلاں بات کا انصرام کیا یونہی ہو جاتا ہے۔ اس کے واسطے بہرحال روپیہ چاہیئے۔

آپ اتنا اعتراض تو کر سکتے ہیں کہ ٹیکس کا روپیہ زیادہ تر رعایا کے فلاح و بہبود پر صرف ہونا چاہیئے لیکن نفس ٹیکس کے خلاف زبان نہیں کھول سکتے۔

ٹیکس کی زد امراء و اغنیاء تک محدود رہے غرباء اور فلاکت زدہ ہیر پھیر سے ([illegible]) بھی ٹیکس کی زد میں نہ آئیں تو ٹیکس تو نعمت ہے۔ چنانچہ اسلام نے جس طرح زکوٰۃ کا ٹیکس فقط مسلمان اغنیاء پر لگایا ہے اسی طرح جزیہ کا ٹیکس فقط غیر مسلم اغنیاء پر لگایا ہے۔ زکوٰۃ اور جزیہ دونوں اغنیاء سے لئے جاتے تھے اور عام ضرورتوں پر صرف کئے جاتے تھے۔ خصوصاً فلاکت زدہ لوگوں کی ضرورتوں پر۔

جزیئے کو خواہ مخواہ مشہور کر دیا ہے۔ غیر مسلموں پر یہ اکیلا ٹیکس تھا۔ زمینداروں سے تھوڑا سا لگان لیا جاتا تھا جو غیر مسلموں کے لئے مخصوص نہیں تھا۔ مسلمانوں پر زکوٰۃ کے علاوہ اور ٹیکس بھی تھے۔ مثلاً جنگ کے وقت انہیں اخراجات جنگ کا حسب حیثیت بار اٹھانا پڑتا تھا۔ غیر مسلم جنگ کے لئے کچھ نہیں دیتے تھے۔ جزیہ ہی جنگ کے وقت بھی انکی حفاظت کا ضامن ہوتا تھا۔

جزیئے کو تو شہرت دی گئی، لیکن ایک لفظ ہے "ذمی"، اُسے شہرت نہیں دی گئی۔ ذمی اُسے کہتے ہیں جس کی جان، مال اور عزت آبرو کی حفاظت کا ذمہ لے لیا جائے۔ بلکہ اس سے اور بڑھ کر جسے اللہ کا ہمسایہ قرار دیا گیا ہے جو ذمۃ اللہ و ذمۃ محمد رسول اللہ (اللہ کا ہمسایہ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے ذمہ دار)۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد ہے۔ "غیر مسلم جزیہ اس غرض سے ادا کرتے ہیں کہ ان کے خون اور مال کی مسلمانوں کے خون اور مال جیسی حیثیت ہو جائے۔"

بیس سال سے کم اور پچاس سال سے اوپر کے مرد سے جزیہ نہیں لیا جاتا تھا۔ عورتیں جزیے سے مستثنیٰ تھیں۔ مردوں کے لئے بھی کم از کم دو سو درہم آمدنی کی شرط تھی۔ جو مرد اپنی خوشی سے جنگی خدمات بجا لاتے تھے۔ انہیں جزیے سے مستثنیٰ کر دیا جاتا تھا۔ جزیے کی مقدار بارہ سے اڑتالیس درہم سالانہ تک تھی اور ماہانہ قسطوں میں وصول کی جاتی تھی۔

فرانس کا نامور مؤرخ ڈاکٹر گستاؤلیبان لکھتا ہے:۔

"مسلمانوں کے سے متحمل اور روادار فاتح کبھی پیدا نہیں ہوئے اور نہ ایسا نرم اور مہربان مذہب وجود میں آیا۔"

ڈاکٹر جے۔ اے۔ کانڈی لکھتا ہے:۔

"مسلمان مفتوح قوموں سے جو شرائط کرتے تھے وہ ایسی ہوتی تھیں کہ مفتوح اپنی پچھلی زندگی پر ان شرائط کی زندگی کو ترجیح دیتے تھے اور اسے خوش قسمتی کہتے تھے۔ عربوں کی بات کا بھرم تھا۔ ان کے عہد و پیمان کا اعتبار کیا جاتا تھا۔"

اطالوی مؤرخ ڈان لیونکیٹانی لکھتا ہے:۔

"مسلمان حاکموں نے ہر زمانے میں مسلموں اور غیر مسلموں کے ساتھ یکساں سلوک رکھا۔ سولھویں صدی کا یہ اسلامی حکم محفوظ ہے کہ ذمی جب جزیہ دینے آئیں تو ان سے اخلاق برتو۔ ان کی خاطر مدارات کرو۔"

سر تھامس آرنلڈ لکھتا ہے:۔

"عیسائی اور دیگر اقوام کے لوگ اگر ترک وطن کرتے تھے تو اسلامی ممالک میں پناہ لیتے تھے اور جزیہ دے کر پوری مذہبی آزادی سے زندگی گزارتے تھے۔"

ڈاکٹر میشور گوپا لکھتے ہیں:۔

"جزیہ وصول کرنے کے بعد ذمیوں کی حفاظت کرنا مسلمانوں کا مذہبی فریضہ تھا جزیہ گویا مسلمانوں کے اس خون کی قیمت تھی جسے مسلمان ذمیوں کی مدافعت میں بہاتے تھے۔"

حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایک دفعہ مسلمانوں کو شہر حمص کسی وجہ سے خالی کرنا پڑا تو حاکم شہر نے جتنی رقم اس سال جزیہ کی وصول کی تھی وہ واپس کر دی۔ کیونکہ رقم جس کام کے لئے لی گئی تھی اس کا انجام جب ہی دیا جا سکتا تھا جب مسلمان وہاں رہتے۔

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے۔ "لھم ما لنا وعلیھم ما علینا" جیسے ہمارے حقوق ہیں ویسے ہی ذمیوں کے حقوق ہیں اور جس طرح ان پر ہمارے حقوق کی ادائے گی لازم ہے اسی طرح ہم پر ان کے حقوق کی ادائے گی لازم ہے۔

ایک اور موقع پر حضورؐ نے ارشاد کیا۔ "من اذی ذمیا فلیس منا" جس نے ذمی کو بے قصور اذیت پہنچائی وہ ہماری جماعت سے خارج ہے

ایک اور حدیث ہے:۔ "جو کسی ذمی کو قتل کرے گا اسے جنت کی خوشبو بھی سونگھنی نصیب نہیں ہو گی۔"

ذمی کی شراب اور ذمی کا سور تلف کر دیا جائے تو تاوان دینا پڑتا ہے۔ ذمی کی غیبت کرنی حرام ہے۔

اسلامی تاریخ کے یہ شواہد اور اسلامی قانون کا غیر مسلموں کے ساتھ یہ سلوک، اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اسلامی حکومت غیر مسلموں کے لئے ہر اعتبار سے امن و سلامتی کا گہوارہ ہوتی ہے اور اسلام غیر مسلموں کو صرف کاغذ پر نہیں بلکہ عمل و واقعیت کی دنیا میں حقوق دیتا ہے اور الخلق عیال اللہ (مخلوق خدا کا کنبہ ہے) کی عملی تفسیر پیش کرتا ہے

عید میلاد النبیؐ

چوھدری محمد سرفراز خاں

آج کے دن سب انبیاء کے سردار اور سب دنیا کے رہنما عرب کے شہر مکہ میں ایک معزز خاندان کے ایک شریف گھر میں پیدا ہوئے۔ دادا نے آپ کا نام محمدؐ اور والدہ نے فرشتہ سے بشارت پاکر احمد نام رکھا۔ احمد کہتے ہیں اللہ کی سب سے زیادہ حمد و ثنا اور تعریف کرنے والا اور محمدؐ کہتے ہیں جسکی سب سے زیادہ تعریف کی جائے۔ آگے چل کر معلوم ہوگا کہ یہ دونوں اسمار گرامی حقیقت پر مبنی تھے۔

آپ ایک ایسے وقت میں پیدا ہوئے جبکہ تمام دنیا پر فسق و فجور کی آندھیاں چل رہی تھیں ظلم و ستم کا دور دورہ تھا۔ نہ چھوٹوں میں بڑوں کا ادب اور نہ بڑوں میں چھوٹوں کے لئے محبت تھی شراب و جوا ان کا روز کا مشغلہ تھا لوٹ مار میں ایک سے ایک بڑھ کر تھا۔

چلن انکے جتنے تھے سب وحشیانہ ہر اک لوٹ اور مار میں تھا یگانہ

فسادوں میں کٹتا تھا ان کا زمانہ نہ تھا کوئی قانون کا تازیانہ

وہ تھے قتل و غارت میں چالاک ایسے

درندے ہوں جنگل میں بے باک جیسے

لیکن آپ کی تعلیم نے ایک وحشی قوم کی حالت بدل دی۔ پھر ان کے طفیل ساری دنیا میں یہ تعلیم پھیل گئی۔ بھیڑیوں کو ایسی تہذیب سکھائی کہ وہ دنیا کے رکھوالے بن گئے اور فقرا و گدا فقیر ہفت کشور کے بادشاہ بنے۔ کیوں نہ ہو یہ سب کچھ صدقہ تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت کا اور آپ کی مقدس تعلیم کا!

دنیا میں ہر قوم اور ملک میں لوگ اپنے اپنے بزرگوں کی سالگرہ مناتے ہیں اگر ہم بھی اس موقع پر خوشی کا اظہار کریں تو بے جا نہ تھا!

ملہ "دن" (Day) اور "سالگرہ" منانے کا طریقہ عجمیوں کی روش ہے، اسلام میں اس قسم کے تکلفات نہیں پائے جاتے، صحابہ کرام (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) سے زیادہ حضورؐ کی یوم ولادت کی خوشی کے تقاضے اور کون پہچان سکتا ہے، مگر انھوں نے اس مبارک دن کو "عید" نہیں بنایا۔ ہمارے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے بعد صحابہ کرام ہی کی پاک زندگیاں نمونہ ہیں دین میں "عقیدت" ہی کے نام پر بدعتیں آئی ہیں اور شاخ در شاخ ہوتی چلی گئی ہیں!

"عید میلاد" کا معاملہ بارھویں ربیع الاول تک ہی محدود ہو کر نہیں رہ گیا۔ اسی تصور اور عقیدت کی بنیاد پر نیاز و فاتحہ کی رسمیں تاریخیں اور تقریبیں ... ایجاد کی گئیں ہیں۔ "بدعت" کا یہ خاصہ ہے کہ وہ ایک حال پر نہیں رہتی۔ اس میں اضافے ہوتے چلے .. جاتے ہیں!

یہ ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کا انسانیت پر سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے انسانوں کی ہدایت کے لئے محمد عربی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کو مبعوث فرمایا اور حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کو انسانیت کے لئے نمونہ بنایا۔ کوئی شک نہیں کہ اس دنیا میں عظیم انسان پیدا ہوئے ہیں مگر پوری دنیا میں "انسانِ کامل" بس ایک ہی پیدا ہوا، اور اسی کی ذات پر اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمت کا اتمام فرما کر، نبوت کے دروازے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔ (باقی نوٹ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمایئے)

شریعت مطہرہ نے اس دن کو عید کا نام نہیں دیا لیکن اگر ہم یہ خیال کر کے کہ خدا کے سب سے بزرگ نبی اور تمام دنیا کے ہادی و رہنما کی پیدائش کا دن ہے تو اسے عید میلاد کا نام دے لیں تو کچھ حرج نہیں فی الحقیقت یہ دن عید سے بھی زیادہ قابل احترام ہے لیکن یاد رہے کہ اور لوگوں کے خوشیاں منانے اور ہمارے اظہار خوشی میں بہت بڑا فرق ہے۔ اگر ہم بھی ان کی نقل کریں تو پھر خدا اور اس کے پیارے رسول کی ... فرمانبرداری نہ ہوگی جبکہ ہم جانتے ہیں کہ خدا کی محبت بھی درحقیقت حضور کی فرمانبرداری میں ہے۔

جب کسی غیر مسلم کے گھر لڑکا پیدا ہوتا ہے تو اس کے ماں باپ بچے کی پیدائش پر خوشی کے اظہار میں آتشبازی چھوڑتے ہیں باجے بجاتے ہیں اور طرح طرح کے تماشے رچاتے ہیں مگر ہادیٔ اسلام نے حکم دیا ہے کہ بچہ پیدا ہونے پر سب سے پہلے اسے غسل دے کر اس کے کان میں اذان دی جائے تاکہ دنیا میں آتے ہی سب سے پہلے جو آواز اس کے کان میں پڑے وہ اپنے خالق و مالک کا اسم گرامی ہو۔

غیر مسلم کے ہاں اگر کوئی مر جاتا ہے تو وہاں رونے پیٹنے کی انتہا ہو جاتی ہے مگر حضور نے یہ تعلیم دی ہے کہ جو بچہ مرنے پر صبر کرے گا تو خدا اسے جنت میں داخل کرے گا اور ساتھ ہی حکم ہوتا ہے کہ میت کی بخشش کے لئے نماز جنازہ پڑھی جائے گویا ہر حال میں اپنے خالق و مالک حقیقی کی یاد تازہ رہے اور اس سے انسان کسی حال میں بھی غافل نہ ہو۔

حضور کی سیرت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح دنیا آپ کی پیدائش کے وقت فسق و فجور میں مبتلا تھی اس کے بالکل برعکس حضور کی وفات سے پیشتر ہی آپ کی تعلیم نے ان وحشیوں کو پاکباز انسان بنا دیا اس لئے ہماری عید میلاد کے جلسوں میں حضور کی سیرت پر روشنی ڈالنا حضور کی تعلیمات کا تذکرہ کرنا اور آپ کے اخلاق حسنہ کا بیان کرنا ہمارا مقصد وحید ہونا لازم ہے تاکہ ہم اس سے سبق حاصل کریں اور اپنی زندگی اس نمونہ کے مطابق بنائیں۔

افسوس ہے کہ اس مختصر بیان میں اتنی گنجائش نہیں کہ آپ کی سیرت کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی جا سکے ورنہ آپ کا بچپن آپ کی جوانی آپ کا بحیثیت خاوند بیویوں سے سلوک بطور باپ اولاد سے محبت ایک جرنیل و فاتح، فرمانروا زاہد و عابد۔ نیز اخلاق و تمدن کا

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ سے آگے)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا دن یقیناً ابتہاج و مسرت کا دن ہے مگر حضور کی ذات گرامی سے ہمارا تعلق وہ نہیں ہے۔ جو بادشاہوں، لیڈروں اور دوسری نامور شخصیتوں سے اُن کے عقیدت مندوں کا ہوا کرتا ہے۔ کہ وہ اُن کی سالگرہ کی تقریب منا کر یہ سمجھتے ہیں کہ عقیدت کا فریضہ اس طرح ادا کر دیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے ہمارا تعلق ایک دن کا نہیں زندگی کے ہر لمحہ کا ہے۔ اٹھتے، بیٹھتے، کھاتے، پیتے، نماز پڑھتے، روزہ رکھتے، لین دین کرتے، محاذ جنگ پر، صلح کانفرنس میں، دفتر میں، ایوانِ حکومت میں، غرض زندگی کے ہر شعبہ میں حضور کی اطاعت پیش نظر رہنی چاہیئے! حضور کا سب سے بڑا "ذکر" آپ کی اطاعت ہے! اور ہم مسلمان "خراج عقیدت" پیش کرنے میں تو بڑی سرگرمی دکھاتے ہیں مگر "خراج اطاعت" کی طرف بہت کم توجہ کرتے ہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ حضور کے ساتھ ہماری عقیدت صرف زبانی نہ ہو بلکہ اس کا سلسلہ "عملی عقیدت" یعنی ۔ ۔ ۔ ۔ اطاعت ۔ سے پیوستہ ہو ... عقیدت اطاعت کے ساتھ ...... یہ ہونا چاہیئے سرکار کی ذات گرامی سے ہمارا ربط و تعلق! سیرت النبی کے جلسوں میں اظہار عقیدت کے ساتھ "اطاعت رسول" پر زیادہ سے زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے، اور لوگوں کو بتانا چاہیئے کہ ایسی عقیدت جس کے ساتھ اطاعت شامل نہ ہو، بلکہ حضور کے احکام کی خلاف ورزی ہوتی ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی کا باعث نہیں ہو سکتی۔

(م ۔ ق)

معلم، تاجر اور مصلح کی حیثیت سے ہمارے لئے اپنی زندگی میں نمونہ ہے یہاں ہم صرف آپ کی ایک مصلح کی حیثیت کا کسی قدر بیان کریں گے، ورنہ آپ کی ہر ہر حیثیت کا بیان ایک مکمل باب ہے اور ہمارے لئے نمونہ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ حضورؐ کی زندگی میں تمہارے لئے بہترین نمونہ ہے (لقد کان لکم فی رسول اللہ اُسوۃ حسنہ) حضورؐ نے اول لوگوں کو توحید کی تعلیم دی، اور ربِ واحد کی پرستش پر لوگوں کو ابھارا۔

کہ ہے ذات واحد عبادت کے لائق زبان اور دل کی شہادت کے لائق

اسی کے ہیں فرمان اطاعت کے لائق اسی کی ہے سرکار خدمت کے لائق

لگاؤ تو لو اس سے اپنی لگاؤ

جھکاؤ تو سر اس کے آگے جھکاؤ

پھر اصلاح کے لئے سب سے بہتر طریقہ اختیار کیا سب سے پہلے قلب کی اصلاح فرمائی تاکہ بُرے فعل صادر ہی نہ ہوں۔ مواعظ حسنہ سے خدا کا خوف دل میں ڈالنا شروع کیا جب اللہ کے خوف سے لوگوں کے دل ڈرنے لگے تو احکام الٰہی کی تعلیم شروع ہوئی احکام کے صادر ہوتے ہی گھر گھر میں اس کی تعمیل ہو جاتی چنانچہ شراب کی حرمت کا حکم آتے ہی جتنی شراب جہاں تھی پھینک دی گئی اور مدینہ کی گلیوں میں شراب بہہ نکلی۔

ایک طرف عیسائیت یہ سکھلا رہی تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی تمام امت کی بداعمالیوں کے عوض صلیب پر چڑھ کر ان کے لئے کفارہ ہو گئے اور اب ہر ایک نجات کا مستحق ہے اس خیال نے انسان کو گناہ کے میدان میں آزاد کر دیا دوسری طرف ہندوانہ عقائد یہ تھے کہ "کرم" یعنی عمل اگر برے ہیں تو ان کی سزا لازمی ہے اس خیال نے بھی لوگوں کی ہمت کو پست کر دیا۔

لیکن حضورؐ کی تعلیم کا ایک نادر پہلو یہ بھی تھا کہ انسان نہ اتنا نڈر ہو کہ اپنے افعال میں شتر بے مہار ہو اور نہ گرفت اور مواخذہ کی سختی سے اتنا سہم جائے کہ مایوس ہو کر بیٹھ جائے لہٰذا توبہ کی تلقین فرمائی کہ گو کفر و شرک وہ سنگین گناہ ہیں جن کی سزا میں انسان ہمیشہ جہنم میں رہے گا مگر سب گناہ حتیٰ کہ کفر و شرک بھی توبہ سے معاف ہو جاتے ہیں اور انسان از سر نو نیک عمل کر کے جنت میں داخل ہو سکتا ہے۔

غرض حضورؐ نے اپنی عمدہ تعلیم کو نہایت عمدہ طریقوں سے پھیلایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پوری قوم کے اعمال اس طرح درست ہو گئے کہ اگر کسی سے بہ تقاضا بشریت کوئی لغزش ہو بھی گئی تو اس نے سزا کے لئے اپنے آپ کو خود پیش کر دیا اس کی کئی مثالیں کتب حدیث میں ملتی ہیں چنانچہ ایک عورت حضورؐ کی خدمت میں آتی ہے اور کہتی ہے کہ "یا رسول اللہ" مجھے پاک کیجئے گویا اب وہ گناہ اور... معصیت کی آلودگی سے مضطرب اور پریشان ہے اور خود سزا طلب کر رہی ہے جس میں وہ اپنی نجات تسلیم و یقین کرتی ہے چنانچہ اس کو گناہ کی سزا دی گئی۔

کیا دنیا میں ہم یہ نہیں دیکھتے کہ ملزم مواخذہ سے بچتا ہے۔ قانون اور حاکم اسے تلاش کرتا ہے یقیناً نسل انسانی کی یہ وہ اصلاح ہے جس کی مثال مل نہیں سکتی۔

پھر ذکر کثیر کی تعلیم دی اور نماز پنجگانہ کی سخت تاکید فرمائی اللہ کی مخلوق سے حسن سلوک کا سبق دیا اور زندگی کے ہر ہر پہلو پر ہدایات جاری کیں یہ تعلیمات اس شدت سے اثرانداز ہوتی چلی گئیں کہ انسان کی روحانیت فلک الافلاک تک پہنچ گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ انسان جو جاہل تھا ظالم تھا۔ جھگڑنے والا تھا۔ ناشکر گزار تھا وہ ہر پہلو سے انسان بن گیا جس سے اب خالق کائنات خوش

ہوکر فرماتا ہے (رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ ذالک من خشی ربہ) اللہ ان سے راضی ہوگیا اور وہ اللہ سے راضی ہوگئے یہ اس لئے ہوا کہ وہ اپنے رب سے ڈر گئے۔

حضورؐ کو اپنی تعلیم اور صحابہ کی تربیت میں پوری پوری کامیابی ہوئی جس کا آپ کو یہاں تک یقین ہوگیا کہ فرمایا "میرے اصحاب مانند ستاروں کے ہیں تم جس کسی کی بھی اقتدار کروگے ہدایت پاؤگے" اپنے شاگردوں کی سیرت پر اس قدر محکم یقین بھی سوائے حضورؐ کے کسی دوسرے مصلح کو نصیب نہیں ہوا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب اپنی قوم سے کہا کہ خدا تمہیں جہاد کا حکم دیتا ہے تو قوم نے جواب دیا کہ "آپ اور آپ کا رب ان سے جاکر لڑیں ہم تو یہاں بیٹھے ہیں" مگر حضورؐ کے صحابہ نے ایک موقع پر عرض کیا کہ ہم قوم موسیٰ نہیں کہ آپ کا ساتھ چھوڑ دیں آپ ہمیں آگ یا سمندر میں کودنے کا حکم دیں تو ہمیں فرمانبردار پائیں گے۔

یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی مقدس تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ تھا کہ صحابہ کرام نے دنیا میں اسلامی تہذیب و تمدن کے فانوس روشن کردیئے اور خانہ بدوش صحرا نشین کشورکشا اور فرمانروا بن گئے۔ اس دور میں اسلام کی دنیا کی سب سے زیادہ غالب طاقت تھا، اور دنیا کی کوئی باطل قوت اسلام کے مقابلہ میں ٹھہر نہ سکتی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ دین و دنیا کی تمام سعادتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہی اتباع میں حاصل ہو سکتی ہیں۔ یہی وہ اسوۂ حسنہ ہے جس کا ایک ایک گوشہ انسانیت کے لئے "کامل نمونہ" ہے۔ جو اطاعت نبوی کے دائرے میں آگیا۔ اس کے لئے فلاح و نجات ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہی عمل مقبول و پسندیدہ ہے۔ جس پر اطاعت رسول کی مہر لگی ہوئی ہو:۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

۱:۔ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو حضورؐ کا اتباع کرو میں تمہیں اپنا محبوب بنا لوں گا۔

۲:۔ اے نبی قسم ہے تیرے پروردگار کی کہ یہ لوگ اس وقت تک ہرگز مومن نہ ہونگے جب تک اپنے جھگڑوں کا فیصلہ آپ پر نہ چھوڑ دیں اور پھر جو آپ فیصلہ کریں اس کو اپنے دل میں بھی برا نہ مانیں بلکہ دل و جان سے قبول کریں گویا سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے کا پورا پورا نمونہ بن جائیں۔ حضورؐ فرماتے ہیں:۔

۱:۔ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔

۲:۔ جسے وہ خود اپنے لئے پسند کرتا ہے اور اپنے بھائی کے لئے بھی وہ چیز پسند نہ کرے جسے وہ خود اپنے لئے ناپسند کرتا ہے۔

۳:۔ تم میں سے کوئی مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اس کے نزدیک اس کے اپنے بال بچوں ماں باپ اور تمام دنیا کے لوگوں سے عزیز ترین نہ ہو جاؤں۔

اس موضوع پر تمام آیات اور احادیث کا تذکرہ مشکل ہے میرا مقصد صرف اتنا ہے کہ آپ سمجھ لیں کہ آپ کا، ور حضورؐ کا تعلق کیا ہے؟ اور ان آیات اور حدیث کی رُو سے ہم کس پایہ کے مسلمان ہیں کیونکہ کوئی شخص فی الحقیقت سچا مسلمان ہی نہیں ہو سکتا جب تک وہ حضورؐ کے احکام کی پیروی نہ کرے جس قدر اتباع میں کامل ہوگا اسی قدر اس کا ایمان بھی مضبوط ہوگا اور جتنا اتباع میں ناقص ہوگا اتنا ہی اس کا ایمان ضعیف ہوگا۔

ایک حدیث میں آیا ہے:۔

"جو بڑوں کی عزت نہ کرے اور جو چھوٹوں سے محبت اور شفقت سے نہ پیش آئے وہ ہم سے نہیں .... اور فرمایا

"قوم کا سردار یا حاکم فی الحقیقت قوم کا خادم ہے"۔

اس اسپرٹ اور نظریہ کے مطابق اگر حاکم اور رعایا میں تعلقات قائم ہو جائیں تو اس پُر رنج اور الم کی دنیا میں ہم جنت کا نظارہ دیکھ لیں کاش کہ ہم خدا اور رسول کے فرمانبردار بن جائیں اور اپنے عمل سے خیر امت ہونے کا ثبوت پیش کر سکیں۔

اقبال اور اُس کی معرفت آموز تعلیمات

تنزیمہ انصاری

اقبال سے قطع نظر دوسرے اصحابِ فکر کی تعلیمات اور اُن کے فلسفۂ حیات کے لیے تاریخ فلسفہ کے اوراق کو اگر انیسویں صدی کے آغاز تک اُلٹ دیا جائے۔ فلسفہ کی تعمیر کا سہرا کانٹ، شیلنگ اور ہیگل کے سروں پر یکے بعد دیگرے بندھا نظر آئے گا۔ کانٹ نے بڑی بے بسی سے حقائق کا سراغ لگانے میں عقل کو قاصر پایا۔ اس کے بعد کے فلسفیوں پر بھی کانٹ کا اثر رہا۔ ہیگل نے فلسفۂ حیات کی بنیاد تصورات کو بنایا اس کی نظر میں ارتقائے انسانیت کی ترتیب محض خیالات کے ٹکراؤ سے وجود میں آتی ہے۔ اور شوپن ہار نے پہلی مرتبہ اپنے فلسفے کی بنیاد قنوطیت پر رکھ کر مغربی فلسفے پر قنوطی فضا قائم کر دی اور انسانیت کی منزل کو خواہشِ زیست تک محدود کر کے رکھ دیا۔ نیٹشے کے "فوق البشر" نے آخر اس قنوطی فضا کا دامن چاک کر دیا۔ اس نے حرکت و حیات کا مقصد "فوق البشر" کی پیدائش تصور کر کے ایک ہی جھٹکے میں خدا اور مذہب کو اپنے دامن سے الگ کر دیا۔ اور ہیگل کی خواہشِ زیست کو خواہشِ اقتدار میں بدل کر اپنے فلسفے کے قالب میں ڈھال دی۔

ہیگل کا تصوری فلسفۂ حیات نیٹشے ہی کے ہاتھوں کافی زک اٹھا چکا تھا کہ مارکس اور اینگلز نے مادی تصور اور معاشی نقطۂ نظر پیش کر کے ہیگل کے فلسفے کی رہی سہی لطافت ہی کو غارت کر دیا۔

اب برگساں آیا اس نے عقل اور وجدان کے تضاد کے خیالی طلسم کو توڑ دیا اس نے وجدان کو عقل ہی کی ایک اعلیٰ قسم بتایا وہ کہتا ہے:

"عقل ہی سب کچھ نہیں ہے اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے سوچنا بند کر دیں اور اپنی ہی گہرائیوں پر
نظر ڈالیں جو زندگی کی دوسری چیزوں کی بہ نسبت ہم سب سے زیادہ قریب ہیں تو ہم جو کچھ
پاتے ہیں وہ مادہ نہیں روح ہے مکان نہیں بلکہ زماں ہے۔ سکون کی بجائے عمل اور میکانیت
کے بجائے تخلیق ہمارے سامنے بے نقاب ہو جاتی ہے۔"

اس طرح برگساں کا تخلیقی ارتقاء، ڈارون اور اسپنسر کے مادی ارتقاء پر بھی حاوی ہو جاتا ہے اور ویسے بھی Modern Scientific discovery اور latest Atomic Theories نے بھی مادی تصور پر ایک ضرب کاری لگائی ہے۔

ہم نے دیکھا کہ ایک کا تراشیدہ بُت دوسرے کے گرز سے پاش پاش ہو تا گیا اور جتنے بُت تراشے گئے وہ سب چور چور ہو گئے اور اس طرح بنیادِ فلسفہ پر تعلیمات کی جتنی عمارتیں تعمیر کی گئیں وہ سب پیوندِ خاک ہو گئیں۔ تصوری سے لے کر مادی تک قنوطیت سے لے کر فوق البشر تک اور مادی ارتقاء سے لے کر تخلیقی ارتقاء تک چاروں طرف فلاحِ انسانیت کی راہیں مسدود ہیں۔

اس اندھیرے میں انسانیت کو ایسی روشنی کی تلاش تھی جو اُسے ایک صحیح اور سیدھے راستے پر لگا تی، اور اقبال کی عقابی نگاہوں نے دیکھ لیا کہ اس وقت اگر کوئی روشنی انسانیت کو صراطِ مستقیم پر لگا سکتی ہے تو وہ محض وہی روشنی ہو سکتی ہے جو آج سے چودہ سو سال پہلے فاران کی چوٹیوں سے طلوع ہوئی تھی جس نے اپنی ضیاء پاش کرنوں سے کائنات کی تاریکی کو روشنی میں بدل دیا تھا اور وہ تعلیم وہ پیغام، وہ فلسفۂ حیات تھا۔

لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ

لا الٰہ الا اللہ کی تفسیر ہی اقبال کا کلام ہے اقبال کا فلسفۂ حیات ہے اقبال کا پیغام ہے اور اقبال کی عرفان آمیز تعلیم ہے۔

" لا الٰہ " کی ضرب کلیمی سے طلسم فوق البشر ٹوٹ جاتا ہے ہر مادی اور قنوطی تصور لب گور ہو جاتا ہے اور انسان اپنی ہستی پہچان لیتا ہے وہ ہر نمرود ہر فرعون کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے انکار کر دیتا ہے کسی ہلاکو کسی چنگیز کا محکوم بننا گوارا نہیں کرتا، اور یہ راہ "الا اللہ" پر پہنچکر تکمیل پا جاتی ہے۔

اقبال اپنی تعلیم میں کانٹ کی طرح نہ خواہش زیست کو منزل انسانیت قرار دیتا ہے اور نہ نیٹشے کی طرح چنگیز و ہلاکو کی پیدائش کو مقصد حیات و حرکت تسلیم کرتا ہے۔ اور نہ وہ مارکس یا اینگلز کی طرح ہر معاشرتی تبدیلی اور انقلاب کا سبب معاشی عوامل کو بتاتا ہے ایک جگہ وہ ایک فلسفہ زدہ سید زادے کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

ہیگل کا صدف گہر سے خالی ہے اس کا طلسم سب خیالی

اور پھر بتاتا ہے کہ:۔

ہے فلسفہ میرے آب و گل میں پوشیدہ ہے، ریشہ ہائے دل میں
اقبال اگرچہ بے ہنر ہے اس کی رگ رگ سے باخبر ہے

اور یہی فلسفہ جو اس کے آب و گل میں ہے جو اس کے ریشہ ہائے دل میں ہے وہ لا الٰہ الا اللہ کے عصائے کلیمی کی شکل انسانیت کو دیتا ہے جس کی ہر ضرب سے تدریج انسانیت کی نئی راہیں پھوٹتی نظر آتی ہیں۔ وہ کہتا ہے:۔

نکتہ می گویم من از مردان حال امتاں را "لا" جلال "الا" جمال
لا و الا احتساب کائنات لا و الا فتح باب کائنات

اور اس پوری نظم میں اقبال نے لا و الا کا تاریخی پس منظر پیش کیا ہے۔ وہ لا الٰہ الا اللہ ہی کی ایمان افروز تعلیم تھی جس نے بھولی بھٹکی انسانیت کو صراط مستقیم پر لگا دیا تھا۔ یہ لا الٰہ الا اللہ ہی کی ضیا پاش کرنیں تھیں جنھوں نے عرب کے جاہل شتربانوں کی آنکھوں کو وہ چمک بخشی کہ روم و ایران کا شاہی جاہ و جلال بھی ان کی آنکھوں کو خیرہ نہ کر سکا۔ یہ "لا الٰہ" ہی کی تعلیمات تھیں جنھوں نے ان کی خودی اور ان کی "انا" کو اتنا بلند اور غالب کر دیا تھا کہ قیصر و کسریٰ کے تخت شاہی کو بھی انھوں نے اپنے قدموں سے روند ڈالا۔

اقبال کہتا ہے:۔

خودی کا سر نہاں لا الٰہ الا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا الٰہ الا اللہ

اس کے بعد وہ بتان وہمی کو گرز لا الٰہ الا اللہ سے پاش پاش کرنے والے کسی ابراہیم کی خبر دیتا ہے:

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الا اللہ،

یہاں اور ایسے ہی دوسرے مقامات پر اہل نظر نے اقبال کی تعلیمات کے مرد مومن "ابراہیمؑ" "حیدر کرارؓ" اور "خالد بن ولیدؓ" کے تصور کو نیٹشے کے فوق البشر پر منطبق کرنے کی سعی لا حاصل کی ہے۔ یہاں ایک بنیادی اختلاف منظر عام پر آتا ہے۔ نیٹشے نے طبقات بندی کر کے یہ دعویٰ کیا تھا کہ اس کا فوق البشر اعلیٰ اور حکمران طبقے میں جنم لے گا مگر یہاں اقبال کا مرد مومن نسلی امتیازات اور طبقاتی

قیود سے آزاد ہے اپنی خودی کو بلند کر کے عشق کی گہرائیوں میں اتر جانے والا ہی اقبالؔ کا مردِ مومن ہے۔ اور دوسرا اختلاف جس کے بارے میں اقبالؔ کہتا ہے :۔

وہ دیں ہے قہر ہے زہر ہلاہل سے بھی بڑھ کے
ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاق

پھر یہاں لاالٰہ الااللہ کی ہی تعلیم اور دعویٰ سامنے آتا ہے۔ سکندر، ہلاکو اور چنگیز نے سینکڑوں بار حضرت انسان کی قبا محض اپنے جاہ وجلال کی حفاظت اور اپنی سلطنت کے پیش نظر چاک کی اس طرح انکی خودی الااللہ کی پابند نہیں تھی اور ہر طرح سے آزاد تھی۔

مگر جب عرب کے بادیہ نشینوں نے دنیا میں انقلاب پیدا کیا، تو وہ کتاب و سنت کے اخلاقی حدود میں رہ کر فاتح اور کشور کشا بنے اور دنیا کو نیکی اور پاکیزگی سے معمور کر دیا۔

اشتراکیت کو اقبالؔ نے سراہا تو ضرور ہے مگر وہ اُسے "لا" میں ہی محدود دیکھتا ہے ایسی صورت میں اشتراکیت محض تخریبی ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس میں اسلام کا وہ صحیح جذبۂ مساوات مفقود ہو کر رہ جاتا ہے جو "الااللہ" میں پوشیدہ ہے۔ اگر نظامِ معاشیات سرمایہ دار سے چھین کر مزدور کو بخش دیا جائے تو سرمایہ داری پر "لا" کے خطِ تنسیخ کے بعد مزدور کی حیثیت پھر "الا" کی ہو جاتی ہے۔ اس طرح اقبالؔ کی نظر میں اشتراکیت جب تک الااللہ کی معرفت کا جام نہ پی لے وہ انسانیت کے لئے آلۂ تخریب ہی بنی رہے گی۔

"نہاد زندگی میں ابتدا لا انتہا الا
پیامِ موت ہے جب لا ہوا الا سے بیگانہ
وہ ملت روح جس کی لا سے آگے بڑھ نہیں سکتی
یقیں جانو ہوا لبریز اس ملت کا پیمانہ"

اس عالمِ آشوب میں الا اللہ کی تعلیم ہی ایک ہموار پاکیزہ اور خوشحال معاشرہ قائم کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔
اقبالؔ کے پاس تجلی فکر ہے، نورانی کلمات ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نورِ یقین ہے ا

دل بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

در مدحِ رسولؐ

ماہر القادری

پیام آمدہ "الکتاب" آمدہ به نامِ محمدؐ خطاب آمدہ

تجلّیِ حق بے نقاب آمدہ کہ ذاتِ رسالت مآب آمدہ

شبِ کفر و طغیاں بہ پایاں رسید سحر جلوہ کرد، آفتاب آمدہ

زہے شہسوارے! عجب رہبرے! کہ فتح و ظفر ہم رکاب آمدہ

عذابے رسیدہ بہ خمر و قمار قیامت بہ چنگ و رباب آمدہ

جہاں حرفِ "انّا فتحنا" شنید خوشا! مژدۂ فتحِ باب آمدہ

بہ ہر شاخ صبحِ بہاراں دمید بہ گلزارِ گیتی شباب آمدہ

نگاہِ مسلماں حیا پیشہ کرد زناں را چو حکمِ حجاب آمدہ

ببوسید[1] ماہر ضریحِ رسولؐ

دعائے دلش مستجاب آمدہ

---

[1] زنگاہِ عقیدت چرا کہ در شریعت بجز "حجرِ اسود" ہیچ مقامِ مستحقِ تقبیل (بوسہ دادن) نیست۔

"مومن"

فاروق بانسپاری

ہنگامۂ میداں ہو کہ سرگرمیٔ محفل
اللہ رے اس مردِ خوش اوقات کے انداز
چہرہ جو ہے بشاش تو دل ہی کا ہے غمگین
اوروں کے لئے راز کشا اپنی جگہ راز
ناکامیٔ تدبیر کا خطرہ نہیں اس کو
فطرت سے ہم آہنگ ہے مومن کی تگ و تاز
عبرت کا مقام آئے تو مانندِ کبوتر
غیرت کا تقاضا ہو تو بن جاتا ہے شہباز
حاکم بھی ہے محکوم بھی عاجز بھی قوی بھی
ہر رنگ میں سوزِ دلِ مومن ہے جہاں ساز
اس بندۂ خاموش کے ظاہر پہ نہ جاؤ
اللہ کی لاٹھی میں کہیں ہوتی ہے آواز
آجاتا ہے جب مرحلۂ بیعتِ باطل
سر دے کے رہِ حق میں یہ ہوتا ہے سرفراز
وہ جنتِ شداد ہو یا آتشِ نمرود
مومن پہ کبھی ہو نہیں سکتی اثر انداز

کافر ہے جو الطافِ زمانہ پہ ہے نازاں
مومن کی فراست پہ زمانے کو ہے خود ناز

ایک گمنام صدا

شمس الرزاق (گورکھپور)

میں نہ ناقد نہ ادیب اور نہ افسانہ نگار
نہ میں واعظ ہوں نہ صوفی ہوں نہ سند یافتہ
نہ ہوس مجھ کو ستائش کی نہ شہرت درکار
ڈھل کے نغموں میں نکلتی ہے مرے دل کی پکار
لے بدل جائے جو نغمے کی تو معذور ہوں میں
تیری دنیائے محبت سے بہت دور ہوں میں
ایک گمنام دصدائے دلِ مجبور ہوں میں

مجھ کو پیغامِ جنوں دیتی ہے فطرت میری
چین سے بیٹھنے دیتی نہیں وحشت میری
راگ بن بن کے ابھرتی ہے محبت میری
حسن کی گود میں پلتی ہے صداقت میری

یہ چھلکتی ہوئی لہریں یہ مچلتی سی گھٹا
یہ مہکتے ہوئے میداں یہ خنک نرم ہوا
یہ طلوعِ مہ و خورشید یہ تاروں کی ضیا
نور کے سانچوں میں ڈھالی ہوئی یہ مست فضا

ایک آئین مقرر پہ ہے ہستی کا نظام
ایک انداز پہ رقصاں ہیں مہ و مہر کے جام
ساز کی لے کے مطابق ہے ستاروں کا خرام
ضبطِ اوقات کے ہمراہ ہے دورِ ایام

بزمِ قدرت میں قوانین کی پابندی ہے
یاں بہ ہر گام اک آئین کی پابندی ہے
ہر نفس ضبط کی تمکین کی پابندی ہے
حسنِ فطرت کے لئے دین کی پابندی ہے
کتنی حیرت ہے کہ یہ دین کا پابند نہ ہو
ابنِ آدم کسی آئین کا پابند نہ ہو

نوائے سرخوش

آصف عارفی

فقیہانِ حرم نے الاماں از راہِ نادانی
بدل کر رکھ دیا ہر مقصدِ آیاتِ قرآنی

حقیقت کو نظر انداز کرنے کی سزا تو یہ
مآلِ فکرِ باطل ہے بہر صورت پشیمانی

ستاروں کی تنک تابی میں پیغامِ سحر بھی ہے
تلاطم ہائے دریا سے ہے گوہر کی درخشانی

کلی کی سینہ چاکی موجبِ لطفِ بہاراں ہے
سکوں دیتی ہے کیا کیا نکہتِ گل کی پریشانی

اگر سوزِ غمِ انساں نہیں تو ایک تہمت ہے
مذاقِ راہبی ہو یا شکوہِ طرزِ سلطانی

محبت کی تجلی گاہ قلبِ مردِ مومن ہے
اندھیرا کہیں سکتی یہاں تیغوں کی تابانی

غزلیں

خیام الہند حیدر دہلوی

میرے اسلوبِ بیاں سے کوئی انجمن میں نہیں
پھول ہی پھول ہیں کانٹے مرے دامن میں نہیں

کس تحفظ پہ ہو صیاد سے ضد، برق سے کد
کون سی سوختنی چیز نشیمن میں نہیں

گل مقصد سے تہی دیکھ کے ہلنے والے
کوئی دھبہ مرے سمٹے ہوئے دامن میں نہیں

برگ و بار و خس و خاشاک میں سب مظہرِ حسن
چند پھولوں سے بہاریں بھرے گلشن میں نہیں

اب کے ہیں ڈھنگ سے ترتیب دیئے ہیں تنکے
کوئی دیکھے تو یہ سمجھے میں نشیمن میں نہیں

کیا خبر قافلہ نکلے ہی قدم پر لُٹ جائے
دوستی عیب یہاں رہبر و رہزن میں نہیں

اب کہاں صحتِ الفاظ و تفکر حیدر
وہ جو تھی حاصلِ فن بات کسی فن میں نہیں

شفقت کاظمی

خود اپنی گردشِ قسمت تھی راہ میں حائل
وگرنہ دور نہ تھی اس قدر تری منزل

وہ دل کہ تیرے ستم سے بھی نامراد رہا
تری نگاہ میں شاید نہ تھا کسی قابل

غمِ حیات نے شانہ ہلا کے چونکا دیا
جہاں کہیں میں تری یاد سے ہوا غافل

یہ کس مقام پہ لائی ہے جستجو تری
نہ فکرِ راہ نہ احساس دوریٔ منزل

عجب کہ بند رہی جن پہ راہِ محفلِ دوست
انہی کا ذکر رہا وجہ گرمیٔ محفل

بھول جانے پر بھی یاد آیا کئے
ہم بہر صورت انہیں چاہا کئے

اس قدر پاسِ رضائے دوست تھا
ہم ستم کو بھی کرم سمجھا کئے

تھا کبھی ہم سے بھی دوستانہ ترا
ہم کو بھولا نہیں وہ زمانہ ترا

اہلِ محفل کی دل چسپیاں ہیں وہی
کب سے دُہرا رہا ہوں فسانہ ترا

میری بربادیوں کا سبب کچھ سہی
نام لیتا ہے لیکن زمانہ ترا

ہم کو اب تک ٹھکانہ میسر نہیں
جانے چھوٹا تھا کب آستانہ ترا

کہہ گئے جو فسانہ زمانے کا ہم
درحقیقت تھا وہ بھی فسانہ ترا

اتنی رسوا تری خوش جمالی نہ تھی
میری خلوت میں تھا جب ٹھکانہ ترا

سو گئی بزم کی بزم اے کاظمی
کوئی سنتا کہاں تک فسانہ ترا

عمر صدیقی گردش

ساقیا ختم نہ کر دورِ مے و جام ابھی
بزم میں تشنہ لبی کی ہے تڑپ عام ابھی

کھول دے بادہ پرستوں پہ درِ لطف تمام
ساقیا کانپتے ہاتھوں میں ہیں کچھ جام ابھی

اُن کے بکھرے ہوئے گیسو کا نظارہ تو یہ
میری ہر صبح پہ چھائی ہوئی ہے شام ابھی

کون جانے مری تقدیر میں کیا لکھا ہے
اور کیا غم ہیں پسِ گردشِ ایام ابھی

روحِ انتخاب

مشائخ طریقت کے اقوال انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصود یہی ہے کہ خلق اللہ کو دنیا کی طرف سے پھیر کر آخرت کی طرف متوجہ کریں۔ ہم نے اوپر چند آیات قرآنی و احادیث نبوی سے استشہاد کیا ہے۔ آخر میں مشائخ طریقت کے چند اقوال اس باب میں پیش کرتے ہیں۔

فضیل بن عیاض کہا کرتے تھے۔

طالت فکرتی فی ھذہ الآیۃ انا جعلنا ما علی الارض زینۃ لھا لنبلوھم ایھم احسن عملا وانا لجاعلون ما علیھا صعیدا جرزا (کہف)

یعنی اس آیت پر میں بہت فکر کرتا ہوں کہ جو کچھ زمین پر ہے ہم نے اس کو اس کی زینت کے لئے اس لئے بنایا ہے تاکہ لوگوں کو جانچیں کہ ان میں سے کون اچھا کام کرتا ہے اور ایک روز اس سب کو چھانٹ کر چٹیل میدان بنا دیا جائے گا۔

اس سلسلہ میں ایک روز ابن عمرؓ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ احسن عملاً کون لوگ ہیں۔ فرمایا۔

احسنکم عقلا واورعکم عن محارم اللہ واسرعکم فی طاعۃ سبحانہ

یعنی جس کی سمجھ اچھی ہو، حرام سے زیادہ پرہیز کرے اور حق تعالیٰ کی فرمانبرداری کی طرف زیادہ جھپٹے۔

اس آیت کریمہ کا جس پر حضرت فضیل زیادہ غور کیا کرتے تھے یہی مفہوم ہے کہ جو لوگ دنیا کے بناؤ سنگار پر ریجھ رہے ہیں وہ خوب سمجھ لیں کہ ان کا یہ زرق برق زیادہ دنوں باقی رہنے والی چیز نہیں دنیوی زیب و زینت کا سامان خواہ وہ کتنے ہی جمع کر لیں اور مادی ترقی سے ساری زمین کو لالہ و گلزار کیوں نہ بنا دیں، جب تک ہدایت ربانی و دولت روحانی سے تہی دست رہیں گے، سرور و طمانیت ابدی و نجات و فلاح سے ہم آغوش نہیں ہو سکتے، آخری و دائمی کامیابی صرف ان کے لئے ہے جو مولائے حقیقی کی خوشنودی پر دنیا کی ہر ایک زائل و فانی خوشی کو قربان کر سکتے ہیں اور راہ حق کی جادہ پیمائی میں کسی صعوبت سے نہیں گھبراتے، نہ دنیا کے بڑے بڑے طاقت ور جباروں کی تخویف و ترہیب سے ان کا قدم ڈگمگاتا ہے۔

مشائخ طریقت نے دنیا کی مثال سایہ سے دی ہے، سایہ متحرک ساکن ہے۔ یعنی حقیقت میں متحرک اور بظاہر ساکن۔ اس کی حرکت ظاہری نگاہ سے نہیں محسوس ہوتی۔ بلکہ بصیرت باطن سے دریافت ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ دنیا کا ذکر حضرت حسن بصری کے سامنے کیا جا رہا تھا۔ آپ نے فرمایا:۔

احلام نوم او کظل زائل　　ان اللبیب بمثلھا لا یخدع

یعنی دنیا کی مثال خواب کی سی ہے یا زوال پذیر سایہ کی سی۔ عقلمند اس جیسی چیز سے دھوکا نہیں کھاتا۔

حضرت امام حسن اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

یا اھل اللذات دنیا لا بقاء لھا　　ان اغترارا بظل زائل حمق

اے لذات دنیا کے پرستار دیکھ لذات کو بقا نہیں ۔ زوال پذیر سایہ سے دھوکا کھانا حماقت ہے !

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُم بِاللَّهِ الْغَرُورُ (لقمان آیت ۳۳)

لوگو بے شک خدا کا وعدہ سچا ہے ۔ سو تم کو نہ بہکائے دنیا کی زندگی اور نہ دھوکا دے تم کو اللہ کے نام سے وہ دغاباز (شیطان)

دنیا مطلب تا ہمہ زینت باشد! دنیا طلبی نہ آں نہ اینت باشد

جو شخص دنیا اور اس کے ساز و سامان کو شیطان (الغرور) کے راہ کا آلۂ کار بناتا ہے اور اپنا تمام وقت نفس امارہ کی لذتوں کے حصول میں صرف کرتا ہے ، وہ ایک اندھا جاہل ہے جس کو دوسرے عالم کی خبر نہیں ۔ اور اسی جنس کے اندھوں کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے :۔

يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غَافِلُونَ (الروم)

یہ لوگ حیاتِ دنیا کے ظاہر کو جانتے ہیں اور آخرت سے غافل ہیں ۔

حق بات صرف اتنی ہے کہ حق تعالیٰ نے اس دنیا کو باطل اور بے معنی نہیں پیدا کیا ۔ (رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَٰذَا بَاطِلًا (آل عمران) کائنات کا یہ عظیم الشان کارخانہ بے کار نہیں جس کا کوئی مقصد نہ ہو ۔ یقیناً ان عجیب و غریب حکیمانہ انتظامات کا سلسلہ کسی عظیم و جلیل نتیجہ پر مبنی ہونا چاہیے اور وہ آخرت ہے جو فی الحقیقت دنیا کی موجودہ زندگی کا آخری نتیجہ ہے ۔

یہ ساری عظیم الشان کائنات ، سمٰوات و الارض انسان ہی کے لئے پیدا کی گئی ہے اور انسان کے تابع بنائی گئی ہے جیسا کہ قرآن کریم اعلان کرتا ہے :۔

هُوَ الَّذِي سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (جاثیہ)

یعنی حق تعالیٰ نے اپنی قدرت و حکم سے جو کچھ کہ آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے انسان کی خدمت گزاری میں لگا دیا ہے ۔

ظاہر ہے کہ اگر انسان اس دنیا اور کائنات کی چیزوں کو استعمال نہ کرے اور ان سے بھاگ کر جنگلوں اور پہاڑوں کو آباد کرے تو اس دنیا کو پیدا کرنے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے اور وہ محض باطل بن کر رہ جاتی ہے اسی لئے اسلام رہبانیت نہیں سکھلاتا ۔ قرآن کریم میں رہبانیت پر نکیر وارد ہوئی ہے ۔

رَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ (الحدید)

رہبانیت کو انھوں نے ایجاد کیا ہے ہم نے اس کی تعلیم نہیں دی ہے ۔

یہ بات بھی تنی واضح ہے کہ گویا دنیا کو انسان کے لئے پیدا کیا گیا ہے لیکن انسان کو دنیا کے لئے نہیں پیدا کیا گیا ہے کہ اس میں غرق ہو کر کھپ جائے بلکہ وہ کسی اور اعلیٰ مقصد کے لئے پیدا کیا گیا ہے ۔ قرآن نے اس اعلیٰ مقصد کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے ۔

مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ

ہم نے جن و انس کو نہیں پیدا کیا مگر اس لئے کہ عبادت کریں ۔

اور حدیث میں اسی چیز کو یوں ادا کیا گیا ہے ۔

الدنیا خلقت لکم وانتم خلقتم للآخرة

دنیا تمہارے لئے پیدا کی گئی ہے اور تم آخرت کے لئے پیدا کئے گئے ہو

لہٰذا قرآن کریم کی رُو سے دنیا کا ترک کرنا ، اس سے بھاگنا ، یا رہبانیت اختیار کرنا قطعاً درست نہیں بلکہ دنیا انسان کے لئے ہے اور انسان خدا اور آخرت کے لئے ، یعنی خدا کے احکام و مرضیات کے مطابق دنیا کو استعمال کرنا تاکہ دوسری زندگی یا آخرت جس کے لئے ہم پیدا کئے گئے ہیں ، اس کی نجات و کامیابی حاصل ہو! خلاصہ یہ کہ مسلمان کا کام نہ تارک دنیا بننا ہے اور نہ عاشق دنیا ، وہ دنیا دار ہے

لیکن دنیا پرست ہرگز نہیں!

تصفیۂ قلب کے معنی اس وضاحت کی روشنی میں قرار دیئے جا سکتے ہیں کہ انسان اپنی تمام خواہشوں اور تمام طاقتوں اور دنیا کی تمام چیزوں پر تصرفات کو حق تعالیٰ کے احکام و مرضیات اور ان کی محبت کے تابع کردے۔ تصفیۂ قلب کے لئے اس امر کی اجازت نہیں کہ وہ دنیا اور اس کے سارے تعلقات کو ترک کردے، نہ اس کی اجازت ہے کہ اصولاً نکاح اور اہل و عیال ترک کردے نہ اس کی اجازت ہے کہ اپنے جسمانی و ذہنی قوتوں کو کمزور و فنا کردے بلکہ تصفیۂ قلب کے طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے تمام قوائے جسمانی و ذہنی کو تمامتر حق تعالیٰ کی ہدایت و راہ نمائی کے ماتحت کردے۔ یعنی دنیا کی چیزوں کو جس حد تک اور جس طریقہ سے استعمال کرنے کا حق تعالیٰ نے حکم دیا ہے استعمال کرے اور اپنی قوتوں اور خواہشوں کو بھی احکام الٰہی کے مطابق کام میں لائے۔ یعنی اہل و عیال کے تعلقات، ملازمت و کسب معاش، تجارت و صنعت و حرفت میں ہر جگہ بھی ان حدود کو قائم و برقرار رکھے جو ان چیزوں کے متعلق مرضیات الٰہیہ نے قائم کئے ہیں، اور ان کا سرانجام صرف رضائے حق کے لئے ہو اور حق تعالیٰ کے سوا کوئی چیز مطلوب و محبوب نہ ہو۔

قرآن کریم کی تعلیم نہ شکست خوردہ ذہنیت (Defeatism) پیدا کرتی ہے نہ جمود، خود (Quietism) ایک طرف یہ دنیا پرستی (Secularism) سے روکتی ہے تو دوسری طرف ترک دنیا و رہبانیت سے منع کرتی ہے۔

(از جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب صدر شعبۂ فلسفہ جامعہ عثمانیہ)

"معارف الحدیث" کے مقدمہ کا اقتباس

درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور ارشادات و ہدایات (جن کے مجموعہ کا معروف نام حدیث و سنت ہے) دین کے لئے وہ فضا اور ماحول مہیا کرتے ہیں جس میں دین کا پودا سرسبز و بارآور ہوتا ہے۔ دین کسی خشک اخلاقی ضابطہ یا قانونی مجموعہ کا نام نہیں، وہ جذبات، واقعات اور عملی مثالوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ ان جذبات و واقعات اور عملی مثالوں کا سب سے بڑا اور مستند مجموعہ وہ ہے جو کسی پیغمبر کی ذات سے متعلق اور اس کے حالات زندگی سے ماخوذ ہو۔ یہودی اور عیسائی، نیز ایشیا کے دوسرے مذاہب اس لئے بہت جلد مفلوج ہو کر رہ گئے کہ ان کے پاس اپنے پیغمبروں کی زندگی کے مستند واقعات اور ایمان آفریں کلام کا مجموعہ محفوظ نہیں تھا۔ اور ان مذاہب کو وہ ذہنی ماحول اور فضا میسر نہیں تھی۔ جس میں پیروان مذاہب دینی نشوونما ترقی حاصل کرتے اور مادیت و الحاد کے حملوں سے محفوظ رہتے۔ انہوں نے بالآخر اس کی ضرورت تسلیم کرکے اس خلا کو پیروان مذاہب و "پیران طریقت" کے واقعات و ملفوظات سے پُر کیا۔ مگر اس خانہ پُری نے رفتہ رفتہ مذاہب کو بدعات و رسوم اور نئی نئی تفسیروں کا ایسا مجموعہ بنا دیا جس میں اصل مذہب کی تعلیم گم ہو کر رہ گئی۔ ان مذاہب و اقوام کی اپنے پیغمبروں کی سیرت اور مستند واقعات زندگی کے بارے میں بے بضاعتی و تہی دامنی اب ایک مسلمہ تاریخی حقیقت بن گئی ہے اور اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اسلام کے آخری اور دائمی مذہب ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ یہ حادثہ اس کو پیش نہیں آیا۔ جس ذہنی و روحانی ماحول میں اور جن ذہنی کیفیات کے ساتھ صحابۂ کرام نے زندگی گزاری حدیث کے ذریعہ اس پورے ماحول کو قیامت تک کیلئے محفوظ کر دیا گیا۔ بعد کی نسلوں اور صدیوں کے ایک آدمی کے لئے بالکل ممکن ہے کہ حدیث کے ذریعہ وہ اپنے ماحول سے اپنا رشتہ منقطع کرکے دفعتاً اس ماحول میں پہونچ جائے۔ جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس موجود ہیں۔ جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مصروف تکلم ہیں، صحابۂ کرام گوش برآواز ہیں۔ جہاں احکام کے ساتھ عمل کی شکلیں اور عمل کی شکلوں کے ساتھ جذبات و کیفیات کے منظر بھی نظر کے سامنے ہیں

جہاں اس کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ایمان کس طرح کے اعمال و اخلاق، در یقین آخرت کس طرح کی زندگی پیدا کرتا ہے، یہ ایک دریچہ ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خانگی زندگی، آپ کے گھر کا نقشہ، آپ کے رات کے معمولات، آپ کے گھر والوں کی معاشرت و معیشت اپنی آنکھوں سے دیکھی جا سکتی ہے آپ کے سجود کی کیفیت آنکھوں سے، ور آپ کی دعا و مناجات کا زمزمہ کانوں سے سنا جا سکتا ہے، پھر جو آنکھیں آپ کی آنکھوں کو اشکبار اور قدم مبارک کو متورم دیکھیں اور جو کان پوچھنے اور سوال کرنے پر یہ آواز سنیں کہ اَفَلَا اَکُوْنَ عَبْدًا شَکُوْرًا (کیا میں خدا کا شکرگزار بندہ نہ بنوں؟) وہ غفلت کا کس طرح شکار ہو سکتے ہیں، جن آنکھوں نے کاشانۂ نبوت میں دو دو مہینے چولہا گرم ہوتے نہیں دیکھا جنھوں نے پیٹ پر پتھر بندھا ہوا اور پشت مبارک پر چٹائی کے نشانات پڑے دیکھے، جنھوں نے سونے سے پہلے بیقراری کے ساتھ صدقہ کا بچا ہوا سونا راہ خدا میں خرچ ہوتے دیکھا جس نے مرض وفات میں چراغ کا تیل پڑوسی کے گھر سے قرض آتے ہوئے دیکھا اس پر دنیا کی حقیقت کیسے چھپ سکتی ہے، اور زہد کا جذبہ اس کے اندر کیسے ابھر نہیں سکتا؟ جس نے آپ کو اپنے گھر والوں کی خدمت، اپنے بچوں کے ساتھ محبت، اپنے خادموں کے ساتھ رعایت اور اپنے رفقاء کے ساتھ عنایت اور اپنے دشمنوں کے ساتھ تحمل فرماتے ہوئے دیکھا وہ مکارم اخلاق اور انسانیت کاملہ کا درس اس در کو چھوڑ کر اور کہاں سے لینے جائے گا۔

پھر اس ماحول میں صرف کاشانۂ نبوت ہی کا دروازہ نہیں کھلتا ہے جس سے دیکھنے والوں کو یہ سب نظر آتا ہے بلکہ صحابہ کرام کے گھروں کے دروازے بھی کھلے ہوئے ہیں، اور ان کے گھروں کی زندگی و معاشرت، ان کے دلوں کی تپش، ان کے سینوں کا گداز، ان کی بازاروں کی مصروفیت اور مسجدوں کی فراغت، ان کی بے نفسی و للہیت اور ان پر نفس انسانی کے حملے، ان کا انقیاد کامل اور ان کی بشری لغزشیں سب عیاں ہیں۔ یہاں ابو طلحہ انصاری کے ایثار کا واقعہ بھی آنکھوں کے سامنے گزرتا ہے اور حضرت کعب بن مالک کے غزوۂ تبوک سے پیچھے رہ جانے کا قصہ بھی پیش آتا ہے۔ غرض یہ ایک ایسا طبعی و قدرتی ماحول ہے جس میں زندگی اپنے پورے تنوعات و حقائق اور انسانی فطرت اپنے تمام خصائص کے ساتھ موجود ہے اور حدیث نے اس کا پورا عکس لے کر قیامت تک کے لئے دور نبوی کو محفوظ کر دیا ہے۔

قرآن مجید کے ساتھ عہد نبوی کی اس تصویر کا باقی رہنا اور نبوت کے کلام اور ماحول کو محفوظ رہنا، اسلام کا ایک اعجاز اور اس کا ایسا امتیاز ہے جس میں کوئی مذہب اور کوئی امت اس کی شریک و سہیم نہیں، ایک ایسا مذہب جس کو قیامت تک باقی رہنا اور تمام آنے والی نسلوں کو عملی نمونہ، اور عمل کے جذبات و محرکات اور قلب و دماغ کو غذا فراہم کرنا ہے، ماحول کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ ماحول حدیث کے ذریعہ محفوظ ہے۔ تدوین حدیث کی تاریخ پڑھ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ اتفاقی امر ہے اور دور متاخر کی کوئی "جدت" نہیں ہے، صحابہ کرام کا عہد نبوی ہی میں کتابت حدیث کی طرف متوجہ ہونا اور بہت بڑی تعداد میں احادیث کا محفوظ کر لینا، پھر انہیں کے آخر دور میں تابعین کا تدوین و ترتیب کی طرف توجہ کرنا، پھر ایران و خراسان و ترکستان سے طالبین علم کے سمندر کا امنڈ آنا، اس کا جمع و حفظ حدیث سے عشق و شغف ان کا غیر معمولی حافظہ ان کا عزم و بلند ہمتی، پھر اسماء رجال و فن روایت کے مجتہدین کا پیدا ہونا جن کو اس کا ملکۂ راسخہ اور بصیرت کاملہ حاصل تھی۔ پھر ان کا انہماک و خود فراموشی، پھر امت کی حدیث کی طرف توجہ اور اس کی عالم اسلام میں مقبولیت اور اشاعت یہ سب واقعات اس بات کا ثبوت ہیں کہ جمع قرآن کی طرح اللہ تعالیٰ کو اس "صحیفہ زندگی" کو محفوظ کرنا مقصود تھا۔ اسی کی بدولت حیات طیبہ کا امتداد و تسلسل باقی رہا، اور امت کو اپنے ہر دور میں وہ روحانی ذوقی، علمی و ایمانی میراث ملتی رہی جو صحابہ کرام کو براہ راست حاصل ہوئی تھی۔ اس طرح صرف عقائد و احکام ہی میں "توارث" کا سلسلہ جاری نہیں رہا بلکہ ذوق و مزاج میں بھی توارث کا سلسلہ جاری رہا۔ حدیث کے ماتحت عہد صحابہ کا "مزاج و مذاق" ایک نسل سے دوسری نسل اور ایک طبقہ سے دوسرے طبقہ تک منتقل ہوتا رہا، اور امت کی طویل تاریخ میں کوئی مختصر سے

لے

مختصر عہد ایسا نہیں آنے پایا جب وہ "مزاج و مذاق" یکسر ناپید اور معدوم ہو گیا ہو۔ ہر دور میں ایسے افراد رہے جو صحابہ کرام کے مزاج و مذاق کے حامل کہے جا سکتے ہیں، وہی عبادت کا ذوق، وہی تقویٰ و خشیت، وہی استقامت و عزیمت، وہی تواضع و احتساب نفس، وہی شوقِ آخرت، وہی دنیا سے بے رغبتی، وہی جذبۂ امر بالمعروف و نہی عن المنکر، وہی بدعات سے نفرت، اور جذبۂ اتباع و سنّت، جو حدیث کے مطالعہ و شغف کا نتیجہ ہے، یا ان لوگوں کی صحبت و تربیت کا فیض ہے جنھوں نے اس مشکوٰۃ نبوت سے روشنی حاصل کی ہو، اور اس میراث نبوی سے حصّہ پایا ہو، امت کا یہ ذہنی و مزاجی توارث قرن اول سے اس چودھویں صدی ہجری کے عہد انحطاط و مادیت تک برابر قائم ہے اور سفیان ثوری، عبداللہ بن مبارک اور امام احمد بن حنبل سے لے کر مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی، مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا سید عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہم تک کی زندگی اور سیرت و اخلاق میں ان کا پرتو صاف نظر آتا ہے۔ اور جب تک حدیث کا یہ ذخیرہ باقی ہے اس سے استفادہ کا سلسلہ جاری، اور اس کے ذریعے عہد صحابہ کا ماحول محفوظ ہے۔ دین کا یہ صحیح مزاج و مذاق جس میں آخرت کا خیال دنیا پر، سنّت کا شرسوم و رواج پر، روحانیت کا اشمادیت پر غالب ہے باقی رہے گا، اور کبھی اس امت کو دنیا پرستی، مرتبا مادیت انکار آخرت اور بدعات و تحریفات کا پورے طور پر شکار نہیں ہونے دے گا۔ بلکہ اس کے اثر سے ہمیشہ اس امت میں اصلاحی و تجدیدی تحریکیں اور دعوتیں اٹھتی رہیں گی اور کوئی نہ کوئی جماعت حق کی علمبردار اور سنّت و شریعت کے فروغ کے لئے کفن بردوش رہے گی۔ جو لوگ امت کو زندگی، ہدایت اور قوت کے اس سرچشمہ سے محروم کرنا چاہتے ہیں اور اس میں اس ذخیرہ کی طرف سے بے اعتمادی اور شک و ارتیاب پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ نہیں جانتے کہ وہ امت کو کیا نقصان پہنچا رہے ہیں، اور اس کو کس عظیم سرمایہ اور کتنی بڑی دولت سے محروم کر رہے ہیں، وہ نہیں جانتے کہ وہ اس امت کو اسی طرح سے "محروم الارث منقطع الاصل، ورآوارہ" کر دینا چاہتے ہیں جس طرح یہودیت اور عیسائیت کے دشمنوں یا حوادث روزگار نے ان عظیم مذاہب کو کر دیا۔ اگر وہ سوچ سمجھ کر ایسا کر رہے ہیں تو ان سے بڑھ کر اس امت اور اس دین کا دشمن کوئی نہیں ہو سکتا اس لئے کہ پھر اس "مزاج و مذاق" کو دوبارہ پیدا کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں جو صحابہ کرام کا امتیاز تھا اور جو یا تو کامل طور پر براہ راست صحبت نبوی سے پیدا ہو سکتا ہے، یا بالواسطہ حدیث کے ذریعہ جو اس عہد کا جیتا جاگتا مرقع، اور حیات نبوی کا بولتا چلتا روزنامچہ ہے اور جس میں عہد نبوی کی کیفیات بسی ہوئی ہیں۔

(مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

ہماری نظر میں

معارف الحدیث (جلد دوم)

تالیف :- مولانا محمد منظور نعمانی ، ضخامت ۳۲۰ صفحات - کتابت ، طباعت اور کاغذ خوب سے خوب تر ، مجلد گرد پوش کے ساتھ ، قیمت مجلد :- پانچ روپے آٹھ آنے - غیر مجلد :- چار روپے آٹھ آنے - ملنے کا پتہ :- کتب خانہ "الفرقان" کچہری روڈ ، لکھنؤ (بھارت)

"معارف الحدیث" کی پہلی جلد پر "فاران" میں تبصرہ ہو چکا ہے ، اب اس کی دوسری جلد منظرِ عام پر آئی ہے جو "کتاب الرقاق" در "کتاب الاخلاق" پر مشتمل ہے ، جن میں دو سو ساٹھ حدیثوں کی تشریح کی گئی ہے -

"معارف الحدیث" پر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے مقدمہ تحریر فرمایا ہے ، جو ہر اعتبار سے اس ایمان افروز کتاب کے شایانِ شان ہے ، "حدیث و سنت" کی دین میں کیا اہمیت ہے ؟ اس کو مولانا علی میاں مدظلہ نے جس اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے ، وہ بار بار پڑھنے کی چیز ہے - ایک ایک سطر ادب و انشاء کی تمام خوبیوں کے علاوہ دینی نقطۂ نگاہ سے بھی ایک "شہ پارہ" ہے ! جس کا اقتباس ہی شمارے کی زینت ہے -

جناب مولانا محمد منظور نعمانی نے جس ترتیب و تبویب کے ساتھ "معارف الحدیث" کو تصنیف فرمایا ہے ، اس کے لئے اردو دنیا کو ان کا شکرگزار ہو جانا چاہیے ، احادیثِ نبوی کا ترجمہ کس قدر بامحاورہ اور عام فہم زبان میں کیا ہے ، اور پھر ان کی دل نشین تشریح "نورٌ علیٰ نور" ایک نمونہ :-

قیامت کے دن معمولی سمجھے والے گناہوں کی بھی باز پرس ہو گی

(۱) عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صلی اللہ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ یَا عَائِشَةُ اِیَّاکِ وَمُحَقَّرَاتِ الذُّنُوْبِ فَاِنَّ لَهَا مِنَ اللهِ طَالِبًا -

(رواہ ابن ماجہ والدارمی والبیہقی فی شعب الایمان)

(ترجمہ) "حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا :- اے عائشہ ! اپنے کو ان گناہوں سے بچانے کی خاص طور سے کوشش کرو اور فکر کرو جن کو حقیر اور معمولی سمجھا جاتا ہے - کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی بھی باز پرس ہونے والی ہے "

(تشریح) "جن لوگوں کو آخرت اور حساب کتاب کی کچھ فکر ہوتی ہے ، اور جو اللہ کے عذاب اور اس کی پکڑ سے ڈرتے ہیں ، وہ کبیرہ یعنی بڑے گناہوں سے بچنے کا تو عام طور سے اہتمام کرتے ہیں لیکن جو گناہ ہلکے اور صغیرہ سمجھے جاتے ہیں ، ان کو خفیف اور معمولی سمجھنے کی وجہ سے اللہ کے بہت سے خدا ترس بندے بھی ان سے بچنے کی فکر زیادہ نہیں کرتے حد یہ کہ اس حیثیت سے کہ وہ گناہ ہیں اور ان کے کرنے میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی

؎ "قربیا نزا بیش بود حیرانی" (صفحہ ۵۹) اصل ضرب المثل "نزدیکاں را بیش بود حیرانی" ہے " صفحہ ۲۵۰ کی حدیث (۱۹۲) میں "ذوالوجہین" کا ترجمہ ہونے سے رہ گیا ہے -

صادر ہوتی ہے، اور آخرت میں اللہ کی طرف سے ان کی باز پرس بھی ہونی ہے۔ ہمیں ان سے بچنے کی بھی پوری پوری فکر اور کوشش کرنی چاہئے ——— اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو یہی نصیحت فرمائی ہے! اگرچہ اس کی خاص مخاطب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ہیں، لیکن درحقیقت یہ انتباہ اور ہدایت و نصیحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اپنی امت کے سب مردوں اور عورتوں کے لئے ہے، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص گھر والوں کو بھی اس کی ضرورت ہے تو ہما شما کے لئے اس میں غفلت اور بے پروائی کی کیا گنجائش ہے!

حقیقت یہ ہے کہ صغیرہ گناہ، اگرچہ کبیرہ گناہ کے مقابلہ میں صغیرہ ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا باعث ہونے کی حیثیت سے، اور اس حیثیت سے، کہ آخرت میں اس کی بھی باز پرس ہونے والی ہے، ہرگز صغیرہ اور ہلکا نہیں ہے، دونوں میں بس اتنا ہی فرق ہے جتنا زیادہ زہریلے اور کم زہریلے سانپوں میں ہوتا ہے، پس جس طرح کم زہر والے سانپ سے ہم بچتے ہیں اور بھاگتے ہیں، اسی طرح ہمیں صغیرہ گناہوں سے بھی اپنے کو بچانے اور محفوظ رکھنے کی پوری کوشش کرنی چاہئے۔ یہی اس حدیث کا منشا اور مقصد ہے۔

احادیث نبوی کے ترجمہ اور تشریح کا پوری کتاب میں یہی رنگ ہے:-

"تلك عاجل بشرى المؤمن"

"یہ تو مومن بندہ کی نقد بشارت ہے"

یہ ترجمہ:- متن کے اصل مفہوم سے کس قدر مطابق و اقرب ہے، "عاجل" کا ترجمہ "نقد" مترجم کے ذہن میں القا کیا گیا ہے ——— اسی طرح "ولیسعك بیتك" (تمہارے گھر میں تمہارے لئے گنجائش ہونی چاہئے) کی یہ تشریح:- کتنی خوب ہے ——— "اس کا مطلب یہ ہے کہ جب باہر کوئی کام نہ ہو تو آوارہ گردوں اور بے فکروں کی طرح باہر گھوما نہ کرو، بلکہ اپنے گھر میں اور بال بچوں میں رہ کر، گھر کے کام کاج کیا کرو اور اللہ کی عبادت کیا کرو!

یہ واقعہ ہے کہ تمدن و تہذیب کی سیمیائی نمودنے اچھے اچھوں کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دی ہے، اور عوام کا تو پوچھنا ہی کیا، خود خواص اور دین کے مبلغین اور داعیوں کی زندگی میں خشیت و تقویٰ کا وہ رنگ نظر نہیں آتا جسے ہم صحابہ اور تابعین کی مقدس سیرتوں میں پڑھتے ہیں ——— تو ایسے "آخرت فراموش دور" میں اس کی شدید ضرورت ہے کہ خوفِ خدا، فکرِ آخرت دنیا کی تحقیر و مذمت، دنیا سے بے رغبتی، اور زہد و ورع کے مضامین کی بار بار تکرار کی جائے! اسی ضرورت کو خاص طور سے پیش نظر رکھ کر یہ کتاب تالیف کی گئی ہے، اور اپنے مقصد میں یہ کتاب ہر اعتبار سے مفید اور کامیاب ہے!

"معارف الحدیث" فتنۂ انکار حدیث کی تردید میں ایک مثبت اقدام ہے، مولانا نعمانی مدظلہ نے یہ کتاب تالیف فرما کر وقت کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے، اللہ تعالیٰ ان کو دارین میں بے حساب اجر عطا فرمائے گا۔

صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں کتاب اللہ کی مقدس تعلیم کے اثر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت و تربیت سے؛ توکل اور صبر و رضا کی شان، دنیا پر آخرت کو ترجیح دینے کا عملی جذبہ، اور خشیت و تقویٰ کا جو رنگ جھلک اٹھا تھا اس نے ان نفوس قدسیہ میں بے پناہ عزیمت بھی پیدا کر دی تھی۔ وہ رومی جاسوس کے بقول "راتوں کے راہب تھے تو دن کے شہسوار بھی تھے"۔ وہ گریۂ شب، نالۂ نیم شبی اور دعائے سحرگاہی سے جن کے دلوں کو تازگی ملتی تھی، اور جو پیوند لگے کپڑے پہنتے تھے۔ وہ فاتح و کشور کشا بھی تھے۔ انہی خشیت و تقویٰ کے چلتے پھرتے مجسموں نے قیصر و کسریٰ کے تاج و تخت کو بھی روند ڈالا تھا، یہ نفوس قدسیہ زاہدانِ عالم گیر، عابدانِ کشور کشا اور فرمانروائی کرنے والے فقیران بے نوا بھی تھے جس قرآن کو پڑھ پڑھ کر ان کے دل لرزتے تھے اور ان کی آنکھیں

اشکبار ہو جاتی تھیں، بس قرآن کے احکام کو وہ دنیا میں نافذ بھی کرتے تھے۔ ان میں اسلام کو غالب کرنے کی بے پناہ عزیمت پائی جاتی تھی!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور آثار صحابہ میں "خشیت" کے ساتھ "عزیمت" بھی ملتی ہے، جو کوئی بھی تحریر و تقریر اور اپنی عملی زندگی کے ذریعہ دین کی تبلیغ کر رہا ہے، اُسے خشیت و تقوی اور خوف آخرت کے ساتھ مسلمانوں میں عزیمت کی برقی رو پیدا کرنے کیلئے بھی جدوجہد کرنی چاہیئے! اسلام گوسفندوں کا نہیں اللہ کے شیروں کا مذہب ہے۔ مسلمان کی زندگی کا یہ موضوع ہونا چاہیئے کہ وہ "معروف" کو قائم اور "منکر" کو مٹانے کے لئے امکانی حد تک تگ و دو کرے، اور کسی غیر اسلامی نظام کے تحت اُسے اطمینان و خوشدلی کی ایک سانس بھی میسر نہ آئے! ضرورت ہے کہ "معارف الحدیث" کی تیسری جلد "دعوت و عزیمت" کے عنوان کے تحت مرتب کی جائے، جسکے اہم ابواب:۔

غزوات جہاد، اسلامی طرز حکومت، حدود اللہ کا اجراً، کفر کی ذلت اور اسلام کا غلبہ، کتاب و سنت کا عملی نفاذ، اسلامی معاشرے کی پاکیزگی اور اس کا انقلابی زمانہ،........ ہونے چاہئیں!

مکالمات نبویؐ

از:۔ مولانا ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی، ضخامت ۲۶۱ صفحات (مجلد، رنگین گرد پوش کے ساتھ) قیمت تین روپے

ملنے کا پتہ:۔ ادارہ اشاعت السنہ، مرکزی جمعیت اہل حدیث شیش محل روڈ، لاہور۔

جناب مولانا ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی دسیوں کتابوں کے مصنف، مؤلف اور مترجم ہیں، اس کتاب کو انھوں نے بڑی محنت اور تحقیق کے ساتھ مرتب فرمایا ہے اور "مکالمہ" کا رنگ پیدا کر کے اس کو دلچسپ بھی بنایا ہے۔

"صلح حدیبیہ" اسلامی تاریخ کا مشہور واقعہ ہے، اس کا عنوان بنا کر، فاضل مصنف نے پہلے یہ بتایا ہے کہ "حدیبیہ" کہاں واقع ہے؟ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے ساتھ عمرہ کرنے کے لئے یہاں تک آنے اور قریش کی مزاحمت کی تفصیل پیش کی ہے، اس کے بعد (۱) حدیبیہ میں سہیل بن عمرو وکیل قریش کا مکالمہ (۲) ابو جندلؓ کو حضورؐ کی زبانی صبر کی تلقین اور (۳) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو ——— درج کی گئی ہے، پوری کتاب میں تاریخی واقعات کی تفصیل کا یہی انداز ہے!

"رسول خدا کے پیروں کے تلے سے زمین نکل گئی" (صفحہ ۸۰) یہ انداز بیان کسی طرح مناسب نہیں، آئندہ ایڈیشن میں اس کو کسی مناسب جملہ سے بدل دینا چاہیئے ——— "آنحضرتؐ انشرح نہ فرمالیتے" (صفحہ ۹۱) یہ کیا زبان ہے؟

"زمین سے رپٹ کر خاک میں لت پت ہوگیا" (صفحہ ۹۹) "رپٹنا" گیلی زمین کے موقعہ پر بولا جاتا ہے!

صفحہ ۱۵۲ پر اس آیت:۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ

کا یہ ترجمہ ——— "لوگو! تمہارے پاس تم ہی میں کے ایک رسول آئے ہیں، تمہاری تکلیف اُن پر شاق گزرتی ہے اور اُن کو تمہاری بہبود کا "ہوکا" ہے!

ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے مترجم قرآن سے لیا ہے، جس میں لفظ "ہوکا" قابل اعتراض ہے، اس میں ذم کا پہلو پایا جاتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے اس لفظ کی نسبت درست نہیں! کیا فاضل مصنف اس سے باخبر نہیں ہیں کہ ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کی "عربی دانی" اگرچہ مسلّم تھی اور وہ اردو زبان کے بھی استاد تھے مگر انہیں قرآن کریم کے ترجمہ میں اردو کے ٹکسالی محاورے لانے کا "ہوکا" تھا اس نے اُن کے ترجمہ کی سنجیدگی اور وقار کو مجروح کر دیا۔

"سیدنا عمرؓ ۔ (حضرت عباسؓ سے) یہ آپ کیا فرما رہے ہیں، واللہ! جس روز آپ مسلمان ہوئے تھے، مجھے اس کی خوشی اپنے باپ خطاب کے مسلمان ہونے سے بھی بڑھ کر ہوتی" (صفحہ ۱۶۴) ——— لائق مصنف نے حضرت عمرؓ کے باپ خطاب کے اسلام

ونے کا ذکر کیا ہے، حالانکہ تاریخ و سیر کی کتابیں اس ذکر سے خالی ہیں!

اگر نفسِ اسلام کے خلاف کوئی داخلی یا خارجی باقاعدہ خروج نہ ہو جیسا کہ پاکستان کے موجودہ دور کی حالت ہے۔ بشرطیکہ فیشن کے اثر سے اسلام پر تبرّا نہ کیا جائے جس کی وبا ہمارے دور میں تیزی سے پھیل رہی ہے، ایسی حالت میں صدرِ اول عہدِ رسالت مآب اور دورِ صدیقی کے تتبع میں سزائے قتل میں ع

تھوڑی سی مزاحمت کا بدلنے کیلئے

ضرور ہونا چاہیئے۔ (صفحہ ۱۸۶)

پوری عبارت ایک "گورکھ دھندے" سے کم نہیں، آخر کہنا کیا مقصود ہے!

"قریش کے دل میں حسدِ محمدؐ کی جو آگ سلگ رہی تھی" (صفحہ ۱۹۹) "حسدِ محمدؐ" کی ترکیب، لکھنے والے کے ذہن میں کیسے آئی......

اوطاس اور حنین کا میدان قبیلۂ ہوازن اور اُن کے حلیفوں سے اٹا پڑا ہے" (صفحہ ۲۰۵) "پٹا پڑا ہے" لکھنا چاہیئے تھا۔ "اٹا" گرد و غبار اور کوڑے کرکٹ کے لئے بولا جاتا ہے ——— "اے برادرِ گرامی! میری کچھ سہایتا فرمائیے" (صفحہ ۲۲) یہ حلیمہ سعدیہ کی بیٹی اور حضورؐ کی رضاعی بہن شیما آپ سے کہہ رہی ہیں، "سہایتا" سنسکرت میں بے شک "مدد" ([illegible]) کو کہتے ہیں مگر سنسکرت کے اس لفظ کے استعمال کا یہاں کیا محل تھا۔

"مبادا کوئی صاحب مومن اور حور عین کے سنجوگ پر برافروختہ ہو کر روایت و حدیث سے دامن .... جھٹک لیں (صفحہ ۲۳۵) بالکل نوشتوں کا سا اندازِ بیان ——— "قریش نے .... اپنا مجربہ حملہ استعمال فرمایا" (صفحہ ۲۵۹) "مجربہ" جیسی نسخوں کی زبان ہے!

افسوس ہے کتاب کی زبان کمزور ہے، اور بعض مقامات پر جملوں کی ساخت سے وجدان کو الجھن ہوتی ہے۔ ——— قریش کی شرک پرستی کے لئے ایک جگہ مصنف کے قلم سے بے ساختہ نکل گیا ہے:-

"یہ لوگ شجرۃ الزقوم میں بھی قلمیں لگانے سے باز نہ رہ سکے" (صفحہ ۲۵۶)

کاش، تحریر میں یہی رنگ پایا جاتا! جہاں تک مواد کا تعلق ہے فاضل مصنف نے کتاب "سنت" کے علاوہ تاریخ و سیر کے سینکڑوں صفحات کا خلاصہ پیش کر دیا ہے۔ کتاب کی افادیت اپنی جگہ بہرحال مسلّم ہے!

چراغ راہ کا اسلامی قانون نمبر

مرتبہ:- خورشید احمد، ضخامت ساڑھے تین سو صفحات، قیمت: تین روپے آٹھ آنے

ملنے کا پتہ:- دفتر چراغ راہ، صدر کراچی۔

ماہنامہ "چراغ راہ" کے "اسلامی قانون نمبر جلد اول" پر فاران میں تبصرہ کیا جا چکا ہے، اب اس کی دوسری جلد اسی اہتمام کے ساتھ منظرِ عام پر آئی ہے۔ جلد دوم کا آغاز ایک نقشہ سے ہوتا ہے جس میں فقہی مذاہب کی بنیاد پر عالمِ اسلام کی آبادی دکھائی گئی ہے، یہ بہت اہم نقشہ ہے مگر اس میں یہ غلطی پائی جاتی ہے کہ دنیا کی شیعہ آبادی ایک کروڑ سینتیس لاکھ ظاہر کی گئی ہے۔ حالانکہ تمام دنیا میں شیعہ آبادی مجموعی طور پر چار کروڑ سے کیا کم ہوگی!

اسلامی قانون نمبر جلد دوم تین حصوں پر مشتمل ہے:-

(۱) اسلامی قانون کی تشکیل جدید۔ (۲) بحث و نظر، اسلامی قانون اور تعبیر نوادر (۳) ہمارا قانونی سرمایہ! اس کے لکھنے والوں میں عالمِ اسلام کی معروف شخصیتیں شامل ہیں، ہر مقالہ اپنی جگہ اہم، جاندار اور معلومات آفریں ہے۔ خاص طور سے مولانا مجیب اللہ

ندوی کا فاضلانہ مقالہ ——— "اجتہاد اور تبدیلیٔ احکام" ——— تجدد پسندوں کے پیدا کئے ہوئے شبہات کا ازالہ، اور غلط فہمیوں کا جواب ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ زمانہ کے تقاضوں کے مطابق "کتاب و سنّت" کے احکام میں رد و بدل کیا جا سکتا ہے (معاذ اللہ) یہ تصور کس قدر غلط، لغو اور گمراہ کن ہے! زمانہ اگر امن و سلامتی چاہتا ہے تو اُسے "کتاب و سنّت" کے مطابق بننا چاہیے۔ "کتاب و سنّت" کو زمانہ کے تقاضوں کے مطابق نہیں بنایا جا سکتا۔ کہ بنیادی حقیقتیں زمانہ کے ساتھ تبدیل نہیں ہوا کرتیں اس مقالہ میں فاضل مقالہ نگار نے تفصیل کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اجتہادی فیصلے کتاب و سنّت کے مطابق تھے، اور حضرت فاروق نے "کتاب و سنّت" سے سرمو تجاوز کرنے کی جرأت نہیں کی!

"اسلامی قانون نمبر" کا تیسرا باب، ایک "سوالنامہ" کے جوابات پر مشتمل ہے، یہ سوالات کتنے اہم ہیں۔

(۱) اسلام کا تصورِ قانون کیا ہے! (۲) آپ کی نگاہ میں اسلامی زندگی کی تشکیل و تعمیر میں قانون کا کیا حصہ ہے؟ اسلام اس سلسلہ میں قانون کا کیا رول مقرر کرتا ہے! (۳) فقہ اسلامی میں جمود کا اصل سبب کیا ہے (۴) اسلامی قانون کی تشکیلِ جدید کس طرح ہو سکتی ہے؟ آپ کے خیال میں اس کی شکل کیا ہو سکتی ہے؟ اس کے لوازمات اور تقاضے کیا ہیں؟ (۵) پاکستان میں اسلامی قانون کے نفاذ کے لئے کیا اقدامات ضروری ہیں!

گیارہ اسلام پسند دانشوروں نے اس سوالنامہ کا جواب دیا ہے، یہ جوابات بڑی دور رس اہمیت کے حامل ہیں! مولانا عبدالماجد دریابادی کے جوابات کو شاید بطورِ تبرک شامل کیا گیا ہے۔ انھوں نے اتنے اہم سوالات کا جواب دینے میں ذرا سی بھی محنت برداشت نہیں کی، بس قلم برداشتہ چند سطریں لکھدی ہیں!

اسلامی قانون پر اردو، عربی اور انگریزی پر کیا کام ہوا ہے؟ اس کی تفصیل "کتابیات" کے باب میں ملتی ہے، جس سے "ریسرچ" میں بہت کچھ فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے!

اسلامی قانون کا معطل پڑے رہنا، دنیا کی سب سے بڑی ٹریجڈی ہے، دنیا کے جن خطوں کی حکومت بھی مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے وہاں اسلامی قانون کے نفاذ کی سعادت جس کسی کے بھی حصہ میں آئے گی۔ تاریخ اُسے یاد رکھے گی اور اللہ تعالیٰ کے یہاں اُسے بے حساب اجر ملے گا دیکھئے یہ سعادت کس کے حصہ میں آتی ہے اور کب آتی ہے!

جناب خورشید احمد نے "اسلامی قانون نمبر" مرتب فرما کر بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے، علمی دنیا کی طرف سے وہ شکریے کے مستحق ہیں۔

سلگتے انگارے | از۔ نیناکاش (ایم اے) ضخامت ۱۹۲ صفحات۔ قیمت۔۔ تین روپے۔ (مجلد، رنگین گردپوش کے ساتھ)
ملنے کا پتہ:۔ نیا ناشر ۳۱۱ جناح کالونی لائل پور۔

یہ نیناکاش کے گیارہ افسانوں کا مجموعہ ہے، جو خاصے دلچسپ ہیں، اور چونکہ مختصر ہیں اس لئے ان کا مطالعہ طبیعت پر گراں نہیں گزرتا، ان افسانوں میں رومانس ہے، سماج پر طنز ہے، منظر نگاری اور نفسیات کی عکاسی ہے! دو تین افسانوں میں ضرورت سے زیادہ اختصار سے کام لیا گیا ہے، پلاٹ پھیلاؤ چاہتا تھا مگر افسانہ نگار نے اس کو بھینچ کر اور سکیڑ کر جلدی سے ختم کر دیا۔

"تنہا" ——— میں جو یہ دکھایا گیا ہے کہ ایران کا شہزادہ (ولی عہد) دہلی آتا ہے اور پہریداروں کو دھوکہ دے کر شاہی باغ میں پہنچکر شہنشاہ اورنگ زیب کی بیٹی زیب النساء سے پیار محبت کی باتیں کرتا ہے ——— یہ کسی طرح درست نہیں! ایسی بے بنیاد روایت اور مفروضہ کو سامنے رکھ کر تاریخ کی کسی معروف شخصیت کو افسانوی رنگ میں پیش کرنا، فنِ افسانہ نگاری کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہے! زیب النساء کے ساتھ عاقل خاں کے معاشقہ اور ناصر علی شاعر کی شاعرانہ چھیڑ چھاڑ کے جو افسانے گھڑے گئے ہیں وہ بھی بالکل...

بے بنیاد ہیں۔ نینا کاشی نے بھی افترا پردازی کی اس لے میں لے ملا دی۔

"بانسری کے مدھر سنگیت سے مرصع، دوپہر کی کجی اداؤں سے فضا کا کلیجہ دھڑک دھڑک اٹھتا تھا: (صفحہ ۷) تحریر میں جہاں یہ رنگ پیدا ہو گیا ہے، وہاں وجدان بڑا انقباض محسوس کرتا ہے ——— اور بیلے کی کلیاں چٹخ کر پھول بننے کے لئے ...." (صفحہ ۷) کلیوں کے لئے "چٹخنا" نہیں "چٹکنا" بولتے ہیں۔ "چٹخنا" شیشہ اور کانچ وغیرہ کے لئے بولا جاتا ہے جیسے:۔ لالٹین کی چمنی چٹخ گئی!

"اس کی پیشانی چوم ڈالی": (صفحہ ۳۱) "چومنے" کے ساتھ "ڈالنا" غیر فصیح ہے ——— "اس کے چاروں طرف کہر ہو رہا تھا": (صفحہ ۳۶) "کہر" بالاتفاق مونث ہے۔ "تمہارے مسبیڈ تمہاری بیگ بازی کی مخالفت نہیں کرتے": (صفحہ ۵۶) "بیگ بازی" جدت ہے مگر نامانوس جدت ——— "آسمان پر اُجیالے بادل سُرخی میں ڈوبے": (صفحہ ۶۵) "اُجلے بادل" لکھنا چاہیے ———

"بات بات میں اس طرح کی اکڑ پھون کون برداشت کرے گا": (صفحہ ۲) "اکڑ فون" بولا جاتا ہے۔

"یہ سُن کر بھر تو کے دل میں ہتھوڑے سے برس لگے": (صفحہ ۴۹) "میں" کا نہیں "پر" کا محل تھا ——— "دل پر ہتھوڑے سے پڑنے یا برسنے لگے": اور "برسنا" پھر بھی وجدان کو کھٹکتا ہے ——— "پیار مادری سے محروم": (صفحہ ۱۰۸) "پیار مادری" ہر اعتبار سے غلط ترکیب ہے (نمونہ ۱) "ماں کے پیار سے محروم، یا ممتا سے محروم" لکھنا چاہیے تھا ——— "تنی ہوئی ڈاڑھیاں خود بخود ندھال ہو گئیں": (صفحہ ۱۴۱) "ڈاڑھیوں" کا "نڈھال ہونا" پہلی مرتبہ نظر سے گزرا اور لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آ گئی۔

زبان و بیان کی اس قسم کی کمزوریاں جگہ جگہ ملتی ہیں۔ بعض مقامات پر اظہار میں خاصہ تکلف بھی پایا جاتا ہے۔

عکس خیال

ارشد صدیقی ساگری۔ ضخامت ۶۴ صفحات، قیمت:۔ دو روپے۔

ملنے کا پتہ:۔ دانش کدہ، بھوپال (ایم، پی، بھارت)

جناب ارشد صدیقی بھوپال کے خوش گو نوجوان شاعر ہیں۔ انھوں نے انگریزی کی پندرہ نظموں کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ ان کی ترجمہ کی ہوئی نظموں کے اس مجموعہ پر جناب کوثر چاند پوری نے پیش لفظ لکھا ہے۔

لانگ فیلو (Long fellow) کی نظم "The Arrow and the Song" کا یہ ترجمہ کس قدر شگفتہ اور جاندار ہے:۔

میں نے اک تیر خلاؤں میں کبھی پھینکا تھا
وہ کہاں جا کے گرا یہ مجھے معلوم نہیں
اس کی رفتار کی تیزی کو نظر کیا پاتی ؟
رہ گئی کھنچ کے تخیل میں فقط ایک لکیر
میں نے ایک نغمہ فضاؤں میں کبھی چھیڑا تھا
وہ کہاں جا کے رکا یہ مجھے معلوم نہیں
کس کی نظروں میں ہو وہ قوتِ پرواز کہ جو؟
کر سکے نغمۂ شاعر کی بلندی کا اسیر
بعد مدت کے جب آیا مجھے وہ تیر نظر
میں نے اک نرم شجر میں اُسے پنہاں دیکھا

اور وہ نغمہ جو چھیڑا تھا فضاؤں میں کبھی

اپنے اک دوست کے سینہ میں فزاں ہے

آر، بندر گھوش کی نظم "Hymn to Mother" کا ترجمہ بھی بہت خوب ہے۔
پہلا بند ہے :-

اے ماتا! تجھ کو پرنام

تو چشموں سے مالا مال — باغ تیرے کرنوں کے جال

مست ہوا ٹھنڈک برسائے — ہری بھری کھیتی لہرائے

تیری شکتی بڑی مہان

آزادی تیرا شبھ نام

اے ماتا! تجھ کو پرنام

بعض مقامات پر "ترجمہ" میں "شعریت" باقی نہیں رہ گئی۔ مثلاً :-

اٹھ جگادے نگہ و ذہن سے خواب آنند — یعنی اک سخت مہم کرکے تو میدان لے گا (صفحہ ۲۷)

"خواب آنند" ہی اول تو کھٹکتا ہے — پھر "مہم کرنا" روزمرہ کے خلاف ہے۔

تجھ کو پچھتاوے نے بے کار جکڑ رکھا ہے (صفحہ ۲۸)

کس قدر غیر شاعرانہ اندازِ بیان ..... !!

اس کی تخئیل کے ہتھیاروں کو اب پھینک بھی دے (صفحہ ۲۸)

لفظی ترجمہ کی جگہ شاعر کے خیال کی اپنے لفظوں میں ترجمانی کرنی تھی تاکہ ترجمہ میں شگفتگی پیدا ہو جاتی۔

اسی نظم کا ایک اور مصرعہ ہے :-

دھار ہتھیاروں پہ کرنے کا بھی اب وقت نہیں

"دھار کرنا" نہیں "دھار رکھنا" بولتے ہیں۔

جہاں جہاں بھی اٹھتی نگاہ پڑتی ہے — کہ اُن بزرگوں کے اعلیٰ دماغ پھیلے ہیں (صفحہ ۳۰)

"اعلیٰ دماغ پھیلے ہیں" نے شعر کو کس قدر بے کیف بلکہ مضحکہ خیز بنا دیا۔

جناب ارشد صدیقی کی شاعری کا ابھی آغاز ہے، وہ کچھ دنوں اور مشق کرنے کے بعد انگریزی نظموں کے ترجمہ کی طرف توجہ فرماتے، تو یہ خامیاں باقی نہ رہتیں، مگر ان کی یہ نظمیں پڑھ کر ہم ان کے شاعرانہ مستقبل سے اچھی توقعات رکھتے ہیں۔

"عکس خیال" ظاہری حسن (گیٹ اپ) کے اعتبار سے بھی خوب ہے، سرورق رنگین ہے، اور شاعر کا فوٹو بھی کتاب کی زینت بنا! اسی کتاب کے اشتہار سے معلوم ہوا کہ ارشد صاحب کی غزلوں اور نظموں کے مجموعے بھی چھپنے والے ہیں۔

مگر ہمارا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ :-

نالہ ہے بلبل آشفتہ ترا خام ابھی

اپنے سینہ میں ذرا اور اسے تھام ابھی

چھینٹے　از:- دار کاشمیری، ضخامت ۹۶ صفحات۔　قیمت:- ایک روپیہ آٹھ آنے۔
ملنے کا پتہ:- خواجہ اسٹیشنری مارٹ ۸۵۳ بہادر شاہ مارکیٹ کراچی ۱۰

جناب دار کشمیری ایک قلندر مزاج شاعر ہیں۔ اس کے ساتھ ہی پریشان روزگار بھی! قلندریت اور پریشاں حالی کے امتزاج نے ان کی شاعری کو "دو آتشہ" بنا دیا ہے!

دار صاحب کی یہ نظمیں مارشل لا سے پہلے کی کہی ہوئی ہیں۔ انھوں نے پاکستان کے سیاسی لیڈروں پر شاعرانہ انداز میں خوب خوب پھبتیاں چست کی ہیں اور سماج کی دکھتی ہوئی رگوں پر انگلیاں رکھ دی ہیں۔

پینا پلانا عام ہے اب تک
رقص بادہ و جام ہے اب تک
اپنا چلن بدنام ہے اب تک

پاک زمیں کے رہنے والو!
پاک زمیں ناپاک ہے اب تک

اس قسم کی اصلاحی نظموں میں دار کے اسلامی خیالات اور دینی معتقدات نے بڑی پاکیزگی پیدا کر دی ہے۔

یہ "قطعہ" (قندیل) کتنا جاندار ہے۔

محبت نغمۂ جبریل بھی ہے　　محبت صُور اسرافیل بھی ہے
محبت ہے شبِ تاریک لیکن　　شبِ تاریک میں قندیل بھی ہے

اس مجموعہ میں مزاحیہ نظموں کے ساتھ ساتھ فلمی دھنوں کے انداز پر چند نظمیں بھی ہیں۔ ایک مزاحیہ نظم کے چند شعر ؎

آپ کا انتظار چالو تھا　　آپ کا انتظار چالو ہے
اس نے مضراب چھین لی ہم سے　　پھر بھی اپنا ستار چالو ہے
عاشقوں کی ہو سائیکل پنچر　　حسن والوں کی کار چالو ہے

"خدا کی دعا" ایک نظم ہے، اس کے تین شعر ؎

اے خدائے جل جلالہٗ　　مری کوئی بھی نہ "چالہٗ"
مجھے سردی لگتی ہے نیند میں　　مجھے بخش دے کوئی "شالہٗ"
مرے سر کے بال بھی اڑ گئے　　وہ پڑا ہے سر پہ "وبالہٗ"

عربی زبان کے اعتبار سے ان شعروں میں "چالہٗ" "شالہٗ" اور "وبالہٗ" غلط استعمال ہوئے ہیں ——————— مگر یہی غلطی ہی میں تو ان شعروں کے مزاح کا سارا لطف پنہاں ہے۔ کہ پڑھ کر اور سن کر بے اختیار ہنسی آ جاتی ہے:-

افسوس ہے کہ دار صاحب نے اپنے قطعات اور نظموں کا انتخاب نہیں کیا جو کہا ہے سب کو چھپوا دیا ہے، اس لئے رطب و یابس سبھی کچھ یکجا ہو گیا ہے!

حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ　از افادات:- مولانا محمد منظور نعمانی، ضخامت ۱۶۰ صفحات۔ قیمت:- ڈیڑھ روپیہ۔
ملنے کا پتہ:- کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ!

حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کا ہندوستان کے مسلمانوں پر بہت بڑا احسان ہے کہ شرک و بدعات کے ہجوم میں انھوں نے توحید خالص کا غلغلہ بلند فرما کر، فاسد عقیدوں کی اصلاح کی، اور بڑے بڑوں کو چونکا دیا...... کہ:-

"یہ کیا کر رہے ہو، یہ کیا ہو رہا ہے"!

حضرت شاہ اسماعیل شہید قدس اللہ سرہ کی تحریروں اور ان میں بھی خاص طور سے "تقویۃ الایمان" سے اہل بدعت کو جو چڑ رہی ہے، اور اس کی عبارتوں سے خود تراشیدہ مفہوم پیدا کر کے، شاہ صاحب کی ذات کو جس طرح نشانۂ ملامت بنایا گیا ہے، وہ علم و اخلاق کا ایک المیہ ہے! خدا کا وہ نیک بندہ جو سنتِ رسول اور اطاعتِ رسول کی طرف دعوت دیتا ہو، اور یہی دعوت اس کی تمام جد و جہد کا موضوع ہو، اس پر "اہانتِ رسول" کا الزام لگانا، کس قدر ظلم اور ناانصافی ہے۔

مولانا محمد منظور نعمانی نے بڑی تفصیل کے ساتھ ان "بہتانوں" کا جواب دیا ہے، جو شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی بعض عبارتوں پر لگائے گئے ہیں! مولانا نعمانی نے بڑی وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ ان "متہم عبارتوں" کا پس منظر کیا ہے، سیاق و سباق سے اگر ان کو علیحدہ کر لیا جائے، تو مفہوم کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ لکھنے والا ان عبارتوں سے کس مفہوم کی ترجمانی کر رہا ہے، پھر جس شخص پر "اہانتِ رسول" کا الزام لگایا جا رہا ہے، اس کی دوسری تحریروں میں انبیاء کرام اور خاص طور سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کس قدر توقیر و عظمت اور محبت و عقیدت پائی جاتی ہے! "اردو زبان" میں ان لفظوں کے کیا معنی لئے جاتے ہیں اور اردو لغت کا فیصلہ کیا ہے؟

کوئی شک نہیں کہ بعض مقامات پر شاہ اسمٰعیل شہید کی عبارتیں کھٹکتی ہیں، اور دل پکار اٹھتا ہے کہ کاش! مفہوم کی ترجمانی اس انداز میں نہ کی جاتی، محتاط اور دلنشین پیرایہ اختیار کیا جاتا ——————— مگر مولانا نعمانی صاحب نے ان عبارتوں کی جو وضاحت فرمائی ہے۔ اُسے پڑھ کر یہ کھٹک دُور ہو جاتی ہے! مولانا نعمانی نے یہ کتاب لکھ کر بڑے مشکل فریضے اور انتہائی نازک ذمہ داری کو قبول فرمایا، مگر اللہ کے فضل سے وہ اس ذمہ داری سے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہو گئے۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہزاروں نہیں لاکھوں کی تعداد میں چھپوا کر اسے گھر گھر پہنچایا جائے، تاکہ مسلمان واقف ہوں کہ ایک مبلغ توحید اور داعی سنت نے اصل میں کہا کیا تھا؟ اور معاندین نے اس کو کس رنگ میں پیش کیا، اور اس طرح ایک محبوب و پسندیدہ شخصیت، ان بہتانوں کے سبب مبغوض بن کر رہ گئی!

کتاب کے آغاز میں مولانا نسیم احمد فریدی امروہوی نے شاہ صاحب کے حالات زندگی لکھے ہیں، جن کے مطالعہ سے ذہن خاصا صاف ہو جاتا ہے اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی شخصیت اُبھر کر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔

فاضل مصنف نے مولانا شہید رحمۃ اللہ علیہ پر لگائے ہوئے اس الزام کی بھی تردید کی ہے کہ وہ "مسئلہ حیات انبیاء" کے منکر تھے سوال یہ ہے کہ کیا صحابہ کرام اور تابعین عظام کے دور میں "حیات النبیؐ" نام کا کوئی مسئلہ ملتا ہے۔ حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ (حیات النبیؐ) کو جس انداز میں اٹھایا تھا، اس میں کتنے خطرے پائے جاتے ہیں خصوصاً ایسے دور میں جب کہ اہل غلو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "بشریت" ہی کے منکر ہیں! اس مسئلہ کا چھیڑنا خطرات سے خالی نہیں۔ اس مسئلہ پر حال ہی میں مولانا محمد اسمٰعیل صاحب (گوجرانوالہ) نے جو مضمون لکھا ہے اور اس مضمون پر مولانا عامر عثمانی مدیر "تجلّی" نے جو شذرہ تحریر فرمایا ہے، اس نے اصل مسئلہ کو مُنقح کر دیا ہے!

اس کتاب کا سب سے زیادہ مرکزی حصّہ وہ ہے، جس میں صوفیائے کرام کی خاص اصطلاح "ہمت" کی وضاحت فرمائی گئی ہے لکھتے ہیں:-

"کبھی اس "ہمت" کا تعلق (استفادہ باطنی کے لئے) اپنے شیخ طریقت (یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم)

سے کردیا جاتا ہے، اور اس وقت دل کو تمام اچھے بُرے خیالات سے خالی کرکے، اسی طرف متوجہ کیا جاتا ہے، (حتیٰ کہ اس وقت دل میں اللہ تعالیٰ کا خیال بھی نہیں ہوتا) اور اسی کا نام صوفیہ کی خاص اصطلاح میں "شغلِ رابطہ" بھی ہے۔" (صفحہ ۴۲)

یہ آخر کیسی "ہمت" اور "شغلِ رابطہ" ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ کے خیال سے بھی دل کو خالی کرلیا جاتا ہے، (استغفراللہ) اس شغل و ورد سے، اس فکر و تصور سے، کروڑ بار اللہ کی پناہ! اس قسم کے تمام اشغال و اوراد اور نظریات و مصطلحات بے دریغ دریا بُرد کردینے کے قابل ہیں.....

تصوف کے یہی وہ خطرناک اور لغو "حقائق و معارف"؟ ہیں جنھوں نے بڑے بڑے داعیانِ توحید کے آئینوں کو بھی بے غبار نہیں رہنے دیا! اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ جیسے داعئ کتاب و سنت، مجدد اور مُصلح بھی جب تصوف کی زبان میں گفتگو فرماتے ہیں، تو دماغوں کو اُلجھن میں ڈال دیتے ہیں، حق یہ ہے کہ اللہ اور رسول کے مقابلہ میں کسی کا قول اور فعل وزن نہیں رکھتا، کیونکہ ہر شخصیت اللہ اور رسول سے... کمتر ہی ہے!

"تصوف" ذہن و دماغ پر کیسے نقش قائم کرتا ہے! اس کا اندازہ اسی سے لگالیجئے کہ مولانا محمد منظور نعمانی جیسے قابلِ اعتماد عالم جنکی ساری عمر شرک و بدعت کے رد میں گزری ہے اور جو کتاب و سنت کے تقاضوں کو پہچانتے ہیں، تصوف کا ذکر و بیان اور صوفیاء کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے ان کے قلم سے بھی اس قسم کی انتہائی قابلِ اعتراض بات نکل جاتی ہے، جن کا انہیں احساس تک نہیں ہوتا (جس نے بھی "افیون" کہا اس نے بڑی پکی بات کہی، یہ تو "کوکین" ہے جو اچھے خاصے آدمی کے شعور کو "سُن" (خدر) کر دیتی ہے۔

چاند تارے

مرتبہ:- بزمِ ریاض الادب کورنگی، ضخامت ۱۹۲ صفحات۔ قیمت:- دو روپیہ۔
ملنے کا پتہ:- مکتبہ اشاعت اُردو کورنگی!

کورنگی میں چند اہلِ ذوق اور اردو کے مخلص خدمت گزاروں نے "بزمِ ریاض الادب" قائم کی ہے جسکے سرگرم کارکنوں میں... کامل صدیقی، افضل سدوزئی، شاد کلکتوی، جلیل احمد صدیقی، اور وفا راشدی قابلِ ذکر ہیں۔ بزم کی طرف سے نظم و نثر کا یہ گلدستہ شائع ہوا ہے۔

اس مجموعہ کی "ترتیب" حسبِ ذیل ہے:-

ریگستان کے آغوش میں	پیش لفظ	وفا راشدی
قلیم تجلی	غزلیں اور نظمیں	کامل صدیقی
تحقیق و تنقید	مقالات و مکاتیب	وفا راشدی
میری تیری کہانیاں	افسانے	افضل سدوزئی
دود آتش	منتخب کہانیوں کے ترجمے	جلیل احمد صدیقی
شادیاں	مزاحیہ کلام	شاد کلکتوی

نظم و نثر کا یہ دلچسپ اور ہلکا پھلکا مجموعہ ہے، جس کا سب سے زیادہ جاندار حصہ "منتخب کہانیوں کے ترجمے" ہیں، خاص طور سے

کتاب و سنت کی حدود میں رہ کر جو "تصوف" "تزکیۂ نفس" کرتا ہے، اس کے ہم منکر نہیں ہیں۔　(م۔ق)

اس انجمن کا نام یا تو "بزمِ ادب" ہوتا۔ یا "ریاض الادب"۔ "بزمِ ریاض الادب"۔
کیا ترکیب ہے!

"موپاساں" کی مختصر کہانی تو اس گلدستہ کی جان ہے، اس سے قبل افضل سدوزئی کے افسانے ہیں، جن میں دلچسپی پائی جاتی ہے، مگر "منتخب کہانیوں کے ترجمے" پڑھنے کے بعد یہ افسانے پھیکے معلوم ہونے لگتے ہیں۔

جناب کامل صدیقی کا کلام بھی اس مجموعہ کی زینت ہے، کامل صاحب ایک مشاق خوش گو شاعر ہیں، دیکھئے یہ شعر کتنے شگفتہ ہیں

چشم دیدار طلب واقفِ آداب نہیں — آپ بے پردہ نہ آجائیں لبِ بام ابھی

جستجو آج وہاں پر مجھے لے آئی ہے — خود جہاں حُسنِ محبت کا تماشائی ہے

حرم ہی تک نہیں محدود راہیں — کچھ آگے اور بھی ہیں جلوہ گاہیں

اُن کا یہ شعر:۔

ختم ہوتی ہیں جہاں مستیٔ بادہ کی حدیں — اس سے بھی آگے ترا عالمِ انگڑائی ہے (صفحہ ۴۲)

پڑھ کر حیرت ہوئی کہ "انگڑائی" اور "عالم" کے درمیان وہ اضافت لائے ہیں!

"چمنیوں کے دھواں اور دھواں کی گھٹی گھٹی فضا میں..... (صفحہ ۶) دونوں جگہ "دھوئیں" لکھنا تھا۔

"جہاں پہنچتی ہوئی ریل کی پٹری اور بل کھاتی ہوئی ندی گزرتی ہے۔" (صفحہ ۶) "ریل کی پٹری کا رینگنا" سمجھ میں نہیں آیا——— صفحہ ۱۳ پر "لرزنے" سے جو "لرزاہٹ" بنایا گیا ہے، وہ بھی خاصہ کھٹکتا ہے——— "کلیرے کی پریشانی عروج پر تھی۔" (صفحہ ۲۳) پریشانی اور مصیبت کے ساتھ "عروج" کچھ بھلا نہیں لگتا——— صفحہ ۱۰۲ پر "بےنیل مرام" کو "بےنیل و مرام" (واؤ کے ساتھ) لکھا ہے——— "اجی حضرت! مابدولت کو فرمودہ حمید سے پورا پورا اتفاق ہے" (صفحہ ۱۰۳) اس جملہ میں کس قدر تکلف اور نومشقی پائی جاتی ہے——— "امتحانی پرچہ جات وہ منگواتا رہتا تھا" (صفحہ ۱۰۹) "پرچہ جات" افسانہ کی نہیں دفتر کی زبان ہے۔

"وحشت کی فارسی شاعری" جناب دفا راشدی کا مقالہ ہے، جس سے پہلی بار اس کا انکشاف بلکہ یوں کہئے معلومات میں اضافہ ہوا کہ وحشت مرحوم فارسی زبان کے بھی قادر الکلام شاعر تھے!

علی گڑھ میگزین کا نظریاتی ادب نمبر

نگراں:۔ رشید احمد صدیقی۔ منیجر۔ ظہیر الدین علوی۔ مرتبہ:۔ انور صدیقی۔
مجلس ادارت:۔ ابن فرید، احمد جمال پاشا، جعفر مہدی تاباں، لئیق احمد صدیقی۔ جلیس احمد، صالحہ علوی۔ ضخامت ۲۴۲ صفحات، ملنے کا پتہ:۔ علی گڑھ میگزین مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (یوپی، بھارت)

یونیورسٹیوں اور کالجوں کے میگزینوں میں "علی گڑھ میگزین" قدامت، مقبولیت، شہرت اور ادبی حیثیت کے اعتبار سے سب سے زیادہ بلند ہے، اس مجلہ کی ادارت مسلم یونیورسٹی کے بعض ایسے طلبا نے کی ہے، جو اپنی نام آوری اور شہرت کے اعتبار سے مسلم یونیورسٹی کے لئے باعث فخر و ناز ہیں! "علی گڑھ میگزین" کے بعض "خاص شمارے" اردو ادب میں تاریخی مقام حاصل کر چکے ہیں!

ہمارے سامنے "علی گڑھ میگزین" کا "نظریاتی ادب نمبر" ہے، جو اپنے مضامین کے تنوع، جامعیت اور دلچسپی کے اعتبار سے مطالعہ کے قابل ہے۔ "اس ادبی بے راہ روی کے دور میں" نظریاتی ادب نمبر" مشعلِ راہ کا کام دے گا! اس شمارے کے ساتھ مرتبین کا ایک مقصد وابستہ ہے۔ بلند و پاکیزہ مقصد! اس کے مضامین میں مادی اور اخلاقی، "رہبر" نظریہ کی ترجمانی کی گئی ہے، تاکہ پڑھنے والے موازنہ کرسکیں کہ ان میں سے کونسا نظریہ صحت مند، پاکیزہ اور معاشرہ کے لئے مفید ہے! حیرت ہے کہ پروفیسر رشید احمد صدیقی کا کوئی مقالہ

اس میں شامل نہیں ہے:
نظمیں اور غزلیں بھی خاصی ہیں مگر ان کا انتخاب کر لیا جاتا تو یہ حصہ بہت نکھرا ہوا ہوتا۔ اور اس گلدستہ میں لالہ و گل کے ساتھ خس و خاشاک نہ پائے جاتے۔

احکام سلطانیہ یعنی اسلامی نظام حکومت

از:۔ علامہ ابوالحسن ماوردی، مترجم و مرتبہ:۔ مفتی انتظام اللہ شہابی۔ ضخامت ۵۲۶ صفحات (مجلد رنگین گرد پوش کے ساتھ) قیمت چھ روپے۔
ملنے کا پتہ:۔ محمد سعید اینڈ سنز تاجران کتب قرآن محل مقابل مولوی مسافر خانہ، کراچی۔

جناب مفتی انتظام اللہ شہابی دس بیس نہیں، سینکڑوں کتابوں کے مصنف، مولف، مترجم اور مرتب ہیں، اُن کی ساری زندگی تصنیف و تالیف ہی کے کام میں گزری ہے، موصوف کی درجنوں کتابوں کے مسودے تو ابھی تک چھپے بھی نہیں ہیں اور اشاعت کے منتظر ہیں۔

علامہ ابوالحسن ماوردی کی مشہور تصنیف:۔
"الاحکام السلطانیہ فی سیاسۃ المدنیہ"

کا اردو زبان میں سب سے پہلے ترجمہ سید محمد ابراہیم مرحوم (ایم اے) نے کیا تھا: سید محمد ابراہیم مرحوم، حکومت پاکستان کے سکریٹری جناب محمد اسحاق (سی، ایس، پی) کے بڑے بھائی تھے، اور دارالترجمہ عثمانیہ (دکن) کے رکن تھے۔ مفتی انتظام اللہ شہابی نے "حرفِ آغاز" میں لکھا ہے:۔

> "چونکہ یہ کتاب ضخیم ہے، اس لئے اس کے خلاصہ کی ضرورت تھی۔ چنانچہ ہم نے اسلامی نظام حکومت کے نام سے اس کا خلاصہ اور بہت ضروری معلومات کا اضافہ کر کے پیش کیا ہے، اکثر ابواب و فصول متداول تھے، اور دینی تعلیم میں عام نہیں، ان کو حذف کر دیا ہے"۔

ترجمہ[1] سادہ اور عام فہم ہے۔ اس لئے فاضل مترجم کی کوشش قدر و ستائش کی مستحق ہے۔
یہ کتاب اکیس (۲۱) ابواب پر مشتمل ہے۔ جس کی دو سو چودہ ذیلی فصول ہیں۔
چند اہم فصول کے عنوانات:۔
حکومت الٰہیہ ——— مجلس شوریٰ ——— خلافت و امامت کی حقیقت ——— شرائط امارت، ——— سپہ سالاروں کا تقرر ——— مقصد جہاد ——— قتل مرتد ——— منصب قضاء ——— امامت صلوٰۃ ——— حاکم صدقات کے فرائض ——— فی اور غنیمت کا حکم ——— جزیہ و خراج ——— تعلیم ——— دفاتر اور اس کے احکام ——— بیت المال کی مخصوص درآمد و برآمد ——— قوانین جرائم ——— احتساب ——— آدابِ حکمرانی
علامہ ماوردی رحمۃ اللہ علیہ اُن چند اکابر علماء اور ارباب فکر میں ممتاز مقام رکھتے ہیں، جن کو اسلامی حکومت اور اسلامی قانون میں قابل اعتماد بصیرت حاصل تھی۔ پوری کتاب مصنف کی ژرف نگاہی، دانش و فراست اور وسعتِ نگاہ کی بولتی ہوئی

[1] کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں بھی ملتی ہیں۔ صفحہ ۸۰ پر "حصور" کو "مضور" لکھا گیا ہے، صرف ایک نقطہ کے اضافہ نے عبارت کو کچھ سے کچھ بنا دیا اور جو لوگ عربی نہیں جانتے، وہ سخت خلجان میں مبتلا ہو جائیں گے۔

شہادت ہے، پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کتاب و سنت، خلفائے راشدین کے آثار اور ائمہ مجتہدین کے اقوال و اجتہادات کو مصنف نے سامنے رکھا ہے بلکہ اُن سے رہنمائی اور روشنی حاصل کی ہے۔

یہ کتاب اس دور میں لکھی گئی ہے، جب کہ مسلم سلاطین "خلفاء" کے لقب سے حکمرانی کرتے تھے، اور اسلامی حکومت خاندانی بادشاہوں کی وراثت بن کر رہ گئی تھی۔ اس لئے اس کتاب کے بعض ابواب "خاصے محلِ غور" ہیں:

فاضل مصنف نے شخصی طرزِ حکومت کے ماحول اور اثرات کو قبول کیا ہے، مثلاً وہ لکھتے ہیں:-

> "مگر امام شافعی اور جمہور فقہا کا مذہب یہ ہے کہ ولی عہدوں میں سے اب جو خلیفہ ہوا ہے اُسے یہ حق ہے کہ وہ جسے چاہے اپنا ولی عہد بنالے، اور اس کے ساتھ کے ولی عہدوں میں سے، وہ جسے چاہے حق خلافت سے علیحدہ کردے"

اس کتاب میں بعض ایسے مسائل بھی ملتے ہیں، جن کا دورِ حاضر کے معاشرے اور سیاست و تمدن میں کہیں وجود نہیں ملتا اور بعض اجتہادی مسائل نظرِ ثانی کے محتاج ہیں! کوئی شک نہیں اسلامی دستور و قانون کی تدوین و ترتیب میں یہ کتاب ہر اعتبار سے مفید کارآمد اور مددگار ثابت ہوگی۔

علماء سلف نے (اللہ تعالیٰ کی اُن پر رحمت ہو) اپنے زمانے میں اجتہاد کیا ہے، اس ہمارے دور کے علماء بھی اجتہاد کا حق رکھتے ہیں بلکہ "اجتہاد" کی آج بہت بڑی ضرورت لاحق ہے مگر "اجتہاد" کتاب و سنت کے عین مطابق ہوگا۔ اللہ اور اس کے رسول کے کسی حکم سے بال برابر تجاوز نہیں ہو سکتا۔

اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہے کہ کتاب و سنّت اور آثارِ صحابہ کے علاوہ ہمارے اکابر علماء، محققین اور اربابِ فکر کے فقہی اور دینی کارنامے موجود ہیں، جو اسلامی مملکت کی تشکیل میں کارآمد بلکہ رہنما ثابت ہو سکتے ہیں، نظم مملکت اور قانون و احتساب پر یہ کتابیں اس وقت لکھی گئی تھیں جب کہ یورپ تہذیب و شائستگی کی ابجد سے بھی واقف نہ تھا! کاش! ہم اپنے اس شرف کا صحیح احساس کر سکیں اور سیاست و حکومت میں اپنے ہی چاند تاروں سے روشنی حاصل کریں، ہم آج تاریکی میں ہیں مگر ہمارا ماضی انتہائی تابناک رہا ہے بس! اسی "تابناکی" کو دلیلِ راہ بنانے کی ضرورت ہے!

تذکرہ حضرت مولانا فضلِ رحمٰن گنج مرادآبادی

مرتبہ:- مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، ضخامت ۱۵۲ صفحات، (مجلد رنگین گردپوش کے ساتھ) قیمت ڈھائی روپے۔

ملنے کا پتہ:- مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء، بادشاہ باغ، لکھنؤ۔

اب سے تقریباً ستر سال پہلے ہندوستان میں چند بزرگ بہت مقبول، محبوب اور مشہور تھے۔ گنج مرادآباد کے مولانا فضل الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ، دیوہ کے حاجی وارث علیشاہ رحمۃ اللہ علیہ، پیلی بھیت کے مولانا محمد شیر میاں رحمۃ اللہ علیہ اور گنگوہ کے مولانا رشید احمد قدس سرّہٗ العزیز آج لاکھوں اہلِ علم اور اربابِ وجد و حال انہی بزرگوں سے واسطہ یا بالواسطہ نسبتِ تلمذ و ارادت رکھتے ہیں، ان میں حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ (۱۲۰۸ھ ـــــ ۱۳۱۳ھ) سب سے زیادہ مقبول و محبوب تھے!

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے چودھویں صدی کے انہی مشہور و مقبول بزرگ (مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی) کا تذکرہ مرتب فرما کر اہلِ دل کے لئے مائدہ نعمت اور خوانِ لذت و انبساط مہیا کیا ہے، اس تذکرہ کا زیادہ تر حصہ فاضل مُرتب کے والد ماجد مولانا حکیم

سید عبدالحیٔ مرحوم کی شہرہ آفاق تصنیف "نزہتہ الخواطر" سے ماخوذ ہے۔ دوسرے لکھنے والوں میں مولانا سید محمد علی مونگیری، نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، صفی الدولہ نواب حسن علی خاں مرحوم، مولوی حیادر علی کرسوی۔ اور مولانا عبدالطیف رحمانی شامل ہیں۔ ان بزرگوں کے تاثرات پڑھنے کے قابل ہیں:

مولانا حکیم سید عبدالحیٔ رحمتہ اللہ علیہ صاحب تذکرہ کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"میں نے اپنے زمانے میں جن علماء و مشائخ کی زیارت کا شرف حاصل کیا ان میں کسی کو سُننِ نبوی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چال ڈھال اور طور و طریق کا آپ سے زیادہ جاننے والا نہیں دیکھا"

اور

"اگر میں حجر اسود اور مقام ابراہیم کے درمیان کھڑا ہو کر میں قسم کھاؤں کہ میں نے دنیا میں ان سے بڑھ کر کریم، اور درہم و دینار سے بے تعلق، کتاب و سنت کا پیرو نہیں دیکھا، تو میں حانث نہیں ہوں گا اسی کے ساتھ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا ان سے بڑا عالم نہیں پایا۔"

مولانا فضل الرحمٰن رحمتہ اللہ علیہ کے یہ ارشادات کس قدر مطابق شریعت ہیں:۔

"ارشاد ہوا افعالِ ظاہری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (کی سنت کے مطابق) بہ سہولت اور بے تکلف ہونے لگنا یہی فنائی الرسول ہے اور کچھ نہیں۔"

"کوئی (ولی) آسمان پر اڑتے نہیں تھے، ولایت اسی کو کہتے ہیں کہ احکام شریعت بے تکلف ہونے لگیں۔ اور افعال شریعت ایسے ہو جائیں کہ گویا امور طبعی ہیں۔"

"...... جناب احمد میاں نے فرمایا کہ قل و عرس تمام بزرگان کا ہوتا ہے، یہاں بھی ہونا چاہیئے، آپ نے بہت خفا ہو کر فرمایا ہر گز نہ ہو، ہماری قبر پر کوئی میلہ نہ کرے۔"

مولوی عبدالحیٔ کرسوی مرحوم کا جو مقالہ (رگنج مراد) اس تذکرہ کی زینت ہے، اس کے صفحہ ۱۴۳ پر یہ عبارت بھی نظر سے گزری۔ ۔

"حضرت صاحب نے اپنے دست مبارک سے شجرہ بھی ارزانی فرمایا"

اس تذکرہ کے فاضل مرتب مولانا علی میاں اس پر ایک فٹ نوٹ تحریر فرما دیتے تو بعض دلوں کی کھٹک دور ہو جاتی کہ مشائخ تصوف جو مریدوں کو شجرے دیا کرتے ہیں جن میں "بحرمت" "بجاہ" اور "بحق" بھی لکھا ہوتا ہے اس کا کب سے رواج ہوا، اس کی دین واحسان میں کیا حیثیت ہے؟ اور کتاب و سنت اور آثار صحابہ میں کیا اس کے لئے کوئی دلیل یا اشارہ ملتا ہے؟

کتاب اپنی جگہ بہت خوب ہے۔ اس کے پڑھنے سے اللہ رسول اور دین و شریعت سے شغف پیدا ہوتا ہے۔ ظاہری حسن و خوبی کے اعتبار سے یہ کتاب کتابت و طباعت کا نقشِ بدیع ہے۔

بینات
ترجمہ مشکلات

مترجم:۔ مولانا محمد نصرت اللہ بالیر کوٹلوی۔ ضخامت ۲۰۰ صفحات (مجلد گرد پوش کے ساتھ) قیمت:۔ چار روپے۔
ملنے کا پتہ:۔ ادارہ اشاعت السنۃ۔ شیش محل روڈ، لاہور۔

مسلمانوں میں بعض ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جن کے اندر اخلاص ہوتا ہے مگر دین و شریعت کے معاملہ میں وہ جلد باز اور بے صبرے واقع ہوتے ہیں، جہاں کسی مسئلہ کی باریکی اور کنہ ان کی سمجھ میں نہیں آئی جھٹ سے اعتراض جڑ دیا۔ خاص طور سے احادیث نبوی کے بارے میں اس ذہنیت اور مزاج کا پایا جانا، اپنے اندر خطرے ہی خطرے رکھتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات

ایمان کے ضائع ہو جانے کا خطرہ ہے ———— کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت دین بلکہ عین دین ہے اور آپ کے ارشاد صحیح پر حرف گیری ایمان کی بربادی ہے۔

کتاب وسنت کی فہم کے لئے "فنِ مطابقت" سے واقف ہونا ضروری ہے، کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو "اہل ذکر" سے دریافت کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، تحقیق وجستجو کے بعد انشاء اللہ دل کی کھٹک دور ہو سکتی ہے، بشرطیکہ طبیعت انکشافِ حق کے لئے پوری طرح آمادہ ہو۔

نجد کے بہت بڑے عالم علامہ عبداللہ القصیمی نے ایک کتاب :-

"مشکلات الاحادیث النبویہ وبیانہا"

کے نام سے لکھی تھی۔ جن میں اُن متعدد احادیث کی تشریح وتوضیح کی ہے، جن پر ہمارے تجدد پسند بھائی شک کا اظہار کیا کرتے ہیں، اور منکرین حدیث نے تو انہی احادیث کو اعتراضات کا نشانہ بنا کر ایک طوفانِ بدتمیزی اٹھا رکھا ہے۔

علامہ قصیمی نے ان اعتراضات کو بڑی خوبی کے ساتھ رفع کیا ہے اور بڑی بڑی نازک گرہیں کھول کر رکھدی ہیں! دو چار جگہ دلائل میں ضرور کمزوری نظر آتی ہے، مگر مجموعی طور پر دلائل وزنی اور اقرب الی الصواب ہیں۔

ترجمہ عام فہم اور آسان ہے، مولانا محمد نصرت اللہ صاحب نے اس کتاب کا ترجمہ فرما کر اور ادارۂ اشاعۃ السنۃ نے اسے چھاپ کر دین کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔

عورت انسانیت کے آئینے میں

اے۔ ایم، عبدالرحمٰن خاں صاحب، ضخامت ۲۴۰ صفحات (مجلد، گرد پوش کے ساتھ) قیمت چار روپے، ملنے کا پتہ :- ایم ثناءاللہ خاں اینڈ سنز، ۲۶ ریلوے روڈ لاہور

جناب منشی عبدالرحمٰن خاں صاحب نے اس کتاب میں صنفِ نازک کے مجد وشرف کو اُجاگر کیا ہے کہ وہ اپنے اندر کس قدر فطری صلاحیتیں رکھتی ہے، اور انسانی معاشرے میں اس کو کتنی بلند اہمیت حاصل ہے، اس کتاب کے چار اہم ابواب ہیں۔

عورت کا مقام ———— عورت کا ماضی ———— عورت کی بلند فطرتی اور عورت کے حقوق ————

فاضل مصنف نے بتایا ہے کہ عورت ناقص العقل اور ضعیف الفطرت نہیں ہے، بلکہ تاریخی شواہد سے ثابت کیا ہے کہ وہ مرد سے زیادہ بلند فطرت ہے! مگر مرد نے اس کے ساتھ ہمیشہ ظلم کیا ہے، اس کے حقوق چھینے ہیں اور اُسے ابھرنے نہیں دیا۔ اس کے بعد کتاب میں ان حقوق وحدود سے بحث کی گئی ہے، جو اسلام نے عورت کے لئے متعین کئے ہیں، کتاب کوئی شک نہیں خاصی محنت اور تحقیق سے لکھی گئی ہے۔

"بحارت بالا یہ خیال قطعاً غلط ہے (صفحہ ۵۹) یہ دفتر اور کچہری کی زبان ہے۔ "اس کے لئے دونوں کو بیدار فطرت سے" (صفحہ ۶۲) بد فطرت "لکھنا تھا۔" "نہ ہی" جہاں بھی کتاب میں آیا ہے، وجدان کو کھٹکتا ہے!

"وہ (یعنی عورت) صرف حُسن وجمال، شرم وحیا، ناز وانداز، اثر وتاثیر، جذب وکشش، لطافت ونزاکت میں ہی فضیلت نہیں رکھتی، بلکہ اس (یعنی مرد) سے زیادہ ذہین، ہشیار، زیادہ قوی الحافظہ، زیادہ منتظم، زیادہ سلیقہ شعار واقع ہوئی ہے (صفحہ ۔۔)"

مگر "طب" کا یہ فتویٰ ہے کہ مرد کے دماغ کا حجم اور وزن عورت کے دماغ سے زیادہ وزنی ہوتا ہے، اور تاریخ کا یہ فیصلہ ہے کہ ذہانت تدبر، قوت حافظہ اور انتظامِ مملکت میں مرد ہی بالادست اور پیش پیش رہا ہے! جہاں تک قوتِ حافظہ کا تعلق ہے، سامنے کی بات

لہ صفحہ، پر "قیاس آرئیاں لڑانا" نظر سے گزرا، قیاس لڑانا" تو درست ہے مگر "قیاس آرائی لڑانا" غلط ہے (م۔ق)

سلہ حیرت ہے کہ منشی عبدالرحمٰن خاں اس کتاب میں "ایم عبدالرحمٰن" بن گئے۔

(م۔ق)

ہے کہ ہزار مردوں کے مقابلہ میں ایک مسلمان عورت مشکل ہی سے حافظ قرآن نکلے گی! اب رہے دوسرے علوم و فنون تو کیا یونان نے افلاطون اور ارسطو جیسی کوئی فلسفہ داں عورت پیدا کی؟ ایران میں فردوسی سعدی اور حافظ کے پایہ کی کوئی شاعرہ خاتون گزری؟ طب میں بوعلی سینا اور زکریا رازی نہ سہی ان سے فروتر درجہ کی کوئی طبیبہ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی؟ کیا جا سکتا ہے کہ مردوں نے صنفِ نازک کی صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقعہ ہی نہیں دیا۔ مگر اللہ تعالیٰ تو نا منصف نہیں ہے، وہ تو عورت کی صلاحیت و استعداد سے پوری طرح واقف تھا، اس نے نبوت و رسالت کے لئے کسی "عورت" کو کیوں منتخب نہیں فرمایا؟

مفسرین میں، محدثین میں، فقہا میں، صوفیا میں لغت و معانی، صرف و نحو، علم کلام اور الہیات کے علوم میں مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کی تعداد کس درجہ کم اور نا قابلِ لحاظ ہے! اس نوبت پر کہا جا سکتا ہے کہ مشرق نے عورت کو سدا مظلوم، مقہور اور غلام بنا کر رکھا، اس لئے عورت کی صلاحیتیں دبی رہیں ——— مگر یورپ نے تو عورت کو پوری آزادی دے رکھی ہے، وہاں تو مرد اور عورتیں ہر شعبۂ حیات میں کسی تفریق کے بغیر دوش بدوش گامزن ہیں ——— تو آپ کے اس روشن خیال مغرب نے شیکسپیر اور ٹینی سن جیسی کسی شاعرہ کو جنم دیا؟ سائنسدانوں میں کسی معروف سائنسداں خاتون کا نام آپ نے سنا؟ مغرب کی کتنی یونیورسٹیوں کی چانسلر اور شعبوں کی صدر عورتیں ہیں؟ اور وزارت کی کتنی کرسیوں پر خواتین رونق افروز ہیں؟ کتنی سفارتیں عورتوں کو تفویض کی گئی ہیں؟ اور حکومتوں کے مابین جو وفود سیاسی اور تجارتی مسائل پر گفت و شنید کے لئے آتے رہتے ہیں، ان میں عورتوں کا کیا تناسب ہوتا ہے؟ کھانا پکانا جو عورت کا فن ہے اس کو ذہن میں رکھ کر یورپ کے ہوٹلوں کا جائزہ لیجئے کہ وہاں ہیڈ باورچی مرد ہیں یا عورتیں ہیں؟ یورپ میں فنِ خیاطی کس کے ہاتھ میں ہے؟ عورتوں کے یا مردوں کے؟

روس جو عورت کی ترقی و آزادی کا یورپ سے زیادہ دعویدار ہے، اور جہاں کی پوری ایک نسل نے اشتراکی نظام کے تحت نشو و نما پائی ہے، وہاں حکومت تجارت، سائنس، صنعت و حرفت، تعلیم، شعر و ادب، ان تمام شعبوں کی زمامِ کار عورت کے دستِ نازک میں ہے یا مرد کا دستِ قوی اُسے سنبھالے ہوئے ہے!

لائق مصنف نے صفحہ ۱۰۹ پر جو یہ لکھا ہے:-

"فتوحاتِ تیموریہ میں ہمیشہ عورتیں پیش پیش رہیں۔"

یہ بھی افسانہ سازی ہے اور یہ ہماری عورتوں کو بیٹھے بٹھائے غلط فہمی میں مبتلا کرتا ہے۔

فاضل مصنف اللہ کے فضل سے پردے کے بھی قائل ہیں اور اسلام نے مرد و زن کے جو حدود مقرر کئے ہیں، اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں مگر افسوس ہے کہ اس کتاب میں جو اُن کا "Approach" ہے، وہ اُن کے دینی معتقدات کے شایانِ شان نہیں ہے۔

عورت کی صلاحیت اپنی جگہ مسلّم، اس کا شرف و مجد تسلیم، اس کا وجود انسانیت کے لئے مرد کے وجود ہی کی طرح ضروری و اہم ہے عورت بے شک نبی نہیں ہوئی مگر اس نے انبیائے کرام کو جنم دیا ہے، جو کوئی عورت کو نگاہِ ذلت سے دیکھتا ہے وہ خود ذلیل اور سفلہ ہے: مگر اس کتاب کے مصنف نے عورت کی حمایت و مدافعت اور مرد و زن کی مساوات کا جو انداز اختیار کیا ہے، وہ ایک ایسا ہتھیار ہے، جس سے انھوں نے مغرب زدوں کو مسلح کر دیا ہے، منشی عبدالرحمٰن صاحب کے تراشے ہوئے دلائل کی آڑ لے کر وہ کہہ سکتے ہیں جب عورت کسی قسم کی ذہنی و فکری صلاحیت میں مرد سے کم نہیں ہے بلکہ مرد سے بلند تر ہے تو مسلمان نمازوں میں عورت کو امام کیوں نہیں بناتے! اور خلفاء راشدین کے انتخاب میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو انھوں نے کیوں منتخب نہیں کیا؟ مرد و عورت کا تناسب انتخاب خلافت میں کم سے کم چار اور ایک کا تو رہنا تھا اور قرآن نے گواہی میں مرد و عورت کے درمیان کیوں امتیاز روا رکھا ہے؟

اس کتاب میں اس قسم کے تمام اعتراضات و شبہات کے لئے مصنف نے گنجائشیں پیدا کردی ہیں کاش ! وہ اُن کتابوں کا مطالعہ فرما لیتے جو اسلام پسند مفکرین نے اس موضوع پر لکھی ہیں، جن میں صنف نازک کے شرف و مجد کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کیا گیا ہے۔ مگر اعتدال کا سر رشتہ ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور مرد و زن کے حقوق اور حدود عمل کے معاملہ میں اسلامی مزاج کو ملحوظ رکھا ہے۔

انیسِ نسواں

از :۔ بیگم سید اصغر حسین، ضخامت ۹۶ صفحات، قیمت دس آنے۔
ملنے کا پتہ :۔ کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ۔

"انیس نسواں" بیگم سید اصغر حسین کے اصلاحی مضامین کا مجموعہ ہے، جس کے عنوانات سے ان مضامین کی افادیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

انسانی زندگی پر توحید کا اثر ــــــ دین اسلام کی حقیقت ــــــ تلاوت قرآن مجید کی اہمیت ــــــ خدا کے حضور دعا مانگنا ــــــ حسن اخلاق ــــــ صبر و شکر ــــــ غصہ اور غصہ کو پی جانا ــــــ غیبت اور جھوٹ ــــــ والدین سے حُسن سلوک اور ان کی خدمت ــــــ بیوی اور شوہر کا حُسن تعلق ــــــ ساس بہو میں حسن سلوک ــــــ مغربی معاشرت کی تقلید

مضامین مفید اور عام فہم ہیں اور ایک ایک سطر سے لکھنے والی کا دین سے شغف اور اسلام سے محبت جھلکتی ہے، اپنا اپنا ذوق ہے ایک ناول نگار عورت نے "ٹیڑھی لکیر" کی طرف اہل ذوق کو دعوت دی اور دوسری خاتون نے "صراط مستقیم" کی نشاندہی کی !

صفحہ ۱۰ پر ایک شعر ہے ؎

جانِ عاشق[1] تن سے جب آزاد ہو
منہ میں کلمہ، دل میں تیری یاد ہو

اصل شعر میں "لب پہ کلمہ" ہوگا۔ یہ کتاب مسلم خواتین کے لئے لکھی گئی ہے۔ اس لئے لفظ "عاشق" بھی کھٹکا۔ "جانِ مسلم" یا اسی وضع قطع کا کوئی لفظ ہوتا تو شعر پاکیزہ تر ہو جاتا۔

صفحہ ۱۲ پر، اس شعر ؎

بے سکوں دل نے کروٹ لی تڑپنے لگا
دل سے بے ساختہ لب پر دعا آنے لگی

کا مصرعہ اولیٰ بحر سے خارج ہے !

---

[1] یہ دعائیہ شعر اس طرح بھی ہو سکتا تھا

جان میری تن سے جب آزاد ہو   لب پہ کلمہ، دل میں تیری یاد ہو

غلط نامہ کا غلط نامہ

ہمیں افسوس ہے کہ "فاران" کی اشاعت بابت ماہ نومبر ۱۹۶۲ء میں جناب جلیل قدوائی صاحب کے مضمون "غلط نامۂ فراق گورکھپوری" میں کتابت کی بہت سی غلطیاں رہ گئیں۔ مزید افسوس اس امر کا ہے کہ عبارت کے علاوہ چندان اشعار کی کتابت بھی غلط ہو گئی جنہیں فراق نے اپنے مضامین میں غلط پیش کیا تھا اور جنکی قدوائی صاحب نے تصحیح کی تھی۔ اس طرح قدوائی صاحب کے مضمون کا مقصد ہی فوت ہو گیا۔ ہم ناظرین سے درخواست کرتے ہیں کہ حسب ہدایات ذیل مضمون کی صحت فرمالیں

(ایڈیٹر)

۱۔ صفحہ ۱۹، سطر ۷۔ "اس تصنیف میں" کے بجائے "اس کی تصنیف میں" ہونا چاہیے۔

۲۔ " " ۱۰:۔ "تم کے بنا پر" " "اس کی بنا پر" "

۳۔ " ۱۲:۔ "انہیں اعتماد ہو" " "انہیں اتنا اعتماد ہو" "

۴۔ " ۱۵:۔ "مگر توڑ کر" " "پھر توڑ کر" "

۵۔ " فٹ نوٹ ۲:۔ "سلہ" یہ نمبر لکھنے سے رہ گیا ہے۔ شروع سطر میں لکھ لیا جائے۔

۶۔ " " :۔ اس کے ذیل میں پہلے شعر کے مصرعہ اولیٰ میں "حیات ہیٹی تھی" کی بجائے "حیات بٹتی تھی" ہونا چاہیے۔

۷۔ صفحہ ۲۰ سطر ۱:۔ "اس لئے" کے بجائے "اگرچہ ــــــ" ہونا چاہیے۔

۸۔ " فٹ نوٹ ۱:۔ پہلی سطر میں "اشعار نقل کرتے" اور "انھوں نے" کے درمیان لفظ "جو" ہونا چاہیے۔

۹۔ صفحہ ۲۱ " ۱:۔ سطر ۱ میں "تحقیق سلسلہ" کے بجائے "تحقیق کے سلسلہ" اور "پتہ ملا" کے بجائے "پتہ چلا" ہونا چاہیے سطر ۹ میں "لکھنے والے" کے بجائے "کس لکھنے والے" ہونا چاہیے۔

۱۰۔ صفحہ ۲۲، سطر ۴:۔ مصرعہ یوں ہونا چاہیے۔ "جب یہ سنتے ہیں کہ ہمسایہ میں آپ آئے ہوئے"

۱۱۔ " ۲۳ " ۹:۔ پہلا مصرعہ " "اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی"

۱۲۔ " " ۱۴:۔ مصرعہ ثانی میں "کم سے ہے" کے بجائے "کم ہے" ہونا چاہیے۔

۱۳۔ " " ۱۹:۔ "فریاد" کے اوپر "سلہ" نمبر ڈالنا چاہیے۔ اس سطر کے نیچے ہی خط کھینچنا چاہیے جس کے بعد فٹ نوٹ شروع ہوں۔ کاتب نے پہلے بغیر خط کھینچے ہوئے ایک فٹ نوٹ لکھ دیا پھر اس کے نیچے خط کھینچ کر دوسرا فٹ نوٹ لکھا۔

۱۴۔ صفحہ ۲۴ - سطر ۱۱:۔ مصرعہ ثانی پر "سلہ" یہ نمبر ڈالنا چاہیے۔

۱۵۔ " " ۱۲:۔ "وہی" اور "پھر" نکال دینے چاہئیں۔

۱۶۔ " " ۱۴:۔ "بے چارے" کے بجائے "بے چارہ" ہونا چاہیے۔

۱۷۔ " " بقیہ فٹ نوٹ:۔ سطر ۲ میں "میر و سودا کی نسبت کمتر" کے بجائے "میر و سودا کے نسبتاً کمتر" ہونا چاہیے۔ سطر ۴ میں

"الہ آبادی" کے بجائے "الہ آباد" ہونا چاہیے۔ سطر ۷ میں "دو غزلیں ہیں پیش کی ہیں" کے بجائے "دو غزلیں پیش کی ہیں" ہونا چاہیے۔

۱۸:۔ صفحہ ۲۵ سطر ۱۷:۔ "ایک بار" کے بجائے "اک بار" ہونا چاہیے۔

۱۹:۔ " ۲۶ " ۴:۔ "فرماتے ہیں" حذف کر دینا چاہیے۔

۲۰:۔ " " " ۱۳:۔ "مشہور یوں لکھدیا" کے بجائے "مشہور شعر یوں لکھدیا" ہونا چاہیے۔

۲۱:۔ " ۲۷ " ۵:۔ "سب سے پہلے" کے بجائے "اس سے پہلے" ہونا چاہیے۔

۲۲:۔ " " " ۱۸:۔ "میر کا مقطع یاد دلیا" داد دین میاں ہونا چاہیے۔

۲۳:۔ " " " فٹ نوٹ ۲:۔ "سے" مع واوین کے بجائے "اسے" مع واوین ہونا چاہیے۔

۲۴:۔ " ۲۸ " :۔ سطر ۳ میں "گورکھپور ..... کے تعلق" کے بجائے "گورکھپور سے تعلق" ہونا چاہیے۔ اسی کے آگے "ایک تین شعر کے غزل" کے بجائے "ایک تیرہ شعر کی غزل ہونا چاہیے"۔ چوتھی سطر میں "اس کے تعلق" کے بجائے "اس تعلق" اور ساتویں سطر میں "قدم قدم پہ قسم" کے بجائے "قدم قدم پہ قسم" ہونے چاہئیں۔ نویں سطر میں "پروفیسر امرناتھ جہا" ہونا چاہیے نہ کہ "پروفیسر امرا"۔ دسویں سطر میں "اس قدر تعلق خاطر بھی ہو گیا" کے بعد یہ عبارت ہونا چاہیے جو ساری کی ساری نہایت خراب چھپی ہے اور جگہ جگہ سے پلیٹ سے صاف بھی ہو گئی ہے "کہ اب تک تین بار ...... ریاض غریب خانہ پر تشریف لا چکے ہیں" اور "مجھے دیکھ کر کہا آپ کو دیکھ کر آپ کے والد مرحوم حضرت عبرت کی یاد آتی ہے"۔ اور سب سے آخر میں مگر سب سے بڑھ کر یہ کہ فراق ان لوگوں میں سے ہیں جن کے دلوں پر آج کے دریافت کلام کا گھاؤ لگا ہے"۔

۲۵:۔ صفحہ ۳۰۔ سطر ۲:۔ "چین سے آخر قبر میں سوتے ہوئے" کے بجائے "آخر چین سے قبر میں سوتے ہوئے" ہونا چاہیے۔

۲۶:۔ " " ۶:۔ "بے اس شاعری" کے بجائے "بے اس شاعر" ہونا چاہیے۔

۲۷:۔ " " ۱۹:۔ "کتابت کی غلطی ہوا کا قوی شبہ ہوا" کے بجائے "کتابت کی غلطی کا قوی شبہ ہوا" ہونا چاہیے۔

تصانیف ملّا واحدی

حیاتِ سرورِ کائنات

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں :۔ "واحدی صاحب کا قلم متین لیکن ساتھ ہی رواں و دل نشین اور جاندار طرز نگارش سے واقف ہے۔ حیات سرورِ کائنات خنک اور خوشگوار شبنم کی ہلکی پھوار معلوم ہوتی ہے۔ قیمت حصہ اول سوا چار روپے محصول نو آنے۔ حصہ دوم ساڑھے تین روپے محصول ۸/

میرے زمانے کی دلّی

اخبار "نوائے وقت" لکھتا ہے "دلی کی کہانی واحدی صاحب کی زبانی بس یوں سمجھئے کہ لیلیٰ کی داستان مجنوں بیان کر رہا ہے" قیمت ساڑھے تین روپے محصول ۸/

سوانحعمری خواجہ حسن نظامیؒ

نوائے وقت لکھتا ہے "ملا واحدی صاحب دوستی کی ابتداء سے آخر دم تک خواجہ صاحب مرحوم کے خلوت و جلوت کے ساتھی رہے۔ انھوں نے خواجہ صاحب کی زندگی کے ہر پہلو کو پیش کیا ہے۔ کمزوریاں بھی گنوائی ہیں اور خوبیوں کو بھی سراہا ہے" قیمت تین روپے محصول ۸/ سب کتابیں مجلد ہیں۔ جلدوں پر سنہری حرفوں میں نام وغیرہ چھپا ہوا ہے۔

ملنے کا پتہ:۔ مینیجر نظام المشائخ جیکب لائنز کراچی

ماہر القادری

رکن انجمن ادبی رسائل، پاکستان

فاران
کراچی

ایڈیٹر
ماہر القادری

جلد (۱۰)
شمارہ (۱۰)

ترتیب

ماہ جنوری
۱۹۵۹ء

سالانہ چندہ
چھ ۶ روپے

فی پرچہ
آٹھ آنے

مقام اشاعت: دفتر فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی نمبر (۱)

پرنٹر پبلشر: مسرور حسین

مطبع سعیدی قرآن محل، کراچی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نقشِ اوّل

ہر قسم کے شک وشبہ سے دل کو پاک وصاف کرکے، پورے اطمینان، یقین اور شرحِ قلب کے ساتھ اس بات کا مان لینا ایمان کی لازمی شرط ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کائنات کا پیدا کرنے والا (خالق) بھی ہے اور اس کا پالنہار (رَبّ) بھی ہے۔ کائنات کی ہر شے اللہ تعالیٰ کی صفتِ ربوبیت اور شانِ قیومیت کے سہارے موجود و قائم ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے چیونٹی کا دل دھڑکتا ہے اور درخت کا پتہ رنگ کو قبول کرتا ہے، اللہ تعالیٰ ہی کی صفتِ خلاقیت تتلی کے پروں پر رنگ برنگ کی دھاریاں ابھارتی ہے اور کوئلہ میں صلاحیت پیدا کرکے اسے چمکدار ہیرا بنا دیتی ہے۔

مکڑی کے کمزور جالے کے خطوط و دوائر کو دیکھئے کہ ان میں آرٹ کی کس درجہ نزاکت اور چابکدستی پائی جاتی ہے، یہی نرم ونازک دام کو اللہ تعالیٰ نے عنکبوت کے لئے رزق کا ذریعہ بنا دیا۔ یہ جو شہد کی مکھی پھول پتوں کا انتخاب کرکے اُن کا رس چوستی ہے، اور اُسے اپنے چھتے کے خانوں میں جمع کردیتی ہے، تو شہد بننے کا یہ سارا عمل (Process) اللہ تعالیٰ ہی کی حکمتِ بالغہ و مشیتِ کاملہ کے تحت ظہور میں آتا ہے، پانی بہتا ہے، آگ جلاتی ہے، سورج اجالا کرتا ہے، ہوا چلتی ہے، موسمِ بہار میں سبزہ لہلہاتا ہے، خزاں میں ہریالی سوکھ جاتی ہے کس کے حکم سے؟ اللہ تعالیٰ کے حکم سے!

روزم تو بر فروز و شبم را تو نور دہ

ایں کار نیست کارِ مہ و آفتاب نیست

یہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کاملہ ہے جو چڑیوں کے دلوں میں بچوں کے لئے جذبۂ رحم و شفقت پیدا کرتی ہے کہ وہ دوڑ دھوپ کرکے ایک ایک دانہ چن کر لاتی ہیں اور اپنے بچوں کی کھلی ہوئی چونچوں میں نرمی و آہستگی کے ساتھ رکھ دیتی ہیں۔

جو کوئی کائنات کی صنعت اور اس کی نشوونما پر جتنا... زیادہ غور کرے گا، اُسی قدر صانعِ حقیقی کے کمالِ صنعت اور رب العلمین کی شانِ ربوبیت پر اس کے ایمان اور یقین میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ اور ساتھ ہی انسان اعترافِ عجز پر مجبور ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے کسی کمالِ صفت کی ایک جھلک کی مدح و توصیف کا وہ کم سے کم حق بھی ادا نہیں کر سکتا۔

جس خالق نے چہچہانے والے پرندوں اور کلیلیں کرنے والے ہرنوں کو خلق فرمایا ہے، اُسی نے سانپ، بچھو، کھنکھجورے اور پھاڑ کھانے والے درندے بھی پیدا کئے ہیں، زمین سے فصل بھی اللہ تعالیٰ ہی اگاتا ہے اور اس فصل کو ٹڈیوں کے جو غول کے غول ذرا سی دیر میں چٹ کر جاتے ہیں۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی مخلوق ہے۔ نیش اور نوش، پھول اور کانٹے، زہر اور تریاق، مٹھاس اور کڑواہٹ، اُجالا اور اندھیرا۔ دھوپ چھاؤں، صحت اور بیماری، ان سب کو اللہ تعالیٰ ہی نے پیدا کیا ہے، اسی کے حکم سے آنکھوں کی بینائی عطا ہوتی ہے اور اسی کے حکم سے بینائی سلب کرلی جاتی ہے۔ کشتی بھی اسی کے حکم سے تیرتی ہے اور طوفان بھی اسی کے فرمان سے اٹھتے ہیں، وہی ڈبوتا ہے وہی، ابھارتا ہے، وہی جلاتا ہے وہی مارتا ہے، اس عالمِ کون وفساد میں جو کچھ ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ ہی کی مشیت کے تحت ہوتا ہے اس کے حکم کے بغیر نہ کوئی پتہ ہل سکتا ہے اور نہ کوئی پرندہ پر مار سکتا ہے، دوستی ہو، دشمنی ہو، صلح ہو جنگ ہو، برائی ہو بھلائی ہو

جدائی ہو، ایکا ہو، لڑائی ہو، بناؤ ہو بگاڑ ہو، تنگی ہو، آسودگی ہو، اقرار ہو انکار ہو۔ ان سب پر اللہ تعالیٰ ہی کی مشیت قاہرہ کا غلبہ ہے۔

جن چند چیزوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، اُن میں سے بعض چیزیں ہمیں ناپسند ہیں، اور ہم اُن کی مضرتوں سے بچنا اور دُور رہنا چاہتے ہیں، مگر ہماری ناپسندیدگی یہ حکم نہیں لگا سکتی کہ فلاں چیز کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کر کے معاذ اللہ غلطی کی ہے۔ مثلاً کوئی آدمی بیماری کو پسند نہیں کرتا اور بیماری سے آدمی کو تکلیف ہی ہوتی ہے، مگر اللہ تعالیٰ کی مشیت تکوینی کے تحت صحت کے ساتھ بیماری کا ہونا بھی ضروری سمجھا گیا، اسی طرح شیرینی کے ساتھ تلخی کا وجود چاہے ہمارے ذائقہ کو کتنا ہی ناگوار محسوس ہو، لیکن اس کا پایا جانا ضروری تھا! اللہ تعالیٰ عادل ہے، حکیم و خبیر ہے، اس کا کوئی فعل غلط اور رائگاں ہو ہی نہیں سکتا، اُس نے جس چیز کو جن خواص کے ساتھ پیدا کیا ہے، اور جو وظیفہ عمل، اس سے متعلق کیا ہے وہ کائنات کے اجتماعی نظام کے لئے سو فیصدی درست اور عین صواب ہے، اللہ تعالیٰ کے کسی کام میں کوئی جھول نہیں، اس کی کسی صنعت و تخلیق میں کوئی کمی نہیں، اس کی کسی صفت میں کوئی نقص نہیں، اور اس کا کوئی فعل عبث و رائیگاں نہیں

اللہ تعالیٰ کی مشیت تکوینی ایک صالح نوجوان کو عین عالم شباب میں موت دیتی ہے اور ایک بدکار بوڑھے کھوسٹ کو عمر طویل عطا کرتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کے یہ دونوں حکم و فعل عین عدل و صواب ہیں۔ اس کی حکمت و مشیت کے ہر بھید کو ہم نہیں سمجھ سکتے، اس کے اسرارِ حکمت و مشیت کی بے پناہی کے مقابلہ میں ہماری سمجھ بوجھ کی نسبت اتنی بھی نہیں ہے، جتنی نسبت مچھر کے پر کی نوک کو اتھاہ سمندر سے ہے!

اوپر جو کچھ کہا گیا ہے، اُسے چند مثالوں کے ذریعہ اگر سمجھنے کی کوشش کی جائے تو بات اور زیادہ واضح ہو جائے گی، کیونکہ یہ مسائل بڑے ہی نازک اور پیچیدہ ہیں، اور اس دوراہے پر نہ جانے کتنی عقلیں بھٹک گئی ہیں ——— مثلاً باغ کے مالی کا ایک شاداب پودے کو جڑ سے اکھاڑ دینا اور ایک مرجھائے درخت کو باقی رکھنا، ڈاکٹر کا کسی مریض کے کسی ایک عضو کو کاٹ دینا۔ نقاش کا چند لکیروں کو مٹا دینا اور کچھ لکیروں کو نہ مٹانا ——— ان "افعال" کو مجموعی حیثیت سے الگ کر کے دیکھا جائے تو ان میں بے اعتدالی اور زیادتی نظر آئے گی مگر مجموعی طور پر ان کا واقع ہونا ضروری تھا، چاہے ان افعال کے وقوع کی ضرورت و اہمیت باغ کے پودوں، مریض کے جسم کے اعضا اور خاکہ و تصویر کی لکیروں کے سمجھ میں نہ آئے۔

آدمی کے منہ میں اگر تھوک خشک ہو جائے تو علاج معالجہ کے ذریعہ تھوک پیدا کیا جائے گا کیونکہ جسم کے مجموعی نظام میں "تھوک" کا پایا جانا ضروری ہے، لیکن اسے جسمانی نظام سے الگ کر کے دیکھئے تو تھوک ناپسندیدہ شے ہے اور اس سے نفرت کی جاتی ہے۔

ہر مکان میں خواب گاہ اور ملاقات کے کمروں کے ساتھ بیت الخلاء بھی ضرور ہوتا ہے، "بیت الخلاء" کا تصور انسان کے لئے چاہے کتنا ہی ناگوار کیوں نہ ہو مگر مکان کے مجموعی نقشے میں اس کی ضرورت سے کون انکار کر سکتا ہے۔

خیر و شر — کوئی شک نہیں کہ کائنات کے مجموعی نظام میں سانپوں اور بچھوؤں کا پیدا ہونا بھی ضروری تھا، مگر ہر انسان سانپ کے پھن اور بچھو کے ڈنک سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اور اسے ایسا کرنا ہی چاہیئے۔ اسی طرح خیر و شر اللہ ہی کی طرف سے ہوتا ہے لیکن جس طرح سانپ اور بچھو اللہ تعالیٰ ہی کے پیدا کئے ہوئے ہیں اور انسان ان کی مضرتوں سے بچتا ہے، اسی طرح "شر" بھی اگرچہ "من جانب اللہ" ہے مگر اس سے بچنا، دور رہنا، مدافعت اور گریز کرنا انسان کے لئے ضروری ہے۔

جب انسان زہر اور تریاق، پھول اور کانٹے میں امتیاز کرتا ہے، اور ان چیزوں کے ساتھ ایک جیسا سلوک نہیں کرتا، ایک سے بچتا ہے، دوسری کی طرف بڑھتا ہے، تو پھر اُسے "خیر و شر" میں بھی امتیاز کرنا چاہیئے۔

آدمی کے ٹھوکر بھی اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے لگتی ہے اور اسی کے حکم سے وہ سنبھلتا بھی ہے، مگر کوئی انسان بہ صحت ہوش و حواس ٹھوکر کھانے اور گرنے کی آرزو نہیں کرتا، اسی طرح کوئی شخص کسی مرض میں مبتلا ہونا نہیں چاہتا، سب لوگ تندرستی ہی کی تمنا کرتے ہیں

انسان فطری طور پر جس طرح اچھی بری چیزوں میں امتیاز کرتا ہے، اسی طرح "خیر و شر" میں بھی اُسے "خیر" کو اختیار اور "شر" سے اجتناب کرنا چاہئے جو کوئی "خیر و شر" کے اس فرق، امتیاز اور تفاوت کو سمجھ لے گا وہ اعتقاد و عمل میں ثابت قدم رہے گا۔

اہلِ تشکیک کے لئے ہر بات میں الجھنیں اور پیچیدگیاں ہیں، اُن کا مزاج سیدھی سادی بات کو بھی معمہ بنا دیتا ہے مگر اہلِ یقین نازک سے نازک مسئلہ میں بھی کوئی پھیر اور اُلجھاؤ محسوس نہیں کرتے! بے یقینی دل کی موت اور یقین دل کی زندگی ہے!

انسان اور حیوان میں سب سے نمایاں فرق یہ ہے کہ حیوان کو اللہ تعالیٰ نے "خیر و شر" میں امتیاز کرنے کی صلاحیت ہی ودیعت نہیں کی، ایک چیل بڑی آزادی کے ساتھ ایک غریب بیوہ کے ہاتھ سے گوشت، جھپٹا مار کر چھین لیتی ہے اور ایک کتا ایک یتیم بچہ کے ہاتھ کی روٹی کو لے بھاگتا ہے، اور اُن پر کوئی باز پرس نہیں ہے ———— گھوڑے سے ایک ڈاکو بھی کام لے سکتا ہے اور ایک مجاہد بھی! گھوڑے کو نہ جہاد میں جانے کی کوئی مسرت ہوتی ہے اور نہ ڈکیتی میں آلۂ کار بننا اس پر گراں گزرتا ہے، اُسے تو کسی نہ کسی راکب کا مرکب بننے سے کام!

جمادات و نباتات کا حال حیوانات سے بھی زیادہ جامد ہے! درخت کے سایہ میں ہر کوئی پناہ لے سکتا ہے، درخت نہ تو کسی آفت زدہ کے لئے اپنی شاخوں کو پھیلاتا ہے اور نہ کسی قاتل اور ظالم کو دیکھ کر اپنے پتوں کو سمیٹتا ہے، تلوار خونیں مجرم کی گردن کو جس بیباکی کے ساتھ اڑا دیتی ہے، اُسی بے باکی کے ساتھ ایک بے گناہ کا سر بھی تن سے جدا کر دیتی ہے، آگ جس طرح کسی محل کو جلاتی ہے، اُسی طرح ایک بیوہ کی جھونپڑی کو بھی جلا کر خاک کر دیتی ہے۔

مگر

حضرتِ انسان کا معاملہ اس کے برعکس ہے، ایک طرف وہ مشیتِ تکوینی کے آگے مجبور ہے اور قسمت کے نوشتہ کے ایک نقطہ کو بھی اِدھر سے اُدھر نہیں کر سکتا۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے اُسے "خیر و شر" میں امتیاز کرنے کی صلاحیت عطا کی ہے، اور اسی صلاحیت کے غلط اور صحیح استعمال پر انسان کے شرف و ذلت، عروج و تنزل اور بلندی و پستی کا دارومدار ہے، آخرت میں انسان سے "خیر و شر" کے امتیاز ہی کے انتخاب و استعمال پر احتساب ہوگا۔

بالکل سامنے کی بات ہے کہ بیل اور گائیں ہر کسی کے کھیت میں چر کر اپنا پیٹ بھر لیتی ہیں مگر انسان پر جائز و ناجائز، حلال و حرام روزی میں امتیاز کرنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، جو کوئی کسی دوسرے کے حقوق پر دست درازی کرتا ہے تو قانون محتسب بن کر اپنا فرض انجام دیتا ہے، اس قسم کے غلط کار آدمی کی سوسائٹی میں عزت باقی نہیں رہتی اور وہ خود اپنے کو مجرم سمجھتا ہے اور چاہے وہ دوسروں کے سامنے اپنے جرم کا اعتراف نہ کرے مگر اُس کا ضمیر ندامت محسوس کرتا ہے۔

۹

خیر و شر، جبر و اختیار اور تدبیر و تقدیر ———— یہ ایسے مسائل ہیں کہ "اہل کلام" نے صدیوں ان مسائل پر جنگ و جدل کیا ہے، اور عقل و دانش کے بل بوتے پر ان گتھیوں کو جتنا سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے، اتنی ہی الجھنیں اور بڑھتی گئی ہیں، اگر دل ایمان و یقین سے معمور ہو تو یہ مسائل پیچیدہ اور شاخ در شاخ ہونے نہیں پاتے اور ایمان و یقین کی بدولت ہر مسئلہ کا حل مل جاتا ہے، جو لوگ تشکیک کی طرف گئے ہیں، اور جنھوں نے عقل کے زور پر تیر تکے لڑائے ہیں، انھوں نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ دو اور دو کا چار (۲+۲=۴) ہونا بھی مشتبہ ہے، اور جن کو ایمان و یقین ملا ہے، انھوں نے "معراجِ رسول" جیسے محیر العقول واقعہ کی بھی سن کر تصدیق کر دی ہے: کسی شخص کو "فلسفہ و کلام" کا شوق ہو تو وہ کتابوں میں "جبر و اختیار" کی بحث کو پڑھ سکتا ہے، ہزاروں صفحات اس موضوع پر اسے مطالعہ کے لئے مل سکتے ہیں

مگر جو کوئی قلب و ضمیر کا اطمینان چاہتا ہے، وہ اس طرز پر سوچے کہ جس خدا نے

ان اللہ علےٰ کلّ شیٍٔ قدیر

فرمایا ہے، اُسی نے یہ کہا ہے کہ انسان کے اعمال پر محاسبہ کیا جائے گا، اور رائی بھر بُرائی اور ذرہ برابر نیکی کا بھی صلہ دیا جائے گا، تو اللہ تعالیٰ کے دونوں قول حق ہیں، یہ بھی کہ ہر شے پر اللہ تعالیٰ ہی قادر و غالب ہے، اور یہ بھی کہ انسان کو کسبِ اعمال میں اختیار دیا گیا ہے اور اُسی "اختیار" کے سبب اس سے باز پُرس کی جائے گی، کوئی متنفس یہ عذر پیش کر کے آخرت کے محاسبہ اور مواخذہ سے بچ نہیں سکتا کہ دُنیا میں حکم اور مشیت اللہ تعالیٰ کی چلتی تھی، ہر شے اور اس کے عمل اور فعل پر اللہ تعالیٰ ہی قادر و محیط تھا، میں تو مجبورِ محض تھا، اس قسم کی معذرتیں لوگوں کے منہ پر ماردی جائیں گی وہاں نہ "قدریین" کا فلسفہ چل سکے گا، اور نہ "جبریین" کی دلیلیں کام آئیں گی اور نہ معتزلہ کی عقل موشگافیوں کو شرفِ پذیرائی حاصل ہوگا۔ اُس دن فوز و فلاح اُسے حاصل ہوگی، جس کے پاس "سمع و اطاعت" کی زیادہ سے زیادہ پُونجی ہوگی!

ایک مسلمان کا "تقدیر" پر ایمان لانا بھی ضروری ہے اور یہ بھی صحیح ہے:۔

"جفّ القلم بما ہو کائن"

"لوح و قلم" کے اسرار چاہے ہماری سمجھ میں نہ آئیں مگر اُن کا وجود اپنی جگہ مسلّم ہے۔ کوئی تدبیر اور سعی مقدرات کو نہیں بدل سکتی، اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت، حکمت اور قدرت کے اندازے کے مطابق جس مخلوق کے لئے بھی جو کچھ "ہونا" مقدر فرما دیا ہے، وہ ہو کر "پیش" آ رہے گا! مگر "تقدیر" پر ایمان لانے کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے دعا و تدبیر اور محنت و سعی کرنے کا بھی حکم دیا ہے، دو ٹوک لفظوں میں فرمایا گیا ہے کہ:۔

لیس للانسان الا ما سعےٰ

اسی حکم کی اطاعت کی بنا پر ہم "تقدیر" پر ایمان رکھتے ہوئے، دن رات دوڑ دھوپ کرتے ہیں، کوئی ایسا نہیں کرتا کہ پیاس لگے اور وہ "تقدیر" پر تکیہ کئے بیٹھا رہے کہ مقدر میں لکھا ہوگا تو پانی کا گلاس خود بخود میرے لبوں تک آ جائے گا۔ اس دار العمل میں ہاتھ پیر ہلائے بغیر کچھ ہو ہی نہیں سکتا، حرکت میں ہی برکت ہے، ہر نفس کے لئے سعی "مقدر" کر دی گئی ہے ——— "تقدیر" پر کامل یقین اور اس کے ساتھ ہر امکانی سعی و تدبیر سے کام لینا اور جدّ و جہد کرنا یہ ہے "فکر و عمل" کا صحیح ہتھیار! جس کسی نے جدّ و جہد سے ہاتھ کھینچ لیا اُس نے "تقدیر" کے مسئلہ ہی کو نہیں سمجھا، "تقدیر و توکل" کے مسئلہ کو صحابۂ کرام نے سمجھا تھا اور اپنے فاتحانہ اقدام سے دنیا میں ہلچل پیدا کر دی تھی، اور اپنی سعی تعمیر سے انسانی معاشرے کو بلند و پاکیزہ بنا دیا تھا۔

کسی جگہ لوگ اخلاص کے ساتھ مسجد بنا رہے ہوں اور ایکا ایکی مسجد کی چھت گر جائے تو اس کو "تقدیر" کہا جائے گا، اور یہی وہ مقام ہے جہاں آدمی کو اپنی درماندگی اور عجز کا اعتراف کرنا پڑتا ہے، اور مسجد کی چھت گر جانے میں چونکہ مسجد بنانے والوں کی کوشش، ارادے اور نیت کا کوئی دخل نہیں ہے، لہٰذا اُن سے اس حادثہ کی باز پُرس نہیں کی جائے گی، مگر اُن کا فرض یہی ہوگا کہ وہ مسجد کی تکمیل کے لئے جدّ و جہد کرتے رہیں، چاہے مسجد کی تعمیر کو ارضی و سماوی حادثات کا بار بار سامنا کرنا پڑے! حوادث کے نزول سے جب کوئی تعمیر متاثر ہوتی ہے، تو بظاہر ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ تعمیر کرنے والوں کے کئے کرائے پر پانی پھر گیا اور اُن کی ساری کوشش اکارت گئی، مگر اللہ تعالیٰ کے یہاں اُن کی کوشش پر پُورا پُورا اجر ملے گا اور آخرت میں اپنی سعی کا وہ خاطر خواہ صلہ پائیں گے، جس حادثہ کو انسان روک نہیں سکتا، اُس کا وہ ——— ذمہ دار نہیں ہے۔

مسجد کی جو خیال اُوپر دی گئی ہے، اس کا انطباق نیکی کی ہر کوشش اور خیر و فلاح کی ہر جدّ و جہد پر ہو سکتا ہے

"جدّ و جہد"

عربی لغت اور دینی مصطلحات کا ایک عجیب جامع لفظ ہے، جس میں ہر امکانی کوشش سے لے کر مشقت و محنت، جانکاہی اور ہر قسم کا ایثار و قربانی تک شامل ہے! جو لوگ دنیا میں حق و صداقت کو قائم اور نیکی کو پھیلانا چاہتے ہیں، ان کے لئے ہر جگہ اور ہر طرح کے ماحول میں کام کرنے کے مواقع موجود ہیں، ماحول سازگار ہو، ناسازگار ہو، حالات موافق ہوں، ناموافق ہوں، امن و اطمینان کی فضا ہو، خطروں کا سامنا ہو، اُن کے واسطے فرائض اور ذمہ داریوں کی کمی نہیں ہے۔

دُنیا کے جب کسی معاملہ کو آدمی "تقدیر" پر چھوڑ کر نہیں بیٹھ جاتا تو اللہ کے کلمہ کو بلند و غالب کرنے کے فریضہ کو "تقدیر" پر کس طرح چھوڑا جا سکتا ہے، یہ فریضہ تو کمیت و کیفیت کی جس مقدار کے ساتھ بھی ممکن ہو، ادا ہی ہوتا رہنا چاہیئے:

مردِ مومن کا چراغ بھی گُل ہو جاتا ہے، تو اس ملال اور دل گرفتگی پر اُسے اللہ تعالیٰ کے یہاں سے اجر ملتا ہے ———————

اس لئے مردِ مومن کے لئے ہر ناخوشگواری اور اذیت ـ حصولِ اجر و ثواب کا ذریعہ بنتی ہے، دل جتنا ٹوٹتا ہے زندگی میں سوز پیدا ہوتا ہے، اور روح کو جس قدر بے چینی ملتی ہے، نفس کا تزکیہ ہوتا جاتا ہے، تمنائیں پامال اور آرزوئیں ناکام ہوتی ہیں تو دل کی جراحتیں "تعلق باللہ" کو مضبوط تر کر دیتی ہیں، "تعلق باللہ" خود بہت بڑی نعمت ہے، یہ نعمت جس کسی کو مل جائے، اس کی قسمت کا کیا پوچھنا!

ایسا بھی ہوتا ہے کہ اخلاص اور دردمندی کے باوجود، کسی جماعت یا فرد کو اپنی ذات اور کاموں کے بارے میں غلط فہمی کی حد تک خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے، یہ ایسی کمزوری ہے جس کا بعض اوقات احساس تک نہیں ہوتا، تو خود شناسی اور خود نگری کی اس غفلت سے چونکانے کے لئے قدرت کی طرف سے "انتباہ" ملتا ہے اور جھٹکے دیئے جاتے ہیں اور جھنجوڑا جاتا ہے!

کسی مشین کا چلتے چلتے رُک جانا کوئی اچھی بات نہیں ہے مگر بعض اوقات یہ رکاوٹ مشین کے پرزوں کے لئے باعثِ رحمت بن جاتی ہے، مشین کے ایکا ایکی رکنے کے بعد، اس وقفہ میں ایک ایک پرزے کو تیز تر چلنے کی فرصت نصیب ہوتی ہے، اور یہ صاف کئے ہوئے کل پرزے جب پھر جُڑ جاتے ہیں تو مشین پہلے سے کئی گُنا زیادہ تیزی کے ساتھ کام کرتی ہے! یہی وہ انفرادی تزکیۂ نفس ہے جو اجتماعی نظم میں کام آتا ہے اور گرد و غبار دُھل کر دلوں کے آئینے مجلّا اور تابناک ہو جاتے ہیں۔

حق کی راہ کو جس کسی نے فرشِ گُل سمجھا، اُس نے پہلے قدم ہی پر غلطی کی، ایسے تن آسان آدمی کو جب بھی رکاوٹوں کا سامنا کرنا اور کانٹوں پر چلنا پڑے گا، وہ ہمت ہار بیٹھے گا وہ اس بات کی کوشش کرے گا کہ کوئی بہانہ تراش کر راہِ فرار اختیار کرے مگر جو کوئی اس منزل کی دشواریوں اور خطروں کو ذہن میں رکھ کر گامزن ہوا ہے، وہ دشواریوں اور کلفتوں سے گھبرا نہیں سکتا۔

جو لوگ شہرت و نمود، شخصی فائدے اور عہدہ و منصب حاصل کرنے کے لئے کسی تحریک یا پارٹی میں شامل ہو جاتے ہیں، اول تو ان کی وفاداریاں جلد جلد بدلتی رہتی ہیں، جس پارٹی کے ساتھ ملے رہنے اور جس بڑے آدمی کی جی حضوری اور نیازمندی میں فائدہ دکھائی دیا، اس کے پیچھے ہو لئے اور اس کے حاشیہ بردار بن گئے، دوسرے یہ لوگ آزمائشوں سے کنی کاٹتے ہیں اور چونکہ کوئی بلند مقصد پیشِ نظر نہیں ہوتا اس لئے اپنی کسی چیز کا زیاں انہیں گوارا نہیں ہوتا، ایثار و قربانی کی توقع ان سے .... نہیں کی جا سکتی! یہ لوگ ہوا کے ساتھی ہوتے ہیں، زمانہ شناس اور موقعہ پرست، چڑھتے سُورج کے پجاری اور ڈوبتے ستاروں سے آنکھیں چرانے والے!

کسی ملک کی تعمیر میں عوام کے وہی افراد کام آسکتے ہیں اور مؤثر و مفید پارٹ انجام دے سکتے ہیں، جن کے سامنے اپنا شخصی مفاد نہ ہو بلکہ وہ قوم، ملک اور دین کے مفاد کو اپنے مفاد پر ترجیح دیتے ہوں، جن کے اندر اللہ کا خوف ہو اور جو آخرت کی باز پُرس کا احساس رکھتے ہوں، جن لوگوں کی وفاداری ادلتی بدلتی نہ رہی ہو، جو زمانہ ساز نہ ہوں، جن کی سیرت و کردار پر اعتماد کیا جا سکتا ہو، جو اُن آزمائشوں میں پورے اتر چکے ہوں جنہیں آپس کے معاملات میں آزمایا جا چکا ہو، جن کا "حساب" پاک ہو، اس لئے محتسب کا انہیں "باک" نہ ہو

جو بلبع خیر پسند ہوں اور اُن کی دلی تمنا یہ ہو کہ دنیا میں نیکی پھیلے، اور برائی مٹے۔ جو حق و صداقت کے منادی ہوں اور جنکی نیکی شرافت اور سچائی کی گواہی اُن کے پڑوسی اور محلہ والے دے سکیں۔

اس مزاج و ذہنیت کے شریف، اور اچھے لوگ حقیقت میں زمین کا نمک اور معاشرے کا محسن ہوتے ہیں۔ اُن کی ذات سے سوسائٹی کو فائدہ پہنچتا ہے، یہ نہ تو چھُپ کر کوئی سازش کرتے ہیں اور نہ کسی قسم کے ادنیٰ سے ادنیٰ بگاڑ کی دعوت دیتے ہیں، نیکی اور تعمیر کے کاموں میں یہ لوگ ہر کسی کے معاون و مددگار ہوتے ہیں، کسی کی اچھائی پر پردہ نہیں ڈالتے اور ساتھ ہی کسی کی غلط کاری اور کج اندیشی سے صرفِ نظر بھی نہیں کرتے ان افراد کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ کی رضا ہوتی ہے، اس لئے ان کے سود و زیاں اور خوب و ناخوب کے پیمانے اُن لوگوں سے مختلف ہوتے ہیں، جن کا مقصود مادی منفعت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا، اللہ کی زمین پر فحش و منکر کے مناظر دیکھ کر ان کی آنکھوں میں سوئیاں چبھتی ہیں اور انسانی معاشرے کے زیاں کو یہ لوگ خود اپنا زیاں سمجھتے ہیں، اُن کے نزدیک کسی حکومت، ملک، فرد اور قوم کے ساتھ جو سب سے بڑی بھلائی کی جا سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ ان میں خدا شناسی، خشیتِ الٰہی، اور اخلاق و نیکو کاری کا زیادہ سے زیادہ احساس پیدا کر دیا جائے تاکہ ترفہ اور خوشحالی کے وقت وہ بے راہ رو اور حدود اللہ کو توڑنے والے نہ بننے پائیں اور پریشانی اور تنگی ترشی کے عالم میں بد حواس، پست ہمت اور ضمیر فروش نہ ہو سکیں۔ اللہ تعالیٰ کے ان فرض شناس بندوں کو سمندروں سے سونا نکلنے کی خبر سُن کر اتنی خوشی نہیں ہوتی، جتنی خوشی کسی صاحبِ اختیار شخصیت کی زبان سے "اسلام، اخلاق اور خوفِ خدا" جیسے حوصلہ افزا اور ایمان افروز الفاظ سُن کر ہوتی ہے!

کسی ملک کی مادی ترقی کے یہ لوگ منکر نہیں ہیں، ان کی تو یہ تمنا ہے کہ ہر ملک ہر اعتبار سے خوشحال اور خود مکتفی ہو جائے۔ بلکہ اُس کا رفاہ اور خوشحالی اس حد تک پہنچ جائے کہ وہ کسی دوسرے کا دستِ نگر بن کر نہ رہے، کیونکہ غیروں کا دستِ نگر بن کر، کسی نہ کسی حد تک اُن کی مرضی کی بھی رعایت کرنی پڑتی ہے۔ ظاہری اسباب کی اہمیت کا یہ لوگ انکار نہیں کرتے اور نہ مادی وسائل کے بارے میں ان کا نقطۂ نگاہ راہبانہ ہے کپڑا سینے والی مشین کی سوئی سے لے کر ہائیڈروجن بموں اور مہر و ماہ شکار راکٹوں تک کی ایجاد کی ضرورت کے قائل ہیں، سائنس ان کے نزدیک شجرِ ممنوعہ نہیں ہے۔ ایجاد و اختراع کے میدان میں مسابقت ان کی نگاہ میں ایک مبارک کوشش اور نیک اقدام ہے۔ یہ ترکِ دنیا کی نہیں بلکہ تسخیرِ دنیا کی تعلیم دیتے ہیں۔ تسخیرِ دُنیا کس لئے؟ سکندر اور قسطنطین اعظم کی طرح اپنی بڑائی کے جھنڈے گاڑنے اور اپنے اقتدار کے پرچم اڑانے کے لئے نہیں بلکہ اللہ کی زمین میں اللہ کا قانون نافذ کرنے کے لئے! تاکہ عمرانی عدل قائم ہو سکے، ہر شخص کے حقوق کی پوری پوری حفاظت کی جا سکے اور کوئی کسی پر زیادتی نہ کرنے پائے!

یہ لوگ قوم کے "مخدوم" بننے کی تمنا نہیں رکھتے، بلکہ ان کی زندگیوں کا مقصد ملک و ملت کی خدمت ہے ان کا تو:-

سروری در دینِ ما خدمت گری است

کے نظریہ پر ایمان ہے، نہ ان کے معتقدات راز ہیں اور نہ ان کے عزائم اور نظریئے چھپے ہوئے ہیں، مسجدوں کے منبر و محراب سے لے کر حکومت کے ایوانوں تک اللہ کے قانون کا نفاذ، غلبہ اور اقتدار، یہ ہے ان کا پروگرام، ان کی تمنا اور ان کا اعتقاد۔ یہ قوم کی تعمیر مصطفیٰ کمال پاشا کے "تجدد زدہ اسلام" کی اساس پر نہیں بلکہ صدیق رضؓ، و فاروق رضؓ کے "خالص اسلام" کی بنیادوں پر چاہتے ہیں! اُن کا یہ ایمان ہے کہ اللہ اور رسولؐ نے جس چیز کو ناپسند فرمایا ہے، اس میں بظاہر کتنے ہی فائدے دکھائی دیں مگر وہ چیز ملک و ملت کے لئے سببِ خیر نہیں ہو سکتی، ان کا یہ عقیدہ اور عزم ہے کہ مسلمان دنیا کے پیچھے چلنے کے لئے نہیں بلکہ دنیا کو اپنے پیچھے چلانے اور اُن کی قیادت کا فرض انجام دینے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ حسن البنا شہید مرحوم نے کتنی سچی بات کہی تھی کہ:-

"مردِ مومن دُنیا کی قیادت سے کم کسی چیز پر راضی نہیں ہو سکتا"

یہ اسلام پسند اور انسانیت دوست افراد مسلمانوں کے دکھ کا علاج نہ امریکہ کی تقلید میں سمجھتے ہیں اور نہ روس کی پیروی میں! یہ دونوں انتہائیں غلط ہیں کہ ان کی تعمیر میں خرابی کی بے شمار صورتیں مضمر ہیں، ہم مسلمانوں کے درد کا مداوا اللہ کی کتاب، رسول اللہ ؐ کی سنت، اور صحابہ کے آثار میں موجود ہے، ہم سے زیادہ نادان اور کم عقل کون ہوگا کہ اپنے دارالشفاء کو چھوڑ کر پنساری کی دکانوں پر دوا اور جڑی بوٹیوں کے لئے ہاتھ پھیلاتے پھریں، یہ خدمت گزارانِ دین و ملت اسلام کو دینِ کامل سمجھتے ہیں، جسکے بنیادی محوروں میں ایک شوشہ کی تبدیلی کسی قیمت پر گوارا نہیں کی جاسکتی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:۔

"میں قیامت کے دن اپنی امت کی کثرت پر فخر کرونگا"

تو یہ غلامانِ رسول ؐ حضور ؐ کے ارشادِ گرامی کی اس اہمیت کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ کی ہدایت پر اعتماد اور اطمینان رکھتے ہیں اور کثرتِ آبادی سے ملک کے مستقبل سے مایوس نہیں ہیں، اگر کہیں ناچ گانے اور منت کاری کے لئے کوئی "نفر اور ایوان" بن رہا ہو، تو اس کے بارے میں وہ یقین رکھتے ہیں کہ ایک نہ ایک دن اُسے "دارالحدیث" اور تربیتِ اخلاق کے مرکز میں تبدیل کرا کے رہیں گے، واقعتاً ایسا ضرور ہو بھی جائے گا، اس کی انہیں فکر نہیں ہے کہ کوششیں کو حدِ اتمام تک پہنچا دینا اللہ تعالیٰ کا کام ہے ———— تو پھر اللہ کے کام کی بندوں کو فکر کیوں ہو، بندوں کا کام تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے جس پیمانہ پر بھی ممکن ہو، کوشش کرتے رہیں، بندوں کو جو کام سپرد کیا گیا ہے اُس میں اُن کو لگے رہنا چاہیئے، اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کو بہتر جانتا ہے، اُس کی مشیت بہرحال اپنے تقاضے پورے کرکے رہے گی؛ ہمارا یہ فرض ہے کہ جو کام ہمیں سونپا گیا ہے، اس سے غافل اور بے تعلق نہ رہیں۔

حکومت اور معاشرہ کون سے خطوط پر استوار ہو کر "کتاب و سنت" کے تقاضوں کو پورا کرسکتے ہیں اور کن اخلاقی حدود میں رہ کر زیادہ سے زیادہ خوشحالی حاصل ہوسکتی ہے، اس کے لئے ان اسلام پسند افراد نے ہزاروں صفحات کا لٹریچر مہیا کردیا ہے، جن میں علمی دلائل ہیں، عقلی براہین ہیں، تجربات و مشاہدات ہیں، یہ لٹریچر مغرب کے دانشوروں کو چیلنج دیتا ہے کہ علم و آگہی، فکر و بصیرت، اور تجربہ و عمل کی کسوٹی پر اسلامی نظریوں کو اچھی طرح پرکھ کر اور جانچ کر دیکھو، انشاء اللہ اس میں کسی قسم کی کوئی کھوٹ نہیں نکلے گی، اسلام اپنی فطرت سے زرِ خالص واقع ہوا ہے، جس نے کسی دور میں کسی ملاوٹ کو قبول نہیں کیا۔

اقامتِ دین کے یہ داعی اسلام اور صرف اسلام کو "شجرِ طیبہ" سمجھتے ہیں، جو کسی دوسرے شجرِ خبیث سے کسی شاخ کے پیوند کو قبول نہیں کرسکتا، اسی پاک درخت کی جڑوں کو ثبات و دوام حاصل ہے، اسی کا تنہ مرکزیت کا حامل ہے، اسی کے پھول پتوں کو اخلاق کی سدا بہار خوشبو میسر ہے، اور اسی کے سایہ میں انسانیت کو راحت، اطمینان اور آسودگی مل سکتی ہے، محمد عربی (ہمارے ماں باپ اور جان و مال حضور ؐ پر قربان ہوں) کے اخلاق کے آبِ حیات نے اس شجرِ طیبہ کی آبیاری کی ہے، اس لئے اس پر زمانہ کی خزاں کا زور نہیں چل سکتا، جو اس سدا بہار درخت کے سایہ میں آگیا، اُس کو دارین کے فوز و فلاح کی بشارت!

یہاں تو زندگی ہی زندگی محسوس ہوتی ہے

حرفِ آخر

بات "خیر و شر" سے چلی تھی، اس کی تفصیل پھیلتی چلی گئی، حق کی وسعت کی کوئی حد و انتہا نہیں، ہزاروں اور لاکھوں صفحات پر بھی سچائی کی ایک جھلک کو محصور و مرقوم کردیا جائے تو بھی دل چاہے گا کہ یہ سلسلہ دراز تر ہوتا چلا جائے

من از ذوقِ حضوری طول دادم داستانے را

ہوا و ہوس کی باتوں میں جب لذت ملتی ہے اور نفس کا تقاضا ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ چلتا ہی رہے ———— تو حق کی لذت

کا کیا پوچھنا! اور حق کی لذت تو اللہ کے ذکر اور سچائی کے بیان ہی میں ملتی ہے، جو دل اس لذت سے آشنا ہو گیا، اس کو پھر کسی اور چیز میں لذت نہیں آتی، یا یوں کہیے کہ وہ اس لذت پر تمام دوسری لذتوں کو قربان کر دیتا ہے۔

سلسلۂ کلام کے آغاز میں کہا گیا تھا کہ "خیر و شر" میں امتیاز کرنا، یہ ہے انسانیت کا سب سے بڑا شرف اور انسان کا فریضۂ اولین جس نے اس فریضہ کو ادا نہیں کیا، اس نے انسانی مجد و شرف کو خاک میں ملا دیا ——— اس حقیقت پر کسی دلیل کے لانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس دنیا میں "شیطان" نے خیر کے مقابلہ میں "شر" پھیلانے کی مہم شروع کر رکھی ہے! اس کی ساری تگ و دو کا ماحصل یہی ہے کہ خیر پر شر کو غلبہ حاصل ہو، نیکیوں پر اللہ کی زمین تنگ ہو جائے اور بُرائیوں کے لئے زمین کو زیادہ سے زیادہ وسعت نصیب ہو!

آج کی دُنیا میں شر و فساد، بداعمالیوں اور برائیوں کو پاؤں پھیلانے اور غلبہ پانے کا جتنا زرین موقعہ ملا ہے ایسا موقعہ تاریخ کے کسی دور میں شاید کبھی نہیں ملا، دنیا کا معاشی کاروبار آج بڑی حد تک سُود پر قائم ہے، اور سُود اتنا بڑا "شر" ہے جس کی اخلاقی مضرتوں کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا، جو لوگ سُود نہ لیتے ہیں اور نہ دیتے ہیں، اُن تک بھی اس آتش خبیثہ کا دُھواں تو کسی نہ کسی طرح پہنچ ہی جاتا ہے ——— شراب جسے "اُم الخبائث" کہا گیا ہے، وہ یورپ میں پانی کی طرح پی جا رہی ہے، اور مشرق بھی اس خباثت میں آلودہ ہوتا جا رہا ہے ——— قماربازی نے فیشن کی صورت اختیار کر لی ہے، ریس کورس سے لے کر کلب گھروں تک جوئے کا دور دورہ ہے ——— مرد و زن کے بیباکانہ اختلاط نے معاشرے کو جس قدر ذلیل، پست اور گندہ کر رکھا ہے، اُس پر خون کے آنسو بہانے کو جی چاہتا ہے، دورِ جاہلیت میں بھی عورت کو یہ ذلت نصیب نہیں ہوئی، جو اس تہذیب و تمدن کے دور میں اُسے میسر آئی ہے ——— غرض نفس کو فربہ اور سرکش بنانے کے جتنے محرکات ممکن ہو سکتے ہیں وہ اس زمانہ میں پائے جاتے ہیں، یہ پوری تہذیب خدا ناشناسی اور آخرت فراموشی کی راہ پر گامزن ہے! انسانی شرف اور عصمت و آبرو کا چوراہوں پر نیلام ہوتا ہے!

شرورِ انفس و آفاق کے اس ماحول میں انسان خدا کو بھولتا جا رہا ہے، جو لوگ خدا کو مانتے ہیں وہ بندگی کے فرض سے غافل ہیں، اُن کو اس کا بہت ہی کم احساس ہوتا ہے کہ ہم جس کی بندگی کا اقرار کرتے ہیں، اس نے ہم پر کچھ ذمہ داریاں اور فرائض بھی عائد کئے ہیں؛ اگر واقعی کئے ہیں تو ہم اُن کو کس حد تک ادا کر رہے ہیں، ایک غفلت و سرشاری ہے جو ہر طرف چھائی ہوئی ہے۔

آج کی دنیا میں مردِ مومن کی "امامت" و "قیادت" کی جتنی شدید ضرورت محسوس ہو رہی ہے، اتنی ضرورت شاید کسی دوسرے دور میں محسوس نہ کی گئی ہو، اس لئے کہ "خیر و شر" میں امتیاز کر کے خیر کو پھیلانا، شر کو روکنا، اور حق کو قائم کرنا اس کے فرائض میں داخل ہے بلکہ اس ڈیوٹی پر اُسے مامور کیا گیا ہے، دنیا میں "خیر" کو مسلمان کی ذات سے پہچانا جانا چاہئیے۔ وہ دنیا میں اللہ کی آیت اور خیر کی علامت ہوتا ہے، دنیا اس سے اشاعت خیر اور دفع شر کی توقع رکھتی ہے، جب دُنیا اندھیرے میں ہو، تو مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ شمع ہدایت لے کر آگے بڑھے اور اندھیرے میں حیران و پریشان لوگوں کو راستہ دکھائے!

مسلمانوں کے ہر جگہ ایک سے حالات نہیں ہیں، جہاں وہ خود مظلوم، مجبور اور مقہور رہیں وہاں، انھیں اپنی بے سر و سامانیوں ہی میں اعلاء کلمۃ الحق کے لئے سرد برگ پیدا کرنے ہونگے، اقامت دین کے کاموں میں معذرت کرنے کا تو کوئی موقعہ ہی نہیں، جس سے جو کچھ ہو سکے، اس سے دریغ نہ کرے، جہاں دینی جدوجہد کے لئے میدان تنگ ہو، وہاں کسی کو اللہ کے کلام کے دو بول سکھا دینا ہی بہت بڑی بات ہے۔ دامے، درمے، قدمے، سخنے کچھ نہ کچھ کرتے ضرور رہنا چاہیئے۔ جس کے دل میں اسلام کی لگن ہو گی وہ کال کوٹھری میں بھی تبلیغ حق کے لئے گنجائش پیدا کر لے گا۔

مگر

جہاں مسلمانوں کو اللہ کے فضل سے اختیار و اقتدار حاصل ہو، وہاں تو انہیں اللہ کے دین کو غالب بنانے کے لئے ہی جدوجہد کرنی

ہے، ساری قوتیں اسی مقصد عظیم میں لگا دینے کی ضرورت ہے۔

دنیا کتابوں کے اوراق کے بجائے، محسوس و مشہود طور پر ایک ایسی "مثالی حکومت" کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی ہے، جو خلافت راشدہ کی تاریخ کو دہرا دے، جہاں نیکیاں سبزے کی طرح اگتی ہوں اور ہر طرف اخلاق کی چاندنی پھیلی ہوئی ہو اور

اگر یہ نہیں تو بابا! پھر سب کہانیاں ہیں

کس قدر مبارک ہے وہ "اقتدار" جو اللہ کی راہ میں صرف ہو، اور کتنا خوش قسمت ہے وہ "صاحب اقتدار" جس کے قدم اقامت دین کے راستہ میں غبار آلود ہوں!

ماہر القادری

اہلِ ہند کو سب سے پہلے کس نے اسلام سے روشناس کیا

ڈاکٹر محمد احمد صدیقی (ڈی۔فل، فاضل، کامل) استاد شعبہ عربی و فارسی یونیورسٹی الہ آباد

مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عربوں اور بھارت باسیوں کے تعلقات بہت قدیم ہیں عرب کا انحصار ہی تجارت پر تھا اور ہندوستان تمدن و تہذیب کا سرچشمہ اور قسم قسم کے تجارتی مال کی بہت بڑی منڈی تھا۔ چنانچہ قدیم تواریخ سے پتہ چلتا ہے کہ عرب کے تاجر کشتیوں کے ذریعہ ہندوستانی مال برآمد کر کے یمن کے ساحلوں سے شام جاتے جہاں سے مصر اور یورپ تک ہندوستانی مال بکثرت بکنے جایا کرتا (فتوح البلدان)

۳۰۰۰ ق م عرب تاجر جن کو کنعانی اور آرامی کہا جاتا ہے ماہر جہاز راں تھے بحر ہند کے رہنے والے تھے شام میں آباد ہو گئے تھے بحر روم کے کنارے کنارے یونان پہنچتے اور وہاں سے یورپ جاتے اسی طرح ایران اور ہندوستان سے ہو کر چین جایا کرتے تھے۔

۲۰۰۰ ق۔م یمن کی قوم سبا نے بھی ہندوستان سے تجارتی تعلقات کو مضبوط کیا تھا مورخ جرجی زیدان نے لکھا ہے کہ ملیبار کے قریب سپارا مقام سے عہد سلیمانؑ میں جن کا زمانہ ۹۵۰ ق۔م ہے فلسطین سے تجارت ہوتی اسی طرح ہندوستانی ململ چھینٹ اور رومال وغیرہ عرب میں مقبول تھے جن کا ذکر عربی اشعار میں ملتا ہے ان تجارتی تعلقات کے علاوہ علمی تعلقات بھی قدیم زمانے سے ہیں چنانچہ ۸۰۰ ق م میں عربوں نے ہندوستان کو لکھنا سکھایا تھا۔ خاندان موریہ اندھر کے تمام کتبات آرامی یعنی عربی طرز میں لکھے ہیں جب بھی آرامی طرز پڑھا جاتا ہے اشوک کے کتبات بھی داہنے طرف سے لکھے ہوئے ہیں (اسلام کامل)

ہندوستان میں عربی بھی اسی وقت سے رائج تھی۔ حضرت مسیح سے سات سو برس پہلے جب کہ پانڈوں کی بڑی ہوئی قوتوں سے دبی ہوئی کوروں نے لاکھ کا گھر بنا کر جب پانڈوں کو جلا دینا چاہا تو ودر جی نے عربی زبان میں اس راز سے ان کو آگاہ کیا اور یدھشٹر نے بھی عربی زبان میں اس کا جواب دیا۔ (دیکھو ستیارتھ پرکاش ذکر مہابھارت؛ اسلام کامل) اور بقول فضل باشہ لطف اللہ فریدی عرب تاجر کی ایک جماعت مقام ..... چول Chaul کلیان Kalyan اور سپارا Supara میں مقیم ہو گئی تھی اور اگاتھرسائڈ Agathurcide کے زمانہ میں ملابار ساحل پر اتنے عرب تاجر مقیم تھے کہ ان سے متاثر ہو کر بہت سے مقامی لوگوں نے ان کا مذہب اختیار کر لیا تھا (بمبئی گزیٹیر) اسی طرح اسلام سے پہلے اہل ہند بھی عرب جایا کرتے تھے۔ چنانچہ عرب مورخین لکھتے ہیں کہ پانچویں صدی اور چھٹی صدی عیسوی میں ہند اور چین سے بہت سے ملاح عرب آتے تھے جن کو شہری لوگ اپنے اپنے گھروں سے دیکھتے تھے تاریخ ابن جریر طبری میں مذکور ہے کہ ایک ہندوستانی بیڑا اواخر حکومت ساسانیہ میں دریائے دجلہ سے ابلہ Oballa تک داخل ہو جو بصرہ کے قریب دجلہ اور فرات کے سنگم پر واقع ہے اس طرح عرب و ہند کے تعلقات زمانہ قدیم سے ہیں۔ یہ سلسلہ ظہور اسلام کے بعد بھی قائم رہا بلکہ مستحکم ہو گیا بغداد میں ایک پورا ڈیپارٹمنٹ ہندی سے عربی میں علوم اور فنون منتقل کرنے کے لئے قائم کیا گیا اور حکیم منک پنڈت۔ بھیم۔ کلپ۔ سندباد۔ ۔ ۔ اور ابن بہلا اور گنگا وغیرہ، مشاہیر ہندی ادیب فلاسفر، اس ڈیپارٹمنٹ کے انچارج اور افسر مقرر ہوئے انہیں تعلقات کی وجہ سے جاٹ اور میڈ قومیں جو ہندو تھیں اور ایرانی فوج میں تھیں ایرانی فوج کے شکست کھاتے ہی محسن اسلام کو دیکھ کر بخوشی مسلمان ہو کر عربوں میں مل گئیں۔ عرب و ہند کے تعلقات کی وجہ کچھ حاکمانہ جور و ستم نہ تھی جیسا کہ بعض یورپین مورخین نے غلط بیانی کی ہے سر تھامس آرنلڈ کا قول

سے کچھ لوگ بنگال ہوتے ہوئے چین آسام چلے جاتے اور کچھ لوگ مالدیپ لنکا دیپ چلے جاتے یہی وجہ ہے کہ یہی مقامات اسلامی مراکز بن گئے اور بقول ہندی مورخ ڈاکٹر تارا چند یہ تجار عرب ہند میں بحر احمر کے راستے سے یا سواحل جنوبیہ سے آتے اور ان کا مطمح نظر بحر سندھ کا دہانہ خلیج کیمبے یا ملابار کے کنارے ہوتے تھے ان سے پھر کولم یا دوسرے بندرگاہ چلے جاتے تھے اور جو کشتیاں خلیج فارس سے آتیں وہ بھی کولم یا ملابار پہنچ جاتیں چنانچہ اکثر مورخین کا خیال ہے کہ یہی تجار عرب ہند میں اسلام کے پہلے مبلغ ہیں اور انہیں کے ذریعہ اسلام سب سے پہلے ہندوستان کے علاقہ ملابار میں آیا۔ صاحب تاریخ فرشتہ نے بہ سند تحفۃ المجاہدین ملابار کے راجہ کے اسلام لانے کی دو روایتیں لکھی ہیں جس کو ہم نے صحیح ترمانا ہے اور جس کا ذکر مسٹر آرنلڈ نے اپنی کتاب Preaching of Islam میں بھی کیا ہے۔ بلکہ یہ بھی بتلایا ہے کہ موپلا کا نام ہر دلعزیز خیال اسی روایت کے مطابق ہے اور یہی کو مسٹر ٹائٹس Titus نے اپنی کتاب Quest of India میں بھی کیا ہے وہ یہ ہے کہ معجزہ شق القمر یہاں کے راجہ حیرت تک پیرومل نے خود اپنی آنکھ سے دیکھا اور پھر تحقیق سے اس کو معلوم ہوا کہ یہ عرب کے نبی کا معجزہ ہے جس کا نام محمد ہے تو وہ سامری راجہ عرب گیا نبی کریم کے پاس پہنچا اس وقت نبی مکہ میں تھے مدینہ کو ہجرت نہیں کی تھی۔ (ٹائٹس Quest of India Titus) وہاں یہ مسلمان ہو گیا پھر آپ سے اجازت لے کر وطن واپس ہوا راستے میں مقام ظفار میں انتقال کر گیا وہیں اس کی قبر ہے۔ جو زیارت گاہ عوام ہے! اسی سامری راجہ نے اپنی موت سے پہلے اپنے ساتھیوں میں سے شرف بن مالک، مالک بن حبیب اور مالک بن دینار کو ہندوستان بھیجا کہ ملابار جا کر اسلام کا پرچار کریں اور پوشیدہ طور سے ان کو ہدایت کی کہ ان کو اس کی موت کی خبر نہ دیں اور حاکم ملابار کو خط لکھا کہ یہ لوگ ملابار جا رہے ہیں ان کی پوری مدارات کرنا جہاں یہ رہنا چاہیں رہنے دینا اور مسجد بنائیں تو زمین دینا جب یہ رفقا ملابار آئے تو خط دیا حاکم ملابار سامری راجہ کا خط پہچان کر بے حد خوش ہوا اور اس کا حال پوچھا ان لوگوں نے جواب دیا کہ جب ہم لوگ کشتی میں سوار ہوئے تو بندرگاہ شجر میں انھوں نے خط دیا تھا اور کہا تھا کہ حاکم ملابار کو دیدینا اس سے زیادہ ہم لوگ کچھ نہیں جانتے ورنہ ہندی لوگ سمجھتے تھے کہ سامری راجہ عرب سے آسمان چلا گیا ہے وہ لوٹے گا۔ لہٰذا اب تک ملاباری اسی راجہ کی یاد میں جب زمورن راجہ کو تاج پہناتے ہیں تو راجہ کے سر پر مسلمان موپلا ہی اپنے ہاتھ سے تاج رکھتا ہے۔ اور راجہ مسلمانوں کا لباس پہنتا ہے اور یہ نیا راجہ اعتقاد رکھتا ہے کہ وہ سامری راجہ کا نائب اور قائم مقام ہے۔ ورنہ اس کی عرب سے واپسی کا منتظر رہتا ہے۔ اور راجہ ٹراونکور بھی جب تاج پہنتا ہے اور تلوار لیتا ہے تو کہتا ہے کہ یہ تلوار میرے پاس صرف اس وقت تک کے لیے ہے جب تک کہ میرا چچا سامری عرب سے واپس آئے (ڈاکٹر تارا چند کی کتاب Influence of Islam on Indian) بہر حال خط پڑھ کر راجہ ملابار نے ان مسلمانوں کی بڑی آؤ بھگت کی اور انہیں نے اسلام خوب پھیلایا اور بقول Brigg ان لوگوں نے مسجدیں بنوائیں، مسجدوں میں مبلغ مقرر کئے اور بہت سے مقامات میں اسلام کی نشر و اشاعت کی۔

صاحب تاریخ فرشتہ کی دوسری روایت یہ ہے کہ دوسری صدی ہجری کے بعد مسلمانوں کی ایک جماعت ملابار آئی یہ لوگ زیارت نقش قدم آدم کے لئے سرندیپ جا رہے تھے لیکن کرنگانور پہنچ گئے، وہاں کے حاکم سے اس نے اس کا مذہب دریافت کیا انھوں نے اسلام بتایا اور معجزہ شق القمر کا ذکر کیا راجہ نے اپنے اہل دیوان سے کسی ایسے واقعہ کی تحریر کے متعلق دریافت کیا انھوں نے تصدیق کی تو راجہ مسلمان ہوا اور عرب گیا واپسی میں انتقال کر گیا قبر ظفار میں ہے۔ اور اس پر ۲۱۶ھ کندہ ہے لیکن ہندوستان کے مورخ ڈاکٹر تارا چند نے اپنی مذکورہ بالا کتاب میں اتنا اور اضافہ کیا کہ اس راجہ نے یہ معجزہ خواب میں دیکھا اور زکی الدین (Sekkeudinnes) مع اپنے رفقا شرف بن مالک اور مالک بن دینار کے زیارت نقش قدم آدم کے لئے لنکا جا رہے تھے کہ ملابار پہنچ گئے راجہ نے خواب سنایا انھوں نے اس کی تعبیر بتائی راجہ مسلمان ہوا اور انہیں کے ساتھ لنکا سے واپسی کے بعد عرب گیا اور واپسی میں ظفار میں انتقال کر گیا۔ انہیں زکی الدین نے ان کا نام عبدالرحمٰن سامری رکھا مرنے سے پہلے اس نے انہیں رفقا کو ملابار موصوفہ کے بھیجا جس کا ذکر گذر چکا اور پھر اسلام پھیلا لیکن بعض مورخین کا خیال ہے کہ یہاں اسلام کی ابتدا ان سے نہیں ہوئی بلکہ ان تاجروں سے ہوئی

جو عراق سے بھاگ کر یہاں پناہ گزین ہوئے جنکی اولاد موپلا ہے۔ بہر حال تو تاریخ شاہد ہیں کہ سامری راجہ مسلمان ہوا اور عرب گیا اگرچہ اس کے اسلام لانے
کی تاریخ میں اختلاف ہے Imperial gazetteer میں لکھا ہے کہ ملابار کا پہلا آدمی جس کا نام چیرومن پیرومل تھا یہ چیر کے حاکموں کا آخیر
بادشاہ تھا یہ تخت چھوڑ کر قبول اسلام کے لئے مکہ پہنچا۔ موجودہ تحقیقات سے پتہ چلا کہ اس کی قبر ساحل سبحانی Sabhani میں ہے وہیں
جو تاریخ معلوم ہوئی ہے وہ ۲۱۲ھ ہے اس کی موت ۲۱۶ھ میں ہوئی اس کی روانگی کی صحیح تاریخ ۲۵ اگست ۸۲۵ء ہے جو Kollam era
کا پہلا دن ہے۔ ڈاکٹر تاراچند نے بھی بحوالہ " [illegible] " پیرومل چیرومل کے اسلام لانے کا زمانہ نویں صدی لکھا ہے۔ اگرچہ ان کو اس قصہ میں شبہ
معلوم ہوتا ہے ایک تو وہ اس قصہ کو خواب ہی سمجھتے ہیں دوسرے ناموں سے نتیجہ نکالتے ہیں کہ لفظ دین کا استعمال مسلمانوں میں پانچویں صدی ہجری
میں ہوا لہٰذا زکی الدین صاحب جنھوں نے ان کی روایت کے مطابق راجہ کو مسلمان کیا تھا دوسری صدی میں ہونا مشکوک ہے ڈاکٹر تاراچند کا خیال
لفظ دین کے استعمال کا پانچویں صدی میں ہونا صحیح نہیں معلوم ہوتا اس لئے کہ یہ لفظ خود قرآن میں موجود ہے جس کو ہر مسلمان جانتا ہے "لکم دینکم
ولی دین" ہاں اس دین کے لفظ کی ترکیب اسماء کے ساتھ کب سے وجود میں آئی قابل غور ہے۔ تیسرے تاراچند صاحب فرماتے ہیں کہ چیرومل
پیرومل تو صرف ٹائیٹل ہے راجہ کا نام نہیں ہے حالانکہ Imperial gazetteer میں چیر کے حاکموں کے اخیر بادشاہ کا
نام لکھا ہے۔ بہرحال یہ اس تنقید کے باوجود تاریخی واقعات کا وہ قطعی انکار نہیں کرتے اور راجہ کے اسلام کا ذکر کرتے ہیں۔ آرنلڈ صاحب نے
اپنی کتاب تبلیغ اسلام میں تاریخ فرشتہ کی کسی ایک روایت کو ترجیح نہیں دی بلکہ لکھا کہ تاریخی حیثیت سے کسی کی بھی سند نہیں ملتی حتیٰ کہ موپلا کے
اس خیال کی بھی کہ راجہ سامری جس کا نام عبدالرحمٰن رکھا گیا اس کی قبر ظفار میں ہے مگر یہ بھی راجہ کے اسلام کے واقعہ کو لکھتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ
موپلا کا عام ہر دلعزیز خیال یہی ہے کہ یہ واقعہ عہد نبوی کا ہے اسی کو ٹائیٹس نے Quest of India میں بھی نقل کیا ہے مزید برآں ان
دونوں مورخین نے لکھا ہے کہ ملابار سے اسلام مالدیپ گیا اور لنکا دیپ گیا اگر یہ صحیح ہے تو ظاہر ہے کہ مالدیپ میں مسلمان پہلی صدی ہجری کے ابتدائی
زمانہ میں ملتے ہیں وہاں کا راجہ بقول صاحب تاریخ فرشتہ [illegible]ھ میں مسلمان ہو چکا تھا تو اس سے فرشتہ کی پہلی روایت ہی کی یعنی عہد نبوی
میں راجہ کے ایمان لانے کی تائید ہوتی ہے کیونکہ ان تاریخوں سے پہلے ملابار میں کسی عرب تاجر کے اسلام کے پرچار کرنے کا پتہ نہیں چلتا۔ پھر سرندیپ
کے راجہ نے پہلی صدی ہجری ہی میں مسلمان عورتوں کو جہاز کے ذریعہ عراق بھیجا جو ان مسلم تاجروں کی بیویاں اور لڑکیاں تھیں جو یہاں مقیم تھے
اور وفات پا چکے تھے ظاہر ہے کہ اس واقعہ سے بھی پہلے اسلام ملابار میں آچکا ہوگا۔ لہٰذا یہ واقعہ بھی فرشتہ کی پہلی ہی روایت کی مؤید ہے پھر
ملابار میں اسلام کا بہت پہلے ہونا اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہاں Coldwell نے [illegible]ھ کے مسلمان سکے برآمد کئے اسلامی
سکہ کا پہلی ہی صدی میں ملابار میں ملنا بتاتا ہے کہ یہاں پہلی صدی کے ابتدائی و اوسط زمانہ میں مسلمان موجود تھے جن کا سکہ بھی رائج تھا جب
تو ان کے سکے برآمد ہوئے یہ بھی یہاں کے راجہ کی عہد نبوی میں ہی اسلام لانے کی تائید کرتا ہے درہ خیبر سے مہلب بن ابی صفرہ ۴۳ھ میں....
ہندوستان آئے اور بہت لوگوں کو مسلمان کیا اگر اسلام سب سے پہلے ملابار آیا جیسا کہ اکثر مورخین کا خیال ہے تو ظاہر ہے کہ ۴۳ھ سے پہلے یہاں
مسلم رہے ہونگے یہ بھی فرشتہ کی پہلی ہی روایت کی مؤید ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے مسلم تاجر کا یہاں آنا اور اسلام کی تبلیغ کرنا تاریخ سے ثابت نہیں
بہرحال جن لوگوں نے راجہ ملابار کے اسلام لانے کو عہد نبوی کا زمانہ بتایا ہے ان کے خیال کے مطابق ہندوستان میں سب سے پہلے اسلام کا
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزہ شق القمر سے پھیلا اور حضور ہی کے دست اقدس پر راجہ نے اسلام قبول کیا —— پھر
وہ راجہ مبلغ اسلام ہے جس نے عرب کے رفقاء کو بھیج کر اسلام کی تبلیغ کی۔

میرا ذاتی خیال ان حضرات کے ساتھ ہے جنھوں نے راجہ کے اسلام لانے کا زمانہ عہد نبوی نہیں مانا ہے اور وہ اس لئے کہ جس زمانہ میں اسلام
مکہ میں ظاہر ہوا تو جو حضرات دوسرے شہروں سے اشاعت اسلام کرنے آئے ان کا ذکر قرآن کریم نے کیا یا روایات صحابہ میں جیسے سات آدمی جو

نجاشی کے تھے اور حبشہ سے نبی کے پاس گئے ان کا ذکر قرآن میں یوں ہے " واذا سمعوا ما انزل الآیہ " اور سلمان فارسی کا قصہ صحابہ روایت کرتے ہیں اگر نبی کریم کے زمانہ میں ملابار کا راجہ آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لئے ہندوستان سے مکہ جاتا تو صحابہ اس اہم بالشان واقعہ کو ضرور ذکر کرتے کیونکہ یہ ایک جلیل القدر ہندوستان کا راجہ تھا اس کا اسلام کے لئے مکہ جانا ہرگز ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا ظاہر ہے کہ ہندوستان اور چین میں لوگوں کا اعتقاد تھا دنیا کے سب سے بڑے بادشاہ چار ہیں اور ان میں سب سے بڑا شاہ عرب ہے۔ (خلیفہ بغداد) دوسرا چین کا خاقان۔ تیسرا قیصر روم اور چوتھا ہندوستان کا راجہ بلہرا۔ تو ظاہر ہے کہ ہند کے راجگان میں سے کسی کا عرب اسلام کے لئے جانا کتنا اہم بالشان واقعہ ہو سکتا ہے جو ہرگز نظر انداز نہیں ہو سکتا تھا اور مسلم تجار کے متعلق یہ کہنا جیسا اکثر مورخین نے لکھا ہے کہ یہ لوگ اولین مبلغ اسلام ہیں تاریخی حیثیت سے مستند نہیں معلوم ہوتا اس لئے کہ ان کے ابتداءً آنے کی صحیح تاریخ کا ثبوت نہیں، اور جو ملتا ہے ان سے پہلے مسلمان آچکے تھے۔ آیا یہ تجار خلافت عمر رض سے پہلے آئے تو ہرگز صحیح نہیں اس لئے کہ صحابہ عہد نبوی میں مکہ سے نکل نہیں سکتے تھے اور صرف حبشہ کی طرف ہجرت کی پھر مدینہ کی طرف پھر ان کو عرب سے باہر ہندوستان آنے کا امکان کہاں قریش کی جنگ کی وجہ سے اور دوسرے قبائل کے عناد کی وجہ سے اور غزوات میں مشغولیت کی وجہ سے۔ اور ان کا آنا ابو بکر رض کے خلافت کے زمانہ میں بھی ممکن نہ تھا فتنہ ارتداد اور مختلف غزوات کی وجہ سے اگر یہ لوگ عہد نبوی میں تبلیغ اسلام کے لئے ہند گئے ہوتے تو ضرور ان کا ذکر صحابہ کرام کرتے۔ لہٰذا مبلغ اسلام اولاً یہ تجار نہیں ہو سکتے۔ ہاں یہ لوگ ناشرین اسلام کہے جا سکتے ہیں۔

دوسرے مورخین کی جماعت مثلاً بزرگ شہریار نے عجائب الہند میں لکھا کہ اسلام سب سے پہلے سرندیپ میں آیا اور ملابار میں اس کے بعد پہنچا۔ سرندیپ کے لوگ بدھ مذہب کے پیرو تھے جب یہاں کے راجہ نے نبی کریم کی بعثت کا حال سنا تو اس نے ایک عاقل آدمی کو تحقیق کے لئے عرب بھیجا یہ حضرت عمر رض کا زمانہ تھا۔ حضرت عمر رض نے نبی کریم اور ابو بکر صدیق رض کے حالات بتائے وہ سن کر واپس چلے تو مکران میں ان کا انتقال ہو گیا ان کے ساتھ ایک غلام تھا وہ صحیح سلامت واپس آگیا اس نے سب حال بتایا یہاں کے بدھ مذہب والے بہت متاثر ہوئے اور مسلمانوں سے حد درجہ محبت ان کو ہو گئی۔ اس طرح اس غلام نے صحیح معنوں میں یہاں اسلام کی تبلیغ کی (ان اللہ قد یوید الدین برجل فاسق) یہاں بھی راجہ کو اسلام کی خبر پہنچانے والے تاجر نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ عہد عمر رض سے پہلے تاجر کا عرب سے اسلام کا پرچار کرنے کے لئے آنا ثابت نہیں۔ Roulandson مسٹر رولینڈسن فرماتے ہیں مسلم عرب پہلے پہل ساحل ملابار میں مقیم ہوئے ساتویں صدی کے اخیر میں فرانسس ڈے .... Francis day بھی اس کی تائید کرتے ہیں اور مسٹر اسٹرک نے Struock جہاں موپلا کا ذکر کیا ہے وہ بھی اس کی تائید کرتے ہیں عرب مورخین بھی اس کے موید ہیں۔ اور یہ زمانہ حضرت عمر رض کے بعد کا زمانہ ہے لہٰذا حضرت عمر رض کے زمانہ کے اسلام کی تبلیغ کرنے والوں کو شرف اولیت حاصل ہوگا نہ کہ ان تجار کو۔ یہاں پر راجہ نے یا تو یہود و نصاریٰ سے سنا یا جو کہ زیادہ قرین قیاس ہے حضرت عمر رض کے زمانہ میں صحابہ کرام نے یہاں اسلام کی جو تبلیغ کی، اس کی خبر ان لوگوں کو پہنچی، تو پھر یہاں ہند میں یا اہل ہند کو سب سے پہلے کس نے اسلام سے روشناس کیا اس کا ذکر آگے آتا ہے۔

دوسرا راستہ جہاں سے مسلمان آئے وہ درہ خیبر تھا اس راستہ کے ۴۴ھ میں مہلب بن ابی صفرہ سب سے پہلے ہندوستان پر حملہ آور ہوئے ملک قیقان (قلات) تک گئے مال غنیمت میں جو گھوڑے تھے ان کے ایال کٹے ہوئے تھے ان کو پسند آئے حکم دیا کہ لشکر کے گھوڑے اسی طرح کر دیئے جائیں کیونکہ اس زمانے میں عرب والے ایال نہ کاٹتے تھے۔

تیسرا راستہ جدھر سے مسلمان آئے وہ بری راستہ تھا اس راستہ سے بلوچستان ہوتے ہوئے مکران اور سندھ میں آئے مکران پر اسلام سے پہلے راجہ چچ ہندی راجہ کا قبضہ تھا جو حدود سندھ میں داخل تھا فارس اور ہند کی بری و بحری حدود بنی ہوئی ہیں لہٰذا سندھی قول میں

فارس کی فوج میں کام کرتی تھیں جنہیں تین سندھی قوموں کا نام تاریخ میں ملتا ہے۔ ۱۔ اساورہ ۔ ۲۔ سیابجہ ۔ ۳:۔ جاٹ ۔ بہرحال سب سے پہلے انہیں قوموں میں اسلام آیا جاٹ قوم کی صورت شکل کے آدمی کو حضرت عبداللہ بن مسعود متوفی ۳۲ھ نے کوفہ میں دیکھ کر فرمایا "کانہم زط" یہ قومیں فارس کے بادشاہ یزدجرد کی فوج میں تھیں ابوموسیٰ اشعری رض قائد لشکر تھے فارسیوں کی جنگ میں۔ اسی جنگ میں اشعری رضہ نے بمشورہ عمر ساداورہ قوموں کی شرائط مان لیں۔ یہ لوگ مسلمانوں سے مل گئے اور فوراً بعد سیابجہ بھی مسلمان ہو گئے۔ اور عرب قبائل کے ساتھ عراق میں مقیم ہو گئے۔ یہ سندھی قوم کا اسلام میں داخل ہونے کا پہلا موقع تھا پھر بہت سے سواحل کے لوگ مسلمان ہوئے حضرت علی نے جاٹوں کو بصرہ میں حاکم خزانہ بنایا (طبری) بصرہ کی فوج کا قائد ابوسلمہ، جاٹ فوج کا تھا۔ امیر معاویہ جاٹوں کو عراق سے شام لے گئے تاکہ روم کے مقابلہ میں اسلام کی جانب سے لڑیں، پھر عبدالملک نے انطاکیہ میں انہیں بسایا انہیں "زطوں" میں سے ہمارے امام اعظم ابوحنیفہ پیدا ہوئے جو اسلام کیلئے باعث فخر ہیں۔ یہ بہترین مثال دنیا کے سامنے اسلامی اخوت ومساوات وعدل وانصاف کی کہ ایک "زط" اسلامی دنیا میں اتنا وقیع مرتبہ حاصل کرتا ہے کہ اس کا لقب امام اعظم ہو جائے ان کی پیدائش ۸۰ھ میں ہوئی اس سے پتہ چلا یہ قوم فتح سندھ کے بہت پہلے اسلام لائی، دور عمر رض کے زمانہ میں اسلام لائی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہندوستان کی قوم حضرت عمر رض کے ہی زمانہ میں مسلمان ہو گئی تھی اور یہ ہرگز ممکن نہ تھا بخصوص حضرت عمر رض کے زمانے میں اشعری رض کسی قوم سے بھی بغیر اسلام پیش کئے ہوئے لڑے ہونگے کیونکہ یہ اسلامی اصول ہے پہلے اسلام پیش کیا جائے پھر جزیہ طلب کیا جائے اس کے بعد جنگ کی جائے ہی وجہ سے ایران کے آتش کدے بعد قبول جزیہ محفوظ رہے عیسائیوں کے کنائس مامون رہے کسی نے مزاحمت نہ کی یورپین مورخین آرنلڈ کارلائل وغیرہ سب شاہد ہیں نیز ہندی مورخ تاراچند یہاں پر زور الفاظ میں اپنی کتاب میں اس کی تائید کرتے ہیں تو بھلا اس جنگ میں اسلام نہ پیش کیا گیا ہو اور پھر حضرت عمر رض کے زمانہ میں اور ایسے جلیل القدر صحابی سے اصول اسلام سے تجاوز ناممکن تھا لہذا ظاہر ہے کہ ان جاٹ قوموں میں اسلام کا تعارف بطریق احسن ہوا جو ایمان لائے وہ تو مسلمان ہوئے جو نہ لائے وہ بھی اسلام سے خوب واقف ہو گئے جس کا چرچا ہندوستان کے رجواڑوں میں ہونا لابدی تھا۔ لہذا سب سے پہلے اہل ہند کی اساورہ اور جاٹ قوموں میں اسلام کا تعارف کا شرف بالیقین انہیں صحابی رسول ابوموسیٰ اشعری رض کو حاصل ہے۔ ان سے پہلے کسی مسلم تاجر کا ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ کرنا ثابت نہیں بلکہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں لکھا ہے کہ مسلم تجار عرب کے ہندوستان میں ابتداءً آنے کی تاریخ صحیح طور پر معلوم نہیں ہے۔ ہاں تجار عرب اور صوفیائے عجم وعرب یقیناً اسلام کے ترقی دینے والے تھے واشاعت اسلام میں ان کا بہت بڑا ہاتھ ہے لیکن ہم اس تفصیل کو چونکہ ہمارے بحث سے خارج ہے نظرانداز کرتے ہیں اب آخر میں صحابہ کرام کا ہندوستان پر حملہ کرنا قابل ذکر ہے جس پر اکثر یورپین مورخین اور مورخین عرب وہند کا اتفاق ہے۔ نیز بسندہ اس اولوالعزم جماعت کے قدوم میمنت لزوم سے سرزمین ہند بھی محروم نہیں رہی چنانچہ حضرت عمر فاروق رض کے زمانے میں ۱۵ھ میں بحرین کے حاکم حضرت عثمان ابن ابی العاص الثقفی رض نے اپنے چھوٹے بھائی حکم بن ابی العاص (ثقفی) رض کو ہندوستان پر فوج کشی کا حکم دیا۔ حکم رض کا شمار صحابہ کرام میں تھا واسد الغابہ، آپ ایک جماعت کو ساتھ لے کر ہندوستان کی جانب چلے اعلائے کلمۃ اللہ کے نشہ اور تبلیغ دین متین کی لگن نے دشوار گزار راستوں کو آسان کر دیا اور آپ کی جماعت نے جیسے ہی سمندری راستہ طے کر کے خشکی کے راستہ منزل مقصود کو سامنے دیکھا تو خوشی میں "اللہ اکبر" کے نعروں سے ہندوستان کی زمین گونج اٹھی یہ اس سرزمین میں سب سے پہلی ایمانی گونج اور سب سے پہلی توحید حقیقی کی پکار تھی (صحیفہ گجرات) تھانہ و حضرت حکم رض نے دعوت و تبلیغ کے لئے نامزد فرمایا مگر حکمرانوں نے سخت مخالفت کی بہرحال آپ نے اصول اسلام کے مطابق اصول تبلیغ پیش کئے مگر کامیابی کی صورت نظر نہ آئی تو اتمام حجت کے بعد حملہ کر دیا اور نہایت شاندار فتح حاصل ہوئی۔ سرزمین ہند پر یہ سب سے پہلا مسلم حملہ اور سب سے پہلی فتح تھی۔ (فتوح البلدان بلاذری) اس میں بہت

سے صحابہ کرام کو مرتبۂ شہادت بھی نصیب ہوا جو بھروچ اور ممبئی کے درمیان مدفون ہیں۔ کچھ عرصہ تک حضرت حکمؓ اور صحابہ کرامؓ اور دیگر مسلمانوں کی جماعت یہاں کچھ عرصہ مقیم رہی جس سے خیر و برکت کا چشمہ ابل پڑا کتنے ہی لوگ نورِ اسلام سے منور ہو گئے کفر و شرک کے تاریکی سے نکل کر مسلمان ہو گئے۔ (صحیفۂ گجراتؒ) اسی زمانہ میں حضرت مغیرہ بن عاص ثقفی نے دیبل پر حملہ کیا اور کامیاب ہوئے۔ پھر صحابہ کرام نے بھراچ پر حملہ کیا اور کامیاب ہوئے۔ (صحیفۂ گجرات) وہ دعوت و تبلیغ کا اثر نمایاں طور پر ظاہر ہو کر رہا اور توحید کے نغموں سے اجیارو اشیج رنگ مانوس ہو گئے پھر چند مصالح کی وجہ سے صحابہ کرام واپس چلے گئے یہ نا قابل انکار تاریخی واقعات شاہد ہیں کہ جیش ثقفی رضؓ نے سب سے پہلے ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ کی خلاصہ یہ کہ سب سے پہلے ہندوستان میں اسلام کا تعارف کرانے والے صحابہ کرام تھے اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بھی۔

جن میں (۱) جیش ثقفی کے قائد حضرت حکمؓ شرف اولیت و تقدم حاصل ہے ——— یعنی ۱۵ھ میں تھانہ پر حملہ کر کے اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا آغاز کیا

(۲) اور چونکہ اس میں حضرت عمرؓ ہی کے زمانہ میں دوسرے صحابی جنھوں نے ہندوستانی جاٹ قوم کو مسلمان کیا جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے ان کو بھی جیش ثقفی کی طرح اولیت کا شرف حاصل ہے وہ ہیں حضرت موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ۔

ا:۔ کوئی صاحب یہ کہیں کہ ابو موسیٰ اشعری رضؓ ہندوستان کبھی نہ آئے بلکہ یزدجرد کی فوج میں ہندوستانی جاٹ قوم کو مسلمان کیا اس لئے اگرچہ انھوں نے بعض اہل ہند کو مسلمان بنایا، مگر دیکھنا یہ ہے کہ ہندوستان کے اطراف میں آکر کس نے سب سے پہلے اسلام کا پیغام پہنچایا۔ جس کی تاریخی شہادت موجود ہو تو ربیع بن زیاد جنھوں نے اشعری رضؓ کے حکم سے مکران پر قبضہ کر لیا تھا اور ابن عامر اور حکم تغلبی جس نے ۲۳ھ میں راجہ مکران کو جو سندھ کے راجہ کی مدد سے لڑ رہا تھا قتل کر دیا تھا ان حضرات کو ہم چھوڑتے اور نظر انداز کرتے ہوئے

۳:۔ تیسرے صحابی کو پیش کرتے ہیں جس کا نام ہے عبدالرحمٰن بن سمرہ رضؓ۔ جو زرنج اور کش تک گئے خلافت عثمانیہ میں اس کو فتح کر لیا۔ یہ مقامات اس وقت ہند کی حکومت میں تھے پھر رخج اور داون پر حملہ کیا۔ اہل داون جبل زور پر پناہ گزین ہوئے اس پہاڑ پر ایک بت تھا جس کا نام زور تھا اور جس کی وجہ سے وہ جبل زور کہلاتا تھا اس بت کی آنکھیں نکلوائیں جو یاقوت کی تھیں اور ان کے دونوں ہاتھ توڑ دیئے جو سونے کے تھے اور اس مقام کے حکام کو جو اس واقعات کو دیکھ رہے تھے بلا کر کہا کہ زر و یاقوت کو لے جاؤ ہم کو اس کی ضرورت نہیں یہ کام ہم نے صرف اس لئے کیا کہ تم لوگوں کو دکھا دیں کہ یہ صرف بت ہے اس میں کوئی طاقت ضرر رسانی یا نفع بخشی کی نہیں ہے یہ تو بالکل اسلام کا تعارف کراتا ہے اور نا قابل انکار تاریخی واقعہ ہے اس لحاظ سے بھی اس اطراف میں سب سے پہلے معروف اسلام صحابی .... عبدالرحمٰن بن سمرہ رضؓ ہیں اگر یہ کہا جائے کہ انھوں نے سب سے پہلے اسلام کی تبلیغ کی تو ضرور کی۔ مگر یہ ثابت نہ ہو سکا کہ ان کی تبلیغ سے کوئی مسلمان بھی ہوا ——— تو ہم :۔

(۴) ناغر بن دعور اور حارث بن امرہ کو پیش کرتے ہیں یہ عہد مرتضوی یعنی ۳۸ھ میں حملہ آور ہوئے (ابن اثیر) اور اسلام کی فتح و نصرت کا یہ واقعہ رونما ہوا کہ مجاہدین نے لڑتے وقت ایک نعرہ اللہ اکبر کا اس زور سے لگایا کہ قیقانی لوگ تھرا گئے کچھ لوگ بھاگ گئے کچھ مشرف باسلام ہوئے (Elliot بسند چچ نامہ تحفۃ الکرام)

اس لحاظ سے اس اطراف میں سب سے پہلے مسلمان بنانے والے یہ ہیں یہ سارے واقعات محمد بن قاسم کے سندھ فتح کرنے سے بہت پہلے کے ہیں حالانکہ بقول کرنل ٹاڈ (Tod) (Elliot) و بسند فتوح البلدان علامہ بلاذری۔ سندھ حضرت علی رضؓ ہی کے زمانہ میں فتح ہو چکا تھا۔ لیکن ان کی وفات کی خبر سن کر مسلمان واپس ہو گئے ان واقعات کے بہت زمانے بعد محمد بن قاسم آئے اور پھر

لے "صحیفۂ گجرات" اور "اسلام کامل" کا فن تاریخ میں کیا درجہ ہے جنکے حوالے اس مقالہ میں دیئے گئے ہیں (ایڈیٹر)

مسلمانوں کے حملہ ہوتے رہے اور ساتھ ساتھ دعوت و تبلیغ کی برابر کوشش ہوتی رہی عرب کے تاجروں نے بھی تبلیغ کی اور صوفیائے عرب و عجم نے بھی اسلام کو خوب پھیلایا جنکی تفصیل کی اس مختصر مضمون میں گنجائش نہیں بہرحال سب سے پہلے اسلام کا تعارف اہل ہند سے کرانے والے اکثر صحابہ کرام ہیں جو حسب ذیل ہیں :۔

سب سے پہلے مبلغ اسلام فی الہند[1]

(۱) جیش ثقفی رضہ یعنی حضرت حکم رضہ بن العاص ثقفی ۔ و مغیرہ بن العاص ثقفی ۱۵ھ اور (نبی عنہ) ۔ بزمانہ عمرؓ ۔ بمبئی میں تھانہ میں لوگوں کو مسلمان کیا ۔ بھروچ و دیبل کے اشجار و احجار تک توحید کے نغموں سے مانوس ہوگئے ۔

ان کے بعد (۲) ابو موسیٰ اشعری رضہ تقریباً ۲۱ھ ۔ بزمانہ عمر رضہ :۔ ہندوستانی فوج اساورہ اور جاٹ کو مسلمان کیا ۔

ان کے بعد (۳) عبدالرحمٰن بن سمرہ رضہ ۔ تقریباً ۲۹ - ۳۰ھ بزمانہ عثمان رضہ :۔ زرنج اور کش کے درمیان علاقہ پر قابض ہوئے جو اس وقت ہند میں ہے پھر رخج اور داون پر قبضہ کیا اور تبلیغ کیا (داور بت کا قصہ)

انکے بعد (۴) تاغرین وغیرہ بسند ڈلیبیٹ (Elliot) و ابو ظفر ندوی ، یا حارث بن مرہ بسند فتوح البلدان بلاذری ۳۸ھ بزمانہ علی رضہ :۔ کوہستان قیقان پر (نعرہ اللہ اکبر کا قصہ) بہت سے لوگ مسلمان ہوگئے ۔

اس مضمون کی ترتیب و تدوین میں مندرجہ ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا ۔

۱۔ تاریخ طبری — ابن جریر
۲۔ تاریخ کامل — ابن اثیر
۳۔ تاریخ ابی الفداء
۴۔ اسد الغابہ
۵۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام
۶۔ فتوح البلدان — بلاذری
۷۔ تاریخ فرشتہ
۸۔ عرب و ہند کے تعلقات — سید سلیمان ندوی
۹۔ اسلام کامل — عبدالقیوم ندوی
۱۰۔ Preaching of Islam آرنلڈ
۱۱۔ Quest of Islam
۱۲۔ Brigg History of the rise of mohamedan power in Islam
۱۳۔ Elliot History of India
۱۴۔ Influence of Islam on Indian Culture ڈاکٹر تاراچند
۱۲۔ ڈاکٹر تاراچند
۱۵۔ Spirit of Islam
۱۶۔ ترجمہ انگریزی چچ نامہ (Elliot)
۱۷۔ تحفۃ المجاہدین نقلا عن المترجمین
۱۸۔ مروج الذہب — مسعودی
۱۹۔ بمبئی گزیٹیر (Bombay gazetteer)

---

(۱) مورخ مسعودی کی کتاب مروج الذہب ج ۲ ص ۱۰ میں حسب ذیل لکھا ہے: جنگ قادسیہ کے بعد ۱۴ھ میں عتبہ کو حضرت عمر رضہ نے ہند کا گورنر بنایا اور کہا خیال رکھنا یہ کفار کا ملک ہے اسی زمانہ میں ایک فلسفی سے ہند کا حال حضرت عمر رضہ نے پوچھا تو جواب ملا کہ کافر کا ملک ہے مگر کہیں سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ ہندوستان آئے ۔ اس وجہ سے میں نے ان کا اس مقالہ میں ذکر نہیں کیا ۔

ترتیب و تالیف ادارۂ فاران

اردو کی ایک قدیم مثنوی

میرزا سعادت یار خاں رنگین اردو زبان و ادب کے قدیم مشاہیر میں خاصی شہرت رکھتے ہیں، ان کا نام تھا "سعادت یار خاں" چونکہ نسباً مغل تھے اس لئے "میرزا" نام کا جزو بن گیا۔ رنگین تخلص کرتے تھے! ان کے آبا و اجداد کا وطن توران تھا۔ رنگین کے والد ترکِ وطن کر کے ہندوستان آئے۔ اور لاہور میں قیام کیا، یہاں اللہ تعالیٰ نے روزگار کی صورت بھی پیدا کر دی، حسین الملک میر معز خاں بہادر کی سرکار میں ملازم ہو گئے۔ مگر نہ جانے یہاں سے جی اُچاٹ ہو گیا یا اس ملازمت کو نباہ نہ سکے، کچھ دنوں کے بعد لاہور سے دلی چلے گئے۔

رنگین کا مولد و مسکن اور منشاء دلی ہے۔ وہیں ہوش سنبھالا اور پلے بڑھے! شہسواری اور سپہ گری کا کم سنی سے شوق تھا جوان ہو کر ان فنون میں کمال حاصل کیا، رنگین کا جیسا تخلص تھا، ویسا ہی انہوں کا مزاج بھی پایا تھا۔ عیش و راحت کے دلدادہ، اور سیر سپاٹے کے تو رسیا تھے حسنِ اتفاق کا ہی کو کہئے، یہ تو سونے پر سہاگہ ہے اتفاق ہے کہ رنگین کو شہزادوں اور امیروں کی مصاحبت اور درباداری کا ماحول ملا، جہاں انکی رنگین مزاجی نے خوب پر پُرزے نکالے!

مرزا سعادت یار خاں رنگین کے اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ گہرے تعلقات انشاء اللہ خاں انشاء سے تھے۔ انشاء جیسا ذہین اور قلندر صفت شاعر کسی بے ذوق آدمی کا دوست نہیں بن سکتا تھا۔ دوستی کے لئے طبعی مناسبت درکار ہے! ورنہ ایک آدمی سے دوسرے آدمی کی شناسائی اور جان پہچان تو ہو سکتی ہے، مگر یارانہ اور دوستانہ نہیں ہو سکتا —————— رنگین نے خاصی طویل عمر پائی، ۱۲۵۱ھ ہجری میں اللہ کو پیارے ہوئے، اس وقت وہ اسی برس کے ہو چکے تھے۔

رنگین نے دسیوں کتابیں لکھیں، اُن کے مزاج کی رنگینی نے اُن کے ذوقِ شعر و ادب میں بھی تنوع پیدا کر دیا تھا۔ شاعری میں مثنوی کی صنف سے زیادہ لگاؤ تھا۔ مولانا روم، جامی اور میر حسن کی مثنویوں کے طرز پر انھوں نے متعدد مثنویاں کہیں اور کسی کسی جگہ نقل میں اصل کی جھلک پیدا کر دی، ہندوستان کے قدیم شعراء میں امیر خسرو سب سے زیادہ پُر گو گزرے ہیں، پُر گوئی میں خسرو کے بعد بس رنگین ہی کا نمبر آتا ہے۔ رنگین صرف اردو ہی کے شاعر نہ تھے، اُن کی جامعیت اور رنگا رنگی کا یہ عالم تھا کہ فارسی، ترکی، پوربی، برج بھاشا، مارواڑی اور پنجابی زبانوں میں شعر کہتے تھے، اتنی بہت سی زبانوں میں شاید ہی کسی شاعر نے شعر کہے ہوں!

ترکی شاعری کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:-

ساقیہ تنگری اُدچُوں بوزکن ایاغ   او لمسہ ضایع بو کیجہ ماہ تاب

لاے ساقی، خدا کے لئے جام دے   شب ماہ کہیں یونہی رائگاں نہ چلی جائے

رنگین کی غزلوں کے چند شعر قارئین کرام کے نشاطِ طبع کے لئے پیش کئے جاتے ہیں:-

تا حشر رہے یہ داغ دل کا   یارب نہ بجھے چراغ دل کا

پھر خیال اپنے گریباں کی طرف آنے لگا   پھر جنوں کچھ کچھ مجھے تعلیم فرمانے لگا

حقیقت گو مگو ہے دل کی سو دل کی کہوں کس سے   دیا جاتا نہیں اس سے، نہ پھیرا جائے ہے مجھ سے

لاسے میں چھپ کے دیکھوں، بر صدوہ غیر کو دیکھے | بھلا یوں دیکھنا، دیکھو تو دیکھا جائے ہے مجھ سے
جو کیفیت تری آنکھوں میں پائی | نشہ ایسا نہ پیمانے میں دیکھا

مولانا (ملا) عبدالرحمٰن جامی کی اس پرگوئی اور قادرالکلامی کا نگاروں نے خاص طور سے ذکر کیا ہے کہ انھوں نے سات بحروں میں مثنویاں کہی ہیں ورنہ عام طور پر شعراء نے ایک یا زیادہ سے زیادہ دو بحریں اختیار کی ہیں مگر رنگین تعدد بحور کے معاملہ میں سب سے بازی لے گئے، انھوں نے گیارہ مختلف بحروں میں مثنویاں کہی ہیں! اُنکی مثنویاں خاصی طویل ہیں، جنکی تعداد چالیس سے بھی اُوپر ہے، اُن کے "دواوین" کے نام بھی لطف سے خالی نہیں۔

دیوانِ ریختہ، دیوان بیختہ ــــــ دیوان، نگیختہ، دیوان آمیختہ

ــــــــــ اور ــــــــــ

حدیقہ رنگین

"تصنیف رنگین" مشہور تذکرہ نگار جناب ایوب قادری دہلی سے، سعادت یار خاں رنگین کی ایک مثنوی کا ایڈٹ فرماہے ہیں، جو اپنے طرز کی واحد مثنوی ہے، "واحد" اس لئے کہ شرک و بدعات کے پھیلانے میں "شاعری" نے سب سے زیادہ پارٹ انجام دیا ہے۔ شعراء عام طور پر محتاط نہیں ہوتے، اور شاعری کے چٹخارے کی خاطر جو چاہتے ہیں نظم کر جاتے ہیں، موضوع اور جھوٹی حدیث سے اگر اُن کی کسی نظم میں قوت، جان اور دلکشی پیدا ہو رہی ہو، تو وہ اس کو بلا تکلف نظم کر دیتے ہیں۔

ــــــــــ مگر ــــــــــ

مرزا سعادت یار خاں رنگین کی سلامتی طبع کی داد دیجئے کہ انھوں نے ایک ایسی مثنوی کہی ہے، جس میں شرک و بدعت کا رد کیا گیا ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے ایک وصیت نامہ لکھا تھا جس میں آٹھ وصایا ہیں، یہ وصایا فارسی زبان میں قلمبند کئے گئے ہیں، جن کا فارسی سے اردو میں ترجمہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی (المتوفی ۱۲۲۵ھ) نے کیا ہے، جو کئی بار چھپ چکا ہے!

لیکن یہ وصیت نامہ شاہ صاحب کے مشہور وصیت نامہ سے بالکل مختلف ہے، اس میں مسلمان گھرانے میں بچہ کی ولادت سے لے کر، اس کی موت کی بعد تک کی غیر اسلامی رسموں اور بدعتوں کا رد کیا ہے۔ اور دو ٹوک لفظوں میں بتایا ہے کہ اسلامی طریق پر عمل کیا جانا چاہیئے، سعادت یار خاں رنگین نے ۱۲۳۹ھ ـ ۱۸۲۳ء میں اس کا منظوم ترجمہ کیا، اور اس مثنوی کا نام "تصنیف رنگین" رکھا۔ انڈیا آفس لائبریری واقع لنڈن میں رنگین کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ موجود ہے:-

یہ منظوم وصیت نامہ (تصنیف رنگین) سب سے پہلے ۱۲۶۳ھ ـ ۱۸۴۶ء میں مطبع دارالسلام (حوض قاضی) دہلی میں چھپا اور دوسری بار ۱۸۵۱ء میں فقہ کی مشہور کتاب کنزالمصلی کے ساتھ فتح گڑھ سے شائع ہوا، جناب ایوب قادری صاحب کے پاس دہلی والے (۱۸۴۶ء) مطبوعہ نسخہ کی قلمی نقل ہے، جو موصوف کو اُن کے برادر مکرم مولوی عبدالحمید شرفی (المتوفی ۱۹۳۳ء) ساکن قصبہ اوجھیانی ضلع بدایوں کے کتب خانہ سے دستیاب ہوا ہے۔

سعادت یار خاں رنگین کی اس مثنوی کے چند منتخب اشعار درج ذیل کئے جاتے ہیں:-

تجھ سے کہتا ہوں میں یہ بات ہی سچ | شرک آفت بڑی ہے اس سے بچ
کون پہنچا سکے ہے نفع و ضرر | التجا اس بن اور سے مت کر

بچّے کا اچھا نام رکھنا

یعنی اچھوں کے نام پر ہو نام — پر نہ ہو اس میں لفظ بخش و غلام[1]

ہے یہ بیہودہ کرنی سا نگرہ — مت کر اس کو یہ ہے وبالِ گرہ

رسمِ بسم اللہ

شرع میں اس کا کچھ بیان نہیں — میں بیاں کیا کروں، زبان نہیں

ایک مشہور خلق میں ہے یہ رسم — کرتے شادی میں اسکی ہر ہر قسم

شرع میں اس کو کہتے ہیں اسراف — بس تجھے کہہ دیا ہے میں نے صاف

کچھ کتابوں میں اس کا ذکر نہیں — اس لئے اس کی مجھ کو فکر نہیں

(شاعر کا مفہوم یہ ہے کہ "رسمِ بسم اللہ کا چونکہ دین کی کتابوں میں کہیں ذکر نہیں ہے، اس لئے اس رسم پر تنقید کرتے ہوئے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا)

سیوم اور چہلم اور ششماہی — ہیں شریعت کی رُو سے سب واہی

اور جو دیو سے ہے سال کے بعد — اس کو بھی تو کیا نہ کرئیے سعد!

قبر پر گچ نہ ہو نہ ہو گنبد — اور نہ ہو سقف کہ ہیں یہ سب بد

قبر بھی ہے شرع کی ہے پسند — پر کو ہاں شتر سے ہو نہ بلند

قبر پر بیٹھنا بھی منع ہے صاف[2]

اور نہ چادر چڑھانا اور غلاف

(قبروں پر بیٹھنے کی کبھی کوئی رسم نہیں رہی، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک صحیح حدیث کا ترجمہ ہے، جس میں "قبر پر بیٹھنے" یعنی اس پر معتکف ہونے سے منع کیا گیا ہے)

یہ مثنوی ۱۲۳۹ھ ہجری میں کہی گئی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے "توحیدِ خالص" کا جو غلغلہ بلند فرمایا تھا اس سے شعراء تک متاثر ہو گئے تھے ——— رنگین کی یہ مثنوی "تقویۃ الایمان" کی صدائے بازگشت

---

[1] نبی بخش، غوث بخش، پیر بخش، علی بخش اس قسم کے نام تو رکھنے ہی نہیں چاہئیں، کیونکہ ہر انسان اللہ تعالیٰ کا پیدا کیا ہوا ہے، اس کے وجود کا کوئی اور "پیدا کرنے والا اور بخشنے والا" نہیں ہے اور مغفرت (بخشش) بھی اللہ تعالیٰ کو سزاوار ہے! غلامی (بہ معنی بندگی) اللہ تعالیٰ ہی کے شایانِ شان ہے اور ہم سب اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کے غلام (یعنی بندے) نہیں ہیں، غلام جو آقا اور صاحب کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے، اس کی نسبت غیر اللہ سے دی جا سکتی ہے!

[2] اس مثنوی سے رنگین کی زندگی کا اندازہ ہوتا ہے کہ مومن کی طرح ان کی زندگی میں بھی انقلاب آچکا ہے! اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کا انجام بخیر کرے اور اصلاحِ حال کی توفیق عطا فرمائے۔

معلوم ہوتی ہے ———— مودی خرم علی بلھوری (متوفی ۱۲۷۰ھ) کے یہاں جاکر یہ رنگ اور زیادہ نکھر گیا!! اُن کے اِس قسم کے شعر —

خدا فرما چکا قرآں کے اندر | مرے محتاج ہیں پیر و پیمبر

خاص و عام میں شہرت پا چکے ہیں، توحید خالص کی یہی تعلیم حالی پانی پتی کے "مسدس" میں معراج کمال کو پہنچ گئی ہے!

نعتِ خواجۂ دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم

مذاق العیشی

اے کہ میں تجھ پر فدا تیرا بیاں میری زباں
اے مری جاں جانِ جاں جانانِ جاں جانِ جہاں

السّلام اے نازشِ دُنیائے زیرِ آسماں
السّلام اے وجہِ تخلیقِ جہانِ کُن فکاں

السّلام اے رحمتِ عالم شفیعِ عاصیاں
السّلام اے آخری امیدِ بخشش کے نشاں

کھا رہا تھا ٹھوکریں انسانیت کا کارواں
تُونے خود چل کر دکھایا جادۂ منزل نشاں

اب حوادث کے تھپیڑوں کے کرم پر ہے رواں
یا رسول اللہ میری کشتیِ بے بادباں

اے قدِ آدم تنِ بے سایہ اے نورِ ازل
تیرا سایہ بن گیا ابرِ کرم کی داستاں

السلام اے صاحبِ اسریٰ و اوادنیٰ مقام
تیری مسند عرشِ حق ہے تیری منزل لامکاں

نقشِ اول نور تیرا نقشِ آخر تیری ذات
تُو ہے تکمیلِ نقوشِ نقشبندِ دوجہاں

تُونے بخشا آدمیت کو یقینِ حق شناس
تُونے باطل کر دیئے باطل کے سب وہم و گماں

تُونے دی انسانیت کو ایک میزانِ عمل
تُونے بخشا زندگی کو احتسابِ جاوداں

تیرا وہ منہ بولتا اعجاز ہے خُلقِ عظیم
جس کے آگے ماند ہیں سب کُفر کی سرگرمیاں

مژدۂ لاتقنطوا تیری زباں سے جب سُنا
عالمِ احساس میں بجنے لگیں شہنائیاں

نعتِ پاکِ خواجۂ کون و مکاں کے واسطے
وسعتیں لاؤں کہاں سے بہرِ اسلوبِ بیاں

گل ہائے تازہ

تسکین قریشی

اُن کی محفل میں جہاں ہم کبھی آئے نہ گئے
آج کیا کیا، ہمیں الزام لگائے نہ گئے

حُسن سے، ناز محبت کے اٹھائے نہ گئے
مُسکرایا نہ گیا، اشک بہائے نہ گئے

سعی و تدبیر سے کیا دل کو تسلی ہوگی
جب دُعاؤں کے لئے ہاتھ اٹھائے نہ گئے

کم سے کم اتنی محبت تو انھیں بھی ہے کہ ہم
یاد آئے نہ کبھی اور بھلائے نہ گئے

حُسن نے ڈال تو رکھے ہیں نگاہوں پہ حجاب
پھر بھی جلوے ہیں کچھ ایسے کہ چھپائے نہ گئے

کچھ مرا جوشِ جنوں مائلِ رسوائی تھا
اور کچھ راز خود اُن سے بھی چھپائے نہ گئے

نازبرداری اربابِ جنوں سہل نہیں
اُن کی محفل میں ہمیں ہیں جو بلائے نہ گئے

اکثر اس طرح بھی آئی ہے تری یاد اے دوست
آنکھ بھر آئی، مگر اشک بہائے نہ گئے

ہائے آغازِ محبت کی نزاکت تسکیں
کتنے افسانے سنے اور سنائے نہ گئے

کوثر نیازی

گرتے ہوئے جب میں نے ترا نام لیا ہے
منزل نے سدا بڑھ کے مجھے تھام لیا ہے

سجدوں میں وہ پہلی سی حلاوت نہیں باقی
جیسے یہ اثر گردشِ ایام لیا ہے

مے خوار تو ہے محتسبِ شہر زیادہ
رندوں نے یونہی مفت میں الزام لیا ہے

وہ مل نہ سکے، یاد تو ہے ان کی سلامت
اس یاد سے بھی ہم نے بہت کام لیا ہے

تجھ سا کوئی رہبر نہیں اے دوریِ منزل
احسان ترا ہم نے بہ ہر گام لیا ہے

وہ اور ہیں جو غم کو پنپنے نہیں دیتے
ہم نے تو ازل سے دلِ ناکام لیا ہے

مانا کہ غمِ جاں، غمِ جاناں ہے بڑی چیز
کوثر نے تو چن کر غمِ "انجام" لیا ہے

عروج زیدی

اپنے جلووں کا نہ کرنا کہ تماشا کرنا — سوچتا ہوں دمِ دیدار مجھے کیا کرنا
اے کہ تو نازشِ صناعیِ دستِ فطرت — کاش آتا نہ تجھے خونِ تمنا کرنا
تو مرا یوسف نہیں دامن تو مرے پاس بھی ہے — تم ذرا پیرویِ دستِ زلیخا کرنا
خودنمائی نہیں انسان کی خودداری ہے — پرچمِ عظمتِ کردار کو اونچا کرنا
ایک حالت میں ہمیں وہ نہیں رہنے دیتے — کبھی طوفاں کبھی قطرہ کبھی دریا کرنا
جادۂ عشق میں اک ایسا مقام آتا ہے — شرطِ اول ہے جہاں ترکِ تمنا کرنا
ہر قدم پہ مری کانٹوں نے پذیرائی کی — جرم پوچھو تو بہاروں کی تمنا کرنا

یہ بھی منجملۂ آدابِ محبت ہے عروج
رنج سہنا، ستمِ دوست گوارا کرنا

رند کاکوروی

ہزار ظلم کے چرکے ملے حسینوں سے
خدا بچائے ستمگر ان تماش بینوں سے

وہ جن کو دید ہے تیری حیات کا مژدہ
ترس رہے ہیں تری شکل کو مہینوں سے

قمر میں داغ ہے، سروِ چمن میں کانٹے ہیں
بچا ہے کون زمانے میں نکتہ چینوں سے

ہزار طوقِ غلامی کو توڑ دیں بندے
نشانِ سجدہ مٹا ہے کہیں جبینوں سے

نہیں یہ اشک کے قطرے یہ پارۂ دل ہیں
چمک رہے ہیں جو آنکھوں میں آبگینوں سے

نکھار آئے گا عالم میں اب یہ طرزِ نوی
نہیں گے اب تو نئے آسماں زمینوں سے

ہوئے نہ رند کبھی اپنے شغل سے غافل
تمام عمر تعلق رہا حسینوں سے

ماہرالقادری

فضائے شوق کی پھر دل کو راس آئی ہے
سکوں نے لوٹ لیا درد کی دہائی ہے

یہ تیوروں پہ جو وارفتگی سی چھائی ہے
تری نظر بھی کہیں چوٹ کھا کے آئی ہے

یہ خارزارِ محبت یہ سنگلاخ زمیں
اسی سفر میں تو لطفِ برہنہ پائی ہے

جبین و رُخ تو ذرا دیکھنا توجہ سے
مری نگاہ بھی کچھ نقش چھوڑ آئی ہے

یہ کون جانبِ عرشِ بریں ہے گرمِ خرام
فلک نے زیرِ قدم کہکشاں بچھائی ہے

میں اُن کی بزم میں شایانِ یک نظر بھی نہیں
اسی کا نام مقدر کی نارسائی ہے

نہ التفات جسے کہہ سکیں، نہ بیزاری
اس اہتمام سے اُس نے نظر چرائی ہے

جنابِ شیخ کی توبہ کو کیا کہوں ماہر
میں جانتا ہوں بڑھاپے کی پارسائی ہے

شاید اُسی حرف کی ہو آواز دی ہوئی
دھڑکا جو دل تو روح کو تسکین سی ہوئی

اے شمع! تیرے سوزِ نمایاں کی خیر ہو
میرے بھی دل میں آگ ہے لیکن دبی ہوئی

گرمِ خرام بادِ صبا ہے روش روش
غنچوں کے دل کی بند گرہ کھولتی ہوئی

اے دوست! میرے ظرفِ محبت کی داد دے
ہے دل کی چوٹ لب پہ تبسم بنی ہوئی

میرے سکوت پر بھی جو ابرو میں پُر شکن
یہ تو حضور! بے سبب آزردگی ہوئی

یہ ہے سوادِ منزلِ جاناں سنبھل کے چل
شاید یہیں کہیں ہو قیامت چھپی ہوئی

ماہر اسی کا نام ہے دُنیا کی دھوپ چھاؤں
مجھ کو ہوا ملال، کسی کو خوشی ہوئی

رُوحِ انتخاب

کیا آپ جانتے ہیں؟

"جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات" کی کچھ جھلکیاں

انٹرنیشنل مونٹری فنڈ (Inter National Monitory Fund)

بین الاقوامی مالیاتی سرمایہ بریٹن ووڈز اگریمنٹ ۱۹۴۴ء کی رُو سے ۱۹۴۵ء میں قائم کیا گیا تھا۔ اس سرمایہ کے قیام کا مقصد شرح مبادلہ کے استحکام اور بین اقوامی ادائگی کو کسی رکاوٹ کے بغیر جاری رکھنا ہے۔ اس سرمایہ کے ساتھ وابستہ ممالک اس بات کا اطمینان کر لینے کے بعد کہ وہ اپنے سکہ پر پابندی عائد کئے بغیر بین اقوامی ادائگی کو جاری رکھ سکتے ہیں، باہمی ادائگی پر کوئی پابندی عائد نہیں کرتے۔ اس سرمایہ سے اس کے اراکین کو مختصر میعاد کے لئے قرضہ بھی دیا جا سکتا ہے۔ اراکین سونے کی شرح مبادلہ میں اس وقت تک کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے جب تک شرح مبادلہ میں کوئی اختلال رونما نہ ہو جائے۔ پھر اگر یہ تغیر دس فیصد سے زیادہ ہو تو اس کے لئے سرمایہ کے اراکین سے منظوری حاصل کرنا ضروری ہے بصورت دیگر اس قسم کا اقدام کرنے والے رکن کو خارج کر دیا جا سکتا ہے۔ اس سرمایہ کے اراکین ایک دوسرے کے ساتھ تجارتی لین دین کرتے ہیں لیکن اگر اس بات کا اندازہ کیا جائے کہ کوئی ملک درآمد کے مقابلے میں برآمد زیادہ کر رہا ہے تو دوسرے ممالک اس ملک سے برآمد بند کر دیتے ہیں اور جب تک درآمد و برآمد میں توازن قائم نہ ہو جائے یہی طریقہ کار قائم رکھا جاتا ہے۔ ابتداً یہ سرمایہ دس ارب ڈالر مقرر کیا گیا تھا لیکن بعد میں ... [illegible] آٹھ ارب ۸۰ کروڑ ڈالر کر دیا گیا تھا۔ جس میں سے متحدہ امریکہ نے ۲ ارب ۷۵ کروڑ، برطانیہ نے ایک ارب ۳۰ کروڑ، سوویت یونین نے ایک ارب ۲۰ کروڑ، چین نے ۵۵ کروڑ اور فرانس نے ۴۵ کروڑ ڈالر مہیا کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور باقیماندہ رقم کی فراہمی بعد میں شامل ہونے والے ممالک پر چھوڑ دی گئی تھی۔ (دیکھئے بریٹن ووڈز اگریمنٹ)

ریڈکراس سوسائٹی (Red cross Society)

یعنی انجمن صلیب احمر ایک ایسی منظم بین اقوامی انجمن ہے جو بلا امتیاز مذہب، و ملت اور رنگ و نسل جنگ اور دوسرے حوادث ارضی و سماوی کے شکار انسانوں کی امداد کرتی ہے۔ ۱۸۵۹ء میں جب ہنگری کے باشندے اپنے بادشاہ فرانسس کی قیادت میں نپولین سوم کے خلاف برسرپیکار تھے تو سوئٹزرلینڈ کے ایک بینکر مسٹر ہنری ڈانٹ کو سفر کے دوران میں میدان جنگ کے قریب سولفرینو کے مقام سے گزرنے کا اتفاق ہوا۔ لڑائی جاری تھی لیکن مجروحین کی تیمارداری کا کوئی انتظام نہیں تھا اور زخمی سپاہی خود ہی اپنی تیمارداری کے لئے مجبور تھے۔ اس منظر نے مسٹر ڈانٹ کے دل پر غیر معمولی اثر کیا۔ اور انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ جس طرح بھی ہو سکے تیماردار خواتین کی ایک جماعت منظم کرنی چاہیئے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے سب سے پہلے گرد و نواح کے دیہاتیوں کو اس امر پر آمادہ کیا کہ وہ زخمی سپاہیوں کو میدان جنگ سے اٹھا کر لے جایا کریں۔ مسٹر ڈانٹ خود بھی تمام دن میدان جنگ میں موجود رہتے تھے اور رات کو پیرس اور جنیوا کے اخبارات کے نام مراسلات لکھ کر انہیں حالات سے مطلع کرتے تھے۔ ان خطوط کی اشاعت

نے فرانس اور سوئٹزرلینڈ کے باشندوں کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ اخبارات نے مقالے لکھے اور عوام مسٹر ڈانٹ کی اس مفید تحریک کو کامیاب بنانے پر متوجہ ہوگئے۔ کچھ مدت کے بعد مسٹر ہنری نے واپس آکر اپنے تجربات کے سلسلہ میں ایک کتاب شائع کی جو بہت مقبول ہوئی اور اسی کتاب نے دنیا کی مختلف اقوام میں ایک ایسی جماعت کے قیام کی ضرورت کا احساس پیدا کر دیا جو بلا امتیاز مذہب و ملت اور رنگ و نسل مصیبت زدگان کی امداد کر سکے۔ چنانچہ ۱۸۶۴ء میں ایک بین اقوامی مجلس نے جنیوا میں ایک ایسی مجلس کے قیام کا فیصلہ کر لیا اور "ریڈ کراس سوسائٹی" کے نام سے مختلف اقوام کے افراد پر مشتمل ایک انجمن کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس انجمن نے نہایت قلیل مدت میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کر لی۔ یہ انجمن اسلامی ممالک میں "انجمن صلیب احمر" کی بجائے "انجمن ہلال احمر" کہلاتی ہے۔ اور ایران میں اس کے پرچم پر شیر اور آفتاب کا نشان بنا ہوا ہے لیکن کسی ملک میں بھی اس کے نصب العین اور طریقہ کار میں کوئی فرق نہیں۔

ورلڈ بنک (World Bank)

عالمی بنک ۱۹۴۴ء کے بریٹن ووڈز ایگریمنٹ کے تحت ۱۹۴۵ء میں قائم کیا گیا تھا۔ اس وقت اس کا بنیادی سرمایہ ۱۹ ارب دس کروڑ ڈالر متعین ہوا تھا۔ جس میں سے متحدہ امریکہ نے ۳ ارب ۱۷ ½ کروڑ، برطانیہ نے ایک ارب ۳۰ کروڑ، سوویت یونین نے ایک ارب ۲۰ کروڑ، چین نے ۶۰ کروڑ اور فرانس نے ۴۵ ½ کروڑ ڈالر ادا کرنے کی ذمہ داری لی تھی۔ اس کے تاسیسی اراکین یہی پانچوں ممالک ہیں۔ لیکن دیگر ممالک بھی اس کے رکن بنتے رہے ہیں۔ اس رقم کے کچھ حصے کو سونے یا ڈالروں میں اور باقی ماندہ کو ان ملکوں کے سکوں میں جمع کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ اس بنک کے مقاصد میں رکن ممالک کی ترقی میں مالی امداد کرنا، ایک ملک کے سرمایہ داروں کو دوسرے ملکوں میں سرمایہ لگانے کی سہولتیں بہم پہنچانا، مختلف ممالک میں بین اقوامی سرمایہ کی ترقی کی حوصلہ افزائی کر کے طویل المدت بین اقوامی تجارت کو ترقی دینا اور کسی ملک کے پرائیویٹ اداروں کو ان کی حکومت کی ضمانت اور بنک کے ماہرین کی سفارش پر ملکی تعمیر و ترقی کے منصوبوں کی تکمیل کے لئے قرضہ دینا شامل ہے۔ ورلڈ بنک اور انٹرنیشنل مونیٹری فنڈ ایک ہی ادارہ کی دو شاخیں ہیں۔

ورلڈ پیس کونسل World Peace Council

عالمی ادارہ امن۔ امن پسندان عام کی مرکزی تنظیم کا نام ہے۔ یہ ادارہ نومبر ۱۹۵۰ء کے تیسرے ہفتہ میں، دوسری امن کانگریس منعقدہ وارسا نے قائم کیا تھا۔ عالمی ادارہ امن کا نصب العین جنگ کے امکانات کو معدوم کرنا ہے اور اس کی جدوجہد کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ۔

(۱) سماجی اور سیاسی اختلافات کے باوجود تمام قوموں کی بقائے باہم ممکن ہے۔

(۲) اقوام عالم کے باہمی اختلافات کو باہمی گفت و شنید کے ذریعہ سے طے کرنا چاہیئے۔ اور

(۳) جہاں تک کسی قوم کے داخلی اختلافات کا تعلق ہے انہیں طے کرنے کا حق اسی قوم کو حاصل ہونا چاہیئے۔

اس سلسلہ میں عالمی ادارہ امن حسب ضرورت مناسب تجاویز پیش کر کے اور دنیا کے کم و بیش ۷۵ ممالک میں پھیلی ہوئی اپنی شاخوں کے توسط سے عوام پر ان تجاویز کی افادی حیثیت واضح کر کے انہیں اپنے اپنے ملک کی حکومتوں کو ان پر عمل کرنے کی ترغیب دلانے پر متفق الرائے بناتا ہے۔ یہ ادارہ مختلف ملکوں، قوموں، نسلوں، سیاسی نظریوں اور مذہبی عقائد سے تعلق رکھنے والے ۲۱۷ اراکین پر مشتمل ہے۔ اور اس نے ۱۹۵۰ء سے ایٹمی اسلحہ کے استعمال کو خلاف قانون قرار دلانے اور ۱۹۵۱ء سے سوویت یونین، برطانیہ، فرانس، عوامی چین اور متحدہ امریکہ کے مابین میثاق امن کرانے کی عالمگیر مہم شروع کر رکھی ہے۔

زائن ازم Zion ism (یا تحریک صیہونیت)

فلسطین میں حکومت یہود قائم کرنے کی تحریک کا نام ہے۔ مسیحیت کے ظہور کے بعد جب فلسطین کی یہودی حکومت زوال پذیر ہوئی اور یہودیوں
کو اقصائے عالم میں منتشر ہو جانا پڑا تو ان کے مذہبی پیشواؤں نے یہ تحریک شروع کی تھی چنانچہ ان کی کتاب الدعامیر بھی اس کا ذکر موجود ہے۔
لیکن مدت دراز تک اسے محض مذہبی تحریک کی حیثیت حاصل رہی اور اس کے معتقد و مقلد حصول مقصد کے سلسلہ میں عملی جدوجہد کرنے کی بجائے
کسی معجزے کے ظہور کا انتظار کرتے رہے۔ ۱۸۸۱ء میں جب روس اور رومانیہ سے یہودیوں کا اخراج عمل میں آیا تو ان میں سے معدودے چند نے
فلسطین آکر وہاں زراعت شروع کر دی اسی زمانہ میں یورپ کے مختلف ممالک میں آباد یہود نے "شووے یو زائن" ____
(Chovev Zion) یعنی محبان زائن کے نام سے ایک جماعت قائم کر کے فلسطین کی تعمیر و ترقی کی غرض سے یہود
کے وہاں پہنچنے کی تحریک شروع کی۔ چند سال بعد آسٹریا کے ایک یہودی اخبار نویس تھیوڈور ہرزل (Theodor Herzl) کے ذہن میں
یہ خیال پیدا ہوا کہ عام یہودی بالخصوص یہودیت کے وہ معتقدین جو مشرقی ممالک میں آباد ہیں مذہب کے مقابلہ میں قومیت کے جذبے سے زیادہ متاثر
ہیں۔ چنانچہ انہوں نے یہود عالم کو متحد کرنے کے خیال سے ان کی ایک ریاست قائم کرنے کا ارادہ کیا۔ ابتداء میں اپنے اس ارادہ کی تکمیل کے لئے وہ فلسطین ہی
کو مخصوص کرنے پر مصر نہیں تھے لیکن وسطی اور مشرقی یورپ کے یہود طلباء اور تعلیم یافتہ طبقہ سے تبادلۂ خیالات کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ قیام
ریاست یہود کے لئے فلسطین ہی بہترین ملک ہے اور انہیں اپنی تجویز کو کامیاب بنانے کے لئے اسے زائن ازم کے ساتھ وابستہ کر دینا چاہئے۔ چنانچہ
انہوں نے ۱۸۹۷ء میں باقاعدہ طور پر فلسطین کو یہود کا قومی وطن بنانے کی تحریک شروع کر دی۔ ہرزل کی یہ تحریک محض سیاسی تھی اور اس میں مذہب
کا رنگ صرف اسے کامیاب بنانے کے لئے دیا گیا تھا۔ "شووے یو زائن" کے ماتحت یہود کو فلسطین میں آباد ہونے کی ترغیب دی جاتی تھی لیکن ان کے
تحفظ اور ترقی کی کوئی ضمانت موجود نہیں تھی اور ان کا مستقبل سلطان ترکی اور عمال حکومت کے رحم و کرم پر منحصر تھا۔ ہرزل اس صورت حال کو
ناپسند کرتے تھے اور اس سلسلہ میں بین الاقوامی ضمانت حاصل کرنے کے خواہشمند تھے۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں ہرزل کا انتقال ہو گیا۔ لیکن اس وقت تک
یہود کی ایک ایسی بین الاقوامی جماعت قائم ہو جانے کے علاوہ جو ان کے بعد حصول مقصد کی جدوجہد جاری رکھے اس تحریک میں کوئی قابل ذکر کامیابی
حاصل نہ ہو سکی۔ ہرزل کے انتقال کے بعد ان کی قائم کردہ مجلس کی کوششوں کی بدولت ایک طرف تو اقتصادی انقلاب سے بہتر حیثیت کے یہودی
فلسطین جا کر آباد ہونے لگے اور دوسری طرف برطانوی حکومت ان کے مطالبہ کی نہ صرف موید ہی بن گئی بلکہ جنگ عظیم اول کے بعد فلسطین پر
اس کا قبضہ ہو جانے کے باعث اس نے انتظامی اعتبار سے ایسے حالات بھی پیدا کر دیئے جن کا انجام ایک آزاد ریاست یہود کا قیام ہی ہو سکتا تھا
ان مساعی کے سلسلہ میں ڈاکٹر وائزمین اور یہودی عالم سوکولو کے اسماء قابل ذکر ہیں جنکی بدولت اعلان بالفور کی شکل میں اس مسئلہ پر برطانوی
حکمت عملی کی وضاحت کی گئی اور اس کے بعد اس کو مجلس اقوام کی تصدیق و تائید حاصل ہوئی۔ فلسطین کو وطن یہود قرار دینے کی تحریک کے حامیوں
کی پہلی کانفرنس ۱۸۹۷ء میں بمقام باسل (Basle) منعقد ہوئی تھی۔ چنانچہ اس تحریک سے متاثر ہو کر برطانوی حکومت نے یہود کو فلسطین
کی بجائے یوگنڈا کا علاقہ دینا چاہا تھا لیکن دوسری زائینسٹ کانگریس منعقدہ ۱۹۰۵ء نے اس پیش کش کو مسترد کرتے ہوئے فلسطین کے متعلق اپنا
مطالبہ کا اعادہ کیا مگر ایک گروہ اس پر رضامند ہو گیا کہ یہود کی آزاد ریاست کے قیام کے لئے جو علاقہ بھی دیا جائے گا وہ اسے قبول کر لے گا۔ اب
تحریک صیہونیت کے علمبردار دو جماعتوں میں منقسم ہیں اور یہ دونوں جماعتیں بھی اپنی اپنی جگہ عمل تقسیم سے متاثر۔ ہرزل کے معتقدین فلسطین
میں یہودی آزاد ریاست کے قیام کے متمنی ہیں اور اگرچہ وہ اس ریاست میں سو فیصد یہودی کو آباد دیکھنا چاہتے ہیں لیکن بدرجۂ اقل اس امر
پر بھی آمادہ ہیں کہ ریاست کی بیشتر آبادی یہود پر مشتمل ہو کیونکہ ان کے لئے یہودیت مذہبی نہیں بلکہ سیاسی اہمیت رکھتی ہے اور وہ مذہب کی خصوصیت

کے بقاء و تحفظ کے مقابلہ میں یہودیوں کی قومی سربلندی کو زیادہ ضروری تصور کرتے ہیں۔ اس کے برعکس روسی یہودی فلاسفر ایشر جینز برگ (Asher Ginzberg) کے مقلد یہودی یہودیت کو قومیت نہیں بلکہ مذہب تصور کرتے ہیں اور اس مذہب کی خصوصیات کو باقی رکھنے نیز شریعت موسوی کے بقاء و تحفظ کے لئے فلسطین میں قیام ریاست کی حمایت کرتے ہیں۔ لیکن ان کے لئے مذہب سے بے نیاز ہو کر ریاست کے قیام کی تحریک کسی کشش کی حامل نہیں۔

بلقان پیکٹ ۱۹۵۴ء (Balkan Pact 1954)

ترکی، یوگوسلاویہ، اور یونان کے درمیان ۲۸ فروری ۱۹۵۳ء کو دوستی اور اشتراک عمل کا جو معاہدہ ہوا تھا اسے ۹ اگست ۱۹۵۴ء کو باقاعدہ اتحاد اور فوجی معاہدہ کی شکل میں تبدیل کر دیا گیا تھا اور اسی معاہدہ کو بلقان الائینس یا بلقان پیکٹ ۱۹۵۴ء کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے یہ معاہدہ ۱۲ دفعات پر مشتمل ہے اور بیس سال تک قابل عمل سمجھا جائے گا۔ اس معاہدہ کو سرکاری طور پر "اگریمنٹ آف الائینس پولیٹیکل کوآپریشن اینڈ ملٹری ایڈ" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اگر مذکورہ بالا ممالک میں سے کسی ایک ملک کے خلاف بھی کوئی فوجی اقدام کیا گیا تو اسے تینوں معاہد ملکوں کے خلاف جارحانہ اقدام تصور کیا جائے گا اور تینوں متحدہ طور پر اس اقدام کی مدافعت کریں گے۔ ترکی اور یونان "ناٹو" کے رکن بھی ہیں لیکن یوگوسلاویہ، ناٹو میں شامل نہیں ہے۔ اس لئے یوگوسلاویہ پر حملہ کی صورت میں ناٹو کا دفاع میں شریک ہونا ضروری نہیں ہوگا۔ اس معاہدہ کی رُو سے تینوں ملکوں کے وزراء خارجہ کی ایک مستقل کونسل قائم کی گئی ہے جس کے اجلاس سال میں دو مرتبہ ہوتے ہیں۔ کونسل کے فیصلے اتفاق رائے پر منحصر ہوتے ہیں۔ اس معاہدہ کے مطابق جب کبھی کسی ایسی غیر بلقانی ریاست پر کوئی حملہ ہوگا جس کے ساتھ ان ملکوں میں سے کسی ملک کا فوجی امداد کا معاہدہ طے ہو چکا ہو تو اس صورت حال میں یہ تینوں ملک باہم مشورہ کریں گے اس معاہدہ میں ایک ایسی دفعہ بھی موجود ہے جس کی رُو سے تینوں ملکوں کے وزراء خارجہ اپنی اپنی حکومت سے تینوں ملکوں کی ایک مجلس مشورہ قائم کرنے کی سفارش کریں گے اس مجلس میں تینوں ملکوں کے نمائندوں کی تعداد مساوی ہوگی۔ اس کا اجلاس سال میں ایک بار منعقد ہوا کرے گا۔ اور یہ وزراء خارجہ کی کونسل کو صرف مشورہ دیا کرے گی۔

ٹریٹی آف ورسائے (Treaty of Versailles)

ورسائے کا صلح نامہ اس مشہور معاہدہ کو کہتے ہیں جو پہلی عالمگیر جنگ کے بعد جرمنی اور اتحادیوں کے مابین ۲۸ جون ۱۹۱۹ء کو ہوا تھا۔ اس معاہدہ کا پہلا باب مجلس اقوام کی تاسیس و تنظیم کے ضوابط پر مشتمل تھا اور دوسرا باب شرائط صلح پر۔ اس صلحنامہ کی رُو سے جرمنی کے علاقہ جات الساس لورین۔ یوپن، ملمنڈی، پوزن، کوریڈ مع میمل نیز ایسٹ اپر سیلیشیا، نارتھ شلسوگ اور ہلچن کو علی الترتیب فرانس، بلجیم، پولینڈ، لتھوانیا ڈنمارک، اور چیکوسلواکیا میں شامل کر دینے کے علاوہ اسے شہر ڈینزگ پر سے اپنے اقتدار کو معدوم سمجھنے، آسٹریا کے ساتھ متحد نہ ہونے، غیر مسلح ہو جانے، اپنے عام فوجی نظام کو معطل کر کے صرف ایک لاکھ افراد پر مشتمل بری افواج اور مختصر سا بحری بیڑہ رکھنے، عسکری طیارے..... تحت البحر کشتیاں، ٹینک اور بڑی توپیں تیار نہ کرنے، اور اسلحہ ساز کارخانوں کو تباہ کر دینے کا پابند بھی بنا دیا گیا تھا۔ مزید برآں رائن لینڈ کو پندرہ سال کے لئے اتحادیوں نے اپنے قبضہ میں لے لیا تھا۔ سار کے علاقہ کو اس شرط پر بین الاقوامی قرار دیا گیا تھا کہ ۱۹۳۵ء میں وہاں کے باشندوں سے استصواب رائے کرنے کے بعد اس کے مستقبل کے متعلق فیصلہ کیا جائے۔ جرمنی کے دریا بین الاقوامی بنا دیئے گئے تھے۔ جرمنی کی تمام نوآبادیات مجلس اقوام کے فرمان کے مطابق اتحادیوں کے مابین تقسیم کر دی گئی تھیں اور جرمنی کو جنگ برپا کرنے کا ذمہ دار قرار دے کر اسے تاوان جنگ ادا کرنے کا پابند بنایا گیا تھا

لیکن تاوان کی رقم کا تعین نہیں کیا گیا تھا۔ دنیا کے مدبرین سیاست کی رائے یہ ہے کہ یہی معاہدہ دوسری عالمگیر جنگ برپا ہونے کا موجب ثابت

وارسا پیکٹ Warsa pact میثاق وارسا

مشرقی یورپ کی سات عوامی جمہوریتوں کے اس معاہدہ کو کہتے ہیں جو ان کے درمیان ۱۴ مئی ۱۹۵۵ء کو ورسا (پولینڈ) میں ہوا تھا۔ اس معاہدہ میں، سوویت یونین مشرقی جرمنی، پولینڈ، چیکوسلاویکیہ، ہنگری، البانیہ اور بلغاریہ شامل ہیں۔ یہ معاہدہ ۱۱ دفعات پر مشتمل ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

۱۔ معاہدین اقوام متحدہ کے منشور کے ساتھ متفق الرائے ہیں اور اس کی حدود میں رہتے ہوئے بین الاقوامی معاملات میں ایک دوسرے کی تائید کریں گے۔

۲۔ قومی تحفظ کے پیش نظر مشترکہ خارجہ حکمت عملی کی تشکیل کریں گے اور ہلاکت خیز اسلحہ کو ممنوع قرار دلانے کی جدوجہد کرتے رہیں گے۔

۳۔ تمام قومی مسائل پر باہم تبادلہ خیالات کریں گے۔

۴۔ کسی جارحانہ حملہ کے وقت معاہدین ایک دوسرے کی امداد کریں گے جس میں فوجی امداد بھی ہوگی۔

۵۔ اس مقصد کے پیش نظر ایک مشترکہ فوج کی تنظیم کی جائے گی۔

۶۔ ایک مشترکہ مجلس مشورہ قائم کی جائے گی۔

۷۔ کوئی فریق اس معاہدہ کے خلاف کسی معاہدہ میں شریک نہ ہوگا۔

۸۔ معاہدین اپنے اقتصادی اور ثقافتی روابط کو مستحکم کریں گے۔

۹۔ اس معاہدہ میں، سماجی اور اقتصادی نظام کے اختلافات کے باوجود یورپ کا ہر ملک شرکت کر سکتا ہے۔

۱۰۔ معاہدہ ۲۰ سال تک نافذ رہے گا لیکن

۱۱۔ اگر دفعہ ۹ کے مطابق یورپ کے دوسرے ممالک اس معاہدہ میں شریک ہو کر مشترکہ تحفظ کا نظام قائم کریں گے تو یہ معاہدہ ساقط ہو جائے گا۔ اس معاہدہ کی بدولت مشرقی یورپ کے تیس کروڑ باشندے متحد ہوگئے ہیں۔

پریزیڈیم (Presidium)

مجلس صدارت اس مجلس کو کہتے ہیں جو کسی اجتماع یا اجلاس کی صدارت کرتی ہے۔ صدارت کا یہ طریقہ پہلی عالمگیر جنگ کے بعد سے شروع ہوا ہے اور اس کی بنیاد اجتماعات کی کارروائی کو زیادہ سے زیادہ جمہوری بنانے کے تصور پر قائم ہے۔ اس طریقہ کے ماتحت کسی اجتماع کی صدارت ایک ہی شخص نہیں کرتا بلکہ صدارت کے لئے متعدد افراد کا انتخاب یا تقرر کیا جاتا ہے اور وہ سب بیک وقت صدارت کرتے ہیں۔

ٹوٹلیٹیرین سسٹم (Totalitarain Systems)

حکومت کے ایسے نظامات کو کہتے ہیں جن کے تحت شخصی آزادی باقی نہیں رہتی۔ حکومت کے ایسے نظامات میں خواہ وہ حکومت شخصی ہو یا جماعتی ہو انفرادی زندگی بھی حکومت کی مداخلت سے محفوظ نہیں رہتی وہ انفرادی زندگی کے ہر شعبہ کو اپنے ہی زیر اثر رکھتی اور ہر اس نظریہ اور اقدام کو کچل دیتی ہے جو اس کے نظریات کے برعکس ہوتا ہے۔ ایسی حکومتوں میں شہری آزادی باقی نہیں رہتی اور تمام سیاسی جماعتوں کو توڑ دیا جاتا ہے۔

ففتھ کالم (Fifth Column)

یعنی پانچواں دستہ، اصطلاحاً ان عناصر کو کہتے ہیں جو ملک کے اندر رہ کر بیرونی دشمن کی امداد کرتے ہیں اور اس اصطلاح میں سیاسی اور فوجی دونوں قسم کی مخالفانہ سرگرمیاں شامل ہیں۔ ہسپانیہ میں ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۹ء تک جو خانہ جنگی برپا رہی تھی اس کے دوران میں جنرل فرانکو نے میڈرڈ پر چار افواج سے حملہ کیا تھا اور جن لوگوں نے میڈرڈ کے اندر سے فرانکو کی امداد کی تھی فرانکو کے ساتھیوں نے انہیں اپنے "پانچویں دستہ" کے نام سے موسوم کیا تھا اور یہ اصطلاح اسی وقت سے استعمال کی جانے لگی ہے۔

میگنا کارٹا (Magna Carta)

اس تاریخی منشور کو کہتے ہیں جو انگلستان کے بادشاہ جان نے ۱۵ جون ۱۲۱۵ء کو جاری کیا تھا اور اس کے ذریعہ سے مختلف طبقوں کے حقوق متعین کرنے کے علاوہ چند ادارات قائم کرکے موجودہ مغربی جمہوریت کی بنیاد بھی قائم کی تھی۔ اب یہ اصطلاح حقوق انسانی کے ہر منشور کے لئے عام ہو گئی ہے اور یہ اصطلاح ایسے تمام واقعات پر حاوی ہے۔

مینڈیٹ (Mandate)

ملکی انتظام کے اس طریقہ کو کہتے ہیں جو جنگ عظیم کے بعد شکست خوردہ ممالک کی نو آبادیات اور مقبوضات کے لئے وضع کیا گیا تھا۔ اس طریقہ کی رو سے بعض ممالک مجلس اقوام کے ماتحت تصور کر لئے گئے تھے۔ اور مجلس اقوام نے وہاں کا انتظام بعض فاتح ملکوں کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ ان ممالک کو "مینڈیٹڈ" Mandated یعنی تحکم بردار علاقہ جات کہا جاتا تھا۔ تحکم بردار علاقہ جات تین اقسام پر منقسم تھے۔ اول وہ علاقہ جات جنہیں کچھ عرصہ کے بعد خود مختار بنا دینے کا وعدہ کیا گیا تھا ان میں عراق شام اور فلسطین شامل تھے۔ دوسری قسم میں وہ علاقہ جات شامل تھے جن کی جداگانہ ہستی کو باقی رکھا گیا تھا لیکن ان پر اس ملک کا اقتدار قائم تھا جس کے سپرد انہیں کر دیا گیا تھا اور تیسری قسم ان علاقوں پر مشتمل تھی جو کسی فاتح ملک کا جزو بنا دیئے گئے تھے۔ لیکن اب اس طریقہ کار کو ترک کرکے ایسے علاقوں کے انتظام کے لئے ٹرسٹی شپ کونسل قائم کر دی گئی ہے۔

وہپ (Whip)

کسی پارلیمنٹری پارٹی کے اس رکن کو کہتے ہیں جسے پارٹی کے رہنماؤں یا مجلس منتظمہ کے فیصلوں کو دیگر اراکین تک پہنچانے اور ان سے ان فیصلوں کی تائید کرانے کی ذمہ داری سپرد کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ پارٹی کے پارلیمانی لائحہ عمل اور اقدامات کے متعلق پارٹی وقتاً فوقتاً جو ہدایات جاری کرتی ہے ان پر مشتمل عام مراسلات کو بھی اسی نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ وہپ میں مسائل کی اہمیت کے اعتبار سے مختلف دفعات کے نیچے ایک سے تین تک خطوط کھینچ دیئے جاتے ہیں اور پارٹی کا جو رکن تین خطوطی مسئل پر ووٹ دینے کے وقت غیر حاضر ہوتا ہے اس سے جواب طلب کیا جاتا ہے۔

اٹلانٹک چارٹر (Atlantic Charter)

دوسری عالمگیر جنگ کے اس دور میں جب نازی جرمنی کے فتوحات نقطۂ عروج پر پہنچتی جا رہی تھیں

برطانیہ کے اُس وقت کے وزیر اعظم مسٹر ونسٹن چرچل اور صدر روز ویلٹ آنجہانی نے بحر اٹلانٹک کی خلیج پلے سینٹا میں امریکی کروزر واگسٹا، اور برطانوی جنگی جہاز، پرنس آف ویلز، پر متعدد ملاقاتوں کے بعد ۱۴ رجنوری ۱۹۴۱ء کو اعلان کیا تھا، اور یہی اعلان اٹلانٹک چارٹر کے نام سے مشہور ہے۔ اس اعلان میں یقین دلایا گیا تھا کہ:۔

(۱) اس جنگ سے اعلان کنندگان کو کوئی مادی فائدہ یا علاقائی توسیع مقصود نہیں۔

(۲) وہ کسی ایسی علاقائی تبدیلی کو گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں ہونگے جو اس علاقہ کے باشندوں کی مرضی کے خلاف کی جائے گی۔

(۳) وہ اس اصول کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہر قوم کو اس کی مرضی کے مطابق نظام حکومت منتخب کرنے کا حق حاصل ہے اور اُن کی خواہش ہے کہ جن قوموں کو جبراً خود مختاری اور حکومت سے محروم کر دیا گیا ہے انہیں از سر نو بحال کر دیا جائے۔

(۴) اعلان کنندگان اپنی موجودہ ذمہ داریوں کا احترام کرتے ہوئے اس امر کی کوشش کریں گے کہ دنیا کی ہر چھوٹی بڑی قوم خواہ وہ فاتح ہو یا مفتوح اپنی اقتصادی خوشحالی کے لئے تجارت کرنے اور خام اشیاء حاصل کرنے میں مساوی طور پر حصہ لے سکے۔

(۵) وہ محنت کشوں کی حالت کو بہتر بنانے، ان کے معیار زندگی کو بلند کرنے، اور سماجی تحفظ کو برقرار رکھنے کی غرض سے تمام قوموں کے ساتھ اقتصادی میدان میں اشتراک عمل کریں گے۔

(۶) وہ اس بات کی توقع کرتے ہیں کہ نازی ظلم و تشدد کے خاتمہ کے بعد جو امن قائم ہوگا تو اس میں ہر قوم اپنی حدود میں حفاظت اور سکون کے ساتھ رہ سکے گی اور کوئی شخص بھی خوف اور احتیاج میں مبتلا نہ ہوگا۔

(۷) ایسے امن کی بدولت ہر شخص کو بحری سفر کی سہولتیں حاصل ہو جانی چاہئیں اور

(۸) چونکہ بحری، بری اور فضائی اسلحہ بندی جاری رہنے کی صورت میں مستقبل میں امن برقرار نہیں رہ سکتا اس لئے اعلان کنندگان کا یقین ہے کہ تخفیف اسلحہ ضروری ہے اور وہ اس معاملہ میں امن پسند قوموں کی ہر ممکن ہمت افزائی کریں گے۔

U.N.O Members Declaration یو۔ این۔ او ممبرز ڈیکلریشن

ادارہ اقوام متحدہ کے رکن ممالک نے ادارہ کی قیام کی دسویں سالگرہ کے موقع پر، ۲۷ رجون ۱۹۵۵ء کو جنرل اسمبلی کے دسویں اجلاس کے خاتمہ پر سان فرانسسکو کے اوپیرا ہاؤس میں جہاں ۲۶ رجون ۱۹۴۵ء کو اقوام متحدہ کے منشور پر دستخط کئے گئے تھے جو اہم اعلان کیا تھا وہ اس نام سے موسوم ہے۔ اس اعلان کو جنرل اسمبلی کے صدر مسٹر سلیکو وان کلیفنز نے پڑھا تھا۔ یہ اعلان چار دفعات پر مشتمل ہے۔ اور ان دفعات کا مفہوم ہے کہ:۔

۱۔ ادارہ اقوام متحدہ کے رکن ممالک اپنے اس عزم کا اعادہ کرتے ہیں کہ وہ آئندہ نسلوں کو جنگ کی تباہ کاریوں سے محفوظ رکھیں گے۔ گذشتہ دس سال نے عوام کی عالمگیر خواہش کو ایک نیا مفہوم عطا کیا ہے اور وہ جانتے ہیں کہ اگر ان اسلحہ سے جو اس وقت ان کے قبضہ میں ہیں۔ کوئی نئی جنگ لڑی گئی تو اس سے بنی نوع انسان کو ناقابل بیان نقصان پہنچے گا۔ اس لئے وہ ادارہ اقوام متحدہ کے منشور کے مطابق ایسے امن کے قیام کے خواہشمند ہیں جو تحفظ، انصاف اور ہمسایہ ممالک کے خوشگوار تعلقات پر مبنی ہو۔

۲:۔ وہ ادارہ اقوام متحدہ کے منشور میں متعین کئے ہوئے اصول کے ساتھ اپنی کامل وابستگی کا از سر نو اعلان کرتے ہیں اور اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ دیرپا امن کا انحصار اس امر پر ہے کہ اقوام عالم ان اصول پر کس طرح عمل کرتی ہیں، اور اپنے باہمی تعلقات میں انہیں کس حد تک ملحوظ رکھتی ہیں۔

۳ وہ اپنے اس عزم کا اعادہ کرتے ہیں کہ تمام بین الاقوامی تنازعات کو ادارہ اقوام متحدہ کے منشور کے مطابق پُر امن ذرائع سے اس طرح سے

کیا جائے گا کہ بین اقوامی امن، انصاف اور تحفظ کو کسی طرح بھی گزند نہ پہنچے نیز تمام قومیں مل جل کر امن اور سکون کی زندگی بسر کریں گی۔ اور

۱۲۔ ادارہ اقوام متحدہ کے تمام رکن ممالک اس بات کا عہد کرتے ہیں کہ وہ تخفیف اسلحے کے مسئلہ کا کوئی ایسا حل تلاش کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے جو قوموں کے تحفظ کی زیادہ سے زیادہ ضمانت ثابت ہو سکے اور جس کی بدولت تباہ کن ایٹمی جنگ کا خطرہ باقی نہ رہے۔

الجیرین انڈیپنڈنس کوسچن Algerian Independence question

الجیریا شمالی افریقہ کا ایک لاکھ ۲۰ ہزار مربع میل علاقہ ہے اس علاقہ کو فرانس نے سنہ ۱۸۳۰ء میں فتح کیا تھا۔ اس علاقہ کی مجموعی آبادی ۹۵ لاکھ افراد پر مشتمل ہے۔ جن میں سے دس لاکھ فرانسیسی ہیں اور باقی ماندہ عرب اور مخلوط النسل مسلمان۔ فرانس نے انتظامی زاویۂ نظر سے الجیریا کو دو حصوں۔ شمالی اور جنوبی پر منقسم کر رکھا ہے۔ شمالی علاقہ براہ راست فرنچ یونین کا جزو ہے اور وہاں سے فرنچ نیشنل اسمبلی کے لیے براہ راست نمائندے منتخب کیے جاتے ہیں اور جنوبی حصے پر فوجی حکومت قائم ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی اس علاقہ کی حیثیت فرانسیسی نوآبادی سے زیادہ نہیں کل اختیارات فرانسیسی گورنر جنرل ہی کے لیے مخصوص ہیں۔ کامل حقوق شہریت صرف فرانسیسی نوآبادکاروں، یہودیوں اور ان مسلمانوں کو حاصل ہیں جنھوں نے خود کو فرانس کا شہری قرار دے لیا ہے اور انہیں فرانس کا حق شہریت اُن کی فوجی خدمات، جائداد، تعلیم کی بنیاد پر دیا گیا ہے ورنہ الجیریا کے عام باشندے اپنی ہی وطن میں حقوق شہریت سے محروم ہیں اور بیشتر فرانسیسی نوآبادکار مقامی باشندوں کے مخالف واقع ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ عوامی بیداری کے اس دور میں الجیریا کے باشندے اس صورت حال کو برداشت نہیں کر سکتے تھے اس لیے خصوصیت کے ساتھ سنہ ۱۹۲۳ء سے وہ بھی قومی آزادی کی جدوجہد میں مصروف ہیں اور ان کی یہ جدوجہد عربوں کے عالمگیر اتحاد کے تصور سے متاثر ہے چنانچہ انکی اس جدوجہد سے متاثر ہو کر دوسری عالمگیر جنگ کے زمانہ میں فرانس کی آزاد حکومت نے الجیریا کے باشندوں کو حکومت خود اختیاری دینے کے سلسلہ میں بعض اقدامات کرنے کا وعدہ کیا تھا اور سنہ ۱۹۴۷ء میں فرانس کی نیشنل اسمبلی نے الجیریا میں سیاسی اصلاحات سے متعلق ایک قانون بھی منظور کیا تھا جس کی رُو سے الجیریا میں ۱۲۰ اراکین پر مشتمل اسمبلی کے قیام کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ مگر اس کے نصف ارکین کے انتخاب کے حق کو یورپی باشندوں اور ان مسلمانوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا جنہیں فرانس کا حق شہریت حاصل ہے۔ اسمبلی کو دو تہائی کثرت رائے سے صرف مقامی بجٹ منظور کرنے کا اختیار دیا گیا تھا۔ فرانسیسی پارلیمنٹ کے بعض قوانین کے نفاذ کو لازمی قرار دیا گیا تھا باقی ماندہ قوانین کے نفاذ کو اسمبلی کی رضامندی کے تابع کر دیا گیا تھا اور مسلمانوں کو انتظام میں زیادہ حصے دینے کا یقین دلایا گیا تھا لیکن الجیریا کے باشندے ان اصلاحات سے مطمئن نہیں ہو سکے اور اگرچہ اپریل سنہ ۱۹۴۸ء میں پہلی اسمبلی عالم وجود میں آ چکی تھی لیکن الجیریا کی قومی جدوجہد برابر جاری رہی۔ ابتداء میں الجیریا کے باشندے سیاسی اعتبار سے دو جماعتوں میں منقسم تھے جن میں سے ایک جماعت عربوں اور یورپی باشندوں کو مساوی... شہری حقوق دیئے جانے کی شرط کے ساتھ فرانس اور الجیریا کے تعلق کو باقی رکھنے کی حامی اور دوسری جماعت الجیریا میں آزاد جمہوری حکومت کے قیام کی داعی تھی۔ مگر عربوں کی عام بیداری مصر کے انقلاب اور ٹیونس اور مراکش کی آزادی نے الجیریا کی قومی تحریک کو بھی متاثر کیا ہے اور اب وہاں کی تمام سیاسی جماعتیں اپنے وطن کی آزادی کے سوال پر متفق الرائے ہیں۔ چنانچہ یکم نومبر سنہ ۱۹۵۴ء کو [illegible] ایک متحدہ قومی محاذ [illegible] کی سربراہی میں الجیریا کی قومی فوج اپنے وطن کی آزادی کی جدوجہد کر رہی ہے اور فرانس اس تحریک سے کچلنے کے لیے اپنی تمام تر فوجی قوت صرف کر رہا ہے۔ سنہ ۱۹۵۵ء میں الجیریا کا مسئلہ ادارہ اقوام متحدہ میں بھی پیش کیا گیا تھا مگر چونکہ فرانس نے اس بحث میں حصہ لینے سے انکار کر دیا تھا اس لیے اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا۔ سنہ ۱۹۵۶ء میں ہندوستان نے بھی اس سوال کو حل کرنے کے لیے ایک تجویز پیش کی تھی ۲۲ اکتوبر سنہ ۱۹۵۶ء کو [illegible] نے الجیریا کی آزادی کی تحریک کے ۵ ممتاز ترین افراد کو اس وقت گرفتار کیا تھا جب وہ سلطان مراکش سے ملاقات کرنے کے بعد سلطان [illegible]

اور وزیر اعظم تیونس سے مشورہ کرنے کے لئے رباط سے بذریعہ ہوائی جہاز تیونس جا رہے تھے اُن کے طیارہ کو فرانس کے جنگی جہازوں نے محصور کر کے الجیریا میں اترنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس واقعہ کے بعد تیونس اور مراکش میں فرانس کے خلاف زبردست مظاہرے اور فسادات ہوئے تھے اور مراکش اور تیونس نے سرکاری طور پر فرانس کی اس زبردستی اور غیر آئینی کارروائی کے خلاف احتجاج کیا تھا لیکن فرانس الجیریا کے ان رہنماؤں کو رہا کرنے پر رضامند نہیں ہوا تھا۔ الجیریا کی قومی تحریک کو عرب ریاستوں کے علاوہ تمام دنیا کے جمہوریت پسند عناصر کی تائید بھی حاصل ہے۔

پرابلم آف پیلسٹائن (Problem of Palestine) مسئلہ فلسطین

فلسطین گزشتہ بارہ سو سال سے عربوں کے زیر حکومت چلا آ رہا تھا اور دوسری عالمگیر جنگ کے خاتمہ تک اس سرزمین پر عربوں کا اقتدار قائم تھا لیکن دوسری طرف یہودیوں کو فلسطین میں آباد کرنے کی تحریک بھی جاری تھی اور بعض یورپی ممالک کی سیاسی مصلحتیں انہیں یہودیوں کی اس تحریک کو تقویت دینے پر مجبور کر رہی تھیں چنانچہ پہلی جنگ عظیم کے سلسلہ میں بعض یہودیوں کی خدمات سے خوش ہو کر ۲ نومبر ۱۹۱۷ء کو برطانیہ نے بالفور ڈیکلریشن کے نام سے جو اعلان کیا تھا اس میں اس امر کا وعدہ کیا گیا تھا کہ جنگ کے بعد یہودیوں کو فلسطین میں بسانے کی باقاعدہ مہم شروع کی جائے گی ابتدا میں فلسطین کی آبادی میں یہودیوں کا تناسب ۱۰-۶ فیصد سے زیادہ نہیں تھا۔ ۱۹۲۲ء کے اعداد و شمار کے مطابق فلسطین کی کل آبادی ۷ لاکھ باون ہزار اور یہودیوں کی تعداد اسی ہزار تھی ۱۹۳۱ء میں اس ملک کی کل آبادی ۱۱ لاکھ ۴۹ ہزار اور یہودیوں کی تعداد ۵ لاکھ ۲۸ ہزار ہو گئی تھی اور ۱۹۴۶ء میں وہ ۱۹ لاکھ ۱۲ ہزار کی آبادی میں ۶ لاکھ ۸ ہزار تک پہنچ گئے تھے دوسرے ملکوں سے یہودیوں کو لا کر فلسطین میں بسانے اور اس طرح ان کی تعداد بڑھانے کا مقصد اس ملک کی تقسیم کی بنیاد قائم کرنا تھا۔ برطانیہ کی اس یہود نواز حکمت عملی کے پیش نظر جب عربوں کو اپنے ہی ملک میں اپنے اقلیت میں رہ جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا تو انہوں نے مفتی اعظم فلسطین سید امین الحسینی کی زیر قیادت اس حکمت عملی کے خلاف منظم جدوجہد شروع کی جس کا سلسلہ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۹ء تک قائم رہا اور اس کے نتیجہ میں برطانوی حکومت نے جسے پہلی عالمگیر جنگ کے بعد مجلس اقوام نے فلسطین کا منتظم مقرر کیا تھا عربوں کو اس بات کا یقین دلایا کہ فلسطین میں یہودیوں کو ایک مقررہ تعداد میں بسانے کے بعد اس ملک میں ان کا داخلہ روک دیا جائے گا لیکن دوسری عالمگیر جنگ کے بعد یہودیوں نے بالفور ڈیکلریشن اور ۱۹۲۳ء میں برطانوی حکومت کی جانب سے اس کی باقاعدہ توثیق کا حوالہ دے کر فلسطین میں یہودیوں کی ریاست کے قیام کا مطالبہ کیا۔ ۱۹۴۶ء میں فلسطین کے حالات کی تحقیق کے لئے ایک اینگلو امریکن کمیشن مقرر کیا گیا جس نے یہ سفارش کی کہ فلسطین میں ایک لاکھ یہودی اور بسائے جائیں اور عربوں کی جانب سے شدید مخالفت کئے جانے کے باوجود اس تجویز پر بھی عمل درآمد کیا گیا حتیٰ کہ مغربی ممالک کی امداد سے فلسطین کے یہودیوں کی طاقت بہت بڑھ گئی اور جب ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو اس ملک سے برطانوی انتداب کے خاتمہ اور تقسیم کا اعلان ہوا اور اتحادی قوموں کی نگرانی میں تقسیم شدہ فلسطین کے ایک حصے کو اسلامی ممالک کی شدید ترین مخالفت کے باوجود یہودیوں کے حوالہ کیا گیا تو انہوں نے وہاں اپنی ریاست "اسرائیل" کے قیام کا اعلان کر دیا لیکن اسی لمحہ یہودیوں اور فلسطینی عربوں کے درمیان باقاعدہ جنگ چھڑ گئی۔ اور مشترک خطرہ کے پیش نظر بعد میں اس جنگ میں تمام عرب ریاستیں بھی شامل ہو گئیں۔ مگر ایک طرف تو عرب مجموعی فوج غیر منظم اور جدید ترین اسلحہ سے محروم تھیں اور دوسری جانب مغربی طاقتیں اسرائیل کی پشت پناہ بنی ہوئی تھیں اور انہوں نے نہ صرف اسرائیل کو تسلیم ہی کر لیا تھا بلکہ اسے ادارہ اقوام متحدہ کا رکن بھی بنا لیا تھا اس لئے عرب یہودیوں کو فلسطین سے نکالنے میں کامیاب نہیں ہو سکے اور نومبر ۱۹۴۸ء میں ادارہ اقوام متحدہ کی مداخلت کی بدولت فریقین کے درمیان عارضی طور پر صلح ہو گئی اور دسمبر میں ادارہ اقوام متحدہ نے بھی تقسیم فلسطین کی قرارداد منظور کر لی۔ لیکن یہ مسئلہ ابھی تک حل نہیں ہو سکا ہے۔ فریقین کے درمیان سرحدی تصادمات برپا ہوتے رہتے ہیں اور اس تقسیم کی بدولت جن عربوں کو ترک وطن کرنا پڑا ہے وہ اب تک خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

عرب اسرائیل ڈسپیوٹ (Arab Israil Dispute)

عرب ریاستوں اور اسرائیل کا براہ راست تنازعہ اگرچہ ۱۹۴۸ء کے وسط سے شروع ہوا ہے لیکن اس کی بنیاد نومبر ۱۹۱۷ء میں اس وقت قائم ہوگئی تھی جب برطانیہ نے اعلان بالفور کے ذریعہ سے فلسطین کو یہود کا قومی وطن بنانے کا یقین دلایا تھا اور اس وقت کے اتحادیوں نے نہ صرف اس کی تصدیق ہی کی تھی بلکہ اُسے صلحنامہ سیورے میں بھی جو ترکی اور اتحادیوں کے مابین ہوا تھا شامل کرلیا گیا تھا۔ جولائی ۱۹۲۲ء میں جب مجلس اقوام نے فلسطین کو برطانیہ کے زیر انتداب دیا تو یہودی وہاں کثیر تعداد میں جاکر آباد ہونے لگے لیکن عرب اسی وقت سے برطانیہ کی اس حکمت عملی کے مخالف تھے۔ اس سلسلہ میں عربوں کا مطالبہ یہ تھا کہ برطانیہ کے سفیر با اختیار سر ہنری میک ماہن اور شریف حسین کے مابین ۱۹۱۵ء میں جو خط و کتابت ہوئی تھی اس میں مقدم الذکر نے مؤخر الذکر کے اس مطالبہ کو تسلیم کرلیا تھا کہ مجوزہ عرب سلطنت جزیرہ نما عرب فلسطین، شام اور بصرہ پر مشتمل اور اس کی مغربی سرحد بحیرہ روم کے ساحل تک وسیع ہوگی۔ البتہ میک ماہن نے دمشق اور الپو کے مغرب میں واقع کچھ علاقہ کو اس سلطنت میں شمولیت سے مستثنیٰ رکھا تھا اس لئے فلسطین کو عربوں ہی کے قبضہ میں رہنا چاہیے لیکن چونکہ برطانوی مدبرین عرب سلطنت کے قیام کی بجائے عربوں کو غیر متحد رکھنے کے لئے عربوں کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کرنا چاہتے تھے اور انہیں اس امر کا اندیشہ لاحق تھا کہ اپنی اس حکمت عملی سے عربوں اور برطانیہ کے مابین اختلاف بھی پیدا ہو سکتا ہے، اس لئے وہ دنیائے عرب کے قلب میں ایک ایسی ریاست قائم کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے جو مستقبل میں ان کے لئے فوجی مستقر کا کام دے سکے۔ اس لئے انھوں نے ۱۹۲۳ء ہی میں دریائے وجد کے مشرق میں واقع فلسطین کے ایک حصہ کو علیحدہ کرکے اُسے شرق اُردن کے نام سے ایک علیحدہ ریاست بنادیا اور وہاں یہودیوں کے داخلہ کو ممنوع قرار دے دیا۔ مگر باقی ماندہ فلسطین میں یہودی بدستور آتے اور آباد ہوتے رہے۔ ۱۹۲۹ء میں جب یہودیوں کی آبادی صرف دو لاکھ تک پہنچی تھی۔ اُن کی نوآبادکاری کے خلاف عربوں نے شدید ہنگامے برپا کئے اور برطانوی حکومت اس مسئلہ کو طے کرنے کے لئے وہاں ایک کمیشن بھیجنے پر مجبور ہوگئی۔ ۱۹۳۰ء میں اس کمیشن نے اپنی جو رپورٹ پبلش کی تھی اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ______ فلسطین میں یہودیوں کے داخلہ کو بند کرکے وہاں ایک مجلس قانون ساز قائم کردی جائے۔ اگر اس سفارش پر عمل کیا جاتا تو اس مجلس میں عربوں کو اکثریت حاصل ہوتی لیکن اس پر عمل درآمد نہیں کیا گیا۔ ۱۹۳۶ء میں عربوں نے ایک مرتبہ پھر یہودیوں کی مسلسل آمد کے خلاف شدید ہنگامے برپا کئے اور اس مرتبہ برطانوی حکومت نے "پیل کمیشن" کے نام سے جو کمیشن مقرر کیا اس نے فلسطین کو دو حصوں میں منقسم کرکے عربوں اور یہودیوں کی علیحدہ علیحدہ ریاستیں قائم کرنے کی سفارش کی لیکن عربوں کے علاوہ بیشتر یہودیوں نے بھی اس تجویز کو منظور کرنے سے انکار کردیا۔ مئی ۱۹۳۹ء میں برطانیہ نے فلسطین کے متعلق ایک قرطاس ابیض شائع کرکے اپنی جس نئی حکمت عملی کا اعلان کیا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ فلسطین میں یہودیوں کی ریاست کی بجائے ایک ایسی آزاد ریاست قائم کی جائے گی جس میں دونوں قوموں کو اختیارات حاصل ہونگے اس ریاست میں یہودیوں کی آبادی کا تناسب ایک تہائی سے زیادہ نہیں ہوگا۔

آئندہ پانچ سال میں صرف ۷۵ ہزار یہودی فلسطین میں داخل ہوسکیں گے، اور اس ریاست کا قیام دس سال کے بعد عمل میں آئے گا۔ اس تجویز سے عربوں اور یہودیوں دونوں نے اپنی بیزاری کا اعلان کیا اور مجلس اقوام کے مینڈیٹ کمیشن نے مسترد کردیا۔ دوسری عالمگیر جنگ میں جب نازی جرمنی کی فوجیں پورے یورپ پر قابض ہوگئی تھیں تو یہودی بتعداد کثیر فلسطین میں آنے لگے۔ اور چونکہ اس وقت برطانوی حکومت اپنی جنگی مصلحتوں کی بنا پر فلسطین میں ان کی آمد کو روکنا چاہتی تھی اس لئے ایک جانب تو اس نے یہودیوں کو فلسطین لانے والے جہازوں کو سمندر میں روک کر یہودیوں کو قبرص اور دوسرے مقامات میں بھیجنا شروع کردیا اور دوسری طرف یہودی دہشت زدگان، دہشت زدگی اور تشدد کے ذریعہ سے برطانوی حکمت عملی کو تبدیل کرانے کی کوشش کرنے لگے اور اس طرح یہودیوں اور برطانیہ کے تعلقات خراب ہوگئے۔ اس

مدت میں موریسن پلان کے ذریعہ سے فلسطین کو منقسم کر کے عربوں اور یہودیوں کی ایک وفاقی دار حکومت قائم کرنے کی کوشش بھی کی گئی تھی۔
لیکن دونوں قوموں نے اس تجویز کو بھی نامنظور کر دیا تھا۔ اس کے بعد فروری ۱۹۴۷ء میں برطانیہ نے فلسطین کے اس مسئلہ کو ادارہ اقوام متحدہ میں
پیش کرنے کا اعلان کیا اور ۳۱ اگست کو ادارہ اقوام متحدہ کی مقرر کی ہوئی خصوصی مجلس کے گیارہ اراکین میں سے ۸ اراکین نے متفقہ طور پر فلسطین کو
تقسیم کر دیئے جانے کی سفارش کی۔ اس تجویز کے ساتھ اختلاف کرنے والے تین اراکین ہندوستان، پرشیا اور یوگوسلاویہ تھے اور انھوں نے
موریسن پلان کے مطابق فلسطین وفاقی حکومت کے قیام کی سفارش کی تھی نومبر ۱۹۴۷ء میں مجلس عمومی نے فلسطین کی تقسیم کی تجویز منظور
کر لی۔ لیکن اس تجویز کے مطابق فلسطین کی جو تقسیم کی جاتی وہ جغرافیائی اعتبار سے منتشر اور غیر مربوط ہوتی۔ اس کی رو سے یہودیوں کو شمال
میں مشرقی گلیلی، وسط میں ساحلی علاقہ اور جنوب میں نجیب کا وسیع خطہ نیز عربوں کو مغربی گلیلی، وسط میں اندرونی علاقہ، بندرگاہ جافا، وہاں
تک پہنچنے کے لئے ایک تنگ راستہ اور جنوبی ساحلی علاقہ بشمول بندرگاہ غازا دینے اور یروشلم کو اقوام متحدہ کے زیر انتظام دیدینے کا فیصلہ کیا گیا تھا لیکن
عربوں نے اس فیصلہ کو منظور نہیں کیا۔ حتیٰ کہ انتداب کی مدت ختم ہونے کے قریب پہنچ گئی اور فلسطین میں تقریباً چھ لاکھ یہودی آباد ہو گئے اور انہوں
نے زندگی کے ہر شعبہ میں اپنی تنظیم کر لی لیکن عرب بدستور فلسطین میں ان کی آمد اور آبادکاری کی مخالفت کرتے رہے۔ ۱۵ مئی ۱۹۴۸ء کو انتداب کی مدت
ختم ہو جانے کے بعد برطانوی افواج نے فلسطین کو خالی کر دیا۔ اس سے پہلی شب کو وہاں ریاست اسرائیل کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ ۱۵ مئی کو
برطانوی افواج کی واپسی کے بعد تمام عرب ریاستوں۔ مصر، شام، لبنان، شرق اردن، عراق، سعودی عرب۔ کی افواج نے چاروں طرف سے
اسرائیل پر یورش کر دی اور اگرچہ بعض داخلی اور خارجی اسباب کے باعث وہ اسرائیل کو شکست نہیں دے سکیں لیکن انھوں نے یروشلم کے
قدیم حصہ پر قبضہ کر لیا۔ اس مرحلہ پر ادارہ اقوام متحدہ نے کاؤنٹ برنا ڈوٹ کو ثالث مقرر کیا اور ثالث نے جون میں فریقین کے مابین عارضی
طور پر صلح کرانے کے بعد یہ تجویز پیش کی کہ۔ یہودی جنوب کے تمام علاقہ یا اس کے ایک حصہ سے دست بردار ہو کر شمال میں مغربی گلیلی لے لیں
اور فلسطین میں ان کی آمد کو ادارہ اقوام متحدہ کے تابع کر دیا جائے۔ لیکن فریقین نے اس تجویز کو بھی نامنظور کر دیا۔ اور جولائی میں دوبارہ تصادم
شروع ہو گیا۔ ستمبر میں انتہا پسند یہودیوں نے کاؤنٹ برنا ڈوٹ کو ہلاک کر دیا اور ان کی جگہ ڈاکٹر رالف بنش کو ثالث مقرر کیا گیا۔ ۵ اکتوبر
کو مفتی اعظم سید امین الحسینی کی سربراہی میں مصر کی زیر حمایت فلسطین کی عارضی حکومت قائم ہوئی۔ اس حکومت کا صدر مقام غازا تھا لیکن
شرق اردن کے حکمران عبداللہ چونکہ فلسطین یا کم از کم اس کے عرب حصے کو شرق اردن کے ساتھ وابستہ کرنا چاہتے تھے اس لئے انھوں نے
اس حکومت کے قیام سے اختلاف کیا۔ اس طرح ایک جانب تو عربوں میں اختلاف رائے رونما ہونے کے باعث ان کی عسکری قوت بھی کمزور ہو گئی اور
دوسری طرف اسرائیل نے سرحدوں کے تعین اور یروشلم کے اس حصے کے الحاق کا مطالبہ شروع کیا جو یہودیوں کے قبضہ میں تھا۔ اسی سال کے آخر میں
جب ادارہ اقوام متحدہ کا اجلاس پیرس میں منعقد ہوا تو اس میں فلسطین کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا۔ ادارہ نے فلسطین کے لئے اسلحہ بہم پہنچانے کی
ممانعت کر دی۔ لیکن اسرائیل کو اسلحہ ملتے رہے۔ ۱۹۴۸ء کے اواخر میں عربوں اور یہودیوں کی جنگ ختم ہو گئی اور ادارہ اقوام متحدہ کے مقرر کردہ
ثالث کی کوششوں سے فروری ۱۹۴۹ء میں جزیرہ روڈس میں پہلے مصر اور اسرائیل کے مابین اور اس کے بعد اسرائیل اور دوسری عرب ریاستوں
کے درمیان متارکہ کی گفت و شنید شروع ہوئی جس کے نتیجہ میں ۲۴ فروری کو مصر اور اسرائیل کے درمیان متارکہ ہو گیا اس عارضی مصالحت نامہ کی رو سے
اسرائیل کو مشرقی نجیب میں تھوڑی سی فوج رکھنے کی اجازت دیدی گئی۔ غازا۔ رفاہ کے ساحلی علاقہ پر مصر کا قبضہ بحال رکھا گیا اور اسے
وہاں ریگستان سینائی میں کچھ افواج رکھنے کی اجازت حاصل ہو گئی اور دونوں نے چند موجودہ چوکیوں کو خالی کر دینے اور مذکورہ بالا علاقوں میں کم از کم
فوجیں رکھنے کا یقین دلایا۔ ۳ مارچ کو شرق اردن کے ساتھ بھی اسی قسم کا معاہدہ ہو گیا جس کی رو سے فریقین نے اس وقت کی فوجی صورت حال کو بدستور برقرار
رکھنے کا وعدہ کیا تھا نیز اسرائیل اور دوسری عرب ریاستوں کے مابین بھی اسی نوعیت کے عارضی صلحنامے طے ہو گئے۔ لیکن چند ہی روز کے بعد اسرائیل نے

نجیب کے پورے علاقہ کو اپنے زیر انتظام لے لینے کا اعلان کر دیا اور چونکہ اس امر کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ اسرائیلی فوج شرق اردن کی بندرگاہ عقبہ پر قبضہ کر لے گی اس لئے برطانوی افواج کو وہاں متعین کر دیا گیا اور اسرائیلی فوجیں قریب ہی بحیرہ احمر کے ایک ساحلی مقام میں مقیم ہو گئیں۔ یروشلم کا نیا حصہ اسرائیل کے حوالہ کر دیا گیا اور ادارۂ اقوام متحدہ کا کمیشن فلسطین میں مقیم رہا۔ اور اپریل ۱۹۴۹ء میں لوزان میں اسرائیل اور عرب ریاستوں کے مابین مستقل صلح کے لئے گفت و شنید شروع ہوئی مگر ناکامی پر ختم ہو گئی۔ اس طرح ۱۹۴۹ء سے اسرائیل اور عرب ریاستوں کے درمیان رسمی طور پر عارضی صلح تو قائم ہے لیکن مصر اور شرق اردن کی سرحدوں پر جو اب محض اُردن کے نام سے موسوم ہے ہمیشہ تصادمات برپا رہتے ہیں اور فریقین کا بیان ہے کہ دوسرا فریق اس کے خلاف بے قاعدہ فوجی کارروائی عمل میں لاتا رہتا ہے۔ مگر یہ تنازعہ صرف اسرائیل اور عرب ریاستوں ہی کا تنازعہ نہیں بلکہ در پردہ اس تنازعہ سے دنیا کی بڑی طاقتیں بھی دلچسپی رکھتی ہیں ریاست اسرائیل کے قیام کی تمام ابتدائی ذمہ داری برطانیہ پر عائد ہوتی ہے لیکن دوسری عالمگیر جنگ کے زمانہ سے مشرق وسطیٰ کے ساتھ متحدہ امریکہ کے مفادات بھی وابستہ ہو گئے ہیں اس لئے سوویت یونین کے مقابلہ میں برطانیہ اور متحدہ امریکہ کے اتحاد کے باوجود داخلی طور پر اس خطۂ ارض کے متعلق دونوں طاقتوں کے درمیان حصول اقتدار کی جدوجہد بھی جاری رہتی ہے جسکے نتیجہ میں آہستہ آہستہ اسرائیل بھی متحدہ امریکہ کے زیر اثر آ گیا۔ مگر بنیادی طور پر یہ ریاست مشرق وسطیٰ میں مغربی طاقتوں کے زبردست مستقر کی حیثیت رکھتی ہے اور چونکہ عربوں کو اس امر کا اندیشہ لاحق رہتا ہے کہ اسرائیل کے توسط سے مغربی طاقتیں کسی وقت بھی اُن کی آزادی اور خود مختاری کو سلب کر سکتی ہیں اس لئے اُن کے اور اسرائیل کے مابین مسلسل بے اعتمادی اور کشیدگی قائم ہے۔ تمام عرب ممالک اسرائیل کے مقابلہ میں متحد ہیں اور اس کے مقابلہ میں مشترکہ مدافعت کے لئے تمام عرب ریاستوں میں دفاعی معاہدے بھی ہو چکے ہیں اکتوبر ۱۹۵۶ء کے اواخر میں جارڈن کے عام انتخابات کے بعد ہی مقصد سے جارڈن شام اور مصر کی مشترکہ فوجی کمان کی تنظیم کا فیصلہ بھی کیا گیا تھا اور اسی فیصلہ کو بہانہ بنا کر ۲۹ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو اسرائیل نے مصر پر حملہ کیا تھا اور مصر و اسرائیل کے اس تصادم کے بعد نہر سویز کے تحفظ کے نام پر برطانیہ اور فرانس نے مصر میں اپنی افواج بھیجدی تھیں اور اس طرح عربوں کے اس اندیشہ کو صحیح ثابت کر دیا تھا جو انہیں اسرائیل کے وجود سے لاحق رہتا ہے۔ جیسا کہ سطور بالا میں بتایا جا چکا ہے عربوں اور اسرائیل کا تنازعہ ابتدا ہی سے مجلس تحفظ کے زیر غور رہا ہے۔ لیکن چونکہ مغربی طاقتیں اسرائیل کی امداد کرتی رہی ہیں اس لئے مجلس تحفظ بھی اس کے خلاف کوئی موثر اقدام نہیں کر سکی اور یہ مسئلہ روز بروز پیچیدہ تر ہوتا جا رہا ہے۔

اسرار احمد آزاد

پردے کی اہمیت

مولوی نذیر احمد کے ہاں ایک مرتبہ خواجہ صاحب کے ساتھ مجھے جانے کا اتفاق ہوا۔ کرتا تہہ بند باندھے، کھری چارپائی پر تشریف فرما تھے۔ چارپائی کمرے میں بچھی تھی۔ چارپائی کے علاوہ کمرے میں تین چار مونڈھے پڑے تھے۔ ہم مونڈھوں پر بیٹھ گئے۔ خواجہ صاحب نے باتیں کرتے کرتے پوچھا "حضرت، آپ کی پردے کے متعلق کیا رائے ہے؟" مولوی عبد الحلیم شرر لکھنوی کا "دل آزیب النساء کی مصیبت" پردے کے خلاف نیا نیا نکلا تھا۔ جس نے پردے کی بحث چھیڑ رکھی تھی۔ مولوی نذیر احمد نے گرج کر کہا "کس کے پردے کے متعلق سوال ہے، لڑکیوں کے یا لڑکوں کے؟ میری رائے میں تو آجکل لڑکوں کا بھی پردہ ہونا چاہئیے۔"

۱۹۱۱ء تک بے پردگی دلی والوں کے نزدیک اتنی معیوب تھی کہ ۱۹۱۱ء میں مولانا محمد علی دلی آئے ہوے اور انکے ساتھ بیگم محمد علی برقعہ اور منہ چھپائے تانگہ میں سے نکلیں تو دلی والوں نے ناک بھوں چڑھائی کہ تانگہ پر پردہ کیوں نہیں پڑا تھا۔۔۔۔۔

منشی ذکاء اللہ ضابطہ اور خاموش طبیعت کے انسان تھے۔ ان کے ہاں بیٹی ہوئی ہی نہیں۔ بیٹی ہوتی اور کوئی آجکل کی سی غلطی کرتی تو منشی ذکاء اللہ اسے سلو پوائزن (slow poison) پلاتے اور خاموشی سے قبر میں سلا دیتے۔ مولوی نذیر احمد کی طبیعت سلطان ابن سعود سے مشابہ تھی۔ مولوی نذیر احمد غلطی کرنے والی اور غلطی کرنے دینے کو علی الاعلان سنگسار کر کے رہتے۔ ("میرے زمانہ کی دلی")

(آتش - ملا واحدی)

ہماری نظر میں

انقلاب روس اور روس انقلاب کے بعد

از:۔ مسعود جوہر (بی اے) ضخامت ۶۲۸ صفحات
(مجلد گرد پوش کے ساتھ)
قیمت:۔ سات روپے

ملنے کا پتہ:۔
مکتبہ برہان اردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۶

کتاب کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ اس میں کیا ہوگا؟ اس موضوع پر اردو ادب میں یہ اپنے طرز کی منفرد کتاب ہے! لائق مصنف نے معلومات کا ایک سمندر ہے جو اس جام میں سمو دیا ہے۔ راسپوٹن نے سب سے پہلے زارینہ کی سہیلی ویروبودا کو مسحور کیا، اور پھر اس کے ذریعہ سے زارینہ تک رسائی حاصل کی۔ زار میں کس درجہ انانیت بلکہ فرعونیت پائی جاتی تھی، اور ملکہ اُس کے دل و دماغ پر چھا گئی تھی، زار کی شہنشاہی کا کس طرح زوال ہوا؟ یہ تمام تفصیل ہمیں کتاب میں ملتی ہے۔

روس میں انقلاب کا بانی مبانی لینن تھا، مگر شروع شروع میں اس کو وہاں کے رجعت پسند طبقہ نے جعلی کاغذات مرتب کر کے یہ مشہور کرا دیا کہ لینن جرمن جاسوس ہے! حکومت نے بڑی چالاکی سے اس خبر کو پھیلایا۔ یہاں تک کہ انقلابی جمہور اور فوج تک اس سے متاثر ہو گئے۔ بالشویکوں کو بڑی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا، کچھ دنوں کے لئے روس میں اُن کی ہوا اُکھڑ گئی، لینن کو فرار ہو جانا پڑا، اور وہ پیٹرو گراڈ کی گلیوں میں چھپتا پھرا۔

اور پھر بالشویکوں سے عوام کی بیزاری اور نفرت کا یہ عالم ہو گیا کہ لوگ بالشویکوں کی حکومت کے مقابلہ میں قیصر جرمنی کی حکومت پسند کرنے لگے۔ اس دلچسپ، سبق آموز اور عبرت خیز تفصیل کے بعد کرنسکی اور کورنیلوف کے نزاع اور کش مکش کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

اس "سرخوں" کا شروع ہی سے کیا رنگ تھا؟ اس کی المناک داستان روس کے مشہور افسانہ نگار گورکی کی زبان سے سنیئے:۔

> "لینن، ٹراٹسکی اور ان کے معتقدین فتح کے غرور میں سرشار ہو رہے ہیں، انھوں نے تقریر و تحریر کی آزادی سلب کر لی ہے اور جمہوری روایات کو فنا کر دیا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ کیا لینن اپنے مخالفوں کو زار کی طرح گرفتار نہیں کر رہا ہے، جب وہ ایسا کر رہا ہے تو زار اور لینن میں کیا فرق رہا۔۔۔۔۔۔۔۔ لینن حکیم نہیں بلکہ عطائی ہے، جس کو پرولتاری کی زندگی و موت سے سروکار نہیں، وہ اس طرح اشتراکیت پھیلا رہا ہے جیسے کیچڑ میں پوری طاقت سے رولر چلایا جاتا ہے؛ وہ روسی پرولتاری طبقے کے خون سے سیاسی تجربات کر رہا ہے۔۔۔۔۔"

لینن کی زبان سے دوران تقریر میں یہ جملہ نکل گیا تھا:۔

"جو چرایا گیا ہے، اُسے چرا لو"

روسی انقلابیوں نے اس جملہ کو گرہ میں باندھ لیا، انھوں نے لوٹ مار شروع کردی، اور خوشحال طبقہ کی ہر چیز کو طاقت کے زور سے چھین لیا لیکن شاید اس سے بے خبر تھا کہ اُس کا ایک جملہ پورے روس کے معاشرتی نظام کو درہم برہم کر کے رکھ دے گا۔ چنانچہ انقلابی جمہور کی...... غارت گریوں اور ستم رانیوں کو دیکھ کر، وہ خود چیخ اٹھا۔

"میں نے یہ جملہ کہا اور اسے بھول گیا، لیکن انقلابی جمہور نے اُسے بنیادی اصول مان کر، اس کے مطابق ایک پروگرام بنا لیا۔"

انقلاب اپنی ذات سے کوئی بُری چیز نہیں ہے مگر جس انقلاب کے پیچھے کوئی اخلاقی نظریہ کارفرما نہ ہو، وہ "برا انقلاب" ہوتا ہے۔ چنانچہ روس میں انقلابیوں کے ہاتھوں میں جب وہاں کی صنعت و حرفت آئی تو ملک میں تباہی مچ گئی اور گورکی جیسے روسی مفکر کو اظہارِ حق کرنا پڑا۔

"ہم نے صنعت و حرفت کو تماشہ بنا دیا ہے، ایک درزی معدنیات کا اور ایک مصور کپڑے کے کارخانے کا منیجر مقرر کیا جا رہا ہے۔"

اس اندھے انقلاب کا نتیجہ یہ نکلا کہ سارا ملک ایک عجیب بحران اور انتشار کی دلدل میں پھنس گیا، گرانی کا یہ عالم ہو گیا کہ ایک سیر مکھن کی قیمت دو پونڈ تک پہنچ گئی اور لوگ کتے کا گوشت تک کھانے لگے، اور کتے کا گوشت بھی دو پونڈ میں ایک سیر ملتا تھا۔

مزدوروں کو لاقانونیت، مار دھاڑ اور دوسروں کے مال و متاع کو لوٹنے کی ترغیب ان "سرخوں" ہی نے دی تھی۔ خوشحال طبقہ کو تباہ کرنے کے بعد اب انقلابی مزدوروں نے بالشویکی لیڈروں پر قاتلانہ حملے شروع کر دیئے، یہاں تک کہ اُن کا لیڈر آرانسکی گولی کا نشانہ بن گیا سُرخ فوج نے بھی اس تشدد کا جواب کھلی ہوئی سفاکی اور بربریت سے دیا اور اپنے ایک ایک آدمی کا بدلہ ایک ایک ہزار انقلابی مزدوروں کے خون سے لیا۔

بالشویکوں نے روسی ترکستان کے مسلمانوں میں اس طرح پھوٹ ڈالی کہ خوشحال مسلمان کو "غریب مسلمان" سے لڑوا دیا، جو ملت ایک کلمہ پر صدیوں سے جمع تھی اُسے "غریب" اور "امیر" دو طبقوں میں بانٹ کر طبقاتی نزاع کھڑی کر دی، اور وسطِ ایشیا میں "اُمتِ مسلمہ" کی وحدت، یکجہتی و اخوت کو پارہ پارہ کر دیا۔

غازی انور پاشا نے مسلمانوں کی اس ابتر حالت کو دیکھ کر سُرخ فوج کے خلاف محاذ قائم کیا، اور میدان میں پہنچ کر "اتحادِ مسلمین" کی سعی شروع کر دی، اور بالشویکوں کے نعرے "دنیا کے مزدور متحد ہو جاؤ" کے مقابلہ میں "دُنیا کے تمام مسلمان متحد ہو جاؤ" کا نعرہ اپنا نصب العین بنا لیا مگر آخر کار سُرخ فوج کے ہاتھوں انہیں جامِ شہادت نوش کرنا پڑا۔

اسٹالین کے بارے میں لائق مصنف کی رائے ہے:۔

"اسٹالین آرزوئے انقلاب سے سرشار، لیکن علم و فضل سے بے بہرہ، اپنے ہم وطنوں کی فطرت کا مُبصر لیکن تخلیقی فکر سے عاری، جبر و قہر کا ماہر لیکن محبت و الفت سے ناآشنا تھا۔"

روس کے قائد ٹروٹسکی نے اسٹالین کے پارٹی سیکرٹری ہو جانے پر لکھا:۔

"اسٹالین کی جن خصوصیات نے لینن کو اس کا گرویدہ بنا دیا تھا وہ اس کی مستقل مزاجی اور طریق کار تھا جو کہ عیاری ہے، لیکن آخر کار لینن کو بھی اسٹالین کے محدود سیاسی زاویۂ نگاہ اور اس کی غیر لطیف فطرت و بے ضمیری کا اعتراف کرنا پڑا۔"

بولشویک لیڈر بخارن نے کہا:۔

"اسٹالین روس کا چنگیز خاں بن گیا ہے، اور اب ہمارا گلا گھونٹا جانا یقینی ہے...... طاقت پر قبضہ رکھنے کے لئے اسٹالین پسپا بھی ہوجاتا ہے، وہ صرف پشت سے اگر کمر میں خنجر گھونپا جانتا ہے، اسٹالین وقت پر چاپلوسی کرنے سے بھی اعراض نہیں کرتا، حال ہی میں مجھ سے کہنے لگا "حکومت میں تم اور میں ہی تو مثل ہمالیہ کے ہیں! باقی ماندہ تو خاک کے ذرے ہیں" ـــ اور اسٹالین کی ان تخریبی کارروائیوں کا نتیجہ خانہ جنگی ہوگا، جو اکتوبر کے انقلاب کو خون میں غرق کر دے گی"

اس کتاب میں ٹروٹسکی اور اسٹالین کے اختلافات کی بھی تفصیل ملے گی۔ اور ہمیں کے جابجا شواہد نظر آئیں گے کہ اسٹالین سے جس نے اختلاف کیا، اُسے موت کی گود میں سونا پڑا اور جو کوئی زندہ بچ گیا، اسے بالکل مفلوج اور بے دست و پا بنا دیا گیا اس خونیں انقلاب کا سب سے بڑا المیہ تو کسانوں کے ساتھ ان "سُرخوں" کا وحشیانہ سلوک ہے، لاکھوں کسانوں کو خاک و خون میں جس طرح تڑپایا گیا ہے، اس کی تفصیل پڑھ کر "کمیونزم" سے جس قدر نفرت ہوتی ہے، اُسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

"کمیونزم" کی "اسلاف پرستی" (Heroe worship) اور مبالغہ آمیزی بھی دیکھئے اور پڑھنے کے قابل ہے لینن یہی کہتا رہا کہ:۔

"مجھ سے غلطیاں ہوئی ہیں اور ہوتی رہیں گی"

مگر لینن کے مرنے کے بعد روس میں اس پر تنقید کرنا سنگین جرم قرار دے گیا، اور ببانگ دہل کہا گیا کہ:۔

"لینن معصوم عن الخطا تھا"

اس طرح حکمراں طبقہ نے اپنے آپ کو تنقید سے بچا لیا۔

اس کتاب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ:۔

"روس میں سیاسی قیدیوں کو کسی وکیل منتخب کرنے یا عزیز و اقارب سے ملنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ روس کا ایک عجیب و غریب قانونی دستور یہ ہے کہ سیاسی ملزم کو عام عدالت میں اس وقت پیش کیا جاتا ہے جب کہ ملزم ابتدائی خفیہ عدالت میں اقرار جرم کر لیتا ہے، یہ امر یقینی ہے کہ اس خفیہ عدالت میں اقرار جرم کرانے کے لئے تیسرے درجہ کی کارروائیاں ہوتی ہوں گی، روس میں سیاسی ملزم کو عدالت میں پیش کرنے کا صرف یہ مقصد ہوتا ہے کہ اقرارِ جرم کا مظاہرہ ہو جائے اور جمہور ملزمین سے شدید نفرت کرنے لگیں"

"حکومت روس کی یہ خاص حکمت عملی ہے کہ اگر کسی مرد کو غیر ملک میں جانے کی اجازت دی جاتی ہے تو اس کے اہل و عیال کو نیک چلنی کی ضمانت کے طور پر روس میں رکھا جاتا ہے تاکہ وہ اپنے اہل و عیال کی عافیت کے خیال سے دوسرے ملک میں پہنچ کر روسی حکومت پر تنقید نہ کرنے پائے"

"۱۹۳۲ء میں محکمہ زراعت کے ۳۵ اعلیٰ عمال کو بلا کسی عام عدالت کے روبرو پیش کئے اور ان کا جرم ثابت کئے بغیر انہیں قتل کر دیا گیا"

"حکمراں پارٹی کی خفیہ فوج اور جی۔ پی۔ او کے ہمہ گیر تسلط پر از سر نو نظر ڈالنی ضروری ہے، جی۔ پی۔ او کسی

بھی فرد کو بلا کوئی الزام لگائے ہر وقت ہر مقام پر گرفتار اور لامحدود وقت تک قید رکھ سکتا ہے، ملزم کو زد و کوب، بھوکا اور بیدار رہنے کی سزا دے سکتا ہے، جونکوں سے اس کا خون چسوا سکتا ہے ... ان مظالم کے علاوہ جی. پی. او کے قبضہ قدرت میں ملزم پر تشدد کرنے کا ایک ایسا موثر ہتھیار موجود ہے، جس کے سامنے مندرجہ بالا مادی تکالیف راحت معلوم ہوتی ہیں، جی. پی. او ملزم کے بے گناہ ضعیف ماں باپ، جوان عمر بھائی بہن شریک حیات اور معصوم اولاد کے ساتھ بھی وہی دردناک سلوک کر سکتا ہے، جو مجرم کے ساتھ روا رکھتا ہے ...... خود ملزمین اور اُن کے بے گناہ متعلقین پر جی. پی. او اتنے شدید مظالم ڈھاتا ہے کہ اپنے متعلقین کو مصائب سے بچانے کی خاطر ملزمین اقرار جرم پر تیار ہو جاتے ہیں۔"

جرمنی کو روس میں کس طرح شکست ہوئی؟ اور مغربی طاقتیں، اُن میں بھی خاص طور سے حکومت برطانیہ جرمنی، اور روس کے ساتھ سیاسی کھیل کھیلتی اور کیسی شاطرانہ چالیں چلتی رہیں، یہ تفصیل بھی بہت دلچسپ ہے!

صفحہ ۲۰۹ پر "کتنی رنگ" کو "کتھئی رنگ" لکھا ہے۔

"من چہ زجاہ طلب" (صفحہ ۳۰۰) "ذاد علفت" کی جگہ "اور" لکھنا تھا۔ "اس ہی دن" (صفحہ ۵۵۵) "اُسی دن" لکھا اور بولا جاتا ہے۔ استفادہ حاصل نہ کر سکیں" (صفحہ ۵۷۰) "استفادہ نہ کر سکیں" لکھنا تھا۔ "حاصل" زائد ہے۔ صفحہ ۲۶۰ پر "پے نیب مرام" کو ——— "تکمیل و مرام" لکھا ہے۔

خدا جانے ان غلطیوں کا مصنف ذمہ دار ہے یا کاتب کہ "حزب" کو "حذب" ——— "اغماض" کو "اغماز" "بجا ادب" کو "بجا رعب" "نذر" کو "نظر" لکھا گیا ہے۔

کتاب کی زبان شستہ اور سلیس ہے، مصنف کی پہلی تصنیف نگاہ سے گزری اور اُن کی مشاقی کا اعتراف کرنا پڑا ———

نمونے: ———

"حالات و واقعات نے کرنسکی کے ہاتھ سے اس کے گورکنوں کو مُسلح کرا دیا۔"

"لیکن افسوس کہ کرنسکی اپنا وعدہ پورا نہ کر سکا، جس مُدبر کو تاریخی تقاضے رُد کر چکے ہوں وہ واپس نہیں آیا کرتا۔"

"ہارے ہوئے جواری کا یہ قاعدہ ہوتا ہے کہ وہ ہر داؤ کو بڑھاتا جاتا ہے کہ جائے تو سب جائے اور آئے تو سب آئے، یہی ہٹلر کی نفسیاتی کیفیت ہو گئی تھی۔"

"جس ملک کے بسنے والوں کے لئے سفر کلفت ہو اور منزل راحت، اور جس قافلہ میں نہ بانگِ درا ہو اور نہ ذوقِ سفر وہ خاموش و پُرسکون قافلہ اس انسان کو میر قافلہ کیونکر بنا سکتا تھا جس کا ذوقِ سفر پابندِ منزل نہ تھا اور جس کی آتشیں گفتار اور پُرجوش کردار موجودہ دور کے انسانیت سوز تہذیب و تمدن کو خاک و سیاہ کرنے کے درپے تھے، لیکن کیا کیا جائے اس رباطِ کہن کی رسمیں عجیب ہیں، اس دنیا میں کبھی کبھی یہ تعجب خیز منظر نظر پڑتا ہے کہ انسان کی اپنی طبیعت کی زود شکنی اس کے لئے بلائے جان بن جاتی ہے، انقلاب و سرفروشی کی آرزو ٹروٹسکی کو روس

لائی تھی اور اس کی دونوں آرزوئیں پوری ہوئیں، انقلاب بھی برپا کیا اور اپنا سر بھی ماسکو کے دیوتا کی نذر کر دیا، جس سرزمین پر باطل کی ظلمت چھا جائے، وہاں اگر کوئی تہذیب و تمدن پھیلانا بھی چاہے، تو کامیابی بھی نہیں ہوتی بلکہ صرف کربلا کا حادثہ پیش آتا ہے۔"

کوئی شک نہیں "انقلاب روس" پر یہ بہت جامع کتاب ہے، جسکے مطالعہ سے معلومات میں بیش از بیش اضافہ ہوتا ہے، اور یورپ کی تاریخ کے بہت سے واقعات نگاہ کے سامنے مجسّم ہو جاتے ہیں!

مشاہیر جنگ آزادی ۱۸۵۷ء تا ۱۹۵۶ء

از:- مفتی انتظام اللہ شہابی، ضخامت ۴۰۰ صفحات (مجلّد، رنگین گردپوش کے ساتھ) قیمت:- چار روپے آٹھ آنے،

ملنے کا پتہ:- محمد سعید اینڈ سنز تاجرانِ کتب، قرآن محل، مقابل مولوی مسافر خانہ، کراچی۔ (پاکستان)

۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۵۶ء تک جن مشاہیر نے ہندوستان کی آزادی کے لئے جان و مال کی قربانیاں دی ہیں، اُن کا تذکرہ اس کتاب میں ملتا ہے۔ سنہ ستاون کی جنگ آزادی کے چند مشاہیر:-

ابوظفر بہادر شاہ، مولوی احمد اللہ شاہ مدراسی، جنرل بخت خاں روہیلہ، مولانا فضل حق خیرآبادی، منیر شکوہ آبادی، امام بخش صہبائی، نواب مصطفےٰ شیفتہ، تانتیا ٹوپے، شاہزادہ مرزا مغل.....

اس کے بعد مسلم لیگ، خلافت اور کانگریس کے لیڈروں کے مختصر حالات پیش کئے گئے ہیں، جن میں ڈھاکہ کے نواب خواجہ سر سلیم اللہ سے لے کر مولانا مفتی عتیق الرحمٰن دیوبندی تک شامل ہیں!

۱۸۴۵ء میں قلعہ معلی میں ایک مشاعرہ منعقد ہوتا ہے، یعنی غدر (۱۸۵۷ء) سے بارہ سال قبل، اس سلسلہ میں فاضل مصنف.. لکھتے ہیں:-

"حالی کے پاس مرزا غالب بیٹھے ہوئے ہیں۔" (صفحہ ۶۷)

اس وقت مولانا حالی کی عمر بارہ تیرہ سال کی ہوگی اس لئے اُن کا قلعہ معلی کے اس مشاعرے میں شریک ہونا، خلاف واقعہ معلوم ہوتا ہے۔

مولانا فضل حق خیرآبادی کا سنہ ولادت ۱۲۳۲ھ لکھا ہے (صفحہ ۲۰) یہ کتابت کی فاحش غلطی ہے، افسوس ہے کتابت کی غلطیاں جگہ جگہ ملتی ہیں، صفحہ ۲۸۰ پر "راجا امیر احمد (یا محمد) خاں" کا نام "راجا امیر حسن خاں" لکھا ہے، یہ تو موجودہ راجہ صاحب محمود آباد کے دادا کا نام ہے!

سیٹھ چھوٹانی مرحوم کو خلافت کمیٹی کا صدر لکھا ہے (صفحہ ۲۹۱) جہاں تک ہمارا حافظہ رہنمائی کرتا ہے وہ خلافت کمیٹی کے خازن رہے ہیں، صدر غالباً نہیں رہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا آبائی وطن دہلی لکھا ہے، یہ بالکل غلط ہے، مولانا کا آبائی وطن ایک گاؤں بھیم کرن ہے، جو قصبہ قصور کے نزدیک واقع ہے۔ یہ بات بھی نادرست ہے کہ مولانا آزاد نے جامعہ ازہر میں تعلیم پائی تھی، مولانا آزاد کے والد کو مولانا فضل حق اور مفتی صدرالدین خاں آزردہ کا ہم صحبت لکھنا بھی مبالغہ آمیز ہے!

مسز سروجنی نائیڈو کے بارے میں لکھا ہے کہ "جب ملک آزاد ہوا.. آپ بھی حکومت کے اعلیٰ عہدہ پر سرفراز ہوئیں" (صفحہ ۳۸۶)

"اعلیٰ عہدہ" ایک مبہم سی بات ہے واضح طور پر لکھنا تھا کہ وہ یو۔پی کی گورنر بنائی گئیں۔

"وہ بڑی سے بڑی بات ایسی زبان اور ایسے لفظوں میں ادا کر دیتے ہیں کہ سدھارن آدمی سمجھ جائیں" (صفحہ ۳۹۷) "معمولی آدمی

کو "ساد ھارن آدمی" کہنا اردو جاننے والوں کو خواہ مخواہ الجھن میں ڈالنا ہے، "سادھارن" کا اردو زبان میں چلن نہیں ہے۔

حیرت ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو اور گاندھی جی کی سوانح حیات کے لئے صرف ایک ایک صفحہ کی گنجائش نکالی گئی ہے اور آچاریہ کرپلانی کے حالاتِ زندگی ساڑھے تین صفحوں پر پھیلائے گئے ہیں!! اور ہاں! جب "اشفاق اللہ خاں" (کاکوری کیس والے) کا ذکر کیا گیا ہے، تو بھگت سنگھ اور جتندر داس کا بھی ذکر کرنا چاہیئے تھا اسی طرح مسز اینی بسینٹ کا تذکرہ بھی ضرور آنا چاہیئے تھا کہ وہ "ہوم رول" کی بانی مبانی تھیں۔

جب مولوی رضوان اللہ اور سید ظفر حسن دانشی کا ذکر دو تین سطروں میں کرنا ضروری سمجھا گیا، تو خواجہ عبد المجید اور تصدق احمد خاں شروانی مرحوم کے نام کس طرح انداز کر دیئے گئے۔

سر تیج بہادر سپرو کا ذکر "جنگِ آزادی" کے مشاہیر میں کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف وٹھل بھائی پٹیل کے تذکرہ کا چھوٹ جانا کتنی بڑی فروگذاشت ہے! اور اس کتاب سے عجیب انکشاف ہوا کہ "سر محمد شفیع مرحوم بھی جنگ آزادی کے ہیرو تھے؟؟! خوب! تو پھر سر محمد یعقوب، سر شفاعت احمد خاں، سر عبد الحلیم غزنوی اور سر سکندر حیات خاں نے کیا قصور کیا تھا، ان کا ذکر بھی آنا چاہیئے تھا!

حیرت ہے کہ ہندو لیڈروں میں لالہ لاجپت رائے کو اس تذکرے میں شامل کرنے کے قابل نہیں سمجھا گیا، حالانکہ وہ کانگریس کے صفِ اول کے لیڈر تھے اور حد ہو گئی کہ مدن لال ڈھنگرہ کا کتاب میں تذکرہ ملتا ہے مگر راجگوپال آچاریہ جیسی اہم شخصیت کو نظر انداز کر دیا گیا۔ پھر لوکمانیہ تلک کے ساتھ مسٹر گوکھلے کا ذکر نہ کرنا کتنی عجیب بات ہے!

مجموعی طور پر کتاب معلومات آفریں ہے مگر فاضل مصنف نے زیادہ ذمہ داری اور محنت کے ساتھ مشاہیر کے حالات جمع نہیں کئے، کتاب کی تدوین سے پہلے انہیں "مشاہیر" کی فہرست مرتب کرنی تھی کہ کس شخصیت کا کیا مرتبہ ہے! اور کون شخصیت تذکرے میں شامل ہونے کے قابل ہے!

تصنیف و تالیف کا کام بڑی محنت، ذمہ داری اور فکر و بصیرت کا کام ہے، آدمی ساری عمر میں چاہے دو تین کتابیں ہی لکھے مگر وہ ہوں شاہکار! جیسے مولانا شبلی نعمانی کی "الفاروق" تاریخ و سیر کی سینکڑوں کتابوں پر بھاری ہے! مفتی انتظام اللہ صاحب کی بسیار نویسی قابلِ داد بھی ہے اور لائقِ شکایت بھی!

اسکولوں کے لڑکے

تالیف:۔ این نوسو ترجمہ:۔ محمود احمد عباسی امروہوی۔ ضخامت ۲۵۸ صفحات (سرورق مصور رنگین) قیمت درج نہیں،

ملنے کا پتہ:۔ کتابستان لمیٹڈ ۱۸ میٹروپول ہوٹل، کراچی۔

اصل کتاب این۔ نوسو نے روسی زبان میں لکھی تھی۔ روز یزدکوتا پیرالے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور انگریزی ترجمہ کو مولوی محمود احمد عباسی صاحب امروہوی نے اردو میں منتقل فرمایا ہے۔ کوئی شک نہیں ترجمہ شگفتہ، رواں اور عام فہم و سادہ ہے، فاضل مترجم اردو ترجمہ کا خاصہ سلیقہ رکھتے ہیں!

"ٹرم" (........) (صفحہ ۶...) کو جگہ جگہ مؤنث لکھا ہے، حالانکہ "ٹرم" اردو میں مذکر بولا جاتا ہے ــــــ "دھوپ سے سونلا گئے تھے" (صفحہ ۱۱) "سانولے" سے "سنولانا" عام طور پر لکھتے اور بولتے ہیں ــــــ "اگر ایک دن بھی اور آرام کرتا تو ڈھیر ہی ہو جاتا" (صفحہ ۴۴) "ڈھیر ہو جانا" یہاں ٹھیک طور پر استعمال نہیں ہوا ــــــ "پالش کرنے والی مشین کی ساخت کا

منصوبہ کر رہے ہیں" (صفحہ ۳۲) "منصوبہ تیار کر رہے ہیں" لکھنا تھا، کیا عجب ہے کہ کتابت میں "تیار" چھوٹ گیا ہو ——— "گھونگرو دار تہ کا پائجامہ ہے جو ہوا میں پھڑ پھڑا رہا ہے" (صفحہ ۳۸) کسی غیر جاندار کے لئے "پھڑ پھڑانا" بولنا روزمرہ اور زبان کے خلاف ہے! یہ "نامانوس جدت" ترقی پسندوں کی ذہانت نادرہ کار؟ کی بڑی یادگار ہے! حیرت ہے کہ مولوی محمود احمد عباسی کے زبان و قلم پر بھی یہ پرچھائیں پڑ گئی۔

"قدموں کی چانپ" (صفحہ ۱۹۱) صحیح املا "چاپ" ہے (اس میں "ن" شامل نہیں ہے) ——— "وہ کچھ ہونق سا ہو گیا" (صفحہ ۱۹۰) اس جملہ میں کوئی غلطی نہیں ہے، مگر عربی کا اصل لفظ "ہبنق" ہے ایسے موقعوں پر حاشیہ میں اصل لفظ لکھ دیا جائے تو پڑھنے والوں کی معلومات ناقص نہ رہنے پائیں گی ——— چینی اور روسی ناموں (اولگا نوکیونا، تولیا ڈیورخن، وانیا نچوماک انور گراجادی) سے طبیعت کو بڑی وحشت ہوتی ہے!

اس کتاب کے پڑھنے سے اندازہ ہوا کہ چین اور روس کا تعلیمی نظام کس قدر ترقی یافتہ ہے! اور ساتھ ہی اشتراکی نظریہ کا مظہر و ترجمان بھی: کہانیاں کتنی دلچسپ اور ہلکی پھلکی ہیں، بچوں کی نفسیات کے عین مطابق: کوئی بچہ کسی مضمون میں کمزور ہے، تو اس کی کمزوری کو کس حکمت اور خوبصورتی کے ساتھ رفع کیا گیا ہے! کتنے شستہ اور اثر انگیز مکالمے ہیں! کیسی کیسی الجھنیں باتوں باتوں میں دور کی گئی ہیں! جو لوگ اس محنت خلوص اور جانفشانی کے ساتھ اپنے نظریات کو پیش کر رہے، اور دلوں میں اتار رہے ہیں، ان کو کشمکش حیات میں کامیاب ہونا ہی چاہئیے!

یہ کتاب پاکستان کے "نظامِ تعلیم" کو آئینہ دکھاتی ہے بلکہ پوری قوم کے منہ پر طمانچہ رسید کرتی ہے کہ نادانو! تم کہ "خیر الامم" ہونے کے دعویدار ہو، تم نے اس گیارہ سال کی طویل مدت میں پاکستان کے "نظامِ تعلیم" کو اسلامی تقاضوں سے کس قدر ہم آہنگ کیا اور تعلیم و تربیت کے ذریعہ اپنی نئی نسل کو کتنا "عملی مومن" بنایا؟

جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد دوم (حصّہ اوّل)

از:- اسرار احمد آزاد، ضخامت ۴۷۸ صفحات (مجلد، رنگین گرد پوش کے ساتھ) قیمت:- پانچ روپے آٹھ آنے

ملنے کا پتہ:- مکتبہ برہان، جامع مسجد دہلی۔

اردو زبان میں اس موضوع پر شاید اتنی جامع اور معلومات آفریں کتاب نہیں لکھی گئی۔ جناب اسرار احمد آزاد نے بڑی محنت، کد و کاوش اور تفحص و جستجو کے بعد یہ کتاب مرتب فرمائی ہے، اس میں بین الاقوامی سیاسیات سے متعلق ——— تحریکوں، نظریوں، صلحناموں، معاہدوں، اداروں ...... کی ضروری معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

ہم اخبارات میں بین الاقوامی مالیاتی فنڈ (International monetary fund) کا ذکر آئے دن پڑھتے رہتے ہیں مگر ہم میں سے کتنے یہ جانتے ہیں کہ یہ فنڈ کس سنہ میں قائم کیا گیا، اس کے اغراض و مقاصد کیا ہیں اور اس کا سرمایہ کتنے ارب ڈالر مقرر کیا گیا تھا؟ اس قسم کے مسائل کی تفصیل اس کتاب میں ملتی ہے، اس کتاب میں یہ تک ملے گا کہ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی نے تقسیم ہند سے قبل کس سنہ میں جماعت اسلامی کو قائم کیا تھا اور اس کے قیام کی غرض و غایت کیا تھی؟ سیاست کے طالب علم اور خاص طور سے اہل صحافت اس کتاب سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟

فاضل مرتب نے مسلم لیگ کا ذکر تقریباً ڈیڑھ صفحہ میں کیا ہے مگر یہ دیکھ کر ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ قائد اعظم محمد علی جناح

جن کے نام سے مسلم لیگ پہچانی جاتی ہے، اور جو اس تحریک اور جماعت کی روح رواں تھے۔ ان کا نام تک کہیں نہیں آیا۔ مصنف سے یہ اتنی بڑی فروگذاشت ہوئی ہے، جس نے ان کی کتاب کے اس حصہ کو بے وزن کر دیا ہے!

"اور اس میں نان و نفقہ کی صرف اتنی ہی مقدار شامل ہے، جو مزدور کو مزدور رہ کر زندہ رکھنے کے لئے قطعی ضروری ہے"۔ (صفحہ ۳۶۵)

"نان و نفقہ" ایک خاص شرعی اصطلاح ہے، جو عوام میں معروف ہے، اس جملہ میں اس اصطلاح نے پوری عبارت کو مضحکہ خیز بنا دیا۔

افکارِ سہیل ترتیب دینے والے:۔ شوکت سلطان اور علی حماد عباسی، ضخامت ۲۶۶ صفحات، قیمت:۔ چار روپے
ملنے کا پتہ:۔ شبلی نیشنل کالج میگزین اعظم گڑھ۔

مولانا اقبال سہیل جیسے ذہین، نکتہ رس اور صاحبِ ذوق انسان بار بار پیدا نہیں ہوتے، ان کی ذہانت ضرب المثل بننے کے قابل ہے اور ان کی شخصیت اس کی مستحق ہے کہ اُسے یاد رکھا جائے! شعریت اور ادبیت اقبال سہیل مرحوم کی گھٹی میں پڑی تھی۔ ادب و شعر و نقد میں وہ اپنے استاد علامہ شبلی نعمانی کے صحیح جانشین تھے! سہیل نے لاأبالی مزاج اور بے نیازانہ طبیعت پائی تھی۔ اگر وہ شعر و ادب کی طرف دوسرے ادیبوں اور شاعروں کی طرح توجہ کرتے، تو آج دُنیائے ادب میں انکی شہرت کا غلغلہ ہوتا، جسکے آگے نہ جانے کس کس کی آواز دب کر رہ جاتی، اور اس آفتاب کے سامنے کتنے ستارے ماند پڑ جاتے۔

جناب شوکت سلطان اور جناب علی حماد عباسی نے "افکارِ سہیل" کو بڑے سلیقہ کے ساتھ مرتب کیا ہے، شروع کے ستر صفحات میں اقبال سہیل کی شخصیت پر مضامین اور نظمیں ہیں جو دلچسپ ہی نہیں، بلند بھی ہیں! اُن کے بعد مولانا اقبال سہیل کے مضامین کو یکجا کیا گیا ہے۔ ان میں تنقیدی مضامین بھی ہیں، کتابوں پر مقدمے اور تقریظیں بھی ہیں، مکتوبات بھی ہیں اور مشاعروں کے صدارتی خطبے بھی ہیں!

اقبال سہیل کے مضامین کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شعر و ادب میں کس قدر بصیرت رکھتے تھے اور فن نقد و نظر میں ان کو کس درجہ مہارت حاصل تھی! تحریر میں شائستگی اور قدرتِ بیان و اظہار کے ساتھ، شوخی اور ندرت بھی پائی جاتی ہے۔

نام نہاد "ترقی پسند شاعری" پر اقبال سہیل کی یہ رائے کتنی وزنی ہے۔:۔

"ترقی پسند شاعری کا زیادہ تر سرمایہ گھٹیا اور پوچ ہے، اور اس میں عام طور سے وہ رعنائی خیال نہیں ملتی، جو شاعری کو الفاظ و معانی، حسن و ترنم کا ایک سحر لازوال بنا دے۔۔۔۔"

مہدی حسن افادی کا ایڈیٹر "صلائے عام" سے ایک جملہ میں تقابل کیا ہے:۔

"اگر ایڈیٹر "صلائے عام" اہل زبان تھے تو یقیناً مہدی حسن مرحوم "زبان آفریں" تھے"۔

چند اور نمونے:۔

"جن لوگوں کو بساطِ شبلی کی حاشیہ نشینی نصیب ہوئی ہے، وہ ہی جان سکتے ہیں کہ تشنہ کامانِ طلب کے لئے علامہ کی صحبت کا ایک لمحہ بھی کسی دوسری جگہ کے درسِ صد سالہ سے زیادہ قیمتی تھا"۔

"اگر منازلِ سلوک و عرفان میں مولانا فضل رحمن گنج مرادآبادی کا مرتبہ متعین کرنے کے لئے مسز اینی بسنٹ حکم بنائی جا سکتی ہیں، تو بے شک مولانا شبلی کے مذہبی عقائد و اعمال پر خواجہ غلام الثقلین کی رائے بھی کسی وقعت کی مستحق ہو سکتی ہے"۔

"ہر حالت میں لطافتِ ذوق اور اعتدالِ صحیح کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ یہ نہ ہو کہ زور بیان چیخ کی حد تک پہنچ جائے، شکوہ لفاظ طبلِ بلند بانگ کا مصداق بن جائے، متانت و سنجیدگی خشکی و پژمردگی کے مُرادف ہو جائے، اور رنگین بیانی نسائیت اور عریانیٔ خیال کا روپ بھرلے۔ شعر کا خطاب شریف ترین انسانی جذبات سے ہوتا ہے، اس لئے شعر کا موسیقی بھی شریفانہ ہونی چاہئے"
"آج چند جھوٹے سکے رواج عام پاگئے ہیں، اور ہر شخص جو شاعری کی قلمرو میں قدم رکھتا ہے، انہی نمونے کے جعلی سکے ڈھال کر اپنا بازار گرم کرنا چاہتا ہے۔ سرمایہ داروں پر تبرا، مزدوروں اور کسانوں کی مظلومیت پر مصنوعی فریاد و بکا، مذہب سے بغاوت، غلط و بے محل لفظوں اور ترکیبوں کا استعمال، فنی ضوابط سے بیگانگی، ادعائے تہذیب کے باوجود اظہار خیال میں حیا سوز عریانی غرض ہر طرح کی ادبی، اخلاقی اور معاشرتی گمراہیوں کا نام "ترقی پسند ادب" رکھا گیا ہے۔"

"اور اس طوفانِ بدتمیزی میں اگر کوئی اِکا دُکا صاحب فن بھی سامنے آجاتا ہے، تو امتیاز مشکل ہوتا ہے، رہ رہ کے اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ بھی فریب نظر نہ ہو۔ لیکن اگر مسلسل تجربات اور پیہم انتخابات کے بعد بھی کوئی کامل العیار ہستی مل جاتی ہے، تو پھر سُرور کا عالم نہ پوچھئے، زبان سے بے اختیار صدائے تحسین نکل جاتی ہے جیسے وہی سماں ہوتا ہے جیسے صحرائے افریقہ میں فریب سراب کے کسی ستم زدہ کو اتفاقاً آب رواں کا چشمہ مل جائے۔"

صفحہ ۱۱۹، ورصفحہ ۲۷ پر اقبال سہیل کے دو شعر جو اُن کے کلام سے منتخب کر کے دیئے ہیں، وہ سطحی ہیں! صفحہ ۱۲۰ پر مولانا شاہ عبدالغنی رح منگوری کو "بنگوری" لکھا ہے ———— بابا فغانی کے مشہور شعر کا مصرعہ اولی یوں ہے:-

لے کہ می گوئی چرا جامے بجانے می خری

مگر کاتب نے "بجانے" کی جگہ "بجائے" لکھ مارا ———— صفحہ ۱۸۹ پر "اساطین فن" کی جگہ "اساتین فن" کتابت ہو گیا ایک مقام پر "بجا نت" کا املا "بجانت" نظر آیا۔

"افکار سُہیل" نے اردو ادب کے سرمایہ میں یقیناً اضافہ کیا ہے، ان مضامین کے مرتبین کی محنت اور حوش ذوقی تحسین و تبریک کی مستحق ہے۔

کشتِ خوں

از:- امامی بنگوری، ضخامت ۲۹۲ صفحات۔ (بانگ درا سائز، مجلّد، رنگین گرد پوش کے ساتھ) قیمت:- پانچ روپے۔ ملنے کا پتہ:- انجمن ترقی اردو، اردو روڈ، کراچی۔

جناب حکیم امامی صاحب بنگلور کے رہنے والے ہیں؛ اور اردو زبان سے والہانہ عشق رکھتے ہیں، شعر گوئی کا بھی انہیں شوق ہے، قومی ... نے اس شوق کو تیز تر کر دیا ہے، انکی شاعری میں بڑی گرمی پائی جاتی ہے، مولانا ظفر علیخاں مرحوم کی شاعری سے وہ بہت متاثر ہیں، اس ... اُن کی نظموں کے رنگا رنگ موضوعات ہیں!

"کشتِ خوں" اُن کے کلام کا مجموعہ خاصے اہتمام سے شائع ہوا ہے، جس پر جناب جوش ملیح آبادی نے "تعارف" اور سید ... صاحب نے "پیش لفظ" اور رئیس احمد جعفری نے "تقریظ" لکھی ہے۔ کتاب میں شاعر کی دو تصویریں ہیں۔ ایک تصویر میں وہ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے ساتھ کرسی پر بیٹھے ہیں اور دوسری اُنکی جوانی کی تصویر ہے۔

"کشتِ خوں" کے چند منتخب اشعار :-

رکھو نہ حسینوں سے کسی بات کی امید — یہ لوگ کبھی درد کا درماں نہیں کرتے

خانہ بربادی کی تہمت مجھ پہ رکھ سکتا ہے کون — میں قفس میں بھی تو فکرِ آشیاں کرتا رہا

اظہارِ غم و درد بھی کرنے نہیں دیتے — نالہ نہ سہی آہ بھی بھرنے نہیں دیتے

مایوس جو ہوتا ہوں تو بن جاتے ہیں امید — جینے نہیں دیتے، کبھی مرنے نہیں دیتے

اس میں کیا شک ہے کہ پایا ہے مزاج تند و تیز — لیکن اتنا ہے کہ کانٹوں کی چبھن رکھتے نہیں

لو تمہیں درد سے آگاہ کئے دیتا ہوں — یاد آئی ہے تو اک آہ کئے دیتا ہوں

بدلے ہوئے طریق جو سارے جہاں کے ہیں — وہ دن بہار کے ہیں، تو وہ دن خزاں کے ہیں

کوئی ہنس ہنس کے اڑاتا ہی رہا غم کا مذاق — عمر بھر بخت پہ رو یا کئے رونے والے

دوسرا رُخ :-

یارب شجرِ فہم میں گُل اور ثمر دے — میں جاہل و بے علم ہوں تو علم و ہُنر دے (صفحہ ۲۱)

"میں" کا نہیں "کو" کا محل تھا ———— اسکے علاوہ "شجرِ فہم" بھی دل پسند ترکیب نہیں ہے۔

اغلاط سے معمور ہوں میں کیا مرا فن کیا — جو شہد کا ہمسر نہ ہو انداز سخن کیا (صفحہ ۳۲)

انداز سخن کی شہد کی حلاوت کے ساتھ "ہمسری" کچھ بھلی نہیں لگتی۔

جو نہ بدلے ہیں نہ بدلیں گے محن ایسے ہیں — اے ستمگر! ترے چال اور چلن ایسے ہیں (صفحہ ۳۵)

"محن کا بدلنا" کیا بات ہوئی! "چال چلن" بغیرِ عطف کے بولا جاتا ہے۔

خدا کرے کہ مرا پھر تو میہماں ہو جائے — پھر ایک بار مجھے تیرا امتحاں ہو جائے (صفحہ ۸۰)

———— اور ————

ہنسی لب پہ آتے ہی کیا ہو گئی — مرے درد دل کی گلا ہو گئی (صفحہ ۱۰۳)

اس قماش کے بھرتی کے بے مزہ اشعار اس کتاب میں جا بجا ملتے ہیں۔

فریاد بھی کرتا ہوں تو ہو جاتے ہیں برہم — جاہل نظر آتے ہیں وہ غافل سے زیادہ (صفحہ ۱۷۰)

"جاہل" نے شعر کو مضحکہ خیز بنا دیا۔

اپنے محسن حکیم محمد جمیل خاں کو امامی صاحب نے "مرجعِ علم و دانش و حکمت" بنا کر ہی خاصہ مبالغہ فرمایا تھا کہ :-

ہند و یونان پر نہیں موقوف — سارا عالم ہے آپ پر نازاں (صفحہ ۳۰۶) کہہ کر مبالغہ کی حد کر دی

یہ لذائذ، وہ یہ رنگینیاں باطل سی ہیں — دیکھتا ہوں غور سے تو اک فریب دل سی ہیں (صفحہ ۲۲۹)

"ناول نویسوں کا سا انداز بیان!

انہی امامی صاحب کا دوسرا مجموعہ "خشتِ خوں" کے نام سے شائع ہوا ہے جسکی ضخامت ۲۹۶ صفحات ہے، بانگِ درا کا سائز ہے۔ (مجلد، گرد پوش کے ساتھ) قیمت :- پانچ روپے ملنے کا پتہ :- انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی۔

اس کتاب کا مقدمہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے اور دیباچہ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے لکھا ہے! پھر اپنے حالات

ذہنی سرگزشت" کے عنوان سے، خود صاحب کتاب نے قلمبند فرمائے ہیں۔

امامی صاحب کے یہ تین شعر کتنے جاندار ہیں۔

دہر میں آزاد ہونے کی تمنا دیکھ لی — حریت میں بھی غلامی کا ہے عالم کیا کریں

ہو رہا ہے منتشر شیرازۂ اہلِ خلیلؑ — ہو رہا ہے قلعۂ نمرود محکم کیا کریں

بے نیازی سے ہر اک چیز کو ٹھکرا دینا — یہ بھی اک خاص ادا ہے ترے مستانوں کی

کاش! اُنکی پوری شاعری کا یہی رنگ ہوتا۔

بچے ہیں سے بڑھ کے دولت کوئی اور کیا عطا ہو — کہیں نالے آتشیں ہیں، کہیں اشک ہائے پیازی (صفحہ ۴۵)

پورا شعر ہی بچکانہ قسم کا ہے، "اشک ہائے پیازی" نے شعر کی سنجیدگی میں "مزاح" کا رنگ پیدا کر دیا۔

کشورِ ہند میں ہوں گر کفر کی لاکھ سازشیں

آنہیں سکتا آپ کا دین تغیرات میں (صفحہ ۵۵)

"دین کا تغیرات میں آنا" عجیب اسلوب بیان ہے۔

مسلمان ہوں تو ناموسِ حرم کا پاسباں میں ہوں — یہ کہہ دو کل جہاں سے قاطعِ کفر جہاں میں ہوں (صفحہ ۸۰)

"جہاں" قافیہ ذہن میں آیا، اس پر "قاطعِ کفر" کا ردا رکھ کر شعر جوڑ دیا۔

ہم میں پیدا جب تک اک شانِ اولوالعزمی نہ ہو

دل میں جب تک جلوہ آرا قوتِ رزمی نہ ہو (صفحہ ۱۵۱)

"قوتِ رزمی" کیا ترکیب ہے؟؟ توبہ!

دکھ پہ دکھ سہتا ہوا اور غم پہ غم کھاتا ہوا — سختیوں سے اور سنگینوں سے ٹکراتا ہوا (صفحہ ۱۷۰)

کسان کا "سنگینوں سے ٹکرانا"، واقعہ کے خلاف ہے!

وہ عبیداللہ سندھی، شارحِ علم الیقیں — ناز فرما جس پہ ہے ہندوستاں کی سرزمیں (صفحہ ۲۲۷)

"سرزمین" کے لئے قافیہ کی ضرورت تھی، تو "شارحِ علم الیقیں" سے اس ضرورت کو پورا کر لیا گیا، اس سے بحث نہیں کہ "شارحِ علم الیقیں" سے آخر کس مفہوم کی ترجمانی مقصود ہے۔

اپنے رونے کا کوئی عالم نہ ہم سے پوچھئے — عالمہائے گریۂ طفلانِ ناداں دیکھ کر (صفحہ ۲۸۶)

یہ شاعری کے ساتھ کس قدر دردناک مذاق ہے!!

وہ ہند میں سب کے رہبر تھے، تھا مسلک صلح کل اُنکا

اسلام پہ گرچہ شیدا تھے وہ ذات کے گرچہ ہندو تھے (صفحہ ۳۰۰)

ایک ہی مصرعہ میں "گرچہ" کی تکرار نے شعریت کا خون کر دیا ——— پھر سر تیج بہادر سپرو کو "وہ ہند میں سب کے رہبر تھے" کہہ کر اُنکی ہجو ملیح کی ہے، اس لئے کہ سر سپرو کو ہندوستان کے پچاس سو آدمی بھی اپنا لیڈر نہیں مانتے تھے۔

حکیم امامی صاحب کی بعض نظموں میں "شعریت" بھی پائی جاتی ہے، مگر اکثر و بیشتر غزلوں، نظموں اور قطعات میں خاصہ جھول، شعریت کی کمی، اور قدرتِ کلام کا عجز ملتا ہے۔

تخیل (IDEA) اظہار (EXPRESSSION) اور اسلوب (STYLE) یہ تینوں چیزیں اُن کے یہاں بہت کمزور ہیں!

اُن کا کلام پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے انھوں نے کئی استادوں کو اپنا کلام دکھایا ہے، اور ہر اُستاد نے اپنے ذوق و استعداد کے مطابق "اصلاح" دی ہے۔

کشتِ خوں اور خشتِ خوں کو جن کوششوں کے ساتھ امی صاحب نے چھپوایا ہے، اس کامیابی پر وہ بے شک مُبارکباد کے مستحق ہیں اور اُنکی جرأت دیدہ بکی تو یقیناً لائق ستائش ہے۔

معجزات القرآن (حصہ دوم) موسوم بہ آئینہ قیامت

مصنف:- مولانا سید شاہ محمد شاہ قادری شطاری مرحوم، ضخامت ۳۵۰ صفحات، قیمت:- تین روپے آٹھ آنے۔
ملنے کا پتہ:- جماعتِ قرآنیہ، مُستعد پورہ، حیدرآباد دکن۔

حیدرآباد دکن میں "جماعتِ قرآنیہ" اس مقصد کو لے کر منظرِ عام پر آئی ہے کہ:-

"قرآنی اسرار و نکات کی تفسیر و تاویل بدلے ہوئے حالاتِ حاضرہ سے انطباق کے ساتھ عام فہم انداز میں عامۃ المسلمین کے آگے پیش کی جائے"

اور

"قرآن فہمی کے سلسلہ میں سابقہ تفسیری روایات کو، جنکی محض ثانوی حیثیت ہے کلام اللہ جیسی اہمیت دی جارہی ہے..... اور انہی روایات کی وجہ سے عام مسلمانوں میں نصرانی و یہودی ذہنیت کی علانیہ جھلک پائی جارہی ہے..."

اُن سے ہٹ کر قرآن کی تفسیر کی جائے۔

اس انجمن (جماعت قرآنیہ) کو مولانا سید شاہ محمد شطاری مرحوم کی سر پرستی حاصل تھی، مولانا مرحوم کی یہ کتاب اسی جماعت نے اپنے اہتمام سے چھپوائی ہے۔

کتاب کے آخر میں مصنف کے مرحوم کے سوانح حیات درج ہیں، جو شروع سے لے کر آخر تک "مناقب و محامد" سے لبریز ہیں، ہمارے کرمفرما مولانا عبدالباری صاحب ندوی: اپنے پیر و مرشد حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو:-

"جامع المجددین"

کے لقب سے یاد کرتے ہیں اور زیر تنقید کتاب میں سید محمد شطاری مرحوم کو:-

"اس صدی کا محقق اور مجدد اعظم"

کہا گیا ہے!

ہم تو اب تک یہی سمجھتے تھے کہ تصوف کے کل "چار سلسلے" ہیں۔ مگر اس کتاب سے معلوم ہوا کہ مولانا شطاری مرحوم کو "چودہ طریقوں میں بیعت و ارادت حاصل ہوئی"

یہ تو اُن کے معتقدین اور مُریدوں کی "قصیدہ خوانیاں" اور "مدح سرائیاں" ہیں لیکن مولانا شطاری مرحوم اپنی مدح میں

خود کیا فرماتے ہیں اُسے بھی لگے ہاتھوں سنتے ہی چلئے:۔

"خداوند رحمن و رحیم اور ہادیٔ مطلق کا مجھ حقیر و فقیر پر کس قدر احسان ہے کہ اس نے مجھ پر اُن معارف و حقائق کا انکشاف کردیا، جو قرآن و حدیث کے بطون میں مضمر و مندرج ہیں، اور ان میں سے بعض تو وہ ہیں، جن سے بڑے بڑے علماء و فضلاء امت تک ناواقف رہے"

اور

"خدا کے فضل سے مجھ پر تمام مذاہب و ملل کی حقیقتیں منکشف ہوگئی ہیں، اور یہ معلوم ہوگیا ہے کہ ہر ایک میں حق کہاں تک ہے اور باطل کہاں تک ہے۔ مذاہب و فرقہ ہائے اسلام میں آج نہ کوئی پوری ہدایت پر ہے، اور نہ پورے بُطلان پر! حق و باطل کی آمیزش سب ہی مذاہب میں دکھائی دیتی ہے، کسی میں زیادہ کسی میں کم!۔۔"

ان دعوؤں کے بعد قرآن پاک کے حروفِ مقطعات کے بارے میں مولانا شطاری صاحب کا یہ ارشاد بھی سُن کر اور پڑھ کر جھومنے کے لائق ہے

"قرآن پاک کے حروف مقطعات میں، اسلامی عہد کے عربوں کی ترقی و تنزل کے سارے ادوار کی ایک جامع تصویر کھینچی گئی ہے"

یہ کتاب "معجزات القرآن" کے نام سے آنے والی ہے، فاضل مصنف کی زیر تنقید کتاب کو پڑھ کر یہی پیش گوئی کی جاسکتی ہے کہ آنے والی کتاب بھی "ایک اعجوبہ" سے کم نہ ہوگی! قرآن کریم کے "حروف مقطعات" سے مسلمان عربوں کی ترقی و تنزل کی تاریخ پیدا کردینا بس "چودھویں صدی کے مجدد اعظم" ہی کا کارنامہ ہوسکتا ہے، کوئی دوسرا عالم اور مفسر تو ایسی جرأت کر نہیں سکتا (اعوذ باللہ من ہذہ الرائے والابتکار)

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں ان "مجدد اعظم صاحب" کے قلم کی غیر سنجیدگی ملاحظہ ہو:۔

"پھر ۳۷ھ میں تو معاویہ نے چند بدمعاش شامیوں کی فوج جمع کرکے امام حق پر بغاوت کردی"

دوسری طرف آپ کی "تحقیق انیق" کا یہ عالم ہے کہ:۔

"۔۔۔۔ یہی وجہ ہے حضرت عمرؓ نے اس بڑی مصلحت کے پیش نظر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کاغذ دوات منگوانے کے باوجود، اس کی تعمیل نہ ہونے دی، کیونکہ ان کو یقین تھا کہ رسول خدا۔ حضرت علیؓ ہی کے لئے وصیت لکھ دیں گے، جس کے لئے آپ پہلے سے تنصیص نہیں تو اشارے ضرور فرمارہے تھے۔۔۔۔"

کوئی حق شناس بصحت ہوش و حواس حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر کیا اس قسم کی تہمت لگا سکتا ہے (توبہ!)

ایک طرف فاضل مصنف ملوکیت کے شدید مخالف اور جمہوریت کے پُرزور مؤید ہیں، اور دوسری طرف آپ کی فکر و بصیرت کا یہ عالم ہے:۔

"بنی اُمیہ کی سازشیں اور شر و فسادات بیچ میں حائل نہ ہوتے تو حضرت مولائے کائنات کی اُن کی اولاد سے شاید یہ سلسلہ آج تک قائم رہتا" (صفحہ ۳۰)

یعنی خلافت بھی کوئی "خاندانی وراثت" تھی کہ ایک ہی خاندان میں منتقل ہوتی رہتی اور جمہور مسلمانوں کی پسندیدگی اور انتخاب کا اس دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔

"خلافتِ راشدہ کے بعد جتنی بادشاہتیں قائم ہوئیں اور جن کا سلسلہ حال حال تک جاری ہے،
وہ سب ڈاکوؤں کی فہرست میں شامل ہیں" (صفحہ ۲۳)

یہ کتنی زیادتی ہے جو مصنف کے قلم سے سرزد ہوئی ہے! حالانکہ مسلم بادشاہوں میں ایسے دسیوں نام پیش کئے جا سکتے ہیں، جن کو ڈاکو کہنا "سبابِ مسلم" کی حد میں آکر "فسق" بن جاتا ہے۔

ایک طرف حضرت امیر معاویہؓ جیسے صحابی اور صلاح الدین ایوبی، ناصر الدین محمود، فیروز شاہ تغلق، اورنگ زیب عالمگیر اور... سلطان ٹیپو شہید جیسے نیک دل بادشاہوں پر بے دھڑک "فردِ جرم" لگائی گئی ہے۔ دوسری طرف اس "شورا شوری" کے مقابلہ میں یہ "بے نمکی" اور اس عتاب و برہمی کے مقابلہ میں یہ رفق و لینت بھی ملاحظہ کیجئے:-

"ہم اُن (یعنی مرزا غلام احمد) کی اسلامی و تبلیغی خدمات اور اس سلسلہ میں اُن کی جدوجہد کا انکار نہیں کرتے بلکہ دُعا کرتے ہیں کہ اللہ پاک اُن کی مستحسن خدمات کے طفیل اُن کے غلط دعووں کو معاف فرمائے۔ آمین" (صفحہ ۱۹۰)

یہ دُعا، معافی و مغفرت کس کے لئے ہے! چودھویں صدی کے ایک "مدعیٔ نبوت" کے لئے ——— اس سے مولانا شعاری صاحب کے معتقدات اور دینی فکر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے!

اس اپنی کتاب میں مصنف نے ملاؤں اور مُلّا ازم پر جابجا طنز کی ہے مگر خود اُن کی "تدبیر فکر" کا یہ عالم ہے:-

"حیاتِ دُنیا کی عمر سات ہزار سال ہے"

حالانکہ علامہ ابن حزم جیسے مفکرین نے اس خیال کی تردید کی ہے، اور بتایا ہے کہ نص (کتاب و سنت) سے دُنیا کی عمر کا تعین نہیں کیا گیا

"نشاۃ الآخرۃ" کی تفسیر یوں کی ہے:-

"ہجری چودھویں صدی اور عیسوی بیسویں صدی سے نشاۃ الآخرہ یعنی نئی دنیا کا آغاز ہوا ہے"

——— اور ———

"یَوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ......" کی تفسیر میں یوں گُہر افشانی فرمائی ہے:-

"صاف الفاظ میں سامراج کو اکھاڑ پھینکنے اور خود راج قائم کرنے کے لئے کھڑے ہوں گے"

"وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ......" کو "مجدد اعظم صاحب" نے اس طرح سمجھا ہے۔

"جبکہ جنگلی جانور جمع کئے جائیں"

——— اور ———

"عجائب خانے اور چڑیا گھر قائم کئے جائیں"

"وَاِذَا الْجَحِیْمُ سُعِّرَتْ ....." سے کارخانوں، انجنوں، مشینوں اور معدنی کوئلہ کی دہکتی ہوئی آگ مراد لی ہے ——— اور

"وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ"

سے یہ مطلب اخذ فرمایا ہے کہ "معدنیات و طبقات الارض کا علم ہے، جس کے ذریعہ انسان اس بات پر قادر ہو گیا ہے کہ زمین کے اندر چھپی ہوئی ایک ایک معدن جو انسان کی زندگی کیلئے نہایت مفید و کار آمد ہے نکالے" (صفحہ ۷۴)

"عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ ......"

سے "ایشیا اور افریقہ کی بیداری" مراد لی ہے ———————— یہ کہ :۔

"انسان کے اگلے اور پچھلے کام سب اس کے سامنے آ رہے ہیں، آج وہ غفلت نہیں ہے، جو ایک صدی قبل ایشیائی ممالک میں تھی"۔

اگر مولانا شطاری جیسے دو چار اور "مجدد اعظم" پیدا ہو گئے (خدا کرے کہ نہ ہوں) تو لوزان کانفرنس، معاہدۂ وارسا، بغداد پیکٹ اور اٹلانٹک چارٹر کے لئے قرآن کریم ہی سے دلیلیں لائی جائیں گی، کہ فلاں آیت میں فلاں پیکٹ اور کانفرنس کی طرف اشارہ ہے!

اعجوبہ روزگار مفسر نے "جنت" اور "عیشۃ راضیہ" سے "محکوم قوم کی ترقی، خوشحالی اور فراغبالی کی زندگی" مراد لی ہے!

"القارعۃ ما القارعۃ" کو مصنف نے یورپ کی "جنگِ عظیم" سمجھا ہے!

قیامت، حشر، نشر، جنت اور جہنم کی اس طرح تاویلیں کر کے مصنف نے اپنے نزدیک بڑی "ندرتِ ابداع" کا ثبوت دیا ہے اور "جماعتِ قرآنیہ" کے ارکان اور مولانا شطاری مرحوم کے معتقدین بھی یہ سمجھتے ہوں گے کہ ان کے پیر و مرشد نے "علمِ لدنی" کے اسرار ظاہر فرمائے ہیں ——— مگر حقیقت میں اس قسم کی انوکھی تاویلیں اور نکتہ آفرینیاں اللہ کی کتاب کے ساتھ دردناک مذاق کے سوا اور کچھ نہیں ہیں۔

جن قدیم مفسرین نے بعض بے بنیاد اسرائیلی روایات کو اپنی کتابوں میں جگہ دے رکھی ہے۔ اُن پر نقد و احتساب کیا جانا ہی چاہیئے، لیکن "تفسیر بالرائے" کا یہ فتنہ اسرائیلی روایات کے فتنہ سے زیادہ خطرناک ہے!

اس دور میں فتنے گھاس پھونس کی طرح اُگ رہے ہیں، جو کوئی کتاب و سنت، آثارِ صحابہ اور سلفِ صالحین کی روش کو پیشِ نظر رکھے گا، ان فتنوں سے انشاء اللہ محفوظ رہے گا! اللہ تعالیٰ ہمیں فکر و رائے اور قول و عمل کے ہر شر سے بچائے رکھے (آمین)

ہمدرد مطب | مرتبہ و شائع کردہ :۔ ہمدرد دواخانہ (وقف) کراچی، ضخامت ۲۰۸ صفحات، قیمت :۔ ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ :۔ ہمدرد دواخانہ، کراچی (پاکستان)

ہمدرد دواخانہ پاکستان اور ہندوستان میں طبِ مشرقی کی جس قدر خدمت انجام دے رہا ہے، اس کی جتنی بھی تحسین کی جائے کم ہے، لاکھوں مریض ہمدرد دواخانہ سے فائدہ اٹھاتے ہیں، خاص طور سے غرباء کے لئے ہمدرد دواخانہ کی سستی دوائیں نعمتِ غیر مترقبہ ہیں! ہمدرد دواخانہ کی بہت سی دوائیں سائنٹفک انداز میں خود اس کی اپنی لیبارٹری (معمل) میں تیار ہوتی ہیں! ہمدرد دواخانہ نے طبِ مشرقی کی ترویج اور اس سے عام استفادہ کی خاطر، عام فہم لٹریچر بھی پیش کیا ہے، جس کی دو کتابیں اس وقت ہمارے سامنے ہیں۔

"ہمدرد مطب" میں :۔

"اکثر واقع ہونے والی بیماریوں کے معمولاتِ مطب مع غذا و پرہیز و ہدایات درج ہیں"۔

کتاب کا ایک اقتباس :۔

آواز بیٹھ جانا

مشہور نام	عربی	سنسکرت	انگریزی
آواز بیٹھ جانا گلا بیٹھنا	بحۃ الصّوت	سُوَر بھنگ स्वर भंग	افونیا Aphonia

"اگر گرمی سے یا زیادہ بولنے سے آواز بیٹھ جائے تو لعوق بادام، یا لعوق بہدانہ نو نو ماشے دن میں تین بار چاٹیں، یا حب بحتہ الصوت منہ میں رکھ کر، اس کا لعاب چوستے رہیں"۔

"اگر سردی سے آواز بیٹھ جائے تو مربہ ادرک ایک ایک تولہ کھلائیں، یا خولنجان تین چار رتی پان کے اندر رکھ کر کھلائیں"۔

"مذکورہ بالا دونوں حالتوں میں مر سعالین کا استعمال بھی مفید ہے، ایک ایک ٹکیہ منہ میں رکھ کر اس کا لعاب چوستے رہیں"

"اگر سیندور کھانے سے آواز بیٹھ جائے تو نمک اور تمباکو آدھی آدھی رتی پان میں رکھ کر دیں"۔

غذا و پرہیز:- "گرمی کی وجہ سے مرض ہو تو ٹھنڈی ترکاریاں، مونگ کی دال، ساگودانہ، اور دلیہ وغیرہ غذائیں دیں۔ دودھ اور مکھن استعمال کرائیں، لال مرچ اور گرم مسالہ جیسی گرم و خشک چیزوں سے پرہیز کرائیں، سردی کی وجہ سے مرض ہو تو شوربہ چپاتی، نیم برشت انڈا دیں، اور ٹھنڈی چیزوں سے پرہیز کرائیں"۔

اطبا کو تو اس کتاب سے بیش از بیش فائدہ اٹھانا ہی چاہیے، مگر عوام کے لئے بھی اس کا مطالعہ فائدہ مند ثابت ہوگا۔ ڈھائی سو کے قریب بیماریوں کے علاج و پرہیز کی تفصیل اس کتاب میں درج ہے۔

ہمدرد عطار

ضخامت ۹۶ صفحات، قیمت:- بارہ آنے۔
ملنے کا پتہ:- ادارہ مطبوعات ہمدرد، ہمدرد ڈاک خانہ کراچی۔

یہ کتاب "عطاروں کے فرائض اور اُن کی ضروری معلومات کے لئے لکھی گئی ہے۔ اور اپنے موضوع پر انتہائی مفید اور کارآمد کتاب ہے! یونانی عطاروں سے عام طور پر لوگوں کو شکایت رہتی ہے کہ وہ دواؤں کے تیار کرنے اور انہیں اپنے اسٹاک میں رکھنے میں مناسب احتیاط نہیں برتتے۔ بہت سوں کو یہ بھی نہیں معلوم کہ کونسی دوا کتنے دن تک قابل استعمال رہتی ہے اور اس مدت کے گزر جانے کے بعد دوا کی تاثیر کم ہو جاتی ہے!

مثلاً ———— "پھٹکری اور مُردار سنگ، زہر مہرہ خطائی مدت دراز تک خراب نہیں ہوتے، مگر "عناب" ایک سال کے اندر ہی خراب ہو جاتے ہیں!"

اس کتاب میں بعض نایاب دواؤں کا بدل (Substitutes) بھی لکھا ہے:-

"مومیائی اصلی نایاب ہے، لیکن اس کے بجائے جو مومیائی اصل مومیائی کے افعال و خواص کو سامنے رکھ کر، روغن بھلاواں، شنگرف وغیرہ سے بنائی جاتی ہے، اس کو اصلی مومیائی کے بجائے استعمال کیا جا سکتا ہے، لیکن یہ یاد رکھئے کہ مومیائی کے کھلانے سے ٹوٹی ہڈی کا جُڑ جانا ایک امر موہوم ہے"۔

اسی صفحہ (۲۸) پر نقلی زعفران کے بارے میں جو یہ لکھا ہے کہ "مکئی بھٹوں کے ریشوں یا اس قسم کی دوسری چیزوں کو رنگ کر اور زعفران کی خوشبو دے کر زعفران تیار کی جاتی ہے" ———— تو یہ ٹھیک ہے، مگر اس کا ذکر بھی ضرور کرنا چاہیے تھا کہ مصنوعی زعفران "کسم" سے بھی بنائی جاتی ہے، "کسم" کے پھول کے ریشے زعفران سے ملتے جلتے بھی ہوتے ہیں!

اس کتاب میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ بعض دواؤں کے مترادف نام ہوتے ہیں، اس لئے عطار کو معلوم ہونا چاہیے کہ سونف کو بادیان! اور تباشیر کو بنسلوچن اور ملیٹھی کو اصل السوس بھی کہتے ہیں"۔

"زکام و نزلہ" میں "غذا" کی جو تفصیل درج ہے۔ اس میں "مرغ کے گوشت اور شوربہ" کا بھی ذکر آنا چاہیے تھا کہ زکام کے لئے مرغ کا گوشت" غذا کی غذا اور دوا کی دوا ہے"۔

نسخوں میں اطبا، مخصوص مصطلحات اور مخففات لکھ دیتے ہیں، عطار کو ان سے واقف ہونے کی ضرورت ہے ——— مثلاً۔ "مکلد ——— " من کلِ دواءٍ" کا مخفف ہے، جس کے معنی ہیں ہر ایک دوا یعنی جو دوائیں مذکور ہوں، اُن کا یہ وزن لیا جائے گا!

عطاروں اور طبیبوں کے علاوہ، عوام بھی اس کتاب کو پڑھیں گے تو اُن کی معلومات میں اضافہ ہوگا!

ہم اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ ہندوستان میں جناب حکیم حاجی عبدالحمید صاحب اور پاکستان میں جناب حکیم حافظ محمد سعید صاحب طب مشرقی کی گرانقدر خدمت انجام دے رہے ہیں، اور اُن کے کاروبار میں اخلاص و ہمدردی کا امتزاج پایا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اُن کے کام میں برکت دے اور اُن کو خدمتِ خلق کی بیش از بیش توفیق عطا فرمائے۔

اسلام اور عصرِ حاضر

مرتبہ:۔ ابو احمد دستگیر، ضخامت ۱۴۴ صفحات، قیمت:۔ دو روپے

ملنے کا پتہ:۔ ۱۰/۲۷ بی سیکشن لانڈھی کراچی (دفتر جمعیت خلافت مبشرہ)

اب سے ایک سال قبل لاہور میں جو بین الاقوامی اسلامی مجلس مذاکرہ منعقد ہوئی تھی، اس کتاب میں اس مجلس کے بعض مضامین و افکار پر تنقید کی گئی ہے، مسٹر غلام احمد پرویز کے مقالہ پر فاضل مرتب کی یہ تنقید کتنی صائب ہے:۔

"جناب غلام احمد پرویز کا مقالہ "اسلامی نظام میں معاشیات" جو مجلس مذاکرہ میں پڑھا گیا، گمراہ کن حد تک پہنچ گیا ہے"

اور یہ بات بھی اپنی جگہ حق ہے:۔

"قوموں کے عروج و زوال کی اساس معاشیات نہیں ایمانیات و کفر ہیں"

"مومن دنیا سے غیب ہو کر، اللہ میں ظاہر ہوتا ہے، جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے اس مقام پر واجب الوجود کا ہر پہلو ذوقیہ ہوتا ہے"

ان افکار و عقائد کو بھلا کوئی مسلمان برداشت کر سکتا ہے ——— توبہ!

"دیندار انجمن" نے اس قسم کی بھول بھلیاں میں اپنے ماننے والوں کو پھنسا دیا ہے، اس پر دعویٰ بلکہ غرہ یہ ہے کہ:۔

"الحمد للہ اس دور میں دیندار انجمن رحمت کا نشان بن کر مسلسل ۳۴ سال سے مستقل طور پر مستحکم ارادہ کے ساتھ ببانگ دہل اقوام عالم کو علیٰ بصیرت اللہ تعالیٰ کی طرف بلا رہی ہے"

"دیندار انجمن" اور اس کے بانی کے کیا عقائد ہیں! اس پر "فاران" میں جناب زاہد صدیقی (سابق مبلغ دیندار انجمن) کا مفصل مقالہ آچکا ہے جس میں انھوں نے اپنے سابق عقائد سے بیزاری اور بے تعلقی کا اظہار کیا ہے!

صفحہ ۸۵ پر "نواہی" کو "نواحی" اور "کرۂ ارض" کو "کرۂ عرض" (۱۳۷) لکھ گیا ہے۔

اس غلطی کو کس سے منسوب کریں، کاتب سے یا مصنف سے!

رہبرِ کامل

از:۔ مولانا عبدالمجید اصلاحی، ضخامت ۱۰۴ صفحات قیمت ۴۹ نئے پیسے (۱۵ر)

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ مدرسۃ الاسرار کوڑہ گھنی، سورہن، اعظم گڑھ۔

یہ کتاب "اسلامی مکاتیب کے طلبا، درجہ چہارم کے لئے" مرتب کی گئی ہے، اور اپنے موضوع پر کامیاب تالیف ہے، حضورؐ کی سیرت مقدس سادہ اور عام فہم زبان میں، طلباء کی استعداد و فہم کو ملحوظ رکھ کر لکھی گئی ہے۔

صفحہ ۳۰ "رنگ کے ٹکڑے" اس میں "رنگ" زیادہ ہے۔ صفحہ ۱۰ کی پر آخری سطر کا یہ جملہ۔

"دُنیا و آخرت دونوں جگہوں پر خوش رہنے کے لئے اُن کو اپنا مکمل پیشوا بنانا ضروری ہے"۔

بہت کمزور ہے، اس خیال کو جاندار اور شگفتہ انداز میں ادا کرنا چاہیئے تھا۔

سہل تجوید از:۔ قاری سید کلیم اللہ حسینی، ضخامت ۶۰ صفحات (قیمت درج نہیں) ملنے کا پتہ:۔ قاری عبدالرحیم صاحب، استاد دار القرأت والدینیات الکلیمیہ، قریب گیٹ محکمہ بلدیہ، بازار نور الامراء حیدرآباد دکن (آندھرا)

مولانا ڈاکٹر سید کلیم اللہ حسینی صاحب فن قرأت و تجوید کے بہت بڑے عالم ہیں، موصوف کئی کتابیں "فن تجوید" پر لکھ چکے ہیں، یہ کتاب (سہل تجوید) اگرچہ مختصر ہے مگر تجوید کے ضروری قواعد اس میں آ گئے ہیں!

حسب ذیل عنوانات سے کتاب کی اہمیت و افادیت کا اندازہ ہو سکتا ہے:۔

مخارج حروف، صفات حروف، لام جلالہ وغیرہ، قواعد راء، نون ساکن و تنوین، میم ساکن، اور میم و نون مشدد، ہائے ضمیر، مد و قصر، وقف و ابتداء؛۔

کتاب ہر اعتبار سے مُفید ہے، طالب علم کو اگر کسی استاد کی بھی تھوڑی سی مشورت حاصل ہو جائے تو اس سے خاطر خواہ استفادہ کیا جا سکتا ہے ——— کتاب کے آخر میں امام جزری رحمۃ اللہ علیہ کی دو نظمیں ہیں، جن میں "مخارج حروف" اور "صفات حروف" پر مفید اشارات ہیں!

الطریقۃ الجدیدہ فی تعلیم اللغۃ العربیہ تالیف:۔ سید امین مصری، ضخامت ۶۴ صفحات، قیمت:۔ آٹھ آنے۔
ملنے کا پتہ:۔ المکتبہ العلمیہ، ۱۵ لیک روڈ، لاہور۔

جناب سید محمد امین مصری جدید طرز پر عربی زبان کی تعلیم اور درس و تدریس میں بڑی مہارت بلکہ تجربہ عبور رکھتے ہیں، جناب موصوف کی متعدد کتابیں مقبول ہو چکی ہیں اور ہزاروں طلبہ نے ان سے فائدہ اٹھایا ہے۔

یہ کتاب عربی کے نو آموزوں کے لئے لکھی گئی ہے، جو اُن کے لئے نہایت مفید اور کار آمد رہا ہے۔ تصاویر نے بچوں کے لئے اور زیادہ سہولت و دلچسپی پیدا کر دی ہے۔

درسِ توحید شائع کردہ:۔ معاونین انجمن اصلاح المسلمین، راولپنڈی۔ ضخامت ۴۰ صفحات۔
ملنے کا پتہ:۔ انجمن اصلاح المسلمین ۳۵۱ ——— پیر ہاڑا راولپنڈی۔

یہ کتاب "توحید خالص" کے تقاضوں کے پیش نظر لکھی گئی ہے، اس لئے عقائد کی اصلاح کے لئے اس کا مطالعہ انشاء اللہ مؤثر ثابت ہوگا، اس کتاب میں جو بات کہی گئی ہے، اُس کے لئے حوالہ اور سند موجود ہے ——— مثلاً "در مختار" کے حوالے سے حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے:۔

> "یہ بات کسی کو درست نہیں ہے کہ دُعا مانگے اللہ سے اور کے وسیلہ سے، بلکہ چاہیئے کہ اللہ ہی کے ناموں اور صفتوں کے ساتھ وسیلہ پکڑے، اور یہ بھی نہ کہے کہ مانگتا ہوں میں تجھ سے یا اللہ بحق فلاں، یا ساتھ فرشتوں یا نبیوں کے اور مثل اس کے"۔

افادۂ عام کے لئے اس کتابچہ کی کوئی قیمت نہیں رکھی گئی، ایک آنہ محصول ڈاک بھیج کر، یہ کتاب منگائی جا سکتی ہے۔

تصویر علم و عقل کی روشنی میں

مرتبہ:۔ مکتبہ نشاۃ ثانیہ، حیدرآباد دکن، ضخامت ۵۶ صفحات، قیمت:۔ ۵۰ نئے پیسے
ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ نشاۃ ثانیہ، معظم جاہی مارکیٹ، حیدرآباد (آندھرا)

یہ کتاب مولانا محمد اسحٰق سندیلوی کے مقالہ "مسئلہ تصویر علم و عقل کی روشنی میں" اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے مقالہ "فوٹو کا مسئلہ" پر مشتمل ہے دونوں مقالے اپنی جگہ کامیاب ہیں۔ مولانا مودودی کا مضمون بہت مختصر ہے مگر بہت خوب ہے!

مولانا محمد اسحٰق سندیلوی نے یہ بڑی پتہ کی بات کہی ہے کہ:۔

"نئی نسل میں جو نسوانیت اور کمزوری پائی جاتی ہے، اور جس طرح وہ بچپن ہی سے عاشقانہ مزاج اور رومانی زندگی کی خواہش رکھتے ہیں، اس میں تصاویر کو بہت بڑا دخل ہے"!

"سندیلوی" کو "سندھیلوی" پڑھ کر وجدان نے گرانی محسوس کی، جی چاہتا ہے کہ اپنا ایک شعر بھی لکھ دوں:۔

واقعہ یہ ہے کہ دُنیا کی تباہی میں شریک
فتنۂ رُخ ہی نہیں فتنۂ تصویر بھی ہے

ٹونک کی عیدیں

از:۔ سید منظور الحسن برکاتی، ضخامت ۳۲ صفحات۔ قیمت:۔ چھ آنے۔
ملنے کا پتہ:۔ شفا منزل، ٹونک (راجستھان)

ہز ہائی نس نواب سعادت علیخاں مرحوم ریاست ٹونک کے آخری با اختیار فرمانروا تھے، شعر و شاعری کے ساتھ موسیقی، تھیٹر، کرکٹ اور شکار کا بھی انہیں شوق تھا۔ سید منظور الحسن صاحب برکاتی نے انہی کے آخری دور کی میٹھی عید (عید الفطر) کی ایک جھلک اس کتابچہ میں پیش کی ہے۔ زبان ہلکی پھلکی اور اسلوبِ نگارش سادہ ہے، چونکہ ہر بات دل سے نکلی ہے، اس لئے تحریر میں تاثیر بھی پیدا ہو گئی ہے! افسوس کہ یہ مناظر، یہ خوش ذوقیاں، یہ جمگھٹے اور دلچسپیاں اب کتابوں ہی میں مل سکیں گی، زمانہ نے تاریخ کے اس ورق کو اس طرح باب کر ہی بند کر دیا۔

مغربی محققین کی غلطیاں

از:۔ محبوب خاں بجنوری، ضخامت ۳۰ صفحات۔ قیمت:۔ ۴۴ نئے پیسے۔ (سات آنہ)
ملنے کا پتہ:۔ زریں کتب خانہ بجنور (یو۔پی)

مغربی جغرافیہ دانوں کی یہ تحقیق کہ:۔

۱:۔ زمین بیضاوی راستہ پر گردش کرتی ہے۔

اور

۲:۔ سورج اپنی جگہ ثابت ہے (ساکن) ہے۔

اس کو جناب محبوب خاں بجنوری نے دلیلوں اور نقشوں کے ساتھ غلط ثابت کیا ہے۔

اُن کا کہنا یہ ہے کہ:۔

"زمین ساکن ہے اور اجرام فلکی گردش میں ہیں"!

جو لوگ جغرافیہ اور فلکیات کا ذوق رکھتے ہیں، اُن کے لئے اس کتابچہ نے دلچسپی اور علمی تفکر کا سامان پیدا کر دیا ہے۔

امتحان میں کامیابی کے راز

از:- سید منظور الحسن برکاتی۔ ضخامت ۲۴ صفحات، قیمت:- ۳۱ نئے پیسے۔
ملنے کا پتہ:- سرسید بک ڈپو، پوسٹ بکس ۳۲ علی گڑھ۔

اس کتابچہ میں تجربہ و مشاہدہ کی روشنی میں یہ بتایا گیا ہے کہ امتحانات کے پرچوں کے جوابات کس طرح دینے چاہئیں!

ایک اقتباس:-

"آپ کو جس قدر یاد ہو وہ سب جواب میں لکھئے! زیادہ سے زیادہ جتنے سوالات کے جوابات مانگے گئے ہوں دیجئے، فرض کیجئے کہ آپ کو پانچ میں سے صرف تین ہی سوال اچھی طرح یاد ہیں، تو اُن تینوں سوالوں کو پہلے کیجئے اور اس کے بعد بقیہ دو سوال بھی، اچھے نہ سہی بُرے سہی ضرور کیجئے: کیونکہ ممتحن آپ کو بے ڈھنگے جواب پر بھی کچھ نمبر دے سکتا ہے (اگر وہ چاہے) لیکن اگر آپ نے سوال بالکل چھوڑ دیا تو سادہ کاغذ پر نمبر کسی طرح نہیں دیئے جا سکتے۔"

ہماری شہنشاہی

از:- محمد عطاء اللہ خان عطا۔ ضخامت ۲۲۴ صفحات مجلد، خوب صورت رنگین گرد پوش کے ساتھ۔ قیمت:- دو روپے دس آنے۔ ملنے کا پتہ:- محمد سعید اینڈ سنز، تاجران کتب، قرآن محل مقابل مولوی مسافر خانہ، کراچی۔

اس کتاب میں فارس، عرب، شام، بابل، چین، یونان، ہندوستان، روم، مصر، اور مصر بعید، طوفانِ نوحؑ کے بادشاہوں کے بعد مسلمان فرمانرواؤں کی تاریخ بیان کی ہے۔ جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس کے بعد بنی امیہ، بنی عباس، دولت عثمانیہ، غزنوی، غوری، خاندان غلامان، خلجی، تغلق، لودھی اور خاندان مغلیہ کے بادشاہوں کے مختصر تذکرے درج ہیں۔ کتاب کا آخری باب "پاکستان" کے حالات پر ختم ہوتا ہے۔

صفحہ ۷ پر فیشدادیہ اور اشغانیہ پڑھ کر کھٹک پیدا ہوئی، غالباً یہ نام "پیشداد" اور "اشکانیہ" ہیں۔ صفحہ ۲۲ پر حزقیل کی جگہ "خرقیل" اور صفحہ ۹۹ پر قتیبہ کی جگہ "قیتبہ" لکھا ہوا نظر آیا۔ جو کتابت کی غلطیاں ہیں۔

"اردشیر بہمن جب تخت پر جلوہ افروز ہو، تو اُس نے ہاتھ بڑھایا اور ساری دنیا کا بادشاہ ہو گیا۔"

"اُس نے ہاتھ بڑھایا" یہ جملہ اس عبارت میں بالکل بے جوڑ اور بے ربط نظر آتا ہے۔

"جلیاں والے باغ کے واقعے سے مسلمانوں کا یہ شیرازہ پھر منتشر ہو گیا، مارشل لا نے دونوں قوموں کے دل پھاڑ دیئے۔" (صفحہ ۲۱۶) جلیاں والے باغ کے بعد تو ہندوستان میں آزادی کی تحریک میں اور جان پڑ گئی، اور ہندو اور مسلمان دونوں قومیں شانہ بشانہ انگریزی حکومت کے خلاف صف آرا ہو گئیں، اس اتحاد کو سب سے زیادہ صدمہ "نہرو رپورٹ" نے پہنچایا ہے۔ اس رپورٹ کی اشاعت کے بعد ہی مولانا محمد علی مرحوم کانگریس سے علیحدہ ہو گئے۔

صفحہ ۲۲۳ پر لیاقت علیخان مرحوم کی صفات بیان کرتے ہوئے جو انہیں "مسکین" لکھا ہے اسے پڑھ کر سوچنا پڑا کہ یہ مدح ہے تو عجیب مدح ہے۔

"جام شہادت کے بعد چند درہم گھر میں برآمد ہوئے۔"

اس میں بھی خاصہ مبالغہ پایا جاتا ہے، پھر "روپیہ" چھوڑ کر "درہم" کے ذکر کا یہاں کیا محل تھا؟

افسوس ہے کہ مصنف کا انداز بیان کمزور ہے، اُن کی مورخانہ فکر بھی کتاب میں جھلکنے نہیں پائی۔

مروّجہ بدعات اور اکیڈیمی آف اسلامک اسٹیڈیز پر تنقید

مرتبہ :- صفوۃ الرحمٰن صابر ، ضخامت ۶۴ صفحات (قیمت درج نہیں)
ملنے کا پتہ :- ادارۂ اہل سنّت وجماعت کمان سلطان شاہی حیدرآباد (آندھراپردیش)

اس کتابچہ کا ابتدائی حصّہ مندرجہ ذیل عنوانات پر مشتمل ہے :-
بدعت کی تعریف ——— علمی وعملی بدعات کی تفصیل ——— بدعت کے نقصان ——— بدعات سے متعلق وعید ——— بعض غلط فہمیوں کا ازالہ ۔

ہر عنوان اپنے مضمون اور شرح وتفصیل کے اعتبار سے وزنی اور مدلل ہے ، چند صفحات میں بہت کچھ مواد جمع کر دیا گیا ہے اور "بدعات" کے ہر رخنہ کو بند کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے ۔

چند اقتباسات :-

"سید احمد کبیر رفاعی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ صوفیا نے علم حق کی یہ جو تفریق کر دی ہے کہ "ایک علم ظاہر ہے ، دوسرا علم باطن" یہ بدعت ہے ۔

"حضرت ذوالنون جو تبع تابعین کے آخری دور کے بزرگ تھے ، ان کے پاس بعض علما آئے اور حضرت ذوالنون سے نفسانی خطرے اور وساوسِ شیطانی کی حقیقت دریافت کی تو حضرت ذوالنون مصری نے فرمایا کہ ایسی گفتگو بدعت ہے ، تم نماز کے مسائل یا احادیث دریافت کرو" (بحوالہ تلبیس ابلیس)

اور

"انائے واحد" وجود واحد کی مشق علم کلام کے وہ مسائل کہ صفاتِ حق ، عینِ ذاتِ حق ہیں یا غیر ذاتِ حق ہیں اور ان مسائل کے جواب میں اہل کشف کا یہ تصفیہ کہ وہ عین حق بھی ہیں اور غیر حق بھی ——— "شریعت" اور "محبت" میں فرق کرنا ——— آیاتِ متشابہات کی تاویل وتعبیر میں منہمک ہونا ——— یہ "بدعات" ہیں اور یہ بھی کہ فنا فی اللہ ، باقی باللہ ، سیر الی اللہ ، سیر باللہ اور سیر فی اللہ کے عنوانات کے تحت جو حقائق ... بیان کئے جاتے ہیں ، ان کو حقائق دینیہ سمجھنا ....!

حیدرآباد دکن میں "اکیڈیمی آف اسلامک اسٹیڈیز" قائم ہوئی ہے ، جس نے "افکارِ اسلامی کی تشکیلِ جدید" کے عنوان سے جو "یادداشت" مرتب کی ہے ، اس پر اس کتابچہ کے حصہ دوم میں تنقید کی گئی ہے اور کوئی شک نہیں کہ فاضل ناقد نے اگرچہ بعض مقامات پر بہت زیادہ سخت گرفت کی ہے مگر اس میں اخلاص ، دینی بصیرت اور دینی غیرت کی فراوانی ملتی ہے ——— ان کی رائے ہے کہ :-

"غرض پوری یادداشت میں مرتب نے اپنے رجحانات وخیالات کو بیان فرمایا ہے ، اس کا ماخذ نہ کتاب اللہ ہے نہ سنّتِ رسول اللہ! یہی وجہ ہے کہ پوری یادداشت میں ایمان ویقین کی چاشنی ہے نہ کوئی دینی بصیرت بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرتب یادداشت مخاطبین کو اپنے بت کدۂ تصورات کی سیر کرا رہے ہیں"۔

دردِ سر دوسرے ہر قسم کے درد اور
نزلہ و بخار کیلئے
انالجین ٹکیاں
ANALGIN
Opal
ہر قسم کی کھانسی
سے فوری
نجات
کیلئے
COUGHSOL
COUGH SYRUP
کفسول شربت
صحت اور
توانائی
کیلئے
LAXSAL
FRUIT SALINE
لیکسال فروٹ سیلائن
اوپل لیباریٹریز لمٹیڈ۔ کراچی

فاران
کراچی
پاکستان
ماہر القادری

ماہنامہ

فاران

کراچی

ترتیب

جلد ۱۰

سنہ ۱۹۵۹ء

فروری

ایڈیٹر

ماہر القادری

شمارہ ۱۱

سالانہ چندہ چھ روپے

فی پرچہ آٹھ آنے

مقامِ اشاعت: دفترِ فاران، کیمبل اسٹریٹ، کراچی نمبر ۱

پرنٹر پبلشر: مشرور حسین

مطبع سعیدی قرآن محل، کراچی

امکان ہی مستغرق ہو گئے اور ان کی سرگرمیاں سرد پڑ گئیں۔ مگر کمیونسٹ کسی نہ کسی عنوان سے چھپ کر حکومت میں گھس کر روس کی امداد اور ہدایت سے کمیونزم کے پھیلانے پر اپنا کام کرتے رہے، دوسری جماعتیں دین و سیاست کے میدان سے ہٹا دی گئی تھیں، کمیونسٹوں کے لئے میدان صاف تھا کوئی تحریک عنوان کے مقابل نہ تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مصر و عراق کی سیاسیات پر کمیونسٹ چھا گئے۔ اور خاص طور سے عراق کے میدان سیاست میں تو وہ ہی وہ نظر آتے ہیں۔ اب حال یہ ہے کہ کمیونسٹوں کی سرگرمیوں سے متعدد عرب ملکوں کی حکومتیں پریشان ہیں مگر یہ فتنہ ان کے دبائے دب نہیں رہا ہے۔

معاشی خوشحالی، زندگی کی اہمیت کا کوئی عقلمند آدمی انکار نہیں کر سکتا۔ معاشرے کو خوشحال ہی ہونا چاہیئے۔ ناداری اور تنگدستی آدمی کو ضمیر فروش بنا دیتی ہے اور کبھی کبھی تو کفر کے قریب ہی پہنچا دیتی ہے، عوام کو مرفہ الحال بنانے کی ہر کوشش قابل مبارکباد ہے ——
مگر "معاشی خوشحالی" کوئی عقیدہ، نصب العین یا نظریہ نہیں ہے بالکل اسی طرح، جس طرح "شکم سیری" کو ہم نظریہ، عقیدہ یا مقصد حاصل نہیں کہہ سکتے۔

اگر کسی ملک کو صرف خوشحال بنانا مقصود ہو تو اس ملک کا انتظام روس یا امریکہ ان دو میں سے کسی ایک کو سونپ دینا چاہیئے۔ وہ وہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہا دیں گے، لیکن اگر کسی ملک کے باشندوں کے سامنے کوئی عقیدہ، اصول اور کوئی نظریہ ہو تو صرف "معاشی خوشحالی" پر قناعت نہیں کی جا سکتی، واضح نظریاتی مملکت (Ideological State) کے باشندے صرف معاشی ترفہ سے مطمئن نہیں ہو سکتے۔

وہ معاشی خوشحالی جس کی پشت پر خدا ناشناس تہذیب کی قوت ہو جس میں اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے حدود ہر وقت ٹوٹتے رہیں اور جہاں عملاً اخلاقی قدروں کا مذاق اڑایا جاتا ہو، اسلامی نقطۂ نگاہ سے ایسی خوشحالی، ایسا مرفہ الحال معاشرہ اور اس قسم کی —— دنیوی حیثیت انسانیت کے لئے ایک وبال ہے۔

ایک مسلمان جو صرف نام کا مسلمان نہیں ہے، جو حیات بعد الممات اور آخرت پر یقین رکھتا ہے، جو اللہ اور رسول کے احکام کو حق سمجھتا ہے، جسے اپنا دین، ایمان ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے چاہے وہ حاکم ہو یا محکوم، غریب ہو یا امیر، سپاہی ہو یا جنرل، چپراسی ہو یا حاکم اعلیٰ، اس کی ہر حالت میں اپنی استطاعت کے مطابق یہی کوشش ہوگی کہ وہ اللہ کے کلمہ کو بلند کرے، نیکیوں کو پھیلائے اور برائیوں کو مٹائے۔

یہ مادہ پرست کی ساری ذمہ داریاں اسی عالم آب و گل سے وابستہ ہیں وہ جو کچھ کرتا ہے، اسی دنیا کے لئے کرتا ہے، اس کی یہی خواہش بلکہ مقصد زندگی ہوتا ہے کہ دنیوی لذتیں اس کا اوڑھنا بچھونا بن جائیں اور جتنی زیادہ وہ غرق ہو کر رہ جائے اسے اتنا ہی لطف، لذت، مسرت اور چین ملنا چاہیئے، خواہ وہ کسی ذریعہ سے حاصل ہو، اس کی نظر میں حرام و حلال میں فرق کرنا بہت بڑی بیوقوفی ہے

—— مگر ——

ایک مسلمان فقط یہی حاصل کرنے کے لیے حیوان نہیں بن سکتا، اس کی تو ہر وقت نگاہ اللہ اور رسول کے احکام پر رہتی ہے، وہ ہر آن اپنے رب کی رضا جوئی میں لگا رہتا ہے، اور اس رضا جوئی کی راہ میں جو قربانی بھی اسے دینی پڑے اس سے دریغ نہیں کرتا۔ یہی زندگی جو اللہ کی رضا جوئی کے تصور سے خالی ہو، اسلام کی نگاہ میں وہ جانوروں کی زندگی ہے اور وہ تہذیب جس کے سایہ میں معاصی پروان چڑھتے ہوں، اور بداخلاقی کو فروغ حاصل ہوتا ہو، یہی تمام ہنگامہ ہٹ کے باوجود ایک تاریک تہذیب ہے!

اسلام دنیا میں غالب ہونے کے لئے ہی آیا ہے۔ اگر اسلام کسی زمانہ میں دنیا کی غالب قوت نہیں ہے تو اس زمانے کے مسلمانوں سے اللہ تعالیٰ باز پرس

فرمائے گا کہ اسلام کو غالب کرنے کے لئے تم نے کیا کیا؟ تم نے سوچا کہ اسلام کس طریقے سے غالب ہو سکتا ہے؟ تم نے اس وقت سے اسلام کی مدافعت کیا کی؟ تم نے اسلام کے لئے کتنی قربانیاں دیں؟ تم نے اس کام میں کتنی جانیں کھپائیں؟ اسلام کو غالب کرنے کی دُھن میں تمہاری کتنی راتیں بے خواب رہیں، اور تم نے اس غم میں راتوں کو کتنی کروٹیں بدلیں؟ تمہارے ہاتھ اللہ کے حضور کتنی بار اُٹھے اور تمہاری آنکھیں کتنی بار اشک آلود ہوئیں؟ ——— اور یہ کہ تم نے اپنی زندگیوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی کس قدر جھلک پیدا کی؟ اور تم نے اپنی سیرت کو صحابہ کرامؓ کی سیرت و کردار سے کتنا قریب اور ہم آہنگ کیا؟

اس دن نہ کسی کی منطق چل سکے گی اور نہ مطلوب خطاکاروں اور عصمت شعاروں کی جھوٹی معذرتیں قبول کی جائیں گی۔ وہ دن بڑا سخت دن ہوگا۔ اُس دن جلال ہی کے آثار سب کے خوف سے اچھے اچھوں کے ماتھے کا پسینہ ایڑیوں پر بہہ رہا ہوگا۔ اُس دن بڑے بڑے باجبروت فرمانروا اس جرم میں ذلت کے ساتھ جہنم کی طرف ہنکائے جا رہے ہوں گے، کہ ان لوگوں نے حکومت کرنے کے شوق میں مخلوق انسانی کی ذمہ داری تو قبول کر لی تھی مگر اس ذمہ داری کو ادا نہ کر سکے، جن کو عوام کی دیکھ بھال کی فکر میں زیادہ سے زیادہ مصروف رہنا چاہیے تھا، اُن کی زندگی کا بہت بڑا حصہ پروٹوکول کے ہجوم اور جام و مینا کے جھرمٹ ہی میں گزرا، مگر اُن کے خوشامدی درباری انہیں ظل اللہ اور مالک رقاب الامم ہی کہتے رہے، وہ نہیں یاد دلاتے رہے کہ "جہاں پناہ کی ذات رعایا کے لئے اللہ کی رحمت ہے، اور حضور کے سر اقدس پر ایک سو ولیوں کا سایہ ہے۔"

آخرت کے اسی محاسبہ سے بچنے کے لئے ایک مخلص انسان کبھی عہدے اور منصب کا حریص نہیں ہو سکتا، مگر جب یہ ذمہ داریاں کسی کے متعلق ہو جاتی ہیں تو وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے کمال دیانت کے ساتھ ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ خلفائے راشدین کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں کہ انہوں نے جو کی روٹی کھا کر اور پیوند لگے کپڑے پہن کر جہاں بانی کی ہے، اور دنیا میں حکمرانی اور حاکموں کی دیانتداری، خدا ترسی اور سادگی کی روشن مثالیں قائم کر دی ہیں۔

توبہ وانابت

آج دنیا جس طرح سے شر و فسق و فجور کے دہانے پر بہہ رہی ہے، اسی طرح دنیا کی سیاست کا رخ بھی دھوکے، لالچ اور جور و جبر کی طرف ہے۔ روس اور امریکہ کی باہمی کشمکش اور رقابت نے خطروں کا ایک آتش فشاں کھڑا کر دیا ہے، نہ جانے یہ آتش فشاں کب حرکت میں آ جائے۔

جب گھٹائیں گھر کر آتی تھیں، اور تیز ہوائیں چلتی تھیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی پناہ طلب فرماتے، اور کثرت کے ساتھ توبہ و استغفار کرتے تھے ——— اس وقت دنیا عذاب کے کنارے کھڑی ہوئی ہے، انسانوں نے خود اپنی ہلاکت کے لئے اپنے ہاتھوں اسباب مہیا کر لئے ہیں۔ قرب قیامت کے آثار بھی جھلک دکھا رہے ہیں، ایسے عالم میں زیادہ سے زیادہ توبہ و انابت کی ضرورت ہے۔ ہر جاندار کے لئے موت مقدر کر دی گئی، مرنا برحق ہے، اس سے کسی کو مفر نہیں۔ ایک کافر اور خدا و آخرت کا منکر بھی تو اپنی زندگی کے جھرمٹ میں زندگی کی آخری سانس لینے کی تمنا کرتا ہے مگر ایک مرد مومن:-

جب دم واپسیں ہو اللہ   لب پہ ہو لا الٰہ الا اللہ

کی آرزو رکھتا ہے اور اللہ کے حضور دعائیں کرتا ہے کہ اس کا ایمان پر خاتمہ ہو۔ ؎

کچھ رہے یا نہ رہے پر یہ دعا ہے کہ امیرؔ
نزع کے وقت سلامت مرا ایمان رہے

انفس و آفاق اللہ تعالیٰ کے وجود کی شہادت دیتے ہیں!

پچھلے انبیاء کرام کے معجزات سے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعہ معراج تک جو معروف معجزے اللہ کی کتاب میں ملتے ہیں، ان کے بارے میں ملحدین، متشککین اور منکرین کیسے کیسے مغالطے پیدا کرتے تھے اور کس کس طرح کے شبہات ڈالتے تھے، مگر اس دور میں سائنس جتنی ترقی کرتی جا رہی ہے انبیاء کرام کے معجزات کے اتنی ہی عقلی دلیلیں فراہم ہوتی چلی جا رہی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی نشانیاں انفس و آفاق میں پھیلی ہوئی ہیں، جس کسی نے ان کھلی ہوئی نشانیوں کو دیکھ کر بھی اللہ تعالیٰ کو نہ مانا اُس نے سب سے بڑی جہالت کا ثبوت دیا۔ سائنس کی ترقی کے ساتھ یہ حقیقت واضح تر ہوتی جا رہی ہے کہ کائنات کے سارے نظام میں کس طرح ترتیب، ربط، ہم آہنگی اور حکمت و دانائی اور باریکی پائی جاتی ہے۔ اور یہ پورا کارخانہ کسی ناگہانی واقعہ یا اتفاقی حادثہ کے سبب ہرگز ہرگز وجود میں نہیں آسکتا، اس کا کوئی خالق، صانع، فاطر اور بنانے والا ضرور ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مہلت دی گئی ہے اور اس پر حجت کا یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ سائنس کی یہ ایجادات اس کی آنکھیں کھول سکیں اور وہ جہالت کے تاریک اندھیرے سے نکل کر علم و یقین کی روشنی میں آجائے۔ اگر وہ اس پر بھی انکار پر جما رہا، اور اس کی آنکھوں سے جہالت کے پردے نہ ہٹے، تو اس کی اس جہالت ـــ ہٹ دھرمی اور خدا ناشناسی سے، ایک طرف مجہول دنیا بیزاری کا اظہار کرے گی اور دوسری طرف کیا عجب ہے کہ اس کے ساتھ قوم عاد و ثمود ـــ جیسا سلوک کیا جائے۔ اور اللہ کی پکڑ کے آگے، اس کی تمام طاقتیں دھری کی دھری رہ جائیں۔

کوئی شک نہیں کہ سائنس کی ایجادیں بہت حیرت انگیز ہیں، اگر آدمی اپنے جسم کی ترتیب و ساخت پر غور کرے، وہ اپنے نفس کو غور و فکر کا موضوع بنائے تو سائنس کی ایجادیں اسے ہیچ نظر آئیں گی ـــ انسان کے حافظہ کی قوت ہی کو لیجئے۔ اس قوت دماغ میں جس کا حجم چند سینٹی میٹر سے زیادہ نہیں ہے، آخر کس قسم کا فیتہ رکھا ہوا ہے، جس پر ہزاروں نہیں لاکھوں اشیاء کے نام، شکلیں، واقعات اور ریکارڈ ہوتی چلی جاتی ہیں اور حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ ہزاروں لاکھوں شکلیں اور ریکارڈ ہیں جو نہی آدمی کے سامنے آتیں اور دہرایا جائے تو وہ دیکھتے ہی ان کو شناخت کر لیتا ہے۔ آدمی کی جسمانی ساخت اور قویٰ کی شکلیں، سائنس کی ایجادات سے ہزار گنا زیادہ حیرت انگیز ہے، آدمی کی برتری تو اس سے ثابت ہے کہ وہ چیزوں کو ایجاد کرتا ہے، جب "ایجادات" کی حیرت انگیزی کا یہ عالم ہے، تو ان کا موجد اور زیادہ حیرت انگیز ہونا چاہیے۔

اس سلسلہ کو ذرا آگے تک بڑھاتے چلے جائیے، یہ دورِ تخلیق کا سلسلہ انسان کی ذات پر منتہی ہو کر نہیں رہ جاتا۔ انسان نے راکٹ اور سیارے بنائے؟ مگر کن چیزوں سے بنائے؟ وہ چیزیں، مسالہ اور مواد انسان کا پیدا کیا ہوا تو نہیں ہے، اس کو تو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے ـــ اس مسئلہ کی ترتیب کا آغاز اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیزوں، اور قوتوں سے ہوتا ہے۔ جیسے انسان نے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ قوتیں، توانائیاں اور خام مواد سے کام لے کر انہیں ملا کر اور جوڑ کر ایک منظم ترتیب دے کر کسی "ایجاد" کو ظہور دیا، جو خود انسان بھی تو اللہ تعالیٰ ہی کی مخلوق ہے۔ وہ ذات کتنی عظیم، پُر جلال، باجبروت اور علیٰ کل شیءٍ قدیر ہو گی جس نے انسان کو خلق فرمایا، اس انسان کو جس کی ایجادات، آفتاب و ماہتاب پر کمندیں ڈال رہی ہیں۔

حسن و کمال اور عبادت و خلق کا منبع و مرکز اللہ تعالیٰ ہی کی ذات قرار پاتی ہے، وہی "حسن مطلق" اور "خیرِ مطلق" ہے، اسی کی حکمرانی و کبریائی برحق ہے، اسی کے حکم پر چلو اور اسی کے فرمان کے آگے سر تسلیم خم کر دو۔ انسان کا فریضہ دیتا ہے جس نے اللہ کو مانا اور اس کے احکام پر چلا، وہ چاہے ہفت اقلیم کا بادشاہ ہو اور اس کی ایجاد چاہے مہر و ماہ کے سینہ کو چیر کر رکھ دے، یہ سائنس خدا ناشناس

اور فرد انسان کسی عزت و اعزاز کا مستحق نہیں ہے۔

جہاں ایمان نہیں، وہاں جہالت و درندگی ہے جہاں "علم" نہیں وہاں فساد پایا جاتا ہے، برعکس اور تہذیب و تمدن کی ان تمام حیرت انگیز ترقیوں کے باوجود آج دنیا میں "فساد و جہالت" کا دور دورہ ہے ہم اللہ کے فضل سے ایمان و علم کے تقاضوں کو پہچانتے ہیں، اللہ اور رسول کو مانتے ہیں، اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں اور اسلام، اور صرف اسلام کو نظام حق سمجھتے ہیں —— ہمارا فرض ہے کہ ہم دنیا کے بگاڑ کو بناؤ سے، فساد کو صلاح و درستی سے اور جہالت کو علم و یقین سے بدلنے کی کوشش کریں۔

اللہ کی معصیت میں کسی انسان کی اطاعت نہیں کی جا سکتی۔ بات وہی قبول کی جائے گی اور اسی قانون کو مانا جائے گا جو اللہ تعالیٰ کے کسی حکم سے متصادم نہ ہو۔ احترام اسی شخصیت کا کیا جائے گا جو اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے کو عبد ذلیل اور حقیر غلام بنا کر پیش کرے۔

ہم اللہ تعالیٰ سے نیکی کی توفیق طلب کرتے ہیں، اور اسی سے ہدایت و استقامت مانگتے ہیں، جو مبارک ہے، مبارک وقت میں بھی قائم دائم رہتا ہے اور کسی جنبش کو قبول نہ کرے۔ آؤ اللہ تعالیٰ کی رضا ہی کو اپنی زندگی کا مقصود بنا لیں، بس پھر بشارتیں ہی بشارتیں اور سعادتیں ہی سعادتیں ہیں!

ہم ہرجائی، دوئی پسند اور کثرت پرست نہیں ہیں، جس طرح ہم ایک اللہ کو مانتے ہیں، اسی طرح انسانوں میں ہم نے اللہ تعالیٰ کے آخری رسول ہی کی قیادت و اطاعت کا قلادہ اپنی گردن میں پہنا ہے، اور یہ رشتہ ہمیں جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

مرتبہ محمد واحد [illegible] دہلوی

اللہ کا اسلامی تصور

(فاضل مقالہ نگار کی زیر ترتیب کتاب حیات سرور کائنات حصہ سوم کے چند ورق)

یوں تو دنیا کی بے پڑھی لکھی عورتیں تک بولا کرتی ہیں کہ "اللہ کو دیکھا نہیں، عقل سے پہچانا" لیکن انسان وحی کی روشنی اور مدد کے بغیر اللہ کا تصور کرتا ہے تو اسے اللہ میں انسانی حسن اور وجاہت کا ایک انتہائی مکمل مجسمہ نظر آتا ہے۔ اس تصور کی قرآن نے صرف تین لفظ کہہ کر تردید اور نفی فرما دی ہے۔ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ کوئی شے اس کی مماثل نہیں۔

تمہارا دیکھنا اور سننا آنکھوں اور کانوں کا محتاج ہے اور آنکھیں روشنی کی اور کان ہوا کے محتاج ہیں۔ اللہ کا دیکھنا اور سننا اندھی ہو جانے والی آنکھوں اور بہرے ہو جانے والے کانوں کا محتاج نہیں ہے۔

تمہارا دیکھنا اور سننا ناقص اور عارضی ہے۔ اللہ کا دیکھنا اور سننا نقص اور عارضیت سے پاک ہے۔ تمہارا دیکھنا اور سننا نقلی ہے اللہ کا دیکھنا اور سننا اصلی اور حقیقی۔ تم کوئی کام اللہ کے عطا کردہ اعضاء سے بے نیاز ہو کر نہیں کر سکتے ورنہ وہ اعضاء واپس لے لئے جاتے ہیں۔ اللہ اعضاء سے بے نیاز ہے۔ اللہ اعضا کا خالق ہے۔ اعضا کا ضرورت مند نہیں ہے۔ اِنَّمَا اَمْرُهٗ اِذَا اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۔۔۔۔۔۔ اس کا معمول یہ ہے کہ جب کسی چیز کا وجود (میں آنا) چاہتا ہے تو اسے حکم دیتا ہے ہو جا۔ وہ ہو جاتی ہے۔

جس طرح تمام اشیاء پہچانی جاتی ہیں اللہ اس طرح نہیں پہچانا جاتا۔ اللہ کی ذات کے متعلق تو حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ مَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ ۔۔۔ "پہچاننے کا جو حق ہے، اے اللہ! ہم تیری ذات کو اتنا نہیں پہچان سکے" اللہ کی ذات پہچانی کیسے جاتی۔ اللہ کسی شے کے مماثل نہیں ہے۔ حضور پھر کیسے کہہ دیتے کہ اللہ ایسا ہے لیکن نے عقلی سطح ہی سے دوری کا چھوڑ حقیقت اس کے مقابلہ میں ہیچ ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔۔ اَلْعَجْزُ عَنْ دَرْكِ الْاِدْرَاكِ اِدْرَاكٌ ۔۔۔ اللہ کی ذات کا ادراک نہ کر سکنا اللہ کی ذات کا ادراک ہے۔ اکبر الہ آبادی نے شاید اسی قول کو منظوم کیا تھا۔

تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا
بس جان گیا میں تیری پہچان یہی ہے

شیخ سعدی شیرازی رح کا شعر ہے

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم
وز ہر چہ گفتہ ایم و شنیدیم و خواندہ ایم

(اے وہ ذات پاک جو خیال قیاس اور وہم سے بالا ہے اور ہماری ہر گفت و شنید اور ہمارے کل علم و عرفان سے ماوراء ہے)

تربیت و پرورش کی کیفیت یہ ہے کہ جس طرح پیدا ہونے سے پہلے ماں کے پیٹ میں مدد پہنچائی جاتی ہے اسی طرح پیدا ہونے کے بعد ماں کی چھاتیوں سے دودھ کے دو چشمے جاری ہو جاتے ہیں۔

اگر بندے اللہ کے بندوں کے ساتھ اللہ کے احکام کے مطابق سلوک کریں تو اللہ کے خزانے میں نہ آسائش بدن کے سامان کی کمی ہے اور نہ آسائش روح کے سامان کی۔ رزق عمر بھر اسی آسانی سے مل سکتا ہے جس آسانی سے دو برس تک ہر امیر اور غریب کو ملتا ہے بچے دودھ پیتے ہیں اور دودھ ماں کا انتظار ہوتا ہے۔ جملہ ضروریات زندگی اسی آسانی سے مل سکتی ہیں۔ فِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ شرط مگر یہی ہے کہ اللہ کے احکام اور قوانین کی پابندی کی جائے اور روزی اللہ کے ہاتھ میں رکھا جائے۔ زمیندار و کارخانہ دار، تجار اور ملی اقتدار لوٹ نہ مچائیں۔

خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَأَنزَلَ لَكُم مِّنَ الْأَنْعَامِ ثَمَانِيَةَ أَزْوَاجٍ ۚ يَخْلُقُكُمْ فِي بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ خَلْقًا مِّن بَعْدِ خَلْقٍ فِي ظُلُمَاتٍ ثَلَاثٍ ۚ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۖ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ فَأَنَّىٰ تُصْرَفُونَ ۝

اللہ نے تم (سب انسانوں) کو ایک انسان (یعنی آدم) سے پیدا کیا ہے۔ اسی انسان سے اس کا جوڑا نکالا اور تمہارے لئے (صرف ماں کے دودھ پر اکتفا نہیں کی، آٹھ سواری کے) چوپائے (اونٹ، گائے، بھیڑ، بکری بھی) پیدا کئے۔ (تاکہ ماں کا دودھ چھٹنے کے بعد وہ چوپائے تمہیں دودھ دیں اور دوسری آسائشیں بہم پہنچائیں) اللہ (ایسا خالق ہے کہ) تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ میں ایک حالت کے بعد دوسری حالت پر تین اندھیروں (ماں کے جوف بدن، بطن اور جھلی) کے اندر پیدا کرتا ہے۔ یہ ہے اللہ تمہارا پروردگار۔ اسی کی (دونوں جہان میں) حکومت ہے اور اس کے سوا کوئی معبود (و مطاع) نہیں ہے۔ (اس سے منہ موڑ کر) کدھر جاتے ہو۔

اپنی پیدائش اور اپنے ہوش سنبھالنے تک کا زمانہ کوئی انسان نہیں دیکھ سکتا، لیکن دوسروں سینکڑوں کی پیدائش اور ہوش سنبھالنے کا زمانہ ہر شخص دیکھتا ہے اور اُن سے کہا کرتا ہے کہ:۔ ؎

بات بھی نہ کرنی آتی تھی تمہیں
یہ ہمارے سامنے کی بات ہے

آج بیٹھے اور اٹھلاتے پھرتے ہو کل تن بدن کی خبر نہیں تھی۔ جانور کا بچہ سمجھدار ہوتا ہے، تم اتنے بھی سمجھدار نہ تھے۔ مگر سب کچھ دوسروں سے کہا جاتا ہے۔ یہی بات خیال نہیں آتا کہ ہم خود کبھی ایسے تھے کہ رحمان و رحیم اللہ اگر ماں باپ کے دل میں محبت نہ ڈال دیتا تو چیلیں اُٹھا لے جاتیں۔ آدمیوں میں نہ بیٹھتا تو جانوروں سے بدتر رہ جاتے۔ صورت، شکل، عقل و فراست، مال و زر، قدر و اختیار اللہ کی دی ہوئی نعمتیں ہیں جیسا کہ پیدا کرنا اور وجود دینا ہے۔ ان نعمتوں پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیئے اور اس کے بندوں کے ساتھ انسانیت سے پیش آنا چاہیئے۔ اللہ سے بغاوت نہیں کرنی چاہیئے، اور اس کے بندوں سے رعونت نہیں برتنی چاہیئے۔ خصوصاً اہل عقل کو۔ عقل کا کمال عقل کا گھمنڈ نہیں ہے۔ عقل کی بے بضاعتی کا احساس ہے۔ ؎

تم سمجھتے نہیں تھے تم جانو
اپنے ہاتھوں تباہ ہو گئے

وَمَن يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِن سَبِيلٍ ۝ اور جسے اللہ گمراہ رکھنا چاہے اُس کے لئے ہدایت پانے کی کوئی سبیل نہیں ہے۔ اور یہ سمجھتے ہو تو آگے جو کچھ بیان کیا جائے گا وہ سب سمجھ میں آ جائے گا۔ مقصد یہ ہے کہ جو (گمراہ و تباہ) ہونے والا ہو وہ (اتمام حجت کے بعد گمراہ و) تباہ ہو اور جو (دین حق پر) زندہ (رہنے والا) ہو وہ (بھی) دلیل (اور ثبوت) دیکھ کر زندہ رہے۔ یعنی

اور اس کی جان بخش کر دیتا ہوں اور جسے چاہوں پھانسی پر چڑھا دوں۔ نمرود کے اس مغالطہ کا جواب ابراہیم نے (دوسری بات پیش کی اور)
اللہ (روزانہ) مشرق سے سورج نکالتا ہے تم ذرا ایک دن اسے مغرب سے نکال کر دکھاؤ۔ یہ سن کر وہ کافر مبہوت ہو کر رہ گیا (لیکن ایمان پھر بھی نہ لایا) اور اللہ ایسے ہٹ دھرم اور نا انصاف لوگوں کو ہدایت نہیں کیا کرتا۔

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَیْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً

نادانو! کیا تم کو دنیا کی کسی شے میں اس کی قدرت کا جلوہ نظر نہیں آتا۔ دیکھیں تم اس بات پر غور کرتے ہو کہ ارض و سماوات میں جو کچھ ہے اللہ نے سب کو تمہارے تابع بنا رکھا ہے اور اپنی ظاہری و باطنی نعمتیں بدرجۂ اتم تم پر نازل کر دی ہیں مثلاً تمہارے اعضا اور اعضا کا باہم تناسب اور کھانے پینے کی ان گنت چیزیں اور قوت فہم و ادراک وغیرہ پھر ابر کا آنا ہوا کا چلنا۔ آفتاب و ماہتاب کی درخشانی ان کا طلوع ہونا اور غروب ہونا۔ تاروں کی چمک دمک۔ جنگلوں کی شگفتگی۔ دریاؤں کی روانی و طغیانی۔ پہاڑوں کی بلندی، زمین کی پستی وحوش و طیور کی حیات و ممات۔ کیڑے مکوڑے شجر حجر۔ غرضیکہ کائنات کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو تمہاری خدمت گزاری کے لئے حاضر ہو اور دنیا میں کوئی انقلاب ایسا رونما نہیں ہوتا جو تمہارے جسم یا تمہاری روح کو نفع نہ پہنچاتا ہو۔ بہت سی چیزیں تمہارے جسم کی زندگی اور تازگی کا باعث ہیں اور بہت سی تمہاری روح کی بیداری بخشتی ہیں اور بہت سی تبدیلیاں تمہیں عبرت کا سبق دیتی ہیں اور عقل سکھاتی ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَیُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ یَّجْرِیْۤ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّاَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ۝

اے انسان! کیا تو نے یہ نہیں دیکھا کہ اللہ (کبھی) رات کو دن میں داخل کر دیتا ہے اور (کبھی) دن کو رات میں داخل کر دیتا ہے (کبھی دن کو رات سے بڑا بنا دیتا ہے اور کبھی رات کو دن سے بڑا بنا دیتا ہے) اور نیز (دیکھ کہ) اسی نے آفتاب و ماہتاب کو دیں مسخر کر رہا ہے (کہ) ہر ایک (اپنا) دورہ لگاتا رہتا ہے اور نیز (جان) کہ جو کچھ تم کرتے اس کی اللہ کو پوری خبر ہے۔ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الْبَاطِلُ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِیُّ الْكَبِیْرُ۝ یہ (تمام انقلابات) اس امر کی دلیل ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی معبود برحق ہے اور نیز اس (بات) کی دلیل کہ شرک کرنے والے اللہ کے سوا جن کو پوجتے ہیں وہ باطل ہیں اور (نیز) اس بات کی دلیل کہ اللہ ہی کی ذات بزرگ و برتر ہے۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ لِیُرِیَكُمْ مِّنْ اٰیٰتِهٖ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ۝ اے انسان! کیا تو نے یہ نہیں دیکھا کہ کشتی دریا میں چلتی ہے اور اللہ کی مہربانی سے (ڈوبتی نہیں) حالانکہ اور چیزیں ڈوب جاتی ہیں۔ اور اللہ کشتی کو چلانے کے لئے ہوا بھیجتا ہے۔ محض اس غرض سے کہ وہ تم (دنیا والوں) کو اپنی (قدرت کاملہ کی) کچھ نشانیاں دکھائے۔ لاریب اس میں (اللہ کی قدرت و حکمت کی بڑی بڑی) نشانیاں ہر اس شخص کے لئے (موجود) ہیں جو (حق پسند و) مخلص اور صابر و شاکر ہے۔ وَاِذَا غَشِیَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمَا یَجْحَدُ بِاٰیٰتِنَاۤ اِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوْرٍ۝

(صابر و شاکر ہے) اور (اکثر) لوگوں (کا حال) ایسا ہے کہ جب (کشتی میں بیٹھے ہوں) اور دریا کی موجیں سائبانوں کے مثل ان کے سر پر چھا جائیں (اور انہیں اپنی جانوں کے لالے پڑ جائیں) تو (اس وقت تو مدد کے واسطے) اللہ کو خالص اسی کے مطیع و منقاد بن کر پکارنے لگتے ہیں لیکن جب اللہ انہیں (مہربانی سے) بچا کر خشکی کی طرف لے آتے تو بعض تو (خیر) راہ راست پر آ جاتے ہیں

؎ یہ ایسا جواب تھا جیسے آج کل کوئی کہے کہ میں مقررہ طریقے کے بجائے مادۂ تولید کو پچکاری کے ذریعہ عورت کے رحم میں پہنچا کر انسان بنا سکتا ہوں۔

"انفس و آفاق میں اللہ تعالیٰ کی بے شمار نشانیاں بکھری پڑی ہیں، جس نے ان نشانیوں کو دیکھ کر اور پڑھ کر بھی خالقِ کائنات کو نہ مانا اور پوری زندگی تذبذب، تشکیک اور بے یقینی کے عالم میں گزار دی، اُس نے سب سے بڑی بے وقوفی و جہالت کا ثبوت دیا۔

علوم و فنون کی ان وسعتوں اور تہذیب و تمدن کی اُس چکا چوند سے، جو انسان کو خدا ناشناس بناتی ہو، کروڑ بار اللہ کی پناہ!"
(م۔ ق)

مصطفیٰ صادق رافعی
ترجمہ: محمد کاظم سباق

ابوالحسنؒ اور شیر

انگریزی کے مشہور ڈرامہ نگار جارج برنارڈ شا کا ایک ڈرامہ اینڈ روکلیز اور شیر کے عنوان سے ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک حبشی جنگل میں گزرتے ہوئے ایک شیر کے پنجے کا کانٹا نکال کر اسے بڑی اذیت سے نجات دلا دیتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد وہ حبشی غلام کسی جرم کی پاداش میں شیر کے آگے ڈالا جاتا ہے۔ لیکن شیر اتفاق سے وہی ہوتا ہے جس کے پاؤں کا کانٹا اس نے نکالا تھا۔ وہ اپنے محسن کو پہچان لیتا ہے اور بجائے اسے چیر پھاڑنے کے اس کے پاؤں چاٹنے لگتا ہے۔

یہ واقعہ عجیب و غریب ضرور ہے لیکن ناقابل فہم نہیں، اس لئے کہ جانوروں کو خدا تعالیٰ نے بڑی قدر پہچان دی ہے۔ اس سے عجیب تر واقعہ تیسری صدی ہجری میں مصر کے ایک بڑے زاہد عابد ابوالحسن بنان رحمۃ اللہ کے ساتھ پیش آیا جبکہ طولونی حکومت کے پہلے فرمانروا احمد بن طولون نے کسی بات پر انہیں شیر کے آگے ڈالنے کا حکم دے دیا۔ اس واقعہ کو عربی کے بے نظیر ادیب اور انشاء پرداز مصطفیٰ صادق الرافعی (م ۱۹۳۷ء) نے اپنے مخصوص فلسفیانہ انداز میں "الاسد" کے عنوان سے سپرد قلم کیا ہے۔ رافعی نے آخر زمانہ میں مصر کے ہفتہ وار ادبی مجلہ الرسالۃ میں کچھ مسلسل مضامین لکھے تھے جو بعد کو "وحی القلم" کے نام سے مرتب ہو کر شائع ہوئے۔ وحی القلم میں ایک سلسلۂ مضامین صوفیاء کی ان عظیم ہستیوں کے تذکرہ میں ملتا ہے جو اپنے زہد و استغنا میں مشہور تھے اور حق کی خاطر جنھوں نے بادشاہ وقت کے ظلم و جبر تک کی پروا نہ کی۔ ان مردان باصفا کا تذکرہ کرتے ہوئے رافعی اسلامی تصوف کا فلسفہ بڑے اچھوتے انداز میں پیش کرتا ہے۔

یہ مضمون اسی سلسلہ میں سے لیا گیا ہے۔ (مترجم)

بغداد کے حضرت ابو علی حسن بن محمد الروذباری (متوفی ۳۲۲ھ) ایک روز مصر میں اپنی مجلس وعظ و ارشاد میں تشریف فرما تھے۔ ان دنوں ان کے مرشد اور دیار مصر کے شیخ اعظم حضرت ابوالحسن بنان رحمۃ اللہ (متوفی ۳۱۶ھ) کا انتقال ہو چکا تھا۔ اور یہ وہ ہستی تھے کہ ان کے زہد و ورع اور عبادت گزاری کا ایک عالم میں شہرہ تھا۔ جب وفات پائی تو سارا شہر امڈ آیا۔ ان کے جنازے کے ساتھ تھے، ان کے جنازہ کا دن گویا ان [illegible]۔ روز قیامت کے برحق ہونے کا ایک بین ثبوت تھا۔ ہر شخص کی چشم بصیرت وا ہو گئی تھی۔ ہر فرد اپنے دل میں یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ وہ اس زندگی کی آرائش و زینت کے پیچھے پڑ کر اندھا ہو چکا ہے۔ نہیں جانتا کہ حقیقت کیا ہے اور دھوکا کیا؟ اپنا حقیقی [illegible] بصیرت کی آنکھ سے نہیں دیکھتا۔ ہاتھ کے لمس سے محسوس کرتا ہے، اپنے متعین کرنے میں تحقیق و تدقیق کے بجائے وہم و گمان سے کام لیتا ہے۔ اور ہر چیز کے معاملہ میں اپنے نفس اور اس کے تقاضوں کو حجت قرار دیتا ہے، نہ یہ کہ اس چیز کی اصل و حقیقت کو اپنے نفس کے لئے حجت قرار دیتا ہے۔ بلکہ

وجود داروں کے گرد و پیش کی انسانی روحوں کے درمیان کوئی گہرا رشتہ قائم ہے۔

اللہ تعالیٰ کی یہ عجیب و غریب حکمت ہے کہ جس طرح خطرناک امراض متعدی ہوتے ہیں کہ ان کی چھوت ایک سے دوسرے کو لگتی چلی جاتی ہے۔ اسی طرح عظیم روحانی قوتیں بھی متعدی ہوا کرتی ہیں، اور محض محبت و اتصال کے رشتے سے ایک سے دوسرے میں سرایت کر جاتی ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ جب صالحین کو اس دنیا میں پیدا کرتا ہے تو تقویٰ کا "روگ" انہیں ایک بیماری کی شکل میں لگا دیتا ہے۔ پھر جس طرح ایک مریض شہوات دنیا سے پرہیز کیا جاتا ہے، اسی طرح یہ "روگ" بھی انہیں خواہشات دنیا سے بہت دور رکھتا ہے۔ وہ ان کے نفس کی سرکشیوں کو توڑ کے رکھ دیتا ہے۔ جب لوگوں کے درمیان ایسا کوئی مرد حق موجود نہ ہو جو ایک عجیب و غریب باطنی قوت سے انہیں تقویٰ کی چھوت لگا دے تو لوگ کسی طاقت کے بل پر سیدھے نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ بلند پایہ صوفی، روحانی پیشوا، عظیم الشان ہیرو اور جرنیل، اور بلند مرتبہ علماء ان کی طرح کے سب لوگ ایک ہی حکم کے تحت آتے ہیں۔ حکمت روحانی کے زاویہ نظر سے یہ سب بہت سخت قسم کے "مریض" ہوا کرتے ہیں۔

بو علی فرماتے ہیں:۔

"میں نے ایک دفعہ ارادہ کیا کہ خود شیخ سے ابن طوطون والے واقعہ کا حال دریافت کروں، لیکن ان کی ہیبت سے میری زبان نہ کھل سکی۔ پھر میں نے دل میں سوچا کہ میں ان سے شیخ کے اس جملے کا مطلب دریافت کروں کہ "وہ انہیں اپنے نفس کا مرض سمجھتے تھے" شاید کہ اس حیلے سے وہ واقعہ ان کی زبانی سن لوں۔ میں یہ سوال کرنے کے لئے ابھی اپنے دل میں جملہ مرتب کر رہا تھا کہ ایک آدمی شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا۔

اے حضرت مجھے فلاں آدمی سے سو دینار لینے ہیں، لیکن جس کاغذ پر قرض کا یہ لین دین لکھا تھا وہ مجھ سے گم ہو گیا ہے، اب میں ڈرتا ہوں کہ اگر اسے پتہ چل گیا تو وہ اس قرض سے منکر ہو جائے گا، اس لئے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کیجئے کہ مجھے میرا مال واپس دلا دے اور اس شخص کو حق پر قائم رہنے کی توفیق دے:

شیخ نے جواب دیا ۔

"بھائی، میں ایک سن رسیدہ آدمی ہوں اور میٹھی چیزیں مجھے بہت مرغوب ہیں۔ اس لئے جاؤ اور ایک سیر مٹھائی میرے لئے لے آؤ، تاکہ میں تمہارے لئے دعا کروں"

وہ آدمی چلا گیا اور ایک دکان پر جا کر مٹھائی خریدنے لگا۔ دکاندار نے وہ مٹھائی اسے جس کاغذ میں ڈال کے دی وہ وہی گم شدہ قرض نامہ تھا۔ وہ آدمی دوڑا دوڑا شیخ کے پاس آیا اور انہیں خبر دی۔ شیخ نے فرمایا:۔

"یہ مٹھائی لے جاؤ اور اپنے بچوں کو کھلا دو۔ خدا تمہیں اپنے نفس کا مرض چکھائے! پھر وہ میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے۔ اے بو علی، اگر کوئی درخت کسی ایسی چیز کی خواہش کرنے لگے جس میں نہ اس کے وجود کی سلامتی ہے نہ اس کی منفعت کا کمال، اور وہ مرغوب چیز اسے دے کر اپنے نفس کا مزا چکھنے کا موقع دے دیا جائے تو معلوم ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ درخت اپنے آپ کو کھا جائے گا اور بالکل سوکھ کے رہ جائے گا"

بو علی فرماتے ہیں "معجزات جو نبیوں کے ہاتھوں صادر ہوتے ہیں، اور وہ کرامات جو متقی لوگوں سے ظاہر ہوتی ہیں اور اسی طرح کے باقی خارق عادات اور غیر معمولی واقعات، یہ سب کچھ گویا قدرت کی طرف سے ایک اور روزگار مرد کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ یہ ہے وہ مرد۔ پس مجھے بھی اب شیخ سے ابن طوطون والے واقعہ کی بابت سوال کرنے کی ضرورت نہ رہی، اور مجھے یوں لگا جیسے میں نے بچشم سر وہ سب کچھ دیکھ لیا جو میں نے سنا تھا۔ لیکن واپس آنے سے پہلے میں قاضی ابوجعفر احمد بن عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ الدینوری (متوفی ۳۲۲ھ) سے ملنے چلا گیا۔ یہ وہ شخص ہے کہ اپنے والد ابن قتیبہ کی تمام کتابوں کے متعلق اپنے حافظے سے گفتگو کرتا ہے۔ اور گنتی میں چھوٹی بڑی اکیس کتابیں ہیں —

ہوئے انسانی وجود کو سونگھتا ـــــــ اس انسانی وجود کو جسے شیر کے اندر کوئی خونخواری اور وحشت محسوس نہیں ہوئی جس نے شیر کو بھی ایک ایسی مخلوق سمجھا جو کسی بڑی قوت کے تابع ہے جس پر وہ ایمان رکھتا تھا اور جس پر اسے بھروسہ تھا۔

اس ایمان بھرے دل پر قرآن کی ایک ایسی شعاع نازل ہوئی کہ سب روز روشن کی طرح واضح نظر آنے لگا کہ وہ حق تعالیٰ سے کتنا قریب ہے۔ وہ ایک شیر کے سامنے نہیں ہے، بلکہ وہ اور شیر دونوں خدا تعالیٰ کے سامنے ہیں۔ اور وہ اس آیت کے یقین میں محو ہو گیا۔ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا (اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کرو، بے شک تم ہماری آنکھوں کے سامنے ہو)

شیر نے ایک ایسا آدمی پہلی بار دیکھا جو سراپا خوف خدا تھا۔ پس وہ اس سے خائف ہو گیا، اور جس طرح شیخ اپنی ذات اور اس کی خصوصیات سے بہت بلند ہو گئے تھے اسی طرح وہ وحشی جانور بھی اپنی ذات، اور اس کی وحشیانہ خصوصیات سے معرا ہو گیا۔ نہ اس انسان میں کوئی خوف، کوئی فکر و پریشانی اور کوئی خواہش نفس باقی رہ گئی تھی، اور نہ اس وحشی میں کوئی خونخواری درندگی، خیرگی، کوئی بھوک یا کوئی خواہش نفس باقی رہ گئی!

شیخ نے اپنے آپ کو بالکل چھوڑ دیا، اور شیر کو گویا محسوس ہوا کہ اس آدمی میں جان ہی نہیں ہے، اس میں وہ "انسانی مٹی" ہی نہیں ہے جس پر وہ حملہ کرے۔ اگر اس وقت تفکرات دنیا کی کوئی لہر یا شک و تذبذب کی کوئی کیفیت شیخ کے دل پر طاری ہو جاتی تو شیر کے نتھنوں میں فوراً انسانی گوشت کی بو سرایت کر جاتی، اور وہ انہیں چیر ڈالتا۔

ابو جعفر نے کہا۔ جب شیر اس جالہ سے ادھر کا پھر کر شیخ کے چہرے کی جانب دیکھا تو وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے پھر انہوں نے شیخ کو باہر نکال لیا۔ اور ہم میں سے ہر شخص اپنے اپنے خیال کے مطابق اندازے لگانے لگا۔ کسی نے کہا۔ یہ شدت خوف تھی جس نے شیخ پر بے خودی کی کیفیت طاری کر دی۔ کسی نے کہا۔ شیخ پر ذہنی موت سوار ہو چکی تھی۔ جسم ان کا زندہ تھا۔ لیکن ان کے ذہن پر موت طاری تھی۔ کسی کا گمان تھا کہ یہ سکون کسی گہری فکر کی وجہ سے تھا تاکہ حرکت جسم سے اس فکر میں اضطراب نہ پیدا ہو۔ کچھ اور لوگوں کا خیال تھا کہ شیخ اس وقت محویت و استغراق کی ایسی حالت میں تھے جس نے شیر کو مسحور کر دیا ـــــــ اس طرح ہم لوگ اپنے اپنے خیال کے مطابق تیر تکے چلانے لگے۔ آخر شیخ ابوالحسن بُنان کو ابن طولون کے سامنے سے لے گئے تو میں نے دریافت کیا۔

"اے شیخ، اس وقت تمہارے دل میں کیا تھا اور تم کس سوچ میں محو تھے؟"

شیخ نے جواب دیا:

"مجھے کوئی خوف نہیں تھا، میں صرف یہ سوچ رہا تھا کہ شیر کا لعاب دہن پاک ہوگا یا پلید؟"

وضاحت

ماہ جنوری کے "فرقان" میں "جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد دوم" پر جو تبصرہ (صفحہ ۴۳-۴۵) شائع ہوا ہے، اس میں گرفت کی گئی تھی کہ فاضل مرتب نے مسلم لیگ کا تو تذکرہ کیا مگر مسٹر محمد علی جناح کا ذکر چھوڑ دیا ـــــــ ندوۃ المصنفین دہلی کے ایک مکتوب میں اس کو واضح کیا گیا ہے کہ اس کتاب کی جلد اول میں قائد اعظم محمد علی جناح مرحوم کا ذکر بہت تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔

ادارہ

روحِ اقبال

مُحسن نصیری

اقبال کی شاعری بہ لحاظ علوِ خیال، تنوعِ افکار، فلسفیانہ بصیرت، حکمت و اسلوبِ بیان اپنی مثال آپ ہے۔

یہ صحیح ہے کہ مشرق و مغرب کے بہت سے میخانوں کی سیر کرنے والے شاعر کے افکار و خیالات کی تہہ تک پہنچنے کے لئے ایک رندانہ ذوق و ظرف نہایت ضروری ہے۔ یہ تسلیم کہ اس کا ذہنی افق نہایت وسیع اور اس کی بے شمار تلمیحات و اشارات کو سمجھنے کے لئے ناگزیر ہے کہ قدیم و جدید فلسفہ و فکر کے میل و سنگِ نشان سے واقفیت ہو۔ یہ معلوم ہے کہ اس کی شاعری میں فلسفہ و مسائل پر تدبر، حسن کی تلاش، محبت کا سوز، انسانِ کامل کا تصور، حیات و کائنات کے اسرار و رموز پر گفتگو، غرض ہر اعلیٰ ذوق کی چیز ملتی ہے۔ ایک سوال یہ ہے کہ اقبال کی شاعری کی روح کیا ہے۔ وہ کون سی سب سے بڑی "ایک فکر" ہے جس سے دوسرے تمام افکار روشنی و گرمی حاصل کرتے ہیں۔ وہ کونسی سب سے بڑی "نیک آرزو" ہے جس سے دوسری آرزوؤں کے چراغ روشن ہوتے ہیں۔ وہ کون سا سب سے بڑا "ایک جذبہ" ہے جس کے تحت سے اس کی شاعری میں تمام تبدیلی و رنگینی، زندگی و حرارت پائی جاتی ہے۔ اس کا مجمل جواب یہ ہے کہ اقبال کی شاعری کی روح روحِ عشقِ رسول ہے جو ایک لازوال کیفیت بن کر اس کی ساری شاعری پر چھا گیا ہے۔

اس کیفیت کو منتخب اشعار کے ذریعہ طور پر واضح کرنا مشکل ہے۔ یہ اس کی شاعری کے رگ و ریشہ میں سمائی ہوئی ہے ع

شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحرگاہی کا نم

انسان کا رتبہ زندگی میں اپنے مجموعی طریقِ کار و طرزِ فکر، اس کی انفرادی و اجتماعی عظمت پر منحصر ہے اس کے اس تصور پر جو وہ کائنات اور اس کے مدبر و منتظم کے بارے میں رکھتا ہے۔ تمام قوانین اسی بڑی قدر کے تابع ہوتی ہیں۔ ہر شعبۂ فکر و عمل کی شاخیں اسی بیج سے نکلتی ہیں۔ سیاست، تمدن [illegible] تہذیب و تمدن کی چھوٹی چھوٹی باتیں سب پر اس تصور کا عکس پڑتا ہے۔ شرفِ انسانیت کا جتنا اونچا تصور آدمی کے ذہن میں ہوگا اتنا ہی اس کا کردار اعلیٰ ہوگا۔ جس معاشرہ میں یہ اعلیٰ تصور عام ہوگا وہ معاشرہ بہترین معاشرہ ہوگا۔ اقبال جس کے یہاں ایک منضبط فکر و خیال، غور و فکر پایا جاتا ہے قدرتی طور پر کائنات و انسان کے متعلق خاص خیالات رکھتا ہے۔

تصورِ الٰہ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلَى الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّى وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَى (سورۃ الاعلیٰ، القرآن)

(اپنے عالی شان پروردگار کے نام سے جو اعلیٰ ہے، جس نے پیدا کیا، پھر تندرست کیا، اور جس نے اندازہ کیا، پھر راہ دکھائی)

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا ست — رحمۃ للعالمینی انتہا ست

نیک بنگر اندرین بود و نبود — پے بہ پے آید تجلی ہا در وجود

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود — رحمۃ للعالمینی ہم بود

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو — آنکہ از خاکش بروید آرزو

یا ز نورِ مصطفیٰ او را بہا ست — یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است

(جاوید نامہ)

خلق۔ یہ کائنات جس کے بے شمار مظاہر دیدۂ بینا کے لئے موجبِ عبرت ہیں جس کے اسرار و رموز کو سمجھنے کے لئے انسان کی عقل کے ہر طرح

بتلا چکا ہے کہ خدا پرستانہ نظام فکر و عمل میں توحید و رسالت کا کیا مقام ہے۔ یہ وہ اساسی تصورات ہیں جن سے فرد اور جماعت کی زندگی کو استحکام حاصل ہوتا ہے۔ انہیں اساسی تصورات کو اقبال نے یقین کا نام اور عمل کی اصل تحریک قرار دیتا ہے۔ اقبال کی شاعری میں جس قدر تلقین عمل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ چنانچہ کہتا ہے ؎

ہر کہ او را قوت تخلیق نیست — پیش ما جز کافر و زندیق نیست

ایک مسلمان اور ذوق عمل سے محروم رہے، یہ کیسے ممکن ہے!

صاحب قرآن و بے ذوق طلب — العجب، ثم العجب، ثم العجب

یقین کی بھی جو اہمیت ہے ظاہر ہے۔ حتیٰ کہ ؎

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوق یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

اقبال کے نزدیک قومی بدحالی اور نوجوانوں کی بے عملی ذوق یقین سے محرومی کا نتیجہ ہے۔ یہی زندگی میں مطلوب ہے ؎

یقیں پیدا کر اے ناداں یقیں سے ہاتھ آتی ہے — وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

فکری پراگندگی، تشکیک اور تلون سے کوئی کردار نہیں بن سکتا۔ کردار اسی وقت بنتا ہے جب ایک عقیدہ و تصور پر آدمی ایمان لائے اور پھر اس پر جم جائے۔ اسی وقت اس کے قدموں کو وہ ثبات حاصل ہوگا کہ بڑے بڑے طوفانوں میں بھی وہ اپنی جگہ ثابت قدم رہے گا۔ ؎

عقل و دل و نگاہ کا مرشد اولیں ہے عشق — عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

غلامی کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ محکوم قوم کے تشخص کو ختم کر دیتی ہے۔ یہی وہ بات ہے جس کا اعتماد رخصت ہو جاتا ہے۔ یقین ہی کی بدولت ملی تشخص، اپنی تہذیب و روایات اور حرمت نفس باقی رہ سکتی ہے۔ اہل مغرب کے استعمار نے اقوام مشرق کی خودی کو مغلوب کر لیا، اور ان کی سائنسی ترقی، رعب اور فکری برتری نے قوم کی قوم سے اس کا تشخص چھین لیا۔ یقین ہی کی تاثیر کا کام ہے کہ اقبال شیشے کو سختی خارا بخشتا ہے ؎

فرنگی شیشہ گر کے فن سے پتھر ہو گئے پانی — مری تاثیر نے شیشے کو بخشی سختی خارا

ایک دوسری جگہ نوجوانوں کو نصیحت کرتا ہے ؎

حاصل کسی کامل سے یہ پوشیدہ ہنر کر — کہتے ہیں کہ شیشے کو بنا سکتے ہیں خارا

یہ یقین ہی حفاظت ناموس کہن کا دوسرا نام ہے جس کے بغیر کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی ؎

زندہ فرد از ارتباط جان و تن — زندہ قوم از حفظ ناموس کہن

حیات انسانی کا کوئی مصلح سلف کے کارناموں سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ کوئی ترقی پائدار نہیں ہو سکتی جب تک اس کی بنیادوں میں سلف کی روایات شامل نہ ہوں۔ انقلاب ماضی کے نقوش کو یکسر مٹا دینے اور اجتہاد گزری ہوئی صدیوں کو جھٹلا دینے کا نام نہیں۔ وہ کسی قوم کا ماضی ہی ہوتا ہے جو مستقبل کا درخشاں خواب بن کر دکھائی دیتا ہے۔ اقبال اسی حقیقت کو ذہن نشین کراتا ہے۔

رہ آبا رو کہ این جمعیت است — معنی تقلید ضبط ملت است

ذکر جمیل

اقبال کے کلام پر غائر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عشق رسول کی چنگاری اس کے خاکستر دل میں شروع ہی سے موجود تھی۔ ابتدائے شاعری کی بات ہے کہ جب اس نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے ایک سالانہ جلسے میں ایک نظم "ابر گہربار" کے عنوان سے پڑھی تھی، جس میں اس نعتیہ انداز کے اشعار پائے جاتے ہیں ؎

یہ کہ تھا نوح ؑ کو طوفاں میں سہارا تیرا
اور براہیم ؑ کو آتش میں بھروسا تیرا

یہ کہ مشعل تھا ظلمت عالم میں تجھ
اور ورد نگہ عرش تھا سایہ تیرا

تند مندی سے انکار نہیں ہے لیکن
غیر ممکن ہے کوئی مثل ہو پیدا تیرا

پھر اسی کے اوائل شاعری ہی کی ایک نظم "حضور رسالت مآب میں" ہے جو انہوں نے ایک خاص فضا میں شاہی مسجد لاہور کے بہت بڑے مجمع میں سنائی تھی۔ یہ نظم اپنی سادگی اور اثر کے لحاظ سے ایک باوقار نظم ہے۔ اقبال کو فرشتے آنحضور صلعم کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ آپ کے اس سوال کے جواب میں کہ ؎

نکل کے باغ جہاں سے برنگ بو آیا
ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا

اقبال عرض کرتا ہے ؎

حضور دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی

ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاض ہستی میں
وفا کی جس میں ہو بو وہ کلی نہیں ملتی

مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

ان اشعار میں قوم پرستی کا سا جذبہ نہیں۔ اپنے مخاطب سے شدید قلبی محبت و جاں نثاری کا اظہار اور ایک نہایت پاکیزہ غم کی ترجمانی ہے جو انفرادی بھی ہے اور اجتماعی بھی۔ اقبال کے افکار و خیالات کو عشق رسول ؐ نے نہایت دلکش رنگ و آہنگ دیا ہے۔ یوں تو اس کی شاعری کے کسی پہلو کو ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ کتاب و رسالت کے فیض سے محروم ہے۔ مگر وہ مقامات خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہیں جہاں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کا ذکر زبان پر آتا ہے۔ عشق کی ایسی سرمستی اور عقیدت کی ایسی سرشاری پائی جاتی ہے کہ جس کا اثر بہت دیر تک دل پر باقی رہتا ہے۔ اپنی شہرۂ آفاق نظم "جواب شکوہ" میں یوں زمزمہ سنج ہوتا ہے ؎

مثل بو قید ہے غنچے میں پریشاں ہو جا
رخت بردوش ہوائے چمنستاں ہو جا

ہے تنک مایہ تو ذرے سے بیاباں ہو جا
نغمۂ موج سے ہنگامۂ طوفاں ہو جا

قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسم محمد ؐ سے اجالا کر دے

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو
چمن دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو

یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو
بزم توحید بھی دنیا میں نہ ہو تم بھی نہ ہو

خیمۂ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبض ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

دشت میں دامن کہسار میں میدان میں ہے
بحر میں موج کی آغوش میں طوفان میں ہے

چین کے شہر مراقش کے بیابان میں ہے
اور پوشیدہ مسلمان کے ایمان میں ہے

چشم اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعت شان رفعنا لک ذکرک دیکھے

سن وصال کے ساتھ صہبائے عشق کی تندی و تیزی بڑھتی گئی جیسم ستی کے مزاج کی نیابت کی تو جو شعر ہمیں روز سعید کی یادگار میں قلم بند ہوئے ان کا خاتمہ ان اشعار پر ہوتا ہے

عجب کیا گر مہ و پرویں مرے نخچیر ہو جائیں
کہ بر فتراک صاحب دولتے بستم سر خود را

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبار راہ کو بخشا فروغ وادی سینا

نگاہ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں، وہی طٰہٰ

اقبال جب سپین میں پہنچا اور مسجد قرطبہ کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تو عالم خیال میں قوم مسلم کا ماضی سامنے آگیا اپنی پوری سطوت و شوکت اور تمام تر شان و جمال و جلال کے ساتھ۔ وادی الکبیر کے کنارے بیٹھ کر اس نے زمان و مکاں، قوموں کے عروج و زوال پر تدبر کیا۔ زندگی کی ناپائداری اور اعمال صالحہ کی حقیقت کو سمجھا۔ اس کے تصور میں تاریخ کے گذرے ہوئے زمانے زندہ ہو گئے۔ اس نے مسجد قرطبہ کی شکل میں بندۂ مومن کے دل کی تپش اور شبوں کے گداز کو آشکار دیکھا۔ اس نے ان گذرے ہوئے اولو العزم سرفروش بندوں اور اپنے درمیان ایک شدید مؤانست و محبت کو محسوس کیا۔ اس کے ذوق و شوق کا عالم ملاحظہ ہو

کافر ہندی ہوں میں دیکھ مرا ذوق و شوق
دل میں صلوٰۃ و درود لب پہ صلوٰۃ و درود

شوق مری لے میں ہے شوق مری نے میں ہے
نغمۂ اللہ ہو میرے رگ و پے میں ہے

اس نبی پر سلام ہو جس کا کلمہ پڑھ کر گورے اور کالے، عرب اور عجم ایک ہو گئے۔ جس کی بدولت وہ ملت بیضا وجود میں آئی جس کی داستان یہ ہے

صد نیستاں کاشت تا یک نالہ رست
صد چمن خوں کرد تا یک لالہ رست

نقشہا آورد و افگند و شکست
تا بہ لوح زندگی نقش تو بست

نالہ‌ها در کشت جاں کاریدہ است
تا نوائے یک اذاں بالیدہ است

نقطۂ ادوار عالم لا الٰہ
انتہائے کار عالم لا الٰہ

ایک دوسری نظم ذوق و شوق کے ان اشعار میں نعت کی شان دیدنی ہے ملاحظہ ہو

یہ کائنات کا معنیٔ دیریاب تو
نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
گنبد آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

عالم آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرۂ ریگ کو دیا تو نے طلوع آفتاب

شوکت سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقر جنید و بایزید تیرا جمال بے نقاب

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب

تیری نگاہ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقل غیاب و جستجو عشق حضور و اضطراب

تیری نظر میں ہیں تمام میرے گذشتہ روز و شب
مجھ کو خبر نہ تھی کہ ہے علم نخیل بے رطب

تازہ میرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا
عشق تمام مصطفیٰ، عقل تمام بولہب

"عشق تمام مصطفیٰ عقل تمام بولہب" یہ مصرعہ اقبال کے کلام میں حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ہے اس کا فکری منتہا اور راہ طلب کی آخری منزل۔

زندگی کا یہ مقصد ہے کہ ———— میری نماز، میرے مراسم عبودیت، میرا مرنا اور جینا اللہ کے لئے ہے ———— تو لازم ہے کہ مسلم کی اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں میں بھی اسی روح کا ظہور ہو۔ جس طرح فرد فرض کی بجا آوری، نیکی اور صبر کی ایک دوسرے کو تلقین ضروری ہے اسی طرح ریاست کے لئے ضروری ہے کہ اپنے عظیم جہانبانی اور وسیع ذرائع و وسائل کے ذریعے دین حق کی برکات کو عام کرے اور ساری دنیا کے آگے حق کی زندہ شہادت بن جائے۔ اسلامی زندگی کی یہ شان ظاہر ہو کر رہے کہ نسل، رنگ، زبان، وطن، اور خاندان کے لحاظ سے جدا جدا مگر اپنے مقصد حیات میں متحد، آپس میں رحیم و شفیق اور دنیا کو فلاح و ترقی، امن و امان اور انصاف و اخلاص سے مالا مال کر دینے والے ہوں۔ یہ کام کیسے ہو؟

نقش حق اول بجان انداختن — باز او را در جہان انداختن

نقش جان تا در جہان گردد تمام — می شود دیدار حق دیدار عام

دیدار رسولؐ

آنحضور صلعم نے فرمایا ہے: وددت انی لقیت اخوانی الذین آمنوا بی ولم یرونی (میں نے چاہا کہ اپنے ان بھائیوں کو دیکھوں جو مجھ پر ایمان لائے اور مجھ کو دیکھا نہیں) آنحضورؐ کی یہ خواہش ہی امتی کے درمیان محبت و مودت کا ایک مرکزی تعلق پیدا کرتی ہے۔ یوں تو آپ کا ہر امتی خواب میں بھی آپ کے دیدار کو اپنی سب سے بڑی سعادت سمجھتا ہے مگر اس کے لئے مجاہدہ کرنے والے حضرات خاص عبادتوں اور ریاضتوں کا اہتمام کرتے ہیں۔ فی الحقیقت آپ کا دیدار کیسے ہو سکتا ہے۔ اقبال سے سنئے:

معنی دیدار آن آخر زمان — حکم او بر خویشتن کردن روان

در جہان زی چون رسول انس و جان — تا چو او باشی قبول انس و جان

باز خود را بین ہمین دیدار اوست — سنت او سری از اسرار اوست

دیدار نبی کے معنی ہیں آپ کی سنت کو دونوں ہاتھوں سے مضبوط پکڑے اور آپ کے لائے ہوئے دین کو خلق خدا کے آگے اس دل سوزی، خلوص، محبت اور تڑپ کے ساتھ پیش کرے کہ جس کا مکمل نقشہ آپ کی زندگی میں نظر آتا ہے۔ اپنی شخصیت کو آپ کے اسوۂ حسنہ کے مطابق مستحکم کر دینے کا مفہوم رکھتا ہے۔

اقبال نے عصر حاضر کو نبی امی کا پیغام سنایا۔ جس قوم سے اس پیغام کو جتنی زیادہ نسبت تھی اس کو عملی جدوجہد کے لئے ابھارا۔ اس کام میں اس کی تمام علمیت، فلسفہ دانی اور شعریت صرف ہو گئی۔ ساقی نامہ کے مندرجہ ذیل اشعار جو خاص طور پر آنحضور صلعم کی مخاطبت میں کہے ہیں، اقبال کے قلبی واردات کو ظاہر کرتے ہیں:

مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں — مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں

مری خلوت و انجمن کا گداز — مرے نالۂ نیم شب کا نیاز

مری فطرت آئینۂ روزگار — غزالان افکار کا مرغزار

مرا دل مری رزم گاہ حیات — گمانوں کے لشکر یقیں کا ثبات

امنگیں مری، آرزوئیں مری — امیدیں مری، جستجوئیں مری

یہی کچھ ہے ساقی متاع فقیر — اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر

مرے قافلے میں لٹا دے اسے

لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

برسوں کی جدوجہد، جہاں بینی، سیر و سیاحت، امرا و فقرا کی ہم نشینی اور سرد و گرم زمانہ چکھنے کے بعد اس وقت جب کہ اقبال کی زندگی کی دھوپ ڈھل رہی ہے۔

الا اے خیمگی خیمہ فرو ہل — کہ پیش آہنگ بیرون شد ز منزل
خرد از راندن محمل فرو ماند — زمام خویش دادم در کف دل

موز بے خودی کے آخر میں یک آرزو کا اظہار شوق اور ادب کے ساتھ اس طرح ہوا تھا ؎

ہست شان رحمت گیتی نواز — آرزو دارم کہ میرم در حجاز

دیکھئے اس سفر کی کیفیت بیان ہو رہی ہے ؎

بایں پیری رہ یثرب گرفتم — نوا خوان از سرور عاشقانہ
چو آں مرغے کہ در صحرا سر شام — گشاید پر بہ فکر آشیانہ

سفر جاری ہے، مناظر بدل رہے ہیں، صبح سے شام اور شام سے صبح ہو رہی ہے۔ راہِ شوق میں یہ عالم ہے ؎

سحر با ناقہ گفتم نرم تر رو — کہ راکب خستہ و بیمار و پیر است
قدم مستانہ زد چنداں کہ گوئی — بپایش ریگ آں صحرا حریر است

آخر وہ وقت آگیا کہ دیارِ حبیبؐ نظر کے سامنے ہے۔ شاعر کی خوشی کا اندازہ کیجئے ؎

حکیماں را بہا کمتر نہادند — بہ ناداں جلوۂ مستانہ دادند
چہ خوش بختے چہ خرم روزگارے — در سلطاں بہ درویشے کشادند

دل کے تمام جذباتِ محبت و عقیدت، آنکھوں کے تمام آنسوؤں، اپنے پورے وجود کو کسی کے قدموں میں ڈال دینے کا وقت آگیا۔ اپنی ہی طرح خوش نصیب اپنے ہم ذوقوں سے کہتا ہے ؎

بیا اے ہم نفس باہم بنالیم — من و تو کشتۂ شان جمالیم
دو حرفے بر مراد دل بگوئیم — بپائے خواجہ چشماں را بمالیم

کے بعد امت کا حالِ زار حضورؐ کو سناتا ہے۔

مسلماں آں فقیر کج کلاہے — رمید از سینۂ او سوز آہے
دلش نالد چرا نالد نداند — نگاہے یا رسول اللہ نگاہے

اپنے ایک ذاتی غم کا اظہار بھی کرتا ہے ؎

بآں رازے کہ گفتم پے نبردند — ز شاخ نخل من خرما نخوردند
من اے میر امم داد از تو خواہم — مرا یاراں غزلخوانے شمردند

بہرحال شاعر اپنے انجام پر مطمئن ہے ؎

بجوئے تو گداز یک نوا بس — مرا ایں ابتدا ایں انتہا بس
خراب جرأت آں رند پاکم — خدا را گفت ما را مصطفےٰ بس

گلہائے نعت

عیش فیروز پوری

دُرود اُس پر بنا جو واسطہ ایجادِ خلقت کا — سلام اُس دن پر جو پیغام لایا اُس کی بعثت کا

یہ دن ہے عیش اُس فخرِ دو عالم کی ولادت کا — جو مطلع بھی ہے مقطع بھی بیاضِ نظمِ قدرت کا

تعلق ہے جہاں تک حُسنِ سیرت، حُسنِ صورت کا — اُنہیں کی ذات سے چمکا ہے جوہر آدمیت کا

ہمارے دل میں پنہاں عرش کی معراج والا ہے — جا سے آئینے نے مُنہ نہیں دیکھا کدورت کا

زہے قسمت اگر اُس آستاں تک ہم پہنچ جائیں! — وگرنہ اس خرابے میں ارادہ استقامت کا

کھُلے گا عالمِ اسباب کا اُس پر سبب کیوں کر — نہیں جو آشنا! اُس آشنائے رازِ وحدت کا

لُٹا ہی اشک حسرت عیش کی پلکوں پہ لرزاں تھے — روانہ جب ہُوا تھا قافلہ اہلِ زیارت کا!

بسمل سعیدی

حق ہو اور تلخ نہ معلوم ہو اللہ اللہ — ہے شیرینیٔ گفتارِ رسولِ عربی

اصغر گونڈوی

چھُٹ جائے اگر دامنِ کونین تو کیا غم — لیکن نہ چھُٹے ہاتھ سے دامانِ محمدؐ

شوکت بخاری

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر — نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ ایں جا

محسن کاکوروی

تیغ میدانِ شجاعت میں چمکتی بجلی — ہاتھ گلزارِ سخاوت میں برستا بادل

مولانا جامیؒ

الصبح بدا من طلعته — واللیل دجیٰ من وفرته

ماہر القادری

ہیں فقرِ ابوذرؓ پہ سلاطیں کی نگاہیں — اللہ رے! اک بے سر و سامانِ محمدؐ

لایا ہوں بصد شوق یہ نذرِ دل و جاں — نادم ہوں کہ یہ بھی نہیں شایانِ محمدؐ

یہ دیکھ آئینہ دل کو توڑنے والے
نشانِ صنعتِ شیشہ گراں نہیں ملتا
ہر ایک دل پہ وہ مشقِ ستم نہیں کرتے
ہر ایک دل کو غمِ شادماں نہیں ملتا
بیانِ یار میں لطفِ بیاں جو ملتا ہے
کسی بیاں میں وہ لطفِ بیاں نہیں ملتا

مشتاق اختر (دہلوی)

گل کھلائے ہیں چمن میں جس نے
وہ ترا نقشِ کفِ پا ہوگا
نکہتِ لالہ و گل بھی اے دوست
اک تری یاد کا جھونکا ہوگا
جب کبھی یاد وہ آئے ہوں گے
دل میں اک درد سا اٹھا ہوگا
آہ وہ عمر کا حصہ اے دوست!
جو تری یاد میں گزرا ہوگا
وقتِ رخصت کوئی آنسو ڈھل کر
ان کے دامن پہ بھی ڈھلکا ہوگا

عروج زیدی بدایونی

یہ سنتا ہوں ازل سے عشق کی قسمت ہے ناکامی
یہ سچ ہے تو علاجِ دردِ پنہاں غیر ممکن ہے
جہاں دستِ ہوس پر وہ حریفِ پاکبازی ہو
وہاں ثابت رہے یوسف کا داماں غیر ممکن ہے
کبھی سیماب انگاروں پہ ٹھہرا ہے نہ ٹھہرے گا
یقیناً تصورِ کفر و ایماں غیر ممکن ہے
نہیں روکا تو بس ضبطِ محبت ہی نے دیوانہ
مرے ہاتھوں سے توہینِ گریباں غیر ممکن ہے
عروج انجامِ صبحِ عیش، شامِ رنج و غم ہوگا
تری خاطر رکے رفتارِ دوراں غیر ممکن ہے

سرور سنبھلی

سمجھا تھا جس کو پردۂ لطفِ نگاہ تک
پہنچی وہ بات بڑھ کے غمِ بے پناہ تک
جنت سمجھ کے آئے تھے تیرے دیار میں
یہ کب خیال تھا نہ ملے گی پناہ تک
گزرا کچھ ایسے قافلۂ عمرِ بے ثبات
ڈھونڈے مگر نہ مل سکی گردِ راہ تک
تیرے کرم پہ اپنے گناہوں کے باوجود
وہ اعتماد ہے کہ نہیں اشتباہ تک
سرور غمِ جہاں غمِ محبوب تو نہیں
شکوے تو کیا لبوں پہ نہ آئے گی آہ تک

عالم اکبر آبادی

ہم پہ بھی کچھ ستم گراں گزرا
ہم گراں کچھ ستم پہ گزرے ہیں
جیسے غم کی گھٹا برس جائے
ایسے دن چشمِ نم پہ گزرے ہیں

علی احمد رفعت

غمِ منزل کی کوئی بات کرو، کچھ تو کہو
اتنے خاموش ہو کیوں ہم سفرو، کچھ تو کہو
تم نے ذرّے کا جگر چیر کے کیا دیکھا ہے؟
نقشِ دیوار ہو کیوں دیدہ ورو، کچھ تو کہو
وسعتِ دشت سے آگے، درِ جاناں کے قریب
کوئی دیوار بھی تھی آشفتہ سرو، کچھ تو کہو

ہماری نظر میں

سکھ مسلم تاریخ حقیقت کے آئینہ میں

از :- ابوالامان امرتسری ، ضخامت ۲۲۴ صفحات (مجلد گرد پوش کے ساتھ) قیمت - تین روپے آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ :-

ادارہ ثقافت اسلامیہ ، ۲ ، کلب روڈ ، لاہور۔

انگریزی حکومت نے مسلمانوں ، ہندوؤں اور سکھوں کے درمیان منافرت اور دشمنی پیدا کرنے کے لئے ایسی تاریخی کتابیں مرتب کرائی تھیں ، جن میں مسلمان حکمرانوں کو ظالم اور متعصب ظاہر کیا گیا تھا ، ایسا کرنے سے اُن کا مقصد یہ بھی تھا کہ ہندوستان کے ظالم حکمرانوں کے حالات پڑھ کر ، ہندوستانی انگریزوں کو اپنے لئے "رحمت" خیال کریں !

"سکھ تاریخ" جو انگریزوں کے ایما سے مرتب کی گئی تھی اس میں مسلمان حکمرانوں پر یہ الزام لگائے گئے تھے :-

۱ - جہانگیر نے گرو ارجن کو کسی جرم کے بغیر مذہبی تعصب کی بنا پر قتل کرایا۔

۲ - اورنگ زیب نے سکھوں کے نویں گرو تیغ بہادر کو دہلی بلایا اور مسلمان نہ ہونے کے جرم میں چاندنی چوک میں قتل کرا دیا۔

۳ - صوبہ سرہند کے حکم سے گرو گوبند سنگھ کے دو دودھ پیتے بچے زندہ دیوار میں چنوا دیئے گئے۔

جناب ابوالامان امرتسری نے کتابوں کے حوالوں اور تاریخی شہادتوں سے ان الزامات کو غلط اور بے بنیاد ثابت کیا ہے ! فاضل مصنف کی یہ کوشش تحسین و تبریک کی مستحق ہے کہ ایک طرف انھوں نے تاریخ اور حق کے اس غبار کو دور کیا ہے ، دوسری طرف دو فرقوں کے درمیان صلح و آشتی کے لئے زمین ہموار کی ہے۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی اس کی "غیر جانبداری" ہے۔ مصنف نے ایک منصف مزاج مؤرخ کی حیثیت سے اپنا فرض ادا کیا ہے - یعنی محض ، حقیقت کے ذریعہ تاریخی واقعات سے خود نتیجہ پیش کرنا اور اُن سے نتائج نکالنا !

"عرض حال" کے صفحہ (۳) پر کاتب کی غلطی سے

Divide and Rule

کی جگہ " Lewide and Rull " چھپ گیا۔ صفحہ ۱۳ پر "گرو ارجن" نہ کہ "گرجتیں" لکھنا چاہیئے تھا۔

"قدیم" کی جگہ کتاب میں متعدد مقامات پر "پرچین" لکھا گیا ہے ، اس سنسکرت لفظ کے استعمال کی آخر کیا ضرورت تھی ، سکھوں کے لئے "پراچین" لفظ کے سکھوں لکھنا درست نہیں ہے ، سکھوں کی تاریخ اتنی "قدیم" نہیں ہے جس کو "پرچین" کہا جائے ، سنسکرت میں "پرچین" انگریزی کے " Old days of yore " کی قریب قریب ترجمانی کرتا ہے کورو اور پانڈوں کے عہد کو "پرچین" کہا جا سکتا ہے :

یہ کتاب اس قابل ہے کہ اس کو "گرمکھی" میں منتقل کیا جائے اور اس ترجمہ کو زیادہ سے زیادہ سکھوں تک پہنچایا جائے غلط عقیدہ اور گھڑے ہوئے واقعات کی بنا پر دو قوموں کے درمیان دشمنی اور نفرت کی خلیج کا حائل ہونا کوئی اچھی بات نہیں ہے ، صحیح واقعات سے اگر غلط فہمیاں دور ہو جائیں تو یہ بڑی مبارک کوشش ہے۔

شب چراغ (قطعات)

از:- آفاقی، ضخامت ۲۴۰ صفحات (مجلد، رنگین و خوب صورت گرد پوش کے ساتھ) قیمت:- پانچ روپے۔ ملنے کا پتہ:- کتب خانہ علم و ادب کراچی ۔

"شب چراغ" پر جناب محمد حسن عسکری نے "پیش لفظ" تحریر فرمایا ہے جو خاصہ جاندار ہے، اس کے بعد "مضمون پریشان" خود شاعر کا لکھا ہوا ہے، لکھتے ہیں:-

"ممکن ہے آپ سوچتے ہوں کہ طویل روپوشی کی دانشمندی کے بعد مکرر خود حماقت کی کیا ضرورت تھی۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانہ میں جناب آفاقی کا کلام رسالوں میں چھپتا تھا، مگر اب بہت دن سے وہ کنج خمول و گمنامی میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ بہر حال آفاقی صاحب ایک گمنام شاعر کی حیثیت سے "شب چراغ" کو لئے ہوئے روشنی میں آئے ہیں۔

اس کتاب میں ان کے ایک ہزار سے کچھ اوپر قطعات ملتے ہیں، شاعر کا مطالعہ وسیع معلوم ہوتا ہے انھوں نے دوسرے شاعروں اور فلسفیوں کا اثر بھی قبول کیا ہے، مثلاً:-

وہ دور زندگی ہے بے حقیقت   نہ ہو جس میں امام وقت کوئی

اور

جو مشت خاک تھی تمہید آفاق   اب اس میں وسعت آفاق ہے گم

میں فکر اقبال کی جھلک ملتی ہے۔

کوئی شے اس جہان رنگ و بو میں   بہ یک وقت آنکھ نے پوری نہ دیکھی

میں "علم مرایا و مناظر" ( ) کے مشہور و معروف نظریہ کی ترجمانی کی گئی ہے۔

اگر چہ بڑی نعمت ہے دولت   نہیں ہے تو فقط اک خاک کا ڈھیر

یہ شعر ماہر اقتصادیات کے ہاں مشہور نظریہ کا ترجمان ہے کہ دولت کو گردش میں رہنا چاہیئے!

نہیں موقوف پودوں پر ہی یہ بھی   بڑوں کے سائے میں پنپے نہ چھوٹے

یہ سنسکرت شاعری کا عکس ہے۔

مجھے فوق البشر کی جستجو میں   پڑا ہے سابقہ تحت البشر سے

اس میں نطشے کے "فوق البشر" کی آرزو جھلکتی ہے۔

جناب آفاقی کے بعض قطعات اتنے چونکا دینے والے ہیں کہ اگر وہ کسی مشہور شاعر سے منسوب ہوتے تو لوگ ان کو طرح طرح سے سراہتے اور تنقید نگار اپنے مضامین میں ان کا ذکر کرتے، آفاقی کے قطعات میں کوئی شک نہیں زندگی کے مختلف "shades" ملتے ہیں، یہ قطعات کتنے جاندار ہیں:-

ہوئے دشت و جبل غرقاب سارے   ستارے ہچکیاں لے کر سدھارے
جو رک جائیں یہ وہ موجیں نہیں ہیں   کہاں تک جائیں گے آخر کنارے

زوال وقت کی فرمائشیں ہیں   نئے انداز کی آرائشیں ہیں
مجھے تجدید کی خواہش ہے لیکن   ابھی تخلیق کی گنجائشیں ہیں

تم دو دو کو نہ ملنے کہہ رہے ہیں   یہ دنیا ہے "سنگوڑ" بھاگنے کی

گزرتے ہیں مگر اپنے شب و روز | کہانی بن کے "سوتے جاگتے" کی
اندھیرا حد سے بڑھتا جا رہا ہے | یہیں سے دور ہے شاید سویرا
مگر تیور گھٹا کے کہہ رہے ہیں | رہے گا آج دن میں بھی اندھیرا
تغیر میں بھی ہے قائم تسلسل | طلب ہے مختلف، مطلب وہی ہے
بدلتا جا رہا ہے گو زمانہ | مگر ترتیب روز و شب وہی ہے
نہ پورا ہو سکا پھر یہ فسانہ | ادھورا چھوڑ کر جانا پڑے گا
مجھے ایسا نظر آتا ہے شاید | ابھی اک بار پھر آنا پڑے گا
قصور اس میں نہیں ہے زندگی کا | اگر مر جائیں، مر جانے کے ڈر سے
چمن میں خشک ہو جاتی ہیں کلیاں | نہیں کھلتیں جو مرجھانے کے ڈر سے
مناسب ہیں ابھی شب کے تقاضے | قریب سحر ہونے سے پہلے
نہ جانے اب کہاں بیدار ہوں گے | بدل لیں پیرہن سونے سے پہلے
لگاتار اٹھ رہی ہے ہوک دل میں | تمنا بھر رہی ہے کوک دل میں
ہوئیں روشن سے آنکھیں دور پیا کی | محبت بن گئی ہے ہوک دل میں
غلط فہمی حفاظت کر رہی ہے | الوہیت کی بے حد سرحدوں کا
نظر کیسے یقیں کی بدولت | گماں ہے معجزوں پر شعبدوں کا
بگڑ جائے گا نقشہ ظلمت شب | اگر دو اک گھڑی ہم بھی جگے ہیں
بھلا کب تک ستاروں کی دہائی | بنائے جائیں اقلیدس کی شکلیں
نظر ملزوم ہے لازم نہیں ہے | کسی اک شکل پر قائم نہیں ہے
وہ جب چاہیں شگفتہ اس کو کر دیں | طبیعت کا کوئی موسم نہیں ہے
رہ و رسم اب ہوئی ہے جس سے پیدا | تصور میں وہ پہلے جلوہ گر تھا
ہمارے ذہن میں منزل کا ہونا | وجود رہگزر سے پیشتر تھا

دوسرا رخ:-

سمجھ میں آئی جب ماہیت نفس | بجائے نام ہو کر رہ گئی روح
مگر جذبات کی طغیانیوں میں | جسد قائم رہا اور بہہ گئی روح (صفحہ ۱۰)

بات پوری طرح کھلی نہیں کہ شاعر آخر کہنا کیا چاہتا ہے؟ پھر ماہیت نفس سمجھ میں آجانے سے بیچاری روح کیوں "بجائے نام" ہو کر رہ گئی! کیا ماہیت نفس سمجھ میں آجانے کا یہ نتیجہ ہونا چاہیے کہ "روح" کی کوئی اہمیت ہی باقی نہ رہے۔

مری آنکھوں میں آ کے خمار بن کر | نہ پایا لطف اس آسودگی میں
نہ جانے کیوں وہ میرے دل میں آگئے | رہے میری عدم موجودگی میں (صفحہ ۱۵)

اسی کو کہتے ہیں "المعنیٰ فی بطن الشاعر"!

خباثت کی نہیں مذہب کی پروا　　　شرافت کو نہیں اس کی ضرورت
حماقت کے ہزاروں پہلوؤں میں　　　عبودیت ہے سب سے خوبصورت　　　(صفحہ ۴۶)

پوری رباعی بے کیف و بے مزہ ہے! پھر "عبودیت" کو "خوب صورت حماقت" کہنا کتنی بڑی حماقت ہے!

دنیا آج تک دیر و حرم میں　　　سنائے کرم خوردہ دینیت کے
جماتی ہے دلوں پر اپنے سکے　　　غلامی نام سے جمہوریت کے　　　(صفحہ ۴۹)

یہ قطعہ دولخت ہے　　　دیر و حرم اور جمہوریت و غلامی میں کیا ربط و مناسبت ہے۔

سروں کو تم جھکا لو پربتوں کے　　　بلاتی ہو کسے آبشارو؟　　　(صفحہ ۵۰)

مجھ بجزید "جو آبشار" مذکر ہے، مونث نہیں ہے۔

بڑھا دی عظمتِ کردار اتنی　　　دلوں سے مذہبی ہیبت مٹا دی
گزر کر کفر کے ساحل پہ میں نے　　　فریب زہد کی کشتی جلا دی

اس قطعہ کا مصرعہ ثانی بہت کمزور ہے۔ پھر "کفر" کے مقابلہ میں "زہد" نہیں "ایمان" لانا چاہیے تھا! اور اگر "زہد" کا لانا ضروری تھا تو "کفر" کی جگہ "رندی" کی ضرورت تھی۔ شاعر نے مصرع

طارق کہ بر کنارۂ اندلس سفینہ سوخت

سے یہ خیال مستعار لیا ہے مگر کہاں وہ ایمان افروز مرکزی خیال کہ ع

ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست

اور یہ کہاں کہ کفر کے ساحل پر اتر کر فریب زہد کی کشتی جلا دینا۔ توبہ!

گنت و دکی تیاری ندامت　　　حصول تربیت؛ عادت و اطوار
کمر کا خم، ضعیفی کی علامت　　　طبیعت کی لچک ہے صعب کردار

پہلے دو مصرعے گنجلک اور بے مزہ ہیں۔

ہے نہیں منجمد جذبات دل میں　　　محبت ہے کہ کفر کفر کا نیتی ہے
یہ کہہ کر زندگی چھلکی تھی مجھ سے　　　وہ سب ہے پر کفر کی لب پا بیتی ہے　　　(صفحہ ۴۸)

یہ قطعہ ایک گورکھ دھندا نہیں تو اور کیا ہے۔

کیا پانی کو پیدا تشنگی نے　　　نظارہ کتنی عجیب ہے
ہے بہروں کا کمال نیکیوں پہ　　　طبیعت خود سراپا کیفیت ہے　　　(صفحہ ۴۵)

یہ قطعہ غلط ہے کہ تشنگی نے پانی کو پیدا کیا۔ آدمی کو پیاس لگنے سے پہلے پانی اللہ تعالیٰ نے پیدا فرما دیا تھا۔ مطلوب ہمیشہ طلب سے مقدم ہوتا ہے۔

ہراساں ٹھوکروں سے ہو نہ کیجے　　　ہدایت اپنی دہیں مجھ سے لیجے
ہوں ممنون آپ کا میں بڑی بجا صحیح　　　مگر یہ فاتو منطق نہ دیجے　　　(صفحہ ۵۲)

ایسا کمزور اور بچکانہ قطعہ بھلا اس مجموعہ میں رکھنے کے قابل تھا۔

سمجھنا، سوچنا، محسوس کرنا　　　عجب امراض لاحق ہو رہے ہیں

وہاں بحران میں بکتی ہے کب کیا — وہ جانے کہاں کیوں مارق ہو رہے ہیں (صفحہ ۲۱۰)

خیال اور نظم دونوں ناقص اور بے لطف:

تم نئی دیر سے کس سوچ میں ہو — یہ دل تو حیران ہی ہو گیا ہے
انگیٹھی سے نکال دہکتی کو — اسے بیٹھے بٹھائے کیا ہوا ہے (صفحہ ۲۲)

اس قطعہ کو پڑھتے ہوئے وجدان چیخنے لگا "توبہ":

جب اپنے ختم کرتب کر چکے وہ — تو آخر کار میری باری آئی
مداری سر پہ رکھ کر پیر بھاگے — چھلانگ اپنے پہ جب میں نے لگائی

یہ ہے وہ "تک بندی" جس کو "ترقی پسندی کا آرٹ" کہا جاتا ہے۔

سڑاند ان مچھلیوں سے آ رہی ہے — جنہیں منڈی میں لائے ہیں مچھیرے
تو سمع، انکساری، اس منڈی — پرانے جسم کے بکتے ہیں میرے

اس قطعہ نے تو سارے ماحول کو "بدبودار" بنا دیا۔ لاحول ولا قوۃ۔

جو حاصل ہو رہے ہیں روشنی میں — وہ جلوے سامنے بڑھتے جا رہے ہیں
کئے تھے دل سے پیدا جو اندھیرے — خدا ہر لحظہ بڑھتے جا رہے ہیں!

شاعر نے: ع

خدا ہر لحظہ بڑھتے جا رہے ہیں

کہہ کر اپنے نزدیک بڑی "ندرت" پیدا کی ہے اور عمیق فلسفہ بیان فرمایا ہے، حالانکہ یہ خیال سراسر لغویت ہے، اور مذہبی نقطہ نظر سے بھی غیر شاعرانہ ہے۔
فانی صاحب اپنے قطعات میں کہیں کہیں اونچے ہو گئے ہیں مگر جہاں جہاں گرے ہیں، وہاں بس پاتال ہی دکھائی دیتا ہے! کاش وہ نئی باتیں کہنے کی دھن میں غیر متوازن نہ ہو جاتے۔

ارکانِ اسلام

تالیف:- مولانا عبید الحق، ضخامت ۱۵۲ صفحات مجلد، گرد پوش کے ساتھ قیمت - پانچ روپے آٹھ آنے،
ملنے کا پتہ:- ۱۵ لیک روڈ، لاہور۔

اس کتاب کا تعارف کراتے ہوئے خود فاضل مؤلف دیباچہ میں لکھتے ہیں -

"مجھے مارچ ۱۹۵۸ء میں محترمہ پرنسپل صاحبہ "البنات" نے طلبہ و طالبات کی دینی تعلیم کے لئے ایسی کتاب مرتب کرنے کا اتفاق کیا، جس میں ارکان اسلام کو بچوں کے فہم و شعور کے مطابق شائع کیا گیا ہو۔"

کوئی شک نہیں جناب مولانا عبید الحق کو جو عظیم خدمت سپرد کی گئی تھی، اس کو انھوں نے بڑے اخلاص، محنت و عرق ریزی کے ساتھ سر انجام کو پہنچا دیا، اس کتاب میں عقائد سے لے کر نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ تک کی تفصیل ملتی ہے، اور تمام ضروری جزئیات کے ساتھ! زبان انتہائی سادہ اور عام فہم ہے۔ بچوں کی سمجھ اور نفسیات کے عین مطابق۔

"دھوپ کے جلے ہوئے پانی سے وضو اور غسل درست نہیں" (صفحہ ۴۴) "درست نہیں" سے مؤلف کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ "ناجائز ہے" حالانکہ دھوپ سے جو پانی گرم ہو گیا ہو، اس سے وضو بھی ہو جاتا ہے اور غسل بھی! ہاں کتب فقہ میں ملتا ہے کہ یہ مکروہ ہے، اس سے برص پیدا ہوتا ہے۔

ایک باب کا عنوان ہے:-

"نماز میں قرأت کے بلند آواز اور منہ میں کرنے کی حکمت" (صفحہ ۱۹۰)

اس عنوان کے آخری جزء میں ذم کا پہلو پیدا ہو جاتا ہے۔ "قرأت کا منہ میں کرنا" کسی جگہ استعمال ہوا ہے۔ اس مفہوم کو اچھے لفظوں میں ادا کرنا چاہیے تھا۔

محراب:- مسجد کا اگلا حصہ جہاں امام نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے (صفحہ ۳۰۰)

"محراب" کی یہ تعریف صحیح ہے اور خاص کر "اردو زبان" میں تو یہ لفظ مسجد کے لئے اسی مفہوم کے لئے بولا جاتا ہے۔ مگر اسی صفحہ پر جو اس آیت کا

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا — زکریا جب کبھی ان کے پاس محراب میں جاتے تو ان کے پاس سے روزی پاتے۔

ترجمہ کیا گیا ہے، تو اس میں "محراب" سے "مسجد کا حجرہ" مراد ہے۔ جو کوئی "محراب" کی تعریف پڑھ کر اس آیت کے ترجمہ میں "محراب" پہ پہنچے گا تو وہ اس سے مسجد کا حجرہ نہیں بلکہ "محراب مسجد" یعنی امام کے کھڑے ہونے کی جگہ" مراد لے گا۔

کتاب میں فاضل مولف نے "توحید کے تقاضوں" کو بھی ملحوظ رکھا ہے، "زیارت قبور" کی عنوان کی تشریح کتنی ٹھیک اور مطابق شریعت کی ہے۔

"نصیحت و عبرت کے لئے قبروں کی زیارت کرنا مستحب ہے"

ورنہ اردو زبان میں تو "زیارت" کے لفظ سے "تعظیم و تقدیس اور طلب برکت" جیسے مفہوم و معنی وابستہ ہو گئے ہیں۔

"ارکان اسلام" دو سو اکیس فصول پر مشتمل ہے، اور اس سے بچے ہی نہیں پختہ عمر کے لوگ بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اس لئے کہ دین کے معاملہ میں ہم میں سے بہت سے "بچے" ہیں۔

جذبات درد

از: سوز درد کاکوروی، ضخامت ۴۸ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے
ملنے کا پتہ: ۳-اے ذیلدار پارک، اچھرہ لاہور۔

جناب درد کاکوروی ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔ موصوف نے نثر و نظم کی چھوٹی بڑی پچیس سے زیادہ کتابیں لکھیں ہیں، جن میں سے انیس کتابیں اب تک چھپ چکی ہیں۔

"جذبات درد" حضرت درد کاکوروی کے کلام کا مجموعہ ہے، جس میں اصناف سخن کا تنوع پایا جاتا ہے، کتاب کے آغاز میں درد صاحب کے خود نوشتہ حالات درج ہیں، جن میں زیادہ تر مشاعروں کا ذکر ہے کہ وہ کن شعراء کے ساتھ کس کس مشاعرے میں شریک ہوئے ہیں۔

بجلی سے بند ہوا تار نفس کا سلسلہ — پھونک دے طور جسم کو اتنا تو سوز و ساز دے (صفحہ ۳۸)

آخر بات کیا ہوئی؟ "طور جسم" کی ترکیب کتنی نامانوس ہے۔

اسی نظم (حمد) کا ایک اور شعر ہے:-

تنگ ہوں وصل کے لئے زخمہ جان ہر نفس — سوز سوز تار دے تار بہ تار ساز دے

کہنا چاہیے تھا "وصل کے لئے مضطرب و بے چین ہوں" ورنہ کہتے "تنگ ہوں" وصل کے لئے" مصرعہ ثانی ایک "عجوبہ" سے کم نہیں۔

جو ہے مجھ کو دیکھ لیتا، وہ ہے زار زار روتا — کسے دوں جا بحسرت مری یاد زندگانی (صفحہ ۴۲)

پورا شعر بے کیف، بے روح، اور بیگانہ۔

جو بہ گلستاں میں انہیں پھول کی طرح؟ — ہر رنگ کو کہاں تک عنادل نہ سمجھا (صفحہ ۴۰)

خالہ اپو کے نام خطوط

مرتبہ - مہر شاہ، ضخامت ۱۴۰ صفحات (مجلد) قیمت ۲۰۰ دو روپے -
ملنے کا پتہ - نیا کتاب گھر، صدر، کراچی۔

جناب مہر شاہ صاحب اُردو ادب کی منزل کے نو وارد اور نو خیز مسافر ہیں جن کی پیدائش ۱۹۴۳ء کی ہے اور ابھی تک تعلیم حاصل کر رہے ہیں، اس نو عمری میں طنز و مزاح کی جو چاشنی اُن کی تحریر میں پائی جاتی ہے۔ وہ اُن کے ادبی مستقبل کے تابناک ہونے کی دلیل بلکہ ضمانت بن گئی ہے، اُن کی اس کتاب میں آٹھ خطوط ہیں جن کے عنوانات کتنے دلچسپ ہیں! -

ممبر - الف تے ے — کچھ کچھ — بعضم تعالیٰ — گھریلو دانشی دہا دس بیوی) —
ادبی وسیاسی — صاف صاف — شاید شاید —

ان خطوط میں مسلمان عورتوں کی مغرب زدگی و فیشن پرستی پر طنز کی گئی ہے، یہ طنز پُر لطف ہی نہیں جاندار بھی ہے!

- "جلتی ہوئی کافی کی پوری پیالی ایک ہی گھونٹ میں ساری الٹ گئی" (صفحہ ۲۸) اول تو "جلتی ہوئی" کی جگہ "گرم" یا کوئی دوسرا لفظ لکھنا چاہیئے تھا، دوسرے "الٹ گیا" یہاں "انڈیل گیا" یا "چڑھا گیا" کے معنی میں استعمال ہوا ہے ——— "ایک دن میں نے چائے پی عجیب بیہودہ تھی، کافی ہوتی، وہ بھی بکواس تھی" (صفحہ ۸۶) کافی کو "بکواس" کہنا کسی طرح درست نہیں "بکواس" تو بات کے لئے بولا جاتا ہے کسی مشروب یا چیز "کو بکواس" نہیں کہتے۔ صفحہ ۱۱۶ پر "بے نیل مرام" کو "بے نیل و مرام" لکھا ہے، افسوس ہے کہ یہ غلطی رواج پاتی جارہی ہے ——— صفحہ ۲۵ پر "خرامِ خراماں" کا املا "خراما، خرما" نظر آیا،

معین فارسی

مؤلف:- مولانا حبیب اللہ صاحب (رفیق دیوبند) ضخامت ۵۶ صفحات - قیمت:- گیارہ آنے
ملنے کا پتہ:- کتب خانہ محمودیہ، دیوبند (یوپی)

یہ کتاب "صفوۃ المصادر" کے انداز پر جدید اسلوب کے ساتھ مرتب کی گئی ہے، اسے پڑھ کر فارسی زبان کے مبتدی طلبہ مصادر سے افعال بنا کر، فارسی زبان سے تھوڑی بہت روشناسی حاصل کر سکتے ہیں، مولانا حسین احمد مدنی مرحوم نے اس کتاب پر یہ رائے دی تھی۔

"حسب رائے مولانا اعزاز علی مرحوم و حسب مشورہ مولانا محمد طیب صاحب میرے نزدیک بھی داس کتاب کو، مدارس میں داخل کر لینا مفید اور کار آمد ہے"!

مفتاح القرآن

مؤلف:- مولوی بدر الدین صاحب مدر - ضخامت ۲۰ صفحات، قیمت درج نہیں
ملنے کا پتہ:- تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور!

یہ جدید عربی قاعدہ ہے جسے تاج کمپنی نے اپنی روایتی شہرت طباعت کے مطابق خوب صورت بلاک پر چھاپا ہے۔ بچے یہ قاعدہ کسی تجربہ کار استاد سے سبقاً سبقاً پڑھ لیں، تو وہ قرآن کو بڑی آسانی کے ساتھ پڑھنے کے قابل ہو جائیں گے۔

قوموں کی کہانیاں

از:- سید نظر زیدی ضخامت ۱۲۸ صفحات۔ قیمت - چودہ آنے۔
ملنے کا پتہ، مکتبہ تعمیر انسانیت، موچی گیٹ لاہور۔

مصری، اشوری، سمیری، عبرانی، آسیائی، ایرانی، چینی، یونانی وغیرہ [illegible] قوموں کی تاریخ کہانی کے سادہ و عام فہم انداز میں پیش کی گئی ہے، یہ کتاب عوام کے لئے تو معلومات آفریں ہی ہے، مگر بڑے پڑھے لکھے لوگوں کے لئے بھی اس کے مطالعہ سے کچھ نہ کچھ فائدہ ہی ہوگا۔

محمد قلی قطب شاہ کی جیون کہانی

از:- وقار خلیل، بی اے، ضخامت ۳۲ صفحات قیمت ۵۰ نئے پیسے
ملنے کا پتہ - ادارہ ادبیات اردو خیریت آباد حیدر آباد دکن۔

اس کتابچہ میں قطب شاہی خاندان کے مشہور بادشاہ محمد قلی قطب شاہ کے حالات زندگی پیش کئے گئے ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ کا سب سے بڑا کارنامہ اس کا اردو کلام ہے، جو اس کے نام کو رہتی دنیا تک زندہ رکھے گا۔

"اور یہ بھی مشہور ہے کہ اس کی بیوی ایک ناچنے والی بھاگ متی تھی جو ہندو تھی جس کے پریم میں سلطان محمد قلی نے شہر حیدرآباد بسایا اور پہلے اس کا نام "بھاگ نگر" رکھا۔" (صفحہ ۲۴)

پروفیسر محمد ہارون خاں شیروانی نے انگریزی میں ایک طویل مقالہ لکھا ہے جس میں اس خیال کی تردید کی گئی ہے کہ محمد قلی قطب شاہ کا "بھاگ متی" نامی کسی ہندو سے تعلق تھا: اور حیدرآباد دکن کا نام "بھاگ نگر" نہیں، "باغ نگر" تھا۔ کیونکہ اس شہر میں باغات کی کثرت تھی۔ غالباً فرشتہ سے یہ غلطی ہوئی کہ اس نے "باغ نگر" کو "بھاگ نگر" لکھا ہے، جسے یار لوگ لے اڑے۔

مولانا مودودی اور غلطیاں

از:- مولانا ابو منظور شیخ احمد، ضخامت ۱۱۵ صفحات۔ قیمت:- چھ آنے
ملنے کا پتہ:- مکتبہ تعمیر ملت چوک بازار، ملتان۔

اس کتابچہ میں دلائل و شواہد اور مولانا مودودی کی تحریروں کے حوالوں سے اس بات کو ثابت اور واضح کیا گیا ہے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اپنی بات کی پچ کے لئے اعتراف حق سے گریز کرتے ہیں کہ مانیں پر جب کسی نے اطمینان بخش دلائل کے ساتھ ان کی غلطی واضح کر دی ہے تو موصوف نے اس غلطی کا اعتراف کر لیا ہے اور اپنی تحریر میں تصحیح کا ڈنکے کی چوٹ اعلان بھی کر دیا ہے۔

یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک کامیاب پیش کش ہے، جس پر مصنف اور ناشر دونوں تحسین کے مستحق ہیں۔

مومنات

از:- مولانا عبدالقیوم ندوی ضخامت ۲۴۰ صفحات (مجلد رنگین گردپوش کے ساتھ) قیمت:- ایک روپیہ آٹھ آنے
ملنے کا پتہ:- محمد سعید اینڈ سنز قرآن محل، مقابل مولوی مسافر خانہ، کراچی۔

اس کتاب میں حضرت خدیجہ، حضرت سارہ، ازواج مطہرات، بنات رسولؐ، بعض صحابیات، اور خواتین اہل بیت کی کرام کی مقدس زندگیوں کے مختصر حالات پیش کئے گئے ہیں ———— اس کے بعد ترکی، مصر، الجزائر، اور ہندوستان کی مسلمان عورتوں کی معاشرتی اور علمی ترقیوں کا ذکر ہے۔ صحابیات کے تحت پاپ، ترکی، اور ایران کی مسلمان عورتوں کا ذکر بہ چھوٹا سا ہے، اس مختصر تذکرے میں مومنات کی بہادری کے واقعات خاص طور پر بیان کئے گئے ہیں۔

"قدیم زمانہ میں دستور تھا کہ جب کسی شریف خاندان میں لڑکی پیدا ہوتی، تو اس معصوم کو زندہ درگور کر دیا کرتے۔" (صفحہ ۸)

اس عبارت سے تو یہ مترشح ہوتا ہے کہ عرب کے علاوہ دنیا کے تمام دوسرے ملکوں میں بھی "دخترکشی" کا رواج تھا۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔

"چنانچہ ایک مشہور فلسفی فیثاغورث کا قول ہے کہ صنف نازک کی عزت اور عصمت کا حقیقی محافظ اور سچا پاسبان اگر کوئی مذہب ہے تو وہ اسلام اور صرف اسلام ہے۔" (صفحہ ۱۵)

فیثاغورث اور اسلام کا ذکر و تعریف ———— ایک عجیب مضحکہ خیز انکشاف ہے!

کھلتی کلیاں

از:- ابو مجاہد زاہد۔ ضخامت ۴۲ صفحات۔ قیمت:- چار آنے۔
ملنے کا پتہ:- ہونہار کتاب گھر، دہلی ۶

کمسن بچوں اور بچیوں کے لئے جناب ابو مجاہد زاہد نے ہلکی پھلکی اخلاقی اور دینی نظمیں لکھی ہیں۔ جیسا نام ویسا ہی کام۔ یعنی ان نظموں سے سچ مچ اخلاق و سیرت کی کلیاں کھلتی اور مہکتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں!

"بچے ایک کی غزل" کے دو شعر ہیں:-

علاوہ دوسرے شعر کے مصرعِ ثانی میں جو "بچے" ہے، بچے لگتا ہوں، نظم کے جز وہ بچے لگتا ہے، زبان کے اعتبار سے درست نہیں، "بچے کر" بولتے ہیں۔

دین کی باتوں کو سنتا ہوں بہت ہی غور سے ۔۔۔ پوچھنے میں بھی جھجکتا ہوں، نہ شرماتا ہوں میں
صبح کو لیتا ہوں قرآں کی تلاوت کے مزے ۔۔۔ ناچتا ہوں اور نہ فلمی گیت ہی گاتا ہوں میں

آخری نظم "دعا" بھی خوب ہے، مگر دوسری نظموں کے مقابلہ میں بچوں کے معیار سے بلند ہے۔

فضائل رمضان

مرتبہ:۔ مولانا عبدالحلیم قاسمی، ضخامت ۴۸ صفحات، قیمت:۔ آٹھ آنے۔
ملنے کا پتہ:۔ شعبۂ اشاعت و تبلیغ مدرسہ جامعہ حنفیہ تمپل روڈ، لاہور۔

اس کتابچہ میں رمضان کے فضائل اور ضروری مسائل عام فہم زبان میں بیان کئے گئے ہیں، جن کا مطالعہ اہل ایمان کے لئے ہر لحاظ سے مفید ہے ۔۔۔ صفحہ ۴۲ پر یہ عبارت نظر سے گذری۔

"عشاء کے فرض اور سنت کے بعد بیس رکعت تراویح با جماعت مسنون ہے، بعض لوگ جو بارہ اور آٹھ بتلاتے ہیں درست نہیں ہے۔"

اس عبارت کا آخری جملہ (بعض ۔۔۔۔۔۔ درست نہیں ہے) زائد ہے، بات پہلے جملہ (عشاء ۔۔۔۔۔ مسنون ہے) پر ہی ختم ہو جانی چاہئے تھی۔ جس سے احناف پر حنفی فقہ کا تراویح کی تعداد کے بارے میں مسلک واضح ہو جاتا۔ تراویح کی تعداد کے تعین کے سلسلہ میں آٹھ بارہ اور بیس رکعات ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کسی تعداد کو "نادرست" کہنا بہت بڑی جسارت ہے، جب کہ احادیث میں ان کا ذکر ملتا ہے۔ تراویح کی مختلف تعدادوں میں کسی ایک تعداد کو بہتر ترجیح دی جا سکتی ہے، جو کوئی تراویح کی آٹھ رکعت پڑھتا ہے، اس کی بھی نماز درست ہوتی ہے۔

کتاب کے آخری صفحہ پر اس حدیث:۔

من بنی للہ مسجداً بنی اللہ لہ بیتاً فی الجنۃ

کے اس ترجمہ ۔

"جو اللہ کی رضا کے لئے مسجد بناتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں محل تیار کرتے ہیں۔"

میں "اللہ تعالیٰ" کے لئے "فعل جمع" کھٹکتا ہے، بعض دوسرے علماء دیوبند بھی "اللہ تعالیٰ کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ حکم دیتے ہیں" بولتے اور لکھتے ہیں، یہ انداز بیان شریعت کے قدہ برابر خلاف نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ کی شان تفرد و توحد اور کبریائی عظمت و جلالت کا اظہار "فعل واحد" سے جیسا ہوتا ہے، "فعل جمع" سے نہیں ہوتا۔

"اللہ تعالیٰ سب سے بڑا ہے۔"

اور

"اللہ تعالیٰ سب سے بڑے ہیں۔"

ان دونوں جملوں سے عظمت وحدت کے اس فرق کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔

ابراہیم علیہ السلام

مترجم:۔ مولانا عبیدالحق، ضخامت ۴۴ صفحات، قیمت چھ آنے۔
ملنے کا پتہ:۔ المکتبۃ العلمیہ ۱۵، لیک روڈ لاہور

یہ کتاب عربی سے ترجمہ کی گئی ہے، جس میں بچوں کے لئے حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی پاک زندگی کے حالات بیان کئے گئے ہیں، ترجمہ آسان اور عام فہم ہے، اس کتاب میں مصنف نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے غار میں پرورش پانے کا واقعہ نقل کیا ہے، جو بعض

تفاسیر میں بھی ملتا ہے، اس میں خاصہ تکلف پایا جاتا ہے، تفاسیر کی روایت لینے میں احتیاط و انتخاب دونوں بصیرت کی ضرورت ہے۔

سیرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ | مولفہ:- حکیم شمس الدین قریشی، ضخامت ۴۰ صفحات۔ قیمت:- چھ آنے۔ ملنے کا پتہ:- دارالاشاعت و تبلیغ ٹیکسلا۔

کتاب کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ اس میں حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح حیات پیش کیے گئے ہیں، امام اعظم کی علمی منزلت اور شان زہد و تقویٰ نے ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔

صفحہ ۴ پر کاتب نے "مجمع البحار" پر یک مقطر کا اضافہ کر کے (مجمع بحار) عبارت کو "مضحکہ خیز" بنا دیا۔

صفحہ ۱۰ پر جو یہ لکھا گیا ہے کہ حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے اساتذہ اور مشائخ کی تعداد چار ہزار تھی — اس میں بہت مبالغہ کیا گیا ہے، یک شخص کا چار ہزار شیوخ اور اساتذہ سے استفادہ کرنا بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے جبکہ اس کتاب کے صفحہ ۱۲ پر یہ بھی لکھا ہے کہ "حضرت امام اعظم نے اٹھارہ برس حضرت حماد کی خدمت میں گزارے"۔

اُردو کے اشاعتی ادارے متوجّہ ہوں!

کل پاکستان انجمن ترقی اُردو کے اخبار "قومی زبان" کے ادارے کی طرف سے ۱۹۵۸ء کی مطبوعہ اردو کتب کی توضیحی فہرست مرتب کی جا رہی ہے جو عنقریب شائع کر دی جائے گی۔ ہند و پاکستان کے اشاعتی اداروں سے درخواست ہے کہ وہ اپنی ان اُردو کتب کی فہرست ارسال فرمائیں جو ۱۹۵۸ء میں شائع کی گئی ہوں۔ اس سلسلے میں حسب ذیل امور کی صراحت ضروری ہے۔

۱:- نام کتاب
۲:- نام مصنّف
۳:- نام مترجم (کتاب کے ترجمہ ہونے کی صورت میں)
۴:- موضوع (مختصر طور پر کتاب کا تعارف)
۵:- تعداد صفحات
۶:- سائز
۷:- ایڈیشن (یہ وضاحت کی جائے کہ کتاب پہلی بار ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی ہے یا اس سے پہلے بھی اس کی اشاعت عمل میں آ چکی ہے)
۸:- ناشر
۹:- خط و کتابت اس پتہ پر کی جائے۔

مدیر "قومی زبان"

کل پاکستان انجمن ترقی اُردو

اُردو روڈ کراچی ۱!

ماہنامہ آستانۂ زکریا ملتان کا عظیم الشان

مشائخ سہروردیہ نمبر (حصہ اوّل)

(ترتیب کے بعد کتابت کے مرحلہ میں)

اپنے موضوع پر اوّلین جامع پر مغز اور جاندار پیشکش —

مقالات و مستند مضامین کی ایک جھلک

مقالات	مقالہ نگار
خانوادۂ سہروردیہ پر یک نظر۔	مولانا شاہ غلام حسین پھلواروی ندوی۔
۱۔ شیخ الاسلام بہاؤالدین زکریا ملتانی کے اور اد	ڈاکٹر مولوی محمد شفیع (پنجاب یونیورسٹی)
۲۔ شیخ الشیوخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ	ڈیر مزید۔ علامہ طالوت۔ علامہ قدری
۳۔ شیخ الاشراق شہاب الدین مقتول سہروردیؒ	پروفیسر رشید احمد ارشد ایم اے۔
۵۔ مخدوم جہانیاں جہاں گشت سید جلال بخاریؒ	محمد ایوب قادری۔ بی اے۔
۶۔ شیخ سعدی شیرازیؒ۔	مولوی محمد سلیمان بدایونی۔
۷۔ شیخ ابو الفتح رکن الدین ملتانیؒ	مولانا جعفر شاہ پھلواروی۔ علامہ طالوت
۸۔ شیخ الاسلام حضرت بہاؤالدین زکریاؒ	ڈاکٹر مولوی محمد شفیع۔ مولانا جعفر شاہ پھلواروی
۹۔ شیخ حسام الدین دہلوی۔ و۔ مولانا جمالیؒ	ڈاکٹر نذیر احمد ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔
۱۰۔ شیخ فخرالدین عراقی سہروردی	ڈاکٹر نبی ہادی۔ محمد دوست کامل۔
۱۱۔ شیخ نجم الدین کبریٰ اور ان کے خلفاء۔	علامہ درد کاکوروی۔
۱۲۔ کتابیات سہروردیہ پر ایک طائرانہ نظر	مخدوم زادہ سجاد حسین قریشی سدید مسلول۔
۱۳۔ مشائخ سہروردیہ کا سیاست میں حصہ	پروفیسر خلیق احمد نظامی
۱۴۔ چشتی۔ سہروردی	وحید احمد مسعود۔
۱۵۔ امیر حسینی سادات ہروی	پروفیسر ظہیر احمد صدیقی ایم اے علیگ
۱۶۔ سہروردی تعلیمات	پروفیسر ضیاء احمد بدایونی۔ مولانا غلام حسین پھلواروی
۱۷۔ ادب۔ الشعر (تعارف)	جناب ماہر القادری۔
۱۸۔ سہروردی صوفیا کا اردو ادب میں حصہ	علامہ درد کاکوروی۔
۱۹۔ سہروردی شعراء کے کلام کا انتخاب۔	میر حسان الحیدری

ان مقالات کے علاوہ —

ڈاکٹر میر ولی الدین ایم اے پی ایچ ڈی۔
مولانا ابو الحسن علی ندوی۔
قاری محمد بشیر الدین پنڈت ایم اے۔
پروفیسر یوسف سلیم چشتی ایم۔ اے۔
ڈاکٹر ابو محمد (فارسی لیکچرر سینٹ اسٹیفن کالج دہلی) اور
میر حسام الدین راشدی کے تحقیقی و علمی مقالات
بھی اس مجموعہ کی زینت بنیں گے

حصۂ نظم کی ترتیب نے تزئین ہیں

حضرت اسد ملتانی۔
جناب ماہر القادری۔
جناب عاصی کرنالی
علامہ درد کاکوروی۔
قاضی غلام سجاد بسمل بدایونی
علامہ ضیاء القادری۔
پروفیسر ضیاء احمد بدایونی۔
محترمہ فہد بدایونی اور میر حسان الحیدری
شرکت فرما رہے ہیں

اہل علم اور شائقین حضرات اپنے آرڈر جلد بک کرائیں۔ کیونکہ یہ نمبر محدود تعداد میں چھپے گا۔

قیمت چار روپے صرف

علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ:-

منیجر آستانۂ زکریہ ملتان شہر (پاکستان)

ہندوستان میں ترسیل زر کا پتہ:-

خواجہ حسن ثانی نظامی ایڈیٹر ماہنامہ منادی۔ درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء۔ نئی دلّی ۱۳

رکن انجمن ادبی رسائل پاکستان

ماہنامہ

فاران کراچی

جلد ۱۰ شمارہ ۱۲

ماہ مارچ سنہ ۱۹۵۹ء

ایڈیٹر ماہر القادری

سالانہ چندہ: چھ روپے | فی پرچہ: آٹھ آنے

ترتیب

مقام اشاعت:- دفتر فاران، کیمبل اسٹریٹ کراچی نمبر (۱)

پرنٹر پبلشر: مسرور حسین — مطبع سعیدی قرآن محل کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

پاکستان میں تعلیمی کمیشن کا وہ سوالنامہ ان دنوں موضوعِ گفتگو اور عنوانِ غور و فکر بنا ہوا ہے، جس میں تعلیمی مسائل حل کرنے کے لئے "صدائے عام" دی گئی ہے۔ ملک کی تعمیر و ترقی کے لئے جو کوئی ایک قدم بھی اٹھاتا ہے، وہ تبریک و تحسین کا مستحق ہے۔

تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کے مسائل و معاملات میں بڑی فراخدلی اور وسعتِ نظر کی ضرورت ہے، خیر و حکمت کے لئے ہم ہر گوشہ سے تمتع اور ہر خرمن سے خوشہ چینی کر سکتے ہیں۔ اور "حکمت" تو یوں بھی مردِ مومن کی متاعِ گم شدہ ہے، یہ جہاں بھی ملے اور جب بھی ملے، اس کے لینے میں تامل نہیں کرنا چاہیئے! اس لئے مشائین و اشراقین سے لے کر ہربرٹ اسپنسر اور میڈم مانٹیسوری تک کے طرزِ تعلیم اور اسلوبِ تربیت کا ہمیں جائزہ لینا ہوگا، اور جو چیزیں ہمارے قومی مزاج اور دینی فکر سے ہم آہنگ ہوں گی، انہیں قبول کیا جا سکتا ہے۔ اصل چیز منزل کی طرف بڑھنا اور حصولِ مقصد کے لئے قدم اٹھانا ہے۔ یہ پیشِ نظر ہو تو ہر جائز ذریعہ کو استعمال کیا جا سکتا ہے، چاہے اس کی تشکیل و ایجاد کا فخر کسی غیر مسلم ہی کو حاصل کیوں نہ ہو!

جہاں ہم "تمتع زہر گوشہ یافتن" کے قائل ہیں، وہاں ہم اُس احساسِ کمتری کے سخت مخالف ہیں، جو یورپ کی مرعوبیت کی وجہ سے ظہور میں آیا ہے اور جس نے ہمارے ذہین طبقہ کی خاصی تعداد کو "مغرب زدہ" بلکہ یوں کہنا چاہیئے یورپ کا "چھاتہ بردار" اور "ہز ماسٹرس وائس" بنا دیا ہے یہ احساسِ کمتری جب تک ختم نہ ہوگا، اور یہ مرعوبیت جس وقت تک دور نہ ہوگی، ہمارے روشن خیال اور ذہین افراد مسائل کو نہ ٹھیک طرح سمجھ سکتے ہیں اور نہ اُن کا صحیح حل تلاش کر سکتے ہیں

اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہم مسلمانوں کا ماضی بہت کچھ شاندار رہا ہے، ہماری قومی روایات آج اس ایٹمی دور میں بھی ہمارے لئے موجبِ نازو افتخار ہیں اور ہم اپنی روایات کے ساتھ متمدن دُنیا اور مہذب عصرِ حاضر سے آنکھ اٹھا کر اور سر اونچا کر کے بات کر سکتے ہیں، تاریخ بتاتی ہے کہ ایسا دور بھی ہم پر گزرا ہے، جب کہ علوم و فنون کے میدانوں میں ہمیں ہم نظر آتے تھے، اور اُس وقت کی معلوم دُنیا ہمارے رُو برو عزت و احترام کے ساتھ زانوئے ادب تہ کرتی تھی!

دُنیا جانتی ہے کہ تمدن و تہذیب کی زلفوں کو ہم نے سنوارا اور انسانیت کے چہرے کو ہم نے نکھارا ہے، علم و فن کا وہ کونسا جادہ ہے، جہاں ہمارے نقشِ قدم نہیں پائے جاتے، اور ثقافت و عمرانیت کی وہ کونسی منزل ہے، جہاں ہمارے اسلاف نے سنگِ میل نہیں چھوڑے، ایک زمانہ میں ترقی ہمارے نام سے منسوب کی جاتی تھی، اور علم و فن کو ہمارے کارناموں سے جانا پہچانا جاتا تھا۔

فلسفہ کو ہم نے مٹنے سے بچایا، منطق کو ہم نے نطق بخشا، تاریخ کو ہم نے فنِ تاریخ بنایا، شعر و ادب کو ہم نے چار چاند لگائے۔ سیاست کے آداب اور جہانبانی کے گُر ہم نے دُنیا کو سکھائے، اخلاق و حکمت کے صحیفے ہم نے مُرتب کئے، علم کیمیا ہو، ہندسہ و مساحت ہو، صنعت و حرفت ہو، فصاحت و بلاغت ہو، غرض خطاطی سے لے کر جہاں رانی اور جہاز سازی تک ہر فن کو ہم نے آگے بڑھایا بلکہ یوں کہیئے کہ اُن کو نئی زندگی عطا کی۔

مراغہ اور اشبیلیہ کی رصد گاہوں کے آثار سے پوچھو کہ ہم نے "فلکیات" کو زمین سے اٹھا کر چرخ چہارم تک پہنچا دیا، الحمرا کے مرمریں ستونوں اور تاج محل کی مرمریں جالیوں سے دریافت کرو کہ فن تعمیر پر ہمارا کس قدر احسان ہے؟ شالامار کے حوض و فوارے اور نسیم و نشاط کی روشیں ہمارے ذوق کی نفاست کی داستانیں سنائیں گی!

ہمارے حمام، ہمارے برج، ہماری سڑکیں، ہمارے مدرسے، ہمارے شفا خانے، ہماری رصد گاہیں، ہماری کاروان سرائیں اور ہمارے کتب خانے، علم و فن کی تاریخ کے نہ مٹنے والے نقوش ہیں۔ خاص طور سے فن تعلیم تو ہمارے ہی ظل عاطفت میں پروان چڑھا ہے اور ہمارے یہاں بہت سے نظام الملک اور محمود گاوان پیدا ہوئے ہیں، جو نہ صرف یہ کہ اپنے زمانے کی عظیم الشان یونیورسٹیوں کے بانی اور سرپرست تھے بلکہ فن تعلیم میں دستگاہ رکھتے تھے۔ ہمارے بادشاہوں نے عوام کی سطح پر آکر، کتابت وانت کی مشق اور ریاضتیں کی ہیں، اور غلاموں نے اخوت و مساوات کا درس دنیا کو دیا ہے۔

اور جو کچھ کہا گیا ہے اس میں کسی قسم کا مبالغہ نہیں کیا گیا، یہ ایسے سچے اور صاف واقعات ہیں جن کی صحت کا ہمارے ان دشمنوں نے بھی اعتراف کیا ہے، جن کی زبان و قلم کا ہمیشہ کام ہی یہ رہا ہے کہ مسلمانوں کے کچھ کے کچھ لگائیں اور اسلام پر تہمت جوڑتے رہیں ہم نے تو یہ کیا ہے کہ اپنے ہزاروں صفحات کے محامد و محاسن اور داستان فخر و ناز کو چند سطروں میں سمیٹ دیا ہے، لوگ اپنی خوبی اور بڑائی کی ایک بوند کو پھیلا کر کیسے کیسے بنا دیتے ہیں، اور ہم نے دریا کو چند قطروں میں محدود کر دیا ہے۔

"پدرم سلطان بود" کے مفہوم کو بھی ہم اچھی طرح جانتے ہیں، اور —

سہ میراث پدر خواہی، علم پدر آموز

کے تقاضوں سے بھی ہم واقف ہیں، ہم نے یہ داستان فخر و ناز اس لئے چھیڑی ہے کہ پاکستان کے ارباب حل و عقد کے ذہنوں میں یہ یاد تازہ ہو جائے کہ اپنے تعلیمی مسائل کو حل کرنے کے لئے اللہ کے فضل سے ہمارے یہاں روایتوں، مثالوں اور نمونوں کی کمی نہیں ہے، ہم اپنے مستقبل کو تابناک بنانے کے لئے اپنے ماضی سے بہت کچھ روشنی حاصل کر سکتے ہیں، ہمارے پاس علوم کا بہت بڑا سرمایہ ہے، اس سرمایہ کی ہمیں قدر کرنی چاہیئے۔

نظام تعلیم کی اساس

یہ بات بالکل واضح ہے کہ امت مسلمہ کے علوم و فنون کا مرکز اور ماخذ ہر دور میں "کتاب و سنت" رہے ہیں، اسی محور کے گرد ہمارا نظام تعلیم گردش کرتا رہا ہے۔ ہمارے علوم نے دنیا کے دلوں کو اخلاق و پاکیزگی کے سایہ میں فتح کیا ہے۔ ہمارے علمی افکار صرف بلند و عمیق ہی نہ تھے بلکہ پاکیزہ بھی تھے، اس پاکیزگی کو دنیا نے محسوس کیا ہے اور معاشرے پر یہ پاکیزگی بہت کچھ اثر انداز ہوئی ہے۔

آج بھی ہمارا نظام تعلیم "کتاب و سنت" کی اساس پر استوار ہو سکتا ہے اور ہونا چاہیئے، جو چیز ماضی میں ہماری کامیابی، مقبولیت بزرگی و عزت اور قوم کی تعمیر کا ذریعہ بن چکی ہے، اس دور میں بھی بن سکتی ہے، بشرطیکہ ہم اس کی قدر و اہمیت کو محسوس کریں اور دور مروج کی نقالی کو اپنی ترقی اور اقبال مندی کا ذریعہ نہ سمجھیں۔ اصل چیز زاویہ نگاہ ہے۔ ہمارے ارباب کار کا زاویہ نگاہ خالص اسلامی ہو جائے، تو پھر ہر اصلاحی کوشش اور تعمیری جدوجہد اسلام کے سانچے میں ڈھلتی چلی جائے گی۔

آج دنیا میں بے یقینی اور بے دینی و تشکیک کا دور دورہ ہے، ہمارا نظام تعلیم اس انداز پر مرتب ہونا چاہیئے، جس سے ایک طرف تو ان فتنوں کا توڑ ہو سکے اور دوسری طرف یقین و ایمان کو قوت مل سکے۔ ہماری درسگاہوں سے جو طلباء فارغ ہو کر نکلیں وہ خدا، یوم آخرت اور اسلام کی دوسری قدروں کے بارے میں پوری طرح مطمئن ہوں، ان کے اندر اللہ کے کلمہ کو غالب کرنے کا جذبہ موجزن ہو، دل

اسلام کا نام لیتے اور اپنے کو مسلمان کہتے ہوئے جو شرم کی جگہ فخر محسوس کریں۔

تعلیم صرف الفاظ کی صورتیں اور شکلیں پہچاننے کا نام نہیں ہے، اس کا اصل کام فکر و نظر کی تربیت ہے، اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ ایک مسلمان کی تربیت اُس کے دینی افکار کی ہی اساس پر ہونی چاہیئے۔ تعلیم و تربیت کے ذریعہ مسلمان نسل کو پختہ تر مسلمان بننا ہے، ایسا مسلمان جو اپنے معتقدات میں پہاڑوں کی چٹانوں سے زیادہ محکم اور عمل میں برق و شرر سے بڑھ کر تیز و متحرک ہو!

دوسری قوموں سے ہم ریاضی، سائنس، جغرافیہ اور دیگر علوم و فنون سیکھ سکتے ہیں، اور دوسروں کی علمی ترقیوں سے ہمیں فائدہ اٹھانا ہی چاہیئے مگر ہم اُن کے قومی، وطنی، سیاسی اور مذہبی نظریوں کو قبول نہیں کرسکتے، ہمیں "مسلمان" بن کر ترقی کرنی ہے ——— "نامسلمان" بن کر نہیں کرنی! اگر کوئی مسلمان سائنسداں چاند کو چھوکر اور عطارد پر چند قدم چل کر زمین پر صحیح و سالم لوٹ آئے مگر ایسا کرنے میں اُس کے دینی اعتقادات ڈانواں ڈول ہو جائیں، تو اسلامی نقطۂ نگاہ سے یہ اس کی ترقی نہیں تنزل ہے!

تربیت و تعلیم ہو، ترقی ہو، ایجاد و اختراع ہو یا اصلاح و انقلاب ہو ——— یہ ساری جدوجہد اسلام کے سایہ میں ہونی چاہیئے، اسلام سے باہر رہ کر کوئی ترقی، ترقی نہیں، اور کوئی اصلاح، اصلاح نہیں!

پاکستان کے نصاب تعلیم میں ابتدائی جماعت ہی سے دینی تعلیم ہونی ضروری ہے، اسلام بچوں کو گھٹی میں پلا دینا چاہیئے اور پھر اُس سے اعلیٰ کلاسوں تک دینی تعلیم نصاب میں شامل ہونی چاہیئے تاکہ ایک طالب علم درسگاہوں سے اسلام میں اس قدر پختہ ہو کر نکلے کہ کسی دوسرے نظامِ زندگی کا رنگ ہی اس پر چڑھ نہ سکے!

اسلامی اخلاق

اس بات کو ساری دنیا جانتی ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر وجود میں آیا ہے، اس لئے پاکستان کی اصل طاقت اسلام اور صرف اسلام ہے، جس نے یہاں اسلام کی کسی ایک قدر کو بھی نظرانداز کیا، اُس نے پاکستان کی طاقت کو نقصان پہنچایا! پاکستان صرف جغرافیائی حدود ہی کا نہیں بلکہ اصل میں ایک "نظریۂ حیات" کا نام ہے، اس نظریہ حیات ——— اسلام ——— کو تعلیم کے ذریعہ ہی دلوں میں اُتارا اور سیرت و کردار میں سمویا جاسکتا ہے۔

جو کوئی پاکستان میں اصلاح و ترقی کے موضوع پر مصطفےٰ کمال پاشا کی شخصیت کو ذہن میں رکھ کر سوچتا ہے وہ غلط سوچتا ہے، کمال پاشا کی اصلاحی اور انقلابی کوششوں کی بدولت ترکی میں اسلامی روح کو جو صدمہ برداشت کرنا پڑا ہے، اُس کی المناکی اور نقصان و خرابی کا کوئی اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ ترکی قومیت کی سربلندی کے لئے اسلامی اقدار کی پامالی اور دینی روایات کی بربادی اسلامی تاریخ کی بہت بڑی ٹریجڈی ہے، جس شخص نے حکومت کی طاقت سے اذان کے عربی لفظوں کو ترکی زبان میں بدل ڈالا ہو، اُس کے ذہن کی ساخت، فکر کی پرواز اور رجحانات کا اندازہ کرنے کے لئے صرف یہ ایک سانحہ بہت کافی ہے۔

مفاد پرست لیڈروں اور غلط کار حکمرانوں کی پیدا کی ہوئی برائیوں کی اصلاح کمال پاشا کے انداز پر نہیں بلکہ حضرت عمر ابن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے اصلاحی اقدامات کے انداز و نہج پر ہونی چاہیئے، اسلام کے اس بطلِ جلیل کی اصلاحی جدوجہد کا محور اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول تھا، اور اللہ کے خوف اور تقویٰ و پاکیزگی کے احساس سے اُن کے قلب و دماغ معمور تھے۔ اللہ تعالیٰ کی شانِ ربوبیت کے قربان جائیے کہ اُس نے اُمت کی اصلاح کے لئے کیسے کیسے اعلیٰ نمونے مہیا فرمائے ہیں ——— فاتحوں، دوست مندوں، سپاہیوں، جنرلوں، خدموں اور فرمانرواؤں غرض ہر حیثیت اور منصب کے آدمی کے لئے اسلامی تاریخ میں ایک نمونہ موجود ہے، اور سب سے بڑا نمونہ تو ذاتِ رسالت مآب کا اسوۂ حسنہ ہے، جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام نعمتوں کا اتمام فرما دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دُنیا کے سب سے بڑے مُعلم اخلاق تھے، اور آپ کو اللہ تعالیٰ نے "کتاب و حکمت" کی تعلیم اور سیرت سازی

(تزکیہ نفس) کے لیے مبعوث فرمایا تھا، اس لئے پاکستان کا نظامِ تعلیم "کتاب و حکمت" کی سی ہوئی تعلیم کے تابع ہونا چاہئے، نظامِ تعلیم کی اساس ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کے فضل سے موجود ہے، انہی خطوط پر کام کرنے اور تعلیم کو ڈھالنے کی ضرورت ہے۔

جہاں تک عقائد، نظریات اور اصولِ زندگی کا تعلق ہے، ہمارے اور دوسروں کے درمیان، زمین آسمان کا بُعد و تفاوت ہے، ہمارے نظریات نہ اشتراکیت سے میل کھاتے ہیں، اور نہ انگلستان، امریکہ اور جرمنی سے کوئی مناسبت رکھتے ہیں۔

ہم ان ملکوں اور قوموں سے کالجوں اور سکولوں کی عمارتوں کے نقشے، درسگاہوں میں حاضری اور امتحانات دینے کے طریقے، سائنس کے آلات، کرکٹ اور ہاکی کے قواعد، علومِ متداولہ کی معلومات تو بے شک لے سکتے ہیں مگر ان کے افکار اور نظریات کو قبول نہیں کر سکتے!

روس اور یورپ کے یہاں نظامِ تعلیم میں اخلاق کا معیار بہت ہی پست اور گھٹیا ہے، اُن کا معاشرہ بد خلقی اور بے حیائی میں جس گراوٹ تک پہنچ چکا ہے، اُن کے تعلیمی ادارے بھی اُس سے متأثر ہیں۔ وہاں لڑکے اور لڑکیاں مل جل کر تعلیم پاتے، شانہ بہ شانہ میدانوں میں کھیلتے، زانو بہ زانو دریاؤں اور تالابوں میں تیرتے اور دوش بدوش سینما ہاؤسوں اور پارکوں میں تفریح کرتے ہیں، وہاں کلچر کے نام پر گانے بجانے کی محفلیں جمتی ہیں اور نیم برہنہ طالبات ناچ کر، تھرک کر ڈرامیٹنگ کر کے سامعین سے دادِ تحسین حاصل کرتی ہیں۔ ——— اسلامی نقطۂ نگاہ سے تو یہ تمام باتیں فحاشی میں داخل ہیں، اور ان جیسی روش میں مبتلا ہونے کے بعد انسان کی اخلاقی موت واقع ہو جاتی ہے؛ یہ تمام حرکتیں، خوش فعلیاں اور رنگ رلیاں ہماری تہذیب کی عین ضد ہیں!

یورپ میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ ہماری آنکھیں کھول دینے کے لئے بہت کافی ہے، ہمیں اُس سے عبرت حاصل کر کے اُن تمام اخلاقی مضرات سے بچنا چاہیئے جن کے سبب یورپ گراوٹ کے پاتال تک جا پہنچا ہے۔ پاکستان کے پچھلے سیاست دانوں اور حاکموں نے جہاں بہت سی حماقتیں اور غلطیاں کی ہیں، اُن میں کی بہت بڑی حماقت یہ مخلوط تعلیم ہے، پچھلے دور میں بعض کالجوں اور اسکولوں میں مسلمان لڑکیوں کو نچوایا گیا ہے، اور اُن کے مقابلۂ حُسن اور رقص و سرود کے ذریعہ "قومی چندہ" جمع کیا گیا ہے، پاکستان کے بننے والے نظامِ تعلیم کو اس قسم کی تمام بے حیائیوں اور فحش باتوں سے پاک ہونا چاہیئے، ملتِ اسلامیہ ایسے غلط نظامِ تعلیم سے پناہ مانگتی ہے، جس کے سایہ میں پروان چڑھ کر، مسلمان لڑکیاں گریٹا گاربو اور ریٹا ہیورتھ بن کر نکلیں، ہماری بہو بیٹیوں اور بہنوں کو ایسے نظامِ تعلیم کی ضرورت ہے، جو اُن کی زندگیوں میں رابعہ بصری، عائشہ، خدیجہ اور فاطمہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) کے کردار و سیرت کی زیادہ سے زیادہ جھلک پیدا کر سکے، اور ہمارے نوجوان شرافت و پاکیزگی کے سایہ میں لکھ پڑھ کر جب معیشت و معاملات کے میدان میں آئیں، تو اُن کی زندگیوں سے اخلاق و نیکوکاری کی خوشبو آتی ہو۔

روس کی مثال ہمارے سامنے ہے، وہاں کا نظامِ تعلیم اشتراکی اصولوں کے گرد گھومتا ہے ——— یہ کہ خدا کا تصور (معاذ اللہ) ایک واہمہ ہے، مذہب ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے، اخلاقی قدریں ساری کی ساری اضافی ہیں، عوام کے نجات دہندے، کارل مارکس، لینن اور اسٹالن تھے، اشتراکیت ہی سے دنیا کے دردوں کا مداوا ہو سکتا ہے ——— یہ تعلیم روسی طالب علموں کے دل و دماغ میں بٹھا دی جاتی ہے، روس کا رہنے والا، چاہے سرکس والا ہو، یا انجینئر، لوہار ہو، بڑھئی ہو، یا درزی، شاعر ہو یا رقاص، ناول نگار ہو یا ایکٹر، گھڑی ساز ہو یا بت تراش، وزیر ہو یا چپراسی ——— غرض ہر شخص نظریہ و فکر کے اعتبار سے "اشتراکی" ہوتا ہے، اور جو نہیں ہوتا اُسے بنایا جاتا ہے، بلکہ بننا پڑتا ہے!

جن کے نظامِ حیات، نظریوں اور اصولوں کو ہم باطل، ملحدانہ اور کافرانہ سمجھتے ہیں، وہ اپنے اصولوں کے ساتھ اس قدر مخلص اور وفادار ہیں۔ اور اشتراکیت کی تبلیغ کی ایسی لگن اپنے اندر رکھتے ہیں۔ ہم جو اپنے کو "مومن" کہتے ہیں، اور صرف اسلام ہی کو دینِ حق

مانتے ہیں، اگر ملک و حکومت، اور اختیار و اقتدار ملنے پر، ہم اللہ تعالیٰ کے کلمہ کو غالب اور نظامِ اسلام کو قائم و برپا نہ کریں، تو ہمیں قیامت کے دن اپنی اس غفلت اور بے پروائی کی شدید جواب دہی کرنی پڑے گی، شرک کے بعد "قومی گناہ" ہی سب سے بڑا "ظلم" ہے، جس کی عقوبت کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا، اللہ تعالیٰ ہمیں اس جرم کے ارتکاب سے محفوظ و مامون رکھے۔ (آمین)

اساتذہ معلمین اخلاق

یورپ کے معلمین عام طور پر اخلاق و نیکوکاری کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے، وہ بھی وہاں کی سوسائٹی کے رنگ میں رنگے ہوتے ہیں اور ماحول کی برائیوں کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں کرتے، وہاں اساتذہ اور طلبہ ایک ہی "بار" (BAR) میں جا کر ساتھ ساتھ شراب پیتے ہیں۔ اور ایک ہی تھیٹر ہال میں دوش بدوش بیٹھ کر ننگا ناچ دیکھتے ہیں، ایسے بھی کیس دیکھنے میں آئے ہیں کہ ایک ہی لڑکی سے استاد اور شاگرد دونوں معاشقہ فرما رہے ہیں، مگر ہمارے معلمین کی ماضی میں یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ اخلاق و نیکوکاری کو اپنے پیشہ کا طغرائے امتیاز سمجھتے تھے، اُن کی صاف ستھری زندگیاں، طلباء کے اخلاق پر بڑا اچھا اثر ڈالتی تھیں۔ تعلیم و تعلم اور درس و تدریس کے بارے میں اُن کا یہ پست نظریہ نہ تھا کہ نصاب کی کتابیں پڑھا دینا اور کورس ختم کر دینا ہی اُن کا فرضِ منصبی ہے، اسی کام کی اُنہیں تنخواہ ملتی ہے، اخلاقی تربیت اُن سے متعلق نہیں ہے ——— تو جو ذمہ داری اُن سے متعلق ہی نہیں ہے، اُس میں وہ سر کا ہے کو کھپائیں ——— مگر اس کے برخلاف مسلمان اساتذہ نے گزشتہ دور میں اپنی ذمہ داریوں کو ہمیشہ محسوس کیا ہے، یہ نیک لوگ اپنے شاگردوں کی سیرت و کردار پر بھی کڑی نگاہ رکھتے تھے۔ وہ "سیرت سازی" کو نصاب کی کتابوں کی تعلیم سے زیادہ ضروری خیال کرتے تھے۔ طلباء اور درسگاہوں سے ان کا تعلق محض "تنخواہ" اور "ملازمت" کا نہ تھا کہ مقررہ اوقات میں کتابیں پڑھا دیں، مہینہ پر تنخواہ وصول کر لی، اور وہ اس طرح اپنے فرائض سے سبک دوش ہو گئے ——— مسلم اساتذہ طلباء کے اخلاق کے بناؤ اور بگاڑ کا اپنے کو ذمہ دار سمجھتے تھے اس لئے طلباء کی زندگیوں پر اُن کی نگاہ رہتی تھی!

پاکستان میں ایک ایسے نظامِ تعلیم کو بروئے کار لانے کی ضرورت ہے، جس کے اساتذہ صرف "معلم کتاب" ہی نہ ہوں بلکہ "معلم اخلاق" بھی ہوں، اُن کی اپنی زندگیاں بھی صاف ستھری ہونی چاہئیں کہ اُن کو دیکھ کر طلباء اچھے اثرات قبول کریں!

رسم الخط

تعلیمی کمیشن کے سوالنامہ کے ایک سوال میں "رومن رسم الخط" کا ذکر لا کر، ایک ایسے مسئلہ کو خواہ مخواہ چھیڑ دیا گیا ہے، جس کا تصور بھی اس سے پہلے ذہنوں اور دماغوں میں نہ تھا، "رومن رسم الخط" کے مسئلے نے بیٹھے بٹھائے عوام کے ذہن کو نہ صرف یہ کہ الجھا دیا ہے بلکہ سخت اذیت میں مبتلا کر دیا ہے، ملک میں پہلے ہی سے طرح طرح کے مسائل کی کوئی کمی نہ تھی کہ "رسم الخط" کے نام پر ایک اور شگوفہ چھوڑ دیا گیا۔

انگریز کے دور میں فوجی گوروں کی سہولت کے لئے "رومن رسم الخط" میں اردو ریڈریں مرتب ہوتی تھیں، یا پھر رومن کیتھولک پادریوں نے عیسائیت کی تبلیغ کے لئے "رومن رسم الخط" اختیار کیا تھا، ان کی یہ کوشش ہندوستان میں کامیاب نہ ہو سکی، عوام کے ذوق اور پسند کو دیکھتے ہوئے انہیں بھی آخرکار انجیل اربعہ اور دوسرے صحیفے اردو رسم الخط ہی میں چھاپنے پڑے، یہ بہرحال انگریز کے یہاں سے جانے کے بعد رومن رسم الخط کی بدعت بھی دفن ہو گئی، اب اس گڑی ہوئی لاش میں روح پھونکنے کا کسے درد اٹھا ہے؟

رومن رسم خط اردو زبان کے ساتھ دردناک مذاق ہی نہیں بلکہ ہولناک دشمنی ہے، اردو کے اس "قتل" کو کسی عنوان گوارا نہیں کیا جا سکتا! ہم اس قسم کی افواہوں کو درست نہیں سمجھتے کہ "رسم الخط" کے بارے میں پہلے سے کوئی فیصلہ کر لیا گیا ہے، تعلیمی مشن نے اس مسئلہ کو عوام کے سامنے رکھا ہے، اور پاکستان کے تقریباً ۹۹ فی صد عوام رومن رسم الخط کو پسند نہیں کرتے، اس لئے کوئی ہوشمند حکومت عوام کی پسند، مرضی اور متفقہ فیصلہ کو نظر انداز کرنے کی غلطی نہیں کر سکتی، ہم نے مانا کہ طاقت کے بل بوتے پر، چند بڑے آدمیوں کی سوچی ہوئی سکیم، قانون اور فیصلہ کو

نافذ کیا جاسکتا ہے، مگر اس کے عواقب و نتائج پر بھی تو نظر رہنی چاہیئے ....!!

"رومن رسم الخط" اختیار کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ہم قرآن سے، حدیث و فقہ سے اور دوسرے اسلامی علوم اور صدیوں کے تہذیبی سرمایہ سے کٹ کر رہ جائیں، کتنے بڑے دینی، قومی اور علمی نقصان کو کسی قیمت پر برداشت نہیں کیا جاسکتا، فنی اعتبار سے بھی رومن رسم الخط اردو کے مروجہ رسم الخط کے مقابلہ میں ناقص ہے، اور اگر ایسا نہ بھی ہوتا تو بھی محض "رسم الخط" کی فنی سہولتوں اور خوبیوں کی خاطر، ہم اپنی صدیوں کی تہذیب، تاریخ اور علوم سے انقطاع گوارا نہیں کرسکتے!

رومن رسم الخط، اُردو زبان کے حق میں "بیتسمہ" کا فرض انجام دے گا، جس کے صرف تصور سے، یک مسلمان شدید بیزاری اور نفرت محسوس کرتا ہے، قوم تو یہ آس لگائے بیٹھی تھی کہ اس نئے دور حکومت میں اردو کو اس کا جائز حق اور صحیح مقام مل سکے گا، اس "رومن رسم الخط" کے قضیہ نامرضیہ نے تو عوام کو ششدر و حیران کردیا!

ہم اس سلسلہ میں آخری بات یہ کہہ دینا چاہتے ہیں کہ پچھلے سیاست دانوں، حکمرانوں اور لیڈروں نے جتنی حماقتیں اور غلطیاں کی ہیں اور ان سب نے مل کر پاکستان کو، ملت کو اور اسلام کو جتنا نقصان پہنچایا ہے، اس سے کہیں زیادہ نقصان تنہا "رومن رسم الخط" کے ذریعے پہنچے گا!

حرفِ آخر پاکستان کے عوام کی خوشحالی اور فلاح و بہبود کی ہر کوشش ہر یک تحسین کی مستحق ہے، اس منزل میں ایک بڑھتا ہوا قدم بھی مبارک ہے اور ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں، پچھلے دور کی خرابیوں سے بھی ہم واقف ہیں اور نئے دور کی مشکلات پر بھی ہماری نظر ہے، اور یہ بھی درست ہے کہ تعمیر و اصلاح تدریج کے ساتھ ہوا کرتی ہیں۔ "کن فیکون" اللہ تعالیٰ کی صفت ہے کہ "چاہا اور ہوگیا" اور معجزے صرف انبیاء سے ظہور میں آیا کرتے ہیں ——— ہماری گزارش یہ ہے کہ اصلاح و ترمیم اور تعمیر و فلاح کی ہر اسکیم اور ہر پلان میں پاکستان کے مقصدِ وجود کو زیادہ سے زیادہ سمونے کی ضرورت ہے، پاکستان صرف "ویلفیر اسٹیٹ" نہیں بلکہ:-

"اسلامی ویلفیر اسٹیٹ"

بننے کے لئے وجود میں آیا ہے، اسی مقصد کے لئے ہم سب عوام و خواص کو جد و جہد کرنی ہے، یہی ہمارا پروگرام ہے، یہی ہماری منزل ہے اور یہی ملت کی تمناؤں کا مقصود ہے!

ماہر القادری ۲۵ فروری ۵۹ء

ضروری گزارش

خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر براہِ کرم ضرور درج فرمایئے، جو آپ کے پتہ کی چٹ پر درج ہوتا ہے ——— منیجر "فاران"

خلافت نمبر
شائع نہ ہو سکے گا

افسوس ہے کہ "خلافت نمبر" کی اشاعت روک دینی پڑی۔ جس کا ادارہ "فاران" کو بہت قلق ہے، اس خاص نمبر کے بعض ضروری مباحث کی اشاعت کے لئے فضا کو سازگار نہ سمجھا گیا۔ انسانوں کے ارادے ٹوٹتے رہتے ہیں، مشیتِ الٰہی ہی آخر کار غالب رہتی ہے۔

وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

جن حضرات نے "خلافت نمبر" کے محصول ڈاک کے لئے آٹھ آنہ روانہ فرمائے ہیں، اُن کی یہ رقم امانت ہے۔ "فاران" کا جب کوئی دوسرا "خاص نمبر" شائع ہوگا۔ یہ آٹھ آنے کی رقم، اُس کے محصول ڈاک میں کام آئے گی، جو خریدار — صاحبان اپنے سالانہ چندہ میں اس رقم کو وضع کرانا چاہتے ہوں، وہ بلا تکلف تحریر فرما دیں، ان کے چندے میں رقم وضع کردی جائے گی، جو صاحبان واپس منگانا چاہیں، انہیں ڈاک کے ٹکٹوں کی صورت میں یہ رقم (آٹھ آنے) واپس کردی جائے گی!

جو صاحبان صرف "خلافت نمبر" کے شوق میں فاران کے نئے خریدار بنے ہوں، اور وہ اس اعلان کے بعد خریدار رہنا نہ چاہتے ہوں، اُن کا زرِ چندہ (جتنے پرچے اب تک پہنچ چکے ہیں، اُن کی قیمت وضع کرکے) واپس کردیا جائے گا، منی آرڈر کی فیس "فاران" ادا کرے گا۔

جن حضرات کو انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی، اُن سے ہم معذرت خواہ ہیں!

"منیجر" فاران"

مُلّا محمد واحدی

ایمان و عمل

(مُلّا واحدی کی زیرِ ترتیب کتاب "حیات سرورِ کائنات" حصہ سوم کے چند اوراق)

ایک دفعہ مشرکین نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے مذاق اور چھیڑ کے طور پر کہا: "تمہارے پیغمبر صاحب تمہیں ہر بات کی تعلیم دیتے ہیں، حتیٰ کہ رفع حاجت کا طریقہ بھی بتاتے ہیں" حضرت سلمان رضی نے فرمایا۔ "ٹھیک ہے، حضور نے ہمیں ہدایت کی ہے کہ رفع حاجت کے لئے بیٹھو تو قبلہ رُخ مت بیٹھو۔ دائیں ہاتھ سے طہارت نہ کرو۔ کم از کم تین ڈھیلے لو۔ اور فرمایا ہے کہ ہڈی اور گوبر سے طہارت نہیں ہوتی"

کچھ خیال ہے، انسان کتنی عمر میں پاکی اور ناپاکی کا فرق سمجھتا ہے اور، کیسے کتنے سمجھانے سے سمجھتا ہے۔ ماں کو کس کی ماں نے سمجھایا تھا اور اس ماں کو اس کی ماں نے۔

سمجھانے کا یہ سلسلہ کہیں جا کر ٹھہرنا چاہئیے۔ آخر کوئی تو ہوگا جس نے پاکی اور ناپاکی کا فرق سب سے پہلے محسوس کیا، جیسے اللہ نے بردبار محسوس کرایا۔ نبی ہی ہے وہ پہلا شخص جس نے صرف پاکی اور ناپاکی کیا، انسان کو پوری انسانیت کے سبق یک یک کر کے پڑھانے شروع کئے نبیاء بتاریج یہ سبق نہ پڑھتے رہتے تو انسان رفع حاجت کے بعد جانوروں کی طرح اُٹھ کھڑے ہوا کرتے۔

پھولوں اور پھلوں اور جانوروں کی نسل میں خوبیاں بڑھانے کی تدبیریں تو ضرور سوچی جاتی ہیں لیکن انسانوں کو انسان بنانے کا کام انبیاء اور اُن کے حقیقی متبعین کے سوا کسی نے نہیں کیا۔

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم معلّمِ آخر اور خاتم نبوت ہیں۔ حضور کے ہاتھوں سے دین کی تکمیل کی گئی ہے۔ ہذا انسانی زندگی کا کوئی شعبہ اور ایمان و عمل کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو حضور سے چھُٹ گیا ہو۔ حضور نے وفات سے چند دن قبل اپنی وداعی تقریر میں ارشاد فرمایا کہ "میں تمہیں ایسے روشن راستے پر چھوڑے جاتا ہوں جس کی رات بھی دن جیسی ہے۔ قد ترکتم علی البیضاء لیلها کنهارها

قرآن و حدیث میں بلند اور متمدن اقوام ہی کے لئے نہیں، پست اور غیر متمدن قوموں کے لئے بھی تعلیمات و ہدایات ہیں۔ اللہ کے ساتھ تعلق ہو یا اللہ کے بندوں کے ساتھ۔ عقائد ہوں یا عبادات۔ آداب مدنیت ہوں یا خانگی قصے۔ حضور کی ہمہ گیر تعلیم سب پر حاوی ہے۔

حضور کی تعلیم کے دو حصے ہیں۔ ایک کا تعلق خالق سے ہے، دوسرے کا مخلوق سے۔ پھر خالق سے تعلق دو شقوں میں منقسم ہے عقیدہ اور عبادت۔ اور مخلوق سے تعلق بھی دو شقوں میں منقسم ہے۔ معاملہ اور اخلاق۔

عقیدے کی پختگی کا نام ایمان ہے، اور عبادت کا معاملہ اور اخلاق تینوں کی بجا آوری کا نام عمل یا عمل صالح ہے۔

عقیدے کا اثر عمل ہی پر نہیں چہرے تک پر پڑتا ہے۔ انسان کا چہرہ ظاہر کر دیتا ہے کہ دماغ میں کیا سمایا ہوا ہے۔ اور عمل تو قطعی عقیدے کے مطابق رہتا ہے۔ جادوگر جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ کرنے آئے تھے جب جان گئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نبی ہیں تو فرعون کا خوف نہیں موسیٰ ع کی پیروی سے نہ روک سکا اور انھوں نے صاف کہہ دیا کہ ہمیں چاہے کاٹ ڈالو ہم تو اب اللہ کے ہوچکے۔

قَالُوا لَنْ نُؤْثِرَكَ عَلَىٰ مَا جَاءَنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالَّذِي فَطَرَنَا فَاقْضِ مَا أَنتَ قَاضٍ إِنَّمَا تَقْضِي هَٰذِهِ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا

اِنَّا اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِیَغْفِرَ لَنَا خَطٰیٰنَا وَمَآ اَکْرَهْتَنَا عَلَیْهِ مِنَ السِّحْرِ وَاللّٰهُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی ۝ انھوں نے (فرعون سے) کہا کہ (اللہ کی قدرت کے واضح دلائل کے بعد جو ہمارے سامنے آئے ہیں ہم (تیری کوری) توں کی اساس (خالق و مالک) پر جس نے ہمیں پیدا کیا ہے اور تجھ کو ہرگز (ہرگز) ترجیح نہیں دیں گے۔ پس جو (بدسلوکی) تو ہمارے ساتھ کرنے والا ہے کر ڈال (ہمیں پرواہ نہیں) تو (جو کچھ کر سکتا ہے) اس دنیا کی (چند روزہ) زندگی میں کر سکتا ہے (اور) ہم اپنے (دونوں جہان کے) مالک پر ایمان لائے ہیں تاکہ وہ ہماری (اگلی پچھلی تمام) لغزشوں کو اور (بالخصوص اس حماقت)۔۔۔ جادوگری کو جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا تھا، معاف فرمائے۔ (اور ہمیں ابدی راحت دے) تیرا انعام بھی فانی ہے اور تیری ایذا دہی بھی فانی ہے (اور) اللہ کی (داد و دہش) تجھ سے بہتر ہے اور (اس کا عذاب و عقاب تیری ایذا دہی سے) بہت زیادہ (دیر) باقی رہنے والا ہے۔

خیر میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ انسان کا عمل عقیدے کے تابع ہوا کرتا ہے۔ عقیدہ بنیاد ہے۔ عمل عمارت۔

قرآن مجید نے جہاں جہاں عمل صالح کا نام لیا ہے وہاں ایمان کا پہلے ذکر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک عمل ناقابل قبول ہے اگر اس کے ساتھ ایمان شامل نہیں ہے، ایمان کے بغیر عمل حسنِ خلوص سے محروم رہتا ہے۔

غزوۂ بدر میں مسلمانوں کی تعداد کل تین سو تیرہ تھی۔ ایک بڑے بہادر شخص نے آکر حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے اپنی طرف سے لڑنے کی اجازت دیجئے۔ حضورؐ نے پوچھا تم مسلمان ہو۔ اُس نے جواب دیا۔ نہیں۔ حضورؐ نے فرمایا مجھے تمہاری مدد درکار نہیں۔ مسلمان اس کی بہادری کے خیال سے اُسے شریک کرنے کے متمنی تھے۔ مگر حضورؐ نے دو دفعہ اس کی درخواست نامنظور فرمائی۔ حضورؐ کی بے نیازی سے وہ حضورؐ کا گرویدہ ہو گیا اور ایمان لے آیا۔ غرضیکہ اللہ اور رسولؐ حسنِ خلوص کے بغیر معمولی عمل کیا جہاد جیسے عمل کو بھی قبول نہیں کرتے۔۔۔

اَلْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ　عمل کی کسوٹی نیت ہے۔ دو آدمی کسی اچھے کام میں چندہ دیں۔ ایک اللہ کی خوشنودی کے واسطے اور دوسرا نمائش اور ناموری کے واسطے۔ آپ اللہ کی خوشنودی کے خواہش مند کو نمائش و ناموری کے خواہش مند سے زیادہ خوش اور بشاش پائیں گا۔ اُس کے پاس اللہ کے ہاں سے رسید سی آجائے گی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی كَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَیْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا یَقْدِرُوْنَ عَلٰی شَیْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا　اے مسلمانو! اپنی خیراتوں کو احسان جتا کر اور اُلاہنے دے دے کر اس طرح رائیگاں مت کرو جس طرح وہ رائیگاں کرتا ہے کہ جو لوگوں کو دکھانے کی غرض سے اپنا مال خرچ کرتا ہے اور اللہ پر اور روزِ قیامت پر یقین نہیں رکھتا (کہ نیکیوں کی جزا دینے والا بھی کوئی ہے، اور نیکیوں کی جزا ملنے کا بھی کوئی دن مقرر ہے) اُس کی خیرات مثل اُس چٹان کے ہے جو بس اتنی مٹی سے ڈھکی ہوئی ہو کہ اس پر ذرا سا پانی برسا اور مٹی ڈھل کر پتھر رہ گیا جس پر اگر کچھ بویا جائے گا تو وہ اُگے گا نہیں۔　اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِیْ بَحْرٍ لُّجِّیٍّ یَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ اِذَآ اَخْرَجَ یَدَهٗ لَمْ یَكَدْ یَرٰىهَا ؕ وَمَنْ لَّمْ یَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ　——————— یا ان کاموں کی مثال ایسی ہے جیسے کسی گہرے سمندر میں سخت اندھیرا چھایا ہوا ہو، خود موج پر موج اُٹھ رہی ہو اور اس پر بادل گھر اُٹھا ہو (یعنی معمولی اندھیرا نہیں) اندھیروں پر اندھیرے ہوں کہ اس میں (انسان) ہاتھ نکالے تو ہاتھ سجھائی نہ دے۔ (یاد رکھو) جسے اللہ نے نور نہیں دیا اُس کے لئے نور ہے ہی نہیں۔　وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِیْعَةٍ یَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ؕ حَتّٰٓی اِذَا جَآءَهٗ لَمْ یَجِدْهُ شَیْــًٔا　——————— جنھوں نے اللہ کا انکار کیا اُن کے کام اُس سراب کے مانند ہیں جو میدان میں نظر آتا ہے، اور جس کو پیاسا سمجھتا ہے کہ پانی ہے۔ مگر جب اُس کے قریب پہنچتا ہے تو وہاں پانی نہیں ہوتا۔

قرآن و حدیث نے علم و عمل کو لازم و ملزوم قرار دیا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہمیں کسی جگہ سانپ کے ہونے کا علم ہو اور ہم وہاں بے دھڑک گھُسے چلے جائیں، علیٰ ہذا ہمیں علم ہو کہ فلاں کام کی جزا جنت ہے اور فلاں کام کی سزا جہنم۔ تو ہم جنت ہی میں جانے کے کام

کریں گے جہنم میں جانے کے کام نہیں کریں گے۔ اور اگر ایسا نہیں کرتے تو یہ ہمارے علم کا کچا پن اور قصور ہے۔ علم یقین کے مرتبے تک نہیں پہنچا ہے[1] علم کی بجائے صرف علم حاصل ہے۔

اسلام میں عمل کی بڑی اہمیت ہے۔ جس طرح عمل بغیر ایمان کے راکھ کا ڈھیر ہے جسے ہوا اڑا کر لے جاتی ہے۔ کَرَمَادٍ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيحُ فِي يَوْمٍ عَاصِفٍ (قرآن مجید) اسی طرح ایمان بغیر عمل کے متعلق ارشاد ہے۔ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ——— (اے مسلمانو!) کیا تمہیں گمان ہے کہ تم جنت میں (یوں ہی) داخل ہو جاؤ گے حالانکہ تم کو ابھی اُن لوگوں کے سے حالات پیش نہیں آئے جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ ...... (مسلمانو!) کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم (یونہی) چھوڑ دیئے جاؤ گے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے (ابھی) انہیں پرکھا ہے جنہوں نے تم میں سے جہاد کیا ہو۔

ایمان کے پانچ اصول سمجھے گئے ہیں۔ ۱۔ اللہ پر ایمان۔ ۲۔ رسولوں پر ایمان۔ ۳۔ فرشتوں پر ایمان۔ ۴۔ صحیفوں پر ایمان۔ ۵۔ آخرت اور جزا و سزا پر ایمان۔

اللہ پر ایمان

اللہ پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں کسی نے بنایا ہے ہم خود بخود نہیں بن گئے ہیں، ہر شے کسی نہ کسی کے بنانے سے بنتی ہے۔ وہ اللہ خالق ہی ہمارا ہے۔ اس کے سوا کوئی اور عبادت اور اطاعت کا مستحق نہیں ہے۔

ساری دنیا اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے پیدا کی ہے اور ہم کو اپنے لئے پیدا کیا ہے۔ جمادات، نباتات اور حیوانات کا مقصد تخلیق انسان کے کام آنا ہے۔ لکڑی چولہے میں سلگا دی یا لکڑی کا صندوق تیار کر لیا، لکڑی کا مقصد تخلیق پورا ہو گیا۔ انسان کا مقصد تخلیق جمادات نباتات اور حیوانات کے کام آنا نہیں ہے بلکہ اللہ کی عبادت و طاعت کرنا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ مَا خَلَقْتُ لَكُمْ وَاَنْتُمْ خُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَةِ...

اگر انسان کا مقصد تخلیق اللہ کی عبادت و اطاعت نہیں ہے تو انسان بے مقصد اور عبث مخلوق ہے۔ اشرف المخلوقات کا بے مقصد اور عبث ہونا عقل میں نہیں آتا۔ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ——— کیا تم خیال کرتے ہو کہ ہم نے تمہیں بے مقصد اور عبث پیدا کیا ہے۔ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ... جن و انس کو عبادت و اطاعت کے سوا کسی مقصد سے نہیں پیدا کیا گیا۔ اور تم کو مر کر ہمارے پاس نہیں آنا؟ (تمہارا مقصد پیدائش ہماری عبادت و اطاعت ہے)

۲۔ اللہ ایسا خالق ہے کہ اپنی ہر صناعی میں تو ہم اس کے بنائی ہوئی چیزوں کے محتاج ہیں مگر اسے اپنی صناعی میں کسی چیز کی احتیاج نہیں ہے۔ مکڑی کو جال بننا، اور شہد کی مکھی کو چھال لگانا بھی، اللہ نے سکھایا ہے اور انسان کو بھی صناعی کی قابلیت و قدرت اللہ نے عطا فرمائی ہے۔ مگر جن مصنوعات پر وردگار سے انسان صناعی کا کمال دکھاتا ہے اُن پر اللہ ہی کا قبضہ ہے۔ انسان ریت کے ذرے سے بم بنا سکتا ہے لیکن ریت کا ذرہ نہیں بنا سکتا۔ مادہ تولید کو پچکاری کے ذریعہ رحم میں پہنچا سکتا ہے لیکن مادہ تولید تیار نہیں کر سکتا۔

۳۔ اللہ ایک ہے۔ اللہ کو شریک و مددگار کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تنہا کل کائنات کا خالق اور مالک ہے۔ اس کی ملکیت حقیقی اور پکی ہے۔ ڈانواں ڈول اور چھن جانے والی نہیں ہے۔ بندوں میں سے جسے چاہتا ہے عزت، دولت اور حکومت بخش دیتا ہے۔ اور جس کو نااہل سمجھتا

---

[1] یہ الگ بات ہے کہ یقین کے مرتبے پر پہنچ کر بھی انسان پورا حق عبودیت ادا نہیں کر سکتا۔ یقین کے بھی مراتب ہیں۔ انبیاء کا یقین۔ صدیقین کا یقین، اولیاء کا یقین اور عوام کا یقین۔ حق عبودیت درجہ بدرجہ ہی ادا ہوتا ہے۔ انبیاء بھی دعویٰ نہیں کرتے کہ ہم نے حق عبودیت ادا کر دیا اور ہم عوام تو بہرحال عوام ہیں۔ گناہ سے ہم نہیں بچ سکتے، مگر یہاں میں کچھ اور بات کہہ رہا ہوں۔

جائے ان نعمتوں سے محروم کر دیتا ہے۔

شریعت کی تاسیس، حلال و حرام کی تعین، جائز و ناجائز کی تفریق، امر و نہی کے احکام یہ کام اللہ کے لئے مخصوص ہیں اور رسول ان احکام کے مبلّغ اور شارح ہوتے ہیں۔

عالم الغیب بھی صرف اللہ ہے۔ اللہ کے سوا کوئی عالم الغیب نہیں ہے۔ قرآن مجید میں ہے:۔ قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ .... (اے پیغمبر) کہہ دو کہ اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین میں کوئی غیب داں نہیں ہے۔

۴: اللہ ہماری ظاہر و پوشیدہ اور خلوت و جلوت کی تمام حرکات سے باخبر ہے۔ ہمارے عام اعضا کو بھی گناہوں سے پاک رہنا چاہیئے اور خاص اعضا دل و دماغ کو بھی نامناسب خواہشوں سے بچنا چاہیئے۔

۵: جسے اللہ نے اچھائی کہا ہے وہ اچھائی ہے اور جسے اللہ نے برائی کہا ہے وہ برائی ہے۔ ہمیں اچھائی کی طرف دوڑنا چاہیئے اور برائی سے بھاگنا چاہیئے، اس واسطے کہ اللہ کا حکم ہے۔

اللہ پر اور اللہ کی وحدانیت پر ایمان اسلام کا اصل الاصول ہے، تیرہ برس تک روزہ، زکوٰۃ اور حج فرض نہیں ہوئے لیکن نماز شروع ہی میں فرض کر دی گئی تھی۔ اللہ کے آگے سر فوراً ہی جھکا دیا گیا تھا اور پھر تیرہ برس مسلسل صرف اللہ کے آگے سروں کو جھکانے اور شرک شبہات شرک اور توہمات شرکیہ کے استیصال میں صرف کئے گئے۔ حتیٰ کہ نماز میں اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا کے ساتھ حبیب اللہ نہیں کہوایا، عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ کہلوایا۔ اور نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھنی لازمی کر دی، جس کی ایک آیت ہے۔ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۔ یعنی (اے پروردگار) ہم فقط تیرے ہی آگے سر جھکاتے ہیں اور فقط تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔

اللہ اور اللہ کی وحدانیت کا اقرار اتنا اہم معاملہ ہے کہ اللہ اور گناہوں کو تو اگر چاہے گا معاف کر دے گا لیکن اپنے انکار اور اپنی وحدانیت کے انکار کو معاف نہیں کرے گا۔ ارشاد ہے:۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ــــــــــــــــــــــــ اللہ شرک کو یقیناً معاف نہیں کرے گا اور شرک کے علاوہ جس کا جو گناہ چاہے گا معاف کر دے گا

سجدۂ تعظیمی اور سجدۂ محبت جائز رہ چکا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو اُن کے والدین نے سجدۂ محبت کیا تھا مگر شریعت آخر نے ان سجدوں سے منع فرما دیا تاکہ توحید خالص کی تکمیل ہو جائے۔

بخاری میں ایک روایت ہے کہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کسی نے عرض کیا "جو اللہ چاہے اور آپ چاہیں"۔ حضور نے کہا تم مجھے مشیت میں اللہ کا ہمسر اور مقابل بناتے ہو۔ کہو "جو اللہ تنہا چاہے"۔ مَا شَآءَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ "اللہ چاہے اور محمد چاہیں" کے درمیان اور کا لفظ استعمال کرنے سے حضور ہمیشہ روکا کرتے تھے، اور کی بجائے پھر کا لفظ کہنے کی ہدایت فرماتے تھے۔ اللہ چاہے، پھر محمد چاہیں۔

ایک دفعہ حضور کی موجودگی میں کوئی صحابی تقریر کر رہے تھے۔ اُن کی زبان سے نکلا کہ "جس نے اللہ اور رسول کی اطاعت کی اس نے ہدایت پائی، اور جس نے ان دونوں کی نافرمانی کی"۔ "ان دونوں" کا لفظ سننا تھا کہ حضور نے فرمایا۔ تقریر بند کرو، تم برے خطیب ہو۔

---

[1] عمل کیا تو جائے تو اللہ کے لئے مگر اس میں نمود و نمائش اور ریا کا شائبہ آجائے، یہ بھی ایک طرح کا شرک ہے، مسلمان کا ہر کام خالص اللہ کی خوشنودی کے لئے ہونا چاہیئے، کسی اور کی خوشنودی چاہی بھی جائے تو وہ اللہ کے لئے ہی چاہی جائے۔ یعنی اللہ کے حکم کے مطابق چاہی جائے

مثلاً پرندوں کی بولی سے فال لینا۔ پرندوں کے اڑنے سے فال لینا۔ ایسے توہمات کو حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے شیطانی باتیں فرمایا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ساتھ رسولؐ کی ذات کو شامل کرتے ہوئے "دونوں" کا لفظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند نہیں آیا۔ صحابی نے جس طرح "اللہ اور رسولؐ کی اطاعت" کہا تھا اسی طرح "اللہ اور رسولؐ کی نافرمانی" کہنا چاہیے تھا۔ حضورؐ نے اس نازک فرق کا احساس کیا اور اسے گوارا نہیں فرمایا۔

رسولوں پر ایمان

رسولوں پر ایمان یہ کہ وہ اللہ کی طرف سے مامور تھے۔ اللہ نے انہیں ہماری ہدایت و رہنمائی کے لئے مقرر کیا تھا۔ رسول اللہ تعالیٰ کی نشان دہی کرتے تھے۔ وہ ہمیں اللہ کے پیغام پہنچاتے تھے۔ نیز ہمارے سامنے اپنا نمونہ پیش فرماتے تھے۔ کہ اس طرح کی زندگی گزارو۔

انسانوں کو جو کچھ ملتا ہے اس کی بنیاد رسولوں نے ڈالی ہے۔ رسول نہ ہوتے تو ہم ایک بات بھی نہ جانتے اور جانوروں سے بدتر قسم کی زندگی بسر کرتے۔ انسانوں کو انسان رسولوں کے ذریعہ بنایا گیا ہے اور انسانی عقل کو نشوونما رسولوں کے ذریعہ دی گئی ہے۔

ہر قوم کو دعویٰ ہے کہ اللہ کے محبوب ہم ہی ہیں۔ ہدایت کی گئی ہے تو ہمیں کی گئی ہے۔ نبی اور پیغمبر آئے تو ہمارے ہاں آئے۔ باقی دنیا اس دولت سے محروم ہے۔ ہم تنہا وہ برگزیدہ اور منتخب لوگ ہیں جنہیں اللہ نے مخاطبت کا شرف بخشا اور مخاطب بنایا۔

بنی اسرائیل نبوت و پیغمبری اپنا ورثہ سمجھتے ہیں۔ ہندوؤں کے نزدیک پرمیشور کسی کی رہنمائی کرتا ہے تو فقط ان کی۔ اور کے کان میں پرمیشور کے الفاظ پہنچ جائیں تو اس کے کان بہرے کر دینے چاہئیں۔ زردشتیوں نے جوہر نورانی کا مصرف اپنے تئیں مستحق قرار دے لیا اور عیسائی تو خود خدا کے فرزند ہیں۔ لیکن قرآن کہتا ہے:- وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ہر قوم کے لئے ہادی بھیجے گئے۔ وَإِنْ مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس میں ہوشیار کرنے والا نہ بھیجا گیا ہو۔ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا إِلَىٰ قَوْمِهِمْ ——— (اے محمد) ہم نے تم سے پہلے کتنے ہی رسول ان کی اپنی اپنی قوم میں بھیجے۔

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت ربانی اور فیضانِ الٰہی کو عرب کے ساتھ مختص نہیں کیا، اور دین اسلام کو صرف اپنی چیز نہیں فرمایا۔ ارشاد کیا کہ جو پیغمبر آتا تھا دین اسلام ہی لے کر آتا تھا۔ تمام انبیاء ازلی صداقت اور ابدی سچائی ہی کی طرف بلاتے رہے۔ بخاری کی ایک حدیث ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام بھائی ہیں جن کا باپ ایک ہے اور مائیں مختلف ہیں۔ اور ان کا دین ایک ہے۔ اَلْاَنْبِيَاءُ اِخْوَةٌ لِعَلَّاتٍ اُمَّهَاتُهُمْ شَتّٰى وَدِيْنُهُمْ وَاحِدٌ

عیسائی دوسرے پیغمبروں کا انکار کرکے عیسائی رہ سکتا ہے۔ یہودی کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے علاوہ کسی پیغمبر کا ماننا لازمی نہیں ہے۔[1] زردشتی تمام دنیا کو بجز حضرت کے کافر کہہ کر زردشتی ہے اور ہندو تمام دنیا کو ملیچھ کہہ کر ہندو۔ لیکن مسلمان اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کی رسالتوں کا اقرار کرے گا۔ مسلمان کو یہ ایمان رکھنا پڑتا ہے کہ حضورؐ کی طرح اور نبی اور پیغمبر بھی آئے تھے جن میں سے کچھ کے نام بتا دیئے گئے ہیں، اور بہت سوں کے نام نہیں بتلائے گئے۔ نبی اور پیغمبر سب اللہ کی طرف سے بھیجے گئے تھے۔ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ہم ان میں سے کسی کے ساتھ تفریق نہیں برتتے۔ یعنی ایسا نہیں کرتے کہ کسی کو مانیں اور کسی کو نہ مانیں۔ بہت سے یہودی حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے لئے تیار تھے بشرطیکہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو نبیوں کی فہرست سے نکال دیا جاتا مگر یہ کیسے ممکن تھا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا

---

[1] چنانچہ عیسائی اور یہودی حضرت ہود علیہ السلام اور شعیب علیہ السلام کے وجود تک سے بے خبر ہیں اور یہودی حضرت داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام کے وجود کے تو مقر ہیں لیکن انہیں پیغمبر نہیں تسلیم کرتے۔

مُذبذبینؔ ـــــــــ جو لوگ اللہ اور اُس کے رسولوں کے منکر ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اُس کے رسولوں کے درمیان فرق کریں (یعنی اللہ کو مانیں اور رسولوں کو نہ مانیں) اور کہتے ہیں کہ ہم بعض (رسولوں) کو مانیں گے اور بعض (رسولوں کو) نہ مانیں گے اور چاہتے ہیں کہ اس معاملہ میں بیچ کا کوئی راستہ نکالیں، یہ لوگ یقیناً کافر ہیں، اور ہم نے کافروں کے واسطے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ یہ عقیدہ اسلام کی خصوصیت ہے اور اسلام کی فراخ حوصلگی کا ثبوت ہے۔ اسلام سکھاتا ہے کہ دنیا کی تمام قومیں یکساں ہیں۔ عرب کو عجم پر اور عجم کو عرب پر فوقیت نہیں ہے۔ گورے بھی اللہ کے ہیں اور کالے بھی اللہ کے ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا "لوگو! تم سب ایک باپ (آدم) کی اولاد ہو" (یعنی سب انسان باعتبار خلقت مساوی ہیں) امتیاز کی چیز بس ایک ہے۔ تقویٰ۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ

فرشتوں پر ایمان

فرشتوں پر ایمان یہ ہے کہ وہ بھی اللہ کی مخلوق ہیں۔ غیر مادّی اور سراپا مُطیع و فرمانبردار۔ اُن کے بہت سے فرائض ہیں۔ اللہ اور اُس کے رسولوں کے درمیان سفارت کرنا۔ مادّیت اور روحانیت کے درمیان واسطہ بننا اور کائنات کو قانونِ الٰہی کے مطابق چلانا[1]۔

فرشتے ہمیں نظر نہیں آتے۔ لیکن ہم انہیں نظر آتے ہیں۔ ہمارے اعمالنامے وہی تیار کرتے ہیں جو روزِ جزا ہم کو دکھائے جائیں گے۔ کسی چیز کے نظر نہ آنے سے اُس کے وجود میں شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہم نے لندن، نیویارک اور ماسکو کہاں دیکھا ہے۔ مگر ہم اُن کے وجود کا یقین رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ دیکھنے والوں نے بتایا ہے کہ یہ آجکل کے بڑے پُر رونق اور اہم شہر ہیں۔ فرشتوں کی خبر اللہ اور رسولوں نے دی ہے۔ یہودی اُنہیں خداوند کا خطاب دیتے ہیں اور پارسیوں نے اُنہیں قابلِ پرستش مان لیا ہے۔ ہندوؤں نے دیوی اور دیوتا۔ اسلام کہتا ہے کہ وہ معبود ہرگز نہیں ہیں البتہ ایک دفعہ اُن سے آدم کو سجدہ ضرور کرایا گیا تھا۔

صحیفوں پر ایمان

صحیفوں پر ایمان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ رسولوں کے ذریعہ دنیا کو جو سبق پڑھاتا رہا کتابوں اور صحیفوں میں اُنہیں محفوظ رکھا جاتا تاکہ اگلی نسلیں اور دور دراز کے لوگ اُن سے فائدہ اُٹھائیں تمام صحیفوں پر ایمان لانا اُسی طرح ضروری ہے جس طرح تمام پیغمبروں پر ایمان لانا ـــ پیغمبروں کی تکذیب کی طرح صحیفوں کے وجود کا انکار بھی کفر ہے[2]۔

---

[1] جس طرح اللہ کی پھونکی ہوئی روح ہمیں متحرک رکھتی ہے۔ اسی طرح فرشتے جو غیر مادّی مخلوق یعنی ارواح ہیں، کائنات کو متحرک رکھتے ہیں۔ ہم چونکہ کسی قدر با اختیار بنائے گئے ہیں، ہماری حرکتوں میں اختلاف اور تضاد ہو جاتا ہے۔ فرشتے مطلق بے اختیار ہیں۔ اس لئے باقی کائنات کی حرکات یک رنگ و یکساں ہیں۔ ہمارے سوا کائنات کی کوئی شے اللہ کا قانون نہیں توڑتی اور اللہ کی مرضی کے خلاف نہیں جاتی

[2] جن پیغمبروں اور صحیفوں کے نام بتا دیئے گئے ہیں ہم اُن کے برابر رام چندر جی، کرشن جی، بدھ مہاراج اور زردشت وغیرہ کی پیغمبری اور ہندوؤں کی کتاب وید اور پارسیوں کی کتاب اوستا کے کتاب اللہ ہونے کی تصدیق نہیں کر سکتے۔ لیکن ان سب سے حسنِ ظن رکھ سکتے ہیں اور اتنا تو قطعی کہہ سکتے ہیں کہ اگر یہ نبی تھے تو انھوں نے اپنے پیروؤں سے یہ کبھی نہیں فرمایا ہو گا کہ ہمیں ہمارے درجے سے بڑھا دو ـــ
مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَہُ اللّٰہُ الْکِتٰبَ وَالْحُکْمَ وَالنُّبُوَّۃَ ثُمَّ یَقُوْلَ لِلنَّاسِ کُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ ـــــــ
کوئی شخص (ایسا) نہیں کر سکتا کہ اللہ (تو) اُسے کتاب اور حکمت اور نبوت عنایت کرے اور وہ لوگوں کو سبق دے کہ اللہ کی بجائے میرے بندے بن جاؤ۔ وید اور اوستا میں جو باتیں صحیح ہیں وہ ممکن ہے اللہ ہی کی باتیں ہوں اور جو صحیح نہیں ہیں انہیں ممکن ہے انسانوں نے بدل دیا ہو۔

اللہ کا آخری سبق قرآن ہے۔ بعض صحیفے پہلے سے منسوخ تھے اُن کے نام صحیفہ ابراہیمؑ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور جو صحیفے موجود تھے یعنی توریت زبور اور انجیل نزول قرآن کے بعد وہ بھی منسوخ کر دیئے گئے۔ آفتاب کے سامنے چراغوں کی روشنی کی ضرورت نہیں تھی۔ خصوصاً جب کہ چراغوں نے تحریف کی وجہ سے اپنی روشنی کھو دی ہو۔ تاہم اس امر کا اقرار لازم ہے کہ چراغ کبھی چراغ تھے اور اللہ کے چراغ تھے۔

قرآن پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ جس جس بات کا اس میں حکم ہے اور جس جس بات کی اس میں ممانعت ہے اس کی تعمیل کروں گا اور قرآن کے ہر بیان کو صحیح تسلیم کروں گا۔

آخرت اور جزا و سزا پر ایمان

آخرت اور جزا و سزا پر ایمان یہ ہے کہ مر کر ہمارا قصہ ختم نہیں ہو جائے گا۔ جسم مرتا ہے روح نہیں مرتی۔ ہم اچھے کام کر کے جیں میں تو اچھے کاموں کی ہمیں جزا ملے گی، اور بُرے کام کر کے چلیں ہیں تو بُرے کاموں کی ہمیں سزا ملے گی، اور پھر ہم مستقل زندگی پائیں گے۔ اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَھِیَ الْحَیَوَانُ ... دار الآخرت کی زندگی) اصلی زندگی ہے۔

دنیا جس طرح آباد کی گئی ہے ایک دن اُسی طرح اجاڑی جائے گی اور دوسرے عالم میں اللہ کے حضور ہماری پیشی ہوگی۔ ہمارے اعمال نامے ہمیں دکھلائے جائیں گے۔ جمادات، نباتات، حیوانات اور انسان، جن جن سے ہمیں سابقہ پڑا ہے سب موافق اور مخالف گواہیاں دیں گے۔ حتیٰ کہ اپنے ہاتھ پاؤں اور تمام اعضا کہیں گے کہ ہم سے اللہ کی مرضی کے مطابق کام لیا گیا تھا یا اللہ کی مرضی کے خلاف کام لیا گیا تھا۔

حیات آخرت اور جزا و سزا کا یقین بڑی اہم چیز ہے۔ اس کے بغیر صحیفوں، فرشتوں اور رسولوں پر ایمان رکھنے کے کچھ معنی نہیں، بلکہ اللہ پر ایمان رکھنا بھی بے معنی ہے اگر اللہ کے پاس واپس جانے کا یقین نہیں ہے۔ ایمان اور عمل صالح کی بنیاد یہی حیات آخرت اور جزا و سزا کا یقین ہے۔

اہل شرک کی عقل میں کوئی بات نہیں بیٹھتی تو وہ توحید کے بعد حیات آخرت ہی ہے[1]۔ یہ دو چیزیں سمجھ میں آجائیں تو پھر صحیفوں، فرشتوں اور رسولوں کا ماننا دشوار نہیں ہے۔

حیات آخرت کو دو دوروں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک دور موت سے قیامت تک کا دور دوسرا دور قیامت سے تا ابد۔ پہلے دور کو برزخ کہتے ہیں اور دوسرے دور کو بعث۔ برزخ کے معنی ہیں حاجب۔ حائل۔ پردہ۔ گویا دنیا اور روز قیامت کے درمیان حاجب، حائل پردہ۔ بعث کے معنی ہیں۔ جی اٹھنا، اکٹھا کیا جانا، کھڑا ہونا۔

فرداً فرداً ہر شخص کے معاملات عالم برزخ میں شروع ہو جاتے ہیں لیکن جب پوری دنیا کا خاتمہ کر دیا جائے گا تو پھر بڑے حساب کا وقت آئے گا۔

راحت و اذیت دنیا میں بھی ملتی ہے، مگر جسم کے واسطے سے، برزخ میں روح براہ راست راحت اور اذیت پائے گی۔ اور جسم متاثر ہوگا تو روح کے واسطے سے ہوگا۔ قیامت کے بعد جسم اور روح دونوں راحت اور اذیت کا مزا الگ الگ اٹھائیں گے۔ سَنُعَذِّبُھُمْ مَّرَّتَیْنِ ثُمَّ یُرَدُّوْنَ اِلٰی عَذَابٍ عَظِیْمٍ ——— ترجمہ ہم انہیں دو مرتبہ (تو دنیا اور قبر یا برزخ میں) اذیتیں دیں گے (اور) پھر قیامت

[1] بعض اہل کتاب کا عقیدہ ہے کہ جزا و سزا زیادہ تر دنیا ہی میں مل جاتی ہے لیکن دنیا میں تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کتنے سیہ کار چین کی بنسری بجاتے ہیں اور نیکو کار تکلیفیں جھیلتے ہیں۔ پھر دنیا جزا و سزا کی اصل جگہ کیونکر ہوئی۔ [2] مٹی کا گڑھا برزخ کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ کوئی دریا میں ڈوب جائے اور مچھلیوں کی غذا بن جائے۔ یا کسی کو درندے کھا لیں۔ یا کسی کو جلا ڈالا جائے تو راکھ دریا میں بہا دی جائے برزخ سے سابقہ بہر صورت پڑے گا اور برزخ کے دور سے ہر شخص گزرے گا مرنے کے بعد انسان جہاں ہے وہی اس کی قبر ہے۔

میں) وہ سخت عذاب کی طرف پہنچائے جائیں گے۔

برزخ کی راحت واذیت خواب کی سی راحت واذیت کے مشابہ ہوگی اور قیامت کے بعد کی راحت واذیت ایسی ہوگی جیسی جاگتے میں ہوتی ہے پسندیدہ روحوں کے پاس موت ہی کے وقت پیغام پہنچتا ہے یا ایتہا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی اے (وہ) روح کہ جس نے (اپنے پروردگار کی یاد اور اطاعت میں) تسکین پائی ہے (آ) تو اپنے رب کے (سایۂ رحمت) کی طرف چل آ۔ اس شان سے کہ تو اس سے راضی (اور) وہ تجھ سے خوش (اور) پھر میرے (خاص) بندوں میں چل۔ میری جنت میں داخل ہوجا۔

اور ناپسندیدہ روحوں کے متعلق ارشاد ہے۔ ان الذین کذبوا بایتنا واستکبروا عنہا لا تفتح لہم ابواب السماء ولا یدخلون الجنۃ حتی یلج الجمل فی سم الخیاط ...... بے شک جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا ہے اور ان سے (روگردانی و) سرکشی کی ہے تو ان کے لئے نہ آسمان (رحمت) کے دروازے کھولے جائیں گے اور نہ وہ کبھی جنت میں داخل ہوسکیں گے جب تک کہ اونٹ (نہ) سوئی کے ناکے میں سے نہ گزرے (اور اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے گزرنا محال ہے)

جس طرح افراد مرتے ہیں یا قومیں مرتی ہیں[1] اور کوئی اس حقیقت کا انکار نہیں کرتا اسی طرح دنیا کی پوری بساط کے لپٹنے کا بھی اب سب کو اقرار ہے۔ حقیقت اہل مذہب میں محدود نہیں رہی ہے۔ اہل سائنس نے بھی مان لیا ہے کہ آفتاب کی گرمی کم ہوتی جاتی ہے اور ایک دن نظام عالم کا یہ انجن گرمی بالکل کھودے گا اور نظام درہم برہم ہوجائے گا۔ نیز سیارے روز بروز کھنچے چلے آتے ہیں اور ایک دن آپس میں ٹکرانے والے ہیں اور ٹکرا کر مٹنے والے ہیں۔ اسلام نے اسی دن کو یوم البعث (مردوں کے کھڑا ہونے کا دن) یوم معلوم معلوم دن یا مقررہ دن الیوم الموعود موعودہ دن۔ یوم عسیر سخت دن۔ یوم الآزفۃ قریبی مصیبت کا دن یوم لا ریب فیہ وہ دن جس کے واقع ہونے میں شبہ نہیں ہے۔ وغیرہ وغیرہ کہا ہے۔ اور اس دن کا بہت ہولناک نقشہ کھینچا ہے۔ یوم یعض الظالم علی یدیہ جس دن گنہگار اپنے ہاتھوں کو (اپنے دانتوں سے) کاٹے گا۔ ویوم تشقق السماء ..... اور جس دن آسمان پھٹے گا۔ یوم یفر المرء

---

[1] جی ہاں قومیں بھی مرا کرتی ہیں اور کوئی باخبر اس حقیقت کا منکر نہیں ہے۔ بابلی، اسیری، کالدی اب کہاں ہیں۔ یونانی اور رومی جو کبھی دنیا کے تنہا مالک تھے کیا وہ یہی آج کل کے یونانی و رومی ہیں۔ نارمن جیسے فاتح کیا ہوئے۔ مجوس جو صدیوں رومیوں سے برسرپیکار رہے ان کی تعداد کتنی باقی ہے۔ الم یاتکم نبؤا الذین من قبلکم قوم نوح وعاد وثمود والذین من بعدہم لا یعلمہم الا اللہ ...... کیا تمہیں ان لوگوں کے حالات و واقعات کی اطلاع نہیں پہنچی جو تم سے قبل (گزر چکے) ہیں۔ (مثلاً) قوم نوح و عاد و ثمود (عاد و ثمود ایک زمانہ میں چھائے ہوئے تھے) اور ان لوگوں کی جو ان کے بعد گزرے ہیں، ان (کے تفصیلی حالات) کو اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔

قومیں جب ان قوانین ہی کی جن کا قوموں کی عظمت وبقا سے تعلق ہے، خلاف ورزی کرتی ہیں تو مر جاتی ہیں اور نیا منسیا ہوجاتی ہیں دور کیوں جائیے۔ ہندوستان کے قدیم مالکوں (گونڈ بھیل وغیرہ) اور ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کی اولاد کو دیکھ لیجئے۔ قوموں کا مرنا یہی ہے کہ ان کا حال گونڈوں اور بھیلوں جیسا اور تغلقوں اور خلجیوں اور مغلوں جیسا ہوجائے۔ تغلقوں اور خلجیوں اور مغلوں کی اولاد کہیں موجود بھی ہے تو اسے کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ یاد ہوگا کس طرح ڈھول بجاتے تھے یا تغلقوں کی اولاد کے متعلق مشہور ہے کہ گھاس کھودتے ہیں اور دلی کی شہر پناہ کے باہر اسے بیچ جاتے ہیں۔ شہر میں مارے غیرت کے نہیں گھستے۔ تغلق آباد کے کھنڈرات میں رہتے ہیں۔ جس طرح قوموں کی تاریخ سے بے خبر عوام صرف افراد کا مرنا جانتے ہیں۔ قوموں کا مرنا نہیں جانتے اسی طرح جنکے سامنے پیدائش دنیا کی تاریخ نہیں ہے وہ دنیا کے فنا ہونے کا ذکر حیرت و تعجب سے سنتے ہیں ورنہ فنا ہونے کے بعد جی اٹھنے پر تو تعجب کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ قال من یحی العظام وہی رمیم قل یحییہا الذی انشاہا اول مرۃ کہتا ہے ان گلی سڑی ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا کہہ دو کہ وہی جس نے پہلی بار پیدا کیا تھا۔ کیسا مختصر اور مکمل جواب ہے

مِنْ اَخِيْهِ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ .... جس دن انسان اپنے بھائی، ماں، باپ اور بیوی اور بیٹوں (کی پرواہ نہیں کرے گا ان) سے کترائے گا) اور بھاگے گا۔ يَوْمَ لَا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا جس دن کوئی کسی دوسرے کے ذرہ برابر کام نہ آسکے گا
اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا (جب پوری زمین انتہا درجہ ہلا دی جائے گی، اور (جب زیر و زبر ہو کر) زمین اپنے (اندر کا سب) بوجھ (باہر) باہر نکال پھینکے گی اور انسان کہے گا کہ زمین کو کیا ہو گیا۔ اس دن (زمین) اپنے اوپر بسنے والوں کے نیک و بد اعمال واقعات بیان کرے گی۔ اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ ...... جب آسمان پھٹ جائے گا اور جب ستارے جھڑ پڑیں گے اور جب سمندر ابل پڑیں گے اور ایک دوسرے سے مل جائیں گے اور جب قبروں کے مُردے زندہ کئے جائیں گے (تب) ہر شخص کو پتہ لگے گا کہ کیا (عمل) تھا جو اس نے آگے بھیج دیا تھا اور کیا (عمل) تھا جسے (کئے بغیر) وہ پیچھے چھوڑ آیا۔ يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ....
.... جس دن آسمان پگھلے ہوئے تانبے کی شکل ہو جائے گا اور جب پہاڑ روئی کے گالوں کی مانند اڑیں گے۔ فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ وَخَسَفَ الْقَمَرُ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ .... جب آنکھیں پتھرا جائیں گی اور چاند گہنا جائے گا اور چاند سورج اکٹھے کر دیے جائیں گے يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ .. .. اس دن (اس کفر پرست) انسان (کو پتہ چلے گا کہ قیامت کیا چیز ہے۔ اس دن گھبرا گھبرا کر) کہے گا کہ ہائے کہاں جاؤں) کدھر بھاگوں کہتا پھرے گا۔

غرض اس قسم کی بہت سی آیتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت موجودہ نظامِ عالم کے خاتمے اور نئی زمین اور نیا آسمان بننے کا نام ہے اور انسان کی عاجزی و بے کسی اور اللہ کی قدرت اور جلالت میں ذرہ برابر شک نہ رہنے کو قیامت کہتے ہیں۔ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ .... جس دن زمین دوسری زمین سے بدل جائے گی اور آسمان بھی (بدل جائیں گے) اور سب اس ایک سب پر قابو رکھنے والے اللہ کے سامنے نکل (نکل) کر آئیں گے۔ اور (جس طرح اس دنیا میں افراد اپنے قصوروں پر نادم اور پریشان ہوتے ہیں اور خمیازہ بھگتتے ہیں اسی طرح قیامت کے دن سب انسان بیک وقت اپنے عمر بھر کے قصوروں پر نادم و پریشان ہوں گے اور خمیازہ بھگتیں گے)
بلکہ دنیا میں تو بے غیرت افراد اور ڈھیٹ قوموں کی ندامت نہیں بھی ہوتی اور خمیازہ بھگتتے وقت ان کا خیال اپنے قصوروں کی طرف نہیں جاتا لیکن قیامت کے دن یہ بات نہیں رہے گی۔ احساس بے حد بڑھ جائے گا۔

ایمان کی بابت اس مختصر مضمون میں کافی لکھ دیا گیا۔ ویسے تو ایمان پر پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے مگر ایمان کے صرف اصولوں کی تشریح کرنی تھی اب میں عمل صالح کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔
عمل صالح کہتے ہیں اس عمل کو جو اللہ کے احکام اور قوانین کے مطابق خالص اللہ کی خوشنودی کے لئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی پیروی میں کیا جائے ؎

بمصطفٰی برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است

۱؎ اس دن ندا آئے گی لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ آج کس کی بادشاہی ہے؟ (آج صرف) ایک سب پر غالب آنے والے اللہ کی (بادشاہی ہے) نئی زمین ہو گی اور نیا آسمان ہو گا۔ ممکن ہے اس نئے عالم میں نئے علل و اسباب ہوں نئے قوانین فطرت ہوں۔ بالکل نئی قسم کی زندگی ہو۔ نئی قسم کی آگ ہو۔ نئی قسم کے باغ ہوں۔ نئی قسم کے پھل ہوں اور نئی خصوصیات کے جسم ہوں۔ اس عالم پر اُس عالم کو ہرگز قیاس نہ کرو۔ دونوں عالموں کا الگ الگ شعور کیا جائے گا۔ تب حقیقت سمجھ میں آئے گی۔

نماز، زکوٰۃ، روزہ، اور حج ایسے عمل ہیں جن سے مسلمان پہچانا جاتا ہے اور جن کا پابند بننے سے باقی اچھے عمل کو کرنے، اور برے اعمال کو چھوڑنے کی توفیق ملتی ہے۔ نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج چاروں کا نام کلمۂ توحید کے بعد ساتھ لیا جاتا ہے۔ کلمہ توحید بھی رکن اسلام ہے اور نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج بھی رکن اسلام ہیں۔ اوپر آپ پڑھ کر آئے ہیں کہ اللہ کے ہاں ایمان کے بغیر بڑے سے اچھے عمل کی کوئی قیمت نہیں ہے، اسی طرح نماز، زکوٰۃ روزہ اور حج کے بغیر دوسرے "اعمال خیر" چھوٹے رہتے ہیں، دوسرے اعمال خیر صحیح ڈگر پر پڑتے جب ہیں جب ارکان اسلام کی منزل طے کر لی جاتی ہے۔ جو لوگ اپنے دوسرے اعمال پر قابو پاتے نہیں دکھائی دیتے، وہ اگر نماز، روزہ، زکوٰۃ، اور حج کے پابند ہیں بھی تو بس رسماً پابند ہیں حقیقتاً پابند نہیں ہیں۔ نماز وہ ہونی چاہیئے جس کی صفت اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی ہے۔ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡھٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡکَرِ نماز خواہش اور ممنوعات سے باز رکھتی ہے۔ علیٰ ہٰذا زکوٰۃ کی ادائیگی میں انکم ٹیکس بچانے کی سی ذہنیت، روزے میں فقط فاقہ اور حج میں سونا وغیرہ چھپا کر لانے کا خیال ہو تو اس کے معنی ارکان کی بجا آوری کے نہیں ہیں، انہیں بدنام کرنے کے ہیں۔

ارکان کے بعد نمبر جہاد کا ہے۔ جہاد ارکان اسلام میں شامل نہیں ہے۔ لیکن ارکان سے مشابہ ہے۔ میں جہاد پر "حیات سرور کائنات" حصہ دوم میں مستقل مضمون لکھ چکا ہوں، "حیات سرور کائنات" حصہ سوم میں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج پر الگ الگ مضامین لکھوں گا اس مضمون میں مجھے اُن اعمال کی طرف توجہ دلانی ہے جن کا تعلق اللہ کے بندوں سے ہے۔ جنہیں معاملات اور حقوق العباد کہا جاتا ہے اور جنہیں، بندے ہی معاف کر سکتے ہیں، اللہ معاف نہیں کرتا۔

حقوق اللہ کی تعمیل اگر ہمارے مسلمان ہونے کی نشانی ہے تو حقوق العباد وہ اہم شے ہیں جن سے بے پرواہی دیکھ کر حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلّم بے پروہ مسلمانوں سے عموماً فرمایا کرتے تھے کہ تم نے اپنے تئیں نہیں بدلا تو ہم تمہیں اپنوں میں نہیں شمار کریں گے۔ (او کما قال) مسلمانوں کے معاملات ہی تھے جنھوں نے کبھی ساری دنیا کو مسلمانوں کا گرویدہ کر دیا تھا اور جن کی وجہ سے ساری دنیا میں اسلام کا ڈنکہ بجنے لگا تھا۔

معاملات یا حقوق العباد ایک ایک کر کے نہیں گنائے جا سکتے۔ ان پر جو کچھ لکھوں گا مضمون کے تناسب سے لکھوں گا مشتے نمونہ از خروار بہ الفاظ میجر جنرل اکبر خاں، مصنّف حدیث دفاع "اسلام حیات انسانی کی پوری کائنات کا احاطہ کرنے آیا تھا" اکل و شرب نشست و برخاست، بات چیت، لین دین، جائز و ناجائز۔ حرام و حلال۔ غرض تمدن و معاشرت اور اخلاق و معاملات سے لے کر عبادات تک ہر کام میں اسلام انسان کو معراج کمال پر پہنچانا چاہتا ہے اور انسان کی فطرت کو اعتدال کے سانچے میں ڈھال کر فضائل و محامد کا ایسا رنگ چڑھانا چاہتا ہے کہ مرضی الٰہی ہر تار و پود میں جاری و ساری ہو جائے اور اس کا وجود اور اس کے وجود کی ساری دل چسپیاں اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کی اطاعت کے واسطے وقف ہو جائیں۔

دوسرے الفاظ میں اسلامی تعلیم کے مقاصد یہ ہیں:۔

۱:۔ آدمی حیوان سے انسان بنے۔

۲:۔ انسان سے با اخلاق انسان بنے۔

۳:۔ با اخلاق انسان سے با خدا انسان بنے۔

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب کیمیائے سعادت میں لکھا ہے کہ:۔

"سعادت کی کیمیا اللہ تعالیٰ کے خزانے کے سوا کہیں سے نہیں مل سکتی ہے۔ اِدھر اُدھر ڈھونڈے گا تو دھوکا کھائے گا"

اسلام کے چار ستون ہیں:۔ ۱:۔ عبادت۔ ۲:۔ اللہ کے بندوں کے ساتھ معاملہ۔ ۳:۔ گمراہ کرنے والی اور نفس کو بگاڑنے والی،

باتوں، مثلاً خود بینی، غرور، غصہ، حسد، بخل وغیرہ سے بچنا۔ ۴:۔ نفس کو اُجالنے والے اوصاف، مثلاً محبت، اُمید، توکل، صبر اور شکر وغیرہ کا اختیار کرنا۔

پہلے، تیسرے اور چوتھے ستونوں کے آثار ابھی کسی نہ کسی قدر موجود ہیں۔ لیکن نمبر دو، معاملات کا ستون مٹی میں دب گیا ہے اور اسکا تین شکستہ اور ٹیڑھے سیدھے ستونوں پر گزارہ کیا گیا ہے۔ شکستہ ستونوں کی مرمت کردی جائے، تب بھی دبے ہوئے ستون کو نکالے بغیر اسلام سربلند نہیں ہو سکتا۔ جب معاملات کا ستون ہی غائب ہے تو گمراہ کرنے والی اور نفس کو بگاڑنے والی باتوں سے بچنے اور اچھے اوصاف و اخلاق اختیار کرنے کے کیا معنی ہیں؟ اور بلیک، رکٹ اور اسمگلنگ قسم کے جرائم کرنے کے بعد لَکَ الشُّکْرُ لَبَّیْکَ کہنے سے اللہ کی خوشنودی کیوں کر حاصل کی جا سکتی ہے

امام غزالیؒ نے معاملات کے متعلق بڑا مواد جمع کیا ہے۔ میں اُسی مواد کے ایک حصے کا نچوڑ ناظرین کی نذر کرنا چاہتا ہوں۔

معاملات میں یوں تو اکل و شرب، نشست و برخاست اور بات چیت جیسی چیزیں تک شامل ہیں۔ مثلاً دوسرا شخص عمر، علم، عمل اور تقویٰ میں فائق ہو تو اُسے کھانا شروع کرنے دیا جائے اور دوسرا فائق نہ ہو تو تکلف برت کر لوگوں کو انتظار نہ کرایا جائے۔ کھانا کھاتے میں فضول گوئی، بیہودگی ہے۔ کھانا تمیز سے کھانا چاہیے تاکہ دوسرا تمہارے ساتھ کھانا بار نہ سمجھے۔ "کھایئے۔ کھایئے" کہلوانا بھی اچھی بات نہیں ہے اور کم خوری کا مظاہرہ کرنے کے لئے عادت سے کم کھانا ریا اور گناہ ہے۔ کم کھانا یا تمیز سے کھانا مجلس کے ساتھ مخصوص نہ رکھا جائے۔ تنہائی میں اس کی عادت ڈالنی چاہیے۔ کھاتے وقت نگاہ نیچی رہے۔ دوسروں کو تکنا بُرا ہے۔ مجلس میں بزرگ ترین شخص کا ہاتھ جب کھانے سے رُکے تو تم بھی ہاتھ روک لو۔ اُس سے پہلے مت روکو۔ کم خور انسان سُست رفتاری سے کھائے تاکہ سب کا ساتھ نباہ سکے۔ لقمہ دانت سے کاٹ کر آدھا کھا لینا اور آدھا لگاون میں ڈال دینا قطعی منع ہے۔ کسی مکروہ اور نفرت انگیز شے کا تذکرہ دسترخوان پر نہ آنا چاہیے۔ طشت یا چلمچی میں ہاتھ دھوئے جائیں اور کُلّی اس طرح کی جائے کہ لوگ دیکھ نہ سکیں۔ اوّل تو بڑے بوڑھوں اور واجب التعظیم حضرات کو ہاتھ دھو لینے دیئے جائیں۔ حاضرین جس سے پہل کرنے کو کہیں وہ انکار و اصرار میں وقت نہ کھوئے۔ کھانے کے اوقات میں کسی کے ہاں نہیں جانا چاہیے۔ بن بلائے ایسے شخص کا مہمان بننا جس سے غیر معمولی تعلق نہ ہو نیچ ہے۔ دوستوں کو کھلانا بڑی خوبی ہے۔ ماں باپ کے کھلانے کا حساب لیا جائے گا، دوستوں کے کھلانے کا حساب نہیں لیا جائے گا۔ کھانا کھلانے والا کھانے والے کا احسان مانے، مگر کھانے والا کھلانے والے پر احسان نہ خیال کرے۔ مہمان میزبان کو انتظار نہ کرائیں وغیرہ وغیرہ۔

یہ مجلس میں بیٹھ کر کھانا کھانے کے سب نہیں چند آداب ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے ہمیں کیسے کیسے سبق پڑھا دیئے ہیں۔ جن آداب طعام کی تنہائی اور مجلس دونوں جگہ پابندی ضروری ہے وہ میں نے قطعی بیان نہیں کئے۔ اُن کے بیان کا موقع نہیں ہے۔ بے حل چیز کی حرمت آنا چاہیے۔

روزی کمانے کے بارے میں اسلام کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ روزی اس طرح کماؤ اور اتنی کہ دوسروں کا پیٹ نہ کٹے اور دوسروں کی روزی کا خون نہ ہو۔ ویسے روزی کمانا بے حد مستحسن فعل ہے۔ ایک دن، بعد نماز فجر حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحاب کرامؓ مسجد میں تشریف فرما تھے۔ کوئی نوجوان سامنے سے گزرا۔ اور کسی دکان میں گھس گیا۔ صحابہ نے کہا۔ کیسا آدمی ہے۔ یہاں نہیں آیا۔ حضورؐ کے فیض صحبت سے محروم رہا جارہا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا: خبردار! یہ دکان میں اگر اس نیت سے داخل ہوا ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنے متعلقین کو لوگوں کی خیرات سے بے نیاز رکھے تو اسے نیکی اور اللہ کے حکم کی تعمیل سمجھو۔ جو شخص حلال روزی کمائے اور غیر اللہ کا محتاج نہ ہو اور پھر اچھی کمائی ہمسایوں

لہ اخلاق پر بھی الگ مضمون لکھوں گا۔

اور رشتہ داروں پر صرف کرے اس کا چہرہ قیامت میں چودھویں رات کے چاند کی طرح چمکے گا۔ اللہ تعالیٰ مومن کا سب کو پسند کرتا ہے۔ سچائی اور دیانت سے روزی کمانے والے کا حشر صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔ حلال کاموں میں بہترین حلال روزی کمانا ہے۔ جو انسان اپنے واسطے ایک دفعہ بھیک کا دروازہ کھول لیتا ہے۔ اس کے واسطے محتاجی کے ستر دروازے کھل جاتے ہیں۔ اپنے آپ کو اور اپنے متعلقین کو محتاجی سے بچانے کو کسب حلال کرنا بھی جہاد ہے۔ تجارت کرو۔ دس میں سے نو حصے رزق کا ذریعہ تجارت ہے (خبردار یہ "تجارت ہے" تک ایک حدیث نہیں ہے۔ کئی حدیثوں کو یکجا کر دیا گیا ہے)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک آدمی سے پوچھا۔ "تم کیا کرتے ہو"۔ اس نے کہا۔ "عبادت کرتا رہتا ہوں"۔ حضرت عیسیٰؑ نے پوچھا۔ "کھاتے پیتے کہاں سے ہو"۔ بولا۔ "میرا بھائی کھلا پلا دیتا ہے"۔ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا۔ "تمہارا بھائی تم سے زیادہ عابد ہے"۔

حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے سوال کیا گیا کہ جو شخص رات دن عبادت کرے اور اللہ کی رزاقی کا منتظر رہے اس کی بابت آپ کی رائے کیا ہے۔ حضرت امام احمد بن حنبل نے جواب دیا۔ وہ جاہل ہے۔ شریعت سے واقف نہیں ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ محنت و مشقت کئے بغیر مت کہا کرو کہ یا اللہ روزی دے۔ اللہ آسمان سے سونا چاندی نہیں برساتا۔

ایک بزرگ کا قول ہے۔ تاجر ایماندار عابد شب زندہ دار سے افضل ہے۔ تاجر ایماندار ہر آن جہاد میں لگا رہتا ہے۔ شیطان بھاؤ تاؤ اور لین دین کے پردے میں اس کا ایمان بگاڑنے آتا ہے مگر وہ اسے مار بھگاتا ہے۔

جس کے پاس اپنے اور اپنے متعلقین کے گزر اوقات کے لائق مال و متاع موجود ہے اسے عبادت و ریاضت ضرور کرنی چاہیئے۔ اس کے لئے عبادت و ریاضت زائد از ضرورت روپیہ کمانے سے بہتر ہے۔ اس کا روپیہ کمائے چلا جانا دنیا سے دل لگانا ہے، مگر جس کے پاس گزر کے لائق مال و متاع نہیں ہے اس کے لئے روزی کمانا ہی اولیٰ ہے۔ وہ بس فرائض ادا کرتا رہے۔ نفلی عبادتوں اور ریاضتوں کا ثواب اسے روزی کمانے میں مل جائے گا۔ روزی کمانے میں اللہ کو اور اللہ کے احکام کو یاد رکھنا بہت بڑی عبادت و ریاضت ہے۔ کچھ لوگ اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں۔ جو واقعی خدمت خلق کے واسطے اپنے آپ کو وقف کر دیں، جو ایسے علوم پڑھ رہے ہوں جن سے خلق اللہ کو فائدہ پہنچ سکتا ہے وہ مدد وصول کر سکتے ہیں۔ لیکن بھیک مانگنے کی انہیں بھی اجازت نہیں ہے۔ کوئی خود بخود مدد کرے تو یہ قبول کر لیں۔ سوال کی ذلت اٹھانی پڑے تو انہیں بھی تلاش معاش کا وقت نکالنا چاہیئے۔

دنیا میں کوئی انسان کھانے اور کپڑے سے بے نیاز نہیں ہو سکتا، لیکن ہمہ تن اپنے آپ کو دنیا میں محو کر دینا بدبختی ہے۔ دنیا پر مٹنے والے دولت مندوں سے آخرت پر مٹنے والے مزدور بہتر ہیں۔ اسلام اعتدال کی راہ سکھاتا ہے اور اللہ کے احکام کے مطابق دنیا سے تعلق رکھنے کو دین قرار دیتا ہے۔ معاش اس خیال سے حاصل کی جائے کہ معاد کی طرف متوجہ رہنے کے لئے معاش کی طرف سے اطمینان ضروری ہے۔

ذیل میں حضرت امام غزالیؒ کے مضامین کی مدد سے اُن آداب کا خلاصہ پیش کرتا ہوں جن کا اسلام نے روزی کمانے کے سلسلہ میں ہمیں پابند کیا ہے:-

حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو شخص نفع بڑھانے کی غرض سے چالیس دن غلہ روک لے وہ بعد میں اگر سارا غلہ خیرات بھی کر دے گا تو کفارہ نہیں ہوگا۔ چالیس دن غلہ روکنا اللہ سے بیزاری کا اظہار ہے۔ اور اللہ تو اس سے بیزار ہے ہی۔

ایک حدیث ہے کہ غلے کو آج کے بھاؤ بیچ دینا اور بھاؤ چڑھنے کا انتظار نہ کرنا ایسا ہے جیسے غلام خرید کر آزاد کر دینا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ہدایت تھی کہ محتکر (یعنی ذخیرہ اندوز) کے گودام کو آگ لگا دو۔ محتکر کو ملعون کہا گیا ہے۔ آخرت میں بھی وہ سزا کا مزہ چکھے گا

اور دنیا میں بھی اُس پر اللہ کی لعنت کا مینہ برسے گا۔

دین تھوڑے نفع کی صورت میں قائم رہ سکتا ہے۔ نفع کا جھکاؤ دین کی جڑ میں ہلا ڈالتا ہے۔ کسان کو جس نے غلہ اُگایا ہے، تھوڑی ڈھیل دی گئی ہے۔ کسان غلہ روک کر بیچ سکتا ہے۔ لیکن مستحسن کسان کے لئے بھی یہی ہے کہ غلہ جلد از جلد خلق اللہ کے پاس پہنچائے۔ دوسری ضروریات زندگی کے تاجروں اور صناعوں کی انسانیت، شرافت اور دینی مردانگی بھی اس میں ہے کہ زیادہ نفع کے لالچ سے دور رہیں۔

ضروریات کی چیزیں بھاؤ چڑھنے اور خوب کمانے کے خیال سے کوئی بند کر کے رکھ لے تو اس سے بڑھ کر خلق اللہ پر اور کیا ظلم ہوگا۔ اور پھر غلہ تو ایسی چیز ہے اس پر حیات انسانی کا دارومدار ہے۔ غلے کی چور بازاری اور انسانوں کے قتل عام میں فرق نہیں ہے۔

غلہ اور دیگر اشیائے ضروری تجار روکتے جب ہیں جب اُن کی پیداوار میں کمی آتی ہے، گویہ پیداوار کی کمی کی مصیبت پر اور مصیبت لاتے ہیں۔ پیداوار بافراط ہو تو احتکار (ذخیرہ اندوزی) حرام نہیں ہے۔ مگر مکروہ اس صورت میں بھی ہے کیونکہ نیت بہر صورت وہی ہوتی ہے کہ شاید دیر کرنے سے زیادہ نفع مل جائے گا۔ عادی محتکر کو انتظار رہتا ہے کہ خلق اللہ کب مصیبت میں پھنسے اور کب اس کے وارے نیارے ہوں۔

ایک اور بات ہے جو بے حد معمولی سمجھی جاتی ہے، لیکن وہ معمولی نہیں ہے۔ دکاندار اپنی غفلت سے کھوٹے سکے لیتے ہیں اور پھر چاہتے ہیں کہ خمیازہ دوسرے بھگتیں۔ جانتے بوجھتے دوسروں کو کھوٹے سکے دے دیتے ہیں۔ پھر لینے والا تیسرے کو دیتا ہے اور تیسرا چوتھے کو۔ دغابازی کی ابتدا کرنے والے کو معلوم ہونا چاہیئے کہ جب تک کھوٹے سکے کا چکر چلتا رہے گا اپنے کئے کی سزا کے علاوہ درمیانی دغابازوں کے گناہ کی سزا بھی، ابتدا کرنے والے کے حصہ میں آتی رہے گی۔ ایک کھوٹا سکہ چلانا سو سکوں کی چوری سے بدتر ہے۔ چوری کا گناہ مر کر ختم ہو جاتا ہے۔ کھوٹے سکے چلانے کا گناہ ممکن ہے مر کر بھی ختم نہ ہو۔ کھوٹے سکے کا چکر مرنے کے بعد بھی تو جاری رہ سکتا ہے۔ کتنا بدنصیب ہے وہ شخص جو خود مر جائے اور اس کا گناہ نہ مرے۔

بعض صاحبان وضع کر دیا کرتے ہیں کہ یہ سکہ جو ہم نے دیا ہے کھوٹا سکہ ہے۔ اس سے اُن کی ذمہ داری نہیں ہٹتی۔ کھوٹے سکے کا ضائع کر دینا ہی ٹھیک ہے۔ دوسرے کی بابت کون جانتا ہے کہ وہ کھوٹا سکہ لے کر اُسے چلائے گا یا تبرک بنا کر رکھے گا۔

کھوٹے سکے میں چاندی سونا ہو تو چاندی سونے کی قیمت البتہ وصول کی جا سکتی ہے، مگر سکے کی نہیں۔ چاندی سونے کی قیمت بھی اُس سے لی جائے جس پر کامل بھروسہ ہو کہ سکے میں سے چاندی سونے کی نکالے گا۔ سکہ چلائے گا نہیں۔ ورنہ یوں سمجھئے کہ انگور کشید کرنے والے کے ہاتھ بیچ دیئے، ہتھیار رہزن کے ہاتھ بیچ دیئے۔

خرید و فروخت میں ایک اصول ملحوظ رکھنا لازم ہے کہ دوسرے کے ساتھ وہ معاملہ نہیں کروں گا جو میرے ساتھ ہوتا تو میں اُسے برا سمجھتا ہر چہ بر خود نپسندی بر دیگراں مپسند۔

دغابازی تاجر کرے یا کسی اور پیشے کا آدمی کرے یکساں ہے۔ حضرت امام احمد بن حنبل سے پوچھا گیا کہ رفو کرنے کے بابت کیا ارشاد ہے۔ فرمایا۔ اپنے پہننے کے کپڑوں میں رفو کرنا اور رفو کرانا جائز ہے۔ لیکن دکاندار بیچنے کے کپڑوں میں رفو کرے اور رفو کو گاہک سے چھپائے تو یہ حرام ہے۔ کسی شے کی تعریف میں مبالغہ کرنا جھوٹ بولنا ہے۔ خریدار شے کی تعریف سے واقف ہے تو کوئی لفظ بھی زبان سے نہ نکالو فضول گوئی بیہودگی ہے۔ "مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ"۔۔۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ انسان جو لفظ زبان سے نکالے گا اس کی بابت اُس سے پرسش کی جائے گی (کہ فضول لفظ کہنے کی کیا مجبوری تھی) اگر بات گفتنی کی ہے تو عذر مسموع نہیں ہوگا۔ ہاں گاہک کے متعلق سوال کرے تو اس کی جو واقعی خوبی ہو تو وہ بتاؤ۔ لیکن مال میں عیب اور نقص ہو تو اُسے بغیر سوال کے ظاہر کر دینا لازم ہے اور پوشیدہ رکھنا فریب کاری ہے۔

حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ایک گیہوں والے کی دکان پر تشریف لے گئے اور ڈھیر کے اندر ہاتھ ڈال کر گیہوں دیکھنے لگے ڈھیر اندر سے

تر تھا۔ حضورؐ نے پوچھا۔ تری کیوں ہے۔ دکاندار نے عرض کیا۔ مینہ گا ہو گیہوں ہے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ تم نے اوپر خشک گیہوں رکھے ہیں۔ گیلے گیہوں اوپر نہیں رکھے۔ مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا جو فریب کاری کرتا ہے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

بعض تاجر مال بیچتے وقت قسمیں کھایا کرتے ہیں۔ جھوٹی قسم کھانا تو خیر گناہ کبیرہ ہے۔ سچی قسم کھانا بھی اچھی بات نہیں ہے۔ مال بیچنے کے لئے اللہ کا نام استعمال کرنا خلاف ادب ہے۔ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ لَا وَاللّٰہِ اور بَلٰی وَاللّٰہِ کہنے والے سوداگروں کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے اور جو پیشہ ور وعدہ خلافی کرتے ہیں (کل اور پرسوں کہتے رہتے ہیں) وہ بھی قابل افسوس ہیں۔ ایک حدیث ہے کہ جو شخص اللہ کی قسمیں کھا کھا کر مال بیچے گا اللہ قیامت کے دن اس کی طرف نگاہ نہیں کرے گا۔

نرخوں کا چھپانا، چیزوں میں ملاوٹ کرنا، خریدنے اور بیچنے کی ترازو میں الگ الگ رکھنا۔ کپڑا خریدتے وقت ڈھیلا ناپنا اور بیچتے وقت کھینچ کر ناپنا۔ قصاب کا اس بے کار ہڈی کو گوشت کے ساتھ تول دینا جسے تولنے کا رواج نہیں ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام حرکتیں حرام ہیں ——— وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ... بڑا نادان ہے وہ انسان جو ذرا سی رقم کے بدلے جنت سے دستبردار ہو جاتا ہے۔

حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا کہ قافلوں کے شہر میں داخلے سے پہلے قافلہ والوں سے سودا مت کیا کرو۔ انہیں شہر کا بھاؤ نہیں معلوم ہوتا اور تم اُن سے سستا مال خرید لیتے ہو۔ قافلہ والوں کو حق ہے کہ شہر میں آنے اور بھاؤ جاننے کے بعد بیع فسخ کر دیں۔

تنہا نفع اٹھانے کو بھی حضورؐ نے منع فرمایا ہے کہ ایک آدمی نے سارا مال خرید ڈالا تاکہ دوسروں کو جس بھاؤ چاہے دے۔ مال سستا ہونے کا فائدہ سب کے حصے میں آنا چاہیئے۔

حضورؐ نے یہ سازش بھی ناجائز قرار دی ہے کہ مال حقیقتاً نہیں خریدا اور ظاہر کیا کہ خرید لیا ہے اور اس قیمت میں خریدا ہے تاکہ لوگ دھوکے میں آ کر قیمت بڑھا دیں۔

سہل انگاری میں مال مہنگا خرید لیا ہے تو بھی بازار کے بھاؤ بیچنا چاہیئے۔ آپ کی غفلت اور غلطی کا دوسرے خمیازہ نہیں بھگت سکتے۔ المختصر فریب اور دغابازی کی جتنی شکلیں ممکن ہیں وہ اسلام کے خلاف ہیں۔

روزگار میں برکت کی دعا مانگنی چاہیئے۔ برکت یہ ہے کہ قلیل روزگار سے کثیر بہرہ مندی ہو۔ برکت کے لئے ایمانداری پہلی شرط ہے۔ دغابازی کی کمائی تو خود ہی باقی نہیں رہتی۔ اس میں برکت کہاں سے ہو گی۔ کوئی نہ کوئی حادثہ پیش آ جاتا ہے تو دغابازی کی کمائی کو لے ڈوبتا ہے —— لوگ چند روزہ سونے چاندی کی خاطر عاقبت کی مستقل زندگی نثار کر دیتے ہیں۔ مگر چاندی سونا اُن سے مُنہ موڑ کر چلتا ہوتا ہے۔ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "مسلمان دین کو دنیا پر بھینٹ چڑھانے کے بعد کلمہ "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہ" پڑھتا ہے تو اللہ کہتا ہے۔ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ دل میں اس کے کچھ ہے، زبان پر کچھ ہے۔

حضورؐ سے کسی صحابی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ! دعا کیجئے کہ میں جو دعا کروں وہ قبول ہو جایا کرے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ دعا حلال روزی کھانے والوں کی قبول ہوتی ہے۔ محض ہاتھ پھیلانے سے قبول نہیں ہوتی۔ اور فرمایا۔ جو شخص حلال و حرام میں فرق نہیں کرتا اُس کی تو نفلیں اور فرض، نہ اس کے صدقات نہیں قبول کئے جاتے۔ اور فرمایا۔ اگر کوئی شخص دس درہم کا کپڑا خریدتا ہے اور دس درہم میں ایک درہم حرام کا شامل ہے تو جب تک وہ کپڑا اس کے جسم پر رہے گا اس کی نماز قبول نہیں ہو گی۔ اور فرمایا جس بدن کی نشو و نما مال حرام کھانے سے ہوا اُسے آگ میں جلنا ہی چاہیئے۔ اور فرمایا۔ جو لوگ اس بات کی پرواہ نہیں کرتے کہ چیز کہاں سے آئی ہے اور کیونکر آئی ہے انہیں حق تعالیٰ بھی دوزخ میں ڈالتے وقت پرواہ نہیں کرے گا۔ اور فرمایا۔ طلب حلال کے لئے محنت کر کے جب مسلمان تھک جاتا ہے اور سوتا ہے تو اس کے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں اور جب صبح وہ اٹھتا ہے تو اللہ اُس سے خوش اور راضی ہوتا ہے۔ اور فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے۔ جو حرام سے پرہیز کرتے ہیں مجھے قیامت کے دن اُن سے حساب

بیٹے شرم کرے گی۔

قرآن مجید میں ہے: اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ ۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو عدل و احسان کا حکم فرمایا ہے۔ اوپر جس قدر بیان کیا گیا اُس سے واضح ہو گیا ہوگا کہ کسب اور تجارت میں عدل کی راہ کیا ہے۔ آگے احسان کی راہ بتائی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ اللہ کی رحمت احسان کرنے والوں کے بالکل قریب ہے۔ جس شخص نے عدل کیا اس نے بھی اپنا دین سنوار لیا مگر احسان کچھ وہ ہی چیز ہے۔ عدل تو فرض ہے۔ عدل نہیں کیا جائے گا تو دنیوی گرفت میں آئے گا۔ لیکن احسان فرض نہیں ہے۔ البتہ احسان کا ثواب بے حساب ہے۔ خریدار ضرورت کی وجہ سے زیادہ قیمت خوشی خوشی دینی چاہے۔ وہ تاجر زیادہ قیمت نہ لے اسے احسان کہتے ہیں۔

حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ تجارت کرتے تھے۔ انھوں نے ساٹھ درہم کے بادام خریدے۔ خریدتے ہی بادام کا بھاؤ ڈیوڑھا ہو گیا۔ لیکن حضرت سری سقطی نے نوے درہم لینے قبول نہیں کئے۔ فرمایا۔ میں پانچ درہم فی سیکڑہ سے زیادہ منافع نہیں لیتا۔ ساڑھے تریسٹھ لوں گا۔ نوے نہیں لوں گا۔

حضرت محمد بن المنکدر رحمۃ اللہ علیہ کی دکان میں مختلف قیمتوں کے کپڑے تھے۔ ان کی عدم موجودگی میں ایک تھان پانچ درہم والا دس درہم میں بک گیا۔ انہیں معلوم ہوا تو خریدار کو ڈھونڈتے پھرے اور جب وہ ملا تو اس سے کہا کہ یہ پانچ درہم واپس لو۔ یا میرے ساتھ چلو میں دس درہم والا تھان بدل دوں گا۔

دوسری قسم احسان کی یہ ہے کہ ضرورت مندوں سے اُن کی چیز گراں قیمت پر خریدی جائے۔ جیسے بیوہ عورتوں سے کاتا ہوا سوت، یا کثر غریب بچے خونچہ لگایا کرتے ہیں۔ انہیں زیادہ قیمت دینا صدقہ کرنے سے افضل ہے۔ مالداروں سے خوب چکائے۔ لیکن غریب دکاندار کو دانستہ زیادہ قیمت دے دی جائے۔

تیسری قسم احسان کی یہ ہے کہ مال کسی کو قرض دیا ہے اور وہ تنگ دستی کی وجہ سے قیمت ادا نہیں کر سکتا اسے مہلت پر مہلت دینی چاہیے اور اس کے ساتھ سختی نہیں برتنی چاہیے۔

چوتھی قسم احسان کی یہ ہے کہ مقروض قرض کی ادائگی میں جلدی کرے اور قرض دینے والے کو تقاضے کی تکلیف نہ دے۔ حدیث ہے کہ جو شخص قرض ادا کرنے کی نیت رکھتا ہے، فرشتے اس کے قرض کی ادائگی کی دعا کرتے ہیں۔ اگر قرض دار قرض ادا کر سکتا ہے اور خواہ مخواہ دائگی میں دیر لگاتا ہے تو وہ گنہگار ہے۔ خواہ نمازیں پڑھتا ہے اور روزے رکھتا ہے۔ ادا کر سکنے کی صورت میں قرض ادا نہ کرنا ایسا گناہ ہے کہ جاگتے ہی میں نہیں سوتے میں بھی اللہ تعالیٰ اُس پر لعنت بھیجتا ہے۔ قرض خواہ کو رضامند رکھکر قرض ادا کرنا چاہیے۔

پانچویں قسم احسان کی یہ ہے کہ غریبوں اور محتاجوں کو یہ سوچ کر قرض دے کہ جب تک وہ ادا کرنے کے قابل نہ ہوگا میں نہیں مانگوں گا اور مقروض مر گیا تو معاف کر دوں گا۔ کہیں یادداشت نہیں رکھوں گا تاکہ میرے ورثا ایسے مقروض کو نہ ستانے پائیں۔

مسلمانوں کو اپنے اپنے پیشے کی بابت علم رہنا چاہیے کہ کیا حلال ہے اور کیا حرام ہے اور کیا حلال تر ہے اور کیا حرام تر ہے۔ ایک پیشہ بھی دنیا میں ایسا نہیں ملے گا جس کی بابت اسلام ہدایت نہ دے سکتا ہو۔

احتیاط اور پرہیزگاری کے بھی مدارج ہیں۔ اور حلال و حرام کے بھی مدارج ہیں۔ سب انسان بھی و حد معیار پر پورے نہیں اتر سکتے۔ اور تمام حرام و حلال بھی یکساں نہیں ہو سکتے۔ مثلاً کسی امیر کا مال غصب کر لینے اور کسی درویش کا مال غصب کر لینے میں فرق ہے مال کسی کا بھی غصب کیا جائے گناہ ہے۔ لیکن درویشوں اور یتیموں کا مال غصب کرنا گناہ عظیم ہے۔ ویسے بزرگان سلف تو مستحبات تک میں سخت احتیاط برتتے تھے۔ احتیاط کی حد کر دیتے تھے۔ وہ صرف یہی نہیں دیکھتے تھے کہ دودھ کس سے خریدا ہے اور قیمت کہاں سے ادا کی ہے بلکہ یہ بھی دیکھتے تھے کہ جس بکری کا دودھ ہے

اُس نے غیر کے کھیت میں تو نہیں چرا ہے۔

حضرت عمرؓ فاروق رضی اللہ عنہ کی اہلیہ محترمہ بیت المال کا مشک تول رہی تھیں تول چکیں تو ہاتھوں میں مشک کی خوشبو بس گئی تھی۔ انھوں نے ہاتھ اپنی چادر پر مل لئے۔ حضرت عمرؓ وہ چادر خود دھونے بیٹھ گئے اور جب خوشبو اڑ گئی تب چادر اوڑھنے کو دی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے مشک رکھا گیا تو انھوں نے ناک بند کر لی اور فرمایا: "یہ کل مسلمانوں کا مال ہے میں اکیلا اس کی خوشبو سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔"

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ اپنے مریدوں کو اُمرا کے ہاں کی آرائش دیکھنے سے روکا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ تم یہ آرائش دیکھتے ہو تو اُمرا سمجھتے ہیں کہ ہم نے دیکھنے دکھانے کے لائق کام کیا ہے اور پھر وہ اور اسراف کرتے ہیں۔ تمہیں اسراف کی تحریک کا گناہ گار نہ بننا چاہیے۔ بزرگان سلف کا قول تھا کہ ظاہر کی آرائش خلق کی نظارہ گاہ ہے اور باطن کی آرائش خالق کی نظارہ گاہ ہے۔

زیادہ احتیاط کرنے والا اللہ سے زیادہ ڈرتا ہے۔ الہذا وہ زیادہ ماجور ہوگا۔ لیکن جو معمولی شریعت کا بھی پابند نہیں رہتا وہ غصب کرتا ہے، وہ فاسق ہے اُسے سزا ملے گی۔

بہرحال اسلام معاملات کو عبادات سے کم اہمیت نہیں دیتا۔ بلکہ نماز کے سوا عبادات میں تو کچھ گنجائش ہے بھی۔ روزہ بعض حالات میں قضا کیا جا سکتا ہے اور بعض حالات میں ترک کیا جا سکتا ہے۔ زکوٰۃ اور حج سے کثیر حضرات مستثنیٰ ہیں۔ اور نفلی عبادتوں کا تو ذکر کیا۔ لیکن معاملات میں گنجائش نہیں ہے۔ اللہ چاہے گا تو شرک کے علاوہ اپنے تمام حقوق نظر انداز فرما دے گا لیکن حقوق العباد معاف ہوں گے تو عباد (بندوں) ہی کے معاف کرنے سے معاف ہوں گے۔

معاملات اللہ کے احکام کے مطابق انجام دیئے جائیں تو خود عبادت ہیں۔ مومن کی پوری زندگی عبادت ہے۔ اللہ اپنے لئے ہم سے کوئی شے طلب نہیں کرتا۔ اللہ ہماری عبادات کا ضرورت مند نہیں ہے۔ کلمہ توحید پڑھوانا ہمیں انسانیت سکھانا ہے۔ وہ انسان کس کام کا جو خالق کو خالق نہ جانے جس نے وجود بخشا ہے۔ اُس کا احسان نہ مانے۔ نماز جاننے اور ماننے کی عملی شکل ہے۔ اور روزہ، زکوٰۃ اور حج کے فائدے بالکل عیاں ہیں۔ اور معاملات کے فائدے اور زیادہ عیاں ہیں۔

ماں باپ کبھی پسند نہیں کرتے کہ ان کی اولاد ایک دوسرے کے ساتھ بد معاملگیاں اور دغابازیاں کرے۔ ایک دوسرے سے بُرا برتاؤ کرے۔ ایک دوسرے کو ذبح کرنے لگے۔ اللہ بندوں کی بھلائی کا ماں باپ سے بڑھ کر خواہاں ہے۔ اسلام کا مقصد یہی ہے کہ بندے بندوں پر ظلم نہ کریں آپس میں سلوک اور محبت سے رہیں۔

غیر مسلموں کے ساتھ اُسے جو کرنا ہے اُن کے مرنے کے بعد کرے گا۔ یہاں اگر وہ اشاعت اسلام میں رخنے نہ ڈالیں تو اُن سے بھی اچھے برتاؤ اور خوش معاملگی کا حکم ہے۔ بد معاملگی اسلام کے مقصد کو فوت کر دیتی ہے۔

معاملات کا دائرہ بہت محدود نہیں ہیں۔ آپ نے کسی کی روپے پیسے سے مدد کی ہے؟ لیکن ساتھ کچھ کہا تھا اُس پر چھالے بھی جلتے ہیں۔ اس کی بابت ارشاد ہوا۔ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ۗ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ

اچھے الفاظ (اور ملائم گفتگو) اور درگزر (اُس) خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے اذیت (اور دل آزاری) ہو۔ اللہ غنی (اور) بردبار ہے (تم بھی غنی و بردبار بنو)

یا آپ غریبوں کے مقابلے میں امیروں کی طرف بہت توجہ کرتے ہیں تو یاد کیجیے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعہ کو کہ حضورؐ نے یہ سوچ کر کہ سرداران قریش ایمان لے آئیں گے تو اشاعت اسلام کی رکاوٹیں کم ہو جائیں گی سرداران قریش کی طرف توجہ رکھی تھی اور

ایک خوب نابینا صحابی کی طرف توجہ نہیں فرمائی تھی۔ صحابی نابینائی کے باعث موقع اور محل سے بے خبر تھے اور اپنی طرف متوجہ کئے جاتے تھے حضورؐ کو ان کی حرکت ناگوار گزری اور حضورؐ کی تیوری چڑھ گئی۔ وحی آئی، عَبَسَ وَتَوَلّٰیٓ ۝ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی تیوری چڑھائی اور منہ پھیر لیا، کیونکہ ان کے پاس (ایک) اندھا آیا تھا۔ (اور وہ اس وقت آنکھوں والوں اور بڑی حیثیت کے لوگوں سے معروف گفتگو تھے)

حضرت عمر بن عبد العزیز رح

ضیاء الدین احمد برنی

حضرت عمرؓ کا قاعدہ تھا کہ وہ حالات معلوم کرنے کی غرض سے راتوں کو گشت کیا کرتے تھے۔ ایک رات جب وہ گشت کرتے کرتے تھک گئے تو ایک دیوار کے سہارے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے سنا کہ گھر کے اندر ایک عورت اپنی لڑکی سے کہہ رہی تھی کہ دودھ میں پانی ملا دے۔ لڑکی نے جواب دیا کہ امیرالمومنین کا حکم ہے کہ دودھ میں پانی نہ ملایا جائے۔ ماں نے جواب دیا کہ کیا اس وقت امیرالمومنین دیکھ رہے ہیں؟ لڑکی نے کہا کہ خدا کی قسم ایسا نہیں ہو سکتا کہ جلوت میں تو امیرالمومنین کی اطاعت کی جائے اور خلوت میں ان کی نافرمانی کی جائے۔ حضرت عمرؓ نے یہ ساری گفتگو سنی اور اپنے غلام اسلم سے کہا کہ اس مکان کو ذہن میں رکھنا۔ صبح ہوئی تو انہوں نے غلام کو بھیجا کہ وہ معلوم کرے کہ وہ عورتیں کون ہیں اور کیا وہ شادی شدہ ہیں۔ معلوم ہوا کہ لڑکی کی ابھی شادی نہیں ہوئی۔ بالآخر حضرت عمرؓ نے اس لڑکی کا نکاح اپنے بیٹے عاصم سے کر دیا۔ اسی لڑکی کے بطن سے حضرت عمر بن عبدالعزیز کی والدہ پیدا ہوئیں۔

مسند خلافت پر بیٹھنے سے پہلے عمر بن عبدالعزیز مصر کے گورنر تھے۔ انہوں نے کوئی اکیس ۲۱ سال تک گورنری کی۔ مورخین کا خیال ہے کہ کوئی گورنر اتنی زیادہ مدت تک اس عہدہ پر فائز نہیں رہا۔ بعد کو انہیں مدینہ کا گورنر بنا دیا گیا۔ گورنری کے زمانہ میں وہ بڑے ٹھاٹھ سے زندگی گزارتے تھے۔ ان کا ذاتی ساز و سامان تیس اونٹوں پر لد کر جاتا تھا۔ اس سے ان کی دنیوی شان و شوکت کا کچھ کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

مدینہ کی گورنری کے زمانہ میں جو ناقابل فراموش کام انہوں نے انجام دیئے ان میں مسجد نبوی کی تعمیر ہے۔ انہوں نے مسجد کی تعمیر میں چند جدتیں دکھائی ہیں۔ محرابوں کی تعمیر انہی کی یادگار ہے۔ انہوں نے پرنالے سیسے کے بنوائے تھے۔ ولید نے حج کے زمانے میں مسجد کا معائنہ کیا اور تزئین و ترقی کے جو کام انہوں نے کئے تھے ان کی تعریف کی۔ اسی زمانہ میں انہوں نے دوسرے عمال کو لکھ دیا کہ عراق کے شہروں میں بکثرت کنوئیں کھدوائے جائیں اور دشوار گزار راستوں کو ہموار کر دیا جائے۔ گورنری کے زمانے میں وہ امیر الحج بن کر لوگوں کو اپنے ساتھ حج بھی کراتے تھے۔

سلیمان بن عبدالملک کو ان کی ذات پر اس قدر اعتماد تھا کہ انہوں نے انہیں اپنا وزیر اور مشیر بنا لیا۔ اور ہی بنا پر جو لوگ خلافت کے حقدار سمجھے جا سکتے تھے ان میں عمر بن عبدالعزیز بھی شامل تھے۔ چنانچہ جب سلیمان بیمار ہوا اور زیست کی امید نہ رہی تو اس نے مشورہ کر کے انہیں اپنا جانشین مقرر کر دیا اور اپنے خاندان والوں سے بھی ان کی بیعت کرا دی۔ ہشام بن عبدالملک نے اس اقدام کی مخالفت کی اور کہا کہ ہم تا قیامت ان کے ہاتھ پر بیعت نہ کریں گے۔ مگر ذرا سی دھمکی کے بعد اس کی مخالفت ختم ہو گئی۔ اس کے بعد عمر بن عبدالعزیز مسند خلافت پر متمکن ہو گئے۔

خلافت کے مسند پر بیٹھتے ہی ان کی زندگی میں عظیم الشان انقلاب برپا ہو گیا۔ ان کی پہلی سی شان و شوکت اور آن بان سب جاتی رہی۔ شاہی سواریاں خچر اور ترکی گھوڑے سب بیت المال میں داخل کر دیئے گئے۔ جب پولیس افسر نیزہ لے کر ان کے آگے آگے چلا تو اسے بھی انہوں نے روک دیا اور کہا کہ میں عام مسلمانوں کی طرح ایک مسلمان ہوں۔ الغرض ہر وہ چیز جس سے نام و نمود کا اظہار ہوتا تھا بیت المال میں بھیج دی گئی۔

خلیفہ بن جانے کے بعد وہ اپنے خیمہ میں فروکش ہوئے اور قصر خلافت میں قیام نہیں کیا جس میں سلیمان کے اہل و عیال رہتے تھے۔ جب وہ اندر داخل ہوئے تو لونڈی نے ان کی پریشانی دیکھ کر پوچھا کہ یہ حالت کیوں ہے؟ جواب میں فرمایا۔ "کیا یہ بات تشویشناک نہیں ہے کہ مشرق و مغرب

میں امت محمدیہ کا کوئی فرد ایسا نہیں ہے جس کا مجھ پر حق نہ ہو اور جس کا بغیر طلب و مطالبہ ادا کرنا مجھ پر فرض نہ ہو۔ اس کے بعد مسجد میں تشریف لائے اور خطبہ دیا جس میں آپ نے فرمایا۔

" لوگو! مجھ پر خلافت کا بوجھ ڈال دیا گیا ہے بغیر اس کے کہ مجھ سے رائے لی جاتی یا میں اس کا خواستگار ہوتا یا عام مسلمانوں سے مشورہ لیا جاتا۔ میری بیعت کا جو جوا تمہاری گردنوں میں ہے میں اس کو خود نکالے دیتا ہوں۔ اب تم جو پسند کرے اپنا خلیفہ مقرر کرلو۔"

اس خطبہ کو سنکر تمام حاضرین نے بہ اتفاق آواز بلند کہا کہ " ہم نے آپ کو اپنا خلیفہ منتخب کیا اور ہم آپ کی خلافت پر راضی ہیں" جب یہ ہیجانی کیفیت ذرا دور ہوئی تو آپ نے مفصل تقریر کی اور لوگوں کی توجہ تقوی اور فکر آخرت کی طرف دلائی اور پھر فرمایا۔

" لوگو! جو شخص خدا کی اطاعت کرے، اس کی اطاعت واجب ہے، اور جو شخص اس کی نافرمانی کرے، اس کی اطاعت جائز نہیں۔ جب تک میں خدا کی اطاعت کروں، میری اطاعت کرو اور اگر میں اس کی نافرمانی کروں، تو میری اطاعت تم پر فرض نہیں رہے گی۔"

یہی وہ الفاظ ہیں جو حضرت ابوبکر نے خلافت قبول کرتے وقت فرمائے تھے۔ ان سے بہتر اور کیا معیار خلافت اور اطاعت ہو سکتا ہے؟

خلافت پر فائز ہونے کے بعد جو اہم ترین کام انہوں نے انجام دیا وہ غصب شدہ جائداد اور اموال کی واپسی تھی چنانچہ انہوں نے منادی کرادی کہ لوگ ایسی جائداد اور اموال کے بارے میں اپنی اپنی شکایتیں پیش کریں انہوں نے ابتدا اپنی ذات سے اور اپنے خاندان سے کی، اور ان سب جاگیروں سے جو سلطنت کے مختلف حصص میں تھیں، دست برداری کرلی اور سب کو بیت المال کا جزو بنا دیا۔ انہوں نے باغ فدک کو جو حضرت عمر کی خلافت کے بعد مروان کے قبضہ میں چلا گیا تھا، اسی حالت پر کر دیا جو آنحضرت کے زمانہ میں تھی اور اس کی آمدنی کو انہی کاموں کے لئے مختص کر دیا جو رسول اللہ اور شیخین کے زمانہ تک انجام دیئے جاتے تھے اس کے بعد انہوں نے اپنی بیوی کے قیمتی جواہرات کو بھی بیت المال میں داخل کر دیا۔ پھر عام مسلمانوں سے اموال مغصوبہ لے کر جائز حقداروں کو واپس دیئے۔ ابن سعد نے لکھا ہے کہ امیر معاویہ کے زمانہ سے لیکر ان کے زمانہ تک کی جو جائدادیں غصب کرلی گئی تھیں، وہ سب کی سب جائز حقداروں کو دلادی گئیں۔

اس کارروائی کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ خوارج نے ان کی حکومت کے خلاف بغاوت کرنی بند کردی مگر خاندان بنی امیہ کے افراد یہ دیکھ کر کہ ان کی وجاہت ختم ہو رہی ہے اور ان کے ساتھ عام مسلمانوں کا سا برتاؤ کیا جا رہا ہے اور ان کی خلاف شرع حرکتوں کو منظر عام پر لایا جا رہا ہے تو وہ دل میں ان کے خلاف ہو گئے۔ مگر ان کی بددلی کے باوجود عمر بن عبدالعزیز قوی سے لے کر کمزور کو حقوق دلاتے رہے۔ بنی امیہ نے ان پر طرح طرح سے اثرات ڈلوائے لیکن ان کے پائے ثبات میں ذرا سی بھی لغزش نہیں آئی اور وہ برابر اپنی پالیسی پر تادم مرگ قائم رہے۔

اس تطہیر کے بعد انہوں نے رشوت خور اور ظالم عمال حکومت کی جانب توجہ کی۔ اس سلسلہ میں انہوں نے سب سے پہلے یزید بن مہلب (گورنر خراسان) کو معزول کرکے قید میں ڈالدیا۔ یہ شخص عمر بن عبدالعزیز کی وفات تک قید خانہ میں رہا۔ اور بھی متعدد افسر معزول کئے گئے۔ وہ اس قسم کا انتہائی اقدام اسوقت کرتے تھے جب ان کو مختلف شہادتوں سے جرم کے بارے میں مکمل ثبوت مل جاتا تھا۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کہ بنو امیہ ان کی پالیسی سے دل ہی دل میں سخت ناراض تھے اور اس لئے انہوں نے خفیہ خفیہ سازش کرنی شروع کردی اور بالآخر انہیں زہر دلوا دیا۔ جس غلام نے زہر دیا تھا اس نے اقرار کیا کہ ایک ہزار دینار کی رشوت دیکر اس سے یہ کام کرایا گیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس سے یہ رقم وصول کرلی اور اسے بیت المال میں داخل کر دیا اور خود اسے خارج البلد کر دیا وہ بیس دن بیمار رہے اور ۳۹ سال کی عمر میں انتقال کرگئے۔ ان کی مدت خلافت ڈھائی سال رہی۔ مگر اس اثنا میں انہوں نے ظلم و عدوان کی جڑیں کاٹ دیں۔ مرتے وقت ذیل کی آیت ورد زبان تھی۔ جس کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے:

" یہ آخرت کا گھر ہے، ہم ان لوگوں کے لئے بناتے ہیں جو زمین میں نہ برتری چاہتے ہیں اور نہ فساد کرتے ہیں، اور عاقبت

پرہیزگاروں ہی کے لئے ہے۔"

مرض الموت میں لوگوں نے مشورہ دیا کہ آپ مدینہ میں جاکر وفات پائیں تاکہ آپ کو رسول اکرم حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے پہلو میں جگہ مل سکے انہوں نے جواب میں فرمایا کہ "اپنے آپ کو ان جیسی برگزیدہ ہستیوں کے پہلو میں دفن ہونے کے قابل نہیں سمجھتا۔"

مرتے وقت انہوں نے ایک سوال کے جواب میں اپنی اولاد کے بارے میں یوں فرمایا۔

"میں نے ان کے منہ کو ہمیشہ اس مال سے خشک رکھا لیکن میں نے ان کا حق کبھی تلف نہیں کیا اور جس چیز پر ان کا حق نہیں تھا وہ ان کو کبھی نہیں دی۔ تمہارا یہ کہنا کہ میں تمہیں یا خاندان کے کسی شخص کو ان کے متعلق وصیت کر جاؤں تو ان کے معاملہ میں میرا وصی اور میرا ولی صرف خدا ہے۔ میرے لڑکے اگر خدا سے ڈریں گے تو خدا ان کے لئے کوئی صورت نکال دے گا۔ اور اگر وہ مبتلائے گناہ ہوں گے تو میں انہیں گناہ کے لئے طاقتور نہ بناؤں گا۔"

اس کے بعد لڑکوں کو بلایا اور بادیدۂ تر فرمایا۔

"تم کسی عرب یا کسی ذمی سے نہ ملو گے جس پر تمہارا حق نہ ہوگا لڑکو، تمہارے باپ کو دو باتوں میں سے ایک کا اختیار تھا۔ ایک یہ کہ تم دولت مند ہو جاؤ اور وہ جہنم میں داخل ہو یا تم لوگ محتاج رہو اور وہ جنت میں جائے۔ لیکن یہ بات کہ تم لوگ محتاج رہو اور وہ جنت میں جائے اس کو زیادہ محبوب تھی بہ نسبت اس کے کہ تم لوگ دولت مند ہو اور وہ آگ میں جائے۔ اٹھو، خدا تمہیں اپنی حفاظت میں رکھے!"

ان کی وفات پر تمام ممالک محروسہ میں غم کیا گیا۔ امام حسن بصری نے وفات کی خبر سن کر فرمایا: "یہ مصیبت تمام امت کے لئے عام ہے" غیر مسلم بھی اس غم میں یکساں طور پر شریک تھے وہ کہتے تھے کہ "ہم ان پر نہیں روتے، بلکہ اب اس نور پر روتے ہیں جو غائب ہو گیا ہے اور دنیا کو تاریک چھوڑ گیا ہے۔"

حضرت عمر بن عبدالعزیز کا اگر دوسرے اموی خلفاء سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انہوں نے نیک نامی کے سوائے اپنے پیچھے اور کوئی چیز نہیں چھوڑی حالانکہ دوسروں نے دولت کے انبار چھوڑے اور طرح طرح کی بدنامیاں اپنے سر مول لیں۔

مرنے کے بعد جو پیچھے رہ جاتی ہے وہ انسان کے اعمال ہیں اور وہ نیکیاں ہیں جو وہ اپنی زندگی میں کرتا ہے۔ آئیے، اسی معیار کے مطابق ان کی زندگی پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں۔

وہ ملاقاتیوں کو انتظار نہیں کراتے تھے بلکہ بلا کسی تاخیر کے اندر بلا لیتے تھے، وہ بیحد متواضع، حلیم اور صابر تھے۔ وہ خلیفہ بننے کے بعد اس طرح رہتے تھے کہ لوگ یہ جان نہیں سکتے تھے کہ خلیفہ کون ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو عام مسلمانوں کی طرح سمجھتے تھے اور ان پر کسی قسم کا تفوق پسند نہیں کرتے تھے۔ لوگ ان کے سامنے کھڑے ہوتے تو وہ فرماتے کہ اگر کھڑے ہو گے تو میں بھی کھڑا ہو جاؤں گا اور اگر تم بیٹھو گے تو میں بھی بیٹھ جاؤں گا۔ لوگوں کو صرف خدائے برتر کے حضور میں کھڑا ہونا چاہئے۔" انہوں نے سرکاری پہرہ داروں کو بھی تعظیماً کھڑے ہونے سے روک دیا تھا۔ وہ سلام کہنے میں بالعموم سبقت کرنے کے عادی تھے۔ وہ عام مسلمانوں کے جنازوں میں شرکت کرتے اور دوسرے عام مسلمانوں کی طرح کندھا دیتے تھے۔

ایک دفعہ کا قصہ ہے کہ ایک عامل نے لکھا کہ "میرے اجلاس میں ایک شخص کو اس جرم میں پیش کیا گیا ہے کہ وہ آپ کو گالیاں دیتا ہے۔ میں اسے انتہائی سزا دینا چاہتا تھا لیکن میں نے بہتر یہی سمجھا کہ آپ سے مشورہ کروں!"

انہوں نے جواب دیا کہ "اگر تم اسے قتل کر دیتے تو میں تم سے قصاص طلب کرتا۔ رسول اللہ ﷺ کے سوائے کسی اور کے گالی دینے پر کوئی شخص قتل نہیں کیا جا سکتا، اس لئے اگر تمہارا جی چاہے تو تم بھی اسے گالیاں دے لو ورنہ اسے رہا کر دو۔"

ایک بار اندھیرے میں مسجد کے صحن میں جا رہے تھے کہ کسی سوئے ہوئے شخص کے پاؤں پر ان کا پیر پڑ گیا۔ اس شخص نے جھلا کر کہا کہ کیا تم پاگل

ہو؟ انہوں نے جواب میں کہا کہ نہیں بھائی، میں پاگل نہیں ہوں، غلطی سے میرا پیر تمہارے پاؤں پر پڑ گیا ہے، مجھے معاف کر دو۔

ان میں رحمدلی بدرجۂ اتم تھی۔ ان کا رحم انسانوں تک محدود نہ تھا بلکہ جانوروں کی تکلیف بھی نہیں گوارا تھی۔ ڈاک کے جانوروں کے متعلق انہوں نے حکم دے رکھا تھا کہ انہیں کبھی کوڑے نہ لگائے جائیں اور ان کے منہ میں بھاری لگام نہ ڈالی جائے۔ انہوں نے مقرر کر دیا تھا کہ ایک اونٹ پر زیادہ سے زیادہ چھ سو رطل بوجھ لادا جائے۔

ان میں حضرت عثمان کی سی حیا تھی۔ وہ بہت سادہ لباس پہنتے تھے، اور اس میں بھی پیوند لگے ہوتے تھے۔ بعض اوقات ان کے جسم پر ایک ہی کپڑا ہوتا جسے بار بار دھو کر پہنتے تھے۔ ان کی غذا بھی نہایت سادہ تھی۔ اہل مجلس میں سے ایک نے کہا۔ یا امیرالمومنین، خدا تعالیٰ اپنی کتاب میں کہتا ہے کہ "ہم نے تم کو جو کچھ دیا ہے ان میں سے بہتر چیز کھاؤ"۔ انہوں نے جواب میں کہا کہ "افسوس، تم نے اس کے الٹے معنی لئے ہیں۔ اس سے مراد وہ مال ہے جو کسب حلال سے حاصل کیا جائے۔ لذیذ کھانے مراد نہیں ہیں"۔

انہوں نے اپنا کوئی مکان نہیں بنوایا۔ فرماتے تھے کہ رسول اللہ کی بھی یہی سنت رہی ہے۔ گھر میں کسی قسم کا ساز و سامان نہ تھا۔ ان کا روزانہ خرچ صرف دو درہم تھا جس کا بار کبھی بیت المال پر نہیں پڑا۔ ان کے اہل و عیال بھی عسرت کی زندگی بسر کرتے تھے۔

ایک بار ان کے سامنے ایک چور پیش کیا گیا۔ اس نے احتیاج کا عذر کیا۔ انہوں نے اس کا عذر قبول کیا اور اسے دس درہم دلوا دیئے۔

آج کل کی طرح وہ اپنے گرد و پیش محافظ اور پہرہ دار نہیں رکھتے تھے۔ ان کا اللہ پر اس قدر زیادہ بھروسہ تھا کہ وہ ظاہری اسباب حفاظت سے بالکل بے نیاز ہو گئے تھے۔

ان کی خلافت سے پہلے طرح طرح کے ٹیکس لگائے جاتے تھے اور مشکل سے کوئی چیز ہوگی جس پر ٹیکس نہ لیا جاتا ہو۔ مگر جب وہ خلیفہ ہوئے تو وہ تمام ٹیکس موقوف کر دیئے گئے جو خلاف شرع تھے۔ مثلاً نو مسلموں سے جزیہ لیا جاتا تھا کہ خزانہ نہ گھٹے۔ انہوں نے اسے موقوف کر دیا اور فرمایا کہ رسول اللہ ٹیکس وصول کرنے والے کی حیثیت سے دنیا میں نہیں بھیجے گئے تھے۔

انہوں نے قیدیوں کے لئے خصوصی سہولتیں بہم پہنچائیں اور عمال کو حکم دیا کہ وہ ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئیں۔ ان کا حکم تھا کہ کسی مسلمان قیدی کو اس طرح سے بیڑیاں نہ پہنائی جائیں کہ وہ نماز ادا نہ کر سکے۔ راتوں کو بیڑیاں اتار دی جائیں وغیرہ وغیرہ۔ قیدیوں کی خوراک کے بارے میں انہوں نے خصوصی احکام جاری کئے تھے۔

بعض عمال مجرموں کو دو دو سو تین تین سو کوڑے لگواتے تھے۔ انہوں نے ایسی سزاؤں کو بند کر دیا اور فرمایا کہ "مسلمان کی پیٹھ بجز حق شرعی کے ہر حالت میں محفوظ ہے"۔

انہوں نے شراب نوشی کے انسداد کے سلسلہ میں بھی مختلف تدبیریں کیں۔ مثلاً ان کا حکم تھا کہ کوئی غیر مسلم باہر سے شراب نہ لائے اور شراب کی دکانیں بند کر دی جائیں۔ نبیذ کے بہانے جو لوگ شراب پیتے تھے اسے بھی بند کرایا۔

انہوں نے اشاعت مذہب میں کافی حصہ لیا۔ علماء کے ساتھ ساتھ طلباء کو بھی وظیفے دیئے جاتے تھے۔ علماء کی امداد کرنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ دلجمعی کے ساتھ دین کی خدمت کر سکیں۔

اپنے زمانہ میں انہوں نے غیر زبانوں سے علمی کتابوں کے ترجمے کروائے۔ سلطنت بھر میں انہوں نے متعدد سرائیں بنوائیں جہاں لوگ دو رات اور دو دن تک ٹھہر سکتے تھے۔ ملک میں جتنی چراگاہیں تھیں انہیں عام کر دیا گیا تاکہ سب لوگ ان سے استفادہ کر سکیں۔

ان سے پیشتر کے اموی خلفاء نے جمعہ کے خطبہ میں حضرت علی اور اہل بیت کے لئے ناشائستہ اور اہانت آمیز الفاظ شامل کر دیئے تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ان الفاظ کو نکال دیا، اور ان کی بجائے ذیل کے الفاظ بڑھا دیئے جو آج تک رائج ہیں!

"اللہ تعالیٰ عدل، اور احسان اور قرابت داروں کو دینے کا حکم دیتا ہے اور فحش، برائی اور ظلم سے منع کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ یہ نصیحت اس لئے کرتا ہے تاکہ تم سمجھو" (ترجمہ)

سابقہ الفاظ انہوں نے اس لئے نکال دیئے تھے کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ حضرت علیؓ کی تذلیل ہو اور دوسرے یہ کہ جمعہ کے خطبہ کو ایسے ذلیل مقصد کے لئے استعمال کیا جائے۔ ایک اور وجہ یہ بھی کہ انہیں اہل بیت سے محبت تھی اور وہ ہر موقع پر ان کی خدمت کرتے تھے جنہیں چوکتے تھے۔ یہ غیر مذہبی رنگ جو اموی خلفا کا پیدا کردہ تھا، اسے انہوں نے اپنے دور خلافت میں کافی حد تک دھو دیا تھا۔

انہیں رسول اللہ سے عشق تھا۔ مرتے وقت ان کی وصیت یہ تھی کہ "میرے کفن میں چند موئے مبارک رکھ دیئے جائیں"۔

ان کا نمایاں کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے کتاب و سنت اور آثار صحابہ پر حکومت کی بنیادوں کو استوار کیا۔ انہیں اس میں اس قدر غلو تھا کہ ایک مرتبہ زمانہ حج میں انہوں نے اعلان کر دیا تھا کہ جو شخص کتاب و سنت پر عمل نہ کرے اس کی اطاعت فرض نہیں ہے۔

انہوں نے کسی رشتہ دار کو گورنری پر فائز نہیں کیا۔ اسی طرح انہوں نے اپنے بیٹوں کو بھی کوئی عہدہ نہیں دیا۔ وہ ظالم اور سفاک عمال کو بھی کوئی عہدہ نہ دیتے تھے۔ ان کی دیانتداری اور اتقا کا معیار اس قدر اونچا تھا کہ ان کے بعد کوئی خلیفہ ایسا نہیں ہوا جو اس تک پہنچ سکے، جو ان کی طرح خشیۃ اللہ سے سرشار ہو، جو ان کی طرح عدل و انصاف کا جذبہ رکھتا ہو، جو ان کی طرح بے تعصب ہو اور بیت المال کو امانت الٰہی سمجھ کر استعمال کرتا ہو اور یہ سمجھتا ہو کہ ایک دن اسے خدائے برتر کے حضور میں اپنے اعمال کا جواب دینا ہے۔

ان کی سلطنت میں غیر مسلم بھی آباد تھے۔ انہوں نے ان کی جان و مال کی اور ان کی مذہبی عبادت گاہوں کی حفاظت کی اور ان کے شعائر میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی۔ جزیہ کی وصولی میں ان کا حکم تھا کہ ذمیوں کے ساتھ ہر ممکن رعایت برتی جائے۔ عام حقوق کے معاملہ میں ان میں اور عام مسلمانوں میں کسی قسم کا فرق نہ رکھا جاتا تھا۔ ایک دفعہ کسی ذمی نے شکایت کی کہ اس کی جائداد غصب کر لی گئی ہے۔ چنانچہ ثبوت پیش ہونے پر وہ جائداد واگذار کرائی گئی۔ ایک مسلمان نے کسی ذمی کا گھوڑا بیگار میں پکڑ لیا اور اس پر سواری بھی کی۔ جب جرم ثابت ہو گیا تو انہوں نے مجرم کو ۴۰ کوڑے لگوائے۔ انہوں نے اپنے عمال کو حکم دے رکھا تھا کہ وہ بوڑھے، معذور اور نادار ذمیوں کی کفالت بیت المال سے کریں۔ شیر خوار بچوں کے وظیفے بھی مقرر کئے گئے تھے۔

ان تمام اصلاحات کا یہ نتیجہ ہوا کہ ایک طرف رعایا خوشحال ہو گئی، تنی خوشحال کہ صدقہ لینے کے لئے کوئی حاجتمند باقی نہیں رہا اور دوسری لوگوں میں مذہبی انہماک پیدا ہو گیا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کا عہد حکومت اور ان کی اصلاحات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قبل از وقت دنیا میں آگئے تھے۔ ان کے عہد کی بہت سی باتیں بالکل جدید ہیں یعنی ایسی ہیں جو آج بھی شائستہ دنیا میں مروج ہیں۔ ان کے عہد حکومت کا موجودہ زمانے کی بہترین حکومت سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کا یہ فرمانا کہ تم میری پیروی کرو اس وقت تک کہ میں کتاب اللہ و سنت رسول پر چلوں، ثبوت ہے اس امر کا کہ وہ جانتے تھے کہ وہ رعایا کی اطاعت اس وقت تک حاصل نہیں کر سکتے جب تک راعی کی حیثیت سے وہ اپنے فرائض بھی طرح ادا نہ کریں۔ حکومت کے بارے میں ان سے سوال و جواب کئے جا سکتے تھے۔ عمر بن عبدالعزیز اس لئے خلیفہ نہیں بنے تھے کہ اپنے عیش و عشرت کی خاطر اپنا گھر دولت سے بھر لیں، عیش و تنعم کی زندگی بسر کریں اور لہو و لعب میں اپنا وقت گذاریں۔ ان سے پہلے جو اموی خلفا گذرے، انہوں نے ملوکیت اختیار کر لی تھی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنی پاکیزہ مثال سے بتا دیا کہ خلیفہ قوم کا ایک خادم ہے اور اس سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ ان کے عہد کے متعدد مسائل ہمارے عہد کے مسائل کی طرح ہیں اور ضرورت ہے کہ انہیں بھی اسی اصول کے مطابق حل کیا جائے جو اصول انہوں نے اپنے پیش نظر رکھا تھا یعنی کتاب اللہ اور سنت رسول سے تمسک۔ اسی میں مسلمانوں کی فلاح ہے[1]۔

---

[1] اس مضمون کی تیاری میں مولانا عبدالسلام ندوی کی کتاب "سیرت عمر بن عبدالعزیز" میرے پیش نظر رہی ہے۔ نیز صلاح الدین خدابخش کی کتاب "اسٹڈیز انڈین اینڈ اسلامک" سے بھی فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

یادِ رفتگاں

پروفیسر محمد الیاس برنی مرحوم

ماہر القادری

چند مہینے ہوئے کہ نواب امین صاحب اشک رامپوری اللہ کو پیارے ہو گئے! داغ کے ایک قابل فخر شاگرد تھے محمود رامپوری داغ کے رنگ میں کامیاب غزل گو، اشک رامپوری انہی سے نسبت تلمذ رکھتے تھے۔ اشک رامپوری کی ایک تو وہ زندگی تھی کہ کوٹ پتلون، کالر اور ٹائی سے ملبس رہتے۔ سات سال انگلستان اور فرانس کی رنگین فضاؤں میں بسر کئے، اور اب آخر میں وہ بالکل بدل گئے تھے، مونچھ شرعی بال، ڈاڑھی، صوفیانہ وضع قطع! گولڑہ شریف کی خانقاہ کے ایک حجرے میں لنگر کا کھانا کھا کر اللہ تعالیٰ کا شکر بھیجتے!

اشک رامپوری کے ایسے شعر —

ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے ہیں اب وحشت میں　　　ہائے دامن نہ ہوا، ہائے! گریباں نہ ہوا

کاغذ پر نہیں، دلوں پر نقش رہیں گے۔

اشک مرحوم کے بعد خیام الہند حیدر دہلوی نے رخت سفر باندھا، اور اپنے پیچھے ہزاروں عقیدت مندوں کو سوگوار چھوڑا حیدر مرحوم شعرگوئی میں حیرت انگیز قدرت رکھتے تھے، سینکڑوں شاگردوں کو ان کی ذات سے فائدہ پہنچا اور نہ جانے کس کس کو صاحب دیوان بنادیا، جو شاعر اتنے بلند پایہ شعر کہتا ہو:-

چمن والوں سے مجھ صحرا نشیں کی بودوباش اچھی　　　بہار آکر چلی جاتی ہے ویرانی نہیں جاتی

ابھی ماحول معیار سخن میں پست ہے حیدر　　　یکایک ہر بلند آواز پہچانی نہیں جاتی

اس کے اٹھ جانے سے اردو زبان و ادب کو کتنا نقصان پہنچا ہوگا۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی موت بھی علم و ادب کا ایک سانحہ ہے، مرحوم برسوں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن میں فلسفہ کے پروفیسر رہے ہیں، اب کئی سال سے ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے ناظم اعلیٰ تھے۔ رومی اور اقبال کے فلسفہ اور کلام پر ان کے بڑے معرکے کے مضامین شائع ہوئے ہیں، اردو اور انگریزی دونوں زبانوں کے انشا پرداز تھے، علامہ اقبال کی ہم نشینی بلکہ بے تکلفی کا انہیں فخر حاصل تھا، بعض دینی عقائد میں شدید اختلاف کے باوجود، ان کی علمی منزلت کا میں ہمیشہ معترف رہا ہوں، جس دن ان کا انتقال ہوا ہے، اُسی شب پیچ لگژری ہوٹل میں انہیں دیکھا اور علیک سلیک بھی ہوئی، وہ ایک انگریز مستشرق سے بات چیت کر رہے تھے۔ انہی مستشرقین کے اعزاز میں ایک استقبالیہ دیا گیا تھا!

یہ داغ ابھی تازہ ہی تھے کہ ایک دن شام کو جناب ظفر احمد انصاری کے یہاں مولانا خلیل الرحمٰن نعمانی کی زبانی سب سے پہلے غم انگیز خبر سنی کہ پروفیسر الیاس برنی کا انتقال ہو گیا، میں نے کہا کہ اخباروں میں اس حادثہ کی کوئی اطلاع شائع نہیں ہوئی، یہ خبر اللہ نے چاہا تو غلط ثابت ہوگی اگر ہمارے چاہنے سے کیا ہوتا ہے، ہوتا تو وہی ہے جو اللہ چاہتا ہے، پھر موت ہر جان کے لئے مقدر کر دی گئی ہے، اس سے کسی کو مفر نہیں!

اس خبر نے طبیعت کو ملول و مکدر کر دیا، دوسرے تیسرے دن روزنامہ "تسنیم" میں الیاس برنی مرحوم کی موت پر ایک "شذرہ"

نظر سے گذرا، اور اس کے بعد مرحوم کے نواسہ کا کارڈ مجھے ملا:-

اسلام علیکم! مولانا الیاس برنی صاحب میرے حقیقی نانا ہیں۔ آپ کا پتہ وہ خود اپنے ہاتھ سے لکھ کر مکان پر رکھ گئے تھے، اپنی ہمشیرہ سے ملنے اپنے وطن بلند شہر تشریف لے گئے تھے، جہاں پر بحالت صحت اچانک ۲۶ جنوری کو ان کا وصال ہو گیا ہے۔ میں آپ کو اطلاعاً لکھ رہا ہوں، میرا پتہ یہ ہے:-

فاروق حسن برنی، بیت السلام، سیف آباد، حیدرآباد دکن۔

پروفیسر محمد الیاس برنی مرحوم بلند شہر (برن) کے رہنے والے تھے، میرا وطن بھی اسی ضلع (بلند شہر) کا ایک گاؤں — کیسر کلاں — ہے۔ جو بلند شہر سے دور اور علی گڑھ سے قریب ہے، مرحوم نے شروع شروع میں، ایم اے، اور کالج علی گڑھ میں لیکچراری کی خدمت انجام دی، پھر وہ حیدرآباد دکن چلے گئے، وہاں عثمانیہ یونیورسٹی میں برسوں پروفیسر رہے، اس کے بعد دارالترجمہ کے ناظم ہو گئے، پھر جامعہ عثمانیہ کے رجسٹرار (REGISTERAR) کی حیثیت سے بھی کام کیا۔

پروفیسر الیاس برنی مرحوم نے "علم المعیشت" کے نام سے ایک معتبر کتاب لکھی، اور "مناظر قدرت" کے عنوان سے اردو نظموں کا انتخاب چھپوایا، جو بہت مقبول ہوا اور عثمانیہ یونیورسٹی کے نصاب میں بھی (غالباً) کئی برس شامل رہا!

مرحوم کا سب سے بڑا کارنامہ "قادیانی مذہب" کی تالیف ہے، یہ تالیف ان کے نام کو زندہ رکھے گی اور آخرت میں ان کے لئے۔ انشاءاللہ ذریعۂ مغفرت اور وسیلۂ نجات بن جائے گی،

قادیانیت کی تردید میں اس کتاب نے جو کارِ عظیم انجام دیا ہے، اس کے موافق و مخالف سب معترف ہیں!

میں نے آج سے تقریباً چوبیس سال پہلے انہیں سب سے پہلے قاضی عبدالغفار مرادآبادی مرحوم (مصنف "لیلیٰ کے خطوط") کے یہاں حیدرآباد دکن میں دیکھا تھا، اس کے بعد دو چار مہینہ کے فصل سے کہیں نہ کہیں آمنا سامنا ہو جاتا! مجھے یاد پڑتا ہے کہ مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم و مغفور اور مولانا عبدالباری ندوی ایک بار مجھے میرے گھر سے صوفی محمد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں لے گئے تھے، تو اس محفل میں الیاس برنی مرحوم موجود تھے!

"فاران" کی اشاعت کے بعد پروفیسر الیاس برنی مرحوم سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا، اور تعلقات بڑھتے ہی چلے گئے، وہ اپنی ہر نئی کتاب "فاران" میں تبصرے کے لئے بھیجتے رہے، ایک دو کتابچوں میں اپنی محبت سے اس ہیچمدان کا ذکر بھی کیا، انھوں نے ایک بار اپنی "نظموں" (؟) کا مجموعہ بھیجا تو میں نے مرحوم کو لکھا کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے "موزونِ طبع" نہیں بنایا، اس لئے "نظموں کی اشاعت ہمیشہ کے لئے روک دیجئے، یہ بات آپ کے منصب سے فروتر ہے۔ میری اس تنقید اور صاف گوئی کا انھوں نے برا نہیں مانا۔

چند مہینے پہلے الیاس برنی مرحوم نے "قادیانی قول و فعل" کا دوسرا حصہ تبصرے کے لئے بھیجا تھا اس کے بعد "یازدہم شریف" — کا ایک مطبوعہ دعوتی کارڈ میرے نام آیا میں نے اس کے جواب میں لکھا کہ اس قسم کے معمولات اور رسموں کا کتاب و سنت میں کہیں پتہ نہیں چلتا لہٰذا ان کے کرنے سے کوئی دینی فائدہ نہیں ہو سکتا — اس کے بعد پھر ان کا کوئی خط نہیں آیا، ان کے انتقال ہی کی ملال انگیز خبر ملی۔

پروفیسر الیاس برنی مرحوم کو ذاتِ رسالت مآب سے والہانہ عقیدت تھی، تصوف کی طرف طبیعت کا خاص میلان تھا، صاحب ذکر و فکر بزرگ تھے، متناسب قد، گوری رنگت، خوب صورت خدوخال، گندمی چہرے پر داڑھی کتنی بھلی لگتی تھی! ظاہر و باطن

دونوں حسین! اللہ تعالیٰ اُن کی قبر کو اپنی رحمت کے پھولوں سے چھپا دے اور اُن کی روح کو ابدی سکون و مسرت عطا فرمائے (آمین)
یہ سطریں لکھتے ہوئے اپنے نفس کی دراز دستیوں کے احساس سے دل کتنی کچوٹ و اذیت محسوس کرتا ہے ــــ موت و آخرت سے کتنی غفلت ہے، دنیا کے چٹخاروں سے کس قدر دلچسپی ہے، ماحول اور معاشرے کے سر سارا الزام کیوں ڈھلئے، خود اپنی ذات ہی پر تعزیر کرنی چاہیے۔ (اَللّٰھُمَّ قلّب قلبی اِلیٰ ذکرک وطاعتک)

زمزمۂ نعت و مناقب

بشیر فاروق

ڈرتے نہیں باطل سے فدایانِ محمدؐ
شاہوں کو جھکاتے ہیں غلامانِ محمدؐ
ابھرے گا زمانے میں ابھی نقشِ وفا اور
نکھرے گا ابھی اور گلستانِ محمدؐ
کچھ فرش نشینوں پہ ہی موقوف نہیں ہے
کچھ عرش نشیں بھی ہیں ثنا خوانِ محمدؐ
یارانِ وفا کیش کی پہچان یہی ہے
سر دے کے بجا لاتے ہیں فرمانِ محمدؐ
جچتے نہیں دارا و سکندر بھی نظر میں
ہم سے کوئی پوچھے کہ ہے کیا شانِ محمدؐ
اے صبحِ بہاراں نہیں کچھ تجھ ہی پہ موقوف
ہم بھی ہیں فدائے رخِ تابانِ محمدؐ
فاروق نہیں دورِ حوادث کا ہمیں خوف
چلتے ہیں تہِ سایۂ دامانِ محمدؐ

اسلام زندہ ہے

راسخ عرفانی

غلامانِ محمدؐ کا جہاں میں نام زندہ ہے
بفضلِ ایزدِ باری ابھی اسلام زندہ ہے
کروڑوں قلب روشن ہیں ابھی تنویرِ قرآں سے
خدائے مہرِ یزل کا آج بھی پیغام زندہ ہے
غمیں بت شکن کی ہے ضرورت پھر زمانے کو
ابھی آذر کے دل میں حسرتِ اصنام زندہ ہے
وفا کے نقش ابتک مرتسم ہیں لوحِ گیتی پر
شہیدانِ رہِ صدق و صفا کا نام زندہ ہے
نظر سوئے فلک ہے منتظر ہے ابرِ رحمت کا
اگرچہ جاں بلب ہے پھر بھی تشنہ کام زندہ ہے
ملے موقعہ کبھی راہِ خدا میں جان دینے کا
اسی اُمید پہ یہ راسخِ بدنام زندہ ہے

نوائے سروش

احمد نسیم مینا نادری

خودی کی ہر نوا پیغمبرانہ — خودی کا ہر قدم ہے غازیانہ
اثر باقی تھا کچھ بانگِ جرس میں — پلٹ آیا میری جانب زمانہ
میرے خوابیدہ احساس دروں کو — جگاتی ہے نمازِ پنجگانہ
قفس جل جائے گا سوزِ دروں سے — زباں تک آ گیا غم کا فسانہ
نظر آتی ہے ہر لغزش قدم کی
دھرا ہے سامنے آئینہ خانہ

دو شعر

بدل ہی جائیں گے اربابِ انجمن بھی کبھی
اسی طرح اگر اندازِ انجمن بدلے

(تابش دھلوی)

زباں ساکت نظر محوِ فغاں ہے
یہ اپنا اپنا اندازِ بیاں ہے

(جام نوائی بدایونی)

فردوسِ غزل

شفقت کاظمی

نہ تھا کوئی اُس غم کا حاصل نہ تھا
مری زندگی میں جو شامل نہ تھا
زمانے میں تھے خوش ادا اور بھی
مگر کوئی تیرا مقابل نہ تھا
تری یاد مجھ پر جو تھی مہرباں
تری یاد سے میں بھی غافل نہ تھا
تعارف کی نسبت بھی کچھ کم نہ تھی
ترا قرب ہر چند حاصل نہ تھا
زمانے سے قطعِ نظر تھا درست
زمانہ توجہ کے قابل نہ تھا
اُداسی تھی ہر سمت چھائی ہوئی
مرے بعد وہ رنگِ محفل نہ تھا

کوثر نیازی

جلوہ فرما ہیں سرِ بزم تو پنہاں کیوں ہیں
اور پردوں میں چھپے ہیں تو وہ عریاں کیوں ہیں
باوجودِ ہمہ اظہارِ کمالاتِ بشر!
دوستو! حشر کے آثار نمایاں کیوں ہیں؟
کیا مرا چاند نکلنے کو ہے اے ہم سفرو!
میری پلکوں پہ ستارے سے یہ لرزاں کیوں ہیں؟
جب وُہی سلسلہ جُنبیاں ہیں تو کوثر صاحب!
آپ آرام میں خوش غم میں پریشاں کیوں ہیں؟

سرکارِ محمدؐ ہی مرے واسطے بس ہے
ہونے دو درِ غیر اگر بند ہوا ہے
جس روزنے سے دل میں رہائی کی تمنا
اُس روزنے سجدوں پہ اثر بند ہوا ہے
یہ کہہ کے مجھے حشر میں فردوس کو بھیجا
کوثر مرے رستے میں نظر بند ہوا ہے

ابھی حیات کو تاریکیوں نے گھیرا ہے
جدھر بھی آنکھ اٹھاؤ بڑا اندھیرا ہے
شبِ سیاہ سے اہلِ سفر نہ گھبرائیں
شبِ سیاہ کی آغوش میں سویرا ہے

نصیب ہو نہ سکی جن کو دید کی نعمت
وہ بدنصیب نگاہیں سلام کہتی ہیں

کیفی دیوبندی

دلِ مضطر نے مرنے کی تمنا عمر بھر کی ہے
نہ پوچھو داستانِ زیست کیسے مختصر کی ہے
انہیں بھی دیکھ جن کی عمر گذری ہے سسکتے میں
تری تکلیف تو اے شمعِ سوزاں رات بھر کی ہے
نہیں آسان ہر خواہش غمِ جاناں پہ تج دینا
مگر میرے دلِ مضطر نے یہ منزل بھی سر کی ہے
تمنائیں ہیں لاکھوں کم ہے لیکن فرصتِ ہستی
اقامت کے ارادے ہیں مگر حالت سفر کی ہے
یہاں بیتاب ہے دل اس طرف کاکل پریشاں ہیں
جو عالم اس طرف کا ہے وہی حالت اُدھر کی ہے
عجب کیا شانِ رحمت ڈھانپ لے میرے گناہ ہر چہ
خدا کی ہے مگر ان کی عطا کو دیکھ کر کی ہے
نگاہِ سا حلِ کیا ڈرا رہے ہیں مجھے کیفی
میں طوفاں میں پلا ہوں عمر موجوں میں بسر کی ہے

لہ جوہر کے رنگ میں یہ تین اشعار زمانۂ اسیری کی یادگار ہیں۔ (کوثر نیازی)

روحِ انتخاب

حضورِ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا حقیقی مقصد دنیا کو برگزیدہ اور پسندیدہ اخلاق کی تعلیم دینا تھا، جیسا کہ خود ارشاد فرمایا

بعثت لاتمم مکارم الاخلاق

صحابہ کرام کو براہِ راست اس سرچشمۂ اخلاق سے سیراب ہونے کا موقعہ ملا تھا۔ اس لئے اس مقدس جماعت کا ہر فرد اسلامی اخلاق کا مجسم نمونہ تھا۔ لیکن حضرت عمرؓ کو بارگاہِ نبوی میں جو تقرب خاص حاصل تھا، اس کے لحاظ سے اُن کو زیادہ حصہ ملا، وہ محاسن و معالی کی مجسم تصویر تھے، ان کے آئینۂ اخلاق میں خلوص، انقطاع الی اللہ، لذائذِ دنیا سے اجتناب، حفظِ لسان، حق پرستی، راست گوئی، تواضع اور سادگی کا عکس سب سے زیادہ نمایاں نظر آتا ہے، یہ اوصاف آپ میں ایسے راسخ تھے کہ جو شخص آپ کی صحبت میں رہتا تھا، وہ بھی کم و بیش متاثر ہو کر اُسی قالب میں ڈھل جاتا تھا۔

حضرت مسور بن مخرمہ کا بیان ہے کہ ہم اس غرض سے حضرت عمرؓ کے ساتھ رہتے تھے کہ ان سے پرہیزگاری اور تقویٰ سیکھیں، عہدِ فاروقی کے افسروں اور عہدیداروں کے حالات بغور مطالعہ کرو، تم کو معلوم ہوگا کہ وہ سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔

حضرت عمرؓ خضوع و خشوع کے ساتھ رات بھر نمازیں پڑھتے، صبح ہونے کے قریب گھر والوں کو جگاتے، حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نماز پڑھ رہے تھے۔ جب اس آیت پر پہنچے۔

اِنَّ عذابَ رَبِّکَ لواقع مالہ من دافع　　تیرے رب کا عذاب یقینی ہوکر رہنے والا ہے، اس کو کوئی دفع کرنے والا نہیں تو بہت متاثر ہوئے اور روتے روتے آنکھیں سوج گئیں۔

آپ جمالِ نبوت کے سچے شیدائی تھے۔ ان کو اس راہ میں جان، مال، اولاد اور عزیز و اقارب کی قربانی سے بھی دریغ نہ تھا۔ عاصی بن ہشام جو حضرت عمرؓ کا ماموں تھا، معرکۂ بدر میں خود ان کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواجِ مطہرات سے ناراض ہو کر علیحدگی اختیار کرلی، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ خبر سُن کر حاضرِ خدمت ہونا چاہا، جب بار بار اذن طلب کرنے پر بھی اجازت نہ ملی تو پکار کر کہا۔ " خدا کی قسم میں حفصہؓ کی سفارش کرنے کے لئے نہیں آیا ہوں، اگر رسول اللہؐ حکم دیں تو میں اس کی گردن مار دوں "۔

حضرت عمرؓ کا جسم کبھی نرم و ملائم کپڑے سے مَس نہیں ہوا، بدن پر بارہ بارہ پیوند کا کرتہ، سر پر پھٹا عمامہ اور پاؤں میں پھٹی جوتیاں ہوتی تھیں، اسی حالت میں وہ قیصر و کسریٰ کے سفیروں سے ملتے تھے اور وفود کو باریاب کرتے تھے!

ایک دفعہ گزی کا کرتہ ایک شخص کو دھونے اور پیوند لگانے کے لئے دیا، اس نے اس کے ساتھ ایک نرم کپڑے کا کرتہ پیش کیا، حضرت عمرؓ نے اس کو واپس کر دیا، اور اپنا کرتہ لے کر کہا کہ اس میں پسینہ خوب جذب ہوتا ہے۔

قناعت کا یہ حال تھا کہ اپنے زمانۂ خلافت میں چند برس تک مسلمانوں کے مال سے ایک خرمہرہ نہیں لیا حالانکہ فقر و فاقہ سے حالت تباہ تھی۔ ایک دفعہ ربیع بن زیاد حارثی نے کہا۔ امیر المومنین! آپ کو خدا نے جو مرتبہ بخشا ہے، اس کے لحاظ سے آپ دنیا میں سب سے زیادہ عیش و نشاط کی زندگی کے مستحق ہیں، حضرت عمرؓ بہت خفا ہوئے اور فرمایا " میں قوم کا امین ہوں، امانت میں خیانت کب جائز ہے "

اپنے وسیع کنبہ کے لئے بیت المال سے صرف دو درہم روزانہ لیتے ہاور تکلیف و عسرت کے ساتھ زندگی بسر کرتے، ایک حج میں ۸۰ درہم صرف ہو گئے۔ تو اس کا افسوس ہوا اور اسے اسراف تصور کیا، کپڑے پھٹ جاتے تھے، لیکن اس خیال سے کہ بیت المال پر بار نہ پڑے پیوند پر پیوند لگاتے جاتے تھے، حضرت امام حسن رضؓ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ خطبہ دے رہے تھے، میں نے شمار کیا تو اُن کے تہہ بند پر بارہ پیوند لگے ہوتے تھے۔

ایک دفعہ بازار میں ایک فربہ اونٹ فروخت ہوتے دیکھا، دریافت سے معلوم ہوا کہ آپ کے صاحبزادے عبداللہ کا ہے، ان سے پوچھا اونٹ کیسا ہے؟ انھوں نے کہا کہ میں نے اسے خرید کر سرکاری چراگاہ میں بھیج دیا تھا، اور اب کچھ فربہ ہو گیا ہے، تو بیچتا ہوں ۔۔۔۔۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کیونکہ یہ سرکاری چراگاہ میں فربہ ہوا ہے، اس لئے تم صرف راس المال کے مستحق ہو، اور بقیہ قیمت کو بیت المال میں داخل کر دی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عظمت و شان اور رعب و داب کا ایک طرف تو یہ حال تھا کہ محض نام سے قیصر و کسریٰ کے ایوانِ حکومت میں لرزہ پیدا ہو جاتا۔ دوسری طرف تواضع و خاکساری کا یہ عالم تھا کہ کاندھے پر مشک رکھکر بیوہ عورتوں کے لئے پانی بھرتے تھے، مجاہدین کی بیوی کا بازار سے سودا سلف خرید کر لا دیتے تھے، پھر اسی حالت میں تھک کر مسجد کے کسی فرشِ خاک پر لیٹ جاتے تھے آپ کو بارہا سفر کا اتفاق ہوا لیکن خیمہ و خرگاہ کبھی ساتھ نہیں رہا، درخت کا سایہ شامیانہ اور فرشِ خاک بستر تھا۔ سفر شام کے موقعہ پر مسلمانوں نے اس خیال سے کہ عیسائی امیرالمومنین کے معمولی لباس اور بے سر و سامانی کو دیکھ کر اپنے دل میں کیا کہیں گے؟ سواری کے لئے ترکی گھوڑا اور پہننے کے لئے قیمتی لباس پیش کیا، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ خدا نے جو عزت ہم کو دی ہے، وہ اسلام کی عزت ہے اور ہمارے لئے یہی بس ہے!

ایک دن صدقہ کے اونٹوں کے بدن پر تیل مل رہے تھے۔ ایک شخص نے کہا امیرالمومنین! یہ کام کسی غلام سے لیا ہوتا، بولے مجھ سے بڑھ کر کون غلام ہو سکتا ہے، جو شخص مسلمانوں کا والی ہے وہ اُن کا غلام بھی ہے۔

ایک بار حضرت زید بن ثابت قاضی مدینہ کی عدالت میں مدعاعلیہ کی حیثیت سے گئے تو انھوں نے تعظیم کے لئے جگہ خالی کر دی حضرت عمرؓ نے کہا "تم نے اس مقدمہ میں یہ پہلی ناانصافی کی"۔ یہ کہہ کر اپنے فریق کے برابر بیٹھ گئے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خود نمونہ بن کر مسلمانوں کو مساوات کا ایسا درس دیا تھا کہ حاکم و محکوم اور آقا و غلام کے سارے امتیازات اٹھ گئے تھے۔

(خلفائے راشدین)

ہماری نظر میں

دین و شریعت | از:- مولانا محمد منظور نعمانی، ضخامت ۲۸۸ صفحات۔ (مجلد، گرد پوش کے ساتھ) کتابت، طباعت کاغذ، ہر چیز خوب سے خوب تر اور جاذب نظر و دیدہ افروز! قیمت:- تین روپے،

ملنے کا پتہ:- کتب خانہ "الفرقان" کچہری روڈ، لکھنو (بھارت)

جناب مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ عالم باعمل ہیں، اقامتِ صلوٰۃ، تعلق باللہ اور خشیت و تقویٰ کے وہ اس دور میں بہت بڑے داعی ہیں، اور اللہ کے فضل سے اس "دعوت" کا اک زندگی نمونہ بھی ہے! وہ دُعائے نیم شبی اور آہِ سحر گاہی کی لذت سے بھی واقف ہیں اور رات کی تنہائیوں میں اللہ تعالیٰ کے حضور آنسوؤں کے نذرانے بھی پیش کرتے ہیں!

مولانا موصوف کی یہ کتاب ——— دین و شریعت ——— اُن کے دینی اخلاص، تزکیۂ نفس، تجربہ و مشاہدہ، علمی تبحر اور اصلاحِ امت کی پُرخلوص کوشش کا بولتا ہوا ثبوت ہے، کتاب:-

عقائد و ایمانیات ——— توحید ——— عقیدۂ آخرت ——— رسالت ——— عملی شریعت ———

اخلاق حسنہ ——— معاملات اور معاشرت ——— احسان و تصوف ———

جیسے اہم، اور ایمان افروز ابواب پر مشتمل ہے، ہر باب میں متعدد فصول ہیں، جن کی مجموعی تعداد ۲۶ تک پہنچ گئی ہے۔

فاضل مصنف کا انداز بیان بڑا شیریں اور دل نشین ہے، "از دل خیزد، بر دل ریزد" کی کیفیت جگہ جگہ محسوس ہوتی ہے، عام مسلمانوں کی ان دنوں جو دینی حالت اور زندگی کے احوال ہیں اُن کو ذہن میں رکھ کر یہ کتاب مُرتب کی گئی ہے! مضامین کی تبویب بھی خوب ہے، اور اُن کی تشریح و تفصیل خوب تر!

"...... بہ ظاہر خدا کا انکار کرنے والوں کو جب ٹٹولا گیا، تو اندازہ ہوا کہ اُن کے بھی دل کے کسی گوشہ میں خدا کی ہستی کا اقرار چھپا ہوا موجود ہے"

منکرین خدا کی نفسیات کا کتنا نازک تجزیہ کیا گیا ہے۔

جو لوگ شرک و بدعات میں مبتلا ہیں، اور ادعائے توحید کے باوجود کسی عنوان سے "صنم پرستی" کرتے ہیں، اُن کی "نفسیات" کا مُصنف نے کتنا اچھا تجزیہ فرمایا ہے:-

"ہم نے اس پر بہت غور کیا ہے، اور آخر میں ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ سب مُشرکین یہ سمجھتے تھے اور سمجھتے ہیں کہ اللہ کو راضی کرنا اور خوش کرنا، اور پھر اُس سے اپنے کام کرا لینا تو بہت مشکل ہے، کیونکہ اللہ تو جب راضی ہوگا، جب اُس کے بتلائے ہوئے سب مذہبی احکام پہ چلا جائے، جھوٹ نہ بولا جائے، بے ایمانی نہ کی جائے، کسی کو دھوکا نہ دیا جائے، کسی کا حق نہ مارا جائے، ہر حرام اور ناپاک کاموں سے بچا جائے، اور پاک زندگی گزاری جائے ——— اور یہ

ان مشرکوں کے لئے بہت مشکل ہے، یہ تو ساری عمر پاپڑ بیلنا ہوا۔ اس لئے وہ خدا کو راضی کرکے
اس سے اپنا کام کرانے سے مایوس ہو گئے اور اس کے سوا انھوں نے جن جھوٹی سچی دنیوی یا فرضی
ہستیوں کو حاجت روا اور نفع و نقصان کا مختار سمجھ رکھا ہے، ان کے متعلق ان کا خیال ہے کہ ان
کو صرف پانچ پیسے کے بتاشوں سے راضی کرکے یا ان کے سامنے بس ڈنڈوت اور سجدہ کرکے
دو چار پیسے کے ہار پھول چڑھا کر اور ایک چراغ جلا کے سارے کام کرائے جا سکتے ہیں ـــ
ہمارے نزدیک شرک کی جڑ بنیاد یہی دھوکا ہے۔"

معتزلہ پر صرف دو جملے لکھے ہیں، اور اُن کی ساری حقیقت کھول کر رکھ دی ہے۔ـ

"معتزلہ جن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دین کے بارے میں عقل پر اس سے زیادہ بوجھ ڈالتے ہیں جتنا کہ وہ بیچاری اٹھا سکتی
ہے، اور جو ہر دینی حقیقت کو اپنی عقل سے سمجھ لینے کے بعد ماننا چاہتے ہیں۔"

اس جملہ میں :ـ

"۔۔۔۔ اس معجزے کو بڑی صفائی کے ساتھ سمجھ سکیں گے۔" (صفحہ ۹۹)

"صفائی" کی جگہ سہولت یا آسانی جیسے کسی لفظ کی ضرورت تھی۔

"اللہ تعالیٰ کے ساتھ کہیں کہیں "فعل جمع" ملتا ہے ۔۔۔۔۔۔ مثلاً
"اللہ تعالیٰ اُسے با عفت بنا دیں گے۔" (صفحہ ۲۸۲۔ حاشیہ)

اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلالت اور شانِ تفرید و توحید کے پیشِ نظر "فعل واحد" ہی کا لانا زیادہ مناسب ہے، مولانا نعمانی صاحب نے
بعض دیو بندی علماء کی تقلید میں کہیں کہیں یہ انداز بیان اختیار فرمایا ہے۔ـ

"اجتہاد کے سلسلہ میں ایک یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ یہ ہر ایک کا کام نہیں ہے، جن بزرگوں نے
یہ کام کیا، ان کا کتاب و سنت کا علم نہایت ہی وسیع تھا۔ انھوں نے ان لوگوں کو دیکھا تھا، بلکہ
ان ہی سے علم دین حاصل کیا تھا، جنھوں نے دینی تعلیم و تربیت براہِ راست صحابہ کرام سے
یا اُن کے خاص شاگردوں سے حاصل کی تھی؛ پھر اس مستند اور وسیع علم اور اس تعلیم و تربیت
کے علاوہ ان میں تعلق باللہ اور تقویٰ اعلیٰ درجہ کا تھا۔ دراصل یہ کام انہیں کا تھا، جن سے اللہ
تعالیٰ نے اس کو لیا۔" (صفحہ ۸۳)

اس عبارت سے تو ایسا مترشح ہوتا ہے، جیسے ائمہ مجتہدین کے بعد "اجتہاد" کا دروازہ ہی بند کر دیا گیا! "نبوت و رسالت" کا دروازہ تو
بے شک ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا گیا ہے مگر "اجتہاد" کی ضرورت ہر دور میں باقی رہے گی اور اس "حق" کو علماء حق استعمال فرما کر اُمتِ
مسلمہ کے لئے آسانیاں اور سہولتیں مہیا کرتے رہیں گے! ہاں، یہ ضرور ہے کہ "اجتہاد" کا حق ہر کس و ناکس کو نہیں دیا جا سکتا، یہ تو بڑی
نازک ذمہ داری ہے، جس سے وہی علماء عہدہ برآ ہو سکتے ہیں؛ جو دین و شریعت کے مزاج سے واقف ہوں، اور کتاب و سنت کی حدود
میں رہ کر، اجتہاد فرمائیں، ایسا اجتہاد اُمتِ مسلمہ کے لئے رحمت ہے اور اس رحمت کو شدتِ احتیاط کی بنا پر رد کرنا نہیں چاہیئے۔

صفحہ ۸۵ پر جو یہ فرمایا گیا ہے کہ :ـ

"اللہ تعالیٰ نے غیبوں کے لئے اپنے نبیوں کو معجزات بھی دیئے ہیں ۔۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔ بہرحال معجزہ

پیغمبر یا پیغمبری کی ضرورت نہیں بلکہ غبی انسانوں کی ضرورت ہے ۔ ۔ ۔ :

اس میں "اضطراب" پایا جاتا ہے ، بات پوری طرح صاف نہیں ہوئی ، اور اس کو اگر کلیہ مان لیا جائے کہ "معجزات" صرف غبی انسانوں کے لئے ظہور میں آئے ہیں ، تو یہ بات درست نہیں ہے ، "معجزہ" خود اہل ایمان کی ضرورت کے لئے بھی ظہور میں آتا ہے ۔ مثلاً حضور کی دعا اور برکت سے کھانے (شوربہ ، کھجور ، دودھ وغیرہ) کی تھوڑی سی مقدار کا وافر ہو جانا ، باطشت میں حضور کی انگلیوں سے پانی کا دھاروں کا جاری ہو جانا ، یا غزوۂ خیبر میں حضور کے لعاب دہن لگا دینے سے علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی دکھتی آنکھوں کا اچھا ہو جانا ۔

اس کتاب کا ایک باب "احسان و تصوف" بھی ہے ، فاضل مصنف تو جو "دین خالص" کے داعی ہیں ، انہیں "احسان اور تزکیۂ نفس" خالص دینی اصطلاحات اس مفہوم کے لئے بولنی چاہیئے تھیں ۔ "تصوف" دین خالص کی اصطلاح نہیں ہے ۔

جہاں تک احسان اور تزکیۂ نفس کا تعلق ہے ، اس کی ضرورت ، اہمیت اور افادیت میں کوئی مسلمان شبہ نہیں کر سکتا "تصوف" کتاب و سنت کی حدود میں رہ کر اس ضرورت کو جس حد تک پورا کرتا ہے ۔ اس کی افادیت کے ہم معترف ہیں اور تصوف ہی پر کیا منحصر ہے ، علم کلام ، فلسفہ و منطق بھی جس حد تک دین کے لئے مفید ثابت ہوں ، اُن کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔

عہد رسالت اور دور صحابہ و تابعین میں اہل ظاہر اور اہل باطن کی تفریق نہیں پائی جاتی اور (تقریباً) فقہ و حدیث کے اکابر ائمہ کے دور تک بھی شریعت ہی سب کچھ تھی ۔ اعمال کی ظاہری درستی سے لے کر تزکیۂ باطن تک "شریعت" ہی اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ہر اعتبار سے کافی تھی ، مگر جب سے "تصوف" کا آغاز ہوا اہل ظاہر اور اہل باطن کی تفریق پیدا ہو گئی ، یہاں تک کہ شریعت کو طریقت سے بلند سمجھا جانے لگا ، اور ارباب باطن (صوفیا) کو اہل ظاہر (علماء کتاب و سنت اور محدثین و فقہا) پر ترجیح دی جانے لگی : اور عام طور پر صوفیائے کرام ہی کو "اولیا ءاللہ" سمجھا جانے لگا !

تصوف اگر صرف "تزکیۂ باطن اور احسان" کا نام ہوتا تو صحابہ کرام کے بعد حضرت امام ابو حنیفہ اور حضرت امام مالک رحمہما اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر مصفیٰ ، مزکیٰ ، اور احسان کے تقاضوں کا جاننے والا اور کون ہو سکتا تھا ، مگر ان بزرگوں کے نام صوفیائے کرام کی فہرست میں نہیں ملتے ، ان کو ظاہری شریعت کا امام سمجھا جاتا ہے ، "باطن و روحانیت" کی امامت ان سے منسوب نہیں کی جاتی ۔ ظاہر و باطن ، شریعت و طریقت اور علمیت و روحانیت کی اس تفریق و امتیاز کو "ذوق و وجدان" کا زیادہ سے زیادہ — " MARGIN " دے کر بھی سراہا نہیں جا سکتا ، بلکہ اس تصور سے دُکھ ہوتا ہے

"ظاہر و باطن" کی اس تفریق و امتیاز کی زد ائمہ فقہ و حدیث ہی پر نہیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شخصیتوں پر بھی جا کر پڑتی ہے ۔ طریقت کے زیادہ تر سلسلے حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ سے منسوب کئے جاتے ہیں ۔ اس لئے دوسرے اجل صحابہ کو ولایت و روحانیت کا منبع اور علوم باطن کا راز دار اور حامل نہیں سمجھا جاتا ———— حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ قیاس کرنا کہ حضور نے کچھ باطنی علوم اور اسرار و روحانیت دوسروں سے چھپا کر کسی مخصوص شخص کو بتا دیئے تھے ، یہ بہت بڑی تہمت ہے ! نبی کا پیام ، تبلیغ اور تعلیم سب کے لئے عام ہوتی ہے ! باطنی واردات اور قلبی کیفیات کے اُلجھاووں کا یہ خوفناک نتیجہ برآمد ہوا کہ منصور حلاج تصوف کا ہیرو بن گیا ، غیرت توحید اور احترام دین کا یہ تقاضا تھا کہ "انا الحق" کی کھلی کر نفی کی جاتی ، مگر اس پر اس قسم کی شاعرانہ تنقیدیں کی گئیں ۔ ۔ ۔

تھا "انا الحق" حق مگر اک لفظِ گستاخانہ تھا

———— اور ————

منصور کے پردے میں خدا بول رہا ہے

یہ بھی کہا گیا کہ منصور کا ظرف چھوٹا تھا کہ شرابِ معرفت سے چھلک گیا۔ آخری دور کے وہ صاحبِ ارشاد و تصوف جو کتاب و سنت کے بہت بڑے عالم بھی ہیں، ان کی کتابوں تک میں منصور حلاج کے مناقب ملتے ہیں۔ اس تصور و عقیدت نے غیر مکلف لوگوں کو "مجاذیب" اور "بہالیل" کے مقامات و مناصب دے کر عظمتِ دین پر ایک اور ضرب لگائی، اور اسرارِ باطن اور روحانیت کے نام پر غیر ذمہ داریوں کا ایک ایسا دروازہ کھول دیا، جہاں زیادہ سے زیادہ بے معنی اور بڑی سے بڑی بے تکی باتوں کو "رموز" کہا گیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عقیدت کے غلو سے امت کو بچانے کی خاطر صحابہ کا اپنی تعظیم کے لئے کھڑا ہونا تک پسند نہیں فرمایا، مگر تصوف کی دنیا میں کہیں کہیں عقیدت المشائخ کی قدم بوسی سے لیکر سجدۂ تعظیمی تک پہنچ گئی! اور جن بزرگوں کے تجدیدی کارناموں کا امتِ مسلمہ پر احسان ہے، جو عامل بالکتاب والسنت! ہونے میں اپنی مثال آپ تھے، اور جن کے احترام و عقیدت سے ہمارے قلوب لبریز ہیں، ان کے یہاں "تصورِ شیخ" کا معمول اور "قیوم" نئے مقام و منصب کی اصطلاح پڑھ کر حیرت ہوتی ہے! جن بزرگوں کی ساری عمر شرک و بدعت کے رد میں گزری ہے، ان کی شہادت کے بعد "غیبوبیت" کی طرف اُن کے بعض عقیدت مندوں کا دھیان صرف اس لئے گیا کہ تصوف میں اسرار و رموز، باطنی حقائق، تصرف و توجہ اور خاص طور سے "وحدت الوجود" کی ایسی نزاکتیں، وہ باریکیاں پائی جاتی ہیں، جو اس قسم کی مفرط عقیدت کو سہارا دیتی ہیں۔

مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کی زندگی کا خاصہ حصہ شرک و بدعت کی تردید میں گزرا ہے۔ بزرگوں کی قبروں پر جو کچھ ہوتا ہے وہ اس سے واقف ہیں، مگر غلط رسموں اور بدعتوں کے یہ قصر جن نشانوں پر قائم کئے گئے ہیں، ان نشانوں کی دھندلاہٹ نہ جانے کتنے اربابِ تصوف کے معمولات و ملفوظات میں ملتی ہے۔

حافظ شیرازی کی شاعری کے مزاج میں "ہوا و ہوس" داخل ہے، اُن کا تغزل "بادۂ و شاہد" کے محور پر گھومتا ہے، ایران کے معاصر کو اُن کی اندازِ شاعری نے خاصہ متاثر کیا ہے! تھوڑی دیر کے لئے فرض کر لیجئے کہ "شرابِ ناب" اور "معشوقِ چاردہ سالہ" کچھ استعارے ہیں جن میں اسرارِ تصوف کی ترجمانی کی گئی ہے مگر اس قسم کے شعروں کی کیا توجیہہ و تاویل ہو سکتی ہے۔

محتسب خم شکست و من سرِ اُو — سن بالسن والجروح قصاص

اور

آں تلخ وش کہ واعظ "اُم الخبائث" خواند — اشہیٰ لنا و احلیٰ من قبلۃ العذارا

شریعت کے اس کھلے ہوئے استخفاف کے باوجود، یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ بعض ایسے تصوف پسند علماء نے جن کے علم و تقویٰ پر اعتماد کیا جاسکتا ہے، حافظ شیرازی کو "عارف باللہ" قرار دیا ہے۔ اور ان کی غزلوں سے عرفان و تصوف کے نکتے پیدا کئے ہیں۔

"زنار" کو تسبیح پر اور بتکدہ کو حرم پر ترجیح۔ کفر کے مقابلہ میں ایمان کا اور رندی و آوارگی کے مقابلے میں زہد و تقویٰ کا استخفاف! زاہد پر طنز، جنت اور حور و غلمان پر طنز! اس قسم کے تصورات صوفی شعراء کے کلام میں بہ کثرت پائے جاتے ہیں۔ اور اُن کو حقائق و معارف کا ترجمان سمجھا جاتا ہے۔ یہ تلے "بڑھ کر" یہاں تک پہنچ گئی ہے ؎

پروانۂ چراغِ حرم و دیر نہ داند
کافرم عشق مسلمانی مرا در کار نیست

او در من و من در وے چوں بو بہ گلاب اندر
خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ

اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور حضورؐ کے ارشادات ہیں، صحابہ کرامؓ کے آثار اور تابعین عظام اور ائمہ حدیث و فقہ کے حالات و بیانات ہیں، ان کا مزاج ہے دین کی سادگی، اعتدال و سنجیدگی اور توازن و ہمواری! اس کے مقابلہ میں تصوف کا مزاج ہے۔ رنگارنگی، کیف و مستی، شوق کا جوشِ مفرط اور وجد و حال کی فراوانی، یہاں تک کہ:۔

ع۔ ایں خرقۂ مے آلود حافظ زخود بفروشید۔

ع۔ کہ ایں آوارۂ کوئے بتاں آوارہ تر بادا۔

ع۔ العشق اذا تم۔ "ہو اللہ" ایں است۔

اور

مقصود ما بہ دیر و حرم جز حبیب نیست

ہر کجا کنیم سجدہ بہ آں آستاں رسد

صحابہ کرام، تابعین عظام اور ائمہ فقہ و تفسیر و حدیث کے آثار، حالات اور ان کی کتابیں پڑھیے، ان میں نہ کسی نے اپنے "مقامات" کا تعین کیا ہے، نہ ان کے یہاں "دعوے" ملتے ہیں اور نہ کشف و عرفان کے رموز پائے جاتے ہیں! مگر اربابِ تصوف کے حالات و ملفوظات پڑھ کر نمایاں طور پر محسوس ہوتا ہے کہ یہ دنیا ہی کچھ اور ہے! یہاں تک کہ "نبی و صحابہ اور تابعینؒ" کی زبان اور اسلوب بیان سے تصوف کی زبان، طرز و اسلوب اور مصطلحات بھی مختلف ہیں! آخر یہ کس دنیا کا علم و فن ہے اور کس عالم کی تعلیمات ہیں کہ جن سے متاثر ہو کر ایک شخص پر وہ حالات و واردات گزرتے ہیں، جن کا ذکر عام طور پر صحابہ، تابعین اور ائمہ فقہ و حدیث کے تذکروں میں نہیں ملتا!

حال و قال کے اس فرق کو سامنے رکھکر دو ہی باتیں کہی جاسکتی ہیں کہ یا تو صحابہ، تابعین اور ائمہ کی زندگیوں میں کوئی کمی رہ گئی تھی کہ ـــ کتاب و سنت کا علم رکھنے کے باوجود ان پر "احسان و تزکیۂ نفس" کے وہ اسرار منکشف نہیں ہوئے تھے جو ہونے چاہیے تھے اور جن کا نشان صوفیائے کرام کے حالات و واردات میں ملتا ہے۔

یا پھر تصوف کو "دین کی ضرورت" تسلیم نہ کرتے ہوئے ان واردات و حالات کی لوگوں کو دعوت نہیں دی جائے گی اور "ارکانِ دین" کے ساتھ تصوف کا جوڑ نہ ملایا جائے گا اور اس فن کے بعض معمولات، مصطلحات اور حقائق کو "دین" پر غیر ضروری بلکہ خطرناک اضافہ سمجھا جائے گا۔

اس نوبت پر کہا جاسکتا ہے اور تصوف کی مدافعت کرنے والوں نے کہا بھی ہے کہ فقہ و حدیث کی بہت سی اصطلاحیں بعد میں جاکر وضع ہوئی ہیں، مگر ان کو دین پر اضافہ نہیں سمجھا جاتا! ــــــــــــ اس سلسلہ میں صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ ایک طرف تو فنِ حدیث کی صحیح، مشہور، حسن، عزیز، غریب وغیرہ اصطلاحیں ہیں، دوسری طرف تصوف کے فنا فی اللہ، سیر فی اللہ اور سیر باللہ جیسے مصطلحات ہیں، ان کا مقابلہ کر کے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ذہن کن اصطلاحات میں خلجان، اضطراب اور الجھن محسوس کرتا ہے اور نہ صرف الجھن بلکہ خطرے بھی! اور کونسی اصطلاحات سیدھی، سادی، صاف اور واضح ہیں۔

حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے احادیث کی جانچ پڑتال کر کے صحتِ حدیث اور پھر ان کی تدوین کی جو عظیم الشان خدمت انجام دی ہے، اس احسان سے پوری ملتِ اسلامیہ عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔ اگر اللہ اور رسولؐ کے ساتھ اس قدر گہرے تعلق کے باوجود امام بخاری کو اربابِ باطن میں شمار نہ کیا جائے اور نگاہِ تصوف میں وہ "اہلِ ظاہر" قرار پائیں، اور حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جن کا تقویٰ ضرب المثل بن چکا ہے اور جن کی دینی خدمات آفتاب کی روشن ہیں۔ اگر کشف و عرفان کے معاملہ میں کورے سمجھے جائیں، تو اس

نعمانی کی کس سے فریاد کی جائے !

مولانا محمد منظور نعمانی نے اپنی گرانقدر تصنیف (ارکانِ دین) میں کتاب و سنت آثارِ صحابہ در فقہ و حدیث کے مجتہدین کے اقوال کے بعد اس کی کیوں ضرورت کمی اور تشنگی محسوس کی کہ جب تک "تصوف" کی طرف دعوت نہ دی جائے گی" ارکانِ دین کی درستی کا حق نہ ہوگا۔ حالانکہ مولانا موصوف "تصوف" کے اضطرابات اور خلجانات سے اچھی طرح واقف ہیں۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی کسی شخص اللہ کے رستہ میں جہاد و قتال کی پرجوش دعوت دے رہا ہو، اور آخر میں وہ یہ بھی کہہ دے کہ میاں! مردِ مجاہد کے لئے نشاطِ خاطر بھی بہت ضروری ہے۔ اس لئے غنا و موسیقی سے بھی ضرور ربط رکھنا ...... ! یہ مشورہ جہاد و قتال کی دعوت کے ساتھ کس قدر بے جوڑ ہے!

"تصوف" اور اربابِ تصوف کے معمولات و ملفوظات اور احوال و کوائف کی جہاں تک کتاب و سنت سے مطابقت ہوتی ہے اُن کا ہم احترام کرتے ہیں اور اُن پر کوئی خیر پسند انسان حرف گیری نہیں کر سکتا، مگر اس کو کیا کیجئے کہ تصوف کی کتابوں میں عجیب و غریب قسم کے خلجانات ملتے ہیں، جن کو "اقرار کیجئے تو مشکل اور "انکار" کیجئے تو مشکل ———— مثلاً متعدد مورخ تصوف کے حالات میں ملتا ہے کہ فلاں مسئلہ میں وہ روحِ رسول ؐ کی طرف متوجہ ہوئے، اور وہاں سے یہ اشارہ یا جواب ملا ———— اس پر ذہن میں یہ خلجان پیدا ہوتا ہے کہ کیا کتاب و سنت میں ایسا کوئی حکم ملتا ہے کہ کسی دینی مسئلہ میں کوئی دشواری پیش آئے تو "روحِ رسول ؐ" سے متوجہ ہونا چاہیئے ؟ صحابہ کرام حضور ؐ کی حیات میں اپنے گھروں اور آس پاس کے مقامات سے خود خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر مسائل پوچھتے تھے اور تصور و مراقبہ میں "روحِ رسول ؐ" کی جانب متوجہ نہیں ہوتے تھے۔ اگر "روحِ رسول ؐ" سے متوجہ ہونے کی انہیں تعلیم ملی ہوتی تو حضرتِ سیدہ فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا "فدک" کا مسئلہ اور حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ "کلالہ" کا مسئلہ "روحِ رسول ؐ" سے دریافت کر لیتے۔

اس نوبت پر محتاط علماء کا کہنا یہ ہے کہ صوفیائے کرام کے اس قسم کے "احوال و مکاشفات" کا دین میں کوئی درجہ نہیں ہے اور ہم ان احوال و مکاشفات کے ماننے کے مکلّف نہیں ہیں ———— بات اپنی جگہ بالکل درست و صحیح ہے، مگر جن باتوں کی کوئی شرعی اور دینی حیثیت نہیں ہے، ان کی طرف اس قدر شد و مد کے ساتھ آخر دعوت کیوں دی جاتی ہے ؟ کتاب و سنت اور آثارِ صحابہ کے بعد، ذہن آخر کس چیز کی تشنگی اور کمی محسوس کرتا ہے ؟

ہمارا ایمان ہے کہ اللہ کی کتاب میں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آثارِ صحابہ میں اخلاص و احسان اور تزکیۂ نفس کی مکمل تعلیم اور بہترین نمونے ملتے ہیں، اور احسان و تقویٰ کا کوئی ایسا گوشہ نہیں رہ گیا ہے، جو چھوٹ گیا ہو، اور جسے بعد کے لوگوں نے پورا کیا ہو، پس اُمت کی بہتری اسی میں ہے کہ خلجانات و اضطرابات کے بجائے اُس طرف لوگوں کو دعوت دی جائے جہاں ہر چیز خالص، صاف و مُجلّا اور مکمل ملتی ہے، بھول بھلیوں میں کسی کو اگر لعل و گہر بھی مل جائیں تو بھٹکنے اور گم ہو جانے کے امکان خطرات کے مقابلہ میں صراطِ مستقیم کے ذرے بہتر ہیں کہ یہاں بھٹکنے کا ڈر نہیں !

طریقِ محمدی یعنی ردِّ تقلید

از:- مولوی محمد صاحب جونا گڑھی، ضخامت ۲۰۰ صفحات، قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔
ملنے کا پتہ:- مکتبہ شعیب، بنس روڈ، کراچی۔

یہ کتاب تقلیدِ شخصی کے رد میں لکھی گئی ہے اور اہلِ حدیث کے مسلک کی پُرزور تائید کی گئی ہے! کسی مسلک کے رد و ابطال میں ...ب و لہجہ عام طور پر درشت ہو ہی جاتا ہے، قلم کی یہ تیزی اور برہمی اس کتاب میں بھی پائی جاتی ہے اور بعض مقامات پر تو یہ خشونت ...ت کچھ کھٹکنے لگتی ہے۔

"مسلمانو! ان سے عبرت حاصل کرو، آج وہی روش ہم میں آگئی کیا ہدایہ، شرح وقایہ عالمگیری، کنز و قدوری، ردالمحتار وغیرہ مجموعے خدا کی طرف سے ہیں؟ کیا ان میں رائے اور قیاس نہیں"۔ (صفحہ ۱۰)

فقہی مسائل کے ان مجموعوں کو "خدا کی طرف سے (نازل کردہ)" تو کوئی حنفی مقلد نہیں سمجھتا، ان میں رائے، قیاس اور اجتہادات بھی بے شک شامل ہیں، اور یہ کتابیں "کتاب و سنت" کی طرح غلطیوں سے بھی پاک نہیں ہیں۔ ہاں! یہ ضرور ہے کہ ان کتابوں پر اعتماد کیا جاتا ہے کہ ان میں جو مسائل درج ہیں وہ کتاب و سنت ہی سے مستنبط اور مستخرج ہیں، اور جہاں اجتہاد و قیاس کی ضرورت پیش آئی ہے، وہاں کتاب و سنت کے منشاء اور تقاضوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے، ان کتابوں کے جامعین اور مولفین "اتباع رسول" کو منصوص اور دین و دنیا میں فلاح و نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے، فقہ کی ان کتابوں نے اُمت کے لئے سہولتیں اور آسانیاں مہیا کی ہیں، یہ دینی کوششیں طنز و تعریض کی نہیں سراہے جانے کی مستحق ہیں۔

صفحہ ۳۸ پر امام محمد بن حماد رحمۃ اللہ علیہ کے ایک خواب کے واقعہ کو "حدیث رسول" کہہ کر لائق مصنف نے فنِ حدیث کے ساتھ ظلم کیا ہے، اور یہ ظلم صرف اس لئے روا رکھا گیا ہے کہ اس خواب کے بیان کر دینے سے حضرت امام اعظم سیدنا ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت مجروح ہوتی ہے۔

دُرِ مختار مصری جلد ثالث کے باب التعزیر میں ہے۔

ارتحل الی مذھب الشافعی یُعزر۔

(یعنی جو شخص حنفی سے شافعی بن جائے اُسے تعزیر کی سزا دینی چاہیئے)۔ (صفحہ ۴۲)

حنفی فقہ کی اس شق پر مصنف نے جو گرفت کی ہے وہ صائب ہے، جب تمام فقہی مذاہب حق ہیں، تو پھر حنفی کے شافعی بن جانے پر تعزیر و سزا کیوں؟ ایسا کرنا کوئی گناہ نہیں ہے، سچی بات یہ ہے کہ تمام فقہی مذاہب حق ہیں اور مسلک اہل حدیث بھی حق ہے؛ فقہی مسائل میں حریفانہ نزاع اور معاندانہ گفتگو نے خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ بنا دیا ہے، اور خاصی تلخیاں پیدا کر دی ہیں۔

اس کتاب کی زبان کمزور ہے، مثلاً صفحہ ۳۵ پر:-

"جس نے ہم مسلمانوں کو تہ تیغ کر دیا"

لکھا ہوا ملا۔ "جس نے ہم مسلمانوں کو تیغ تیرہ کر دیا یا تتر بتر کر دیا" لکھنا چاہیئے تھا۔

اس قسم کے شعر:- ؎

گر تم نہیں تو اور بُت مہ جبیں سہی ہم کو تو دل لگی سے غرض ہے، کہیں سہی

بھلا دینی کتاب میں نقل کئے جانے کے قابل تھے ——— صفحہ ۱۲۷ پر نظام رام پوری کے مشہور شعر کو ناموزوں لکھ کر ایک طرف اس شعر کی مٹی پلید کی، دوسری طرف مصنف نے ... ؎

انگڑائیاں بھی لینی نہ پائے اٹھا کے ہاتھ دیکھا تو مجھے چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ

درج کر کے اپنے ذوقِ شعری کا بڑا ثبوت دیا۔

مینا بازار مصنف:- ملا نورالدین محمد ظہوری ترشیزی، با ترتیب و تحشیہ و تصحیح و تقدمہ۔ ڈاکٹر محمد احمد صدیقی، استاد عربی و فارسی الٰہ آباد یونیورسٹی، ضخامت ۱۳۲، قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

ملنے کا پتہ:- مطبع اسرار کریمی، الٰہ آباد۔

"مینا بازار" مشہور فارسی نثر نگار ظہوری کی تصنیف ہے جسے ڈاکٹر محمد احمد صدیقی نے ایڈٹ کیا ہے، اس پر سیر حاصل مقدمہ تحریر فرمایا ہے اور شرح لکھی ہے! "مینا بازار" پر فاضل مُرتب کی یہ رائے ہے کہ اس کتاب کی نثر "دسویں اور گیارھویں صدی کی مروج اور بہترین انشاء کا نمونہ ہے" پھر انھوں نے سجع و قافیہ، لطافتِ خیال، نزاکتِ خیال، حسنِ بیان، ندرتِ ادا، تراکیب میں جدت و جودت، شوکتِ کلام اور لطافتِ تشبیہ و مجاز کی خوبیاں گنوائی ہیں۔

اس مقدمہ کی سب سے زیادہ قیمتی اور اہم بحث یہ ہے، جس میں فاضل مُرتب نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ نثر ظہوری" اور "مینا بازار" کا مصنف ایک ہی شخص ——— ظہوری ——— ہے!

ڈاکٹر محمد احمد صدیقی نے بڑی محنت اور کاوش بلکہ عقیدت کے ساتھ اس کتاب کو ایڈٹ فرمایا ہے مگر وہ ایک صحیح الخیال مسلمان ہیں۔ لہٰذا انھوں نے "مینا بازار" کے میلہ کو "بدعت" اور "فحش کے اڈے" سے تعبیر کیا ہے، لکھتے ہیں!۔

"پھر یہ بدعت، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں تین بادشاہوں کے زمانہ تک تو چل سکتی تھی، وہ چلی، لیکن سلطان محی الدین اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ جیسے بدعت دشمن اور دین پرور سلطان کے عہد میں کسی طرح جاری و ساری نہیں رہ سکتی تھی۔ سو فیصدی اس کا امکان بلکہ یقین ہے کہ اس نے زنانہ بازار کے پرستان کا خود راجہ اندر بننا اور اپنے گرد پریوں کا اکھاڑہ رکھنا کبھی پسند نہ کیا ہوگا، اس لئے اولین فرصت میں فحش کے اس اڈے کو ختم کرکے سلاطین گورگانیہ کے ناصیۂ عزت کو کلنک کے اس ٹیکے سے بچایا ہوگا، اکبر کی یہی دینی اور دنیوی معاملات میں بے راہ رویاں تھیں، جن کے باعث عالمگیر کہتا تھا!۔

"جدِ ما اکفر بود" (اکفر کو اکبر کی تصحیف کے طور پر استعمال کیا ہے)

فاضل مرتب نے بعض ایسے الفاظ کے معنی شرح میں لکھے ہیں جن سے عوام تو کیا شاید پاک و ہند کے بعض خواص فارسی داں حضرات بھی واقف نہ ہوں۔

کعبِ غزال:۔ شکرپاروں کی وہ قسم جو گول سیاہی مائل ہوتے ہیں۔

قصب السبق:۔ لفظی معنی جیت کا ڈنڈا یا جھنڈا! میدان میں ایک بانس، لکڑی یا جھنڈا گاڑ دیتے ہیں اور دور سے گھوڑا دوڑ کر آتے ہیں، جو سوار اس جھنڈے کو پہلے چھو لے یا اکھاڑ لے، وہ جیت گیا۔

شاخچہ بندی ——— تہمت ——— میخوش ——— ہلکا کھٹ میٹھا ——— خستہ ——— گٹھلی ———

ترنجِ دست افشار یا گوئے طلا دست افشار ——— فارس کے بادشاہ خسرو پرویز کے لئے دستکاروں نے گیند یا لیمو کی طرح سونے کا ایک لوٹا ایسا نرم بنا دیا تھا کہ وہ اُسے ہر وقت ہاتھ میں لئے رہتا اور دبا دبا کر جس شکل کو چاہتا بنا تا رہتا۔

شرح بند:۔ ریشم کا ڈورا یا کلابتون جس سے نیچہ باندھتے ہیں۔

سون ۔ چون ۔ قفل چپ اُفتادہ ۔ اُلٹا ہوا قفل جسے کھولنا مشکل ہے۔

ڈاکٹر محمد احمد صدیقی نے "مینا بازار" کو مُرتب فرما کر ادب کی قابلِ قدر خدمت انجام دی ہے۔ اُردو شاعروں اور ادیبوں کو فارسی اور عربی سے ربط قائم رکھنا چاہیئے۔ گزشتہ دور میں جو شخص عربی یا کم سے کم فارسی نہ جانتا تھا، اُس کا شمار جہلا میں ہوتا تھا

دینی آیات

از:۔ ابراہیم، ایس، غزالی۔ ضخامت ۲۴۰ صفحات۔ قیمت غیر مجلد تین روپے آٹھ آنے۔ مجلد چار روپیہ چار آنہ

ملنے کا پتہ:۔ دفتر مکتبہ "انگارے" پی، جی، سی وکٹوریہ روڈ۔ کراچی۔

اس کتاب کا اصل نام تو "دینی آیات" ہے، مگر اس کے تیسرے ورق پر مندرجہ ذیل عبارت نظر آئی:۔

"جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں"

سائل عشق، عاشقانِ رسول کریم، شہدائے اہل بیت اور صحابہ کرام کے متوالوں کے لئے

"کیمیا دی تحفہ"

اس عبارت ہی سے لکھنے والی کی فکر و استعداد اور رجحانات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ کیا واقع ہوئے ہیں؛

صفحہ "۶" پر یہ گلفشانی کی ہے:۔

"امید ہے کہ پڑھنے والے حضرات میری ہر بات کا اور ہر حرف تک کو صحیح معنوں میں سمجھنے کی کوشش کریں گے اور عقلمندی کا ثبوت دیں گے، ہو سکتا ہے کوئی صاحب میری بات یا ذات ہی کو نکتہ چینی یا بحث سے کم از کم غلط ثابت کرنے کی کوشش ہی کریں، تو ان سے دلیسے ہی دست بستہ عرض ہے کہ وہ اس کتاب کو ہاتھ تک نہ لگائیں"

وہ جو صاحب تصنیف نے اس کتاب کی تعریف میں "بہ قلم خود" لکھا ہے کہ "یہ اپنی نوعیت کا ایک ہی نسخہ ہے"۔ اس کی تصدیق ان کی اس کتاب سے ہوتی ہے۔ چند اقتباسات:۔

"خداوند کریم نے اپنے بندے کو، محبوب اور معشوق کو راضی رکھنے کے لئے احسان کا بدلہ چکانے کے لئے اور حق معشوقی پر دیکھ کر اپنا حق عاشقی ادا کرنے کے لئے تمام کی تمام کائنات بنائی، جن میں فرشتے، جن اور روح بھی شامل ہے جونہی ذاتِ محمد مصطفےٰ ؐ نے ان میں سے کچھ ذی جانیں اپنے قریب دیکھیں تو زبان مبارک پر "ہا" کے بجائے "لاہ" کے الفاظ لگ گئے تھے۔" (صفحہ ۱۸)

کسی موحد کے زبان و قلم سے بھلا ایسے الفاظ سوتے میں بھی نکل سکتے ہیں؟۔ کیا اللہ تعالیٰ پر بھی کسی کا احسان ہے؟ توبہ... استغفراللہ.... نقلِ کفر کفر نہ باشد) اور اللہ تعالیٰ نے احسان کا بدلہ چکانے کے لئے کائنات کو پیدا فرمایا ہے (لاحول ولا قوۃ)

"دنیا اور ہر کائنات کی ہر چیز، ہر نفس اور ہر شے فانی ہے صرف ذات محمد مصطفےٰ ؐ ابدی ہیں۔" (صفحہ ۲۸)

یہ تصور و عقیدہ قرآنی تعلیم کے خلاف کھلا ہوا چیلنج ہے!

پوری کتاب کا یہی رنگ ہے، مصنف کو زبان و بیان پر قدرت ہے۔ نہ اپنی بات ٹھیک طرح کہنے کا سلیقہ ہے نہ کوئی علمی فکر ان کے پاس ہے، قلم ہاتھ میں لے کر کاغذ پر جو چلایا ہے، تو جو کچھ انٹ شنٹ جی میں آیا، لکھتے چلے گئے ہیں: اس قسم کی کتابیں دین و اخلاق اور خود علم و ادب کے ساتھ دردناک مذاق کے سوا اور کچھ نہیں!

کلام بے نظیر

مرتبہ:۔ محمد اکبر الدین صدیقی، ضخامت ۵۶۴ صفحات (مجلد گرد پوش کے ساتھ) قیمت:۔ چند روپے
ملنے کا پتہ:۔ مطبع ابراہیمیہ، حیدرآباد دکن۔

سید بے نظیر شاہ وارثی کے دور ترقی و شباب میں نہ رسالوں کی کثرت تھی، ور نہ ریڈیو کا وجود تھا، اس لئے وہ بہت زیادہ مشہور نہ ہو سکے۔ اور ان کی شہرت خاص دائروں میں محدود رہی، پھر بھی ان کا نام ادبی حلقوں کے لئے نیا نہیں ہے۔ شعر و ادب سے ذوق رکھنے والے، دلکھے پڑھے لوگ بے نظیر شاہ کو جانتے اور ان کے کلام کو پہچانتے ہیں۔

بے نظیر شاہ صوفی منش بزرگ تھے اور گوناگوں خوبیوں کے حامل تھے، فارسی میں دستگاہ رکھتے تھے اور عربی زبان پر اتنا عبور تھا کہ عربی میں شعر کہتے تھے، رباعی، قصیدہ، غزل، مثنوی، مسدس،.... غرض تمام اصناف سخن میں انہیں مہارت حاصل تھی ور کسی گھر بند

نہ تھے۔ اُن کے "کلیات" کو جناب مولوی محمد اکبر الدین صدیقی لکچرار جامعہ عثمانیہ نے مرتب فرما کر، اُس پر بسیط مقدمہ لکھا ہے۔ "عرضِ حال" صاحب کلیات کے فرزند سید حامد بے نظیر شاہ نے تحریر فرمایا ہے۔ اور "واقعہ احرام پوشی و سجادگی" بے نظیر شاہ مرحوم کا لکھا ہوا ہے!
اس کتاب میں بے نظیر شاہ کی تصویر کے ساتھ، فاضل مرتب اور شاعر کے دو فرزندوں کے فوٹو اور شاعر کا عکسِ تحریر بھی شامل ہے۔ ایک تصویر بے نظیر شاہ کی جوانی کی ہے!

بے نظیر شاہ پرگو اور مشاق شاعر تھے۔ بیس بائیس شعر سے کم کی غزل تو کم ہی کہتے تھے۔ کسی کسی زمین میں تو دو دو تین تین طویل غزلیں کہی ہیں۔ طوالت مثنوی اور قصیدہ کا تو حُسن ہے مگر غزل کے لئے عیب ہے کہ شاعر زیادہ سے زیادہ قوافی لانے کے لئے اشعار کہتا ہے، اور اس طرح کلام میں "آورد" پیدا ہو جاتی ہے۔ بے نظیر شاہ کی غزلوں میں "آورد" کی خاصی مقدار پائی جاتی ہے۔ بعض بعض طویل غزلیں سپاٹ اور بے نمک ہیں۔

چند منتخب اشعار :-

کچھ ستم ہو تو شکایت کیجئے — اس ستم کی داد کیا فریاد کیا
ہم اک رنگ پر اپنے قائم رہے — زمانے کو نقشہ بدلنے دیا
کیا حال ہو جہاں کا اگر تجھ کو دیکھ لے — نادیدہ اک جہان تو قربان ہو گیا
اپنا سمجھ لیا تو نہ لی پھر کبھی خبر — پہچان کردہ اور بھی انجان ہو گیا
گم ہوئے جستجوئے یار میں ہم — چھپ گئے اپنی ہی غبار میں ہم
الٰہی خیر یہ کوئی جنون ہے یا طبیعت ہے — خیال باغ کرتا ہوں، بیاباں یاد آتے ہیں
ادھر رہ گئی یا اُدھر رہ گئی — دل کی شکایت مگر رہ گئی
خدا جانے آنکھوں میں اب کیا رہا — نظر تو ترے بام پر رہ گئی
تیری گلی سے کوئی اٹھائیگا کیا مجھے — یہ بات اور ہے کہ اٹھا لے خدا مجھے
وہ تری گلی کی قیامتیں کہ لحد سے مُردے نکل گئے* — یہ مری جبینِ نیاز تھی کہ جہاں دھری تھی دھری رہی
بڑی احتیاط طلب ہے یہ جو شراب ساغرِ دل میں ہے — یہ چھلک گئی تو چھلک گئی، یہ بھری رہی تو بھری رہی
اس نظارے کی خوشی کیا جب رہے تھے وہ کہیں — اتفاقاً پڑ گئے ہم بھی نظر کے سامنے
حضرت پیرِ مغاں سے نہ ہو بدظن اے شیخ — کچھ نہ کچھ مل ہی رہے گا جو عقیدت ہو گی
دہر میں دامِ ازل سے کوئی آزاد بھی ہے — ایک پھندے میں یہاں صید بھی صیاد بھی ہے
ترے وصفِ قامت کا ہے یہ عروج — کہ پڑھ پڑھ کے مصرعے غزل ہو گئے
مانعِ دید ہے فروغِ جمال! — یہ بھی صورت حجاب کی سی ہے

بے نظیر شاہ کی غزلوں کے صرف چند منتخب اشعار اوپر درج کئے گئے ہیں، ان کی غزلوں میں جہاں یہ رنگ آگیا ہے، وجدان لذت محسوس کرتا ہے، ان کی غزلیں داغ، اور امیر کے طرز و اسلوب کا سنگم ہیں، اور اس سنگم میں خود ان کی انفرادیت بھی جھلکتی ہے۔

---

* راقم یہ مصرعہ مجھے اس طرح یاد تھا: ع وہ تری گلی کی قیامتیں کہ لحد سے مُردے نکل پڑیں۔ (م-ق)

دوسرا نسخہ :-

ضرور اس کو لیلا ملے گی، ملے گی　　ز خود رفتہ مجنوں مگر ہو کسی کا　　(صفحہ ۱۷)

کتنا کمزور شعر ہے۔ کیا عجب ہے کہ یہ غزل بے نظیر شاہ کی نومشقی کے زمانے کی ہو۔

وہ سدھارے اور بیس بن کے سنگِ تفرقہ　　خشتِ انجم ساتھ دیا تھا جو کچھ معمار صبح　　(صفحہ ۵۲)

آورد ہی آورد، بناوٹ ہی بناوٹ! "سنگِ تفرقہ" کتنی نامانوس ترکیب ہے۔

کسی سے حسینوں کو رغبت ہے شاذ　　کہ نفرت ہے عام، اور الفت ہی شاذ　　(صفحہ ۶۸)

غزل کے لئے "شاذ" کی ردیف تلاش کرنا ہی "آورد" کی علامت ہے! راسخ دہلوی کے دیوان میں بھی "ژاژ" کی ردیف دیکھ کر طبیعت بہت منغص ہوئی تھی!

کیا اس کے دل پہ تیرِ ملامت کا ہو اثر　　تودے لگے ہیں جہل کے جاہل کے آس پاس　　(صفحہ ۸۰)

یہ کلام موزوں تو ضرور ہے مگر شعر نہیں ہے۔

چڑھتے فلک پہ طور پہ ٹھیرے نہ حیدر و رسولؐ　　عرش الٰہ تک گئے صرف یہ خوش خرام دو　　(۹۸)

اول تو شعر کمزور ہے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تنہا معراج ہوئی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہ تھے!

کوئی نزختامہ پسند آئے کیوں کر　　کہ ارزاں بھی تجھ کو گراں ہو رہا ہے　　(صفحہ ۲۱۴)

"نزختامہ" نے شعر کو "بازاری" بنادیا!

نہیں چشم فرہاد کیوں سوئے شیریں　　اگر دودھ میں کچھ بھی کالا نہیں ہے　　(صفحہ ۲۲۴)

"کلام بے نظیر" کے مرتب کو ایسے شعر تو ضرور چھانٹ دینے چاہیے تھے ———— پھر "دودھ میں کالا نہیں" دال میں کالا" اصل ضرب المثل ہے۔

اُدھر مفسدوں کو وہ دیں گوشمال　　تاسف سے بیٹھیں ادھر راں ہم　　(صفحہ ۱۰۷)

حیرت ہے کہ شاعر نے ایسے گھٹیا شعر اپنے کلام میں کیسے رہنے دیے!

ہمیں نفسِ جاناں، ہمیں بے نظیر　　ہمیں ذاتِ باری، بشر بھی ہمیں　　(صفحہ ۲۴۵)

قطع نظر اس کے کہ یہ عقیدہ خالص عجمی اور غیر اسلامی ہے، اس کا اظہار بھی سلیقہ سے نہیں کیا گیا!

بے نظیر شاہ صوفی شاعر تھے۔ مگر ایسی، احرام پرستی اور تصوف مشربی کے باوجود نواب میر عثمان علیخاں سابق فرمانروائے دکن کی مدح میں انھوں نے اس قدر مبالغہ کیا ہے :-

تیری فکرِ دقیق کی محتاج　　حکمتِ شیخ و فقہ نعمانی
ابتدائی ترے مراتبِ خلق　　منتہائے کمالِ انسانی
تیرے اصنافِ نظم کے عاشق　　سعدی و انوری و خاقانی
فی المثل اب ہی تو خدائے سخن　　یادگارِ کمالِ سحبانی

اور اب زوالِ نعمت کے بعد نواب میر عثمان علیخاں کی تعریف میں ایک مصرعہ بھی کہیں دیکھنے میں نہیں آیا؟

بے نظیر شاہ کی شاعری کے جوہر مثنوی میں کھلتے ہیں، اس صنف کو انھوں نے ترقی بھی دی اور میر حسن کے رنگ کو بھی قائم کیا

ہر ایک طرف وہ عبیر و گلال | ہوا دامنِ موج تک لال لال
وہ چھایا گلستاں پہ رنگِ شفق | مطلا ہوئے سارے گل کے ورق
بھرے مے سے لالہ کا رنگیں ایاغ | دہکنے لگا آتشِ گل سے باغ
صباحِ ربیع و لبِ جوئبار | یہ خنکی، یہ سبزہ، یہ ابرِ بہار
پپیہوں کو اُدھر مور تولے ہوئے | گھٹائیں اِدھر بال کھولے ہوئے
ہوا دوشِ پرشاں ڈالے ہوئے | گھٹاؤں کے آنچل سنبھالے ہوئے
یہ کہتا ہے ہر برگِ شجر کا سکوت | فسبحان الذی لایموت

جناب محمد اکبر الدین صدیقی نے "کلامِ بے نظیر" مُرتب فرما کر، بے نظیر شاہ کے کلام کے بہت سے شائقین کی تمنا کو پورا کیا ہے! کوئی شک نہیں بے نظیر شاہ کی مثنویاں اُن کے نام کو زندہ رکھیں گی۔

تاریخِ ملّت جلد یازدہم سلاطینِ ہند حصہ دوم

تالیف :- مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی اکبر آبادی
ضخامت ۳۰۰ صفحات، قیمت مجلد تین روپے بارہ آنہ، غیر مجلد تین روپے آٹھ آنے، ملنے کا پتہ :- ندوۃ المصنفین جامع مسجد، دہلی۔

اس کتاب میں گورنرانِ بنگال، سلاطین کشمیر، شاہانِ گجرات، بہمنی، عماد شاہی، برید شاہی، قطب شاہی اور عادل شاہی سلاطین کے مختصر حالات اور بابر سے لے کر، آخری مغلیہ بادشاہ، سراج الدین ظفر بہادر شاہ کا مفصل تذکرہ ملتا ہے۔

مفتی انتظام اللہ شہابی مورخ ہیں مگر ایسے مورخ جن کا زیادہ تر دارو مدار "نقل و ترجمہ" پر ہے، یہی اُن کی خصوصیت اُن کی کتابوں میں بھی ملتی ہے!

صفحہ ۸۸ پر راجہ بہارا مل کی بیٹی اور جہانگیر کی ماں کا خطاب "مریم زمانی" لکھا ہے، مگر صفحہ ۹۶ پر یہ عبارت نظر آئی:-

"جب اکبر بادشاہ کی والدہ مریم مکانی کا انتقال ہوا"

"مریم زمانی" "آگے چل کر" "مریم مکانی" ہو گئیں اور سب سے زیادہ مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ اکبر بادشاہ کی بیوی کو اس کی ماں لکھ دیا۔

ہم نے جب فتحپور سیکری کی سیر کی تھی تو گائیڈ نے بتایا تھا کہ یہ عمارت اور باغ اکبر بادشاہ کی عیسائی بیوی "مریم زمانی" کا تھا، مگر اس کتاب سے معلوم ہوا کہ "مریم زمانی" جہانگیر کی ماں کا خطاب تھا۔

"اس کی طبیعت موزوں تھی اور اس کے اشعار زبان زدِ روزگار ہیں" (صفحہ ۹۰) نور جہاں کی تعریف میں یہ مبالغہ کیا گیا ہے، شاعرہ کی حیثیت سے نور جہاں کا کوئی مقام نہیں ہے، اور نہ اُس کے اشعار لوگوں کو یاد ہیں:

حیدرآباد کے شاعر (انتخابِ کلام)

مُرتبہ :- خواجہ حمید الدین شاہد (ایم -اے) ضخامت ۴۳۶ صفحات، بڑا سائز مجلد، رنگین گرد پوش کے ساتھ۔ قیمت غیر مجلد چار روپے - مجلد، پانچ روپے

ملنے کا پتہ :- آندھرا پردیش اکاڈمی، حیدرآباد (بھارت)

۱۹۰۰ء سے لے کر ۱۹۵۵ء تک کے اُن شعراء کے حالات اور کلام کا انتخاب اس کتاب میں درج ہے، جو یا تو حیدرآباد میں پیدا ہوئے ہیں، یا کافی مدت تک حیدرآباد میں رہے ہیں! اس انتخاب پر انگریزی میں پیش لفظ مسز سروجنی نائیڈو نے لکھا ہے، اُردو زبان کی دل کشی اور حلاوت کا اعتراف کرنے کے بعد صاحب موصوف تحریر فرماتے ہیں:-

"اردو زبان وادب کی اہمیت کو کسی عنوان کم نہیں کیا جاسکتا"

جناب فضل الرحمٰن صاحب نے اس کتاب پر مقدمہ لکھا ہے، جس میں جناب حمید الدین شاہد کی کوششوں کو سراہا ہے اور بجا طور پر سراہا ہے۔ شاہد صاحب اردو زبان وادب کے لئے کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتے ہیں!

"سنہ ۱۹۲۳ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے"

یہ انداز بیان جگہ جگہ ملتا ہے۔ سنہ کے ساتھ "کو" نہیں "میں" لکھنا چاہیئے تھا۔ ہاں! تاریخ کے ساتھ "کو" استعمال ہوتا ہے۔ اس طرح

"وہ سنہ ۱۹۲۳ء میں پیدا ہوئے اور اُن کے بھائی ۳ رجنوری سنہ ۱۹۲۵ء کو تولد ہوئے"

راجہ نرسنگھ راج عالی کا سنہ پیدائش سنہ ۱۸۵۵ء صحیح نہیں ہے، غالباً سنہ ۱۸۹۴ء کتابت میں سنہ ۱۸۵۴ء ہو گیا ہے۔

یہ "انتخاب" اپنی جگہ خوب ہے، جسے توقع ہے شائقین شعر وادب خاصی دلچسپی اور شوق کے ساتھ پڑھیں گے!

چائے کی میز پر

ضخامت ۲۰ صفحات، قیمت چھ آنے۔
ملنے کا پتہ:- عبد الغفار سلفی۔ کتب خانہ سعودیہ، پرنس روڈ لاہور۔

اس کتابچہ میں احادیث سے ثابت کیا گیا ہے کہ نماز باجماعت میں، امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ ضرور پڑھنی چاہیئے۔ اور آخر میں تمام دنیا کے علماء احناف کو کھلا چیلنج دیا ہے کہ وہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ نہ پڑھنے کا خاص لفظ حدیث مرفوع، صریح صحیح اور حسن میں دکھادیں۔

تدریس القرآن

(حصہ اول سورۂ فاتحہ واز سورۃ العلق تا سورۃ الناس) مرتبہ:- محمد منظر۔ ضخامت ۴۰ صفحات، قیمت:- چھ آنے۔ ملنے کا پتہ:- مکتبہ فاروقیہ جدید آغا پورہ حیدرآباد دکن (آندھرا پردیش)

قرآن کریم کو سمجھ کر پڑھنے پڑھانے کے لئے پاک و ہند میں جو کوششیں کی گئی ہیں، ان کی کڑی یہ کتابچہ ہے۔ عربی کے نوآموز طلبا کی سہولت اور آسانی کے لئے آیات کا ترجمہ کیا گیا ہے اور جملوں کے آغاز کی ترتیب کو ملحوظ رکھا گیا ہے، یہ کوشش مفید اور کارآمد ہے۔

منکرین حدیث اور قربانی

از:- علامہ محمد ایوب، ضخامت ۲۶ صفحات (بلاقیمت)
ملنے کا پتہ:- ادارہ تحقیق حق۔ ۵، گارڈن روڈ۔ کراچی۔

بقرعید پر اُمت مسلمہ جو عہد رسالت سے لے کر اس زمانہ تک قربانی کرتی آئی ہے، اور مسٹر پرویز نے جس کا انکار کیا ہے۔ یہ کتابچہ اسی فتنہ کے رد میں لکھا گیا ہے! دلائل بہت وزنی اور دل نشین ہیں! مولانا محمد ایوب صاحب کا علمی تبحر حق کی حمایت و دفاع مدافعت کا اس دور میں بہت بڑا کارنامہ انجام دے رہا ہے۔

[illegible]ات رمضان

از:- مولوی محمد صادق سیالکوٹی، ضخامت ۲۰۰ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنے۔
ملنے کا پتہ:- مکتبہ کتاب و سنت، بازار دھاروال، سیالکوٹ شہر۔

اس کتاب میں رمضان کے فضائل و برکات سے لے کر فدیہ وسحری، تراویح واعتکاف اور عید الفطر وعید الضحٰی کے مسائل تک جمع کئے گئے ہیں، کتاب کی ہر سطر سے صاحب کتاب کا اخلاص اور دینی شغف نمایاں ہے۔

ہم نے [illegible] میں بعض نمازیوں کو دیکھا ہے کہ خلاف جہر کے ساتھ نیت کے الفاظ ادا کرتے ہیں۔!!

"نیت کی [illegible] رکعت نماز فرض.... چار رکعت نماز فرض.. منہ میرا کعبہ شریف کی طرف"۔

[illegible] گرفت کی گئی ہے:۔

[illegible] نیت [illegible] کے ارادے کو کہتے ہیں اور دل ہی دل میں رکھنا چاہیئے ہم نے اس بات پر اس لئے اتنا

زور دیا ہے کہ زبان سے نیت کا ذکر نا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ سے کہیں بھی ثابت نہیں ہے، "دین کی جو چیز دین سے ثابت نہ ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تعامل صحابہ سے اس کا پتہ نہ چلے، اس کو دین سمجھ کر عمل میں لانا بدعت کا مرتکب ہونا ہے"۔

کتاب کی زبان[1] سیدھی سادی اور عام فہم ہے۔ زیادہ تر مسائل احادیث کی روشنی میں واضح کئے گئے ہیں۔

مقامِ حدیث

ضخامت ۵۰ صفحات، ملنے کا پتہ، شعبۂ تبلیغ جماعت، غرباء اہل حدیث، محمدی مسجد۔ بنس روڈ کراچی ۱

جناب مولانا محمد عبد الغفار رانخیری نے اس کتابچہ میں قرآنی آیات کو دلیل میں پیش کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ "اطاعت رسول" منصوص ہے اور دین کے متعلق حضورؐ کا ہر لفظ ہر عمل اور ہر فعل وحی پر مبنی ہے۔

کتابچہ کے آخر میں جماعت غرباء اہل حدیث کی رپورٹ درج ہے، جس سے اس جماعت کی دینی سرگرمیوں کا پتہ چلتا ہے کہ اپنے محدود مالی وسائل کے باوجود اس نے بہتر ہزار تبلیغی مطبوعات مفت تقسیم کئے ہیں۔

حقوق محمدیؐ

مولفہ:- مولانا محمد صاحب جوناگڈھی مرحوم، ضخامت ۱۶ صفحات۔

ملنے کا پتہ:- شعبہ تبلیغ محمدی، بنس روڈ، کراچی۔

اس کتابچہ میں بتایا گیا ہے کہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا اسم گرامی سن کر، فرطِ عقیدت سے جو لوگ انگوٹھا چوم کر آنکھوں سے لگاتے ہیں، یہ درست نہیں ہے، اس بارے میں جو حدیثیں بیان کی جاتی ہیں، ان میں سے ایک حدیث بھی صحیح نہیں ہے، اور ایسی تمام روایتیں موضوع ہیں۔

مولانا شاہ عبد العزیزؒ رحمۃ اللہ علیہ اپنے فتاویٰ میں تحریر فرماتے ہیں:-

"در وقت اذان سوائے کلماتِ اذان چیزے ثابت نہ شدہ، و در وقت ذکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سوائے فرستادن درود و سلام بر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم در زمانہ خلفاء راشدین نبودہ، پس ایں عمل را بوقت اذان یا بوقت شنیدن نام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سنت یا مستحب دانستہ کردن بدعت است و ازیں امر احتراز باید کرد"۔

استعانت بالاولیاء

مرتبہ:- صفوۃ الرحمٰن صاحب۔ ضخامت ۲۲ صفحات، قیمت درج نہیں

ملنے کا پتہ:- ادارۂ اہل سنت و جماعت کمان سلطان شاہی حیدرآباد دکن

اس کتابچہ میں قرآنی آیات سے ثابت کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی روح سے استعانت و استمداد جائز نہیں ہے۔ یہ قدرت صرف اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہے کہ جو کوئی کہیں سے بھی پکارے، اس کی فریاد کو سن لے اور اس کی مصیبت کو دور فرما دے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی میں یہ طاقت نہیں ہے۔

"وسیلہ کی تفسیر میں "روح المعانی" کے جو اقتباسات اس کتابچہ میں درج کئے گئے ہیں، وہ بہت واضح اور اہم ہیں۔ اس کتابچہ کے مرتب کرنے والے کو اللہ تعالیٰ دارین میں جزائے خیر عطا فرمائے کہ وہ توحید خالص کی حمایت اور بدعت و شرک کے رد میں ہمیشہ تگ و دو کرتے ہی رہتے ہیں!

رسالہ نجاتیہ (مع اردو ترجمہ)

از:- مولانا محمد فاخر زائر الٰہ آبادی (متوفی ۱۱۶۴ھ) مع حواشی نواب سید محمد صدیق حسن خاں مرحوم (متوفی ۱۳۰۷ھ) ترجمہ:- مولانا حافظ محمد اسحاق صاحب۔

---

[1] صفحہ ۲۳ پر غالباً کاتب کی غلطی سے "صعود" کی جگہ "سعود" درج ہو گیا۔

ضخامت ۵۶ صفحات ۔ قیمت ایک روپیہ ۔ ملنے کا پتہ ۔ جمعیۃ اہل حدیث، شیش محل روڈ، لاہور۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کے زمانہ میں مولانا زاہد رحمۃ اللہ علیہ ایک صوفی مشرب بزرگ گزرے ہیں مگر اپنی اس "صوفیت" کے باوجود عقیدہ و عمل میں وہ اہل حدیث مسلک رکھتے تھے، یہ کتابچہ انہی کا لکھا ہوا ہے، فارسی متن کے نیچے، عام فہم اردو ترجمہ ہے۔

"تقلید شخصی" کے بارے میں فاضل مصنف لکھتے ہیں :۔

"دین کا ماخذ اللہ کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، اجماع اور قیاس اس میں داخل نہیں ہے اور نہ یہ حجت شرعی ہیں۔ ہاں! قرآن و سنت سے استدلال کرنے کے لیے معاون و وسیلہ بن سکتے ہیں مگر علی الاطلاق نہیں۔ بلکہ اس طریقہ سے جس کی اصول کی کتابوں میں تفصیل ہو چکی ہے، تقلید شخصی کو واجب قرار دینا بدعت ہے"

اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارے میں فاضل مصنف "اہل ظاہر" کا مسلک رکھتے ہیں۔ "استویٰ علی العرش" کی جو شرح انھوں نے کی ہے وہ کھٹکتی ہے، متکلمین نے جو یہ کہا ہے کہ :۔

"اللہ تعالیٰ جوہر، عرض، محدود، معدود، مشہود اور متحیز نہیں ہے، اور نہ وہ کسی مکان ہی میں ہے" اس کو مولانا زاہد "بدعت" سے تعبیر کرتے ہیں ——— تو کیا اللہ تعالیٰ کے لئے مکان، جہت، حد اور عدد ثابت کیا جائے ——— توبہ!

سبحان اللہ عما تصفون

متکلمین نے اللہ کی توحید، تجرید، تفرید اور تنزیہ کی شان کو جس انداز میں پیش کیا ہے، وہ، ان عقائد و تصورات کے مقابلہ میں اقرب الی الصواب معلوم ہوتی ہے، جن سے اللہ تعالیٰ کے لیے جہت و مکانیت بلکہ تجسم تک ثابت ہوتا ہو ——— یہ کہہ دینا کہ "ید اللہ" سے اللہ کا ہاتھ ہی مراد ہے، اگرچہ وہ مخلوق کے ہاتھ کی مانند نہیں ہے اور ہم "اللہ کے ہاتھ" کو سمجھ نہیں سکتے ——— کیا اس عقیدہ سے "تجسم" کی بو نہیں آتی اس کے مقابلہ میں "ید اللہ" سے "اللہ کی طاقت" مراد لینا۔ ایک طرف تجسم کی نفی ہے اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی شان تنزیہی کا اظہار ہوتا ہے!

"اہل ظاہر" کے اس مسلک کو جس کا اس کتابچہ میں ذکر کیا گیا ہے جمہور امت مسلمہ نے قبول نہیں کیا، اہل حدیث کا یہ سب سے زیادہ کمزور موقف ہے۔

حقیقت الفقہ کامل

از :۔ مولوی حافظ محمد یوسف جے پوری، ضخامت :۔ ۲۰۰ صفحات (مجلد) قیمت تین روپے۔
ملنے کا پتہ :۔ آرٹلری میدان عقب برنس روڈ، کراچی۔

فقہ کے جتنے مذاہب ہیں، ان میں عقیدہ کا تو سرے سے کوئی اختلاف پایا ہی نہیں جاتا اور مسائل میں بھی کوئی بنیادی اختلاف نہیں ہے، اختلاف فروع میں ہے، اور ان اختلافات کی بھی زیادہ تر نوعیت راجح و مرجوح کی ہے، تمام فقہی مذاہب حق ہیں اور مسلک اہل حدیث بھی حق ہے، اس کے علاوہ فقہی اختلافات کے "حرام و حلال" کی وہ نوعیت بھی نہیں ہے، جو "خمر و میسر" کی ہے کہ جن کی حرمت منصوص ہے اور ان کو حلال کہنا کفر ہے۔

مثال کے طور پر نماز کو لیجیے کسی فقہی مذہب کی نماز قیام کو رکوع اور سجود سے خالی نہیں ہے، ہر نماز میں "قرأت" پڑھا جاتا ہے، اور تکبیر و تسبیح کی جاتی ہے، ان تمام ارکان میں جو قطعی طور پر منصوص ہیں، تمام فقہی مذاہب مشترک ہیں۔ اختلاف فروع سے شروع ہوتا ہے مثلاً "رفع یدین کا کرنا یا نہ کرنا، اس کے بارے میں دونوں طرح کی حدیثیں، آثار اور تعامل پایا جاتا ہے، جو رفع یدین کرتا ہے، اس کی نماز بھی ہو جاتی ہے، اور جو کوئی رفع یدین نہیں کرتا، اس کی بھی نماز ہو جاتی ہے۔ "رفع یدین نہ کرنا" امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ نہ پڑھنا" اور اسی قسم

کے دوسرے مسائل واختلافات خدانخواستہ "ہوائے نفس" کی ایجاد نہیں ہیں اور نہ ان کا "عجمی تصورات" سے کوئی دُور کا بھی واسطہ ہے، ان مسائل کی پشت پر سنن وآثار پائے جاتے ہیں، اور ان کی بنیاد بھی سنتِ رسول کی اتباع، نقل، اور تقلید اور فرمانبرداری ہی ہے۔ سہو ولغزش کی دوسری بات ہے مگر کسی فقہی امام ومجتہد نے دیدہ ودانستہ اتباعِ رسول سے انحراف نہیں کیا!

اب رہا تقلید کا مسئلہ تو تقلید نہ شرک ہے اور نہ واجب ہے، یہ دونوں انتہائیں مبالغہ آمیز ہیں۔ فقہی مسائل میں کسی امام کی تقلید کو جو کوئی شرک سے تعبیر کرتا ہے، وہ بہت بڑی زیادتی کرتا ہے، اور کوئی مقلد کسی امام کے مسئلہ کو چھوڑ کر، کسی دوسرے امام کے اجتہاد وقیاس پر عمل کرلے، تو ایسا کرنے سے چاہے وہ تقلید کے دائرے سے باہر ہو جائے مگر اتباعِ رسول کے دائرے سے ہرگز باہر نہیں ہوتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی دوسرے انسان کی اطاعت منصوص نہیں ہے، یہ منصب صرف نبی کا ہے کہ اسکی اتباع سے انحراف گناہ تو ہے ہی، مگر وہ "کفر" کی حد تک بھی پہنچ جاتا ہے، کوئی مسلمان یہ کہے کہ:۔

"میں تو صرف اللہ تعالیٰ کی اطاعت کو منصوص سمجھتا ہوں، رسول اللہ کی اطاعت کو منصوص نہیں سمجھتا"

تو یہ کلمۂ کفر ہے، جو ایک بدبخت مسلمان کے منہ سے نکلا، مگر کوئی مسلمان یوں کہے:۔

"میں اللہ اور رسول کی اطاعت کو منصوص سمجھتا ہوں اور کسی امام ومجتہد کی تقلید کو منصوص اور لازمۂ ایمان نہیں سمجھتا"

تو ایسا کرنا شرعاً کوئی گناہ کی بات نہیں ہے۔ کسی فقہی امام نے اپنے فقہی مسلک کو امت پر "واجب" قرار نہیں دیا، جن لوگوں نے "تقلید" میں اس درجہ مبالغہ کیا ہے۔

"مرا از حدیث چہ کار، قول ابوحنیفہ بیار"　　(استغفر اللہ)

انہی کی شدت ومبالغہ کی وجہ سے "تقلید" بدنام ہوگئی ہے!

اہلِ حدیث کا بھی فقہی مسائل میں ایک مسلک ہے، اور وہ اپنے مسلک کو پیش کرنے کا حق رکھتے ہیں مگر یہ دیکھکر افسوس اور فکر ہوتا ہے کہ یہ حضرات فقہی اختلافات کو "جدال ونزاع" کے رنگ میں پیش کرتے ہیں، لہجہ خاصہ درشت ہوتا ہے، اور بعض مسائل میں تو چیلنج دے کر "انعام" کا اعلان کیا جاتا ہے! تبلیغ کا یہ انداز ہی حکمت وموعظت کے خلاف ہے۔

ہمارے پاس علماء اہلِ حدیث کی کتابیں تبصرے کے لئے آتی رہتی ہیں، جن کا خاص طور سے "ہدف" حنفی فقہ ہوتا ہے، اور حنفی فقہ پر اس انداز میں تنقید فرمائی جاتی ہے، جیسے حنفی فقہ "کتاب وسنت" سے الگ کوئی چیز ہے، اور جو کوئی اس فقہ کی تقلید کرتا ہے اس کی نہ عبادات معتبر ہیں اور نہ معاملات درست ہیں۔

اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ تنقیدیں شایانِ ملامت ولغزش ہیں، اکابرِ اہلِ حدیث کو چاہیئے کہ وہ اپنے اہلِ قلم کو ایسی رکیک حرکتوں سے روکیں اور تنقید واحتساب کو سنجیدہ حدود سے آگے نہ بڑھنے دیں!

یہ کتاب ——— حقیقت الفقہ ——— جو ہمارے سامنے ہے، اُس میں ― "حنفی فقہ" پر جو چوٹیں کی گئی ہیں وہ بہت ہی سطحی اور گھٹیا درجہ کی ہیں، مثلاً صفحہ ۵۰ پر، ایک عنوان قائم کیا گیا ہے کہ:۔

"کیا حنفی مذہب میں ولی ہوئے ہیں؟"

اس کے ذیل میں شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے:۔

قیل للشیخ الجیلانی ھل کان للہ ولیا علی غیر اعتقاد احمد بن حنبل فقال ما کان ولا یکون

ترجمہ:۔ حضرت پیران پیر سے پوچھا گیا کہ حنبلی مذہب والوں کے سوا اور مذہب میں بھی کچھ ولی ہوئے ہیں یا نہیں

فرمایا نہ ہوئے ہیں اور نہ ہونگے "۔

اس ترجمہ میں "حقیقت الفقہ" کے مصنف نے "اعتقاد" کا ترجمہ "مذہب" کرکے اردو جاننے والوں کو دانستہ طور پر غلط فہمی میں مبتلا کرنے کی کوشش کی ہے، اس قول میں "اعتقاد" سے فقہی مسائل ہرگز مراد نہیں ہیں۔ "اعتقاد" سے وہ "بنیادی عقائد" مراد ہیں جن پر کفر و اسلام اور نجات و عذاب کا دار و مدار ہے اور ان بنیادی عقائد میں حضرت امام احمد بن حنبل اور دوسرے ائمہ فقہ — (رحمہم اللہ تعالیٰ) کے درمیان کوئی اختلاف و نزاع نہیں ہے! شیخ رحؒ کے زمانہ میں رفض و خروج کے فتنوں کا زور تھا اس قول سے ان فرقوں کے "عقائد" پر طنز بلکہ اُن کی تردید و استخفاف مقصود ہے۔

اگر اس قول کی حضرت شیخ سے نسبت درست ہے، اور فاضل مصنف نے اُس کا جو ترجمہ کیا ہے، بفرضِ محال وہی شیخ کا مفہوم ہے، تو خود ہندوستان میں جو ہزاروں اولیاء اللہ گذرے ہیں، وہ حنبلی نہ تھے، بلکہ احناف تھے۔ یہ واقعات و مشاہدات شیخ کے قول کی تردید کرتے ہیں!

"اسمائے گرامی، اُن ائمہ محدثین، فقہاء و فضلاء کے جنھوں نے حضرت امام ابوحنیفہ کو ناقص الحافظہ اور حدیث کم جاننے والا اور اُسی کی جانچ پرکھ میں ناقص، اور نیز عربی زبان میں بتلایا ہے ۔...... صفحہ ۷۶)

اس عبارت میں حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے آفتاب سے زیادہ روشن کمالاتِ دینی اور تبحر علمی کو گھٹانے کی سعیٔ بیجا فرماکر، مصنف نے اپنے "دلی بغض" کو بے نقاب کردیا ہے! حالانکہ مصنف اس بات کو جانتے ہیں کہ فقہ و حدیث اور تفسیر کے اجل ائمہ اور کبار علماء میں سے کوئی ایسی شخصیت نہیں گزری، جس پر کسی نہ کسی عنوان سے جرح نہ کی گئی ہو، خود امام احمد بن حنبل اور امام بخاری (اللہ کی اُن پر رحمتیں ہوں) پر بھی دوسروں کے اقوال و آراء جمع کرکے "جرح و طعن" کا ایک باب اور ایک پوری فصل مُرتب کی جاسکتی ہے۔ حالانکہ حق یہ ہے کہ اس تمام جرح و تنقید کے بعد بھی ان بزرگوں کے دینی کارنامے اور ان کی عظیم شخصیتیں مسلم اور لائق صد احترام ہیں! ابوحنیفہ معصوم نہ تھے۔ اُن سے فکر و اجتہاد میں غلطیاں بھی ہوئی ہیں، مگر یہ واقعہ ہے کہ صحابۂ کرام کے بعد اتنا عظیم فقیہہ اور مُقنن اُمتِ مسلمہ میں پیدا نہیں ہوا!

صفحہ ۷۶ پر علی ابن مدینی کا ایک قول نقل کیا گیا ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے:۔

"علی بن مدینی کے بیٹے عبداللہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے باپ علی مدینی سے ابوحنیفہ کا حال پوچھا تو انھوں نے ان کو ضعیف بتلایا اور کہا پچاس حدیث میں بھولے ہیں"

حالانکہ حافظ ابن عبدالبر "جامع بیان العلم" (جلد ۲ صفحہ ۱۴۹) میں لکھتے ہیں:۔

وقال علی ابن المدینی ابوحنیفہ ———— ثقۃ لا باس بہ

(علی ابن مدینی کہتے ہیں کہ ابوحنیفہ ثقہ ہیں، اور اُن میں کوئی عیب نہیں ہے)

مصنف نے امام اعظم کو مجروح کرنے کے لئے "جرح و طعن" کی وہ روایت لی ہے، جو کمزور ہے، اور امام اعظم کی مدح و توصیف کی اس روایت کو چھوڑ دیا ہے۔ جو مستند اور قوی ہے۔

صفحہ ۱۸ پر ابوحنیفہ "درمختار، عالمگیری، ہدایہ اور بہشتی زیور کے حوالوں سے لکھا گیا ہے کہ "کتا نجس العین نہیں ہے" مصنف نے اس قسم کے مسائل درج کرکے، حنفی فقہ کی کمزوری پر استدلال کیا ہے ———— حالانکہ یہ بات بالکل صحیح ہے، کتا اگر (خنزیر کی طرح) "نجس العین" ہوتا تو اس کا کیا ہوا شکار کیوں حلال ہوتا!

صفحہ ۱۳۲ پر شرحِ وقایہ کے حوالہ سے لکھا ہے۔

"متعہ درست ہے" (زُفرؒ، شرح وقایہ)

حالانکہ شرحِ وقایہ میں تو "نکاحِ موقت" اور "متعہ" کو باطل قرار دیا گیا ہے اور امام زُفرؒ سے کچھ منقول نہیں ہے۔ البتہ حاشیہ میں زُفر رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک یوں لکھا ہے۔

"یجوز الموقت بہ معنی انہ منعقد موبداً و یلغو التوقیت"

(نکاح موقت بایں معنیٰ جائز ہے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سمجھا جائے گا، اور اس میں وقت کا تعین لغو سمجھا جائیگا)

دوسرے ائمہ کے نزدیک "نکاح موقت" منعقد ہی نہیں ہوتا، امام زفر رحمۃ اللہ علیہ ایسے "نکاح موقت" کے قائل نہیں ہیں جو ایک "معین وقت" کے لئے کیا جائے، بلکہ اُن کا کہنا یہ ہے کہ "نکاح موقت حقیقت میں" نکاح موبد" ہے!

اسی صفحہ (۱۳۲) پر، اس کتاب میں، شرحِ وقایہ کے حوالہ سے فقہ حنفی کا مسئلہ ان لفظوں میں لکھا گیا ہے۔

"شراب اور سؤر مہر کے بدلے میں ہو تو نکاح صحیح ہے"

جن لوگوں نے "شرحِ وقایہ" نہیں پڑھی اور حنفی فقہ پر جن کی نظر نہیں ہے، وہ اس مسئلہ کو پڑھ کر حنفی فقہ کے بارے میں کس قدر بدگمان ہو جائیں گے۔ حالانکہ اس مسئلہ کا تعلق مسلمانوں سے نہیں، "حربی" اور "ذمی" غیر مسلم سے ہے (ملاحظہ ہو شرح وقایہ، جلد ۲ صفحہ ۵) اصل مسئلہ اس عبارت سے شروع ہوتا ہے۔

فان نکح ذمی ذمیۃ او حربی حربیۃ ثم۔

نہ جانے اس کتاب میں فقہ حنفی کے مسائل میں اور کتنے مغالطے دیئے گئے ہیں اور اصل مسائل کو کہاں کہاں مسخ کر کے بیان کیا گیا ہے ——— یہ انداز اہل تقویٰ کو ہرگز زیب نہیں دیتا اور خاص طور سے اُن حضرات کے منصب سے تو بہت ہی گری ہوئی بات ہے، جو عامل بالحدیث ہونے کے دعویدار ہوں، کسی کی دشمنی میں عدل و انصاف اور اخلاق و دیانت کی حدود سے گزرنا نہیں چاہیئے!

فاضل مصنف کو پورے دلائل کے ساتھ سنجیدہ، باوقار اور علمی انداز میں حنفی فقہ کے اُن مسائل پر گفتگو کرنی چاہیئے تھی، جن میں اہل حدیث یا دوسرے فقہی مذاہب کے ائمہ کا موقف مستحکم اور اقرب الی الصواب ہے ——— مگر انھوں نے جو پوزیشن اس کتاب میں اختیار کی ہے، اُس نے خود اُن کے موقف کو کمزور اور مشتبہ بنا دیا ہے۔

حکمائے قدیم کا فلسفۂ اخلاق

از:- بشیر احمد ڈار، ضخامت ۶۰۰ صفحات، قیمت:- چھ روپے
ملنے کا پتہ:- ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ پاکستان، ۲ کلب روڈ، لاہور

ادارہ ثقافت اسلامیہ نے دین و اخلاق، شعر و ادب اور فلسفہ پر بڑے معرکہ کی کتابیں شائع کی ہیں، ان میں "اسلام اور موسیقی" اور "مُلّا اور اقبال" جیسی کتابیں بھی ہیں، جن کو دینی حلقوں میں عام طور پر ناپسند کیا گیا ہے، اور بعض کتابیں خالص علمی اور ادبی بھی ہیں! یہ کتاب ——— حکمائے قدیم کا فلسفۂ اخلاق ——— اس ادارے کی قابلِ قدر پیشکش ہے اُردو داں طبقہ کے لئے تو ایک نادر تصنیف اور معلومات آفریں تالیف ہے۔

مانی کو اچھے خاصے لکھے پڑھے لوگ ایک "مصور" کی حیثیت سے جانتے ہیں اور بہزاد مصور کے ساتھ مانی کا نام لیا جاتا ہے، مگر اس کتاب میں مانی کا فلسفۂ اخلاق پڑھ کر بہت سے لوگوں کی معلومات میں اضافہ ذ کا انکشاف ہوگا کہ وہ ایک مستقل مذہب کا بانی ہے، اسی طرح

سقراط، افلاطون اور ارسطو پر اردو میں کتابیں آچکی ہیں اور مضامین تو آتے ہی رہتے ہیں، لیکن زرتشت اور کنفیوشس کی حکمت اور فلسفۂ اخلاق سے عوام کیا خواص بھی پوری طرح واقف نہیں ہیں، یہ کتاب اُن کی اس بے خبری کو علم وخبر سے بدل دے گی۔

اس کتاب میں کنفیوشس، گوتم بدھ، بھگوت گیتا، زرتشت مانی، سقراط، افلاطون، ارسطو کے علاوہ رواق اور مصری فلسفۂ اخلاق تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، فلسفیانہ مسائل بڑے نازک اور پیچدار ہوتے ہیں مگر فاضل مصنف نے انہیں کس قدر سلجھا کر بیان کیا ہے، کہیں کہیں لائق مصنف نے بعض حکمائے کے فلسفیانہ خیالات پر گرفت بھی کی ہے، اور یہ دلیل ہے اُن کی نظر کے بالغ و عمیق ہونے کی! حکمائے کے بعض اقوال کی اسلام کے فلسفۂ اخلاق اور آیات قرآنی سے مطابقت دے کر مصنف نے کتاب کو اور زیادہ وقیع اور یقین افروز بنا دیا ہے۔

چند اقتباسات :-

"اگر کوئی شخص ایک معمولی سے ظلم کو دیکھکر برانگیختہ نہیں ہوتا، تو اس کو زیادہ ظلم کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔" (کنفیوشس)

"ایک شخص نے کون فیوشس سے سوال کیا "آپ کا اس سوال کے متعلق کیا خیال ہے کہ برائی کا بدلہ مہربانی سے دیا جائے (جواب دیا گیا) اگر اس کو مان لیا جائے تو پھر مہربانی کا بدلہ کس طرح دیا جائے گا؟ برائی کا بدلہ انصاف سے دو، اور مہربانی کا بدلہ مہربانی سے!"

فرض کیجئے ایک کشتی میں ایک آدمی، اس کی بیوی اور والدہ موجود ہیں، اور حالات ایسے نازک ہو چکے ہیں کہ بیوی اور والدہ میں سے وہ صرف ایک کو بچا سکنے پر قادر ہے، سوال یہ ہے کہ وہ کیا کرے۔"

"سبت کے دن یہودی عام تعطیل مناتے تھے، اور کوئی کام کرنا برا سمجھتے تھے، اُس دن حضرت عیسیٰؑ نے ایک بیمار عورت کو اچھا کر دیا، اس پر تمام یہودی علمائے نے حضرت عیسیٰؑ کو حرمتِ سبت توڑنے کا مجرم گردانا، لیکن انہوں نے جواب دیا کہ۔۔۔ سبت کے دن کی حرمت کا یہ مفہوم کبھی نہیں ہو سکتا، کہ نیکی اور رحم کے کاموں سے بھی ہاتھ روک لیا جائے، نیکی اور بھلائی کا قانون سبت کے دن کے قانون سے افضل ہے۔"

"بنی نوع انسان کی تمام مصیبتیں اور مشکلات صرف اسی صورت میں رفع ہو سکتی ہیں، جب ان کے حکمران ایسے ہی حکیم اور متقی انسان ہوں۔"　　　　(افلاطون)

"جسم وروح، دُنیا وآخرت، فرد اور جماعت کے اختلاف میں تضاد بھی ہے اور توافق بھی، اور ایک صحت مند معاشرے میں ان دونوں کی ضرورت ہے،"　　　　(افلاطون)

عام طور پر مشہور ہے کہ یونانی فلاسفہ، فلسفہ کے ابوالآبا اور موجد تھے، مگر اس کتاب میں فاضل مصنف نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ یونانی فلاسفہ نے مشرق کے بعض ملکوں کی حکمت کا اثر قبول کیا ہے، خاص طور سے رواقی نظام، زرتشتی نظام اخلاق کا خوشہ چین ہے۔

ریاست کے بارے میں افلاطون کا یہ قول آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے :-

"استعمال اخلاق، اعلاء کلمۃ الحق یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ صرف ایک اچھے معاشرے کی تکمیل پر منحصر ہے، صرف ریاست ہی سے یہ تمام مقاصد حاصل کیے جا سکتے ہیں، یہی وہ ذریعہ ہے جس سے نیکی اور بھلائی کی قوتیں کامیاب ہو سکتی ہیں اور بدی اور شر کا سر کچلا جا سکتا ہے۔"

اور

" بنی نوع انسان کی تمام مصیبتیں اور مشکلات صرف اسی صورت میں رفع ہو سکتی ہیں ، جب ان کے حکمراں ایسے ہی حکیم دمتقی انسان ہوں "

" آخر ہم نے کہاں جانا ہے (صفحہ ۳۶) اسی طرح اور بھی کئی جگہ " نے " کا استعمال غلط کیا گیا ہے ——— آدمیوں اور عورتوں کا بازار میں اکٹھے پھرنا (صفحہ ۱۰) " آدمیوں " کی جگہ " مردوں " لکھنا تھا کہ عورت بھی " آدمی " ہی ہوتی ہے ——— میں یہ کام میں ہر اُس شخص سے کرتا ہوں اور کروں گا جو مجھے ملے گا " (صفحہ ۲۶۶) اس میں ذم کا پہلو پایا جاتا ہے ——— صفحہ ۲۵۹ پر " ترمیم وایزادی " میں " ایزادی " کھٹکا " اضافہ " لے آتے ، تو یہ کھٹک کا ہیکو رہتی !

" خارجی عوامل وآرائشوں کا لباس " (صفحہ ۲۰) واؤ " عطف غلط استعمال ہوا ہے ، " اور " کا محل تھا ، کتاب میں کئی جگہ " واؤ " عطف (مثلاً وسعت وگہرائی (صفحہ ۲۴۰) اسی طرح غلط استعمال کیا گیا ہے ، اگر مصنف جان کر ایسا کرتے ہیں تو زبان اس طرح وسیع نہیں ہوتی بلکہ اُس کا حُسن کم ہو جاتا ہے !

جناب بشیر احمد ڈار اس کتاب پر علمی دنیا کی طرف سے مبارکباد کے مستحق ہیں ، سستے اور گھٹیا لٹریچر کے دور میں ایسی بلند پایہ کتابیں آتی ہیں ، تو انہیں پڑھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے ۔

مولانا ابوالکلام آزاد بچوں کے لئے

مرتبہ :- وقار خلیل ۔ ضخامت ۳۲ صفحات ، قیمت ۵۰ نئے پیسے ۔
ملنے کا پتہ :- ادارۂ ادبیات اُردو ، خیریت آباد ، حیدر آباد دکن ۔

اس کتابچے میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے سوانح حالات ، آسان زبان میں بیان کئے گئے ہیں ، مولانا مرحوم کے کمال انشا پردازی اور معجزانہ ذہانت کا ہمیں کیا پوری علمی دنیا کو اعتراف ہے ، لیکن افسوس ہے کہ وہ جب اپنے سوانح حیات اور اپنے خاندان کے حالات بیان کرتے ہیں ، تو اُس میں نہ صرف یہ کہ بیجا مبالغہ فرماتے ہیں بلکہ اس میں " ایجاد بندہ " کی خاصی آمیزش ہوتی ہے ، اس معاملہ میں وہ اپنے وقت کے " واقدی " تھے ۔ اُن کی بلند شخصیت کو دیکھ کر ، جب اُن کے اس احساسِ کمتری پر نگاہ جاتی ہے ، تو حیرت کے ساتھ دکھ بھی ہوتا ہے !